جلد نمبر ۱۰ فروری سنہ ۱۹۵۶ء شمارہ نمبر ۲

شاہراہ

ناولٹ نمبر

حصہ اوّل

تراجم

مرتب

محمد یوسف (ماں)

قیمت :- تین روپے

دفتر

اُردو بازار دہلی ۶

یوسف جید برقی پریس دہلی



سید شہیر الدین اشرفی
(ناظم شاہراہ)



محمد اسمٰعیل
(ہمارے آرٹسٹ)

اس انجمنِ گل میں

اُردو ادب میں جو فروغ نظم و افسانہ کو ہوا وہ فروغ حاصل نہیں ہوا ناول کو ہے — یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں ناول پر ایک کسمپرسی کا عالم ہے۔ ناول نگاری ابھی گھٹنوں چل رہی ہے۔ یہاں تو اُردو میں سماجی، سیاسی اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ایک بھی ایسا ناول تخلیق نہیں کیا گیا جسے ہم دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اپنی فخریہ پیشکش کر سکیں۔ نظم و افسانے کے میدان میں اُردو اتنی آگے نکل چکی ہے کہ بعض ملکی زبانوں میں اُن کی ابھی تک تقلید ہو رہی ہے۔ اور اس میدان میں بنگالی کو چھوڑ کر اُردو ابھی تک سب پر حاوی ہے۔ جس زبان کی نظم اور افسانہ اتنی ترقی یافتہ ہو اس سے ناول کے میدان میں بھی یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ کچھ ایسے چراغ جلائے گی جن سے دوسروں کے یہاں بھی اُجالا ہو گا۔ مگر یہ توقع شدید مجروح ہوئی ہے۔ اور یہ وادیِ سینا اُس حکیم کی منتظر ہے جو عالم تاب تخلیقوں کو پردے سے نکلنے پر مجبور کر دے۔

اُردو ناول نگاری کے میدان میں کچھ کوششیں قابلِ تحسین ضرور ہیں مگر وہ محض کوششیں ہی رہیں۔ کارنامہ نہیں۔ دنیا ترقی کی سمت کروٹ لے رہی ہے۔ ہمیں اپنی بپتی پر یہ سرسری جائزہ دکھاتا ہے۔ اُردو کو اپنے چاؤ، اپنی توانائی اور اپنے نکھار کے اعتبار سے ہند کی دوسری زبانوں میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ بھی قائم رہ سکتا ہے۔ مگر اس کا ناول بھی ایک امتیازی ترک اور اختتام کا حامل ہو سکے۔ ہمیں اچھے ادیبوں کا ایک بہت بڑا شکوہ ہے جسے اپنی خوابیدہ قوتوں کا علم بھی ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہر آج اُردو ناول نگار اپنی صلاحیتوں کو بیکار اور بے سود راستوں میں صرف کر رہے ہیں۔

ایک بڑا ادیب صرف ہیں منزل شناس اور ثبت نگار ہوتا ہے۔ لیکن وہ جب اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ سے آنکھ مچولی کھیلنے لگے تو نہ صرف اس کی اپنی بلکہ اُس کی قوم کی بھی بدنصیبی ہوتی ہے۔

'شاہراہ' گمراہوں کو تھامنے کا عزم ابھی تک محسوس کر رہا ہے۔ اگر یہ منزل سے گمراہوں کو سہارا دیتے جب تک اس کے بہتے کنارے شق ہو چکے ہیں۔ شاہراہ کا ناولٹ نمبر اُردو میں ناول کو فروغ دینے کی طرف ایک قدم ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ادب کے شہ پارے جمع کئے گئے ہیں جن کے انتخاب میں دقتِ نظر اور صلاح و مشورہ سے کام لیا گیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کے دو واضح مقاصد ہیں۔ ایک طرف تخلیق کی رفتار نہایت سست ہو چکی ہے چنانچہ اس ناولٹ نمبر کے ذریعہ قارئین کے لئے ادبِ عالیہ کے نمونے پیش کیا گیا ہے۔ اور ادیبوں کے لئے ایک مشعلِ راہ تلاش کی ہے۔ کہنے والے یوں کہتے ہیں۔ آپ بھی یہاں سے یہی مہر و ماہ فروزاں کیجئے۔

جب فرنچ ناول نگاری کی بنیاد رکھی گئی تھی روس میں ترگنیف، گوگول، دستوفسکی، ٹالسٹائی اور گورکی نے اسکو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ٹالسٹائی کے سوا ہم روس کے چار عظیم ادیبوں ترگنیف، دستوفسکی، گورکی کا ذکر کرتے ہیں۔ روسی زبان کے یہ چار ناولٹ روس کی جاندار اور قابلِ تقلید روایات کا آئینہ دار ہیں اور چار دانشمند بیک انگریزی کے تین ممتاز ادیب ہیں۔ اور اپنے ناولوں کے لئے عالمی شہرت رکھتے

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

ہندوستانی ادب کے ناولٹ

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

اس کو نکال کر رکھ دیا۔ اس کی نگاہ ایک کتاب پر پڑی، جو نصف اس کے بستر کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کو اٹھا لیا اور بستر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دل ہی دل میں پڑھتا رہا مگر رفتہ رفتہ اس کے لب ہلنے لگے اور پھر اس کے بعد وہ زور زور سے پڑھنے لگا:-

آج بھی
جب عُلمائے عصر محلوں سے لوٹتے اور وہاں کی باتیں کرتے تو
میں غور سے سنتا
وہ محل جہاں انہوں نے اپنی جوانیاں مسلسل تفکر میں ختم کر دیں
میں یہ سب کچھ سنتا ہوں، لیکن اگر نہیں سنتا تو اپنی محبوبہ
کی سرگوشی کو
ہماری وہ مبہم گفتگو جب ہم پر نیند طاری ہو رہی تھی
وہ اس کے عقل و تدبر سے بھرپور مختصر الفاظ
پانی کی طرح بے پروا اور خبیر مٹی کی طرح پُر اشتیاق

آج بھی
مجھے یاد ہے کہ گلاب کے پھولوں اور سرو کے درختوں سے
مجھے کتنا پیار تھا
مجھے کتنا پیار تھا عظیم نیلے پہاڑوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری
پہاڑیوں سے
سمندر کے شور پیہم سے اور بارہا
خلا میں نظر آنے والی عجیب آنکھوں اور تتلی کے جیسے
بازوؤں سے

کس طرح میری ہی خاطر صبح کو پرندے مصروفِ پرواز
ہوتے تھے
اور بچے چھوٹے چھوٹے چشموں میں غسل کرتے تھے

ڈاکٹر نے کتاب بند کر دی۔ پلیٹوں کے ڈھیر میں جو موجیں اٹھ رہی تھیں وہ اسے صاف سنائی دے رہی تھیں، اسی طرح جالی کے اندر چوہوں کی بھاگ دوڑ کی آواز بھی اس کے کان میں آ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں گیا تو ناند میں پانی ٹھنڈا ہو گیا تھا، اس میں اور گرم پانی ملایا۔ اس نے بلند آواز میں ناند سے گفتگو کی، چوہوں سے باتیں کیں اور اپنے سے خطاب کیا:-

آج بھی
جب کہ میں شریف زندگی کو اچھی طرح چکھ چکا ہوں
بزم جہاں میں زمرد کے ساغر بھی اٹھا چکا اور سونے کے
ڈھیر بھی

ایک اور صرف ایک ہی لمحہ کے لئے
اپنی محبوبہ کے طفیل میں میں نے آنکھیں بھر کے دیکھا ہے
اس بارانِ نور کو جس میں ابدیت کی جھلکیاں تھیں

اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ سفید چوہے جالی کے کٹہرے میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور نکلنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ چپی سانپ گلاس کے پیچھے اب بھی بیٹھا ہوا تھا اور اپنی گرد آلود اور خشمگیں آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔

اس انجمنِ گُل میں

اُردو ادب میں آج نظم و افسانہ کو وہ فروغ حاصل نہیں جو ناول کو ہے — یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں ناول پر ابھی کمی کا عالم ہے۔ ناول نگاری ابھی گھٹنوں چل رہی ہے۔ یوں تو اُردو میں سماجی، سیاسی اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ایک بھی ایسا ناول تخلیق نہیں کیا گیا ہے جو دوسری زبانوں کے مقابلے پر اپنی فخریہ پیشکش کر سکیں۔ نظم و افسانے کے میدان میں اُردو اتنی ترقی کر چکی ہے کہ بعض بھی دنیا کی زبانوں میں اس کی [illegible] تنقید جو ہے۔ اور اس میدان میں بنگال کو چھوڑ کر اُردو ہی تک [illegible] کا درجہ ہے۔ جس زبان کی نظم اور افسانہ اتنی ترقی یافتہ ہو اس سے ناول کے میدان میں بھی یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ کچھ ایسے پہلو جلا دے گی جن سے دوسروں کے یہاں بھی اُجالا ہو گا۔ مگر یہ توقع تشنۂ تکمیل ہی ہے۔ اور یہ ملاقی سینا اُس حکیم کی منتظر ہے جو عالم تاب تخلیقوں کو پردے سے نکلنے پر مجبور کر دے۔

اُردو ناول نگاری کے میدان میں کچھ کوششیں قابلِ تحسین تو ہیں مگر وہ محض کوششیں ہی تو ہیں۔ کارنامے نہیں۔ دنیا تو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ہمیں [illegible] پر سرسوں جما کر دکھانا ہے۔ اُردو کو اپنے ہاتھ پاؤں اپنی توانائی اور اپنے سلیقے کے اعتبار سے ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ بھی قائم رہ سکتا ہے کہ اس کا ناول بھی ایک امتیازی رنگ و اختصاص کا حامل ہو۔ سعود میں انتخابات کا ایک بہت بڑا شکوہ ہے جسے اپنا خواب، وقتوں کا علم ہو ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہو پا رہے ہیں۔ اور اردو ناول نگار اپنی صلاحیتوں کو بیکار اسے سستے راستوں میں صرف کر رہے ہیں۔

ایک بڑا ادیب اپنے معاشرے کا مزاج شناس اور نبض شناس ہوتا ہے۔ لیکن وہی ادیب جب اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ سے بے خبر ہو جائے تو یہ نہ صرف اس کی اپنی بلکہ اس کی قوم کی بھی بدقسمتی ہوتی ہے۔

"شاہراہ" گردو کو [illegible] کا حرج ابھی تک محسوس کر رہا ہے۔ اگرچہ منزل ابھی دور ہے لیکن اس کا ہر قدم [illegible] ہے۔ "شاہراہ" کا ناولٹ نمبر اسی سلسلہ میں ناول کو فروغ دینے کی طرف ایک قدم ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ادب کے شہ پارے جمع کئے گئے ہیں۔ انتخاب میں وقت کی نظر اور صلاح و مشورہ سے کام لیا گیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کے دو واضح مقاصد ہیں۔ [illegible] تخلیق کی رفتار نہ سست پڑنے پائے لہٰذا اس ناولٹ نمبر کے ذریعہ قارئین کے لئے ادبِ عالیہ کے [illegible] گیا ہے۔ اور ادیبوں کے لئے ایک مشعلِ راہ تلاش کی ہے۔ کہ لکھنے والے یوں لکھتے ہیں۔ آپ بھی انہیں مشعلِ راہ قرار دیجئے۔

جب فرانسیسی ناول نگاری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ روس میں تورگنیف، گوگول، دستوفسکی، ٹالسٹائی اور گورکی نے اسے کمال عروج پر پہنچایا۔ ٹالسٹائی کے سوا اہم روس کے چار عظیم ادیبوں تورگنیف، دستوفسکی، گوگول اور گورکی [illegible] کر رہے ہیں۔ روسی زبان کے یہ چار ناولٹ روس کی جان دار اور قابلِ تقلید روایات کے آئینہ دار ہیں۔ ایک اور جاپانی ادیب کے افسانے انگریزی کے تین ہم عصر ادیب ہیں۔ اور اپنے ناولوں کے لئے عالمی شہرت کے

دیگر اداروں کی کتب

ادب:-

تاریخ ادب اُردو رام بابو سکسینہ ۱۰/۰
تاریخ زبان اُردو ڈاکٹر مسعود حسن ۴/۰
اُردو ادب کی تاریخ نسیم قریشی ۲/۸
آبِ حیات محمد حسین آزاد ۶/۸
اُردو ہندی ہندوستانی سجاد ظہیر -/۱۲/۰
مشترکہ زبان مہاتما گاندھی ۴/۰
تاریخ ریختی دیوان جان صاحب ۳/۰
۱۹۵۴ء کا بہترین ادب مکتبہ شاہراہ ۵/۸
۱۹۵۵ء " " " ۵/۸
منتخب ادب احتشام حسین ۶/۰
تاریخ ادبیات ایران مترجمہ مبارز الدین احمد ۱۲/۰
روسی ادب مکمل پروفیسر محمد مجیب ۸/۰
ادب اور انقلاب ڈاکٹر اختر حسین ۲/۸
ادب اور سماج احتشام حسین ۲/۱۲
نیرنگ خیال مکمل محمد حسین آزاد ۱/۸
ایک مشرقی کتب خانہ مبارز الدین ۳/۰
احوالِ غالب ڈاکٹر مختار الدین احمد ۹/۰
نقدِ غالب " ۱۰/۰
میر تقی میر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۲/۰
مطالعہ حالی شجاعت علی سندیلوی ۳/۸
مطالعہ شبلی " ۳/۸
ادب اور نظریہ آل احمد سرور ۳/۸
ادب کیا ہے ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی ۲/۰
اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصہ ڈاکٹر عزیز ۵/۸
بیانِ غالب باقر ۵/۰

دو نایاب زمانہ بیاضیں ہندوستانی اکیڈمی ۲/۴
فلسفۂ کلامِ غالب شوکت سبزواری ۳/۴
ہمعصر شعراء کے خطوط ضیاء اسلام ۴/۸
انشائے داغ سید علی حسن ۱/۸
شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں عبد اللطیف اعظمی ۳/۰
جنوبی ہند میں دو ہفتے جگن ناتھ آزاد ۱/۰
آرائشِ محفل نولکشور پریس ۷/۸
باغ و بہار میر امن دہلوی ۷/۴
الف لیلیٰ مکمل نولکشور پریس ۵/۰
داستانِ امیر حمزہ " ۸/۰
سیر کہسار (مکمل دو حصے) رتن ناتھ سرشار ۱۰/۰
اُردوئے قدیم شمس اللہ قادری ۲/۸
انوارِ سہیلی ۱/۰
گل بکاؤلی -/۱۱/۰
ہندی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محمد حسن ۵/۸
امیر خسرو ڈاکٹر وحید مرزا ۵/۰
کبیر صاحب منوہر لال زتشی ۳/۰
اقبال کامل عبد السلام ندوی ۶/۸
بزمِ تیموریہ سید صباح الدین ۷/۰
بزمِ مملوکیہ " ۵/۸
چند دکھنی پہیلیاں محمد نعیم الرحمٰن ۱/۸
ایک نادر روزنامچہ نور الحق ہاشمی ۲/۸
اکبر میری نظر میں مولانا عبد الماجد دریا آبادی ۳/۰
فلسفۂ اقبال عبد القوی دریا آبادی ۲/۸
ادبی خطوط غالب مرزا حسن عسکری ۳/۸
معرکۂ چکبست نولکشور پریس ۳/۰
ذوقِ ادب و شعور احتشام حسین ۳/۰

نئے پرانے چراغ احتشام حسین ۵/۰
ہماری قومی زبان سر تیج بہادر سپرو -/۸/۰
ادب الجاہلی رضا انصاری ۶/۰
حکایاتِ رومی مکمل مرزا نظام شاہ ۲/۰
حکایاتِ آغانی رئیس احمد جعفری ۴/۰
جامع الحکایات مکمل اختر شیرانی ۵/۰
اخوان الصفا مولوی اکرم علی -/۸/۰
طربیۂ خداوندی ۳/۰
آرائشِ محفل شیر علی افسوس ۳/۸
کلاسکی ادب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۳/۸
اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر ڈاکٹر عبد العلیم -/۸/۰
آثار ابو الکلام آزاد قاضی عبد الغفار ۶/۰
یادگارِ غالب مولانا حالی ۴/۰
اُردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین ۱۰/۰
شعر الہند مکمل علامہ شبلی ۱۲/۸
بہادر شاہ ظفر امیر احمد علوی ۳/۰
طرۂ امیر " ۱/۰
عودِ ہندی غالب ۱/۸
ہماری شاعری مسعود حسین رضوی ۳/
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ " ۳/۰
مکاتیب شبلی مکمل مولانا شبلی ۴/۴
زبانِ داغ رفیق مارہروی ۳/۸
ادب کا مقصد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۸
ذکرِ حافظ سجاد ظہیر ۲/۴
بزمِ بے تکلف ڈاکٹر سید عابد حسین ۲/۸
مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر ڈاکٹر عبد الحق ۱/۰

مالک ہیں۔ وہاں کے ممتاز ناولٹ بہترین ناول نگاروں کے حامل ہیں۔

شاہراہ کے ناولٹ نمبر کی خصوصیت بنگالی، پنجابی، سندھی، تامل، گجراتی اور مراٹھی کے ناولٹ ہیں۔ یہ سب ناولٹ ہماری کڑی محنت، دوڑ دھوپ اور مسلسل تلاش و جستجو کا نتیجہ ہیں۔ یہ ناولٹ ایک آئینہ ہیں کہ ہماری ملکی زبانیں ناول کے میدان میں کہاں تک ترقی کر چکی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ناولٹ نمبر ایک تاریخی دستاویز ہے۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان تمام مصنفوں اور مترجموں کی تصاویر جو ہمیں دستیاب ہو سکیں، ان کی تصانیف کے ساتھ اسی آرٹ پیپر پر جو ان اوراق میں ملیں گی۔ ملکی اور غیر ملکی ناولٹ کے ڈیزائنوں کے بھی ہوں گے اور یہ پورے ۳۲ صفحات ان ۴۸۰ صفحات میں شامل نہیں ہیں بلکہ یہ ناولٹ نمبر کل ۶۸۲ صفحات کا ہے۔ چند قارئین کے اصرار پر شاہراہ کے منیجر اور آرٹسٹ کے فوٹو بھی علیحدہ روشناسی پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہم نے جب ناولٹ نمبر کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا تھا تو اس وقت یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اتنی طویل ہو جائے گی۔ اس عظیم کام کا اب آغاز کرنے کے بعد اسے ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ سارا ارادہ تو تھا کہ ناولٹ نمبر کو دو حصوں میں ختم کر دیا جائے لیکن اب یہ کام تین حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ غیر ملکی ادب کے کچھ مشہور ناولٹ جنہیں ہم پیش نہیں کر پائے اور بنگالی باقی آئندہ زبانوں کے ناولٹ تیسرے حصے میں پیش کئے جائیں گے۔

دوسرا حصہ اردو کے طبع زاد ناولٹوں پر مشتمل ہوگا۔ ناولٹ نمبر کا دوسرا حصہ جولائی کے پہلے ہفتے میں پیش کیا جائے گا۔ ناولٹ نمبر کے دوسرے حصے میں کیونکہ طبع زاد ناولٹ ہوں گے اس لئے ہم اسے مواد اور طباعت کے اعتبار سے ایک بے مثال صحیفہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کم و بیش بیس ناولٹ قارئین کی نذر کئے جائیں گے۔ اس کی ضخامت بھی موجودہ ناولٹ نمبر سے زیادہ ہوگی۔ اردو کے سب ہی نامور ادیب تعاون کا یقین دلا چکے ہیں۔ ہم ان سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات ہمیں جلد بھجوانے کا کرم فرمائیں۔

آخر میں ہمیں اپنے قارئین سے ایک درخواست کرنی ہے۔ جو اصحاب شاہراہ کے خریدار ہیں یا اب بننا چاہیں گے انھیں شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا پہلا حصہ مفت دیا جائے گا۔ اگر وہ شاہراہ کے طبع زاد ناولٹ نمبر بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ مزید چھ روپے بھجوانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

ناولٹ نمبر کا تیسرا حصہ جنوری [illegible] میں شائع ہوگا۔

محمد یوسف (جامعی)

بال وپر کنہیا لال کپور ۲/۸
پردیسی کے خطا مجنوں گورکھپوری ۳/۸
اُردو ادب کے چاند تارے امیر الحسن نورانی ۳/۸
زبانِ داغ سید رفیق مارہروی ۳/۸
بزمِ داغ ۳/۴
آبِ حیات کے لطیفے محمد حسین آزاد ۱/۸
اُردو کی کہانی سید احتشام حسین ۱/۶
ساحل اور سمندر ۴/۸
ناول کیا ہے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۴
مختصر تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر اعجاز حسین ۵/۸
انمول آنسو مہاتما گاندھی کے ادبی کارنامے ۴/۸
مشاعرہ عالم ارواح سید مرتضیٰ حسین ۴/۰
میری اصلاحیں ابرار حسین گنوری ۳/۰
مطالعۂ غالب اثر لکھنوی ۱/۸
تحقیقی مطالعے ڈاکٹر نذیر احمد ۲/۰
نقد الادب حامد اللہ افسر ۲/۸
اُردو (مضمون نگاری) ڈاکٹر ظہیر الدین ۲/۸
اُردو زبان کا ارتقاء ڈاکٹر شوکت سبزواری ۶/۸
میعار البلاغتہ ۱/۰
بحر الفصاحت نجم الغنی ۱۰/۰
اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست } نصیر الدین ہاشمی ۱۲/۰

تنقید

تنقیداتِ عبد الحق مولانا عبد الحق ۲/۴
شعر العجم مکمل ۵ حصے علامہ شبلی ۱۶/۸
محاسن کلام غالب ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری ۱/۶
تحقیقات ڈاکٹر عندلیب شادانی ۵/۸
تنقید کیا ہے آل احمد سرور ۳/۰
تنقیدی اشارے 〃 ۳/۰
اُردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۴

قدر ونظر پروفیسر اختر اورینوی ۳/۰
تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر ۲/۸
حسرت موہانی پروفیسر عبد الشکور ۳/۰
تنقیدی سرمایہ 〃 ۲/۰
فانی 〃 ۳/۰
روح اقبال ڈاکٹر یوسف حسین ۶/۰
مزامیر مکمل دو حصے اثر لکھنوی ۹/۰
نکات الشعراء میر تقی میر ۱/۱۲
نقد حیات ممتاز حسین ۳/۰
انیس کی مرثیہ نگاری اثر لکھنوی ۲/۰
جہان بیں 〃 ۳/۸
اثر کے تنقیدی مضامین 〃 ۳/۸
اقبال کی شاعری عبد المالک آروی ۵/۸
نصرتی ڈاکٹر عبد الحق ۳/۰
تحقیقی مقالے پروفیسر معین الدین ۲/۴
سخنہائے گفتنی کلیم الدین احمد ۱/۰
نقوش وافکار مجنوں گورکھپوری ۳/۰
ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۳/۸
چند تنقیدات عبد الحق ۰/۸/۰
فن شاعری عزیز احمد ۱/۴
سودا شیخ چاند احمد ۲/۸
غالب نامہ محمد اکرم ۴/۸
فکر وفن خلیل الرحمٰن اعظمی ۳/۰
جہان نو ڈاکٹر غلام جیلانی ۳/۰
باقیاتِ فانی فانی ۲/۸
نکات مجنوں مجنوں ۵/۰
ادبی رجحانات اعجاز حسن ۳/۱۲
نئی فکریں سید محمد طفیل ۱/۸
اُردو ادب میں طنز ومزاح فرقت کاکوروی ۱۰/۰
روایت اور بغاوت احتشام حسین ۳/۰
ہندوستانی لسانیات کا خاکہ 〃 ۲/۸

آبحیات کا تنقیدی مطالعہ سید مسعود حسن رضوی ۱/۸
اُردو تنقید کی تاریخ مسیح الزماں ۳/۰
تعبیر تشریح تنقید 〃 ۲/۰
تنقیدیں اویس احمد ادیب ۳/۰
اقبال مجنوں ۱/۴
مطالعۂ شبلی ناظر کاکوروی ۳/۰
کتابِ نورس ڈاکٹر نذیر احمد ۲/۸

مقالات:-

مقالات حالی مکمل عبد الحق ۴/۸
فردوسی پر چار مقالے پروفیسر محمود شیرانی ۶/۰
مقالات گارساں دتاسی مکمل دو حصے ۸/۰
خطبات 〃 ۶/۸
مضامین عابد ڈاکٹر عابد حسین ۴/۰
خطبات عبد الحق جلد دوم ۱/۸
خطبات شبلی ۱/۸
مقدمہ رقعاتِ عالمگیر پروفیسر نجیب اشرف ۵/۰
رقعاتِ عالمگیر 〃 ۴/۰
مقالاتِ شبلی مکمل ۸ حصے ۱۶/۸
مکالماتِ برکلے ۱/۸
مکاتیب حالی شیخ محمد اسمٰعیل ۳/۰
پطرس کے مضامین ۲/۰
مضامین سرسید عزیز الدین اختر ۲/۴
انتخاب مضامین شرر ۱/۴

تذکرے وسوانح:-

گلِ رعنا مولانا عبد الحی مرحوم ۷/۰
حیات شبلی سید سلیمان ندوی ۹/۰
برکلے اور اس کا فلسفہ مولانا عبد الباری ۱/۴
ادبی اور قومی تذکرے حصہ اول ودوم ۱۱/۰
حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی پروفیسر خلیق احمد ۷/۰

عالمی ادب کے ناولٹ



شاہراہ





دستووسکی

دستووسکی انسان کے مصائب، اس کے غم و آلام، اس کی ذہنی پیچیدگیوں اور اس کی فطری غلاظتوں کا مصور تھا۔ اس نے اپنی تخلیقات میں ایک ایسے سماج کی عکاسی کی ہے جس کی قدم قدم پر آنچ پہنچتی ہے۔ اور جس کے افراد سسک سسک کر جیتے ہیں۔ دستووسکی نے اپنے ناولوں میں انسان کو قدموں تلے پستا اور کراہتا ہوا تو دکھایا ہے لیکن اس نے انسان کو مصیبت اور ذلت سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں سجھایا۔

دستووسکی نے خود زندگی کے تلخ حقائق کا مزا چکھا تھا۔ وہ مرگی کے مرض میں مبتلا تھا اور اپنی جوانی میں پھانسی کے تختے پر چڑھتے چڑھتے بچا تھا — ان دو حادثوں نے اسے بے بس بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے ناولوں میں ایسے شکستہ کردار پیش کیے ہیں جو چپکے چپکے ظلم و ستم سہتے رہتے ہیں۔

دستووسکی کے ناولوں میں ہمیں سب کچھ ملتا ہے، سرکاری ملازم، جھوٹے دکاندار، اوباش کی زندگی بسر کر کے تباہ ہو جانے والے جاگیردار، بھٹکے ہوئے نوجوان، امراض سے جکڑے ہوئے انسان اور اپنے دلوں میں جرائم، نفرت اور غلاظتوں کی پرورش کرتے ہوئے افراد ملتے ہیں۔

دستووسکی کے ناولوں کے ہیرو فرار کے قائل ہیں۔ وہ اپنے سینے پر زخم کھا سکتے ہیں مگر احتجاج نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے انقلابی راستہ اختیار نہیں کرتے۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دستووسکی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اس کی نگاہ ہمیشہ انسان کی فطری غلاظتوں کو ٹٹولتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ گھناؤنے اور نفرت انگیز واقعات کی کھوج میں رہتا تھا۔ دستووسکی کے ناول پڑھنے سے ہمیں زندگی کے علم پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے بہت سے پہلو ہم پر بے نقاب ہوتے ہیں۔ اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ صدیوں کی لوٹ کھسوٹ اور بربریت نے انسان کے باطن میں کتنی گتھیاں، کتنی غلاظتیں اور کتنی ذہنیتیں بھر دی ہیں۔ ہم ان ذلتوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

یہ دستووسکی کے فن کا کمال ہے — اور اس کا یہ فن اس ناول میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

دستووسکی کے ناول اس دور کی پیداوار ہیں جب روس میں جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا۔ اور سرمایہ دارانہ تعلقات استوار ہو رہے تھے۔ دستووسکی کے ناولوں کے ہیرو اس عبوری دور میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ خود دستووسکی بھی اس دور کا انسان تھا اس لئے اپنے بیشتر ناولوں کا وہی ہیرو ہے۔



شاہکار

دستوئیفسکی

مترجم: ...

غریب لوگ

میری پیاری واروارا

کل رات میں بہت خوش تھا۔ میں تصور میں بھی اتنا خوش نہ ہو سکتا تھا کیونکہ میری ننھی واروارا! تم نے اپنی زندگی میں پہلی بار ویسا کیا جیسا میں نے چاہا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ اور جانِ من یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ کام کے بعد ذرا سستا لینے کا مجھے بے حد شوق ہے) میں نے موم بتی جلائی، کاغذات کو ترتیب دی اور ابھی قلم کو ٹھیک درست ہی کر رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ اٹھی۔ اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر میرے دل کی بات تم نے جان ہی لی یعنی جیسا میں نے کہا تھا تم نے بالکل اسی طرح پردے کا ایک کونہ مرتبان کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ یہاں تک محسوس ہوا کہ تم کھڑکی میں کھڑی ہو اور تمہارا گڑیا ایسا چھوٹا سا چہرہ تم کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں اور تمہارے دل میں بھی میرا خیال چٹکیاں لے رہا تھا میری ننھی سی فاختہ۔ مجھے اس بات سے دکھ ہو رہا تھا کہ مجھے تمہارا خوبصورت چہرہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ کیا دن تھے کہ جب میری بینائی ٹھیک تھی۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میری لاڈلی۔ بڑھاپا لعنت ہے۔ سب کچھ دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ اور شام کے اندھیرے میں ذرا سا لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے بعد صبح کو آنکھیں اس طرح دکھنے لگتی ہیں اور ان سے پانی بہنے لگتا ہے کہ لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بہرحال میری ننھی فرشتہ تمہاری اس مسکراہٹ سے میرا دل جگمگا اٹھا تھا۔ وہ مسکراہٹ کتنی نرم اور شیریں تھی اور مجھے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا جیسے وہ ... تھیں یہ سب ٹھیک ہے۔ یاد ہے نا؟ ... تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ... ہو کر ... سے میرا ... سچ سچ بتانا کہ ... مطلب! ... مجھے اس واقعے کے بارے میں ... لکھنا۔

اور ہاں ۔۔۔ ہم نے پردے کی آڑ لیکر جو چالاکی دکھائی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ کمال کر دیا ہے ۔۔۔ ہے نا؟ کام کرتے وقت یا سوتے جاگتے وقت میں فوراً سمجھ جاتا کہ تم ادھر بیٹھی میرے بارے میں سوچ رہی ہو۔ تم مجھے یاد کر رہی ہو۔ اور تم خوش ہو۔ اگلا پردہ گرا دینے کا مطلب ہوتا تھا ۔۔۔ ماکار ۔۔۔ شب بخیر! اور پردہ اٹھانے سے مراد تھی ۔۔۔ ماکار ۔۔۔ صبح بخیر۔ امید ہے کہ رات تم اچھی طرح سوئیں؟ یا اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا تھا ۔۔۔ ماکار ۔۔۔ مزاج کیسا ہے۔ میں تو خدا کے فضل سے اچھی ہوں۔ خوش ہوں ۔۔۔ دعا ہے:

لیکن میری جان تم یہ دیکھو کہ ہم نے کیا ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ اب تو خط بھی بے معنی نظر آتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ اور یہ سب کچھ میں نے ہی سوچا تھا ۔۔۔ مجھے ایسی باتیں خوب سوجھتی ہیں۔ مانتی ہو نا!

میری ننھی واروارا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کل رات میں ... سویا اور مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ اتنی اچھی نیند آ سکے گی۔ اور یہ بات بہت ... وہ ہے۔ کیونکہ عام طور پر شروع شروع میں نئی جگہوں پر اچھی طرح نیند آتی نہیں۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی ہے کہ آدمی کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ آج صبح میں بلبل کی طرح ہشاش بشاش اٹھا تھا۔ اور جانِ من صبح بھی کتنی حسین اور خوشگوار تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ سامنے سورج چمک رہا تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ہوائیں موسم بہار کی مہک لیے ہوئی تھی ... زندگی پھوٹ رہی تھی۔ ہر چیز میں بہار آئی ہوئی تھی۔ ہر شے ... تھی۔ میں نے کچھ خیالی گھوڑے بھی دوڑائے اور فقط تمہارے بارے میں سوچا ۔۔۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تمہیں آکاش کا وہ پنچھی ... بنایا ہے کہ وہ قدرت کا حسن اور انسان کو راحت ... اور ... ہاں مجھے خیال آیا کہ ... پریشانی اور مصیبت میں ...

کی کاوش ہے اُتنا ہی اور معصوم پرندوں سے رشک ہوتا لازمی ہے۔ اور
باہر اور میں بیٹھے بیٹھے میں نے کئی مبہم اور خوشگوار ربطے بھی قائم کئے تھے
وارینکا۔ میرے پاس ایک کتاب ہے اور تمہیں اس کتاب میں ایسی بہت سی
باتیں نظر آئیں گی جیسی کہ میں یہاں لکھ رہا ہوں۔ اگر سچی بات پوچھو تو میں نے سب
کچھ اسی کتاب سے پایا ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے کتاب کے مصنف کی بھی
بالکل میری طرح تمنائیں اور حسرتیں ہیں۔ اور ان کا اظہار اُس نے شاعری میں
یوں کیا ہے۔

"سوسائٹی میں اک پنچھی ہوتا ہو شکار کے تجسس میں بلندیوں کو
چیرتا جاتا ہے"

اور یہ نظم اسی طرح چلتی جاتی ہے۔ اس میں اور بھی بہت سی نازک خیالیاں
ہیں۔ لیکن تم اسے چھوڑو ——— یہ بتاؤ کہ آج صبح تم گئی کہاں تھیں۔ جب تم
اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی نکلی تھیں تو میں ابھی کام پر جانے کو تیار نہ ہوا تھا
تمہیں ایک نظر دیکھ کر دلی خوشی ہوتی۔ لیکن وارینکا ۔ دکھی ہونے سے بھی کچھ
نہیں بنتا۔ آنسو کسی فکر کی تلافی نہیں کر سکتے۔ یقین مانو میری لاڈلی ———
میں نے تجربات سے یہ سیکھا ہے ——— ہاں وہ فیڈورا کیسی ہے۔ وہ بہت
نیک عورت ہے۔ وارینکا جواب دیتے وقت میری سب باتوں کا جواب
لکھنا اور یہ بتانا کہ تم دونوں مل کر کیسے دن گذار رہی ہو۔ ویسے سب کچھ
ٹھیک ہے نا؟ فیڈورا کو بات بات پر منہ بنا لینے کی عادت ہے لیکن تم
بُرا نہ ماننا۔ وہ بہت ہی اچھی عورت ہے۔ خدا اُسے سُکھی رکھے۔

میں تھیریسا کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ وہ بہت
ایماندار اور نیک عورت ہے۔ مجھے تو بے حد فکر لگ گئی تھی کہ ہم اپنے
خط ایک دوسرے تک کیسے پہنچائیں گے! اور ہماری خوش قسمتی سے خدا
نے تھیریسا کو ہمارے لئے یہاں بھیج دیا۔ وہ نیک دل ہے۔ بے حد
سلیقہ مند ہوتی اور کام آنے والی عورت ہے۔ لیکن ہماری مکان مالکن بہت
ہی بے رحم اور سنگ دل ہے۔ وہ اس بیچاری سے بہت زیادہ کام لیتی
ہے اور بہت ظلم کرتی ہے۔ بڑی سخت عورت ہے۔

وارینکا میں کس جگہ آ گیا ہوں۔ یہ تو عجیب گندگی ہے۔ کمرے
بہت ہی گندے اور تاریک ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گوشہ نشین انسان
ہوں۔ جہاں پہلے رہا کرتا تھا وہاں اتنا سکون اور سکوت ہوتا تھا کہ اگر
مکھی بھی بھنبھنائے تو اس کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اور یہاں
یہاں شور ہے۔ بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ یہ جگہ
ہے کیسی؟

قیاس کرو کہ ایک لمبا سا برآمدہ ہے جو بہت ہی تاریک اور
گندہ ہے۔ دائیں طرف دیواریں ہیں جن پر نہ رنگ نہ روغن ہے بس سیاہی
لگی دیواریں۔ بائیں طرف کسی ہوٹل کی طرح قطار در قطار دروازے ہی
دروازے نظر آتے ہیں۔ اور ان کمروں میں ایک ایک یا دو دو آدمی رہتے ہیں
کچھ کمروں میں تو تین تین آدمی بھی رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب گڑبڑی ہے
یہ جگہ واقعی حضرت نوح کی حقیقی کشتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب
لوگ بظاہر اچھے ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق
رکھتے ہوں اور اچھے پڑھے لکھے لوگ ہوں۔ آگے اندر کی بات خدا
جانے۔ ان میں ایک صاحب کلرک ہیں (ویسے ان کا کام ادبی نوعیت کا
ہے) بہت وسیع المطالعہ شخص ہے۔ اُسے ہومر یا برامبیوس کے بارے میں بھی
بہت علم ہے اور دیگر ادبی تصنیفات کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہے۔
دنیا بھر کا ادب پڑھ رکھا ہے۔ اُسے ہر چیز کے بارے میں علم ہے بھئی
ذہین آدمی ہے۔ دو فوجی افسران ہیں۔ وہ تو ہمیشہ تاش ہی کھیلتے رہتے ہیں۔
ایک بحری فوج کے افسر ہیں اور ایک صاحب انگریزی کے مدرس ہیں۔ لیکن
تم میرے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ تمہاری دلچسپی کے لئے میں مختصر پیرائے
میں ایک ایک کا ذکر کروں گا بالکل ویسا ہی لکھوں گا جیسے وہ ہیں اور بڑی
تفصیل سے لکھوں گا۔ مکان مالکن ٹھگنے قد کی، پھوہڑ، اور بوڑھی عورت
ہے۔ وہ سارا دن سلیپر پہنے اور ڈریسنگ گاؤن پہنے گھومتی رہتی ہے اور
تھیریسا کو ڈانٹتی رہتی ہے۔ میں رسوئی میں رہتا ہوں۔ بلکہ صحیح لفظوں میں
ہے کہ رسوئی کی ساتھ والی دائیں طرف ایک کمرہ ہے (اور یہاں یہ بتا دوں کہ
ہماری رسوئی بہت اچھی ہے۔ صاف اور ستھری ہے) لیکن وہ کمرہ کچھ
خاص بڑا نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا ہے...... بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب
ہوگا کہ رسوئی اس سے بڑی ہے۔ اس میں تین کھڑکیاں ہیں اور درمیان
میں دیوار کھڑی کر کے اسی رسوئی سے ایک اور کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ اور
اس کا علیحدہ کمرہ دکھایا جا رہا ہے۔ چوڑا اور [illegible] آرام دہ
کمرہ ہے۔ اُس میں ایک کھڑکی ہے۔ میں اسی میں رہتا ہوں [illegible]
جگہ سے مجھے پوری تسلی ہے۔ اب اس سے یہ مطلب نہ لینا [illegible]
بالکل [illegible] ہے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ [illegible] رسوئی کا
ایک حصہ ہے۔ میں اس میں رہتا ہوں اور اس سے [illegible]
[illegible] ہر لحاظ سے خلوت گاہ ہے۔ [illegible]

رکھ سکتا ہوں اور آرام سے تو تم رہتا ہوں۔ جہاں تک سامان کا تعلق
ہے تو میرے پاس ایک بستر ہے، ایک میز، الماری اور دو کرسیاں
ہیں۔ میں نے ایک موسیقی بھی لا کر رکھ دی ہے۔ ایک تنہا انسان کے لئے
یہ ہر خوشی کا باعث ہوتا ہے اور پھر کمرہ سستا بھی ہے۔ اس مکان میں
سب سے چھوٹے کمرے کا کرایہ ۴۵ روپے ہے اور یہ میری بساط سے باہر
ہے۔ اس وقت میں اس کمرے کے ۴۲ روپے دے رہا ہوں اور پھر ساتھ
کھانا بھی مل رہا ہے۔ اس سے پہلے مجھے پورے تیس روپے ادا کرنا پڑتے
تھے اس کے باوجود اپنے آپ کو کئی چیزوں سے محروم رکھنا پڑتا تھا۔
میں سب سے پہلے چائے پینے کی سوچ تک نہ سکتا تھا اور اب چائے اور کھانا
پینے میں کچھ رقم بچانے کے قابل ہو جاتا ہوں۔ جانِ من مجھے بڑی شرم
آتی ہے کہ چائے تک بھی نہ پی سکوں۔ یہاں ہر شخص صاحبِ عزت و وقار
ہے اور یہ کافی تکلیف دہ بات ہے۔ میں کھوکھلی شان کا قائل نہیں
ہوں اور مجھے یہ چھچھلا پن بھی نہیں لگتا۔ اور پھر اگر ضروریاتِ زندگی
جوتوں اور کچھ کپڑوں کے لئے پیسے علیحدہ کرنے جائیں تو باقی رہ ہی کیا
جاتا ہے۔ اور بس میری ساری تنخواہ یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات نہیں
ہے کہ میں شکایت کر رہا ہوں۔ بالکل نہیں۔ یہی تنخواہ برسوں سے
میری ضروریات کے مطابق ہے اور کبھی کبھی مجھے بونس بھی مل جاتا ہے
اچھا۔ آرام جان — خدا حافظ — میں نے تمہارے
لئے پھولوں کے کچھ گلدستے خریدے ہیں۔ سستے مل گئے ہیں۔ اور
تم خوشبودار پھولوں کی دلدادہ ہو۔ دوکاندار کے پاس ایسے پھول
ہیں۔ تم ضرور مجھے لکھ بھیجو کہ تمہیں وہ کیسے لگے یا نہیں لیکن خدا را ہر بات
کھل کے لکھنا اور ہاں دیکھو اس وجہ سے میرے حساب کتاب
سے میں کوئی تشویش یا خیال دل میں نہ لانا۔ میں اپنا گھر بسانے
کا بیڑہ اٹھا رہا ہوں۔ میں اس مکھی کی مانند بھی نظر آ سکتا ہوں جو
[illegible] پھینک دی جاتی ہے لیکن اگر ذرا سا بھی غور کرو تو میں ایسا
[illegible] میں اپنے متعلق سمجھ جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں ایک
[illegible] پاک روح کا مالک ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ اپنی تھوڑی
[illegible] بہت سا پیار قبول کرو۔

تمہارا سچا اور وفادار دوست

ماکار دیووشکن

(ان [illegible] سے ایک [illegible] ہے۔ [illegible])

جانِ حیات جس قدر طویل خط لکھ سکتی تھی لکھ دیا ہے۔ میں تمہارے لئے ایک
پونڈ مٹھائی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ تم پسند کرو گے۔ اور خدا کے لئے میرے
بارے میں سوچ کر پریشان مت ہونا۔ اچھا تو خدا حافظ۔

۸/ اپریل۔

میرے پیارے ماکار

مجھے اندیشہ ہے کہ آخرکار مجھے تم سے جھگڑا کرنا پڑے گا
یقین مانو میرے اچھے ماکار کہ تمہارے یہ تحفے قبول کرنا میرے لئے بہت
مشکل ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے ان پر کتنی رقم خرچ کی ہو گی۔ تم نے
اپنے اوپر کتنا جبر کیا ہو گا کن نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھا ہو گا۔ میں
نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے بالکل کچھ نہیں چاہیئے۔ اور تم
جانتے ہو کہ میں اس فیاضی کا صلہ نہیں چکا سکتی۔ تم نے وہ پھول بھیجے کیوں؟
چلو گلاب کی ایک ٹہنی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن موتیا اور گیندے کے پھول
کیوں بھیجے۔؟ بس ذرا سی کسی نے اپنی پسند ظاہر کی جیسے میں نے گیندے
کے بارے میں ذکر کیا اور تم لپکے بازار کی طرف۔ اور وہ بہت مہنگے آئے
ہوں گے۔ لیکن ہیں وہ خوبصورت۔ تمہارے خط سے مجھے پتا چلتا ہے
کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ضرورت سے زیادہ ہی جنت، بہار، خوشبو
اور چہچہاتے ہوئے پرندوں کا ذکر ہے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ شاعری بھی ضرور
ہو گی۔ ماکار تمہیں کچھ اشعار لکھنے چاہئیں تھے باقی تو ہر چیز موجود تھی۔ نازک
احساسات، دلربا تصورات اور دعا لے کیا کیا کچھ! رہا پردے کا سوال تو
میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ شاید جب میں نے پردوں کو کھینچا
تھا تو وہ پردہ اپنے آپ ان میں اٹک گیا ہوگا۔ اور تم نے کیا کچھ نہ سمجھ لیا۔
دیکھو ماکار! تم مجھے یقین دلانے کے لئے چاہے کچھ بھی کہتے رہو
سب روپیہ تمہارا اپنی ضروریات پر خرچ ہوتا ہے لیکن تم مجھ سے کچھ نہیں
چھپا سکتے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو لازمی ضروریات
سے بھی محروم کر رہے ہو۔ تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی
جہاں تمہیں ہر وقت پریشانی رہتی ہو اور تم دکھی ہوتے رہتے ہو جہاں تمہیں
آرام میسر نہیں اور دبے رہتے ہو۔ تمہیں گوشہ نشینی پسند ہے اور یہ چیز تمہیں
اس جگہ نہیں مل سکتی۔ اور اگر تمہاری آمدنی کو دیکھا جائے تو تم بہت اچھی طرح
رہ سکتے ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت آرام سے رہا کرتے تھے کیوں ایسا
تو نہیں کہ تم نے اپنی زندگی تنہائیوں میں گزاری ہو۔ ساری عمر یہاں اکیلے
میں کتنا دور ہی ہو۔ کبھی کسی نے تمہیں پیار بھرے لفظ سے مخاطب بھی نہ کیا ہو اور

وینٹیلیٹر کے کمرے کرائے رہے کہ عجیب عجیب جگہوں پر رہتے ہو۔ میرے
پر میرا دل تمہارے لئے کتنا دکھی ہوتا ہے۔ خوش رہو اور ٹھیک رہنے کی
کوشش کرتے رہو بابا رے! تم لکھتے ہو کہ موم بتی کی روشنی میں لکھنے سے
تمہاری آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تو پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ یقینی بات
ہے کہ تمہارے افسر جانتے ہیں کہ تم کتنے محنتی انسان ہو۔

میں تمہیں ایک بار پھر تاکید کرتی ہوں کہ میرے لئے اتنا رقم نہ خرچ کیا
کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن تم امیر نہیں ہو۔ آج صبح
جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بھی اپنے آپ کو بہت شگفتہ اور تروتازہ محسوس
کیا تھا۔ میں بے حد خوش تھی۔ نیڈرا بہت دیر سے کام پر گئی ہوئی تھی۔ وہ
میرے لئے بھی کام لے آئی۔ اور میں اس سے بے حد خوش ہوئی۔ میں تھوڑا
ریشم خریدنے کے لئے بازار گئی تھی اور پھر واپس آکر میں نے کام شروع کر دیا
تھا۔ پوری صبح میں نے اپنے آپ کو بہت ہشاش بشاش محسوس کیا۔ لیکن
اب میں پھر اداس ہو گئی ہوں اور میرا دل غمگین ہے۔

آخر میرا بنے گا کیا؟ میرا مستقبل کیا ہے! اور غیر یقینی کا عالم کس قدر
ہولناک ہوتا ہے۔ آدمی کو احساس تک نہ ہو بلکہ ذرا بھی پتہ نہ چلے کہ کیا
کیا ہوگا تو مایوسیاں ابھر آتی ہیں۔ اور پھر ماضی اس قدر اذیت ناک تھا کہ
اُس کا خیال آتے ہی دل دھک سے بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری
لمحات میں میں اُن لوگوں کی جان کو روؤں گی جنہوں نے میری زندگی تباہ
کر دی ہے۔

اس وقت تاریکی بڑھ رہی ہے اور مجھے پھر اپنا کام شروع کر دینا
چاہیئے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ اور لکھوں لیکن وقت نہیں ہے۔ کام بہت
ضروری ہے لہٰذا مجھے دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ خط لکھنے میں جی
بہت لگتا ہے۔ آدمی اپنے آپ کو اس قدر تنہا نہیں محسوس کرتا۔ لیکن تم
کبھی ہم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں چلے آتے؟ ماما! آخر ایسا کیوں؟
اب تمہیں زیادہ دور بھی نہیں جانا پڑے گا اور یقیناً تم ملاقات کیلئے وقت
نکال سکتے ہو۔ خدارا ضرور آؤ۔ میں حال ہی میں تمہاری [illegible] سے ملی ہوں
بیچاری بہت بیمار نظر آرہی تھی۔ مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں نے اُسے
تیس پچیس دے دیئے۔ ارے بابا۔ دیکھو میں بالکل [illegible] ہی چلی
تھی۔ ہاں سنو تم جس طرح بھی رہ رہے ہو اس کی ایک ایک پائی کا حساب
مجھے بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کون کون لوگ رہ رہے ہیں اور تمہارا
[illegible] ہے۔ میں یہ بات جاننا چاہتی ہوں۔ اور دھیان [illegible]

کہ تم یہ سب کچھ کیا کر بیٹھے۔ آج رات میں نے اس مقصد سے اپنے چہرے
کے کرنے کو تمہاری خاطر ڈھیلا چھوڑ دوں گی تم جلد سمجھا کرو۔ [illegible]
میں دیکھ رہی تھی کہ تمہارے کمرے میں آدھی رات تک بتی جلتی رہی تھی اچھا
خدا حافظ۔ اس وقت میں بہت اداس ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں [illegible]
ہوں۔ زندگی میں کیا دن دیکھنے کو ملے ہیں۔ خدا حافظ۔

تمہاری دوست

وار وارا

۔۔ اپریل۔

میری پیاری وار وارا۔

ٹھیک کہتی ہو میری وار وارا۔ میری جان حیات۔ ہاں اپنی بدبختی کے
ہاتھوں میں بھی ایسے ہی دن دیکھ رہا ہوں۔ وار وارا۔ تم نے مجھ بوڑھے
آدمی کے ساتھ خوب مذاق کیا۔ لیکن یہ میرا قصور ہے سراسر میرا قصور۔
ایک بوڑھا شخص جس کے سر پر گنتی کے بال رہ گئے ہیں وہ جذبات اور تصور یا
رومان سے جی بہلائے۔ ہاں جانِ من مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آدمی بعض اوقات
میں عجیب حرکات کرتا ہے۔ بلکہ عجیب شخصیت بن جاتا ہے۔ وہ خیالی پلاؤ
پکاتا ہے بہار بیچنے جائے گا۔ اور پھر کن حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا کی
پناہ! اور پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! بات پہنچی کہاں ہے؟ کچھ بھی نہیں
مطلقاً کچھ نہیں ہاں انسان گندگی کے اس ڈھیر پر جا گرتا ہے جہاں سے صرف
خداوند تعالیٰ ہی اسے بچا سکتا ہے۔ لیکن میری پیاری یہ نہ سوچنا کہ میں خفا
ہوں مجھے تو یہ سوچ سوچ کر رنج ہوتا ہے کہ میں نے کس احمقانہ [illegible]
انداز میں تمہیں خط لکھا تھا۔ آج جب میں اپنے کام پر گیا تھا تو [illegible]
کی طرح خوش تھا۔ میرے دل میں خوشی موجزن تھی اور [illegible] اپنے آپ
کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ المختصر مجھے انتہائی عالم بہجت [illegible]
لیکن آج شام گھر آتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں [illegible]
ہر وقت تمام اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ علاوہ ازیں [illegible]
سردی کے مارے ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری مصیبت [illegible]
ہوتی ہی رہتی ہے۔ شاید [illegible] کی وجہ سے میری [illegible]
بہار کو دیکھ کر [illegible]
پتلون سے کوٹ میں باہر نکل گیا تھا۔

میں [illegible] کہ تم نے میرے جذبات کو غلط [illegible] تم
بالکل غلط سمجھی ہو۔ [illegible]

اُن دنوں [illegible] تمہاری تنہائی اور [illegible] حالات میں ہم نے تمہارے باپ کی جگہ
سنبھالی۔ یہ سب کچھ تم جانتے ہو [illegible] بالکل [illegible] بچے [illegible] رشتہ دار
[illegible] آخر میں [illegible] تھا [illegible] رشتہ دار تو ہوں نہیں ہوا
کیا؟ بہت دور کا [illegible] ہے میرا تو ہاں۔ لیکن کچھ بھی کہو رشتہ دار تو ہیں [illegible]
اور اب خدا کے فضل سے میں تمہارا سب سے قریبی رشتہ دار اور [illegible]
ہوں۔ کیونکہ [illegible] حفاظت، ہمدردی [illegible] تھی وہیں تم سے [illegible] کر
کیا اور تمہیں [illegible] شاعری کا اور وہ بھی میری اپنی شاعری کا تو
اب میرا [illegible] نہیں رہا کہ میں شعر کہتا پھروں۔ شاعری [illegible] ہے۔ جانتی ہو
میرا تو کچھ [illegible] ہے۔

وہ وعدہ تم آرام، چین اور اپنی باتوں کے بارے میں کیوں لکھتی ہو؟
[illegible] نہیں ہوں اور میری ضروریات بہت کم ہیں۔ میں جتنا [illegible] اب ہوں
اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ اس بڑھاپے میں مجھے اس قسم کا خیال رکھنے کی کیا ضرورت
ہے میرے پاس کھانے کو بہت ہے۔ کچھ کپڑے اور جوتے بھی ہیں پھر ان
چیزوں کے بارے میں فکر کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ [illegible]
سے [illegible] تعلق رکھتا نہیں۔ اور یہ بھی بات نہیں کہ میرے آبا جان [illegible] میں
شامل ہوتے تھے۔ انہوں نے [illegible] اس آمدنی میں کیا انتظام کہ میری آمدنی
[illegible] کم تھی۔ [illegible] ہوں۔ لیکن [illegible] بات پوچھی جائے تو میرا
[illegible] کہیں بہتر تھا۔ عزیزم وہاں مجھے گھر کا احساس ہوتا تھا۔ میرا یہ کمرہ کافی
[illegible] ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی لحاظ سے زیادہ خوشنما ہے اور اگر
[illegible] تو اسے زیادہ دل افزا کہہ لو۔ [illegible] منہ سے بولتا ہے۔ میں اس
[illegible] کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اب تو وہ چیزیں بھی جو ان دنوں بہت بُری
[illegible] ہے وہ [illegible] کرتی تھیں اب وہ بھی اچھی لگنے لگی ہیں ہم [illegible]
[illegible] کرتے تھے۔ ہم [illegible] اور وہ بوڑھی عورت جو اب
[illegible] ہے۔ [illegible] یاد [illegible] کرتی ہے۔ وہ بہت اچھی عورت
[illegible] کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ لمبی لمبی
[illegible] کرتی رہتی تھی۔ ہم دونوں ایک [illegible] موم بتی کی
روشنی میں کام کرتے تھے [illegible] دونوں ایک میز پر کام کرتے تھے۔ اس کو [illegible]
[illegible] یاد ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

گرمیوں کی راتوں میں ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے اور [illegible] کام
بہت [illegible] کیا کرتے تھے۔ بچی کو خوش کرنے کے لئے وہ اُسے شرارت سے
باتیں [illegible] وہ بیچاری بوڑھی عورت اسے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔
اور [illegible] کہتے ہیں اُن کہانیوں کے [illegible] صرف بچہ ہی کیا ایک جوان اور ذہین شخص
بھی اُن کو سنتے سنتے اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی اپنا پائپ [illegible]
بیٹھا انہیں سنتا رہتا اور اتنا محو ہو جاتا کہ اپنا کام تک بھول جاتا۔ اور وہ بچی
وہ شرارت کی پتلی [illegible] جیسے چہرے کو اس عورت کے ہاتھوں پر ٹیک
دیتی اور اس کا معصوم اور خوبصورت سا منہ آدھا کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ اور
اگر کہانی ڈراؤنی ہوتی تو وہ بچی سرک کر اپنی دادی سے جا لگتی تھی۔ اُسے اس
عالم میں ڈرا ڈرا دیکھ کر ہم دونوں کو اس پر بے ساختہ پیار آ جاتا تھا۔ اور
ہم وہاں ایک عجیب کیفیت میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے اور موم بتی کی
[illegible] بھول جاتے۔ [illegible] کا شور سنائی
دیتا۔ [illegible] کتنی اچھی زندگی گذر رہی تھی۔ اور یقین مانو کہ ہم اسی
عالم میں [illegible] تک اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن دیکھا [illegible] جذبات کی رو میں
بہہ گیا۔ بھلا تمہیں اس واقعے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور اُس وقت کی یاد
سے میں ابھی کچھ [illegible] نہیں ہوتا اور خاص کر اس عالم میں تو وہ یاد میرے لئے
اور دکھ کا باعث ہو گی۔ تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ تقریباً [illegible] سے
[illegible] جھک جھک کر رہی ہے۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔ اور میری [illegible] میں بھی
[illegible] رہی ہے۔ اور میرے خیالات [illegible] ہوئے اور بکھرے ہوئے
جیسے سوچنے سے [illegible] جیسے میرے خیالات بھی آزار میں مبتلا
ہوں۔ آج میں بہت اداس ہوں۔

لیکن ہاں عزیزم تم نے یہ لکھا تھا میں تم سے [illegible]
لوگ کیا کہیں گے [illegible] غلط باتیں بنائیں گے۔ نہیں میرے [illegible]
بہتر یہی ہو گا کہ میں تمہیں کل [illegible] مل لوں۔ میرا خیال ہے [illegible] اور ہم دونوں
کو [illegible] نہیں پہنچے گا۔ دیکھو ایسا خط لکھنے کی بنا پر مجھے معاف کر دینا
میں نے خود اسے دو بارہ پڑھ کر دیکھا [illegible] اور سب [illegible] باتیں [illegible]
ہوں میں ایک بوڑھا شخص ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ چیزوں کو [illegible]
کرنے میں مجھے کوئی مہارت حاصل نہیں ہے نہ کسی کو مجھے [illegible]
[illegible] نہ کسی کو [illegible] لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے جب [illegible]
[illegible] میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہیں میں نے اپنے خیالات [illegible]
دیا ہے۔ آج صبح میں نے تمہیں کھڑکی پر دیکھا تھا۔ تم [illegible]

خدا حافظ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تمہارا نگہبان ہے۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار۔

ہاں ایک اور بات کہنی ہے کہ میں کسی سے متعلق طنزیہ پیرائے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ واروارا اب میری یہ عمر نہیں۔ کہ مذاق کروں اور پھبتیاں کسوں۔ لوگ مجھ پر ہنسیں گے اور پرانی روسی کہاوت تازہ ہو جائے گی کہ جو دوسرے کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں جا گرتا ہے۔

۹ اپریل

میرے پیارے ماکار

ایسے خیالات دل میں لاتے ہوئے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم تو میرے دوست ہو اور میری بھلائی کرنے والے ہو۔ کیا میں تمہیں چوٹ پہنچا سکتی ہوں؟ میں جانتی ہوں کہ اکثر و بیشتر میں بے دھیان رہتی ہوں لیکن میں سوچ تک نہیں سکتی تھی کہ میرے ان فقروں کا مطلب تم یہ نکالو گے کہ میں نے تمہیں تمسخر کا ہدف بنایا ہے۔ سچ میں تمہاری عمر یا چال چلن کا کبھی مذاق نہیں اڑا سکتی۔ یہ تو فقرہ میں بے دھیانی میں لکھ گئی تھی اور پھر سچ بات تو یہ ہے کہ میں اکتا چکی ہوں۔ اور انسان اکتاہٹ کے عالم میں کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ اگر میں اپنے دل کی بات کہہ دوں تو میں سمجھی تھی کہ تم اپنے خط میں سوانگ رچا رہے ہو۔ اور جب میں نے یہ جانا کہ تم میرے خط سے اس قدر دکھی ہوئے ہو تو میرا دل بھر آیا۔ سنو میرے مخلص دوست، اگر تم مجھ پر ناشکر گزاری اور بے حسی کی تہمت دو تو تم مجھے قطعاً غلط سمجھو گے۔ میرے دشمنوں سے ان کی نفرت اور انتقام کے جذبے سے مجھے بچانے کے لئے تم نے جو کچھ کیا ہے میں اسے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے دعائیں مانگوں گی اور اگر خدا نے میری دعائیں سن لیں تو تمہیں ضرور خوشی نصیب ہو گی۔

آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔ میں ٹھٹھرا اٹھتی ہوں اور میرا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ فیڈورا بہت گھبرا رہی ہے۔ مجھ سے اگر ملنے میں اور میرا حال پوچھنے میں تمہیں شرم محسوس نہ کرنی چاہیئے۔ لوگ بکتے ہیں بکنے دو۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟ اچھا ماکار خدا حافظ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا ہے اور اب کچھ اور مجھے نہیں لکھنا۔ اچھا دیکھو ——— مجھ پہ خفا مت ہونا اور میری دائمی محبت اور دوستی پر بھروسہ رکھو۔

تمہاری مخلص اور مؤدب دوست

وارورا۔

۱۲ اپریل

میری پیاری واروارا

کیا ہو گیا؟ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ہمیشہ مجھے ڈراتی رہتی ہو۔ میں ہر خط میں لکھتا ہوں منت کرتا ہوں کہ تم اپنا دھیان رکھا کرو۔ اچھا کپڑے پہنا کرو۔ خراب موسم میں گھر رہا کرو اور ہر بات سوچ سمجھ کر کرو۔ لیکن تم میرا کہا مانتی کب ہو۔ میرے ننھے سے فرشتے ایک بچے کی طرح تم ہمیشہ میری نصیحت کے خلاف عمل کرتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم گھاس کی پتی کی طرح نرم و نازک ہو۔ تم ذرا زور سے سانس لینے پر زکام کا شکار ہو جاتی ہو۔ عزیزم اپنا پورا پورا خیال رکھو۔

تم میری روزمرہ زندگی اور ماحول کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔ اس سے بڑھ کر مجھے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن دیکھو میں الف سے لے کر یے تک لکھوں گا۔ گھر کے سامنے والی سیڑھیاں شاندار ہیں اور خاص کر بڑی سیڑھیاں تو لاجواب ہیں۔ یہ سیڑھیاں صاف شفاف اور کشادہ ہیں اور جگہ جگہ جہاگنی کی لکڑی اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ لیکن پچھلے زینے کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا بہتر ہے۔ اوّل تو وہ کوئی چکر کھاتا ہے۔ پھر وہ ہر وقت گیلا اور میلا رہتا ہے۔ اور زینے کی جو سیڑھیاں ہیں وہ نہایت شکستہ حالت میں ہیں اور دیواریں اس قدر لیس دار ہیں کہ اگر ان پر انگلیاں پڑ جائیں تو وہیں چپک جائیں۔ اور زینے کے ہر موڑ پر صندوقوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔ کرسیاں پرانی الماریاں اور صفائی کرنے والی چیزوں کا ڈھیر لگا رہتا ہو۔ اکثر و بیشتر کھڑکیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور جگہ جگہ گندگی سے بھرے ہوئے ٹب پڑے ہیں۔ ان میں کوڑا کرکٹ، انڈوں کے چھلکے اور مچھلیوں کا گوشت پڑا سڑتا رہتا ہے۔ اس کی بدبو تو بس ناقابل برداشت ہے۔ المختصر یہ حصہ بالکل اچھا نہیں۔

اب کمروں کے بارے میں مجھ سے سن لو میں نے تمہیں بتایا ہے کہ کمروں کی ترتیب کیسی ہے۔ اچھے آرام دہ ہیں لیکن کچھ بھرے بھرے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے بدبو آتی رہتی ہے لیکن ان سے ایک خاص قسم کی بو ضرور آتی ہے۔

گھر میں پہنچتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جاگ جاتا ہے اور لوگ بھاگ ادھر ادھر چل قدمی کرتے ہیں [illegible] کو تو کام پر جانا ہوتا ہے اور جو اس وقت نہیں جاگتے [illegible] ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو ہم سب لوگ چائے پیتے ہیں [illegible]

ور ترستان شکی کی ہیں اور پھر وہ بھی ضرورت کے مطابق نہیں ہیں لہٰذا ہر
کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کیتلی لے کر
اور باری کا انتظار نہ کرے تو باقی کے لوگ اس مجرم پر ٹوٹ پڑتے ہیں
میرے ساتھ بھی یہاں کچھ ہوا تھا لیکن وہ واقعہ بیان کرنے کے قابل نہیں۔
میں اسی دن سب لوگوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اور سب سے پہلا
وہ بحری فوج کا افسر رہا تھا۔ وہ ایک راز داں قسم کا شخص ہے۔ اس
نے مجھے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بہن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا
اس کی بہن کی شادی ضلع تولا میں کسی افسر کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس
کے گرد و پیش شہر کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے مجھے
مدد کا یقین دلایا اور پھر وہیں اسی وقت مجھے چائے پر بھی مدعو کیا تھا۔
نے اسے ایک ایسے کمرے میں پایا جہاں تاش کی بازی کبھی ختم نہیں
ہوتی۔ چائے کے بعد ان سب نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ
مل کر تاش کھیلوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ اس معاملے میں واقعی
سنجیدہ تھے یا نہیں۔ وہ ساری مدت تاش کھیلتے رہے تھے اور جب میں
کمرے میں داخل ہوا تھا تو تب بھی اسی انہماک سے کھیل رہے تھے۔
چھائی جا رہی تھی اور چاک کو پھیلا جا رہا تھا۔ کمرے میں تمباکو کی
پھیلی ہوئی تھی۔ جب میں نے جوا کھیلنے سے انکار کر دیا تو مجھ سے کہہ
تھا کہ فلسفہ مت بگھارو۔ اس کے بعد مجھ سے کسی نے کوئی بات
۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے پرواہ بھی نہیں کی۔ میں اب وہاں کبھی
جاؤں گا بھی نہیں۔ وہ لوگ جوئے باز ہی تو ہیں۔ جوئے باز بھونے
وہ احمد ہیں گیا! ہمارے درمیان ایک ادیب بھی رہتا ہے۔
اپنے کمرے میں لوگوں کو مدعو کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں کی ہر چیز
ایک مصنوعیت ہے، دکھاوا ہے، نزاکت ہے اور ہر چیز بہت بلند
معیار پہ کہی جاتی ہے۔

وہ اور نیکا ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ
مکان مالکن بڑی جابر قسم کی بوڑھی عورت ہے۔ وہ تو چڑیل ہے۔
تقریباً سے ملی ہو اور جانتی ہی ہو کہ وہ کتنی دُبلی پتلی ہے بالکل مرغی کی
طرح ہے اور یہاں ذکر صرف وہ ہیں۔ تقریبا اور نالڈونی۔ نالڈونی
شاید کوئی اور نام ہے لیکن اسے نالڈونی کہہ کر پکارو تو وہ جواب دیتا ہے
اس شخص نے نالڈونی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ سڑی قسم کا
... ہے۔ چہرہ جیسی تو اس کی ناک ہے۔ وہ

ہر وقت تقریبا کے ساتھ ہاتھا پائی کرتا رہتا ہے۔ اکثر بیشتر تو خوب
گھونسا بازی تک آ پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ ... یہ ہے کہ زندگی
یہاں اتنی خوشگوار نہیں ہے۔ یہاں لوگ کبھی ... مقررہ وقت پہ نہیں
سوتے۔ ہمیشہ کچھ گروہ تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ہو
گزرتی ہیں، جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اب تو
میں ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں لیکن حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک
گرہستی آدمی اس گندے ماحول میں رہنا کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ ہال سے
پرے ایک کمرہ ہے اس میں ایک غریب کنبہ رہتا ہے۔ وہ کمرہ باقی کمروں
سے الگ تھلگ ایک کونے کا کمرہ ہے۔ وہ خاموش طبع کنبہ ہے۔ وہ لوگ
زیادہ نظر بھی نہیں آتے اور اس اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ دن گزار
رہے ہیں۔ اس کنبے کے باپ کا نام گرد شکوف ہے۔ اور وہ بیچارہ بیکار
رہے۔ سات سال پہلے اسے کسی وجہ سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے
سے قد کا آدمی ہے اور اس کے سر کے بال بھورے رنگ کے ہیں۔ اور
بیچارہ اس طرح گھسٹتا ہوا چلتا ہے کہ اسے دیکھ کر دل پہ ٹھیس پہنچتی ہے
اس کی واسکٹ میری واسکٹ سے بھی زیادہ خستہ حال ہے۔ وہ بہت
بے حد اداس رہتا ہے۔ (ہم کبھی کبھی برآمدے میں ایک دوسرے سے
مل جاتے ہیں) اس کے گھٹنے بے جان نظر آتے ہیں اور یوں تو اس کے
ہاتھ اور سر میں لرزہ طاری رہتا ہے۔ کسی بیماری یا خدا جانے کس وجہ
سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ بہت ہی ڈرپوک قسم کا شخص ہے ہر شخص
سے جھینپتا ہے اور صرف اپنے آپ تک محدود رہتا ہے۔ کئی لحاظ سے تو
پر میں بھی ہر شخص سے جھجکتا ہوا نظر آتا ہوں لیکن اس کا حال تو مجھ سے بھی
برا ہے۔ اس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بالکل اپنے
باپ کی مانند ہے۔ اس کی بیوی کو ایک نظر دیکھنے سے احساس ہوتا ہے
کہ کسی وقت وہ ضرور حسین ہوگی کیونکہ اب بھی اس میں ایک کشش ہے۔
لیکن وہ بیچاری چیتھڑوں میں لپٹی رہتی ہے۔ ان کے سر پر کرایہ بھی بہت
چڑھ گیا ہے۔ کم از کم میں نے ایسا ہی سنا ہے۔ اور مکان مالکن ان کے
ساتھ کسی صورت بھی اچھی طرح پیش نہیں آتی میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کسی
جھگڑے کی بنا پر گرد شکوف کو نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں یقین
سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی تفتیش ہوئی تھی یا مقدمہ چلا تھا۔ لیکن خدا کی
پناہ وہ تو بالکل کنگال ہیں۔ ان کے کمرے سے کبھی کوئی آواز سنائی نہیں
دیتی۔ ایسا سناٹا چھایا رہتا ہے جیسے اس کمرے میں کوئی بھی نہ

رہتا ہو۔ بچوں تک کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ میں نے کبھی انہیں ادھر اُدھر کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بہت بڑی بات ہے۔ ایک شام جب میں اُن کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو اندر سے مجھے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دی۔ اُس وقت باقی گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سسکی کے بعد مجھے سرگوشی کی آواز سنائی دی اور پھر کسی کے سسکنے کی آواز۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس قدر ڈر کر اور دُکھ درد سے رو رہا تھا کہ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ میں ساری رات اُن کے بارے میں سوچتا رہا اور ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا تھا۔

اچھا میری وارنیکا۔ میری ننھی سی نایاب گڑیا۔ خدا حافظ۔

میں جس طرح خط لکھتا ہوں اس سے خفا نہ ہونا۔ میں صاحب اسلوب نہیں ہوں۔ بالکل نہیں۔ کاش میرا کوئی اسلوب ہوتا۔ تمہیں خوش کرنے کی غرض سے جو کچھ مجھے سوجھتا ہے میں ویسا ہی لکھ دیتا ہوں۔ اگر مجھے عمدہ تعلیم ملی ہوتی تو بات کچھ مختلف ہوتی۔ لیکن مجھے تعلیم ملی کیسی! ایک دمڑی کے برابر۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

تمہارا مستقل اور مخلص دوست

ماکار

۲۵۔ اپریل۔

مائی ڈیر ماکار

آج مجھ سے میری چچا زاد بہن ساشا ملی تھی۔ اُس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی وہ تو برباد ہو جائے گی۔ ہاں مجھ تک افواہ پہنچی ہے کہ بینا فیوڈوانا میرے بارے میں اطلاعات حاصل کرتی رہی ہو۔ کیا وہ مجھے زندگی میں کبھی اکیلے جینے دے گی؟۔ وہ مجھے معاف کر دینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ گزشتہ مردے نہ اکھاڑے جائیں۔ اور کچھ ہی دنوں میں مجھ سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم میرے دُور کے بھی رشتہ دار نہیں ہو۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وُہ میرے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ تمہاری خیرات اور مدد لے کر زندہ رہتے ہوئے مجھے شرم آنی چاہیئے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے اُسکی میزبانی کے احسانات کو بھلا دیا ہے۔ نیز اس کا دعوےٰ ہے کہ اسی نے میری ماں کو اور مجھے بھوک کے ہاتھوں مرنے نہیں دیا تھا۔ اور وہ جو اڑھائی برس اس نے ہمیں کھانا کھلایا تھا اس سے بیچاری کا بہت خرچ بڑھ گیا تھا۔ لیکن جو کچھ

ہوا سو ہوا وہ سب سے بڑا احسان یہ کر رہی ہے کہ وہ ہمارے سب قرضے کو بخش دے گی۔ ہائے اس نے جو میری غریب ماں کو بھی نہیں بخشا۔ کاش امی جان کو یہ پتہ چل جائے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ لیکن خدا تو سب کچھ دیکھ رہا ہے نا۔ بینا فیوڈوانا کہتی ہے کہ یہ سب قصور میرا اپنا ہے جو میں اپنی خوشیاں کھو بیٹھی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے مجھے راستہ بتایا تھا اور یہ اُس کا قصور نہیں ہے جو میں اپنی عزت نہ بچا سکی اور نہ شاید بچا سکوں گی۔ اور میرے خدا پھر یہ سب قصور کس کا ہے اینا کہتی ہے کہ مسٹر بائیکوف غلطی پر نہیں ہے اور پھر کسی آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس عورت سے شادی کر لے جو......... خیر یہ سب کچھ لکھنے سے کیا حاصل؟ ماکار ایسی ناانصافی برداشت کرنا بہت مشکل ہے مجھے جھجک نہیں کہ میرے ساتھ کیا بیت رہا ہے۔ میں یہاں بیٹھی ہانپتی رہتی ہوں سسکیاں لے لیکر روتی ہوں۔ اس خط کو لکھنے میں مجھے دو گھنٹے لگے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ آخر کار وہ سمجھ جائے گی اور تسلیم کرے گی کہ اُس نے مجھے کس غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ لیکن انجام سب پر واضح ہے۔ پھر بھی تم فکر مت کرو تم میرے واحد مددگار رہو۔ فیڈورا ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بتاتی ہے مجھے بخار نہیں ہے۔ کل میں ذرا دیر کے لئے وولکوو چرچ تک گئی تھی اور بس اسی آنے جانے میں ذرا سردی لگ گئی۔ لیکن تم میرے ساتھ کیوں نہیں آئے؟ میں نے التجا کی تھی منت مانگی تھی گڑگڑائی تھی کہ میرے ساتھ چلنا۔ ہائے میری امی جان۔ کاش آپ ایک بار قبر سے اٹھ سکیں اور دیکھ سکیں کہ لوگوں نے میرا حال کیا کر دیا ہے۔

دی۔ ڈی۔

۲۰ مئی۔

میری فاختہ وارنیکا۔

میں تمہارے لئے کچھ انگور بھیج رہا ہوں۔ انگور صحت کے لئے اچھے ہوتے ہیں۔ پیاس بجھانے کیلئے ڈاکٹر لوگ بھی انگور کی ہدایت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہی سوچ کر میں نے انگور بھیج دئے ہیں۔ صرف پیاس کا تقاضا کرنے کیلئے۔ کل تم نے کچھ سیب کھانے کی خواہش ظاہر کی تھی میں تمہارے لئے کچھ سیب بھیج رہا ہوں۔ عزیز تم بتاؤ اب تمہاری بھوک کیسی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ خوب بھوک لگنی چاہیئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بیماری ٹل گئی اور اب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے ہمیں خدا کے حضور میں سجدہ کرنا چاہیئے۔ اب دیکھو کتابوں کی بات تو ابھی نہیں

انھیں بھی اس خوش کن خبر کا کسی سے کیا پتہ ہے کہ ان دنوں ایک بہت ہی اچھی کتاب شائع ہوئی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ میں نے ابھی خود کتاب کو نہیں پڑھا لیکن جس سے بات کرو وہی اس کی تعریف کرتا ہے اور کچھ لوگوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ مجھے کتاب مستعار دیں گے کیا تم پڑھنا پسند کرو گی۔ تم اتنی نازک مزاج ہو کر بڑی مشکل سے تمہیں کچھ پسند آتا ہے۔ دیکھو میں تمہارے ذوق سے بخوبی واقف ہوں۔ غالباً تمہیں ایسی چیز زیادہ پسند آتی ہے جس میں شعریت ہو جیسی آہیں بھر بھر کے داستانِ محبت بیان کی گئی ہو۔ بے فکر رہو میں تمہارے لئے ایسی کتاب بھی حاصل کروں گا۔ ان لوگوں کے پاس مجموعۂ شعری بھی ہے۔

رہا میرا سوال تو یہاں سب خیریت ہے۔ اور عزیزم تم میرے بارے میں نہ فکر کرنا۔ اور فیڈورا جو کچھ بھی کہتی ہے اُس پر زیادہ دھیان نہ دینا اُس سے کہہ دو کہ اِدھر اُدھر کی باتیں اُڑانا اُس کی پرانی عادت ہے۔ انہی الفاظ میں اُس سے یہ بات کہہ دو۔ میں نے اپنی نئی وردی نہیں بیچی۔ اور میں کیوں بیچنے لگا۔ آخر کس لئے؟ میں نے اڑتی سی خبر سُنی ہے کہ مجھے تنخواہ میں مزید چالیس روبل ملنے والے ہیں۔ پھر وردی مجھے بیچنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ جانِ من ایسی باتوں پر گھبرایا نہ کرو۔ اور تم تو جانتی ہو کہ فیڈورا بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے اور خواہ مخواہ گھبراتی رہتی ہے۔ اچھے دن بھی آنے والے ہیں۔ میرے فرشتے بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ خدا کی محبت کے نام پہ تندرست ہو جاؤ اور ایک بوڑھے شخص کو نا اُمید مت کرو۔ ہاں تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں دُبلا ہو گیا ہوں۔ یہ بھی محض افواہ ہے بالکل بے پر کی اُڑائی ہے کسی نے۔ مجھے جتنا تندرست ہونا چاہیئے میں اتنا تندرست ہوں بلکہ اس قدر صحت مند ہو گیا ہوں کہ ۔۔۔ اب کیا کہوں مجھے خود شرم آتی ہے۔ میں تو عیش کر رہا ہوں۔ بس تم اچھی ہو جاؤ۔ اچھا خدا حافظ۔ اپنی ننھی سی انگلیوں پر میرا بوسہ قبول کرو۔

تمہارا ابدی دوست

ماکار۔

ایکسیات او جانِ من یہ تم کیا لکھتی رہتی ہو؟ کچھ بھی [illegible] آسکے گا تم سے ملنے کیسے آسکتا ہوں۔ میں ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں سوائے تاریکی کی چادر لپیٹنے کے اور کسی وقت میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں! [illegible] [illegible]

مر جانے سے اُٹھا تھا اب مجھے [illegible] نہیں تاکہ میں وہ سب کچھ کیسے کر لیا تھا لیکن افواہیں اور لوگوں کی باتیں سن کر مجھے جانا پڑا تھا۔ صاحب بھی لوگ کچھ نہ کچھ بکتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ یہ بات تو نئی نہیں ہے لیکن ذرا غور کرو کہ اگر لوگوں کو ہمارے بارے میں زیادہ علم ہو گیا تو کیا کیا باتیں بنیں گی۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے اور کیا کچھ کہتے پھریں گے صبر کرو۔ اور صحت یاب ہو جاؤ۔ تھوڑا انتظار کرو۔ پھر ہماری تمہاری ملاقات انشاء اللہ رہے گی۔

ورجان۔

میرے محترم ماکار۔

میں نے بہت چاہا کہ ایسی کوئی بات کروں جو تمہیں بہت پسند آئے۔ تم نے مجھ پر جس طرح پیار نچھاور کیا ہے میں اس کے لئے تمہیں کسی طرح بھی خوش کرنا چاہتی ہوں۔ اور میرے دل میں یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ آخر کار میں نے اپنی میز کا ہر خانہ چھان ڈالا اور یہ پرانی کتاب میرے ہاتھ لگی ہے۔ میں یہ تمہیں بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس کتاب کو فارغ البالی کے ایام میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ اور پھر وقفے ڈال ڈال کر اسے پڑھتی رہی تھی۔ تم نے کئی بار میرے ماضی کے بارے میں پوچھا ہے۔ تم نے میری ماں جس انداز پوکروسکی اینا فیڈروونا کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں اور دوسری مشکلات کے بارے میں کچھ جاننا چاہا ہے۔ یہ حالات جاننے کا تمہیں بے حد اشتیاق تھا اور میں نے اس کتاب میں خدا جانے کیسی بہت سی باتیں لکھ رکھی ہیں۔ جب کبھی مجھے وقت ملا میں نے اپنے ماضی کے بارے میں اس کتاب میں سب کچھ لکھ دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر تمہیں خوشی ہوگی۔ میں تو جب انھیں پڑھتی ہوں اور زیادہ اُداس ہو جاتی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ اس کتاب کی آخری سطر لکھتے وقت میری جتنی عمر تھی اب میری عمر اُس سے دوگنی ہو گئی ہے۔ ماکار۔ خدا حافظ! میں بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہی ہوں میں تنہا ہوں اور راتوں کو جاگنے کی مریض ہو چکی ہوں۔

وی۔ ڈی۔

(۱)

جب میرے ابا جان نے وفات پائی تو میں چودہ برس کی تھی۔ میرا بچپن خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ شہزادہ پی کی جاگیر میں میرے ابا جان نائب کی حیثیت سے ملازم تھے اور ہم لوگ وہاں خوشی سے اور اطمینان سے رہا کرتے

تھے۔ ورونژ شہر سے ایک گاؤں میں کوئی کھیتی باڑی کا ٹھیکہ نہ تھا۔ وہ گاؤں یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ میں بچپن میں ٹک کر نہ بیٹھتی تھی اور ہمیشہ باغات سے گاہوں اور جنگلات میں اچھلتی کودتی رہتی تھی۔ ابا جان کو جاگیر کی دیکھ بھال سے فرصت نہ ہوتی تھی اور امی جان کو گھر کے کام کاج سے فراغت نہ نصیب ہوتی تھی۔ بس میں آزاد ہوتی تھی۔ مجھے پڑھانے لکھانے والا کوئی نہ تھا اور مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی۔ میں علی الصبح تالاب کے کنارے جا بیٹھتی تھی، گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا پہنچتی تھی وہاں سے چڑیاں اڑاتی تو گھاس اور فصل کاٹنے والوں کے درمیان جا کھڑی ہوتی۔ میں نے اس بات کی کبھی پروا نہ کی تھی کہ دھوپ بہت تیز ہے یا میں گھر سے بہت دور نکل آئی ہوں۔ مجھے اس بات کا کبھی خیال نہ رہتا تھا کہ جھاڑیوں میں اچھلنے کودنے سے میرے ہاتھ یا منہ پر خراشیں آگئی ہیں یا میرا لباس تار تار ہو گیا ہے۔ اور پھر اگر گھر پہنچ کر ڈانٹ بھی پڑ جائے تو کیا فرق پڑتا تھا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر میری ساری عمر اس گاؤں میں کٹ جاتی تو میں بے حد خوش رہتی۔ لیکن نصیبوں میں کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ میں ابھی بارہ برس کی بچی ہی تھی کہ ہم لوگوں کی تبدیلی سینٹ پیٹرس برگ میں ہو گئی۔ اس روانگی کی یاد سے اب بھی میرے دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ مجھے وہاں کی جو چیز عزیز تھی میں نے اس سے رو رو کر الوداع مانگی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیسے سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے ابا جان کی گردن سے لپٹ گئی تھی اور ان سے بلک بلک کر التجا کی تھی کہ ذرا دیر اور رک جائیں۔ ابا جان خفا ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ امی جان نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ تیرے ابا کا کام ہی ایسا ہے بیٹی اس لئے ہمیں جانا ہی پڑے گا۔ شہزادے پال کی وفات ہو گئی تھی۔ اور اس کے جانشینوں نے میرے ابا جان کو برخاست کر دیا تھا۔ میرے ابا جان نے سینٹ پیٹرس برگ میں کچھ تاجروں کے ساتھ حصہ داری کر لی تھی اور ان کا خیال تھا کہ دارالخلافہ میں رہنے سے ہماری حالت سدھر جائے گی۔ یہ بات مجھے امی جان نے بعد میں بتائی تھی۔ پیٹرس برگ میں پہنچ کر ہم لوگ پیٹرس برگ سٹوروونا میں ٹھہرے تھے اور ابا جان کی وفات تک وہیں رہے تھے۔

نئے ماحول سے آشنا ہونا میرے لئے کس قدر دشوار تھا یہ میں بتا نہیں سکتی۔ ہم بہار کے موسم میں پیٹرس برگ پہنچے تھے۔ لیکن جب ہم اُس گاؤں سے روانہ ہوئے تھے تو اُس دن بڑی پیاری دھوپ تھی۔ فضا میں حدت اور رونق تھی۔ کھیتوں کا کام قریب ختم ہو چکا تھا۔ زمین پر چاروں طرف گندم بکھری پڑی تھی۔ اور اوپر آسمان میں جب سفید بادل چھاتے ہوئے اڑتے پھر رہے تھے۔ ہر شے پہ ایک حسن تھا نکھار تھا۔ اور جب ہم شہر میں پہنچے تھے تو وہاں سوائے بارش کے اور کچھ نہ تھا۔ میرا کسی کو خیال تک نہ رہا تھا۔ اور پہلے ہی دن کتنا دکھ ہوا تھا کھڑکی کے سامنے تاروں کی باڑھ تھی اور نیچے گلی میں زمین کا کوئی حصہ خشک نہ تھا اور پھر بہت کم لوگ گلی سے گزر رہے تھے اور جو گزر رہے تھے وہ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کیلئے لمبے لمبے کوٹوں میں لپٹے رہتے تھے۔

ہمارا گھر بھی نہایت بدنما اور بے رونق تھا۔ ہمارا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ دوست۔ انیا فیڈورنا سے ابا جان کے تعلقات اچھے نہ تھے ـــ (ابا جان کو اُس کا کچھ قرض چکانا تھا) اور گھر میں اکثر و بیشتر ابا جان کے حصہ دار سوداگر آیا کرتے تھے۔ اور وہ بات بات پر جھگڑتے تھے اور بحث کرتے وقت زور زور سے چلایا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ابا جان کو دکھی کر جایا کرتے تھے اور وہ چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ اُن لوگوں کے جانے کے بعد ابا جان لگاتار کئی پہروں فرش پہ ادھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ اُس عالم میں ان سے بات کرنے کی ہمت امی جان میں بھی نہ ہوتی تھی اور میں بھی ایک کونے میں کتاب پکڑے چوہے کی طرح دبک کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ میں آنے کے تین مہینے بعد مجھے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ اُف توبہ۔ ان اجنبی چہروں کے درمیان جا کر میرا دل بجھ کے رہ گیا تھا۔ کوئی بھی تو دوست نظر نہ آتا تھا۔ ماسٹر ہمیشہ مجھے ڈانٹتے رہتے اور لڑکیاں میرا مذاق اُڑایا کرتیں۔ اس قدر پابندی تھی وہ سمجھتی تھی کہ بس ہر کام کے لئے مقررہ اوقات ہوتے تھے یہاں تک کہ کھانا کھانے کا وقت مقرر تھا۔ اور ہمارے سبق تو نہایت ہی صبر آزما ہوتے تھے۔ ہر چیز دل شکن اور دکھ دینے والی تھی۔ شروع شروع میں تو میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ اور میں تمام رات بستر پہ لیٹی آنسو بہاتی رہتی۔ جیسا کہ ہر چیز سے میرے دل کو دکھ پہنچا اور اپنے گاؤں کی معمولی سے معمولی چیز کی یاد سے بھی دل خوش ہو جاتا تھا۔ اور میں ہمیشہ یہ تمنا کیا کرتی تھی کہ کاش میں وہاں پہنچ جاؤں۔ کاش میں اُسی چھوٹے سے کمرے میں جا بیٹھوں جہاں آشنا چہرے نظر آئیں۔ ہر چیز آشنا ہو اور راحت افزا اور جاں بخش ہو۔ کیا میں میں خوشی کے مارے والہانہ طور پر اپنی امی جان کے گلے سے لپٹ جاتی۔ میں وہاں بیٹھی یہ سب باتیں سوچا کرتی اور اکثر اوقات کہ مجھے پورا سبق بھول جاتا اور تمام رات میں اپنے سنتا رہتا ... سکول کی

ہیڈ مسٹرس [illegible] اور مجھے جو محبت [illegible] کے بارے میں [illegible] اب دیکھا کرتی اور
شفقت کیا کرتی تھیں اپنے سبق ایک طرح یاد کرتی ہوں گی کہ مجھے سبھی
سمجھتی تھیں کہ میں ویسا ہی پاتی ۔ وہ مجھے سزا کے طور پر گھنٹوں
کے لیے کھڑا کر دیتے اور صرف رات کا کھانا دیا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ اداس
رہا کرتی تھی [illegible] تو لڑکیاں میرا مذاق اڑایا کرتی تھیں مجھے روتی دیکھا
کرتی تھیں اور جب میں اپنے استاد کے کسی سوال کا جواب دیا کرتی تو
جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کر دیا کرتیں کہ مجھے سب بھول جاتا تھا کھانے
کے وقت جب ہم ٹولیاں بنا کر سکول سے باہر نکلتیں تو وہ سب مجھے
سے دور رہتی تھیں اور پھر بعد میں خود ہی ہیڈ مسٹرس کے پاس میری شکایت
کر دیتی تھیں۔ لیکن جب ہر سنیچر کی رات کو نینی مجھ سے ملنے کیلئے آیا کرتی تھی
تو مجھے کتنا اچھا لگتا تھا میں پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ جاتی اور اس
کا منہ چوم لیا کرتی ۔ وہ مجھے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ دیا کرتی ۔ اور پھر
ہم دونوں گھومنے نکل جاتیں لیکن جب ہم واپس گھر کی طرف چلتیں تو نینی
چلنے میں میرا ساتھ نہ دے سکتی ۔ اور میں گھر پہنچنے تک کسی نہ کسی بات پر لڑتی
جھگڑتی ۔ اور جب میں گھر پہنچتی تھی تو اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور سنجیدہ
محسوس کیا کرتی ۔ میں اس طرح گھر کے ہر شخص سے لپٹ جاتی اور
انہیں چوم لیا کرتی تھی جیسے میں دس برس بعد گھر واپس آئی ہوں ۔ اور
پھر گھر میں کیا شغل کیا جاتا تھا۔ ہر شخص ایک دم اپنی بات شروع
کر دیتا اور عجیب و غریب کہانیاں سننے میں آتیں۔ میں ہر شخص سے ایک
ہی وقت میں [illegible] زور سے ہنستی، شور مچاتی اور اودھم مچا دیتی تھی۔ پھر
اپنی پڑھائی کے بارے میں ابا جان کے ساتھ بڑی سنجیدہ گفتگو ہوتی
فرانسیسی گرامر، [illegible] اور دو استادوں کے بارے میں
بات چیت ہوتی اور ہر کوئی خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ باتیں
یاد کر کے میں مسکرا اٹھتی ہوں۔ میں نے اپنے ابا جان کی خاطر سبق یاد
کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میں جانتی تھی کہ میری پڑھائی پر وہ اپنے
خون پسینے کی کمائی کی آخری پائی تک خرچ کر رہے ہیں۔ اور
خدا جانے وہ کیسے گزارہ کر رہے ہیں۔ [illegible] بے چین
اور [illegible] ساتھ نباہ کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کا کاروبار
بالکل خراب ہو گیا۔ اور ان کے سر پر بہت سا قرضہ چڑھ گیا۔ ان کا بال
بال قرضے میں [illegible] قرضہ اتارنے کی کوئی صورت
نظر نہ آتی تھی۔ جب میں سکول سے واپس آیا کرتی تو گھر میں ہر شخص کو

اداس پایا کرتی۔ ابا جان کو اکثر چپ دیکھا کرتی اور امی جان کی صحت گرتی
سے میں جان گئی کہ انہوں نے کوئی اندر کا روگ لگا لیا ہے گھر میں
ترش اور سخت سست باتیں ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ابا جان شکوہ کیا
کرتے کہ میں انہیں کوئی خوشی نہیں پہنچا رہی کوئی آرام نہیں دے رہی
وہ کہا کرتے کہ انہوں نے میری پڑھائی پر آخری پائی تک خرچ کر دی ہے
اور میں فرانسیسی زبان بولنا تک نہیں سیکھ پائی۔ المختصر تمام ناکامیوں
اور مایوسیوں کا الزام مجھ پر اور امی جان پر تھوپ دیا گیا۔ اور ساتھ ہی
ابا جان میری امی کو کس طرح اذیتیں دیا کرتے تھے۔ امی جان کو ایک نظر
دیکھتے ہی میرا دل تھام کر رہ جاتی۔ ان کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے
آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن
سب سے بری قسمت تو میری تھی۔ ہمیشہ کوئی معمولی سی بات چھڑ جایا کرتی تھی
اور پھر خدا جانتا ہے کہ وہ کیا شکل اختیار کر لیتی۔ اکثر و بیشتر میں یہ بھول جایا
کرتی کہ یہ سب فساد ہو کس لئے رہا ہے۔ میرے خلاف ہر قسم کا الزام عائد
کر دیا جاتا۔ میں گرامر اور سبق یاد کرنے کی لاکھ کوشش کرتی لیکن تہمت پھر
پھر بھی یہ دھر دی جاتی۔ اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ ابا جان کو مجھ سے پیار نہ تھا
بلکہ وہ امی جان اور مجھ پر فریفتہ تھے۔ بس یہ ان کی خوبی تھی۔

اپنی مصیبتوں اور ناکامیوں میں گھر کر اور ان سے گھبرا کر ابا جان بہت
جذباتی اور شکی مزاج کے ہو گئے تھے۔ کئی بار یوں ہوا کہ انتہائی مایوسی کے
عالم میں وہ اپنی صحت کا بھی خیال نہ رکھا کرتے اور آخر کار انھیں سردی لگ گئی
اور مختصر سی علالت کے بعد چل بسے۔ ان کی موت اس قدر اچانک اور غیر متوقع
طور پر ہوئی تھی کہ کچھ دن تک تو ہم لوگ گنگ پاگل سے بنے بیٹھے رہے یہ یقین
تک نہ آیا کہ وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں۔ امی جان کو صدمے پہنچنے
اور اب مجھے ان کی فکر لاحق ہوئی میں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر گھلا
کرتی تھی۔ ادھر ابا جان کے مرنے کی دیر تھی ادھر قرض خواہ ہم پر بھیڑیوں کی طرح
جھپٹ پڑے۔ انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک ایک چیز
بکوا ڈالی۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا ہمیں سب کچھ دینا پڑا۔ چیزیں بیچ
بیچنے کے بعد بھی [illegible] ابا جان نے قرضہ [illegible]
کوئی علم نہیں کہ آخر کار یہ معاملہ کیسے سلجھا تھا لیکن ہم اس کے بعد بے گھر ہو
اور وہ وقت پیٹ پالنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تب [illegible] امی جان کو
[illegible] اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ گھر میں نام کو [illegible] نہ تھا [illegible]
اس پر ستم یہ تھا کہ کوئی امید نہ تھی۔ اس وقت میری عمر [illegible]

اور یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ اینا فیشمنا ہم سے پہلی بار ملنے آئی تھی۔ اُس نے یہ بات بار بار جتائی کہ وہ کوئی [illegible] اور ہماری رشتہ دار ہو گئی تھی۔ امی جان بھی کہتی تھیں کہ وہ ہمارے رشتہ دار تو ضرور ہے لیکن بہت دور کی رشتہ دار ہے۔ ابا جان کے جیتے جی وہ ہم لوگوں سے ملنے کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ ہمدردی جتانے کیلئے آنسو بہاتی ہمارے پاس آئی۔ اس نے ہمارے نقصان اور صدمات کا احساس کرتے ہوئے ہمدردی کی باتیں بنائیں لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ سب مقدر کا معاملہ تھا۔ وہ اپنی بساط سے باہر پیسہ خرچ کرتے رہے اور ضرورت سے زیادہ [illegible] سے بچتے تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔

اُس نے مجھے لفظوں میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ہماری دوست بننا چاہتی ہے اور اُس نے امی جان سے کہا کہ ماضی میں جو کچھ ہوا اُسے بھول جانا ہی اچھا ہے اور جب امی جان نے اُسے بتایا کہ ان کے دل میں کبھی کوئی رنجش یا تلخی نہ تھی تو اینا خوب روئی بھی تھی۔ وہ امی جان کو [illegible] لے گئی اور وہاں اُس نے مرحوم ابا جان کی روح کو تسکین پہنچانے کیلئے عبادت کا انتظام کر لیا۔ بس اس طرح ہم آپس میں گھل مل گئے

اُس کے بعد اُس نے کئی موقعوں پر ہمارے بُرے دنوں، ہماری انتہائی بے کسی اور بے بسی کا ذکر کر کے تجویز پیش کی کہ اس کا جو چھوٹا سا گھر ہے ہم وہیں جا بسیں۔ امی جان اس پیشکش کیلئے شکر گزار تو ضرور ہوئیں لیکن ایک عرصے تک وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر پائیں لیکن اور کوئی راستہ بھی نہ تھا اور ہم کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ آخر کار امی جان نے اینا کو یہ بتا ہی دیا [illegible] کہ اس کی پیشکش ہمیں قبول ہے۔ بس صبح ہم پیرس پارک سے [illegible] جزیرے پہنچ گئے تھے مجھے وہ صبح آج بھی یاد ہے۔ مطلع صاف تھا اور صبح خوشگوار تھی۔ امی بالکل روئی ہوئی تھیں اور بہت غمگین تھیں مستقبل کے دھندلے تصور دل پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کتنی مصیبت کے دن تھے ....

(۲)

اینا کی جاگیر [illegible] ریلوے لائن پر واقع تھی۔ اور جب تک ہم گھر کے دستور [illegible] سے آشنا ہوئے تھے تب تک زندگی کا ایک ایک لمحہ پُر خوف [illegible] انداز سے گذرتا تھا [illegible] تین کمرے [illegible] کے پاس تھے۔ [illegible] اس عورت کو اینا نے [illegible] دیا گیا تھا [illegible] رکھا تھا۔ [illegible] کا نام [illegible] تھا

اینا فیشمنا جتنی امیر تھی اتنی ہی دیکھنے میں خوفناک تھی۔ بلکہ اس کی آنکھیں تو خطرناک حد تک پُراسرار تھیں۔ جتنا اس کا [illegible] وہ کبھی آرام سے نہ بیٹھتی تھی ہمیشہ مصروف رہتی تھی اور کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی [illegible] گھر سے باہر چلا جایا کرتی تھی۔ [illegible] وقت سے باہر تھا۔ اُس کی [illegible] گھر میں آتے تھے [illegible] خدا ہی جانے۔ وہ ہمیشہ [illegible] بمشکل ایک منٹ کیلئے ٹھہرتے تھے۔ جب [illegible] امی جان مجھے [illegible] بلایا کرتیں [illegible] کی اس حرکت پر بے حد خفا ہوتی تھی۔ وہ امی جان پر برس پڑتی کہ ہم لوگ بہت مغرور ہیں اتنے مغرور جتنی ہماری اوقات نہیں ہے اور وہ کہا کرتی تھی کہ [illegible] مغرور ہونے سے تمہارا مطلب کیا ہے۔ اور وہ [illegible] باتیں کہتی تھی جو اُس وقت [illegible] کا مطلب نہ سمجھ سکتی تھی لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ امی جان اینا کے گھر جانے سے کیوں ہچکچاتی تھیں۔ وہ بد مزاج عورت تھی اور ہمارے لئے وہ مستقل عذاب بن گئی تھی۔ لیکن یہ بات میرے لئے [illegible] ہے کہ اُس نے ہمیں وہاں رہنے کو کہا کیوں تھا پہلے پہل تو وہ کافی خوش دلی سے پیش آتی تھی اور بڑی دیر کے بعد اُس کی اصل فطرت ہم پر کھل سکی تھی لیکن اُس کے رویے میں فرق تب آیا تھا جب وہ جان گئی تھی کہ ہم بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہیں اور حقیقتاً ہم کہیں اور نہیں جا سکتے [illegible] میرے ساتھ اُس کا سلوک پھر اچھا ہو گیا تھا۔ [illegible] کیا کرتی تھی۔ لیکن میں نے اُس کے [illegible] امی جان سے کم اذیت برداشت نہیں کی وہ بار بار ہماری [illegible] کا ذکر [illegible] بات [illegible] کیا کرتی تھی۔ وہ ہمیں [illegible] لوگوں سے اس طرح متعارف کرتی جیسے ہم اس کے یتیم رشتہ دار تھے جنہیں اس نے عیسائی خیرات کے ناطے پناہ دی ہو۔ کھانا کھاتے وقت وہ [illegible] نظروں سے ہمارا ایک ایک [illegible] کم کھاتے تو [illegible] شروع ہو جاتی [illegible] اُس کے ساتھ [illegible] کھانا ہمیں راس نہ آتا تھا۔ [illegible]

اور شرارتیں کیا کرتی اور کبھی کبھی تو سبق اور ادھورا چھوڑ کر ہی کمرے سے باہر نکل جاتا
تھا۔ اور بس پھر وہ کئی کئی دن اکیلا کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور اپنی کتابوں میں
ڈوبا رہتا۔ اُس کے کمرے میں کئی کتابیں تھیں۔ سب کی سب نایاب اور قیمتی
وہ کتابیں وقتاً فوقتاً وہ جیسے بھی کما لیا کرتا تھا کیونکہ وہ دوسری جگہوں پر بھی پڑھانے جاتا تھا۔
اور جو بھی اُسے کہیں سے فیس ملتی تھی وہ مزید کتابیں خرید لیتا تھا۔ جیسے جیسے میری
اُس کی جان پہچان بڑھتی گئی تو میں محسوس کرنے لگی کہ میں نے اتنا اچھا اور نیک دل
شخص کبھی نہیں دیکھا۔ امّی جان اس کی بہت عزت کرتی تھیں اور بعد از اں امّی جان
کے بعد وہ میرا بہترین دوست تھا۔ لیکن پہلے پہل میں بھی ساشا کے ساتھ مل کر
اُس پر پھبتیاں کسا کرتی تھی۔ ایک بار جب ہم نے اُسے اتنا ستایا کہ اُس کے
آنسو نکل پڑے تو میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا تھا "کتنے ظالم بچے ہیں" اور
ایک دم مجھ میں تبدیلی آگئی۔ مجھے بڑی شرم آرہی تھی اور اپنے سلوک پر بڑا
افسوس ہو رہا تھا۔ میں بُری طرح شرما رہی تھی اور میری آنکھیں قریب قریب
بھیگ گئی تھیں۔ میں نے اُس سے معافی مانگی اور کہا کہ ہماری احمقانہ حرکتوں کا
بُرا نہ مانیے۔ لیکن اُس نے کتاب بند کر دی اور سبق ختم کرائے بغیر کمرے سے
باہر نکل گیا۔ میں سارا دن روحانی اذیت میں مبتلا رہی اور یہ سوچ سوچ کر اپنے
آپ کو کوستی رہی کہ ہم نے اُس غریب کو رُلا دیا۔ کیا ہم توقع نہ کرتی تھیں کہ وہ رو دے؟
کیا ہم یہی چاہتی تھیں کہ وہ رو دے؟ اور بس اسی جذبے کے تحت ہم نے اُس
مغموم اور مفلس شخص کی حالت پر ہنس کر اُسے اپنی بے بسی کا احساس
دلا دیا۔ اُس رات میں ایک پل کیلئے نہ سو سکی تھی۔ میں اپنے آپ کو رہ رہ کر برا بھلا
کہہ رہی تھی۔ میں بہت غمگین تھی بہت دکھی تھی۔ کہاوت ہے کہ ندامت سے دل
کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کہاوت کتنی جھوٹی ہے۔ اور پھر میری ندامت کے ساتھ میرے
رنج کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی جذبہ چھپا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے
بچہ سمجھے اور میرے ساتھ بچوں جیسا سلوک کرے۔ میں پندرہ سال کی ہو چکی تھی۔

اس دن سے میرے دماغ نے ہزاروں ترکیبیں سوچیں کہ کیا اپنے متعلق پیٹر کا
خیال تبدیل کیسے کیا جا سکے اور ہر ترکیب میرے لئے اذیت ناک تھی۔ مجھے
بہت تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن میں شرمیلی تھی اور بچپنے کی حد تک تھی اور میں خواب
دیکھنے کے سوا کسی صحیح فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ اور خواب بھی کتنے بیہودہ تھے۔
میں فقط اتنا ہی کر سکی کہ اس کے ساتھ مذاق کرنے میں ساشا کا ساتھ نہ دیا کرتی
تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے ہمیں بگاڑنا چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے میرے
غرور کی تسکین نہ ہوئی۔

اب میں یہاں ایک سب سے عجیب و دلچسپ [illegible]

میں سوچتی کہ کیا ہوتا تھا اسپتال میں نجات کا جذبہ زیادہ پیدا ہو تاکہ تندرستی جلد
ہو جاؤں۔ اُس کی باتیں سُن سُن کر ہم دونوں ہنستیں۔ اس کی صحت دن بدن خراب
ہوتی گئی۔ اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس
کے باوجود ہم خوشی سے لیکچرز تک سب کرتی رہتیں اور اکثر و بیشتر ہم کپڑے
سینے کا کام بھی کیا کرتی تھیں۔ امّاں اس پر بہت خفا ہوتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ گھر کا
گزر بسر ان کی آمدنی پر نہیں ہے۔ لیکن ہم تو اپنے کپڑے خریدنے اور آمدنی
کے اخراجات پورے کرنے کیلئے کام کرتا تھا۔ علاوہ ازیں ہم اس کوشش
میں بھی تھیں کہ کچھ پیسہ بچا کے کہیں اور چلے جاتے۔ لیکن اس محنت کا
نتیجہ یہ ہوا کہ امّی جان کی رہی سہی صحت بھی جواب دے گئی۔ بیماری اُن کی جان
کو بن آئی اور جوں جوں دن بیتتے گئے ہم امّی جان کو موت کے منہ میں
جاتی دیکھتی رہیں۔ ہم دونوں یہاں چپ چاپ رہا کرتی تھیں۔ بالکل جیسے دنیا
سے دور ہی بھلا سا، جیسے ہمیں ایسا احساس ہوتا کہ ہم دو لوگ کسی جگہ
اس کے بس میں ہی تو وہ بھی اکثر آگئی۔ کبھی کوئی سوچ تک نہ سکتا تھا کہ اس کی
مرضی کے خلاف کچھ کیا جائے۔ ہمارے اور اُس کے کمرے کے درمیان ایک
برآمدہ پڑتا تھا اور ہمارے ساتھ والا کمرہ پیٹر کے ٹیوشن کا تھا۔ وہ بیچارہ ساشا
کو فرانسیسی، جرمن، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ جو ایلا نے کہا تھا۔ ساشا کی کتابیں
پڑھاتا تھا اور اُس کے معاوضے میں اُسے کمرہ اور دو وقت کی روٹی
ملتی تھی۔ ساشا کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی اور وہ بہت حاضر جواب تھی
لیکن اس میں ایک گنوار پن بھی تھا۔ ایک بار ایلا نے کہا کہ ساشا کے ساتھ میں
بھی پڑھ لیا کروں کیونکہ میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی تو امّی جان نے
بخوشی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ میں بھی ساشا کے ساتھ پڑھنے لگی اور پیٹر
نے ایک سال تک ہم دونوں کو تعلیم دی۔

پیٹر بہت ہی مفلس و جوان تھا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی
اجازت اس کی صحت نہ دیتی تھی۔ اور اُسے محض عادت کی بنا پر طالب علم کہا
جاتا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے وہاں رہتا تھا کہ ہمیں اس کے کمرے سے آواز
تک نہ سنائی دیتی تھی۔ اور اُس کی شکل و صورت بھی عجیب و غریب تھی۔ اُس کے
چلنے کا انداز بہت ہی بے ڈھنگا تھا۔ اُس کے آداب کرنے کا انداز بہت
بھدا تھا۔ اُس کا چہرہ اتنا عجیب تھا کہ پہلے دن تو میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی
تھی۔ ساشا اس کے ساتھ بیٹھ کر اُس کی نقلیں اتارا کرتی تھی اور منہ بگاڑ کر اس کی باتوں کے
[illegible]
[illegible]

کے بارے میں مختصر سا کچھ لکھوں گی۔ میں اس موقع پر اس کا ذکر اس لئے کر رہی ہوں کہ اس سے پہلے میں نے اُس پر کبھی توجہ نہ کی تھی اور توجہ بھی صرف تبھی دینی شروع کی تھی جب اُس کے متعلق یہ واقعہ اہم ہو گیا۔

کبھی کبھار ایک پست قد بوڑھا شخص اس گھر میں آیا کرتا تھا۔ اُس کا لباس تار تار ہوتا، سر کے بال بھورے رنگ کے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک غریب شخصیت تھا۔ یوں جان پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی چیز سے شرمایا کرتا تھا اُس کو اپنے آپ سے شرم آتی تھی۔ اس جذبے کے تحت وہ اندر ہی اندر سکڑتا رہتا اور ایسی ایسی حرکات کرتا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ گمان ہونے لگتا کہ آیا یہ شخص اپنے ہوش و حواس میں تو ہے۔ گھر تک پہنچتے ہی وہ شیشے والے دروازے کے باہر کھڑا ہو جاتا اور اندر آنے سے ڈرتا رہتا جب کوئی وہاں سے گزرتا مثلاً میں یا ساشا یا اور کوئی رحصل نوکر تو وہ ذہنی سے سکڑ کر عجیب و غریب اشاروں سے کچھ پوچھا کرتا۔ اور جب ہمارے جواب سے اُسے تسلی ہو جاتی کہ گھر میں اس وقت کوئی اجنبی نہیں ہے اور وہ بخوشی اندر آ سکتا ہے تو وہ کپکپاتا ہوا دروازے کو کھولتا اور عجیب حسرت بھرے انداز میں اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے پنجوں کے بل پوکروفسکی کے کمرے تک جا پہنچتا۔ یہ شخص پوکروفسکی کا باپ تھا۔

مجھے اُس کے بارے میں پوری کہانی بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ بہت پہلے وہ کسی جگہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ لیکن اُس نے کام میں کوئی ذہانت نہ دکھائی لہٰذا اُسے ایک واجبی سا کام دے دیا گیا تھا۔ جب اُس کی پہلی بیوی یعنی پوکروفسکی کی ماں وفات پا گئی تو اُس نے نئی شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بس اُس کی نئی بیوی کو آنے کی دیر تھی کہ اُس کے بُرے دن آ گئے۔ وہ جو بھی قدم اُٹھاتا وہی غلط پڑتا۔ وہ عورت کسی کو بھی اکیلا نہ رہنے دیتی تھی اور اُس نے ہر شخص کو اپنے بس میں کر لیا۔ اُس وقت پوکروفسکی کی عمر دس برس کی تھی۔ اُس کی سوتیلی ماں اس سے سخت نفرت کرنے لگی لیکن قسمت نے پوکروفسکی کا ساتھ دیا۔ بائیکوف نام کا ایک زمیندار اس کے باپ کو جانتا تھا۔ اس نے پوکروفسکی کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اُسے تعلیم حاصل کرنے کیلئے سکول میں داخل کرا دیا۔ اُس نے پوکروفسکی میں اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی دکھائی کیونکہ وہ اس کی مرحومہ والدہ سے متعارف تھا۔ اس کی والدہ اس وقت نوجوان تھی جب وہ بائیکوف سے متعارف ہوئی تھی۔ اس کا تعارف انیا فیدوروفنا کی معرفت ہوا تھا۔ بعد ازاں اس کی شادی پوکروفسکی کے باپ سے ہو گئی تھی۔ بائیکوف انیا بہت ہی قریبی اور گہرا دوست تھا۔ اس نے پوکروفسکی کی ماں کی شادی پر [illegible] سے کام لیا تھا کہ اُس نے جہیز کے طور پر ۵۰۰۰ روبل دئے تھے۔ یہ بات کم کو معلوم نہیں کہ اُس رقم کا کیا بنا۔ انیا سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ نوجوان پوکروفسکی شاذ و نادر ہی اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کیا کرتا۔ سننے میں آیا ہے کہ اُس کی ماں بہت حسین تھی اور میرے خیال میں یہ اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُس نے پوکروفسکی کے باپ سے شادی کر لی لیکن وہ نوجوانی ہی میں چل بسی یعنی شادی کے صرف چار سال بعد اُس کی وفات ہو گئی تھی۔ سکول کی تعلیم مکمل کر کے پوکروفسکی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ مسٹر بائیکوف نے یونیورسٹی کے اخراجات کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لے لیا۔ مسٹر بائیکوف اکثر و بیشتر سینٹ پیٹرس برگ آتے جاتے تھے۔

جب خرابِ صحت کی بنا پر نوجوان پوکروفسکی کو یونیورسٹی چھوڑنی پڑی تو بائیکوف نے انیا کو سفارش کر دی کہ اُسے اپنے پاس بُلا لے۔ اور انیا نے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ساشا کو تعلیم دے گا اور انیا اسے رہنے کی جگہ اور دو وقت کا کھانا دے گی۔ اُدھر پوکروفسکی کے باپ کو اس کی نئی بیوی نے اس قدر دکھی کر دیا کہ اُس نے شراب نوشی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ سب بُرے کام کرنے شروع کر دئے۔ اُس کی بیوی اُس کو پیٹا کرتی تھی۔ اُس سے رسوئی کا سارا کام کرایا کرتی تھی اور اس عورت نے اس کو ذلت سہنے کا اس قدر عادی بنا دیا کہ اب وہ ذلیل ترین سلوک کا شاکی نہ ہوتا تھا اور مار پیٹ سے نہ اُسے جسمانی تکلیف پہنچتی تھی اور نہ ہی مار پیٹ کی شکایت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ شخص عمر کے لحاظ سے ابھی بوڑھا نہ ہوا۔ لیکن کثرت سے مے نوشی کرنے کی بنا پر اس کی صحت جلد بگڑنے لگی۔ اب اُس شخص میں انسانی نفاست کا ایک ہی جذبہ باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا پوکروفسکی سے گہرا لگاؤ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نوجوان پوکروفسکی اُس کی پہلی بیوی کی ہو بہو تصویر تھا۔ ممکن ہے کہ اُس کی پہلی بیوی کی محبت اور اس عورت کی [illegible] اور حقیقت میں [illegible] شاید یہ بوڑھا شخص پوکروفسکی سے اس قدر پیار کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے سامنے کوئی اور بات سوچ سکتا تھا نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ ہفتے میں [illegible] پوکروفسکی سے ملنے کے لئے آیا کرتا تھا لیکن اس سے زیادہ بار وہ نہ آ سکتا تھا کیونکہ [illegible] ڈرتا رہتا تھا۔ اور پھر نوجوان پوکروفسکی کو [illegible] کرتا تھا۔ نوجوان پوکروفسکی ہر جگہ [illegible] کہ وہ اپنے باپ کی مطلق عزت نہ کرتا تھا کیونکہ [illegible]

پر غصے سے زیادہ شگفتہ تھا۔ اُس کے دکھوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بوڑھا باپ اپنے بیٹے [illegible] سے پیشکار کرتا تھا اور پینکا کی تعریف کرتے کبھی نہ تھکتا تھا۔ وہ جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا تو اُس کے چہرے پر عجیب آثار ہوتے جیسے وہ ڈرا ڈرا اور سہما ہوا کمرے میں جانا چاہتا ہو کیونکہ اس شخص کو کبھی یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کا سواگت کس انداز میں کیا جائے گا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا کیا سوچتا رہے گا اور اگر کہیں اُس طرف سے ہرگز نہ جھانکے تو پورے بیس منٹ تک مجھ سے سوالات کرتا رہتا۔ پینکا کیسا ہے۔ اُس کی صحت کا کیا حال ہے اور اس وقت اُس کے مزاج کیسے ہیں۔ کیا وہ کسی بہت ہی ضروری کام میں مصروف تو نہیں اور اگر کسی ضروری کام میں مصروف ہے تو وہ کیا کام ہے۔ کس نوعیت کا ہے۔ وہ کچھ لکھ رہا ہے یا صرف اپنے دھیان میں مگن بیٹھا ہے؟ اور جب میں اُس بوڑھے شخص کو ہر طرح دلاسہ دیتی اور اُسے بار بار یقین دلاتی تو وہ [illegible] دروازے کی جانب سرکتا تھا لیکن دروازہ کھولتے وقت اُس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ چہرہ ذرا سا اور جھکتا تھا اور جیسے اُس کو تسلی ہو جاتی کہ اُس کا بیٹا غصے میں نہیں ہے بلکہ اُس نے سر جھکا کر اندر آنے کو کہہ دیا ہے تو وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو جاتا تھا [illegible] کوٹ اتارا نہیں بڑی احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیتا تھا۔ اور پھر بڑی احتیاط سے خود ایک کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ اُس کی نظریں اپنے بیٹے کے چہرے سے یوں چپکی رہتی تھیں جیسے وہ پینکا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر رہا ہو۔ اور اگر کہیں پینکا کے چہرے پر ذرا سے بھی برہمی کے آثار پیدا ہوتے تو یہ بوڑھا شخص ایک دم سہم سا جاتا تھا۔ اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا کرسی سے اٹھ [illegible] میں تو یونہی بس ایک منٹ کے لئے آیا تھا۔ اُدھر سے گزر رہا تھا [illegible] پھر نہایت کھسیانے انداز میں [illegible] آہستہ سے دروازہ کھولتا اور [illegible] باہر نکل جاتا۔ [illegible] شرمندگی کو چھپانے کیلئے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتا۔

لیکن [illegible] بوڑھا شخص خوشی کے [illegible]

ہر جواب احمقانہ ہوا کرتا تھا اُس کے بولنے اور کرسی سے [illegible] بیٹھ چکنے میں ہی دہشت صاف نمایاں تھی۔ بیچارہ کہاں اچھی گفتگو کرنے کے قابل تھا وہ تو بے حد اُلجھا ہوا اور سہما ہوا کر رہ جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ وہ اپنے آپ سے کیا کہے اور وہ [illegible] بیٹھا رہتا تھا جیسے اپنی ہر بات کی تصحیح کر رہا ہو۔ لیکن کہیں اُس سے صحیح جواب بن جاتے تو پھر وہ اپنے کندھوں کو سیدھا کر لیتا تھا۔ اپنی واسکٹ، نکٹائی اور قمیض کو از سر نو درست کرنا شروع کر دیتا تھا اس کے چہرے سے وقار جھلک اٹھتا تھا یہی نہیں بلکہ وہ اتنا دلیر ہو جاتا تھا کہ کرسی سے اٹھ کر کتابوں کی میز تک چلا جاتا تھا کسی کتاب کو اٹھا لیتا تھا اور اُس کے سرورق پر ایک اچٹتی سی نظر بھی ڈال لیتا تھا۔ ایسے شاذ و نادر موقعوں پر وہ اس قدر چست اور شگفتہ دل و دماغ کا شخص نظر آتا تھا جیسے اپنے بیٹے کی کتابوں کی دیکھ بھال سے بخوبی واقف ہو جیسے پینکا سے اتنا اچھا سلوک تو مستحق ہی تھا لیکن ایک بار جب اُس کے بیٹے نے اُسے ڈانٹ دیا تھا کہ کتابوں کو وہیں رہنے دے جہاں وہ اس وقت میز پر موجود تھیں۔ خوف کے مارے وہ سہم کر رہ گیا تھا۔ وہ ڈانٹ سے اس قدر گھبرایا اور اتنا ڈرا کہ اُس نے کتاب کو اٹھا کر رکھ دیا۔ پھر اُس کی گھبراہٹ اور بڑھی اور اُسے سیدھا کر کے رکھنے کی غرض سے اُس نے کتاب کو [illegible] کھڑا کر دیا۔ لیکن اس دوران میں اپنی خفت کو چھپانے کیلئے وہ برابر مسکراتا رہا۔ اپنی حرکات سے اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ واقعہ نہایت ہی معمولی اور غیر اہم نظر آئے۔

اپنے باپ کی عادات بدلنے کی غرض سے پینکا کبھی کبھی اُسے کچھ رقم دیتا رہتا تھا۔ لیکن عام طور پر اُسے وہ کوپیکس ہی ملتے تھے ہاں اگر وہ مسلسل تین مرتبہ [illegible] کوئی غلطی نہ کرے تو اُسے پچاس یا اس سے بھی زیادہ کوپیکس مل جاتے تھے۔ یا پینکا اُسے جوتے خرید دیتا تھا، نکٹائی یا واسکٹ لے دیتا تھا اور اپنے بیٹے سے یہ تحفہ پا کر بوڑھا باپ فخر سے [illegible] طرح تن جاتا تھا کبھی کبھار وہ ہم لڑکوں سے ملنے بھی چلا آتا تھا۔ وہ سارا سارا [illegible] میرے لئے سیب اور مٹھائی لے کر آتا تھا اور پینکا کے بارے میں [illegible] گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ نصیحت کرنے کے انداز میں ہم سے کہا کرتا تھا کہ سبق اچھی طرح یاد کیا کرو اور اس بات کو تو سو بار دہرایا کرتا تھا کہ پینکا [illegible] بلکہ عالم فاضل ہے۔ اتنا کہہ کر وہ [illegible] اور ایسی ایسی حرکات کرتا تھا کہ ہنستے ہنستے میرا [illegible] بوڑھے شخص کو بہت پسند کرتی تھیں [illegible]

نفرت تھی۔ یہ اس بات تھی کہ بینا کی ان چونکوں میں وہ چوہے کی طرح دبک کر بیٹھا رہتا
تھا

میری تعلیم اگرچہ قریب قریب مکمل ہونے والی تھی لیکن پینٹنگ کلاس بھی مجھے
ایک محبت [illegible] کہتا تھا [illegible] مجھے بھی [illegible]
اُس کے اس رویے سے مجھے چوٹ پہنچی تھی کیونکہ میں اپنی گذشتہ حرکات کی تلافی
کرنے کیلئے اپنے آپ کو بہت حد تک بدل چکی تھی۔ لیکن اس کا اُس پر مطلق اثر نہ
ہوتا تھا اور اُس کی اس بات سے مجھے اور زیادہ دکھ ہوتا تھا۔ سبق پڑھنے کے
بعد میں نے شاذ و نادر ہی کبھی اُس سے گفتگو کی تھی۔ حالانکہ اگر کبھی موقع بھی ملا تو
میری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا تھا۔ میں شرما جاتی تھی اور میری زبان پر
تالا پڑ جاتا تھا پھر میں تنہائی میں چھپ چھپ کر خوب جی بھر کے آنسو بہاتی تھی۔
اور اگر ایک خاص موقع مدد نہ کرتا تو کون جانے کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔
ایک شام امی جان تو رینا کے کمرے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا
اور پرکاش کے کمرے میں گھس گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔
لیکن اُس کے کمرے میں جانے کا جذبہ اور جو مطلب مجھے تھا یہ میں نہیں کہہ سکتی۔
اس سے پہلے میں اُس کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک برس سے
ملازم رہتے ہوئے میرا پڑوسی تھا۔ میرا دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے تو میں نے ڈرتے ڈرتے پورے کمرے کا جائزہ
لیا۔ اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب اشتیاق چٹکیاں لے رہا تھا کہ رہنے کے
کمرے میں کوئی سلیقہ یا قرینہ نہ تھا کرسیاں اور میزیں الٹی پلٹی پڑی تھیں اور
بکھری ہی کوئی پھوٹی تھیں۔ وہاں اس کے ساتھ ساتھ کتابوں کی بے پناہ تعداد تھیں۔
کرسیاں اور میزیں کاغذات سے لدی پڑی تھیں۔ ہر جگہ کتابیں اور کتنے ہی کاغذ
تھے۔ اور میں اس وقت میرے دماغ میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا اس جذبے
نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی کہ وہ شخص میری دوستی اور میرے
خلوص کی کیوں پرواہ کرنے لگا۔ وہ ایک عالم شخص ہے اور میں ایک بیوقوف
اور ان پڑھ لڑکی ہوں میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے کچھ نہیں پڑھا ایک بھی کتاب
نہیں پڑھی۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے اُن کتابوں کے پلندے کو دیکھا۔
مجھے اس قدر دکھ ہوا اور غصہ بھی آیا کہ جی میں آیا میں یہ تمام کتابیں ایک ہی سانس
میں پڑھ جاؤں۔ بہت ممکن ہے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں بھی
اس جیسی عالم بن جاؤں تو شاید وہ میری دوستی کی قدر کرنے لگے۔ جلدی جلدی میں نے
ایک پرانی لیکن ضخیم کتاب اٹھائی۔ کتاب کی جلد پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں
نے اس کتاب کو سینے سے چمٹا کے اٹھایا اور [illegible] ہوئی اس کے کمرے سے

بھاگ آئی۔ میں نے [illegible] ہاتھ [illegible] تھی۔
میرا دل [illegible] کہ میرا یہ [illegible] فیصلہ کر کے [illegible]
لیمپ کی روشنی میں ساری کتاب پڑھ ڈالوں گی۔ اور [illegible] تو سب جان لوں گی [illegible] میرا
کسی پر فاش نہ ہو گا۔ لیکن جب میں نے اپنے کمرے میں جا کر کتاب کھولی تو میری
مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ اُس کتاب کے ہر صفحے کو دیمک لگی ہوئی تھی۔ ورق ورق
خستہ تھا اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ کتاب [illegible] زبان میں تھی۔ میں
نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی کر دی اُس کے کمرے میں پہنچ
[illegible] میں کتاب کو اصل جگہ پر رکھنے ہی والی تھی کہ [illegible] کی آواز سنائی دی۔
میں نے اُس [illegible] کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ادھر اُدھر مصیبت یہ تھی کہ
میز پر کتابیں اس طرح اوپر تلے پڑی تھیں کہ مجھے اُس کی اصل جگہ ہی نہ سمجھ میں آئی میں
اُس کتاب کو اُس کی اصل جگہ پر دوبارہ نہ رکھ سکی۔ میں باقی کتابوں کو جلدی جلدی
اپنی پوری طاقت سے ادھر اُدھر کر رہی تھی تاکہ کسی طرح وہ کتاب اپنی جگہ پر پہنچ جائے۔
میرا خیال ہے کہ میں کتابوں کی [illegible] تھی وہ شاید اسی [illegible]
تھیں۔ اور پورے کا پورا کتابوں سے بھرا ہوا تختہ نیچے زمین پر گر گیا۔ کتابیں
[illegible] ساری چیزیں زمین پر ایک انبار لگ گیا اُدھر دروازہ کھلا اور
پرکاش کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اُس نے [illegible] نہ کیا
تھا کہ کوئی شخص اس کی کتابوں کو ہاتھ لگائے۔ اور اگر کوئی ہاتھ لگا بیٹھے تو وہ
خفا ہو جاتے۔ اب اس واقعے اور اس حقیقت کو جاننے کے بعد ذرا [illegible]
کا اندازہ لگائیے۔ ضخیم [illegible] کی وہ [illegible] ساری کتابیں
چاروں طرف فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ کرسیوں اور میزوں کے نیچے پڑی تھیں۔
میں نے بہت چاہا کہ بھاگ نکلوں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا
کہ [illegible] تمام عزت ختم ہو [illegible] یہ سب کیا
[illegible] اور [illegible] بیوقوف لڑکی کی طرح میں یہ حرکت
کرتی ہوئی پکڑی گئی ہوں۔ کس قدر بیہودہ [illegible] ہوں میں۔ پرکاش [illegible] غصے کے
مارے [illegible] ہو رہا تھا۔ اور وہ چلایا۔ "[illegible] ایسی
واہیات حرکتیں کرتے ہوئے تمہیں کیا شرم نہیں آئی۔ [illegible]
اور [illegible] میری کتابیں اٹھانے کیلئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
نادم [illegible]

اس کی آنکھوں میں نرمی آ گئی۔ اب وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے بات کر رہی تھی جیسے وہ
میں بچپن سے جانتی ہوں۔ آخر میں پوچھتا ہوں تمہیں عقل کب آئے گی۔ خدا کے لئے
تمہارا حسن تو کچھ نہیں ہے، مگر سنو نہیں ہو، تم پندرہ برس کی ہو، اور پھر جیسے
وہ بیٹھنا پسند نہیں کرتا ہے۔ اس نے قریب ہو کر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر
اچانک نہ جانے پھر شروع پڑ گیا۔ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ میں کھڑی اسے گھور گھور کر دیکھتی
رہی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ بہت تھکا نظر آتا تھا، جیسے وہ کچھ گھبرا رہا ہو
گھبرایا ہوا اور جب اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ ہانپ رہا تھا جیسے
اُسے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ نہ جانے وہ کس بات کی معافی
مانگ رہا تھا۔ شاید اُسے یک دم خیال آ گیا تھا کہ میں ایک جوان لڑکی ہوں
اور لب ہی سب کچھ کر گئی۔ اس وقت نہ کیا کیا، مجھے کچھ نہیں پتا۔ مجھے
صرف اتنا پتا ہے کہ میں اس طرح لجائی کہ سمٹ کر گٹھڑی سی ہو گئی۔ میں اپنی
سالگرہ بھول گئی تھی۔ میں نے اپنا منہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور کمرے سے
بھاگ کھڑی ہوئی۔

مجھے شرمندگی کا احساس اتنا شدید ہو رہا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا
کیا کروں۔ میں بار بار سوچتی کہ مجھے اپنے کمرے میں پا کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔
اس نے اپنی غیر موجودگی میں تو تنہا مجھے وہاں پایا تھا۔ تین دن تک میری ہمت
نہ پڑتی تھی کہ اس کے سامنے آ سکوں یا اس کی آنکھ سے آنکھ ملا سکوں۔ میں اتنی
نادم تھی کہ آخر ایک دن میرے آنسو بہہ نکلے۔ میرے دل میں عجیب و غریب
اور الجھے الجھے خیالات اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور سب سے عجیب خیال
یہ تھا کہ سیدھی اس کے پاس چلی جاؤں اور ساری بات اُسے صاف صاف
بتا دوں اور اُسے یقین دلا دوں کہ میں ایک جاہل اور بے وقوف لڑکی نہیں
ہوں لیکن میں نے کچھ ایسی بات سوچی تھی۔ میرا ارادہ پکا نہ تھا۔ میں نے اس
سے ملنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ہمت نہ پڑی۔ اور میرا خیال ہے خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ہے کہ میں اس سے ملنے نہیں چلی گئی۔ میں اچھی طرح اندازہ کر سکتی
ہوں اگر میں یہ سب کچھ کہتی تو بہت ہی مضحکہ خیز صورت نظر آتی۔ اب بھی اس
بات کا خیال میرے دل میں آتا ہے تو میں شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔

میری امی جان سخت بیمار پڑ گئیں۔ وہ اتنی سخت بیمار ہو گئیں کہ
تیسرے روز بخار بہت تیز ہو گیا تھا اور وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑا
بھی رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ان کے بستر سے نہ ہلے۔ میں انہیں وقت
پر دوا اور پانی دیتی رہی، لیکن دوسری رات میں تھکن سے چور ہو چکی تھی۔
اور آنکھیں بند ہو جاتیں، مشکل سے کھلی رکھ پا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا
دھیرے دھیرے لڑکھڑانے لگے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اردگرد ہر چیز گھوم
رہی ہے۔ اگر امی جان کی تکلیف ایسی نہ ہوتی، ہائے ہائے میرے دل کو چیرتی
نہ رہتی تو میں کب کی سو گئی ہوتی۔ میں سارا سا چین نہیں کر رہی تھی لیکن نیند کو قرار
پھر بھی غلبہ پا لیتا۔ واقعی میں ایک عذاب سہہ رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں
لیکن ایک لمحے کے بعد جب میں کچھ کچھ نیم خوابی کے عالم میں تھی تو ایک عجیب
غریب سپنے نے بلکہ ایک ایسے بھیانک منظر نے میرے مشغول دماغ کو
جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صرف لیمپ
کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ اور اس کی روشنی سے دیواروں پر کچھ عجیب سی روشنی
پڑ رہی تھی۔ میرے احساس پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ میں کیا خوفناک
سپنا دیکھ رہی تھی اور جاگنے پر بھی اُسے اپنے دل سے جھٹک نہ سکی تھی۔ میرا
دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی تھی کہ گر کر ہی سے اچھل
پڑی۔ میری چیخ سے صاف ظاہر تھا کہ اب مجھ سے اور زیادہ عذاب برداشت
نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور پروفیسر کمرے میں داخل ہوا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ جب میں ہوش میں آئی تو اس کی بانہوں میں تھی۔
اس نے سہارا دے کر بڑے آرام سے مجھے کرسی میں بٹھا دیا۔ پھر وہ اُٹھا
اور میرے لئے پانی کا گلاس لے آیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی
بوچھاڑ کر دی۔ میں نے جواب میں کچھ کہا ضرور تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں کہ
میں کیا کہہ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "تم تو بیمار ہو۔
بہت سخت بیمار ہو۔ تمہارا جسم تپ رہا ہے۔ کیوں اپنی صحت برباد کر رہی
ہو۔ لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ میں دو گھنٹے بعد پھر آ جاؤں گا۔ اچھا لیٹ جاؤ"
وہ میری کوئی بات سُنے بغیر اپنی کہتا رہا۔ میں اصل تھکاوٹ کے مارے گری
جا رہی تھی۔ میری آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ میں سستانے کی غرض سے کرسی
ہی میں ٹیڑھی سیدھی ہو کر لیٹ گئی لیکن میں صبح تک سوتی رہی۔ اور وہ بھی
پروفیسر نے آ کر مجھے جگایا کیونکہ امی جان کو دوا دینے کا وقت ہو گیا تھا۔
اگلی رات میں امی جان کے بستر پر بیٹھ گئی اور میں نے من ہی من میں تہیہ کر لیا
تھا کہ سوؤں گی نہیں۔ گیارہ بجے پروفیسر نے دروازے سے پردہ سرکایا۔
میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے بولا "تم
اکیلی بیٹھی کیا تنہائی نہ محسوس کرو گی۔ لو یہ کتاب پڑھتی رہو، اس سے
وقت کٹنے میں مدد مل جائے گی۔" میں نے کتاب لے لی اور اس کا
شکریہ ادا کیا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتی کہ وہ کتاب کون سی تھی یا اس نے وہ
کتاب کھولی بھی تھی یا نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس رات ایک

بی کیلئے دسوتی تھی ایک عجیب جذبے نے مجھے ساری رات جگائے رکھا۔ میں بے چین ہو اٹھی۔ میرے لئے وہ گفتگو کرنا پہلے سا محال ہو گیا اور میں بار بار اُٹھ کر کمرے کے چکر لگاتی رہی۔ مجھے ایک عجیب مسرت اور گرمجوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کی اس توجہ اور فکر پر میں خوش بھی تھی اور فخر بھی محسوس کر رہی تھی۔ میں ساری رات کچھ سوچتی رہی اور خیالات کا طومار باندھتی رہی۔ وہ دوبارہ نہیں آیا اور میں جانتی تھی کہ وہ آئے گا بھی نہیں۔ پھر بھی بار بار یہی سوچتی رہی کہ کیا وہ کل رات پھر آئے گا۔ :

اگلی شام جب اندھیرے بڑھ رہے تھے اور ہر شخص سونے کی تیاری کر رہا تھا تو پیکروسکی نے اپنا دروازہ کھولا اور دہلیز پر کھڑا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے کیا کچھ کہا تھا۔ بس مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میں شرما رہی تھی، بات کرتے وقت میرے خیالات الجھ رہے تھے اور مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اس وقت اس بات کی متمنی تھی کہ اب یہ گفتگو ختم ہو جانی چاہیئے حالانکہ میں نے اس کے ساتھ بات کرنے کیلئے ہزار بار دعائیں مانگی تھیں، خواب دیکھے تھے اور دل ہی دل میں سوال و جواب کی خوب تیاری کی تھی۔ اُسی شام سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ پھر جب تک امی جان بیمار رہیں، ہم دونوں ہر روز کئی کئی گھنٹے اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی جھجک پر قابو پا لیا۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ جب بھی ہماری گفتگو ختم ہوتی تو میں اپنے آپ سے خفا نظر آتی۔ میں دل ہی دل میں اس بات پر بہت خوش تھی کہ پیکروسکی کتاب والا واقعہ بھول چکا ہے۔ لیکن ایک دن بات سے بات نکل آئی اور کتابوں کا تحفہ لوٹانے کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں اُس وقت عجیب عالم میں تھی اور میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی تھی۔ میں جذبات کی رو میں بہہ گئی اور سب کچھ کہہ سنایا کہ میں علم حاصل کرنا چاہتی تھی اور مجھے اس بات سے بڑا رنج ہوتا تھا کہ مجھے بچہ سمجھ لیا جائے۔ میری ہر بات میں اُس وقت ایک عجیب نرمی عود آئی تھی اور میری آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کہ میرے دل میں اُس کے لئے دوستی کا جذبہ تھا۔ میں اس کی ہر بات کی پیروی کیا کرتی تھی۔ میں اُس کے ساتھ گھل مل جانا چاہتی تھی۔ میں اُسے آرام پہنچانا چاہتی تھی اُسے تسکین دینا چاہتی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُن سے حیرت اور گھبراہٹ صاف نمایاں تھی لیکن اُس نے کچھ نہ کہا اور بس اُس کی اس چپ سے میرے جذبات کو گہری ٹھیس لگی جیسے میرے دل پر زخم لگ گیا ہو۔ میں مایوس ہو گئی۔ وہ شاید میرا مطلب نہ سمجھ سکا ہو اور شاید دل ہی دل میں مجھ پر ہنس رہا ہو۔ میں بچوں کی طرح بلک بلک کے رو اٹھی۔ میں اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ میرے ہاتھوں کو دبایا اور چوما۔ میرے ہاتھوں کو اس نے اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھے تسلی دی [illegible] اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کیا کہا مجھے یاد نہیں۔ مجھے بس یہ یاد ہے کہ میں کبھی روتی تھی کبھی ہنس پڑتی تھی اور مارے خوشی کے میری آنکھوں کے آنسو بہہ نکلے تھے میرے رخسار جل رہے تھے۔ تمتا رہے تھے۔ خوشی کے مارے میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ میں اتنا ہی محسوس کر سکی اور وہ بھی کچھ بے چین تھا۔ ممکن ہے میرے اس اچانک اظہار پر وہ ابھی تک سنبھل نہ سکا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض حیرت میں ڈوب کے رہ گیا ہو۔ لیکن اُس دن کے بعد اُس نے میرے خلوص کو قبول کیا تھا میری گرمجوشی میرے محبت بھرے الفاظ، میرا التفات اُسے منظور تھا۔ وہ اب مجھ سے اپنی بہن کی طرح [illegible] خلوص سے پیش آتا تھا۔ وہ بھی التفات دکھاتا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نرمی اور پیار سے پیش آتا تھا جیسے وہ میرا دوست ہو بلکہ جیسے وہ میرا بھائی ہو۔

مجھے یہ سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا مجھے کتنا چین ملا تھا۔ اب کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی اب اسے بخوبی سمجھتا تھا اور دن بدن میرے قریب آتا گیا۔

اُن دنوں میں ایسی کونسی بات تھی جو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نہ کی ہو۔ وہ پیارے پیارے فکرمند ایام کتنے خوشگوار تھے۔ جب میرا دل بہت اُداس ہو جاتا ہے تو وہی یادیں اس طرح تازہ دم اور مسرور کن لگتی ہیں جیسے دوپہر کی گرمی کا مرجھایا ہوا پھول شام کو شبنم سے نکھر اٹھتا ہے۔

امی جان کی صحت اب اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میں پھر بھی ایک منٹ کے لئے انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ پیکروسکی میرے لئے اکثر و بیشتر کتابیں لایا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ کتابیں صرف اس لئے لاتا تھا کہ میں رات کو سو نہ جاؤں لیکن رفتہ رفتہ میں نے انہیں زیادہ توجہ اور غور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر انہیں پڑھنے کیلئے میرا اشتیاق بڑھ گیا۔ کتابیں کیا تھیں میرے لئے نئے خیالات کا ایک خزانہ تھا۔ جہاں میں تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ میرے دل میں نئے نئے خیالات پیدا ہونے لگے اور ان کتابوں کو سمجھنا جتنا مشکل تھا اتنی ہی وہ مجھے اچھی لگتیں اور مجھے ان سے

پیاری کتابیں تھیں۔ وہ ایک ماؤنٹ کرتی کی طرح میرے دل میں اُتر جاتیں اور مجھے عالمِ حیرت میں غرق کر دیتیں۔ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ اس رُوحانی سیلاب سے میرے قدم نہیں اُکھڑے۔ میں ایسی باتوں کو سمجھنے سے ذرا قاصر رہی تھی جب اَنّی جان ٹھیک ہو گئیں تو ہمارا شاموں کو اکٹھے مل بیٹھنا بھی ختم ہو گیا پھر تو بات کئے ہوئے بھی کئی کئی دن گذر جاتے تھے ہم کبھی کبھار مختصر اور معمولی لفظوں میں کچھ کہہ جاتے تھے۔ لیکن ان لفظوں میں کیا کیا جذبات پنہاں ہوتے تھے اور ہم کیا کچھ نہ کہہ جاتے تھے۔ میں خوش تھی۔ بہت خوش اور کئی ہفتوں تک مجھ پہ خوشی کا نشہ سا چھایا رہا۔

ایک دن پوکروفسکی کا بوڑھا باپ ہم سے ملنے کیلئے آیا۔ سنکی تو خیر وہ تھا ہی لیکن اُس دن وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ خوشی کے مارے اُس سے کوئی بات مکمل نہ ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر لطیفے سُناتا رہا اور ہنستا رہا اور آخر کار اُس نے اپنی مسرت کی وجہ ہم سب کو بھی بتا دی کہ اگلے ہفتے پیتنکا کا جنم دن ہے۔ اور وہ اس مبارک موقعے پر اپنے بیٹے سے ملنے آئے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس روز وہ نئی واسکٹ پہنے گا اور اُس کی بیوی نے جو نئے جوتے خرید کر دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اُن جوتوں کو بھی پہن کر آئے گا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اُس کی کوئی بات ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

پوکروفسکی کا جنم دن! میں دن رات اس پر غور کرتی رہی۔ میں بھی دوستی کے ناطے اُسے کوئی تحفہ تو دوں گی۔ لیکن وہ تحفہ کیسا ہونا چاہیئے۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں تحفے کے طور پر کچھ کتابیں پیش کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنی لائبریری میں پُشکن کے تازہ ایڈیشن شامل کرنا چاہتا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پُشکن کی ساری کتابیں خرید کر اُسے پیش کروں گی۔ میں نے کپڑے سی سی کر کوئی تیس روبل جمع کر لئے تھے۔ لہٰذا میں نے باورچن کو بھیج کر پُشکن کی تمام کتابوں کی کل قیمت معلوم کروائی۔ اور میرے خدا اس نے بتایا کہ گیارہ کتابوں کی قیمت کم از کم ساٹھ روبل ہو گی۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گی۔ میں اس سوال پر جتنا غور کرتی اتنا ہی اور اُلجھ جاتی۔ اَنّی جان سے پیسے مانگنے کا مجھے حوصلہ نہ ہوتا۔ وہ تو ضرور ہی مدد کر دیتیں لیکن پھر سارے گھر میں سب کو پتہ چل جاتا اور بات بن جاتی کہ پوکروفسکی کو تعلیم کا معاوضہ چکایا جا رہا ہے۔ اور پھر میں یہ بھی چاہتی تھی کہ تحفہ صرف میرا دیا ہوا ہو۔ اس میں کسی اور کا ہاتھ نہ ہو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا کہ اُس نے میرے لئے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں تو صاف بات ہے کہ میں ساری عمر اُس کے اس قرضے تلے دبی رہنا چاہتی تھی۔ میں اس کے بدلے صرف اپنی دوستی پیش کرنا چاہتی تھی اور آخر کار مجھے حل سُوجھ ہی گیا

میں جانتی تھی کہ گوسٹنی دیور پر دوکاندار کبھی کبھی پُرانی کتابیں بھی بیچتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُن سے سودا کر سکے تو وہ لوگ نصف قیمت پر کتابیں دے دیتے ہیں۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے وہاں جانے کا اگلے ہی دن موقع مل گیا ہمیں گھر کی کچھ چیزیں درکار تھیں اور چونکہ اَنّی جان کی طبیعت ابھی ناساز تھی اور اینا پر سستی کا دورہ پڑا ہوا تھا لہٰذا اُن کی خرید و فروخت میرے ذمے آ پڑی۔

میں میٹروفینا کے ہمراہ چل دی اور بہت جلد مجھے پُشکن کی بیچی کتابیں نظر آئیں کتابیں بیچنے والا پہلے تو اُس دوکان سے بھی زیادہ دام مانگتا تھا لیکن بحث و تکرار کرنے کے بعد اور کئی بار وہاں سے چل دینے کی دھمکی سے وہ شخص چاندی کے دس روبل تک اُتر آیا۔ مجھے یوں سودا کرنے میں بڑا لُطف آیا۔ بیچاری میٹروفینا کچھ نہ سمجھ سکی کہ میں اس قدر خوش کیوں ہوں یا مجھے اتنی کتابیں کیوں درکار ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری جیب میں فقط تیس روبل تھے اور وہ بھی بینک نوٹوں کی شکل میں۔ اور اب وہ شخص ایک پائی بھی کم کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے منّت کی، اُسے اپنی ضرورت اور مجبوری کا واسطہ دیا اور آخر جب میں کئی بار وہاں سے آگے بڑھ چکی تھی اور واپس آ چکی تھی تو وہ کچھ مان گیا اور اُس نے قیمت دو روبل اور کم کر دی۔ اور اُس نے خدا کی قسم اُٹھائی کہ وہ قیمت محض اس لئے کم کر رہا ہے کیونکہ میں اتنی حسین و جوان ہوں ورنہ وہ دنیا کے کسی شخص کے لئے بھی قیمت کم نہ کرتا۔ اب میرے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ میرے پاس جتنے پیسے تھے یہ شخص اب بھی اُن سے اڑھائی روبل زیادہ مانگتا ہے۔ اور اسی احساس سے کہ اب فقط اڑھائی روبل کی کسر رہ گئی ہے میں قریب قریب رونے ہی والی تھی کہ ایک غیر متوقع بات نے مجھے مصیبت سے نکلنے میں مدد دی۔

میں نے دیکھا کہ دو قدم پرے ایک اور دوکان پر بوڑھا پوکروفسکی چار یا پانچ کتب فروشوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور وہ اُسے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی کتابیں اُس کے ہاتھوں میں تھما رہا تھا اور جانے وہ کیا کتابیں تھیں لیکن بوڑھا پوکروفسکی اور زیادہ کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ تو تمام کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بیچارہ اپنی پسند کی کتابیں

بیٹھی پڑھ رہا تھا۔ جب میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس کو مجھ سے بھی بہت پیار تھا۔ شاید وہ مجھے پیلیکا سے کم پیار نہ کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا —
" واروارا میں کتابیں خرید رہا ہوں۔ پیلیکا کے لئے کچھ کتابیں خرید رہا ہوں اس کا جنم دن آ رہا ہے اور اُسے کتابیں پسند ہیں۔ میں بہنا میں کتابیں خرید رہا ہوں، یہ دیکھو کتنی عمدہ کتابیں ہیں۔" آخری لفظ اُس نے یوں رُک رُک کے کہا کہ مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ ابھی رو دے گا کیونکہ وہ کتابیں قیمتی تھیں۔ میں صاف دیکھ رہی تھی کہ آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کی آنکھوں سے چھلک کر اُس کے رخسار پر بہنے والے تھے۔ میں نے فوراً پوچھا کہ اُس کے پاس کُل پیسے کتنے ہیں۔ وہ میری بات سُنتے ہی زیرِ لب بولا۔ " اوہ — میرے پاس —" اور یہ کہہ کر اُس غریب نے اپنی ساری پونجی مجھے دکھا دی — " یہ دیکھو۔ ایک تو آدھا رُوبل ہے۔ بیس کوپک ہیں اور دو تانبے کے پیسے ہیں۔" میں اُسے ایک طرف کو لے گئی اور اُسے اپنے دکاندار کے پاس لے آئی — " اس کے پاس گیارہ کتابیں ہیں اور ان کی قیمت ساڑھے تینتیس رُوبل ہے۔ میرے پاس تیس رُوبل ہیں۔ آپ اپنے اڑھائی رُوبل بھی مجھے دے دیجئے۔ ہم یہ کتابیں اکٹھے خرید لیں گے اور انھیں دونوں کی طرف سے پیش کر دیں گے۔" وہ تو خوشی کے مارے ناچ اُٹھا۔ اُس نے اپنے پیسے دکاندار کے ہاتھ میں تھما دئیے اور دکاندار نے کتابوں کا سارا بوجھ اُس پر لاد دیا۔ اُس نے کتابیں اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔ اپنے بغل میں داب لیں اور مجھ سے وعدہ کر گیا کہ اگلے دن چپکے چپکے وہ کتابیں میرے پاس لے آئے گا۔ اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے بیٹے سے ملنے کیلئے آیا۔ اور حسبِ معمول ایک گھنٹہ بھر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم سے ملنے چلا آیا۔ وہ عجیب مضحکہ انگیز اور پُراسرار انداز میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے مسکراہٹ بکھری پڑتی تھی اور وہ یوں اپنے ہاتھوں کو پُر اشتیاق انداز میں مل رہا تھا جیسے اُس کے ہاتھوں میں کوئی راز ہو۔ آخر اُس نے بتایا کہ کتابیں خفیہ طور پر ہمارے کمرے میں لائی جا چکی ہیں اور میٹرینا کی زیرِ نگرانی انھیں رسوئی میں باحفاظت پہنچا دیا گیا ہے۔ پوکروفسکی کے جنم دن کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔ اور وہ ہمیں بتانے لگا کہ تحفہ کیسے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ جتنا زیادہ بول رہا تھا اتنا ہی مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ایسی بات جسے زبان پر لانے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی۔ جسے زبان پر لاتے ہوئے وہ ڈر رہا ہے۔ میں کچھ نہ بولی لیکن میں دیکھ رہی کہ اُس کا جوش و خروش اُس کی آنکھوں میں چمک اور اُس کے چہرے کی دمک، سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ وہ لحظہ بہ لحظہ زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

آخر کار وہ بول اُٹھا۔ " بار برا —" اس کی آواز میں ایک عجیب ڈر اور گھبراہٹ تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ " واروارا۔ کیا تم جانتی ہو میں کیا سوچ رہا ہوں —" وہ اور زیادہ پریشان نظر آنے لگا — " بات یہ ہے کہ اگر دس کتابیں تم اُسے دے دو اور گیارہویں میں خود دے دوں تو کوئی ہرج ہے کیا؟ یعنی وہ دس کتابیں تمہاری طرف سے تحفہ ہوں گی گیارہویں میری طرف سے۔ سمجھیں میرا مطلب — یعنی تم بھی اُسے تحفہ پیش کر دو گی۔ میرے پاس بھی پیش کرنے کیلئے کچھ ہو گا — دونوں اپنا اپنا تحفہ دے دیں گے۔" وہ اس قدر جذباتی ہو گیا کہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا جیسے میرے جواب کا منتظر ہو۔ میں نے تحمل آواز میں پوچھا — " لیکن آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ ہم دونوں اکٹھے تحفہ پیش کریں —" " بات یہ ہے واروارا۔ میرا مطلب ہے کہ دراصل.. ..... " اُس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی اُسے بات کرنے کے لئے لفظ نہ مل رہے تھے اور اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا لیکن اُسے جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ گیا۔

" دراصل بات یہ ہے کہ میں وقتاً فوقتاً شراب نوشی کرتا ہوں واروارا میں رُک نہیں سکتا — اور جیسا مجھے ہونا چاہیئے میں ویسا ہوں نہیں — دیکھو نا — مثلاً سردی ہی لگ گئی ہے یا ایسے ہی ... کوئی جھگڑا ہی ہو جائے یا ویسے ہی جی اُداس ہو جاتے یا کچھ دل کو چوٹ پہنچے تو تم جانتی ہو کہ آدمی گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیتا ہے اور پیلیکا اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ خفا ہو جاتا ہے — وہ مجھے ڈانٹتا ہے، لیکچر پلا دیتا ہے سو اگر میں اُسے علیحدہ تحفہ پیش کروں گا تو اُس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ میں اپنے طور طریقے ٹھیک کر رہا ہوں — مطلب یہ ہے کہ ذرا اچھا رہتا ہے۔ وہ جان جائے گا کہ میں نے مدت سے پیسہ جمع کر رہا تھا کیونکہ پیلیکا جانتا ہے کہ جب تک وہ مجھے کوئی پیسہ دے تب تک میرے پاس اور کہیں سے نہیں آتا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے.......... اور وہ یہ جان کر بہت خوش ہوگا کہ میں نے اس مقصد کیلئے وہ پیسہ خرچ کیا ہے یعنی میں نے تحفہ اُس کیلئے اتنی دیر پیسہ بچا کے رکھا۔"

اور اپنی بات ختم کرکے جس طرح اُس بوڑھے شخص نے مجھے تکنا
شروع کیا مجھے اس پر بہت ترس آیا اور میں نے من ہی من میں فوراً فیصلہ
کر لیا

"لیکن آپ ہی تمام کتابیں کیوں نہیں پیش کر دیتے۔؟"
"تمام؟ تمہارا مطلب ہے پوری گیارہ کی گیارہ؟"
"ہاں ہاں کیوں نہیں"
"یعنی وہ سب کتابیں میں بطور تحفہ پیش کر دوں؟"
"ہاں ــ"
"یعنی بالکل اپنی طرف سے۔"
"ہاں ہاں جیسے وہ آپ نے تحفے میں دینے کے لئے خریدی ہیں۔" بہت دیر تک وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اُس کے پلّے کچھ نہ پڑا ہو۔ پھر وہ کچھ کھویا کھویا زیرِ لب بڑبڑایا۔ "اچھا یونہی سہی۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن۔ میرا مطلب ہے۔ تم کیا کرو گی دارعارا ــ؟"

"اتنی سی بات ہے نا کہ میری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہوگا۔ سو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ خوفزدہ ہو۔ "تمہاری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہوگا۔ یعنی تم کچھ نہ دے سکو گی۔" وہ کچھ اتنا مایوس ہو گیا کہ مجھے یوں نظر آیا گویا وہ اپنا پہلا ارادہ بھی ترک کر دے گا۔ تاکہ میں بھی اُس کے بیٹے کو تحفے میں کچھ دے سکوں۔ وہ بہت نیک دل شخص تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے بیٹے کو کوئی تحفہ پیش کر کے مجھے بے حد خوشی ہوتی لیکن میں اُس کی خوشیاں ختم نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ کا بیٹا اور آپ خوش ہوں تو پھر میں اپنے آپ خوش ہو گئی۔ اور مجھے واقعی ایسی ہی خوشی ہوگی جیسے وہ تحفہ میں نے خود دیا ہو۔" اب اُسے کچھ تسلی ہوئی اور اُسے میری بات کا یقین آیا۔ اس کے بعد وہ قریب قریب دو گھنٹے ہمارے پاس بیٹھا رہا لیکن ایک پل کیلئے بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ وہ بات بات پہ اچھل پڑتا۔ زور زور سے بولتا رہا، ہنستا رہا۔ ساشا کے ساتھ اچھل کود کرتا رہا۔ میرے بوسے لیتا رہا اور جب اُس کا ہاتھ پہنچ سکتا تو میرے بازو پر چٹکی بھی کاٹ لیتا اور اپنا منہ جب کسی اور طرف کو ہوتا تو اُس کی طرف دیکھ کر منہ بھی بنا دیتا۔ اور اینا نے آخر تنگ آ کر اُسے چلے جانے کو کہہ دیا۔ اس سے پہلے وہ اتنا خوش کبھی نظر نہ آیا تھا۔

جب وہ مبارک دن طلوع ہوا تو وہ ٹھیک گیارہ بجے چرچ سے سیدھا دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے کپڑے بڑی احتیاط سے پہنے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی واسکٹ اور اُس کے جوتے بالکل نئے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کتابوں کے بنڈل تھے۔ ہم سب اینا کے کمرے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے (وہاں یہ اتوار کا دن تھا)۔ اُس نے آتے ہی پہلا فیصلہ تو یہ صادر فرمایا کہ پُشکن بہت اچھا شاعر ہے لیکن دوسرے ہی لمحے گھبرا گیا اور کچھ ایسی باتیں کرتا رہا کہ آدمی کو ٹھیک ڈھنگ سے بات چیت کرنی چاہیئے اور اگر کوئی اس بات کی پروا نہیں کرے گا تو پھر وہ قدم قدم پہ غلطی کرے گا اور پھر اُس کی برائیاں اُس کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیں گی۔ اور یہ نکتہ تو اُس نے کئی مثالیں پیش کرکے واضح کیا اور بار بار کہا کہ گذشتہ کئی ماہ سے وہ اپنے اطوار ٹھیک کرتا چلا آ رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ اُس کے ہر کام میں ایک سلیقہ ہو۔ اُس نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ اُس کی کسی بات کے حق بجانب ہونے پر اُس نے کبھی شبہ نہ کیا تھا۔ اُس کی ہر بات اس نے گوشِ دل سے سنی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ کو سیدھے راستے پہ لانا ابھی ابھی شروع کیا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں اُس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ یہ سب کتابیں قبول کرے جو اُس نے ایک مدت کی بچائی ہوئی رقم سے خریدی ہیں۔

جب وہ مجھے یہ سب باتیں بتا رہا تھا تو میرا ایک تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا دوسرے میں جی کھول کے مسکرا بھی جا رہی تھی۔ کم از کم وہ یہ جانتا تھا کہ کس موقعہ پر کونسی بات کی جانی چاہیئے۔ کتابیں پوکروفسکی کے کمرے میں تھیں اور اس کی میز کی زینت بن چکی تھیں۔ اب یہ بات اور تھی کہ پوکروفسکی ایک دم سچائی کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور وہ کتابوں کے بارے میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو کھانے پر مدعو کیا تھا اور کیا خوب دن گذر رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم تاش کھیلتے رہے ساشا شرارت کی پتلی بنی ہوئی تھی اور میں بھی اُس سے کچھ کم نہ تھی جب میں کھیل ہوتی تو پوکروفسکی اپنی تمام تر توجہ کا مرکز مجھے بنا لیتا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے اُسے موقع نہ دیا۔ گذشتہ چار برسوں میں اتنا زیادہ خوش کبھی نہ ہوئی تھی۔

لیکن اب اُداس اور درد انگیز یادوں اور مصیبت کے دنوں کا

ذکر بھی لازم ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میرا قلم بہت آہستہ آہستہ لکھ رہا ہے۔ قلم شاید کچھ اور لکھنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ لیکن شاید ایک یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے اسی لمحے کے انتظار میں اپنی خوشیوں کے ایّام کو پوری تفصیل میں بیان کر دیا ہے۔ میری خوشیاں اس قدر کم تھیں کہ اُن کے بعد میری زندگی پر غم کے اتنے گہرے بادل چھا گئے ہیں کہ خدا ہی جانتا ہے یہ پاپ کب کٹے گا۔

دراصل میری مصیبتوں کا آغاز پوکروفسکی کی بیماری اور موت سے ہوتا ہے۔ جو واقعہ میں ابھی ابھی اوپر لکھ چکی ہوں اس کے ٹھیک دو ماہ بعد پوکروفسکی بیمار پڑ گیا۔ کیونکہ ان دو مہینوں میں روزی کمانے کے لئے پوکروفسکی نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ کیونکہ اُس کی زندگی کی کوئی ٹھوس بنیاد تو تھی نہیں۔ ہر تپ دق کے مریض کی طرح پوکروفسکی بھی آخری لمحے تک اس اُمید کا دامن نہ چھوڑتا تھا کہ ابھی اُسے بہت جینا ہے اگر وہ اس طرز کی ملازمت سے نفرت نہ کرتا تو وہ بہ آسانی سکول ماسٹر بن سکتا تھا۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق تھا تو اُس کی صحت اتنی خراب تھی کہ اُسے سرکاری ملازمت کبھی نہ مل سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اُسے اپنی پہلی تنخواہ کیلئے بہت دیر انتظار کرنا پڑتا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اُسے ہر بات میں نقطۂ فکر کا پہلو نظر آتا تھا آخر کار اُسکا کردار یاسیت زدہ ہو کر رہ گیا اور اُسکی صحت بھی دن بدن تباہ ہوتی گئی اور ستم یہ تھا کہ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں مطلق آگاہ نہ تھا۔ موسم بہار میں اکثر وبیشتر وہ نوکری کی تلاش کرنے کیلئے ایک پتلا کوٹ پہن کر نکل جاتا تھا اور جس جگہ جاتا تھا اپنی خستہ حالت کی بنا پر کافی ذلت اٹھاتا تھا اسی طرح وہ کئی بار بارش میں بھیگ چکا تھا اور گیلے پاؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایسا بستر پہ پڑا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ بہار اپنے پورے جوبن پر تھی کہ وہ اس دُنیائے فانی سے اُٹھ گیا۔ یہ ماہ اکتوبر کے آخری دن تھے۔

اُس کی بیماری کے دوران میں میں شاذونادر ہی کبھی اُسکے کمرے سے باہر گئی ہوں گی۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے اُس کی دیکھ بھال کی۔

پوکروفسکی کبھی کبھی آنکھ کھولتا تھا تو مجھے پہچان لیتا تھا۔ لیکن ایسا موقع بہت کم آتا تھا۔ زیادہ تر وہ غش کھاتے رہتا تھا۔ اور تمام رات کسی بحث میں اُلجھا رہتا تھا اُس کی زبان سے طویل، مبہم اور اُلجھے ہوئے فقرے سُننے میں آتے۔ اُس چھوٹے سے کمرے میں اُس کی

بجھتی ہوئی آواز عجیب طرح گونجتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے گنبد میں صدا گونجتی اور مرجھا جایا کرتی تھی۔ خاص کر آخری رات تو اُس پر شدت کی بے ہوشی طاری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شدید کرب میں مبتلا ہے۔ وہ رہ رہ کر کراہتا اور آہیں بھرتا۔ ہر شخص ڈر گیا تھا یا نے خدا سے دُعا مانگی کہ اُسے جلد اپنے پاس بُلا لے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ صبح تک خاتمہ ضرور ہو جائے گا۔

اُس کے بوڑھے باپ نے وہ تمام رات دروازے کے باہر بیٹھ کر گذاری۔ وہاں اُس کے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ وہ بار بار کمرے میں آتا لیکن ایک خوف کے تحت بغیر کچھ دیکھے واپس لوٹ جاتا۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ رنج و یاس نے اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ کسی خوف کے زیر اثر اُس کا سر ہلتا ہی رہا۔ بلکہ وہ سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہی کچھ کہتا رہا کبھی انکار کرنے کے انداز میں سر ہلا دیتا کبھی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ اس قدر تھک ٹوٹ چکا تھا کہ گہری نیند میں سو گیا۔

ابھی صبح کے سات بجے تھے کہ میں نے دیکھا موت اب پوکروفسکی کے سرہانے کھڑی ہے۔ میں نے اُس کے باپ کو جگا دیا۔ پوکروفسکی عین آخری لمحے پر اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھا۔ اُس نے ہم سب کو الوداع کہی اور پچھلی باتوں کی معافی مانگی حالانکہ میرا دل پاش پاش ہو چکا تھا لیکن میری آنکھوں سے ایک بُوند آنسو نہ گرا۔

پوکروفسکی کا آخری وقت پتھر کو بھی لہو رلا سکتا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز اور ڈوبتی ہوئی سانسوں میں کوئی التجا کر رہا تھا لیکن میں کچھ نہ سمجھ پائی۔ بلکہ وہ موت کا ناچ میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ تڑپتا رہا۔ اور رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ مطلب ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نحیف اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کوئی التجا کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس بار پھر کچھ نہ سمجھ سکی۔ باری باری میں نے سب کو اس کے بستر کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اُسے پانی پلایا۔ لیکن اُس نے مایوس انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ آخر کار میں جان گئی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سامنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا جائے تاکہ آخری بار سورج کی روشنی کو دیکھ لے۔ وہ دن کے نور کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ وہ خدا کی کائنات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا دیا۔ لیکن باہر بھی فضا اُسی طرح دُھندلی اور ماتمی تھی جیسے اُس کی

دم توڑتی ہوئی زندگی۔ موت جیسی روشنی کہیں غائب ہو گئی اور آسمان دُھند اور کہر میں چھپا ہوا فضا آسمان میں اُداسی کا پیکر نظر آ رہا تھا اور یوں جان پڑتا تھا جیسے یہ بے ستون عرش ابھی الٹ پڑے گا۔ کھڑکی کے تختوں پر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور اس بارش اور کہر بھری فضا کو دیکھ کر یوں جان پڑتا جیسے سارا منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ اندر تیل کے دئیے کی ہلکی ہلکی کرنیں دم توڑتی ہوئی لَو کے ساتھ جدوجہد کر رہی تھیں۔ مرنے والے نے پُرحسرت نظروں سے مجھے دیکھا اور مایوسی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ یہ اُس کی زندگی کی آخری رمق تھی وہ موت کی نیند سو گیا۔ وہ اس جہان سے دوسری دُنیا میں جا چکا تھا۔

اینا نے جنازے کا انتظام کرایا تھا۔ ایک سادہ سا کفن خریدا گیا اور ایک معمولی سی بیل گاڑی کرائے پر لے لی گئی۔ اور اُن اخراجات کو پورا کرنے کیلئے اینا نے مرحوم کی کتابوں اور ساری ملکیت پر قبضہ کر لیا۔ مرحوم کا بوڑھا باپ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اینا سے زور آزما تھا۔ جتنا اُس سے بن پڑا اتنی کتابیں اُس نے اینا سے واپس حاصل کر لیں۔ اُن کتابوں کو اُس نے اپنی جیبوں، اپنے بیگ میں ٹھونس لیا۔ اُن کتابوں کو اُس نے تین روز تک اپنے سے علیحدہ نہ کیا تھا حتیٰ کہ وہ چرچ میں بھی اُنہیں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا رہا۔ لیکن وہ اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک سوچنے سمجھنے اور بولنے کے ناقابل ہو چکا تھا۔ وہ تابوت کے اردگرد پاگلوں کی طرح چکر لگاتا۔ اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا اور بار بار اپنے مرحوم بیٹے کی گردن کو ٹھیک کرتا تھا۔ کبھی موم بتی جلا دیتا کبھی بجھا دیتا۔ اُس کے خیالات کسی بات پر پل بھر کے لئے نہ جم سکتے تھے۔ مرحوم کی روح کی شانتی کے لئے چرچ میں جو عبادت کی گئی اُس میں نہ اتنی جان نہ اینا شامل ہو سکی تھیں۔ اتنی جان کی طبیعت تو ٹھیک نہ تھی اور اینا جانے کو تیار ہی تھی کہ پھر اُس بوڑھے شخص سے اُلجھ پڑی اور اُس نے عبادت میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا بوڑھا باپ اور میں وہاں موجود تھے۔ عبادت کے دوران میں میرے دل و دماغ پر ایک عجیب خوف طاری ہو گیا۔ جیسے مجھے اپنا مستقبل یاد آ گیا ہو۔ میں عبادت پوری ہونے تک کا بھی انتظار نہ کر سکتی تھی۔ آخرکار جنازہ اُٹھایا گیا اور اُسے بیل گاڑی پر رکھ دیا گیا اور بیل گاڑی چل دی۔ میں گلی کے سرے تک تو اُس بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ گئی وہاں پہنچ کر کوچوان نے گھوڑے کو زور سے چابک مارا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اُس کا بوڑھا باپ سسکیاں بھرتا ہوا ہانپتا ہوا گرتا پڑتا اُس بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کا بیگ گر گیا لیکن وہ اُسے اُٹھانے کیلئے نہ رُکا۔ بارش سے اُس کے بال اور اُس کا جسم بھیگ چکا تھا۔ سرد اور تند ہوا اُس کے چہرے پر چابک کی طرح لگ رہی تھی۔ لیکن اُسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی اور وہ اُس ٹھیلے کے کبھی اِس طرف سے ہو کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا کبھی اُس طرف سے۔ اُس کے کوٹ کے سرے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ اُس کے کوٹ کی جیبوں سے پوکروفسکی کی کتابیں لُڑھک لُڑھک کر زمین پر گر رہی تھیں۔ جو سب سے بڑی کتاب تھی اُسے اُس کے بوڑھے باپ نے اپنے سینے سے بھینچ کر لگا رکھا تھا۔ راہگیر جنازے کو دیکھتے تو اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور عبادت کرنے کے انداز میں جھک جاتے۔ کچھ لوگ اس دیوانے کو دیکھنے کیلئے بھی رُک جاتے۔ کتابیں اس کی جیب سے نکل نکل کر نیچے کیچڑ میں گرتی رہیں۔ اگر کوئی اُسے روک کر گری ہوئی کتاب دکھاتا تو وہ لپک کر کتاب اُٹھا لیتا اور پھر بیل گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا۔ گلی کے آخری موڑ پر اُس کے ہمراہ ایک پھٹے کپڑوں والی بھکارن بھی ہو گئی تھی۔ جب بیل گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں گھر چلی آئی اور اتنی جان کے سینے سے لپٹ گئی ہچکیاں لیتے لیتے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے کئی بار اتنی جان کو چوما اُنہیں اپنی باہوں میں لپیٹ لیا۔ جیسے میں موت کے ہاتھوں سے اپنے آخری دوست کو بچانا چاہتی تھی۔ لیکن موت تو پہلے ہی اُن کے سرہانے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ....

....

اا رجون۔

ماہا ماکل جزیرے تک کی سیر و تفریح کے لئے میں بے حد شکر گزار ہوں۔ جزیرے کتنے حسین تھے۔ کس قدر شاداب اور ہرے بھرے نظر آتے تھے۔ میں نے ایک مدت سے گھاس اور درخت نہیں دیکھے تھے۔ جب میں بیمار پڑ گئی تھی تو مجھے گمان گزرا تھا کہ اب میں اُنہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میرے خیال میں اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکوں گی۔ لہٰذا اب تم خود اندازہ کر لو کہ اس مایوسی کے بعد کل وہی کچھ دیکھنے سے میں کتنی خوش ہوں گی۔ دیکھو کل میں کیونکہ اُداس اُداس نظر آ رہی تھی اس لئے خفا نہ ہو جانا۔ میں واقعی بہت خوش تھی اور میرے دل کو بہت چین تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ ہوا ہے کہ جب مجھے بہت زیادہ خوشی نصیب ہوتی تو میں ہمیشہ اُداس ہو جاتی ہوں۔ اور اگر میں رو بھی پڑی تھی تو اس سے تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں اکثر و بیشتر بغیر وجہ جانے رو پڑتی ہوں۔ میرے خیال میں اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ چیزیں بہت آسانی سے چوٹ پہنچا جاتی ہیں میرے تاثرات ہمیشہ

درد انگیز ہوا کرتے تھے۔

ماکار ۔۔ تمہیں یاد ہے جب کل تم مجھے بغور دیکھ رہے تھے تو میں جان گئی تھی کہ تم میرے دل کا حال جاننا چاہتے تھے۔ تم میری خوشیوں کی تہہ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ نظر کے سامنے کوئی جھاڑی تھی یا پھولوں کی بہار تھی یا درختوں کا جھنڈ تھا یا کوئی چشمہ تھا لیکن تم مجھے دیکھ رہے تھے اور تمہاری آنکھوں میں ایک فخر جھلک رہا تھا کچھ ایسا فخر جیسے وہ ساری جگہ تمہاری اپنی جاگیر ہو۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم رحمدل اور نیکدل انسان ہو۔ اور میرے اچھے ماکار تمہاری اس خوبی کی بنا پر مجھے تم سے محبت ہے۔ اچھا خدا حافظ میرے اچھے ماکار ۔۔ آج پھر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج صبح میرے پاؤں بہت دیر تک بھیگے رہے اور مجھے سردی لگ گئی ہے۔ فیڈورا بھی بستر پر پڑ گئی ہے اور ہم دونوں بیکار سی ہو کے رہ گئی ہیں۔ ہمیں بھول نہ جانا اور جب ممکن ہو سکے تو ملنے چلے آؤ۔

تمہاری

وی۔ ڈی۔

۱۲ اپریل۔

میری پیاری واروارا۔

کیا تم جانتی ہو کہ میں کیا امید کر رہا تھا کہ تم مجھے منظوم خط لکھو گی۔ اور اس کی بجائے تم نے ایک چھوٹے سے صفحے کا خط لکھ بھیجا۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم نے بہت تھوڑا لکھا ہے لیکن خوب لکھا ہے اور طرزِ تحریر پر تو میں سو جان سے فدا۔ تم نے جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔ رہا میں تو مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے اگر میں ایک درجن صفحے بھی لکھ دوں تو ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہو گی۔ تم کہتی ہو کہ میں رحمدل اور نیکدل انسان ہوں اور خدا کا فرشتہ ہوں اور نہ جانے کن کن الفاظ میں تم نے میری تعریف کی ہے۔ جانِ من یہ سب سچ ہے میں بالکل ایسا ہوں جیسا تم نے بیان کیا ہے۔ لیکن تم نے جو کچھ لکھ دیا ہے اسے پڑھ کر دل پھول جاتا ہے اور دماغ میں اداس خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سنو میری ننھی سی جان اب میں تمہیں اپنی زندگی کے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔

میں نے تیرہ برس کی عمر میں ملازمت شروع کی تھی۔ یعنی یہ تیس سال پہلے کی بات ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دنوں میں نے کئی سروس کوٹ پہنے ہوں گے لیکن اب عمر کے ساتھ ساتھ میری سوجھ بوجھ بھی تو بڑھی ہے۔ اور آخرکار میں نے دنیا دیکھی ہے یقیناً انھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ ثبوت چاہتی ہو! تو سنو کہ ایک ایسا بھی وقت آیا تھا جب میری خدمات کے صلے میں مجھے تمغہ عطا کرنے کی سفارش کر دی گئی تھی شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے۔ بدقسمتی سے برے لوگ زندگی میں ہر مقام پر آ ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں بیوقوف اور جاہل ہوں گا لیکن میرے سینے میں بھی ویسا ہی دھڑکتا ہوا دل ہے جیسا کسی اور انسان کے سینے میں ہو سکتا ہے۔ اور واروارنیا کیا تم سوچ سکتی ہو کہ اس بدخواہ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا مجھے بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تم یہ نہ پوچھو اس نے کیا کیا تھا۔ تم یہ پوچھو اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیونکہ میں شرمیلا شخص ہوں اور کیونکہ میں خاموش طبع ہوں، کیونکہ میرے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا نازک دل ہے۔ اصل بات تو یہی کہ میں اسے پسند نہ تھا بس ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے یہ سب فساد کھڑا ہو گیا تھا۔ "ماکار ایسا ہے ماکار ویسا ہے پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ "ماکار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے بیکار آدمی ہے چل ۔" اور آخرکار یہ بات بھی سننے میں آئی ۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر خطا کس کی ہے: ظاہر ہے ماکار کا قصور ہے ۔ سو اب تم خود جان سکتی ہو کہ ہمیشہ اور ہر بات غریب ماکار ہی کی خطا ہوتی ہو بس اس شخص نے اس سے زیادہ اور کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن یہی ضرب بڑی کاری ثابت ہوئی تھی۔ اس نے وزارت کے ہر شعبے میں ماکار کو بدنام کر دیا اور سب کی نظروں سے نیچے گرا دیا۔ لیکن پھر یہ سلسلہ یہیں تک ختم نہ ہوا۔ انہیں میرے جوتوں پر اعتراض ہونے لگا۔ میرے کوٹ، میرے بال حتیٰ کہ میرے وجود تک پر اعتراض ہونے لگے۔ یہ بات غلط تھی اور اس کا کفارہ لازمی تھا۔ اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا جب مجھے ذلیل نہ کیا جاتا تھا۔ اب میں اس سلوک کا عادی ہو چکا ہوں پھر میں تو ہر بات کا عادی ہو سکتا ہوں۔ آخر ایک معمولی رتبے کا انسان جس کو کسی شمار میں نہیں لایا جا سکتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہ سب کچھ کیوں برداشت کر دوں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ کیا میں کسی دوسرے شخص کی ترقی روک دی ہے؟ افسران کے سامنے میں نے کسی شخص کی چغلی کھائی ہے؟ کوئی بھی ایک ثبوت پیش کر سکتا ہے؟ یہ بھی چھوڑو۔ کیا میں نے کبھی خود اپنی ترقی کیلئے زبان سے ایک لفظ تک نکالا ہے؟ کیا میں نے کسی کے ساتھ بھی کوئی ساز باز کی ہے؟ ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہئے۔ اور مجھے کیا ضرورت پڑی

حق کس سب کچھ کرتا پھرتا؟ اور پھر اتنا تو سوچا جائے کہ کیا میں بلند ارادے اور عزم پیدا کرنے کے قابل ہوں بھی؟ لیکن خدا کی پناہ میں اس سزا کا حق دار کیسے ٹھہرایا گیا...... تمہاری نظروں میں تو میں ایک اچھا شخص ہوں۔ ہے نا؟ اور جانِ من کہ تم دُنیا کے باقی ہر شخص سے اچھی ہو۔ اور آخر کار ایک مہذب شہری کی سب سے بڑی خوبی ہے کیا؟ آئیو فورڈ نے کل ایک پرائیویٹ جلسے میں کہا تھا کہ سب سے خوبی یہ ہے کہ جیو لیاں جڑ جڑ کے پیسہ کماؤ۔ آئیو فورڈ کہ ضرور مذاق کر رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آئیو فورڈ نے ازراہِ مذاق یہ بات کہی ہوگی) لیکن اس فقرے کا اصل مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی پر بوجھ نہ بنے اور میں کسی شخص پر بوجھ نہیں بنا ہوں۔ میں نے روکھی سوکھی یا باسی روٹی کھائی ہے لیکن وہ روٹی خون پسینے کی کمائی سے حاصل کی ہے اور شرافت سے پیسہ کمایا ہے۔ آخر ایک انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔ کاغذات کی نقل کرنے میں کوئی خاص ذہانت نہیں درکار لیکن مجھے اس کام پر بھی فخر ہے کیونکہ میں اسی کام میں اپنا پسینہ بہا دیتا ہوں۔ اور پھر نقل اُتارنے میں کیا بُرائی ہے! کیا یہ گناہ ہے؟ "وہاں بیٹھا مکھی پہ مکھی مار رہا ہے" — "سالا دفتری چوہا ہٹتا ہی نہیں سے" آخر ان فقروں کا مطلب کیا ہے۔ آخر اس کام میں بے ایمانی کہاں سے آگئی؟ میرا دستخط بہت اچھا ہے دیکھنے میں صاف اور واضح ہے اور حضور والا تو ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔ اور حضور والا کے بہت ہی ضروری کاغذات کی دوسری کاپی تو میں ہی تیار کرتا ہوں۔ رہی اسلوب کی بات تو خواہ مخواہ مغز کھپاتا رہتا ہوں میں صاحبِ اسلوب نہیں ہوں اور میں اپنی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں ملازمت میں کبھی ترقی نہیں پا سکا۔ وار نیکا — میں تو تمہیں بھی خط لکھتے ہوئے بالکل اسی طرح لکھ دیتا ہوں۔ میں فلسفیانہ خیالات اور رندانہ بیاں کہاں سے لاؤں۔ بس جو کچھ دماغ میں جیسے بھی آئے اور اندازے آتا ہے اسی طرح اُسے کاغذ پر اُتار دیتا ہوں۔ میں ایک سوال پوچھتا ہوں حالانکہ میں اس کا جواب بخوبی جانتا ہوں لیکن پوچھنے میں کیا ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص نئی بات کہنے لگ جائے تو پھر اُسی بات کو دہرائے گا کون؟ تم اس سوال کا جواب خیر کیا دو گی لیکن اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن لوگوں کو میرے مقابلے میں غالباً مذاق نہیں کرنا چاہئیں۔ وہ مجھے بعد شوق دفتری چوہا کہیں کیا وہ لوگ یہ نہیں محسوس کر سکتے کہ اسی چوہے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی چوہا اُن کے لئے کتنا معنی ثابت ہوتا ہے۔ چلو میں چوہا ہی سہی لیکن میری قسمت کی جاتی ہے۔ میں وہ چوہا ہوں جو کام آتا ہے۔ لیکن جانِ من لعنت ان سب باتوں پر تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا محض جذبات کی رو میں بہہ گیا اور سب کچھ لکھ گیا۔ کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے کہ کھری کھری کہہ دی جائے۔ خدا حافظ جانِ من۔

میرے آرام جان۔ میرے ننھے فرشتے میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گا تب تک اپنے آپ کو تم تنہا محسوس کرنا۔ میں اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لاؤں گا۔ اچھا۔ خدا حافظ وار نیکا۔

تمہارا مخلص اور خیر خواہ
ماکار

۳۰ جون

مائی ڈیر ماکار

مجھے وقت بے کار کام ختم کرنے کی بہت جلدی ہے اور اُسی جلدی میں میں یہ خط لکھ رہی ہوں — سنو — تم ایک بہت اچھا سودا کر سکتی ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ کوئی صاحب اپنی بالکل نئی وردی بیچنا چاہتے ہیں۔ وردی کے ساتھ پتلون، واسکٹ اور ٹوپی بھی ملے گی۔ بالکل نئی اور سستی ہے۔ خرید لو نا! اب تو تمہارے پاس پیسے بھی ہیں اور تم خود کہتے ہو کہ تمہاری مالی حالت ان دنوں اچھی ہے دیکھو اب مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے ایسی چیزیں بہت کارآمد ہوتی ہیں۔ ایک نظر خود پر ڈال تو لو — جو کپڑے پہنے پھرتے ہو ذرا انہیں دیکھو تو سہی۔ کتنی بُری حالت میں ہے تمہارے کپڑے بڑی شرم کی بات ہے اور تمہارے پاس نئی وردی تو ہے ہی نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم لاکھ کہو کہ تمہارے پاس نئے کپڑے ہیں لیکن میں نہ مانوں گی۔ خدا جانے تمہاری نئی وردی کب ہوئی۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ دیکھو خدا اور اس کے متعلق فیصلہ کر لو — میری خاطر ہی سہی لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تم یہ وردی ضرور خرید لو۔

تم نے میرے لئے کچھ ریشمی کپڑا بھیجا ہے لیکن تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ غضب خدا کا تم اپنا پیسہ خرچ کیسے کر رہے ہو۔ تم عجب فضول خرچ ہو — یہ چیزیں بالکل غیر ضروری ہوتی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ مجھے بھیج کر

"برمک نے زلیخا بول ـــــ" برمک ـــ دنیا بڑی ظالم ہے اور انسان ناانصاف ہے ۔ وہ ہمیں اپنی دنیا سے نکال باہر کریں گے، وہ ہم پہ لعنت ملامت کریں گے ۔ میرے محبوب برمک ـ وہ ہماری زندگی عذاب بنادیں گے ۔ تمہارے ماحول کی بے مہر، مغرور اور اونچی سوسائٹی اُس غریب لڑکی کا دم گھونٹ کے مار دے گی جو بہت کے جنگلی میدانوں میں اپنے باپ کے خیموں میں پلی ہے ـــ اے میری جانِ حیات ـــ تمہارا ماحول مجھے کبھی نہ سکے گا ـــ"

برمک کی آنکھوں سے شعلے برس پڑے ۔ اور وہ شیر کی طرح دہاڑ کر بولا

"دنیا ایسی ہی بات ہے تو برمک کی تلوار موت کے نغمے سناتی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی سب کا سر کاٹ کے رکھ دے گی"

وارنیکا ذرا اندازہ کرو جب برمک کو یہ پتا چلا ہوگا کہ زلیخا کو قتل کر دیا گیا ہے تو اُس کے دل پر کیا بیتی ہوگی ۔ رات کی تاریکی میں اندھا اور بوڑھا نجیم برمک کے خیمے میں گھس گیا تھا اور اُس نے ننھی لڑکی کے سینے میں کئی خنجر گھونپ دیئے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ جس شخص نے اس کا تخت اور وقار چھین لیا ہے اس کو وہ خود بھی کس قدر ضرب کاری پہنچا رہا ہے ۔

برمک غصے میں پاگل ہوا تھا ۔ اپنی تلوار کو چٹان کے چکیلے پتھر پہ زور سے مارتا ہوا بولا ـــ" میں پتھر پہ وار کر کے اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا اور اس بدمعاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا ۔

لیکن برمک زلیخا کی موت کا صدمہ نہ برداشت کر سکا ۔ وہ آتش میں کود گیا اور یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے ۔

اور ذرا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ کرو ۔ یہ ذرا مزاحیہ انداز میں ہے ۔

"کیا تم آئیون بیروکوفش زلیٹوپوز کو جانتے ہو ۔ یہ وہ شخص ہے جس نے یہ دکوتی آئیو زوچ کی ٹانگ کو کاٹ کھایا تھا ۔ آئیون بیروکوفش منکرانہ کردار کا مالک ہے لیکن اُس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں ۔ اُس کے برعکس بیرد کوتی آئیوزوچ مشتبہ اور وحشت کا علمبردار ہے ۔ جب بیلاگو اینٹونوونا اُس کی دوست تھی ۔ ۔ ۔

کیا تم بیلاگو اینٹونوونا کو جانتے ہو ـــ یہ وہی عورت ہے جو ہمیشہ الٹا ہی کوٹ پہنتی ہے ـــ"

وارنیکا ـــ کیا بلند پایہ مزاح ہے ۔ بلکہ یہ تو حسین مزاح ہے ۔ جب دا آنازیف نے ہمیں یہ کہانی پڑھ کر سنائی تھی تو مارے ہنسی کے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے ۔ وہ خود بھی ایسی ہی شخصیت ہے ۔ خدا اُس کی عمر دراز کرے ۔ ہو سکتا ہے کہ کہانی کا انداز بیاں ذرا زیادہ ہی بانکا اور ہلکے درجے کا ہو لیکن کیا سادگی ہے کیا معصومیت ہے ۔ بیباک خیال اور فطری خیالات کا شائبہ تک نہیں ہے ۔ وارنیکا میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ دا آنازیف ایسے چال چلن کا مالک ہے لہٰذا بلند پائے کا ادیب ہو یہ بات اکثر و بیشتر ادیبوں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی ۔

اور فرض کرو کہ ـــ آدمی کے دماغ میں کیا کیا خیالات آتے ہیں ـــ ہاں تو فرض کرو کہ اگر میں بھی لکھنے لگ جاؤں ۔ ذرا تصور کرو کہ اگر اچانک تمہیں ایک کتاب نظر آئے جس کا عنوان ہو ۔ مکار کی نظمیں ـــ تو پھر تم کیا سوچو گی ۔ تمہارا رد عمل کیا ہوگا ؟ میرا سوال تو پھر میں دوبارہ نیفکی پراسپیکٹ میں جانے کا نہیں ۔ مجھ میں نہیں آتا کہ جب ہر شخص مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے گا ـــ" وہ مکار ہے ۔ وہی مکار ـــ شاعر اور نامور ادبی شخصیت" تو میں کیا محسوس کروں گا ۔ پھر میں اپنے ان شکستہ جوتوں کا کیا کروں گا ۔ اب بات چل ہی پڑی ہے تو میں بتا دوں کہ میرے جوتوں پہ ہمیشہ ٹانکے لگے رہتے ہیں ۔ اور کبھی کبھی تلوا تو بری طرح باہر کو نکل آتا ہے ۔ اگر ہر شخص اپنے شاعر مکار کو اس حالت میں جاتے ہوئے دیکھے گا تو کیا سوچے گا ۔ اور اگر شہزادی سلجدہ خستہ حال بوٹ پہنے ہوئے دیکھ لے گی تو پھر کیا ہوگا ـــ میرا خیال نہیں کہ انکی نگاہ جوتوں پر ہی پڑے گی کیونکہ شہزادیاں لوگوں کے جوتے نہیں دیکھتی پھرتیں اور پھر کلرک کے جوتے کے بارے میں وہ خاص توجہ بھی کیا دیں لیکن میرے اپنے دوست ڈانٹ دیں گے ۔ اور دا آنازیف سب سے پہلا شخص ہوگا ۔ دا آنازیف آئے دن شہزادی سے ملنے جاتا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ شہزادی اور شاہی خاندان کے باقی افراد ایک عزیز دوست کی طرح اس کا سواگت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے ۔ دا آنازیف کہتا ہے کہ شہزادی کا ہستی بہت خوش

تمہارا مخلص دوست
ماکار

۲۲ جون۔
میری پیاری وار ما را
میں بڑے دکھ سے تمہیں ایک بہت بڑی خبر سنا رہا ہوں۔
ہمارے مکان میں ایک بہت بڑا واقعہ ہو گزرا ہے۔ آج صبح چار
بجے کراشکوف کا چھوٹا لڑکا مر گیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی
وفات کیسے ہو گئی۔ تیز بخار کی بنا پر یا کسی اور روگ کی وجہ سے
چل بسا لیکن یہ بہت بری بات ہوئی۔ میں ان لوگوں کو تسلی دینے
گیا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ غریبی کے ہاتھوں وہ تو اپنے
دن کاٹ رہے ہیں۔ ان کا کمرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا۔ اور
کون جانے کہ وہ پورا کنبہ محض اسی ایک کمرے میں رہتا ہو اور
صرف حفاظت کی خاطر کمرے میں چادریں لٹکا کر وقت کاٹ
رہے ہوں۔ جنازہ تیار تھا۔ تابوت سیدھا سادہ تھا لیکن
صاف ستھرا تھا۔ ان لوگوں نے بنا بنایا ہی خرید لیا تھا۔ بچے کی
عمر نو برس تھی اور ان کا کہنا ہے کہ بڑا ہونہار بچہ تھا۔ وارنیکا ان
لوگوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ بچے کی ماں کا یہ حال تھا کہ
روئی بھی نہیں لیکن اسے ایک عجیب چپ لگ گئی تھی۔ ممکن
ہے کہ ایک بچے کی موت سے ان کا بوجھ ہی کم ہوا ہو۔ ایک
آدمی کی روٹی کا خرچ بچا ہو۔ دو بچے اور ہیں۔ ایک تو نو
زائیدہ ہے اور ایک چھ یا سات برس کی لڑکی ہے۔ بچوں کو دکھی
ہوتے نہیں دیکھا جا سکتا اور خاص کر جب وہ اپنے ہوں تو
ان کے لئے کچھ کیا نہ جا سکے۔ ان کا باپ اپنا پرانا کوٹ پہنے ایک
شکستہ کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اس کے گال سے آنسوؤں کی جھڑی
بہہ رہی تھی شاید یہ آنسو رنج کی بنا پر نہ امڈ آئے تھے شاید
انہیں رونے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ خراب
ضرور ہیں۔ وہ عجیب وضع کا انسان ہے۔ جب کوئی اس
سے بات کرے تو شرما جاتا ہے۔ گھبرا اٹھتا ہے اور اس کی
زبان ہی نہیں کھلتی۔ اس کی چھ برس کی ننھی سی بیٹی جنازے
کے قریب گم سم کھڑی تھی۔ جیسے گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔
وارنیکا کسی بھی بچے کو اس انداز میں گم سم دیکھنا میرے بس کا
روگ نہیں ہے۔ مجھے بڑا ہول اٹھتا ہے۔ اس کی پرانی اور خستہ
حال گڑیا فرش پر ایک طرف پڑی تھی۔ اس کی انگلیاں اس کے
ہونٹوں پر پڑی تھیں اور وہ کھوئی کھوئی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔
بالکل ساکت و متحیر۔ مکان کی مالکن نے اسے بسکٹ کی ٹکڑی
دی۔ اس لڑکی نے وہ ٹکڑی لے تو لی لیکن اس نے کھائی
نہیں۔ وارنیکا۔ یہ ہوتا ہے رنج۔ ٹھیک کہتا
ہوں نا؟

ماکار۔

۲۵ جون
میرے پیارے ماکار
میں نے تمہاری کتاب واپس بھیج دی ہے۔ کیا واہیات
کتاب تھی پڑھ کر سخت کوفت ہوئی۔ ایسا نایاب نسخہ تمہارے
ہاتھ لگا کہاں سے! ماکار۔ یہ تو خیر مذاق کی بات تھی سچ سچ
بتاؤ کیا واقعی تمہیں اچھی لگتی ہیں۔ پرسوں تم نے وعدہ کیا تھا
کہ میرے پڑھنے کے لئے کوئی چیز بھیجو گے۔ ہم دونوں
ساتھ ساتھ اسے پڑھ لیں گے۔ اچھا زیادہ لکھنے کے لئے
میرے پاس وقت نہیں ہے خدا حافظ
وی۔ ڈی

۲۶ جون۔
عزیزم وارنیکا۔
سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ کتاب خود نہیں پڑھی
تھی۔ میں نے یونہی صفحے ادھر ادھر سے الٹ کر دیکھا تھا کہ
ہنسنے ہنسانے کے لئے ذرا اچھے لطیفے درج ہیں بالکل میں نے
سوچا کہ کچھ تو دل لگی ہی رہے گی۔ کون جانے کہ وارنیکا کو یہ
کتاب پسند ہی آ جائے۔ بس یہی سوچ کر میں نے تمہیں بھیج
دی تھی۔
راتازیئف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے حقیقتاً کوئی اچھی
تصنیف دے گا۔ غم مت کرو۔ پڑھنے کے لئے بہت مواد ہو
گا۔ راتازیئف ایک سچا محقق اور واقعی وسیع المطالعہ شخص ہے
وہ خود بھی لکھتا ہے۔ اور ارے بابا کیسی کیسی چیزیں لکھ ڈالتا
ہے وہ! اس کی تحریریں جان ہے اور وہ اس انداز سے ہوتی

آشنا ہے کہ تحریر میں اسلوب کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ
تو ایک ایک لفظ میں جان ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ وہی تھوڑا
سے بات کرتے ہوئے میری زبان سے جو الفاظ معمولی کا
بے معنی اور روا ہیات نظر آتے ہیں وہی الفاظ جب وہ
استعمال کرتا ہے تو ان میں ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ میں
اسکی دعوتوں میں ہمیشہ شریک ہوا کرتا ہوں۔ وہاں ہم
لوگ بیٹھے سگریٹوں کے کش لگاتے رہتے ہیں اور وہ ہمیں
اپنی تخیلات سناتا ہے۔ کبھی کبھی تو صبح کے پانچ بج جاتے ہیں
میں ان محفلوں کو دعوت ادب کہوں گا۔ لاجواب تحریر ہے اسکی
جیسے پھول جھڑتے ہیں۔ واقعی ہر فقرے سے پھولوں کی لڑی
گوندھی جاسکتی ہے۔ موتی پروتا ہے موتی۔ اور پھر آدمی بھی
نیک دل ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو سمجھتا ہے اور مدد کرنے
کی کوشش کرتا ہے۔ میرا اس کا کیا مقابلہ۔ میں اس کے سامنے
ہوں کیا؟ کچھ بھی نہیں اُسکی عزت ہے شہرت ہے اور میں۔؟
میں بالکل صفر! اُس کے سامنے میری ہستی ہی کیا ہے۔ لیکن اسکے
باوجود میری عزت کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے اتنی اجازت دے
دیتا ہے کہ اس کے لئے نظم یا نثر کا کچھ حصہ کاپی کر دوں۔ لیکن عزیز
اس سے یہ مطلب نہ نکالنا کہ یہ فقط اس کی چالاکی ہے۔ اور
یہ بھی نہ سمجھنا کہ وہ میری عزت اس لئے کرتا ہے کہ میں اُس کی نظم
ونثر کی کاپی کر دیتا ہوں۔ نہیں نہیں ایسا کوئی خیال دل میں نہ لانا۔
میں یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہوں کہ میں من سے یہ کرنا چاہتا ہوں۔
اس میں میری اپنی خوشی ہے اور یہی وجہ کہ وہ بھی میری قدر کرتا ہے۔
تاکہ مجھے خوشی میسر ہو۔ جان من جب کوئی معاملہ نازک ہو جاتا ہے
تو وہ میری آنکھوں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ اچھا اور نیک شخص ہے۔
ہاں۔ اور بے مثال ادیب ہے۔

دارنیکا — یہ ادیب بھی کمال کی چیز ہے۔ واقعی خوب
ہے۔ یعنی کل میں نے ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہی راز پایا ہے۔
ادب۔ بہت گہری اور ٹھوس حقیقت ہے۔ جاندار چیز ہے۔
ادب ایک تصویر ہے اور وہ ایک خاص قسم کی تصویر۔ یہ ایک
آئینہ ہے۔ جس میں جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں بلند پایہ
نکتہ سنجی ملتی ہے۔ ہدایات ہوتی ہیں۔ اور پھر زندگی کی تفسیر ہے۔

میں نے یہ باتیں انہی لوگوں سے سیکھی ہیں۔ میں تو صاف بات
کروں گا۔ میں وہاں بیٹھ کر کوئی بھی کہانی یا نظم تو سن سکتا ہوں اور
دوسروں کی طرح اپنا آپ پیارا رہتا ہوں) لیکن جہاں انہوں نے
بحث شروع کی اور دلائل پیش کئے تو پانی اپنے سر سے گزر
جاتا ہے۔ وہ باتیں اپنی سمجھ سے باہر کی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ
میں بھی سمجھ دار نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن سچی بات تو یہ
ہے کہ مجھے خود پر شرم آتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے۔ کاٹھ کے پتلے
کی طرح تمام شام وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ اور ایک صحیح اور
موزوں لفظ ادا کرنے کے لئے اپنا دماغ کریدتا رہتا ہوں۔ لیکن
خدا کی مار ہے کہ ایک لفظ بھی دھیان میں نہیں آتا۔ کچھ بھی
نہیں کہہ پاتا ہوں — اور دارنیکا اگر آدمی باقی لوگوں کے معیار
پر پورا نہ اترے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ کتنی سچی کہاوت ہے: "پگلی
کورے شخص جیسا کوئی بیوقوف نہیں ہو سکتا۔" اور پھر میں ان
کے لمحات میں کرتا بھی کیا ہوں۔ بس پڑا سویا رہتا ہوں۔ اور
پھر میں کر دوں بھی کیا؟ میرا خیال ہے مجھے کچھ اچھی بات کرنی چاہئے
مجھے خالی وقت میں کچھ لکھتے رہنا چاہئے۔ یہ مشق میرے لئے بھی
فائدہ مند ثابت ہوگی اور دوسرے بھی خوش ہو جائیں گے۔ اس سے
میرا وقار بڑھ سکتا ہے جان من۔ اور تم کیا اندازہ کر سکتی ہو کہ وہ
اس فن سے کتنی آمدنی بنا لیتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!
مثلاً داتا زین کی مثال لے لو۔ ایک صفحہ لکھ دینا اس کے لئے بہت
ہی معمولی بات ہے۔ وہ ایک روز میں پانچ صفحات لکھ سکتا ہے
اور جانتی ہو کہ اس کے معاوضے میں اُسے کیا ملتا ہے؟ تین سو روبل یہ
داتا زین ہی نے بتلایا ہے مجھے۔ اور اگر وہ کوئی ایسی کہانی لکھ دے
جس میں لوگ بہت زیادہ دلچسپی دکھائیں تو اُسے پانچ سو روبل بھی
مل جاتے ہیں۔ وہ انکار کر کے تو دیکھیں ہم اگلی بار ایک ہزار روبل
طلب کریں گے۔ وارداراً۔ اب اس مسئلے پر تم اپنی رائے
نہ دے بیٹھنا۔ بلکہ سن سوچو تو — فقط ایک نظم کے کچھ اشعار
اور پھر اس نے تو پوری کتاب لکھ رکھی ہے۔ سات ہزار روبل
اُس کی لاگت کتنا ہے۔ اندازہ تو کرو۔ یہ تو کسی جاگیر کی لاگت
ہو سکتی ہے۔ کسی محل کی قیمت ہو سکتی ہے۔ داتا زین کا کہنا ہے کہ
پبلشر پانچ ہزار روبل دینے پر آمادہ ہے لیکن اُسے منظور نہیں۔ یعنی

کا بکثرت مجموعہ ہے۔ اس کا خاوند اس کے ہاتھوں دکھی ہو کے
مرا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے خاوند
کو مار دیا تھا۔ شاید اس نے تمہیں خفا کر دیا ہو۔ نہیں جان من
مجھے یقین ہو جائے تم ملازمت نہیں کرو گی — یہ تو سوچو میں کیا
کروں گا۔ ارے میرے پاس کون رہ جائے گا۔ نہیں دلربا
بالکل نہیں۔ اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال کر باہر کرو۔ تم
مجھے اور عبیدہ کو کتنی خوشیاں عطا کرتی ہو اور تم ہم
دونوں کی کس قدر مشتاق ہو۔ بس جس طرح جی رہی ہو اسی
طرح جیو۔ کھاؤ پیو اور سو رہو۔ شوق پورا کرنے کے لئے
پڑھایا کرو یا سلائی کا کام کر لیا کرو۔ یا اگر سلائی بھی نہ
کرنا چاہو تو صرف کتابیں پڑھتی رہو۔ لیکن ایک بات سن لو
کہ تمہیں کہیں نہیں جانا۔ تمہارا در چھوڑ جانا کسی حق میں بھی
مفید ثابت نہ ہوگا۔ تمہیں جن کتابوں کی ضرورت ہوگی میں
خرید دوں گا۔ ہم دونوں سیر کرنے جایا کریں گے۔ لیکن عقل سے
کام لو۔ سمجھدار بنو اور ایسے پاگل پن کو دوبارہ دماغ میں مت لانا۔
میں تم سے ملنے آؤں گا اور شاید بہت جلد چلا آؤں۔

صاف صاف بات کر دینے پر مجھے معاف رکھنا لیکن میں
مجبور ہوں۔ یہ تو بڑی ذلت ہے۔ جان من بہت زیادہ
توہین ہے۔ میں پڑھا لکھا شخص نہیں ہوں۔ اور جیسی کہ کہاوت
ہے میں نے بھی بیچ دے کر تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن اس وقت
میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا میں فقط داتا زیت کے بارے
میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ عزیزم میری خطا معاف کرنا لیکن میں
اس کی طرف سے صفائی ضرور پیش کروں گا۔ وہ میرا دوست
ہے میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ صفائی پیش کئے
بغیر رہ سکتا ہوں۔ وہ اچھا لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے۔
درحقیقت اس مسئلہ میں میں تمہارے ساتھ متفق نہیں ہوں۔
وہ لفظ گندہ پیاسے میں لکھتا ہے اس قدر صاف زبان اور
اس کی نشست الفاظ اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ داد دینی ہی
پڑتی ہے۔ غالباً اسے پڑھتے وقت تمہارا دل کچھ میلا ہوگا۔
ممکن ہے تم ... کے ساتھ ناراض ہوگی یا اور ناخوشگوار
بات ہو گئی ہوگی۔ اسے دوبارہ پڑھنا۔ اچھا خاص

توجہ اور صحیح جذبے کے ساتھ پڑھنا ... کے طور پر پڑھتے
وقت منہ میں مصری کی ڈلی رکھ لینا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسے
کئی ادیب ہیں جو داتا زیت سے کہیں اچھا لکھتے ہیں۔ مانا کہ
وہ لوگ بہت اچھا لکھتے ہیں لیکن داتا زیت بھی اچھا لکھتا ہے۔
اگر اور لوگ اچھا لکھتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ داتا زیت
برا ادیب ہے۔ وہ صاحب اسلوب ہے۔ نئی بات کہتا
ہے اور یہ پہلو اس کے لئے اچھا ہے۔ خدا حافظ جانِ من
میں اور زیادہ اس وقت کچھ نہیں لکھ سکتا۔ آج میں بہت مصروف
ہوں۔ دیکھو مایوسی کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔ خدا تمہارا
نگہبان ہے اور میں بھی جو بیٹھا ہوں۔ تمہارا سچا دوست
ماکار

ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا۔ بھیجی کتاب کے لئے بہت بہت
شکریہ۔ میں پیکن کر پڑھوں گا۔ شام کے وقت میں تم سے ملنے آؤں گا۔
پہلی جولائی۔

میرے پیارے دوست ماکار

مجھے پورا یقین ہے کہ یہاں تمہارے درمیان رہ کر میری کوئی
زندگی نہیں۔ بار بار غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس پیش
کو ٹھکرا دینا سخت غلطی ہوگی۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ میں اپنے دو وقت
کی روٹی ہی کھاؤں گی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں ایک اجنبی خاندان کی
محبت جیتنے کے لئے پورا پورا احتیاط کروں گی۔ ضرورت محسوس ہوگی
تو میں اپنا کردار بدل ڈالوں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اجنبی ماحول میں
رہنا بہت مشکل ہوگا۔ انہیں خوش کرنا ہوگا۔ میری ذاتی زندگی بے بہرہ
رہے گی۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن شاید خدا میری مدد کریگا۔
میں تمام عمر اسی طرح شرمیلی بن کر گذارا نہیں کر سکتی۔ میری زندگی میں
ایسے کئی سانحات پہلے بھی تو گذرے ہیں۔ آخر بورڈنگ ہاؤس
کے ایام میں بھول تو نہیں گئی — مجھے ہر وہ اچھی طرح یاد ہے جب
میں گھر آ کر اودھم مچایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ جب امی جان مجھے ڈانٹ
دیا کرتی تھیں تو بھی میرا دل پھول کی طرح کھلا اور شگفتہ رہتا تھا
لیکن جونہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے میرے دل پر بھی اداسی
چھا جایا کرتی تھی۔ کیونکہ کل صبح نو بجے مجھے سکول پہنچنا ہوتا تھا۔ وہ
سکول جس کا ہر پہلو میرے لئے اجنبی تھا۔ جس کی سرد مہری اور سختی
مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اور استانی کا تصور میرے لئے

عذاب جاں کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں کئی بار بلک بلک کے رونا چاہتی رہی لیکن آنسو پی جاتی تھی۔ تاہم کبھی کبھار تنہا کسی گوشے میں جی بھر کے رو لیا کرتی تھی۔ کیونکہ جی میں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ بچوں کا ہی ادرست کہتے ہیں۔ لیکن فیصلہ یا سبق کے ڈر سے میں کبھی نہ روئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد کیا رہتی! جوں جوں وقت گذرتا گیا میں سکول کی اسی فضا سے مانوس ہوتی گئی اور جب سکول سے روانگی اور ہم جماعتوں سے رخصت لینے کا وقت آیا تھا تو میں اس دفعہ بھی سسکیاں لے لے کر روئی تھی۔

اور پھر یہ بھی تو مناسب نہیں کہ میں تم پر یا فیلڈ والا پر بوجھ بنی رہوں۔ اس خیال ہی سے مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ میں آج صاف صاف باتیں کہہ رہی ہوں کیونکہ میرے تمہارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے۔ کیا میں دیکھتی نہیں کہ بیچاری فیلڈ والا منہ اندھیرے اٹھ کر کام شروع کر دیتی ہے اور پھر سارا دن اتنی مصروف رہتی ہے کہ دم لینے کی بھی اسے فرصت نہیں ملتی۔ اور پھر تم تو جانتے ہی ہو کہ بڑھاپے میں آدمی کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا میرے منہ پہ یہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں ہیں کہ تم اپنی ساری آمدنی مجھ پر خرچ کر دیتے ہو؟ اب ذرا سوچو کہ تمہاری آمدنی کس قدر قلیل ہے اور میں تم پر کتنا بڑا ظلم کر رہی ہوں۔ تم نے تو خط میں لکھ دیا کہ میری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تم اپنے بدن کا گوشت تک اتار کے بیچ آؤ گے۔ اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ تم ایسا کر گذرو گے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت دلیر ہو۔ لیکن یہ سب کچھ تم اس وقت کہہ رہے ہو ——— جب تمہیں بونس ملنے کی امید بندھ چلی ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ اور کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں مستقل طور پر بیمار رہتی ہوں۔ جس طرح جی مار کر تم کام پہ لگے رہتے ہو میں اتنی محنت نہیں کر سکتی حالانکہ اتنا کام کرنے پر مجھے دلی خوشی ہوگی۔ اور پھر یہ بھی مصیبت ہے نا کہ ہر وقت کام بھی تو نہیں ملتا! پھر صبر سے کرنے کو رہ کیا گیا ہے؟ بس یہی کہ تم پر آس لگائے بیٹھی رہوں اور سب کچھ ضائع کرتی رہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تم دونوں کے کس کام آ سکتی ہوں۔ تم لوگوں کو میری اتنی کیا ضرورت ہے۔ میں نے آج تک تمہارے لئے کونسا اچھا کام کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتی ہوں۔ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو۔

لیکن جب میری قسمت ہی ایسی ہے تو کس کا کیا دوش! میں پیار کر سکتی ہوں۔ لیکن اس قابل نہیں کہ اس پیار کے بدلے کچھ کر سکوں یا کوئی اچھا کام کر سکوں تاکہ تمہاری مہربانیوں کا کچھ تو صلہ دے سکوں۔ خواہ مخواہ مجھے اپنے پاس مت رکھو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے ایک بار پھر غور کر لو اور اپنی آخری رائے سے مجھے آگاہ کر دو۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

وی ۔ ڈی

پہلی جولائی۔

وارنیکا! آخر کیا مصیبت ہے۔ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا ہے! بس تمہیں ذرا سی تنہائی ملی اور تم ادھر ادھر بے سر و پا سوچنے لگیں۔ کہ تمہیں یہ نہیں اچھا لگتا اور وہ نہیں ٹھیک لگتا اور سب کچھ بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔ میں ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ تم بے پر کی اڑاتی ہو! ہم سب ایک دوسرے کے مشتاق ہیں ——— ہل بیٹھتے ہیں ——— چین ہے ——— خوشی ہے ——— اور کیا چاہتے ہیں؟ اجنبی لوگوں میں جا کر کیا ملے گا؟ عزیزم اجنبی لوگوں سے تمہارا پالا پڑا نہیں۔ کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہوتے کیسے ہیں۔ میں ان کی خصلت سے واقف ہوں۔ رگ رگ پہچانتا ہوں۔ میں نے ان کی روٹی کا مزہ چکھا ہوا ہے۔ وارنیکا۔ وہ بہت برے لوگ ہیں۔ وہ بڑے زہریلے ہوتے ہیں تم اس قدر نیک نہیں رہ سکتیں۔ کیا ان کی نظریں کیا ان کی باتیں سبھی زہر بھرے نشتر ہوتی ہیں۔ اور یہاں ہمارے درمیان رہ کر تم اپنے آرام سے دن کاٹ رہی ہو جیسے گھونسلے میں کوئی ننھا سا پرندہ رہتا ہو۔ اگر تم اڑ گئیں تو سوچو تم پہ کیا بیتے گی۔ اور یہ غریب لوگوں کا دل چرا کے لے جاؤ گی کیونکہ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ بولو میں کیسے دن گذارا کروں گا؟ تم کہتی ہو کہ تم بیکار پڑی رہتی ہو ——— بیکار! کیا کہہ رہی ہو! ذرا سا سوچو کہ تم بیکار کیسے ہو! تمہارا اثر کس قدر خوش گوار ہے ——— مثلاً یہی دیکھو کہ اب میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور بے حد خوش ہوں۔ کبھی کبھی میں اپنے سارے جذبات خط میں قلمبند کر کے تمہیں بھیجتا ہوں اور پھر تمہاری طرف سے ان کا طویل جواب آتا ہے۔ میں تمہارے پہننے کے لئے اچھے اچھے کپڑے خرید سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں ایک ہیٹ بھی خرید دیا ——— اور پھر تم مجھ سے کوئی نہ کوئی کام کہہ کر

مزاج اور زندہ دل عورت ہے - اس سے ملنا ہی ایک خوشی کی بات - اس کا کہنا ہے کہ شہزادی بہت زبردست ادیب نواز اور ادب پرست ہے - بھئی کیا کہنے داتا زیت کے - بہت ہی قابل شخص ہے -

اچھا اب کوئی اور بات کرتا ہوں - میں تو یہ سب کچھ تمہاری دل لگی کے لئے لکھ رہا تھا - اچھا عزیزم خدا حافظ - آج میں نے جی کھول کر واہی تباہی بکی ہے - لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج میں بے حد خوش ہوں - ہم سب نے کل داتا زیت کے ہاں کھایا تھا - اور کچھ بدمعاشوں نے شراب بھی پی تھی - مجھے یہ سب کچھ لکھنا نہیں چاہیئے - لیکن تم مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھنا - یہ تو ہم مل بیٹھنے کا بہانہ ہے اور کچھ نہیں - میں کتابیں ضرور بالضرور تمہیں بھجوا دوں گا - ان دنوں پال ڈی کاک کی ایک کتاب ہمارے حلقے میں پڑھی جا رہی ہے - لیکن عزیزم وہ کتاب تمہارے مطلب کی نہیں ہے - تمہیں ایسی کتابیں تمہیں دور سے بھی نہیں دیکھنی چاہئیں - سننے میں آیا ہے کہ سینٹ پیٹرس برگ کے تمام نقاد اس کتاب پر برس پڑے ہیں - میں تمہارے لئے ایک پونڈ مٹھائی بھیج رہا ہوں - میں نے خاص تمہارے لئے خریدی ہے تاکہ تم مٹھائی کی لذت اٹھاتے وقت مجھے بھی یاد کرتی جاؤ - اور ہاں صرف ان کا رس چوسنا - انہیں دانتوں سے مت کاٹنا ورنہ دانت خراب ہو جانے کا خدشہ ہے - تمہیں کیا پھلوں کا مربہ اچھا لگتا ہے - اگر اچھا لگتا ہے تو مجھے لکھ بھیجو - اچھا ڈارلنگ خدا حافظ - خدا تمہارا نگہبان رہے -

تمہارا بہترین دوست
ماکار

۲۷ - جون -

میرے پیارے ماکار

فیڈورا کہتی ہے کہ اگر میں چاہوں تو کئی لوگ مجھے کام دینے کو تیار ہیں - اور مجھے بچوں کی دیکھ بھال کا کام اچھی اجرت پر مل سکتا ہے - تم مجھے صلاح دو کہ میں اس پیش کش کو قبول کروں یا نہ کروں - اگر میں یہ کام شروع کر دوں تو پھر میں تم پر بوجھ نہ بنی رہوں گی - کیونکہ اس ملازمت کے لئے پیسے بھی ملیں گے - لیکن دوسری طرف بھی ایک اور امر بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ کسی اجنبی گھر میں داخل ہونے کا تصور ہی مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے اور جو شخص مجھے ملازمت دینے کو تیار ہے وہ کوئی جاگیردار ہے - لیکن میں ڈر رہی ہوں کہ وہ میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہے گا اور میں اسے کیا کہوں گی ؟ علاوہ ازیں میں بالکل کسی جنگلی باشندے کی طرح ہوں - مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے - میں ان جگہوں کی عادی ہو جاتی ہوں جہاں مجھے زیادہ دیر رہنا پڑے اور پھر وہاں چاہے لاکھ مشکلات پیش آئیں میں گزارا کر ہی لیتی ہوں - یہ جگہ ایک تو یہاں سے کوسوں دور ہے اور پھر کون جانے کہ مجھے وہاں کیا کام کرنا ہوگا - ممکن ہے بچوں کی نگہبانی کرنی پڑے اور کوئی بھی کام نہ ہو لیکن بچوں کی دیکھ بھال کونسی آسان بات ہے بچے کس کے قابو میں آتے ہیں - اور پھر ان لوگوں نے گزشتہ دو برسوں میں دو دو استانیاں بدلی ہیں - ماکار خدا کے واسطے مجھے صلاح دو - کیا میں ہاں کر دوں یا انکار کر دوں ؟ تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آتے - ان دنوں تم نظر ہی نہیں آتے - صرف اتوار کے دن ملتے ہو یا چرچ میں مل جاتے ہو - تم بھی واقعی کسی جنگلی باشندے کی طرح ہو - بالکل میری طرح ہو - اور قریب قریب میں تمہاری ہم فطرت ہوں

ماکار - تمہیں مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں ہے - میں اکیلی بیٹھی بیٹھی کتنی اداس ہو جاتی ہوں - خاص کر کبھی کبھی شام کے وقت تو میں بالکل اکیلی ہوتی ہوں - تن تنہا بیٹھی رہتی ہوں - فیڈورا کہیں گئی ہوتی ہے اور میں بیٹھی بیٹھی سوچتی رہتی ہوں - میرے دل و دماغ میں پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میں سوچتی رہتی ہوں کہ کونسا واقعہ غم انگیز تھا اور کونسا واقعہ مسرت بخش - تمام مناظر ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں (بالکل یہی تصویریں ہوتی ہیں) اور امی جان سے متعلق جتنے واقعات یاد آتے ہیں اتنے دیگر واقعات یاد نہیں آتے - اور نہ جانے مجھے کیسے کیسے سپنے آتے ہیں - مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے - میں بہت کمزور ہو چکی ہوں آج جب میری آنکھ کھلی تو اچانک بے ہوش ہو کے گر پڑی تھی - کچھ عرصے سے مجھے بری کھانسی بھی آنے لگی ہے - مجھے یقین ہے کہ

میں جلد مرجاؤں گی۔ اور میرے مرنے کی کسے پرواہ ہے۔ میرے لئے کون روئے گا اور قبر تک میرے جنازے کے ساتھ ساتھ کون جائے گا۔ اور کونسی بڑی بات ہے کہ میری موت کسی اجنبی گھر میں ہو جائے۔ بالکل اجنبی جگہ پہ میں بسوں۔ میرے خدا زندگی کس قدر اداسیوں سے بھری ہوئی ہے

اور ہاں یار — تم ہر وقت مجھے مٹھائیاں اور بسکٹ کیوں کھلاتے رہتے ہو۔ میں سوچ تک نہیں سکتی تمہارے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ میرے عزیز دوست۔ اپنے پیسوں کو بچالو۔ میں نے ایک چٹائی کی سلائی اور کڑھائی کی تھی — فیڈورا اسے فروخت کرنے والی ہے۔ ابھی تک مجھے بینک نوٹ کی صورت میں پاس روبل پیش کئے جا چکے ہیں۔ میرا خیال ہے تم ابھی ایسے بجا دو گی۔ کم از کم مجھے اتنی توقع نہ تھی۔ تین روبل میں فیڈورا کو دے دوں گی۔ اپنے لئے ایک جمپری لوں گی۔ جیسے سیدھا سادہ ہوگا لیکن گرم کپڑے کا ہوگا۔ اور ہاں میں تمہارے لئے بھی ایک واسکٹ بناؤں گی۔ یہ واسکٹ میں اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی اور اچھے سامان سے تیار کروں گی۔

فیڈورا نے ایک کتاب خریدی ہے۔ اس کا نام ہے The Tales of Ivan Belkin میں یہ کتاب تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو اسے پڑھ لینا۔ لیکن خدا کے لئے اسے خراب یا گم نہ کر دینا یا اسے اپنے پاس زیادہ دیر رکھے رہنا۔ دو برس پہلے کی بات ہے کہ یہی کہانیاں میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی اور جب میں نے یہ کہانیاں اکیلے بیٹھ کر پڑھیں تو میرے دل پر گہری اداسی چھا گئی۔ اگر تمہارے پاس کچھ کتابیں ہوں تو میرے پڑھنے کے لئے بھیج دینا۔ ہاں وہ رتاذیت کوئی کتاب دے تو وہ نہ بھیج دینا۔ وہ تو فقط اپنی کتاب دے گا اور وہ بھی اگر کسی نے چھاپ دی ہو۔ مکار تم اس کی کہانیاں پسند کیسے کر بیٹھے۔ یہ وہ بہت ہی واہیات کہانیاں ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔ میں نے بھی آج بے شمار باتیں کی ہیں۔ میں جب کبھی اداس ہوتی ہوں تو اسی طرح بے مقصد اور بے معنی باتیں کرتی ہوں۔ یہ میرے درد کی اصل دوا ہے کیونکہ اس طرح میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ اچھا میرے دوست

تمہاری

دی۔ ڈی

۲۸۔ جون۔

میری ننھی فاختہ پیاری

اس طرح ناامید ہونے سے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ اچھا اچھا بتاؤ یہ اداسی۔ ہمت باندھو میرے فرشتے! تم ایسی باتیں سوچ کیسے سکتی ہو؟ نہیں جانِ من تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ تم بالکل بیمار نہیں ہو۔ تم تو چہک رہی ہو۔ تم تو ہشاش بشاش ہو۔ تم اس خوبصورت پھول کی طرح ہو جو ذرا سا پیلا ضرور ہے لیکن مہک رہا ہے۔ اور سپنے کیا دیکھتی رہتی ہو تم۔ کیا سوچتی رہتی ہو۔ بس۔ بری بات ہے یہ تو۔ تمہیں شرم آنی چاہئیے۔ ایسے خیالات اپنے دماغ سے جھٹک کر رکھ دو۔ دیکھو میں کتنی اچھی نیند سوتا ہوں۔ اتنا اچھی طرح سوتا ہوں کہ کوئی دکھ مجھے پریشان نہیں کرتا۔ میری طرف دیکھو ذرا اور اسکے دکھوں سے بے خبر ہو کے سو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خوش رہتا ہوں۔ چہکتا ہوں اور نوجوانوں کی طرح نوا ہوں۔ واقعی — میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ وارنیکا چھوڑو یہ اداسی — اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں جانتا ہوں تمہارے سر میں کیا خبط سمایا ہوا ہے۔ ذرا سی بھی بات تم پر اپنا اثر کر جاتی ہے۔ تم ہو کہ بیٹھی پریشان ہوتی رہتی ہو اور بے وجہ سوچتی رہتی ہو۔ دیکھو تم ایسا نہ کیا کرو۔ میں اپنے پیار کا واسطہ دیتا ہوں۔ وہی اس ملازمت کی بات تو صاف انکار کر دو۔ نہیں نہیں نہیں ایسی بات بھول کر بھی دماغ میں لانا۔ میں حیران ہوں تم ایسی باتیں دماغ میں لاتی کیسے ہو۔ اور پھر وہ جگہ کتنی دور ہے یہ بھی تو دیکھو — نہیں میری گڑیا تم یہ ملازمت نہیں کرو گی۔ میں یہ بات کیسے برداشت کروں گا۔ میں اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کروں گا۔ میں اپنا کوٹ تک بیچ دوں گا صرف تمہیں پہنچو مت منظور کروں گا لیکن تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ کرنے دوں گا۔ نہیں وارنیکا۔ تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا ہے پھر بھی یہ حماقت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے یہ سب قصور فیڈورا کا ہے۔ یہ اسی بیوقوف اور جاہل عورت کی حماقت ہے جس نے تمہارے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہ کرنا۔ میرا کہا مانو — اس کے بارے میں ابھی بہت سی باتیں ہیں جو کا تمہیں علم ہے۔ وہ بالکل بیوقوف عورت ہے بات

کے لئے کہتی ہو۔ تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم بیکار ہو۔۔۔ اور پھر تمہ
را انسان تنہا کیا کرے گا۔ بتاؤ میں کس کام کا رہ جاؤں گا۔
وارنیکا شاید یہ باتیں تم سوچتی ہی نہیں۔ لیکن تمہیں سوچنا چاہیئے۔
اس پہلو سے سوچو کہ یہ بوڑھا آدمی میرے بغیر کیا کر سکے گا۔ تمہیں کو
پاکر میں جیتا ہوں اور اگر تم چلی گئیں تو پھر میرے کرنے کو ایک ہی بات
رہ جائے گی اور وہ یہ کہ نیوا پر جا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ پھر
میں جی کر کیا کروں گا۔ وارنیکا یوں نظر آتا ہے کہ تم مجھے کھاٹ پہ لٹا
ہوا دیکھنا چاہتی ہو اور پھر کچھ لوگ مجھے بھکاریوں کے قبرستان
کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے اور تم وہاں کھڑی دیکھو گی کہ وہ میری
قبر کو ریت سے بھر دیں گے اور پھر دیں مجھے بھول کر تم واپس چلی
آؤ گی۔ ایسا چاہنا بہت بڑا گناہ ہے۔ گناہ عظیم ہے۔ میں تمہاری
کتاب لوٹا رہا ہوں۔ اور عزیزم اگر تم میری رائے جاننا چاہتی
ہو تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ میں نے زندگی بھر اس سے اچھی اور کوئی
کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے ساری زندگی میں تین چار سے زیادہ
کتابیں پڑھی ہی نہیں۔ تمہاری اس کتاب میں سٹیشن ماسٹر کہانی
پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ایک عمر گذر جاتی ہے لیکن یہ احساس تک
نہیں ہوتا کہ پاس کوئی ایسی کتاب بھی پڑی ہے جو زندگی کی مکمل
داستان کو سیدھے سادے نقشے کی صورت میں بیان کر دیتی ہے۔
پہلے جو باتیں صاف نہیں ہوتیں وہ مطالعے سے نظر آنے لگتی ہیں۔
ان کے حل سوجھتے ہیں۔ یادداشت بڑھتی ہے۔ سمجھنے اور سوچنے
کی طاقت بڑھتی ہے۔ اور اس کتاب میں مجھے جو سب سے اچھا پہلو
نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ باقی کتابوں میں اس قدر چالاکی اور چابکدستی
سے کام لیا جاتا ہے کہ آدمی عمر بھر پڑھتا جائے لیکن اس کے پلے
ایک بات نہ پڑ سکے گی۔ میں فطرتاً ایسی موٹی عقل کا واقع ہوا ہوں
کہ ایسی لطیف اور بلند پایہ کتابیں میرے لئے نہیں لکھی گئیں۔
اور اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ پڑھتے وقت یوں محسوس
ہوتا ہے گویا میں نے خود لکھی ہو۔ جیسے میں باتیں کر رہا ہوں۔ اپنے
دل کی باتیں کہہ رہا ہوں۔۔۔ کچھ بھی کہا جائے ۔۔۔ یہ کتاب ہر
شخص کی اپنی داستان ہے۔ سچی بات میں اتنی دیر سے کہنا چاہتا ہوں۔
واقعی بہت ہی سلیس اور دلنشیں ہے۔ میں خود بھی ایسی کتاب لکھ سکتا
تھا۔ اور کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ کتاب کو پڑھتے ہی مجھے یہ احساس

ہوا ہے۔ بیچارے سیمسن وائرن کو جن حادثات کا سامنا کرنا پڑا تھا
کیا میں ان ہی حادثوں سے دوچار نہیں ہوا! خدا جانے ہم لوگوں میں
کتنے وائرن سسک سسک کے جی رہے ہیں۔ کون جانے
ہم تم میں کون وائرن ہے۔ میں تو قریب قریب رو دیا تھا کس طرح
وہ غریب شراب نوشی کا شکار ہوا۔۔۔ اتنی زیادہ شراب پینے لگا
کہ بے ہوش ہو کر سارا سارا دن چٹائی پر سویا رہتا تھا۔ اور جب
آنکھ کھلتی تو اپنی پھٹی ہوئی اور گندی آستین سے اپنے آنسو پونچھتا رہتا
اپنی بیٹی کی یاد میں رو رو کر برا حال کر لیتا۔ ہاں ۔۔۔ زندگی اسی کا
نام ہے۔ اس کتاب کو دوبارہ پڑھنا۔ یہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔
مجھ پہ یہ سب گذر چکا تھا۔ یہ تو ہمارے ماحول میں ہے۔ میں ہر
شخص کے چہرے پر اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں تم [illegible]
ہی کو لے لو۔۔۔ یا ۔۔۔ اس غریب کلرک کی زندگی دیکھ لو۔ کیا وہ
دوسرا سیمسن نہیں ہے۔ ہم سب بھی کچھ ہیں اور کوئی بڑی بات نہیں کہ
ہم سب کا ایک ایک انجام ہو بہو ویسا ہی ہو۔۔۔ اور کون جانے کہ بڑے
یا محلوں میں رہنے والے شہزادوں کا انجام بھی ایسا ہی ہو۔ ہاں
ان کی ٹھاٹھ باٹھ کی بنا پر اس انجام میں ہلکا سا فرق آ سکتا ہے۔ لیکن
صورت وہی ہوگی۔ میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ تم سمجھیں کہ نہیں۔
ہمیں چھوڑنے کے بارے میں تم سوچ کیسے سکتی ہو! وائرن جیسا
ردِ عمل میرا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اسلئے
کچھ عقل سے کام لو۔ اپنے دماغ میں ایسے واہیات خیالات کو پیدا ہی
ہونے دو۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دکھی مت
کرو۔ اور میری چڑیا سی جان یہ تو سوچو کہ دنیا کے اوچھے ہتھیاروں
اور ذلیل لوگوں سے تم اپنے آپ کو بچاؤ گی کیسے! اچھا بھول جاؤ
ایسی باتیں۔ اس کہانی کو بار بار پڑھنے سے تمہیں بہت کچھ ملے گا۔
اس کو جتنا پڑھو گی تمہاری اتنی بھلائی ہوگی۔

میں نے داماز لیف سے بھی اس کہانی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اپنی
بات پہ بضد ہے کہ یہ کہانی پرانے انداز میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
موجودہ زمانے کی تمام کتابوں میں تفصیلی تصاویر اور خاکے ہوتے
ہیں۔ ان کی بات میری کچھ سمجھ میں آئی نہیں۔ وہ یہ تو مان گیا تھا کہ
پشکن اچھا ادیب ہے اور وہ یہ بھی مان گیا تھا کہ پشکن نے روس
کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ دیکھو وارنیکا یہ کتاب بہت ہی

اچھی ہے - تم اسے بار بار پڑھو - اور پوری توجہ سے پڑھو - میری نصیحت پر عمل کرو - اور ایک بوڑھے آدمی کا کہا مان کر اسے خوش کر دو - خدا تمہیں اس کا پھل دے گا - میری نوازیکا خدا تمہیں ضرور اس کا صلہ دے گا -

تمہارا دوست
ماکار -

چھ جولائی -

میرے پیارے ماکار

آج فیڈورا نے مجھے پندرہ روبل لاکر دیئے — سب سکے چاندی کے تھے - اور جب میں نے اسے تین روبل دئے تو وہ بے حد خوش ہوئی - بیچاری فیڈورا یہ خط میں ذرا جلدی میں لکھ رہی ہوں - میں تمہارے لئے ایک واسکٹ تیار کر رہی ہوں - کپڑا بہت ہی نفیس ہے - کپڑا پیلے رنگ کا ہے - اور اس پر پھول کاڑھے ہوئے ہیں - میں تمہارے لئے ایک کتاب اور بھیج رہی ہوں - وہ بھی کہانیوں کا مجموعہ ہے — میں نے اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں - "سمر درس کوٹ" نام کی کہانی تم ضرور پڑھو - تم اصرار کر رہی ہو کہ میں تمہارے ساتھ تھیٹر ضرور ہی چلوں - کیا پیسے زیادہ خرچ نہ آجائینگے؟ اچھا یوں کرو کہ اگر ضرور ہی چلنا ہو تو پھر گیلری کے ٹکٹ خرید لینا - مجھے تھیٹر گئے ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ کچھ یاد نہیں - لیکن پھر مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ مفت کی فضول خرچی ہو گی - فیڈورا تو یہ کرنے کے انداز میں سر ہلا ہلا کر کہتی ہے کہ تم چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہے ہو - اور پھر یہ تو میں دیکھ رہی ہوں کہ فقط مجھی پر تم کتنا خرچ کر چکے ہو - مجھے ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چلتے رہے تو کسی دن بہت بھاری مصیبت آجائیگی - فیڈورا نے بتایا ہے کہ کرائے کے سلسلے میں مکان مالکن سے تمہاری کچھ لے دے بھی ہوئی ہے - ماکار — مجھے تمہارا بہت فکر لگا رہتا ہے - اچھا خدا حافظ - اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں - کام تو بہت تھوڑا سا ہے لیکن ہے ضروری — مجھے اپنے ہیٹ کا ربن بدلنا ہے -

اگر ہم تھیٹر گئے تو میں اپنا نیا ہیٹ پہنوں گی اور کالا سکرٹ پہن کر جاؤں گی - بہت اچھا رہیگا - ہے نا؟

سات جولائی -

میری پیاری واروارا -

میں نے کل اپنی بات جہاں سے چھوڑی تھی آج خط میں وہیں سے شروع کرتا ہوں - میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب میں بھی بے پروا نوجوان ہوا کرتا تھا - میرے دل و دماغ پر ایک ایکٹرس اپنا جادو کر چکی تھی - لیکن معاملہ یہیں تک نہیں تھا - حد تو یہ تھی کہ ایک بار تھیٹر میں دیکھنے کے علاوہ اور میں نے اس ایکٹرس کو کبھی نہیں دیکھا تھا - لیکن پھر بھی مجھے اس سے محبت تھی - والہانہ محبت - ان دنوں کچھ واہیات نوجوان میرے پڑوسی تھے اور میں صریحاً اپنی طبیعت کے خلاف ان کا دوست بن گیا - لیکن ان کے کارناموں سے میں ہمیشہ علیحدہ رہا تھا - ہاں — دوستی کے ناطے میں ان کی ہنسی مذاق میں شریک ہو جایا کرتا تھا - اس ایکٹرس کے متعلق مجھے انہی لوگوں نے بڑھ چڑھا کر باتیں بتائیں - اور ہر شام جب بھی کھیل شروع ہوتا تھا سات لڑکوں کا پورا گروہ گیلری کے ٹکٹ لے کر تھیٹر میں ڈٹ جاتا حالانکہ زندگی کی معمولی سے معمولی ضرورت پورا کرنے کے لئے ان کا پاس دھیلا نہ ہوتا - لیکن اس ایکٹرس کی خاطر وہ ہر شام وہاں جا پہنچتے اور پاگلوں کی طرح اندھا دھند تالیاں بجاتے اور چیخ چیخ کر اس ایکٹرس کا نام لے لے کر نعرے لگاتے - اور تھیٹر ختم ہونے کے بعد سونے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا - ساری رات ہر ایک شخص اپنی محبوبہ گلاشا کے بارے میں ہوائی قلعے بناتا ہم سب کے سب اس ایکٹرس کی محبت میں سر سے پاؤں تک گرفتار تھے - وہ مجھ سے بہت پہلے اس پر عاشق ہو چکے تھے اور پڑوسی ہونے کے ناطے سے اس جال میں مجھے بھی کھینچ کر لے گئے اور پیشتر اسکے کہ میں کچھ سمجھ پاتا میں نے اپنے آپ کو ان کے ہمراہ گیلری میں موجود پایا - جہاں مجھے کرسی ملی تھی وہاں سے پردے کا ذرا سا حصہ نظر آتا تھا لیکن میرے کان کسی طرح بھی اس سے محروم نہ رہے - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی آواز بہت ہی شیریں تھی - اس کی آواز ایسے تھی جیسے کہ گھنٹیاں بج رہی ہوں — جیسے کانوں میں شہد ٹپک رہا ہو - ہم اتنا چیخے کہ ہمارا گلا بیٹھ گیا - اتنی زور سے اور اتنی دیر تک تالیاں

جائیں کہا خود کھینے لگے اور اس قدر اودھم مچایا کہ تم میں سے ایک لال بھی دیا گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو یہ عالم تھا کہ پلے کچھ نہ تھا اور جیب میں صرف ایک روپیہ باقی تھا اور تنخواہ ملنے میں ابھی دس دن پڑے تھے۔ اور دارلنگ تم کیا سوچتی ہو۔ اگلی صبح دفتر پہنچنے سے پہلے ہی وہ روپیہ بھی میں نے خوشبودار تیل اور صابون خریدنے میں خرچ کر دیا۔ میں نے وہ تیل صابون کیوں خریدا اس کے بارے میں میں آج بھی کچھ نہیں سکتا۔ اس دن میں نے روٹی کھائے بغیر گذارا کیا۔ اور سارا وقت اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر گذار دیا۔ وہ تیسری منزل پر رہتی تھی۔ دفتر سے تھوڑی سی دیر میں گھنٹہ بھر آرام کرتا اور پھر تو گئی یہ اس کے گھر کے نیچے جا کھڑا ہوتا۔ پورا ڈیڑھ مہینہ مجھ پر یہی جنون چھایا رہا۔ کبھی کبھی بازار کے نکڑ پر میں ایک تیز رفتار تانگہ بھی کرائے پر کر لیتا تھا اور اس کی کھڑکی کے سامنے سے شہنشاہی جلال میں گذر جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا امبرا بال بال قرضے میں جکڑ گیا لیکن آخرکار اپنا جذن نوشنڈا پڑ گیا۔ درحقیقت میں اکتا گیا تھا دیکھتی جاؤ کہ ایک ایکٹرس ایک ایماندار شخص کو کس پستی تک اتار سکتی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ وہ میری نوجوانی کے ایام تھے۔

ایم۔ ڈی۔

آٹھ جولائی۔

میری پیاری دارلنگ۔

اس مہینے کی چھ تاریخ کو جو کتاب مجھے ملی تھی میں نے فوراً سے واپس کر دیا تھا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ اس کی وجہ بھی بیان کر دی تھی۔ عزیزم ــ ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے دینا کہاں کی شرافت تھی۔ خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کو زندگی میں وہ مقام عطا کیا ہے جسکا وہ مستحق ہے۔ کچھ لوگوں کو تقدیر نے جرنیلوں کے حکم کی تعمیل کے لئے بنایا ہے۔ کچھ وہ ہیں جنہیں پریوی کونسلر کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے کچھ حکم چلائیں گے اور باقی ان کی تعمیل کریں گے۔ اُن کے خوف سے تھر تھر کانپیں گے اور زبان پر ایک لفظ تک نہ لا سکیں گے۔ قدرت نے جس انسان کو جس درجے کے قابل سمجھا اسے بنا دیا۔ کچھ لوگ ایک کام کر سکتے تو کچھ لوگ دوسرا۔ اور یہ حکم خدا خود جاری کرتا ہے مجھے دفتر میں کام کرتے ہوئے آج تیس برس ہونے کو آئے میرے کام پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا ــ میرے رؤسا سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا اور کبھی کسی نے مجھے ہڑبونگ مچاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک شہری کی حیثیت سے جہاں میں اپنی خامیوں سے آگاہ ہوں وہاں خدا شاہد ہے کہ مجھ میں خوبیاں بھی ہیں۔ میرے افسر میری عزت کرتے ہیں حتیٰ کہ ہز ایکسی لینسی بھی مجھ سے خوش ہیں۔ اگرچہ انہوں نے میری کوئی خاص رعایت نہیں کی تاہم میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے خوش ہیں۔ میں اپنی عمر گذار کر بوڑھا ہونے کو آیا لیکن کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس سے میرا سر شرم سے جھک جائے یا میں اندر ہی اندر ہی ڈرتا رہوں۔ میرے کردار پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔ رہی بات معمولی خطاؤں کی تو ایسی خطائیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہر شخص دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ تم بھی یہ کوشش کرتی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات میں نے آج تک نہیں کی جس سے دوسروں کو نقصان پہنچا ہو یا کسی کی بے عزتی ہوئی ہو۔ میں نے کبھی قانون نہیں توڑا۔ کبھی امن کو خراب نہیں کیا۔ نہیں کبھی نہیں۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب تمغے کے لئے میرا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن ایسی بات کرنے کا کیا فائدہ۔ انصاف کا تو یہ تقاضہ ہے کہ تمہیں اس واقعہ کا علم ہونا چاہیئے تھا اور اس مصنف کو بھی۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے ہر بات کو بیان کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہی ہے تو اسے ہر بات جاننی بھی چاہیئے۔ دارلنگ ــ باقی لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ــ کم از کم مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔

تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بدقسمت گوشہ تنہائی میں بھی چھپ کر آرام سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ حالانکہ وہ صوف جیسے بھی روکھی سوکھی مل رہی ہے کھاتے۔ اس کے علاوہ خدا کا خوف کھائے ــ کسی سے زیادتی نہ کرے اور دوسروں سے فقط یہ توقع کرے کہ وہ اُس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ وہ اپنے کام سے مطلب رکھیں گے اور اس کے معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ آخر کسی کی ذاتیات کے بارے میں کسی کو جاسوسی کرنے کا حق کیا ہے۔ انہیں اس فکر میں گھلنے کی کیا مصیبت ہے کہ کسی کے پاس

وا سکٹ ہے یا نہیں - آیا کسی کے بدن پہ کپڑے ہیں یا نہیں اور آیا ان جوتوں کے نیچے تلا ہوا ہے یا نہیں ؟ انہیں یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی کیا کھاتا ہے - کیا پیتا ہے - جہاں سڑک خراب ہوتی ہے اگر میں وہاں اپنے جوتوں کو بچانے کے لئے پنجوں کے بل چلتا ہوں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــ کیوں اعتراض ہو ؟ کسی مصنف کو یہ تحریر کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ جو آدمی جی رہا ہے یہ فاقے کر رہا ہے ـــ یہ چار پیسے بغیر گذارا کرتا ہے - جب جاپنا زندگی کا فرض اوّلین ہو ؟ کیا میں بیٹھا اپنے پڑوسی کے نقص گنتا رہتا ہوں ؟ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایسی حرکت کبھی کی ہے ؟ تو پھر دوسرے کیوں ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں - میں وار وار لیس یہ پوچھنا چاہتا ہوں - کوئی آدمی لاکھ ایمانداری سے اپنا کام کرے - اسکے افسر اس کی لاکھ عزت کریں (تم جو چاہو کہو لیکن یہ سب سچ ہے) لیکن اچانک کہیں سے کوئی موقع شناس آ ٹپکتا ہے اور اس ایماندار شخص کو سب کی نظروں میں بدھو اور بے وقوف بنا دیتا ہے - اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ جو شخص بے وقوف بنایا گیا ہے وہ کبھی کبھار پہننے کے لئے نیا کپڑا بھی سلوا لے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس قدر خوش ہو کر رانس جاک جاک کے کاٹ دے - کم از کم میں تو نئے بوٹ پہنتے ہوئے ایسا ہی محسوس کرتا ہوں - ہاں ـــ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کیونکہ میں اپنے پاؤں سخت چمڑے میں محسوس کر کے خوشی سے پھولا نہیں سماتا - میں تسلیم کرتا ہوں کہ مصنف نے یہ باتیں حرف بہ حرف صحیح لکھی ہیں - لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی ہے کہ ہمارا افسر نیو ڈور ایسی کتابوں کے حق میں ہو - اسے تو ایسی کتابوں کے خلاف ہونا چاہیئے - اسے اپنے کردار کی حفاظت میں کچھ کہنا چاہیئے تھا - یہ ٹھیک ہے کہ وہ ابھی نیا اور نوجوان افسر ہے اور جیسا کہ کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے اسی طرح وہ ہمیں لعن طعن بھی کرتا رہتا ہے - لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ لعن طعن کیوں نہ کرے ـــ وہ ہماری مٹی کیوں پلید کرے - جو لوگ چھوٹے ہوتے ہیں نا اگر انہیں کبھی کبھار ڈانٹ پھٹکار ملتی رہے تو ان کے لئے اچھا رہتا ہے ـــ میں جانتا ہوں کہ بعض اوقات وہ یہ ڈانٹ پھٹکار محض اپنی افسری جتانے کے لئے بھی کرتا ہے لیکن میں پھر پوچھتا ہوں کہ وہ کیوں نہ کرے - ہمیں اپنے مقام کا احساس دلاتے رہنا اس کا فرض ہے -

اس کا فرض ہے کہ ہمیں خدا کا خوف دلاتا رہے کیونکہ وار نیکا میں صرف اپنی تمہاری بات کرتا ہوں کہ خوفِ خدا کے بغیر ہم ایسے ناچیز انسانوں کی قیمت ایک کوڑی بھی نہیں پڑ سکتی - اور ہم سب اپنی اپنی تنخواہوں پر گذر اوقات کرنے کی سوچتے ہیں - سوال کام کرنے کا نہیں ہے سوال تو تعلق ہے - اور چونکہ ہم سب کا جدا جدا مرتبہ ہے اور ہم سب اپنے سے چھوٹے آدمی کو کچلتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کچلنے کے انداز علیحدہ علیحدہ ہیں - اور یہ طریقہ کیسے بدل سکتا ہے - جان من دنیا کا دستور ہی یہی ٹھیرا اپنے اپنے انداز میں جو کسی سے بڑا ہے وہ اس کو کچل رہا ہے - اور اگر یہ رواج قائم نہ رہے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے - خدا کی تسلیم ٹوٹ جائے - مجھے واقعی حیرت ہے کہ فائیڈر عد ایسی گستاخی کو برداشت کر گیا -

اور پھر ایسی باتیں لکھنے سے حاصل کیا ہے ؟ کیا فائدہ ہوا کیا کتاب پڑھنے والا مجھے نیا کوٹ سلوا دے گا ؟ یا تنخواہ میں اضافہ کر دے گا ؟ وار نیکا ایسی کوئی کتاب نہیں ہونے کی - وہ یہ قصہ پڑھے گا اور مزید پڑھنے کے لئے اس کا اشتیاق بڑھے گا - اس کی طلب اور زیادہ بڑھ جائے گی - اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی فکر سب کو لگی رہتی ہے ـــ افواہوں اور سرگوشیوں کو لپیٹے آپ بچانے کے لئے کون احتیاط نہیں کرتا - رائی کا پہاڑ بنایا جا سکتا ہے اور پیشتر اس کے کہ تم جان سکو کہ کیا ہو گذر رہا ہے تمہارا پورا کنبہ کھلی کتاب کی طرح کسی کہانی میں پیش کر دیا جائے گا - تمہارا مذاق اڑے گا - لوگ انگلیاں اٹھائیں گے - اس کے بعد کوئی کس منہ سے کسی سے ملے ؟ ہر بات کو ہر واقعہ کو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ لوگ ہماری حالت سے ہمیں پہچان جائیں گے - اگر مصنف کتاب کے آخر میں ذرا عقل سے کام لیتا تو معاملہ اتنا نازک نہ ہوتا - بات اتنی نہ بڑھتی - اور اگر اس کردار کو آخر میں مار نہ دیا جاتا تو اور بھی اچھا ہوتا - مناسب یہی تھا کہ اسے اس کا کوٹ واپس دلا دیا جاتا - ایسی صورت پیدا کر دی جاتی کہ عالی جناب اسے اپنے دربار میں طلب کرتے اور پھر اس کی خدمات کے بارے میں تحقیق کر کے اسکو انعام اور تحفہ عطا کرتے تاکہ یہ سبق ملتا کہ انجام کار خوبی اور نیکی کی جیت ہوتی

سے اور بدی اور پستی کو سزا ملتی ہے۔ اگر میں لکھتا تو اسی طرح لکھتا۔ اور جس انداز میں اس نے کہانی کو بڑھایا ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟ ہماری روزمرہ زندگی کا مذاق اڑایا گیا ہے اسکے علاوہ اور ہے کیا؟ وارنیکا — تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے بھیج دی! بہت بری کتاب ہے یہ۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی جھوٹ ہے کیونکہ ایسا کوئی کلرک اس دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کتاب کے خلاف۔ احتجاج کرنا چاہیئے۔

تمہارا دوست
ماکار

۲۷ جولائی۔

مائی ڈیر ماکار

پچھلے دنوں سے کچھ باتیں ایسی ہو رہی ہیں اور تمہارے تین چار خطوں نے تو مجھے اتنا حیران کیا کہ میں پریشان ہو اٹھی۔ آخر فیڈورا نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ماکار اس قدر دکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے جتنی صفائی پیش کی ہے اس سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ اور میرا خیال ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ مجھے وہ ملازمت کرہی لینی چاہیئے تھی۔ حال ہی میں جو کچھ ہو گذرا ہے اس سے میں تو بہت ڈر گئی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ محض میری محبت کی خاطر تم نے مجھ سے اتنا کچھ چھپایا۔ اور ادھر میں تمہارے احسان تلے دبی جا رہی تھی حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ تم اپنے بنک کی جمع شدہ رقم مجھ پہ خرچ کئے جا رہے ہو۔ اب ذرا تم ہی مجھے بتاؤ یہ جان کر مجھ پر کیا گذر رہی ہے کہ بنک میں تو تمہارا ایک دھیلا نہ تھا اور تم میری حالت پہ رحم کھا کھا کر کئی مہینوں کی تنخواہ پیشگی لے کر خرچ کر چکے ہو۔ میری علالت کے دوران میں تم نے اپنا کوٹ تک بیچ دیا۔ اوہ میرے ناچار ماکار اب میں کیا کروں! دوستی اور محبت کے جذبے کے تحت اگر تم نے یہ سلسلہ شروع کیا ہی تھا تو تمہیں بہت پہلے اسے ختم کر دینا چاہیئے تھا۔ تمہیں عیش و عشرت کے مقامات پر یوں روپیہ برباد نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم ایک سچے دوست نہیں ہو! تم نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ اور اب جبکہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم آخری کوڑی تک کپڑوں، مٹھائیوں، سینما کی ٹکٹوں، کتابوں اور تفریح کے سامان پر خرچ کر چکے ہو تو اندازہ کرو کہ مجھے خود اپنی بےخیالی پر کس قدر اذیت ہو رہی ہو گی۔ (کیونکہ کیا میں نے تمہاری ضروریات کا خیال کئے بغیر یہ سب تحفے قبول نہیں کئے) تم نے مجھے خوشی پہنچانے کا جتن کیا اس کا انجام یہ ہوا کہ میں رنج و غم کے اتھاہ ساگر میں غرق ہو گئی ہوں۔ پچھلے دنوں سے میں تمہیں پریشان بھی دیکھتی رہی اور خود حیران بھی ہوتی رہی لیکن جب مجھ پر حقیقت کھلی تو میرے حواس باختہ ہو گئے۔ میں کسی اندرونی خوف سے کانپ رہی ہوں۔ ماکار — غضب خدا کا تم اپنے آپ پر مکمل اختیار کیسے کھو بیٹھے! لوگ کہیں گے؟ اور پھر میرے لئے یہ احساس کس قدر اذیت دہ ہے کہ تم ایسا متحمل، نیک اور شریف انسان اس علت کا شکار ہو جائے جس سے تمہیں تمام عمر نفرت رہی ہو۔ اندازہ کرو کہ یہ جان کر میرا کیا حال ہو گا کہ تم شراب کے نشے میں دھت پائے گئے اور پولیس نے تمہیں پکڑ پہنچایا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔ اور ویسے میرا دل کہتا تھا کہ چونکہ تم گذشتہ چار روز سے مجھے ملنے نہیں آئے لہٰذا کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی ہو گی۔ ماکار تم نے کبھی یہ بھول کے سوچا کہ اگر تمہارے افسران کو تمہاری غیر حاضری کی صحیح وجہ معلوم ہو جائے تو وہ کیا کہیں گے۔

تم خط میں لکھتے ہو کہ ہر شخص تمہارا مذاق اڑا رہا ہے اور سب لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا ہے جبکہ تمہارے پڑوسی بات بات میں منہ بنا کر میرا نام لیتے ہیں۔ ماکار — خدا کے لئے نہ انکی پروا کرو نہ اپنے آپ کو دکھی کرو۔ افسر کے ساتھ تمہارا جو جھگڑا ہوا تھا اس کی خبر سن کر میں بھی بہت فکرمند ہوں۔ خدارا اس کے متعلق مجھے مکمل کر کے بتاؤ۔ تم نے لکھا ہے تم یہی بات کہنے سے ڈر رہے ہو اور خاص کر اس بات سے ڈر رہے ہو کہ کہیں میری دوستی نہ کھو بیٹھو۔ تم لکھتے ہو کہ تم اس لئے مایوس رہے تھے کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میری مدد کس طرح کرو اور مجھے ہسپتال نہ داخل کرانے کی کیا صورت ہو۔ تم لکھتے ہو کہ تمہارا بال بال قرضے میں جکڑ چکا ہے اور کرائے کے مکان مالکن سے تمہاری شدید جھڑپیں ہوئی ہیں۔ ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے کہ تم اس سے زیادہ بری بات اور کیا کر سکتے تھے

کہ یہ سب کچھ مجھ سے چھپائے رکھا۔ خیر اب تو مجھے ہر بات کا علم ہو گیا ہے۔ آخر تم نے بات کھول ہی دی کہ تمہاری ہر آرزو کا سبب صرف میں تھی۔ لیکن تمہارے روپئے کو جان کر میرے دکھ دوگنے ہو گئے ہیں۔ میرے دوست ماکار تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ بدقسمتی اچھوت کی بیماری کی طرح ہے۔ ماکا ہم سب کو جو کہ غریب اور مصیبت زدہ ہیں ایک دوسرے کے نزدیک نہ پھٹکنا چاہیئے۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے دور دور رہنا چاہیئے۔ تم نے اپنی زندگی میں جن آلام اور مصائب کا سامنا کیا تھا میں نے تمہیں انہی سے دوچار کرا دیا۔ اور یہ تصور میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

اب تو مجھے صاف صاف بتا دو کہ تم پر کیا بیتی، دو رتمہاری یہ حالت ہوئی کیسے! اور اگر ممکن ہو تو کوئی ایسی بات بھی بتا دو جس سے کچھ تسکین ملے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم سے یہ سب پوچھنا کیا میری خود غرضی نہیں ہے۔ لیکن تم نے میرے دل میں اس طرح گھر کیا ہے کہ تمہاری دوستی میرے دل سے کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔ خدا حافظ — میں بڑی بے چینی سے تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔ اور میرے بارے میں ایسا سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔

تمہاری مخلص دوست

وار دارا

۲۸ جولائی۔

میری انمول بچی وار دارا

اب جبکہ طوفان تھم چکا ہے گرد تھم رہی ہے اور میری زندگی پھر اپنی روش پر بہہ نکلی ہے تو لو سنو میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ کیونکہ تمہیں یہ فکر ہو گئی ہوئی ہے کہ نہ جانے لوگ کیا سوچیں تو سنو۔ مجھ پر یقین کرو کہ مجھے اس دنیا میں اپنی عزت سے بڑھ کر اور کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ اسی روشنی میں تم میری تمام مصیبتوں اور شکستوں کو دیکھو اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے افسران کو نہ ان باتوں کی خبر ہے نہ ہو سکتی ہے۔ بس — وہ آج بھی میری عزت کرتے ہیں اور پھر میری برائی ان کی نظروں میں مجھے اور بھی عزت کا مستحق بنا دیتی ہے۔ مجھے صرف ایک بات کی فکر ہے اور وہ ہے افواہیں پھیلانے والوں کی حرکات۔ تم نے جو دس روبل مجھے بھیجے تھے ان سے مکان مالکن کا تو منہ بند ہو چکا ہے اب میرے سر پہ اس کا کوئی کوڑا واجبی نہیں ہے۔ رہی دوسرے لوگوں کی بات تو وہ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔ اور ان لوگوں سے جب تک میں ادھار نہیں لیتا تب تک ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور عزیزم میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ تمہاری عزت مجھے اس زندگی میں سب سے زیادہ عزیز اور لائق احترام ہے۔ اور تمہاری پاکیزگی میری ان چھوٹی چھوٹی شکستوں کی بخوبی تلافی کر دیتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس طوفان کے پہلے تھپیڑے اب ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ تم مجھے خود غرض شخص اور جھوٹا دوست نہ سمجھو۔ اے میرے ننھے سے فرشتے میں تم سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دینے کا تصور بھی میرے لئے ناقابل برداشت عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا ہے اور میرے جو پہلے سے دوگنے ہو گئے ہیں لہذا اب میں اپنے کام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ کل میں جب البتان آئیوانوچ کے قریب سے گذر رہا تھا تو اس نے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ نہیں — میں اب یہ راز نہیں چھپاؤں گا کہ میں قرضے تلے پس چکا ہوں۔ اور میرے کپڑے بہت ہی خستہ حالت میں ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور میں التجا کرتا ہوں کہ تم ناحق پریشان نہ ہوتی پھرو۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے پچاس کوپک وصول کر کے میرے دل پر کیا بیتی۔ میں سینہ مسوس کر رہ گیا۔ میں خون کے آنسو رو دیا کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ کیونکہ اب یہ بڑھا بے وقوف تمہاری مدد نہیں کر رہا بلکہ ایک بے آسرا بچی میری مدد کر رہی ہے۔ فیڈورا واقعی قابل تعریف ہے کہ اس نے یہ رقم حاصل کر لی۔ لیکن جانِ من ابھی کچھ دیر تو کہیں سے پیسہ ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جونہی کوئی صورت نظر آئے گی میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر تو اس بات کی ہے کہ نہ جانے کیا کیا افواہیں پھیلیں گی۔ اپنے نرم و نازک ہاتھوں پر میری طرف سے بوسہ لو۔ میں اور زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ مجھے دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ مجھے گذشتہ فروگذاشت کی تلافی کرنی ہو گی۔ آج شام میں باقی ساتھا کے بارے میں لکھوں گا کہ افسران حضرات سے میرا جھگڑا کیسے ہوا۔

تمہارا دوست

ماکار

۲۸ جولائی۔

وارنیکا۔

اب مجھے نہیں بلکہ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ یہ بات ساری عمر تمہارے احساس میں پھانس کی طرح کھٹکتی رہے گی۔ تمہارے آخری خط نے تو مجھے بالکل دم بخود کر دیا۔ میں ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا لیکن جب میں نے اپنا دل ٹٹولا تو دیکھا میں سراسر سچائی پر تھا۔ یہاں میں پچھلے گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا (انہیں تو بھلا دو۔ بہت ہو چکی) لیکن میں تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ صرف میں تمہارا آرزومند ہوں۔ اور تم ایسی ہستی ہے پیار کرنا کوئی نازیبا بات نہیں ہے۔ اگر تمہیں ایک بار احساس ہو چکا کہ مجھے تم سے کتنا پیار ہے تو تم ایسی باتیں ہرگز نہ لکھو جن سے مجھے دکھ پہنچے۔ اور تم اپنے دل سے کچھ نہیں کہہ رہیں۔ یہ تمہارا دماغ ہے جو تمہیں ایسی باتیں لکھنے کے لئے اکساتا ہے۔

اگر انصاف سے سوچا جائے تو مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آرہا کہ میرے اور ان افسران حضرات کے درمیان تلخی کیسے پیدا ہوئی۔ بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں خاصہ پریشان رہا ہوں۔ پورا مہینہ بھر میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں لٹکا رہا ہوں۔ اس کو سے زیادہ کیا کہوں کہ زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دل کا حال تم سے چھپایا۔ اپنے پڑوسیوں سے چھپایا لیکن وہ مکان مالکن تو چڑیل ہے چڑیل۔ لیکن میں نے اس کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دیا اور من ہی من میں سوچ لیا کہ اسے بھگا دوں۔ وہ جی کھول کر بکنے لگی۔ اول اول تو اس نے اور طرح ذلیل کیا لیکن نہ جانے اسے ہمارے خطوں کے بارے میں کیسے علم ہو گیا۔ بس پھر کیا۔ پھر تو اس نے وہ واہی تباہی بکی کہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دوسروں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کی بجائے اپنے کان کھڑے کر لئے ــــ اب میں کیا کہوں ــــ اب بھی اس یاد سے میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

وارنیکا۔ اس مصیبت کے طوفان نے مجھے تو قریب قریب ختم ہی کر دیا تھا۔ اور اس پہ ستم یہ کہ تم بھی اس توہین کا شکار ہو گئیں۔ فیڈورا بتا رہی تھی کہ کسی ذلیل شخص نے تمہاری بھی بہت توہین کی تھی۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہوگا۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کیونکہ یہ واقعہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے سر پہ جنون سوار ہو گیا میں دیوانہ وار اس ذلیل انسان کے گھر کی طرف لپکا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں کیا کر گزاروں گا۔ لیکن میں تمہاری توہین کی خبر سن کر ضبط نہ کر سکا۔ مجھے بہت رنج ہوا تھا۔ اور ادھر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گلیاں اتنی گیلی ہو چکی تھیں کہ پاؤں اپنے آپ پھسل رہے تھے۔ مجھ سے زیادہ نہ بھاگا گیا تو دل پہ اداسی اور بھی گہری چھا گئی۔ میں اپنا ارادہ ترک کر کے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ پھسل کر دھڑام سے منہ کے بل جا گرا۔ اچانک میری ملاقات ایمیلا سے ہو گئی۔ ایمیلا بیچارہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اسے وہاں سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اور میں یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کی گذر اوقات کیسے ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں اسی جانب بڑھ گئے۔ لیکن وارنیکا ــــ تم اپنے دوست کے دکھ درد اور مصیبت بھری کہانی پڑھ کر کیا کرو گی۔ اس سے تین روز بعد ایک شام ایمیلا نے مجھے اس افسر سے ملنے پہ مجبور کر دیا۔ اس افسر کا پتہ مجھے ایک تانگے والے سے مل گیا۔ اب اس افسر کی سنو وہ بھی کچھ خبطی ہے۔ جب وہ ہمارے گھر میں رہتا تھا تو میں اس کی حرکات کو بغور دیکھا کرتا تھا۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ جب میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو مناسب لباس میں نہ تھا۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں کہ وہ کمرہ کئی افسران حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یا مجھے ایک ایک کی جگہ دو دو افسر نظر آرہے تھے۔ خدا جانتا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ میں نے وہاں کیا کہا تھا لیکن مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میرے منہ میں جو کچھ آیا تھا میں کہہ گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے کمرے سے باہر نکال دیا بلکہ دھکا دے کر سیڑھیوں سے لڑھکا دیا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے مجھے دھکا دے دیا اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے مجھے گھر سے باہر ضرور نکال دیا تھا۔ باقی تو تم جان ہی چکی ہو میں گھر کیسے پہنچا۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے وقار کو ٹھیس پہنچی تھی۔ لیکن کوئی غیر شخص اس واقعہ کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔ اور چونکہ اس واقعہ کو صرف تمہیں جانتی ہو لہٰذا میرے لئے یہ واقعہ ہو گزرا یا نہیں ایک ہی بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا وارنیکا؟ میں اس بارے میں کوئی دلیل پیش

نہیں کردیا کہ میں واقعی پستی پہ اتر آیا ہوں۔ ہاں میں پستی پہ اتر آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اور مجھے پختہ یقین ہے کہ خدا کو ایسا ہی منظور ہے۔ اس کا کیا کوئی ٹال سکتا ہے قسمت کے پھیر سے کوئی بچ سکتا ہے۔ بس وارنیکا میری ذلت یا مصیبت کی اتنی ہی داستان تھی۔ اور یہ داستان کچھ ایسی ہے نہیں کہ اسے پڑھا جائے یا اس پر غور کیا جائے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھ پہ ہمیشہ بھروسہ کر سکتی ہو۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار

۲۹۔ جولائی۔

میرے پیارے ماکا۔

میں نے تمہارے دونوں خط پڑھے اور سخت پریشان ہوئی۔ میرے بے بس دوست یا تم اپنی مصیبت بھری داستان کا کچھ حصہ چھپا رہے ہو۔ اچھا دیکھو — آج شام ہم لوگوں سے ضرور ملنے چلے آؤ ملنے ہی کیا۔ بلکہ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ۔ تم مجھے یہ بھی نہیں بتا رہے کہ ان دنوں تم اپنا گزارہ کیسے کر رہے ہو۔ اس مکان مالکن کا اب برتاؤ کیسا ہے۔ نظر آتا ہے کہ تم جان بوجھ کر چپ اختیار کئے بیٹھے ہو۔ اچھا۔ شام کو ضرور آنا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ تم شام کا کھانا یہیں کرنا۔ فیڈورا بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔

تمہاری وار وارا

میری اپنی وار وارا

تم خوش ہو۔ خداوند نے تمہیں توفیق عطا کی ہے کہ محبت کا صلہ محبت سے دو۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کیونکہ تم میں محبت کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ مجھے برا بھلا مت کہا کرو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے برا بھلا کہنے پر میں بھی تمہیں ڈانٹ پھٹکار سناؤں گا۔ نہیں۔ چلو اگر تم اسی بات پر بضد ہو کہ وہ گناہ تھا تو گناہ سہی۔ لیکن تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ مجھے واقعی صدمہ پہنچتا ہے۔ یوں خفا ہو کر مجھے ایسی جلی کٹی نہ سنایا کرو۔ میرا دل پہلے ہی بہت ستایا گیا ہے۔ غریب لوگ ویسے بھی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ پیدائشی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ یہ احساس پہلے بھی مجھے کئی بار ہوا ہے۔ غریب آدمی ہمیشہ شکی ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک پر اور ہر چیز کو بغور دیکھتا ہے۔ کنکھیوں سے دنیا کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا ہے کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں — شاید وہ یہ کہہ رہے ہیں — اور کیا زندگی ہے اس کی بھی — یہ بھلا کیا سوچے گا۔ یہ کسی کو کیا منہ دکھانے کے قابل ہے۔ اور وارنیکا اس بات سے کون واقف نہیں کہ غریب کی کوئی عزت نہیں — اس کی عزت کے دام کوڑیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ لوگ بک بک کیا کرتے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زمانہ اپنی صدیوں پرانی روش پر قائم رہا ہے اور رہے گا۔ اور کیوں نہ ہو؟ لوگ ایک غریب آدمی سے توقع رکھتے ہیں کہ ہر عذاب کو پی جائے۔ ہر ذلت کو برداشت کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تماشہ بھی بنے۔ سب کچھ سہے لیکن اس میں جذبات کی گہرائی نہ پیدا ہو۔ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہیئے جو اس کی نظروں میں تبرک کا مقام حاصل کر لے۔ رہا ذاتی عزت کا سوال — تو غریب کی ذاتی عزت نہیں ہوتی۔ کل ہی کی بات ہے ایمیلا مجھے بتا رہا تھا کہ اس کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ لیکن ہر دس کوپیک اکٹھے ہونے کے بعد سرکاری طور پہ تفتیش کی جاتی تھی اور اس کی ضروریات کو پرکھا جاتا تھا۔ چندہ دینے والوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک غریب آدمی کی عینک کے لئے پیسے دے رہے تھے۔ آج کل خیرات بھی عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ یا کون جانے کہ ازل سے اسی طرح خیرات دی جاتی ہو۔ یا خیرات دینے والوں کو یہ علم نہیں کہ اس کا صحیح طریقہ کیا ہے یا وہ پھر بہت زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو ہونا اسی طرح ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری باتوں سے متعلق ہم بہت کم واقفیت رکھتے ہوں لیکن اس پہلو کے بارے میں ہم اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ وہ واقفیت خود ہمارے حق میں اچھی نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ تجربہ یہ ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی شریف انسان ہمیں ضرور نظر آ جاتا ہے جو ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اپنے آپ سے یہ کہتا جاتا ہے —

"وہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کنگال کلرک آج رات کا کھانا کیسے کھائے گا؟ میں تو خیر بریانی اور پلاؤ کھاؤں گا اور یہ شخص شاید

اہلا ہوا گوشت اور وہ بھی یہی ممکن ہے کہ بغیر نمک کے کھاتا ہے۔

اسے یہ سوچنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ دارنیکا واقعی ہمارے ماحول میں اپنے شریف زادے موجود ہیں۔ یہ طبقہ اتنا بدمعاش واقع ہوا ہے کہ یہاں تک غور سے دیکھیں گے آیا ہم ٹھیک ڈھنگ سے زمین پر پاؤں رکھ رہے ہیں یا نہیں۔ کیا فلاں محکمے کے کلرک کا جوتا آگے سے پھٹا ہوا ہے یا اس کے کوٹ سے اس کی کہنیاں ننگی نظر آ رہی ہیں۔ پھر وہ گھر پہنچ کر اس واقعے کو کاغذ پہ اتارے گا اور اپنی اس بکواس کو کتابی صورت میں شائع کرا دے گا۔ ان نواب زادوں سے کوئی پوچھے کیوں حضرات آپ کو اس جانچ پڑتال کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میری کہنیاں کوٹ سے باہر نکلی ہوئی ہیں یا نہیں۔ دارنیکا۔ مجھے اس تلخ کلامی کے لئے معاف رکھنا لیکن ایک غریب انسان اتنا ہی شرمیلا اور حیا والا ہوتا ہے جتنی ایک نوخیز دوشیزہ۔ میرے گنوارپن کے لئے معاف کرنا لیکن تم اجنبی لوگوں کے سامنے کپڑے اتار کر نہیں کھڑی ہو جاؤ گی۔ بالکل اسی طرح ایک غریب شخص بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی امیر زادہ اس کے گھریلو ماحول یا اس کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کرے۔ اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے دشمنوں کے رویئے سے اتنا شدید گھائل کیوں ہو گیا تھا۔ انہوں نے میری شرافت اور میری عزت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

دفتر میں بھی۔ میں بالکل بے زبان جانور کی طرح سہما بیٹھا رہتا ہوں۔ اس خیال سے ہی میں زمین میں شرم کے مارے گڑ جاتا ہوں۔ پھٹی ہوئی کہنیوں یا ٹوٹے ہوئے بٹن دیکھ کر کیسے نہیں شرم آئے گی۔ لیکن بدقسمتی عجب دن دکھاتی ہے۔ آج میرے کپڑے جس قدر خستہ حال تھے شاید ہی پہلے کبھی ہوئے ہوں۔ حتیٰ کہ کوئی شخص کار لوچ بھی توجہ دیئے بغیر رہ سکا تھا۔ کسی دفتری بات کے دوران میں کہا اٹھا دیمی ماکر۔ خدا کے واسطے۔ لیکن پھر اچانک چپ ہو گیا۔ لیکن مجھ پر سارا ماجرا کھل گیا اور مجھے اس قدر شرم آئی کہ میرے گنجے سر پہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک طرح سے دیکھو تو بات کچھ نہیں غور کرو تو بہت کچھ ہے بلکہ سبھی کچھ ہے۔ کیا انہیں کسی بات کی خبر ہو گئی تھی؟ خدا نہ کرے ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے

ایک شخص پہ شک ہے بھی۔ جنہیں کسی کی بے بسی کا مذاق اڑانا ہوا نہیں کیا۔ وہ تو ایک دمڑی میں تمہاری نجی زندگی کے تمام راز بیچ دیں گے ان کے لئے کچھ بھی پاکیزہ نہیں ہے۔

اور میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ راتازیت کے علاوہ یہ کام اور کسی شخص کا نہیں ہو سکتا۔ ہماری منسٹری میں کسی شخص اس کی جان پہچان ہے اور اسی نے سب کچھ بتلا دیا ہوگا اور ممکن ہے کچھ بڑھا چڑھا کر ہی بتایا ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی منسٹری میں یہ بات کی ہو اور وہاں سے یہ بات ہمارے محکمے تک پہنچی ہو۔ میرے پڑوس کا بھی ہر شخص اس بات سے واقف ہے۔ میں نے انہیں تمہاری کھڑکی کی طرف اشارے کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جب میں رات کا کھانا کھانے تمہارے کمرے میں آیا تھا تو سب لوگ اپنی اپنی کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوتے تھے۔ مکان مالکن چڑیل کہ بوڑھے کو شرم بھی نہیں آتی ایک بچی پہ پردے ڈال رہا ہے اور اس نے تمہیں گالیاں بھی دیں۔ لیکن یہ سب باتیں راتازیت کی اس حرکت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی ایک کتاب کا کردار بنا کر پیش کیا اور ہر بات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا۔ اس نے اتنی زیادہ باتیں کی ہیں کہ کچھ خیرخواہ لوگوں نے مجھے آگاہ بھی کیا ہے۔ میں تو کچھ کر گزرنے کی حدوں تک اتر آیا ہوں آخر ہم کریں تو کیا؟ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہمیں سزا ملے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ وقت گزارنے کے لئے تم مجھے کتاب بھیجو گی۔ خیر لیکن کتاب کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر ایک کتاب ہوتی کیا ہے؟ بس یہی ادھر ادھر کی چہ میگوئیاں۔ ناول کس بلا کا نام ہے؟ بیکار لوگوں کا دل بہلانے کے لئے فضول کی بکواس۔ اور کیا! میں کیا یہ کچھ اتنے طویل تجربے سے بھی نہیں جان سکتا؟ لوگ جب شیکسپیئر کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جب آپ ادب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو شیکسپیئر کا ذکر بھی لازم ہے۔ تو تم یقین مانو کہ وہ بھی باقی کتابوں کی طرح واہیات اور بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ سب دوسرے پہ کیچڑ اچھالنے کی بات ہے۔

مکار

کہ میں اسے اجنبی نہ سمجھوں۔ یہ کہنے کے بعد وہ فیڈورا کو ایک طرف لے گیا اور اسے کسی بہانے سے کچھ روپے قبول کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ فیڈورا نے صاف صاف انکار کر دیا۔ آخر کار وہ جانے کے لئے اٹھا اور بولا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کے لئے آئے گا اور آتے ہوئے میرے لئے کانوں کی بالیاں لیتا آئے گا۔ وہ اب اس کی بدنیتی صاف نمایاں ہو چلی تھی۔ ماں نے مجھے بھی نصیحت کی کہ میں کسی اچھے مکان میں رہوں۔ اور پھر ایک بہت ہی اچھا مکان اس کی نظروں میں ہے بھی۔ وہاں رہنے کی مجھے کچھ لاگت بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اس نے ایک بار پھر کہا کہ میں اسے بے حد پسند آئی ہوں کیوں کہ میں بہت ہی ایماندار اور سمجھدار لڑکی ہوں اور اس نے تنبیہ کی کہ مجھے آوارہ گرد لڑکوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بالآخر وہ یہ کہہ بیٹھا کہ وہ اینا فیڈورونا کو بھی جانتا ہے اور اینا مجھ سے ملنے کے لئے بہت جلد یہاں آئے گی بھی۔ اب تو مجھ پر سب حقیقت واضح ہو گئی اور میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس درجہ غصہ آیا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے آپ کو اتنے غصے میں دیکھا۔ میں آپے سے باہر ہو گئی اور اسے صاف بتا دیا کہ میں اس جیسے لچے اور لفنگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ فیڈورا نے بھی اسے خوب جلی کٹی سنائیں اور ہم دونوں نے مل کر اسے قریب قریب دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ سب اینا کی کرتوت ہے۔ ورنہ اسے ہمارے بارے میں کیا خبر ہو سکتی تھی۔

ماکار۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ان حالات میں ہمارا ساتھ نہ چھوڑو۔ خدا کے لئے کہیں سے قرض لے لو کیونکہ ہمیں مکان تبدیل کرنا ہی۔ فیڈورا بھی میری رائے سے متفق ہے۔ ہمیں کم از کم ۲۵ روبل درکار ہیں۔ میں یہ پوری رقم واپس کر دوں گی۔ میں کماؤں گی۔ فیڈورا میرے لئے کام تلاش کرے گی۔ سود کی پرواہ مت کرو۔ جتنے سود پہ بھی ملے قرض لے لو۔ میں ایک ایک پائی چکا دوں گی۔ بس تم اس وقت میری مدد کر دو۔ ان حالات میں جب کہ خود تمہاری جان عذاب میں ہے تمہیں تکلیف دینا ایک حد تک ظلم ہے اور مجھے اس بات کا بہت رنج ہے لیکن تم میری واحد امید ہو۔ خدا حافظ ماکار۔ ذرا میرے دل پہ غور کرو۔ اور خدا کا نام لے کر قرض لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

وی۔ ڈی۔

میری پیاری وار وارا

ان اچانک اور غیر متوقع صدموں نے مجھے جڑ سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بدمعاش تو ہم لوگوں کے لئے سانس لینا بھی دوبھر کر دیں گے۔ مجھے اب چاہے موت کے گھاٹ کیوں نہ اترنا پڑے لیکن میں تمہارے لئے ضرور قرضہ حاصل کر لوں گا۔ لیکن واروکا۔ قرضہ مل جانے پر بھی تو میری موت یقینی ہے کیونکہ پھر تم مجھ سے دور بہت دور چلی جاؤ گی۔ اور میری زندگی ویران ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ غم گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ واروکا تم میرے ساتھ ایسا ظلم کیسے کر سکتی ہو؟ میں جانتا ہوں تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے اور تم بے حد دکھی ہو لیکن تم نے جہاں مجھے مدد کرنے کے لئے کہا ہے وہاں یہ لکھ دیا ہے کہ تم پائی پائی لوٹا دو گی۔ محنت کر کے کماؤ گی۔ یعنی تم اپنی صحت پر ظلم کرو اور اسے اور زیادہ برباد کرو گی! ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ آخر تمہیں یہ سب کچھ کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ میں اپنی حالت بھی بخوبی جانتا ہوں کہ اب میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہارے کام آؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ میں اور زیادہ کام کروں گا۔ میں ادیبوں کی تحریروں کی نقل اتارنے کا کام حاصل کر لوں گا۔ میں خود ان کے پاس جاؤں گا اور منت سماجت کر کے مزید کام حاصل کر لوں گا۔ تم نے لکھا ہے کہ میں سود کی پرواہ نہ کروں۔ بے فکر رہو اب مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے۔ میں کہیں سے بھی چالیس روبل کا انتظام کر کے رہوں گا۔ میرا خیال ہے یہ رقم کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ادھار دینے والے میرے وعدے کا یقین کر لیں گے؟ وعدہ کرنے کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میری شخصیت ایسی ہے کہ لوگ ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے قرض دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ ان چالیس روبل میں ۲۵ روبل میں تمہیں دے دوں گا۔ ۲ روبل مکان مالکن کے حوالے کر دوں گا اور باقی رقم سے اپنی ضروریات پوری کر لوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکان مالکن کو زیادہ پیسے دینے چاہئیں۔ وہ مطالبہ کرنے میں جائز بھی ہے۔ لیکن اگر تم اندازہ کرو تو تم پر یہ آسانی کھل جائے گا کہ میں اس سے زیادہ رقم دینے کے قابل نہیں ہوں۔ لہذا اس کا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔ کچھ پیسوں میں ایک نیا بوٹ خریدا جا سکتا ہے

میرا اپنا حال بھی اس قابل نہیں ہے کہ کل مجھے دفتر تک بھی پہنچا سکے۔ اندر پھر تیں۔ وہ تو نصف لازم ہیں۔ کہیں حضور انور نے مجھے پیوند والے کپڑے پہنے ہوئے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا کہہ بیٹھیں۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر میں قرض لینے میں ناکام رہا تو پھر کیا بنے گا۔ خدا ہی میری مدد کرے۔ میں دعا گو ہوں کہ مجھے کامیابی نصیب ہو۔

ماکار۔

۵ اگست

میرے معزز دوست

ماکار

اگر تم اسقدر مایوس ہو جاؤ گے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپیکس بھیج رہی ہوں۔ اس سے زیادہ رقم میں نہیں بھیج سکتی۔ اس سے صرف وہی اشیاء خریدنا جن کی تمہیں شدید ضرورت ہو۔ فیڈورا اور میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ ہم دونوں کل کیا کریں گی۔ یہ سچ ہے کہ یہ بہت ہی افسوسناک بات ہوتی ہے لیکن تم اپنے آپ کو تنہا پریشان نہ کرو۔ تمہیں روپیہ حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی نہ سہی لیکن تم سے جو بھی بن پڑا تم نے اتنا تو کیا۔ فیڈورا کا خیال ہے کہ ہمیں یہیں رہنا چاہیے کیونکہ اگر وہ بدمعاش چاہیں تو ہمیں نئی جگہ پر بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن اگر آج نہیں تو کل۔ بہر صورت ہمیں اس جگہ سے تو اب جانا ہی ہے۔ میں اور زیادہ لکھتی لیکن میرا دل بجھ گیا ہے۔

ماکار۔ تم بھی عجیب کردار ہو۔ ہر بات تمہارے دل پر کتنی جلدی اثر کرتی ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو تم زندگی بھر خوش نہیں رہ سکو گے۔ میں تمہارے خط پوری توجہ سے پڑھتی ہوں اور مجھے یہ حقیقت صاف واضح ہے کہ تم بے وجہ پریشان ہوتے رہتے ہو۔ اپنی بساط سے باہر غم کھاتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم رحمدل ہو۔ میں کالو یہ کہوں گی لیکن میں آج کچھ نصیحت دینا چاہتی ہوں۔ اسے ایک دوست کی نصیحت سمجھنا۔ ماکار۔ تم نے

میرے لئے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لئے بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے تمہارے احسانات کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ میں تو تمہاری مصیبتوں کی وجہ بنی ہوں اور تم ہو کہ میری خوشیوں اور مصیبتوں میں بھی شریک ہوتے رہتے ہو۔ تم فقط میری محبت کے سہارے پر زندہ ہو۔ اور تم جو دوسرے لوگوں کے دکھ میں یوں شریک ہوتے رہتے ہو پھر کیا عجب ہے کہ تم کبھی سکھی نظر نہیں آتے۔ دفتر سے لوٹ کر تم جب کل شام ہمیں ملنے کے لئے آئے تھے تو میں تمہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ تمہارا چہرہ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ تمہارا رنگ اڑا ہوا تھا اور چال ایسی تھی جیسے زندہ لاش چل رہی ہو۔ آخر کیوں؟ محض اس لئے کہ تم قرضہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ بات مجھے بتاتے ہوئے ڈرتے تھے! بس! اور جب میں تمہیں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی تو تمہارے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جیسی بیتی گی سب لیں گے لیکن غم نہ کیا کرو۔ ماکار۔ کچھ ہوش سنبھالو۔ میں بھیک مانگتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو یہ مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ورنہ جیسے تم لوگوں کے دکھ میں گھلتے رہتے ہو تمہارے لئے زندگی جنجال ہو جائے گی۔ اچھا خدا حافظ میرے دوست۔ میرے بارے میں اتنا زیادہ نہ سوچا کرو۔

وی۔ڈی۔

۵ اگست

میری ننھی فاختہ واربنکا

اگر تم کہتی ہو کہ قرض نہیں ملا تو گھبرا نے کی بات نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر میں بہت خوش ہوں۔ اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اب مجھے یقین آیا اور مجھے ایک سچی خوشی کا احساس ہوا۔ اور مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ تم یہیں رہو گی۔ اگر اپنے دل کی بات کہوں تو تمہارا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ تم میرے جذبات کی کتنی قدر کرتی ہو۔ میں یہ سب باتیں کسی غرور یا فخر کے ساتھ نہیں کر رہا بلکہ اس جذبے سے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ مجھے اپنا دل کمزور نہیں کرنا چاہیے۔ بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ کسی بھی آدمی کا دل کمزور نہیں

ہونا چاہیئے۔ لیکن جہاں تک میرے دماغ پر تو بوٹ کا تصور سوار
ہے کل تک اگر نئے جوتے نہ لے سکا تو دفتر کیسے پہنچوں گا۔ کوئی
ایک مشکل تھوڑے ہی ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے غم جان کا روگ
بن جاتے ہیں۔ اور میں اپنے لئے دکھی نہیں ہو رہا۔ مجھے اس بات
کی پرواہ نہیں ہے کہ میرے پاس بوٹ ہے یا نہیں۔ میں تو زبردست
گھر میں بھی ننگے پاؤں اور بغیر آستین والی قمیض پہن کر چل
نکلوں گا۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اپنی عمر گزار بیٹھا لیکن اگر
لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو وہ کیا کہیں گے۔ میرے
دشمن نہ جانے کیسی کیسی افواہیں پھیلائیں گے۔ بس یہی وجہ ہے
کہ آدمی بوٹ اور کوٹ پہنتا ہے۔ وارنیکا میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہو گی
کہ میری عزت اور نیک نامی کو بچانے کے لئے نئے جوتے بہت
ضروری ہیں۔ پھٹے جوتوں میں آدمی نہ جانے کیا کیا سوچتا ہے۔ مجھ
پر یقین کرو۔ یہ باتیں میری عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ اپنا [illegible]
باتوں پر کان نہ دھرو بلکہ ایک بوڑھے آدمی کی بات کا یقین نہ کرو۔
لیکن میں نے ابھی یہ تو بتلایا نہیں کہ آج کیا گزری۔ آج صبح
جو کچھ میں نے برداشت کیا ہے اگر کوئی اور ہوتا تو پورا سال روتا
رہتا۔ میں صدا میرے اٹھ کر چل دیا تاکہ اس سے پہلی مل لیں
دفتر بھی دیر نہ ہو جائے۔ رات کی بارش ہو رہی تھی اور جگہ جگہ
گڑھے تھے۔ میں اپنے کوٹ میں لپٹا ہوا چلا جا رہا تھا اور دعا
مانگ رہا تھا۔۔۔

رب کریم میرے گناہ بخش دینا۔ میری دعا سن لو۔
بس اب کی بار میری دعائیں قبول کر لو۔۔۔"

جب میں ایک چرچ کے سامنے سے گزرا تو ذرا جھک
کر سجدہ بجا لایا اور بار بار دل میں کہتا گیا گنہگار کے گناہ بخش دو۔
میری مصیبتوں کو کاٹ دو۔ لیکن مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ
کہ خدا سے اس طرح شرطیں نہیں باندھی جاتیں۔ بس اسی دھن
میں چلتا گیا۔ میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے آس
پاس کی کسی چیز کی سدھ بدھ نہیں اور راستے میں جو کچھ آتا تھا میں
اس سے گھبراتا نہیں۔ گلیاں سنسان نہیں اور اگر کوئی اکا دکا
راہگیر گزرتا تو وہ بھی میری طرح اپنے خیالات میں غرق گزر جاتا
تھوڑی ہی دور آگے جا کر مجھے کچھ مزدور نظر آئے اور ان پر نظر [illegible]

نے اس بارش میں مجھے اچھی طرح دھکے دیئے۔ میں گھبرا اٹھا
اور تیز تیز چلنے لگا۔ جونہی میں [illegible] پر پہنچا تو میرے جوتے
کا تلا بالکل جواب دے گیا۔ اور ایک قدم بھی اٹھانا میرے
لئے مشکل ہو گیا۔ عین اسی وقت سامنے سے میرا مولائی
چلا آ رہا تھا۔ وہ جونیئر کلرک سے بھی نچلے درجے کا نقل نویس
ہے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لئے ذرا سا رکا۔ اور پھر میرے پیچھے
پیچھے یوں چلنے لگا جیسے مجھ سے ایک روپیہ ادھار مانگنا چاہتا
ہو۔ میری صحت کی خیر مانگنے کے لئے۔ "کیوں نہیں۔ کیوں
نہیں" میں نے سوچا۔ "میری صحت کی خیر کیوں نہ
چاہو۔" میں جب اور نہ چل سکا تو ذرا سا سستانے کے لئے
رک گیا اور پھر چل پڑا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خیالات
آ رہے تھے۔ لیکن کوئی ایسا خیال نہ آتا تھا جو دیرپا ثابت
ہوا اور اسی ذہنی کشمکش کے عالم میں میں سیدھا ایک کیچڑ
بھرے گڑھے میں دھنس گیا اور میرے کپڑے اتنے گندے
ہو گئے کہ شرم کے مارے میرے آنسو نکل پڑے۔ آخر کار
مجھے کافی فاصلے پر ایک پیلا مکان نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ
کوف کا یہی گھر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایمیلان نے اسی جگہ بتلایا تھا
حالانکہ مجھے پورا یقین تھا لیکن میں اپنے حواس اس قدر کھو بیٹھا
تھا کہ میں نے ایک چوکیدار سے پوچھ ہی لیا۔ "کیوں دوست
یہ کس کا مکان ہے؟" اس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا۔ "
یہ مارکوف کا گھر ہے۔" میں تین بار گھر کے سامنے سے ہو کر گزر گیا لیکن
مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اندر چلا جاؤں۔ میرے دل میں ہوک سی
اٹھتی تھی۔ "وہ مجھے ادھار نہیں دے گا۔ ہرگز نہیں دے گا
میں ایک مریل سا اجنبی شخص ہوں۔ پھر حلیہ کیا بنا رکھا ہے اور معاملہ
بھی ایسا ہے۔" لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیا
جائے۔ آخر وہ لوگ مجھے کھا نہیں جائیں گے۔ میں نے آہستہ سے
دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ لیکن اب مصیبت پر مصیبت
کھڑی ہو گئی۔ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی کتے کا پلا زور سے
بھونکتا ہوا میرے سامنے ناچنے لگا۔ اب تم جانو کہ یہ ایسی چیز ہے کہ
بڑے بڑوں کے ہوش اڑ جائیں۔ میں سہمے ہوئے ابھی ڈیوڑھی تک
ہی پہنچا تھا کہ ایک [illegible]

مرغی جو دودھ کے مرتبانوں سے دو دو ہاتھ چھلانگ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبان
لڑھک بھی گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا
لیا۔ " یہاں کیا لینے آئے ہو۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو۔" اور وہ نہ
جانے کیا کیا کہہ گئی۔ وادنیکا۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں
کہ جب بھی کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہے تو مجھ پر ایسی ہی بیتی ہے۔ میری
قسمت ہی ایسی ہے۔ اس کی چیخ پکار سن کر مکان مالکن آ گئی۔ میری تو
سٹی جان بھی خشک ہو گئی۔ لیکن میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کیا
مارکوف یہیں رہتا ہے۔ وہ بولی۔ " یہ مارکوف کا مکان نہیں ہے" لیکن
اس نے مجھے ایک نظر اچھی طرح دیکھا اور مجھے نظر آیا کہ اس نے اپنا
ارادہ بدل لیا ہے کیونکہ اس نے میری آمد کا مقصد پوچھا۔ میں نے بتایا
کہ مجھے ایمیلان نے بھیجا ہے۔ اور میں نے اس عورت کو سارا ماجرا کہہ
سنایا۔ اس نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ اس کی بیٹی لمبے قد کی تھی اور
وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آ پہنچی۔ " ابا جان کو بلا لاؤ۔ وہ اپنے
کرایہ داروں سے باتیں کر رہے ہیں۔" پھر مجھ سے مخاطب
ہوئی۔ " اندر تشریف لائیے۔"

کمرہ کافی حد تک تنگ و تاریک تھا۔ دیواروں پر فریم لٹک رہے تھیں۔ زیادہ تصویریں فوجی جرنیلوں ہی کی تھیں۔
ایک صوفہ تھا۔ ایک گول میز تھی۔ اور کرسی چیزیں پڑی تھیں۔
میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آج واپس چلے جانے ہی میں بھلا
ہے اس لئے واپس چلے جاؤ۔ کل پھر آ جانا۔ موسم بھی اچھا ہو گا۔
دودھ کے مرتبان بھی نہیں لڑھکیں گے۔ اور میں نے دروازے
کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ چھوٹے
قد کا بوڑھا سا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح ہر چیز کا جائزہ
لے رہی تھیں۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا اور ایک سنہری
دھاگا باندھ رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا کہئے۔ " آپ
کو کیا چاہیئے۔" میں نے ایمیلان کا حوالہ دیا۔ اور پچاس روبل
کی ضرورت بیان کی اور اپنا دکھڑا سنایا۔ لیکن اس کی نظروں سے
مجھ پر کھل گیا کہ یہ تاکامی ہوئی ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
وہ بولا۔ " تمہیں روپیہ کیوں چاہیئے۔ اور میرے پاس کیا ہے
اور پھر تم ضمانت کے طور پر کیا پیش کر سکتے ہو؟" میں نے بتایا
کہ ضمانت تو میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ لیکن میں نے پھر ایمیلان
کا ذکر کیا اور پھر التجا کی کہ مجھے روپوں کی سخت ضرورت ہے۔"
تم بات بات میں ایمیلان کو کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ وہ کیا کہے
گا۔" " میرے پاس پیسہ ہی نہیں ہے۔" " یہ کیوں ہو گا۔ میں
تو بہت پہلے جانتا تھا۔" میں اپنے دل میں بس یہی کچھ کہہ سکا۔
وادنیکا کاش اس وقت زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا
میری ٹانگیں پتھر کی مانند بھاری ہو گئیں اور میرے جسم میں بجلی سی دوڑ
گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں میرے چہرے پر
جمی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہا ہو۔ " اچھا اب معاف کرو۔ جاؤ"
اور اگر یہ کاروباری بات چیت نہ ہوتی تو مجھے بہت پریشانی
ہوتی۔ (اس نے صاف پوچھا) " تمہیں روپیہ کس لئے چاہیئے۔"
میں نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے سننے کی زحمت
گوارا نہ کی۔ " نہیں۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے مجھے
سخت افسوس ہے۔" میں نے بار بار التجا کی۔ وعدے کئے
وقت پر رقم لوٹا دوں گا بلکہ یہ بھی کہا کہ وقت سے پہلے لوٹا دوں
گا۔ وہ جتنا سود لگائے مجھے منظور ہے۔ وہ جتنی رقم دے
سکتا ہے اتنی ہی دے دے۔ مجھے اس وقت تمہارا خیال آ رہا
تھا اور تمہارے اس آدھے روبل کا خیال آ رہا تھا جو تم نے مجھے
دیا تھا۔ اس نے پھر زور دے کر کہا۔ " نہیں۔ اور تم سود کی
کیا بات کر رہے ہو۔ تمہیں ضمانت کے طور پر کچھ پیش کرنا چاہیئے
بلکہ میرے پاس پیسہ ہے ہی نہیں۔ مجھے خدارا افسوس ہے۔"
وہ چور۔ وہ لٹیرا۔ خدا کا نام لے رہا تھا۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں گھر سے باہر کیسے نکلا۔ میں بہت
تھک گیا تھا۔ میرے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ میں
دفتر دیر سے پہنچا۔ میں نے چاہا تو تھا کہ برش سے کپڑے جھاڑ لوں
لیکن چوکیدار نے اجازت نہ دی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں برش
خراب نہ ہو جائے اور تم جانتی ہو کہ برش آخر کار دفتر کا مال تھا
سو تم نے دیکھا۔ دنیا کا بس چلے تو میرے جسم پر اپنے پاؤں پونچھ
دے۔ مجھے روپے کی کمی نہیں مار رہی۔ مجھے یہ سب کچھ مار
رہا ہے۔ یہ آرزو، یہ تمسخر، یہ مذاق اور اس پر اتنی [illegible]
خدا نہ کرے کہ کبھی حضور والا کے کانوں تک یہ بات پہنچے۔
مجھے نظر آ رہا ہے کہ میرے برے دن آ گئے ہیں۔ آج اور کچھ

تمہیں سوجھا تو میں نے تمہارے تمام گزشتہ خطوط ایک بار پھر پڑھ ڈالے۔ اچھا خدا حافظ۔

مالکار۔

ممکن ہے میں کل تم سے ملنے چلا آؤں۔ میں نے یہ واقعات مزاحیہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ تم ہنسو لیکن یوں ہو نہ سکا۔

۱۱۔ اگست

دارا دارا

لو بھی سب ختم ہو گیا۔ میں مٹی میں مل گیا۔ اور میرے ساتھ تمہاری عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ ہم دونوں کہیں کے نہ رہے۔ دیکھتے دیکھتے سب کیا دھرا دھڑام سے نیچے آ گرا۔ میری عزت میری نیک نامی خاک میں مل گئی۔ میں خود برباد ہوا اور ساتھ تمہیں بھی برباد کر بیٹھا۔ تمہاری تباہی کا میں ذمہ دار ہوں۔ دنیا والے مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ مجھے لعن طعن کر رہے ہیں اور مکان مالکن نے تو حد کر دی۔ اس نے بھرے مجمعے میں مجھے ذلیل کیا۔ اور ردا آنا زینت کے ہاں ایک دعوت ہو رہی تھی اس میں کسی شخص نے میرا ایک خط زور زور سے پڑھ کر سب کو سنایا جو میں نے تمہیں لکھا تھا۔ وہ خط میری جیب سے گر گیا تھا انہوں نے خوب پھبتیاں کہیں اور جی کھول کر ہمارا مذاق اڑایا۔ ان کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ میں غصے کے عالم میں کمرے میں داخل ہو گیا اور میں نے دانا زینت کو جی بھر کے برا بھلا کہا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور بولا کہ غدار اور دھوکے باز وہ نہیں میں ہوں۔ اس نے مجھے پراسرار شخص بتایا اور کہا کہ میں دوسرا نوشیں ہوں۔ اب سب لوگ مجھے مسٹر نوشیں کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بہت برا ہوا۔ وہ سب کچھ جان گئے۔ میرے تمہارے بارے میں۔ ذرا سوچو تو کہ غلام دین بھی گستاخ ہو گیا ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ پنساری کی دکان پر جا کر سودا خرید لائے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور بولا کہ اسے فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا "لیکن یہ کام کرنا تمہارا فرض ہے" "جی نہیں۔ بالکل نہیں" وہ بولا۔ "اور وہ اس لئے نہیں ہے کہ آپ کرایہ ادا نہیں کر رہے" میں ایک گنوار دیہاتی شخص سے یہ بات نہ سن سکا اور میں نے اسے بے وقوف کہہ دیا۔ جانتی ہو اس نے جواب میں کیا کہا۔ "بیوقوف آپ ہوں گے" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں ہے۔ میں نے چلا کر کہا "جاہل۔ احمق۔ نشے میں بکواس کر رہے ہو" اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "آپ کو میں نے کی نہیں پیا۔ بلکہ حضور کی جیب میں تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ پرسوں صبح ہوش میں آنے کے لئے ذرا گھونٹ بھی چڑھا سکتے۔ کیا آپ نے اس عورت سے دس کو پیکس نہیں مانگے تھے۔" اور وہ سمر گڑ گڑا کر لیکن اتنا کچھ کہہ کر بھی اسے صبر نہ آیا۔ بولا کیا کہنے آپ کی شرافت کے۔ خوب شریف آدمی ہیں۔"

سن لو دارشکا۔ اب ہماری اتنی بھی عزت نہیں رہ گئی۔ مجھے تو جیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں تو زندگی سے عاجز آ گیا۔ لوگ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے میں اچھوت ہوں۔ جیسے میں خانہ بدوش ہوں۔ کیا بدبختی ہے۔ مٹی میں مل گیا۔ ایسا برباد ہوا کہ تلافی نہیں ہو سکتی۔

ایم۔ ڈی۔

۱۳۔ اگست۔

بدقسمتی پہ بدقسمتی چلی آ رہی ہے میرے معزز دوست مالکار۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ تمہارا آخر کیا بنے گا؟ یا میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟ آج لوہے سے میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ لوہا آگ کی طرح جل رہا تھا۔ بس میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور مجھے جلا کر رکھ دیا۔ اب میں کیا کروں؟ میں تو کام کرنے کے قابل رہی نہیں فیڈورا تین روز سے بیمار پڑی ہے۔ میں اب سخت پریشان ہوں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپیکس بھیج رہی ہوں۔ بس ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اور نہ کر سکنے کا احساس رلانے کے لئے بہت کافی ہے۔ خدا حافظ میرے عزیز دوست! اگر آج تم ملنے چلے آؤ تو مجھے بڑا سکون ملے گا۔

۱۴۔ اگست۔

مالکار۔

تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا تمہارے دل میں خدا کا خوف بالکل نہیں رہا۔ تم مجھے پاگل کر کے چھوڑو گے۔ تمہیں شرم آنی چاہیئے کہ اپنے آپ کو یوں تباہ کر رہے ہو۔ ذرا اپنی عزت کا خیال کرو۔ تم ایک باعزت شخص ہو۔ تم ایسی حرکت کر گذرو؟ اگر یہ بات دفتر میں پھیل گئی تو کیا ہو گا؟ تم شرم کے مارے مر جاؤ گے۔ اپنے سفید بالوں کا لحاظ کرو۔ خدا سے خوف کھاؤ۔ فیڈورا کہتی ہے کہ اب وہ تمہاری مزید مدد کرے گی۔ اور نہ ہی میں کروں گی۔ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے کردار سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہاری بنا پر کتنا عذاب سہہ رہی ہوں۔ میں سیڑھیوں پر نہیں آتی کیونکہ جہاں ہر کی نظریں مجھ پر جمی رہتی ہیں اور طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شرابی کے پلے پڑ گئی ہے۔ اور جب لوگ تمہیں کندھوں پر اٹھا کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں تو لوگ مجھے سنا سنا کر کہتے ہیں۔ " لو بھئی اس کلرک کو کچھ لوگ پھر یہاں تک پہنچا گئے۔ " مجھے اتنی شرم آتی ہے کہ چیخ چیخ کے رونے کو جی چاہتا ہے۔ میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ میں یہاں سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ میں نوکرانی بن جاؤں گی۔ دھوبن کا کام کر لوں گی لیکن میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔

میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے ملنے چلے آؤ لیکن تم نہیں آئے میری التجاؤں اور میرے آنسوؤں کا تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں اس پہ حیران ہوں کہ تمہارے پاس پیسہ آیا کہاں سے؟ خدارا کچھ اپنا خیال رکھو۔ کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو۔ اور پھر کس وجہ سے؟ میں نے سنا ہے کہ تمہاری مکان مالکن نے تمہیں کمرے میں نہیں گھسنے دیا اور تمہیں رات برامدے میں گذارنی پڑی۔ توبہ توبہ۔ جانتے ہو جب مجھ تک یہ بات پہنچی تو مجھ پہ کیا بیتی ہو گی!

خدا کے لئے ہم سے ملنے کے لئے چلے آؤ۔ تمہیں یہاں خوشی ملے گی۔ ہم اکٹھے مل کر کوئی کتاب پڑھیں گے اور پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں گے۔ فیڈورا بھی متبرک مقامات پر جا چکی ہے وہ انکے بارے میں بتائے گی اور میرے عزیز دوست خدا کے لئے اپنے آپ کو یوں تباہ نہ کرو۔ میں صرف تمہارے لئے جی رہی ہوں۔

اور زندہ ہوں۔ صرف تم ہو کہ جس کی وجہ سے میں یہاں رہ رہی ہوں۔ باعزت شخص بنو۔ مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ غریب ہونا گناہ نہیں ہے۔ اور پھر تم اتنے مایوس کیوں ہوتے ہو؟ خدا سب کا نگہبان ہے ہماری مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن آدمی میں برداشت کا مادہ ہونا چاہیئے۔ میں تمہارے لئے بیس کوپیکس بھیج رہی ہوں۔ اس سے تمباکو خرید لو یا اور جس چیز کی تمہیں اشد ضرورت ہو وہ خرید لو لیکن میری قسم اس رقم کو غلط کی نذر نہ کر دینا۔ اور ہم سے ملنے ضرور آؤ۔ شاید عادت کے مطابق تمہیں ملتے ہوئے شرم آ رہی ہو گی لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیئے اس جھوٹے وقار کو ختم کر دو اور سچے دل سے پچھتاوا کرو۔ خدا پہ بھروسہ رکھو اور وہی سب کام ٹھیک کر دے گا۔

وی۔ ڈی۔

۱۹۔ اگست

میری پیاری جان جانا

سچ مانو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ اور اتنا نادم ہوں کہ اپنا منہ ہاتھوں میں ڈھانپ لینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اگر سوچو تو آخر ایسا بھی کیا بگڑ گیا ہے۔ کیوں نہ کبھی کبھی اپنے دل کو خوش کر لیا جائے۔ میں یہ بھول جاتا ہوں کہ میرے جوتوں کے تلے بالکل بے کار ہو چکے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو تلے تو گھسنے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی معمولی چیز۔ یہ بھی کہہ دو۔ ہیں تو جوتوں کے تلے ہی۔ اور یونانی فلسفی بھی ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ اگر یونان کے فاضل مدبران کے بغیر چل سکتے تھے تو ہم ایسے لوگ ان کے لئے اتنا پریشان کیوں ہوں؟ پھر لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں اور میرا مذاق اڑائیں۔ وہ میری توہین کیوں کرتے ہیں؟ عزیزم۔ کیا انہیں خط لکھنے کے لئے کوئی اچھا مضمون نہیں سوجھتا۔ اور میری طرف سے فیڈورا کو کہہ دو کہ وہ آفت کی پرکالہ ہے بلا کی بے درماں ہے اور پرلے درجے کی بے وقوف عورت ہے۔ رہا سوال میرے سفید بالوں کا تو عزیزم یہیں غلطی ہوتی ہے۔ جتنا تم کہتی ہو میں اتنا بوڑھا بھی نہیں۔ ایمیلا آداب عرض کرتا ہے۔ تم کہتی ہو کہ تم نے میرے بڑے دکھ برداشت کئے اور تم

روتیں ۔ اور میں یہ کہتا ہوں میں تمہارے لئے برباد ہو گیا۔ اور رو یا ہیں بھی اب اس کے سوا تے ہیں اور کیا کہ سکتا کہ خدا تمہیں اچھی صحت عطا کرے اور خوش رکھے ۔ رہا میرا سوال تو میں تندرست ہوں ۔

تمہارا دوست
ماکار

میری پیاری اور ناقابل قدر دوست وار وارا

میں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے کیونکہ گناہ کرنے سے پہلے بھی میں اپنے آپ کو کم گناہ گار محسوس نہ کرتا تھا ۔ اور اس گناہ کے احساس کے باوجود میں پھسل گیا ۔ سنو ۔ میں دل کا برا یا کمینہ آدمی نہیں ہوں ۔ تمہیں چوٹ پہنچانے کے لئے تو کسی جنگلی اور خونخوار چیتے کا جگر چاہیئے اور میرے سینے میں تو بھیڑ کا دل ہے اور تم جانتی ہو کہ ظلم کرنا میں نے نہیں سیکھا ۔ انجام کار میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قصور صرف مجھ اکیلے کا نہیں ہے ۔ میرے دل کا ، میرے دماغ کا ، میرے مزاج کا بھی کوئی قصور نہیں ۔ قصور کس کا ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ وہ تو ایک مبہم چیز ہے اس کا میں نام کیا لوں تم نے پہلے ہی مجھے جاڑے کے لئے کوٹ کیوں بھیجے ۔ بعد میں بیس اور ۔ میں بیٹھا اس رقم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا ۔ تمہارا ہاتھ جل چکا ہے ۔ تم کام کرنے ناقابل ہو گئیں ۔ ظاہر ہے کہ جلد ہی فاقے کرو گی لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم میرے لئے پیسے بھیج رہی ہو تاکہ میں تمباکو خرید سکوں ۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا کہ ایک بے آسرا بچی کی خون پسینے کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر کھاؤں ؟ میرا دل دھک سے بیٹھ گیا ۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں ۔ بیکار شخص ہوں ۔ اپنے جوتوں کے تلوں سے زیادہ بے کار ۔ میری نظروں میں میری کوئی اہمیت نہ رہی بلکہ اس کے برعکس میں اپنی نظر میں ذلیل ہوا ۔ جو ہی میں اپنی نظروں سے خود گر گیا تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے ۔ میں کسی قابل نہیں ہوں ۔ اور انہوں نے مجھے میرا زوال دکھایا ۔ جانتی ہو ۔ یہ قسمت تھی ۔ میں اپنے آپ کو ذرا تازہ دم کرنے کے لئے باہر نکل گیا اور پھر بات سے بات بڑھتی گئی ۔ قدرت بھی بے حد اداس تھی ۔ موسم سرد تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور راستے میں ایمیلاں مل گیا ۔ وہ اپنا سب کچھ گروی رکھ چکا ہے ۔ وار یکا اس کے پاس جو کچھ بھی تھا سب گروی رکھ چکا ۔ دو روز سے اس کے پیٹ میں ایک دانہ بھی نہ گیا تھا ۔ میں اپنی ضروریات کے ہاتھوں اتنا تباہ نہ ہوا تھا جتنا رحم کے جذبے سے مارا گیا ۔ بس یہاں سے میرا گناہ شروع ہوتا ہے ۔ ہم دونوں زور زور سے روتے اور ہم دونوں نے تمہیں بہت یاد کیا ۔ ایمیلا بہت اچھا شخص ہے ۔ اس کے سینے میں انسان کا دل دھڑکتا ہے ۔ نازک آدمی ہے ۔

میں اپنے بارے میں بھی تو یہی کچھ محسوس کرتا ہوں ——— یہی وجہ ہے کہ میری یہ حالت ہو گئی ہے ۔ میں چونکہ یہ باتیں محسوس کرتا ہوں اسی لئے تو مجھ پہ مصیبتیں آئی ہیں ۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ پہ تمہارے کتنے احسانات ہیں ۔ اور جب میں نے تمہیں جان لیا تو میں اپنے آپ کو اور اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوا ۔ میں نے اپنے آپ کو اور اچھی طرح جانا تو تمہیں اور زیادہ پیار کیا ۔ اور اس سے پہلے میں اس بھرے جہان میں اتنا تنہا تھا کہ جیا تو کیا محض سویا رہا ۔ ان دنوں لوگ کہا کرتے تھے کہ میرے تو چہرے پہ نحوست برستی ہے اور ان لوگوں نے مجھ سے اتنی نفرت کی کہ خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں جاہل ہوں اور مجھے بھی یقین ہو گیا کہ میں جاہل ہوں ۔ لیکن جب تم میری زندگی میں آئیں تو ایسے جان پڑا جیسے میری زندگی میں آسمان سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہو ۔ جیسے میری زندگی میں نور ہی نور ہو ۔ میرے تاریک وجود کو تم نے روشن کیا ۔ تم نے میرے دل ، میری روح کو روشنی عطا کی ۔ آخر مجھے اندر سے چین آ گیا اور میں جان گیا کہ میں باقی لوگوں سے زیادہ برا نہیں ہو سکتا ہے کہ مجھ میں شائستگی کی کمی ہو ۔ ممکن ہے ذہانت اور خوش اسلوبی کی بھی کمی ہو ۔ لیکن میرے دل و دماغ میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ میں انسان ہوں ۔ لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب میرا وہم تھا ۔ میری نظروں میں پھر میری کوئی عزت نہیں رہی اور نامرادیوں نے

مجھے بالکل ہی ڈھیر کر دیا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا ہی دیا ہے تو میری ایک التجا سن لو۔ میں ان روتی ہوئی آنکھوں سے التجا کرتا ہوں کہ دوبارہ اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ میں بہت تھک چکا ہوں — میں تھکا ہارا شخص ہوں — میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔

تمہارا سچا دوست
ماکار

۲ ستمبر

ماکار —

میں تیرا خط پڑھ رہی تھی — کچھ اور لکھنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں ایسے کئی لمحات آتے ہیں جب تنہا ہو کر مجھے خوشی ہوتی ہے — میں ان لمحات میں بے اندازہ خوش اور اداس ہو جاتی ہوں اور ایسا عالم میری زندگی میں بار بار آتا ہے۔ یاد کا ایک ایسا پہلو ہے جسے کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا — اور وہ پہلو کچھ ایسا ہے جو مجھے بے ساختہ طور پہ اس دنیا سے اتنی دور لے جاتا ہے کہ آس پاس زندہ لوگوں کے لئے میں پہروں بے خبر رہتی ہوں۔ اس وقت نہ اداسی ہوتی ہے نہ خوشی — میرے احساس پہ کوئی ایسا اثر نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنے احساس پہ کسی ایسے ہی تجربے کی پرچھائیں پڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر بچپن کے واقعات دل و دماغ میں گھوم رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ جونہی ایسا عالم ختم ہوتا ہے تو میں اتنی دل شکستہ ہوتی ہوں جس کا اندازہ نہیں۔ میں کمزور ہو جاتی ہوں۔ میری یہ بے خبری مجھے بری طرح تھکا کے رکھ دیتی ہے اور میں محسوس کر سکتی ہوں کہ میری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔

لیکن آج کی صبح بہت ہی پیاری اور دل خوش کرنے والی تھی۔ خزاں کے موسم میں ایسی صبحیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور اپنے آپ کو تندرست محسوس کر رہی ہوں۔ تو — خزاں شروع ہو گئی۔ ہائے — دیہات میں تو میں اس موسم پہ بھی جان سے قربان ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت میں بچی تھی لیکن مجھ پہ ہر چیز کا کتنا اثر ہوتا تھا۔ پہاڑیوں سے پرے ایک جھیل تھی — اور وہ جھیل میرے گھر سے کچھ ہی فاصلہ پر تھی۔ میں قریب قریب اسے اب بھی دیکھ رہی ہوں۔ جھیل بہت چوڑی تھی اور صاف شفاف تھی۔ بالکل شیشے کی طرح۔ اور جب شام چپ چاپ ہوا کرتی تھی تو جھیل کا پانی ہلنے تک کا نام نہ لیتا تھا۔ اور آس پاس کے درخت بھی چپ سادھ لیتے تھے۔ کسی پتے تک کے کھڑکنے کی آواز نہ آتی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی تھی۔ اور دور دور تک گھاس کی ننھی ننھی پتیوں پہ دبے پاؤں آ کر بیٹھ جاتی تھی — گھاس پھوس کے جھرمٹوں سے اچانک روشنی کی کئی لکیریں ابھر آتی تھیں اور مویشی اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بس ایسے وقت میں سب کی آنکھوں سے خود کو بچا کر جھیل کے کنارے آ پہنچتی تھی۔ میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔ میں پہروں بیٹھی آگ کے شعلوں کے اس عکس کو پانی پہ ناچتے ہوئے دیکھتی رہتی جو جھیل کے کئی کناروں پہ بھڑک اٹھتے تھے۔ یہ آگ مچھیرے سلگایا کرتے تھے۔ اور اوپر ٹھنڈے نیلے آسمان کو دیکھتی رہتی جو اس روشنی میں چاند کے ابھرنے تک ہلکا ہلکا سرخ نظر آیا کرتا تھا۔ اور ہواؤں میں سرسراتی تھی جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کسی پرندے کے پر ہلانے کی آواز، جھاڑیوں کی ذرا سی سرسراہٹ یا کسی مچھلی کی ڈبکی سے ابھرنے والی آواز سناٹے کی جان ہوا کرتی تھی۔ اور پھر دھند ابھرنی شروع ہو جاتی تھی اتنی تاریک اور پانی جیسی پتلی دھند اس تاریکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ دور کی تمام چیزیں دھندلی پڑتی چلی مٹ کے رہ جاتی تھیں۔ لیکن ایک ہاتھ پرے تک کی ہر چیز یوں نظر آتی تھیں جیسے کسی بت تراش نے بت تیار کر کے اتار رکھے ہیں مثلاً کشتیاں، پانی کا کنارہ، پانی میں کہیں کہیں خشکی والی جگہ، یا بھولی بھٹکی لکڑی کا تختہ یا پیلے پھولوں والی جھاڑیاں اور اس عالم میں کوئی چیز ہوتی تو اسی پہلو پڑی سوتی تھی۔ اچانک کوئی پرندہ اوپر سے شفاف پانی میں کسی مچھلی کے شکار کے لئے غوطہ لگاتا اور پھر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ جاتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی تھی۔ سب کچھ محسوس کرتی تھی، سب

کچھ سنتی تھی اور ایک عجیب حیرانی میں ڈوبی رہتی تھی — اس وقت میں بچی تھی۔

ہاں مجھے خزاں سے محبت تھی۔ خاص کر موسم خزاں کے آخری دنوں سے بے پناہ محبت تھی کیونکہ اس وقت فصل کاٹی جا چکی ہوتی تھی — سب کام ختم ہو چکے ہوتے تھے اور دیہاتی لوگ ایک دوسرے کے جھونپڑوں میں اکٹھے ہو کر موسم سرما کے بارے میں بات چیت کیا کرتے اور گایا بجایا کرتے تھے۔ پھر گھرے ہوئے آسمان کے تلے ہر چیز پر اداسی چھا جاتی تھی۔ سردی سی آ جاتی تھی اور ننگے جنگلات کے کناروں پر جھاڑیوں اور پھولوں کی پتیاں بکھری نظر آتی تھیں۔ اور دن بھر وہ کالی پڑتی جاتی تھیں — ان کا رنگ نیلا ہو جاتا تھا۔ خاص کر شام کو دھند چھا جانے کے بعد ننگے درخت دیوؤں کی طرح منہ پھاڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایسے بھی کئی لمحات آتے تھے جب میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھی اور پھر رات گئے گھر لوٹتی تھی — اور پھر اچانک مجھے احساس ہوتا کہ میں تو بالکل اکیلی تھی۔ بس میں ڈر کے مارے سہمے ہوئے گھر کی طرف بھاگتی تھی — میں خود بھی پتے کی طرح کانپتی اور مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ کسی بھی درخت کے کھوکھلے پن سے کوئی بھیانک چہرہ ابھر آئے گا۔ اور پھر تیز اور تند ہوا سارے جنگل میں پاگل اور وحشی کی طرح گھومتی گرجتی ماتم کرتی اور باقی کے رہے سہے پتے بھی اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیتی۔ پھر اچانک پنچھی اور پکھیرو غول در غول بے پناہ شور مچاتے ہوئے آسمان کو تاریک کرتے ہوئے بھاگ اڑتے اور میں اکیلی وہاں رہ جاتی — ڈر کے مارے میں سہم جاتی — میں اپنے من ہی من میں ایک آواز سنتی — "بھاگو — میرے بچے — بھاگو —" "یہاں تو قیامت آئی ہوئی — "بھاگو —" اور میں دم دبا کے بھاگ کھڑی ہوتی۔ گھر پہنچ کر میں دیکھتی کہ ہر طرف خوشی ہوتی اور ایک خاص ہی رہتا — ہم بچوں کو سبزی کاٹنے یا دوسرے کام پہ لگا دیا جاتا — اور ادھر گیلی لکڑی تڑاخ پڑاخ کرتی ہوئی انگیٹھی میں جلتی رہتی۔ امی جان ہم سب کو پیار بھری نظروں سے دیکھتیں۔ بوڑھی نرس اوکینا ہمیں بھولے بسرے زمانے کی باتیں بتاتی۔ جادوگروں اور پریوں کی کہانیاں سناتی۔ ہم ڈر کے مارے ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر اچانک سب پہ سناٹا چھا جاتا۔ کیا کسی نے دروازے پر تو دستک نہیں دی۔ لیکن ہاں! یہ تو بوڑھی فرولوشا کے چرخے کی آواز ہوا کرتی۔ پھر کتنے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ لیکن راتوں کو بھیانک اور ڈراؤنے سپنوں کے ڈر سے ہی نیند آتی تھی۔ میں آدھی رات گئے جی کڑا کر کے اٹھ کے بیٹھ جاتی اور پھر پو پھٹنے تک جاگتی رہتی تاکہ کہیں کوئی ڈراؤنا سپنا نہ آ جائے۔ لیکن اتنا جاگنے پر بھی جب صبح ہوتی تو میں پھول کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ دم ہوتی۔ میں کھڑکیوں سے باہر جھانک کے دیکھتی کہ سردی نے کھیتوں کی ساری ہریالی ختم کر کے رکھ دی ہے اور خزاں کی دھند باقی ماندہ سبزے کو چاٹ رہی ہے۔ جھیل کی سطح پر ہلکی ہلکی برف کی تہہ جم جاتی اور چاروں طرف پرندے خوشی سے چہچہاتے پھرتے۔ لیکن سورج کی گرم گرم کرنوں سے وہ برف کی پتلی سی تہہ آسانی سے پگھل جاتی۔ دنیا نکھر اٹھتی۔ خوشبو سے مسرور ہو اٹھتی۔ اور ہم گوشت صاف کرنے میں لگ جاتیں اور ایک بار انگیٹھی سلگنے لگتی — ہمارا کالو کتا — اگرچہ ابھی تک رات سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہوتا لیکن کمرے کی طرف دیکھ دیکھ کر امید بھرے انداز میں اپنی دم ہلاتا۔ اچانک کسی کسان کے چھکڑے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی۔ کوئی کسان ایندھن اکٹھا کرنے کے لئے جنگل کی طرف جا رہا ہوتا۔ کیا دن تھے وہ کہ ہم سب خوش تھے اور چین سے رہتے تھے۔

یہ یادیں مجھے رلا دیتی ہیں — ماضی کتنا روشن اور اچھا نظر آنے لگتا ہے اور اس کے مقابلے میں حال — اکتا دینے والا اور مایوس کن۔ اوہ خدا — جانے یہ پاپ کٹے گا۔ سنو۔ کیا تم اس بات سے واقف ہو کہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں اس خزاں میں مر جاؤں گی — مجھے پورا پورا یقین ہے — دیکھو تو میں کتنی بیمار ہوں — میں کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں — میں یہاں نہیں مرنا چاہتی۔ میں اس مٹی میں دفن نہیں ہونا چاہتی — حق ہے پچھلی بہار کی طرح میں دوبارہ بستر پہ پڑ جاؤں — تم جانتے

ہو کر میں پورے طور پہ تو اچھی ہو ئی ہی نہ تھی۔ اب بھی میں اپنے آپ کو بہت بیمار محسوس کرتی ہوں۔ فیڈورا آج سارا دن باہر رہی ہے۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ ہاں ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب مجھے تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے اور ہر وقت جی میں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی شخص میرے کمرے میں ہے۔ کوئی مجھ سے بات کر رہا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت بہت شدید ہوتی ہے جب میری بے خبری کے دورے ٹوٹتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اتنا لمبا خط لکھا ہے۔ جب میں لکھتی ہوں تو ڈر نہیں لگتا۔ اچھا خدا حافظ۔ اب تو مجھے خط ختم ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کاغذ بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ ہیٹ اور لباس تیار کرنے کے معاملے میں مجھے جو رقم ملی تھی اُس میں صرف ایک روبل اور وہ بھی چاندی کا باقی بچ رہا ہے مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی مکان مالکن کو چاندی کے دو روبل دے دیئے۔ اب کچھ دنوں کے لئے اُس کا منہ بند رہے گا۔

اپنے کپڑوں کو ترتیب دے کر رکھو۔ اچھا دوست خدا حافظ میں اتنی کمزور ہوں کہ بہت جلد تھک جاتی ہوں۔ ذرا سی کوشش کرنے پر تھک جاتی ہوں۔ ہانپنے لگتی ہوں۔ میں کام کرنے کے قابل تو رہی نہیں کام مل بھی گیا تو کروں گی کیسے؟ بس یہ خیال ہی تمام امیدوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بہت ہے۔

وی۔ ڈی

۵ ستمبر

پیاری وارنیکا

آج مجھے کئی باتوں کا تجربہ ہوا۔ پہلے پہل تو شدید سر درد رہا۔ سر درد کا علاج کرنے کے لئے میں نے سیر کرنے کا فیصلہ کیا اور فونتانکا کے کنارے دور تک سیر کی۔ شام بھیگی بھیگی تھی اور اندھیرا چھا چکا تھا۔ ان دنوں پانچ بجے کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن بارش نہ ہوئی تھی۔ لیکن دھند بارش سے زیادہ بُری تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لوگ بھاگم بھاگ کناروں پہ چلے جا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب خوف و ہراس طاری تھا۔ کچھ کسان شراب کے نشے میں دُھت اِدھر اُدھر گردھکے پھر رہے تھے۔ ان کی ناکیں چپٹی ہو رہی تھیں اور سر گنجے تھے۔ کچھ لمبے بوٹوں میں فن لینڈ

کی عورتیں سیر کر رہی تھیں کاریگر لوگ، مزدور، کلرک اور ہر طبقے کے لوگ وہاں موجود تھے۔ غالباً ہر طبقے کے لوگوں کے اجتماع کا یہی وقت ہوتا ہوگا اور پھر نہر بھی تو دیکھنے کے قابل تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنی کشتیاں وہاں سما کیسے گئیں۔ پل پہ عورتیں سیلے ہوئے میٹھے کیک بیچ رہی تھیں اور گلی سڑی سبزیاں اور پھل فروخت کر رہی تھیں۔ فونتانکا سیر کے لئے قطعاً اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر تو جی اور اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف دھند اور آسمان پر گہر چھائی ہوئی تھی۔ تو بہ کتنی اداس شام تھی وہ۔

جب میں گروکونایا تک پہنچا تو بہت اندھیرا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے گیس کے لیمپ جلانے شروع کر دیئے تھے۔ میں اس گلی میں مدتوں بعد آیا تھا مجھے یہ گلی بہت اچھی لگی۔ اس میں زندگی کے آثار تھے۔

خوبصورت دکانیں تھیں۔ بڑی چھوٹی سبھی دکانیں سجی ہوئی تھیں اور وہ قیمتی اشیا سے چمک دمک رہی تھیں۔ اس سے تم یہ اندازہ بھی لگا سکتی ہو کہ یہ سب انتظام خوبصورتی کو مدّنظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ہمارے ماحول میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اتنی خوبصورت اور قیمتی چیزیں اپنی بیویوں کے لئے واقعی خرید لیتے ہیں۔ اس بازار میں دولت کا کوئی حساب نہیں۔ مالدار جگہ ہے۔ اسی گلی میں کئی جرمن باورچی بھی رہتے ہیں مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ لوگ بھی ضرور امیر ہوں گے بے شمار گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ گلی کا پتھر ان سب کا بوجھ کیسے برداشت کرتا ہے۔ اور پھر کس قدر شاندار رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی گاڑیاں ہیں۔ بگھیوں میں کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے اور گاڑیوں کے ہمراہ چلنے والے پیادوں کے ہاتھ میں نیزے یا تلواریں تھیں۔ جب یہ گاڑیاں میرے قریب سے گزرتی تھیں تو میں دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا کہ یہ شہزادیاں ہیں یا شاہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے ڈانس اور شام کی دعوتوں پہ جانے کا یہی وقت ہوگا۔ جبھی تو اتنی سج دھج کر یہ عورتیں بگھیوں میں سوار ہو کر جا رہی تھیں۔ ایک بات ہے کہ کسی بھی رئیس خاتون یا شہزادی کو قریب سے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے آج سے پہلے میں نے کبھی کسی شہزادی یا امیر عورت کو قریب سے نہیں دیکھا تھا مجھے اس وقت تمہارا خیال آگیا اور میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ وارنیکا۔

تم اس قدر دکھی کیوں ہو؟ تم کس لحاظ سے باقی دنیا سے بری ہو؟ تم اتنی رحمدل ہو، اتنی اچھی ہو، خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو۔ پھر تم یہ برے دن کیوں دیکھ رہی ہو۔ قدرت کا یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک اچھا انسان اس طرح سسک سسک کر جینے پر کیوں مجبور ہو؟ اور کیا بات ہے کہ دوسرے لوگوں کو بن مانگے خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے کیونکہ اس سے آزاد خیال میں خلل پڑتا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کوئی پیدا ہونے سے پہلے ہی قسمت کا دھنی ہوتا ہے اور کوئی اس لئے رگڑ رگڑ کے مرتا ہے کیونکہ وہ بے آسرا پیدا ہوا ہے۔ بھوت پریت کی کہانیوں میں تو ایسا اکثر ہوا ہے کہ بے وقوفوں کو انتہائی خوشی نصیب ہو جاتی لیکن حقیقی زندگی میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس طرح سوچنا گناہ ہو سکتا ہے لیکن ایسے کئی گناہ وجود رکھتے ہیں جو اس سے پہلے کہ ہمیں علم ہو ہمارے دل میں گھر کر چکے ہوتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم بھی ان تتلیوں میں ہوا کے دوش پر کیوں نہیں اڑتی پھرتیں۔ جرنیلوں کے ہمراہ کیوں نہیں ہنس ہنس کے باتیں کر سکتیں۔ میرا مطلب ایسے جرنیل سے نہیں ہے جو سلام کا بھی بھوکا ہو تم ان چیتھڑوں کی بجائے سونے چاندی کے گہنوں میں لدی ہوئی نظر آؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو کیا اتنی کمزور اور بیمار رہ سکتی ہو جتنی اب ہو۔ تمہارے نزدیک بیماری پھٹک تک نہیں سکتی۔ تم بھی اپنے محل کی جھلملاتی کھڑکی میں کھڑی ہو کر اپنا سایہ دیکھا کرو اور خوشی سے پھولے نہ سماؤ مگر تم نتھی حسین اور سعادت مند ہو۔ لیکن افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا اصل روپ کتنا مختلف ہے۔ بڑے لوگوں نے تمہیں رنج والم کا شکار بنا کے رکھ دیا ہے۔ اور زخم پر نمک گرانے کا کام اس بدمعاش نے کر دیا۔ کیا فقط اس لئے کہ اس کے بدن پر اچھے کپڑے ہیں اور وہ سونے کے بل پر اینٹھتا پھرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ جیسے چاہے تمہارے ساتھ ویسا سلوک کر سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ باقی لوگوں کو اس کی بیہودگی برداشت کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا واقعی کرنی چاہیئے؟ آخر کیوں؟ کیونکہ تم ایک غریب اور بے آسرا لڑکی ہو اور تمہارا ایسا کوئی طاقتور دوست نہیں ہے جو تمہاری حفاظت کر سکے؟ میں پوچھتا ہوں وہ کوئی انسان ہے جو ایک یتیم لڑکی کی آبرو کا دشمن بن جائے۔ وہ اور کچھ ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ وہ شیطان کے بھیس میں انسان بنا پھرتا ہے۔ اس سے اچھا تو وہ مستری ہے جو مجھے گرد کھونا یا گلی میں ملا تھا۔ اگر وہ ایک آنہ اور کمانے کے لئے سارا دن گلی میں مارا مارا پھرتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے اس کی انسانیت میں کیا کمی آ جاتی ہے۔ وہ کسی کا غلام نہیں۔ اپنے من کا مالک ہے محنت کرکے روٹی کماتا ہے۔ بھکاری نہیں ہے بلکہ لوگوں کے چاقو اور استرے ٹھیک اور تیز کرتا ہے اپنے خون پسینے کی کمائی کھاتا ہے۔ جیسے کہتا ہو ــــ مزے اڑاؤ ــــ آخر میں اور کس کام کا ہوں؟ شاید وہ بھی بھکاری ہے۔ شاید حقیقی معنوں میں بھکاری ہے لیکن ایک باعزت بھکاری ہے جو کام ہو تھکا ہارا ہو لیکن وہ اپنی دھن میں لگا رہتا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ سچ مانو۔ ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں اور بمشکل دو وقت کی روٹی کما سکتے ہیں لیکن یہ لوگ نہ کسی کے سامنے جھکتے ہیں نہ ہاتھ پسارتے ہیں۔ میں بھی اس مستری کی طرح ہوں۔ اس مستری کی طرح ہو بہو تو نہیں لیکن پھر شائستگی اور عزت کے لحاظ سے اس کی طرح ہوں۔ جتنی محنت مجھ سے بن پڑتی ہے میں کر دیتا ہوں۔ بتاؤ اور کیا کروں؟

آج مجھے اس مستری کا خیال یوں آ رہا ہے کہ آج مجھے اپنی غربت کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ میں اسے اوزار تیز کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے ذرا سا رک گیا۔ اور میں اپنے دل سے کچھ مایوس کن خیالات کو جھٹکنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ شاید طبیعت کسی اور طرف مائل ہو۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ مستری کسی مکان کی کھڑکی کے نیچے اپنا سامان رکھ کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر میری نظر ایک دس برس کے بچے پر جا پڑی۔ اگر یہ بچہ پیلا زرد اور کمزور نہ ہوتا تو اچھا حسین لڑکا ہوتا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور محض ایک قمیض پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک جگہ کھڑا منہ کھولے کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑکے آخر لڑکے ہوتے ہیں۔ سامنے ایک جگہ تتلی کا ناچ ہو رہا تھا وہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا اس کے گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے

تھے لیکن وہ وہاں کھڑا اپنی قمیض کا ایک کونہ منہ میں چبا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا کاغذ بھی تھا کہیں سے کچھ لوگوں نے اُس ڈبے میں کچھ پیسے ڈال دیئے جس پہ وہ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔ پیسوں کی کھنک سے لڑکا چونکا اور اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ پیسے شاید میں نے ڈالے ہیں کیونکہ وہ لپک کر میری طرف آیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اُس نے وہ کاغذ مجھے تھما دیا اور رُندھی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ اسے پڑھوں۔ میں نے وہ کاغذ کھولا۔ اُس میں وہی کچھ لکھا ہوا تھا جو ہر چہرے سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسی کئی تحریریں میں کئی بار پڑھ چکا ہوں کہ ماں بخار سے مر رہی ہے اور تین ننھے ننھے بھائی بھوکوں مر رہے ہیں۔ اے مہربان لوگو! خدا کے نام پر کچھ مدد کر دو۔ اُسے سمجھنے میں زیادہ مشکل نہ پیش آئی لیکن اسے دینے کے لئے میرے پاس تھا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں لیکن مجھے کتنا دُکھ ہوا۔ یہ معصوم عمر۔ یہ سردی اور اتنا کمزور سا اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ بھوکا بھی تھا۔ وہ میرے سامنے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ نہیں میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسی مائیں زندہ ہیں جو اپنے معصوم بچوں کو اس موسم میں ادھ ننگا کر کے بھیج دیتی ہیں۔ شاید وہ حوصلہ ہار بیٹھی ہو اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو اور بچاری ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ یہ بھی سچ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی بیمار ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے مناسب افسروں کے پاس درخواست کرنی چاہیئے۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان بچوں کو بھیج کر لوگوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ اُبھار کر پیسے وصول کرنا چاہتی ہو۔ بچے کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتی ہو اور خود بیٹھی کھاتی ہو! لیکن کاغذ کے اس ٹکڑے سے اُسے کتنے روپے مل جائیں گے؟ وہ بھاگ بھاگ کے لوگوں سے التجا کرتا ہے گڑگڑاتا ہے لیکن اُس کی بات سننے کی لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہے۔ لوگوں کے دل پتھر کے ہو گئے ہیں اُن کی زبان خنجر۔" بھاگ — بدمعاش کہیں کا —" لڑکے کا چہرہ مُرجھا جاتا تھا اور وہ سکڑتا ہوا

کسی اور کی طرف لپکتا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سُن تھے اور اس دم توڑ دینے والی ٹھنڈی ہواؤں میں اُس کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جان سکے وہ کھانسنے لگے گا اور اُس کے اس کومل سینے میں تپدق کالے ناگ کی طرح کنڈلی مار کے دھرنا دے بیٹھے گا۔ پھر کیا ہے۔ پھر موت اُس کے سرہانے آ کھڑی ہو گی کسی غلیظ اور تاریک کونے میں اُس کی منتظر رہے گی۔ اس کی پرواہ کرنے والا کون ہے۔ اُس کی مدد کرنے والا کون ہے؟ اور اُس کی یہ مختصر سی زندگی ختم ہو جائے گی۔ وارنیکا کی زندگیوں کی بس اتنی سی ہی داستان ہے۔ کسی کے منہ سے یہ الفاظ سُن لینا آسان نہیں ہے کہ "عیسیٰ مسیح کے نام پہ میری مدد کر دو" اور پھر یہ کہہ کر گذر جانا تو بہت ہی مشکل ہے کہ — "خدا تمہاری مدد کرے گا —" میں مانتا ہوں کہ ایسے بھی کئی واقعات ہو گذرتے ہیں عیسیٰ مسیح کا نام بھی دل پہ خاص اثر نہیں کرتا۔ کیونکہ کچھ بھکاری یہ فقرہ کہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اُن کی آواز دل پہ کوئی اثر نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کو کچھ نہ دینا کوئی بُری بات نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ مصیبتوں کے پالے ہوئے ہوتے ہیں۔ عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح جی ہی لیں گے۔ لیکن جب آج اُس بچے نے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا — "عیسیٰ مسیح کے نام پہ ایک پیسہ دے دو صاحب —" تو میرے دل پہ برچھیاں چل گئیں۔ اُس کی آواز اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں کیا دے سکتا تھا اُسے! میرے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ لیکن میں سوچ نہیں سکتا کہ جب ایک غریب آدمی اپنی بدقسمتی کے ہاتھوں دُکھی ہو کے بھیک مانگتا ہے تو امیر لوگ اُسے بوئے جان کیوں کہتے ہیں۔ اُسے دھتکار کیوں دیتے ہیں؟ کیا غریبوں کی ماتمی آواز سے اُن کی راتوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ واقعہ اس قدر تفصیل میں اس لئے لکھا ہے کہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا اور اپنی طرزِ تحریر کا نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے تم دیکھ رہی ہو کہ گذشتہ کچھ عرصہ سے میری طرزِ تحریر سنور رہی ہے۔ اب تو میں اتنا

بے دل ہو چکا ہوں کہ میں اپنے آپ کو تسلّی دیتا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس تسلّی کا فائدہ کچھ بھی نہیں ہو گا تاہم کبھی کبھی اپنے آپ کو تسلّی دینا اپنے آپ سے انصاف کرنے کے مترادف ہے۔ اور خاص کر اس شخص کے لئے تو بہت ضروری ہے جو جگہ جگہ ذلیل ہوتا ہو اور اپنا وقار کھو بیٹھا ہو۔ مواز نے کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ میں اسی طرح پس چکا ہوں جس طرح وہ لڑکا ۔ وارنیکا۔ کبھی کبھی جب میں دفتر جلدی چلا جاتا ہوں تو مجھے ایک نظر شہر کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور ایسے بے شمار نظارے مجھے اپنے چھوٹے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن آؤ ذرا زندگی کو اور قریب سے دیکھیں۔ ذرا دھیان سے سوچو کہ ان بڑے بڑے مکانوں کے اندر کیا ہوتا ہے، یہ دیکھو اور پھر سوچو کہ کیا فقط اپنی غربت کی بنا پر اپنی نظروں میں گر جانا ٹھیک ہے؟ میرا مطلب کسی شخص سے نہیں ہے۔ ویسے ہی بات کر رہا ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ان عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم چاہے یہ سمجھو کہ میں جھک مار رہا ہوں یا میں نے یہ سب کچھ کسی کتاب سے نقل کیا ہے یا میرا مزاج برہم ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب گھر آیا تو بہت اداس تھا۔ میں نے انگیٹھی پر کیتلی رکھ دی تاکہ ایک پیالہ چائے پی سکوں ۔۔۔ اس وقت میرا پڑوسی گروشکوف میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے صبح بھی محسوس کیا تھا کہ وہ باقی لوگوں سے نظر بچا کر مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ گروشکوف کے بارے میں تمہیں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس کی زندگی مجھ سے بھی بدتر گذر رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ اس کی بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ اگر میں گروشکوف ہوتا تو نہ جانے کیا کر گذرتا۔ گروشکوف کمرے میں آیا۔ ذرا سا جھکا اور پھر چپ چاپ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے اسے کرسی پیش کی لیکن میرے پاس ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی ہے۔ پھر میں نے اسے چائے پیش کی۔ وہ بہت دیر بیٹھا معافی ہی مانگتا رہا اور چائے پینے سے انکار کرتا رہا لیکن آخر اس نے چائے کا پیالہ قبول کر ہی لیا لیکن اس نے چینی لینے سے انکار کر دیا بلکہ بہت عاجزی سے کہتا رہا نہیں نہیں نہیں ۔۔۔ بہت بہت شکریہ ۔۔۔ جب میں نے بہت زور ڈالا تو اس نے ایک چمچہ لے لی اور مجھے بار بار کہتا جاتا تھا کہ چائے بہت ہی اچھی اور میٹھی ہے۔ افلاس انسان کو کتنا عاجز بنا دیتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "کہو زندگی کیسی گذر رہی ہے ۔" اور اب اس نے کہنا شروع کیا۔ "ماکار ۔۔۔ تم خدا کے نام پر کچھ مدد نہیں کر سکتے ۔۔۔ ایک بدقسمت کنبے کی ذرا سی امداد کر دو۔ شاید تمہیں علم ہو کہ پچھلے دو روز سے میری بیوی اور میرے بچوں نے کچھ نہیں کھایا ۔۔۔ کچھ کھانے کے لئے ہے ہی نہیں ۔۔۔ میں باپ ہوں اور بے بسی سے ان کا منہ تکتا رہتا ہوں ۔"

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس نے روک دیا اور بولا ۔۔۔ میں یہاں کے ہر کرایہ دار سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ اتنا ڈرتا نہیں جتنا شرم کے مارے انہیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ وہ لوگ ہم سے کتنے مختلف ہیں۔ کتنے علیحدہ ہیں۔ میرے دوست میں تمہیں کوئی تکلیف نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہو۔ تم میری مدد نہیں کر سکتے لیکن خدا کے لئے کچھ ادھار دے دو۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ تمہارے پاس آنے کی مجھے ہمت کیسے ہوئی لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں بہت ہی نازک دل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی میری طرح ضرورت مند ہو اور جانتا ہوں کہ میری مصیبت کا حال سن کر تم مجھ سے زیادہ دکھی ہو گے۔ اور وہ دخل اندازی کے لئے پھر معافی مانگنے لگا۔

اس کی مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھر گڑگڑایا ۔۔۔ "میرے دوست ماکار۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں زیادہ نہیں مانگ رہا لیکن ذرا میری حالت پہ غور کرو (اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا) میری بیوی اور میرے بچے ۔۔۔ تم جانتے ہو ۔۔۔ وہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ تم کیا دس کوپک بھی نہیں دے سکتے ؟" یہ فقرہ سن کر شرم سے میری گردن جھک گئی۔ اس کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ میرے پاس کل سرمایہ بیس کوپک تھے۔ اور مجھے کچھ بہت ضروری چیزیں خریدنا تھیں۔

منٹیں ۔۔۔ مجھے معاف کرو ۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔۔۔"
"لیکن ماکار ۔۔۔ جو کچھ بھی کہو ۔۔۔ جو جی میں آئے کرو۔ لیکن کم از کم مجھے دس کوپکس دے دو ۔۔۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنے بیس کوپکس نکالے اور اسے دے دیئے۔ اور بیس کوپکس بھی جاتی ہو خیرات میں دیئے گئے۔ کیا غریبی ہے۔ ہم نے بات چیت شروع کر دی اور آخر میں پوچھ ہی بیٹھا کہ جب اس کی یہ حالت ہے تو اس نے پانچ روبل پہ کمرہ کیسے کرائے پہ لے رکھا ہے۔ وہ بولا کہ اسے آئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور تین مہینوں کا کرایہ اس نے پیشگی ادا کر دیا تھا۔ لیکن اب اس صورتِ حالات کے پیشِ نظر اسے کچھ پتا نہیں کہ کیا کرے۔ اسے امید تھی کہ اتنے لمبے عرصے میں اس کے مقدمے کا کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ اس نے ایک سوداگر پہ مقدمہ چلا رکھا ہے کہ خزانے میں اس نے گڑبڑ کی تھی۔ جب مقدمے کی پیروی کی گئی تو بیچارہ گرشکوف بھی لپیٹ میں آ گیا۔ گرشکوف کا صرف اتنا قصور ہے کہ حساب میں غلطی اس کی نظروں سے بچ گئی لہذا اس پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے ملک کے مفاد کو دھکا پہنچایا ہے۔ یہ مقدمہ کئی برسوں سے چل رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور بیچارے گرشکوف کو آئے دن نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گرشکوف کہتا ہے ۔۔۔ "میں بالکل بے گناہ اور معصوم ہوں ۔۔۔ میری جس قدر توہین ہوئی ہے۔ مجھ پہ جعل سازی کا جو الزام لگا ہے سب غلط ہے میں بالکل معصوم ہوں ۔۔۔" لیکن اس مقدمے سے اس کا اعتبار تو اٹھ گیا۔ اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ اور اگرچہ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تاہم بات صاف نہ ہوئی۔ اگر وہ باعزت طور پہ الزام سے بری کر دیا جاتا ہے تو اس سوداگر کو اسے خاصی رقم ادا کرنی پڑتی۔ مجھے تو گرشکوف کی بات پہ اعتبار ہے لیکن کچہری کے ججوں کو نہیں ہے۔ یہ اتنا الجھا ہوا مقدمہ ہے اس قدر پیچیدہ مقدمہ ہے کہ اس کے فیصلے کے لئے سو سال درکار ہیں۔ وکیل اور جج مل کر ایک گتھی سلجھاتے ہیں تو وہ کمبخت سوداگر ایک اور پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے گرشکوف سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ اس بیچارے کو کوئی کام نہیں ملتا۔ اس کا اعتبار لوگوں کی نظروں سے اس طرح اٹھ گیا ہے کہ کوئی اسے ملازمت نہیں دیتا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ تو بیچ کے کھا چکا۔ مقدمہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا اور اسی مقدمے کے دوران میں اس کے گھر ایک لڑکا بھی پیدا ہوا لیکن غلط وقت پہ پیدا ہوا۔ کیونکہ اس پہ پیسہ خرچ آتا ہے۔ جب بچہ بیمار پڑ گیا تو پھر پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ اور جب وہ مر گیا اور پیسہ خرچ ہو گیا۔ اس کی بیوی بیمار ہے ۔۔۔ اور اسے بھی ایک پرانا روگ لگا ہوا ہے۔ بہت دکھ اٹھایا ہے اس نے ۔۔۔ لیکن اسے امید ہے کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی موافق فیصلہ ہو جائے گا وہ کہتا ہے کہ اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔ وارنیکا مجھے اس کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے۔ مجھ سے جتنا بن پڑا میں نے اسے تسلی دی۔ اس کا بھی کوئی نہیں۔ اسے حوصلہ دینے والا کوئی نہیں۔ اچھا ۔۔۔ خدا حافظ ۔۔۔ خدا تمہیں تندرست رکھے۔ تمہارا خیال ہی دکھتی روح کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اور تمہارے لئے دکھ اٹھانے میں ایک خاص چین ہے۔

تمہارا سچا دوست
ماکار۔

۹ ستمبر۔

وارووارا۔

مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا۔ غضب ہو گیا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے اور مجھے ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ تم سوچ تک نہیں سکتیں کہ میں کیا بتانے والا ہوں۔ ہمیں ایسی بات کی امید تک نہ تھی۔ لیکن ہاں۔ مجھے کچھ ہلکا سا علم تھا۔ میرا دل کہتا ہے یہ ہو جائے گا۔ کچھ اسی نوعیت کا خواب بھی میں نے پچھلی رات دیکھا تھا۔

ہاں تو قصہ یوں ہے ۔۔۔ لیکن ایک بات ہے کہ میں اپنی تحریر کی نوک پلک سنوارے بغیر سب کچھ لکھوں گا۔ جیسے جیسے من میں خیال آتے جائیں گے لکھتا جاؤں گا۔ آج صبح میں حسبِ معمول اپنے دفتر پہنچا اور جا کر اپنی کرسی پہ بیٹھ کر کام میں محو ہو گیا۔ ہاں میں کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ کل جب آئیوانووچ نے آ کر کہا تھا کہ اس کاغذ کی دوسری نقل فوراً

تیار کرو تو میں یہی کام کر رہا تھا۔ آئیونووچ نے کہا تھا — "اسے خوشخط بنا کر اور صاف لفظوں میں لکھنا لیکن جتنی جلدی ہو سکے اتنی جلد نقل تیار کرو۔ حضورِ انور اس کاغذ پر آج ہی دستخط کریں گے۔" اور اب تم سے کیا چھپانا ہے کل میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میں بہت اداس تھا اور شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا اور پھر میں تمہارے بارے میں بہت فکر مند ہو رہا تھا۔ اب اسے شیطان کی کرتوت سمجھو یا یہ سمجھو کہ قسمت میں ہی ایسا لکھا تھا بات یوں ہوئی کہ نقل اتارتے وقت میں ایک سطر بالکل چھوڑ گیا۔ اور اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس سطر سے اس مضمون کا سارا مطلب کیسے ختم ہو گیا۔ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ اس میں کوئی مطلب تھا یا نہیں بہر حال دفتر والے کل تو حضورِ انور سے دستخط نہ کرا سکے انھوں نے آج اس پر دستخط کیے۔ میں جب دفتر آیا تو مجھے ایسی کسی بات کا سان گمان نہ تھا اور میں بڑی تشفی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں تو فطرتاً ہی شرمیلا ہوں لہٰذا آج بھی میں بے وجہ جھینپ رہا تھا اور کسی کی نظروں سے نظریں نہ ملا رہا تھا۔ وہ ظالم آئیونووچ بولا — "ماکار تم ... کی طرح کیوں بیٹھے جھینپ رہے ہو —" اور اس نے یہ فقرہ کہہ کر اس طرح منہ بنایا کہ سارا دفتر ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ لوگوں کی ہنسی تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح بیٹھ گیا گویا میں نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میں اسی طرح لوگوں سے اپنا پیچھا چھڑواتا ہوں اچانک سامنے کے کمرے سے کچھ حرکت ہوئی اور پھر میرا نام لے کر پکارا گیا مجھے یقین نہ آیا لیکن نہیں، میرا ہی نام پکارا جا رہا تھا — دیوشکن۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی مجھے نہ جانے کیا ہو گیا لیکن میں کسی انجانے خوف کے تحت سمٹ کے گٹھڑی سا بن گیا۔ میں کرسی کے ساتھ چپک گیا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ آخر بلانے والا میرے قریب آ پہنچا۔

"دیوشکن — کون ہے دیوشکن —"

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا —

"ماکار — تمہیں حضورِ انور نے طلب کیا ہے۔ تم نے وہ دستاویز بالکل خراب کر کے رکھ دی ہے۔"

اس نے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔ لیکن اتنا ہی بہت تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں کرسی سے کیسے اٹھا اور کیسے چل سکا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دماغ میں کیا خیالات چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں نے ایک کمرہ پار کیا پھر دوسرا۔ پھر ایک اور — اور آخرکار حضورِ انور کا کمرہ آ ہی گیا۔ میں وہاں مجرموں کی طرح کھڑا تھا اور سامنے حضورِ انور اور باقی افسران حضرات بیٹھے تھے۔ مجھے پورا اندیشہ ہے کہ میری جو کیفیت تھی میں حضورِ انور کے سامنے جھکنا بھی بھول گیا۔ میرے ہونٹ کے کونے پھڑک رہے تھے اور میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ کمرے کے ایک طرف شیشہ لٹک رہا تھا۔ میں نے اس میں ایک نظر اپنے آپ کو دیکھا — توبہ — کیا حلیہ تھا — کیا چہرہ کیا کپڑے سب پہ لعنت برس رہی تھی۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ آج تک میں نے دفتر میں ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے کوئی میرا واقف بن سکے۔ حضورِ انور کو کیا علم کہ میں دفتر میں ہوں بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے میرا نام ضرور سنا ہو لیکن انھوں نے مجھے جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی — وہ غصے کے عالم میں بولے —

"آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ تم احتیاط سے کام کیوں نہیں کرتے؟ یہ کاغذ اتنا ضروری تھا اور تم نے اس کا ناس پیٹ دیا"

یہ کہنے کے بعد ہز ایکسیلنسی آئیونووچ سے مخاطب ہوئے۔ میں یہی کچھ الفاظ سمجھ پایا — "ایسی غفلت — اتنی لاپرواہی — کام بڑھا — وقت ضائع ہوا —"

میں نے معافی مانگنے کے لیے کئی بار منہ کھولا لیکن منہ سے کوئی آواز نہ نکلی — میرا بس چلتا تو وہاں سے بھاگ نکلتا لیکن پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ اور پھر مجھ سے وہاں کھڑے کھڑے وہ حرکت سرزد ہو گئی کہ — لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے — میرے کوٹ پہ ایک ہی بٹن تھا اور وہ بھی کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا — وہ اچانک ٹوٹ کے گر گیا — اور — ٹن ٹن کرتا ہوا سیدھا حضورِ انور کے قدموں کے پاس جا کر رکا۔ بٹن ٹوٹنے سے پہلے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا — سب خاموش بیٹھے تھے۔ اس سناٹے میں یہ بٹن ٹوٹ گیا۔ یعنی معافی مانگنے کی جگہ یہ حرکت ہو گئی۔ حضورِ انور نے آنکھ اٹھا کر

مجھے دیکھا۔ میری صورت اور میرے لباس کا جائزہ لیا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے شیشے میں اپنے آپ کو کیسا پایا تھا۔ میں بٹن کو پکڑنے کے لئے لپکا۔ ایک بار بٹن کو تھام بھی لیا لیکن وہ کانپتے ہاتھوں سے پھر پھسل گیا — دیکھ رہا ہو۔ میں نے کس شائستگی کا مظاہرہ کیا؟ آخر کار میں نے بٹن اٹھا ہی لیا اور سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں سیدھا کھڑا ہوتا اور میرے ہاتھ نیچے ہوتے۔ لیکن کہاں مجھے بٹن سنبھالنا تھا اور پھر کوٹ کو کھلنے سے روکنا تھا۔ اور نہ جانے کیوں میرے چہرے پہ کھسیانی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ہاں۔ میں مسکرا رہا تھا۔ برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ حضورِ انور نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا لیں۔ ایک نظر پھر مجھے دیکھا اور آئیو نووچ سے مخاطب ہوئے۔

" یہ کیا بات ہے — ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو —"

میرے اللہ کیا عزت پائی میں نے — " ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو —" آئیو نووچ بولا — " بہت پرانا ملازم ہے سرکار — لیکن اس کے خلاف ابھی تک ایک بھی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ چال چلن — قابلِ تعریف ہے — اور تنخواہ کا حساب بھی پائی پائی تک درست ہے —"

حضورِ انور نے فرمایا۔ " تو پھر اس کی مدد کی جائے۔ اسے پیشگی کچھ دے دیا جائے۔"

" حضور۔ حساب کے مطابق جتنی پیشگی رقم یہ لے سکتا تھا لے چکا ہے — حالات نے اسے پیشگی رقم لینے پر مجبور کر دیا۔ بہت اچھے کردار کا مالک ہے۔ اس کے خلاف ایک بھی شکایت نہیں ہے ایک بھی نہیں — کسی کو اس کے خلاف کچھ نہیں کہنا —"

میرا حال یہ تھا جیسے میں جہنم کی آگ میں جل رہا ہوں۔

حضورِ انور مجھے سنانے کی غرض سے بولے — " تو ٹھیک ہے۔ غیر — جتنی جلدی ہو سکے اس دستاویز کی دوسری کاپی تیار کی جائے — اور دیو شکن — ادھر آؤ۔

اس کے بعد بغیر غلطی کئے اس کی دوسری نقل فوراً تیار کر دو اور سنو —" یہ کہہ کر حضورِ انور نے سب لوگوں کو باہر بھیج دیا۔

اور صرف ہم دونوں وہاں رہ گئے۔ انھوں نے جلدی سے اپنی میز کا ایک خانہ کھولا۔ سو روبل کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا — " یہ لو — اسے قرض کچھ کے سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کروں گا —"

مجھے کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے — میں اپنے ہوش میں ہوتا تو ان کے ہاتھ چوم لیتا — اچانک ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور پھر۔ اور پھر — میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھ رہا وارنیکا — پھر انھوں نے مجھ ناچیز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زور سے ہاتھ ملایا جیسے میں ان کے برابر کا آدمی ہو اور کہنے لگے —" اچھا — اب تم جاؤ — مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد نہیں کر سکتا — لیکن اب دوبارہ غلطی نہ کرنا جو کچھ ہو گیا۔ اس کا الزام ہم دونوں اپنے سر لے لیں گے —"

وارنیکا — میں تم اور فیڈورا سے یہی چاہتا ہوں کہ ہر روز حضورِ انور کے حق میں دعائیں مانگو — اگر میرے بچے ہوتے تو میں ان سے بھی دعائیں مانگنے کو کہتا — میں خود بھی دعائیں مانگ رہا ہوں۔ میں نے بہت برے دن دیکھے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔ میں قسم اٹھا کے کہتا ہوں کہ یہ سو روبل اتنے عزیز نہیں جتنی یہ حقیقت کہ حضورِ انور نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک شرابی اور نچلے درجے کے آدمی سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے مجھے دوبارہ انسان بنا دیا ہے۔ انھوں نے عمر بھر کے لئے مجھے جینے کی ہمت عطا کی ہے اور میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ میں لاکھ گنہگار ہوں لیکن حضورِ انور کے حق میں جو دعائیں میں مانگ رہا ہوں وہ ضرور قبول ہوں گی۔

وارنیکا — مجھے اپنی شدہ بد مقبول گئی ہے۔ میں خوشی کے مارے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا ہے۔ میں ۴۵ روبل تمہیں بھیج رہا ہوں۔ بیس روبل میں اپنی مکان مالکن کو دے دوں گا۔ پھر میرے پاس باقی ۳۵ روبل رہ جائیں گے۔ بیس ایک کے قریب تو میرے کپڑوں پر

خرچ ہو جائیں گے ۔ اور باقی ضروریات پوری کرنے کے لئے پندرہ روبل پھر بچ رہیں گے ۔ آج صبح کے واقعے نے مجھے بالکل پاگل کر دیا ہے ۔ میرا خیال ہے مجھے لیٹ جانا چاہیئے ۔ مجھے اس وقت بہت چین محسوس ہو رہا ہے ۔ ہاں میری روح ضرور دکھی ہے اور میں محسوس کر سکتا ہوں کہ میرے اندر ہی اندر کوئی چیز کانپ رہی ہے ۔ میں تم سے پھر کبھی ملنے آؤں گا ۔ اس وقت میں کسی کام کے قابل نہیں ہوں ۔ میری بچی ۔ خدا سب کی سنتا ہے ۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے ۔ وہ سب پہ نظر رکھتا ہے ۔

مکار ۔

۱۵ ستمبر میرے پیارے مکار

میں یہ واقعہ سن کر بہت خوش ہوں ۔ اور تمہارے حضور انور کی فیاضی کی داد دیتی ہوں ۔ اب کم از کم تمہیں پریشانیوں سے تو نجات ملے گی ۔ لیکن خدا کے لئے اس رقم کو ضائع نہ کر دینا ۔ آرام سے رہو ۔ شان میں نہ آجانا اور ہو سکے تو اب ایک ایک پائی کر کے کچھ پیسہ جمع کرنا شروع کر دو تاکہ دوبارہ مصیبت کے دن آئیں تو تم کچھ مقابلہ کر سکو ۔ اور خدارا ہمارے بارے میں فکر مت کیا کرو ۔ اور فیڈورا اپنا گزارہ کر لیں گی ۔ مکار ۔ تم نے ہمیں اتنے روبل کیوں بھیج دیئے ؟ واقعی ہمیں اتنی رقم کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اسی سے اطمینان ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر تبدیل کرنے کے لئے ہمیں پیسہ درکار تھا لیکن فیڈورا کو توقع ہے کہ اسے اپنا ایک پرانا قرضہ واپس مل جائے گا ۔ میں ضروری کام پورا کرنے کی غرض سے بیس روبل اپنے پاس رکھ رہی ہوں اور باقی تمہیں واپس بھیج رہی ہوں ۔ پیسے کو سوچ سمجھ کر خرچ کرنا بلکہ اسے محفوظ رکھو ۔ خدا حافظ ۔ خدا کرے کہ تم پریشانیوں سے نجات پاؤ اور سکھ کی زندگی بسر کرو ۔ اگر میں تھکن محسوس نہ کر رہی ہوتی تو اور زیادہ لکھتی ۔ کل سارا دن تو میں بستر ہی پہ پڑی رہی ۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے ملنے کا وعدہ کیا ہے ۔

وی ۔ ڈی ۔

میری پیاری واروارا !

دیکھو اب تو جانے کا نام نہ لو ۔ اب تو میں اتنا خوش ہوں اور چین سے ہوں ۔ اب یہاں سے نہ جاؤ ۔ فیڈورا کے کہنے میں نہ آجاؤ ۔ تم جو کہو گی میں کر دوں گا ۔ میں اچھی طرح رہوں گا ۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا ۔ پہلے کی طرح ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کو خوشیوں بھرے خط لکھیں گے ۔ اور اگر مصیبتیں آئیں تو مصیبتوں کا حال لکھیں گے ۔ ہم چین اور سکھ سے رہیں گے ۔ ہم پھر ادب کا مطالعہ شروع کر دیں گے ۔ میری زندگی ہر لحاظ سے بدل چکی ہے ۔ مکان مالکن درست ہو گئی ہے ۔ تھریسا اب زیادہ سمجھدار ہو گئی ہے اور فالڈونی بھی کہنا ماننے لگا ہے ۔ میں نے راتازیف سے بھی صلح کر لی ہے ۔ میں اتنا خوش تھا کہ میں خود اس سے ملنے چلا گیا ۔ وہ آدمی دل کا اچھا ہے ۔ اور لوگوں نے اس کے بارے میں جو باتیں کی ہے وہ سب غلط ہے ۔ اس نے کبھی نہیں چاہا کہ ہمیں اپنی کسی کہانی کا کردار بنائے ۔ اس نے یہ سب باتیں خود مجھے بتائیں ۔ اور اس نے مجھے اپنی کچھ نئی کہانیاں پڑھ کر سنائیں ۔ وہ کہہ رہا تھا جہاں تک تمہیں یہ شکایت ہے کہ تمہارا نام مسٹر لولیس کیوں لکھ دیا گیا تو یہ لفظ کوئی برا نہیں ہے اور نہ یہ گالی ہے ۔ یہ لفظ کسی بدیشی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہے سخت آدمی ۔ یا کتابی زبان میں یوں بھی کہہ لو ۔ کیا تیز زبان آدمی ہے اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہے ۔ سو یہ تو ایک بے ضرر مذاق تھا ۔ میں خواہ مخواہ برا مان گیا ۔ لیکن میں نے معافی مانگ لی ہے ۔ آج تو موسم بھی بہت اچھا ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی اور صبح کچھ دھند بھی تھی لیکن اس سے موسم اور نکھر گیا ہے ۔ میں نے بہت عمدہ جوتے خریدے ہیں ۔ آج صبح میں سیر کرنے کے لئے نیوسکی تک گیا تھا ۔ وہاں ذرا دیر کے لئے میں اخبار پڑھنے کے لئے بھی رکا تھا ۔ میں تمہیں خاص بات بتانا تو بھول ہی گیا ۔ آج صبح حضور انور کے متعلق آئیون دیچ اور [illegible] سے میری بات چیت ہوئی تھی ۔ پتا چلا ہے کہ انہوں نے صرف مجھی پہ کرم نہیں کیا ۔ حضور انور اپنی دریا دلی کے لئے مشہور ہیں ۔ ساری دنیا ان کی تعریف کرتی ہے اور کئی لوگ تو آنکھوں میں آنسو بھر کر ان کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں ۔ سنتا ہے

کہ بہت پہلے انھوں نے ایک یتیم بچی کو گود لے لیا تھا اور جب وہ جوان ہوئی تو ایک افسر کے ساتھ اُس کی شادی کر دی تھی یہ واقعہ بھی عام ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک بیوہ کے لڑکے کو ملازمت بھی دلائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ میں نے یہ باتیں سُننے کے بعد اپنا قصہ سُنانا بھی اپنا فرض سمجھا۔ مَیں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مجھے شرم تو بہت آئی لیکن میں نے سب کچھ کہہ سُنایا۔ میں چاہتا ہوں کہ ساری دُنیا حضورِ انور کے گُن گائے۔ مَیں نے بڑے فخر سے سارا قصہ سُنایا۔ میں نے انھیں اور بھی بہت کچھ بتایا (لیکن تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا) مَیں نے ان لوگوں کو مکان مالکن، ماتا ریٹ، اپنے جوزک اور مارکوٹ کے بارے میں سب کچھ کہہ سُنایا۔ کچھ لوگ ہنسے بھی۔ ممکن ہے میرے چہرے یا میرے جوتوں میں کوئی ایسی بات ہو کہ انھیں ہنسی آگئی۔ ایسے ہاں ضرور میرے جوتوں پر انھیں ہنسی آئی ہوگی۔ لیکن وہ میری ہنسی نہیں اُڑا رہے تھے۔ بھلا وہ لوگ حضورِ انور کی فیاضی کا مذاق کیسے اُڑا سکتے تھے۔ کیوں وارنیکا؟ جانِ من مجھے ابھی تک تسلی نہیں ہوئی کیونکہ ان واقعات کی مجھے توقع نہ تھی۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس ایندھن تو ضرورت کے مطابق ہے نا! اپنی صحت کا خیال رکھو کہیں سردی نہ کھا بیٹھنا۔ تمہاری اُداسی بھری باتیں مجھے بہت دکھ پہنچاتی ہیں۔ مَیں خدا سے ہمیشہ تمہارے لئے دعا مانگتا رہتا ہوں۔ تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا یا سویٹر بھی ہے یا نہیں؟ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو مجھے فوراً بتا دو۔ اس بوڑھے آدمی پر بڑا احسان کرو گی۔ بہت سے دن گذر گئے اب بُرا وقت آگیا ہے۔

بہت دُکھ اٹھائے ہم نے۔ لیکن اب وہ دن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے ہیں اور جُوں جُوں وقت گزرتا جائے گا ہم اُن دنوں کو بھی اچھی طرح یاد کیا کریں گے۔ مجھے اپنے بچپن کے دن ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ایسا بھی وقت گذرا ہے جب میری جیب میں ایک کوپک نہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں خوش رہا کرتا تھا۔ اُن دنوں میرا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی حسین چہرہ میں نے گلی میں دیکھا تھا اگر اُن دنوں وہ جب ملتا تھا تو بس سارا دن خوش رہا کرتا تھا۔ وہ وقت بھی خوب گذرا۔ زندگی بہت حسین ہے وارنیکا۔ خاص کر اگر پیٹرس برگ میں کٹے تو کیا کہنے! کل میں عبادت کرنے بیٹھا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور میں نے دعا کی کہ بُرے وقتوں میں مجھ سے جو گناہ بھی سرزد ہوا ہے وہ بخش دیا جائے۔ اس کے لئے معاف کر دیا جاؤں۔ عبادت کے دوران میں مجھے تمہارا خیال بھی آیا کیونکہ تمہیں نے مجھے حوصلے عطا کئے۔ آرام پہنچایا۔ آج میں نے ہر خط کو چوما۔ مجھے پتا چلا ہے کہ پیٹرس برگ میں کوئی سروس ٹوٹ بک رہا ہے۔ میں اُس کے بارے میں اطلاع حاصل کر دوں گا۔

خدا حافظ۔ ماکار

۱۵ اگست۔ میرے پیارے ماکار۔

مَیں بہت پریشان ہوں۔ میرا ہر خدشہ سچ ثابت ہو رہا ہے۔ اب خدا تم ہی غور کرو۔ وہ بائیکوف سینٹ پیٹرس برگ میں رہتا ہے۔ فیڈورا اُس سے ملی تھی۔ وہ ایک بگھی میں کہیں جا رہا تھا۔ جب اُس نے فیڈورا کو دیکھا تو اس سے ملنے کے لئے اُتر گیا اور فیڈورا سے پوچھنے لگا کہ ان دنوں کہاں رہتی ہے۔ جب فیڈورا نے بتانے سے انکار کر دیا تو ذرا ہنس کر کہنے لگا کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تمہارے ساتھ اور کون رہتی ہے۔ (یہ بات ضرور انا نے اسے بتائی ہوگی) فیڈورا سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سرِ عام اُس کو بہت بُرا بھلا کہا اور بولی کہ وہ اوّل درجے کا لفنگا شخص ہے بد اخلاق ہے اور میرے تمام دُکھوں کی واحد وجہ ہے۔ اس پر وہ بولا کیونکہ اس کے پاس ایک دھیلا نہیں ہے لہٰذا دُکھی تو وہ رہے گی۔ فیڈورا نے اسے بتایا کہ وہ کما کر بھی کھا سکتی ہے۔ کسی سے شادی بھی کر سکتی ہے لیکن اُس کی بدولت اور اور اُس کی مہربانیوں کی بدولت ان دنوں سخت بیمار ہے اور اگر کسی دن مر بھی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ اس پر وہ بد زبان بولا۔ کہ میں ابھی جوان ہوں اور پھر اکیلا ہوں اور بولا کہ میری آبرو میں داغ بھی لگ چکا ہے۔ (یہ اُس کے لفظ ہیں)

میرا اور فیڈورا کا خیال تھا کہ آپ ہمارے مکان کے بارے میں کوئی علم نہیں لیکن کل میں کچھ خرید و فروخت کرنے گئی تو فیڈورا کو اتنی دور تک ہو گئی تھی کہ وہ ہمارے کمرے میں آیا۔ وہ جان بوجھ کر اُس وقت آیا تھا جب میں گھر پر نہیں تھی۔ اُس نے فیڈورا سے میرے متعلق کئی سوال کئے۔ میری زندگی کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور قریب قریب گھر میں جو چیز رکھی تھی اس کا معائنہ کیا۔ میرے ہاتھ کی کاڑھی ہوئی چیزیں بھی دیکھیں اور آخرکار بولا۔ "وہ کلرک کون ہے جس سے تمہاری اتنی گہری واقفیت ہو گئی ہے؟" میں اُسی وقت تم بازار سے گذر رہے تھے اور فیڈورا نے تمہاری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہے۔ اُس نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور بس مسکرا دیا۔ فیڈورا نے اُسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور اُس سے کہہ دیا کہ میری تمام مشکلات اُسی کی پیدا کردہ ہیں اور اُس کا مجھ سے ملنا میری مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اُس نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا لیکن کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ کہ ایک 'خاص کام' کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے فیڈورا کو پچیس روبل پیش کرنا چاہے۔ فیڈورا نے اُنہیں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ وہ یہاں کیوں آیا؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اُسے ہمارے بارے میں ہر بات کا علم کیسے ہوا۔ فیڈورا کہتی ہے کہ اُس کی چچا زاد بہن اگنیسا جو کبھی کبھی ملنے آتی ہے وہ ناستاسیا کو جانتی ہے۔ ناستاسیا دھوبن ہے اور اُس کا چچا زاد بھائی اُس منسٹری میں کام کرتا ہے جہاں انیا کے بھتیجے کی جان پہچان والے لوگ اعلیٰ افسر ہیں۔ ضرور اسی طرح انیا کو ہمارے بارے میں خبریں پہنچی ہیں۔ شاید فیڈورا غلطی کر رہی ہو۔ میں کچھ نہیں سوچ رہی کہ اب کیا کریں۔ کیا وہ کمبخت دوبارہ آئے گا۔ میری جان تو اسی خیال سے خشک ہو رہی ہے۔ جب فیڈورا نے مجھے یہ سب باتیں کل بتائیں تو میں قریب قریب غش ہی کھا گئی تھی۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں اُس سے نہیں ملنا چاہتی۔ وہ مجھ غریب کی جان کو کیوں آیا ہے۔ وہ کیوں میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مجھے تو ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے۔ اگر بائیکوف ابھی مجھے آ گیا تو پھر کیا ہو گا۔ خدا جانے میری قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھ سے ملنے کے لئے فوراً چلے آؤ۔ ماکار خدا کے لئے فوراً چلے آؤ۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔ ترس کرو۔ ول ہو گی۔

و۔ د

۱۹ر ستمبر۔

مائی ڈیر وار وارا

آج کی تاریخ کو ہمارے مکان میں ایک سمجھ نہ آنے والا اور بالکل غیر متوقع سانحہ گذرا۔ وہ بیچارہ گرشکوف آج بر الزام سے بری کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ تو جج حضرات نے بہت پہلے کر لیا تھا لیکن آج وہ آخری فیصلہ سننے کے لئے گیا تھا۔ یہ مقدمہ اُس کے لئے بہت خوش قسمت ثابت ہوا۔ غلطی نہ پکڑنے کی جو بھی خطا اُس سے سرزد ہوئی تھی اُسے بر طرف کر دیا گیا۔ اور اُس سوداگر سے اُسے ایک اچھی خاصی رقم معاوضے میں دلا دی گئی ہے۔ اُس کے حالات اس سے سنور گئے ہیں اور اُس کے اخلاق پر جو داغ آیا تھا وہ بھی دھل گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ اُس کی توقعات صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ کوئی دوپہر کے تین بجے کچہری سے واپس لوٹا۔ اُس کا چہرہ گندھک کی طرح پیلا پڑ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنی بیوی کو کس کے سینے سے لگا لیا۔ بچوں کو خوب پیار کیا۔ ہم سب لوگ ہجوم کی صورت میں اُسے مبارکباد دینے لگے۔ وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ جھکا ہی جا رہا تھا۔ وہ بار بار جھک رہا تھا۔ اور ہم میں ایک ایک کے ساتھ اُس نے کئی کئی بار ہاتھ ملایا۔ کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ لمبا ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کی کمر سیدھی ہو گئی ہو۔ اُف وہ۔ کتنا خوش تھا وہ۔ وہ ایک منٹ بھی تو چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ایک چیز اُٹھاتا تو دوسری رکھ دیتا۔ بار بار مسکرائے جا رہا تھا۔ ہزار بار تو وہ اُٹھا اور بیٹھا ہی ہو گا۔ جو بات اُس کے منہ تک آتی تھی وہ کہہ سنا دیتا تھا۔ اپنے اعلیٰ چلن کے متعلق اپنی بیوی اپنے بچوں کے بارے میں نہ جانے کیا کیا اُس نے بتایا ——— وہ جذبات کی شدت میں رو بھی دیا تھا۔ ہم میں سے کئی لوگوں کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ممکن ہے اُس کی حوصلہ افزائی کے لئے راتا زیف نے کہا ہو "میرے

دوست اگر جیب میں پیسہ نہیں ہے تو کیا عزت کو چاٹنا ہے۔ اصل بات تو پیسہ ہے۔ تمہیں اس بات کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے کہ" اور راتا زیلیف اُس کے کندھوں پر تھپکنے لگا۔ یہ یوں جان پڑا کہ گروشکوف کو اُس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ جس نے غالباً بُرا مانا۔ یہ نہیں کہ اُس نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تھی بالکل نہیں۔ بس اُس نے راتا زیلیف کو عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر اُس کا ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا تھا۔ وہ پہلے ایسی بات کبھی نہ کرتا۔ خیر۔ ہر شخص کا کردار مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں خوشی کے ایسے موقع پر اتنا مغرور کبھی نہ ہوتا۔ زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب آدمی محض دوستی اور شرافت کے ناتے پر ہی جھک جاتا ہے۔ لیکن اپنے متعلق کیوں بات کروں؟ گروشکوف نے راتا زیلیف کے جواب میں کہا تھا — "ہاں — بیشک کہتے ہو پیسہ بھی اچھی چیز ہے۔ اس کے لئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اُس کی بیوی نے شام کے کھانے کے لئے اچھے اچھے پکوان تیار کرنے کو کہا اور ہماری مالکن نے اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کیا۔ ہماری مکان مالکن کام ڈھنگ کی اچھی عورت ہے۔ کھانے کا انتظار کرتے وقت گروشکوف بہت بےچین ہو گیا اور وہ قریب قریب ہر کمرے میں گیا — یہ اور بات تھی کہ کسی کو دعوت دی یا نہیں۔ وہ فقط کمرے میں جاتا مسکرا کر آداب بجا لاتا پھر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کچھ بات کرتا یا بالکل ہی خاموش رہ کر واپس چلا آتا۔ بحری فوج کے افسر نے اسے تاش کھیلنے کے کمرے میں روک لیا۔ اب وہ چار ساتھی ہو گئے لیکن گروشکوف نے سلسلہ کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا۔ بغیر سوچے سمجھے چال چل دیتا اور آخر میں یہ کہہ کر اٹھ گیا — "میں تو بس ایک دو بازیاں کھیلنے کے لئے آیا تھا۔" جب وہ مجھ سے برآمدے میں ملا تو اُس نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لئے۔ اُس نے مجھے عجیب لیکن محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر زور سے میرے ہاتھوں کو دبایا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اُس کی بیوی خوشی کے مارے پاگل ہو رہی تھی۔ اُس کمرے کا یہ عالم تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا — "میرا خیال ہے مجھے تھوڑی دیر آرام کرنا چاہیئے —" پھر کچھ دیر چھوٹی بچی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اُس نے مڑ کے اپنی بیوی کو دیکھا اور بولا — "پیٹکا کہاں ہے —" اُس کی بیوی دبیا سجدے میں جھک گئی اور اُسے یاد دلایا کہ پیٹکا کی تو وفات ہو چکی ہے — "ارے ہاں —" اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا — "پیٹکا تو جنت میں ہے —" اُس کی بیوی نے دیکھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اور اس واقعے سے اُس کی حالت کچھ غیر ہو گئی ہے۔ اُس نے اصرار کیا کہ وہ اب سو جائے — "ہاں — یہی ٹھیک ہے — مجھے اب سو جانا چاہیئے —" وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ چپ چاپ لیٹا رہا۔ اُس نے ایک بار پھر اپنی گردن گھمائی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اُس کی بیوی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور اُس نے پوچھا کہ کیا کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی بیوی کو جب یقین آگیا کہ وہ سو گیا ہے تو وہ اُٹھ کر مکان مالکن کے پاس چلی گئی اور وہاں گھنٹے بھر بیٹھی رہی۔ جب وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہا تھا اور وہ کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی کام میں اس قدر مصروف رہی کہ اُسے کچھ بھی بھول گئی۔ لیکن اچانک وہ بڑبڑا کے کام سے اٹھ بیٹھی — اور کسی انجانے ڈر کے تحت سہم کے رہ گئی۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا تھا۔ اُس نے نظر اٹھا کر بستر کی طرف دیکھا۔ اُس کے خاوند نے ابھی تک کروٹ نہ بدلی تھی۔ وہ جس پہلو سے لیٹا تھا اُسی طرح پڑا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر اُس کے قریب گئی اور دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ گروشکوف — جیسے اُس پر فالج گر گیا ہو۔ اور کسی کو علم نہیں کہ کیوں گر گیا؟ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا ہے کہ میں ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا۔ آدمی اس طرح کیسے مر سکتا ہے۔ بیچارہ گروشکوف — کیا زندگی گزاری اُس نے! کیا زندگی گزری اُس کی! اُس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کے مارے وہ کچھ بول نہ سکتی تھی۔ اُس کی ننھی لڑکی دریک کے کونے میں جا چھپی۔ پھر قیامت آ گئی۔ سنا ہے کہ اُس کی نعش کا پوسٹ مارٹم ہو گا — میں اپنے دکھ کو لفظوں میں نہیں بیان کر سکتا۔ ہم میں سے

کون قسمت کے کھیل کو جان سکتا ہے۔ آج یہاں میں تو کل یہاں بھی نہیں۔

تمہارا ماکار

میری پیاری دارد ارا۔

میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ راتاریف نے میرے لئے کسی ادیب کے ہاں ایک کام ڈھونڈ دیا ہے۔ وہ ادیب ایک ضخیم مجموعہ لے کر راتاریف کے پاس آیا تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ کام مل گیا۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ اُس ادیب کا دستخط اتنا بُرا ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ لیکن کام جلد ختم کرنے کا ٹھیکہ کیا ہے اور اصل مسودہ اتنا بُرا لکھا ہوا ہے کہ سطر پر سطر چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کوپیکس فی کاغذ کے حساب سے معاملہ طے ہوا ہے۔ میں یہ سب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اب میرے پاس کچھ مزید رقم اور کپڑے آجائیں گے۔ خدا حافظ۔ مجھے اپنا کام شروع کرنا ہے۔

تمہارا دوست ماکار

میرے پیارے دوست ماکار

میں نے گذشتہ تین روز سے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا لیکن ان تین دنوں میں مجھ پر آفت آپڑی ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ بائیکوف پھر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ فیڈورا کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ جب میں نے دروازے پر دستک سن کر دروازہ کھولا اور اُسے دیکھا تو اتنی زیادہ ڈر گئی تھی کہ اپنی جگہ سے ہلنا محال ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ حسبِ معمول زور سے ہنسا اور اندر آگیا۔ کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک کونے میں بیٹھ کر کام میں لگ گئی۔ جب اُس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا تو اُس کی مسکراہٹ دب کے رہ گئی۔ میں اتنی کمزور ہوچکی ہوں۔ میرا خیال ہے میرا رنگ کاغذ کی طرح سفید پڑ چکا ہے۔ وہ لوگ جو ایک سال پہلے مجھے جانتے تھے اگر اب مجھے دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کچھ دیر تو وہ سنجیدگی سے بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر اُس کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر اُبھر آئی۔ اُس نے کچھ کہا تھا۔ میں نے جواب میں کیا کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں لیکن وہ زور سے ہنسا تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ یہاں بیٹھا

رہا۔ سوالات کرتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا (یہاں میں اُسی کے الفاظ دہرا رہی ہوں) دار دارا — یہ بات ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیئے۔ یہ جو تمہاری رشتہ دار اور میری واقف اینا ہے نا یہ کمینی اور بداخلاق عورت ہے۔ اُس نے تمہاری چچازاد بہن ساشا کو آوارہ لڑکی بنادیا ہے اور تمہیں بھی تباہ کیا ہے۔ رہا میرا سوال تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا رویہ لفنگوں اور لچوں جیسا رہا ہے۔ اور ہر انسان کردار کی کمزوری کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ زور سے ہنسا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ وہ اچھا مقرر نہیں ہے لیکن اُس نے مزاحیہ انداز میں جو کہنا چاہا وہ کہہ گیا اور اب وہ چھوٹی سی بات صاف صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہے۔ اُس نے دبیں اور کھلے الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میری عزت اور وقار کو قائم کرنا اُس کا فرض ہے۔ وہ امیر ہے اور کہہ رہا تھا کہ شادی کے فوراً ہی بعد وہ مجھے اپنے گاؤں لے جائے گا جہاں وہ خرگوشوں کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اب وہ سینٹ پیٹرس برگ بالکل نہیں جائے گا کیونکہ وہ شہر خراب ہے۔ اُس کی فضا خراب ہے۔ اُس شہر میں اُس کا ایک آوارہ بھتیجا بھی رہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اُسے ایک پائی نہیں دے گا اور اُس سے تعلقات ختم کردے گا۔ اُس نے کہا کہ شادی کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے، وہ اپنی دولت کا شریک کسی غیر آدمی کو نہیں بنانا چاہتا۔ پھر بولا کہ جب اتنی غریبی میں رہ رہی ہو تو بیمار ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ اور بولا کہ اگر ایک مہینہ اور یونہی رہیں تو دیکھ لینا کہ چل بسو گی۔ اور کہتا گیا کہ پیٹرس برگ میں رہنا تو اپنی آبرو سے کھیلنے کے برابر ہے اور مجھ سے کہہ گیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادو۔

اُس کی اس پیشکش سے مجھے اس قدر گھبراہٹ ہوئی کہ بہت روئی۔ رونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سمجھا کہ میں تشکر کے احساس سے رو رہی ہوں اور لیا کر آگے بیٹھے اسی بات

سا تقین تھا کہ میں ایک نیک اچھی اور سمجھدار لڑکی ہوں لیکن تاہم جب تک اُس نے میرے بارے میں مکمل تحقیق نہ کر لی تھی تب تک یہ قدم نہ اُٹھایا تھا۔ پھر اُس نے تمہارے بارے میں کچھ سوالات پوچھے اور کہنے لگا سنتا ہے وہ آدمی بھی اصُول کا مالک ہے۔ نیک ہے اور وہ بھی تمہارے لئے کسی بوجھ تلے نہیں دبنا چاہتا۔ کیا اُس نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے اُس کے معاوضے میں پانچ سو روبل کافی ہوں گے ہے؟

جب میں نے اُس کو بتایا کہ تمہارے احسانات کا بدلہ کسی صورت نہیں چکایا جا سکتا ___ دولت سے تو بالکل نہیں چکایا جا سکتا تو وہ بولا کہ یہ سب بکواس ہے۔ کہنے لگا یہ سب کتابی قصّے کہانیاں ہیں۔ کہنے لگا میں ابھی بچی ہی ہوں اور شاید مجھے ابھی تک شعر و شاعری پڑھنے کا شوق ہو۔ کہنے لگا اسی شعر و شاعری اور ناولوں نے تو نوجوان لڑکیوں کو تباہ کیا ہے۔ کتابیں اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اسی لئے تو وہ انہیں بُرا سمجھتا ہے۔ اگر میں بھی اتنا ہی بڑی ہوتی جتنی اس کی عمر ہے تو شاید لوگوں کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ جبھی مجھے پتا چل سکے گا کہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ وہ کہنے لگا اُس کی پیش کش پر اچھی طرح سوچ بچار کروں کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اگر میں جلد بازی اور بغیر سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کروں گی تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی جلد بازی اور ناسمجھی نے تو نوجوانوں کو تباہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے منہ سے ہاں سُننا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ پھر اُسے مجبوراً ماسکو کے ایک سوداگر کی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی کیونکہ وہ اپنے بھتیجے کو اپنی دولت کا وارث نہیں بنانا چاہتا۔ اور وہ میرے انکار کرنے پر بھی میری الماری کے اوپر پانچ سو روبل رکھ گیا۔ اُس نے کہا تھا مٹھائی کھا لینا۔ وہ کہتا تھا کہ میں دیہات میں اتنی صحت مند ہو جاؤں گی کہ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے حد مصروف نظر آتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سارا دن بھاگ دوڑ میں گذر گیا ہے۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر چلا گیا۔ میں نے اُس کے جانے کے بعد بہت سوچا اور جتنا سوچا اتنا دکھی ہوئی لیکن آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی ہوں۔ میں اس آدمی سے شادی کروں گی۔ میں اس کی پیش کش قبول کر لوں گی۔ اگر کوئی شخص مجھے اس ذلت سے بچا سکتا ہے۔ میری نیک نامی مجھے لوٹا سکتا ہے، مجھے غربت اور ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے تو وہ یہی شخص ہے۔ اس سے زیادہ میں اپنے مستقبل سے اور کیا مانگ سکتی ہوں؟ اس سے زیادہ میں تقدیر سے کیا چاہتی ہوں۔ فیڈورا کہتی ہے انسان کو اپنی خوشی سے منہ نہیں پھیرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ خوشی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے تو میرے دوست مجھے کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا۔ میں اتنا زیادہ کام کر رہی ہوں کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے۔ کہیں استانی یا نوکرانی بن جاؤں؟ تو سوائے اس کے کہ تنہائیوں میں گھل گھل کے مروں اور کسی کام کی نہ رہوں اور کیا ہوگا۔ ابھی فطرتاً بیمار کردار ہوں اور ہمیشہ کسی نہ کسی پر بوجھ بنی رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں جنت میں نہیں جا رہی لیکن میں کیا کروں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے کونسا راستہ نظر آرہا ہے۔

میں کوئی رائے نہیں چاہتی۔ میں اس معاملے پر خود غور کرنا چاہتی ہوں۔ میرا فیصلہ جو تم پڑھ چکے ہو وہ اب بدلا نہیں جا سکتا۔ اور میں بائیکوف کو اس فیصلے کی اطلاع دے دوں گی۔ کیونکہ وہی پیش کش کر رہا ہے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا اور میرے کچھ وہموں کی بنا پر وہ شادی کی تاریخ کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں خوش ہوں گی یا نہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اپنی قسمت کا فیصلہ اُس پروردگار پر چھوڑتی ہوں ___ لوگوں کا کہنا ہے کہ بائیکوف اچھا انسان ہے۔ وہ میری عزت کرے گا اور ممکن ہے کہ میں بھی اُس کی عزت کرنا سیکھ جاؤں گی۔ پھر اس شادی سے میں اور کیا توقع کروں؟

ماکار میں نے یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ مجھے یقین ہے تم معاملے کی نزاکت کو سمجھو گے۔ مجھے اب اس فیصلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس بات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو اور سوچو کہ کن حالات نے مجھے یہ قدم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ پہلے میں بہت پریشان ہو اُٹھی تھی لیکن اب مجھے اطمینان ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرا کیا بنے گا۔ قسمت کو کون جانتا ہے۔ کوئی جو چاہے کرے ___ ہوتی خدا کی

مرضی ہی ہے۔

بائیکوف ابھی ابھی کمرے میں آیا ہے۔ میں یہ خط ادھورا چھوڑ رہی ہوں۔ حالانکہ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔

۲۴ ستمبر۔

میری عزیز واروارا

میں تمہارے خط کا جواب بلا پسِ و پیش دے رہا ہوں۔ اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سخت حیران ہوں۔ کہیں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے۔ کل ہم نے گرو شکوف کو دفنا دیا۔ ہاں۔ بائیکوف نے نیکی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن عزیزم کیا تم واقعی ہاں کر چکی ہو؟ خیر سب کچھ کرنے والا تو وہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ اور خدا جیسا چاہتا ہے قسمت ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ فیڈورا بھی متفق ہے۔ چلو۔ اب تم خوش رہو گی۔ میری ننھی سی فاختہ۔ میرے خوبصورت فرشتے اب تم چین سے رہو گی۔ آنند سے رہو گی۔ لیکن وارنیکا اتنی جلدی کیوں۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ارے ہاں۔ مسٹر بائیکوف کے کاروباری معاملات میں فرق آتا ہوگا۔ آخر ہر شخص کو اپنا کام ختم کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اُسے تمہارے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھی وضع قطع کا مالک ہے۔ اچھی صورت ہے لیکن کہیں نہ کہیں کچھ خرابی ضرور ہے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ اچھی صورت کا ہے سوال یہ ہے کہ مجھے فکر دامن گیر ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو خط کیسے لکھ سکیں گے۔ اور میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ میں تمہاری تمام دلیلوں پر غور کر رہا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے غور کر رہا ہوں۔ میں اس ادیب کے مسودے کا بیسواں صفحہ لکھ رہا تھا جب تمہارا خط مجھے پہنچا۔ تم جا رہی ہو۔ تم کو زندگی کی ضروریات کا پورا سامان خرید لینا چاہیئے۔ جوتا ہیں۔ سویٹر۔ جوتے وغیرہ وغیرہ۔ گروکھووایا پر ایک دوکان ہے۔ یاد ہے میں پہلے بھی تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ لیکن اب تم مجھے چھوڑ کیسے رہی ہو؟ یہ خیال مجھے کھائے جا رہا ہے۔ تم اس وقت نہیں جا سکتیں ۔۔ بالکل نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ابھی اتنا کچھ خریدنا ہے اور پھر تمہیں بھی خریدنی ہے۔ موسم خراب ہے اور دیکھو تو سہی کہ کتنی بارش ہو رہی ہے۔ تمہیں سردی لگ جائے گی۔ اور پھر کیا ایک اجنبی کے ہمراہ جاتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ میرا یہاں کون رہ جائے گا؟ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت خوش قسمت ہو۔ لیکن وہ تو چڑیل ہے۔ وہ تو مجھے برباد کرنے کا سوچتی رہتی ہے۔ کیا تم ولیسپرز دیکھنے جاؤ گی؟ میں وہاں تمہیں ایک نظر دیکھنے جاؤں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ لیکن اگر وہ سوداگر کی لڑکی سے شادی کر لے تو اس کے لئے اچھا رہے گا کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ اندھیرا چھا جانے کے بعد میں گھنٹہ بھر کے لئے تم سے ملنے چلا آؤں گا۔ ان دنوں جلدی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں آج ضرور آؤں گا۔ بس شام ہوتے ہی چلا آؤں گا۔ تمہیں بائیکوف کے آنے کی امید ہوگی اور بس اُس کے جاتے ہی میں چلا آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا میں ضرور آؤں گا۔

ماکار دیوشکن

۲۷ ستمبر۔

میرے پیارے دوست ماکار

مسٹر بائیکوف کا کہنا ہے کہ میرے پاس ہالینڈ کی بنی ہوئی ریشم کی تین درجن قمیصیں ہونی چاہئیں۔ دو درجن جمپر تیار کرنے کے لئے مجھے ایک درزن تلاش کرنی پڑے گی۔ اور وقت بہت کم ہے۔ بائیکوف بہت بے صبر ہو رہا ہے وہ کہتا ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت تکلیف پہنچاتی ہیں۔ ہماری شادی پانچ دن بعد طے پائی ہے اور اُس سے اگلے روز ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بائیکوف کو بہت جلدی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا زیادہ وقت ضائع کرتے ہوئے اُسے شرم آتی ہے۔ میں اتنی بھاگ دوڑ کر چکی ہوں کہ میری ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ ابھی اتنا کام کرنا باقی ہے اور بہت سارا کام تو بغیر کئے ہی چھوڑنا پڑے گا۔ ہاں ایک بات اور ہے ہم نے ریشمی دھاگا اور ڈوریاں زیادہ نہیں خریدیں اور پھر ہمارے پاس خریدنے والا بھی کوئی نہیں۔ بائیکوف کہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو دیہاتی لباس میں نہیں دیکھنا چاہتا اور اُس کے بقول مجھے مقامی عورتوں کا سر نیچا کرنا ہوگا۔ کیا تم گروکھووایا کی مادام شفون سے مل سکتے ہو؟ اُس سے کہو کہ فوراً کسی درزن کو بھیج دے۔ اور عین کرم ہوگا اگر خود چلی آئے آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

ہمارا نیا گھر بہت ٹھنڈا ہے اور ابھی اسے صاف کرنے کا کام باقی ہے۔ بائیکوف کی ایک چچی بھی ہے۔ وہ اتنی بوڑھی اور بیمار ہے کہ مجھے شبہ ہے کہ ہماری روانگی سے پہلے ہی انتقال کر جائے۔ بائیکوف کہتا ہے کہ فکر مت کرو۔ وہ اپنے آپ چلی آئے گی۔ ہر چیز بے ترتیب ہے۔ بائیکوف خود یہاں رہتا نہیں اور نوکر خدا جانے کہاں بھاگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو صرف فیڈورا کام کرنے کے لئے رہ جاتی ہے۔ بائیکوف کا ایک خاص نوکر ہے۔ عام طور پر سب انتظام اُسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ تین روز کے لئے چلا گیا ہے۔ بائیکوف ہر صبح یہاں آتا ہے اور جب بھی آتا ہے غصے ہی میں آتا ہے۔ کل اُس نے باورچی کو اتنا مارا کہ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ اب تم تک میرے خط پہنچانے والا کوئی نہیں لہٰذا میں یہ خط ڈاک میں ڈال رہی ہوں۔ ارے بابا۔ میں سب سے ضروری بات تو بھول ہی گئی۔ میڈم چیفون سے کہنا کہ وہ بلاؤز کا ڈیزائن کل کے بھیجے ہوئے نمونے کے مطابق تیار کرے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ وہ خود چلی آئے اور مجھے سب ڈیزائن دکھا دے۔ ہاں اُسے یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے چیزوں کے بارے میں اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اب میرے جمپر کریپ سے تیار کئے جائیں۔ اور ان پر ریشمی دھاگوں کی بجائے گلکاری کی جائے۔ تمہیں یہ سب باتیں یاد رہیں گی نا؟ میں تو ہر بات بھولتی جا رہی ہوں۔ اُسے یہ بھی کہنا ہے کہ اونی کوٹ کے کالر ذرا اونچے ہونے چاہئیں اور اُن پر ریشمی ڈوری سے کڑھائی ہونی چاہیئے۔ دیکھو بھولنا نہیں۔

تمہاری

وی۔ ڈی۔

مجھے بہت شرم آتی ہے کہ میں تمہیں اس طرح تکلیف دے رہی ہوں۔ پرسوں بھی تم ساری صبح بھاگتے پھرتے رہے تھے۔ لیکن اب میرے کام کون کرے گا۔ یہاں کوئی چیز ترتیب سے نہیں ہے اور میں بیمار ہوں۔ ماکار مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔ میں پہلے ہی بہت اُداس ہوں۔ میرے نیک دل دوست جانے میرا کیا بنے گا! میں آنے والے کل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ میں کچھ بھی اندازہ کرتے ہوئے ڈرتی ہوں اور ہر بات سے غافل ہو کر جی رہی ہوں۔ میں نے جو کام بتائے ہیں انھیں نہ بھول جانا۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں تم غلطی نہ کر بیٹھو۔ یاد رکھنا صرف ریشمی دھاگے سے نہیں بلکہ گلکاری۔

۲۷ ستمبر۔

میری پیاری فیودورا۔

میں نے تمہاری ہدایت پر پوری توجہ سے عمل کیا ہے۔ میڈم چیفون کہتی تھی کہ وہ خود گلکاری کا کام کرے گی کیونکہ یہ زیادہ خوبصورت ہوگا یا کیا ہوگا مجھے یہ یاد نہیں رہا۔ اُس نے ریشمی دھاگے کے بارے میں بھی کچھ کہا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اُس نے ریشمی دھاگے کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔ مجھے تو وہ عورت پاگل نظر آتی ہے۔ اور اس نے کیا کہا تھا؟ وہ خود ہی تمہیں بتا دے گی۔ میں تو بھاگ بھاگ کے تھکن سے اتنا چور ہو چکا ہوں کہ آج دفتر بھی نہیں گیا۔ لیکن تم اس کی فکر مت کرو۔ میں تمہارے سکون کی خاطر شہر کی ہر دکان پر پہنچ کر تیار ہوں۔ تم کہتی ہو کہ تم مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہو تو سات بجے تمہیں ہر بات کا علم ہو جائے گا۔ میڈم چیفون نے سات بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ یوں دل نہ چھوڑ بیٹھو۔ سب ٹھیک ہوگا۔ ارے کیا وہ ریشمی دھاگے کی مصیبت ہے۔ نہ یاد آتی ہے نہ بھولتی ہے۔ میں خود تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ میں ضرور آؤں گا۔ درحقیقت میں دو بار تمہارے گھر کے دروازے کے آگے سے گزرا بھی ہوں لیکن وہ بائیکوف ہمیشہ اتنے غصے میں ہوتا ہے کہ بس — واقعی — خیر کیا ہو سکتا ہے۔

ماکار

۲۸ ستمبر۔

میرے پیارے ماکار

دیکھو فوراً بھاگ کے جوہری کی دکان پر جاؤ اور اُس سے کہہ دو کہ زمرد اور نگینے کے بندے نہ بنائے۔ بائیکوف اب کہہ رہا ہے کہ قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ بائیکوف بہت ناراض ہے اور کہتا ہے کہ ان چیزوں میں پہلے ہی اندھی دولت خرچ آ چکی ہے۔ اور اُسے لوٹا جا رہا ہے۔ کل بھی وہ کہہ رہا تھا کہ اگر اُسے ان اخراجات کا اندازہ پہلے ہو جاتا تو وہ یوں وعدہ نہ کر بیٹھتا۔ اُس نے کہا تھا کہ شادی ہوتے ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔ کسی مہمان کو نہیں بلایا جا۔

کوئی دعوت نہیں کی جائے گی اور ایک عرصے تک کسی دعوت کی اُمید نہیں۔ وہ اسی طرح باتیں کرتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں اور بائیکوف نے خود انھیں تیار کرایا ہے۔ میں اُسے جواب اس لئے نہیں دیتی کیونکہ وہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ نہ جانے میرا کیا بنے گا؟

۲۸ر ستمبر۔

میری بچی وار وارا

میں کہنا ———— میرا مطلب ہے کہ جوہری تک تمہارا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ میں کہنے یہ لگا تھا کہ میں بیمار ہوں اور بستر پر پڑا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں کہ جب کام کا وقت آتا ہے تبھی بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اور میری مزید بدقسمتی یہ ہے کہ حال ہی میں حضور انور بہت غصے میں تھے اور انھوں نے ایمیون ایئولو وچ کو اس قدر ڈانٹا کہ بیچارہ بے ہوش ہو گیا۔ بس میں تمھیں یہ بتانا چاہتا تھا۔ میں اور لمبا خط لکھتا لیکن اس خیال سے قلم رُک گیا ہے کہ تمھیں ناواجب پریشانی ہوگی۔ میں چالاک آدمی کہاں ہوں۔ میں تو صاف صاف باتیں کہنا جانتا ہوں اور جو میرے دل میں آتا ہے وہ خط میں لکھ دیتا ہوں۔ جبھی تمھیں نظر آتا ہے کہ میری کچھ باتیں اتنی صاف نہیں ہوتیں جتنا انھیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ماکار

۲۹ر ستمبر۔

میری پیاری ننھی بچی۔

آج مجھے فیڈورا ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کل تمہاری شادی ہو جائے گی اور پرسوں تم چلی جاؤ گی۔ سُنا ہے مسٹر بائیکوف نے گھوڑے کرائے پر لے بھی لئے ہیں۔ میں حضور انور کے متعلق تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ اور کیا لکھنا ہے؟ ارے ہاں گرد کھووا یا کی دوکان کے جتنے بل آئے تھے میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے۔ بل تو ٹھیک ہیں لیکن بہت ہی مہنگی اور قیمتی خریدی گئی ہیں۔ اور یہ بتاؤ یہ بائیکوف تم پر کیوں خفا ہوتا ہے۔ میں تو اتنی ہی دعا کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ خوش رہو۔ یہ جان کر کہ تم خوش ہو میں بھی بہت خوش ہوں گا۔ اگر میری بیٹھے میں درد پھر نہ شروع ہو گیا تو میں شادی کے موقع پر ضرور آؤں گا۔ ہاں ——— خطوں کا ذکر دوبارہ زبان پر آجاتا ہے ——— خطوں کون پہنچائے گا؟ فیڈورا ——— خیر اُس کی جھولی تم نے بھر دی یہ بہت اچھا کیا ——— تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ اور اس کے عوض خدا تمھیں صلہ دے گا۔ اچھے کام کا ضرور پھل ملتا ہے۔ اور نیکی اُس پیرو نگار کے انصاف کو ضرور جیت لیتی ہے۔ میری پیاری۔ میری بچی میں تو ہر گھنٹے کے بعد تمھیں خط لکھنا چاہوں گا۔ ہر منٹ کے بعد لکھنا چاہوں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ میرے پاس تمہاری وہ کتاب The Tales of Ivan e Bun ہے۔ اُسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ اور میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں اُسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ سردیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ اور اب شامیں بڑی ہو جائیں گی۔ بڑی ہو جائیں گی اور اُداس ہو جائیں گی۔ اُس وقت کچھ پڑھنے کو جی چاہے گا۔ میں اس کمرے سے تمہارے پُرانے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ جہاں اب فیڈورا رہتی ہے۔ میں اُس نیک اور ایماندار عورت کو کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں کروں گا۔ بہت اچھی عورت ہے۔ کیا کہنے۔ کل میں تمہارا خالی کمرہ دیکھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں خوب گھوما۔ ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک کونے میں تمہاری سلائی کڑھائی کا ادھورا کام بھی پڑا تھا جسے تم کرتے کرتے چھوڑ گئیں۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھا اور ایک دو اور چیزیں بھی دیکھیں۔ مجھے یہ جان کے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے ریشم کی گولی بنانے کے لئے میرے ایک خط کو استعمال کیا ہے۔ میز پر مجھے کاغذ کا ایک ایسا ٹکڑا نظر آیا جس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا "ڈیر ماکار۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں —" اُس وقت شاید کوئی آگیا ہوگا اور یہ خط ادھورا رہ گیا ہوگا۔ اور اُس پردے کے پیچھے میں نے تمہارا چھوٹا سا پیارا سا بستر بھی دیکھا میری ننھی سی فاختہ۔ اچھا۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ۔

میری عزیز بچی ——— جواب دینا ——— اچھا!

ماکار۔

ستمبر۔

میرے بچے اور مخلص دوست ماکار

جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ناتا ہو گیا۔ اب میری قسمت میں کیا لکھا ہے یہ میں نہیں جانتی لیکن اب میں اس پروردگار کے ہاتھ میں ہوں۔

میرے قریبی دوست، میری زندگی کے رکھوالے، میری آتما — میں یہ الوداعی سطریں لکھ رہی ہوں کیونکہ کل ہم چلے جائیں گے۔ میرے لئے مت رونا۔ خوش رہنا۔ مجھے یاد کرو گے نا۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔

میں تمہیں ہمیشہ یاد کیا کروں گی اور دعا کے وقت تمہارا نام لیا کروں گی۔ میری زندگی کے جو دن یہاں گذرے تھے تو ان کا خاتمہ ہو چکا۔ مستقبل میں مجھے جو کچھ یاد آئے گا اس سے مجھے چین تو کم ملے گا لیکن تمہاری یاد مجھے سب سے عزیز ہو گی۔ ساری دنیا میں صرف تمہیں میرے دوست ہو۔ تمہیں وہ ہو جس نے مجھ سے پیار کیا۔ میں جانتی تھی مجھے سب معلوم تھا کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے۔ محض میری مسکراہٹ یا میرے ہاتھ کی ایک سطر تمہیں خوش کرنے کے لئے بہت تھی۔ اب تمہیں مجھے بھولنا پڑے گا۔ آہ — تم کس قدر تنہا رہ جاؤ گے؟ اب تمہیں آرام پہنچانے والا یہاں کون رہ جائے گا۔ تمہیں کون تسکین دے گا۔ میرے مہربان اور دلی دوست میں وہ کتاب، وہ سوناٹا کریٹشر کا کام اور وہ خط جو ادھورا رہ گیا تھا تمہارے لئے یہیں چھوڑ جاؤں گی۔ بس پہلی سطر کو پڑھو — پھر پڑھو اور دیکھو کہ باقی مضمون کے متعلق اندازہ کر کے تمہیں کتنی خوشی ہو گی۔ خدا جانے میں کیا لکھنے بیٹھی تھی۔ یا کیا لکھتی! دیکھو اپنی وارنیکا کو ضرور یاد رکھنا۔ تم نے اتنا پیار کیا ہے تو بھول نہ جانا۔ میں نے تمہارے تمام خطوط احتیاط سے میز کے اوپر والے خانے میں رکھ چھوڑے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ تم بیمار ہو لیکن بائیکوف آج مجھے باہر نہیں جانے دے گا۔ میں تمہیں خط ضرور لکھا کروں گی لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ میرا کیا بنے گا اس لئے میرے عزیز ترین دوست میری روح سے آواز آ رہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے آخری الوداع اور خدا حافظ کہہ دیں۔ میرا بس چلتا تو میں تمہارے سینے سے آ لگتی۔ خدا حافظ میرے دوست خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا خوش رہنا۔ میں تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگوں گی۔ میں اپنے دل کا بوجھ بیان نہیں کر سکتی۔ بائیکوف بلا رہا ہے۔ میرا رومال رواں رواں رو رہا ہے۔ میری روح ادھڑ رہی ہے، آنسو آنکھوں میں یوں امڈتے چلے آ رہے ہیں کہ جی گھٹتا جا رہا ہے۔ خدا حافظ — اپنی بے آسرا وارنیکا کو یاد رکھنا۔

ہمیشہ تمہاری

وارنیکا۔

وارنیکا، میری جان۔ میری فاختہ۔ میری زندگی۔

وہ لوگ تمہیں مجھ سے بہت دور لئے جا رہے ہیں۔ تمہیں زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ وارنیکا تم جا رہی ہو کیا! انہیں اس طرح کرنے سے انہوں نے کسی خنجر سے میرا دل کیوں نہیں چیر کے رکھ دیا۔ تم نے انہیں مجھ پر ظلم کرنے کیسے دیا؟ تم رو رہی ہو لیکن جانے پر مجبور ہو۔ مجھے تمہارا جو خط ابھی ابھی پہنچا ہے وہ ابھی تک آنسوؤں کے قطروں سے گیلا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم جانا نہیں چاہتیں۔ اور وہ زبردستی کر رہے ہیں — اور تمہیں میری یاد آ رہی ہے — تمہیں میرے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے — تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ اب تمہارا خیال کون رکھے گا۔ تمہارا ننھا سا معصوم دل تنہائیوں میں رو رو کر ہلکان ہو گا۔ تمہیں رنج گھن بن کے کھا جائے گا۔ تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ تم وہاں تنہائیوں میں گھل گھل کے مر جاؤ گی اور وہ ظالم تمہیں یخ بستہ مٹی میں دفنا دیں گے۔ وارنیکا — تمہاری قبر پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔ بائیکوف تو خرگوشوں کے شکار میں مصروف ہو گا۔ اسے فرصت نہیں ملے گی۔ میری بچی تم نے ایسا قدم اٹھایا کیوں! ہائے تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے یہ کیا کیا۔ اپنے ساتھ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ لوگ مل کر تمہیں دھکے دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ تمہارا وہ ننھا سا جگر ذبح کر دیں گے۔ میرے ننھے فرشتے تم تو اتنی نازک ہو جیسے فاختہ کا ننھا سا بچہ۔

ارے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ارے میں نے کیا کیا۔ میں دیکھ رہا تھا میں جانتا تھا کہ بچی بہک گئی ہے۔ میری بچی بیمار ہے۔ مجھے جان پر کھیل کے بچانا۔۔ لیکن اب کیا۔۔ میں تو بے وقوف بنا رہا۔ میں تو بیوقوف رہا مجھے کچھ نہیں سوجھا۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔۔ جیسے جو کچھ بھی ہو رہا تھا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھ پر خدا کی مار۔ میں بیوقوفوں کی طرح ریشمی دھاگے کے پیچھے بھاگتا پھرا۔ نہیں وارنیکا۔ یہ نہیں ہو گا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ میں کل ٹھیک ہو جاؤں گا اور میں بستر پر نہیں پڑا رہوں گا کل۔۔ میں تمہاری بگھی کے نیچے سر دے دوں گا۔ میں نہیں تمہیں جانے دوں گا یہ تو ظلم ہے۔ انھیں یہ ظلم کرنے کا کیا حق ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اگر تم مجھے ساتھ نہ لے جاؤ گی تو میں تمہاری بگھی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔ جب تک سانس ساتھ دے گا تب تک بھاگوں گا۔ وارنیکا! کہاں جا رہی ہو؟ کیا جانتی بھی ہو؟ سُنو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم چٹانی علاقوں میں جا رہی ہو، وہ علاقے میرے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح بے جان، ننگے اور خشک ہیں۔ تم وہاں کس سے ملو گی؟ وہاں اُجڈ اور گنوار دیہاتیوں کی بیویاں ہوں گی۔ اُن کے شوہر شرابی اور بدتمیز ہوں گے۔ سردی اور بارش نے تو وہاں کے درختوں کو بھی کالا اور ننگا کر دیا ہے۔ میری بچی تم اس جگہ جا رہی ہو۔ بائیکوف خرگوش کا شکار کرتا رہے گا اور تم؟ تم میری بچی۔ کیا ایک زمیندار کی بیوی بننا چاہتی ہو؟ وارنیکا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اب خط کسے لکھوں گا؟ اب میں وارنیکا کہہ کر کسے پکارا کروں گا؟ میں اس پیارے پیارے نام سے کس کو آواز دوں گا۔ میرے ننھے فرشتے میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ میں مر جاؤں گا! وارنیکا۔ میں یہ صدمہ نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں نے تمہیں خدا کا اور مجھ کر پیار کیا ہے۔ اپنی جان کر پیار کیا ہے۔ میں تمہارا نام لے لے کر جیتا تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میری زبان پر تمہارا نام رہتا تھا۔ میں کام ختم کر کے اور مسودوں کی نقل اتار کے خطوں میں اپنے جذبات بیان کر دیتا تھا کیونکہ اس طرح میں تمہیں اپنے قریب محسوس کرتا تھا۔ شاید تم نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا لیکن یہ سچ ہے۔ سُنو۔ میری بات سُنو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جا رہی ہو۔ تم نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسے بارش کتنے زوروں سے ہو رہی ہے۔ تمہیں تو سردی لگ جائے گی۔ تم اتنی کمزور اور نازک ہو۔ بگھی کی چھت سے پانی ٹپکے گا بلکہ بگھی ٹوٹ جائے گی۔ اس شہر کی سڑکوں سے جونہی تم باہر نکلو گی بگھی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ کون جانے۔ پیٹرس برگ کی بگھی بنانے والے تو گدھے ہیں۔ انھیں تو صرف اتنا پتا ہے کہ بگھی کو اور زیادہ نقش دار کیسے بنا دیا جائے۔ لیکن وہ مضبوط بگھی نہیں بنا سکتے۔ نہیں وہ نہیں بنا سکتے میں قسم اٹھا کے کہتا ہوں۔ میں بائیکوف کے پاؤں پکڑ لوں گا۔ اُس کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی بات سچ ثابت کر دوں گا۔ وہ سب دیکھ لیں گے۔ اور جانِ من تم بھی تو اُس سے کہو۔ اُسے کہہ دو کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ کہہ دو کہ میں یہیں رہوں گی۔ میرے خدا۔۔ اس نے ماسکو کے سوداگر کی لڑکی سے کیوں نہ شادی کر لی۔ اُسے کیا مصیبت پڑی تھی۔۔ اُس کے ساتھ شادی کر لیتا تو اُسی کے حق میں اچھا رہتا۔ سوداگر کی لڑکی اس سے نباہ کر لیتی۔ مجھے پورا یقین ہے۔ پھر تم میرے پاس یہاں رہ سکتی تھیں۔ اور پھر تمہیں بائیکوف کی کیوں ضرورت محسوس ہو گی؟ وہ تمہیں کب سے پیارا ہو گیا۔ ریشمی کپڑوں کی بنا پر تو تمہیں اُس سے پیار نہیں ہو گیا نا؟ اور ریشمی دھاگے ہوتے کیا ہیں۔ اُن کا ذکر ہی کیوں کیا جائے بکواس ہے۔ اب سوال زندگی اور موت کا ہے ریشمی دھاگوں کا نہیں۔ ریشمی دھاگے کیا چیز ہیں کپڑا اور کیا۔ ارے گھٹیا کپڑا۔ بس مجھے تنخواہ مل لینے دو۔ ہیں۔۔ میری تنخواہ آنے کا انتظار کر لو میری بچی تم جتنے ریشمی کپڑے کہو گی میں تمہیں خرید دوں گا؟ اُسی دوکان سے۔۔ یاد ہے نا؟ بس میری تنخواہ آ لینے دو۔ وارنیکا۔ میری زندگی۔۔ تب تک انتظار کر لو۔ وارنیکا خدا کے لئے رک جاؤ۔ کیا تم واقعی بائیکوف کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ ہمیشہ کے لئے؟ نہیں وارنیکا نہیں۔ تم مجھے پھر خط لکھنا۔ اچھا۔ ایک خط تو اور لکھ دو! اور اُن چٹانوں کی بستی میں جا کر دوبارہ لکھنا۔ اگر تم نہیں لکھو گی تو یہ جو تمہارا خط میرے پاس پڑا ہے یہ آخری خط بن جائیگا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ آخری خط نہیں ہو سکتا۔ اسے یہ کیسے ممکن ہے۔۔ ایک غم۔۔ یہ احساس کہ یہ تمہارا آخری خط ہے۔۔ میں نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم بھی لکھنا اب تو میرے لکھنے کا انداز نکھر رہا ہے۔۔ کیسا انداز؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ لیکن جب تک میں لکھے جاؤں تب تک کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میری ننھی فاختہ۔۔ میری بچی۔۔ میری اپنی۔۔!

شاہکار

میکسم گورکی

حقیقت پسندی کی عالی تمام ادبی تخلیقات کی بنیاد زندگی پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے گورکی نہ صرف بہت بڑا حقیقت پسند تھا بلکہ زندگی کا عظیم معلم بھی تھا۔ انشاپردازی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے لئے ایک ادیب کو اپنے تجربوں، اپنی معلومات، اپنے مشاہدوں، اخلاقی قدروں، اپنے جمالیاتی ذوق اور زبان و اظہار پر اپنے عبور کی مدد سے حقیقت کی ایک جالی بکنا پڑتی ہے۔ میکسم گورکی نے اپنی تمام تخلیقات میں حقائق کو کچھ ایسے ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔ میکسم گورکی نے زندگی کو نہایت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ وہ روس جیسے عظیم ملک کے ہر گوشے میں پچیس برس تک آوارہ گردی کرتا رہا تھا اور زندگی کے مختلف سرچشموں سے اپنے ذہن و فکر کو سیراب کرتا رہا تھا۔ اس نے زندگی کے ایسے دلآویز نقش پیش کئے ہیں کہ آج تک وہ دنیا کے حقیقت پسند ادیبوں کو متاثر کرتا چلا آرہا ہے۔ ادیب اس کی نگارشات سے فیضِ عرفان حاصل کرتے ہیں۔

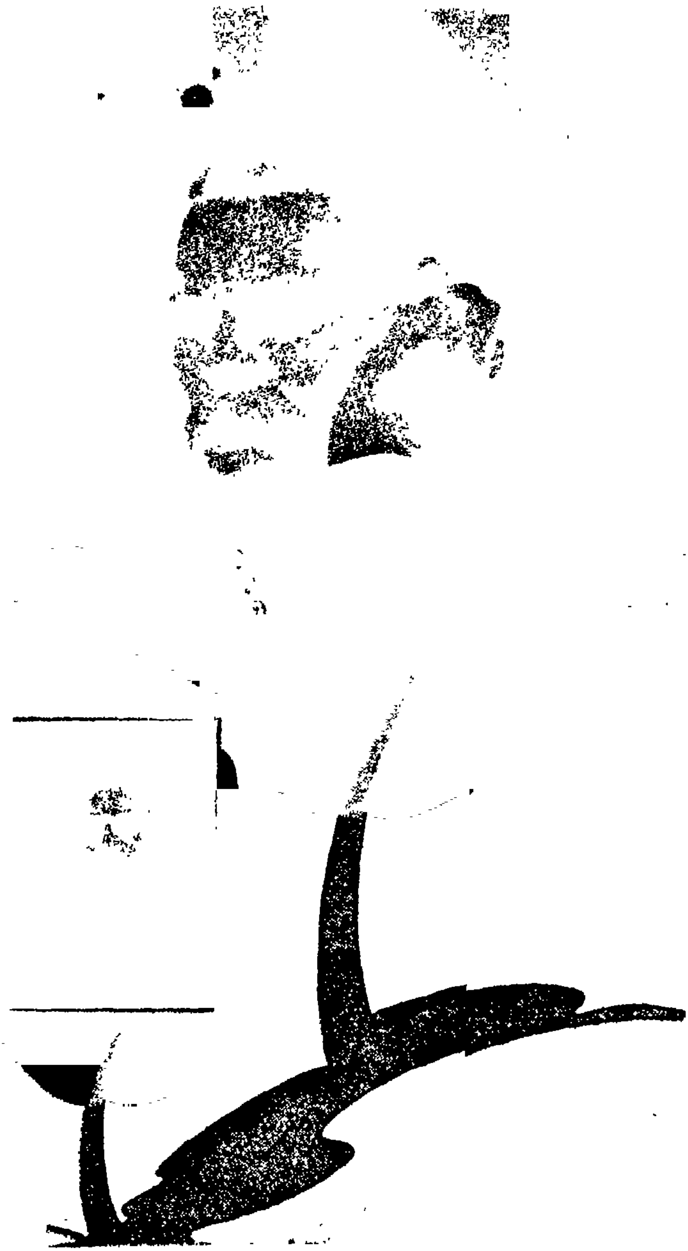
گورکی نے اپنے ادب میں اپنے نظریہ (کمیونسٹ خیالات) کو کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ سمویا ہے کہ انہیں عظیم ادب کا روپ دے دیا ہے۔ اس کے ناولوں سے، اس کے مقالوں سے اور اس کے خطوط سے انسان کے ساتھ بے پناہ محبت کا چشمہ بہتا ہے۔

گورکی کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کے تاریخی حالات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی نے روسی عوام کے انقلابی شعور کو اور بھی پختہ کیا۔ گورکی کے شہ پارے آج کے حقیقت پسندانہ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گورکی کے وہی ناول اور افسانے زیادہ مقبول ہیں جو انھوں نے اپنی ابتدائی انقلابی زندگی کے دوران لکھے۔ آج کے ادب میں مثبت ہیرو کا وجود، بورژوازی کے خلاف جدوجہد، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج گورکی کی دین ہے۔ گورکی نے سماج کو گھن کی طرح چاٹنے والی تمام قوتوں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی بیخ کنی کے لئے آواز بلند کی ہے۔ عوام کی انقلابی سرگرمیوں نے گورکی کی تخلیقات میں بار پایا۔ اور گورکی نے عوام کی انقلابی سرگرمیوں کو کچھ ایسے ڈھنگ کے ساتھ پیش کیا کہ اب وہ دوسروں کے لئے چراغِ منزل ثابت ہو رہا ہے۔

گورکی کی اپنی زندگی بھی تاریکیوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد تھی۔ وہ تپ دق کا مریض تھا، ان پڑھ اور یتیم تھا لیکن اس نے زندگی کی ان تمام دشواریوں پر عظیم الشان فتح حاصل کی۔ گورکی کا افسانۂ حیات انسان کی فتح و نصرت کا عظیم افسانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی کے ہر ایک ناول میں ہم اس کا آئینہ کارفرما دیکھتے ہیں۔ اس کی تخلیقات میں زندگی سے بھرپور کردار ہیں جو رکاوٹوں کو روندتے ہوئے منزل کی جانب نکلتے ہیں۔

گورکی کے اس ناول "دی مدر" (ماں) میں بھی گورکی کے تمام فنی محاسن جذب ہیں۔ یہ داستان اتنی پیاری اور زندگی سے اتنی قریب ہے کہ آپ اپنی زندگی کی تلخیوں پر حیران بھی ہوتے ہیں اور زندگی سے محبت کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی زبردست خواہش بھی محسوس کرتے ہیں۔



میکسم گورکی | مترجم: خلیل احمد

اے غمِ دوراں!

گندے سے اور چھوٹے سے احاطے کے گرد لکڑی کے پرانے اور وسیع مکان ہیں۔ یہ سینٹ پیٹرز برگ کی جائیداد ہے۔ انہیں میں سے ایک مکان کی بالکل نچلی منزل کی دو کھڑکیوں سے ہر سنیچر کی شام کو یہ ہنگامہ سنائی پڑتا۔

شوہر، شوہر۔ بدمعاش۔ شرابی، شوہر۔ ایک تیز نسوانی آواز آتی۔

نہیں مجھے جانے دے۔ کوئی مرد کہتا سنائی پڑتا۔

میں نہیں جانے دوں گی۔ کمبخت۔

اچھا تو نہیں جانے دے گی۔ دیکھتا ہوں۔

نہیں نہیں چاہے تو مجھے مار ڈالے۔

جا تو تو مجھے نہیں جانے دیگی؟ نہیں۔ اچھا تو لے۔

ہائے اللہ! یہ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ اللہ

لے اب تو جانے دیگی۔

سینکا پیزرک۔ رنگ ساز ہنچ کوف کے پاس کام کرتا تھا۔ وہ تمام دن اس احاطے کے ایک شیڈ میں بڑا ہر طرح کے رنگوں کو ملا کرتا تھا۔ وہ پہلی ہی آواز پر دوڑ پڑتا اور چلاتا کہ "میاں بیوی پھر لڑ رہے ہیں"۔

اسے اس طرح کے جھگڑوں سے ایک خاص دلچسپی تھی وہ اطمینان کے ساتھ آکر کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور کھڑکی میں منہ لگا کر اس تاریک کمرے میں جھانکنا شروع کرتا۔ جھانکنے میں اس کی ناک میں کچھ چمڑے کی بساند، موم کی بو اور کمرے کی سیلن کی بو آتی جیسے تاریک کمرے میں وہ انسان جھگڑتے ہوئے [illegible] اور ہے۔

تو مجھے مار ڈالے گا کمبخت۔ عورت چلاتی۔

کوئی فکر نہیں۔ اسکا شوہر اسے فوراً تسکین دیتا۔

پھر لاتوں اور گھونسوں اور ساتھ ہی ساتھ عورت کی ہائے ہائے اور کراہ کی آواز آتی۔

اُف کمبخت نے آخری گھونسہ کتنا زبردست رسید کیا۔ سینکا دوسرے تمام تماشائیوں کو بتاتا۔ مفت کا تماشا دیکھنے کو کافی لوگ جمع ہو جاتے۔ خصوصیت کے ساتھ عدالت کا پیادہ لیوجنکر اور باجے والا کسیلاکوف اس موقع پر ضرور موجود ہوتے۔ اور اندر کمرے کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے چین۔ اگر سینکا تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا تو وہ اسکی ٹانگ گھسیٹنے لگتے۔ وہ کوئی اسکا رنگ آلود پتلون بھی کھینچنے لگتا۔ ہر شخص اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لیتا۔

اچھا! اب وہ اسے چوٹی کے بل زمین پر گھسیٹ رہا ہے۔ اور اسکی ناک زمین پر رگڑ رہا ہے۔ سینکا شان کے ساتھ منتظر تماشائیوں کو بتاتا۔

دوسرے لوگ بھی بری طرح اس تماشے کو دیکھنے کے مشتاق ہوجاتے ہر شخص کھڑکی کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ ان میں سے تقریباً سب کو اس طرح کی مارپیٹ کا اپنا ذاتی تجربہ تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اور لوگوں کی طرح استاد نہ تھا۔

"ارے کیا ظالم نے اس کی ناک توڑ ڈالی!

اوہ خون کے فوارے بہہ رہے ہیں۔"

"ہائے اللہ" عورتیں چلاتیں۔ بڑا سنگدل ہے ظالم۔

لیکن مردوں کی تنقیدیں زیادہ ڈھنگ کی ہوتیں۔

"یہ اسے ضرور مار ڈالے گا" وہ کہتے۔

"میری بات سن رکھو۔ یہ اسے ایک نہ ایک دن چھرا مار دے گا" کسیلاکوف صاحب پیشین گوئی کرتے۔

"کھیل ختم" سینکا نے کہا۔ اور کھڑکی سے کود کر الگ ایک دوسری جگہ کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں اوزلوف باہر آئے گا۔

سا انتظار کرتی ہوتی۔

اور لوت کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اُن کے ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن اٹھارہ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ جس کا غم میاں بیوی نے بہت کیا تھا۔ لیکن اس امید پر کہ شاید اُن کے کوئی اور اولاد ہو جائے۔ دونوں نے صبر کر لیا۔

نچلی منزل کا وہ کمرہ جس میں وہ رہتے تھے بہت تاریک تھا اور اسکی چھت ٹاٹ پڑی تھی۔ دروازے کے پاس کھڑکی کے نزدیک ایک بدسی چولہا تھا۔ اس چولہے سے گزر کر دو کھڑکیاں احاطے میں کھلتی تھیں۔ اور روشنی کی دو ایک لکیریں ان کھڑکیوں میں سے گزر کر اس کے گھر میں آتیں۔ کمرہ میں تاریکی اور سیلن کی افراط تھی۔ اور اس کے سوا وہاں جیسے کچھ نہ ہو۔ اگرچہ اس جگہ پر کچھ لوگ رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود موت کی سی سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔ چولہے سے ہٹ کر ایک بڑا پلنگ بچھا رہتا جس پر ایک پھولدار زرد رنگ کی چادر بچھی رہتی۔ اس بستر کے مقابل میں ایک میز تھی جس پر یہ میاں بیوی کھانا کھاتے اور ناشتہ کرتے۔ دیوار [illegible] کی درمیانی جگہ میں بیٹھ کر میاں بیوی اپنا کام کرتے کیونکہ [illegible] کھڑکیوں سے روشنی چھن کر گرتی تھی۔

[illegible] ادھر اُدھر تبسم صاحب محو خرام ہوتے۔ ان [illegible] دیواروں پر تصویریں چپکا یا کرتا تھا بطور عنوان انہیں استعمال کرتے۔ [illegible] نہیں بلکہ [illegible] کی تعداد دیر [illegible]

اور لوت کے گھر کا معمول تھا کہ مسز ورمن صبح ہی اٹھتی اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے ٹوٹے پھوٹے سیکڑوں پیوند لگے ہوئے سماور میں پانی گرم کرنے کو رکھ دیتی۔ اور پھر کچھ صفائی وغیرہ کر کے سودا لینے چلی جاتی۔ وہاں سے آ کر شوہر کو جگاتی اور جب تک وہ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوتا سماور میں پانی اُبلنے لگتا اور میاں بیوی چائے اور روٹی کے ناشتہ کے لئے بیٹھ جاتے۔

اور لوت بہت ہی اچھا موچی تھا اور اُسے کبھی کام کی کمی نہ رہتی۔ ناشتہ ہی سے وہ دن بھر کے کام کو لگ جاتا۔ باریک اور دقیق کام تو وہ خود کرتا اور چھوٹے موٹے کام مسز ورمن کو مرمت کا کر کر دیا کرتا۔ لیکن جو تا مسز ورمن کرتی۔ ناشتہ کے بعد دوپہر کے کھانے کے متعلق طے ہو جاتا۔ جس بات میں وہ کچھ زیادہ کھاتے۔ اس لئے کھانے کا موضوع اُن کے لئے کافی دلچسپ ہوتا۔ لیکن گرمیوں میں وہ ذرا ہاتھ روک لیتے۔ اور جو لُسا تو صرف اتوار کو جاتے۔ بلکہ بعض بعض اتوار کو بھی ناغہ کر جاتے۔ اس لئے وہ ایسے [illegible] سے بیں چولہے کی ضرورت ہی نہ پڑتی نہیں تو کبھی کسی پنساری کے چولہے پر اپنا گوشت پکا لیتے۔ ناشتہ کے بعد وہ کام پر بیٹھ جاتے۔ اور لوت تو ایک برتن اوندھا کر لیتا۔ اور اس پر گدے کے لئے کچھ چیتھڑا رکھ کر بیٹھ جاتا۔ مسز ورمن اسکی بغل میں ایک لکڑی کی بنائی ہوئی چوکی پر بیٹھتی۔

کچھ دیر تو خاموشی کام میں مصروف رہتے۔ کیونکہ بات کرنے کی کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ یا کبھی کبھی کام کے متعلق ایک آدھ بات ہوتی تو ہو گئی ورنہ دیر تک دونوں چپ رہتے۔ صرف ہتھوڑے کی کھٹ کھٹ یا سلائی کے وقت دھاگوں کے کھنچنے کی سٹپ سٹپ کی آواز کانوں میں آتی۔ کبھی کبھی اور لوت جماہی لیتا۔ اور ساتھ ہی ہاہو کا ایک آدھ نعرہ لگا دیتا۔ مسز ورمن بھی ایک آدھ گہری ٹھنڈی سانس لیتی۔ گرگیوری کبھی کبھی گنگنانے لگتا۔ اسکی آواز اگرچہ سخت تھی۔ لیکن وہ گانا خاصا اچھا گاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسکی آواز تیز ہو جاتی۔ اور پھر وہ پوری طرح گانے لگتا۔ اور اب مسز ورمن بھی اس کے ساتھ گانا گانے لگتی۔ پھر دونوں کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو جاتی۔ اور مسز ورمن چپ ہو جاتی۔ اور کبھی کبھی چپ بھی ہو جاتی۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں پھر اس کا ساتھ دینے لگتی۔ چنانچہ وہ ایک طرح سے اپنے غموں کو اس میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔ اپنی کھوکھلی زندگی میں وہ اس خیالی زندگی کو لانا چاہتے جو ان کے اپنے شعور میں بھی ابھی ناپختہ تھی۔ کبھی کبھی اسلسلہ محدود میں اپنے الفاظ گھسیٹر دیتا۔ اور مسز ورمن ان سے چڑ جاتی۔

"کیا بیہودگی ہے۔ یہ بیچارا انسان۔ رکو۔" اسکے اس جملہ کا اور لوت پر ہمیشہ بہت برا اثر پڑتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بڑھو کچھ رہی ہیں۔ گرمی کبھی کبھی۔ اچھا چیخنا بند کر کے اب بہت شرح کر دیا۔

"چپ رہو بدتمیز! اور اپنا کام کر۔ چلو بیٹھو تیز [illegible]"

[illegible] سنتے ہی مسز ورمن بالکل چپ ہو جاتی۔ وہ دیکھ لیتی کہ اور لوت کی گردن کی رگ پھول چکی ہے۔ یہ غصہ کی علامت ہوتی۔ پھر مسز ورمن دیر تک چپ سادھے رہتی۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بات کا بھی جواب نہ دیتی۔ [illegible]

اُتر گیا جاتا۔

اور لوٹ اُسکی طرف مسلسل کے ساتھ دیکھا کرتا اور اس کی مسکراہٹ سے اندازہ کرتا لیکن وہ نظریں جھکائے رہتی۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اسکے جذبات سے کھیلنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اور اکثر اس کے جنونانہ غصہ کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے یہ خوشی ہوتی۔ کہ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہے اور وہ اُسے منانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں زندگی ہے احساس ہے اور جذبات ہیں۔

دونوں جوان اور تندرست تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے اور اس پر ناز بھی کرتے تھے گریگوری نوجوان خوبصورت اور تندرست تھا۔ مطرونہ گوری۔ گداز بدن اور حسین تھی۔ وہ دونوں ایک سے محبت کرتے تھے۔ لیکن زندگی سے تنگ تھے۔ ان کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔ زندگی بالکل ٹھس ہوکر رہ گئی تھی۔ ان کے دلوں میں اب جذبات اور اُمنگیں نہیں تھیں۔ وہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ تھے۔ خواہش۔ احساس۔ مختصر یہ کہ زندگی کی کمی کو بُری طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں کچھ اس طرح سے مرگئیں تھیں کہ اب انہیں کوئی خواہش پیدا ہی نہ ہو۔ حالانکہ وہ صرف دولت ہی جمع کرنے کی خواہش ہو۔ پیسہ پیسہ جوڑنا۔ لیکن یہ بھی انہیں میسر نہ تھا۔

ہر وقت اکٹھا رہنے سے وہ ایک دوسرے کو اس طرح سے جان گئے تھے کہ اب مزید کسی علم کا کوئی امکان ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ جانتے کہ اب دوسرا کیا کہے گا میں کیا جواب دوں گا۔ روزانہ ایک سی زندگی۔ زندگی میں کوئی جان نہ رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں وہ دوستوں سے بھی ملنے جاتے لیکن اُن کے دوست ان سے بھی زیادہ کم ملے۔ ان میں تو احساس بالکل مر ہی چکا تھا یہ دوست کبھی اور لوٹ کے گھر بھی آتے لیکن سوائے شراب و ناچ کے اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نہ جنگ۔ نہ جھگڑا نہ فساد۔ زندگی کی ایک بھی علامت نہیں اور پھر دوسرا دن آتا۔ بالکل اسی طرح سے جیسے سلسلے کی کڑیاں ہیں جو کہ ایک کے بعد دوسری آتی چلی جاتی ہیں۔ وہی کام وہی لوگ۔ وہی اکتاہٹ۔ وہی یکسانیت۔ وہ زندگی سے عاجز تھا۔

کبھی کبھی اور لوٹ کہتا۔

یہ کمبخت زندگی۔ اسکا مصرف ہی کیا ہے؟ کام کرو اور افسوس کرو۔ اور پھر کام کرو۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اپنی نظریں چھت کی طرف اٹھاتا اور زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑانے لگتا۔ خدا کی مرضی سے میری ماں مجھے اس دنیا میں لائی۔ ان کے خلاف کیا ہوں۔ پھر میں نے اپنا کام سیکھا۔

لیکن اس سے فائدہ۔ کیا دُنیا میں موچیوں کی کمی ہے۔ خیر چلو میں بھی ایک موچی سہی۔ آخر اس سے مجھے کیا ملا۔ اس گندی کوٹھڑی میں بیٹھے کیلیں جڑا کروں۔ ایک دن میں مرجاؤں گا۔ جیسے پھیل رہا ہے۔ پچھلے دو۔ کسی زمانے میں ایک موچی تھا۔ جیسے پھیلا اور مرگیا ہی کیا ہوا اس سے اگر میں زندہ رہوں اور جوتے بناؤں یا مرجاؤں۔

مطرونہ چپ چاپ سنا کرتی۔ اپنے شوہر کے خیالات سنتے سنتے اس کے دل میں اس کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوتا۔ پھر بھی اُسے ایسی باتیں کہنے سے منع کرتی۔ کیونکہ یہ گناہ ہے اور اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے۔ اور کبھی جب وہ جھنجلا جاتی تو کہتی کہ اگر تم شراب پینا چھوڑ دو تو تمہاری زندگی سدھر جائے۔ دوسرے کتنے لوگ ہیں جو روپیہ بچا کر کارخانے قائم کر لیتے ہیں اور پھر شریفوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

تم بیوقوف ہو اور عقل سے خالی۔ ذرا سوچو تو یہی شراب پیتے پھر دوں۔ میری زندگی میں مسرت کی تو یہی ایک کرن ہے۔ دوسرے لوگ! دوسرے لوگوں کے متعلق تمہیں کیا معلوم ہے۔ کیا میں بھی شادی سے پہلے ایسا ہی تھا۔ اور سچ کہو کہ کہو تو تم نے میری تمام مسرتوں کو چوس لیا۔ تم جونک ہو جونک۔

مطرونہ کو اسکی بات بُری معلوم ہوتی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے شوہر کی سچائی سے متاثر ہوتی۔ وہ سوچتی کہ ہاں وہ حقیقت میں پہلے بہت ہنس مکھ تھا۔ پہلے تو وہ نشے میں بھی ہنستا اور بہت گرگیدی شادی سے پہلے بہت نرم دل اور ہمدرد تھا۔

میں اس پر بار ہوں! وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

یہ سوچ سوچ کر اُسے جھرجھری آجاتی۔ اور وہ اپنی اور اور لوٹ دونوں کی زندگیوں پر افسوس کرنے لگتی۔ پھر وہ اسکی طرف محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی۔ اور اس کے پاس جاکر بیٹھ جاتی۔

اچھا اب ہٹ جا۔ ہو چکے نخرے۔ اور لوٹ مسکراتے ہوئے اس طرح سے کہتا جیسے کہ وہ ابھی اُسے اپنے سے الگ کر دے گا۔

لیکن مٹرونہ اس سے اور لپٹ جاتی اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے نہ ہٹا سکے گا۔

اس پر ادولوف بھڑک اٹھتا۔ اور کام کو چھوڑ چھاڑ کر بیوی کو اپنی گود میں بٹھا لیتا۔ اور اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا اور اس سے بہت دھیرے دھیرے محبت کی باتیں کرنے لگتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اسکی محبت کی باتوں کو سن لے۔

آخر مٹرونہ ہماری بھی زندگی کیا زندگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح پھاڑ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے کچھ بھی نہیں یہ صرف ہماری قسمت ہے۔ ہر آدمی کا ستارہ ہوتا ہے اور وہی ستارہ اسکی قسمت ہے۔ منحوس یا مبارک۔

لیکن اسے اس جواب سے تشفی نہ ہوئی۔ وہ اپنی بیوی کو اور لپٹا لیتا اور سوچنے لگتا۔

وہ دونوں دیر تک اس طرح اس تاریک اور متعفن کمرے میں بیٹھے رہتے۔ مٹرونہ سوائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے کچھ نہ کہتی اور اس موقع پر اسے وہ چوٹیں یاد آتیں جو اس کے خاوند نے بلاقصور اسے پہنچائی تھیں۔ اور پھر اس کے آنسو نکل آتے۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ لفظ شکایت کا بھی اس کے منہ سے نکل جاتا اور لوف اسوقت بہت متاثر ہوتا۔ اور اسے زیادہ پیار کرنے لگتا۔ اس کی تسکین اور دلاسے سے پر مٹرونہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور ادولوف چڑ جاتا۔

چل اب بسورنا بند کر۔ نہیں تو میں تجھے پھر پیٹ کر رکھ دوں گا۔ چاہے مجھے پچھتا کر جان بھی دے دینا پڑے۔ سن لیا اچھا اب چپ ہو جا۔ عورت کو انگلی پکڑاؤ۔ اور وہ فوراً گردن ناپنے لگے گی۔ یہ رونا دھونا بند کر۔ ایک زندگی سے عاجز مرد کو اس طرح تسکین دیکا تی ہے۔

کبھی کبھی جب وہ ہوش میں ہوتا تو ایسے موقعوں پر اسے سمجھانے کی بھی کوشش کرتا۔

میرے جیسے آدمی کس کے کام کے! میں نے تمہیں ہمیشہ دکھ دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے ہمیشہ تم کو اپنا سمجھا۔ ہاں کبھی کبھی مجھ پر جلد فراموشی کا دورہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اور پھر بھی مجھے بھی ایک نظر برداشت نہیں کر پاتا۔

اس کا بھی کبھی تم نے خیال کیا ہے۔ چونکہ تم نے بہت لیا ہوگا کہ جب عذاب جیسے میرا کو بھر گیا ہے۔ اور کبھی مجھ پر جنون کا دورہ پڑتا ہے اور میں چاہتا ہوں مختار سے بلکہ اپنے ہی کو بھٹکا ڈالوں۔

اگرچہ وہ اس کی پوری بات نہ سمجھ پائی۔ لیکن پھر بھی اس طرح کی گفتگو سے وہ بہت متاثر ہوتی اور اسے کچھ تسکین حاصل ہوتی۔

خدا نے چاہا تو یہ مشکلیں سب دور ہو جائیں گی۔ اور ہم ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ وہ شاید کہتی ہی تھی کہ وہ دونوں نہ جانے کب کے ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہو چکے ہیں۔ اتنے قریب کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کھا ڈالا ہے۔

"اگر ہمارے ایک بچہ ہوتا" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔ تو ہمارے لئے ایک دل بہلاوا ہو جاتا۔

"تو پھر کیوں نہیں ایک بچہ پیدا کر لیتی"۔

"لیکن میرا حمل ٹک کب سکتا ہے۔ تم مجھ اس بیہودہ اور بے ڈھب طرح سے مجھے مارتے ہو کہ حمل قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ تم پیٹ پیٹ کسی حصے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اور گو نشے کی اور بات ہے لیکن تم تو لاتیں بھی بہت بے احتیاطی سے مارتے ہو؟"

"ہاں۔ تو کوئی ایسا بھی ہے جو غصے میں احتیاط کے ساتھ مارپیٹ کرتا ہو۔ میں کتا نہیں ہوں۔ مارتا ہوں تو مارتا ہوں اور وہ بھی اپنی مسرت کے لئے نہیں بلکہ میری بے بسی و بے چارگی مجھے مارپیٹ پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"یہ بے بسی کہاں سے آتی ہے۔ تمہاری بے بسی؟"

"یہ میری قسمت ہے مٹرونہ۔ گریگوری فلسفیانہ انداز میں کہتا یہ میری قسمت ہے اور میری فطرت۔ مجھے دیکھو۔ کیا میں دوسرے مردوں سے الگ لگتا ہوں۔ لیو چیکو کو ہی دیکھو۔ وہ اکیلا ہے۔ نہ اسکی بیوی ہے اور نہ اولاد۔ اگر میری بیوی نہ ہو تو میں مر جاؤں لیکن وہ کمبخت پھر بھی ہر وقت خوش رہتا ہے اور مگن اچھا پاپ پیا کرتا ہے۔ اسے یہی ناز ہے کہ اس کے پاس ایک پلیٹ تو ہے۔ لیکن مجھ سے یہ کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے بالکل سکون نہیں۔ میری آتما معلوم نہیں کتنی بھوکی ہے۔ شائد اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے گا

ایک بیدبخت سا ہوں جسے ہوا کی ایک جنبش گھنٹوں نہیں
اُڑان بھاتے دیتی ہے۔ مثلاً میں بازار جاتا ہوں۔ وہاں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ اور پھر کر گھر چلا آتا ہوں تنہا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز میری اپنی نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اور میں آپے میں نہیں رہ پاتا۔ لیکن یہ چیز اسکو جیسے کوئی پرواہی نہیں۔ مجھے تو اسکا سکون دیکھ کر بھی غصہ چڑھ جاتا ہے مردہ کر جیسے کسی چیز کی چاہت ہی نہیں۔ اس کا کام بغیر کسی چیز کے چل رہا ہے۔ اور میں ہوں کہ مجھے ہر چیز چاہیئے۔ ایک چیز کی کمی بھی مجھے پاگل بنا دینے کو کافی ہے۔ لیکن میرے لئے صرف یہی ایک تاریک کمرہ ہے۔ اور کوئی بھی چیز میری نہیں ہے۔ تم اپنی ہی کو لو۔ تم میری بیوی کا ہو۔ لیکن اس سے کیا ہوا۔ تم صرف ایک عورت ہو جیسے کہ کوئی دوسری عورت۔ اور پھر میں تم کو بالکل جان گیا ہوں۔ سر سے پیر تک اب تم میں کوئی ایسی چیز نہیں رہ گئی۔ جسے اور جانا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے اب تم روؤ گی تو تمہارا منہ کیسا بنے گا۔ کل ہنسو گی تو کیسی شکل ہوگی اور اگلے دن اگر چھینکو گی تو کیسی آواز آئے گی کیونکہ تیں لاکھوں بار سنتے۔ ہزاروں بار ہنستے اور چیلنے چھینکتے سن چکا ہوں تمہیں اور آوازیں میرے آنکھ کان میں رچ بس گئی ہیں اب یہ میرے لئے اور کیا لا سکیں گی۔ کچھ بھی نہیں۔ اور اسی لئے میں شراب خانے چلا جاتا ہوں۔ وہاں کچھ تسکین ہو جاتی ہے

"پھر تم نے شادی کیوں کی؟" مشروونہ نے پوچھا۔

گرگیوری ہنسا۔

"خدا جانے کیوں؟ اور سچ پوچھو تو مجھے شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ مجھے تو خانہ بدوش ہونا چاہیئے تھا۔ شاید اس سے مجھے فاصلے کرنے پڑتے۔ لیکن کم از کم میں آزاد تو ہوتا جہاں چاہتا چلا جاتا۔ اور اس طرح تمام دنیا کے چکر لگاتا۔"

"تم اب بھی جا سکتے ہو۔ مجھے آزاد کر دو۔" مشروونہ نے بے بسی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ اچھا تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" گرگیوری نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"جہاں میری مرضی۔"

"بتا کہاں؟" اسکی آنکھیں سے شرارہ سے نکلنے لگے۔

"چلاؤ مت۔ تم اس طرح مجھے دھمکا نہیں سکتے۔"

"اچھا تو تُو نے کسی اور کو دیکھ لیا ہے۔ بتا وہ کون ہے! جلد بتا۔"

"بس مجھے جانے دے۔"

"کہاں جانے دوں؟" گرگیوری گرجا۔ اور پھر اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ گرگیوری کے غصے نے مشروونہ کو بھی تاؤ دلا دیا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اسکی تسکین کرتی وہ اسے معنی خیز نظروں سے اسکی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ گرگیوری اب غصے کی تاب نہ لا سکا۔ اور اسے بُری طرح مارنے لگا۔

رات کو جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی کراہ رہی تھی۔ اس کے تمام بدن پر نیل پڑ گیا تھا۔ اور کہیں کہیں زخم پھوٹ گیا تھا۔ تو گرگیوری نے اسکی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔ اسکا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ پھر اسکی جلن بے وجہ تھی۔

"اچھا بھئی اب مان جا۔ میں مان لیتا ہوں کہ میں غلطی پہ تھا۔ پھر تو نے بھی تو کچھ جواب نہ دیا۔ بلا وجہ مجھے بھڑکا دیا۔ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟"

اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ مار پیٹ کرنے کے بعد اسے ہوش آ جاتا ہے اور وہ پھر اسے منانے کی کوشش کرتا اور پھر وہ مجسم محبت بن جاتا اور اس کی محبت کے محض تصور ہی سے اسکی آنکھیں بھر آتیں۔ "آجا۔ پیاری مشروونہ اب آ جا۔ میری پیاری۔ میری گڑیا۔ اب نہ رو۔ مجھے معاف کر دے۔ میری جان" وہ اس کے بالوں کا بوسہ لیتا۔ اور اُسے خوب پیار کرتا۔

ان کے گھر کی کھڑکی اگرچہ کھلی تھی۔ لیکن وہاں سے آسمان دکھائی نہ دیتا تھا۔ کیونکہ بیچ میں ایک دیوار حائل تھی۔ اور ان کے کمرہ میں بیتلا جیسی اندھیرا تھا۔

"آخر یہ کیا زندگی ہے۔ کُتے کی زندگی۔" یہ کہہ کر گرگیوری نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ گویا وہ اپنے درد کا اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا یہ سب اس سرد و کال کوٹھڑی کی بدولت ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم یہاں جیتے جی دفن کر دیئے گئے ہیں۔"

"تو پھر کہیں اور جگہ کیوں نہ چلے جائیں" مشروونہ نے اسکا مطلب

نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اگر ہم محل میں بھی چلے جائیں تو وہ ہمارے لئے کال کوٹھری ہوگا۔ یہ کمرہ نہیں کال کوٹھری بلکہ یہ ہماری زندگی ہے جو ہر چیز کو کال کوٹھری بنائے ہوئے ہے۔"

متروُنہ تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "اگر خدا نے چاہا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

"دن پھرنے کی بات تم روز کہا کرتی ہو لیکن دن تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری لڑائیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔"

اسکی یہ بات بڑی ٹھیک تھی کہ اب انہیں جلد جلد جھگڑا ہونے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو سوائے سنیچر کے ایسا اتفاق کم ہوتا تھا

"سچ تو یہ ہے اب شراب خانے میں جاکر خوب شراب پیوں گا یعنی شراب اتنی شراب کہ پھر مجھے کسی چیز کی ہوش نہ رہے۔"

متروُنہ کی بھویں سکڑ گئیں۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ تم ہرگز نہ بولنا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ خاموشی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

اورلوف نے دن میں کئی بار اپنے ارادے کو بیان کیا جیسے جیسے شام ہوتی جاتی تھی اس کے خیالات کا زہر بڑھ رہا تھا۔ اسے بار بار یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ سے متروُنہ کے دل پر چوٹ پڑتی تھی۔ اور اس کے دل کو اس سے ایک طرح کی راحت بھی پہنچتی تھی۔ لیکن ایسے موقع پر اسے متروُنہ کی خاموشی بہت کھلتی تھی اور وہ کھول اٹھا کرتا تھا۔ اُسکا شکوہ اس بات پہ ہے تو اور بڑھتا رہتا

اور پھر شام کو سینما نے رات کے جھگڑے کا اعلان کر دیا۔

جب بھی اورلوف اپنی بیوی کو مارتا۔ اس رات وہ تمام رات واپس نہ آتا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اتوار کو بھی واپس نہ لوٹتا۔ زخموں سے چور متروُنہ پڑی اپنے شوہر کا انتظار کرتی۔ اسکا شوہر جب آتا تو اس کی حالت بہت ہی خستہ ہوتی۔ لیکن وہ خاموش رہتی۔ پر اسکا دل ہمدردی سے لبریز ہو جاتا۔ آخر یہ اسکا شوہر ہی ہے۔ جو لوٹ کر پھر رات میں اسی کے پاس آتا ہے

وہ جانتی تھی کہ اب اسکا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ اور اسے سخت تکلیف ہوگی۔ اس خیال سے وہ تھوڑی سی شراب اس کے لئے اپنے پاس رکھتی۔ اورلوف کو بھی اسکا علم تھا

"مجھے دے دو۔" اور پھر وہ چھین کر اسے پی کر وہ کام پر بیٹھ جاتا۔

تمام دن وہ اپنے جسم کی سرزنش برداشت کرتا۔ اور اکثر جب یہ تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی تو وہ کام سامان چھوڑ دیتا اور اول فول بکنے لگتا۔ اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ یا جاکر بستر پر پڑا رہتا۔ متروُنہ انتظار کرتی کہ وہ قابو میں آئے اور پھر دونوں میں صلح ہو جاتی۔

شادی کے شروع کے دنوں میں جنگ کے بعد صلح کے لمحات ایک خاص مسرت لاتے۔ جنہیں وہ دونوں اور شدت سے محسوس کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ زندگی کی مجبوریاں غالب آگئیں۔ وہ سمجھ گئے۔ کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے بغیر بولے گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اور اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ہفتہ تک ایک دوسرے سے نہ بولیں۔

"تم ایک دن شراب پیتے پیتے مر جاؤ گے۔" متروُنہ آہ بھر کر کہتی

"ہاں۔" اورلوف تائید کرتا۔ اور پھر ایک عجیب استغنا کے ساتھ تھوکتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے جینے اور مرنے کی پروا نہیں۔ "اور پھر تم مجھے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ گی۔" اورلوف اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہتا۔

وہ اپنی نظریں جھکا لیتی۔ اور وہ اتنی حیا پیدا کرتی تھی اورلوف اسے دیکھ کر بھویں سکوڑ لیتا اور دانت بھینچ لیتا۔ متروُنہ اپنے شوہر کو بلا بتائے بہت سے جوتشیوں اور پیروں کے پاس گئی۔ کتنے پانی پڑی بوٹیاں اور تعویذ ہی لاتی۔ بزرگوں کے مزاروں پر گڑگڑا کر دعائیں مانگیں ایسے بزرگوں جنہوں نے ہزاروں نابیناؤں کو آنِ واحد میں ولی کر دیا تھا۔

لیکن اسکی دعائیں بے اثر رہیں۔ اور پھر اس کے بیچ دل میں اس شراب سے گھن آنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اسکا دل اورلوف کی طرف سے سخت ہوتا گیا۔ حالانکہ یہ وہی آدمی تھا جس نے تین سال پہلے اپنی زبردست نازک بات اور ہنس مکھ پن سے اس کے دل کو جیت لیا۔ اور اس کے دل میں ہزاروں تمنائیں امنگیں پیدا کر دی تھیں

اس طرح سے یہ دو طلسمات جن میں کوئی بھی دل کا برا
نہ تھا آہستہ آہستہ ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں
ابھی بہت تاریکی تھی۔

دو ہفتہ کی صبح کو جس وقت کہ یہ میاں بیوی ناشتہ کر رہے
کہ ایک پولیس مین ان کے تاریک کمرے کے دروازے پر
دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی اولیفنٹ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
سوچنے لگا کہ ادھر اس سے کونسی غلطی ہوئی۔

"ادھر آیئے۔ اس طرف"۔ پولیس مین نے کسی اندر سے کہا۔

آفت یہ کہ کالی کوٹھڑی کی طرح تاریک ہے۔ خدا اس سیلن
سے بچائے۔ کسی نوجوان کی آواز سنائی دی۔ اور دوسرے
لمحہ وہ نوجوان کمرے میں تھا۔ وہ یونیورسٹی کے لڑکوں کی سفید
یونیفارم پہنے تھا۔ وہ ٹوپی اتارے اپنے ہاتھ میں لئے تھا۔ جس
بال ترشے ہوئے تھے۔ اسکا چہرہ مسکراتا ہوا تھا۔ اور وہ
لگائے تھا۔

"گڈ مارننگ"۔ اس نے کہا۔ میں سینٹری انسپکٹر ہوں۔
یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ لوگوں کے گھروں میں کیسی صفائی
ہے۔ [illegible]

اور لوٹ کی جان میں جان آئی اور اس نے ایک
اطمینان کا سانس لیا۔ اولیفنٹ کو یہ نوجوان پہلی ہی نظر میں بھا گیا
اس کے چہرے کی سرخی اور اسکا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے
صاف اور شریف ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ اور اسکی مسکراہٹ
اولیفنٹ کے اس تاریک کمرہ کو بھی روشن کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

اچھا جناب انسپکٹر نے کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو
ایک کھڑکی باہر بنوایا کریں کیونکہ سب سے زیادہ بُو کا باعث تو یہی
اور اسکی سڑاند ہوتی ہے۔ اور میں آپ سے یہ بھی عرض کروں گا
برتن مانجھنے کی جگہ بھی ذرا صاف کر لیا کریں۔ اور جن بھی تم
لٹکائے ہو۔ اس نے اولیفنٹ کا ہاتھ پکڑتے اور اسکی
دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکے کی تیز کلامی اور بے تکلفی نے دونوں کے منہ بند
دیئے۔ مسز لوٹ تو اسے دیکھ دیکھ کر صرف مسکرا رہی تھی۔
خاموش تھی۔ لیکن اولیفنٹ کی مسکراہٹ میں کچھ گھبراہٹ بھی

معلوم ہوتی تھی۔

تمہارے پیٹ کا کیا حال ہے۔ پاخانہ وغیرہ ٹھیک ہوتا
ہے۔ اس طالب علم نے پوچھا۔ گھبراؤ نہیں۔ ہمارے سب کے پیٹ
ہیں۔ ہاں اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو فوراً کہہ دو۔ میں دوا دے دوں گا۔

ہم ٹھیک ہیں۔ اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ گریگوری نے
مسکرا کر جواب دیا۔ اچھا یہ سکھا چہرہ ——— ہو۔ ارے یہ کچھ
نہیں ہے اور اگر تم پوچھو تو یہ کل کی شراب کا خمار ہے۔

ٹھیک۔ ٹھیک۔ میری ناک بھی بتا رہی ہے کہ کل آپ نے
کچھ تھوڑی سی چکھی ہے۔

اس نے کچھ اس مضحکہ خیز ڈھنگ سے کہا۔ کہ گریگوری کھلکھلا کر ہنس
پڑا۔ مزدورنی بھی ساتھ ہی ہنس پڑی۔ لیکن اس نے دامن سے اپنا
منہ ڈھک لیا۔ اور طالب علم نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔ لیکن وہ
سب سے پہلے قابو میں بھی آیا۔ اور جیسے قہقہے کی رنگین اثرات
اس کے چہرے سے ختم ہوئے اور وہ سنجیدہ معلوم ہونے لگا۔

ٹھیک ہے مزدور کو پینا بھی چاہیے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو
جائے کہ وہ کب بس کرے۔ لیکن بھئی زمانہ وہ آ لگا ہے کہ اگر انسان
پرہیز کرے تو بہتر ہی ہے۔ کیا آپ لوگوں نے پھیلی ہوئی وبا کے بارے
میں بھی کچھ سنا ہے۔

پھر اس نے بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر آسان طریقے سے
ہیضہ اور اس سے بچاؤ کی ترکیبیں بتانا شروع کر دیں۔ اور باتیں
کرتے کرتے وہ کمرے کی دیوار کے سہارے اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں
منہ ہاتھ منہ دھونے کی نشست رکھی تھی۔ اور جہاں برتن دھوئے
جاتے تھے۔ اس نے کچھ کر کے اس جگہ کو سونگھا۔ اور ساتھ ہی
ساتھ ہی ساتھ اس کے بیان میں اور روانی پیدا ہوتی گئی۔ جو اسکی
باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں آپ ہی آپ اترتی جاتی تھیں
اسے جیسے اپنے مقصد اور خلوص پر بہت زیادہ بھروسہ ہے۔

گریگوری بہت حیرت سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔
مزدورنی کے منہ سے کوئی صوت آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پولیس مین
وہاں سے کھسک چکا تھا۔

اب آپ لوگ آج ہی سے اپنے گھر کی صفائی شروع کر
دیں۔ پڑوس میں ایک مکان بن رہا ہے۔ اگر وہاں سے پانچ تک

کوپک میں آپ جتنا چاہیں تم تا خرید سکتے ہیں اور بہتر ہے کہ آپ شراب چھوڑ دیں۔ اچھا چلے۔ گڈ بائی۔ پھر ملیں گے۔

جیسے وہ آیا تھا ویسے ہی وہ یکبارگی غائب ہو گیا لیکن اُسکا مسکراتا ہوا چہرہ۔ میٹھی باتیں ابھی میاں بیوی کے نظروں میں پھر رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اور اپنے تاریک کمرہ میں اس طرح کے انسان کے آنے نے انہیں سخت متحیر کر جاتا

ایک لمبی ہوں کے ساتھ گرگوری نے کہنا شروع کیا۔ یہ تھا تہا ما سینیٹری انسپکٹر۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو زہر دیتے ہیں۔ ایسی شکل کا انسان کس کو زہر دے سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اس کی باتیں کتنی دل نشیں تھیں۔ اور وہ کتنی صاف گفتگو کرتا تھا۔ اُس نے کتنی سادگی اور صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ میں سینیٹری انسپکٹر ہوں۔ اور پھر اُس نے ہم لوگوں کو کہا تھا کیا چونا بھی کبھی زہر ہوا ہے اور سٹرک ایسڈ۔ یہ کیا ہے۔ شاید معمولی تیزاب۔ لیکن سب سے اہم بات تو صفائی ہے۔ صاف فرش۔ صاف برتن اور صاف برتن مانجھنے کی جگہ اور صاف نالیاں۔ یہ لوگوں کو زہر دیں گے! اخ۔ کیا خوب آدمی تھا۔ مٹروونہ تم نے سنا تھا کہ اُس نے کہا تھا کہ ایک مزدور کو شراب ضرور پینی چاہیئے۔ لیکن اُسے معلوم ہو کہ کب بس کرنا چاہیئے۔ اچھا مٹروونہ تو پھر تم مجھے ایک گلاس دے دو نا۔ کچھ رکھے ہو؟

اور پھر مٹروونہ کہیں سے ایک بوتل نکال لائی۔ اور اُسکا آدھا گلاس بھر دیا۔

وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ ہر ایک کو بھلا لگنے والا۔ مٹروونہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اُسکی نظروں کے سامنے اس طالب علم کا چہرہ گھوم گیا۔ ہاں یہ جو زہر کی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے لئے نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔

نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔ گرگوری نے بات کاٹی۔ کس لئے! آخر انہیں کیوں کوئی رکھے گا۔

لوگوں کو مارنے کے لئے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور انہیں کم کر دینے کا حکم ہو چکا ہے۔ مٹروونہ نے تشریح کی۔

"کون کہتا ہے؟"

سب ہی لوگ۔ انہیں رنگ سازوں کی بادرچن ہی اُس دن کہہ رہی تھی۔ اور سب ہی لوگ کہتے ہیں۔

سب گدھے ہیں۔ اس سے کسی کو کیا نفع ہوگا۔ تم خود ہی سوچو کہ بیماری میں کتنی الجھن اور کتنا خرچ ہوتا ہے۔ اور پھر مرنا ودفنانا۔ قبر۔ کفن اور معلوم نہیں کتنے خرچ بڑھ جائیں گے۔ اور یہ سب خرچ گورنمنٹ کیوں بلا وجہ اپنے سر مول لے۔ اگر وہ ہم سے نجات ہی پانا چاہتی ہے تو پھر سب کو سائبیریا بھیج دے۔ جہاں ایسے ایسے کروڑوں آدمی ایک کونے میں آ سکتے ہیں اور پھر وہاں بھیجنے پر گورنمنٹ کو نفع ہی نفع ہے۔ مار کر دفن کرنے میں تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اور گورنمنٹ تو ہمیشہ منافع چاہتی ہے کیا وہ کبھی اپنے لئے گھاٹا چاہے گی۔ اب اسی طالب علم کو لے لو۔ کیا کوئی اسے مارنے کے لئے نوکر رکھے گا۔ اس کی شکل ہی مارنے والوں کی سی نہیں۔ وہ کیا کسی کو مارے گا۔ ہاں وہ ہماری حالتوں میں انقلاب ضرور چاہتا ہے۔

اس دن تمام وقت اسی طالب علم کے متعلق باتیں کرتے رہے اسکی ہنسی۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ۔ اسکا مسکراتا چہرہ۔ اسکا لباس وغیرہ۔ بلکہ ایک بار تو میاں بیوی اس بات پر جھگڑ پڑے اسکے کوٹ کا جو بٹن ٹوٹا تھا وہ کس طرف کا تھا۔ مٹروونہ کہتی تھی کہ وہ داہنی طرف کا تھا۔ لیکن اولوف اصرار کرتا کہ نہیں وہ بائیں جانب کا بٹن ٹوٹا تھا۔ اور غصہ میں آ کر اُس نے مٹروونہ کو تین چار صلواتیں سنا دیں۔ لیکن پھر اسے فوراً یاد آ گیا کہ مٹروونہ نے ابھی بوتل میں تھوڑی سی شراب بچا رکھی ہے۔ اس لئے وہ اسکی بات مان گیا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ کل وہ تمام فرش وغیرہ صاف کر ڈالیں گے اور اس کے بعد وہ پھر تازہ جوش و خروش کے ساتھ اس طالب علم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

کمبخت۔ ہم سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ جیسے ہم سے اسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ہر جگہ اپنی ٹانگ پھنسا رہا تھا اور پھر کلیجہ دے کر چلتا بنا۔ نہ کوئی غرور۔ نہ غل۔ نہ کوئی دھونس۔ وہ آیا اور کہہ کر چل دیا۔ مٹروونہ میں کہتا ہوں کہ یہ سب گدھے ہیں یہ سینیٹری انسپکٹر تو ہماری جان کی حفاظت کے لئے آیا تھا۔ اور یہ تم ہو دہر

کی بات معلوم ہو گی اس سے۔ ہمارے پیٹ کا بھی حال تو اس نے پوچھا۔ اور پھر کیسی اچھی طرح سے اس نے جراثیم کے بارے میں بتایا کیا نام بتایا تھا اُس نے [illegible]۔ خیر جانے دو۔ لیکن یہ بات تو اس نے صرف ڈرانے کو کہی تھی کہ ہم مکان و فرش صاف رکھیں۔

کون جانے۔ ہو سکتا ہے اس نے جو کچھ کہا ہو سچ ہی ہو۔ آخر سیلن میں کیڑے تو پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اس نے ان کیڑوں کا نام کیا بتایا تھا۔ پولی وگ۔ نہیں نہیں۔ ارے نام تو میرے دل میں ہے لیکن زبان پر نہیں آ رہا ہے۔

سوتے سوتے بھی وہ اسی کی باتیں کرتے۔ انہیں آج بچوں کی طرح سے مسرت حاصل تھی۔ بلکہ وہ نیند میں بھی سب بڑبڑا رہے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی انہیں رنگ سازوں کی باورچن نے آ جگایا۔ اسکا چہرہ آج کچھ اترا ہوا تھا۔

اُٹھنے کا وقت ہو گیا۔ ہمارے گھر میں تو ہیضہ آ گیا خدا کی لعنت۔ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

"ارے کیا پاگل ہوئی ہے!" گریگوری نے کہا۔

"میں تو کل نشست بھی صاف کرنا بھول گئی تھی" مسٹر ورن نے نادم ہوتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں تو نوکری چھوڑ رہی ہوں اور اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔" باورچن نے کہا۔

"کس کو ہیضہ ہو گیا؟" گریگوری نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"باجے والے کو؟ رات کے وقت اُسے ہیضہ ہوا۔ بہت تکلیف ہے اور دست و قے ایک منٹ بھی بند نہیں ہوتے۔"

"باجے والا؟" جیسے گریگوری کو یقین نہ آ رہا ہو کتنا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ابھی تو کل ہی کیسا ہنس ہنس کر بول رہا تھا۔ میں تو اسے دیکھنے جا رہا ہوں" گریگوری نے زور سے کہا۔

"نہیں گریگوری نہیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے!" دونوں عورتیں بیک وقت چلائیں۔

"خدا خیر کرے۔ ایسی بات نہ سوچو!"

"چپ!" گریگوری نے جوتے پہنتے ہوئے کہا اور بغیر کنگھا کئے اور قمیض کا بٹن لگائے وہ باہر جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اسکی بیوی نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور اسکی انگلیوں کی تھرتھراہٹ محسوس کی۔ اور پھر معلوم نہیں کیوں اُسے غصہ آ گیا۔

"ہٹ! نہیں تو تیرا سر توڑ دوں گا!" وہ چلایا اور اس کے سینے پر دھکا دے دیا۔

احاطے میں بالکل سناٹا تھا۔ اور ایک عجیب سی خاموشی چھائی تھی۔ اور اُن کے دل پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ اور وہ آپ ہی آپ کچھ کانپنے لگا اور اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ کوئی اُدھر اسے نہیں دیکھ رہا ہے، اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن یہ خیال کہ وہی اکیلا ہے جو بیمار پڑوسی کو جا رہا ہے اُسے کچھ ہمت ہوئی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ ایک دور ہی سے مریض کو دیکھنے جاتے دیکھ رہا ہے تو اُسے ایک عجیب طرح کا فخر محسوس ہوا۔ پھر وہ سیٹی بجانے لگا اور سر کو غرور سے اٹھا لیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور جب دروازے کو سیکا چپکے سے کھولا تو اسکا منہ لٹک گیا کہ وہ پہلا شخص نہیں جس نے اس شاندار فرض کو ضروری سمجھا۔

گریگوری چچا! وہ تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔

کمرے سے بُو کا ایک بھبکا آیا۔ گریگوری ابھی باہر کھڑا سیکا کی باتیں سن رہا تھا۔ اور دروازے میں سے مریض کی حالت دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا اُسے ایک گلاس پانی پلا دوں گریگوری چچا؟" سیکا نے یکبارگی پوچھا۔

دونوں کے چہروں پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

"لاؤ تھوڑا پانی لے آؤ!" گریگوری نے کہا اور ہمت کر کے کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ لیکن کمرے میں جاتے ہی اس کے قدم جیسے رک گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُسے پیچھے دھکیل رہا ہو۔ اس نے دیکھا کہ کستیا کوف دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے پیٹ کے بل میز پہ پڑا ہے۔ اور پیر گیلے فرش پر بار بار پٹک رہا ہے۔

"بھئی کون آیا!" اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

گریگوری ہمت کر کے اسکی طرف بڑھا۔ بلکہ اُسے خوش کرنے کی نیت سے کہا: "میں ہوں گریگوری اور سنو۔ کیوں کیا رات زیادہ کھا گئے تھے۔ اتنا نہ کھاؤ کہ جو منہ پھر جائے!"

لیکن یکبارگی جیسے اُسے سکتہ ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ کستیا کوف اُسے پہچان بھی نہیں رہا ہے۔

کسیاکوف کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ گالوں کی ہڈیاں عجیب انداز سے نکل آئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے سے موت کی علامات اور موت کا خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ صرف جبڑوں کی حرکت سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ابھی اس میں کچھ جان ہے۔ کسیاکوف اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گریگوری کو گھور رہا تھا۔ یک بارگی گریگوری کے دل پر ایک خوف طاری ہوا اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی سرد سرد ہاتھوں سے اسکا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اور اس کمرے میں جہاں عفونت و سردی اور [illegible] تھی، اس وقت موت کے خاموش طرح جیسا کہ معلوم ہوتا تھا۔ گریگوری چاہتا تھا کہ کسی طرح سے وہ اس کمرے سے نکل بھاگے۔ لیکن اس کے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے۔

"اچھا!" گریگوری نے رخصت ہونے کے انداز سے کہا۔

کسیاکوف کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور اسکے ہونٹوں کے کناروں پر سیاہ کف جم گیا۔ اور ایک بے آواز کی آواز میں اس نے کہا۔

"میں مر رہا ہوں!"

یہ تین لفظ گریگوری کے دل و دماغ پر ایک گھونسہ تھے۔ اور پھر وہ بیوقوفوں کی طرح سے مسکرایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا لیکن اسی وقت سینکا پسینہ میں شرابور ہانپتا کانپتا پانی کا گھڑا لئے ہوئے آ موجود ہوا۔

"سپرنٹنڈنٹ کے کنوئیں سے پانی لایا ہوں۔ سنتری کے بچے مجھے پانی ہی نہیں بھرنے دیتے تھے۔" کہتے کہتے سینکا کونے سے گلاس اٹھا کر لایا۔ وہ سمجھتا جاتا تھا کہ وہ لوگ سمجھ رہے تھے۔ "اچھا تم [illegible] بیٹھے ہوا ہے کہ میں نے چاہا ہے؟ تو پھر تم کو کیا! کم بختو وہ تم کو بھی ہوگا اور کوئی بھی نہ بچے گا۔ حرامزادوں نے پھر بھی مارا۔"

گریگوری نے گلاس بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس پی گیا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک کسیاکوف کی آواز "میں مر رہا ہوں" گونج رہی تھی۔

"پانی!" کسیاکوف نے کہا۔

سینکا نے لپک کر گلاس اس کے بے رنگ ہونٹوں سے لگا دیا۔ گریگوری کا [illegible] کا سہارا [illegible] تھا۔ اور اس پر [illegible] کا سا عالم طاری تھا۔ اور اسی حالت میں اس نے سنا کہ سینکا کہہ رہا ہے۔ "شہر والے ہم ایسے تباہ حالوں سے [illegible] پانی پر لئے رہتے ہیں۔" اتنے میں اس نے سنا کہ رنگ سازوں کی کھانا پکانے والی کمرے سے جھانک کر کہہ رہی ہے۔ کہ "اسے تم وہاں اس میں تھوڑی سی [illegible] ملا دو۔ ایک گلاس رم میں دو چمچے۔"

احاطے میں سے کرائے کے کمرے سے کسی نے آواز لگائی کہ "اسے آدھا آونس اسپرٹ رم میں ملا کر دو۔" یک بارگی [illegible] گریگوری کو [illegible] سا ہو گیا اور اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور احاطے میں سے ہوتا ہوا سڑک پر نکل گیا۔

"ہائے اللہ! اس موچی کو بھی ہیضہ ہو گیا۔ وہ [illegible] جا رہا ہے۔" کھانا پکانے والی نے اور عورت کو اس طرح جاتے دیکھ کر رنج کے انداز میں کہا۔

مٹرونا جو اس کے برابر کھڑی تھی۔ یکبارگی چیخ پڑی اور اس کی آنکھیں جیسے نکل آئیں۔

"یہ جھوٹ ہے!" اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ "یہ موذی بیماری اسے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے بچنے نہ دے گا۔"

لیکن کھانا پکانے والی ابھی تک اندر سے سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک اچھا خاصا مجمع احاطے میں اکٹھا ہو گیا۔ ہر ایک کے چہرے پر حسرت کے یاس اور ہمدردیاں اتر رہی تھیں۔ ان میں بعض اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یاس [illegible] سینکا بار بار آکر انہیں کسیاکوف کی کیفیت سے مطلع کرتا۔

لوگ سب ایک ہی جگہ جمع ہو کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور ان کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کوئی پکار اٹھتا تھا۔

"وہ دیکھو ڈاکٹر!"

ڈاکٹر ایک گاڑی میں بیٹھا تھا۔ جیسے ایک سفید صندوق [illegible] ہوئے آدمی [illegible] تھا۔

بچے [illegible] گاڑی [illegible] [illegible] یہ کیا [illegible] سکوت طاری ہو گیا۔ [illegible]

پہلے مگر گنتی پر سے سیزر کا سپلائر اور لاٹ کے گھر پہنچا تھا سفید وردی پہنے ہوئے تھا۔ لیکن پہلے سے اُس نے پوچھا۔ اگرن نے اسکو عجیب نظروں سے دیکھا۔ اور ان کی نگاہوں میں کچھ غصہ بھی تھا۔

"آپ سے ملئے۔ آپ نے کفالت ناتے ہیں۔" کسی نے اس کی سفید وردی کا مذاق اڑایا۔

"دیکھتے جاؤ۔ یہ تمہیں کیسا سمجھتے ہیں۔" کسی اور صاحب نے جملہ چپکایا۔

"کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ بس وہ آجائے گا۔" کسی نے دھیمی بولی میں کہا۔ "اس جگہ پہ ایک جنتر ہے۔" لیکن خوف اور اطمینان کا ملا جلا تھے۔

"لیکن یہ لوگ ہیں بڑے شدید۔" ایک شخص نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے۔

اگرن کی طبیعت کی جو حالت ٹھہر گئی۔ "وہ اسے لئے جا رہے ہیں اس حرامی اور لاٹ کو دیکھو۔"

"ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

"سالا شرابی ہے۔"

"اور لوٹ خدا سمجھتے۔ اسکا پیر اور تو اٹھاؤ۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ گاڑی لے چلو۔" طالب علم نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔ ہاں اور لاٹ اب ہمیں اس جگہ کو صاف کرنا چاہیئے۔ ساتھ ہم ساتھ یہ بھی سیکھ جاؤ گے کہ مریضوں کی جگہ کو کیسے صاف کرسکتے ہیں۔ کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے فخر سے سینہ تانتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں بھی مدد کروں گا۔" سیکا نے کہا۔ وہ مریض کی گاڑی کو کچھ دور تک پہنچا کر ہی لوٹا تھا۔

طالب علم نے عینک کے درمیان سے جھانک کر کہا۔ "اور تم کون ہو؟"

"میں۔ میں تو سیکا ہوں۔ انہیں رنگ سازوں میں سے۔ میں وہ اصل ان کے پاس اچھا کام سیکھتا ہوں۔" سیکا نے پورے فخر سے کہا۔

"کیا تم ہیضہ سے نہیں ڈرتے؟"

"نہیں نہیں! میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

"اچھا خوب! ہاں سمجھ میں آئی بات تو یہ ہے۔" طالب علم نے وہاں پڑی ہوئی ایک بیرل پر بیٹھ کر سمجھاتے ہوئے انہیں سمجھایا۔ "تم سب سے پہلے اپنے آپ کو بالکل صاف رکھنا چاہیئے۔"

مزدور بھی مسلسل مسکراہٹ کے ساتھ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے اپنے میلے کپڑوں سے ناک ڈھکتی ہوئی بلور چی بھی آگئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ طالب علم ان کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور اس نے کہنا شروع کیا۔ "ہیضہ سے بچنے کے لئے سب سے ضروری بات صفائی ہے۔ جسم کی صفائی، جگہ کی صفائی اور ہوا کی صفائی۔"

"ہیضہ سے بچنے کی یہ صورت ہرگز نہیں۔ اسکی اگر کوئی صورت ہے تو یہ ہے کہ ہم شہید بابا سے دعا مانگیں۔ تو وہ ہمیں نجات دلا سکتے ہیں۔" مادر چین نے کہا۔ "سینکڑوں آدمی صاف رہتے ہیں اور صاف ہوا میں سانس لیتے ہیں لیکن مر جاتے ہیں۔" مجمع سے ایک اور نے اپنی رائے پیش کی۔

اور لوٹ اپنی بیوی کے برابر کھڑا تھا۔ اتنے میں سیکا نے اسکی آستین پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اور آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "کیا گرگوری کسیا تو اب مر جائے گا۔ اور اس کے کوئی دیر بھی نہیں ہے۔ پھر مر جا کون لیگا۔"

"چپ شیطان کہیں کا۔" گرگوری نے جھٹک کر آستین اس کے ہاتھ سے چھڑا لی۔

سیکا وہاں سے چلا گیا اور جا کر کسیا کوٹ کے کمرے میں کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ وہاں اسکی آنکھیں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں۔

کمرہ تاریک تھا۔ وہ طالب علم سعد ندر سے گفتگو کر رہا تھا۔

اسی ہنگامہ خیز دن کی شام کو جب وہ کھا رہے تھے تو مزدورنی نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"آج تم اس طالب علم کے ساتھ کہاں گئے تھے؟"

گرگوری نے اس کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔

کسیاکوٹ کے کمرے کو دھونے وغیرہ کے لئے وہ طالب علم کے ساتھ چلا گیا تھا۔ لیکن تین بجے کے قریب جب وہ واپس آیا تو وہ کچھ متفکر اور کھویا کھویا سا تھا۔ وہاں سے آکر وہ چپ چاپ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اگرچہ مزدورنی نے اس سے دو ایک بار باتیں کیں لیکن اس نے

کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی عادت کے خلاف اُس نے کوئی گالی بھی نہ دی۔ بلکہ صرف چپ چاپ پیتا رہا۔ اس سے مترونہ کو فکر تھی اور اُسے بات کا اندیشہ لگنے لگا تھا۔ چونکہ اُسے شوہر سے ایک خاص لگاؤ تھا اس لئے وہ اس کے رجحانات اور خیالات کے سہارے رہا کرتی تھی۔

"کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟"

گرگوری نے اپنی پیالی کا آخری گھونٹ پینے کے بعد ہاتھ سے مونچھیں صاف کیں اور پھر اطمینان کے ساتھ پیالی کو سماوار کی طرف بڑھا دیا۔

"میں آج اس طالب علم کے ساتھ بیرک گیا تھا۔" اس نے اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں؟ ہیضہ بیرک۔ کیا بہت لوگ بیمار ہیں؟" مترونہ نے پوچھا۔

"کسلیا کروٹ کوئے کے ۲۵ آدمی ہیں۔ کچھ اچھے بھی ہو رہے ہیں۔"

"ہیضہ سے اچھے ہو رہے ہیں۔ ناممکن۔ ہو سکتا ہے انہیں کوئی اور بیماری ہو اور بات بنانے کو اُسے ہیضہ بتا دیا ہو۔ کہ لوگ اُن کی دوا کے قائل ہو جائیں۔"

"تم بے وقوف ہو اور اس احاطے والے سب کے سب پاگل ہیں۔" گرگوری نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "ایک سے ایک بڑا جاہل ہے۔ تم لوگوں کی تو صحبت بھی ہیضہ سے زیادہ مضر ہے۔ ہر ایک کوڑھ مغز ہے۔ کوڑھ مغز۔ کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی۔" کہتے کہتے اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اُسے پیا اور بالکل خاموش ہو گیا۔

"تم آج کہاں سے علاج کی ڈگری لے کر آئے ہو۔" مترونہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

گرگوری نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ مترونہ کو دوبارہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ کمرے میں بس لیمپ اور اسٹوو کے ٹوٹے کرکٹ کی آواز گونج رہی تھی — میاں بیوی خاموشی سے بیٹھے بیٹھے اپنے اپنے حصّے کی چائے پی رہے تھے۔ مترونہ کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ اور گرگوری بیٹھا انگلیوں سے میز بجاتا رہا۔

"تم نے کوئی چیز بھی اس قدر صاف شفاف نہ دیکھی ہوگی۔" اس نے اچانک کہنا شروع کیا۔ "ہر آدمی بالکل دودھ جیسے سفید کپڑوں میں ملبوس ہے۔ مریضوں کو ہر گھڑی دیکھا جاتا ہے۔ انہیں بہترین غذائیں دی جاتی ہیں۔ اور دوائی ڈھائی ڈھائی روپے کی ملتی ہے۔ تیمارداری تو اس طرح سے ہوتی ہے کہ ماں کی شفقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں یہ کونسا مذاق ہے کہ انسان کی تمام زندگی میں تو اسکا پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور موت کا پیغام آ جاتا ہے تو اسکی اس طرح خبرگیری کی جاتی ہے کہ دنیا کی تمام آسائشیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر وہ یہی آسائشیں زندگی اور تندرستی کے ایام میں بہم پہنچائیں تو زندگی کس قدر آسودہ ہو جائے۔ اس وقت میں اتنا ہی سمجھ سکتا ہوں کہ یہ پالیسی غلط ہے۔ یہ خدمت کرے۔ ہم کو ڈھائی ڈھائی برس سے یہ نعمتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہی آسائشیں اگر تندرستی کے دنوں میں میسر آ جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ فی الحال میں وہ سمجھتا ہوں۔"

مترونہ اسکی باتیں سن رہی تھی۔ لیکن وہ انہیں سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کر رہی تھی۔ مترونہ اس سے سوال کرنا ہمیشہ خطرناک سمجھتی تھی۔ کیونکہ وہ بعض وقت ہمیشہ اسکے سوالوں سے اُلجھ جاتا تھا۔ لیکن آخر اُس سے نہ رہا گیا اور وہ بول اٹھی۔

"شاید وہ لوگ اس بات کو تم سے بہتر سمجھتے ہوں۔" مترونہ نے شوہر کو زک دیتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

گرگوری نے اپنے شانوں کو ایک بے نیازانہ شان کے ساتھ جنبش دی۔ اور مترونہ پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"خیر یہ ان کا اپنا کام ہے۔ خواہ وہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ لیکن اگر میں زندگی کے یہ مزے اٹھائے بغیر مر گیا تو مجھے کم از کم یہ حق ضرور ہے کہ اس مسئلہ میں اپنی رائے پیش کروں۔ میں کہوں گا کہ میں اپنی موجودہ زندگی سے عاجز آ چکا ہوں اور اب اسکا قطعاً انتظار نہیں کر سکتا کہ مجھے ہیضہ ہو کر دیا جائے اور پھر اس کے بعد آپ لوگ مجھ پر نوازشات کی بارش کریں۔ میں کسی طرح سے اس امید پر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر کالمبو نے کہا ہے کہ تقدیر کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ ایک طرف تقدیر اور دوسری طرف تم خود پھر دیکھو کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔ یہ جنگ جنگ ہو اور اس میں کسی رعایت کی گنجائش نہ ہو۔ سمجھیں۔ میں اسپتال میں کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں اپنا سر ہیضہ کے منہ میں ڈال دوں گا۔ خواہ وہ میرا سر ہی کاٹ ڈالے۔ جیسی وہ بلی پنجہ گاڑ دے اور کھا لے۔ مجھے پرواہ نہیں۔ شاید اس کام میں مجھے جان دینی پڑے۔ لیکن میں اس جگہ پر تو اس سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر گرگوری نے اتنی زور کا مکہ میز پر مارا کہ تمام پرچ پیالیاں اچھل پڑیں۔

شروع شروع تو مترونہ نے کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن آخر کے جملوں نے اسے چونکا دیا۔ اور اس نے معاندانہ لہجہ میں کہا۔

"اچھا تو اس واسطے آپ نے آپ کو یہ صلاح دی" مٹرونا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں خود بھی صلاح رکھتا ہوں۔ مجھے دوسروں کے مشورے کی کم ضرورت ہے" گریگوری نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"اچھا اور پھر اس نے میرے بارے میں تمہیں کیا صلاح دی" مٹرونا نے پوچھا۔

"تمہارے بارے میں" گریگوری کچھ سوچتا ہوا جھجکا۔ اس نے اپنی بیوی کے بارے میں ابھی تک کچھ سوچا ہی نہ تھا اور یہ سوال اسے بے ڈھب معلوم ہوا۔ وہ اسے گھر پر چھوڑ سکتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی تو اپنی بیویوں کو گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مٹرونا کو اس طرح سے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس نے مٹرونا سے کہا "تم گھر پر رہو گی اور میں اپنی تنخواہ لا کر تمہیں دیا کروں گا۔"

مگر مٹرونا معنی خیز نظروں سے مسکرائی۔ اسکی مسکراہٹ گریگوری کو بہت بری معلوم ہوئی۔ اور اسکے شبہات اور زیادہ پختہ ہو گئے۔ اور اس کے دل میں رشک کی جلن پیدا ہو گئی۔ گریگوری ان معاملات میں بہت زیادہ ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اسکی خودداری نے اسے اظہار خیالات سے روک دیا۔

"تم بیٹھی گھر آرام سے سیتی رہنا۔ اور تم کر ہی کیا سکتی ہو" اورلوف نے کہا اور پھر مٹرونا کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

مٹرونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ اسی طرح سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"لیکن ہوا کیا ہو گا؟" گریگوری نے کہا۔

"یہ کیا؟" مٹرونا نے پوچھا۔

"زہریلی ناگن۔ یہ طعنے دے رہی ہے۔ ورنہ میں سر اچھا رہتا" گریگوری نے غصہ سے کہا۔ "خواہ میں موت ہی کے منہ میں جانا چاہتا ہوں لیکن تجھے سبق دینا چاہوں گا۔"

"میں تو تمہیں وہاں نہیں بھیج رہی ہوں۔ مت جاؤ!"

"اچھا کم بخت میں خوب سمجھتا ہوں کہ تیرے دل کی تمنا کیا ہے تو چاہتی ہے کہ میں وہاں جاؤں اور پھر لوٹ کے نہ آؤں۔" وہ زور سے چلایا۔

جواب میں مٹرونا بالکل نہ بولی۔ اس نے اورلوف کے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کی سب سے ٹھنڈا دیر ہو چکی کہ فوراً ہی اسکے خیال میں ایک چال آ گئی تھی۔

"میں تجھے خوب سمجھتا ہوں۔ تو تو مجھے پھنسا کر بہت ہی خوش ہو گی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی ایسا کروں گا کہ تو آپ اپنی چال میں پھنس جائے۔ دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے جھپٹ کر اپنی ٹوپی اٹھائی اور کمرے کے باہر نکل گیا۔ اسکی بیوی اپنی حرکت پر افسوس کرتی رہی۔ کہ اس نے بے کار اسے چڑا دیا۔ اور پھر وہ کچھ متفکر بھی ہو گئی کہ اب معلوم نہیں وہ کیا کرے۔ اس کی بیوی فکر میں پڑ گئی۔ اور اللہ پر بھروسہ کئے تھی۔

وہ بڑی دیر تک میز پر بیٹھی سوچتی رہی۔ معلوم نہیں اسکا خاوند کیا کرے۔ اور صاحب کو اب معلوم نہیں آج کیا حرکت سوجھی ہو۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے اسکی شعاعیں کھڑکی میں گزر کر صاف کئے ہوئے برتنوں پر پڑ رہی تھیں۔ جن سے اس تہ خانے میں بھی تھوڑی سی روشنی ہو گئی۔ اور مٹرونا اس روشن جگہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور برتن دھو اپنی جگہ رکھ کر سونے کے لئے اپنے پلنگ پر لیٹ رہی۔

رات گئے گریگوری لوٹا۔ سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آہٹ سن کر مٹرونا کو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت خوش ہے۔ وہ اندھیرے کو کوستا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھا اور اسکی بغل میں بیٹھ گیا۔

"اچھا بوجھو!" گریگوری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا بوجھوں؟"

"تم میرے ساتھ کام کرو گی؟"

"کہاں؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اسی بیرک میں جہاں میں کام کروں گا۔" اورلوف نے سینہ تان کر کہا۔

مٹرونا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس نے اسے چمٹا لیا اور اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ مٹرونا نے یہ حرکت کچھ اس بے ساختہ پن کے ساتھ کی۔ گریگوری نے اسے جھٹک دیا۔

اس نے سوچا کہ یہ مجھے بیوقوف سمجھتی ہے۔ کہ میں اس کی حرکت سے یقین کر لوں گا کہ یہ میرے ساتھ کام پر راضی ہے۔ مکار کہیں کی۔

اس کے دل میں آیا کہ اسے اٹھا کر زمین پر دے مارے۔

لیکن اس نے جذبات پر قابو پا کر اس سے پوچھا "یہ حرکت کیا تھی؟"

صرف اس لئے کہ ..... اس نے اترا کے ہنسنا شروع کیا۔

"بس بس۔ تم بے حد نکارہ ہو۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔"
"بیچارے؟"
"چل ہٹ!"
"گریگوری۔ میری جان۔"
"تمہارا مطلب کیا ہے۔" گریگوری کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس نے پوچھا۔
"کیا تم ناراض نہیں؟"
"کس بات سے۔ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے نا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔
گریگوری کو یہ جواب سن کر خوشی ہوئی۔
"میری جان!" کہہ کر گریگوری نے اسکے زور کی چٹکی لی کہ وہ اچھل پڑی۔

برک میں کام کے پہلے ہی دن کثرت سے مریض آتے رہے۔ یہ جوڑا اتنیک جس تن آسانی کا عادی رہا ہے اسکی بنا پر انہیں [illegible] سے تھوڑی سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اور اپنے جوڑے پن پر انہیں اور بھی الجھن ہوتی تھی۔ جو کچھ کہا جاتا تھا وہ اتنی جلدی انکی سمجھ میں نہ آتا تھا اور اس وجہ سے وہ اور بھی الجھتا۔ اور ہر وقت یہ سوچتا کہ اب وہ ڈانٹا جائے گا۔ اور اسے سخت سست کہے گا لیکن اُسے بہت حیرت تھی کہ انکی اتنی بڑی بڑی غلطیوں پر بھی اسے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

ایک دن ایک لمبے تڑنگے ڈاکٹر نے گریگوری سے ایک مریض کو اٹھانے کو کہا۔ اور گریگوری نے اسے اس طرح سے جوش اور جھٹک سے اٹھایا کہ بیچارے کی چیخ نکل گئی۔

یار! دبا کر اسکا کچومر نہ نکال۔ یہ نہ ہو کہ ہم نہانے کے ٹب میں سے اسکے ایک ایک عضو کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔

گریگوری کا سر شرم سے جھک گیا۔ لیکن مریض نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ سیکھ جائیں گے۔"

جب یہ میاں بیوی برک میں پہنچے تو وہاں ڈاکٹر نے انہیں سب سے پہلے یہ بتایا کہ مریض کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں۔ مریضوں کو کیسے لٹاتے کیسے پکڑیں۔ کیسے اٹھائیں۔ کیسے بٹھائیں۔ اور مرض کی مختلف حالتوں میں کیا کریں۔ آخر میں ڈاکٹر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ نہا چکے ہیں۔

اور اس کے بعد اس نے انہیں سفید لباس دیا۔ ہر شخص سفید لباس میں تھا۔ اور ان کے سفید سفید خفتان کر کے بہت معلوم ہوتے تھے سارا کام بہت تیزی سے ہوتا تھا۔ مریضوں کی کراہ اور دوا کی تیز بو سے تمام برک بھری تھی۔

پہلے پہل تو گریگوری کو اس سارے کاروبار میں ایک افراتفری معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ یہاں کبھی کام کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ اور اسکا دم گھٹ جائے گا یا بیمار ہو جائے گا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اس ہنگامہ میں شامل تھا۔ اس میں بھی وہ جوش عمل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی کام کا ہو سکے۔ شاید یہ زندگی اور خدمت کی مہم ہی اس کی زندگی کو کچھ خوشگوار کر دے۔

کسی دوا کے لئے ایک ڈاکٹر نے پکارا۔
"گرم پانی!" ایک طالب علم چیخا۔
"ارے تمہارا کیا نام ہے۔ ہاں اور دیکھ۔ ذرا اس مریض کے پیر تو دباؤ۔ ارے یوں بس یوں۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا آہستہ آہستہ۔ اسکی کھال نہیں اتارنی ہے۔" ایک دوسرے طالب علم نے کہا۔ اور پھر اس نے خود مریض کے پاؤں دبا کر بتایا کہ کس طرح مالش کرنی چاہئے۔
"ایک اور مریض آیا ہے۔" کوئی پکارا۔
"اور لوٹ ذرا اسکو اندر تو لانا۔"

گریگوری پسینہ میں شرابور۔ گھبرایا ہوا۔ ہر کام کے انجام دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ کام میں اتنا محو ہو جاتا تھا کہ اپنے وجود کو بھی فراموش کر جاتا تھا۔ مریضوں کی افسوسناک حالت۔ انکی کراہیں۔ اتنی ہوئی آنکھیں اور بھاری بدن کو موڑ ڈالنے والی درد۔ [illegible] گریگوری کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

ایک آدھ بار گریگوری نے اپنی بیوی کو کبھی پاس سے گزرتے دیکھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلدی میں ہوتی تھی۔ اسکا چہرہ بھی ستا ہوا اور کام کی وجہ سے ماندہ نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دبلی بھی نظر آتی تھی۔
"کیسے حال ہیں؟" ایک بار اس نے پوچھ لیا۔
لیکن مرتھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔
گریگوری کو خیال گزرا کہ اس منظر اور کہیں ایسا خوفناک جگہ

کر غلطی کی۔ مگر اُسے کچھ ہو گیا ہوگا۔ اس لئے جب اس نے اُسے دوبارہ برآمدے سے گزرتے دیکھا۔ تو ذرا تلخی سے اس نے پاس سے آواز دی۔

"دیکھو اپنے ہاتھ بہار صاف رکھنا۔ اور ذرا احتیاط بھی۔"

"اور اگر میں احتیاط نہ کروں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

گریگوری کو تاؤ آ گیا "چڑیل نے کیا جگہ مذاق کی تجویز کی ہے۔ یہ نیتی بھی بڑی کمینی ہوتی ہیں۔ لیکن مرطوبز نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ لیا اور بغیر کچھ کہے چپکے سے عورتوں کے وارڈ میں چلی گئی۔

کچھ ہی لمحہ بعد وہ ایک پولیس مین کو مردہ خانے سے جا رہا تھا۔ سپاہی آرام سے اسٹریچر پر پڑا تھا۔ اور اسکی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گریگوری اسکی طرف دیکھنے لگا تو اُسے ایک جھرجھری آ گئی۔ ابھی تین دن ہوئے کہ یہی سپاہی اس سے اکڑ رہا تھا۔ وہ کتنا مضبوط اور تندرست معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آج اسکی لاش کیسی بےطرح بگڑی اور اکڑی پڑی ہے۔

موت و حیات کا یہ مسئلہ گریگوری کو عجیب معلوم ہو رہا تھا کیوں آدمی اس طرح سے چند ہی صرف ایک ہی دن میں، ایسی گندی بیماری سے مر جاتا ہے۔ اور وہ سپاہی کو دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔

یکبارگی سپاہی کا بازو اٹھا اور سیدھا ہو گیا اور اسکا ادھکھلا منہ بالکل بند ہو گیا۔

"لٹھ یہ زندہ ہے۔" "پھر وہ تیز: ٹھہر۔ گریگوری نے اپنی طرف کا اسٹریچر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

اسٹریچر کے دوسری طرف والا آدمی رُک گیا۔ اور پھر مردہ پر اس نے نظر ڈالی۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ارے اس نے تو بازو کو اس لئے سیدھا کیا ہے کہ آسانی سے کفن میں سما سکے۔ چل اُٹھا۔"

"لیکن ابھی تو ہلا تھا" گریگوری نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا۔

"بس اٹھا اور چل۔ تیری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی۔ یہ تو دکھن کے لئے اس نے ہاتھ سیدھا کیا۔ لیکن وہ اس لئے ہلا۔ تم اپنی بیوقوفی سے ضرور پچھتاؤ گے۔ مردوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہیں کہتے۔ کیا کوئی مصیبت کھڑی کرنا چاہتے ہو سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ اور اگر یہ بات تم منہ سے نکالو گے تو بات پھیل جائے گی اور بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اور لوگ قیامت برپا کر دیں گے کہ ہم زندہ ہی لوگوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ اچھا اب چپ رہنا۔ ہاں اسے ادھر بائیں طرف رکھو۔"

اس آدمی کی اطمینان بخش باتوں سے گریگوری کو کچھ سکون ہوا۔

"گھبراؤ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب باتوں سے عادی ہو جاؤ گے۔ میں کیا۔ ہم تو مزے میں ہیں۔ اچھا کھانا اور اچھا پہننا اور پھر اس سے کیا ایک روز ہم خود اس طرح سے مردہ خانے میں ڈال دیئے جائیں گے۔ مگر تب تک تم بالکل منہ بند کئے رہو ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالو۔ ابھی تم کچھ سمجھ رہے بھی ہو؟"

"ہاں!" گریگوری نے کہا۔

"میں نے ایک بوتل اُدھر کونے میں چھپا رکھی ہے۔ چلو ایک ایک گھونٹ پی لیں"

وہ دونوں اس کونے کی طرف گئے۔ اور بوتل میں سے تھوڑی تھوڑی سی شراب پی۔ اس کے بعد پروتن نے تھوڑی سی شکر پر پیپرمنٹ چھڑک کر گریگوری کو دی۔ اور خود بھی کھا لی۔ تاکہ منہ سے بدبو نہ آئے۔

"اسے کھا لو۔ یہاں لوگ دارو کا پینے کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ تمہارے منہ کی مہک دور ہو جائے گی۔"

"تم تو اب عادی ہو گئے ہو گے" گریگوری نے پوچھا۔

"میں یہاں تو پہلے ہی دن سے ہوں اور میں نے بہتوں کو دم توڑتے دیکھا ہے۔ اور نہ یہ کوئی آرام دہ جگہ ہے۔ ویسے بُری نہیں ہے۔ یہ تو خیر کا کام ہے۔ یہ ایک جنگ کا میدان ہے۔ تم نے کبھی میدان جنگ کی نرسوں اور ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ میں نے تو ترکوں کی جنگ میں انہیں خود دیکھا ہے۔ اور یہ لوگ حقیقت میں سپاہیوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ ہم تو میدان جنگ میں بندوق لے کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ گولیوں کی بوچھاڑ میں ایسے پھرتے ہیں گویا کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ اور میدان سے زخمیوں کو اٹھاتے ہیں خواہ وہ روسی ہوں یا ترک۔ گولیوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو گولی انہیں بھی زخمی کر دیتی ہے۔"

شراب اور اس گفتگو کے بعد گریگوری کچھ نیند محسوس کرنے لگا اب جب سفر شروع ہو گیا تو ہو گیا۔ رکنا نہیں ہے۔ اس لئے

ایک مریض کے چہروں پر مالش کرتے ہوئے سوچا۔ اس کے کانوں میں دوسرے مریضوں کی کراہ کی آواز آ رہی تھی۔

"پانی۔ خدا کے لئے ایک گھونٹ" کوئی مریض کہتا۔

"گرم سفیدی اور سرے امسی سے تسکین ہوتی ہے۔ ان میں اور گرم پانی ملا دو۔"

"اسے تھوڑی سی شراب دے دو" ڈاکٹر داس گپتا نے حکم دیا۔

کام کرتے کرتے اب اور لوٹ کو پتہ لگ گیا کہ یہ کام اتنا بھیانک اور برا نہیں ہے جتنا اس نے پہلی نظر میں محسوس کیا تھا۔ اور نہ اب ہنگامہ بے ترتیبی اور گڑبڑ ہے بلکہ یہ تمام ظاہری گڑبڑ ایک ٹھکانے کی تنظیم تھی۔ لیکن پھر بھی جب اسے اس پولیس مین کی یاد آتی تو وہ گھبرا اٹھتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ وہ شاید مر ہی گیا تھا۔ پھر خود ہی اس کی تردید کر دیتا۔ وہ سوچتا کہ کہیں وہ پولیس مین اللہ کو پیارا نہ ہو گیا ہو۔ اس نے سنا تھا کہ ایک بار ہیضہ کا ایک مریض تابوت کے صندوق میں اٹھ بیٹھا تھا اور اس سے ڈر کر بھاگ گیا۔

اسے پھر بیوی کا خیال آیا۔ وہ کیا کر رہی ہوگی اور اس کا دل چاہنے لگتا کہ کسی طرح سے کام چھوڑ کر دیکھ آئے کہ مثروتہ کیا کر رہی ہے لیکن پھر اسے اپنے اس خیال ہی سے شرم آنے لگتی۔ اور پھر وہ خود ہی اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا کہ وہ مثروتہ سے کہے گا۔

"ہاں کام کئے جا گنگو۔ بے شک تیرا یہ گندا جسم گل جائے اور پھر تو تجھے کوئی نہ پوچھے گا اور تیری سب ہڈیاں خاک میں مل جائیں گی"

اسے اکثر یہ شک ہوتا کہ مثروتہ اسے ایک نہ ایک دن چھوڑ کر بھاگ جائے گی اور یہ بات اسے اپنے تجربات و مشاہدات کے مطابق معلوم ہوتی تھی۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے کو قائل کرتا کہ شاید وہ خود ہی اس کے متعلق اتنے برے خیالات رکھتا ہے۔ تو اگر وہ اسے چھوڑ کر بھاگ بھی جائے تو کیا برا ہے۔ اسکی زندگی کونسی اچھی گزر رہی تھی۔ اور جو اس طرح کی زندگی گزاریگا۔ اسکے ہی دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھیں گے اور پھر ان خیالات کی بنا پر اسے یقین ہو جاتا کہ مثروتہ ضرور اس سے بیوفائی کرے گی کبھی یہ سوچنے لگتا کہ آخر وہ اپنی کوٹھری چھوڑ کر کیوں اس دھکے ہوئے کیا اوپر گر پڑا۔ انکی سمجھ میں اسکا کوئی جواب نہ آیا۔ اور پھر وہ خیالات کے دریا میں ڈوب جاتا۔ لیکن ان ڈاکٹروں کی بیحد خدمات دیکھ کر اس کے دل نے جو اثر قبول کیا تھا۔ وہ خیالات اسکی فطرت خود

محسوس کرتا گنگو نہ بڑھنے دیتا۔ وہ ڈاکٹروں اور طالب علموں کے تھکے ہوئے چہرے دیکھتا۔ ان کی ماندگی اور اس پہ کام کی لگن دیکھ کر وہ سوچنے لگتا کہ ان کا کھایا پیا ایک ایک کوپک حلال کا ہے۔

شام کو جب اسکا کام ختم ہو گیا۔ تو وہ اسپتال کے احاطے میں چلا گیا اس کا سر سنسنا رہا تھا اور تمام بدن تھکاوٹ کی وجہ سے چور چور تھا۔ اور وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ اور آسمان پر دوڑتے ہوئے رنگین بادلوں کو تکنے لگا۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ سو گیا۔

اس نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر نے اسکی اور اسکی بیوی کی دعوت کی ہے۔ ایک بہت بڑا سا کمرہ ہے۔ اور اس میں ہسپتال کے تمام مریض بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اور مثروتہ بیچ فرش پر کھڑے ناچ رہے ہیں اور وہ خود سب کچھ کھا رہا ہے۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ ڈاکٹر کی ٹانگیں بہت بہت لمبی ہیں اور ناچ میں مثروتہ کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے اور عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا ہے۔ تمام مریض بھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ دروازے پر وہی پولیس والا کھڑا دھکا رہا ہے۔ "تم گریگوری ہو تم مجھے مردہ سمجھ کر مردہ خانے میں ڈال آئے تھے۔ اور اب خود مزے سے رباب بجا رہے ہو۔ چل۔ اٹھ۔ کھڑا ہو۔"

گریگوری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر داس گپتا اس کے پاس کھڑا تھا۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ یہاں باہر میدان میں گھاس پر پڑے ہو۔ تمہیں غضب کرو اور لیسٹر مل چکا ہے۔ تو تم گھاس پر کیوں لیٹے ہو۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گے۔ اور جلد ہی ٹھنڈے ہو جاؤ گے اور خود تمہیں بھی چھت نہ ملے گا۔ ایسی حرکت پھر نہ کرنا۔ ارے تمہیں زکام ہو گیا۔ دیکھا نہ خیر چلو۔ میں دوا دیتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب میں بہت تھک گیا تھا" گریگوری نے رک رک کر کہا۔

"تب تو یہ اور بھی بری بات ہے۔ تمہیں احتیاط کرنی چاہئے۔ اور اس طرح تو بات بگڑ جائے گی۔ اور ابھی ہمیں تمہارے جیسے آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

گریگوری ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے گیا اور وہاں ڈاکٹر نے اسے دوا کا گھونٹ میں دوا دی۔ گریگوری ایک ایک گھونٹ انہیں پی گیا۔ وہ الٹی کرنے کو اس نے برا سا منہ بنایا اور وہیں فرش پر تھوک دیا۔

"اچھا اب جاؤ اور جا کر سو رہو۔" کہتا ہوا ڈاکٹر تو ایک طرف کو روانہ

اس شفاف کمرے میں چائے پیتے ہوئے اُسے بڑا مزا آ رہا تھا۔

اور اس وقت کا ماحول اُسے بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اسکی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسکی خوشی میں کیوں بڑھ رہی ہے۔ یہ خوشی آپ ہی آپ اس کے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ آج وہ اپنی نیکی کا سبب بتا کر مطرونہ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

اگر میں نے کام کرنا شروع کیا تو اس زمین کی وسعت بھی میرے لئے ہو جائے گی۔ کم لوگوں میں ایسی خدمت کا جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس نے کافی مبالغہ کے ساتھ ڈاکٹر والی بات بھی سنائی۔ مطرونہ سُن کر متعلوم ہوئی تھی اور اُسکا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

اور یہ کام تو خاص طور سے بہت اہم ہے۔ ایک کا منظر جس کے ایک طرف ہیضہ اپنی فوجیں لئے تباہی و بربادی کے واسطے آ رہا ہے اور دوسری طرف مریض اور ہم لوگ۔ مدافعت کے لئے۔ کون کہتا ہے! اس میں بہت دماغ کی ضرورت ہے۔ ہیضہ چھا گیا ہے۔ پھر اسکو اچھی طرح جان لینے کے بعد ہم اسکی سب سے کمزور جگہوں پر حملہ کریں گے۔ ڈاکٹر واسن چنکو نے تو کہا تھا کہ ہمارا رول ہیں تو تم جیسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے جیسے جوان ہمت مرد ہی ہیضہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور تمہاری مدد سے ہم ہیضہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ اور ان مریضوں کو موت کے منہ سے نکال لیں گے۔ اپنی اس زندگی کے لئے یہ مریض تمہارے ہمیشہ احسانمند رہیں گے۔ گریگوری نے فخر سے سینہ تان لیا۔ اور اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

مطرونہ نے بھی اُسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ اسوقت بہت حسین نظر آ رہا تھا۔ اور آج وہ ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ شادی سے پہلے تھا۔

ہمارے یہاں وارڈ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ ایک معمولی سی ڈاکٹر ہے۔ وہ عینک لگاتی ہے لیکن مریضوں کی تیمارداری ایسی کرتی ہے کہ جیسے وہ اس کے لڑکے ہوں۔ اور پھر اُسے اپنی خدمت کا ذرا بھی غرور نہیں۔ اور بات اس نرم و نازک لہجہ میں کرتی ہے کہ تھکے ہوئے آدمی کو بھی ایک لفظ میں تر و تازہ کر دیتی ہے۔

اچھا تب تمہیں بھی یہ زندگی پسند ہے۔ گریگوری کا جوش کچھ دب گیا۔

بالکل۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ اب بارہ روبل ہفتہ مجھے ملتے ہیں

روبل نہیں ملتے ہیں۔ کل بیس روبل ہوئے۔ اور ہمارا یہاں کوئی خرچ نہیں اس لئے اگر یا نون تک یہ ہوا تو پھر موسم تک ہم کافی بچا لیں گے۔ اور اس کال کوٹھری کو چھوڑ کر کوئی اچھا سا مکان لے لیں گے۔

ہاں بھئی یہ بات تو سچ ہے۔ گریگوری نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ پھر مطرونہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اس نے جوش سے کہا۔ اور پھر تو ہمارے گھر میں بھی دھوپ آیا کرے گی۔ اور زندگی اس سے کہیں زیادہ حسین ہو جائے گی۔

مطرونہ تبسم مسکراہٹ تھی۔ کاش تم ۔۔۔۔

"اب کچھ اور نہ کہو۔ جب دن بدل جائیں گے تو میری عادت بھی بدل جائے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو"

"بس بھئی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے"

"پیارے گریگوری"

ان کے دلوں میں کتنی امنگیں تھیں۔ اور ایک نئی زندگی کی تمنا۔ ان کے دل کو بے پایاں مسرت سے بھر رہی تھی۔ اتنی مسرت کی تمنا میں وہ سخت سے سخت محنت کے لئے تیار تھے۔

اِدھر اوسلوف بہت تن دہی سے کام کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی بار اسکی محنت کا اعتراف کیا اور وہ مردوں کے سامنے اسکی تعریف کی۔ اس کے بہت سے ساتھی اُس سے جلنے لگے۔ اور موقع ملنے پر اسکی بیجا شکایتیں بھی کرتے۔ سب تو سب پروشن بھی اُس سے جلنے لگا اگرچہ پروشن اُسے پسند تھا۔ اُس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سن لیتا تھا۔ لیکن اوسلوف بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

بدمعاش۔ پروشن کا خیال آتے ہی اس نے دل میں کہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنی تمام باتیں مطرونہ سے کہہ سکتا ہے۔ اور وہ دوسروں کی طرح اسکی کامیابی سے جلے گی نہیں بلکہ خوش ہو گی۔

اوسلوف کام میں اور دلچسپی لینے لگا۔ اسے ہمیشہ یہی دھن لگی رہتی کہ مریضوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کس طرح کی جائے۔ وہ اب دواؤں کو بعض سونگھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کس وقت مریضوں کو دی جاتی ہیں۔ دوائیں اور مریضوں کی تیمارداری میں اُسے دواؤں سے زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر اور طلبا میں بھی اسکی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی تھی اور اوسلوف کو اب اپنی شخصیت کا احساس ہو رہا تھا۔ [illegible]

سکہ وہ ایسے کارہائے نمایاں کر جائے جو دوسروں سے ممکن بھی نہ ہوں۔ اور وہ اپنے کو سب سے اونچا کرنا چاہتا تھا سب سے نمایاں اور منفرد۔ اور اس کے لئے وہ ہر قربانی کے لئے تیار تھا۔

اب وہ ایسے مریضوں کی خدمات اپنے ذمہ لیتا جن سے لوگ گھن کرتے۔ لیکن وہ چھوت چھات کی پروا کئے بغیر ان کی خدمت کرتا رہتا۔ ایک دن تو وہ ایک بھاری مریض کو اپنی پیٹھ پر لاد کر غسل خانے لے گیا اور وہاں سے بغیر کسی کی مدد کے اسے اٹھا لیا۔ اب وہ دشوار سے دشوار اور سخت سے سخت کام کے لئے ہر طرح سے تیار رہتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب اسے اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں۔ لیکن اب بھی اسے سیری نہ ملتی۔ وہ کوئی انوکھا کام کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیوی سے اس موضوع پر بات کرتا۔

ایک دن شام کو کام ختم کرنے کے بعد میاں بیوی نے اکٹھا کھانا کھایا اور اسکے بعد دونوں سیر کو نکل گئے۔ اسپتال شہر سے تھوڑی دوری پر بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ اور ایک طرف کسانوں کے کھیت تھے۔ چڑھتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں وادی کے سبزہ زار میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اور دوسری جانب شہر کی سمت کے مکانات کی کھڑکیوں کو یہ روشنی بہت ہی حسین اور دلکش بنا رہی تھی۔ کہیں سے گانے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ مگر گریگوری اس حسین منظر میں کھویا کھویا سا مٹرونہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ مٹرونہ کو اسکا یہ متفکرانہ انداز کچھ پسند نہ آیا۔ اس لئے اس نے بات شروع کرنے کے لئے پوچھا۔ معلوم نہیں یہ گانے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے اسپتال سے؟

"گانا؟" گریگوری نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ "لعنت بھیجو اس گانے پر۔ تم اسوقت اس نغمہ کو سنو جو میرے دل میں چھڑا ہوا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو" مٹرونہ نے شوہر پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں . . . میں کچھ نہیں چاہتا۔ بس میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میرا دل کچھ کرنے کو تڑپ رہا ہے۔ کوئی بڑا کام۔ یہی وجہ اگر ایک دلیر بن جاؤں تو سمجھیں اس سے لڑنے کو دوڑ آتا۔ جو جہاں ہو اس وقت تک لڑتا رہوں۔ جب تک جسم کا ایک قطرہ بھی باقی ہے

میں اسے خدا سے مقابلے کے لئے للکاروں گا۔ کہ آؤ مجھ سے مقابلہ کرو۔ اور پھر جب میں اس سے لڑتے لڑتے مر جاؤں تو لوگ میری قبر پر یہ کتبہ لگائیں کہ یہ گریگوری اورلوف کا مزار ہے۔ جس نے ہیضہ کا مقابلہ کیا اور اپنے آخری دم تک لڑتا رہا۔ اور آخر میں اس نے روس کو اس وبا سے آزادی دلائی" کہتے کہتے اسکی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"میرے شوہر!" کہہ کر مٹرونہ اس سے لپٹ گئی۔

"میں اپنے کو ہزاروں بلاؤں کے مقابلے میں ڈال دوں اگر میں یہ سمجھ لوں کہ اس سے کچھ بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انسان کتنی بڑی قربانیاں کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر واسن چیکو اور وہ طالب علم خوخ بکوف یہ ایثار اور قربانی کے پتلے ہیں۔ جن کی زندگی لوگوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ یہ خدمت محض خدمت کے لئے کرتے ہیں۔ یہ تنخواہ انہیں اس طرح کام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ ان کی خدمت اور خلوص کا جواب تو دنیا کا تمام خزانہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی یہ محنت اور اس کے پیچھے کسی فائدہ کا نہ ہونا ایک معجزہ ہے معجزہ۔ کیا یہ روپیہ کے لئے کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ انہیں روپیہ کی اتنی پروا نہیں۔ ان کی زندگی تو خدمت ہے صرف خدمت۔ انہوں نے کیسے کیسے لوگوں کی خدمت کی ہے۔ خدا یہ رحمت ہی کو لو۔ کون خدا و جسکی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ نیکی اور اچھائی چھو کر نہیں گزری جس نے تمام عمر صرف چوری ہی نہیں بلکہ نہ معلوم اور کتنے جرائم کئے ہیں۔ لیکن انکو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو اسے ہیضہ سے چھین لینا چاہتے تھے اور پھر جس دن وہ اچھا ہو کر اسپتال سے نکل رہا تھا تو وہ کتنا خوش تھا انکی شکل پر جیسے ساری دنیا کی مسرتیں سمٹ آئی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کاش مجھے بھی مسرت نصیب ہو۔ اور اتنی نصیب ہو کہ میں اس میں ڈوب جاؤں مجھ سے دوسروں کی ایسی مسرت برداشت نہیں ہوتی۔ میں خود تڑپ اٹھتا ہوں۔ عجیب کیفیت ہے میری۔ خدا غارت کرے۔"

گریگوری پھر سوچ میں پڑ گیا۔

مٹرونہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی ایسی باتوں سے ڈر لگنے لگتا۔ اسکے الفاظ میں پوشیدہ اپنے شوہر کی ایک ایسی شخصیت جھلکتی نظر آتی جسے اس نے کبھی سمجھا نہ تھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی وہ ایک عجیب خود پرست تھا۔ اور وہ کسی کا [illegible]

چلتے چلتے وہ پہاڑی کے [illegible] پہنچ گئے۔ چیڑ کے درختوں کی شاخیں جیسے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ان کے نیچے تمام گھر پھیلا ہوا تھا۔ اور ایک سوندھی سوندھی سی مہک اندر کی ساری فضا کو مہکا رہی تھی۔ اور تمام وادی میں جیسے ایک پرسکون آواز رقص بنی ہوئی تھی۔ درخت کچھ اس طرح سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جیسے ان کی گود میں کوئی سو رہا ہو اور وہ ڈر رہے ہوں کہ ان کے زور سے بولنے سے کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ مسٹر اور مسز گریگوری چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گریگوری اپنی انگلیوں سے اپنے بیٹے کو بجا رہا تھا اور مسز [illegible] خاموش محبت بھری نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"میرے پیارے۔ میری جان گریگوری" مسز [illegible] نے آہستہ سے کہا۔ "تم کتنے عجیب معلوم ہوتے ہو۔ میرے پیارے۔ یہ [illegible] شادی کے پہلے دنوں کی طرح اچھے اور بہت پیارے لگ رہے ہیں۔ اب تم صرف محبت کی باتیں کرتے ہو۔ اور مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتے ہو۔ اب مار پیٹ بھی نہیں ہے۔ یہ دن کتنے اچھے ہیں۔"

"اچھے تمہیں بھی پسند ہے۔ اور اب بھی ایک آدھ گھونسا اور لات رسید کر سکتا ہوں" گریگوری نے اپنی بیوی کی طرف محبت اور رحم بھری نظروں سے دیکھا کہا۔

مسز [illegible] اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں کو تھپتھپانے لگا۔ جیسے وہ کوئی ننھا بچہ ہو اور کسی بڑے کی محبت بھری آغوش میں ہو۔ اس کے بازوؤں میں کتنی گرمی اور کتنا سکون تھا۔

"پیارے۔"

"کہو میری جان اور کچھ کہو۔ یقین کرو۔ کہ میں تمہارا سب سے بڑا دوست ہوں۔ تم شاید اوروں کا سہارا ڈھونڈتی رہی۔ میں نے جب بھی تمہیں مارا ہے تو مجبور ہو کر۔ وہ زندگی ہی ایسی تھی۔ نہ دوستی اور نہ مسرت۔ اس تنگ و تاریک جگہ میں نفرت کی بجائے محبت کیسے آ سکتی تھی۔ میں اس وقت اندھا تھا۔ زندگی ہی کچھ ایسی تھی۔ تم میری بیوی تھی اور میری سب سے بڑی دوست۔ لیکن کیا بہت سے لوگ تو بہت [illegible] ہنستے ہیں۔ پرانی [illegible] خیر چھوڑو ان کی بات۔ اب ہم اچھی طرح سے رہیں گے اور خوش رہیں گے"

"ارے یہ کیا" مسز [illegible] کے مارے خوشی کے آنسو نکل آئے۔

"میں اب مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ [illegible] مدتوں کے [illegible] میں آیا ہوں۔ تم تو شاید [illegible] جانتی ہو۔ میں ایسا بدھو نہیں ہوں کہ اتنی آسانی سے [illegible]۔ تم اتنی آسانی سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتیں"

"اچھا تو تمہیں افسوس ہے کہ [illegible] تم میرے اتنے قریب کیوں آگئے۔ تم نے مجھے پیار کیوں کیا۔ مجھ سے محبت کی باتیں کیں۔ میرے بوسے کیوں لئے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ان الفاظ سے تم نے میرے دل پر کتنا بڑا چرکا لگایا۔ تم نے ان الفاظ سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا تمہارا دل مجھ سے بالکل بھر گیا۔ کیا تم مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے؟"

اس نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں تلخی تھی اور وہ اپنی بات کا جواب چاہتی تھی۔

"نہیں" گریگوری نے کچھ بے چینی سے جواب دیا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ ہم ایک کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اسکا خیال ہی ہماری ہیبت کو مشتعل کر دینے کو کافی ہے۔ اور اب جبکہ ہم اس سے نکل چکے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہ ہر چیز ایسی جلد جلد بدل رہی ہے۔ اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم کچھ اور تھیں۔ میں کچھ اور تھا۔ اسکا کیا مطلب ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"گریگوری جو کچھ خدا چاہے گا وہی ہوگا۔ لیکن کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ تم نے مجھے شام کو اتنا پیار کیوں کیا تھا۔"

"خیر اب اسکا تذکرہ چھوڑو" گریگوری نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے اسکی بات کاٹی۔ "میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ ہماری زندگی سے کچھ خاص ہوگا۔ نہ ہماری پچھلی زندگی آرام دہ تھی۔ اور موجودہ زندگی ہی سے مجھے بہت زیادہ امید ہے۔ بہرحال میں شراب چھوڑ دوں۔ تمہیں دھتکاروں یا گالی دوں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

مسز [illegible] بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اب تو تمہیں اتنی فرصت [illegible] نہیں ملتی کہ تم یہ حرکتیں کر سکو"

"خیر تم اب [illegible] یاد [illegible] رشتہ ہے۔" گریگوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب میں خود ہی [illegible] جاؤں گا۔ یہ تو ایک بات ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں [illegible] کی بنا پر کرتا ہوں۔ یا میں شراب سے تنگ آ گیا ہوں۔ [illegible]

پڑھ لیا۔

"پتہ نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ اچھی خاصی زندگی ہے۔ اگرچہ تھوڑی سی محنت ضرور ہے۔ تمام ڈاکٹر تم سے محبت کرتے ہیں اور دوسرے عملے نے بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر اور تمہیں کیا چاہیئے۔ پتہ نہیں تم میں کون سا پارہ بھرا ہے!"

"یہ تو ٹھیک ہے میں ہمیشہ بیقرار رہتا ہوں۔ اور کبھی کبھی تو تمام رات سوچتے گزر جاتی ہے۔ [illegible] کہ تمام انسان برابر ہیں۔ تو کیا میں انسان نہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر [illegible] مجھ سے بہتر ہے۔ اور [illegible] بھی۔ اسے یوں سمجھو۔ کہ مزدور میرے برابر ہیں اور نہ میں انکے برابر ہوں میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مشکل کا علاج کیا۔ اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ایک آدمی کو اچھا کر کے لوگ خوش کیوں ہوتے ہیں۔ کیونکہ سچ پوچھو تو دنیا کی تنگی تو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور وہ سب اس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی اسکی زندگی بچا کر وہ خوش خوش ہیں۔ لیکن میں تو نہیں خوش ہو سکتا۔ اگر مجھ سے پوچھو تو آخر اس میں خوش ہونے کی بات کیا ہے؟"

"لیکن وہ لوگوں کے لئے افسوس بھی تو کرتے ہیں؟"

"ہمارے بھی وارڈ میں جب کوئی مریضہ اچھا ہونے لگتی ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ غریب ہوتی ہے تو اسے دوا اور پیسے بھی دیتی ہیں۔ تم سنو تو شاید رو پڑو۔ وہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔"

"[illegible] نہیں مجھے صرف حیرت ہوتی ہے۔" ابن گریگوری نے اپنا سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر مطرونہ کو جوش آ گیا۔ اور وہ اپنے شوہر کو رحم اور محبت کے معنی سمجھانے لگی۔ اور باتیں کرتے کرتے وہ اس پر جھک پڑی۔ اور نظروں میں بے پایاں محبت جھلکنے لگی۔ گریگوری سوچنے لگا۔

"اب تو یہ خوب بولنے لگی ہے۔ آخر ایسے اتنے الفاظ کس نے بتائے [illegible] ان پر ترس کھاتی [illegible] کیا حرج نہیں [illegible] تم [illegible] زندگی [illegible] گئی ہے۔

گریگوری بہت غصہ سے ہنسا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ میری زندگی تو ضرور سدھر گئی۔ لیکن بات یہ ہے اس زندگی پر کہ لوگ ہنستے مسکرا رہے ہیں۔ اور میری زندگی بہتر رہی ہے۔ اسے تم زندگی کہتی ہو!"

گریگوری ہنستا ہوا وہاں سے اٹھ کر کام پر چلا گیا۔ اور اسپتال کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا مطرونہ تو عورت ہے لیکن بات پتہ کی کہتی ہے۔ اگر وہاں دو چار آدمی اور ہوتے اور اس کی باتیں سنتے تو ٹھیک ہوتا۔ وہ مسکراتا ہوا مردانہ وارڈ میں چلا گیا۔ جہاں سے مریضوں کی کراہ کی آواز اور کھانسی [illegible] آ رہی تھی۔

مطرونہ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ اب اس کے شوہر کی نظر میں اسکا وقار بڑھتا جا رہا ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے حتی الوسع کوشش کرتی رہی۔ اور اپنی کوشش اور محنت کو دیکھ دیکھ کر وہ خود اپنی نظروں میں اونچی ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ جنگلی اور شروع سے کسی بات کے سوچنے کی عادی نہیں تھی۔ لیکن پھر جب وہ اپنی کل کی [illegible] والی زندگی سے موجودہ زندگی کا مقابلہ کرتی تو اسے ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسکی یاد سے گزشتہ دن محو ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اسپتال کا تمام عملہ اسکی عزت کرنے لگا تھا۔ لوگ اسکی پھرتی اور نفاست کی تعریف کرتے۔ اور ہر ایک اس سے پیار اور محبت سے پیش آتا۔ اور اسے بھی انسان سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ ایک ایسی زندگی بسر کر رہی تھی جس کا اسے پہلے کوئی تجربہ نہ تھا اور اس زندگی نے اسے اپنے سے بھی محبت کرنا سکھا دیا تھا۔

ایک بار رات کی ڈیوٹی پر وہ تھی۔ ڈاکٹر نے [illegible] کے حالات پوچھے۔ اور مطرونہ نے باتوں باتوں میں اسے سب کچھ بتا دیا اور پھر وہ ہنس پڑی۔

"تمہیں ہنسی کس بات پر آئی؟" ڈاکٹر نے کہا

"نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن وہ [illegible] کیا زندگی تھی مجھے آج محسوس ہوا ہے۔"

"بیتے ہوئے دن یاد کر کے مطرونہ کے دل میں اب بھی اپنے شوہر کا خیال آتا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اور اسکی محبت بالکل اندھی تھی۔

وہ عورت عشق اور محبت کے باب میں بالکل اندھی تھی۔ اب وہ سوچتی کہ شوہر کا سلوک اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ اب وہ جب کبھی بھی اس کے ساتھ بات کرتی تو بہت سنبھل سنبھل کر۔ وہ اب بالکل نہیں چاہتی تھی کہ اسکا شوہر کسی بات پر بھڑک کر گالیاں بکنے لگے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے دل میں یہ شک بھی گزرتا کہ شاید وہ کبھی بھی پہلے والی زندگی نہ گزار سکیں گے۔ اور پھر وہ یہ بھی سوچتی کہ گرگوری کی اب وہ پہلی حالت نہیں رہی۔ اور اب اسکا غصہ ختم ہو گیا ہے۔

قسمت ہی کی بات تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔ دونوں جوان اور محنتی تھے۔ اور دونوں نے زندگی کے لئے بھی سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ لیکن پھر بھی زندگی کی الجھنیں ان کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اور گرگوری کا بے چین دل تو کبھی بھی مطمئن نہ رہتا تھا۔ وہ اس روز روز کی سخت محنت سے بالکل عاجز آ چکا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن شام کو ایمبولنس کار ہسپتال کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ سینٹ پیٹرن کورٹ کے احاطے سے ایک اور مریض کو لایا ہے۔ گرگوری اس لڑکے کو اٹھا رہا تھا۔ اسکی سانس بہت رک رک کر چل رہی تھی۔

"کون سینکا!" گرگوری نے پھٹی آواز میں کہا۔ "ارے تو نے مجھے پہچانا۔"

ہاں سینکا نے بہ دقت جواب دیا۔ اس نے اپنے سر کو آہستہ آہستہ حرکت دے کر اور لوف کی طرف جو کہ اسٹریچر کو دوسری طرف سے پکڑے تھا۔ دیکھتے ہوئے کہا۔ اورلوف کو ایک دھچکا لگا۔ سینکا کی حالت خراب تھی۔ اور اورلوف کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ

"آخر لوگوں کو یہ بیماری کیوں ہوتی ہے؟"

سینکا کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اور وہ بالکل خاموش تھا — انہوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اور اس کے نجس اور گندے چیتھڑے کو اتارنے لگے۔ اسکا تمام جسم غلاظت میں تیرا ہوا تھا۔

"میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے" سینکا نے کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔ ابھی ہم تمہیں گرم پانی سے نہلا رہے ہیں اور تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔" گرگوری نے تسلی دی۔

"نہیں اب میں اچھا نہیں ہوں گا۔ گرگوری چچا۔ خدا میری ایک بات تو سن لو۔ میں نے کسیاکوف کا بٹوہ چرایا ہے۔ چوری کے بعد آج بیس دن ہو گئے کہ میں نے پہلی بار اسے کھولا تھا۔ اور اسی دن مجھے ہیضہ ہوا۔ گرگوری چچا میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور یہ اسی کی سزا ہے۔ میں نے زینے کے نیچے دیوار پھاٹک دیا ہے اور پھر اس کے اوپر کچھ لکڑی وغیرہ ڈال کر چھپا دیا تھا۔ چچا اسے کسی طرح سے پھیر دو۔ کسیاکوف کی ایک بہن بھی ہے جو وہاں آئی ہوئی تھی۔ اس نے اسے کو مانگا بھی تھا۔ چچا تم اسے اس کو واپس کر دینا۔" کہتے کہتے سینکا درد سے تڑپنے لگا۔ اور پیٹ میں سخت درد اٹھ رہا تھا۔

سینکا کو بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن مرض اس کے کمزور جسم پر پورا قابو پا چکا تھا۔ آخر شام کو اورلوف اسکی لاش کو مردہ خانہ میں پہنچا آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسکا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔

وہاں مردہ گھر میں اس نے چاہا تھا کہ وہ سینکا کے ہاتھ پیر تو سیدھے کر دے۔ لیکن وہ سب بہت جلد اکڑ گئے تھے کہ وہ انہیں پھر ٹھیک بھی نہ کر سکا۔ اور اسی طرح سے بے چین۔ تھکا ہوا اور افسردہ دل ہی دل میں روتا ہوا وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس کے ذہن میں سینکا کا اکڑا ہوا جسم سمایا ہوا تھا۔ ایک دن یہی لڑکا کتنا ہنس مکھ اور تیز تھا۔

آج وہ موت کے سامنے کتنا مجبور نظر آ رہا تھا۔ اس نے سینکا کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ڈاکٹروں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن وہ مر گیا۔ اس کے دل میں یکایک بغاوت کا طوفان اٹھنے لگا۔ ایک دن شاید اسے بھی ہیضہ ہو جائے اور اسکی نس نس کو توڑ کر رکھ دے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اور پھر اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ کاش وہ کسی سمجھدار آدمی سے اسکے متعلق بات کر سکتا۔ کئی مرتبہ طالب علموں سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی۔ لیکن انہیں فلسفیانہ خیالات کے لئے فرصت کہاں تھی۔ اب سوائے اس کے کہ وہ بیوی سے جا کر بات کرے چارہ ہی کیا تھا۔ اور وہ ویسا ہی افسردہ اس کے کمرہ کی طرف چل پڑا۔

مطریونا اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ سماوار میز پر رکھا ہوا ابل رہا تھا اور پانی کے ابلنے کی آواز تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

گرگیوری کمرے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور اپنی بیوی کو نہلاتے دیکھنے لگا۔ کمرے کے اندر پانی کی سنسناہٹ کی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ باہر لوگوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اور گرگیوری بیٹھے بیٹھے قدموں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ یکبارگی اسے اپنی بیوی کے کندھے سیسیکا کے کندھوں جیسے معلوم ہونے لگے۔ ویسے ہی سرد اور اکڑے ہوئے۔ اور وہ یکبارگی کانپ اٹھا۔

"سیسیکا مر گیا۔" اس نے ڈوبی ہوئی آواز سے ——— بیوی کو بغیر مخاطب کئے ہوئے کہا۔ سیسیکا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس نے اس کی بخشش کے لئے دعا مانگی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" گرگیوری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

بڑا شیطان تھا۔

لیکن اب تو وہ مر چکا ہے۔ ایسی بات کہنے سے فائدہ۔ بہرحال اس کی موت افسوسناک ہے۔ وہ بڑا تیز تھا۔ ہاں وہ کسیا کو کا باجا بجاتا تھا۔ خیر وہ لڑکا بہت تیز اور ہوشیار تھا۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا۔ کہ اسے اپنے پاس لے لوں اور کام سکھاؤں بیچارا یتیم تھا۔ ہم اس سے اولاد کی طرح محبت کرتے۔ ویسے تو تم ابھی جوان ہو اور تندرست ہو۔ لیکن کاش ہمارے ایک بچہ ہوتا۔ تو شاید ہمارا دل بہلا ہو جاتا۔ اور پھر زندگی بھی اتنی دوبھر نہ معلوم ہوتی۔ یہ ہم جو اتنی محنت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ کیا صرف پیٹ بھرنے کے لئے۔ کہ ہم اور محنت کر سکیں۔ اور پھر صرف پیٹ بھریں۔ مگر اس پاگل پن کی کوئی حد بھی ہے۔ ہاں اگر ہمارے اولاد ہوتی تو اور بات ہوتی۔

کہتے کہتے اس نے گردن جھکالی۔ اور اس کے لہجے میں شکایت بھری ہوئی تھی۔ مٹرونا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اور اس کی بات سن کر وہ نیلی ہوتی جا رہی تھی۔

"ہم دونوں ہی جوان ہیں۔ دونوں تندرست ہیں۔ پھر ہمارے اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے۔ میں یہی سوچا کرتا ہوں۔ اور پھر جا کر شراب خانے چلا جاتا ہوں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" مٹرونا نے چیخ کر کہا۔ ایسی بات منہ سے مت نکالا کرو۔ تم محض عیاشی کے لئے شراب پیتے ہو۔ اور یہ محض بہانہ ہے۔ اور بے ہودہ بہانہ سازی تمہیں اپنے آپ پر دنیا بھر سے شرمندہ

گرگیوری ہکا بکا سا ہو گیا۔ اور پھر کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ تاکہ مٹرونا کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ یہ وہی مٹرونا ہے۔ جو ایسی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس نے اسے ایسی باتیں کرتے نہ سنا تھا۔ نہ اس نے کبھی طعنہ دیا تھا۔ اور نہ اسکا اس طرح سے مضحکہ اڑایا تھا۔

اچھا۔ گرگیوری نے کرسی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "ہاں تو تم اور کیا کہنا چاہتی ہو۔"

بہت کچھ۔ میں تمہارے لئے کوئی لڑکا پیدا کرنا پسند نہ کروں گی کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ سنو اب میرے کوئی لڑکا نہیں ہوگا۔ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

"بس اب چیخ مت۔" اس کے شوہر نے کہا۔

"کیوں نہ چیخوں۔ یاد ہے تم نے مجھے کتنی بار انتہائی بیرحمی سے پیٹا ہے۔ کتنی بار تم نے میرے پیٹ میں لات ماری ہے۔ جاؤ اور انہیں یاد کرو تم نے کیسے کیسے مجھے پیٹا ہے۔ تمہارے گھونسوں نے میرا کتنا خون بہایا ہے۔ میرے تمام کپڑے خون میں تر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ تمہیں خود شرم آنی چاہئیے اور مجھے اپنی صورت نہ دکھانی چاہئیے۔ اپنے بچوں کے قاتل تم ہو۔ اور پھر مجھے الزام دیتے ہو۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا اور تمہیں معاف کرتی رہی۔ لیکن تمہارے ان الفاظ کو مرتے دم تک بھی معاف نہیں کر سکتی۔ کیوں تم نہیں جانتے کہ اگر میرے اولاد نہیں ہوتی تو قصور تمہارا ہے۔ تمہاری مار پیٹ کا ہے۔ کیا میں دوسری عورتوں سے الگ ہوں۔ میرا دل اولاد کے لئے بے چین نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کتنی راتیں میں نے گڑگڑاتے گزار دیں کہ تمہاری مار سے خدا میرے پیٹ کے بچے کو محفوظ رکھے۔ لیکن تم ظالم۔ سفاک۔ قاتل تم نے کبھی مجھے نہیں چھوڑا۔ دوسری عورتوں کے بچے دیکھ دیکھ کر میں پاگل ہو جاتی۔ میں اولاد چاہتی تھی۔ سیسیکا کو بھی بچے کی طرح چاہنے کی خواہش کرتی۔ ہائے اللہ!"

وہ سانس لینے کے لئے رکی۔ لیکن اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی رہے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ دل میں ہوک اٹھ رہی تھی۔ اور الفاظ اس کے گلے کو پکڑ رہے تھے۔

گریگوری بالکل مبہوت ہو کر اسے تک رہا تھا۔ اس نے اس عورت کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے کبھی ایسی باتیں کرتے سنا تھا۔ اب وہ اس عورت سے ڈر رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اچھل کر اس کا گلا نہ دبا دے۔ لیکن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ بیہانی معلوم ہو رہی تھی۔ بدنسی طرح اسے اسی وقت چپ چاپ دیکھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آج مٹرونہ کے چہرے پہ ایک [illegible] تھا جو گریگوری کو کمزور بنائے دے رہا تھا۔

"تم نے میری روح کو زخمی کر دیا ہے۔ تم نے بہت ظلم کیا ہے۔ میں اب تک سب کچھ سہتی رہی اور میں تم سے کچھ صرف اس لئے نہ کہتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتی تھی۔ لیکن تمہارے یہ ظلم میری برداشت سے باہر ہیں اور میں ان کی تاب نہیں لا سکتی۔ خدا تجھے جہنم رسید کرے۔"

"چپ رہو کمبخت۔" گریگوری نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ "سنو۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ کیا تم اس وقت مجنون رہے ہو۔ کہ تم پاگل ہو؟"

گریگوری جوش اور غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ اور اس نے دروازے میں فرشتے جیسے آدمی کو دیکھا اور معاً کمرے سے باہر نکل گیا۔ مٹرونہ [illegible] کمرے میں [illegible] رہ گئی۔ پھر آخر کار وہ ٹٹولتی ہوئی اپنے بستر پہ پہنچی۔

اندھیرا چھا چکا تھا۔ ستارہ سا چاند اسکا حال پوچھنے کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بادل چھا گئے اور بارش ہونے لگی۔

کھڑکی کے کھلے پٹ اور کھڑکی کے شیشوں پہ پانی کی ٹپ ٹپ ایک بہت ہی ہم آہنگ نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ مٹرونہ اسی طرح بے سدھ پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کی [illegible] ہوئی آنکھیں چھت کی طرف لگی تھیں۔ دانت بھنچے ہوئے تھے۔ ہونٹ بھڑک رہے تھے۔ پانی اسی طرح گر رہا تھا۔ جیسے قدرت کوئی بات بار بار ایک ہی لہجے میں دہرائے چلا جا رہا ہو اور جب اس کی تکرار کے اس کے لہجے میں کوئی تغیر نہ ہو۔ جیسے بڑی سے بڑی بے اتفاقی بھی اسے اس کی ہستی سے نہ روک سکے گی۔

دن نکلنے تک بارش ہوتی رہی۔ وہ تمام رات سو نہ سکی۔ مانو تمام بارش کے قطرے اس سے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا ہوگا۔

جواب کیا ملے؟ اپنی نفرت کی شراب میں وہ ہر شئی تصویر نظر آتی۔ لیکن اب اس کے لئے ایک محبت بھری زندگی کے خواب کو بھلانا ناممکن تھا۔ وہ اب تک اس خواب کے سہارے زندہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر ایک نہ ایک دن سیدھے راستے پر آ جائے گا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب اگر اس نے ایک بار بھی شراب پی لی تو پھر وہ قابو میں نہ آ سکے گا۔ اس کے شراب نوشی کے دنوں کی یاد اس کے لئے بہت تلخ تھی۔ اور اب جبکہ کچھ دنوں سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امن سے رہ رہی تھی تو اسے گذشتہ ایام دوزخ سے بھی بدتر نظر آ رہے تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی اس دنیا کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن وہ پھر بھی سوچتی تھی۔ اور اپنے تمام دکھوں کو قسمت پہ ٹال دیتی۔

"یا اللہ یہ سب کیا تھا۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی خونخوار درندہ تھا جس کی زنجیر ٹوٹ گئی ہو۔

اب اجالا ہو چلا تھا۔ اگرچہ کھیتوں پر کہر ابھی تک طاری تھا۔

"مٹرونہ اور لوٹ۔ ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو گیا۔"

یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور آہستہ آہستہ ہسپتال کی طرف چل دی۔ آج وہ کچھ سست نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے نے ڈاکٹر کو متاثر کیا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"ہم سے بتانے میں کیا بات ہے۔ تمہاری جگہ آج کسی اور کو بلایا جائے۔"

مٹرونہ کو بہت شرم معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی دوسرا اس کے بھید سے واقف ہو۔ یہ ڈاکٹر اگرچہ اس پہ بہت مہربان تھی۔ لیکن پھر بھی اجنبی تھی۔ اور پھر کوشش کر کے وہ ہنسی۔

"کوئی بات نہیں۔ خدا ہم میاں بیوی میں [illegible] جال ہو گئی تھی۔"

لیکن کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

" بے چاری ! کسی کو کیا معلوم تھا کہ خود اسکی زندگی میں کیا بھید ہے۔"

مرفونہ کا دل اُمنڈ آیا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس عورت سے لپٹ کر خوب روئے۔ لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی اور ہونٹوں تک آئی ہوئی کراہ کو زبردستی دانت بھینچکر روکا۔

کام ختم کرکے جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں جاکر کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ نیچے ایمبولنس اسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ شاید کوئی اور نیا مریض آیا ہو۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور نیچے اب کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مرفونہ وہاں سے ہٹ آئی اور میز پر آکر بیٹھ گئی۔

" اب کیا ہوگا" یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھی یونہی ایک طرف کو تکتی رہی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ہر آواز پر چونک اٹھتی۔ جہاں برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھتی اور دروازے کی طرف دیکھ لیتی۔

لیکن جب آخرکار دروازہ کھلا۔ اور گریگوری اندر آیا وہ اسی طرح سے بے تعلق بیٹھی رہی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے سینے پر ایک سِل رکھ دی گئی ہو۔ اور اسے بےطرح دبائے جا رہی ہے۔

گریگوری پہلے تو آکر دروازے میں تھوڑی دیر رکا اور وہیں سے اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی اُتار کے فرش پر پھینک دی۔ اس کے تمام کپڑے پانی میں تر بتر تھے۔ اور وہ کھانستا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اسکے چہرے پر بیوقوفوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل بدھو نظر آرہا تھا۔

" وہ کیا بھیگی بنائی ہے ؟ " مرفونہ نے کہا۔

اور اس نے عجیب نامعقولیت سے سر ہلا دیا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پیروں پر پڑ کر معافی مانگوں۔"

مرفونہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آیا اس معاملے میں میری غلطی ہے کہ نہیں۔ لیکن اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلطی میری ہی تھی۔ اور اسی وجہ سے میں تم سے پوچھ رہا تھا میں تمہارے پیروں پر گر کر معافی مانگوں۔۔

وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔ اور ووف کے منہ سے واڈکا کی تیز بو آرہی تھی۔ اور اسکا دل برا ہو رہا تھا۔

" میں زیادہ نخرے نہیں برداشت کرسکتا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے معاف کرسکتی ہو یا نہیں" گریگوری نے چیختے ہوئے سوال کیا۔

" اس وقت تم نشے میں ہو۔ بہتر ہے کہ جاکر سو جاؤ" مرفونہ نے گہری لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

" جھوٹ ہے۔ مجھے بالکل نشہ نہیں ہے۔ ہاں میں ذرا تھک گیا ہوں۔ میں ابھی تک یہی بات سوچ رہا تھا۔ اور میں یہ سب سوچ رہا تھا۔ اچھا اب ہوشیار ہو جاؤ۔"

اس نے اسکی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شیطنت بھری آواز سے کہا۔

"منہ سے کیوں نہیں بولتی۔" اس نے پھر سوال کیا۔

" میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"اچھا کیوں ؟"

اس کی آواز میں سختی تھی اور اسکی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں۔

" دیکھ ! کل تو نے یہاں میری بےعزتی کی تھی۔ مجھ پر چیخی چلائی تھی اور اب میں ہی تجھ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ اچھی طرح سے سمجھ لے اس بات کو۔ "

اسکی آواز میں دھمکی تھی۔ اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ مرفونہ اسکا مطلب خوب سمجھ رہی تھی۔ اسکی نظروں میں وہ کوٹھڑی والی زندگی اور سیچر کی شامیں گھوم رہی تھیں۔ وہ مارپیٹ۔ وہ عقوبت اور وہ دوزخ۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچ رہی تھی۔ اب اس میں اس زندگی کو برداشت کرنے کی قوت نہ رہ گئی تھی۔

" میں خوب سمجھ رہی ہوں۔ تم میں وہی درندگی پھر کروٹ لے رہی ہے۔"

" درندگی ! پھر میری زندگی سے تمہاری زندگی میں کیا فرق

پڑتا ہے۔ میں تو تم سے صرف معافی چاہتا ہوں۔"
"گریگوری خوب! اب تم چلے جاؤ۔" مٹرونہ نے روتے ہوئے کہا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔
"چلا جاؤں؟" وہ شیطانی ہنسی ہنسا۔ "اور تمہیں رنگ رلیاں منانے کے لئے چھوڑ دوں۔ یہ حرکتیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟" کہتے کہتے اس نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور ایک زنگ آلود چاقو نکال کر کھول لیا۔
"کمبخت تو مجھے مار بھی ڈال۔" کہتے کہتے اس نے اسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور لوٹ پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر مٹرونہ کے لہجے نے الفاظ سے زیادہ اثر ڈالا۔ یہ بات تو اس نے کئی بار پہلے بھی کہی تھی۔ لیکن کبھی اسکا لہجہ ایسا نہ تھا۔ پہلے تو وہ چھوٹتے ہی ہاتھ چلا دیتا تھا۔ لیکن آج اسے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ اور اس نے چاقو کو میز پر پھینک دیا۔ جیسے وہ اس کے الفاظ سے ڈر گیا ہو۔
"چڑیل! تو مجھ سے آخر کیا چاہتی کیا ہے؟" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔
"میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی۔ تو مجھے مارنے آیا تھا۔ مار ڈال!"
گریگوری بالکل بوکھلا سا گیا۔ وہ حیرت سے اسکا منہ تکنے لگا۔ آج وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ آج وہ اپنی بیوی کو دبائے گا۔ کیونکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کل شام کو اسکی بیوی نے اسے دبا لیا تھا اور یہ اسکی بے عزتی ہے۔ لیکن آج اس نے اپنی بیوی کو زیر کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے نیچا دکھائے گا۔
اور یہ سوچ سوچ کر اسکا غم دم بدم بڑھ رہا تھا۔ پھر بیوی کے شکستہ ہوئے الزامات [illegible] اور تلخ معلوم ہونے لگے۔ کیونکہ وہ ٹھیک تھے۔ گریگوری جھنجلا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ مٹرونہ بغاوت پر آمادہ ہے اور وہ اسی لئے سوچ رہا تھا کہ اگر مٹرونہ نے مقابلہ کیا ۔۔۔ تو وہ اسکا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن یہاں نقشہ ہی الٹا تھا۔ مٹرونہ نے کوئی جدوجہد نہ کی۔ وہ اس کے سامنے مرنے کے لئے بالکل تیار کھڑی ہو گئی۔ اور یہ ایسی صورت ہو گئی تھی۔ جسے اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اور مٹرونہ کی بے بسی نے اسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا تھا۔ مٹرونہ کی اس بے بسی نے گریگوری کے
ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔
"سنو۔ اب اتنی اونچی نہ اڑو۔ میں تیرے سینے میں چاقو مار دوں گا۔ اچھی طرح کچھ لے سنا۔ میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔"
تھوڑی دیر سمجھا کہ یہ گفتگو بالکل فضول ہو رہی ہے۔ اور اس وجہ سے وہ بالکل چپ ہو گیا۔ مٹرونہ بھی ویسے ہی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک سوال چکر لگا رہا تھا۔
"اب کیا ہو گا؟"
"مٹرونہ!" گریگوری کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "میں مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری غلطی ہے۔ لیکن اب ہو گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"اُف یہ زندگی۔ تم اسے زندگی کہتی ہو۔ ٹھیک ہے کہ ابھی تک ہیضہ کے مریض آ رہے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری زندگی اسکی وجہ سے کہاں آسان ہوئی۔ ہیضہ کے مریضوں میں کچھ مرتے ہیں تو کچھ اچھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں تو اسی طرح سے زندہ ہوں۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ بس ایک وبال ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے پوری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اب میں یہ زندگی بالکل نہیں بسر کر سکتا۔ ان مریضوں کو دیکھو۔ انکی کیسی تیمارداری ہوتی ہے۔ میری بھی تو روح بیمار ہے۔ اور کیا مجھے تیمارداری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ہیضہ کے مریضوں سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔ میری روح میں مروڑ سے اٹھ رہے ہیں۔ چاہے تم مجھے اس کے لئے ظالم کہو۔ شرابی کہو۔"
گریگوری یہ الفاظ بہت آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ لیکن مٹرونہ کا دھیان دوسری طرف تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسکا دماغ وہ تکلیفیں جو جھیل چکی اس وقت محسوس کر رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔
"اب تم بالکل نہ بولو گی؟" گریگوری کے جذبات امنڈ آئے۔
"تم بولتی کیوں نہیں؟ آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"
"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔ کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر تم خود کیا چاہتے ہو؟" مٹرونہ نے رک رک کر جواب دیا۔
"میں کیا چاہتا ہوں ۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔ مجھے چاہئے ۔۔۔۔"
لیکن پھر گریگوری کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا [illegible]
ایک [illegible]

اس کو پاٹ نہ سکیں گے۔

پھر اس پر جنون سوار ہوگیا۔ اور اس نے تان کر مژدونہ کے ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگا۔

"سور کی بچی۔ آخر تو جانتی ہے۔ میں سبھی کو مار کر رکھ دوں گا۔"

گھونسہ پڑتے ہی مژدونہ کا سر میز سے جا ٹکرایا۔ لیکن وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور انتہائی نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پھر مار" وہ انتہائی نفرت انگیز لہجے میں چلائی۔

"چپ رہ"

"آ۔ پھر مار"

"او۔ او۔ چڑیل کہیں کی"

"بس۔ بہت ہو چکا۔ گرگیوری۔ بس اب ہو چکا۔"

"چپ"

"بس اب تم میرے ساتھ من مانی نہیں کر سکتے۔"

وہ دانت پیستا ہوا کچھ پیچھے ہٹا۔ شاید وہ دوسرا گھونسہ مارنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی لمحہ ڈاکٹر وا اس چھنکو کمرے میں آ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم اس جگہ کو کیا سمجھتے ہو۔ آخر تمہارا اس حرکت سے مطلب کیا ہے؟"

ڈاکٹر کے چہرے سے حیرت و خشونت کا بیک وقت اظہار ہو رہا تھا۔

لیکن گرگیوری نے ان الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ وہ ڈاکٹر کے سامنے تعظیماً جھکا بھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ذرا سی میاں بیوی کی گرما گرمی تھی" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"تم کل کام پر کیوں نہ آئے" ڈاکٹر نے اسکی بے حسی پر غصہ ہوتے ہوئے کہا۔

گرگیوری نے اپنے کندھوں کو جنبش دی۔

"مجھے تھوڑا سا نشہ تھا کام تھا اس وجہ سے نہ آیا۔"

"کل رات کون یہاں جھگڑا کر رہا تھا"

"ہم۔۔۔ہاں"

"تم۔ بہت خوب۔ اور تم سمجھتے ہو کہ یہ تمہارا گھر ہے۔"

یہ کہتے ہوئے جب جیالی بھاجے باہر چلے گئے۔"

"ہم تمہارے غلام نہیں ہیں۔ کیونکہ۔۔۔"

"خاموش! تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ بد تمیز۔ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

گرگیوری کے دماغ میں یک بارگی بغاوت کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کو برباد کر دے۔ ہر چیز توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اب وہ موقع آ گیا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کر سکتا تھا۔ آج وہ ان تمام بیڑیوں کو جو اسکی روح کو جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈالے۔ اسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور پھر اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

"چلاؤ مت۔ نہیں تو گلے کی نالی پھٹ جائے گی۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم مذبح خانے میں ہیں۔ جہاں جانوروں کے بدلے انسان ذبح کئے جاتے ہیں۔"

"کیا۔ کیا کہا تم نے؟" حیران ڈاکٹر اسکی طرف بڑھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم خود سب جانتے ہو۔" باندھ مژدونہ اپنا اسباب۔"

"نہیں یہ سب کچھ نہیں۔ پہلے تم میری بات کا صاف صاف جواب دو۔ نہیں تو میں۔۔۔"

"بس بس چلا کر ساری دنیا کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

گرگیوری نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا جیسے جیسے وہ بولتا جاتا تھا اسکا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے تمہیں یہ حق دے دیا ہے۔ کہ تم جو چاہو وہ کر سکتے ہو۔ تم کچھ نہیں ہو۔ اور تمہاری دوائیں وغیرہ اب فریب ہیں۔ ہاں اسکو ذبح خانہ کہنا شاید غلط ہو۔ اور میرے منہ سے غلط بات نکل گئی ہو۔ لیکن پھر بھی تمہیں اس طرح چیخنے کا کوئی حق نہیں۔"

"یہ کیا! اچھا اب تم ادھر آؤ۔ میں ابھی تمہیں ایک آدھ سبق دوں" لوگ شور سن کر برآمدے میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے گرگیوری نے بھویں سکوڑ کر کہنا شروع کیا۔

"میں کوئی جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں! لیکن آپ کے سبق سے پہلے میں بھی ایک بات بتا دوں!"

"ضرور کہو!"

"شہر جا کر میں سب کو بتا دوں گا کہ آپ لوگ کیسا علاج کرتے ہیں۔"

"یہ کون سی بات ہے۔"

"جو وہاں آگ و آتش بازی کی وصولی دی جاتی ہے۔"

"یہ کیا نامعقولیت ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" ڈاکٹر کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ اب تک اسے ایک اچھا اور محنتی کارکن سمجھتا تھا۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں وہ اس قسم کی اختراع پردازی کر رہا تھا۔

"بے وقوف! کہہ کیا رہا ہے!"

"بے وقوف" گریگوری نے ڈاکٹر کی بات دہرائی۔ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے الفاظ درست ہیں۔ لیکن اس لفظ کو اس نے اپنی بےعزتی سمجھا۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اسے سمجھتا بھی ہوں اور ٹھیک بھی ہے میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں۔ کہتا ہوں۔ میں کوئی بات چھپاتا نہیں۔ اچھا مٹرونہ اب یہاں سے چل۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" مٹرونہ نے صاف جواب دیا۔

ڈاکٹر نے دونوں کو بیک وقت دیکھا۔ اور پھر اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اسکی سمجھ میں بات نہ آ رہی تھی۔

"تم نشے میں ہو۔ اور ہوش سے باہر۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔"

گریگوری اب بھی اپنی بات پر جما تھا۔ "آپ ہیضہ کے مریضوں کا علاج کر رہے ہیں لیکن تندرست زندگی سے عاجز آ کر مرتے جا رہے ہیں مٹرونہ اگر تو فوراً نہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں تیرا سر توڑ دوں گا۔"

مٹرونہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے بلا کی متانت اور پختہ عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ گریگوری باوجود انتہائی جوش میں تھا لیکن اس سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"لاحول۔ اس کمبخت کو خود بھی ہوش نہیں کہ وہ کیا بک رہا ہے۔"

"بس اب یہاں سے نکل جا۔ اسی کو غنیمت سمجھ کہ میں تجھے جیل نہیں بھجوا رہا ہوں۔ اب فوراً یہاں سے نکل جا۔"

گریگوری کی گردن جھک گئی۔ اگر اسکی ان لوگوں نے پٹائی کی ہوتی یا اسے جیل بھجوا دیا ہوتا تو وہ اتنا برا نہ محسوس کرتا۔

"تو آتی ہے یا نہیں۔ بس یہ آخری سوال ہے۔" گریگوری نے گھمبیر آواز میں اپنی بیوی سے کہا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا جیسے وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں گریگوری پھر مکا نہ مار دے۔

"تم سب جہنم میں جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔"

"چل۔ دُور ہٹ چل۔" ڈاکٹر نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"چپ رہو جی۔ بڑے آئے طرم خان کا بچہ۔ میں تو جا رہا ہوں۔ بلکہ شاید اب ہم ملیں نہ ملیں۔ لیکن اگر کبھی کہیں ملے تو پھر تمہاری خیر نہیں۔"

اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔

"خدا حافظ۔" ڈاکٹر نے طنزاً کہا۔

گریگوری چلتے چلتے رک گیا۔ اسکی آنکھوں سے کرب و بےچینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"بس اب مجھے نہ چھیڑو۔ اور مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی گردن سلامت لے جا رہے ہو۔ اسکو غنیمت جانو۔"

اس نے فرش پر سے ٹوپی اٹھائی۔ اسے پہنا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چلتے وقت اس نے اپنی بیوی پر آخری نظر بھی نہ ڈالی۔

ڈاکٹر مٹرونہ کو دیکھ رہا تھا۔ اسکا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر نے گریگوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اب وہ کہاں گیا ہوگا؟"

"شراب خانے۔" مٹرونہ نے بغیر جھجک کے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے ایک بار نظر اٹھائی۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مٹرونہ کھڑکی میں سے جھانکی۔ باہر ایک انسانی شکل جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی بارش و ہوا میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی۔ بالکل تنہا۔ کھیتوں میں سے ہو کر شہر کی طرف۔

مٹرونہ کا چہرہ اور سفید ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے کی عبادت گاہ کے پاس گئی۔ اور حضرت مریم کے سامنے جھک گئی۔ وہ ایک ہی دعا کو بار بار دہرا رہی تھی۔ اور اپنے گلے اور سینے کو سہلاتی جاتی تھی۔

x x x x

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھے اپنا صنعتی اسکول دکھانے کے لئے مدعو کیا۔ انہیں اپنے اس اسکول سے بہت محبت تھی۔ اور وہ اسے اپنی عزیز اولاد کی طرح سے سمجھتا تھا۔ اور ہر ایک کو دکھانے کی کوشش کرتا۔ اسے اپنے اسکول پر فخر تھا۔ اور وہ سمجھے لگا کر معلموں کا نوجوان طبقہ

کس طرح سے ہم سے تعاون کر رہا ہے۔ اور اس اسکول کی نیک نامی کے لئے تن من سے لگا ہوا ہے۔ آیئے میں آپ کو اپنے جونیئر ماڈل کی کلاس کو دکھاؤں۔ اسکی معلمہ دوسروں کے لئے مشعل راہ سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ پیدائشی معلمہ ہے۔ اسے اپنے طالب علموں سے بالکل ماں جیسی محبت ہے۔ اگرچہ اُسے صرف ... ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اسی تنخواہ پر دن رات محنت کرتی ہے۔ بلکہ وہ غریب طالب علموں کی کفالت بھی کرتی ہے۔ آپ اس سے ضرور ملئے۔ آپ کو اس سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔

میرے دوست کی تعریف نے سمند شوق پر تازیانہ کا کام کیا اور میں اس سے ملنے دوسرے ہی دن اسکے گھر پہنچ گیا۔ اور یہیں مجھے مٹروڈنہ اور رولف نے اپنی دردبھری کہانی سنائی۔ اور رولف سے الگ ہو جانے پر بھی اور رولف نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ وہ آکر اُسے ستاتا۔ شراب کے نشے میں بدمست وہ مارپیٹ بھی کرتا۔ وہ اکثر سڑکوں پر کھڑا اسکا انتظار کیا کرتا۔ کہ اگر مٹروڈنہ نکلے تو اُسے ستائے اور مارپیٹ اور جھگڑا کرے۔ لیکن مٹروڈنہ نے سب کچھ برداشت کیا۔

آخر جب اسپتال بند ہوگیا تو ڈاکٹروں نے اُسے اس اسکول میں سفارش کرکے رکھوا دیا۔ ایک نرس نے اُسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ اور اس کے بعد مٹروڈنہ کی زندگی پرسکون ہوگئی تھی۔ وہ یتیم خانے سے دو بچوں کو پرورش کرنے کے لئے لے آئی تھی۔ اور انہیں بہت عزیز رکھتی۔ اپنے طالب علموں کے لئے وہ ہر محنت و مشقت کے لئے تیار رہتی۔ ان کے لئے بڑی سے بڑی محنت بھی آرام کے مترادف تھی۔ اسکی اس محنت اور جانفشانی نے ہی تو اسکے لئے دوسروں کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اب وہ بالکل مطمئن تھی۔ لیکن ماضی کی دردبھری یاد اب بھی اس کی آنکھوں میں جھلکتی تھی۔ اسے بہت ہی بری قسم کی کھانسی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور رخسار مرجھا گئے تھے۔

مجھ سے گرگوری کی بھی ملاقات ہوئی۔ وہ شہر کے بدترین علاقوں میں رہتا تھا۔ میں دو تین ہی ملاقاتوں میں اسکا دوست ہو گیا۔ اس نے بھی اپنی زندگی کی داستان قریب قریب ویسی ہی بیان کی تھی جو مٹروڈنہ نے بیان کی تھی۔ اور کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

یہ ہے میری دردبھری کہانی۔ سوچتا ہوں کچھ دن کے لئے میں ابھرا لیکن پھر اُسی گڑھے میں جا گرا۔ اور میں زندگی کا وہ بڑا کام جو کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا۔ لیکن اسکی ہوس اب بھی میرے دل میں ہے۔ میں اب بھی چاہتا ہوں کہ اس زمین کو پیس کر سرمہ کر دوں۔ یا ڈاکوؤں کا سردار بن جاؤں۔ کوئی بھی غیر معمولی اور اہم کام کر ڈالوں جو مجھے عام لوگوں سے اونچا اٹھا دے تاکہ میں وہاں سے ان پر تھوک سکوں۔ اور ان سے کہوں کہ زمین پر رینگنے والے کیڑو تمہاری حیثیت کیا ہے۔ تمہاری زندگی کتوں سے بدتر ہے اور پھر تم اسکو زندگی کہتے ہو۔ اور اس کے بعد میں خود اس اونچائی سے سر کے بل آ پڑوں۔ بس خاتمہ۔ اف زندگی کس قدر نفس اور بے مزہ ہے۔ جب میں نے مٹروڈنہ کو چھوڑا تھا تو میں نے کہا تھا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ اب مزے ہی مزے ہیں۔ لیکن جیسے دن رات کی روانی ہی رک گئی ہو۔ زندگی بالکل خشک ہوگئی ہے۔ لیکن میں پھر بھی دنیا کو ضرور دکھاؤں گا کہ زندگی کیا ہوتی ہے اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میری بیوی . . . . لعنت بھیجو بیوی پر۔ میرے جیسے انسان کو بیوی کی کیا ضرورت۔ یا پھر اسکو میری کونسی حاجت۔ وہ زن جسے چاروں طرف سے الجھنیں گھیرے ہوں۔ جو ہمیشہ سے ناآسودہ رہا۔ اُسے کبھی بھی سکون نہ ملا۔ آوارہ گردی میری فطرت میں ہے۔ میں ہر جگہ پھرا۔ چلا۔ گھوما۔ لیکن کہیں سکون نہ ملا۔ شراب۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں۔ واڈکا۔ اف یہ ایک چیز ہے۔ جو میرے دل کی آگ کو بجھاتی ہے۔ اس میں آگ بجھانے کی بہت بڑی صلاحیت ہے۔ میں ہر چیز سے تنگ آگیا ہوں۔ شہر۔ دیہات۔ آدمی۔ چھوٹے بڑے۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا اس سے بہتر اور کچھ بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ہر آدمی دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہے۔ ہر شخص درندہ ہے سفاک ہے بھیڑیا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ سب کو پیس کر رکھ دوں۔ یہ دنیا شیطان کا کارنامہ ہے۔

شراب خانے کا دروازہ۔ بار بار کھلتا اور بند ہوتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے یہ ایک اژدہا ہو اور ایک ایک کرکے تمام روسیوں کو نگلے جا رہا ہو۔ خواہ وہ آسودہ ہوں یا ناآسودہ۔

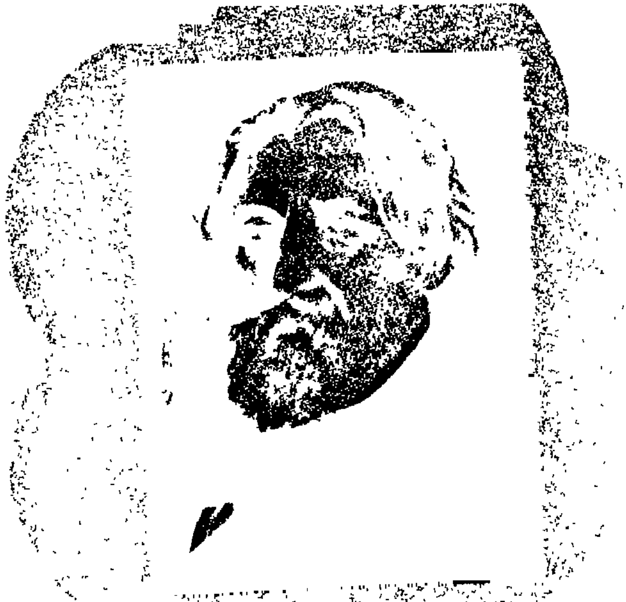
تورگنیف

تورگنیف کا شمار دنیا کے گنے چنے عظیم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی ہر تصنیف کو عالمی ادب میں حقیقت پسندی کی ایک زندۂ جاوید روایت کا درجہ حاصل ہے۔ نامور نقاد بیلنسکی لکھتے ہیں: "تورگنیف ایک انتہائی ذہین فنکار ہے۔ اس کی ہر بات میں عظمت کے ابدی نشان ملتے ہیں۔" دنیا کے عظیم ترین ناول نگار دستوئسکی اس کے بارے میں کہتے ہیں: "قدرت نے تورگنیف کو عدیم المثال ذہانت، بے نظیر قوتِ اظہار اور اسلوب کی بیش بہا شعریت عطا کی ہے۔" ایک اور عظیم نقاد ہرزن نے لکھا ہے: "تورگنیف کا مقام روسی ادب میں بہت بلند ہے۔" اس طرح فرانس کے شہرۂ آفاق ادیبوں فلوبیئر اور زولا نے تورگنیف کو حقائق کا داستاں سرا بتایا ہے۔ سارس بیرنگ انگریزی ادب کے نامور نقاد تو تورگنیف کی تخلیقات کا یوں جائزہ لیتے ہیں: "تورگنیف ایک شاعر ہے، ایک کلاسیکی فنکار ہے اور اس کی نثر میں چشموں کی روانی، بہاروں کی تازگی اور کلیوں کی صباحت ہے۔"

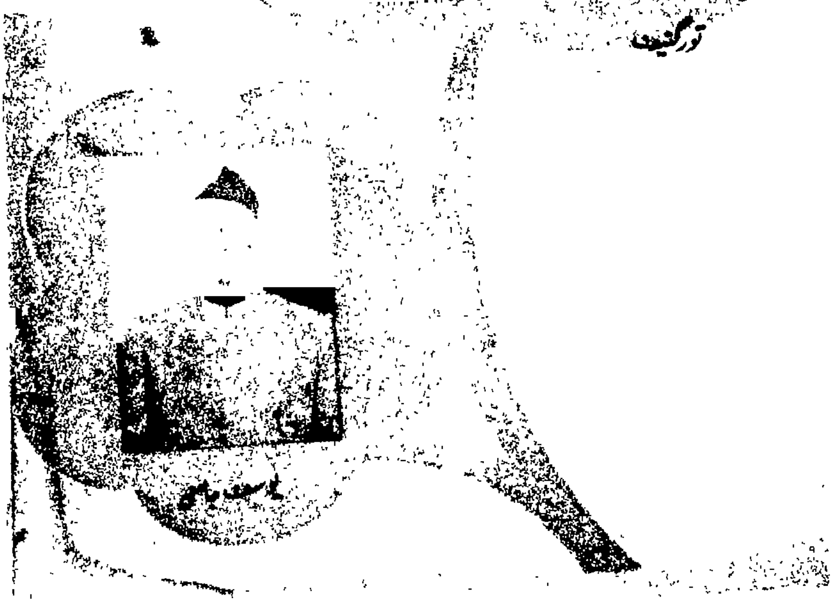
گزشتہ صدی میں روسی ادب کا ایک عظیم دور شروع ہوا تھا اور اس عظیم دور کی ابتدا تورگنیف ہی سے ہوتی ہے۔ تورگنیف نے اپنے ناولوں میں نئے روس کے ابتدائی خدوخال کی تصویر کشی کی ہے۔ تورگنیف جس عہد میں پیدا ہوا، اس نے اس عہد کی نہایت ہی بے حد عکاسی کی ہے۔ اس وقت کے تمام تضادات کو اُجاگر کیا ہے۔

تورگنیف ایک اچھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ گزشتہ صدی کے روس اور مغربی یورپ کی تاریخ کے ہنگامہ پرور دور میں زندہ رہا۔ تورگنیف اپنے عہد کا انسان تھا۔ اس نے اپنی ادبی تخلیقات سے اپنے وقت کی پود کے ذہن اور دل کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔

تورگنیف زندگی کے مشاہدات کو فنکارانہ رنگ دینے میں کمال رکھتا تھا۔ وہ وقت کے نئے تقاضوں پر عبور حاصل کر لیتا تھا اور وہ اس بات کا سختی سے حامی تھا کہ قومیت کے بغیر نہ کوئی آرٹ ہے، نہ کوئی صداقت ہے اور نہ ہی کوئی زندگی ہے ـــــ تورگنیف روسی عورتوں کی بے حد عکاسی کے لئے مشہور ہے۔ تورگنیف نے اپنے اس ناولٹ میں بھی روسی عورت اور اپنے عہد کے نوجوانوں کے کردار کو ان کے اصل رنگ میں پیش کیا ہے۔



تورگنیف



تورگنیف
یوسف جامی

پھرتے ہیں میر خوار

گرمیوں کی ایک پرسکون صبح تھی۔ صاف شفاف آسمان میں سورج کافی بلند ہو چکا تھا لیکن گھاس ابھی تک شبنم سے چمک رہی تھی۔ وادی سے جو ابھی بمشکل بیدار ہوئی تھی۔ ایک تازہ مہک آ رہی تھی۔ اور جنگل میں جو ابھی تک خاموش اور نم آلود تھا۔ صبح سویرے بیدار ہونے والے پرندے کلیلیں کر رہے تھے۔ ایک ڈھلوان پہاڑی پر جو اپنے دامن سے چوٹی تک رائی کی فصل سے ڈھکی تھی ایک چھوٹا سا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ رائی ابھی ابھی میں کچی تھی۔ گاؤں کو جانے والی ایک تنگ پگڈنڈی پر ایک نوجوان عورت ململ کے لباس میں چل رہی تھی۔ اس کے سر پر دار گول تنکوں کی ٹوپی تھی۔ اور اس کے ایک ہاتھ میں چھاتا تھا ملازم لڑکا اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا

نوجوان عورت بڑے سکون کے ساتھ قدم رکھ رہی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سیر سے لطف اندوز ہو رہی ہے کے ارد گرد رائی کی بلند فصل کے اوپر جو نرم اور طویل لہروں میں جھوم رہی تھی اور کبھی نقرئی سبز رنگ کی ہو جاتی تھی اور کبھی سرخ ہو کر دمکنے لگتی تھی۔ چنڈول شتالا رہے تھے۔ یہ نوجوان عورت اپنے گاؤں سے آ رہی تھی۔ جو سامنے کی بستی سے ایک میل سے کم فاصلے پر واقع تھا اس کی طرف وہ جا رہی تھی۔ یہ نوجوان عورت الیگزینڈرا پاولونا لپنا اور بیوہ تھی۔ جس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ ایک امیر عورت تھی اپنے بھائی سرگئی پاولووچ وولنتسیف کے ساتھ رہتی تھی۔ جو کا ایک سبکدوش کپتان تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ اور بہن کی جاگیر کا تمام انتظام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔

مادام لپنا سامنے کے گاؤں میں پہنچ گئی اور نزدیک کے جھونپڑے سے آگے جا کر رک گئی۔ جس کی چھت بہت نیچی ، اور بڑی خستہ حالت تھی۔ اس نے لڑکے کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ وہ جھونپڑے کے اندر جائے اور اس جھونپڑے کی مالکن کی خیریت پوچھے۔ لڑکا ایک پتلے دبلے کسان کے ہمراہ جلدی باہر آگیا۔ کسان کی ڈاڑھی سفید تھی

"کیا حال ہے اس کا؟" لپنا نے پوچھا۔

"ابھی تک زندہ ہے" بوڑھا بڑبڑایا۔

"کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔"

مادام لپنا نے جھونپڑی کے اندر قدم رکھا۔ یہ جھونپڑی تنگ اور تاریک تھی۔ دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر دم گھٹتا تھا انگیٹھی نما صوفے پر کسی نے کروٹ لی اور وہ کراہنے لگا۔ اس طرف دیکھتے ہوئے مادام لپنا کو نیم تاریکی میں ایک بڑھیا کا زرد اور جھریوں دار چہرہ نظر آیا۔ چار خانے کا ایک رومال اس کے سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ سینے تک ایک بڑے کوٹ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشکل کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے لمبے لمبے ہاتھ بڑی نقاہت کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

مادام لپنا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور بڑھیا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی جل رہی تھی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" انگیٹھی نما صوفے پر جھک کر اس سے پوچھا۔

"آہ ــ" عورت نے کراہتے ہوئے اور مادام لپنا کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"میرا حال بہت ہی برا ہے پیاری خاتون! میری آخری گھڑی آ پہنچی ہے"

"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ بیٹریتا۔ تم شاید اچھی ہو جاؤ۔ کیا تم نے دوا پی تھی۔ جو میں نے تمہیں بھجوائی تھی؟"

بوڑھی عورت نے دردناک انداز میں کراہتے ہوئے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا۔

"دعا ہی لگی ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ جو اب دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

مادام لینا بوڑھے کی طرف مڑی۔

"کیا تمھارے سوا اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ایک لڑکی ہے۔ اس کی پوتی۔ لیکن وہ اکثر باہر رہتی ہے۔ وہ دیر تک ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتی۔ بڑی شریر ہے۔ اتنی کاہل ہے کہ اپنی دادی کو پانی کا ایک پیالہ تک نہیں دے سکتی۔ اور میں بہت بوڑھا ہوں۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا۔۔"

"تو کیا میں اسے اپنے اسپتال میں لے جاؤں؟"

"نہیں۔ وہاں اسے کیوں لے جایا جائے؟ اسے مرنا تو ہے ہی۔ اپنی زندگی گزار چکی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ وہ تو اس صوفے پر سے اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اور اسپتال کی بات کر رہی ہیں۔ اس کو اٹھانے کی کوشش کی گئی تو مر جائے گی۔"

"آہ۔ بڑھیا پھر کراہی۔ پیاری خاتون میری قسمت کو تنہا نہ چھوڑ دینا۔ ہمارے مالک بہت دور رہتے ہیں۔ اور تم۔۔"

بوڑھی عورت خاموش ہو گئی۔ اس کی طاقت جواب دے گئی۔

"فکر نہ کرو۔" مادام لینا بولی۔ "ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ میں تمھارے لئے چائے اور کھانڈ لائی ہوں۔ چاہو تو تھوڑی سی پی لو۔۔۔۔ تمھارے پاس سماوار ہے کہ نہیں؟" اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سماوار؟ نہیں ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر میں لا سکتا ہوں۔"

"ضرور لاؤ۔ نہیں تو میں تمھیں اپنا بھجوا دوں گی۔ اپنی پوتی سے کہنا کہ وہ گھر پر رہا کرے۔ یہ بھی کہنا کہ اسے شرم آنی چاہیئے۔"

جواب دیئے بغیر بوڑھے نے چائے اور کھانڈ کا پارسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تیری پیاری خدا حافظ!" مادام لینا بولی۔ "میں تمھیں پھر دیکھنے آؤں گی۔ ہمت نہ ہارو اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتی رہو۔"

بوڑھی عورت نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس نے اپنی آنکھوں پر زور دے کر اپنی محسنہ کی طرف دیکھا۔

"خاتون۔ ذرا اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔"

مادام لینا نے بوڑھی عورت کی التجا کی تعمیل نہ کی۔ اس کی بجائے وہ جھکی اور اس نے بوڑھی عورت کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ جاتے ہوئے مادام لینا نے بوڑھے سے کہا۔ "یہ بات یاد رکھو۔۔۔ اسے باقاعدگی کے ساتھ دوا دیتے رہنا اور کچھ چائے بھی پلا دینا۔"

بوڑھے نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اور صرف اپنا سر جھکا کے رہ گیا۔

جب تک مادام لینا باہر تازہ ہوا میں نہ آگئی تب تک وہ آزادی کے ساتھ سانس نہ لے سکی۔ اس نے اپنا چھاتا کھولا۔ اور گھر کی طرف چل پڑی۔ اتنے میں جھونپڑے کے نکڑ سے ایک چھوٹی سی دوڑ کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس میں تیس برس کی عمر کا ایک مرد۔ بھورے رنگ کے مٹیالے کوٹ میں بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی۔ نوجوان عورت کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور اس کی طرف مڑا۔ اس کا چوڑا اور زرد چہرہ چھوٹی بھوری آنکھوں اور یکساں ترشی ہوئی دو مونچھوں کے ساتھ اس کے لباس کے رنگ سے ملتا تھا۔

"صبح بخیر۔" اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔؟"

"ایک بیمار عورت کو دیکھنے آئی تھی اور تم کہاں سے آ رہے ہو مائیخیل؟"

جس شخص کو اس نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرایا۔

"تم بہت اچھا کر رہی ہو کہ بیماروں کی دیکھ بھال میں لگی ہو۔ تم اسے اپنے اسپتال کیوں نہیں لے جاتیں؟"

"وہ بہت کمزور ہے۔ اور ہلنے جلنے کے قابل نہیں۔"

"اور تم کیا اسپتال سے دستکش ہو رہی ہو۔؟"

"وہ کیوں؟ میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگی۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں۔"

"بڑا عجیب خیال ہے تمھارا۔ یہ بات تمھارے ذہن میں سمائی ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ تمھاری مادام لاسنکایا سے گہری دوستی ہے اور تم پر اس کا اثر ہے۔ اور اس کے خیال میں یہ اسپتال اور یہ اسکول محض بکواس ہیں۔ بیکار خوش فہمیاں ہیں۔ خلاف تکلف رکھو۔ سختی کے ساتھ ایک ذاتی معاملہ ہونا چاہیئے اور تعلیم کو بھی۔۔۔ میرے خیال میں اس کے ان الفاظ کو میں صحیح طور پر یاد کر رہا ہوں۔"

تو حیران ہوں کہ وہ اس قسم کے خیالات کہاں سے لاتی ہے ۔۔۔"

مادام لیپنا ہنسی "مادریا ایک ذہین عورت ہے ۔ میں اس کی بڑی قدر کرتی ہوں ۔ اور مجھے اس سے محبت ہے ۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ اس سے کوئی غلطی نہ سرزد ہو اور میں اس کی ہر بات پر اعتبار نہیں کرتی ۔"

"تمھیں کرنا بھی نہیں چاہیے ۔۔۔" اس مرد نے اپنی رائے دی جو ابھی تک گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا ۔۔۔ "کیونکہ وہ خود بھی جو کچھ کہتی ہے ۔ اس پر آدھا اعتبار کرتی ہے ۔ خیر تم سے ملاقات ہو گئی میں بہت خوش ہوں ۔۔"

"کیوں ؟"

"کیا سوال ہے ؟ جیسے تم سے ملاقات باعث مسرت نہ ہو آج تم اس صبح کی طرح تر و تازہ اور دلفریب ہو ۔۔۔"

نوجوان عورت پھر مسکرائی ۔

"تم ہنس کس بات پہ رہی ہو ؟"

"مجھ سے ہنسے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا ۔ تعریف کا یہ کتنا سرد اور بے روح طریقہ ہے ۔ مجھے تو حسرت ہو رہی ہے کہ تم نے آخری الفاظ کہتے ہوئے جمائی کیوں نہ لی ۔۔"

"مرد تو ہے لیکن تمھیں آگ کی ضرورت ہے ۔ مگر آگ کوئی فائدہ بھی تو ہو ۔ یہ بجھ گئی ہے ۔ صرف الاؤ ہے اور کچھ باقی نہیں ۔ لیکن گرمی تو پہنچاتی ہے ۔۔۔" عورت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔۔۔

"ہاں مگر جلا بھی دیتی ہے ۔۔۔"

"جلا دیتی ہے تو پھر کیا ہوا ؟ اس میں ہرج کی بات ہی کون سی ہے ۔ آگ بہت اچھی چیز ہے ۔"

"اس وقت نہ جانے تم کیا کہو گی جب تم واقعی جل اٹھو گی ۔۔۔" مائیکل نے تیوری چڑھا کر کہا ۔ اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو چابک لگائی ۔

"خدا حافظ !"

"ذرا ٹھہرو ۔۔۔" نوجوان عورت چلائی "تم ہمارے یہاں کب آ رہے ہو ؟"

"کل ۔۔۔ اپنے بھائی سے میرا سلام کہنا ۔۔"

اور گھوڑا گاڑی دور نکل گئی ۔

نوجوان عورت اپنی آنکھوں سے اس کا تعاقب کرتی رہی اور اس نے سوچا ۔۔ "یہ تو ایک بہت بڑی بوری کی طرح ہے ۔۔" گرد سے اٹا ہوا اور گردن جھکا کر بیٹھا ہوا اور اپنی ٹوپی کو سر سے پیچھے کی طرف کھسکائے ہوئے جس میں سے اس کے زرد رنگ کے بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھی ۔ وہ واقعی آٹے کی ایک بہت بڑی بوری کی طرح دکھائی دے رہا تھا ۔

مادام لیپنا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی ۔ اس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں ۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔ ایک سپاہی گھوڑے پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا ۔ اس کے پہلو میں ایک نوجوان چل رہا تھا ۔

اس نوجوان کا قد چھوٹا تھا ۔ اس کے لمبے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے ۔ اور اس کی نکٹائی ہلکے رنگ کی تھی ۔ اس کے سر پر بھورے رنگ کی ٹوپی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں سیر کی چھڑی تھی ۔ وہ کچھ دیر تک مادام لیپنا کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا اگرچہ وہ دیکھ رہا تھا کہ مادام لیپنا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہے ۔ تو جب مادام لیپنا رکی وہ اس کے قریب گیا اور نہایت ہی پُر لطف اور نرم آواز میں گویا ہوا ۔ "صبح بخیر انگیز ندرا پافلوونا ۔۔۔ بالکل بخیر !"

"آہ کانستنتین دیومودوچ !" اس نے جواب دیا ۔۔ "کیا تم داریا کے یہاں سے آ رہے ہو ۔۔۔"

"بالکل وہیں سے آ رہا ہوں ۔۔۔ مادام !" نوجوان نے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا ۔ "مادام داریا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے ۔ اور میں نے پیدل چلنا مناسب سمجھا ۔ کتنی حسین صبح ہے ۔ اور صرف دو میل ہی کا تو فاصلہ ہے ۔ جب میں یہاں پہنچا تو مادام تم گھر پر نہیں تھیں ۔ تمھارے بھائی نے اطلاع دی کہ تم اس بستی کی طرف آئی ہو ۔ اور وہ خود کھیتوں کی طرف جا رہا تھا ۔ لہٰذا میں تم سے ملنے کے لئے یہاں چلا آیا ۔ ہاں بالکل ۔۔۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے"

یہ نوجوان اچھی اور صحیح روسی زبان بول رہا تھا اگرچہ اس کا لب و لہجہ بدیسی تھا ۔ اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ

لب و لہجہ کہاں کا تھا۔ اس کے خدوخال میں کچھ ایشیائی انداز تھا۔ لمبی ناک، شربتی بڑی بڑی غیر متحرک آنکھیں۔ موٹے موٹے سرخ ہونٹ، ترچھی پیشانی اور گہرے سیاہ بال۔ اس کی ہر بات کہہ رہی تھی کہ مشرقی نسل سے ہے۔ تاہم وہ نوجوان اپنا نام پنڈے لانسکی بتاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ وہ وطن پرست کا رہنے والا ہے۔ اگرچہ اس کی پرورش ہاسٹلوں میں ہوئی، اور اسے ایک سخاوت پسند امیر بیوہ نے پالا تھا۔ ایک اور بیوہ نے اس کے لئے غیر فوجی ملازمت مہیا کر دی تھی۔ عام طور سے ادھیڑ عمر کی عورتیں پنڈے لانسکی کی سرپرستی کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ انہیں ڈھونڈھتا اور پھر ان کو دام پر لانا جانتا تھا۔ اب بھی وہ مادام لاسنکایا ایک امیر جاگیردار عورت کے یہاں رہتا تھا۔ اس کے سہارے گزر بسر کر رہا تھا لیکن وہ منفت خور تھا۔ وہ انتہائی مہربان، اطاعت گزار، جذباتی اور عشرت پسند تھا۔ اس کی آواز نہایت خوشگوار تھی۔ بیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ اور جس سے وہ بات کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی عادت تھی وہ بڑی نفاست کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور دیر تک ایک ہی سے کپڑے پہنے رہتا تھا۔ وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کی بڑی احتیاط کے ساتھ حجامت بناتا تھا۔ اور اپنے سر کے ایک ایک بال کو خوب سنوارتا تھا۔

مادام لیتا نے اس کی بات سنی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہوئی ــــ "کتنا اچھا دن ہے ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات ہوئی ابھی ابھی میں لیزنف سے باتیں کر رہی تھی ــــ"

"آہ لیزنف ــــ کیا وہ کہیں جلد جا رہا تھا ہــ"

"ہاں ــــ اور خیال تو کرو وہ بھی دوڑ لگانے کی گاڑی میں، ٹاٹ پہنے ہوئے تھا۔ بالکل ٹاٹ مگر دیں اٹھا ہوا عجیب و غریب انسان ہے ــ!"

"ہاں ہے تو مگر خوب آدمی ہے ــ"

"کون؟ موسیو لیزنف ہی؟" پنڈے لانسکی نے ناقابل اعتبار لہجے میں پوچھا۔

"ہاں میخیل لیزنف ــــ" والنتیف نے بات دہرائی "اچھا تو بہن خدا حافظ ــــ منت ہو گیا کہ میں تمہارے کھیتوں کی طرف چل دوں ــــ ان دنوں گیہوں کی بوائی ہو رہی ہے ــــ موسیو پنڈے لانسکی تمہیں گھر تک چھوڑنے جائیں گے ــــ" اتنا کہہ کر والنتیف گھوڑے کو ہلکی چال چلاتا ہوا سڑک پر نکل گیا۔

"مجھے بہت خوشی ہوگی ــــ" اور پنڈے لانسکی نے نوجوان عورت کو اپنا بازو پیش کیا۔

نوجوان عورت اس کے بازو میں بازو ڈال کر اس پگڈنڈی پر چل جو اس کی جاگیر کی طرف جاتا تھا۔

• • • • •

مادام لیتا کو اپنے بازو پر لئے ہوئے پنڈے لانسکی بڑی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی مشرقی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اکثر نم آلود رہتی تھیں۔ پنڈے لانسکی کی آنکھیں فوراً ڈبڈبا آتی تھیں اور پھر کون ایسا ہے۔ جو ایک حسین اور جوان عورت کے بازو میں بازو ڈال کر خوش نہیں ہوتا۔!

گوبرنا کا پورا علاقہ متفقہ طور پر اعلان کیا کرتا تھا کہ مادام لیتا ایک دلفریب عورت ہے۔ اور گوبرنا کے لوگ غلطی پر نہیں تھے اس کی باریک خم دار ناک ہی کسی فانی انسان کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کی مخملیں اور بادامی آنکھوں، اس کے سنہرے بالوں، اس کے گرشے دار سرخ رخساروں اور اس کی دوسری دلی آویزیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ جب وہ ہنستی تھی تو ایک بچے کی طرح معصوم معلوم ہوتی تھی۔ گوبرنا کی خواتین اسے بڑی سادہ لوح عورت خیال کرتی تھیں۔ کوئی اس کے سوا اور کیا تمنا کر سکتا ہے؟

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ مادام دلریا نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔" اس نے پنڈے لانسکی سے پوچھا۔

"ہاں مادام داریا لاسنکایا نے مجھے بھیجا ہے ــــ" پنڈے لانسکی نے "س" کے حرف کو ہکلاتے ہوئے ادا کیا۔ جیسے انگریز "تھ" کا حرف ہکلا کر ادا کرتے ہیں۔ "مادام لاسنکایا یہ چاہتی ہیں کہ آپ ضرور آئیں۔ اور رات کے یہاں کھانا کھائیں ــــ" پنڈے لانسکی اس بات کی خاص احتیاط رکھ رہا تھا۔ کہ اس کے لہجے میں بے تکلفی کا عنصر داخل نہ ہونے پائے۔ وہ یہ احتیاط خاص طور پر خواتین کے معاملے میں روا رکھتا تھا ــــ "مادام لاسنکایا کے یہاں ایک نیا مہمان آ رہا ہے۔ اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ ان سے ضرور ملیں! ــــ"

"وہ کون ہے؟"

ہیرن مثل جو سینٹ پیٹرز برگ میں رہتا ہے۔ اور جو ملک معظم کی خواب گاہ کا منتظم ہے۔

مادام لاسنکایا کی اس سے حال ہی میں شہزادہ گارن کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ مادام کا خیال ہے کہ وہ ایک نہایت ہی شائستہ اور عالم و فاضل شخص ہے۔ اور ادب میں بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ آہ کتنی حسین تتلی ہے۔ ذرا اس کی طرف دیکھئے تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیرن مثل سیاسی اقتصادیات کے خاص طور پر دلدادہ ہیں۔ انھوں نے ایک جاذب نظر موضوع پر ایک مقالہ لکھا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مادام لاسنکایا اس کے بارے میں اپنی رائے صادر فرمائیں۔

"سیاسی اقتصادیات پر مقالہ!"

"اسلوب کے نقطۂ نظر سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ تو بلا شبہ جانتی ہیں کہ مادام لاسنکایا اپنی دوسری خوبیوں کے علاوہ اسلوب سے متعلق اپنی رائے دینے میں مستند خیال کی جاتی ہیں۔ نوکا دامکی شاعر تو ان سے مشورہ لیا کرتا ہے۔ اور میرے سابقہ محسن معزز و محترم وکسولن میریا درویچ ساندریکا جو اوڈیسہ میں رہتے ہیں ـــ آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے ان کا نام کبھی نہیں سنا ـــ!"

"اس معزز شخص کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا۔ خیریت ہے ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ موموہیوڑ ساندریکا بھی مادام لاسنکایا کے روسی زبان پر عبور کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں ـــ"

"آج کے مہمان ہیرن مثل کیا ایک نظریہ پرست ہیں؟"

"بالکل نہیں۔ اس کے برعکس مادام لاسنکایا کا خیال ہے کہ انھیں دیکھ کر فوراً ہر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک دنیادار شخص ہیں ہیرن نے مشہور نغمہ نگار بیتھوون کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں کہ بوڑھا شہزادہ گارن بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کاش میں وہاں ہوتا کیونکہ میرا خیال ہے کہ موسیقی میرا مرغوب موضوع ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو یہ جنگلی پھول پیش کردوں!"

مادام لینا نے وہ پھول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور چند قدم چل کر وہ پھول زمین پر گرا دیا۔ اب مادام لینا کا گھر دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ گھر نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تابندہ و درخشندہ کھڑکیاں جو پرانے لیموں کے پیڑوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اس گھر میں آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔

"تو پھر میں مادام لاسنکایا سے جا کر کیا کہوں؟" پینڈسے لاسکی نے اپنے پھول کے انجام سے ہراساں ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ رات کا کھانا وہاں کھائیں گی؟

مادام لاسنکایا نے آپ کے بھائی کو بھی مدعو کیا ہے ـــ"

"ہاں۔ ہم ضرور آئیں گے ـــ نتالیا کا کیا حال ہے؟"

"وہ اچھی ہیں ـــ اوہ ہم تو مادام لاسنکایا کی جاگیر کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچ گئے ہیں! مادام مجھے اب رخصت دیجئے۔"

مادام لینا ایک لمحہ کے لئے رکی اور بولی ـــ "کیا آپ اندر نہیں چلیں گے؟" اس کے لہجہ میں ایک جھجک سی تھی۔

"نہیں ـ میں بہت مسرور ہوتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ مادام نتالی برگ کا نغمہ سننا چاہتی ہیں مجھے ذرا مشق کرنا ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میری بیوی میں آپ کو لطف نہیں آئے گا ـــ"

"تمہیں یہ گمان کیوں گذر رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

پینڈسے لاسکی نے ایک سرد آہ بھری اور بڑے معنی خیز انداز میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"صبح بخیر مادام!" ـــ اس نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اپنا سر جھکایا اور اسی طرف قدم اٹھا کر وہ اپنے راستہ پر ہو لیا۔

مادام لینا مڑی۔ اور اپنے گھر کی طرف بڑھی۔

پینڈسے لاسکی بھی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے چہرے پر بھرپور سی شگفتگی کا نقاب اوڑھے رہتا تھا۔ وہ اب اس کے چہرے سے اٹھ چکا تھا۔ اب اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور سنجیدگی کے آثار تھے۔ اب تو اس کی چال میں بھی فرق آگیا تھا۔ اب اس کے قدم لمبے اور بھاری ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی چھڑی کو لہراتا ہوا دو فرلانگ آگے بڑھ چکا تھا۔ کہ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر تبسم نے بل بدلا کیونکہ اس نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان اور شرمیلی کسان لڑکی کو دیکھا جو کھیت کی طرف اپنے بیل لئے جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کے قریب پہونچا۔ اس وقت اس میں ایک بلی کی سی پھرتی پیدا ہو گئی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی پہلے تو خاموش رہی۔ پھر وہ تھوڑی سی شرمائی اور دبی زبان میں ہنسی اس کے

بعد اس نے اپنی آستین سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور مڑتے ہوئے بولی — "اپنی راہ لیجئے سرکار —"

پینڈے لافسکی نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس سے کہا کہ وہ اس کے لئے لیموں کی چند بالیاں ضرور لے آئے۔

"آپ لوگوں کو ان کی کیا ضرورت پڑ گئی حضور — کیا ہار بناؤ گے؟" لڑکی نے منہ بنا کر کہا — "اچھا اب اپنا راستہ ناپیے سرکار!"

"ذرا ٹھہرو تو میری جان —" پینڈے لافسکی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی۔

"جائیے... وہ رہا آپ کا راستہ" لڑکی نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا — "چھوٹے آقا آ رہے ہیں —!"

پینڈے لافسکی نے مڑ کر دیکھا۔ واقعی سامنے سے وانیا اور پیٹیا مادام لاسنکایا کے بیٹے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا استاد ییپے توف تھا کالج سے تازہ نکلا ہوا بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ ییپے توف کا قد لمبا تھا۔ اس کی ناک تیکھی تھی۔ اس کی آنکھیں سور کی سی تھیں۔ وہ بدصورت تھا۔ لیکن نہایت ہی سیدھا اور صاف اور مہربان و ایماندار شخص تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور اپنے بال نہیں کٹواتا تھا۔ یونہی نمائش کے طور پر نہیں بلکہ کاہلی کی وجہ سے۔ وہ کچھ کھانے کا شائق تھا۔ ایک اچھی کتاب، سرگرم گفتگو اور بحث کا بھی وہ دلدادہ تھا۔ وہ اپنے دل کی گہرائی سے پینڈے لافسکی کے ساتھ نفرت کرتا تھا۔

مادام لاسنکایا کے بیٹے ییپے توف کی پرستش کرتے تھے اور اس سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ وہ گھر کے دوسرے افراد کا بھی گہرا دوست تھا۔ اور مادام لاسنکایا اس دعویٰ کے باوجود کہ وہ کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتی تھی۔ ییپے توف کی اس بے تکلفی کو پسند نہیں کیا کرتی تھی۔

"میرے بچو صبح بخیر!" پینڈے لافسکی نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا — "آج تم صبح سویرے سیر کیلئے نکل پڑے ہو — دوستو —" اس نے ییپے توف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا — "کافی مسافت طے کر چکا ہوں۔ قدرت کے نظارے میں مجھے بہت لطف آتا ہے —"

"ہاں یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ کہ تم کس طرح قدرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے —" ییپے توف نے کہا۔

"تم تو ایک مادیت پرست ہو۔ نہ جانے تم کیا سوچتے رہتے ہو۔ میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں —"

پینڈے لافسکی جب ییپے توف جیسے اشخاص سے بات کرتا تھا۔ تو وہ جھلا اٹھتا تھا اور بڑی صفائی کے ساتھ "میں" کا لفظ ادا کرتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس لڑکی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ رہے تھے؟" ییپے توف نے دائیں بائیں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا — اسے اس بات کا احساس تھا کہ پینڈے لافسکی اس کے چہرہ کو گھور رہا ہے۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ تم ایک مادیت پرست ہو۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ تم ہمیشہ ہر چیز کی کمزوری طرف دیکھتے ہو —"

"لڑکو —" ییپے توف نے دفعتاً کہہ دیا — "وہ سامنے چراگاہ دیکھ رہے ہو نا — دیکھیں وہاں سب سے پہلے کون پہنچتا ہے؟ ایک — دو — تین!"

"رذیل کسان!" پینڈے لافسکی نے سوچا — "یہ ان لڑکوں کا اخلاق بگاڑ دے گا — نادار کسان — اور نہیں تو کیا!"

اپنے نفیس اور صاف ستھرے بدن کی طرف دیکھتے ہوئے پینڈے لافسکی نے اپنی انگلیاں پھیلا کر اپنا کوٹ جھاڑا — اپنا کالر سیدھا کیا — اور اپنے راستہ پر ہو لیا۔ اپنے کمرہ میں آکر اس نے اپنا نہایت اچھا شب خوابی کا لباس پہنا۔ اور ایک خاص مقصد کے ساتھ پیانو کے سامنے جا بیٹھا۔

۲

داریا مائیخولانا لاسنکایا کا گھر گوبرنا کے علاقہ میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ یہ پتھر کا گھر تھا۔ اور اٹھارویں صدی کی طرز کی عمارتوں کے مطابق اس کا نقشہ راسترلی نے تیار کیا تھا۔ یہ مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اور اس پہاڑ کے دامن میں روس کا ایک بڑا دریا بہتا تھا۔ خود لاسنکایا ایک دولت مند خاتون تھی اور روس کی قانون ساز مجلس کے رکن کی بیوہ تھی۔ اگرچہ پینڈے لافسکی یہ کہا کرتا تھا کہ مادام لاسنکایا سارا یورپ گھوم چکی ہے اور

م یورپ اسے جانتا ہے۔ اس کے باوجود یورپ میں اسے کوئی نہیں
آنا تھا۔ اور سنیٹ پیٹرز برگ میں بھی اسے کوئی خاص مقام
اصل نہیں تھا۔ البتہ ماسکو میں اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور جو ضیافتیں
ہ دیا کرتی تھی ان میں ہر کوئی شریک ہوتا تھا۔ وہ دولت مند و کبیر
ارگھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اسے نہایت ہی عجیب و غریب فکر
ور ایک ہوشیار عورت سمجھا جاتا تھا۔ اپنے عہد شباب میں وہ بہت
سین تھی۔ شاعروں نے اس کی تعریف میں نظمیں کہی تھیں ——
وجوانوں نے اس کی خاطر اپنے دل لٹائے تھے۔ اور مشہور شخصیتیں
ن کے ساتھ شادی کی خواہش مند رہا کرتیں۔ لیکن اس بات
و ۲۵ یا ۳۰ برس گزر چکے تھے۔ اس کے سابقہ حسن کے آثار اب
قی نہیں رہے تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اسے اب دیکھتا تھا۔ وہ
پنے آپ سے سوال کرتا تھا ——کیا یہی وہ عورت ہے۔ جس کی عمر
ی کچھ زیادہ نہیں۔ بلکہ ذرا کچھ دبلی پتلی ہے۔ ناک بھی لمبی ہے جو
پنے وقت میں بہت ہی حسین ہوتی تھی —— ؟ اور ہر شخص ارضی
شیاء کی بے پناہ تبدیلی پر جی ہی جی میں حیران ہوتا۔ پینڈسے لافسکی
اگر اب بھی یہ خیال تھا۔ کہ مادام لاسنکایا کی آنکھوں کا حسن ابھی تک
ائم ہے اور یہی پینڈسے لافسکی یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ تمام یورپ
دام لاسنکایا کو جانتا ہے۔

ہر موسم میں لاسنکایا اپنے دیہی مکان میں اپنے بچوں کے ساتھ
تی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے جن کی عمر نو اور دس برس
ے ہے اور ایک سترہ برس کی لڑکی نتالیا۔) اپنے اس مکان کے
دروازے کھلے رکھتی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں مہمانوں کو
واتی ہے۔ اس کے مہمان خاص طور پر کنوارے مرد ہوتے ہیں۔
دیہات میں رہنے والی خواتین کو پسند نہیں کرتی۔ وہ سمجھتی ہے
ان میں بڑی یکسانیت ہوتی ہے۔ مادام لاسنکایا ایسی خواتین
ے بات کرتے ہوئے درشت کلامی سے کام لیتی ہے۔ اس وقت وہ
یے منکسر مزاج نہیں ہوتی۔ تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے
یسے وقت میں وہ اپنی زبان کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ اس
کے الفاظ پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مادام لاسنکایا دیہات میں زندگی کی ذرہ
بھر پروا نہیں کرتی۔ مگر پابندیوں سے آزاد اس کی سادگی میں

ایک بڑے شہر کے رہنے والی عورت کی وہ نفرت پائی جاتی تھی۔ جو
اپنے ارد گرد منڈلانے والے لاعلم اور حقیر انسانوں کے لئے اپنے دل
میں رکھتی ہے۔ وہ اپنے شہر کے شناساؤں کے ساتھ بھی تضحیک
آمیز سلوک کرتی ہے۔ لیکن وہاں نفرت غائب ہوتی ہے۔

اتفاقیہ طور پر یہاں قارئین سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ
ایک شخص جو اپنے ماتحتوں سے گریز کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بڑوں
کے ساتھ کیوں ایسا نہیں کر پاتا —— ! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خیر
اس قسم کے سوالات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

جب پینڈسے لافسکی نے تھالی برگ کے نغمہ ایتوڈے کو
زبانی یاد کر لیا۔ تو وہ اپنے صاف ستھرے کمرے سے نیچے اترا اور
نشست گاہ میں پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے لوگ وہاں جمع تھے
مجلس شروع ہو چکی تھی۔ گھر کی مالکن ایک چوڑے صوفہ پر بیٹھی تھی
اور وہ ایک فرانسیسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کھڑکی کے
قریب دوسری جانب نتالیا لاسنکایا اور میڈموازیل بون کورٹ بیٹھی
تھیں۔ بون کورٹ نتالیا کی استانی تھی۔ اور اس کی عمر ساٹھ برس
کے لگ بھگ تھی اور نہایت ہی دبلی پتلی تھی۔ اس نے اپنے کانوں
میں روئی ٹھونس رکھی تھی اور وہ گھر پر پہننے کی رنگ دار ٹوپی
کے نیچے ایک چھوٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ دروازے کے قریب ایک
کونے میں بیٹھے توف اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی دائیں طرف پیٹیا
اور ودانیا ڈرافٹ کھیل رہے تھے۔ انگیٹھی کے قریب جھکا ہوا شخص
جس نے اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ ایچی
پگاسف تھا۔ جس کا تلچٹ تھا اور جس کے بال سفید تھے۔ اور چہرے
کی رنگت سیاہی مائل تھی۔ اور آنکھیں سیاہ تھیں۔

پگاسف ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کو ہر چیز سے
خدا واسطے کا بیر تھا۔ عورتوں کا خاص طور پر دشمن تھا۔ وہ صبح
سے شام تک شکوہ سرا رہتا۔ کبھی اس کی یہ شکایت بڑی بیکسی ہوتی
اور کبھی بڑی احمقانہ ہوتی۔ مگر ہر وقت وہ بڑے جوش و خروش
کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی جھلاہٹ ہمیشہ بڑی رکیک ہوتی۔ اس کی
ہنسی، اس کے لہجہ، اور اس کا تمام وجود تنک مزاجی کا پلندہ
تھا۔ مادام لاسنکایا بڑی فراخ دلی کے ساتھ پگاسف کا خیر مقدم
کیا کرتی تھی۔ پگاسف کی ہنسی ٹھٹھول سے وہ خوش ہوتی تھی۔

اس کا ہنسی ٹھٹھا مسخرے پن کی حد کو چھوتا تھا۔ اسے مبالغہ آرائی کا جنون تھا۔ مثال کے طور پر جب اسے کسی قدرتی آفت کا حال بتایا جاتا۔ یعنی یہ کہ بجلی کی کڑک سے ایک گاؤں جل گیا۔ سیلاب میں، باندھ بہہ گیا۔ یا ایک کسان نے لکڑیاں چیرتے ہوئے اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ تو وہ غیر متلوب بہٹ دھرمی کے ساتھ پوچھتا ــــ "وہ کون تھی؟" اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کس عورت کی وجہ سے یہ آفت آئی۔ اس کا یہ یقین تھا کہ ہر مصیبت کا سبب کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر معاملہ کی تہہ کو کریدا جائے تو کوئی نہ کوئی عورت بظاہر واقعہ کی وجہ نظر آئے گی۔

ایک دفعہ اس نے ایک بالکل اجنبی عورت کے سامنے اپنے آپ کو گھٹنوں کے بل جھکا دیا جو اس کے سامنے مٹھائی اور چیل رکھ رہی تھی۔ اور اپنے ماتھے پر بل پیدا کرتے ہوئے انتہائی غیظ آلود ہو کر اس نے کہا کہ وہ اسے اس خاطر و مدارات سے باز رکھے۔ اس نے اس عورت کو یقین دلایا کہ وہ آئندہ پھر کبھی اس کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ ایک مرتبہ اوم لاسکایا کا گھوڑا ان کی دھوبن کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے بدک گیا۔ اور اس نے اس دھوبن کو ایک کھائی میں جا گرایا۔ وہ بیچاری مرتے مرتے بچی۔ اس وقت کے بعد سے بکاسف اس گھوڑے کو ہمیشہ سے "ننھا سا شاندار گھوڑا" کہہ کر پکارتا رہا۔ اس نے تو یہاں تک کہا کہ وہ پہاڑی اور خندق سیر و تفریح کے لئے نہایت اچھے مقامات ہیں۔

[redacted] نے اپنے اس خبط کی وجہ سے زندگی میں ترقی نہیں کی تھی۔ وہ ایک غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی جگہ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں۔ وہ بہت کم پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو کھلایا پلایا۔ اور اسے کپڑے پہنائے۔ اس کے سوا اس نے اور کچھ نہ کیا۔

اس نے اپنے بیٹے بکاسف کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی اس کی ماں نے اس سے بہت لاڈ کیا مگر وہ جلد مر گئی۔ بکاسف نے اپنی ہمت سے زندگی میں قدم رکھا۔ وہ خود ہی اسکول گیا۔ اسکول سے کالج پہنچا۔ اس نے تین زبانیں سیکھیں۔ فرانسیسی، جرمنی اور لاطینی تو نہایت اچھی سند کے ساتھ وہ کالج سے باہر نکلا اور دڑود ریوٹ چلا گیا۔ جہاں وہ مسلسل افلاس و نکبت کے خلاف لڑتا رہا اور وہاں اس نے تین سال کا نصاب ختم کیا۔ بکاسف کی خوبیاں بس دوسرے درجہ ہی کی رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بلا کا صبر و تحمل رکھتا تھا۔ مگر اس کے لئے سب سے طاقتور تحریک اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بڑے لوگوں کے حلقہ میں قبول کر لیا جائے۔ اس کی دولت چاہے اسے کتنا ہی کیوں نہ پچھاڑے۔ مگر وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔ یہ اس کی خواہش رہی تھی جو اسے ڈروپوٹ کی یونیورسٹی میں لے گئی تھی۔ افلاس نے اس کے مشاہدے پر دھار رکھی۔ اس کی طرز گفتگو بڑی نرالی تھی۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں اس نے اپنی گفتگو میں چڑچڑاپن اختیار کیا۔ اس کے خیالات اگرچہ معمولی آدمیوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ نہ ہو سکے لیکن وہ اپنے خیالات کو کچھ اس طرح پیش کرتا کہ اسے نہ صرف حاضر دماغ بلکہ ایک ذہین اور دانشمند خیال کیا جاتا۔

گریجویٹ ہو جانے کے بعد بکاسف نے طے کیا کہ وہ درس و تعلیم کا پیشہ اختیار کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ اپنے طبقہ کا ہم پلہ ہو سکتا ہے (وہ اپنے ساتھی اونچے طبقہ میں سے چنتا تھا اور جانتا تھا کہ ان کے ساتھ تعلقات کس طرح قائم کئے جاتے ہیں وہ خوشامد سے بھی احتراز نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ جھلاہٹ سے کام لیتا تھا) اس مقصد کے لئے چٹان کے سے کردار والے شخص کی ضرورت تھی۔ بکاسف نے علم کو علم حاصل کرنے کی نیت سے حاصل نہیں کیا تھا۔ اسی لئے اس کی معلومات محدود تھیں۔ بحث مباحثہ میں وہ بری طرح ناکام رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ جو طالب علم اس کے گرد رہتا تھا وہ جس کا اکثر وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس سے سبقت لے گیا۔ اس ناکامی نے بکاسف کو چراغ پا کر دیا۔ اس نے اپنی تمام کتابوں اور کاپیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اور سول سروس میں شامل ہو گیا۔

پہلے پہل تو اسے اپنی کامیابی کے امکانات روشن نظر آئے لیکن وہ روز پیدائش ہی سے بدمزاج تھا۔ وہ خوش کار نہیں تھا لیکن اپنی اسی کمی کو وہ خود نمائی اور دلیری سے پورا کیا کرتا تھا۔ دنیا میں ترقی کرنے کی جلدی میں وہ مصیبت میں مبتلا ہوا اور اس نے غلط قدم اٹھایا۔ اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ وہ تین برس تک اپنے گاؤں میں رہا۔ جو اس نے خرید لیا تھا۔ مختصر یہ کہ آخر کار اس نے ایک دولت مند اور تعلیم یافتہ دیہاتی عورت سے شادی کر لی جس پر وہ رات دن اپنی طنز اور ترش مزاجی کے نشتروں کی بوچھاڑ کیا کرتا تھا

پگاسف کا کردار اب نہایت تلخ اور پریشان زدہ ہو چکا تھا ازدواجی زندگی اس کے لئے وبال جان بن گئی تھی۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ چند سال رہ کر ماسکو بھاگ گئی۔ اور اس نے اپنی جاگیر ایک شہ بازن کے ہاتھ فروخت کر دی۔ پگاسف نے اس کی جاگیر پر ابھی مکان تعمیر ہی کروایا تھا۔ یہ آخری ضرب بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ پگاسف نے اپنی بیوی پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اس مقدمے میں وہ ہار گیا۔ اس کے بعد وہ تنہا رہنے لگا کبھی کبھی اپنے پڑوسیوں کے یہاں چلا آتا جن کو وہ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتا۔ اور بعض اوقات تو وہ ان کے منہ پر انہیں گالیاں دیتا۔ اس کے بعد پگاسف نے کبھی اپنے ہاتھ میں کوئی کتاب نہ پکڑی۔ وہ سو غلام کسانوں کا مالک تھا۔

"آہ کانسٹنٹین! " مادام لاسنکایا پینڈیے لافسکی کے نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی بولی — "کیا الیگزینڈرنیا آ رہی ہے؟"

مادام لینا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر دوں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ضرور آئیں گی — " پینڈیے لافسکی نے دائیں بائیں سر جھکا کر یہ بات کہی۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنے صفحوں لوٹ ہوئے بالوں پر آہستگی کے ساتھ ہاتھ بھی پھیر تا رہا —

"کیا ولنتیف بھی آئے گا؟"

ہاں — موسیو ولنتیف بھی آئیں گے۔

"ہاں تو تم یہ اصرار کر رہے ہو —" مادام لاسنکایا نے پگاسف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا — تمام نوجوان عورتیں اس مرض کا شکار ہیں۔

پگاسف کے ہونٹوں میں بل پڑ گئے اور اس کی کہنی پھڑپھڑانے لگی — "میں کہتا ہوں کہ —" اس نے راسخ لہجے میں کہا — " وہ گھبراہٹ اور برہمی کے عالم میں بھی بڑے صاف لہجے میں بات کیا کرتا تھا — "نوجوان عورتیں عام طور پر اس مرض کا شکار ہوتی ہیں اس میں وہ نوجوان عورتیں شامل نہیں جو یہاں موجود ہیں .... "

"کون تمھیں ان کو بھی ان میں شامل کرنے سے روک رہا ہے — " مادام لاسنکایا نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

میں یہاں کی عورتوں کو ہمیشہ ہر بات سے خارج رکھتا رہا ہوں — ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ نوجوان خواتین بڑی جذباتی ہوتی ہیں مثال کے طور پر جب ایک نوجوان عورت ڈر جاتی ہے یا بہت خوش ہوتی ہے۔ یا پریشان ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ اضطراب والا رُبا انداز اختیار کرتی ہے —" یہاں پگاسف نے نہایت بدصورتی سے ساتھ اپنی کمر کو بل دیا اور اپنے ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیئے — "اس کے بعد وہ چلاتی ہے — آہ — یا ہنستی ہے۔ یا آنسو بہانے لگتی ہے۔ ایک دفعہ البتہ مجھے جذبات کا صحیح اور پرخلوص اظہار میسر آیا تھا — "

"وہ کیسے؟ —"

پگاسف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی — "میں نے پیچھے سے اس عورت کے پہلو میں ایک چھڑی سے ضرب لگائی۔ وہ چلائی اور میرے منہ سے نکلا — "شاباش —" یہ چیخ ایک فطری آواز تھی —" کمرے میں موجود ہر شخص زور سے ہنسا۔

"کیا خرافات بک رہے ہو —" مادام لاسنکایا بولی — "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اعتبار کر لوں۔ کہ تم نے ایک لڑکی کے پہلو میں چھڑی سے ضرب لگائی —!"

"ہاں ہاں۔ میں سچ کہتا ہوں —"

"مونسیور پگاسف ذرا بچوں کا تو خیال رکھئے —" بوڑھی اتالیق بون کورٹ نے قہقہے لگاتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھیں اس کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ تم تو اسے اچھی طرح جانتی ہو —"

"مادام لاسنکایا بولی —"

مگر فرانسیسی عورت دیر تک زیر لب بڑبڑاتی رہی۔

"تمھیں شاید اعتبار نہیں آ رہا ہے۔ لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا۔ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اور میں تنہا وہ شخص نہیں۔ جو اس راز کو جانتا ہوں۔ تم تو یہ کہو گی کہ تمھیں میری پڑوسن مادام جیلیو زوفا کا بھی اعتبار نہیں جس نے اپنے بھتیجے کو قریب قریب ہلاک کر دیا تھا —"

"کیسی بات کر رہے ہو —"

"مجھے بات تو ختم کر لینے دو۔ میری بات پوری سن لو اور پھر خود ہی فیصلہ کر دینا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ میں اس پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ جیسے ہر کوئی کسی عورت کو پسند کر سکتا ہے۔ اس کے گھر میں کیلنڈر کے سوا کوئی کتاب نہیں ہے

وہ جب بھی پڑھتی ہے۔ تو بلند آواز سے پڑھتی ہے۔ پڑھنے کا اور کوئی طریقہ اسے معلوم ہی نہیں ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے اسے پسینہ آجاتا ہے۔ بلا میا وہ شکوہ کرتی ہے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑنے کو ہیں۔ ویسے وہ بہت اچھی عورت ہے۔ اس کی ملازمائیں سب کی سب فربہ اندام ہیں — خیر میں اس پر کیوں الزام لگاؤں —"

"تم پھر بہکنے لگے ہو —" مادام لاسنکایا بولی۔ "تم نے اپنا من بھاتا موضوع چھیڑ دیا ہے۔ اور اب رات تک تمہاری زبان قینچی کی طرح چلے گی —"

"میرا من بھاتا موضوع — یعنی عورتیں میرا من بھاتا موضوع ہیں۔ ؟ اگر میرا من بھاتا موضوع ایک ہے تو عورتوں کے تین ہیں۔ ان کے بارے میں وہ اس وقت تک باتیں کرتی ہیں جب تک کہ سو نہیں جاتیں۔"

"وہ موضوع کیا ہیں ؟"

"شکوہ، شکایت، ملامت اور طعن و تشنیع !"

"خدا کی قسم پگاسف —" مادام لاسنکایا نے کہا۔ "تم عورتوں کے بارے میں اس قدر تلخ ہو تو تمہارے پاس ضرور اس کی کوئی ٹھوس وجہ موجود ہوگی۔ کسی عورت نے یقیناً تمہیں . . . . ."

"مجھے دکھ پہنچایا ہوگا۔ تم یہی کہنا چاہتی تھیں نا ؟"

مادام لاسنکایا ذرا گھبرا گئی۔ کیونکہ اس وقت وہ پگاسف کی اندوہناک شادی کے حالات گویا یاد کر رہی تھی۔ وہ صرف اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے عورت نے صرف ایک دفعہ سخت اذیت پہنچائی — اگرچہ وہ عورت بہت مہربان تھی۔"

"وہ کون تھی ؟"

"میری ماں —" پگاسف نے اسٹیج پر کی جانے والی سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تمہاری ماں — وہ بھلا تمہیں کیونکر اذیت پہنچا سکتی تھی ؟"

"مجھے جنم دے کر . . . . ."

مادام لاسنکایا کے ابروؤں پر بل پڑ گیا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اب ہماری گفتگو افسردگی کا رخ کر رہی ہے — کانستنتین تم تھال برگ کا نغمہ مجھے سناؤ۔ شاید موسیقی پگاسف کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دے — کیا آرفیس نے جنگلی درندوں کو موسیقی سے رام نہیں کر لیا تھا —"

چینڈسے لافسکی پیانو کے پاس جا بیٹھا اور اس نے نہایت اطمینان بخش طور پر وہ نغمہ بجایا۔ پہلے تو نتالیا غور سے سنتی رہی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بہت خوب !" مادام لاسنکایا بولی — "مجھے تھال برگ بہت پسند ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو پگاسف ؟"

"میں سوچ رہا ہوں —" پگاسف نے آہستگی کے ساتھ کہا — "کہ دنیا میں تین قسم کے انانیت پرست ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو خود بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی جینے دیتے ہیں دوسرے وہ جو خود تو زندہ رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کو جینے نہیں دیتے۔ اور تیسرے وہ جو خود بھی زندہ نہیں رہتے۔ اور دوسروں کو بھی جینے نہیں دیتے۔ عورتیں تیسرے زمرے میں آتی ہیں —"

"تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ پگاسف ایک بات جو مجھے پریشان کرتی ہے یہ ہے کہ تم اپنے فیصلہ کی قطعیت میں یقین رکھتے ہو۔ جیسے تم کبھی کوئی غلطی نہ کر سکتے ہو —"

"نہیں میں بھی غلطیاں کرتا ہوں۔ مرد بھی غلطی کر سکتا ہے مگر تم ہماری اور عورتوں کی غلطیوں میں شاید فرق کو نہیں جانتیں۔ نہیں تم اس فرق سے آگاہ نہیں ہو۔ اگر مرد مثال کے طور پر یہ کہتا ہے۔ کہ دو اور دو چار نہیں پانچ ہوتے ہیں۔ یا ساڑھے تین ہوتے ہیں تو عورت یہ ضرور کہے گی۔ کہ دو۔ اور دو ایک موم بتی ہو سکتے ہیں —"

"تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی۔ میری سنی ہوئی ہے۔ مگر کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں۔ کہ تمہارے تین قسم کے انانیت پسندوں کے نظریہ اور اس موسیقی کے درمیان ربط کیا ہے جو تم نے ابھی سنی ہے ؟"

"کوئی ربط نہیں۔ کیونکہ میں موسیقی سن ہی نہیں رہا تھا !"

"میرا خیال ہے کہ تم کبھی درست نہیں ہو سکتے —" مادام لاسنکایا نے گریبوئدوف کے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم موسیقی کو پسند نہیں کرتے۔ تو پھر تمہیں کیا چیز پسند ہے — کیا ادب — ؟"

"ہاں میں ادب کا شیدائی ہوں۔ مگر جدید ادب کا نہیں۔"

"کیوں ؟"

"اس کی ایک وجہ ہے — حال ہی کا ذکر ہے میں نے ایک شخص کے ساتھ کشتی میں اوکا دریا کو پار کیا۔ کشتی کنارے کے قریب جا کر رک گئی۔ اب ضرورت تھی کہ کشتی کو ہاتھ سے کنارے تک کھینچا جائے۔ میرا ہمنوا ذرا بھاری بھرکم شخص تھا۔ کشتی بان جبکہ پورا زور لگاتے ہوئے اپنی کمر توڑ رہے تھے۔ اور کشتی کو کنارے تک گھسیٹ رہے تھے۔ وہ بھاری بھرکم شخص کراہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ تقسیم محنت کے نظام کا یہ نیا اطلاق ہے۔ یہی بات جدید ادب پر منطبق کی جا سکتی ہے۔ دوسرے جبکہ کام کرتے ہیں۔ اور زور لگاتے ہیں۔ نیا ادب صرف کراہتا ہے —"

مادام لاسنکایا مسکرائی —"

"اور وہ اس کراہنے کو نئی زندگی کی عکاسی کہتے ہیں"[1] چرب زبان پنکاسف نے جو بات کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں تھا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا —"سماجی مسائل سے گہری دلچسپی اور اس قسم کی دوسری باتیں محض حسین الفاظ ہیں — !"

"مگر جن عورتوں پر تم حملہ کرتے ہو۔ وہ تو حسین الفاظ استعمال نہیں کرتیں —"

پنکاسف نے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ —"وہ انھیں اس لیے استعمال نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ انھیں استعمال کر ہی نہیں سکتیں —"

مادام لاسنکایا کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا —"پنکاسف تم بدتمیز ہوتے جا رہے ہو" — مادام نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

کمرے میں چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

"زالوتن تو خاکیاں ہے ؟" — ایک لڑکے نے اپنے استاد بیبی توف سے دفعتاً پوچھا۔

"پولتوا گوبرنیا میں میرے بچے — !" پنکاسف تیزی کے ساتھ بیچ میں بول پڑا —"کھاکھولوں کے ملک میں —" پنکاسف خوش تھا کہ اسے گفتگو کا رخ کسی دوسری طرف موڑنے کا موقع مل گیا تھا —"ادب کی بات ہو رہی تھی" — اس نے کہا۔ —"اگر میرے پاس فالتو روپیہ ہو تو میں فوراً ایک یوکرینی شاعر بن سکتا ہوں —"

"مگر میں تو ایسا کبھی نہیں کر سکتی — اور تم کیا خاک بنو گے!" مادام لاسنکایا نے کہا —"تمھیں کیا وہ زبان آتی ہے ؟"

"بالکل نہیں —" اور وہ زبان جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں —"

"ضرورت بھی نہیں ؟"

"قطعاً نہیں —" ایک کاغذ اٹھاؤ۔ اور اس کے ایک کونے پر لکھ دو — مرثیہ۔

اور اس مرثیہ کا یوں آغاز کرو۔ ہائے مقدر۔ ہائے مقدر ! یا پھر اس طرح — کاسک نیلو آنکھ ایک پہاڑی پر بیٹھا ہے . . . . . . یا (۲) انداز سے کچھ اور لکھ دو۔ نہایت اچھی نظم تسلیم کی جائے گی۔ یوکرینی اسے گھر گھر پڑھیں گے۔ اپنے ہاتھ پر اپنی ٹھوڑیاں رکھ کر — اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے —"

"خدا کے لئے —" بیبی توف نے کہا —"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ لغو اور بیہودہ — میں یوکرین میں رہا ہوں۔ مجھے یوکرین سے محبت ہے۔ میں ان کی زبان جانتا ہوں اور یوکرین کی زبان کے بارے میں تمھارا سارا علم سنی سنائی خرافات سے کم نہیں —"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے باوجود یوکرینی آنسو بہائے گا۔ اور تم زبان کی بات کر رہے ہو۔ کیا کیا یوکرینیوں کی بھی کوئی زبان ہے — ایک دفعہ میں نے ایک کھاکھول سے درخواست کی کہ وہ ایک روسی محاورہ کا ذرا ترجمہ کر دے جو اس وقت مجھے یاد آ گیا تھا۔ اس کا ترجمہ طوطے کا رٹا ہوا جملہ معلوم ہوتا تھا۔ اور تم اسے زبان کہو

---

[1] زار شاہی روس میں یوکرین کے رہنے والوں کو کھاکھول کہا جاتا تھا۔

تھا۔ کہ بیرن اس علاقہ میں چند روز قیام کریں گے ——"

"مسٹر رُودن ! " خادم نے مہمان کی آمد کا اعلان کیا

۳

۴۰ برس کی عمر کا ایک دراز قامت شخص جو ذرا جھک کر چلتا تھا۔ نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے زیتون کا سا رنگ تھا۔ سیدھے سادے خدوخال تھے۔ مگر بشرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کی تیز اور گہرے نیلے رنگ کی آنکھوں میں ایک نم آلود چمک تھی۔ اس کی ناک چوڑی اور سیدھی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں دلآویز خم تھا۔ اس کا لباس نیا نہیں تھا اور اس کے بدن پر بہت کس کے آیا تھا۔ جیسے وہ اپنے اسی لباس میں سن بلوغ کو پہنچا ہو اور پروان چڑھا ہو۔

وہ پھرتی کے ساتھ مادام لاسنکایا کی طرف بڑھا۔ اور اس نے تعظیماً جھک کر اطلاع دی کہ وہ ایک مدت سے اس تعارف کا خواہشمند تھا۔ اور اس کے دوست بیرن کو بے حد افسوس ہوا کہ وہ ذاتی طور پر الوداع کہنے کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔

رودن کی مہین آواز اس کے قد اور اس کے فراخ سینے کے مطابق نہیں تھی۔

"تشریف رکھئے —— میں واقعی آپ سے ملکر بہت خوش ہوئی ہوں ——" مادام لاسنکایا نے کہا اور پھر سب کے ساتھ اس کا تعارف کرانے کے بعد اس نے رُودن سے پوچھا۔ کہ وہ اس علاقہ کا رہنے والا ہے۔ کہ اس علاقہ میں ایک اجنبی ہے

"میری جاگیر گوبرنا میں ہے ——" رودن نے جواب دیا وہ اپنی ٹوپی اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھا —— "مجھے یہاں آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے ہیں۔

میں ایک خاص کام کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ اور آپ کے قصبے میں مقیم ہوں ——"

"کس کے یہاں ٹھہرے ہو ؟"

"ڈاکٹر کے یہاں۔ وہ یونیورسٹی کے وقت کا میرا دوست ہے"

"اوہ ڈاکٹر —— ڈاکٹر یہاں کافی مشہور ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے فن کا ماہر ہے —— کیا آپ بیرن کو ایک مدت سے جانتے ہیں ؟ ——"

"نہیں گذشتہ سردیوں میں ان سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور اب ایک ہفتہ یہاں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گذارا ہے ——"

"بیرن بہت دانشمند ہے ——"

"ہاں مادام ——!"

مادام لاسنکایا نے اپنے رومال سے عطر سونگھا اور سوال کیا —— "کیا آپ سول سروس میں ہیں ؟"

"کون —— ؟ میں ——"

"ہاں آپ ——"

"نہیں۔ میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہوں ——"

تھوڑی دیر تک توقف رہا۔ اس کے بعد پھر گفتگو کا آغاز ہوا ——

"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں ——" پگاسف نے رودن سے مخاطب ہو کر کہا —— "کہ بیرن نے جو مقالہ بھجوایا ہے۔ اس کے مندرجات سے آپ واقف ہیں ؟"

"ہاں ——"

پگاسف بولا —— "مادام آپ نے یہی کہا تھا نا کہ مقالہ میں ہمارے ملک کی صنعت کے ساتھ تجارت کے رشتہ پر بحث کی گئی ہے ——!"

"ہاں۔ یہی اس مقالہ کا موضوع ہے ——" مادام لاسنکایا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ کہ میں ایسے مقالوں پر اپنی رائے نہیں دے سکتا ——" پگاسف نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا —— "مگر میں اس بات کا اعتراف ضرور کروں گا۔ کہ مقالہ کا عنوان —— میں صاف طور پر کیوں نہ کہوں ذرا مبہم اور الجھا ہوا ہے ——"

"آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے —— ؟"

پگاسف نے طنز سے مسکراتے ہوئے اور مادام لاسنکایا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا —— "کیا آپ کو یہ عنوان صاف اور غیر مبہم معلوم ہوتا ہے ——"

پگاسف نے اپنا لومڑی کا سا چہرہ رودن کی طرف موڑ دیا ——"

"ہاں ——"

"خیر —— آپ بہتر جانتے ہیں ——!"

"کیا تمہارے سر میں درد ہے؟" مادام لپنانے میزبانہ سے پوچھا ——"

"نہیں ——"

"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں ——" پگاسف نے دوبارہ ناک میں بولتے ہوئے پوچھا ——" آپ کے واقف برن منل —— میرے خیال میں یہی ان کا نام ہے ——"

"بالکل ——"

"کیا برن منل سیاسی اقتصادیات کو اپنا مشغلہ تصور کرتے ہیں۔ یا لمحات فرصت گذارنے کے لئے اس پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ سماجی لذتوں اور سرکاری فرائض سے فراغت پاتے ہیں۔ رودن نے پگاسف کا جائزہ لیا

"برن اس موضوع کے شائق ہیں ——" رودن نے ذرا سا سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا —— "لیکن ان کے مقالے میں بہت سی باتیں جائز اور تعمیری ہیں ——"

"جب تک میں وہ مقالہ پڑھ نہ لوں۔ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ مگر یہ پوچھنے کی جرأت ضرور کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کے دوست کا یہ مقالہ عام نقطۂ ہائے نظر تک محدود ہے۔ یا اس میں کچھ حقائق بھی ہیں ——"

"حقائق بھی ہیں اور حقائق پر مبنی نقطہ ہائے نظر بھی ہیں ——"

"بالکل —— میں آپ سے یہ کہوں گا۔ کہ میرے خیال میں۔ اور میں اپنے اس خیال کو کبھی کبھی ظاہر بھی کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تین سال تک ڈیوبپاٹ میں رہا ہوں۔

یہ تمام نام نہاد نظریے، مفروضے اور نظام وغیرہ وغیرہ مجھے بہانات کرتا۔ کیونکہ میں ایک دیہاتی ہوں۔ سب کے سب بالکل بیکار ہیں۔ لوگوں کو احمق بنانے کے لئے فلسفہ چھانٹا جاتا ہے۔ ہمیں تو صاف اور سیدھے حقائق کی ضرورت ہے اور بس!"

"واقعی —— رودن نے طنز کی —— کیا حقائق کی اہمیت بیان نہیں کی جانی چاہیئے۔

"عام مفروضے ——" پگاسف نے سلسلۂ کلام جاری رکھا —— "یہ مفروضے، یہ استفسار اور یہ نتائج میرے لئے تو جان لیوا ہیں۔ ان سب کی بنیاد نام نہاد یقینِ کامل پر ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنے عقائد کی بات کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ ان کا احترام کیا جائے۔ اور ان کے بارے میں وہ جھگڑتا ہے۔ . . . ."

پگاسف نے اپنا مکّہ ہوا میں لہرایا۔ پینڈسے لانسکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھی بات ہے ——" رودن بولا —— "آپ کو اس بات پر اصرار ہے کہ عقائد یا یقین نام کی کوئی چیز نہیں ——؟"

"ہاں ایسی کوئی چیز نہیں؟"

"کیا یہ آپ کا یقین یا عقیدہ ہے؟"

"ہاں ——"

"تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسی کوئی چیز نہیں؟ آپ نے تو ابتدا ہی ایک یقین سے کی ہے ——"

کمرے میں موجود ہر شخص مسکرایا۔ سب کی نگاہیں آپس میں ملیں ——

"ذرا ٹھہرو ——" پگاسف نے بات شروع کی لیکن مادام لاسنکایا نے تالی بجائی اور کہا ——" شاباش۔ شاباش پگاسف کو شکست ہو چکی ہے ——" اور مادام لاسنکایا نے رودن کی ٹوپی بڑی آہستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"اتنی جلدی خوش کیوں ہوتی ہو ——" پگاسف نے تلخی کے ساتھ کہا۔ محض بزرگانہ انداز میں کوئی دانشمندانہ بات کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔ اسے ثابت کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں تو ہم اپنے موضوعِ بحث سے بھٹک گئے ہیں ——"

"معاملہ نہایت صاف ہے —— رودن نے کہا۔ آپ عام مفروضوں اور عقائد کی افادیت میں یقین نہیں رکھتے ——

"بالکل نہیں۔ میں کسی بات پر یقین نہیں رکھتا ——"

"اچھی بات ہے —— آپ کوئی عقیدہ نہیں رکھتے ——"

"مجھے ان الفاظ کے استعمال کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ دوسری بات یہ ہے ——"

"کوئی بات کر رہا ہو تو اس میں دخل اندازی نہیں ہونی چاہئے ——" مادام لاسنکایا نے مشورہ دیا۔

"اسے گردن سے پکڑ لو —— کتنا اچھا کتا ہے ——" پینڈ لانسکی نے اپنے آپ سے کہا اور فرطِ مسرت سے مسکرایا۔

"میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہ معنی رکھتے ہیں اور آپ انھیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں انھیں کیوں نہ استعمال کروں آپ کسی بات پر یقین نہیں رکھتے۔ پھر آپ حقائق پر کیوں یقین رکھتے ہیں ——؟"

"کیوں ——؟ یہ بھی کیا سوال ہے؟ ہم سب حقائق پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ حقائق کیا ہوتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں اپنے تجربہ سے اپنے ادراک سے فیصلہ کرتا ہوں ——"

"لیکن آپ کا ادراک آپ کو دھوکا بھی تو دے سکتا ہے؟ کیا آپ کا ادراک آپ کو یہ بتاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے؟ شاید آپ کوپرنیکس سے بھی اتفاق نہیں رکھتے! کیا آپ کو اس پر بھی اعتبار نہیں؟"

ایک دفعہ پھر سب کے لبوں پر تبسم پیدا ہوا۔ اور سب کی نگاہیں رودن پر جم گئیں۔

"یہ شخص کوئی مفکر معلوم ہوتا ہے ——" ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ خیر کیجئے ——" پکاسف بولا۔ "آپ کا مذاق کس قدر فطری ہے۔ لیکن اس کا اصل نقطۂ بحث سے کوئی تعلق نہیں ——"

"یہ جو بات میں نے کہی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ بالکل طبع زاد یا فطری نہیں ہے ——"

رودن نے طنز کی —— "اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے اور اسے ایک ہزار مرتبہ دہرایا جا چکا ہے۔ ہاں اصل نقطہ بحث یہ نہیں ہے ——"

"تو پھر وہ کیا ہے؟" پکاسف نے تحقیر انگیز لہجہ میں پوچھا۔ پکاسف عام طور پر حقارت آمیز لہجہ میں بحث کی ابتدا کیا کرتا تھا۔ پھر گستاخ ہو جاتا تھا۔ اور بحث کے آخر میں پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بالکل خاموش ہو جاتا تھا۔

"وہ یہ ہے کہ ——" رودن بولا —— "میں اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے واقعی افسوس ہوتا ہے۔ جب میں کسی دانشمند شخص کو حملہ کرتے ہوئے سنتا ہوں ——"

"نظاموں پر ——"

"اگر آپ چاہیں تو اپنے حملہ میں نظام بھی شامل کر سکتے ہیں۔ نظام کے لفظ پر آپ کو نفرت کیوں ہے؟ ہر نظام بنیادی اصولوں یعنی زندگی کے بنیادی اصولوں کے علم پر مبنی ہوتا ہے"

"مگر یقیناً انھیں سمجھا یا دریافت نہیں کیا جا سکتا!"

"مجھے معاف کیجئے —— ہر شخص کی ان تک رسائی نہیں ہوتی ...... انسان غلطی بھی کرتا ہے۔ مگر آپ یقیناً مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے۔ کہ نیوٹن نے ان بعض اصولوں کو دریافت کر لیا تھا۔ وہ واقعی ایک ذہین اور دانشمند شخص تھا۔ مگر دانشوروں کی دریافتوں تک اب ہر آدمی کی رسائی ہے —— ہر انفرادی مظہر قدرت میں بنیادی اصولوں کو دریافت کرنا انسانی ذہن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ اور ہم اپنے مکمل علم کے ساتھ......"

"اچھا تو آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے ——!" پکاسف نے ہر لفظ کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے دخل اندازی کی —— "میں ایک باعمل شخص ہوں۔ اور میں ان تمام مابعد الطبیعاتی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہتا ——"

"بہت اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ مگر یہ بات جان لیجئے کہ ایک باعمل شخص بننے کی تمہاری خواہش بھی ایک نظام ہے۔ ایک تنظیم ہے۔ اور ایک نظریہ ہے ——"

"آپ تنظیم کی بات کر رہے تھے ——" پکاسف نے پھر بات کاٹی —— "تنظیم کیا اچھی چیز ہے ——! آپ جس تنظیم کی ڈینگ مار رہے ہیں۔ وہ لوگوں کا کیا بھلا کر رہی ہے ——"

میں آپ کی اس تعلیم کی قطعہ بھر قدر نہیں کرتا ۔۔۔ "

" افریقین پکاسف بحث کرنے کا یہ انداز نہیں ہوتا ۔ ! "
زربانہ نے اپنی رائے دی ۔ اور وہ جی ہی جی میں اپنے نئے مہمان کی سکون مزاجی پر خوش ہو رہی تھی ۔ وہ رودن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ کہہ رہی تھی ۔۔۔ " یہ شخص کسقدر بُردبار اور متحمل مزاج ہے ۔ ! مجھے اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرنا چاہیئے ۔۔۔ " یہ آخری الفاظ اس نے اپنے ذہن میں روسی زبان میں ادا کیئے ۔

" میں تعلیم کی حمایت میں کچھ نہیں کہوں گا ۔۔۔ " رودن نے توقف کے بعد کہا ۔۔۔ " اور تعلیم کو میری امداد یا حمایت کی ضرورت بھی نہیں ۔۔۔ آپ تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں ۔ یہ آپ کی اپنی پسند ہے ۔ تعلیم پر بحث ہمیں اصل موضوع سے دور لے جائے گی ۔ تاہم مجھے اجازت دیجئے ۔ کہ میں آپ کو ایک پرانی کہاوت یاد دلاؤں ! " اے موزر تو دیوتا تو ناراض ہے ۔ اس لئے تو ہی قصور وار ہے ۔۔۔ ! " میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لٹاموں معام مفروضوں وغیرہ پہ حمد اس لحاظ سے اور بھی قابلِ مذمت ہے ۔ کہ لا زماً لوگوں کے ساتھ ساتھ لوگ علم ، سائنس اور ان میں اعتقاد کی بھی تردید کرتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر خود اپنے آپ میں اعتقاد اور اپنی صلاحیتوں کی بھی تردید کرتے ہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانوں کو اس اعتقاد کی ضرورت ہے ۔ وہ صرف اپنے محسوسات اور ادراک پر زندہ نہیں رہ سکتے ۔ کسی خیال پر نادم ہونا اور اس کا یقین نہ کرنا غلط ہے بے اعتقادی کو ہمیشہ بے اثری اور نامرادی کا نام دیا گیا ہے ۔۔۔ "

" یہ محض الفاظ ہیں ۔۔۔ " پکاسف بڑبڑایا ۔

" ممکن ہے کہ یہ محض الفاظ ہوں ۔ مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے ۔ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ۔۔۔ " یہ محض الفاظ ہیں ۔۔۔ " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اکثر الفاظ سے زیادہ کوئی واضح بات کہنے کی ضرورت کو نظر انداز کرتے ہیں ۔۔۔ "

" کیا کہا ؟ " پکاسف نے اپنی آنکھیں میچتے ہوئے پوچھا

" جو کچھ میں نے کہا ہے ۔ وہ آپ سمجھ تو گئے ہیں ۔۔۔ "

رودن نے جان بوجھ کر طنز کی مگر فوراً ہی اپنی بے صبری پر قابو پاتے ہوئے کہا ۔۔۔ " میں اپنی بات دہراتا ہوں ۔ اگر کوئی شخص ایک ٹھوس اصول نہیں رکھتا جس پر اسے یقین ہو ۔ اور اس کے قدموں تلے کوئی پائدار بنیاد نہیں ۔ تو وہ اپنی قوم کی ضروریات کردار اور مستقبل کے بارے میں اپنے ذہن کی کھڑکیاں کیونکر کھول سکتا ہے ۔ وہ کیسے جان سکتا ہے ۔ کہ اسے کیا کرنا ہے ۔ اور اگر ۔۔۔۔

۔ میں تمہارے لئے میدان چھوڑ رہا ہوں ۔۔۔ " پکاسف نے دفعتاً یہ کہا اور سر جھکا کر کسی کی طرف دیکھے بغیر ایک کونے میں چلا گیا ۔

رودن نے اس کی طرف نگاہ کی اور نہایت آہستگی کے ساتھ مسکرایا ۔ اور اس نے کچھ نہ کہا ۔

" آہا ۔۔۔ پکاسف دم دبا کر بھاگ گیا ۔۔۔ " مادام لاسنکایا نے کہا ۔۔۔ " کوئی بات نہیں ۔۔۔۔۔ مجھے معاف کرنا ۔۔۔ " اس نے مسکرا کر رودن کی طرف دیکھا اور پوچھا ۔۔۔ " آپ کا آبائی نام کیا ہے ۔۔۔ ؟ "

" نکولے وچ ۔۔۔ "

" کوئی بات نہیں پیارے دمتری نکولے وچ ۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس نے متاثر نہیں کیا ۔ وہ اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ بحث نہیں کرنا چاہتا ۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ تم سے بحث نہیں کر سکتا ۔۔۔ ذرا اور قریب آجاؤ ۔ آؤ ہم باتیں کریں ۔ ! "

رودن نے اپنی آرام کرسی ذرا آگے کھسکا لی ۔

" یہ کیا بات ہے کہ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ۔۔۔ " مادام لاسنکایا بولی ۔۔۔ " مجھے تو حیرت ہوتی ہے ۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے ؟ "

یہ کہکر مادام لاسنکایا نے رودن کو وہ کتاب پکڑا دی جو وہ خود پڑھ رہی تھی ۔

رودن نے وہ کتاب لے لی اور اس کے چند ورق الٹے اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اعلان کیا ۔ کہ اس نے موسیو ڈوٹو کے ویلے کی یہ کتاب نہیں پڑھی ۔ مگر اس کتاب کا مصنف جس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرتا ہے اس پر اکثر غور کیا ہے ۔ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز ہوا ۔ رودن پہلے تو جھجکتا رہا ۔ الفاظ تلاش کرتا رہا ۔ مگر اس کے بعد اس نے اس موضوع پر گرم جوشی کے ساتھ بحث شروع کر دی ۔ پندرہ منٹ کے بعد کمرے میں

صرف اسی کی آواز سنائی دے رہی تھی محفل اسکے گرد جمع ہو گئی تھی جس پکاسعت ہی انگیٹھی کے قریب ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

رُودن نہایت ہوشیاری، روانی اور دانشمندی سے ساتھ بات کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ علم کے دریا بہا دیتا تھا۔ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس محفل میں کسی شخص کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا حیرت انگیز شخص ہے۔ کیونکہ اس کا لباس دلآویز نہیں تھا۔ اور اس کے آنے سے پہلے کوئی افواہ نہیں پھیلی تھی ایک ایسے ہوشیار شخص کی اچانک آمد پر اور وہ بھی اس دیہی علاقہ میں ہر شخص حیران تھا اور اسے یہ بات ناقابلِ فہم معلوم ہو رہی تھی لہٰذا وہ سب حیران تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ خاص طور پر مادام لاسنکایا ـــــ وہ اس بات پر خوش تھی کہ یہ شخص اس کی اپنی دریافت ہے۔ اور وہ اس کو سماج کے بہترین حلقہ میں متعارف کرانے کی تجویزیں تیار کر رہی تھی۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود مادام لاسنکایا بچوں کی طرح اپنے پہلے تاثرات سے بہت مرعوب ہو تی تھی۔ مادام لیناکی سمجھ میں اگرچہ وہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ جو رودن کہہ رہا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بھی خوش تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا بھائی ولنتیف بھی دل ہی دل میں رُودن کی تعریف کر رہا تھا۔ پینڈے لافسکی مادام لاسنکایا کی طرف حسد کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ پینڈے لافسکی سوچ رہا تھا ـــــ "

میں پانچ سو روبل کی خاطر اس سے زیادہ اچھی فاختہ ڈھونڈ سکتا ہوں ـــــ "

بیسے توف اور نتالیا رودن سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ بیسے توف تو اپنا سانس روک کر بیٹھا تھا۔ کبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا اور کبھی ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اور رودن کی بات گہری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور آج تک اس گہری توجہ کے ساتھ اس نے کسی کی بات نہیں سنی تھی۔ نتالیا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں رودن پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں بار بار جھک اٹھتی تھیں۔

" اس آدمی کی آنکھیں کتنی حسین ہیں! " ولنتیف نے نتالیا سے سرگوشی کی ـــــ "

" ہاں ـــــ "

" افسوس کی بات ہے۔ کہ اس کے ہاتھ بڑے ہیں۔ اور سرخ ہیں ـــــ "

نتالیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

چائے پیش کی گئی۔ اب گفتگو عام باتوں پر ہونے لگی۔ لیکن جب رودن بات کرنے کے لئے ہونٹ کھولتا تھا۔ تو اس وقت اچانک ہو خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا۔ کہ اس نے ان پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔

مادام لاسنکایا کو یک بیک یہ خیال سوجھا کہ پکاسعت کو چھیڑا جائے۔ اس کے قریب جا کر وہ دبی زبان میں بولی تم کیا ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ اس سے پھر بولو ـــــ "

پکاسعت نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ رودن کی طرف بڑھی اور اپنی انگلی سے پکاسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ـــــ

" ایک اور بات کا شاید تمہیں علم نہیں۔ پکاسعت عورتوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور ان پر حملہ کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں ہو سکے تو اس کی یہ عادت ذرا درست کر دو ـــــ "

رُودن نے پکاسعت کی طرف دیکھا۔ رودن قامت میں پکاسعت سے کہیں بلند تھا۔ پکاسعت نے اس کی طرف ملامت آمیز انداز میں دیکھا۔ اور اس کا جھلایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا ـــــ "

" مادام دراصل لاسنکایا غلطی پر ہیں۔ میں صرف عورتوں پر ہی حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ عام طور پر پوری انسانیت کا دشمن ہوں ـــــ "

" وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں انسانوں کے بارے میں اتنی گھٹیا رائے رکھنے پر مجبور کیا ہے؟ " رودن نے اس سے پوچھا ـــــ "

پکاسعت نے اس کی نظر سے نظر ملاتے ہوئے کہا ـــــ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے دل کا اپنا مطالبہ ہو۔ اور یہ دل کا مطالبہ مجھے روز بروز بے بضاعت باتوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے میں دوسروں کے بارے میں اپنے دل کے ذریعہ رائے قائم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات غیر منصفانہ ہو اور میں خود دوسروں سے زیادہ گھٹیا انسان ہوں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ یہ میری عادت ہے ـــــ "

"میں سمجھتا ہوں اور تم سے پوری ہمدردی رکھتا ہوں ۔۔۔"
ان نے جواب دیا ۔۔۔ "ہر نیک آدمی نے اپنی تذلیل خود کی ہے ۔لیکن اس غیر محکم صورت حال میں ہمیشہ کیلئے رہنے سے تو کام نہیں چلتا ۔۔۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ کہ آپ نے مجھے ایک نیک انسان کہا ہے ۔۔۔"

پگاسف نے طنز کی ۔۔۔ "لیکن میں جس حال میں ہوں ۔ مطمئن ہوں ۔ چاہے یہ صورت حال نا محکم ہے ۔ مجھے اس کی کیا پرواہ ہے ۔ میں اس صورت حال کو بدلنے کیلئے تیار نہیں ۔۔۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا ۔ ذرا مجھے معاف کرنا ۔ کہ زندہ رہنے اور صداقت کی روشنی میں زندہ رہنے کی خواہش پر آپ اپنے آپ سے محبت کو ترجیح دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بالکل ۔۔۔" پگاسف بولا ۔۔۔ "اپنے آپ سے محبت تو ایک بات ہوئی ۔ میرا خیال ہے آپ کیا ہم سبھی اسکو سمجھتے ہیں رجہاں تک صداقت کا تعلق ہے ۔ صداقت کس چڑیا کا نام ہے یہ صداقت کہاں ہے ؟"

"میں تمھیں خبردار کردوں کہ تم اب باتیں دہرانے لگے ہو ۔۔۔" میزبان نے اپنے خیال کا اظہار کیا ۔

پگاسف نے اپنے کندھے ذرا بلند کئے اور کہا ۔۔۔ "اگر میں اپنی بات دہرا رہا ہوں ۔ تو پھر کیا ہوا ۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ صداقت ہے کہاں ؟ خود فلسفی یہ نہیں جانتے کہ صداقت کیا ہے ۔ کانٹ کہتا ہے کہ صداقت یہ ہے مگر ہیگل کہتا ہے صداقت یہ نہیں ہے ۔ بلکہ صداقت یہ ہے ۔۔۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہیگل صداقت کے بارے میں کیا کہتا ہے ؟"

رودن نے اس سے پوچھا ۔

"میں پھر یہ بات دہرا رہا ہوں ۔۔۔" پگاسف نے تیزی سے جواب دیا ۔۔۔ "کہ میں صداقت کو سمجھنے سے قاصر ہوں ۔۔۔ میرے خیال میں تو صداقت کا کوئی وجود نہیں ۔ میرا مطلب ہے کہ صداقت نام کے لفظ کا تو وجود ہے ۔ مگر خود صداقت کا کوئی وجود نہیں ہے ۔۔۔"

"شرم کرو ۔۔۔" مادام لاسنکا یا چلائی ۔۔۔ "تم بڑا سنے پاپی ہوتے ہوئے یہ بات کیونکر کہہ سکتے ہو کہ صداقت کوئی چیز نہیں ۔ اگر ایسی بات ہوتی تو انسان کے لئے جینے کی خاطر کیا رہ جاتا ۔۔۔ ؟"

"مادام میں واقعی یہ سوچتا ہوں ۔ کہ آپ صداقت کے بغیر تو گزارہ کر سکتی ہیں ۔ مگر اپنے باورچی ایسٹن کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتیں ۔ جو نہایت اچھا شوربہ تیار کرتا ہے ۔ آپ صداقت سے کونسا اچھا کام لے سکتے ہیں ۔ ؟ آپ صداقت سے اپنی ٹوپی کا پھندنا نہیں بنا سکتے ۔ !"

"مذاق دلیل نہیں ہوا کرتا ۔۔۔" مادام لاسنکایا بولی ۔۔۔ "خاص طور پر جب اس سے اتہام کی بو آرہی ہو ۔۔۔"

"میں تمہاری فلسفیانہ صداقت کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا مگر گھریلو صداقت کے بارے میں ضرور جانتا ہوں ۔ جسے نگلنا ذرا دشوار ہوتا ہے ۔۔۔" پگاسف نے اتنا کہا ۔ اور ناراض ہو کر دوبارہ اپنے کونے کی طرف چلا گیا ۔

رودن نے غرور کی بات چھیڑ دی ۔ اور اس نے اسی موضوع پر نہایت اچھی باتیں کہیں ۔ اس نے یہ دلیل پیش کی ۔ کہ غرور کے بغیر آدمی کچھ بھی نہیں ۔ اور غرور تو ارشمیدس کے لیور کی طرح ہے ۔ جو زمین کو اس کے محور سے اوپر اٹھا سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انسان کا لقب پانے کا اہل وہی شخص ہے ۔ جو اپنے غرور پر قابو پائے ۔ جیسے ایک گھوڑ سوار اپنے گھوڑے پر قابو پاتا ہے اور عام انسانوں کی بھلائی کیلئے خود کو قربان کر دیتا ہے ۔

آخر میں اس نے کہا کہ ۔۔۔ "جھوٹا غرور خودکشی کے مترادف ہے ۔ اس غرور کا شکار شخص ایک بانجھ درخت کی طرح سوکھتا ہے ۔ اور وہ غرور جو اکملیت یا کمال حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے ۔ تمام عظمتوں کا سرچشمہ ہے ۔ ہاں ایک انسان کو اپنی انانیت کی خود غرضی کو دبانا چاہیئے اور اسے صحیح راستہ پر ڈالنا چاہیئے"

"کیا آپ مجھے ایک لمحہ کیلئے پنسل عنایت کر سکتے ہیں ۔۔۔"

پگاسف نے بیسے نوف کی طرف مڑتے ہوئے کہا ۔

بیسے نوف کی سمجھ میں نہ آیا ۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے ۔۔۔ "آپ کو پنسل کس لئے چاہیئے ؟" اس نے آخرکار پوچھا ۔۔۔

"میں 'میور رودن کا آخری جملہ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں نے یہ جملہ نہ لکھا تو بھول جاؤں گا۔ تمہیں مان لینا چاہیئے کہ یہ آخری جملہ "بعد" ، کے کھیل میں گرینڈ سلیم جتنا شاندار ہے۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ یونیورسٹی کا سعت جن کا مذاق اڑانا انتہائی خطرناک ہوتا ہے ———" جیسے توت نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ کہا۔ اور پکاسعت کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

اس اثنا میں رودن نتالیا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نتالیا کے چہرے سے بے کلی کا اظہار ہو رہا تھا ملانتیف جو اس کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا ——

"یہاں مجھے پیانو دکھائی دے رہا ہے ——" رودن نے ایک شہزادہ کی طرح بات کا آغاز کیا —— "کیا آپ پیانو بجا لیتی ہیں —— ؟"

"ہاں ——" نتالیا نے ہکلاتے ہوئے کہا —— "مگر مجھے اس میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ موسیو رپینڈے لافسکی مجھ سے زیادہ اچھا پیانو بجاتے ہیں ——"

پینڈے لافسکی نے اپنا منہ آگے بڑھایا۔ وہ مسکرا رہا تھا "نتالیا الیکزینڈرونا تمہیں یہ بات نہیں کہنا چاہیئے۔ تم اتنا ہی اچھا پیانو بجاتی ہو۔ جتنا کہ میں ——"

"کیا آپ شوبرٹ کا نغمہ" ارل کوننگ " بجا لیتے ہیں !"

"ہاں ——" میزبانہ نے جواب دیا —— "کانستنتین ذرا پیانو کے قریب جا بیٹھو۔"

"کیا دمتری نکولے وچ آپ کو موسیقی پسند ہے ؟ ——"

رودن نے اس بات کے جواب میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اور بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ جیسے وہ پیانو بجانے کے لیئے خود کو آمادہ کر رہا ہو۔ پینڈے لافسکی نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔

نتالیا رودن کی طرف منہ کر کے پیانو کے قریب کھڑی تھی جونہی پیانو سے پہلے سر بلند ہوئے۔ رودن کا چہرہ بجھا حسین ہو گیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں کمرے میں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ اور کبھی کبھی نتالیا کے چہرے پر آ کر ٹھہر جاتیں۔

پینڈے لافسکی نے وہ نغمہ ختم کیا۔ رودن کسی قسم کی رائے کا اظہار کیئے بغیر کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک خوشبو دار مہ باغ کو اپنی لپیٹ میں لیئے ہوئے تھا۔ پاس کے درخت تھوڑی سی تازگی چھوڑ رہے تھے۔ اور آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ گرمیوں کی رات ٹھنڈی تھی۔ اور ہر لمحہ زیادہ ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ رودن نے تاریک باغ میں جھانکا اور پھر مڑ کر اس نے کہا۔

—— "موسیقی اور یہ رات مجھے جرمنی میں اپنے طالب علمی کے ایام کی یاد دلا رہی ہے ——" ہمارے وہ جلسے ......"

"کیا تم جرمنی میں بھی رہے ہو ؟" میزبانہ نے سوال کیا۔

"میں ایک سال تک ہیڈل برگ میں رہا ہوں اور سال کے لگ بھگ برلن میں ——"

"کیا ان دنوں تم طالب علموں کا سا لباس پہنا کرتے تھے ؟ میں نے سنا ہے کہ وہاں طالب علم عجیب و غریب لباس پہنتے ہیں :"

"میں ہیڈل برگ میں رسالے کے فوجیوں کی طرح گھٹنوں تک آنے والے بوٹ اور جھالر دار کوٹ پہنتا تھا۔ اور میرے بال میرے شانوں پر گرتے تھے۔ برلن میں طالب علم عام لوگوں کا لباس پہنتے ہیں ——"

"اپنی طالب علمی کی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی حکایت سناؤ ——" مادام لیپا نے درخواست کی ——

پہلے پہل تو رودن کی داستان بہت بے کیف تھی۔ اس میں نہ تو رنگ تھا اور نہ ہی مزاح تھا۔ تاہم وہ جلد ہی اپنے تجربوں کا ذکر ختم کرنے کے بعد سائنس، تعلیم اور یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کی زندگی پر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بیباکی کے ساتھ ان سب کی ایک واضح تصویر کھینچی۔ سامعین اس کی ایک ایک بات پر عش عش کر اٹھے۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ دل کو موہ لینے والے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ تھوڑے سے ابہام سے بھی کام لے رہا تھا۔ اور اس سے اس کے الفاظ میں مزید دلکشی پیدا ہو رہی تھی۔

خیالات کے بہاؤ نے رودن کو وضاحت اور صفائی کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے سے روکا۔ وہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر کھینچتا۔ ایک تشبیہ کے بعد دوسری تشبیہ دیتا۔ اور وہ تشبیہ نہایت موزوں ہوتی۔ اس کی گفتگو میں ایک تجربہ کار

قرر کا سا انداز نہیں تھا۔ اس کی ہر بات میں ایک سچا جوش و خروش تھا۔ وہ الفاظ کے لئے اپنے ذہن پر زور بھی نہیں دیتا تھا۔ الفاظ اس کا حکم مانتے ہوئے خود بخود اس کے لبوں پر آتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ اس کے دل سے ابھر رہا ہے۔ اور ہر لفظ اس کے یقین سے دہک رہا ہے۔

رودن خطابت کی موسیقی کا جو سب سے بڑا اسرار ہے ماہر تھا۔ جب وہ دل کے ایک تار پر انگلی رکھ دیتا تھا۔ تو دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھتے تھے۔ سامعین میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ان کے سینے میں زیر و بم پیدا تھا۔ اور ایک بے نام تابناکی ان کی نگاہوں کے سامنے پیدا تھی۔

رودن کے تمام خیالات ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ مستقبل کی جھلک ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خیالات جوان اور پر شباب معلوم ہوتے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر بات کر رہا تھا وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان عورتوں کی توجہ کی عام ہمدردی اور توجہ اور رات کے حسن کی وجہ سے وہ اپنے ہی جذبات میں بہا جا رہا تھا۔ اور اس کی خطابت شاعری کی سرحدیں چھو رہی تھی۔۔۔ اس کی نرم اور پر خلوص آواز کی صورت اس کے الفاظ کو ایک نئی دلکشی عطا کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی عظیم قوت جس سے وہ خود بھی آشنا نہیں تھا۔ اس کے لبوں کے ذریعہ بات کر رہی ہے۔ رودن وہ باتیں کہہ رہا تھا۔ جو مختصر انسانی زندگی کو ابدی قدر عطا کرتی ہیں۔

"مجھے سکینڈے نیویا کی ایک حکایت یاد آرہی ہے" اس نے آخر میں کہا۔۔۔ "

ایک بادشاہ آگ کے گرد ایک تاریک کھلیان میں اپنے جنگجو سپاہیوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ دفعتاً ایک ننھا سا پرندہ ایک دروازے سے اڑ کر دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ یہ پرندہ ایک لمحہ روشنی اور گرمی میں گزار کر تاریکی سے باہر آیا اور تاریکی میں غائب ہوگیا۔ سب سے بوڑھے جنگجو سپاہی نے کہا۔۔۔ "اے شہنشاہ یہ پرندہ تاریکی میں فنا نہیں ہوگا۔ وہ اپنا گھونسلہ ڈھونڈ لے گا۔۔۔"

"یہ سچ ہے کہ ہماری زندگی مختصر سی ہے۔ بے بضاعت بھی ہے۔ لیکن ہر عظیم کارنامہ انسان ہی انجام دیتا ہے۔ انسان کا یہ ادراک کہ وہ بلند و ارفع قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ اس کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ موت میں بھی انسان اپنی زندگی کو ڈھونڈے گا۔ اپنا آشیانہ تلاش کرے گا۔۔۔"

رودن نے ایک لمحہ کیلئے توقف کیا اور غیر ارادی طور پر گھبراہٹ کے عالم میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"نہایت عمدہ۔۔۔ تم تو بہت بڑے شاعر ہو" مادام لاسکایا کے منہ سے نکلا۔

دل ہی دل میں میں نے مادام لاسکایا کی رائے سے اتفاق کیا۔ مگر پگاسف اس بات سے متفق نہیں تھا۔ اس نے رودن کی طویل تقریر کو آخر تک سننے کا انتظار کئے بغیر اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اور جاتے ہوئے اس نے پینڈے لافسکی کے کان میں جو دروازے کے قریب کھڑا تھا یہ کہا۔۔۔ "اس سے تو کہیں اچھا ہے۔ کہ میں احمقوں کی مجلس میں جا بیٹھوں۔۔۔"

کسی نے بھی پگاسف کو روکنے کی کوشش نہ کی اور کوئی بھی اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کر سکا۔

خادم رات کا کھانا لے کر اندر آ گئے۔ اور آدھ گھنٹے کے بعد ہر کوئی اپنی گاڑی میں یا پیدل روانہ ہو گیا۔ میزبان نے رودن سے اصرار کیا کہ وہ رات اس کے یہاں بسر کرے۔ اپنے بھائی کے ساتھ گھر لوٹتے ہوئے مادام لیپنا نے بار بار رودن کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف کی اور اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ ولانتیف بھی اس کا ہم خیال تھا۔ اور اس نے صرف اسی قدر کہا کہ رودن بعض اوقات مبہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور اس کی آنکھیں، جو گاڑی کے ایک کونے میں جھانک رہی تھیں اور بھی افسردہ ہو گئیں۔

پینڈے لافسکی نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے اپنے گھٹنوں پر سے ریشمی تسمے اتارتے ہوئے کہا۔۔۔ "فوراً قبول عام حاصل کر لینے والا شخص ہے۔۔۔!" اور پھر اس نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر نکل جائے۔ اچانک اس کا چہرہ بہت سنجیدہ ہو

گیا۔ تورت تمام رات سو نہ سکا۔ وہ اپنا لباس تبدیل کئے بغیر پلنگ پہ پڑا رہا۔ اور ماسکو میں اپنے ایک دوست کے نام خط لکھتا رہا۔ نتالیا اگرچہ لباس تبدیل کر کے بستر پر جا چکی تھی۔ مگر نیند اسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی رہی۔ اس کا ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا۔ اور وہ تاریکی میں گھور رہی تھی۔ اس کی رگوں میں اس کا لہو تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اور اس کے سینے سے سرد آہیں ابھر رہی تھیں۔

(۴)

دوسرے دن صبح کو رودن اپنا لباس تبدیل ہی کر رہا تھا کہ جب ایک خادم اس کے پاس مادام لاسنکایا کی یہ دعوت لے کر آیا کہ وہ چائے اس کے ساتھ اس کے ذاتی کمرے میں پئے۔ رودن نے مادام لاسنکایا کو تنہا پایا۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملی۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو اسے نیند تو اچھی آئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی پیالی میں چائے انڈیلی اور اس سے دریافت کیا۔ کہ چائے میں شکر کافی ہے کہ نہیں۔ اسے سگریٹ پیش کی۔ اور دو مرتبہ اپنے اس تعجب کا اظہار کیا۔ کہ وہ اس سے پہلے کیوں نہ مل سکی۔ رودن پہلے تو اس سے دور بیٹھا رہا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے جلد ہی اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر تھوڑا سا اس کی طرف جھک بھی گئی۔ اور اس سے اس کے رشتہ داروں، اس کے آئندہ تجاویز اور ارادوں کے بارے میں دریافت کرتی رہی۔ مادام لاسنکایا خود تو کبھی کبھار بات کرتی۔ لیکن اس کی باتیں بڑے غور کے ساتھ سنتی۔ رودن پر یہ بات نہایت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی۔ کہ وہ خوشامد کی حد تک اس سے شائستگی کے ساتھ پیش آ رہی ہے۔ اس نے صبح کی ملاقات کا یونہی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اس نے لباس تو نہایت سادہ پہنا تھا۔ مگر بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ بہرکیف اس نے جلد ہی اس سے سوالات پوچھنے بند کر دیئے۔ اب وہ اپنی باتیں کرنے لگی۔ اپنی جوانی کی، اپنے رشتہ داروں کی اور ان لوگوں کی جنہیں وہ جانتی تھی۔ رودن نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کی تمام باتیں سنیں۔ مادام لاسنکایا جس شخص کے بارے میں بھی بات کرتی۔ اسے تو وہ پس پشت

ڈال دیتی۔ اور خود اپنے کو زیادہ ابھار دیتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ جس شخص کے بارے میں وہ بات کر رہی ہوتی۔ وہ تو بالکل غائب ہو جاتا اور وہ خود ہی سامنے رہ جاتی۔ ان سب باتوں کے باوجود رودن کو اس بات کا تفصیل کے ساتھ پتہ چلا۔ کہ مادام لاسنکایا نے فلاں مشہور شخص سے کیا کہا تھا۔ اور فلاں نامور شاعر پر اس کا کتنا گہرا اثر تھا۔ مادام لاسنکایا کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس صدی کے گذشتہ پچیس سالوں میں یہ مشہور آدمی اس سے ملنے کیلئے بیتاب تھا۔ اور اس کی عنایات کا طلبگار تھا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے گہرے دوست رہے ہوں۔ وہ ان کی تعریف اور ان کی قصیدہ خوانی نہیں کر رہی تھی۔ بعض اشخاص کو تو وہ بہت ہی عجیب و غریب ڈھنگ سے پیش کر رہی تھی۔ جس وقت وہ ان سے متعلق باتیں کر رہی تھی تو ان کے نام اس کے ہونٹوں سے اس طرح ادا ہو رہے تھے۔ جیسے وہ نام خود مادام لاسنکایا کے نام میں تحلیل ہوتے جا رہے ہوں۔ ایک نایاب ہیرے کے گرد جڑے ہوئے نگینوں کی طرح۔

رودن سگریٹ پیتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموش رہا۔ کبھی کبھی وہ اس خود نما خاتون کی بات پہ یونہی سی کوئی رائے دے دیتا۔ رودن نہایت اچھی طرح بولتا تھا۔ اور باتیں کرنے میں اسے مزہ آتا تھا۔ وہ دوسروں سے بات چیت اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دوسروں کی باتیں خوب غور سے سنتا تھا۔ جن لوگوں کو وہ ابتدا ہی میں بوکھلا نہیں دیتا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں کھل کر باتیں کرتے تھے۔ وہ جب دوسروں کے بیان کے تسلسل کو قائم رکھنے میں امداد دیتا تو اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ نہایت اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ ان لوگوں کی طرح نیک طینت تھا۔ جنہیں اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ بحث کرتے ہوئے وہ اپنے مدمقابل کو یہ موقع نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنی بات پوری طرح کہہ سکے۔ کیونکہ وہ اس کے طرز کلام کی روانی اور شستگی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔

مادام لاسنکایا روسی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اپنی مادری زبان پر اپنے عبور کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مگر چہ اس

یہ جملوں میں فرانسیسی محاورے اور ضرب الامثال بار بار نمودار ہوتی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر عام بول چال کی زبان استعمال کر رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ غیر موزوں جملے بھی کہہ جاتی۔ یہ کھچڑی سی زبان رودن کو برہم نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان باتوں پر غور نہیں کر رہا تھا۔

جب مادام لاسنکایا تھک گئی۔ تو اس نے اپنی بازوؤں والی کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا۔ اور رودن کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

میں اب سمجھا ہوں۔ کہ آپ گرمیوں میں اپنے اس دیہی مکان میں کیوں آتی ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ دارالحکومت کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد یہاں سکون کی زندگی انسان کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ قدرت کی دلفریبیوں سے ہمدردی رکھتی ہیں ــــ۔"

مادام لاسنکایا نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

"قدرت ــــ ہاں کیوں نہیں۔ میں تو قدرتی مناظر کی پرستار ہوں۔ لیکن پیارے دمتری دیہات میں بھی احباب کے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ پگاسوف کو یہاں سب سے تیز و طرار اور ذہین شخص خیال کیا جاتا ہے ــ ۔"

"وہ کل کے تلخ مزاج سن رسیدہ بزرگ ــــ"

"ہاں ــــ دیہات میں تو اس کا بھی خیر مقدم کیا جا سکتا ہے"

"وہ شخص تو احمق ہے ــــ" رودن بولا ــــ" کیونکہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ آپ شاید مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر ہر بات کی نفی اور شدید نفی ہمیشہ لاحاصل ہوا کرتی ہے۔ مگر ایک یہ بات بھی ہے۔ کہ آپ ہر چیز کی تردید کیجئے۔ آپ کو خدا رسیدہ بزرگ تصور کیا جائے گا۔ اور سادہ لوح لوگ بہت جلد یہ اعتبار کر لیں گے کہ آپ جس بات کی تردید کر رہے ہیں۔ آپ اس سے برتر ہیں۔ درحقیقت ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ابتدا میں آپ ہر شے میں نقص تلاش کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے اگر آپ اسی پر بھی ہیں۔ تو آپ آخر میں فتحیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ذہنی نفی پر تل جاتا ہے۔ وہ خشک اور ٹھس ہو جاتا ہے۔ اپنے غرور کی تسکین آپ کو غور و فکر کی مسرت سے محروم کر دیتی ہے ــــ زندگی اور اس کا نچوڑ آپ کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور آپ اپنی بات کو گالیوں پر ختم کرتے ہیں اور ہر آدمی کے مذاق کا موضوع بن جاتے ہیں۔ پس جو شخص محبت کرتا ہے۔ اسے ہی تنقید کا حق پہونچتا ہے ــــ"

"بہت خوب ــــ" مادام لاسنکایا کے منہ سے نکلا ــــ" تم لوگوں کا جائزہ لینے میں مہارت رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ پگاسوف نے تمہاری یہ بات ہرگز تسلیم نہ کی ہوتی۔ کیونکہ اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے ــــ"

"وہ اپنے آپ پر تنقید اس لئے کرتا ہے۔ کہ دوسروں پر تنقید کر سکے ــــ"

رودن نے کہا ــــ"

مادام لاسنکایا ہنسی ــــ "یعنی اسطرح الزام . . . .

ہاں وہ کیا کہاوت ہے ــــ" اس نے کہاوت کو یاد کرنے کی بے سود کوشش کی ــــ"

یعنی اسطرح الزام دوسروں پر لگایا جائے ــ ہاں یہ تو کہو بیرن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ــــ؟"

"بیرن ایک نہایت اچھا شخص ہے۔ وہ دل کا نرم ہے اور وسیع معلومات رکھتا ہے۔ مگر اس کا کردار مضبوط نہیں وہ عمر بھر نیم خادم رہے گا۔ اور نیم دنیا دار رہے گا میرا مطلب یہ ہے کہ فنون لطیفہ کا قدر دان رہے گا۔ اور اس طرح بے بضاعت اور حقیر رہے گا ــــ" اور یہ کسقدر افسوس کی بات ہے ــــ"

"میں نے خود بھی اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے ــــ" مادام لاسنکایا نے کہا ــــ"

"میں نے اس کا مقالہ پڑھا ہے . . . . ."

"کیا آپ کا اور بھی کوئی دلچسپ پڑوسی ہے۔؟"

مادام نے اپنی سگریٹ کی راکھ اپنی چھنگلیا سے جھاڑی۔

"نہیں کوئی نہیں ــــ مادام لپنا ہیں۔ جنھیں تم نے کل رات کو یہاں دیکھا تھا۔ ایک شریف عورت ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اس کا بھائی بھی ایک اچھا آدمی ہے۔ ایک گھریلو قسم کا شخص ہے۔ شہزادہ گارن کو تو تم جانتے ہی ہو۔ اور یہاں

کوئی نہیں۔ دو تین اور پڑوسی بھی ہیں۔ مگر قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ یہ وہ بس، پلے سے آدمی ہیں۔ دنیا دار بالکل نہیں ہیں۔ میں خواتین سے بہت کم ملتی ہوں۔ ایک اور پڑوسی بھی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا تعلیم یافتہ اور عالم ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ مادام لیپنا اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ اور اس سے کچھ مرعوب بھی ہے۔ دمتری تمہیں چاہیئے کہ تم اس پر ذرا توجہ دو۔ مادام لیپنا ایک نہایت پیاری عورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری توجہ اسے بہت بہتر بنا سکتی ہے ــــ"

"وہ واقعی ایک دلآویز عورت ہے ــــ" رودن بولا۔

"مگر بالکل بچی ہے۔ گود میں کھیلتی ہوئی بچی ــ وہ بیوہ ہے۔ اگر میں مرد ہوتی تو ایسی ہی عورتوں سے عشق کرتی ــ"

"واقعی ؟"

"ہاں ــــ ! ایسی عورتیں بڑی تازہ اور شگفتہ ہوتی ہیں۔"

رودن ہنسا ــــ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اور جب کبھی ہنستا تھا۔ تو اس کا چہرہ عجیب و غریب انداز اختیار کر لیتا تھا۔ نہایت ہی بے ڈھنگا انداز ــــ اس کی آنکھیں سکڑ جاتی تھیں اور اس کی ناک میں بل پڑ جاتے تھے۔

"وہ سنکی شخص کون ہے۔ جس سے مادام لیپنا اس قدر مرعوب ہیں ؟" رودن نے پوچھا۔

"مونیور یزنف ــــ مائیکل مائیخلوف ــــ ایک مقامی جاگیردار ہے ــــ"

رودن نے حیرت سے کہا ــ "یزنف ــ کیا وہ تمہارا پڑوسی ہے ؟"

"ہاں ــــ کیا تم اسے جانتے ہو ؟"

رودن ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا ــــ "ہاں میں کبھی اس سے واقف تھا ــــ مگر ایک مدت ہو چکی ہے۔ وہ ایک دولت مند شخص ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ــــ" اس نے اپنی کرسی کے بازوؤں پر زور سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ دولت مند ضرور ہے۔ مگر نہایت بھونڈا لباس پہنتا ہے۔ اور دوڑ والی گاڑی میں گھوم پھرتا ہے۔ جیسے وہ کوئی گماشتہ ہو۔ میں نے اسے یہاں بلانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بڑا ہوشیار شخص ہے۔ میں اس سے کاروبار کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جاگیر داری کا انتظام خود کرتی ہوں ــــ تمہیں شاید اس کا علم ہو ــــ ؟"

رودن نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"میں اپنی جاگیر کا خود انتظام کرتی ہوں۔ اسی لئے میں زیادہ خوشحال ہوں ــــ"

"میں ان لوگوں کی بات کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ عورت باعمل نہیں ہوتی ــــ"

مادام لاسنکایا مسکرائی ــــ "آپ ایک نہایت مہربان شخص ہیں۔ ہاں تو یزنف سے میرا زمین کی حدبندی کے بارے میں جھگڑا ہے۔ میں اسے بار بار بلوا چکی ہوں۔ مگر وہ آتا ہی نہیں۔ وہ بڑا سنکی ہے ــــ"

اتنے میں دروازہ کا پردہ اٹھا کر ایک ملازم اندر آیا۔

"کیوں کیا ہے ؟"

"مونیور یزنف تشریف لائے ہیں ــــ"

"اوہ میرے خدا ــــ شیطان کا ذکر کرو۔ اور وہ فوراً آدھمکتا ہے۔

اسے اندر بھیج دو ــــ"

ملازم باہر چلا گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ کہ وہ شخص بڑا سنکی ہے۔ اور وہ آخرکار آ ہی گیا۔ بڑے غلط وقت یہاں آیا ہے۔ ہماری گفتگو میں خلل انداز ہوا ہے ــــ"

رودن کرسی پر سے اٹھا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے روک دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی موجودگی میں بھی بات کر سکتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ تم اسے بھی پیاسے کی طرح آڑے ہاتھوں لو ــــ"

رودن ایک لمحہ کیلئے سوچ میں پڑ گیا۔ مگر دوبارہ اپنی جگہ

بیٹھ گیا۔"

یز نف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنا پرانا لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ اور جالسے کی میز تک آ گیا۔

"آپ نے اپنی تشریف آوری سے آخر کار مجھ پر احسان کر ہی دیا ——"

"تشریف رکھئے ——"

یز نف رودن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"میرا خیال ہے کہ . . . . . . " اس نے اپنا سر تھوڑا سا جھکا کر کہا۔

"ہاں ہم دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھ رہے تھے ——"

"مگر اس کے بعد بھی تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

مادام لاسنکایا ان دونوں کی طرف بڑی پریشانی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے شاید حد بندی کی خاطر بلوایا ہے ——"

"مگر میں تو یہ بھی چاہتی تھی۔ کہ آپ میرے ہاں بھی ہوں۔ کیا ہم ایک دوسرے کے نزدیکی پڑوسی نہیں ہیں؟"

"شکریہ ——" یز نف بولا ——"

جہاں تک حد بندی کا سوال ہے۔ میں سارا معاملہ آپ کے گماشتہ سے طے کر چکا ہوں۔ میں اس کی تمام تجاویز قبول کر چکا ہوں۔

"یہ میں جانتی ہوں ——"

"اس نے یہ بات کہی تھی کہ کاغذات پر آپ سے ملاقات ہونے پر دستخط ہو سکتے ہیں۔

"ہاں میرا یہی اصول ہے ——"

"تو میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ——"

"آپ کے لہجہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ میرے یہاں آنے میں جھجکتے رہے ہیں ——"

"کیونکہ میری یہ عادت ہے کہ میں کہیں بھی نہیں جاتا ——"

"کیا مادام لینا کے یہاں بھی نہیں ——"

"ہاں وہاں جاتا ہوں۔ کیونکہ ان کا بھائی میرا دوست ہے"

"اس کا بھائی؟ خیر میں کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتی۔ لیکن عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ اور اس بات پر تمہیں سرزنش بھی کر سکتی ہوں۔ تم ایک سادھو کی سی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو —— کہیں یہ بات تو نہیں کہ تمہیں میرا گھر پسند نہیں ہے"

"نہیں —— آپ کا گھر تو ایک نہایت شاندار گھر ہے حقیقت تو یہ ہے۔ کہ میں ذرا آرام پسند واقع ہوا ہوں۔ پھر میرے پاس شام کا لباس نہیں۔ دستانے نہیں ——" میں دراصل آپ کے حلقہ کا آدمی نہیں ہوں ——"

"کیوں۔ تم نے اتنی اچھی تعلیم پائی ہے۔ امیر گھرانے میں جنم لیا ہے ——"

"جنم اور تعلیم کا میری اس عادت سے کوئی واسطہ نہیں"

"آدمی کو ملتے جلتے رہنا چاہیئے۔ ——"

مادام لاسنکایا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ پھر وہ بولی "تم یہ نہیں چاہتے۔ کہ اپنے جاننے والوں کے حلقہ میں مجھے شامل کرو ——"

"موسیو یز نف ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ محبت کے جذبے سے ذاتی آزادی کے ذرا زیادہ ہی قائل ہیں ——" رودن نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

یز نف نے کوئی رائے نہیں دی اور وہ رودن کی طرف نگاہ کر کے رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

"تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ سارا معاملہ طے ہو چکا ہے ——" کیا آپ کے گماشتہ نے کہہ دیا کہ وہ کاغذات بھجوا دے ——"

"ہاں کہہ دو —— ویسے تمہارے رویہ کو دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے۔ کہ انکار کر دوں"

"وہ کیوں —— نئی حد بندی سے تو آپ ہی کو فائدہ ہوگا"

"کیا آپ ناشتہ تک یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"بہت بہت شکریہ۔ میں ناشتہ نہیں کیا کرتا۔ اور پھر مجھے جلدی بھی ہے ——"

"اچھا تو میں تمہیں کیوں روکوں ——" مادام لاسنکایا نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ تو ——" اور یز نف کمرے سے باہر چلا گیا۔

"دیکھا تم نے کس قدر عجیب آدمی ہے۔ میں نے تو یہ سن رکھا تھا۔ کہ وہ ایک عجیب و غریب شخص ہے۔ مگر آج

تو خود ہی ہو گئی ــــ "

"یہ دونوں ایک ہی مرض کے شکار ہیں" ــ رودن نے وضاحت کی ــــ "دونوں ہی بہت خود پرست ہیں۔ مغرور ہیں۔ ان میں ذرہ بھر صداقت نہیں۔ ذرہ بھر محبت نہیں۔ اپنے آپ کو ذہین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر دونوں ہی ذہانت اور قابلیت کو دفنا چکے ہیں ــــ "

"تم لوگوں کا کتنا اچھا تجزیہ کرتے ہو۔ تمھاری نگاہ سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا ــــ "

"ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دینی چاہیئے۔ میں اس شخص سے محبت کرتا رہا ہوں۔ مگر بعد میں ہم دونوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور ــ"

"اور پھر تم دونوں آپس میں لڑ پڑے ــــ "

"نہیں ــــ یہ نوبت تو نہیں آئی۔ مگر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شاید ہمیشہ کیلئے ــــ "

"تم شاید جیسی خاموش رہے۔ بہر حال میں آج کی خوشگوار صبح کے لئے تمھاری شکر گذار ہوں۔ تم ناشتہ کے وقت تک ٹہل سکتے ہو ــ میں ذرا اپنا کام کر لوں ــــ "

مادام لاسنکایا نے اپنا ہاتھ رودن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور اس پر بوسہ دیا۔ وہ نشست گاہ سے ہوتا ہوا باغیچے کی طرف چل دیا۔ اور باغیچے کے اوپر اس کی ملاقات نتالیا سے ہوئی۔

(۵)

مادام لاسنکایا کی بیٹی نتالیا پہلی نگاہ میں حسین نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور اس کا رنگ گیہواں مائل تھا اس کی کمر میں ذرا سا خم تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح نشو و نما نہیں پائی تھی۔ اس کے ابرو بہت دلآویز تھے۔ پیشانی چوڑی تھی۔ وہ بہت کم باتیں کیا کرتی تھی۔ مگر سنتی زیادہ تھی کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوتا اور غائب ہو جاتا۔

میڈموازیل بون کورٹ اکثر کہا کرتی تھی کہ ایک نوجوان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ کھوئی ہوئی سی رہے۔

مادام لاسنکایا اپنی بیٹی کو نہایت مدبر اور سگھڑ خیال کرتی تھی اور مذاق کے طور پر اکثر کہا کرتی تھی ــــ "میری نتالیا سرد ہے وہ مجھ پر نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے اچھا بھی ہے ــــ وہ زندگی میں خوش رہے گی ــــ " مگر مادام لاسنکایا غلطی پر تھی آخر کون ایسی ماں ہے جو اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتی ہے۔

فرمانبردار بیٹی ہوتے ہوئے بھی نتالیا اپنے سب راز اپنی ماں سے نہیں کہتی تھی۔

"تمہیں مجھ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیئے ــــ" مادام لاسنکایا اکثر اسے ہدایت دیتی۔

رودن جب باغیچے میں داخل ہوا تو نتالیا میڈموازیل بون کورٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ تاکہ ٹوپی پہن کر باغ کی سیر کے لئے جائے۔ وہ اپنا صبح کا مطالعہ ختم کر چکی تھی۔ نتالیا کے ساتھ اب بچوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نتالیا صبح کو تاریخ سفرنامہ کتاب اور دوسرا صاف ستھرا ادب پڑھا کرتی تھی ــــ استانی بون کورٹ اسے ہر قسم کا فرانسیسی ادب ڈوما کے ناولوں کے سوا پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ ڈوما کے ناول استانی بون کورٹ خود پڑھتی تھی۔ چوری چھپے نتالیا دوسری کتابیں بھی پڑھتی جن کا علم استانی بون کورٹ کو نہیں تھا۔ اسے پشکن کا مجموعہ کلام زبانی یاد تھا۔

رودن کو دیکھ کر نتالیا ذرا سا مسکرائی۔

"کیا آپ سیر کے لئے جا رہی ہیں؟" رودن نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ــ ذرا باغ تک جا رہی ہوں ــــ "

"کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ ــــ "

نتالیا نے استانی بون کورٹ کی طرف دیکھا۔

"آپ بڑی خوشی کے ساتھ ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں ــــ " ادھیڑ عمر کی استانی نے فرانسیسی زبان میں کہا۔

رودن اپنی ٹوپی اٹھا کر ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔

نتالیا پہلے پہل تو رودن کے ہمراہ چلتے ہوئے ذرا گھبرائی لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ رودن اس کے درس و مطالعہ کے بارے میں سوالات کرتا رہا

رودن نے شالیا کا سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا — "آپ دیہی علاقہ میں بے کیفی تو محسوس نہیں کرتیں ؟"

"نہیں — میں تو خوش ہوں —"

"خوش ہو — خوشی بڑی چیز ہے — آخر آپ کیوں نہ خوش ہوں — آپ جوان جو ہیں —"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری رہی۔

"آج صبح میں آپ کی والدہ سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ وہ ایک غیر معمولی عورت ہیں۔ میں اب سمجھا ہوں کہ ہمارے شاعران کے ساتھ دوستی کی کیوں اتنی قدر کرتے رہے ہیں کیا آپ کو شاعری سے کچھ شغف ہے — ؟"

شالیا نے سوچا — "یہ شخص میرا امتحان لے رہا ہے" پھر اس نے جواب دیا — "ہاں —"

رودن بولا — "شاعری دیوتاؤں کی زبان ہے — میں شعر و شاعری کا دلدادہ ہوں۔ مگر شاعری صرف نظموں تک محدود نہیں — شاعری تو ہر جگہ موجود ہے — ہمارے چاروں طرف — ذرا ان درختوں کی طرف اور آسمان کی طرف دیکھئے — ہر چیز سے حسن اور زندگی پیدا ہے — اور جہاں کہیں حسن اور زندگی ہوتی ہے۔ وہیں شاعری بھی موجود ہوتی ہے —" اس نے آگے جھک کر کہا — "آؤ ذرا یہاں بنچ پر بیٹھ جائیں —" اس کے بعد اس نے شالیا کی طرف بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا — "جب آپ مجھ سے مانوس ہو جائیں گی۔ تو آپ میری دوست بن جائیں گی کیوں آپ کا کیا خیال ہے — ؟"

"وہ مجھ سے ایک اسکول کی طالبہ کی طرح سلوک کر رہا ہے —" شالیا نے اپنے آپ سے کہا — پھر اس نے پوچھا کہ کیا وہ یہاں ایک لمبی مدت تک رہیں گے —"

"گرمیاں یہیں گزاروں گا شاید سردیاں بھی۔ میں دولت مند نہیں ہوں۔ میرے حالات خراب ہیں۔ اور پھر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے تھک گیا ہوں — اب میرے آرام کرنے کا وقت ہے —"

شالیا حیرت زدہ رہ گئی — "کیا واقعی یہ آپ کے آرام کا وقت ہے — ؟"

"اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے ! —" اس نے ذرا سا گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا —

"میرا مطلب ہے کہ دوسرے تو آرام کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کو کام کرنا چاہیئے۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیئے۔ اگر آپ کام نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا —"

"آپ کی اس تعریف کے لئے آپ کا شکریہ —" یہ کہنا کہ کوئی مفید کام کرو۔ ایک آسان بات ہے اگر مجھ میں یہ یقین بھی پیدا ہو جائے کہ میں کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو مجھے ہمدرد کہاں میسر آئیں گے —" رودن خاموش ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ افسردہ بھی۔

شالیا جی ہی جی میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہ شخص ہے جو رات کو اتنی گرم جوش تقریریں کر رہا تھا۔

یکایک رودن نے اپنے بال پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا — "میں جو کچھ کر رہا ہوں بکواس ہے — آپ ٹھیک کہتی ہیں —" شالیا انگیز تھا — "میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں —"

شالیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا شکریہ کس بات کے لئے ادا کر رہا ہے

"آپ کے ایک ہی لفظ نے مجھے میرے فرض کا احساس دلا دیا ہے۔ آپ نے مجھے صحیح طور پر میرا راستہ دکھایا ہے — ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ میں عمل کروں۔ مجھے اپنی بات چھپا کے نہیں رکھنا چاہیئے —"

اس کے منہ سے الفاظ ندی کے بہاؤ کی طرح نکل رہے تھے اس نے اپنے آپ کی ملامت کی۔ اپنی بے حسی کو کوسا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کام کرنے والے شخص کے ہمدرد پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر میں اس نے ایک بار اور شالیا کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا سا مروڑا اور کہا — "آپ بہت خوبصورت ہیں۔ آپ ایک نیک دل خاتون ہیں —"

میڈموازیل پون کورٹ رودن کی بے باکی اور بے تکلفی پر حیران ہو رہی تھی۔ داستانی لڑکی کورٹ نے اگرچہ بیس برس پیرس میں گزارے تھے۔ مگر وہ روسی زبان کو مطلقاً نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو صرف رودن کے بات کرنے کے انداز کی جی ہی جی میں تعریف کر رہی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹا نہیں رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے شخص اخلاق کے اتنے پابند نہیں ہوتے —

وہ اٹھی اور اپنے لباس کے بل سیدھے کرتے گئی اور اس نے

نگاہوں ہی نگاہوں میں نتالیا سے اشارہ کیا کہ ان کا اب گھر کے اندر جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ناشتہ پر ولانتیف بھی آرہا ہے۔

"تو ولانتیف تو آ بھی پہونچا ــــ" بوڑھی استانی نے گھر کی طرف آنے والے راستے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ولانتیف اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے دور ہی سے سر جھکا کر سب کو سلام کیا اور نتالیا کی طرف اضطراب کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا ــــ "آہ ــ تم سیر کر رہی ہو ــــ!"

"ہاں ــــ ہم گھر کو لوٹنے ہی والے تھے ــــ" نتالیا نے جواب دیا ــــ۔

"تو آؤ چلیں ــــ" وہ سب گھر کی طرف چل دئیے۔

"آپ کی بہن کیسی ہیں بیٹا؟" رودن نے ولانتیف سے پوچھا۔

"شکریہ۔ وہ اچھی ہے۔ شاید وہ آج یہاں آئے۔ میرا خیال ہے۔ کہ آپ کسی بات پر بحث کر رہے تھے؟"

"ہاں ۔ نہایت دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ اور نتالیا الیگزنڈیا نے ایک انسی بات کہی ہے جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں ــــ"

ولانتیف نے یہ نہ پوچھا کہ وہ بات کیا تھی اور وہ خاموش گھر کو لوٹ گئے۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے محفل ایک دفعہ پھر جمی لیکن بچا رنگ نہ آیا۔ رودن ابھی اس وقت اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ پنڈے لاسکی نے بتھوون کا نغمہ بجایا۔ ولانتیف فرش کی طرف نظر جھکا کر دیکھتا رہا۔ نتالیا اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھی رہی۔ جیسے تو رودن کی طرف دیکھا اور کبھی انتظار میں رہا کہ رودن ابھی کوئی دانشمندانہ بات کہے گا۔

اس بے کیفی میں تین گھنٹے گذر گئے۔ مادام لینا دوپہر کے کھانے پر نہ آئی۔ جونہی محفل کھانے کی میز پر سے اٹھی۔ ولانتیف نے اپنی گاڑی منگوائی اور کسی سے خدا حافظ کہے بغیر وہاں سے کھسک آیا۔

ولانتیف کا دل غم سے لبریز تھا۔ وہ ایک مدت سے نتالیا کے ساتھ محبت کر رہا تھا۔ مگر وہ شادی کی تجویز ابھی تک پیش نہیں کر سکا تھا۔ نتالیا اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتی تھی مگر اس کا دل اس کی طرف نہیں کھنچا تھا۔ ولانتیف بھی اس کے دل میں جذبات کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس امید میں تھا کہ وہ خود بخود اس کی طرف راغب ہو جائے گی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ مضطرب تھا۔ ؟ اس نے نتالیا میں کون

سی تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ نتالیا اس سے پہلے کی طرح ہی گفتگو کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مضطرب اور بیقرار تھا۔

جب وہ گھر پہنچ کر اپنی بہن سے ملا تو اس نے پوچھا ــــ "آج تم اس قدر جلد کیوں لوٹ آئے ہو؟"

لزنف بھی اس وقت گھر میں موجود تھا۔

"میں اکتا گیا تھا! ــــ" ولانتیف نے جواب دیا۔

"کیا رودن وہیں ہے۔ ؟"

"ہاں ــــ"

ولانتیف نے اپنی ٹوپی زور سے ایک کونے میں پٹک دی اور بیٹھ گیا۔ اس کی بہن اس سے مخاطب ہوئی ــــ "بھیا ذرا میری مدد کرو یہ لزنف یہ بات مانتا ہی نہیں کہ رودن ایک ذہین اور دانشمند شخص ہے ــــ"

ولانتیف زیر لب کچھ بڑبڑایا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ رودن دانشمند نہیں یا ایک نہایت اچھا مقرر یا خوش بیان نہیں۔ میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ شخص مجھے پسند نہیں ہے ــــ ۔ ۔"

"کیا تمھاری اس سے ملاقات ہوئی؟" ولانتیف نے پوچھا۔

"ہاں آج صبح ہی۔ مادام لاسنکایا کے یہاں۔ وہ تو ان دنوں مادام کا وزیر بنا ہوا ہے۔ مگر وہ دن جلد آنے والا ہے۔ جب وہ اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر پنڈے لاسکی سے جدا نہیں ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ میں نے اسے وہاں دیکھا۔ اس لئے وہاں سے جلد کھسک آیا۔"

"تم وہاں گئے کیوں تھے۔ ؟"

"حد بندی کا معاملہ طے کرنے کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرا خیال ہے کہ رودن کی برتری تمھاری ناراضگی کا باعث ہو" مادام لینا نے کہا ــــ "شاید اسی بات کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس کا دل اور اس کا ذہن بھی نہایت اچھا ہے۔ ذرا اس کی آنکھوں کی طرف تو دیکھا ہوتا ــــ"

"اس کی آنکھوں میں پاکیزہ اخلاق کا جھلک ہے ــــ کیا یہی کہنا چاہتی ہونا؟" لزنف نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بگڑ جاؤں گی ــــ اور رو پڑوں گی۔ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ میں مادام لاسنکایا کے یہاں کیوں نہ گئی اور تمھارے سے

پاس کیوں بیٹھی رہتی۔ اب مجھے زیادہ نہ ستاؤ۔ اور مجھے اس کے شباب کی داستان سناؤ ــــ"

"کس کے شباب کی۔ کیا رودن کے شباب کی ؟"

"ہاں۔ تم نے ابھی تو کہا ہے کہ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اور برسوں سے جانتے ہو ـــ"

یزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "ہاں ــــ" اس نے بات شروع کی ـــ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ میں اس کے شباب کا قصہ سناؤں۔ بہت اچھا تو سنو ـــ وہ ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین غریب جاگیردار تھے۔ اس کے والد کی جلد موت ہو گئی۔ وہ اور اس کی ماں تنہا رہ گئے۔ اس کی ماں ایک نہایت مہربان اور شفیق عورت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پرستار تھی۔ وہ اپنا پیٹ کاٹتی تھی اور جس قدر روپیہ اس کے پاس ہوتا تھا اپنے بیٹے کو دے دیتی تھی۔ اس نے ماسکو میں تعلیم پائی۔ اس کے یہ اخراجات اس کے کسی چچا نے برداشت کئے اور پھر ایک امیر شہزادہ اس کی تعلیم کا خرچ دیتا رہا۔ وہ اس شہزادے کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اچھا مجھے معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ شہزادہ اس کا دوست بن گیا تھا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ میری ملاقات اس سے یونیورسٹی میں ہوئی ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔ ان دنوں کی اپنی زندگی کا حال میں پھر کبھی سناؤں گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد وہ غیر ممالک کی سیر کو نکل گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یزنف برابر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اور مادام لیپنا کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"جن دنوں وہ غیر ممالک میں تھا اس نے اپنی اماں کو کبھی خط نہ لکھا۔ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے کے لئے گیا۔ اور وہ بھی دس روز کے لئے۔ بوڑھی خاتون کا اس کی عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا۔ جب اس کی ماں نے دم توڑا تو اس وقت بھی رودن کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں ان دنوں گاؤں سے چھ میل دور رہتا تھا۔ میں اکثر اس کی ماں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی مہمان نواز عورت تھی ــــ اس کے بعد غیر ممالک میں میری ملاقات رودن سے ہوئی۔ اس وقت وہ ایک خاتون کی نظروں پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خاتون نہایت بدشکل تھی۔ میسے بہاری بھرکم تھی۔ وہ ایک مدت تک اس خاتون سے وابستہ رہا۔ بعد میں اس نے اسے چھوڑ دیا ــــ مجھے معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ اس خاتون نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے چھوڑ دیا ــــ"

یزنف خاموش ہو گیا۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کرسی پر جا بیٹھا۔

"مونیور یزنف شاید تمہیں معلوم نہیں۔ تم ایک بدطینت شخص ہو بالکل پگاسف کی طرح۔ میں یہ مانتی ہوں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور تم نے کوئی بات اپنی طرف سے بڑھائی نہیں مگر تم نے کتنی سنگ دلی کے ساتھ یہ داستان سنائی ہے۔ غمزدہ خاتون، اپنے بیٹے کے ساتھ اس کا لگاؤ۔ تنہائی میں اس کی موت ـــ غیر ممالک میں رہنے والی بھاری بھرکم خاتون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب باتیں تم نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یزنف اپنی کرسی پر سے پھر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں رنج پہنچا ہے مگر میں نے کسی پر بہتان نہیں لگایا تم نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ قصہ میں نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کیا ہے ـــ مگر کون جانے رودن بدل چکا ہو۔ شاید میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ـــ"

"دیکھا تم نے ـــ تم مان رہے ہو مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس کے ساتھ دوبارہ دوستی پیدا کر دو گے تاکہ تم اسے اچھی طرح جان سکو اور پھر اس کے بارے میں کوئی آخری رائے دے سکو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ مگر ولانتیف تم کیوں خاموش ہو ـــ ؟"

ولانتیف چونک پڑا جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے ـــ"

"آج تمہارا رنگ زرد ہے ـــ" اس کی بہن نے کہا۔

"میرے سر میں درد ہے ـــ" ولانتیف یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

مادام لیپنا اور یزنف نے ولانتیف کا نگاہوں سے تعاقب کیا

(۶)

دو مہینے گزر گئے۔ اس وقت کے دوران میں رودن مضافات ...

لاسنکایا کے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ وہ مادام لاسنکایا کیلئے ایک ضرورت بن گیا۔ ایک روز جب اس نے مادام لاسنکایا سے یہ کہا کہ اس کا روپیہ ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ جانا چاہتا ہے تو مادام لاسنکایا نے اسے پانچ سو روبل دے دیئے اور وہ رک گیا۔ اس نے دو سو روبل والانتیف سے قرض لئے۔

پگاسوف اب مادام لاسنکایا کے یہاں کبھی کبھی آتا۔ وہ رودن کی موجودگی میں اپنا سکہ نہ بٹھا سکتا۔ رودن نے تنہا پگاسوف ہی کو کچل کے نہیں رکھ دیا تھا۔ بلکہ کچھ اور بھی روندے اور مسلے گئے تھے۔

پگاسوف اب یہ کہتا — "رودن روسی زندگی سے متعلق کسی ناول کے کردار کی طرح بولتا ہے۔ اگر آپ کو چھینک بھی آتی ہے۔ تو وہ آپ پر جھپٹ پڑتا ہے۔ جب وہ آپ کی تعریف کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی اعزاز بخش رہا ہو —"

پینڈے لافسکی بھی رودن سے ہراساں تھا اور وہ اس کی خوشامد کرنے لگا تھا۔ رودن اگر اس کی کبھی تعریف کرتا پینڈے لافسکی کو یہ شک گزرتا کہ وہ اسے بنا رہا ہے۔ والانتیف کی بھی یہی حالت تھی وہ نتالیا کی وجہ سے رودن سے حسد کرنے لگا تھا۔

بیسے توف برابر رودن کی پرستش کرتا رہا۔ رودن اس کی طرف دھیان تک نہیں دیتا تھا بس ایک روز صبح کو رودن نے بیسے توف سے بات چیت کی تھی۔ نہایت نازک مسئلوں پر بحث چھیڑی تھی۔ اس نے بیسے توف کے دل کو خوب گرمایا تھا۔ اس روز کے بعد رودن نے بیسے توف کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یزنف اب اکثر مادام لاسنکایا کے یہاں آنے لگا تھا۔ رودن اس کے ساتھ کبھی بحث نہیں کرتا تھا اور جب وہ موجود ہوتا تو رودن اکثر باہر چلا جاتا تھا۔ یزنف بھی اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا۔ اس نے مادام لاسنکایا کو رودن کے بارے میں اپنی آخری رائے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ رودن کی تعریف کرتی تھی مگر یزنف پر اعتبار بھی کرتی تھی۔

مادام لاسنکایا کے گھر کا ہر فرد رودن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا جاتا۔ ان کا پروگرام رودن وضع کیا کرتا۔ رودن اب تو مادام لاسنکایا سے اس کی جاگیر کے بندوبست سے متعلق بھی اپنی رائے دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بچوں کی پرورش کے بارے میں بھی مشورے دیتا۔ وہ بڑے غور کے ساتھ اس کی باتیں سنتی۔ وہ اس کی محض لفظی تعریف کرتی مگر عمل اپنے گماشتے کی نصیحت پر کرتی۔

مادام لاسنکایا کے بعد رودن دیر تک نتالیا سے باتیں کرتا۔ وہ چوری چھپے اسے کتابیں لا کر دیتا۔ اس کو اپنے ارمان اور اپنی تمنائیں بتاتا۔ مستقبل میں جو مقالے اور جو کتابیں وہ لکھنے والا تھا۔ ان کے بارے میں نتالیا سے بحث کرتا۔ اس کی بعض باتیں نتالیا کی سمجھ میں نہ آتیں۔ رودن اس بات کی پروا نہ کرتا کہ نتالیا اس کی باتیں سمجھتی نہیں تھی۔ وہ تو خوش تھا کہ نتالیا بڑے غور کے ساتھ اس کی ہر بات سنتی تھی۔

مادام لاسنکایا غلطی پر تھی۔ نتالیا بچوں کی سی باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ واقعی رودن سے مرعوب تھی۔ وہ اس کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ جب رودن اسے کی کتاب "فاؤسٹ" پڑھ کر سناتا اور جو پیرے اس کی سمجھ میں نہ آتے ان کی تشریح کر کے بتاتا تو وہ جرمنی کی رومان پرور فضاؤں میں پہنچ جاتی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حسین و جمیل اور پراسرار منظر کھل جاتے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم پیدا ہو جاتا۔ اس کے دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ اس کے جذبات کی چنگاریاں شعلے بن جاتیں

ایک دن کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے نتالیا نے اسے پوچھا — "اب کے سردیاں تم پیٹرزبرگ میں گزارو گے ہونا؟"

"ابھی مجھے اس کا علم نہیں —" رودن نے کتاب اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے جواب دیا — "اگر مجھے ذرائع میسر آ گئے تو میں ضرور پیٹرزبرگ جاؤں گا —"

وہ صبح سے بیکار رہا تھا۔ اس لئے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا

"مجھے یقین ہے کہ تم ذرائع حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو گے"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے"

نتالیا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

"وہ دیکھو سیب کا درخت اپنے پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ چکا ہے —" رودن نے کہا۔

"ہاں اس لئے ٹوٹ گیا کہ اس کا کوئی سہارا نہ تھا —" نتالیا بولی

"آدمی کے لئے سچائی تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے —"

رودن نے کہا —

نتالیا بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی — "تم دیہات میں سردیاں کیونکر بسر کرو گے۔؟"

"میں اپنی کتاب زندگی اور آرٹ میں المیہ لکھوں گا —"

"کیا تم یہ کتاب شائع کرواؤ گے —؟"

"نہیں —"

"نہیں — تو پھر یہ کتاب لکھو گے کیوں؟"

"تمہارے لئے —"

نتالیا نے اپنی نگاہیں جھکا لیں — "یہ تو بہت بڑا ایثار ہوگا —"

"اس کتاب کا نام کیا ہوگا۔؟" بیسے ترف نے دور سے بات سنتے ہوئے پوچھا۔

"آرٹ اور زندگی میں المیہ — رودن نے جواب دیا ہاں — مونیور بیسے ترف بھی میری یہ کتاب پڑھیں گے۔ ابھی اس کتاب کا بنیادی خیال میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ابھی تو میرے ذہن میں محبت کی المناک اہمیت ہی واضح ہوتی ہے —"

محبت کے بارے میں رودن بہت کم باتیں کیا کرتا تھا۔ استانی بون کورٹ پہلے تو محبت کے لفظ پر اپنے کان کھڑے کرتی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی محبت کے موضوع پر گفتگو سے مانوس ہو گئی اور جب کبھی محبت کا لفظ اسے سنائی دیتا تو وہ اپنے ہونٹ بھینچ لیتی اور اس کی پتلی ناک میں جھریاں پڑنے لگتیں۔ "مجھے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کا المیہ یہی ہے کہ محبت کا صلہ نہ ملے —"

"نہیں — رودن بولا — یہ تو محبت کی مضحکہ خیز صورت ہے محبت تو ابتدا سے آخر تک ایک اسرار ہے۔ محبت کا پیدا ہونا۔ محبت کا پروان چڑھنا اور محبت کا غائب ہونا یہ سب ایک راز ہے۔ اسرار ہے ابھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک نئے دن کی طرح مسرت انگیز ہوتی ہے۔ پھر راکھ تلے دیر تک سلگتی رہتی ہے۔ ایک شعلہ بننے کے لئے۔ اس کے بعد وہ دل میں ناگن کی طرح رینگتی ہے۔ اور دفعتاً کہیں گم ہو جاتی ہے .... یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ اور پھر ہمارے اس زمانے میں محبت کرتا ہی کون ہے۔ کون محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے —"

رودن دیر تک محبت کے موضوع پر گفتگو کرتا رہا یکایک اس نے سوال کیا — "کیا بات ہے ایک مدت سے مونیور والنتسیف دکھائی نہیں دیتے؟"

نتالیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں نہیں جانتی وہ کیوں نہیں آتے —" نتالیا نے سرگوشی کے انداز میں کہا —

"وہ بہت اچھے انسان ہیں —" رودن نے اٹھتے ہوئے کہا: "وہ ایک روسی رئیس زادے کی بہترین مثال ہیں —"

استانی بون کورٹ نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رودن نے اٹھتے ہوئے کہا — "برگد کا پیڑ آپ نے دیکھا ہے۔ اس کے پرانے پتے اس وقت جھڑنے لگتے ہیں جب نئے پتوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔"

"ہاں میں نے اکثر دیکھا ہے —" نتالیا نے آہستگی کے ساتھ کہا —

"یہی حالت پرانی محبت کی ایک مضبوط دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ پرانی محبت دل میں شگفتہ ہی ہوتی ہے۔ مگر نئی محبت کے بیدار ہوتے ہی پرانی محبت دم توڑ دیتی ہے —"

نتالیا نے اس بات پر اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"اس بات سے اس کی مراد کیا ہے —"

رودن دیر تک کھڑا ہوا اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔

نتالیا اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ دیر تک رودن کے آخری الفاظ پر دماغ سوزی کرتی رہی۔ یکایک اس نے تالی بجائی اور زار و قطار رونے لگی۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ بار بار اپنے آنسو پونچھتی لیکن پھر رو پڑتی۔ جیسے دیر سے ایک بند چشمہ پھوٹ بہا ہو —

اس روز مادام لپنا نے رودن کے متعلق لزنف سے بات کی پہلے تو لزنف نے رودن کے بارے میں بات کرنے سے انکار کیا لیکن

مادام لینا نے اصرار سے کام لیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم رودن کو بدستور ناپسند کرتے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اسے ناپسند کیوں کرتے ہو —"

"جیسی تمھاری مرضی" — یزنف نے تھوک نگلتے ہوئے کہا — "اگر تم ناراض نہ ہو تو کہوں —"

"کہو بھی —"

"ہاں میں رودن کو ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ایک بہت ہی چالاک شخص ہے —"

"بالکل —"

"نہایت ہی چالاک شخص ہے لیکن کھوکھلا ہے —"

"خیر کھوکھلا ہونا تو کوئی برائی نہیں۔ میں اسے یہ الزام بھی نہیں دوں گا کہ وہ ایک سنگدل شخص ہے، کاہل ہے اور کافی ذہین بھی نہیں —"

"کافی ذہین بھی نہیں؟" مادام لینا نے زور دے کر پوچھا۔

"ہاں کافی ذہین بھی نہیں۔ دوسرے وہ برف کی طرح سرد ہے۔"

"سرد اس کی روح تو بہت گرم ہے۔"

"نہیں وہ برف کی طرح سرد ہے۔ وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے اور خواہ مخواہ گرم جوش بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ یہ کھیل اس کے لئے خطرناک نہیں۔ کیونکہ وہ خود گرہ سے کبھی ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کرتا اور دوسرے اس کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں —"

"تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟"

"رودن کی — وہ ایماندار بھی نہیں ہے۔ وہ ایک نہایت اچھا مقرر ہے۔ مگر وہ ایک بچے کی طرح اپنے الفاظ سے حظ اٹھاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رودن کے الفاظ محض الفاظ ہوتے ہیں۔ اس کے الفاظ کبھی عمل میں تبدیل نہیں ہوتے۔ مگر یہ الفاظ ایک نوخیز دل کو تباہ بھی کر سکتے ہیں —"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ نتالیا کی۔"

مادام لینا ایک لمحہ کے لئے ششدر رہ گئی — "کیا بات کرتے ہو۔ نتالیا تو بچی ہے۔ اگر میں تمھاری بات مان بھی لوں۔ تو مادام لاسنسکایا اس کی ماں ...."

"اس کی ماں بہت بڑی انانیت پرست ہے۔ وہ تو اپنے آپ میں گم رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف ایک نگاہ ڈالے گی اور ہر بات ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ خود کو ایک ذہین عورت سمجھتی ہے۔ مگر وہ ایک احمق بیوہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نتالیا بچی نہیں ہے۔ وہ سوچنے کی عادی ہے اور اکثر اس کی سوچ مجھ سے اور تم سے گہری ہوتی ہے۔ کس قدر شرمناک بات ہے۔ کہ ایک ایماندار، جذبات سے لبریز لڑکی کو ایک اداکار کے حوالے کر دیا جائے۔"

"اداکار —"

"ہاں اداکار نہیں تو کیا۔ کیا ایک شریف شخص کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی گھرانے کے امور میں دخل دے —"

"تم اس وقت بہت مشتعل ہو۔ مجھے تو یہ جان پڑتا ہے کہ تہ میں کوئی اور بات بھی ہے —"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ کہ تم ایسا ضرور سوچو گی۔ ایک عورت کے سامنے عقلمندی کی بات کرو تو وہ عورت ہر بات کی تہ میں کوئی راز ڈھونڈنے لگتی ہے —"

یزنف کی اس بات پر مادام لینا کو بہت غصہ آیا۔ وہ بولی "مونیور یزنف تم تو پگاسف کی طرح عورتوں سے نفرت کرنے لگے ہو۔ تم کچھ بھی کہو مگر میں یہ نہیں مان سکتی کہ تم ایک شخص کو اتنی مختصر سی مدت میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اگر تمھاری بات مان لی جائے تو رودن ایک بگلا بھگت معلوم ہوتا ہے —"

"مصیبت تو یہ ہے کہ وہ بگلا بھگت بھی نہیں۔ بگلا بھگت کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کی جستجو میں ہے۔ مگر یہ شخص تو اپنی ذہانت کے باوجود ......"

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے —"

یزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا — "میں چونکہ رودن کے بارے میں اپنی بے باک اور کڑوی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس لئے تم مجھ سے ناراض ہو رہی ہو۔ مگر مجھے حق حاصل ہے۔ کہ میں اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کروں۔ یہ حق حاصل کرنے کے لئے میں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں اسے نہایت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ کچھ عرصہ رہا ہوں۔ تمھیں یاد ہو گا کہ میں نے کہا تھا کہ میں اپنا دونوں کی زندگی کے بارے میں

تمھیں پھر کبھی قصہ سنا ڈالوں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ قصہ مجھے اب بیان کر ہی دینا ہو گا۔ کیا تم صبر کے ساتھ یہ داستان سن سکو گی؟"

"ہاں ہاں۔ کہو ---"

"اچھا تو سنو --- " یوزف کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اور ہر بات کرتے کرتے وہ کبھی کبھی رک بھی جاتا --- "شاید تمھیں معلوم ہو میرے والدین کا سایہ لڑکپن میں میرے سر پر سے اٹھ گیا تھا۔ میں اس وقت سترہ برس کا تھا۔ میں ماسکو میں اپنی چچی کے یہاں رہتا تھا میں ان دنوں بڑا نمود پسند اور رکھ رکھاؤ والا لڑکا تھا۔ میں یونیورسٹی میں داخل ہوا اور اسکول کے لڑکوں کی طرح عمل کرنے لگا جس کی وجہ سے مجھے مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ مصیبت کیا تھی وہ قابل ذکر بھی نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اور اس کی وجہ سے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا گیا۔ میں رات بھر روتا رہا۔ میں اس وقت اپنے ایک دوست کے کمرے میں تھا۔ اور وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب میرا مذاق اڑا رہے تھے مگر اس کو مجھ پر ترس آ گیا۔ وہ مجھ بازو سے پکڑ کر وہاں سے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔"

"کیا وہ رودن تھا؟"

"نہیں وہ شخص اب مر چکا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ اس کا نام پوکورسکی تھا۔ میں چند لفظوں میں اس شخص کو بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں نے اس کی بات شروع کر دی تو پھر کسی دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا وہ ایک نیک طینت فرشتہ خصلت اور بے نظیر انسان تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ وہ بعض اوقات اپنے کسی مہمان کو ایک کپ چائے بھی نہیں پلا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہزاروں آدمی اس سے ملنے آتے تھے۔ ہر شخص اس سے پیار کرتا تھا۔ وہیں رودن سے میری ملاقات ہوئی کیونکہ ان دنوں اس کے دوست شہزادے نے اسے چھوڑ دیا تھا۔"

"پوکورسکی میں غیر معمولی بات کیا تھی؟" مادام سپاسٹا نے پوچھا۔

"الفاظ اس کی فطرت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ اپنی ذہانت کے باوجود بچوں کی طرح دلکش تھا ---"

"کیا وہ بہت اچھی باتیں کرتا تھا؟"

"ہاں جب وہ موڈ میں ہوتا تھا۔ مگر حیران کن حد تک نہیں وہ ان دنوں جیسی اس سے بہتر اچھی باتیں کرتا تھا۔"

یوزف ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر سینے پر اپنے ہاتھ باندھ کر بولا: "رودن اور پوکورسکی میں کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ رودن زیادہ ہوشیار تھا۔ چرب زبان۔ شاندار مقرر تھا اور شاید زیادہ پرجوش بھی تھا۔ وہ

پوکورسکی سے زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پوکورسکی سے اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ رودن ایک خیال کی نہایت اچھی وضاحت کرتا تھا اور نہایت اچھی بحث کرتا تھا۔ لیکن اس کے خیالات اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتے تھے۔ دوسری طرف پوکورسکی اگرچہ سادہ، شریف اور کمزور تھا۔ مگر وہ عورتوں کا دلدادہ تھا۔ تفریح کا عاشق تھا۔ اور اس سلسلے میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ وہ خیالات کا بادشاہ تھا۔ رودن یوں تو بڑا گرم جوش تھا۔ لیکن برف کی طرح سرد تھا۔ ان دنوں ہمارا حلقہ نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ ہم آرٹ، علم اور زندگی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ بہت سے حسین الفاظ تھے مگر پیچیدہ۔ ہم کائنات کے قوانین کا شعور نہیں رکھتے تھے اور مبہم انداز میں بحث کیا کرتے تھے اور جب ہم رودن کی باتیں سنتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام باتیں ہم پر روشن ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر رودن کے خیالات طبع زاد نہیں تھے تو اس کی کون پروا کرتا تھا۔ ہاں ایک بات کہ رودن ہم جس قدر علم ان دنوں حاصل کر سکے وہ رودن کی بدولت ہی حاصل کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے پوکورسکی ہمارے دلوں میں حسن کی آگ روشن کر دیتا تھا۔ مگر وہ بعض اوقات بڑی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ پوکورسکی کی صحت بہت خراب تھی رودن ایک خوبصورت جوان تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ وہ ہر بات میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ وہ ہر بات کی وضاحت اور تشریح کی کوشش کرتا تھا۔ میں اس وقت اس زمانے کے رودن کی بات کر رہا ہوں مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پچاس برس کی عمر میں بھی اس کے خیالات نہیں بدلے۔

"بیٹھ جاؤ۔ تمہارا ادھر ادھر گھومنے سے مجھے پریشانی سی طاری ہوتی ہے۔"

"میں اس طرح زیادہ اچھی طرح بات کر سکتا ہوں۔ میں جب پوکورسکی کے حلقے میں شامل ہو گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا نیا جنم ہوا ہے۔ میں زیادہ منکسر ہو گیا۔ ہر بات کی زیادہ کھوج کرنے لگا۔ پانچ چھ نوجوان جمع ہوتے رات بھر باتیں ہوتیں۔ صبح کا اجالا پھیلتا اور ہم اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوتے۔ کتنا اچھا زمانہ تھا۔"

یوزف خاموش ہو گیا۔ اس کا بے رنگ چہرہ اس وقت سرخ ہو رہا تھا۔

"مگر تمہارا رودن سے جھگڑا کب ہوا؟" مادام سپاسٹا نے یوزف کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا اس سے جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا

جب مجھے پردیس میں اس بات کا پتہ چلا کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ ماسکو میں اس سے بیگانگی کی پہر ... تھی۔ اس نے میرے ساتھ نہایت رذیل دھوکا کیا۔"

"وہ دھوکا کیا تھا ——؟"

"بتاتا ہوں۔ میں ہمیشہ کسی نہ کسی سے محبت کرنے کا عادی رہا تھا۔"

"تم؟"

"ہاں سنو تو سہی۔ میں ایک نہایت ہی پیاری لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہا ہو؟ میں تمہیں اس سے زیادہ حیران کن بات بتا سکتا ہوں۔"

"ذرا میں بھی سنوں وہ کونسی بات ہے ——؟"

"تو سنو جن دنوں میں ماسکو میں تھا تو میں اپنے باغ میں ایک ... جو کسی سے پیار کرتا تھا۔ لیموں کے درخت سے۔ میں لیموں کے درخت سے لپٹ جاتا۔ اس کے تنے کو اپنے آغوش میں لے لیتا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری قدرت میرے آغوش میں ہو۔ مگر میں تو تمہیں اپنی محبت کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک لڑکی سے میری واقفیت ہو گئی۔"

"لیموں کے درخت سے محبت چھوڑ دی؟"

"ہاں۔ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ بڑی نیک دل۔ اس کی آنکھیں بہت ہی چمکدار تھیں اور اس کی آواز چاندی کی گھنٹی کی آواز کی طرح تھی۔"

"تمہاری قسمت ستاروں پہ محبت ہوتی ہے۔" مادام سہیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نہایت ہی بڑی نقاد ہو۔ خیر تو وہ لڑکی اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس لڑکی سے ملاقات کے تیسرے دن میں نے اپنی محبت کا ذکر رودن سے کیا کیونکہ ایک نوجوان کے لئے اپنی محبت کو چھپانا دشوار ہوتا ہے۔ جب رودن کو میری محبت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے میرے فرض سے آگاہ کیا۔ میں ہر قسم کی کوشش ہو کر سکتا ہوں۔ اس کے الفاظ نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ رودن نے میری محبوبہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے ہی اسے اس لڑکی سے متعارف کرا دینے پر زور دیا ہو گا۔"

"اب میں سمجھی رودن تمہاری محبوبہ لے اڑا اور اس کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ کیوں میں ٹھیک کہتی ہوں نا؟"

"نہیں رودن میری محبوبہ کو نہیں لے اڑا۔ اس کا یہ ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے میری مسرت کا گلا گھونٹ دیا۔ اور آج میں اس بات کے لئے میں اس کا شکریہ ادا کرنے کو تیار رہوں۔ مگر ان دنوں تو میں پاگل ہو گیا۔ رودن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ عادت تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زندگی کا پروگرام مرتب کیا کرتا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو سمجھایا کہ ہمیں ایک دوسرے سے کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس نے تو ہم سے خط و کتابت بھی شروع کر دی ہے ہم دونوں کو الجھا کر رکھ دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہم کم سے کم چند مہینے تو مزے سے گزار سکتے تھے۔ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ ایک روز رودن نے کہا کہ وہ ہمارا بہترین دوست ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ لڑکی کے باپ سے بات کرے اور وہ لڑکی کے باپ سے بات کرنے چلا گیا۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں ایسا اس نے میری مرضی اور اجازت سے کیا۔ میں اس وقت بڑا پریشان تھا۔ مجھے سفید چیزیں سیاہ اور سیاہ چیزیں سفید نظر آتی تھیں۔ سچ مچ جب اس کا خیال آتا ہے۔ تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"اور تمہیں اس لڑکی سے الگ ہونا پڑا؟" مادام سہیلہ نے بڑے پیار سے اور نزاکت سے پوچھا۔

"ہاں —— اور یہ جدائی بڑی الم ناک تھی۔ میں بھی رویا اور وہ لڑکی بھی روئی۔ مجھے نہیں معلوم ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا۔ بہرکیف اس جدائی کا نتیجہ اچھا نکلا۔ اس لڑکی نے ایک قابل شخص سے شادی کر لی ہے اور خوش ہے۔"

"اس پر بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ رودن کو معاف نہیں کر سکتے۔"

"نہیں یہ بات نہیں جب رودن غیر ملک کی سیر کے لئے روانہ ہوا تو میں بچوں کی طرح لپٹ کر اس سے رویا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نفرت کا بیج اس دن سے میرے دل میں بویا جا چکا تھا۔ اس کے بعد پردیس میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت عمر میں ادا ... ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رودن کیا تھا۔"

"تم نے کیا دریافت کیا؟"

"وہی ایک گھنٹہ پہلے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ خیر رودن کا قصہ اب ختم ہو گیا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں اس کے بارے میں سخت فیصلہ صادر کر رہا ہوں تو اس لئے نہیں کہ ... نہیں

اسے جلنے سے منع کر رہا ہوں۔ میں اب اور کچھ نہیں کہوں گا۔ ذرا اپنے بھائی پر توجہ دو۔"

"اپنے بھائی پر ۔۔۔ وہ کیوں؟"

"ذرا اس کی طرف دیکھو تو ۔ کیا تمہیں کوئی بات نظر نہیں آتی؟"

"نظر کیوں نہیں آتی ۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ کچھ دنوں سے وہ بے آپ میں نہیں۔ کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ ۔۔۔"

"ذرا آہستہ سے" لوئیس نے سرگوشی کی "مجھ پر اعتماد کرو نتالیا اچھی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ایک ناتجربہ کار [illegible] ہے۔ میری بات یاد رکھنا ایک دن وہ لڑکی تمہیں حیرت میں ڈال دے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایسی لڑکیاں اکثر بے حد سرکش ہوتی ہیں۔ یا زہر کھا لیتی ہیں۔ تم اس کی سادگی پر نہ جاؤ۔ وہ اندر سے آگ ہے آگ۔"

"رہنے بھی دو تم تو شاعری کرنے لگے تمہیں تو ہر جگہ ایک آتش فشاں پہاڑ ہی نظر آتا ہوگا۔"

"اور نہیں تو کیا ۔۔۔" لوئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ولانتیف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بہن اور لوئیس پر ایک طنزیہ سی نگاہ ڈالی۔ وہ گزشتہ دنوں میں بہت دبلا ہو گیا تھا۔ ولانتیف کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نتالیا اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ اس کے پیروں تلے کی زمین نکل رہی ہے۔

دوسرے دن اتوار تھا اور نتالیا ذرا دیر سے جاگی۔ کل کے دن اور بہت خاموش رہی تھی جب بھی میں اپنے آنسوؤں پر ندامت محسوس کرتی رہی تھی۔ سعادت کو اسے [illegible] نہیں آئی تھی۔ پیانو کے سامنے بیٹھ کر وہ نہایت دھیمے سروں میں اسے بجاتی رہی تھی تاکہ ہمسائیوں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ سعدون کے بارے میں کم مگر اس کے خیالات کے بارے میں زیادہ سوچتی رہی تھی۔ کبھی کبھی ولانتیف کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی وہ جانتی تھی کہ ولانتیف اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر وہ جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتی وہ ایک عجیب و غریب کشمکش سے دوچار تھی۔

ناشتہ کر کے وہ تیزی کے ساتھ اپنا لباس تبدیل کر کے باغ کی طرف نکل گئی۔ [illegible] میں ایک تیز خوشبو [illegible] کے قریب پہنچی ہی تھی

سعدون اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جیسے زمین نے اسے اگل دیا ہو۔

وہ حیران رہ گئی –

"کیا تم اکیلی ہو؟"

"ہاں" نتالیا نے جواب دیا ۔۔۔ "مگر میں ذرا سی دیر کے لئے باہر آئی ہوں۔ مجھے اب لوٹ جانا چاہئے۔"

"کیا میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔؟"

یہ کہہ کر سعدون اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"تم آج افسردہ دکھائی دے رہی ہو!"

"کیا واقعی؟ اور میں یہ کہنے والی تھی کہ تم آج زیادہ ملول ہو"

"مجھ پر اکثر غم کے دورے پڑتے ہیں۔ مگر تمہاری عمر اداس ہونے کی نہیں"

"کیوں۔؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ کہ مجھے کبھی کوئی رنج نہیں ہوتا۔؟"

"تمہاری عمر میں تو ہر شخص کو زندگی کا لطف اٹھانا چاہئے"

نتالیا چند قدموں تک خاموش رہی [illegible]!

"ہاں کہو کیا بات ہے؟"

"کیا تمہیں وہ موازنہ یاد ہے جو تم نے کل کیا تھا۔ وہ برگد کے پیڑ کا قصہ؟"

"ہاں"

نتالیا نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا اس سے مطلب کیا تھا؟"

سعدون نے سر جھکا لیا۔ اور دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "نتالیا تم نے یہ بات دیکھی ہوگی کہ میں اپنے ماضی کا بہت کم ذکر کرتا ہوں میں اپنے دل کے بہت سے تاروں پر انگلی نہیں رکھتا۔ کسی کو یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ میں کن مصائب میں سے گزرا ہوں۔ لیکن میں تم سے صاف صاف باتیں کر سکتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ میں نے بھی محبت کی ہے اور دکھ جھیلے ہیں۔ میرا دل بے پایاں مسرت اور بے کراں دکھ سے شناسا ہے ۔۔۔" سعدون ایک لمحے کے لئے خاموش رہا "کل جو بات میں نے کہی تھی وہ مجھ پر صادق آتی ہے میں [illegible] سے چلتے ہوئے راستے پر ایک مسرت انگیز گوشے میں [illegible] منزل کب آئے گی یا آئے گی بھی کہ نہیں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔"

"آؤ ہم تمہارے بارے میں باتیں کریں۔"

"مسٹر روڈن کوسے وچ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں زندگی سے کوئی توقع ہی نہیں رہی؟"

"نہیں میں زندگی سے بہت توقع رکھتا ہوں۔ زندگی جو مسرتیں ہر کسی کو عطا کرتی ہے۔ میں اسے کبھی ترک نہیں کروں گا۔ لیکن محبت شاید میری قسمت میں محبت نہیں ہے۔ محبت میں مبتلا ایک عورت مرد کے کل وجود کو طلب کر سکتی ہے۔ مگر میں اپنے پورے وجود کو نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ جوانی بڑی خوبصورت ہوتی ہے میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں کسی کو اپنا دیوانہ نہیں بنا سکتا۔"

"میں سمجھتی ہوں" نتالیا بولی "کہ جو شخص ایک بلند و ارفع مقصد حیات رکھتا ہے وہ اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے لیکن کیا کوئی بھی عورت اس شخص کی قدر نہیں کر سکتی؟ مجھ پر اعتبار کرو کہ عورت نہ صرف ایثار کی قدر کرتی ہے بلکہ اس کی اہل بھی ہوتی ہے۔"

نتالیا کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ روڈن سے ملنے سے پہلے اس نے کبھی اتنی بڑی بات نہیں کی تھی۔

"تم عورت کے بارے میں میری بات سن چکی ہو" روڈن بولا "میرے خیال میں تو جون آف آرک ہی صرف فرانس کو بچا سکتی تھی۔ لیکن میں تو تمہارا ذکر کر رہا تھا۔ تم زندگی میں قدم رکھ چکی ہو اس لئے تمہارے مستقبل سے متعلق بات چیت زیادہ سود مند ثابت ہوگی۔ اگر میں ایک سوال کروں تو اس سے تم کوئی میرا مقصد تو وابستہ نہیں کرو گی؟ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا دل آزاد ہے؟"

نتالیا حجاب سے سرخ ہو گئی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ روڈن رک گیا اور وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" وہ بولی "لیکن تمہارے اس سوال کی مجھے توقع نہیں تھی۔"

"بہرکیف تمہیں اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے دل کا بھید جانتا ہوں۔"

نتالیا نے حیرت کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ تمہارا اس سے اور کوئی انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے تمہاری قدر کرے گا۔ زندگی نے اس پر کوئی غم نہیں ڈالا۔ اب بھی تابناک و درخشاں ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔"

"تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟"

"جیسے تمہیں علم ہی نہ ہو۔ میرا مطلب وولنتسیف سے ہے۔ کیا میں سچ نہیں کہہ رہا؟"

نتالیا نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بہت گھبرا گئی۔

"کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ جاؤ بھی جب وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے تو پھر اپنی نگاہیں تم پر سے نہیں اٹھاتا۔ تمہاری ہر حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔ ہر آدمی کے لئے اپنی محبت کو چھپانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"

"دمتری نکولے وچ" نتالیا نے ہاتھ بڑھا کر بات بیچ میں کاٹ دی۔ "میرے لئے اس معاملے پر بحث کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔"

"غلطی پر ہوں۔ نہیں میرا یہ خیال نہیں ہے۔ ہم اگرچہ ایک دوسرے کو تھوڑے دنوں سے جانتے ہیں۔ پھر بھی میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں..... ورنہ جو میں تبدیلی تم میں دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تم وہ نہیں ہو جو ہفتہ پہلے ہوا کرتی تھیں۔ نہیں نتالیا تمہارا دل آزاد نہیں ہے۔"

"شاید" نتالیا نے دبی زبان میں کہا۔ "مگر تم غلطی پر ضرور ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"برائے کرم مجھے تنہا چھوڑ دیجئے اور مجھ سے سوالات نہ کیجئے۔"

وہ گھر کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی چل دی۔ اس کے سینے میں جو جذبات یک بیک ابھر آئے تھے وہ ان سے خوفزدہ تھی۔

روڈن نے اسے جا لیا۔ اور وہ اسے روک کر بولا۔ "نتالیا گفتگو یوں ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے لئے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیسے سمجھ پاؤں گا؟"

"مجھے تنہا چھوڑ دیجئے" نتالیا نے بات دہرائی۔

نتالیا ڈر کے مارے جواب دے رہی ہے" روڈن نے [illegible]

"تم بات کو سمجھتی ہو۔ اس لئے تم [illegible] اس نے

ہاتھ اس سے چھڑا لیا اور مڑ کر وہ پیچھے پر نگاہ ڈالے بغیر گھر کی طرف چل پڑی۔

"خدا کے لئے ایک بات سنتی جاؤ ..... " رودن نے التجا کی۔ وہ رک گئی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

رودن بولا — "تم نے ابھی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے برگد کے پیڑ کا قصہ کیوں سنایا تھا۔ جیسی کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ قصہ میرا اور تمہارا قصہ تھا۔"

"میرا قصہ تھا؟"

"ہاں تمہارا بھی — تم جانتی ہو میں نے ایک نئے احساس اور ایک نئے جذبے کی بات کی تھی۔ آج سے پہلے میں یہ جرأت کبھی نہ کرتا۔"

نتالیہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور گھر کی طرف بھاگ گئی۔

نتالیا گفتگو کے اس غیر متوقع موڑ سے اتنی حیران ہوئی تھی کہ وہ ولاتیف کو دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گئی۔ ولاتیف ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ وہ پندرہ منٹ پہلے مادام لاسنکایا کے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے گھر کی مالکہ کو نشست گاہ میں پایا تھا۔ اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد نتالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ ایک عاشق کے سے احساس کے ساتھ وہ سیدھا باغ میں پہنچا تھا۔ اس وقت نتالیا اپنا ہاتھ رودن کے ہاتھوں سے چھڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ نتالیا کی طرف دیکھتا رہا۔ رودن پیڑ کی اوٹ سے باہر نکلا۔ رودن نے جب اپنی نظر اٹھائی تو اس نے ولاتیف کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں نے سر جھکا کر ایک دوسرے کو سلام کیا۔ اور دونوں الگ الگ سمتوں میں چل دئے۔

"یہ ابھی انجام نہیں ہے۔" دونوں سوچ رہے تھے۔

ولاتیف باغ میں ٹہلتا رہا۔ اور جی ہی جی میں بل کھاتا رہا۔ اس کے دل پر منوں بوجھ تھا اور بعض اوقات اس کا خون کھولنے لگتا۔ بجلی کی کوندا پاس لپکنے لگی تھی۔ رودن اپنے کمرے میں پہنچا وہ بہت پریشان تھا۔ کھانے کی میز پر کوئی بھی سیدھی نہیں تھی۔ نتالیا کا دل تنگ تھا وہ بمشکل کرسی پر بیٹھ سکی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھا رہی تھی۔ ولاتیف جس طرح اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ نتالیا سے

بات کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس روز پگاسف بھی مادام لاسنکایا کے یہاں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ سب سے زیادہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو بھی کتوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسی چھوٹی دم کے کتے، لمبی دم کے کتے۔ چھوٹی دم کے کتے یا آدمی ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ مگر جن کتوں کی دم گھنی اور لمبی ہوتی ہے وہ ہمیشہ تقدیر کے دھنی ہوتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "میرا شمار چھوٹی دم والے کتوں میں ہوتا ہے اور پاگل بنا دینے والی بات تو یہ ہے کہ دم میں نے خود چھوٹی کی ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں —" رودن بولا — "تم وہ بات کہنا چاہتے ہو جو کہ راچے فوکو لڑ بہت پہلے کہہ چکا ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ کرو تو دوسرے تم پر بھی بھروسہ کرنے لگیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر دم کہاں سے آ گئی۔"

"ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جس طرح وہ چاہے آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔" ولاتیف نے غضب آلود ہو کر کہا۔ "اور اگر آپ مطلق العنانی کے بارے میں میری رائے پوچھتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ان نام نہاد ہوشیار اشخاص کی مطلق العنانی سے بڑی چیز دنیا میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ خدا انہیں غارت کرے۔"

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر آدمی ولاتیف کے یک بیک بھڑک اٹھنے پر حیران رہ گیا تھا۔ رودن نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں کی نگاہیں دیر تک متصادم نہ رہ سکیں۔ رودن مسکرایا اور خاموش رہا۔

"اچھا تو تم بھی دم کٹے کتے ہو —" پگاسف سوچ رہا تھا۔

نتالیا کا کلیجہ اس کے منہ کو آ گیا تھا۔ مادام لاسنکایا بھی ولاتیف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس خاموشی کو توڑا اور ایک وزیر کے کتے کا ذکر لے بیٹھی۔

کھانا ختم ہوتے ہی ولاتیف نے اجازت چاہی اور جاتے جاتے وہ نتالیا سے دبی زبان میں کہہ گیا — "تم کیوں پریشان ہوتی ہو جیسے تم کوئی مجرم ہو۔ تم کبھی کسی کے سامنے مجرم نہیں ہو سکتیں۔"

نتالیا اس کی بات کے مطالب نہ سمجھ سکی اس نے ولاتیف کی طرف بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔

جانے سے پہلے رودن اس کی میز کے قریب آیا اور اچانک خوشی سے کے بہانے کہتے ہوئے اس نے کہا "یہ سب باتیں ایک خواب ہیں۔ کیا نہیں ہیں؟ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" اور پھر اس نے نتالیا کی طرف ذرا اور جھکتے ہوئے کہا۔ "دس بجے باغ میں آنا میں تمہارا منتظر رہوں گا"

رودن میران پگاسف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ آج کی شام کا ہیرو پگاسف تھا۔ مادام لاسنکا یا اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پہلے تو پگاسف نے اپنے ایک پڑوسی کی کہانی سنائی جو زن مرید تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ خود بھی نسوانی حرکات کرنے لگا۔ اور ایک دن تو اس نے اپنے کوٹ کا کنارا اس طرح اوپر اٹھایا جیسے عورتیں پیٹی کوٹ اٹھاتی ہیں۔ پھر اس نے دیہات میں رہنے والے ایک رئیس کا قصہ چھیڑ دیا۔ مادام لاسنکا یا خوب ہنس رہی تھی۔ پگاسف اپنی عورتوں پر فتوحات کا بھی ذکر کر رہا تھا وہ بتا رہا تھا کہ عورت کو عورت بنا دینا یا محبت میں مبتلا کر دینا نہایت آسان ہے بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کسی روز تک لگاتار اس سے یہ کہو کہ اس کے ہونٹ بہشت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں اور دوسری تمام عورتیں کھلونے ہیں گیارہویں دن وہ خود یہ سمجھنے لگے گی کہ اس کے ہونٹ جنت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں۔ وہ تم سے عشق کرنے لگے گی۔ یہ باتیں اکثر ہوتی ہیں۔ شاید پگاسف ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ساڑھے نو بجے رودن باغ میں پہنچ گیا آسمان پر کوئی کوئی ننھا سا تارا ٹمٹما رہا تھا اور سامنے سارا گھر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ کھڑکیوں میں نہایت مدھم روشنی تھی۔ رودن اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا سانس روک رکھا تھا۔ آخرکار اسے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔

رودن اچھل کر نتالیا کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ لڑکی کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے "نتالیا" رودن نے سرگوشی کے الفاظ میں کہا "میں کل تک انتظار نہ کر سکا میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے خود مجھے یہ معلوم نہیں تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں"

نتالیا کے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں کپکپا اٹھے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" رودن نے دوبارہ کہا "میں اب تک اندھا تھا۔ ویسے میں تم سے ایک مدت سے محبت کر رہا ہوں اور تم نتالیا۔؟"

نتالیا نے سانس لیتے ہوئے کہا "تم دیکھ تو رہے ہو کہ میں یہاں ہوں"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ——!" اس نے سرگوشی کی۔

رودن نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

"مجھے چھوڑ دو میں خوفزدہ ہوں —— میرا خیال ہے کہ کوئی میری باتیں سن رہا ہے"

"اس کی پروا نہ کرو —— تم دیکھ تو رہی نہیں کہ دو پہر میں نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا"

نتالیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے جانے دو"

"صرف ایک لمحہ کے لئے ٹھہرو"

"تم مجھ سے خوفزدہ دکھائی دیتی ہو"

"نہیں —— مجھے اب جانا چاہیئے"

"ایک بات بتاتی جاؤ ——"

"تم خوش ہو نا؟" نتالیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں۔ کیا تمہیں کوئی شک ہے"

نتالیا نے جھکی ہوئی ابرو اٹھائی۔ اس وقت وہ بہت حسین پرجذبات اور پرشباب دکھائی دے رہی تھی۔

"تو اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری ہوں ——"

"یا میرے خدا!" رودن کے منہ سے نکلا۔

نتالیا اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رودن ویسے ہی بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار تھا۔ "میں خوش ہوں ——" اس نے زیر لب کہا —— "ہاں بہت خوش ہوں" جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش

لیا ہوتے وہ تن کر کھڑا ہو گیا اس نے اپنے سینوں کو جھٹکا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان کی طرف بڑھا۔

اسی اثنا میں ننھے ننھے تنکوں کی جھیڑوں میں سے باہر نکلا اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنے آپ سے کہا " مادام لاسنکایا تو یہ تمام ماجرا بتاتا ہوگا " یہ کہہ کر وہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ولاتیف جب گھر پہنچا تو وہ اس قدر اُداس تھا کہ اس نے اپنی بہن کے سوالوں پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور فوراً کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور مادام سنہا نے فیصلہ کیا کہ وہ اندر سے لزنف کو بلوائے اور اس سے مشورہ کرے۔ لزنف کے یہاں سے پیغام آیا کہ وہ کل صبح آئے گا۔

دوسرے دن صبح کو بھی لزنف اُداس اور کھویا کھویا سا تھا۔ وہ چائے پینے کے بعد کھیت پر کام کرنے کی غرض سے جانا چاہتا تھا۔ مادام سنہا کی نگاہیں اپنے بھائی کی نگاہوں سے ملیں مگر اس نے کوئی سوال کرنے سے احتراز کیا۔ اتنے میں ایک گاڑی صدر دروازے کے آگے آ کر رکی۔

"خدا کا شکر ہے" وہ بولی "ضرور لزنف آیا ہوگا" اتنے میں ایک ملازم اندر آیا اور اس نے رودن کی آمد کا اعلان کیا۔

ولاتیف نے اپنی کتاب میز پر پھینک دی اور گردن اٹھا کر پوچھا "کون؟"

"مسٹر رودن" ملازم نے جواب دیا۔

ولاتیف اچھل کر کھڑا ہو گیا "انہیں اندر لے آؤ" پھر وہ اپنی بہن سے مخاطب ہوا "بہن تم ہمیں ایک لمحے کے لئے تنہا چھوڑ دو"

"اسی کی وجہ میں بعد میں بتاؤں گا"

رودن کمرے کے اندر داخل ہوا۔ ولاتیف کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ نہیں پیش کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری آمد کی توقع نہیں ہو گی" رودن نے اندر آتے ہی کہا اور اپنی ٹوپی میز پر پھینک دی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو پا رہا تھا۔ اور اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بالکل نہیں" ولاتیف نے جواب دیا "کل رات جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد تو مجھے تمہاری طرف سے پیغام کی توقع تھی اور یہ توقع نہیں تھی کہ تم خود آؤ گے"

"سمجھا" رودن نے بیٹھتے ہوئے کہا "میں تمہاری صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ میں خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں ایک شریف انسان کی طرح"

"ان صفات کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں اپنی آمد کو مقصد بنانا چاہتا ہوں"

"ہم دوسرے کو جانتے ہیں تکلیف کی کیا ضرورت ہے"

"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات پر دھیان دو گے"

"کچھ کہو گے بھی کہ نہیں" اس نے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے رودن کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں اور فوراً ان کی ابتدا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ایک تیسرے آدمی کا سوال بھی ہے"

"وہ تیسرا آدمی کون ہے؟"

"نہیں معلوم ہے۔ مسٹر ولاتیف"

"نہیں دفتری نکولے وچ میں اسے نہیں جانتا"

"تو تم جانتے ہو"

"میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ تم ادھر اُدھر کی باتیں چھوڑو اور اصل بات کرو"

ولاتیف کا غصہ دم بدم تیز ہوتا رہا تھا۔ رودن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "اچھا تو میں اس کا آغاز کرتا ہوں"

"ویسے تمہیں اس کا اندازہ بھی ہے۔ مجھے نتالیا سے محبت ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے"

ولاتیف کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ خاموش رہا کھڑکی کے قریب جا کر وہ رودن کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم تو سمجھے ہو گے" رودن بولا "اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں یہاں نہ آتا"

چلنے سے پہلے رودن اس کی میز کے قریب آیا اور اسے خدا حافظ کہنے کے بہانے کہتے ہوئے اس نے کہا "یہ سب باتیں ایک خواب ہیں۔ کیا نہیں ہیں؟ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" اور پھر اس نے نتالیا کی طرف ذرا اور جھکتے ہوئے کہا۔ "دس بجے باغ میں آنا میں تمہارا منتظر رہوں گا"

رودن میران پگاسف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ آج کی شام کا ہیرو پگاسف تھا۔ مادام لاسنسکایا اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پہلے تو پگاسف نے اپنے ایک پڑوسی کی کہانی سنائی جو زن مرید تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ مرد خود بھی نسوانی حرکات کرنے لگا۔ اور ایک دن تو اس نے اپنے کوٹ کا کنارا اس طرح اوپر اٹھایا جیسے عورتیں بیٹھی کوٹ اٹھاتی ہیں۔ پھر اس نے دیہات میں رہنے والے ایک رئیس کا قصہ چھوڑ دیا۔ مادام لاسنسکایا خوب ہنس رہی تھی۔ پگاسف اپنی عورتوں پر فتوحات کا بھی ذکر کر رہا تھا وہ بتا رہا تھا کہ عورت کو عورت بنا دینا یا محبت میں مبتلا کر دینا نہایت آسان ہے بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کسی روز تک لگاتار اس سے یہ کہو کہ اس کے ہونٹ بہشت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں اور دوسری تمام عورتیں کھلونے ہیں گیارہویں دن وہ خود یہ کہنے لگے گی کہ اس کے ہونٹ جنت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں۔ وہ تم سے عشق کرنے لگے گی۔ یہ باتیں اکثر ہوتی ہیں شاید پگاسف ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ساڑھے نو بجے رودن باغ میں پہنچ گیا آسمان پر کوئی کوئی ننھا سا تارا ٹمٹما رہا تھا اور سامنے سارا گھر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا کھڑکیوں میں نہایت مدھم روشنی تھی۔ رودن اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا سانس روک رکھا تھا۔ آخرکار اسے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آرہا تھا۔

رودن اچھل کر نتالیا کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ لڑکی کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے "نتالیا" رودن نے سرگوشی کے الفاظ میں کہا "میں کل تک انتظار نہ کر سکا میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے مجھے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں"

نتالیا کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں کپکپا اٹھے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" رودن نے دوبارہ کہا "میں ابھی تک اندھا تھا۔ ویسے میں تم سے ایک مدت سے محبت کر رہا ہوں اور تم نتالیا۔؟"

نتالیا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ تو رہے ہو کہ میں گئی ہوئی ہوں"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ——!" اس نے سرگوشی کی۔

رودن نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

"مجھے چھوڑ دو میں خوفزدہ ہوں —— میرا خیال ہے کہ کوئی میری باتیں سن رہا ہے"

"اس کی پرواہ نہ کرو —— تم دیکھ تو رہی نہیں کہ دوپہر کو میں نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا"

نتالیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے جانے دو"

"صرف ایک لمحہ کے لئے ٹھہرو"

"تم مجھ سے خوفزدہ دکھائی دیتی ہو"

"نہیں —— مجھے اب جانا چاہئے"

"ایک بات بتاتی جاؤ"

"تم خوش ہو نا؟" نتالیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں۔ کیا تمہیں بھی کوئی شک ہے"

نتالیا نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس وقت وہ بہت حسین۔ پُرجذبات اور پُرشباب دکھائی دے رہی تھی۔

"تو اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری ہوں"

"اوہ میرے خدا!" رودن کے منہ سے نکلا۔

نتالیا اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رودن وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔

"میں خوش ہوں" اس نے زیرلب کہا "ہاں میں بہت خوش ہوں" جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش

پیا ہوگیا۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے بیوں کو جھٹکا دیا اور
تیز قدم اٹھاتا ہوا اصطبل کی طرف بڑھا۔
اصطبل میں پہنچ کر اس نے ... کو کھینچتے ہوئے پیڑوں میں سے باہر نکلا
سامنے ایک ہونٹ بھینچ کر اپنے آپ سے کہا: مادام لاسکایا
کو یہ تمام ماجرا بتانا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ بھی تاریکی میں غائب ہوگیا۔

ولاتیف جب گھر پہنچا تو وہ اس قدر اداس تھا کہ اس نے
اپنی بہن کے جملے پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور فوراً کمرے میں
جاکر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ادھر مادام سنہا نے فیصلہ کیا کہ
وہ اندرے لزنف کو بلوائے اور اس سے مشورہ کرے۔ مزنف
کے یہاں سے پیغام آیا کہ وہ کل صبح آسکے گا۔

دوسرے دن صبح کو بھی لزنف آیا۔ اداس اور کھویا کھویا سا
تھا۔ وہ چلنے پھرنے کے بعد کھیت پر کام کرنے کی غرض سے جانا چاہتا تھا۔
مادام سنہا کی نگاہیں بھتیجے بھائی کی نگاہوں سے ملیں۔ مگر اس نے کوئی
سوال کرنے سے احتراز کیا۔ اتنے میں ایک گاڑی صدر دروازے
کے آگے آکر رکی۔

"خدا کا شکر ہے" وہ بولی۔ "ضرور لزنف آیا ہوگا۔" اتنے
میں ایک ملازم اندر آیا اور اس نے رودن کی آمد کا اعلان کیا۔
ولاتیف نے اپنی کتاب میز پر پھینک دی اور گردن اٹھا کر پوچھا
"کون؟"
"مسٹر رودن" ملازم نے جواب دیا۔
ولاتیف اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "انہیں اندر لے آؤ"
... بہن سے مخاطب ہو کر ... تم مجھے ایک لمحے کے لئے تنہا
چھوڑ دو۔
"اس کی وجہ میں بتاؤں گا۔"
رودن کمرے کے اندر داخل ہوا۔ ولاتیف کرسی کے پیچھے
کھڑا تھا۔ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ تک نہ بڑھایا۔
"مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری آمد کی توقع نہیں ہوگی۔" رودن
نے اندر آتے ہی کہا اور ٹوپی میز پر پھینک دی۔ اس کے ہونٹ
... تھے ... اپنی گھبراہٹ کو
چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔" ولاتیف نے جواب دیا۔ "کل رات جو کچھ ہوا
ہے اس کے بعد تو مجھے تمہاری طرف سے پیغام کی توقع تھی اور یہ توقع
نہیں تھی کہ تم خود آؤ گے۔"
"سمجھا۔" رودن نے بیٹھے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری
صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ میں خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں
ایک شریف انسان کی طرح۔"
"ان صفات کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟"
"میں اپنی آمد کو مقصد بتانا چاہتا ہوں۔"
"ہم دوسرے کو جانتے ہیں تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔"
"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات پر دھیان دو گے۔"
"کچھ کہو گے بھی کہ نہیں۔" اس نے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے
رودن کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔
"میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں اور فوراً ان کی ابتدا
نہیں کر سکتا۔"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ ایک تیسرے آدمی کا سوال بھی ہے۔"
"وہ تیسرا آدمی کون ہے؟"
"تمہیں معلوم ہے۔ مسٹر ولاتیف۔"
"نہیں دفتری نکولے وچ میں نہیں جانتا۔"
"تو تم چاہتے ہو"
"میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ تم ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ کر
اصل بات کرو۔"
ولاتیف کا غصہ دم بدم تیز ہوتا جا رہا تھا۔
رودن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا — "اچھا تو میں گفتگو کا
آغاز کرتا ہوں۔"
"ویسے تمہیں اس کا اندازہ بھی ہے ... غالباً محبت
ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"
ولاتیف کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ خاموش رہا ... کھڑکی کے
قریب جا کر وہ رودن کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔
"تم تو سمجھ ہو" رودن بولا۔ ...
... ہے۔

"وہ میرے ضرور ہے" واثیق بے ساختہ بول اٹھا "مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں۔"

"مبارک ہو۔ لیکن تم مجھے یہ خبر سنانے کیوں آئے ہو؟ مجھے اس سے واسطہ؟ مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔ کہ تم کس سے محبت کرتے ہو۔ اور کون تم سے محبت کرتا ہے۔ اور یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

واثیق کھڑکی میں سے باہر گھورتا رہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ رودن اٹھ کھڑا ہو گیا۔ "میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے تم سے یہ راز چھپانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ اس لئے آیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تمہیں دھوکے میں رکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کالا ایک کے لئے دل میں کیا جذبہ رکھتے ہو۔ اب جب کہ قدرت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں فریب سے کام نہیں لینا چاہئے۔"

واثیق ابھی تک سینہ پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا جیسے دل میں اٹھتے ہوئے جذبات کے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"مسٹر واثیق" رودن نے آگے چل کر کہا "میں نے تمہارے احساسات کو مجروح کیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں۔ مگر مجھے بخش دو۔"

واثیق ہنسا اور بولا "کیا تم صرف اپنی طرف سے بول رہے ہو۔ کیا تم کو اس کا مقصد معلوم ہے؟"

رودن ایک لمحہ کے لئے حیرت زدہ رہ گیا: "نہیں۔ میں نے ابھی اسے اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری ہم خیال ہے۔"

"تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں صرف کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے مکار اور سازشی خیال نہ کرو۔ میرے خلوص پر شبہ نہ کرو۔ ہمیں دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہئے۔ مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔" یہ کہہ کر رودن نے واثیق کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔" واثیق رودن کے روبرو ہوتے ہوئے اور ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "میں تمہارے ارادے سے انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ارادے نیک اور عظیم ہیں۔ لیکن ہم جیسا سادہ لوح شخص تمہارے ذہن کی پرواز کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک پر خلوص ہے وہ میرے نزدیک خود غرضی ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک سیدھی اور واضح ہے وہ میرے لئے ایک الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ مجھے معاف کیجئے میں تمہیں اپنا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ اور تم سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔"

رودن نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور افسردہ لہجہ میں کہا "اچھا تو مسٹر واثیق خدا حافظ! میں نے تم سے غلط توقع رکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے یہی سلوک کرنا چاہئے تھا۔ تم راستی پر ہو۔ الوداع! مگر مجھے تم پر اب بھی اعتماد ہے۔"

"خدا حافظ" واثیق بولا "میں نے تمہارا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ اور تمہیں بھی حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر اعتماد کرو۔"

رودن کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ واثیق نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

اتنے میں دروازے کے باہر سے ایک بہن کی آواز سنائی دی "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

واثیق نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن نہ جانے اس نے کیا سوچ کر کہا "ایک لمحہ کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر دروازے تک آئی۔ "وقت آ گیا ہے۔ کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" وہ صوفے کے قریب بازو دالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

واثیق کی نبضوں کے بل ڈھیلے ہو گئے۔ اور اس نے اپنی دوست کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس نے رودن کے متعلق ساری گفتگو بیان کر سنائی۔ اس نے ابھی تک کالا ایک سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی محبت چھپی ہوئی نہیں۔

"مجھے رودن سے تو بہت عجیب و غریب باتوں کی توقع تھی لیکن اس کا یہ قدم دکھائی ہی نہیں تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ [illegible] ہے۔"

"[illegible] کو کیا بھیجنا چاہتا تھا۔ شروع یہاں کیوں آیا؟"

"میرے دوست اس کا کوئی مقصد نہیں [illegible] نہیں تھی۔"

بیا کر یا واقعی نیک دل کا ثبوت ہے۔ وہ یہاں اپنی خوش بیانی
کرنے آیا تھا۔ اور وہ ایسے مواقع کی تلاش رہتا ہے۔ یہ ایک
موقع تھا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی زبان
ہی اس کی دشمن ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان اس کی غلام
بھی ہے۔ خادم بھی ہے۔"

ذرا اس کی حماقت تو دیکھو۔ جیسے یقین کے ساتھ یہاں آیا اور
نہایت بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ
اس کی اس حرکت کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ فلسفہ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ایک طرف تو یہ فلسفہ ہے اور دوسری طرف اس کی
یہ حرکت بالکل ایک مقصد رکھتی ہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ ایک بہت بڑے جھوٹ سے کام لے
رہا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ آؤ پائپ سلگائیں اور
تمہاری بہن کو آواز دیں۔ وہ بھی چائے پئیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ انگو! تم ذرا اب اندر آ جاؤ۔" اس نے
اپنی بہن کو آواز دی۔

ملازم چائے اندر آئی تو اس نے اپنی بہن کے ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لئے اور اس پر بوسہ دیا۔

روون گھر لوٹا تو وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ وہ بہت آپے
[illegible] ناراض تھا اپنے اوپر ملامت کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس نے
بے بیگانہ حرکت کیوں کی۔ اس بات سے زیادہ تکلیف دہ کوئی
اور بات نہیں ہوتی۔ جب انسان کو احساس ہو کہ اس سے حماقت
سرزد ہوئی ہے۔

[illegible] تھا۔۔۔ میں اس جگہ رہ کے یہاں کیوں
گیا۔ کس بات نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

اس انتظار [illegible] بیٹھا [illegible] ناشتہ
[illegible] مگر [illegible] میں [illegible]
تھی۔ [illegible] کمرے میں جانے کی اجازت تھی
اور وہ [illegible] روون کو [illegible]
[illegible] کے ساتھ اپنے کمرے

میں تھی۔ جس وقت وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کی مڈبھیڑ
نتالیا سے ہوئی۔ اس نے اس کی طرف اجنبی نگاہ سے دیکھا۔ اور
روون کا دل ڈوب گیا۔ اس کے چہرے میں ایک نمایاں تبدیلی
آ گئی تھی۔ روون کے دل میں غلط فہمیاں سر اٹھانے لگیں۔ وہ میں
لوف سے ملنے چلا گیا اور بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دو گھنٹہ
کے بعد مادام [illegible] نشست گاہ میں آئی۔ وہ روون سے خندہ
پیشانی کے ساتھ ملی۔ مگر اس سے الگ تھلگ رہی۔ کبھی وہ مسکراتی
اور کبھی ناک بھوں چڑھاتی۔ روون کے ساتھ وہ سرد مہری
سے پیش آ رہی تھی۔۔۔ "آخر معاملہ کیا ہے؟" روون
سوچ رہا تھا۔

اُسے زیادہ دیر تک یہ سوچنا نہ پڑا۔ وہ جب اپنے
کمرے میں آدھی رات کو لوٹ رہا تھا تو تاریک ڈیوڑھی میں
کسی نے اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دے دیا۔ اس نے
دیکھا کہ ایک لڑکی الٹے پاؤں واپس جا رہی تھی۔ اس نے پہچان لیا
یہ نتالیا کی خادمہ تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے نوکر
کو باہر بھیج دیا اور نتالیا کا خط پڑھنے لگا۔

"کل صبح ساڑھے چھ بجے اودیلوکن تالاب کے کنارے
پہنچ جانا۔ اس وقت کے سوا ملاقات مشکل ہے۔ یہ ہماری
آخری ملاقات ہوگی۔۔۔ یہ انجام ہوگا۔۔۔ ضرور آنا۔
ہمیں جلد فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور اگر تم نہ آئے تو ہم ایک
دوسرے سے مل نہ سکیں گے۔ اور ایسی حالت میں تمہیں پھر
ایک رقعہ بھجواؤں گی۔"

روون سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ رقعہ اپنے تکیے کے
نیچے رکھ دیا۔ لباس تبدیل کیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ اسے
دیر تک نیند نہ آئی۔۔۔ ابھی پانچ بھی نہیں بجے تھے کہ وہ
بیدار ہو گیا۔

اودیلوکن تالاب جہاں نتالیا کو روون سے ملنا تھا۔
اب تالاب نہیں رہا تھا۔ تیس سال ہوئے اس کا پانی خشک
ہو گیا تھا [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] لوگ پہچان سکتے تھے کہ یہاں کبھی کوئی تالاب

تالاب کے کنارے ایک جاگیردار کا گھر تھا۔ لیکن اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

اس تالاب کے بارے میں دیہاتی لوگوں میں عجیب و غریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تالاب کے کنارے صنوبر کے جو دیو قامت درخت تھے ان کے نیچے لوگوں کا خیال تھا کہ بھیانک جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے یہ مقام آسیب زدہ خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ اس تالاب کی طرف محض اشد ضروری کام کی غرض سے آتے تھے ورنہ اس سے دور ہی رہتے تھے نتالیا نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

سورج آسمان میں کافی بلند ہو چکا تھا جب رودن دیو کن تالاب پہنچا تو یہ ایک سہ کیف صبح تھی۔ آسمان میں دودھیا رنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ رودن وہاں ٹہلنے لگا۔ وہ بہت بے قرار اور مضطرب تھا۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ انجام قریب ہے۔ ادھر رودن ٹہل رہا تھا اور ادھر نتالیا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی تالاب کی طرف بڑھ رہی تھی —— سینیورا نتالیا آپ کے پاؤں بھیگ جائیں گے۔ اس کی خادمہ بار بار اسے خبردار کر رہی تھی۔

نتالیا اس کی التجاؤں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

— سینیورا مونزیل کیا ہوگا اگر لوگ ہمیں یہاں دیکھ لیں گے۔

اگر سینیورا مونزیل یون کو رسٹ بیدار ہو گئیں تو کیا ہوگا — مونیور رودن —— خادمہ کی رودن پر نگاہ پڑی —— وہ اسی طرح سب کے سامنے کیوں کھڑے ہیں؟ وہ کہیں چھپ کیوں نہیں گئے؟

— ماشا تم یہاں ٹھہرو —— نتالیا نے اپنی پریشان خادمہ سے کہا —

رودن نتالیا کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے کے آثار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نتالیا کے ابروؤں پر بل تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی جھلک تھی —

— دمتری نکولائیوچ ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ میں صرف چند منٹوں کے لئے یہاں آئی ہوں۔ میں تمہیں بتا دوں۔ میری والدہ کو سب باتوں کا علم ہے۔ چند دن سے وہ ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ وہ آنکھ کا جاسوس ہے۔ اس نے کل مجھے بلا کر سب کچھ بتا دیا تھا۔

— اوہ میرے خدا —— رودن کے منہ سے نکلا — [illegible]

پڑا ہوا — تمہاری اماں نے کیا کہا —؟

— وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے — اور اس نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں ڈانٹا۔ صرف اتنا کہا کہ میں بچوں کی طرح عمل کر رہی ہوں؟

— بس؟

— ہاں — اور یہ کہا کہ اگر میں تم سے شادی کروں گی تو ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔

— کیا انہوں نے یہ کہا تھا؟

— ہاں —— اور میری اماں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے — تم مجھ سے محبت کی پینگیں محض اس لئے بڑھا رہے ہو کہ تم بے کیفی محسوس کر رہے ہو اور انہیں اس بات کی تم سے توقع نہیں تھی ——

نتالیا کا لہجہ نہایت پھیکا تھا۔

— تم نے ان سے کیا کہا نتالیا؟

میں نے ان سے کیا کہا؟ نتالیا نے اس کا سوال دہرایا اور کہا۔ تم اب کیا کرنا چاہتے ہو؟

— اوہ میرے خدا — کس قدر ظلم ہے — کیا تمہاری والدہ بہت ناراض تھیں؟

— ہاں —— وہ تو تمہارا نام تک سننا نہیں چاہتیں —

— اوہ کس قدر ظلم ہے — پھر تو کوئی امید نہیں؟

— کوئی نہیں —

— نتالیا تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے — مجھے صرف یہ خوف ہے کہ تم کس قدر پرسکون ہو —

— تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خوفزدہ پریشان نہیں ہوں؟

— رودن نے ٹہلنا شروع کر دیا —— تمہاری والدہ نے سوالات تو نہیں کئے؟

— ہاں — اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں کہ نہیں —

تو تم نے کیا جواب دیا؟

نتالیا ایک لمحے کے لئے رکی [illegible] بول سکی —

— تم کتنی نیک دل [illegible]

سمجھتا ہو تو سہی — کیا تمہاری والدہ ہماری شادی کے سخت خلاف ہیں؟
"میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ اسے یقین ہے کہ تم مجھ سے
شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"
"وہ مجھے دغاباز سمجھتی ہیں۔ میں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے؟" روون
نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
"فضول باتوں سے کیا — ہم وقت ضائع کر رہے ہیں —" نتالیا
بولی "یہ بات یاد رکھو کہ میں پھر کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ میں
یہاں رونے اور شکوہ کرنے کے لئے نہیں آئی۔ میں تم سے مشورہ کرنے
آئی ہوں۔"
"میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں نتالیا؟"
"کیا مشورہ دے سکتے ہو —؟ تم مرد ہو — مجھے تم پر پورا بھروسہ
ہے۔ میں آخر دم تک تم پر بھروسہ کروں گی — مجھے بتاؤ تمہارا
ارادہ کیا ہے؟"
"میرا ارادہ — تمہاری ماں مجھے گھر سے نکال دیں گی۔"
"ہو سکتا ہے — وہ کل مجھے بتا چکی کہ وہ تم سے کوئی واسطہ
نہیں رکھے گی۔"
"مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"
"یہی کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔"
"ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"
"ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" روون نے پھر اس کا سوال دہرایا۔
"ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔"
"پیچھے ہٹ جانا چاہئے" نتالیا نے ہونٹوں کو بھینچتے
کہا۔ اور اس کے ہونٹ سفید ہو گئے۔
"ہاں قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ ہم اور
کیا کر سکتے ہیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کام
کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اگر امیر بھی ہوتا تو کیا میں تمہاری والدہ کے
غصہ کی تاب لا سکتا تھا۔ کیا میں تمہارے کہنے سے اس طرح الگ ہو سکتا تھا؟
نہیں نتالیا میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں
کا ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنا تقدیر میں نہیں لکھا تھا۔ اور
ہم نے محض جھوٹی مسرت کا خواب دیکھا تھا۔"
نتالیا ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"نتالیا، عزیز از جان نتالیا" — روون چلا اٹھا "اس طرح
کیوں روتی ہو — مجھے کیوں کرب و اذیت سے دوچار کرتی ہو —
اپنے آپ کو ذرا سنبھالو۔"
نتالیا نے اپنا سر اوپر اٹھایا "تم مجھے مشورہ دے رہے
ہو کہ میں چپ ہو جاؤں۔"
اس نے کہا "میں اس بات کے لئے آنسو نہیں بہا رہی ہوں
جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو — مجھے اس بات پر رنج ہو رہا
ہے کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی — میں اس وقت یہاں تم سے
مشورہ لینے آئی تھی، اور تم سب سے پہلی بات مجھ سے یہ کہہ رہے
ہو کہ میں ہتھیار ڈال دوں۔ کیا تم آزادی اور اختیار کے بارے میں
تم اپنے خیالات کو یونہی عمل میں لاتے ہو۔"
یہاں پہنچ کر اس کی آواز ٹوٹ گئی۔
"لیکن نتالیا —" روون نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے
کہا "یاد رکھو کہ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"
"تم نے مجھ سے ابھی پوچھا تھا کہ میں نے اپنی والدہ کو کیا جواب
دیا۔ جب اس نے کہا تھا کہ میں نے اگر تم سے شادی کی تو وہ ہمیشہ کے لئے
اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے اسے
کیا جواب دیا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر کسی دوسرے شخص سے
میری شادی کی گئی تو میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ اب میں سوچتی
ہوں کہ میری والدہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کہ تم میری طرف اس لئے متوجہ
ہو کر یہاں بے کیفی محسوس کر رہے ہو۔"
"نتالیا میں قسم کھاتا ہوں — میں تمہیں یقین دلاتا ہوں
کہ ———"
لیکن نتالیا نے روون کی بات سننے سے انکار کر دیا۔
"اگر تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ خیر
اب تو بات ہی ختم ہو گئی۔"
"ذرا صبر سے کام لو — ہم دونوں کو مل کر سوچنا چاہئے
کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"
"تم بہت باتیں کرتے رہے ہو۔ مگر مجھے اس وقت [illegible]
یہ کہا ہو کہ نتالیا میں تم سے محبت کرتا ہوں — مگر [illegible]
کر سکتا — وہ مجھے اپنا ہاتھ دے [illegible]

کیونکہ تمہارے ساتھ زندگی میں ہر بات کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن بات اور عمل میں بہت فرق ہوتا ہے "

روزن کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ نتالیا کے بے باک الفاظ نے اس پر بہت اثر کیا۔ نتالیا کمرے کا فرش تکنے لگی۔ اس کی خود پسندی پر بھرپور ضرب لگائی۔

"نتالیا اس وقت تم اپنے آپے میں نہیں ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ اس وقت تم کس قدر سنگدلی کے ساتھ مجھے دکھ پہنچا رہی ہو۔ مگر وقت آئے گا جب تم میرے ساتھ انصاف کرو گی۔ اس وقت تمہاری سمجھ میں یہ بات آسکے گی کہ اس مسرت کو ترک کرتے ہوئے کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے"

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں نے تم پر اعتبار کیا۔ آئندہ بات کرنے سے پہلے تول لیا کرو۔ جب میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے تو اس بات کے مفہوم کو بھی جانتا تھا۔ میں ہر بات کے لئے تیار رہتی ... جو مسرتیں تم نے مجھے دی ہیں اس کے لئے تمہارا شکر گزار رہوں گی الوداع!

"ٹھہرو خدا کے لئے ٹھہرو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں میں نے تمہاری نفرت کا ہدف بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ جو تم کہتا تھا بجا ہے تم خدا میری جگہ سے کر سوچو میں تمہارے اور اپنے دونوں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں فوراً پیشکش کی ہوتی کہ آؤ بھاگ چلیں جلد یا بدیر تمہارے والد نے ہمیں معاف کر دیا ہوتا۔ لیکن اپنی مسرت کے بارے میں سوچنے سے پہلے میں نے ..... وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے ہو کہ تم ایک باعزت شخص ہو "

نتالیا بولی " مجھے اس بارے میں ذرہ بھر شک نہیں۔ لیکن کیا میں تمہاری جانب سے اس ثبوت کے لئے یہاں آئی ہوں؟
"نتالیا مجھے خیال نہیں تھا کہ "

"آہ آخر تم نے وہ بات کہہ دی نا ! تمہیں یہ خیال نہیں تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا ۔" گھبراؤ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ اور میں خود کو تم پر تھوپنا نہیں چاہتی تھی مجھے تم سے محبت ہے " روزن بولا "

نتالیا تم کو کیا ہو گیا ہے " ہو سکتا ہے لیکن وہ محبت کہاں ہے؟

شاید تمہیں اپنے الفاظ یاد ہوں۔ پہلی ملاقات کے بعد محبت ہو جانے پر تم مجھ سے بلند درجہ رکھتے ہو۔ میرا اور تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تمہاری ہی منزل تھی۔ مجھے وہ دن یاد رہے گا۔ خدا حافظ "

"نتالیا تم جا رہی ہو؟ کیا ہمیں اس طرح ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا؟"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نتالیا رک گئی۔ روزن کی التجا نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا۔

"نہیں " وہ بولی " مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چیز میرے اندر ٹوٹ گئی ہے۔ میں یہاں آئی اور تم سے اس طرح باتیں کرتی رہی جیسے مجھے ہوش آنا چاہئے۔ جب میں یہاں آئی تو میں اپنے گھر کو اپنے تمام ماضی کو خیرباد کہہ کے آئی تھی۔ لیکن میری یہاں کس سے ملاقات ہوئی؟ ایک کمزور اور ناتواں دل شخص سے جو یہ وہم کیونکر ہوا کہ میں اپنے کنبے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تم واقعی دفتری معذوں ہو۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو میں نے اُسے بھی محسوس کر لیا ہوتا۔ مگر نہیں ---- اچھا خدا حافظ۔!"

وہ مڑی اور اپنی خادمہ ماشا کی طرف دوڑی۔ ماشا بڑی دیر سے اُسے اشارے کر رہی تھی۔

"تم بزدل ہو نتالیا۔ میں بزدل نہیں ہوں ---" روزن ات زور سے چلا یا۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے ہوئے نتالیا کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف بڑھتی رہی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اسے چکر سا آیا اور وہ اپنی خادمہ ماشا کے بازوؤں میں جا گری۔

روزن اس تالاب کے پاس بہت دیر تک کھڑا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت شرمندہ اور مضطرب تھا "کیا لڑکی ہے!" وہ سوچ رہا تھا " اور مجھ میں اتنا میرے سے زیادہ نہیں۔ نہیں میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ حیرت انگیز لڑکی ہے۔ کیا خوبصورت ارادے رکھتی ہے۔" وہ ٹھیک کہتی ہے "نہیں اس کی محبت کا مستحق نہیں ہوں"

اور گھر پہنچ کر روزن کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ [illegible] تھا۔ خود اس نے ایک دوسرے کی جگہ [illegible] ۔ روزن جلد بات کا شکار [illegible] دیا۔ [illegible] کی طرف

[illegible] وہ ولاتیف کے مکان کی طرف چل پڑا جہاں اس نے [illegible] بسر کی تھی۔ اس نے ولاتیف کو سویا ہوا پایا۔ اس نے ملازموں کو [illegible] کہ وہ سویا ہوا ہے [illegible] اور بچے میں بیٹھ کر وہ سگار پینے لگا اور جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔

ولاتیف دس بجے بیدار ہوا۔ بچے میں لزنف کو بیٹھا ہوا پا کر وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ تم تو گھر جا چکے تھے"

"نہیں راستے میں مجھے روون مل گیا۔ وہ کھیت میں تنہا تھا اور بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس لئے میں یہاں لوٹ آیا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم یہاں اس لئے لوٹ آئے کہ تمہیں راستے میں روون مل گیا تھا؟"

"ہاں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں لوٹ آیا۔ شاید اسے دیکھ کر مجھے تم یاد آ گئے۔ یا شاید اس لئے کہ مجھے گھر جانے کی جلدی نہیں"

ولاتیف مسکرایا "ٹھیک ہے تم ان دنوں جب بھی میرے بارے میں سوچتے ہو تو تمہیں روون کا بھی خیال آ جاتا ہے" پھر اس نے [illegible] کہا "کوئی بات نہیں [illegible]" دونوں دوست چائے پینے لگے۔ لزنف نے کاروباری باتیں شروع کر دیں۔

ولاتیف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں روون کو مبارزت کی دعوت دوں گا۔ یا تو خود گولی کا نشانہ بن جاؤں گا یا اس کی [illegible] گولی سے چھید کر دوں گا۔"

"چھوڑو بھی۔ کیوں اتنا چلاتے ہو؟ میرے حق سے [illegible] پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ تمہیں کیسے پتہ کیا ہو گیا"

"جناب والا کا کام نہیں ہو سکتا" میرا خون کھولنے لگتا ہے۔

"تمہیں فخر کرنی چاہئے کیا اعتقاد [illegible] کر رہے ہو؟"

"نہیں اس شخص نے میری توہین کی ہے۔ میں اس فلسفی کو گولی سے اڑا دوں گا"

[illegible] "تم اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہو کیا [illegible]"

تمہارا معاملہ ختم ہو جائیگا"

ولاتیف اپنی کرسی میں جا گرا "میں یہاں سے کہیں چلا جاؤں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں"

"تم کہہ رہے ہو کہ تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ گے۔ میرا بھی خیال ہے کہ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ آؤ ہم دونوں کہیں دور نکل چلیں۔ سائبیریا چلیں یا پھر سیر کریں"

"اور اپنی بہن کو یہاں چھوڑ جاؤں؟"

"نہیں۔ مادام تمہارا بھی ہمارے ساتھ چل سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی خبرگیری کروں گا" "وہ صرف ایک مرتبہ ہاں کر دیں پھر تو میں رات کو ان کی کھڑکی کے نیچے باجا بجانے کو پہنچ جایا کروں گا۔ گاڑی بان کو سفر میں نہلا دوں گا۔ اور پوری سڑک پر پھول پھیلا دوں گا" "میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دوست ہم دونوں کا نیا جنم ہو گا۔ اور جب ہم واپس آئیں گے تو ہماری تو زندگی ہی نئی ہو گی"

"بس تم تو مذاق کر سکتے ہو"

"نہیں مذاق نہیں کر رہا" "تمہیں واقعی ایک نہایت اچھا مذاق سوجھا ہے"

"وہ سب تو اچھا ہے" "میں اس سے مبارزت کروں گا"

"پھر وہی بات"

اتنے میں ایک خادم اپنے ہاتھ میں ایک خط لئے ہوئے اندر آیا۔

"یہ کس کا خط ہے؟" لزنف نے پوچھا۔

"مسٹر روون کا" "مادام [illegible] کا ملازم ابھی لایا ہے"

"روون کا؟" ولاتیف نے پوچھا "کس کے نام ہے؟"

"آپ کے لئے حضور"

"میرے لئے" "لاؤ ادھر لاؤ"

ولاتیف نے جھپٹ کر وہ خط ملازم کے ہاتھ سے لیا اور تیزی کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور عبارت پڑھنے لگا۔ لزنف غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ولاتیف کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا لکھا ہے؟" لزنف نے سوال کیا۔

"مخروطی چلے ہو ۔" وانتیف نے وہ خط اپنے دوست کو دیا
لزنف نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ وانتیف کے نام تھا۔

پیارے وانتیف!

میں آج مادام لاسنکایا کا مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تمہیں حیرت ہوگی۔ خاص طور پر کل کے واقعہ کی وجہ سے میں تمہیں اپنی روانگی کی اطلاع دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ تم مجھ سے ناراض ہو اور مجھے ایک بدنام شخص خیال کرتے ہو۔ میں اپنی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو وقت کرے گا۔ دشمنی بھی جاتا ہے وہ مجھے معاف کر دے گا۔ میرے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ تم ایک ایماندار شخص ہو۔ ہاں تو میں جا رہا ہوں اور تمہاری مسرت کا خواہاں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے پر تم میرے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کر لو۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم پھر کبھی مل سکیں گے بھی کہ نہیں۔ اس کے باوجود میں ہمیشہ تمہارا دوست رہوں گا۔ — دمتری رودن"

نوٹ۔ جو دو سو روبل تمہارے مجھے دینا ہیں وہ میں سنے گاؤں پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم اس خط کا مادام لاسنکایا سے ذکر نہ کرنا۔ ایک درخواست اور بھی ہے کہ نتالیا سے کبھی اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ میں تم سے ملنے آیا تھا۔

"کیوں؟ اس خط کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟" وانتیف نے لزنف سے پوچھا جس نے خط پڑھ لیا تھا۔

"کوئی کیا کہہ سکتا ہے" لزنف نے کہا "کوئی مشرقی انداز میں انشاءاللہ کہنے اور دانتوں میں انگلی دبانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے" "وہ جا رہا ہے اچھا ہوا" وانتیف کی آنکھیں پھٹی "عجیب بات تو یہ ہے کہ اس نے تمہیں خط لکھنا اپنا فرض سمجھا۔ اس قسم کے حضرات جو بھی قدم اٹھاتے ہیں وہ ایک فرض ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک کوئی نہ کوئی فرض ہوتا ہے یا کوئی نہ کوئی قرض" اس نے خط کے آخری حصہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھو تو کیا جملے لکھے ہیں۔"

لزنف نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔

وانتیف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے مادام لاسنکایا کے یہاں جانا چاہئے ... [illegible] ... جانا چاہئے؟"

"میرے دوست، میرے کام [illegible] وقت [illegible] کر وہ یہاں سے چلے گئے"

"وہ یہاں سے غائب ہو رہا ہے" "تم اور کیا چاہتے ہو! اس سے تو زیادہ اچھا ہے کہ جاکر سو رہو۔ تم ساری رات کروٹیں بدلتے رہے ہو گے۔ لیکن اب تمہارا معاملہ سلجھ رہا ہے"

"تمہیں یہ خیال کیوں پیدا ہو رہا ہے؟"

"صاف ظاہر ہے ۔ جاؤ جاکر سو رہو۔ اور میں تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں"

"سونے کو میرا جی نہیں چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ذرا کھیتوں کا جاکر ایک چکر لگاؤں۔"

"یہ خیال تو برا نہیں"

اس کے بعد لزنف مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لزنف نے مادام سنہا کو نشست گاہ میں پایا۔ مادام سنہا نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ کل رودن کی آمد کے وقت سے پریشان تھی۔

"تم میرے بھائی سے ملے ہو۔ آج اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے ۔ وہ کھیتوں کی طرف گیا ہے۔" مادام سنہا ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی پھر اس نے اپنے رومال کے کنارے سے کھیلتے ہوئے کہا "کیا تمہیں رودن کی آمد کا مقصد معلوم ہے" لزنف نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا

"ہاں [illegible]"

"خدا حافظ کہنے آیا تھا؟"

"[illegible] کیا تم [illegible] مادام لاسنکایا کے یہاں سے جا رہا ہے"

"جا رہا ہے؟"

"ہاں اور ہمیشہ کے لئے"

"[illegible]"

"یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ـــ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ اس نے ساز کے تار کو ذرا زیادہ کس دیا ہوگا۔ اور وہ تار ٹوٹ گیا "

"تم کیا معمّوں میں بات کر رہے ہو ـــ ہمیشہ مذاق اچھا نہیں ہوتا "

"مذاق کون کر رہا ہے۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ وہ جا رہا ہے اور اس نے اپنی روانگی کی تحریری اطلاع بھیجی ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ وہ جا رہا ہے۔ مگر اس کی روانگی نے ایک بے نظیر تجویز کو تہہ و بالا کر دیا ہے جس پر میں تمہارے بھائی کے ساتھ بحث کر رہا تھا "

"وہ کیا تجویز تھی ؟"

میں نے تمہارے بھائی کو مشورہ دیا تھا کہ یہاں سے کہیں دور تفریح کی غرض سے چلا جائے۔ اور تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جایا جائے اور میں نے تمہاری دیکھ بھال کی پوری ذمّہ داری اپنے اوپر لی تھی۔

"خوب میں جانتی ہوں جس طرح تم میری دیکھ بھال کرو گے بھوکوں مار دو گے "

تم دراصل مجھے جانتی نہیں ہو " تم سمجھتی ہو کہ میں پتھر کی مورت ہوں۔ لیکن تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ میں کھانڈ کی طرح پگھل سکتا ہوں اور کئی دن اپنے گھٹنوں کے بل گزار سکتا ہوں "

اتنا کہہ کر زنف اٹھا اور مادام سنہا کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گیا ـــ پھر آہستگی سے بولا ـــ " مجھے جاننا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو "

"کیا کہا ـــ ؟"

"وہی جو میں ایک مدّت سے کہنا چاہتا تھا ـــ اور میں کہہ چکا ہوں "

میں اس وقت تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تاکہ تم سوچ سکو میں تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں " میں جا رہا ہوں۔ اور اگر تمہیں میری یہ پیشکش منظور ہو تو مجھے بلوا بھیجنا "

مادام سنہا نے زنف کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ تیزی سے مڑ کر جا چکا تھا ـــ جب وہ باغیچے سے گزر رہا تھا تو اس کے سر پہ ٹوپی بھی نہیں تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ نے آواز دی ـــ "مسیو لزنف مالکن آپ سے ملنا چاہتی ہیں "

زنف تیزی کے ساتھ مڑا۔ اس نے خادمہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور حیران و ششدر خادمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور پھر وہ مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

زنف سے مڈبھیڑ کے بعد رودن گھر لوٹا تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور اس نے دو خط لکھے ایک تو وانتیف (جس سے آپ واقف ہیں) اور دوسرا انستاسیا کے نام۔ دوسرے خط کو تحریر کرتے ہوئے اس نے زیادہ وقت لیا۔ اس خط میں اسے بہت کچھ کاٹنا پڑا۔ اور بہت کچھ دوبارہ لکھنا پڑا۔ اس خط کو پھر اس نے از سر نو صاف کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا ـــ انتہائی افسردگی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پھر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اپنی ہتھیلیوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پھر وہ اٹھا اس نے اپنے کوٹ کے بٹن لگائے اور نوکر کو آواز دی۔ نوکر کمرے میں آیا تو اس نے اس سے کہا کہ وہ مادام لاسنکایا کے پاس جائے اور جا کر پوچھے کہ وہ کیا اس سے مل سکتی ہیں۔

نوکر جلد ہی واپس آ گیا اور اس نے اطلاع دی کہ مادام اس کی منتظر ہیں ـــ

مادام لاسنکایا رودن سے اپنے دارالمطالعہ میں ملی۔ اس وقت مادام لاسنکایا تنہا نہیں تھی۔ پینڈسے لاسکی اس کی بغل میں بیٹھا تھا۔

مادام لاسنکایا نے رودن کا بڑی شائستگی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ رودن نے بھی سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ مگر اس کے چہرے کی طرف ایک ہی نگاہ کسی بھی طالب علم کو یہ بتا سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناخوشگوار واقعہ گزر چکا ہے۔ رودن جانتا تھا کہ مادام لاسنکایا ناراض ہے ـــ

پینڈسے لاسکی نے جو راز مادام لاسنکایا کو بتایا تھا اس سے مادام کے اندر ایک عظیم خاتون بیدار ہو گئی تھی۔ اسے اس بات پر غصّہ آ رہا تھا کہ رودن جیسا مفلس بے بضاعت اور گمنام شخص اس کی بیٹی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ ورنہ یا ماتحت خانہ سے کیا لینا بیٹھا ہے ـــ

"ٹھیک ہے کہ وہ ایک ذہین اور ہوشیار شخص ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا رہا تھا۔ "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ایک ذہین مگر قلاش شخص میرا داماد بن جائے"

"مجھے تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ آدمی اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو بھول جاتا ہے۔" ہینڈرے لانسکی نے مادام کے غصہ کو ہوا دی تھی۔

برجی کے عالم میں مادام نتالیہ کی خوب بری تھی۔

مادام لاسنکایا نے روون کو بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ سابقہ روون عنقریب جو گھر کا مالک بن گیا تھا جو ایک پرانا دوست تھا۔ بلکہ ایک نئے روون سے ابھی کی حیثیت سے ایک اجنبی مہمان سے زیادہ نہیں تھی۔

"مادام میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں" روون نے گفتگو کا آغاز کیا "میں آپ کا مہمان نوازی کے لئے شکر گزار ہوں۔ میرے گاؤں سے میرے نام خط آیا ہے اور میں آج جا رہا ہوں"

مادام لاسنکایا نے لاپروائی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اپنے جی میں کہا "وہ پہلے کر چکا ہے۔ چلو اچھا ہوا ورنہ تو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوتا"

"کیا واقعی جا رہے ہو؟" اس نے بلند آواز میں کہا "خیر اگر تمہیں ضرور جانا ہے تو پھر میں تمہیں کیونکر روک سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سردیوں میں تم سے ماسکو میں ملاقات ہوگی۔"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا مادام۔ شاید میں ماسکو نہ جا سکوں ہاں اگر مجھے ذرائع میسر آ گئے تو پھر میں ماسکو میں شرف ملاقات ضرور حاصل کروں گا۔"

ہینڈرے لانسکی جی ہی جی میں سوچ رہا تھا "میرے دوست کل یہاں تمہارا راج تھا۔ اور آج تم کس انداز میں بات کر رہے ہو"

"کیا تمہارے گاؤں سے کوئی بری خبر آئی ہے؟"

"ہاں"

"شاید فصل اچھی نہیں ہوئی؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ بہرحال میں تمہارا ممنون ہوں" یہاں میرا بہت اچھا وقت گزرا"

"میں بھی اپنی اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ کب جا رہے ہو؟"

"آج دوپہر کو کھانے کے بعد"

"اس قدر جلد — خیر میں تو یہ بھی نہ کہہ سکوں گی کہ تمہارا سفر اچھی طرح ہو اور اگر تمہارے گھریلو امور تمہیں جلد فارغ کر دیں تو تم ہمیں ملنے ماسکو میں شاید نہ آ سکو" روون نے اٹھتے ہوئے کہا "ہاں میں آپ کا اس وقت فرض ادا نہیں کر سکتا — مگر گھر پہنچتے ہی"

"چھوڑو بھی دلری تم کیسی باتیں کر رہے ہو — کیا وقت ہوگا؟"

ہینڈرے لانسکی نے اپنی سونے کی گھڑی واسکٹ کی جیب سے نکال کر جواب دیا۔

"دو بجکر ۲۴ منٹ ہو چکے ہیں"

"اچھا تو میں ذرا اپنا لباس تبدیل کر دوں۔ خدا حافظ دلری"

روون کمرے سے باہر آ گیا۔ مادام لاسنکایا اور اس کے درمیان تمام بات چیت ایک خاص نوعیت کی تھی۔ اداکار اسطرح اپنے پارٹ کی مشق کرتے ہیں۔ یا پھر سیاست دان کانفرنس میں پہلے ہی سے تیار کئے گئے جملوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔

روون اپنے تجربے سے یہ بات جانتا تھا کہ اونچی سوسائٹی کے لوگ صرف ایک شخص کو اپنے حلقے سے بڑی آسانی کے ساتھ نکال باہر کرتے ہیں۔ بلکہ جب ضرورت ہوتی ہے تو اسے اپنے دستانے کی طرح نالی کے کیچڑ میں گرا دیتے ہیں جیسے وہ دستانہ لاٹری کا ٹکٹ ہو۔ جس کا انعام نہ نکلا ہو۔

روون نے اپنا سامان عجلت کی ساتھ باندھا اور ساتھی روون کے گھوڑوں کا انتظار کرنے لگا۔ گھر میں ہر شخص اس کی یک بیک روانگی پر حیران تھا۔ ملازم بھی اس کی طرف پریشانی کے ساتھ دیکھ رہے۔ بیس توف تو خاص طور پر اداس تھا۔ نتالیہ اسے قطعی نظر انداز کر رہی تھی۔ تاہم روون اس کے ہاتھ میں اپنا خط دینے کامیاب ہو گیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت مادام لاسنکایا نے ایک دفعہ اپنی یہ بات دہرائی کہ ماسکو جانے سے پہلے شاید اس سے پھر ملاقات ہو مگر روون نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہینڈرے لانسکی نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ روون کا جی چاہا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کی گلابی اور صحت مند چہرے کو نوچ ڈالے۔ مادموازیل بولنکورٹ کنکھیوں سے روون کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "اب تمہارا دماغ ٹھکانے آیا۔ سلوک کیا جا رہا ہے"

آخر کار ہونا تھا۔ اور روون کے لئے گاڑی گھر کے احاطے میں آگئی ۔ اس نے محبت کے ساتھ سب سے رخصت طلب کی۔ اس کے دل پر بوجھ سا تھا اور وہ ملول تھا۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اسکو اس انداز میں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا ۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس گھر سے اسے نکالا جا رہا ہو۔ کیا اچھی صورت حال ہے میں نے یہ کیوں کیا؟ خیر جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے ۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے نتالیا کی طرف آخری نگاہ ڈالی ۔ اور اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک اس کے لئے سرزنش سے کم نہیں تھی۔

وہ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں پر سے اترا اور گاڑی کی طرف دوڑا جیس توف اسے رخصت کرنے کے لئے آگے بڑھا اور کود کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی جب احاطے سے گزری اور صنوبر کے پیڑوں والی سڑک پر آگئی تو روون بولا "تمہیں یاد ہو گا جب ڈان کوک ناٹ ڈچیس کے دربار سے باہر نکلا تھا تو اس نے دربان سے کہا تھا "آزادی ایک بے نظیر تحفہ ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ وہ شخص بہت خوش ہے ۔ جسے خدا روٹی کا ایک نوالہ دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سوا کسی اور کا ممنون نہیں ۔ جو بات ڈان کوک ناٹ نے محسوس کی تھی ۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں ۔ خدا نہ کرے پیارے جیس توف کہ تمہیں بھی اس تجربے سے ایک دن گزرنا پڑے"۔

جیس توف بہت متاثر ہوا ۔ اس نے روون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس وقت جیس توف کا دل اس کے سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ راستہ بھر روون انسان کے وقار کی اور سچی آزادی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بڑی ایمانداری اور تقدس کے ساتھ باتیں کرتا رہا ۔ اور جب رخصت کے وقت آیا تو جیس توف نے روون کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور سرد آہیں بھرنے لگا ۔ روون کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ۔ وہ جیس توف سے جدا ہونے کی خاطر آنسو نہیں بہا رہا تھا ۔ یہ اس کی خود نمائی کے آنسو تھے۔

نتالیا اپنے کمرے میں آکر روون کا خط پڑھنے لگی۔

"پیاری نتالیا! اس نے لکھا تھا ۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں ۔ میرے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ مجھ سے یہ کہا جاتا کہ یہاں سے چلے جاؤ میں جا رہا ہوں۔

میری روانگی کے بعد حالات معمول پر آجائیں گے ۔ اور کوئی مجھے یاد بھی نہیں کرے گا ۔ اور کوئی مجھے کیوں یاد کرے؟

یہ ایک حقیقت ہے پھر میں تمہیں خط کیوں لکھ رہا ہوں ۔ نہ جانے کیوں؟ میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں اور میرے لئے یہ بات بڑی اندوہناک ہوگی ۔ اگر تم میرے بارے میں کوئی برا خیال رکھو گی ۔ اس لئے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں ۔ میں اس وقت اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ، اور کسی دوسرے پر کوئی الزام بھی لگانا نہیں چاہتا ۔ میں تو صرف تمہاری جانب اپنے رویے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ۔ گزشتہ چند دنوں کے واقعات غیر متوقع تھے اور اچانک ظہور میں آئے تھے ۔

تمہاری ہماری ملاقات میرے لئے ایک ناقابل فراموش سبق ہے تم نے ٹھیک کہا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہیں جانتا ہوں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے ناآشنا تھا ۔ اپنی زندگی کے دوران ہر قسم کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے ۔ بہت عورتیں اور لڑکیاں میری دوست رہی ہیں ۔ لیکن تم تنہا ۔ تم ایک پاکیزہ اور ایماندار لڑکی ہو ۔ لہذا مجھے حیرت ہوئی اور میں انصاف نہ کر سکا ۔ میں پہلی ہی ملاقات میں تم سے کھنچ گیا تھا اور تمہیں بھی اس کا علم ہے ۔ میں گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھا رہا ہوں ۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہ پہچان سکا ۔ اور میں ایمانداری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی کوشش بھی نہیں کی ۔ اس پر بھی میں یہ خیال کر رہا تھا کہ میں تمہاری محبت میں مبتلا ہوں ۔ اس گناہ کی مجھے یہ سزا ملی ہے

میں نے اس سے پہلے بھی ایک عورت سے محبت کی اور اسے بھی مجھ سے محبت تھی ۔ لیکن اس کی سمت میرے احساسات بڑے پیچیدہ تھے اور وہ بھی میری جانب سے پیچیدہ احساسات رکھتی تھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا ۔ اس کی فطرت سادہ نہیں تھی ۔ مگر اس وقت مجھ پر حقیقت کا انکشاف نہ ہوا ۔ لیکن جب اس سے میں دوچار ہوا تو وقت گزر چکا تھا ۔ کوئی ماضی کی طرف نہیں لوٹ سکتا ۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری زندگی متحد ہو جاتی ۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں ۔ میں یہ کیسے ثابت کروں کہ میں نے تم سے شاید سچی محبت کی ہوتی

وہ محبت جو دل سے کی جاتی ہے خیالات سے نہیں بلکہ شاید میں اس قسم کی محبت کے قابل نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ قدرت نے مجھ کو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اور اس وقت میں انکسار و عجز سے کام نہیں لینا چاہتا۔ خاص طور پر ایسے لمحوں میں جب میں انتہائی ندامت محسوس کر رہا ہوں — ہاں قدرت نے مجھکو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں کوئی مفید کام کئے بغیر مر جاؤں گا۔

نہ جانے مجھ میں کیا کمی ہے — شاید مجھ میں اس بات کی کمی ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کو متاثر نہیں کر سکتا کسی عورت کے دل پہ فتح نہیں پا سکتا۔ میری قسمت عجیب دلفریب ہے۔ میں بڑے شوق کے ساتھ جان و دل کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا چاہتا ہوں مگر ایسا کرنے کی اپنے میں قدرت نہیں پاتا۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی ایسی احمقانہ بات کے لئے خود کو قربان کر دوں گا جس پر میں یقین نہیں رکھتا ہوں گا۔ اوہ میرے خدا! پینتیس برس کی میری عمر ہو چکی ہے اور میں ابھی تک کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کے سامنے اپنا دل یوں کھول کر نہیں رکھا یہ میرا اعتراف ہے۔

خیر میں اپنے بارے میں بہت سی باتیں کہہ چکا ہوں۔ اب مجھے تمہارے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے سوال کا اور بات کا اہل نہیں ہوں۔

تم ابھی جوان ہو اور تم چاہے کتنی دیر زندہ کیوں نہ رہو۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ہمیشہ اپنے دل کی رہنمائی قبول کرنا اپنے یا کسی دوسرے کے خیالوں سے بہک نہ جانا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ ایک شخص کی زندگی کا حلقہ جس قدر تنگ اور سادہ ہوتا ہے اس قدر وہ اچھا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے نئے امکانات تلاش نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کو جوار مراحل سے گزرنے دیا جائے۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو اپنی جوانی میں جوان رہتا ہے — لیکن مجھے ایسا ہو رہا ہے کہ مشورہ خود میرے لئے ہے اور تمہارے لئے نہیں۔

بات تو یہ ہے نتالیا میں اس وقت نہایت ہی بری صورت حال میں مبتلا ہوں۔ جیسے تمہارے بارے میں جو احساسات بیدار ہوئے ان کی نوعیت سے متعلق میں نے خود کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ایک عارضی پناہ گاہ میسر آ گئی ہے — لیکن مجھ ایک مرتبہ پھر خانماں ایک جگہ سے دوسری جگہ آوارہ رہنا ہو گا۔ تمہارے ساتھ گفتگو تمہاری موجودگی اور تمہاری دلنشین ادائیں یاد آئیں گی۔ ان کا بدل مجھے نہیں ملے گا۔ بس میں خود ہی ملزم ہوں۔ تم بھی اس بات تسلیم کرو گی کہ قدرت نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ مگر میں تمہیں وہ باتیں کیوں یاد دلاؤں جو تم پہلے ہی کہہ چکی ہو — آج میں تیز رفتار کے ساتھ روانہ ہو رہا ہوں۔ اور اپنے دل پر جبر کر کے یہ وضاحت پیش کر رہا ہوں۔ مستقبل کی کوئی امید نہیں …. اور میں نے جو کچھ دو بدو عرض کیا ہے اس کو تم پوری طرح نہیں جانتیں۔ بعض اوقات میں اس قدر باتیں کرتا ہوں۔ خیر۔ اب چھوڑو میں تو جا رہا ہوں۔

یہاں رودن نے نتالیا کو آگاہ کیا تھا کہ وہ دالتیف سے ملنے گیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے پورا پیرا کاٹ دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ لکھا تھا۔

میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور خود کو ان باتوں کے لئے وقف کرتا ہوں جن کے میں قابل نہیں۔ تم نے صبح یہ طعنہ دیا تھا۔ کاش میں ان باتوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکوں۔ اور اپنی سستی اور کاہلی کو تیاگ سکوں۔ لیکن نہیں میں ہمیشہ ایک کمزور دل شخص رہوں گا۔ میرے راستے میں ایک ہی رکاوٹ پیدا ہو گی اور میری ہمت جواب دے جائے گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ گزرا ہے وہ اس کا ثبوت ہے۔ میں اس ذمہ داری سے ڈر گیا جو میرے کندھوں پر آ پڑی تھی اور اس لئے میں تمہارے قابل نہیں ہوں میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری خاطر اپنے حلقہ کو چھوڑ دو — شاید یہ ایک اچھی بات ہوتی ہے شاید میں اس آزمائش سے پاکیزگی کے ساتھ اور ایک مضبوط آدمی بن کر ابھر سکتا۔

میں تمہاری بھرپور مسرت کا خواہاں ہوں۔ الوداع مجھے کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا — مجھے امید ہے کہ میں تمہیں پھر خط لکھوں گا۔

(رودن)

نتالیا کے جس ہاتھ میں رودن کا خط تھا وہ اس کی گود میں جا گرا اور وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس خط نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا تھا۔

کر رودن کو اس سے محبت نہیں تھی مگر یہ لکھنا بہت ہی بودی تکبیر تھی وہ خط بجھتی رہی اور اسے ایسا معلوم ہوا کر تاریک موجوں نے اسے پیٹ لیا تھا اور وہ ڈوب رہی تھی سب بے جان اور شل ہو کر کسی جادو یا وہم کو بہلا نا اور ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے مگر ایک ایسا فرد تسکین کے لئے جو خود فریبی میں تسکین نہیں ڈھونڈتا یہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے ۔

نتالیا کو اپنا بچپن یاد آیا ۔ کس طرح شام کو سیر کے وقت وہ آسمان کے روشن حصّے کی طرف آگے بڑھتی رہی تھی ۔ جہاں غروب ہوتا ہوا آفتاب شعلہ ریز تھا ۔ وہ تاریکی کی طرف کبھی قدم نہیں اٹھاتی تھی ۔ اب زندگی اس کے سامنے تاریک تھی اور روشنی کی طرف وہ منہ موڑ کر کھڑی تھی ۔

نتالیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ آنسو ہمیشہ تسکین کا باعث نہیں ہوا کرتے ۔ آنسو تو صرف اس وقت مرہم ثابت ہوتے ہیں جب دیر سے آنکھوں میں رُکے پڑے ہوں ۔ مگر آنسو سرد بھی ہوتے ہیں شکوے کے انداز میں نکلتے ہیں اور وہ آنکھوں سے دل پر اسی کے بوجھ کی وجہ سے ایک ایک بوند کی صورت میں ٹپکتے ہیں سے کوئی تسکین نہیں ہوتی ۔ دل کو آرام نہیں آتا ۔ شاید ہی شخص ایسے آنسو بہاتا ہے اور اس شخص کو ہم صحیح معنوں میں وہ نہیں کہہ سکتے جو یہ آنسو بہا نہیں پاتا ۔ نتالیا اس روز آنسوؤں سے واقف ہوئی ۔

دو گھنٹے گزر گئے اپنے کو سنبھالتے ہوئے نتالیا اٹھی اپنے آنسو پونچھے اور موم بتی جلائی ۔ رودن کے خط جلا دیا اور راکھ کھڑکی سے باہر پھینک دی ۔ اس کے بعد اس نے پشکن کا مجموعہ کلام اٹھایا اور بے سوچے سمجھے اس کا ایک ورق اُلٹا (وہ اپنی تقدیر کا حال جاننے کے لئے اکثر پشکن کی مدد لیا کرتی تھی) اس کی نگاہ ان مصرعوں پر پڑی ۔

جس کسی نے بھی جنوں خیز محبت کی ہے
بیتے ایّام کے صعوبت سہتے ہیں اُسے
کوئی ہے جو مسرت نہیں ملتی اس کو
اس کی یادیں اسے سانپوں کی طرح ڈستی ہیں
چاٹتا جاتا ہے تأسف دلِ محزوں اس کا

نتالیا ایک لمحہ تک کھڑی رہی پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی اور وہ مسکرائی اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور نیچے نشست گاہ میں چلی گئی ۔

اسے دیکھتے ہی مادام لاسنکا یا اس کو اپنے مطالعہ میں لے گئی ۔ اس نے نتالیا کو اپنے قریب بٹھا لیا اور بڑی شفقت کے ساتھ اپنی بیٹی کی طرف دیکھتی رہی ۔ مادام لاسنکا یا دل ہی دل میں پریشان تھی ۔ اسے ابھی ابھی یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو نہیں جانتی تھی ۔

جب پنڈیلے فاکی نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بیٹی رودن سے چوری چھپے ملتی ہے تو اسے صدمہ کی بجائے حیرت ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی بھلا اس طرح کیونکر عمل کر سکتی ہے ۔ جب اس نے اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلا کر اسے ڈانٹ پلانی شروع کی تھی تو نتالیا کے تو ی جواب نے اسے پریشان کر دیا تھا اور وہ ڈر گئی تھی ۔

رودن کی اچانک روانگی نے اس کے دل سے بھاری بوجھ اٹھا دیا تھا مگر اس وقت وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی آنسو بہائے گی اور کہرام بپا کر دے گی ۔۔۔ نتالیا کے ظاہری سکون اسے بےحد مضطرب بنا رہا تھا ۔

" بیٹی آج تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟"

" نتالیا نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا

" تمہارا عاشق تو جا چکا ہے ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیوں اس قدر جلد یہاں سے چلا گیا ۔

" اماں ۔۔۔ " نتالیا نے دھیمی آواز میں کہا ۔ " میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر تم اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہو گی تو میں بھی اس کے بارے میں خاموش رہوں گی "

" اچھا تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو نا ؟"

نتالیا نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنا جملہ دہرایا ۔۔۔ " میں اس کے بارے میں خاموش رہوں گی "

" میں تمہارے اس وعدہ پر یقین کرتی ہوں " اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا " مجھے تم پر اعتبار ہے ۔ لیکن کل تم نے ۔۔۔ تمہیں تو یاد ہی ہو گا ۔۔۔ خیر اب میں کچھ نہ کہوں گی ۔ سب بات ختم ہو چکی ہے ۔ گڑے مُردے اکھاڑنے ۔۔۔ تم ہی بتاؤ مجھے جیسے

دکھائی دے رہی ہو۔ ویسے تم نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا ــــ لاؤ مجھے بوسہ دو بچی ــــ

نتالیا نے اپنی اماں کا ہاتھ اٹھا کر اس پر بوسہ دیا اور مادام وسنکایا نے اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر پر بوسہ دیا۔

ہمیشہ میرے مشورے پر عمل کیا کرو۔ تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئیے کہ تم لاسنکایا ہو اور میری بیٹی ہو ــــ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم خوش رہو گی ــــ اچھا اب جا سکتی ہو ــــ

چپکے سے نتالیا وہاں سے چلی آئی۔ معمر عورت نے نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا، اور وہ سوچنے لگی ــــ اس کی ہر بات میں مجھ سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ کس قدر آسانی کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے ــــ اس کے بعد مادام لاسنکایا بیتے ہوئے ایام کی یادوں میں کھو گئی۔

مادام لاسنکایا نے میڈموازیل بون کورٹ کو بلوا بھیجا اور وہ دونوں دیر تک بند کمرے میں باتیں کرتی رہیں۔ بون کورٹ کے جانے کے بعد اس نے پینڈسے لاٹسکی کو بلوایا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ رودون کی روانگی کا سبب جان کر رہے گی۔

پینڈسے لاٹسکی نے اسے مطمئن کر دیا۔ وہ اس بات میں بڑی مہارت رکھتا تھا ــــ

دوسرے دن والنتیف اور اس کی بہن نے مادام لاسنکایا کے یہاں کھانا کھایا۔ مادام لاسنکایا پہلے سے کہیں زیادہ ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئی۔ نتالیا کی اس وقت بُری حالت تھی۔ مگر والنتیف بڑی شائستگی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وہ کچھ اس طرح گھبرا کر باتیں کر رہا تھا کہ نتالیا خود کو اس کا ممنون سمجھ رہی تھی۔

دن بڑی تیزی مگر بے کیفی کے ساتھ گزر گیا اور جب محفل برہم ہو گئی تو ان سب نے اس طرح محسوس کیا۔ جیسے وہی پرانے دن لوٹ آئے ہوں ــــ

ہاں پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ مگر نتالیا یہ محسوس نہیں کر رہی تھی۔

آخرکار وہ اپنے پلنگ پر جا گری۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور غم زدہ تھی۔ اسے زندگی انتہائی تلخ نظر آ رہی تھی، آنسو بہنے لگے۔ وہ اپنی محبت پر اور اپنے غم و آلام پر نادم ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اس وقت موت آ جائے ــــ وہ بہت دنوں تک اداس رہی۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر کاٹ دیں۔ لیکن ابھی جوان تھی۔ اس کی زندگی کا ابھی آغاز ہی تھا۔ کسی کا غم چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو اسے کھانا تو کھانا ہی پڑتا ہے۔

نتالیا نے بہت دکھ اٹھائے۔ یہ دکھ اس نے پہلی مرتبہ اٹھائے تھے مگر پہلے دکھ پہلی محبت کی طرح اپنے آپ کو دہراتے نہیں ہیں، اور یہی خوش نصیبی کی بات ہے ــــ

دو سال گزر چکے تھے۔ مئی کے مہینے کا آغاز تھا۔ مادام اب مادام لزنف بن چکی تھی اور وہ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس کی شادی ہوئے ایک سال سے زیادہ مدت ہو چکی تھی۔ وہ پہلے کی طرح حسین و جمیل تھی۔ اس کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ برآمدے کے سامنے باغ میں ایک آیا گلابی رخساروں والے بچے کو کھلا رہی تھی۔ اس بچے کی ماں اس کی طرف دیکھ رہی تھی بچہ رو نہیں رہا تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بچہ اپنے قابل باپ لزنف کی طرح ذہین ثابت ہو گا۔

پیگاسف اس وقت مادام لزنف کے قریب برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دبلا پتلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جب بولتا تھا تو سیٹیاں بجتی تھیں کیونکہ اس کے تمام اگلے دانت جھڑ گئے تھے۔ وقت کے گزرنے پر اس کا ذہن کند ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی باتیں دہرانے لگا تھا لزنف گھر پر نہیں تھا۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ چائے کے وقت آ جائے گا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ افق پر زرد رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فلک پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے تھے۔

یکبارگی پیگاسف نے ہنسنا شروع کیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" مادام لزنف نے پوچھا

کچھ نہیں کل میں نے ایک کسان کی بیوی جو بیمار پڑی ہوئی ہے یہ کہتے سنا ــــ "مجھ کو تنہا چھوڑ دو" ــــ مجھے یہ بات بہت پسند آئی

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت بھلا کیا بات کر سکتی ہے۔ معاف کرنا۔ میں تمہاری بات نہیں کر رہا۔ ہمارے پیش رو ہمارے آباؤ اجداد کتنے اچھے آدمی تھے۔ ان کے بیویوں کے قصوں میں عورت بکلا کیوں جب جتی رہتی ہے اور ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتی ہے، اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ ہمارے اس علاقے کے مارشل کا بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ وہ میرے اس رجحان کو پسند نہیں کرتی ۔۔۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نہایت قریب سے گولی داغ دی ہو ۔۔۔ رجحان کی بھی ایک ہی کہی ۔۔۔ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر قدرت اُسے زبان سے محروم کر دے؟"

تم ابھی تک اپنی پرانی ڈگر پر قائم ہو اور ہم غریب عورتوں کو ملامت کا نشانہ بنائے رہتے ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں یہی تمہاری سب سے بڑی بدقسمتی ہے ۔۔۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟ ۔ دنیا میں صرف تین قسم کی بدنصیبیاں ہیں۔ سردیوں میں ایک سرد کمرے میں رہنا۔ گرمیوں میں تنگ جوتے پہننا۔ اور روتے ہوئے بچے کے کمرے میں سونا ۔۔۔ سچ پوچھو تو اب میرے یہی اخلاقی اصول ہیں"

کیا اخلاقی اصول ہیں؟ ابھی کل ہی کی بات ہے مارشل کی بیوی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی تھی"

"سچ؟ ذرا میں بھی تو سنوں اُس نے میرے بارے میں تم سے کیا کہا؟"

"اس نے یہی کہا کہ تم صبح سے شام تک اس کے سوالوں کا جواب ۔۔۔"

کیا کہا ۔۔۔ کیا کہا ہے ۔۔۔ بیشتر ہے اور دبی چھپی ہوئی آواز میں"

ینگا نیف زور سے ہنسا "میں نے بہت اچھا کیا"

"کیا عورت کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا اچھی بات ہے؟"

"کیا تم مارشل کی بیوی کو عورت سمجھتی ہو؟"

"عورت نہیں تو وہ اور کیا ہے؟"

"ایک ڈھولک ہے ۔۔۔ ڈھولک ۔۔۔ جسے لکڑیوں سے پیٹا جاتا ہے"

"ہاں۔ ہاں" مادام لاسٹکا یلنے بات کا موضوع بدلنے کی غرض سے کہا "میں نے یہ سنا ہے کہ تمہیں مبارکباد دینی چاہیئے"

"کس بات پر؟"

"یہی کہ تم مقدمہ جیت گئے ہو۔ اور چراگاہیں اب تمہارے قبضے میں رہیں گی"

"ہاں" ینگا سف نے اُداسی کے ساتھ جواب دیا۔

"سالوں تک یہ مقدمہ تم لڑتے رہے ہو اور اب یہ مقدمہ جیت لینے پر تم غیر مطمئن نظر آ رہے ہو!"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔" ینگا نف نے آہستگی کے ساتھ کہا "ایک مسرت جو قدرت کے بعد حاصل ہوا اس سے بڑی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس سے تم ایک رعایت سے محروم ہو جاتے اپنی قسمت کو کوستے رہنے کی مسرت انگیز رعایت سے ۔۔۔ میں ٹھیک کہتا ہوں مادام جو مسرت مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ بہت گھناؤنی ہوتی ہے"

مادام سہما طرف اپنے کندھے جھٹک کر رہ گئی "آیا!" اس نے آواز دی "میرا کوٹ لا دو" لاؤ مجھے دو"

وہ اپنے بچے کو کھلانے لگی۔ ینگا سف بڑبڑاتا ہوا برآمدہ کے دوسرے کونے میں چلا گیا"

دفعتاً لزنف باغ کے گرد گھومتا ہوا سڑک پر نمودار ہوا۔ وہ اپنی دو گھوڑوں والی گاڑی میں آ رہا تھا۔ دو ادھیڑ عمر کے شخص اس کے گھوڑے کے آگے دوڑ رہے تھے۔ یہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے"

لزنف ۔۔۔ ادھر دیکھو۔ میں اپنے ساتھ کیا لایا ہوں"

لزنف نے دور ہی سے اپنی بیوی کو آواز دی۔

مادام لزنف اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان نہ سکی۔ آخر کار وہ بولی "او مونیور بین توف"

"یہ ایک نہایت اچھے جھولے ہیں"

لزنف احاطہ میں داخل ہوا ۔۔۔ احاطے سے ہوتا ہوا بین توف کے ہمراہ برآمدے میں پہنچا۔

"خوش ہو جاؤ ستیا تمہارے بھائی کی شادی ہو رہی ہے"
"کس سے؟"

"نتالیا سے اور کس سے — ہمارا دوست بیس توف ماسکو سے یہ خبر لایا ہے اور تمہارے نام ایک خط بھی ہے — سنو ستیا!" اس نے پھر اپنے بچے کو بیوی کی گود سے چھینتے ہوئے کہا — "تمہارے ماموں کی شادی ہو رہی ہے! تم تو بس رال ٹپکاتے ہو یا آنکھیں جھپکتے رہتے ہو —!"

"اسے نیند آ رہی ہے" آیا نے کہا۔

"ہاں —" بیس توف نے مادام لزنف کے قریب جاتے ہوئے کہا "میں مادام لاسنکایا کے حکم کے مطابق آج ہی ماسکو سے یہاں آ رہا ہوں — یہ رہا وہ خط!"

مادام لزنف نے لفافہ چاک کر کے اپنے بھائی کا خط پڑھا — یہ ایک مختصر خط تھا — صرف چند ہی سطور میں مسرت کے عالم میں اس نے اپنی بہن کو اطلاع دی تھی کہ اس نے نتالیا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور وہ مان گئی — اس کی اماں بھی رضامند ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے خط میں وہ تمام تفصیلات لکھے گا — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بے خودی کے عالم میں یہ خط لکھا تھا۔

چائے آ گئی اور بیس توف پر سوالات کی بوچھار کر دی گئی۔ لیکاسف بھی اس خبر پر خوش تھا۔

"ہم پر ایک شخص موئیدکو رجاگن سے متعلق افواہیں پہنچی تھیں — میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹی ہیں"

"کورجاگن ایک خوبصورت نوجوان تھا بڑا تند مزاج اور اکھڑ — وہ کچھ اس قسم کے دبدبہ کا اظہار کرتا تھا — جیسے وہ انسان نہ ہو بلکہ ایک مجسمہ ہو جس پر کوئی عبارت کندہ ہو۔"

"نہیں بالکل جھوٹی تو نہیں ہیں —" بیس توف نے مسکراتے ہوئے کہا "مادام لاسنکایا اس کے حق میں تھیں — مگر میڈم دارزیل نتالیا اس کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتی تھیں"

"میں اس شخص کو جانتا ہوں —" لیکاسف بولا "بالکل کاٹھ کا اُلو ہے — خدا کی قسم اگر تمام انسان اس جیسے ہوتے تو میرے لئے جینا محال تھا"

"مگر دیکھئے طبقوں میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے"

"چلو اب اس کی باتیں ہی چھوڑ دو —" مادام لزنف نے کہا "میں خوش ہوں کہ میرا بھائی کامیاب ہو چکا ہے کیا نتالیا بھی خوش ہے؟"

"ہاں! وہ ہمیشہ بڑی پرسکون رہتی ہے"

وہ شام نہایت پرجوش باتوں میں بسر کی گئی — پھر رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

"ہاں — یہ تو کہو —" لزنف نے بیس توف کے جام میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا "کیا کبھی کچھ رودن کے بارے میں بھی سنا ہے —؟"

"نہیں ایک مدت ہو چکی ہے وہ گزشتہ سردیوں میں تھوڑی سی دیر کے لئے ماسکو آیا تھا اور پھر ستمبر تک چلا گیا وہ ایک کنبے کے ہمراہ تھا — ہم دونوں میں کچھ دنوں تک خط و کتابت ہوتی رہی — اپنے آخری خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ سمبر تک چھوڑ کر جا رہا ہے — کہاں — اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ پھر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں معلوم ہو سکی"

"وہ شخص اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے —" لیکاسف بیچ میں بول اٹھا — "میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی کہیں بیٹھا ہوا پرچار کر رہا ہے — اس شخص کو ہر وقت دو تین مداح میسر آ سکتے ہیں جو حیرت سے کھلے ہوئے منہ کے ساتھ اس کی باتیں سن سکتے ہیں اور اسے روپیہ قرض دے سکتے ہیں — میری بات یاد رکھنا اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ کہیں دور افتادہ مقام میں مثلاً زارف کاک یا کھوما میں ایک بوڑھی عورت کے بازوؤں میں دم توڑے گا جو اسے نہایت قابل شخص سمجھتی ہو گی"

"آپ اس کے بارے میں نہایت سخت الفاظ ادا کر رہے ہیں —" بیس توف بولا

"بالکل نہیں — میں سچی بات کہہ رہا ہوں — میرے خیال میں وہ ایک مفت خور کے سوا کچھ بھی نہیں" لیکاسف نے پھر لزنف کی طرف مڑتے ہوئے کہا "میاں تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میری ملاقات تاروتوف

ہے ہوگئی تھی جو پردیس میں روون کے ہمراہ رہ چکا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں اس شخص نے روون کے متعلق مجھے کیا کچھ بتایا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ وقت گزرنے پر روون کے بھی دوست دشمن بن جاتے ہیں "

"میں ان میں سے نہیں" بیس توف نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات دوسری ہے ——— میں تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں "

"تمہیں تاروخوف نے کیا بتایا؟" مادام لزنف نے پوچھا۔

"بہت سی باتیں بتائیں۔ مجھے سب تو یاد نہیں مگر ایک قصہ تو نہایت ہی اچھا ہے۔ روون جیسے شخص ہر وقت ترقی کرتے رہتے ہیں جب کہ دوسرے کھاتے اور سوتے ہیں۔ ایسے شخص کھاتے اور سوتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ترقی بھی کرتے ہیں۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا مسٹر بیس توف! (بیس توف نے کوئی جواب نہ دیا) اس طرح وہ مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں۔ روون کو یہ خیال سوجھا کہ وقت آگیا ہے کہ محبت کی جائے قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی شناسائی ایک فرانسیسی عورت سے ہوگئی۔ وہ نہایت ہی حسین عورت تھی۔ یہ قصہ دریائے رائن پر واقع ایک جرمن شہر کا ہے۔ روون اس عورت کے یہاں مسلسل جانے لگا۔ اسے اپنی کتابیں دیتا رہا اور اس سے ہیگل اور قدرت کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ فرانسیسی عورت نے اسے ایک نجومی خیال کیا۔ تم تو جانتے ہی ہو روون دیکھنے میں برا نہیں پھر وہ ایک بدیسی تھا روسی۔ فرانسیسی عورت کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ آخرکار انہوں نے ملاقات کے لئے ایک جگہ مقرر کی۔ بیحد عاشقانہ تھی۔ دریا میں کشتی کی سیر ——— فرانسیسی عورت مان گئی سب سے بہترین لباس پہنا اور اس کے ساتھ کشتی کی سیر کو چل پڑی وہ دو گھنٹے تک کشتی میں سیر کرتے رہے اور جانتے ہو اس نے کیا کیا؟ وہ عورت کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور خواب آلود آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہا۔ اور بار بار اس عورت سے یہ کہتا رہا کہ وہ اس کے لئے ایک باپ کی سی شفقت محسوس کر رہا ہے عورت غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر لوٹی۔ اس نے بعد میں یہ سارا قصہ تاروخوف کو سنایا ——— ہاں تو روون ایسا شخص ہے ———"

——— ریگاسف ہنسا۔

"تم بہت بڑے کلبیت پسند ہو" مادام لزنف نے اسکو ڈانٹتے ہوئے کہا "مجھے دن بدن یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ جو شخص بھی روون کو برا بھلا کہتا ہے اس کے پاس کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے وہ برا ثابت ہو"

"یہ بڑی بات ہی نہیں ——— وہ دوسرے لوگوں کی جیب پر ٹوکا ڈالتا ہے ——— قرض لینے کی اسے عادت ہے ———"

"مونیو رلزنف اس نے ضرور تم سے کچھ روپیہ قرض لیا ہوگا؟"

"ادھر دیکھو مونیو ریگاسف" لزنف نے بات کی ابتدا کی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار پیدا ہوگئے "تم بھی جانتے ہو اور میری بیوی بھی جانتی ہے کہ میں روون کا قدردان نہیں ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس میں کئی عیب نکالے ہیں۔ اس کے باوجود میں "

یہاں پہنچ کر لزنف نے سب کے گلاسوں میں شراب ڈالی اور کہا "

یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اپنے بھائی اور اس کی محبوبہ کی صحت کو جام دینے کے بعد ہم روون کی صحت کا جام پئیں "

مادام سنیا اور ریگاسف نے لزنف کی طرف حیرت سے دیکھا۔ بیس توف سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے مسرت جھلک رہی تھی "

"میں روون کو اچھی طرح جانتا ہوں" لزنف نے اپنی بات جاری رکھی "

میں اس کے عیوب اور اس کی کوتاہیوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ مگر یہ کوتاہیاں اس لئے ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ روون بذاتِ خود کوئی چھوٹا آدمی نہیں ہے۔

"روون ایک نہایت ہی ذہین شخص ہے۔" بیس توف نے دخل اندازی کی۔

"ہاں اس میں ذہانت کی چنگاریاں ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے انسان ہونے کا تعلق ہے۔ مصیبت تو یہی ہے کہ وہ پورا انسان نہیں ہے۔ خیر یہ ایک غیر متعلق بات ہے،

میں صرف اس کی خوبیوں کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں جوش و خروش ہے — ہمارے اس عہد میں ایک گراں قدر خوبی ہے۔ ہم سب بےحس ہو چکے ہیں۔ لاپروا بن چکے ہیں — ہم سو رہے ہیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔ ہمیں اس شخص کا ممنون ہونا چاہیے جو ہمیں جگاتا ہے اور ہم میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے چاہے گرمی لمحاتی ہی کیوں نہ ہو۔ سنیا تمہیں یاد ہوگا ایک مرتبہ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اس پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ سرد ہے۔ میں اس وقت ٹھیک بھی کہہ رہا تھا اور غلط۔ اس کے خون میں سردی ہے۔ یہ اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ مگر اس کے ذہن میں آگ ہے۔ وہ کوئی اداکار نہیں ہے جیسا کہ پہلے میں نے اسے کہا تھا — وہ بہروپیا بھی نہیں — ریاکار بھی نہیں۔ وہ دوسرے شخص کے احساسات پر ایک چالاک شخص کی طرح زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک بچے کی طرح۔ عین ممکن ہے کہ تنگدستی اور ناداری میں اس کی موت واقع ہوگی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ محض اس بات کے لئے اسے سنگسار کر دیا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خود کوئی کامیابی نہیں حاصل کر سکے گا۔ اس لئے کہ اس میں ہمت نہیں اور اس کا خون سرد ہے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ مفید ثابت نہیں ہو رہا اور مفید ثابت ہی نہیں ہوگا — میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کے الفاظ نے جوان دلوں میں بیداری کے بیج بو دئے ہیں ان نوجوانوں کے دلوں میں جو عمل کی قوت رکھتے ہیں اگرچہ قدرت نے اسے عمل کی قوت عطا نہیں کی ہے۔ وہ رکیوں جاؤ؟ خود میں اس کا بہت ممنون ہوں کہ میرے دل میں بھی اس نے بیداری کا بیج بو دیا ہے میری بیوی سنیا جانتی ہے کہ جوانی کے ایام میں رودن کی میرے دل میں کیا قدر و قیمت تھی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ رودن کے الفاظ انسان کو متاثر نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اس کے الفاظ ان انسانوں کو متاثر نہیں کر سکتے جو سن رسیدہ ہیں اور میری طرح زندگی کے تلخ تجربات سے گزر چکے ہیں مگر نوجوان جو ابھی پختہ کار نہیں ہوتے اس کے الفاظ سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ نوجوان [illegible] اس سے سنتے ہیں اسے حسین اور خوبصورت [illegible] کی کمان پر نا کرتا ہے — وہ نوجوان اپنے [illegible] متاثر پیدا کر لیں گے۔

[illegible] — خوب — میں تو پہلی بار [illegible] سے کتنی

یہی بات کہی ہے۔

جہاں تک تاثر کا تعلق ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ شخص نہ صرف دلوں میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ بلکہ وہ آپ کو آگے بڑھاتا ہے اور آپ کے آگے بڑھنے کو جاری رکھتا وہ تمہیں جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور آگ لگا دیتا ہے۔

سنا تم نے ترلنت نے پگاسف کی موجودگی میں کہا ہے

اب تمہیں کس مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ تم فلسفہ پر حملہ کرتے ہو۔ مگر تمہیں حملہ کرتے وقت الفاظ موزوں نہیں ملتے میں خود بھی فلسفہ کا اس قدر قائل نہیں ہوں اور میری سمجھ میں بھی کم آتا ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ ہماری مصیبتوں کا باعث صرف فلسفہ ہی نہیں — ایک روسی کبھی فلسفیانہ شعبدہ گری سے متاثر نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ جو شخص بھی صداقت کی تلاش کرتا ہے۔ ہم اس کی اس تلاش کو فلسفہ کہہ کر معتوب نہیں بنا سکتے رودن کی یہ بدقسمتی ہے کہ روس کو نہیں جانتا۔ روس کو ہمارا ضرورت نہیں مگر ہمیں روس کی ضرورت ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ روس کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے وہ دکھ اٹھاتا ہے۔

اپنے آپ کو پردیسی کا ظاہر کرنا خود کو مٹا دیتا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ رودن کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے اور ہمیں اس پر الزام لگانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے اندر جو اچھائیاں ہیں۔ ہمیں تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ہمیں اس کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے خود اپنے آپ کو سزا دے لی ہے۔ خدا کرے اس کے اندر جو برائیاں ہیں وہ تباہ ہو جائیں اور [illegible] باقی رہ جائے جو اس کے اندر خوبصورت اور [illegible] کے نام پر جام پیتا ہوں۔

اس پر سب نے نیز [illegible] کے ساتھ اپنے گلاس کو [illegible] جوش و خروش میں [illegible] اپنا گلاس توڑ دیا — مادام نے اپنے خاوند کا ہاتھ دبایا۔

"مجھے اس کی امید ہی نہیں تھی کہ تم بھی ایک اچھے مقرر ہو۔ تم تو [illegible] خوش بیان ہو"

"[illegible] — [illegible] کے متعلق بہت باتیں

پالیا ہے۔ آؤ اب گفتگو کا موضوع بدل دیں۔ کیا پیٹر ابھی تک
مادام لاستالیا کے یہاں رہتا ہے!"

"ہاں — مادام لاستالیا نے اُسے نہایت اچھی ملازمت حاصل
کرا دی ہے!"

کھانا ختم ہوا تو مہمان رخصت ہو گئے۔ مادام لینا اپنے خاوند کے
ساتھ اکیلی رہ گئی۔ اُس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی: "آج تم
نے کمال کر دیا۔ آج تم نے رودن کے حق میں جو دلائل دیے... میں نے تو تمہیں
یا اپنے جوش و خروش سے کبھی بولتے ہوئے نہیں سُنا:"

"میں اس وقت آدمی پر حملہ نہیں کر سکتا جو گر چکا ہو۔"

"ذرا یاکاسف بہت خوش ہو گیا تھا جب وہ رودن پر نکتہ چینی
کر رہا تھا!"

"میں نے محض یاکاسف کی وجہ سے رودن کا ساتھ دیا تھا۔ وہ
رودن کو سمپل نچوڑ کیونکر کہہ سکتا ہے جبکہ وہ خود ایک سمپل نچوڑ ہے۔
تمہیں معلوم ہے جب یاکاسف سرکاری ملازم تھا تو رشوت لیا کرتا تھا؟"

"نہیں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا..." اور پھر اس کے بعد اس
نے اپنے شوہر سے پوچھا: "تمہارا کیا خیال ہے کہ میرا بھائی نتالیا کے
ساتھ خوش رہے گا؟"

"ہاں کیوں نہیں — نتالیا جلد اپنے غم و الم بھلا پائے گی —
دونوں کی آپس میں محبت ہے۔ ہم بھی تو ایک دوسرے سے محبت کرتے
ہیں۔ اور خوش ہیں۔"

وہ مسکرائی اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر
زور سے دبایا۔

جس دن مادام لینا کے گھر میں وہ واقعہ ہوا جس کا ذکر کیا جا چکا
ہے اس دن ایک چھکڑا جسے کسانوں کے تین گھوڑے کھینچ رہے تھے۔
روس کے علاقہ گیرتا کے دور دراز علاقے میں دوپہر کے وقت بڑھا رہا
تھا۔ کوچوان کی نشست پر سفید بالوں والا ایک کسان پھٹا پرانا کوٹ پہنے
ہوئے بیٹھا تھا۔ چھپر کے نیچے ایک لمبے قد کا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ
میں ایک تھیلا تھا۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی اور اس کا کوٹ گرد
آلود تھا۔ یہ شخص رودن تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی
اپنی آنکھوں تک کھینچ لی تھی۔ [illegible]
"کیا ہم [illegible] پہنچ سکیں گے؟" اس نے کسان سے پوچھا۔

"حضور صرف ایک دو میل کی بات ہے۔"

"تم اچھے ڈرائیور نہیں ہو!"

تھکے ہوئے گھوڑے آخر کار اس چوکی تک پہنچ گئے۔ رودن تیزی
سے اس گاڑی میں سے اُترا۔ اس نے کسان کو کچھ رقم دی اور پھر تھیلا
اٹھا کر اس گھر میں داخل ہو گیا۔

میرے ایک دوست نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جن چوکی میں روسی
جرنیلوں کی تصویریں لگی رہتی ہیں وہ فوراً تمہیں تازہ دم گھوڑے دیتے
ہیں لیکن جس چوکی میں جیلی جاسوس ڈی جی الزکی تصویر آویزاں ہوتی ہے
وہاں آپ کتنے ہی دن پڑے رہتے ہیں اور گھوڑے نہیں ملتے۔ جس کمرے
میں رودن نے قدم رکھا اس میں اُسی جاسوس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اُس
نے جب آواز دی تو ایک شخص اونگھتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اُس نے
خواب آلود لہجے میں انکشاف کیا: "گھوڑے ابھی نہیں مل سکتے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا!"

"حضور گھوڑے ہوں تو دوں!"

رودن گھبراہٹ کے عالم میں کھڑکی کے قریب چلا گیا۔

گذشتہ دو برسوں میں اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی
البتہ اس کا چہرہ ذرا زیادہ مغموم ہو گیا تھا۔ اس کے گھنگریالے بالوں
میں سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں اپنی تھوڑی سی
چمک کھو بیٹھی تھیں۔ اس کے لبوں کے گرد اُس کے گھٹے ہوئے جذبات
نے جھریاں پیدا کر دی تھیں۔ اُس کا لباس پرانا اور بوسیدہ تھا۔ جوانی
کے ایام گذر چکے تھے۔

رودن نے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا شروع کر دی۔

دفعتاً دروازہ چرچرایا اور چوکی کا مالک اندر آیا۔

"آپ کے گاؤں تک جانے کیلئے گھوڑے مل نہیں رہے۔ دیر
تک ملنے کی امید بھی نہیں۔ ! گاؤں اوت تک گھوڑے مل سکتے ہیں۔"

"کیا گاؤں پنیزا تک گھوڑے نہیں مل سکتے؟"

"نہیں۔"

"اچھا تو اوت تک ہی سہی۔ گھوڑے جتنے کا حکم دو!"

جلد ہی گھوڑے تیار ہو گئے۔ رودن نے اپنا تھیلا اٹھایا
اور گاڑی میں اُچک کر جا بیٹھا۔ وہ اب بھی اپنے سر کو جھکائے ہوئے
تھا۔ اس کے خمیدہ جسم سے واضح افسردگی اور اس کی [illegible]

ہوتا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور جھٹکوں کی وجہ سے اُس کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

اختتامیہ

چند سال اور گزر گئے۔

موسم خزاں کا یہ ایک سرد دن تھا دفعتاً کوہستانی علاقہ کے قصبہ ولیس کے سب سے بڑے ہوٹل کے سامنے ایک سفری گاڑی آکر رُکی۔ اس میں سے ایک شخص نکلا اور اُس نے انگڑائی لی۔ وہ کوئی بوڑھا شخص نہیں تھا۔ اس کے طور و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی مہذب اور دولت مند شخص ہے۔ وہ سیڑھیوں سے اس ہوٹل کی پہلی منزل پر پہنچا۔ کہیں ایک دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور ایک خادم نمودار ہوا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر مسافر نے اپنا کوٹ اُتار دیا۔ یہ مسافر لیزلف تھا۔ وہ ایک سال سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی مہم پر تھا اور اب وہ قصبہ ولیس میں پہنچا تھا۔

اتنے میں لیزلف کا خادم بھی آگیا۔ یہ ایک گلابی سے رخساروں والا نوجوان تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

"آخر ہم پہنچ ہی گئے۔ اور وہ گاڑی کا شائر جس کے متعلق تم اتنے فکر مند تھے ٹھیک ہی رہا۔" لیزلف بولا۔

"ہاں پہنچ ہی گئے حضور۔" خادم نے جواب دیا۔

ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ "اندر کون ہے؟"

"نا ہیلو۔ اندر کون ہے؟" یہ آواز پھر آئی۔

لیزلف اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے ایک دراز قد شخص کھڑا تھا جس کی کمر خمیدہ تھی۔ اس کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اُس نے کمبل کا کوٹ پہن رکھا تھا جس میں پیتل کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ لیزلف نے اسے فوراً پہچان لیا۔

"رودن" اس کے منہ سے نکلا۔

رودن ہکا بکا کھڑا تھا وہ ابھی تک لیزلف کو نہیں پہچان سکا تھا چونکہ لیزلف روشنی کی طرف اپنی پیٹھ موڑ کر کھڑا تھا۔

"تم مجھے پہچانتے کیا نہیں ہو؟" لیزلف بولا۔

"اوہ۔ ٹھیک لیزلف!" رودن نے حیرت سے کہا اور اُس نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

لیزلف نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"آؤ۔ آؤ۔ میرے کمرے میں آجاؤ۔" اور پھر رودن کو دھکیل کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

"تم کسقدر تبدیل ہو چکے ہو؟"

"ہاں مگر تم بھی تو بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہاری بیوی کا کیا حال ہے؟"

"شکریہ۔ اچھی ہے۔ مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں یہاں اتفاقیہ پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے ایک رشتہ دار کو یہاں ڈھونڈنے آیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں تم سے مل کر خوشی ہوئی!"

"تم کھانا کہاں کھاتے ہو؟"

"میں۔ جو ہوٹل بھی سامنے آجائے وہیں کھا لیتا ہوں لیکن آج مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔!"

"کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟"

رودن نے معنی خیز طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں وہ مجھے میرے گاؤں میں بیچ رہے ہیں۔"

"آؤ۔ میرے ساتھ کھانا کھاؤ!"

رودن نے لیزلف کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم واقعی مجھے کھانے کی دعوت دے رہے ہو؟"

"ہاں۔ بالکل اچھے دوستوں کی طرح۔ پرانے دنوں کی طرح۔ کیا تمہیں یہ دعوت منظور ہے؟ میرے خدا مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ ہم اس طرح جدا نہیں ہو سکتے"

"بہت اچھی بات ہے۔!"

اس پر لیزلف نے زور سے رودن کا ہاتھ دبایا اور نوکر کو بلا کر اُسے میز پر کھانا لگانے اور برف میں لگی ہوئی شیمپین شراب لانے کا حکم دیا۔

....

کھانے کے دوران لیزلف اور رودن بیٹھے ہوئے اپنے طالب علمی کے ایام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بہت سے واقعا

بہت سے لوگوں کو یاد کیا۔ پہلے پہل تو رودن ذرا خاموش تھا لیکن شراب نے اس کے کو کھول دیا۔ خادم جب کھانا لگا کر چلا گیا تو نیزلف نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

" اب تم مجھے ہم سے جدا ہونے کے بعد کا سارا قصہ سناؤ گے!" نیزلف بولا۔

رودن نے نیزلف کی طرف دیکھا۔ لیزلف سوچ رہا تھا۔

" میرے خدا یہ غریب آدمی کتنا تبدیل ہو چکا ہے!"

رودن کے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی صرف اس کی آنکھوں کا انداز بدلا ہوا تھا۔

" کیا وہ سارا قصہ سناؤں!" رودن بولا۔ میں تمہیں سارا قصہ نہیں سنا سکتا۔ میں نے بہت آوارہ گردی کی ہے اور بہت دُکھ اٹھائے ہیں۔ لوگوں اور بہت سی باتوں پر سے میرا اعتقاد اُٹھ چکا ہے۔ بعض اوقات مجھے اپنے ہی الفاظ پر غصہ آیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو گالیاں دی ہیں۔ میں کہاں کہاں نہیں گھوما۔ اور بعض راستے بہت ہی گندے تھے۔ کیا تمہیں معلوم ہے مونسیور۔!"

" یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیوں تکلف سے کام لے رہے ہو ہم میں اتنا تکلف کہاں تھا۔ آؤ شراب پئیں۔" نیزلف بولا۔

" ہاں میرے دوست آؤ شراب پئیں!"

" کیا تمہیں معلوم ہے۔" اب کے رودن نے مونسیور کا لفظ اڑا دیا۔

میرے اندر ایک کیڑا ہے جو مجھے آہستہ آہستہ کریدرہا ہے اور بہکا رہا ہے۔ مجھے چین میسر نہیں۔ یہ ان لوگوں کو میرے کریدتا ہے جو مجھ سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ جب سے میں تم سے جدا ہوا ہوں میں نے بہت سی چیزوں کو آزمایا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ نئی زندگی کا آغاز کیا اور اس کا جو انجام ہوا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو!"

" تم میں صرف ہمت کی کمی ہے" نیزلف نے کہا۔

" کیا کہا مجھ میں ہمت نہیں۔ میں کبھی ایک معمار نہیں رہا۔ جب کسی کے پاس ایک ٹھوس بنیاد ہی نہ ہو وہ کیا تعمیر کر سکتا ہے۔ میں تمہیں وہ تمام واقعات نہیں سناؤں گا۔ یا یوں کہو اپنی ناکامیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ لیکن تم سے صرف واقعات بیان کروں گا اپنی زندگی کے وہ واقعات جب میری تقدیر مسکرا اٹھی تھی اور مجھے کامیابی کی امید ہو گئی تھی"

رودن نے اپنے سفید بالوں کو انگلیاں پھیر کر سیدھا کیا اور اپنے بالوں کی موٹی لٹوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا بولا۔" سنو! ماسکو میں میری ایک عجیب و غریب شخص سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سرکاری ملازم نہیں تھا مگر بہت دولت مند تھا۔ اُس کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ وہ سائنس سے بیحد محبت کرتا تھا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے سائنس سے محبت کیوں تھی۔ وہ اس کیلئے موزوں نہیں تھا۔ تقریر تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بڑی محنت کرتا تھا خوب پڑھتا اور لکھتا تھا۔ وہ ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ایک عجیب و غریب انسان ہے۔ میں نے اُس سے واقفیت پیدا کی۔ وہ مجھ سے متاثر ہُوا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس سے واقعی کوئی اچھا کام کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کے یہاں رہنے لگا۔ جہاں میں اس کی جاگیر تھی وہاں بھی اس کے ہمراہ گیا۔ میں نے بہت سے منصوبے تیار کئے تھے۔ میں بہت سی اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں۔

" جیسا تم نے مادام لاسنکایا کے یہاں کیا تھا!" نیزلف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" نہیں۔ وہاں تو مجھے علم تھا کہ میرے الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر یہاں مجھے ایک شاندار موقع مل رہا تھا۔ میں نے اپنی تجاویز کی آزمائش کی اور وہ صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ خود بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ہر تجویز میں سرگرمی سے حصّہ لیتا لیکن جلد ہی اُس ساری تجویز کو ملیامیٹ کر دیتا اور نئی تجویز پر عمل شروع کر دیتا۔ لہٰذا میں اُس سے برسوں تک جدوجہد کرتا رہا۔ دشواریوں کے باوجود کام اچھی طرح ہو رہا تھا مگر میں جلد ہی اپنے دوست سے اکتا گیا۔ میں نے اس پر طنز شروع کر دی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ میری کامیابی سے ڈر کر میری ہر تجویز کو منسوخ کر دیتا تھا۔ بعد میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں خواہ مخواہ اُس سے چمٹا ہوا ہوں۔ اس بات کا انکشاف بہت تلخ تھا۔ میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ یہ انکشاف بہت تکلیف دہ تھا کہ میں اپنا وقت اور اپنی محنت ضائع

کر رہا ہوں — میں یہ سب جانتا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر میرا کیا حال ہوگا لیکن میں نے ان باتوں کے باوجود اس سے جھگڑا کیا اور اس رئیس زادہ کو چھوڑ کر چلا آیا۔ چند دنوں آنے میں جرمنی کا دلیر ملا کر گزندھا گیا تھا —!"

"یعنی تم نے اپنی روزی پر لات مار دی —!" نیرنعت نے روون کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں — ایک دفعہ پھر میں نے خود بھوکا اور ننگا پایا۔ میرے ہر طرف بیکراں خلا تھا اور میں جہاں بھی چاہتا اُڑ کر جا سکتا۔ خیر آؤ شراب پئیں ۔"

"میں تمہاری صحت کا جام پیتا ہوں —" نیرنعت نے اُٹھ کر روون کے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ہمت کے لئے دار یا آرسکو کی میں جام پیتا ہوں — اُس میں ابھی غریب رہنے کا حوصلہ تھا۔"

"ہاں تو یہ پہلا واقعہ تھا۔ کیا میں اپنی کہانی جاری رکھوں؟"

"ہاں ہاں — خوشی سے !"

"میرے دوست اب میں باتیں کرتا ہوا تھک جاتا ہوں۔ خیر — بہت سی جگہوں پر ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے تجارت شروع کرنی چاہیئے — یہ اتفاق کی بات ہے کہ میری ملاقات کوربیٹ سے ہو گئی۔ کیا تم نے اس کا نام سُنا ہے؟"

"نہیں — مگر روون میرے دوست تمہیں تاجر بننے کا خیال کیوں آیا؟ تاجر بننا کونسی اچھی بات ہے ۔"

"میں جانتا ہوں ۔" روون بولا۔ "کاش تم نے کوربیٹ کو دیکھا ہوتا۔ میں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک بہت دانشمند شخص اور صنعت و تجارت کے متعلق بے پناہ ذہانت رکھتا تھا۔ اس کا ذہن تجاویز کا مرقع تھا۔ ہم نے مل کر عوام کے مفاد کا ایک کام کرنا چاہا۔"

"وہ بھلا کیا تھا؟"

روون نے اپنی نگاہیں جھکا کر کہا۔ "سنو گے تو ہنسو گے !"

"ہم نے فیصلہ کیا کہ گوہستان کے علاقہ میں دریا کے کو جہاز رانی کے قابل بنا دیں۔" روون اس انکشاف پر مسکرایا۔

"کیا خوب بات سوچی۔ کوربیٹ ضرور کوئی سرمایہ دار ہوگا —؟"

"نہیں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ غریب تھا۔" روون نے بدستور سر جھکائے ہوئے کہا۔

نیرنعت نے ایک قہقہہ سر کیا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور روون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے دبایا اور بولا۔ "تمہاری تجویز کا خذ پر ہی رکھی رہ گئی ہوگی؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ ہم نے مزدور کرائے پر لے اور کام شروع کر دیا لیکن جلد ہی ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بات یہ تھی کہ مل کے مالک اس منصوبہ کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ہمیں مشینری کی ضرورت تھی۔ ہمارے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا۔ ہم چھ مہینے تک مٹی کی جھونپڑیوں میں رہے۔ اور جب آخری دھیلا تک خرچ ہو گیا تو ہم وہاں سے واپس آ گئے —!"

"اور تم کر ہی کیا سکتے تھے؟"

"بالکل — مگر میں اتنا کہہ دوں وہ منصوبہ تھا شاندار!"

"کوربیٹ اب کہاں ہے —؟"

"وہ سائبیریا میں بے زمین کھود کر سونا نکالنے میں مصروف ہے۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن وہ بے پناہ دولت پیدا کرے گا —!"

"ہو سکتا ہے۔ مگر تم کبھی بھی دولت پیدا نہیں کر سکو گے!"

"خیر تم تو ہمیشہ مجھے نکما سمجھتے رہے ہو —!"

"تم اور نکمے ہو — یہ کیسے ہو سکتا ہے — ٹھیک ہے ایک وقت تھا جب میں صرف تمہاری کمزوریوں کو دیکھتا تھا لیکن مجھ پر اعتبار کرو — اب میں تمہاری قدر و قیمت کو پہچانتا ہوں۔ تم دولت پیدا نہیں کر سکو گے ۔ مجھے اسی لئے تم سے محبت ہے۔"

روون مسکرایا — "کیا سچ مچ —"

"ہاں میں تمہارا احترام کرتا ہوں — اچھا اب تم مجھے تیسرا واقعہ سناؤ —"

"جب میں ان باتوں سے تنگ آ گیا تو میں نے سوچا کہ مجھے بچوں کو پڑھانا چاہیئے — جس نے جو علم حاصل کیا ہے وہ اب دوسروں کو بھی عطا کرنا چاہیئے — میں نے ملازمت کے لئے

درخواست دے دی کیونکہ میں پرائیویٹ طور پر پڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ آخرکار مجھے ملازمت مل گئی۔"

"کیا تم ایک اُستاد بن گئے ——؟"

"ہاں میں مدرسے کا ادب پڑھانے لگا۔ میں نے بڑے جوش و خروش سے یہ کام شروع کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نوجوانوں کے ذہن کو بہتر طریقے سے ڈھال سکوں گا۔ میں نے تین ہفتے تعارفی لیکچر لکھنے میں صرف کئے ——!"

"کیا اس کی کوئی نقل تمہارے پاس ہے ؟"

"نہیں وہ مجھ سے گم ہو چکی ہے۔ میں اپنے اس کام میں بہت کامیاب رہا۔ پہلا موقع تھا۔ انسپکٹر بھی موجود تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ تپلا دُبلا۔ میں نے جب پلیٹ فارم پر چڑھ کر لیکچر دیا تو میرا خیال تھا کہ وہ لیکچر ایک گھنٹے میں ختم ہوگا۔ لیکن میں نے صرف بیس منٹ لئے۔ وہ بوڑھا انسپکٹر بولا:

"لیکچر اچھا تھا۔ ذرا مبہم تھا دراصل موضوع پر بہت کم باتیں کہی گئی ہیں۔" مگر میرے شاگردوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور انہوں نے میری حمایت کی۔ اس کے بعد میں نے لکھے بغیر زبانی لیکچر دینے شروع کر دئے۔

"کیا تم اس میں بھی کامیاب رہے ——؟"

"ہاں۔ اس جماعت میں صرف تین چار لڑکے ایسے تھے جو میری باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے باقی سب کند ذہن تھے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ لڑکے میری باتوں کو سمجھتے تھے وہ بھی بعض اوقات مجھ سے ایسے سوالات کرتے تھے جن سے میں اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ اس کے باوجود انھیں مجھ سے محبت تھی اور وہ امتحان میں پورے نمبر حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد میرے خلاف بلیشہ دوا شخص کا آغاز ہوا۔ میں دراصل پڑھانے کے سسٹم میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا۔ تعلیم کے طریقے میں اصلاح کا قائل تھا۔ میں ہیڈ ماسٹر کی مدد سے یہ اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایک نیک انسان تھا۔ اُس کی بیوی کا میرا [illegible] تھی۔ میں اُس جیسی بہت کم عورتوں سے [illegible] عمر تیس برس سے زائد تھی لیکن وہ ہر خلیفہ [illegible] ایک لڑکی کی طرح محبت کرتی تھی، ہر ایک کے

سامنے وہ اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کرتی تھی میں اس کی روح کی پاکیزگی اور اُس کے مقدس جوش و خروش کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ اس کے مشورے سے میں نے ایک تجویز تیار کی مگر میرے سامنے ہی اس پر بہتان لگائے گئے۔ علم ریاضی کے اُستاد نے جو گیاسٹ کی طرح تھا مجھے سخت نقصان پہنچایا۔"

"ہاں یہ تو کہو گیاسٹ کا کیا حال ہے ؟"

"اُس نے شہر کی ایک عورت سے شادی کر لی ہے اور یہ عام افواہ ہے کہ وہ عورت اُسے پیٹتی ہے ——!"

"جیسے کو تیسا ملنا چاہیے۔ نتاشیا لاسنکایا کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہے ——"

"خوش ہے ؟"

"ہاں ——"

رودن خاموش ہو گیا اور پھر جھنکتے ہوئے بولا: "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ خوب یاد آیا۔ علم ریاضی کا ٹیچر مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ یہ بات بنائی کہ میرے لیکچر آگے ہوتے ہیں —— بالکل لگے۔ اور پھر اُس نے یہ بات پھیلا دی کہ ہیڈ ماسٹر کی بیوی کے تعلق میری نیت اچھی نہیں ہے —— انسپکٹر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جس سے میرا [illegible] سے نہیں سکی تھی۔ اس انسپکٹر نے ہیڈ ماسٹر کو میرے خلاف کر دیا جھگڑا ہوا۔ میں نے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کا انجام کو بھی پہنچنا تھا مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ مگر میں چپکا نہ بیٹھا۔ میں انہیں بتا دینا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اب میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے بہت جلد چلا جانا چاہیے تھا۔"

رودن خاموش ہو گیا اور دونوں دوست دیر تک خاموش رہے اور پھر رودن بولا: "میں گوئٹے کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں —— تم نے میری مجبوری مجھے اتنے دُکھ دئے ہیں کہ اب نجات کا بھی کوئی راستہ میرے سامنے کھلا نہیں ہے —— میں تمہیں بتا دوں کہ اب میرے لئے کچھ بھی نہیں رہا اس کے باوجود اس دھرتی پر کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے میں نہ کر سکوں۔ میں پہلے یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن اب میں [illegible] کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں حالات کے مطابق [illegible]

[illegible] گوئٹے [illegible] ایک برگزیدہ جرمن شاعر [illegible] سے لئے گئے ہیں۔

کے لئے تیار ہوں۔ میرا مطالبہ زیادہ نہیں ہے۔ میں اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک ہے۔ تاکہ میں کسی کام آ سکوں۔ وہ کونسی چیز ہے جو مجھے دوسروں کی طرح کام کرنے سے روک رہی ہے؟ بس اب میں یہی سوچتا ہوں اور یہی میرے خواب ہیں۔ میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب میں یہاں جم گیا ہوں۔ اس وقت تقدیر میرے خلاف ہو جاتی ہے۔ کیا تم میرے لئے یہ معمہ حل کر سکتے ہو؟"

"یہ واقعی ایک بہت بڑا معمہ ہے" لیزنف بولا۔ "تم خود بھی میرے لئے ایک معمہ رہے ہو۔ تم عظیم قوتیں رکھتے ہو۔ لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تھکا دینے والا راستہ اختیار کرتے ہو"

"وہ محض الفاظ تھے میرے دوست میں نے کوئی کام نہیں کیا۔" رودن بولا۔

"ہاں۔ مگر اچھے الفاظ بھی ایک کارنامہ ہوتے ہیں۔"

رودن نے خاموشی سے لیزنف کی طرف دیکھا اور اپنا سر اوپر اٹھایا لیزنف کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"تم کیا واپس اپنے گاؤں جا رہے ہو۔؟" لیزنف نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا ابھی تک تم اس کے مالک ہو؟"

"ہاں اس کا کچھ حصہ ابھی تک میرے پاس ہے۔ صرف دو چار غلام کسان ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا گوشہ ہے جہاں میں آرام سے مر سکتا ہوں۔ تم شاید سمجھ رہے ہو کہ میں اب بھی خوبصورت الفاظ ادا کر رہا ہوں۔ لیکن یہی الفاظ میری تباہی ہیں۔ میں ان سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ تم نے میرے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا ہے اور کڑا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن میرے دوست یہ صرف الفاظ نہیں ہیں۔ یہ بال۔ یہ جھریاں۔ یہ گھسی ہوئی کہنیاں۔ خیر اب وقت گذر چکا ہے۔ لیمپ میں تیل نہیں رہا اور شعلہ بھڑک رہا ہے۔ میرے دوست موت ہی سکون کا پیغام لائے گی۔"

لیزنف اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "رودن تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو۔ کیا تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں۔ تو سنو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رہا وہ شخص جو اپنی ذہانت کی وجہ سے کیا کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس دنیا کی کون سی دولت جمع نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو وہ یہ سب کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن آج میں اسے بھوکا اور بے گھر دیکھ رہا ہوں۔"

"تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو" رودن نے کہا۔

"نہیں تم یہاں غلطی کر رہے ہو۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں اگر تم نے اس امیر جاگیردار کو خوش کیا ہوتا تو وہ تمہارے قدموں پر دولت کے انبار لگا دیتا۔ تم اسکول میں کیوں ناکام ہوئے۔ اس لئے کہ تم نے اپنے مفادات کی قربانی دی۔"

"میں تو پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ ایک پتھر کی طرح لڑھکتا رہوں اور ہمیشہ لڑھکتا رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اس کیڑے کی وجہ سے نہیں ہے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا تھا۔ تمہارے باطن میں صداقت کے لئے محبت کا دیا جل رہا ہے۔ اور تمہارے اندر یہ دیا ہم لوگوں کے دیئے سے زیادہ روشن ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کیڑے کو کبھی کا خاموش کر چکا ہوتا اور ہر بات پر تیار ہو جاتا مگر تم نے اس سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ تم ایک نوجوان کی طرح پھر کسی تحریک کا آغاز کرنے والے ہو۔"

"نہیں میرے دوست میں بہت تھک چکا ہوں۔"

"تھک چکے ہو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا مر گیا ہوتا۔ تم سمجھتے ہو کہ موت سکون بخش ہوتی ہے۔ مگر تمہارا کیا خیال ہے کیا حیات بھی سکون نہیں بخشتی؟ جو شخص زندہ ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرف روادار نہیں ہے وہ اپنے لئے بھی روادار نہیں ہو سکتا۔ تم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہو۔ تم اور کیا کرتے؟ میرے دوست۔ تم تو ایک بالکل بدلے ہوئے انسان ہو۔"

رودن نے سرد آہ بھر کے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے چونکہ میں نے ایک دولت مند گھرانے میں جنم لیا تھا۔ مگر غور سے دیکھو۔ ہم ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں۔ ہم ایک سی زبان بولتے ہیں۔ ایک دوسرے کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ ہم ایک ہی سا آدرش لیکر پیدا ہوئے ہیں ہم میں سے اب وہ بہت کم رہ گئے ہیں میرے دوست۔ پہلے ہم ایک دوسرے سے اختلاف کر سکتے تھے لیکن اب کیونکر کر سکتے ہیں جبکہ نئی پود ہمارے سامنے سے گذر رہی ہے اور ہماری منزل پر پہنچنے کے لئے تلی ہوئی ہے۔ ہمیں اب ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہیئے۔ میرے دوست

بیتا کا سوال کرتی اور اپنے اتحاد کے معاہدہ پر دستخط کریں"۔

دونوں دوستوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ دونوں سے حد متاثر ہوئے اور دونوں نے بہترین روسی انداز میں اپنے وقت کا وہ گیت گایا جو کبھی طالب علم گایا کرتے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ اب تم گاؤں جا رہے ہو" نیزلف بولا۔ تم یہاں نہیں ٹھہرو گے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس بات کو یاد رکھنا کہ تم پر چاہے کچھ بھی کیوں نہ بیت جائے تمہارے پاس اپنا ایک جگہ ہے۔ ایک آشیانہ جہاں تم پناہ لے سکتے ہو۔ میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں میرے دوست۔ خیالات بھی حضر ہوتے ہیں انہیں بھی گھر کی ضرورت ہوتی ہے"۔

رودن اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "شکریہ میرے دوست۔ شکریہ۔ میں اس بات کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ میں اگرچہ اس کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی غلط بسر کی ہے۔ میں نے اپنے خیالات کی اس طرح خدمت نہیں کی جس طرح کہ مجھے کرنا چاہیئے تھی۔"

"چپ رہو۔ قدرت نے جس طرح کسی انسان کو بنایا ہے وہ اسی طرح رہتا ہے" لیزنف بولا "اس سے کسی اور بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ تم اپنے آپ کو ایک آوارہ گرد یہودی کہتے ہو۔ لیکن تمہیں کیا خبر ہے شاید تمہاری قسمت میں مسلسل آوارہ گردی لکھی ہے۔ شاید تم اس طرح کوئی مقصد عظیم پورا کر رہے ہو جس کی تمہیں خبر نہیں۔ کیا تم جا رہے ہو" لیزنف نے پوچھا چونکہ رودن نے اپنی ٹوپی اٹھا لی تھی "کیا تم رات یہاں بسر نہیں کرو گے؟"

"نہیں میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ اور شکریہ۔ ہاں میرا بہت برا انجام ہو گا"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیا تم واقعی جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں خدا حافظ۔ مجھے ہمیشہ مہربانی سے یاد کرنا"

"بہت اچھا۔ تم بھی مجھے مہربانی سے یاد کیا کرنا۔ اور میں نے جو بات کہی ہے اسے بھول نہ جانا۔ اچھا خدا حافظ"۔

دونوں دوست بغلگیر ہوئے اور رودن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ لیزنف دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر کھڑکی کے قریب جا کر رک گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بڑبڑا رہا تھا "بیچارا غریب!" پھر وہ میز کے گرد جا بیٹھا اور اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔

باہر ہوا چل رہی تھی اور چیخ رہی تھی اور اس کی کھڑکیوں کو کھڑکھڑا رہی تھی۔ موسم خزاں کی طویل رات آ پہنچی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو اپنے گھروں کی چھت تلے بیٹھتے ہیں اور جن کے پاس ایک گرم گوشہ ہوتا ہے۔ اور خدا بے گھر آوارہ گردوں پر اپنا رحم کرے!

....

۲۶ جون ۱۸۴۸ء کی ایک گرم دوپہر کو پیرس میں مزدوروں کی بغاوت کو دبانے کی مہم آخری مرحلے میں تھی اس وقت ایک باقاعدہ پیدل پلٹن فوبرگ سینٹ انطون کے شہر کی ایک گلی میں ایک مورچہ پر حملہ کر رہی تھی۔ توپ کے گولوں نے اس مورچہ کو توڑ دیا تھا اور اس مورچے کے جتنے محافظ بچ رہے تھے وہ سب کے سب اپنی جان بچانے کی سوچ رہے تھے۔ دفعتاً اس مورچہ کے عین اوپر ایک ٹوٹی پھوٹی بس پر ایک دراز قد شخص نمودار ہوا۔ اس نے ایک پرانا اور بوسیدہ کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے سر پر سرخ رنگ کی شکنوں والی ٹوپی تھی اور اس ٹوپی میں سے اس کے سفید بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں سرخ جھنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کند تلوار تھی۔ وہ عجیب و غریب لہجہ اور چیختی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور اپنے سر کے اوپر اس جھنڈے اور تلوار کو لہرا رہا تھا۔ شاہی حکومت کے ایک فوجی نے نشانہ باندھا اور گولی داغ دی۔ وہ دراز قد شخص جھنڈے کو پھینک کر ایک بورے کی طرح اوندھے منہ گر پڑا۔ جیسے وہ اپنے آپ کو کسی کے قدموں پر گرا رہا ہو۔ گولی اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ایک باغی نے بھاگتے ہوئے کہا "یہ جاتا گیا ناظر تھا"۔

"ہاں" دوسرے نے جواب دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک گھر کے تہ خانے کی طرف بھاگ گئے جس کی کھڑکیاں بند تھیں اور اس مکان کی دیواریں گولیوں اور توپ کے گولوں سے چھلنی ہو گئی تھیں۔

اور وہ کمانڈر دمتری رودن تھا۔

دنیا کے مشہور ترین ناول

میکسیم گورکی کا شہرۂ آفاق ناول

ماں

یہ ناول اس دور سے متعلق ہے جب زار کے مظالم اور شخصی حکومت کے استبداد سے نالاں عوام نے ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی گورکی کا یہ ناول انقلابی قوتوں کی عظیم جدوجہد کی ہی داستان نہیں ہے۔ بلکہ اس ناول میں گورکی نے اپنی زبردست ذہانت سے کام لیتے ہوئے انسانی زندگی کے تمام حقائق کو ان کی اصلی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کو قوت، استحکام اور شعور کی پختگی عطا کرتا ہے۔ انسان دشمن طاقتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ گورکی کی فنی خصوصیات اس ناول میں اپنی معراج پر ہیں۔

اس ناول میں انقلابی صحیفے سے عوام کو مستفیض کرنے کے لئے اس کا سستا مگر جاذب نظر ایڈیشن باہتمام شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت ۴۰۰ صفحے — قیمت چار روپے

روس کے عدیم المثال ناول نگار

نکولائی گوگول

کا

شجاعت اور حب الوطنی سے لبریز ناول

تاراس بلبا

سرزمین روس کا پہلا ناول

جس میں طبقاتی جنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ مٹھی بھر کسانوں نے اپنے ملک کو بیرونی حملہ آوروں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تو شخصی حکومت بھی اس بغاوت سے بوکھلا اٹھی۔ روسیوں کو روسی حکومت سے لوہا لینا پڑا۔ ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ لیکن ایک عظیم انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی۔

مترجمہ: خلیق انجم — قیمت ۲/۸

نٹ ہمسن

نوبل پرائز یافتہ مصنف

کا

شاہکار ناول

بھوک

جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے
جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے۔
جو ایک بھوکے کو انقلاب کا مجسمہ یا پاگل بنا دیتا
جو بھوک کی بیچارگی پر انسان کو کربستہ کرتی ہے۔

مترجم
محمود جالندھری

قیمت
تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ - دہلی

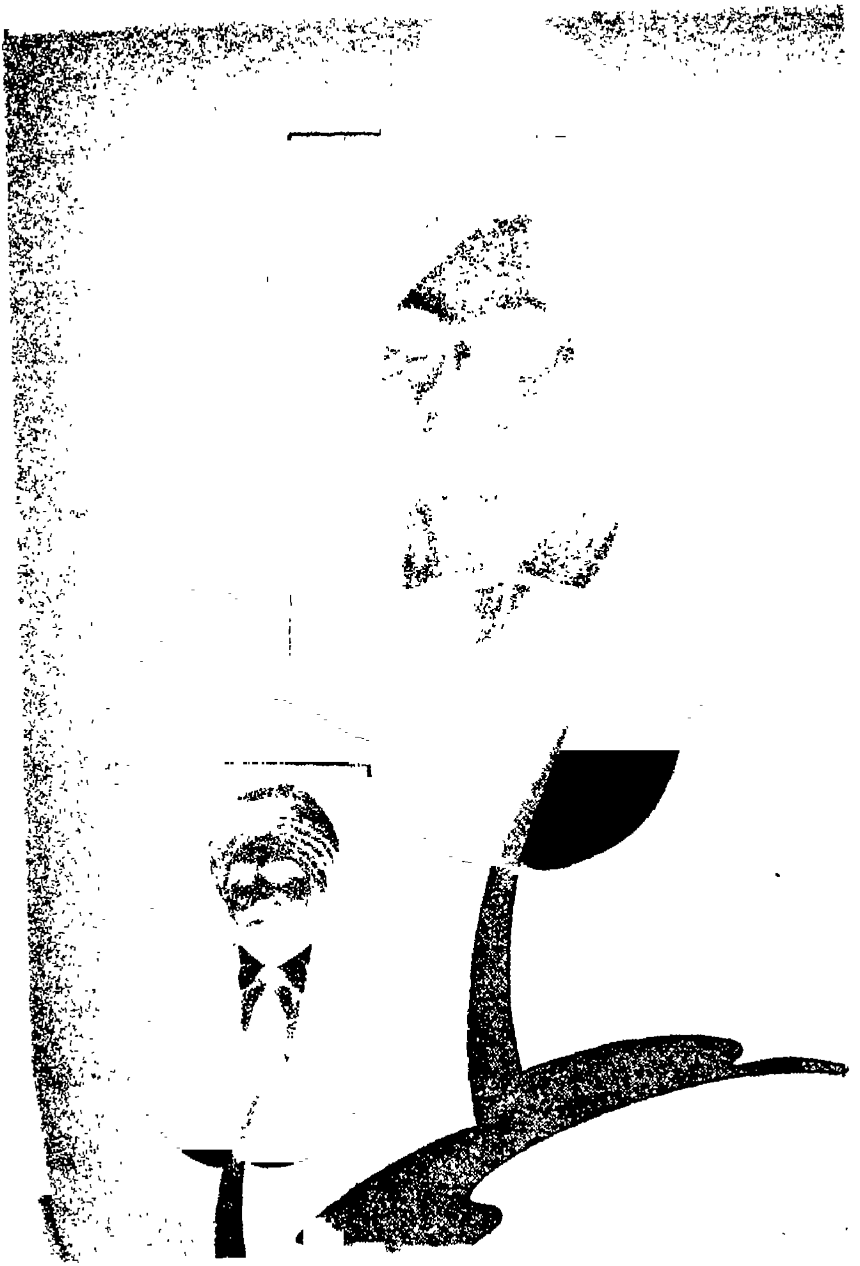
نکولائی گوگل

نکولائی گوگل پولٹاوا کے قریب سارو چنیزی کے مقام پر ۳۱ مارچ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ گوگل نے اپنا بچپن وسطی یوکرین میں بسر کیا۔ وہ زمانہ یوکرین کا سنہری زمانہ تھا۔ اس کے والدین چھوٹے جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ ایک اچھا اداکار تھا اور اس نے کچھ طربیہ ناٹک بھی لکھے تھے۔ گوگل کو یہ صفات اپنے باپ سے ورثے میں ملیں۔ اپنے اسکول کے ایام میں گوگل بھی ایک اچھا اداکار تھا۔

گوگل کا قد چھوٹا تھا اور وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ گوگل اپنی ان کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس نے اپنی کمزوریوں کا بہتر حل ڈھونڈنے کے لئے انشاء پردازی کا آغاز کیا اور اس نے طنز و مزاح کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ وہ انسانوں میں مضحکہ خیز باتوں کا خاص طور سے مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کی دو اہم نگارشات "انسپکٹر جنرل" اور "مردہ روحیں" اسکے اس ذہنی جھکاؤ کا ثبوت ہیں۔

اس نے طنز و مزاح میں بڑا نام پیدا کیا۔ اپنے فن میں پختگی حاصل کرنے سے پہلے اُسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اپنے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لئے ہمیشہ اس انداز میں سوچتا تھا کہ اُسے دنیا میں عظیم کارنامے سرانجام دینا ہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے سینٹ پیٹرس برگ پہنچا۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ ایک شاندار زندگی کا آغاز کرے گا ——— مگر وہاں جاکر اُسے ایک کلرک بننا پڑا اور اس کی تمام تمناؤں پر اوس پڑ گئی ——— کلرکی سے مایوس ہو کر اُس نے اسٹیج پر اداکاری کو اپنا پیشہ بنانا چاہا۔ لیکن اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ یہاں بھی اُسے ایک تلخ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ——— آخرکار سب طرف سے مایوس ہو کر اس نے ادب کے میدان کا رُخ کیا۔ اس کی کہانیاں بہت کامیاب ہوئیں۔ ان کہانیوں میں مزاح کی نہایت اچھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ نثر نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ گوگل نے خود اپنے اس فن کی وضاحت کی ہے۔ اُس نے کہا ——— "میں بہت اداس رہتا تھا اور مجھے قہقہوں کی تلاش تھی ——— میں یہ قہقہے اپنے افسانوں میں سمو دیا کرتا تھا۔"

سینٹ پیٹرس برگ میں نکولائی گوگل نے ایک نہایت اندوہناک زندگی بسر کی تھی۔ اس نے اپنے اس ناولٹ "نفیسکی پراسپیکٹ" میں سینٹ پیٹرس برگ سے انتقام لیا ہے۔ جن لوگوں نے اُسے رنج پہنچایا تھا، اس نے اس ناولٹ میں اُن کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ مگر اتنا خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس نے حقیقت کو کہیں مسخ نہیں ہونے دیا۔ گوگل مضحکہ خیز کردار اور عجیب و غریب واقعات ایجاد کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور اس کا یہ ناولٹ اس کی جدت و اختراع کا منہ بولتا ثبوت ہے۔



نکولائی گوگل　　　　　　　　مترجم: دلیپ سنگھ

دیارِ جاناں

سینٹ پیٹرس برگ میں بہر صورت بازار نیفسکی پراسپکٹ کا کسی دوسرے بازار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس شہر کے لئے یہ بازار ہر چیز پر مشتمل ہے۔

ماحول کا حسن ہے ـــــ مجھے یقین ہے کہ اس شہر کی زرد اور کلرکوں کی آبادی میں سے ایک بھی شخص نیفسکی پراسپکٹ کو کسی دوسری ارضی نعمت سے تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا ـــــ وہ صرف ۲۵ برس کی عمر کا پڑھیا ہو یا کہ تمہاری حسین ہوتی ہیں۔ اور جو کسی اچھے درزی کا حیرت انگیز حد تک اچھا سلا ہوا عمدہ کوٹ پہنتا ہو۔ بلکہ وہ شخص بھی جس کی ٹھوڑی پر سفید بال اگنے لگتے ہیں۔ اور جس کا سر چاندی کی طشتری کی طرح چمکدار ہوتا ہے۔ بازار نیفسکی پراسپکٹ کے بارے میں بہت جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے ـــــ اور خواتین! اوہ ان خواتین کے لئے تو یہ بازار بہت بڑی مسرت ہے ـــــ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس بازار کے سلسلے میں مسرور کون نہیں ہے ـــــ

آپ ابھی اس بازار میں داخل ہی ہوتے ہیں کہ آپ پاکیزہ چہل قدمی کی خوشبو سے دوچار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ضروری کام بھی ہوتا ہے تب بھی آپ اس بازار میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ خود پسند نہیں ہیں۔ اور جہاں انہیں وہ ضرورت اور کاروباری مفاد نہیں لاتا جس نے سارے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے ـــــ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بازار نیفسکی پراسپکٹ میں جس آدمی سے ملتے ہیں وہ مار سکا یا ’گورخودایا‘ لتے تایا اور میش چانسکایا‘ کے بازاروں میں ملنے والے آدمی کی بہ نسبت کم انانیت پسند ہے۔ جہاں حرص و ہوس‘ ذاتی مفاد اور ضرورت کے آثار ہر راہ گیر اور ان لوگوں کے چہروں پر ثبت ہوتے ہیں۔ جو گاڑیوں اور ٹمٹم میں بھاگے پھرتے ہیں۔ نیفسکی پراسپکٹ ایک طرح سے سینٹ پیٹرس برگ کی چوپال ہے ـــــ وہ شخص جو سینٹ پیٹرس برگ میں یا وا یبورگ ضلع میں رہتا ہے اور اپنے دوستوں سے سینڈز یا ماسکو دروازے پر ملنے کے لئے برسوں نہیں گیا ہوتا اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے احباب اس بازار میں ضرور مل جائیں گے۔ نیفسکی پراسپکٹ میں جتنی بھی اطلاع مل سکے گی‘ وہ تو کوئی تیسری کی کتاب اور نہ کوئی ڈاک خانہ مہیا کر سکتا ہے ـــــ نیفسکی پراسپکٹ قادر مطلق ہے ـــــ سینٹ پیٹرس برگ میں رہنے والا ایک غریب آدمی جب اس میں سیر کے لئے آتا ہے تو بے مثال جوش و خروش محسوس کرتا ہے۔ ـــــ اس کی پیٹریاں کتنی صاف ہیں۔

اور میرے خدا ـــــ کتنے ہی قدموں کے ان پر نشانات موجود ہیں۔ ایک ٹیکدار وردی کے بوٹوں کے بھونڈے اور گندے جوتوں کے نشان جن کے بوجھ تلے چٹان بھی چٹخ جاتی ہے ـــــ اور ایک عورت کے ننھے ننھے جوتوں کی طرح ہلکے سلیپروں کے نشان‘ جو دوکانوں کی تابناک کھڑکیوں کی طرف یوں اپنی گردن موڑتی ہے جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف ـــــ ان پیٹریوں پر ایک علم بردار فوجی کی تلوار کا نشان بھی ہے۔ جس سے اُن پر خراش پڑ گئی ہے ـــــ ہر شخص ان پیٹریوں سے اپنی کمزوری اور اپنی طاقت سے انتقام لیتا ہے ـــــ یہاں ایک دن کے دوران کتنے ہی فریب نظر کے مظاہر پیش ہوتے ہیں ـــــ ہر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہاں کتنی ہی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

آیئے پہلے اس کا آغاز بہت سویرے سے کرتے ہیں جب تمام سینٹ پیٹرس برگ ایک تازہ پکائی ہوئی گرم روٹی کی طرح خوشبو چھوڑتا ہے۔

اور جب چیتھڑوں میں ملبوس بوڑھی عورتیں پاک باز اور رحم دل راہگیروں سے بھیک مانگنے کی غرض سے دعائیں پڑھتی ہیں۔

اس وقت نیوسکی پراسپیکٹ خالی ہوتا ہے۔ موٹے پیٹ والے دوکاندار اور اُن کے منشی بابو اس وقت سوئے ہوتے ہیں۔ اور یا پھر منہ ہاتھ دھو کر کافی پی رہے ہوتے ہیں۔ پیسٹری بنانے والوں کی دکان کے سامنے بھیک مانگنے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور جنہیں جو کل چاکلیٹ کے پیالے ہاتھوں میں تھامے مکھی کی طرح اڑتا پھر رہا تھا۔ اب نیم خوابی کی حالت میں ہاتھ میں جھاڑو تھامے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے دوکان سے باہر نکلتا ہے اور باسی پیسٹریاں اور روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے اُن کی طرف پھینکتا ہے۔ سڑک کے کنارے آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنہیں مجبوراً وہاں آنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی روسی کسان جس کے بوٹ چونے میں اس قدر لتھڑے ہوئے ہیں کہ انھیں کیتھرائن دی گریٹ کی نہر جو اپنی صفائی کے لئے مشہور ہے۔ بھی شاید صاف نہ کر سکے۔ کام پر جاتے ہوئے سڑک کو عبور کرتا ہے۔ ایسے وقت پر عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ روسی لوگ اپنے خیالات کا اظہار کچھ ایسے نامناسب الفاظ میں کرنا پسند کرتے ہیں کہ عورتیں انھیں تھیٹر میں بھی سننا پسند نہ کریں۔ کبھی کبھار کوئی کلرک اپنی بغل میں فائلوں کا پلندہ تھامے ہوئے نظر آ جاتا ہے۔ اگر اُس کے دفتر کا راستہ اُس گلی کی طرف سے ہو۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے بارہ بجے تک نیوسکی پراسپیکٹ کسی کی منزلِ مقصود نہیں۔ بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آہستہ آہستہ اس میں ایسے لوگ آنے شروع ہوتے ہیں جنہیں اپنی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور جو اپنے خیالات میں گم چلے جاتے ہیں۔ اور جنہیں اس گلی کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ روسی کسان اپنی ساٹھ کوپک "چاندی کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ بوڑھے مرد اور عورتیں۔ اپنے ہاتھوں کو ہلا رہے ہوتے ہیں۔ اور بڑے نمایاں انداز سے اپنے ساتھ خود سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں لیکن

کوئی نہ تو اُن کی بات سنتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھوں کی حرکت پر ہنستا ہے سوائے اُن شریر بچوں کے جو لکیر دار کپڑے کی بنی ہوئی قمیص پہنے ہاتھ میں خالی برتن یا مرمت شدہ جوتے نہ اُس گلی میں بجلی کی سی تیزی سے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوپہر کے وقت ہر قوم کے ٹیچر اپنے طلباء کے ہمراہ اس گلی پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی اُستاد اپنے شاگردوں کو انگلی لگائے، مناسب سنجیدگی سے یہ بتاتے ہوئے گزرتے ہیں کہ یہ جو دوکانوں پر سائن بورڈ لگائے گئے ہیں۔ یہ اس لئے لگائے گئے ہیں کہ لوگ اِن ہی کو دیکھ کر بتا دیں کہ فلاں دوکان کے اندر کونسی چیز بکتی ہے۔ زرد رنگ کی مائیں اپنے ساتھ شوخ و شنگ ننھی لڑکیوں کو یہ بتاتے ہوئے گزرتی ہیں کہ اپنے کندھوں کو قدرے اُبھار کر اکڑ کر چلنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ نیوسکی پراسپیکٹ پر اس وقت مدرسانہ ماحول چھایا ہوتا ہے۔

دو بجے کے قریب یہ اُستاد، مائیں اور طلباء کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس گلی میں بچوں کے دُبلے پتلے والدین اپنی شوخ و شنگ خاتون دوستوں کو ساتھ لئے اس گلی میں آ دھمکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان میں وہ تمام لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنے گھر کے ضروری معاملات میں مصروف تھے۔ اور اب ابھی اُن سے فارغ ہوئے ہیں۔ اُن کے ضروری معاملات کچھ اس قسم کے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے ساتھ موسم کے متعلق بات چیت کی۔ اور اُس نامعلوم سی پھنسی کے بارے میں اُس کا مشورہ لیا، جو اُن کی ناک پر اُبھر آئی ہے۔ یا اپنے گھوڑوں اور بچوں کی خیر و عافیت دریافت کی یا اخبار میں تازہ واردات شہر اور شہر سے رخصت ہونے والوں کے نام کی فہرست پڑھی یا کسی تھیٹر کا اشتہار دیکھا۔ اور آخر میں کافی کا ایک پیالہ پیا۔

آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس گلی میں آ شامل ہوتے ہیں۔ جنہیں خدا نے کلرک کے عہدے پر فائز کر کے اس [illegible]

ان میں وہ لوگ آ ملتے ہیں جو فارن آفس میں کام کرتے ہیں۔ اور اپنے پیشے اور عادات کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ میرے اللہ یہ دفتر اور یہ ملازمتیں کتنی حیران کن ہوتی ہیں۔ یہ دل کو کس قدر خوشی پہنچاتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں ملازم نہیں ہوں اور اپنے افسران بالا کی نیک سلوکی کا اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔ ہر شے جو آپ کو کیوسکی پراسپکٹ میں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ اپنے کوٹوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے نوجوان ہوں یا سُرخ، سفید اور نیلی ساٹن کا لباس اور خوبصورت پینٹ پہنے والی عورتیں ہوں۔ یہاں آپ کو قسم قسم کی مونچھیں نظر آئیں گی۔ بھوری مونچھیں، ریشمی مونچھیں، کوئلے کی طرح سیاہ مونچھیں ـــــ لیکن یہ سیاہ مونچھیں آپ کو محکمۂ خارجہ کے کارکنوں کے چہروں پر نظر آئیں گی۔ خدا نے دوسرے دفتروں میں کام کرنے والوں کو یہ عطیہ نہیں بخشا۔ وہ چاہے کتنا ہی ناپسند کریں۔ انھیں مجبوراً سُرخ مونچھیں رکھنا پڑتی ہیں ـــــ آپ کو یہاں ایسی ایسی مونچھیں نظر آئیں گی جو نہ تو برش بنا سکتا ہے نہ قلم بیان کر سکتا ہے ـــ ایسی ایسی مونچھیں جن پر زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا گیا ہے اور اب جن کی حفاظت کی گئی ہے ـــــ مونچھیں جنھیں بہترین قسم کی خوشبوؤں سے آراستہ کیا گیا ہے جنھیں رات کے وقت بہترین قسم کے کاغذ میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ مونچھیں ـــــ جن پر ان کے مالکوں نے محبت کے حسین ترین جذبات قربان کر دیئے ہیں۔ مونچھیں ـــ جنھیں راہ گیر حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس گلی میں آپ کو ہزاروں قسم کے زنانے کوٹ، پینٹ اور رومال نظر آتے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور جو کم سے کم دو دن کے لئے اپنے مالک کے جسم سے جدا نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تتلیوں کا ایک بھاری گروہ پھولوں سے اُٹھ کر ایک بادل کی طرح مردوں کے کالے سروں پر منڈلا رہا ہو۔ یہاں آپ کو ایسی ایسی کمر نظر آئے گی جو آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ایسی پتلی کمر جو بوتل کی گردن سے زیادہ پتلی نہیں۔ جنھیں دیکھ کر آپ ادب سے ایک طرف ہو جائیں گے کہ کہیں آپ کی کہنی اُس سے چھو نہ جائے۔ آپ کے دل پر خوف سا چھا جائے گا کہ کہیں آپ کی کوئی گستاخ سانس قدرت اور فن کے اس عجوبہ کو ضرر نہ پہنچائے۔ اور پھر عورتوں کے کیسے کیسے آستین اس گلی میں نظر آئیں گے۔ اور صنعت کے کتنے حسین نمونے ہیں۔ بالکل دو غباروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر ان عورتوں کو نہ تھامیں تو یہ ہوا میں اُڑ جائیں کیونکہ ایک عورت کو ہوا میں اُٹھا لینا اتنا ہی آسان ہے اور پُر لطف جتنا ایک شمپین کے گلاس کو ہونٹوں تک لے جانا۔ دُنیا کے کسی کونے میں دو آدمی ایک دوسرے کو اس طرح جھک کر نہیں ملتے۔ جیسے اس گلی میں ملتے ہیں۔ یہاں پر آپ کو بے مثال مُسکراہٹیں نظر آئیں گی۔ جن کو پیدا کرنے میں بڑی فنکاری سے کام لیا گیا ہے۔ کبھی ایسی مُسکراہٹ جو آپ کو خوشی سے پاگل کر دے۔ اور کبھی ایسی کہ آپ شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ اور پھر کبھی ایسی کہ جسے دیکھ کر آپ اپنے کو کسی جہاز کے مستولوں سے بھی زیادہ بلند محسوس کریں۔ یہاں آپ کو ایسے آدمی ملیں گے جو موسم یا کسی کنسرٹ کا ذکر بھی کریں۔ تو آپ کو اُن کے خاندان کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو ہزاروں قسم کی عادات و اخلاق کے لوگ ملیں گے۔ کیسے کیسے عجیب غریب آدمیوں سے اس گلی میں ملاقات ہوتی ہے یہاں کئی ایسے آدمی ہیں جو آپ سے ملتے ہیں تو عموماً آپ کے جوتوں پر نگاہ ڈال لیتے ہیں لیکن جب آپ گذر جاتے ہیں تو وہ پیچھے مڑ کر آپ کے کوٹ کا دامن دیکھتے ہیں مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ شروع شروع تو مجھے خیال ہوا کہ یہ شاید موچی ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط تھا کیونکہ اُن میں سے اکثر دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ یا یہ وہ لوگ ہیں جو گھوم پھر کر یا چائے خانوں میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے اپنا وقت گذارتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ عام طور پر عزت دار ہوتے ہیں۔

بعد از دوپہر اور دوپہر کے درمیان کے خوش نصیب وقت پر یہ گلی اپنی پوری تابانی پر ہوتی ہے۔ انسان کی بہترین تخلیق کی اس وقت یہاں نمائش ہوتی ہے کہیں تو آپ کو بہترین فراک نظر آتا ہے۔ اور کہیں یونانی ناک کا بہترین نمونہ کہیں پر بہترین مونچھیں نظر آتی ہیں۔ کہیں پر کوئی عورت ـــ دو خوبصورت آنکھیں اور ایک حیران کن چھوٹا سا ہیٹ اور پھر کوئی اور عورت جس کی نازک اور خوبصورت انگلی پر ہیرے کی طلسمی انگوٹھی نظر آتی ہے ـــ

جونہی تین بجتے ہیں۔ تو اس گلی میں گھومنے والوں میں ایک اور تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔ اس وقت اس گلی میں اچانک بہار آ جاتی ہے۔ اس میں سبز لباس پہنے والے کلرک آ دھمکتے ہیں۔ اس وقت یہاں آپ کو کالجیٹ رجسٹرار اور دوسرے سکریٹری اس انداز سے ٹہلتے ہوئے نظر آئیں گے جس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے کہ

وہ کونسل چیمبر میں چھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں بیٹھے۔ لیکن پارلیمنٹ کا لیجیت سکریٹریز اور کونسلرز سر جھکائے تیزی سے چلتے ہیں۔ راہگیروں کا نظارہ کرنے کی انھیں فرصت نہیں۔ وہ ابھی تک اپنے دفتر کے کام سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر پائے۔ اب بھی اُن کے دماغ میں دفتر کے کاغذات گھوم رہے ہیں۔ کافی دیر تک انھیں دوکانوں کے سائن بورڈز کی بجائے کاغذوں سے بھرے ہوئے تھیلے اور چانسلر کے دفتر کے افسرِ اعلیٰ کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔

چار بجے کے بعد نیوسکی پراسپیکٹ خالی ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو یہاں پر ایک کلرک بھی نظر نہیں آئے گا۔ کوئی ایک دوکان میں نکل کر نیوسکی پراسپیکٹ میں سے گزر جائے یا کوئی اجنبی جس کے لئے سارا وقت ایک سا ہے۔ یا کوئی لمبی اور پتلی انگریز عورت جس کے ہاتھ میں ایک مالا اور ایک کتاب ہے۔ ایک روسی مزدور ایک اوور کوٹ پہنے جس کی کمر اُس کی پشت پر آتی ہے۔ اور جس کی مختصر سی داڑھی ہے۔ جس نے اپنی تمام زندگی تیزی سے چلتے ہوئے گذار دی ہے۔ اور جس کا ہر چیز ہلتی ہے۔ کمر، ہاتھ، ٹانگیں، سر جب وہ چلتا ہے تو اُس کا سب کچھ ہلتا ہے۔ یا کبھی کبھار کوئی مستری۔ اس وقت اس گلی میں آپ کو ان لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں ملے گا۔

لیکن جونہی مکانوں اور گلیوں پر شام کے دھندلکے چھا جاتے ہیں۔ اور چوکیدار اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹ کر لیمپ جلانے کے لئے نکل پڑتا ہے۔ اور دوکانوں کے شوکیسوں میں سے ایسی ایسی چیزیں جھانکتی ہیں جو دن کے وقت شکل دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتیں۔ تب نیوسکی پراسپیکٹ پہ پھر رونق آجاتی ہے اور پھر وقت شروع ہو جاتا ہے جب لیمپ ہر شے کو حیران کن اور عجیب و غریب بنا دیتی ہے۔

اس وقت آپ بہت سے نوجوانوں سے دو چار ہوں گے جن میں سے اکثر کنوارے ہوتے ہیں اور گرم کوٹ اور چغے میں ملبوس ہوتے ہیں اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کا یہاں آنے کا کوئی مقصد ہو۔ یا مقصد سے ملتا جلتا کوئی جذبہ ہو یعنی آپ یہاں بغیر کوشش کے کھنچے چلے آئے ہیں۔ ہر ایک کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے ہوتے ہیں۔ دیواروں اور چھتوں پر لمبے لمبے سائے ابھرتے ہیں جو پولیس پریفکٹ سے بھی اونچے اُٹھ جاتے ہیں نوجوان کالجیت سکریٹری کچھ دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن بوڑھے کالجیت سکریٹری اور جنرل عام طور پر اس وقت گھر پر بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ یا تو وہ شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اور یا پھر اُن کے جرمن باورچی جو اُن کے گھروں میں ہوتے ہیں بہت اچھا کھانا پکاتے ہیں۔ آپ اُن معزز طلب بزرگوں سے جو دو بجے کے قریب اِسی گلی میں ٹہل رہے تھے اور جن کی چال ڈھال سے اُن کی اہمیت اور برتری کا احساس ہوتا تھا، ملیں گے۔ لیکن اس وقت وہ بھی کالجیت سکریٹری اور کونسل کی طرح تیزی سے چلتے ہوئے دکھائی دیں گے کیونکہ انھیں بھی اُس عورت کے ہیٹ کے نیچے جھانکنا ہے جس کے اُبھرے اُبھرے سُرخ ہونٹ بہت پیارے لگتے ہیں۔ خاص طور پر بارمین، مزدور اور دکاندروں جو ہمیشہ جرمن اوور کوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اور پھر میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔

" ایک منٹ ٹھہرنا " لفٹیننٹ پیروگوف نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ڈریس کوٹ میں ملبوس نوجوان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا " دیکھا تم نے "

" ہاں بھئی دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت ہے "

" تم کونسی کی بات کر رہے ہو "

" اُس کی جس کے بال کالے ہیں " اوئی اللہ! کتنی پیاری آنکھیں ہیں۔ اور اُس کے چہرے کے نقوش کتنے پیارے ہیں "

" لیکن میں تو بھورے بالوں والی اُس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو اُس کے پیچھے گئی ہے، لیکن اگر تم کو وہ لڑکی اتنی پیاری لگی ہے تو اُس کا تعاقب کیوں نہیں کرتے "

" تعاقب! کیا بکتے ہو۔ کیا تم آسے اُن عورتوں میں سے سمجھتے ہو جو شام کو نیوسکی پراسپیکٹ میں گھومتی ہیں وہ تو ضرور کسی اونچے خاندان کی عورت ہے اُس کا تو اکیلا کوٹ ہی اسی روبل کا ہوگا " اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

" بے وقوف کہیں کا " پیروگوف نے دور سے دھکیلتے ہوئے کہا " جاؤ جاؤ اُس کے پیچھے جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے اور میں بھورے بالوں والی لڑکی کا تعاقب کرتا ہوں "

دونوں دوست جدا ہو گئے۔

"ہم تمہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں" ہیرو کو نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ کوئی حسینہ اُسے رد نہیں کر سکتی۔

ڈریس کوٹ میں ملبوس نوجوان شرماتا اور ڈرتا ہوا اس رنگین ٹوپی کے پیچھے جو ہوا میں لہرا رہی تھی چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹوپی کبھی تو لیمپ کی روشنی میں چمک اٹھتی اور کبھی لمحہ بھر کے لئے سایوں میں ڈوب جاتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور انجانے میں اُس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ وہ اُس حسینہ کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا وہ صرف وہ مکان دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ حور شمائل مکین تھی۔ وہ حسینہ جو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس گلی میں آسمان سے اُتر آئی ہو اور پھر شاید کسی نامعلوم کوچے کو چلی جائے۔ وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ وہ لگاتار کئی عزت دار بھوری مونچھوں والے آدمیوں کو پرے دھکیل رہا تھا۔

یہ نوجوان اُس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو ہمارے درمیان عجیب سا لگتا ہے۔ اور سینٹ پیٹرز برگ کے ساتھ اُس کا وہی تعلق ہے جو خواب میں دیکھے ہوئے ایک چہرے کا حقیقی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی یہ مخصوص کلاس اُس شہر میں خاص طور پر عجیب لگتی ہے۔ جہاں کا ہر ایک باشندہ یا تو کلرک ہے یا دکاندار اور یا پھر جرمن کاریگر ...... وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ یہ عجیب سین ہے کیا؟ آرٹسٹ اور سینٹ پیٹرز برگ میں۔ برفیلی زمین آرٹسٹ۔ اُس جگہ کا آرٹسٹ جہاں کی ہر چیز بھیگی بھیگی سی ہے۔ صاف ستھری۔ بھوری اور دھندلی ہے۔ یہ آرٹسٹ اٹلی کے آرٹسٹوں سے مختلف ہیں۔ اٹلی کے آرٹسٹ اپنے ملک کی زمین اور آسمان کی طرح مغرور اور جوشیلے ہیں۔ یہاں کے آرٹسٹ عام طور پر نیک۔ شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے لوگ ہیں۔ اکثر آپ ایک دو دوستوں کے ساتھ کسی چھوٹے سے کمرے میں جائے پیتے ہوئے اپنے کسی پسندیدہ مضمون کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ اور اُس مضمون سے ہٹ کر کبھی کوئی بات نہیں کرتے۔

یہ آرٹسٹ اکثر کسی بوڑھی فقیر عورت کو گھر لے آیا کرتا۔ اور اُسے مجبور کرتا کہ وہ پورے چھ گھنٹے وہاں بیٹھی رہے۔ صرف اس لئے کہ وہ اس کے درد انگیز چہرے کو کینوس پر منتقل کر سکے۔ وہ اپنے کمرے کو سیٹ کرتا جس میں ہر ایسی غلاظت کا ڈھیر ہو جس کا اس کے پیشے کے ساتھ کوئی تعلق ہو سکتا ہے ـــــ پلاسٹر آف پیرس ـــــ جس کا رنگ وقت اور گرد کی متفقہ کوششوں کی وجہ سے کافی ہو چکا ہے ـــــ ٹوٹے ہوئے فریم ـــــ ٹوٹا پھوٹا کلر بکس جو الٹا پڑا ہے۔ ستار بجاتے ہوئے ایک دوست کی تصویر ـــ رنگ سے آلودہ دیواریں۔ اور ایک کھلی کھڑکی جس میں سے نیوا کے زرد رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور اُس کے رشتہ دار غریب مچھیرے اپنی سُرخ قمیصوں میں کھائی دیتے ہیں۔ اُن کے ہمیشہ بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں ـــ مشرقی علاقوں کا خاص نشان لیکن باوجود ان سب باتوں کے یہ آرٹسٹ لوگ محنت سے کام کرنے میں حقیقی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر واقعی اچھے فنکار ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی وہ اٹلی کی تازہ ہواؤں میں سانس لے سکتے تو اُن کا فن بھی شاید اسی آزادی اور بغیر رکاوٹ کے ترقی کرتا جیسے ایک پودا اچھا پھولتا ہے۔ جسے کمرے سے اٹھا کر باہر رکھ دیا جائے۔ عمومی طور پر وہ بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ کسی اچھے لباس میں ملبوس آدمی کو دیکھ کر وہ اکثر اپنی تصویروں کی قیمت کم کر دیتے ہیں۔ وہ فیشن ایبل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے فیشن میں بھی گنوارپن کی جھلک نظر آتی ہے۔ کبھی آپ کو یہ لوگ بڑے خوبصورت ڈریس کوٹ میں ملبوس لگتے ہیں لیکن اُس کے اوپر ایک گندہ سا چغہ ہوگا۔ کبھی ایک قیمتی کرتی اور اُس پر رنگ آلود جیکٹ یعنی اُسی طرح آپ اُن کو کسی نامکمل سینری یا ایک حسینہ کی تصویر دیکھیں گے جس کا سر نیچے ہوتا ہے۔ اور پاؤں اوپر۔ اور کسی اور مناسب جگہ کی ناموجودگی میں یہ تصویر کسی اور نامکمل سینری کا پیچھے لٹکا دی جائے گی۔

یہ آرٹسٹ کبھی آپ سے آنکھ نہیں ملائیں گے۔ اور اگر کبھی مل جائے تو شرما کر پرے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کے

دیکھتے ہیں نہ تو عقاب کی سی تیزی ہوتی ہے نہ باز کی سی۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ وہ آپ کے نقش و نگار دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلاسٹر
آف پیرس کے بنے ہوئے کسی ہرکولیس کے نقش و نگار بھی دیکھ رہے
ہوتے ہیں۔ جو اُن کے کمرے میں پڑا ہوتا ہے۔ یا وہ اپنی وہ تصویر
دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ابھی انھوں نے بنائی ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ وہ آپ کی باتوں کا جواب اکثر ٹوٹے پھوٹے اور نامناسب الفاظ
میں دیتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں مضامین کی آمیختگی انھیں اور
شرمیلا بنا دیتی ہے۔

اور اس کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نوجوان جس کا ہم
ابھی ابھی ذکر کر رہے تھے۔ آرٹسٹ پکاریو ـــ شرمیلا۔ گوشہ نشین۔
لیکن اُس کی روح میں احساسات کے ایسے دبے دبے روشن تھے جو
جو موقع ملنے پر شعلوں کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ وہ دبے
پاؤں اپنی خواہشات کے مرکز کے پیچھے۔ جس نے اُسے اس قدر مسحور
کیا تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس بدسلوکی پر خود حیران تھا۔
اس اثنا میں اُس اجنبی نے جس پر اُس کی آنکھیں اُس کے خیالات
اُس کے احساسات مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دم مڑ کر دیکھا
اللہ! اللہ! کتنے حسین نقش تھے اُس کے۔ ایک نہایت
ہی حسین ماتھے کی چند صیاد بنے دلی سفید رنگت خوبصورت
بالوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اُس کی حسین زلفیں ہیٹ سے نکل کر
اُس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ رخساروں میں سے شام
کی ٹھنڈی ہواؤں کی تازگی جھلک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے
اردگرد حسین خوابوں کا سلسلہ چھایا ہوا تھا ـــ اُس نے
پکاریو کو پلٹ کر دیکھا پکاریو کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے
اُسے بے حسی سے دیکھا۔ اِس قسم کے بیہودہ تعاقب کی وجہ سے
اُس کے چہرے پر حقارت کے جذبات ابھر آئے تھے لیکن غصے
نے اُس چہرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ شرم اور کمزوری کے
غلبے کی وجہ سے وہ نظریں جھکا کر رُک گیا۔ لیکن اُس مندر کا
پتہ لگائے بغیر جہاں وہ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کوئی کیسے اُس
پری وش سے سبکدوش ہو جائے۔ اُس نوجوان کے دماغ میں
اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے اور اُس نے تعاقب جاری رکھنے
کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے اس ارادے کو چھپانے کی خاطر وہ

کافی فاصلے پر چل رہا تھا۔ یوں ہی اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔
ظاہراً دوکانوں کے بورڈوں پر نگاہ ڈالتے جا رہا تھا۔ لیکن
اُس حسین عورت کے ایک قدم سے بھی غافل نہیں تھا۔ راہ گیر
کم ہوتے گئے۔ گلی میں خاموشی چھا رہی تھی۔ اُس عورت نے مڑ کر
دیکھا اور اُس نوجوان کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ہونٹوں پر
ایک دھیمی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ کانپ گیا۔ اُسے
اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔
نہیں! اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ضرور لیمپ کی روشنی
کا بھرم ہے۔

نہیں! یہ ضرور اُس کے اپنے خوابوں کا عکس ہے۔ اُس
کا سانس سینے میں گھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری
تھی۔ اُس کے احساسات جل رہے تھے۔ اور اُس کی نظروں کے
سامنے ہر چیز دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی اُسے یوں محسوس
ہوا جیسے اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہو گاڑیاں تیز
گھوڑوں کے باوجود ساکن کھڑی ہیں۔ پل پیچھے سے بہہ گیا اور
پھر ٹوٹ گیا۔ سامنے والا مکان اُلٹا کھڑا ہے۔ ایک عجوبہ چیز
گرتی نظر آئی۔ ایک بورڈ کے سنہری الفاظ اُسے اپنی بھووں
پر چپکتے نظر آئے ـــ یہ تمام تصورات ایک حسین چہرے کی فقط
ایک جنبش کا نتیجہ تھے۔ بغیر کچھ سُنے دیکھے یا سمجھے وہ اُن حسین
قدموں کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر قابو پانے کی
کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے پاؤں اس کے دل کی رفتار
کے ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی تو وہ اُس حسینہ کے اشارے
کے متعلق شک میں مبتلا ہو جاتا۔ اس پر وہ ایک لمحے کے لئے
رُک جاتا لیکن اُس کے دل کی دھڑکن اور ایک غیبی طاقت
اُسے مجبور کرتی کہ وہ آگے بڑھے اچانک اُس کے سامنے ایک
چار منزلہ مکان نمودار ہوا جس کی کھڑکیوں کی چار قطاروں میں
سے روشنی چھن چھن کر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے
اُس حسینہ کو اُس مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔
پھر واپس مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ وہ ہونٹوں پر اُنگلی رکھے اُسے
پیچھے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں ڈگمگائے۔ اُس
کے احساسات اور خیالات جل گئے [illegible] تیزی سے

۔۔۔ کے دل کو چیر کر نکل گیا۔

نہیں یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میرے اللہ! ایک لمحہ میں اس قدر مسرت۔ ایک پل میں اتنی حسین زندگی۔

لیکن یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیا وہ حسینہ جس کے ایک اشارے پر وہ اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھا جس کے در پر پہنچا ایک ناقابلِ بیان مسرت تھی ——— کیا وہی اب اُس کی طرف اس قدر توجہ ہو سکتی ہے ——— وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اُس کے دماغ میں کوئی دنیاوی خیالات نہ تھے۔ نہ ہی اس کے دل میں دنیاوی جذبات کی گرمی تھی۔ وہ اُس لمحے ایک کنواری لڑکی کی طرح پاک و پوتر تھا جس کے دل میں محبت کا ایک ناقابلِ بیان روحانی تصور ہوا اور بس۔ ایک ایسی چیز جو ایک عام انسان میں گھٹیا قسم کے جذبات بیدار کر دیتی۔ پکارلو کے جذبہ انسانیت کو ابھارنے کی محرک ثابت ہوئی۔

اُس نازک اندام حسینہ نے جو اعتقاد اُس پر رکھا، وہ اُس کے لئے بالکل ویسے ہی تھا جیسے ایک بہادر آدمی کا ارادہ یا ایک غلام کی غلامی۔ اُس کی صرف ایک خواہش تھی وہ یہ کہ وہ حسینہ اُسے مشکل سے مشکل حکم دے تاکہ اُس کو سرانجام دینے میں اُسے اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑے۔ اُسے یقین تھا کہ کسی غیبی طاقت نے اُس حسینہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اُس پر اعتقاد رکھے۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اہم خدمت کے لئے کیا جائے گا۔ اور وہ اُس قوت ارادی اور طاقت کو اپنے اندر پہلے سے ہی محسوس کر رہا تھا۔ جو اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے درکار تھی۔

سیڑھیاں آگے جا کر مڑ گئیں اور ان کے ساتھ اُس کے خیالات کا دھارا بھی دیکھنا! دھیان سے چڑھنا جیسی کسی کی طرح کی ایک آواز نے اُس کے دل میں ایک نیا جوش بھر دیا۔ چوتھی چھت کے گہرے اندھیرے میں اُس اجنبی نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ایک حسین سی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے کھڑی تھی۔ اُس نے پکارلو کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اُس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے کے مختلف کونوں میں اُسے تین عورتیں دکھائی دیں۔ ایک تاش کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دوسری دو انگلیوں سے پیانو پر ایک پرانے گیت کی دھن بجا رہی تھی۔ تیسری ایک آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے لانبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اور ایک اجنبی کی آمد سے اُس نے بارسنگھار میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ہر ایک چیز سے ایک ناپسندیدہ بے ترتیبی کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے عام طور پر ایک کنوارے آدمی کے کمرے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ فرنیچر پر جو کہ خاصہ اچھا تھا۔ گرد کی ایک تہ جمی ہوئی تھی۔ انگیٹھی پر جگہ جگہ مکڑی کا جالا بنا ہوا تھا۔ ایک اور کمرہ جس کا دروازہ اس کمرے میں کھلتا تھا۔ اُس میں سے ایک گشتی اور چیچو کے علاوہ ایک سرخ لباس نظر آ رہا تھا۔ ایک مرد اور عورت کے ملے جلے قہقہوں کی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی۔

یا خدا! وہ کہاں آ گیا ——— پہلے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اُس نے کمرے کے سامان کو زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن آرائش سے مبرا دیواریں اور بے پردہ کھڑکیاں اس بات کی شاہد تھیں۔ کہ یہاں کوئی گھریلو قسم کی عورت نہیں رہتی۔ ان قابلِ رحم مرجھائے ہوئے چہروں میں سے ایک اُس کے بالکل قریب تھا۔ اور اسے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے پکارلو کسی اور کے لباس پر ایک دھبہ ہو۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک ایسے غلیظ ماحول میں آ گیا ہے۔ جہاں قابلِ رحم گراوٹ مکین ہے۔ گراوٹ جو ایک ایسے نظام کی پیداوار ہے۔ جہاں ایک طرف تو دولت کے انبار ہیں اور دوسری طرف بھوک اور افلاس ——— ایسے ماحول میں جہاں انسان نے ہر پاک اور پوتر احساس کا گلا گھونٹ کے رکھ دیا ہے۔ جہاں عورت جو دنیا کا حسن اور تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ ایک بے حقیقت سی چیز بن کے رہ گئی ہے۔ اُس سے اس کی روح کی پاکیزگی اور عورتیت چھن گئی ہے۔ اور نزاکت اور حسن جو عورت کا خاص سرمایہ ہے چھن کر اس میں مردوں کے سے انداز اور دلیری آ گئی ہے۔ پکارلو نے اُس عورت کو

سر سے پاؤں تک بغور دیکھا جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کہ آیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس پر اس قدر جادو کر دیا تھا کہ وہ اُس کے پیچھے یہاں تک کھنچا چلا آیا ہے ــــ وہ اپنے حسن کی تمام رنگینیوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال ویسے ہی خوبصورت تھے۔ اُس کی آنکھوں میں وہی سحر انگیزی تھی۔ اُس کے چہرے کی تازگی بھی ویسی ہی تھی۔ اُس کی عمر صرف سترہ برس کی ہوگی۔ ابھی تک لیکاریو میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ وہ اُس کے تازہ اور گلابی رخساروں کو چھو سکے۔ وہ بہت حسین تھی۔

وہ اُس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اپنے آپ میں کھو جانے کے لئے ویسے ہی تیار تھا۔ جیسے وہ پہلا اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ لیکن وہ حسین لڑکی اس لمبی خاموشی سے تنگ آ گئی۔ اور لیکاریو کی نگاہوں میں جھانکتی ہوئی معنی خیز طور پر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک دردناک بیہودگی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر اتنی عجیب لگ رہی تھی جتنا کسی جلاد کے دل میں رحم اور کسی شاعر کے ہاتھ میں بہی کھاتہ۔

وہ کانپ سا گیا۔ اُس نے اپنے حسین ہونٹوں کو جنبش دی اور کچھ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ سب فضول اور بیہودہ تھا ــــ جیسے پاکیزگی کے چھن جانے سے عقل بھی چھن گئی ہو۔ وہ اب کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکاریو میں ایک بچے کی سی سادگی تھی۔ اس قسم کا موقع کسی بھی اور شخص کے لئے مسرت کا باعث ہو سکتا تھا لیکن وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گلی میں اتر آیا۔

سر جھکائے اور اپنے بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑے وہ اپنے کمرے میں ایک ایسے دکھی انسان کی طرح بیٹھا تھا جو ایک نایاب ہیرا پا کر اسے سمندر میں گرا دے۔ "اتنی حسین عورت! اتنے پیارے نقش و نگار! اور کہاں پڑی ہے؟" وہ صرف یہی الفاظ کہہ سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم اس قدر رحم دل کبھی نہیں ہوتے جتنا ہم ایک حسین چہرے کو غلاظت کے گڑھے میں گرا دیکھ کر ہوتے ہیں۔ بدصورتی اور غلاظت کو ایک جگہ دیکھ کر دکھ نہیں

ہوتا۔ لیکن حسن ــــ حسن کی اور بات ہے۔ حسن کا تعلق ہمارے خیالات میں پاک وصاف چیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ حسین لڑکی جس نے لیکاریو کو مسحور کر دیا تھا۔ واقعی حسن نسوانیت کا ایک حسین نمونہ تھی۔ اس غلاظت کے گڑھے میں اُس کی موجودگی کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہی تھی ــــ اُس کے چہرے کے نقوش اس قدر متناسب تھے۔ اُس کے چہرے سے اس قدر برتری ٹپکتی تھی کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ گراوٹ نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

وہ ایک نایاب ہیرا ہو سکتی تھی۔ ایک بے پناہ محبت کرنے والے خاوند کی جنت ہو سکتی تھی۔ وہ ایک خاندان کا چشم و چراغ ہو سکتی تھی۔ اُس کے حسین لبوں کی جنبش حکم صادر کر سکتی تھی۔ رقص و سرود کی محفلوں کی وہ شہزادی ہو سکتی تھی۔ جہاں موم بتی کی روشنی میں ہزاروں عشاق اپنے دلوں کے نذرانے اُس کے قدموں پر پیش کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن افسوس کسی شیطانی قوت کے زیر اثر وہ زندگی کی قدروں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس غلاظت کے کنوئیں میں دھکیل دی گئی تھی۔

دکھ اور رحم کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا وہ موم بتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ آدھی رات کب کی گذر چکی تھی۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سے جب آدھی بجے کی آواز آئی تو وہ نیند سے بیدار ہو کر پڑا تھا۔ نیند کی دیوی آہستہ آہستہ اُسے اپنی گود میں لے رہی تھی۔ کمرے کے در و دیوار اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں گم تھا۔ اُسے صرف موم بتی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کانپ سا گیا۔ اور گھبرا سا گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک بڑے قیمتی لباس میں ایک کوچوان اندر داخل ہوا۔ آج تک اس کمرے میں کبھی اتنے حسین لباس میں ملبوس کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ اور پھر اتنی رات گئے اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوچوان کو اُس نے بڑے بے صبر تجسس سے دیکھا۔ کوچوان جھک کر آداب بجا لایا اور کہا "میری مالکن نے آپ چند گھنٹے ہوئے مل کر آئے ہیں آپ کو بلایا ہے۔ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ گاڑی نیچے کھڑی ہے"

لیکاریو حیرت میں گم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں حسین لباس

ابھی کیا دیکھا ہے بیچارے محنت کشوں کی زندگی کو قریب سے دیکھو گی تو تمہیں رونا آجائے گا۔

دوسرے دن ہیرا آیا تو ریکھا اُس سے بھی یہی باتیں کرنے لگی۔

"ہیرا! غریبی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سائنس نے جو اتنی ترقی کی ہے۔ وہ کیا صرف امیروں کے لئے جن کے پاس عیش و آرام کے سب ذرائع موجود ہیں۔ غریبوں کے لئے نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا۔ رہنے کی جھونپڑیاں بھی گندی گلیوں میں پہلے میں اُن کی عادتوں کو بُرا بھلا کہتی تھی مگر اب دیکھتی ہوں کہ یہ عادتیں بھی حالات کی پیداوار ہیں۔"

چندن بولا "ہیرا اب تمہاری بھابی آہستہ آہستہ سچائی کو پرکھنے اور سمجھنے لگ گئی ہے۔"

"مگر جیسے جیسے سچائی کھل کر میرے سامنے آتی جاتی ہے میں اور بھی اُداس ہوتی جاتی ہوں۔ زندگی کی ندی کو پہاڑوں کے آنچل سے کل کل کرتے بہتے زمین کو سرسبز اور شاداب بناتے ہوئے سمندر میں جاکر ملنے کی بجائے اُسے چھوٹی چھوٹی نالیوں اور گھٹ گھٹ میں سڑتے دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔"

ریکھا، سچائی کے راستے پر چلنے والا ہر ایک مسافر پہلے دُکھ کی آگ میں جلتا ہے لیکن اُسے چین تبھی نصیب ہوتا ہے جب وہ زندگی کے دریا کو میدانوں کی طرف موڑنے کے لئے خود کام کرنے لگتا ہے

ریکھا نے ان الفاظ میں اتنی سچائی دیکھی کہ بہت دیر تک چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی چندن کے یہ الفاظ صرف الفاظ نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے ایک اٹل سچائی چھپی ہوئی تھی ریکھا نے اُسے کبھی ایک منٹ بھی بیکار ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ریکھا نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم کہ زندگی کی جن گھڑیوں کو میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے حاصل کر سکنے کے ارادے کر رہی تھی ان کا استعمال سماج کی بھلائی اور عوام کے سُکھ چین کے لئے ہو رہا ہے۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی چارپائی کے پاس اُس پر جھکا ہوا ہے۔ اُس کی گرم سانس اُس کے چہرے کو چھو رہی ہے وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔ بتی جلائی تو دیکھا چندن اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا وہ اُس کے قریب گئی اور سوچتی سمجھ کر لیٹ گئی۔

وہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ چاہے کتنا بھی چھپائے مگر اُس کا چہرہ پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ یقیناً اُسے بہت چاہنے لگے ہیں۔ پھر یکایک اُسے خیال آیا۔ ابھی دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہے جس کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے، یہ کیسے ہوگا؟ یہ کیسے ہوگا؟

(۱۳)

چندن جس مل میں کام کرتا تھا اُس میں ہڑتال شروع ہوئی تھی اور ہڑتال کو پورے سولہ دن ہوگئے تھے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی ہڑتال اکیس تاریخ کو شروع ہوئی تھی مہینے کے سات دن اور بیت گئے مگر تنخواہ نہیں ملی۔ پا بڑ، دودھ اور دہی وغیرہ منگوانا بند ہوگیا۔ اب اناج گھی اور تیل سلیٹ کی بھی تنگی ہونے لگی۔

ریکھا نے جھنجھلا کر شوہر سے کہا اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟"

چندن نے تیوری چڑھا کر کہا تکلیف؟ تکلیف کا تو تمہیں ابھی علم ہی نہیں تکلیفیں تو حقیقی معنوں میں ہمارے مل کے مزدور اُٹھا رہے ہیں ہم کلرکوں کو تو صرف تکلیف کی ہوا سی لگی ہے آج ہمارا جلسہ ہونے والا ہے چل کر دیکھو گی کہ مزدوروں کی بستی کی کیا حالت ہے؟"

ریکھا شام کو وہاں گئی بستی کو دیکھ کر وہ سُن ہوگئی۔ مرجھائے چہروں والی عورتیں، کمر خمیدہ مرد، کالے کلوٹے اور ننگے اور ننگے دھڑنگے بچے، اُداس اور مایوس چہرے، تھکے تھکے اور بکھرے ہوئے ڈھانچے سب دیکھ کر ریکھا کا دل کانپ اُٹھا۔

بستی کی جھونپڑیوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور اس کے پیچھے میدان۔ وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں جمع ہوئے تھے۔ شروع میں ایک لڑکی نے گیت گایا پھر کئی لوگوں نے تقریریں کیں۔

ریکھا جلسے سے لوٹی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسا سماج پر چھائی ہوئی [illegible] گناہوں میں بھی شامل ہوگئی ہوں۔ دل کی صاف اور خزل روشنی کو پاکر گلیاں اور کھڑکیاں۔۔۔۔۔ سبھی روشن ہو اُٹھی ہوں۔

ایک تیلی اور لمبی عورت نے کہا تھا۔ ہم ہر تکلیف صبر سے برداشت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم سب سچائی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

"میرے اللہ۔ مجھ پر رحم کر۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے اس کا دیدار بخش دے"۔

وہ اب شام کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے اسے نیند آگئی۔ نیند کے ساتھ خواب آئے۔ ایک کلرک کا خواب جو ایک کلرک بھی تھا اور سپاہی بھی۔ کس قدر ناقابل برداشت تھے یہ خواب... آخر وہ بھی نمودار ہوئی۔ اس کا سر۔ اس کی زلفیں ... لمبے نظر آئیں۔ لیکن صرف چند لمحوں کے لئے پھر ایک دھندلکا سا چھا گیا۔ اور پھر اسے کوئی اور گھٹیا سا خواب دکھائی دیا۔

یہ خواب آہستہ آہستہ اس کی زندگی بن گئے۔ اب اس کی زندگی کے دھارے نے ایک خاص رخ اختیار کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیداری میں سوتا ہے اور نیند میں جاگتا ہے۔ اگر کوئی اسے اپنی میز پر گم سم بیٹھے دیکھ لیتا۔ یا اسے گلی میں چلتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ شاید پکاریو کو پاگل یا شرابی سمجھا۔ اس کا چہرہ بالکل بے حس تھا۔ اور غفلت جو اس کی پیدائش سے اس کی زندگی کا ایک حصہ تھی اب اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ اس کا چہرہ ہر قسم کے احساس و حرکات سے عاری ہو گیا۔ رات کو البتہ اس میں کچھ گرمی پیدا ہوئی۔

ان حالات میں اس کی صحت بالکل تباہ ہو گئی۔ شب بیداری اس کے لئے ایک مصیبت بن گئی۔ اس ایک خزانے کو پا لینے کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ افیم کھانے سے خوابوں کی کڑیاں جوڑی جا سکتی ہیں۔ اسے ایک دم ایک ایرانی کا خیال آیا۔ جو شالیں بیچا کرتا تھا۔ اور پکاریو سے اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر بنا دو۔ پکاریو نے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہاں سے افیم مل سکے گی۔

ایرانی اسے آلتی پالتی مارے دیوان پر بیٹھا ملا۔

"تمہیں افیم کس لئے چاہیئے" ایرانی نے پوچھا۔

پکاریو نے اپنی بے خوابی کا حال کہہ سنایا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں افیم دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے ایک بہت ہی حسین لڑکی کی تصویر بنا دو۔ دیکھو۔ لڑکی بہت خوبصورت ہو۔ اس کی پلکیں سیاہ ہوں اس کی آنکھیں بادام ایسی ہوں۔ مجھے اس کے قریب لیٹا ہوا دکھاؤ۔ میرے منہ میں میرا پائپ ہو۔ مجھے لڑکی بے حد خوبصورت ہونی چاہیئے"۔

پکاریو نے تمام شرطیں منظور کر لیں۔ ایرانی ایک پل کے لئے باہر گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں سیاہ رنگ کا پانی سا تھا۔ اس نے اس ڈبے میں سے کچھ ایک اور ڈبہ میں الٹا اور پکاریو کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ ایک وقت میں سات بوندوں سے زیادہ نہ پیئے۔ پکاریو نے لالچی ہاتھوں سے ڈبیا کو اس سے چھین لیا۔ ڈبہ۔ جو اس کے لئے سونے کی ایک ڈلی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا ــــ اور ایک ہی سانس میں گھر پہنچ گیا۔

واپس پہنچ کر اس نے اس میں سے چند قطرے ایک گلاس میں ڈالے اور ایک ہی گھونٹ میں انہیں پی گیا۔ سونے کے ارادے سے وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس کے خوابوں میں نمودار ہوئی۔ لیکن ایک بالکل نئے ماحول میں وہ ایک گاؤں کی ایک جھونپڑی کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا لباس شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھا۔ کس قدر سادگی تھی اس کے بال بھی بڑے سادہ انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔

لیکن کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی ترچھی ہوئی گردن کے گرد ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کی ہر چیز سادہ تھی انوکھی تھی۔ اور ایک ناقابل بیان سلیقے کی حامل تھی۔

اس کے چلنے کے انداز میں ایک عجیب بانکپن تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ اور لباس کی سرسراہٹ بھی کس قدر موسیقی تھی۔ بالوں کے بنے ہوئے [illegible] میں اس کا ہاتھ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی پریم آنکھوں سے پکاریو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

"مجھے تیری مت سمجھ۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ غور سے دیکھو اور مجھ کو کہیں وہ [illegible] ہوں جس کے تم مجھے [illegible]

"نہیں ہرگز نہیں۔ جو تمہیں ایسے کہے گا میں۔۔۔"
لیکن اس پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں درد وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ بہتر تھا کہ تمہارا اس دنیا میں وجود ہی نہ ہوتا۔ تم محض میرا ایک شاہکار ہوتیں۔ تاکہ میں تمہیں ہمیشہ دیکھتا رہتا۔ اور تم سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ تم میرے سانسوں میں بستیں۔ اگر میرے اس خواب کی تکمیل ہو سکے تو اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی خوش نہ ہوگا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں خواب اور بیداری کے عالم میں تمہیں اپنے محافظ فرشتے کی طور پر پاتا۔ خدا کے نور کی عکاسی کرتے وقت میں تمہارے حسن کا سہارا لیتا۔ لیکن اب ـــ کس قدر تلخ ہے میری زندگی۔ مجھے تمہاری ہستی سے کیا؟ کیا ایک پاگل کی زندگی اس کے دوستوں اور عزیزوں کے لئے نہیں وہ کبھی محبت نہیں کرتا، خوشگوار ہو سکتی ہے؟ میرے اللہ! یہ بھی کیا زندگی ہے۔ جہاں حقیقتیں خوابوں سے اس قدر مختلف ہیں؟" وہ ہر وقت اس قسم کے خیالات میں گھرا رہتا۔ اسے کسی اور چیز کا خیال نہیں تھا۔ بہت ہی کم کھاتا تھا۔ ایک عاشق کی طرح ہمیشہ اپنی آرزوؤں کے بر آنے کا شدت سے انتظار کیا کرتا۔ اس کے تمام خیالات ایک نقطہ پر مرکوز ہو جانے کی وجہ سے اسے تقریباً ہر روز اپنی خواہشات کا عکس نظر آتا۔ اور اکثر ان حالات میں نظر آتا جو حقیقت سے کہیں دور تھے۔

چونکہ اس کے خیالات ایک بچے کی طرح پوتر تھے، اس لئے اس کے خوابوں کا محور بھی پوتر اور روحانی چہرے کے طور پر نظر آتا۔

افیم کے استعمال نے اس کے خیالات کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کی حالت اس بدبخت عاشق کی تھی۔ جو پوری شدت اور پاگل پن کو آخری حد تک اپنے محبوب سے محبت کرتا ہے۔

آج تک جو خواب اس نے دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک بہت ہی پیارا تھا۔ اس خواب میں اسے اپنا محبوب نظر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگوں کی طشتری تھی۔ اور وہ بھی وہیں تھی۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اس کی کرسی کی پشت پر اپنی کہنی ٹکائے اسے کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خواب آور آنکھوں میں مسرت کی جھلک تھی۔ اس کے کمرے میں جنت کی سی کیفیت تھی۔ بڑا سجا سجایا اور زندگی سے بھرپور تھا۔ اللہ! اس نے اپنا حسین سر اس کی چھاتی پر جھکا دیا۔ اس سے حسین تر خواب اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خواب کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ اپنے میں نئی زندگی محسوس کر رہا تھا۔

اس کے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس نے سوچا شاید وہ کسی حادثے کی وجہ سے اس غلاظت کے کنوئیں میں جا پڑی ہے شاید وہ پراشچت کرنے کو تیار ہو۔ شاید وہ خود بھی اس غلاظت کے گڑھے سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور یقیناً کوئی بھی غلاظت کے اس دریا میں بہتے نہیں دیکھ سکتا۔ خاص طور پر جب اسے بچانے کے لئے محض ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔

وہ سوچے جا رہا تھا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو میرے معاملات سے کیا۔ اور میں دنیا سے ڈرتا نہیں۔ اگر وہ سچے دل سے توبہ کرے اور اپنی زندگی کا رخ بدل لے تو میں اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں ان کئی لوگوں سے بہتر ہوں گا جو اپنی بھونڈی نوکرانیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔

اس قسم کا پلان بنا لینے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے اس کے رخساروں میں نیا خون ابل آیا ہو۔ اس نے آئینہ دیکھا۔ تو وہ ٹھٹک سا گیا۔ اس کے رخسار اندر کو پچکے ہوئے تھے اور رنگ زرد تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سنوارنا شروع کیا۔ نہایا۔ بال سنوارے۔ نیا کوٹ پہنا۔ ایک خوبصورت ویسکٹ پہنی اور گلی میں نکل پڑا۔ تازہ ہوا میں سانس لے کر اسے بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی بیمار کافی عرصے بیمار رہنے کے بعد پہلی بار باہر آئے۔

جب اس نے اس گلی میں قدم رکھا جہاں وہ اس ناقابلِ

فراموش صفات کے بعد کبھی نہیں گیا تھا۔ تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ کافی دیر تک اُس مکان کو تلاش کرتا رہا جہاں شوہد شائل بکین تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ وہ دو بار گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کہاں رکنا چاہئیے۔ آخر ایک مکان اُسے بالکل ویسا ہی لگا۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا۔ سامنے کون کھڑا تھا۔ اُس کا نصب العین۔ اُس کے خیالات کی دیوی اُس کے خوابوں کا عکس۔ جس کے لئے وہ اس قدر شدت سے اِس قدر دُکھ سے اس قدر پیار سے زندگی گزار رہا تھا۔

وہ خود اُس کے سامنے کھڑی تھی وہ کانپ سا گیا کمزوری کی وجہ سے اُسے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لیکن وہ انتہائی مسرت محسوس کر رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کھڑی تھی مگر اُس کی آنکھیں خواب آلودہ تھیں۔ اگرچہ اس کا چہرہ قدرے مُرجھایا ہوا تھا لیکن اُس کا حُسن بدستور قائم تھا۔

دو بج چکے تھے۔ لیکاریو کو دیکھ کر وہ چلّائی ۔"اوہ تم! اُس دن کیوں بھاگ گئے تھے؟"

لیکاریو نقاہت کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی طرف گھورنے لگا۔

"میں ابھی ابھی جاگی ہوں۔ وہ صبح سات بجے گھر چھوڑ گئے تھے۔ میں شراب کے نشے میں بدحال تھی" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اُف! اس قسم کی باتیں کرنے سے اُس کا گونگا اور بہرہ ہونا بہتر تھا۔ اس نے ایک ہی فقرے میں اپنی زندگی کی مکمل تصویر اُس کے سامنے پیش کر دی تھی لیکن ان سب باتوں پر دھیان دئیے بغیر اپنے حقیقی جذبات کو چھپا کر وہ آج یہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ آیا اُس پر اس کی نصیحتوں کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔

بڑی کراہت، جوش اور خوف سے ملی جلی آواز کے ساتھ وہ اُس کی حالت کی گراوٹ بیان کرنے لگا۔ وہ اُس کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہی تھی لیکن اُس کے چہرے سے وہ تعجب عیاں تھا۔ جو ہمیں کسی عجیب غریب نظارے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سہیلی کی طرف دیکھا جو کمرے میں ایک طرف بیٹھی اپنے بال سنوارتے لیکاریو کی ناصحانہ باتوں کو غور سے سُن رہی تھی۔

"میں غریب ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔" لیکاریو نے ایک لمبی ناصحانہ تقریر کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا۔"لیکن ہم محنت کریں گے۔ اپنی محنت پر زندہ رہنے سے زیادہ کوئی چیز خوشگوار نہیں۔ میں تصویریں بناؤں گا۔ تم میرے پاس بیٹھ کر میرا حوصلہ بڑھانا۔ یا تم کڑھائی کا کام کرنا یا کوئی اور کام کرنا جو تمھیں پسند ہو۔ ہم دونوں محنت کریں گے۔ تو ہم غریب نہیں رہیں گے۔

"میں کام کروں" اُس نے حقارت آمیز آواز میں اُسے ٹوکا۔ "کیا میں کوئی دھوبن یا درزن ہوں جو کام کروں"۔
اِن الفاظ سے اُس کی کھوکھلی زندگی کا نمونہ پوری طرح عیاں تھا۔

"تمہارے ساتھ شادی؟" کونے میں بیٹھی ہوئی اُس کی سہیلی جو ابھی تک خاموش تھی۔ بول اُٹھی۔" اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو پھر پیٹا کرتی"۔ یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنے قابلِ رحم چہرے پر ایک عجیب مضحکہ خیز تاثر پیدا کیا۔ جو اس حسینہ کو بہت پسند آیا۔

یہ انتہا تھی۔ وہ اِسے برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔

وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے خیالات اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ اُس کا دماغ خالی تھا۔ وہ بغیر کچھ دیکھے سمجھے یا محسوس کئے سارا دن بے مقصد پھرتا رہا۔ کوئی اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ رات بھر سویا رہا ہے۔ وہ کہیں دوسرے دن کسی نامعلوم جذبے کے تحت اپنے مکان پر پہنچا۔ اُس کا زرد چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا...

کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کے چہرے پر پاگل پن کے آثار نمایاں تھے۔

اُس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ کسی کو اندر آنے نہیں دیتا تھا۔ اُسے کسی چیز کی تمنا نہ تھی۔ چار دن گذر گئے اور اُس کے کمرے کا دروازہ ایک بار بھی نہ کھلا۔ ہفتہ گذر گیا مگر کمرہ اُسی طرح بند رہا۔ لوگ اُس کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار دروازہ توڑا گیا۔ اور اُس کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ خون میں لت پت ایک استرا پاس پڑا تھا۔ اُس کے مُڑے ہوئے ہاتھ اور اُس کے چہرے کی مسخ شدہ حالت اس بات کی شاہد تھی کہ اُس کے ہاتھوں نے ٹھیک طرح پر کام نہیں کیا۔ اور کی گناہ گار روح جسم کے پنجرے سے نجات پانے سے پہلے بہت دیر تک تڑپتی رہی تھی۔

اِس طرح بیچارہ لیتاریو مٹ گیا۔ لیتاریو جو ایک اندھے جنون کا مریض تھا۔ خاموش۔ شرمیلا جس میں ایک بچے کی سادگی تھی۔ جس میں فن کے شرارے تھے۔ جو وقت گذرنے پر شعلوں کی بلندی اور چمک دمک اختیار کر سکتے تھے۔ ختم ہو گیا اُس کی موت پر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے۔ اُس کی لاش کے قریب کوئی شخص نہ تھا۔ سوائے مکانوں کے سپروائزر اور پولیس کے ڈاکٹر کے اُس کا جنازہ خاموشی سے اُٹھایا گیا۔ اور بغیر چرچ کی رسوم کو ادا کئے اُسے اُٹھا لے جایا گیا۔ اُس کے جنازے کے ساتھ صرف ایک ماتمی تھا۔ ایک سپاہی۔ وہ بھی اس لئے کہ اُس نے رات زیادہ ووڈکا پی لی تھی۔ لفٹیننٹ پیروگو کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی میں دوستی کا حق نبھایا تھا۔ وہ بھی اس بدقسمت کی لاش کے آخری دیدار کے لئے نہ آیا۔ دراصل پیروگو کے پاس ایسے کاموں کے لئے وقت ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود ایک دلچسپ مہم سر کرنے میں لگا ہوا تھا۔ آئیے ہم اُس کی باتیں کریں۔ مجھے لاشیں پسند نہیں ہیں۔ جب کوئی جنازہ میرے راستے سے گذرے تو مجھے ایک عجیب بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں جب بھی کسی شخص میں ملبوس کسی لاش کو دیکھتا ہوں۔ تو میں اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جب میں کسی غریب کی بے کفن لاش کو دیکھتا ہوں جس کے پیچھے صرف ایک بھکارن ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی اور کام نہیں ہوتا۔ تو میرے دل کے بوجھ میں غم کے آثار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ہم لفٹیننٹ پیروگو سے اس وقت جدا ہوئے تھے جب وہ بیچارے لیتاریو کو چھوڑ کر اُس سنہرے بالوں والی لڑکی کے پیچھے چل پڑا تھا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ وہ ہر شو ونڈو کے سامنے رُکی اور دیکھیاں۔ رومال، بالیاں۔ دستانے غرض جو بھی خرافات شوکیسوں میں رکھی تھی اُن میں نگاہ ڈالتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کی نگاہ ہر طرف اُٹھ رہی تھی آگے پیچھے دائیں بائیں۔

"میری جان، تم میری ہو" لفٹیننٹ پیروگو نے اُس کا تعاقب کرتے ہوئے پورے بھروسے کے ساتھ کہا۔ اُس نے اپنے چہرے کو کوٹ کے کالروں میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ اگر اُس کا کوئی ملنے والا مل جائے تو پہچان نہ سکے۔ یہاں قارئین کو لفٹیننٹ پیروگو کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری نظر آتی ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ لفٹیننٹ پیروگو کے بارے میں کچھ کہا جائے یہ بہتر ہوگا کہ اُس سوسائٹی کا بھی ذکر کیا جائے جس سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں کچھ ایسے افسر تھے۔ جو اس شہر کا درمیانہ درجہ شمار ہوتے تھے۔ کونسلر کی طرف سے دی جانے والی پارٹیوں پر (کونسلر چاہے وہ پیدائشی ہوں یا اپنی محنت کی وجہ سے اس رتبے پر پہنچے ہوں) اس قسم کے لوگوں سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ان پارٹیوں پر آپ کو چائے کی میز پر پیانو اور ٹوائلٹ کے ساتھ ساتھ آپ کو کچھ بے رونق سی عورتیں نظر آتی ہیں، جن کی جوانی ڈھلک چکی ہے۔ ان بے رونق عورتوں کو ہنسانا یا اپنی طرف متوجہ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے کیونکہ اس کے لئے بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔ یا بلکہ یہ کہئے کہ کسی کاریگری کی ضرورت نہیں۔ آپ کی گفتگو نہ تو

سنجیدہ ہونی چاہیئے اور بہت پھیپھسی نہیں ہونی چاہیئے
جس میں ہر قسم کی وہ خرافات شامل ہو جو عورتوں کو ہمیشہ
پسند رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مذکورہ بالا نوجوان بہت
کامیاب ہیں۔ ان بے دونوں عورتوں کی باتوں کو سنتا اور
انھیں خوش کرنا ان لوگوں کی خاص خوبی ہے۔ اور اس خوبی کا
معاوضہ اکثر انھیں ان الفاظ میں ملتا ہے" اب بس بھی کرو۔ اس
قسم کا مذاق کرتے تمھیں شرم نہیں آتی" اونچے طبقے میں یہ لوگ
بہت کم نظر آتے ہیں۔ بلکہ نظر آتے ہی نہیں۔ تاہم انھیں پڑھے
لکھے اور سمجھدار لوگ سمجھا جاتا ہے۔ انھیں ادبی گفتگو کا
بہت شوق ہے۔ وہ بلگرن، لشلن اور گرترچ کی تعریف
کرتے ہیں اور اے اے۔ آر لو کا نام آتے ہی ناک بھوں
چڑھا لیتے ہیں۔ وہ پبلک میں کبھی مس نہیں کرتے چاہے وہ
حساب کتاب اور خیالات کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔
اس قسم کے کچھ لوگ آپ کو تھیٹر میں ضرور مل جائیں گے۔
چاہے وہاں "غلاظت" قسم کی کوئی چیز سٹیج کی جاری ہو
جو اُن کے مذاق اعلیٰ کو پسند نہیں۔ تھیٹر کے ڈائریکٹروں
کے لئے یہ لوگ بڑے مفید ہوتے ہیں ڈرامے میں اچھے اشعار کو
پسند کرنا اور ایکٹروں پر آوازے کسنا ان کا محبوب مشغل ہے۔
ان میں اکثر سول سروس کا امتحان دیتے ہیں یا دینے کی کوشش
کرتے ہیں۔ لیکن آخر دو گھوڑوں کی ایک گاڑی خرید لینے
پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ تب اُن کی دوستی کا دائرہ وسیع ہونا
شروع ہوتا ہے۔ آخر کار وہ کسی بیوپاری کی لڑکی سے
شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جو پیانو بجا سکتی ہے۔
اور جس کے پاس ہزار ایک روپیہ نقد اور بہت سے ریشم ولر
رشتہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عورت انھیں اس وقت تک نصیب
نہیں ہوتی جب تک وہ کرنل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ ریشم ور رئیس
باوجودیکہ اُن سے کو بھی کی بو آتی ہے۔ اپنی لڑکی کی شادی جنرل یا
کم سے کم کرنل کے ساتھ کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔
یہ تو اس طبقے کے خصوصیات تھے۔ لیکن لفٹیننٹ
ہیروگو میں بہت سی اچھی خوبیاں تھیں جو محض اس کی ذات تک
محدود تھیں۔ مثال کے طور پر وہ "ڈمنٹر جالنکا" کے اور

ڈی مسعان جونز کن بی انگ کلیور تھیں سے بڑھ کر خوبصورتی سے
شعر پڑھ سکتا تھا۔ اُسے اپنی پائپ سے دھوئیں کے دائرے
بنانے میں اس قدر مہارت تھی کہ وہ ایک کش کے ساتھ اکیس
دس دائرے بنا لیتا تھا۔ اس قسم کے عجیب قصے کہ [illegible]
کیوں ہے اور ایک توپ توپخانوں سنانے میں اُسے بہت مہارت
تھی۔ ہیروگو کی تمام خوبیوں کا جو اُسے قدرت کی طرف سے
عطا ہوئی تھیں بیان نہایت مشکل ہے، وہ ایکٹروں اور تماشو
کے بارے میں گفتگو کرنے کا بہت مشتاق تھا لیکن اس کی
گفتگو ایک نئے زکریٹ کی طرح بدمزہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے
عہدے سے بہت خوش تھا جس میں اس کی ابھی ابھی ترقی ہوئی
تھی۔ ویسے وہ کبھی کبھی کہا کرتا تھا۔ کہ اگر میں لفٹیننٹ ہوں
تو کیا ہے۔ یہ عہدے وغیرہ سب بکواس ہے۔ لیکن اندر ہی اندر
وہ اپنے عہدے سے بہت خوش تھا۔ وہ اکثر بات چیت کے دوران
میں اپنی پوزیشن کے متعلق اشارہ کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب بازار
میں اس کا ایک کلرک سے جھگڑا ہو گیا تھا جس نے اس کی شان
میں کچھ گستاخ الفاظ کہے تھے۔ تو ہیروگو نے دو ٹوک اس کو احساس
دلا دیا تھا کہ وہ ایک لفٹیننٹ سے بات کر رہا ہے۔ کسی ایرے
غیرے سے نہیں۔ اور اس نے یہ بات نہایت فصیح زبان میں
کہی تھی کیونکہ اس وقت وہاں سے دو قدم پر حسین عورتیں کھڑی
رہی تھیں۔

ہیروگو کو ہر حسین شے کا اشتیاق تھا۔ اسی لئے وہ آرٹسٹ [illegible]
کا حوصلہ بڑھایا کرتا تھا، ہو سکتا ہے۔ [illegible] کے ساتھ
اس کی دوستی کی حقیقی وجہ یہ ہو کہ ہیروگو اپنے حسین نقش کی تصویر
کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہو۔

ہیروگو کی بہت سی خوبیاں ہم نے بیان کر دیں لیکن بیان
پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ انسان [illegible] ایک ایسا حیران کن تخلیق ہے
کہ کوئی بھی اس کی تمام خوبیاں بیان نہیں کر سکتا۔ [illegible]
اس کا [illegible] میں [illegible] کی کوشش کرتا ہے۔ اس [illegible] اور
خامیاں [illegible] کا بیان کرنا ممکن ہے۔

ہیروگو اس [illegible] لڑکی کا تعاقب کر رہا۔ اور [illegible]
[illegible]

ہوئے ٹوٹے پھوٹے اور گول مول الفاظ میں دی تھی وہ اندھیر کاراں گیلری سے گذر کر گلی ششتا یا میں داخل ہو گئے۔ یہ تمباکو بیچنے والوں کی گلی تھی۔ یہاں تمباکو فروشوں کے علاوہ جرمن کاریگروں کی دکانیں تھیں۔ وہ سنہری بالوں والی لڑکی تیزی سے ایک قدرے گندے سے مکان میں داخل ہو گئی۔ پیرو گور بھی اس کے پیچھے پیچھے اس مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اندھیری سیڑھیوں میں سے گذر کر ایک دروازے میں داخل ہو گئی۔ پیرو گور بھی دلیری سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے کمرے میں پایا جس کی دیواریں کالی اور چھت دھواں زدہ تھی۔ دھات کے پرزوں کا ایک ڈھیر لوہار کے اوزار، چھپے ہوئے کالی کے برتن اور موم بتیاں میز پر پڑی تھیں۔ فرش پیتل اور لوہے کے برادے سے چمک رہا تھا پیرو گور فوراً سمجھ گیا کہ یہ ایک کاریگر کا مکان ہے۔ اجنبی لڑکی بغل کے دروازے سے نکل گئی۔ پیرو گور نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور پھر روسی قاعدے کے مطابق اسی دروازے میں داخل ہو گیا۔ اب وہ ایک اور کمرے میں تھا۔ جو پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ بڑا صاف اور ستھرا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا۔ اس کا مالک ایک جرمن کاریگر ہے۔

یہاں اس نے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا، جسے دیکھ کر وہ حیران پریشان رہ گیا۔ اس کے سامنے شلر بیٹھا تھا۔ وہ شلر نہیں جس نے Wilhelm Tell کو The History of the Thirty Years War لکھی ہے۔ بلکہ یہ تو وہ مشہور شلر تھا جو اس گلی میں ٹین سازی کا کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ہاف مین کھڑا تھا۔ ہاف مین ادیب نہیں۔ بلکہ آفیسرز سٹریٹ کا موچی جو شلر کا بڑا قریبی دوست تھا۔ شلر بہت سی شراب پیئے ہوئے تھا اور کرسی پر بیٹھا [illegible] پاؤں کو زمین پر مار رہا تھا۔ اور بڑی گرمجوشی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن پیرو گور کی حیرانی کا باعث یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی حیرانی کا سبب ان لوگوں کے بیٹھنے کا انداز تھا۔ شلر [illegible]

کر رہا تھا۔ ہاف مین اپنی انگلیوں سے اس کی ناک کو پکڑے ہوئے تھا۔ اور اس پر موچیوں کا چاقو پھیر رہا تھا۔ دونوں جرمن بول رہے تھے، اور چونکہ پیرو گور جرمن بہت کم سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ ماجرے کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ دراصل شلر یہ کہہ رہا تھا "مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے ناک کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "میں مہینے میں تین پونڈ تمباکو اکیلی ناک پر خرچ کرتا ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ مجھے ایک گھٹیا سی روسی دوکان سے لینا پڑتا ہے۔ (کیونکہ جرمن دوکاندار روسی تمباکو نہیں بیچتے) اس گلی سڑی روسی دوکان کو مجھے ایک پونڈ کے تیس کوپک دینے پڑتے ہیں یعنی ایک روبل اور بیس کوپک ایک روبل اور بیس کوپک سے ضرب دو تو ہو جائیں گے چودہ روبل اور چالیس کوپک سنتے ہو ہاف مین بھائی۔ چودہ روبل اور چالیس کوپک اکیلی ناک پر۔ اور چھٹی والے دن میں ریپے (Rape) لیتا ہوں۔ کیونکہ میں چھٹی والے دن گھٹیا روسی تمباکو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے سال میں دو پونڈ ریپے خریدنا پڑتا ہے۔ اس پر میرے سکے تو خرچ آتے ہیں چھ اور چودہ بیس۔ بیس روبل۔ اور چالیس کوپک صرف تمباکو پر۔ یہ لوٹ ہے۔ کیوں دوست ہاف مین ہے کہ نہیں لوٹ ......" ہاف مین چونکہ خود شراب پیئے ہوئے تھا اس لئے اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"بیس روبل اور چالیس کوپک۔ میں جرمن ہوں۔ ایک ایسے ملک کا باشی جہاں پر شاہی حکومت ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں چاہئے یہ ناک۔ اسے کاٹ دو تمہارے سامنے رکھی ہے۔"

..... اور اگر اچانک لفٹیننٹ پیرو گور نہ آ جاتا۔ تو ہاف مین اپنے دوست کی خواہش پوری کر چکا ہوتا کیونکہ وہ چاقو کو بالکل اسی حالت میں پکڑے ہوئے تھا جیسے تلوا کاٹتے وقت پکڑتا تھا۔

شلر کو بڑا غصہ آیا کہ ایک اجنبی کی بے موقع آمد اس کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ پیر اور [illegible]

لمحے کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سین کے درمیان کسی اجنبی کی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ جس وقت پیروگور نے قدرے جھک کر ان آداب کے ساتھ جن سے وہ قدرتی طور پر آشنا تھا کہنے لگا۔

"معاف کیجئے گا . . . ."

"باہر نکل جاؤ" شلر نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس سے پیروگور کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ اس قسم کے سلوک سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔ اور اس نے زخم خوردہ آن سے کہا۔

"جناب . . . . میں حیران ہوں . . . . آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا۔ میں ایک افسر ہوں۔"

"افسر ہو تو کیا۔ میں جرمن ہوں۔ میں خود (اس پر شلر نے میز پر مکہ مارا) میں خود افسر بن سکتا ہوں۔ سال ایک سال کے لئے کیڈٹ، دو سال میں لفٹیننٹ۔ میں کل ہی افسر بن جاؤں۔ لیکن میں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ افسر۔ تھو!" اور شلر نے اپنی ہتھیلی پر تھوک دیا۔

لفٹیننٹ پیروگور سمجھ گیا کہ یہاں سے چلے جانے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن ایسے چلے جانا اس کی پوزیشن کے خلاف ہونے کے علاوہ اس کے لئے ویسے بھی اچھا نہ تھا۔ وہ کچھ [illegible] میں دبکا۔ جیسے وہ اپنی ساری طاقت اکٹھا کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ شلر کو کیسے اس کی بدسلوکی کا مزا چکھائے۔ آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شلر کو معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ اور پھر جب اسے اس سنہرے بالوں والی لڑکی کا خیال آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس سارے قصے پر مٹی ڈالو . . . . . دوسرے دن لفٹیننٹ پیروگور صبح صبح لوہار کی دوکان پر آ موجود تھا۔

پچھلے کمرے میں اس کی اسی حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ لڑکی نے بڑے [illegible] سے جو اس کے چہرے پر بہت مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ پوچھا

"تمہیں کیا چاہیئے؟"

"میری جان۔ کیا ایک عرض کرتا ہوں ---- مجھے پہچانا نہیں۔ . . . . . تمہاری آنکھیں کتنی چمکیلی ہیں۔"

اس پر لفٹیننٹ پیروگور اسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبا لینا چاہتا تھا لیکن لڑکی نے چیخ کر اس کا ہاتھ جھٹک کے پوچھا۔

"تمہیں کیا چاہیئے؟"

"میں صرف تم سے ملنا چاہتا ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے" لفٹیننٹ پیروگور نے مسکراتے ہوئے اور قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ شرمیلی حسینہ بغل والے کمرے میں کھسک جانا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔

"جان من سنو۔ میں کچھ ایڑیاں (Spurs) بنوانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تم سے محبت کرنے کے لئے ایڑیوں کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر چابک کی . . . . تمہارے ہاتھ کس قدر خوبصورت ہیں۔"

لفٹیننٹ پیروگور اس قسم کی وضاحتیں پیش کرنے کا عادی تھا۔

"میں ابھی اپنے خاوند کو بلاتی ہوں" جرمن لڑکی نے چیخ کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کچھ لمحے گزرنے کے بعد شلر کچھ بیداری کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا۔ کل رات پی ہوئی شراب کا خمار ابھی تک اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ اسے صاف طور پر کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ کل رات اس سے کچھ ناواقف حرکت سرزد ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"میں ایڑیوں کے بغیر [illegible] کام لوں گا۔"

ایک ایماندار جرمن کی حیثیت سے آپ ایسے آدمی سے باتیں کرتے ہوئے جس نے آپ کو نہایت گھٹیا حالت میں دیکھا تھا، [illegible] سے ملامت کر رہا تھا۔

شلر وہ ایک دوستوں کو چھوڑ کر کسی کے سامنے شراب نہیں پیتا تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے [illegible] سے بھی چھپ کر پیتا تھا۔

پیروگور نے نہایت ادب سے [illegible]

"اس قدر [illegible]

"جرمن کاریگری کی وجہ سے" شلر نے گھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کسی روسی سے بنوا لیجئے۔ وہ آپ کو دو روبل میں بنا دے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کہ تم مجھے بہت پسند ہو اور میں تم سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ میں پندرہ روبل ہی دے دوں گا۔"

شلر ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا۔ چونکہ وہ ایک ایماندار جرمن تھا اس لئے اُسے بہت شرم محسوس ہوئی۔ اس خواہش میں کہ کسی طرح ہیروگو آرڈر دینے سے باز آ جائے۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایڑیاں پندرہ دن سے پہلے تیار نہ ہو سکیں گی۔ لیکن ہیروگو اس پر بھی نہ گیا بلکہ یوں ظاہر کیا کہ اس قدر وقت کا لگ جانا بالکل جائز ہے۔

شلر اب یہ سوچ رہا تھا کہ کام کس خوبصورتی سے کیا جائے کہ وہ پندرہ روبل کا نظر آئے۔

اس اثنا میں سنہرے بالوں والی وہ لڑکی ورکشاپ میں آ گئی۔ اور اُس میز سے چیزیں اٹھانی شروع کر دیں جس پر ساتھی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ لفٹیننٹ شلر کی خود فراموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا اور اُس کے قریب جا کر اُس کے بازو پر جو کندھوں تک ننگا تھا چٹکی دی۔

شلر کو یہ بات بہت بُری لگی۔

"مین فرا" اُس نے جرمن زبان میں کہا۔

"واندر ولٹ سائی واچ" لڑکی نے جواب دیا۔

"گون سائی ان فورڈی کچن"

لڑکی چلی گئی۔

"تو پھر پندرہ دن میں ہو جائیں گی تیار؟"

"ہاں ہو جائیں گی" خیالات میں ڈوبے ہوئے شلر نے جواب دیا۔ "مجھے ان دنوں بہت کام ہے۔"

"اچھا میں پھر آؤں گا۔"

"بہت اچھا" شلر نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

[illegible] جرمن لڑکی نے ہیروگو کو [illegible] مسکرا دیا تھا۔

لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُس کا پیچھا جاری رکھا جائے۔ یہ بات سمجھنے سے وہ بالکل قاصر تھا کہ کوئی اُس سے کیسے غیر دوستانہ برتاؤ روا رکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر جب اُس کی شکل و صورت اور رتبہ اس قدر اچھا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ شلر کی بیوی باوجود اپنے حسن کے بہت بے وقوف تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بے وقوفی عورت کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ میں کم سے کم کئی ایسے خاوندوں کو جانتا ہوں جنہیں اپنی بیویوں کی بے وقوفی بے حد پسند ہے۔ اور اسے وہ طفلانہ معصومیت کا نام دیتے ہیں۔ حسن کئی معجزوں کا محرک ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت کی تمام روحانی کمزوریاں بُری لگنے کی بجائے نسبتاً زیادہ خوبصورت لگتی ہیں خود بُرائی حسین لگنے لگتی ہے لیکن اگر کوئی عورت حسن سے محروم ہو تو ایک مرد کی محبت تو کیا عزت حاصل کرنے کے لئے بھی اُسے مرد سے بیس گنا زیادہ چالاک ہونے کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ شلر کی بیوی بے وقوف ہونے کے باوجود اپنے فرائض سے واقف تھی۔ ان حالات میں ہیروگو کے لئے اپنی اس دلیرانہ مہم میں کامیاب ہونا ممکن نہ تھا لیکن رکاوٹوں کو دور کرنے میں بھی ایک عجیب لطف ہے وہ لڑکی دن بدن اُس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی گئی۔ وہ اکثر ایڑیوں کے بارے میں پوچھنے چلا جاتا۔ جس سے شلر بہت تنگ آ گیا۔

وہ جلد سے جلد ایڑیاں تیار کر دینا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ مکمل ہو گئیں۔ "کاریگری کا کتنا حسین نمونہ ہے" لفٹیننٹ ہیروگو نے ایڑیاں دیکھ کر کہا۔ "خدا کی قسم کتنی حسین بنی ہیں۔ ہمارے جنرل کے پاس بھی اس قدر خوبصورت ایڑیاں [illegible]"

خود پسندی کی ایک لہر شلر کے دل میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ اور دل ہی دل میں ہیروگو سے اُس کی نفرت جاتی رہی۔

"روسی افسر اچھے کام کی قدر کرنا جانتا ہے" اُس نے سوچا۔

"میرے خیال میں تم کاریگری کا [illegible] قسم کی چیز بھی [illegible]"

سکتے ہو؟"

"ہاں، کیوں نہیں" شلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم مجھے چھری کا ایک دستہ بنا دو۔ میں کل چھری لے آؤں گا۔ میرے پاس ایک بہت خوبصورت ترکی چھری ہے۔ لیکن میں اُس کا دستہ بدلنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ شلر کو تیر کی طرح چبھے۔ اچانک اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اُس نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی۔ کہ یہ مصیبت پھر گلے ڈال لی ہے۔ انکار کرنا اب کمینگی کے مترادف ہے۔ خاص طور پر جب کہ روسی افسر اُس کے کام کی اس قدر تعریف کرتا ہے اُس نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا . . . . . .

لیکن اُس بوسے والے واقع نے اُسے عجیب شش و پنج میں ڈال دیا۔

میرے خیال میں قارئین کو اس وقت شلر کے بارے میں ذرا اور تفصیل کے ساتھ بتا دینا بیجا نہ ہوگا۔ شلر سرتاپا سے جرمن تھا۔ ایک صحیح جرمن کی خوبیاں۔ برائیاں سب اُس میں موجود تھیں بیس سال کی عمر میں جب ایک روسی چھاؤنی میں لگا ہوتا ہے شلر نے اپنی زندگی کا مکمل پلان بنا لیا تھا۔ اور حالات کا اُتار چڑھاؤ اُسے اس پلان سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہ کر سکے۔ وہ ہر صبح سات بجے اُٹھتا تھا۔ دس بجے کھانا کھاتا تھا۔ بہت کم گو تھا۔ ہر اتوار کو شراب پیتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ دس سال میں پچاس ہزار روپے کمائے گا، اور اس کے لئے یہ فیصلہ نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل تھا۔

ایک کلرک دفتر میں داخل ہو کر اپنے افسر کے کمرے میں جھانکنا بھول جائے لیکن ایک جرمن اپنے فیصلے سے کبھی نہیں بدلتا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے خرچ میں اضافہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اگر آلوؤں کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے۔ تو بجائے خرچ بڑھنے کے وہ آلوؤں کی مقدار میں کمی کرتا تھا۔ اسی لئے اُسے کبھی کبھی بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ کم کھانے کی عادت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اُس نے اپنی بیوی کے بوسوں کا بھی راشن مقرر کر رکھا تھا

وہ دن میں صرف دو بار اپنی بیوی کا بوسہ لیتا تھا۔ اور بوسے زیادہ بار بوسے لینے کی ترغیب سے بچنے کے لئے وہ اپنے شوربے میں ایک چمچ سے زیادہ کالی مرچ نہیں ڈالتا تھا۔ ہاں البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اتوار کو اس قانون پر سختی سے کاربند نہیں رہتا تھا۔

لیکن اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ اتوار کو وہ دو بوتلیں بیئر اور ووڈکا کی بوتل پیتا تھا۔ شراب وہ انگریزوں کی طرح نہیں پیتا تھا۔ جو رات کو کھانا کھا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں اور اکیلے پیتے ہیں۔ نہ وہ تو جرمنوں کی طرح ہمیشہ دوستوں کے ساتھ پیتا تھا۔ شراب یا وہ اپنی بیوی کے ساتھ اور پھر ایک اور جرمن دوست کنٹر، ترکھان کے ساتھ جو خود بڑا شرابی تھا۔ پیتا تھا۔

یہ تھا شلر محترم جو ایک بڑی عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا اگرچہ وہ لاپرواہ قسم کا جرمن تھا لیکن ہیروگو کی حرکتوں نے اُس کے دل میں حسد سا پیدا کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کے چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا۔ لیکن اُسے روسی افسر سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس عرصے میں ہیروگو اپنے دوستوں کے درمیان پائپ پیتے ہوئے ——

یہ قدرت کا اصول ہے کہ افسری ملتے ہی آپ کو پائپ مل جاتی ہے۔ ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ وہ ایک حسین جرمن لڑکی کے ساتھ اپنے تعلقات کی طرف بڑا معنی خیز اشارہ کرتا۔ اُس کی باتوں سے کچھ یوں اُس لڑکی سے کافی میل جول پیدا کر چکا ہے اور اُسے حاصل کرنے کی اُسے رتی بھر اُمید نہیں۔

ایک دن شستا یا گلی میں گھومتے ہوئے اُس نے اُس دکان کی طرف دیکھا۔ جس پر شلر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اُس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ جب اُس نے اُس حسینہ کو کھڑکی سے سر باہر نکالے [illegible] کا [illegible] کرنے میں مشغول پایا۔ وہ وہیں رُک گیا۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"سلام عرض کرتا ہوں۔"

جواب میں اُس لڑکی نے بالکل ویسے ہی ہاتھ ہلایا جیسے ایک دوست ہلاتا ہے۔

"تمہارا خاوند گھر پہ ہے؟"

"ہاں" وہ بولی۔

"وہ گھر سے جاتا کب ہے؟"

"اگلا اتوار وہ گھر پر نہیں ہوتا۔" اُس بے وقوف لڑکی کے منہ سے نکل گیا۔

"یہ بھی کوئی بُرا نہیں۔" پیروگو نے دل ہی دل میں کہا مجھے ضرور اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اگلے اتوار کو وہ اپنی پیش کش کے ساتھ پیش ہوا۔ شلر واقعی گھر پر نہیں تھا۔ گھر کی مالکن گھر ہی تھی لیکن اس بار پیروگو نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ اُس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ اور جھک کے اپنے حسین جسم کی مکمل نمائش کی۔ وہ بڑی عزت کے ساتھ بڑی دلچسپ باتیں کرتا رہا لیکن وہ بھولی بھالی لڑکی صرف ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ آخر کار جب اُس کے تمام حربے اُس حسینہ کو رام کرنے میں ناکام رہے۔ تو اُس نے رقص کی تجویز پیش کی۔ پیروگو کو رقص سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ ایک یہ تو ایسی شے تھی جو اُس لڑکی کو پسند تھی۔ دوسرے اُس میں وہ اپنے حسن کی نمائش بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔ تیسرے رقص میں چونکہ ایک دوسرے کے قریب آنا پڑتا تھا۔ لہذا اُسے بغل گیر ہونے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ قصہ مختصر اُسے یقین تھا کہ رقص یقیناً اس کی کامیابی کا باعث ہوگا۔ وہ کسی گیت کا ایک مصرعہ گنگنانے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جرمن لڑکیوں کے ساتھ تیزی دکھانے سے کام نہیں چلتا۔ لڑکی کمرے کے وسط میں چلی گئی اور اپنا خوبصورت پاؤں رقص کے انداز میں اُٹھایا۔ لڑکی کے اس انداز کو دیکھ کر پیروگو خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ اُس کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ لڑکی رونے لگی۔ رونے سے اُس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پیروگو نے اُس کی آنکھوں کے بے شمار بوسے لئے۔۔۔۔ اچانک دروازہ کھلا۔ اور شلر ہاف مین اور کنسٹر ترکمان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ تمام کاریگر حضرات نوابوں کی طرح شراب میں بدمست تھے۔

شلر کے غصے کا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں خاموش رہنا بہتر سمجھوں گا۔

"کمینے" وہ غصے میں چلایا۔ "میری بیوی کا بوسہ لینے کی جرأت تمہیں کیسے ہوئی۔ تم روسی افسر نہیں۔ سوائی ہو۔ تم شیطان کی ... میں جرمن ہوں۔ تمہاری طرح کوئی روسی کمینہ نہیں۔ کیوں بھائی ہاف مین (ہاف مین نے سر ہلا کر اُس کی ہاں میں ہاں ملائی) مجھے نہیں چاہیئے افسری۔ ہاف مین بھیا اسے گردن سے پکڑ کر باہر پھینک دو مجھے نہیں چاہیئے ......" وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُس کی واسکٹ کی طرح سُرخ تھا۔

"میں آٹھ سال سینٹ پیٹرز برگ میں رہا ہوں۔ میری ماں سویبیا میں اور میرا چچا نیورمبرگ میں۔ میں جرمن ہوں۔ کوئی گدھا نہیں۔ ہاف مین اِسے باہر پھینک دو۔ کامریڈ کنسٹر اسے ٹانگوں سے پکڑ لو۔"

جرمنوں نے پیروگو کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ پیروگو کی اپنے آپ کو چھڑانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ یہ تینوں کاریگر سینٹ پیٹرز برگ کے مضبوط ترین انسان تھے انھوں نے پیروگو کے ساتھ اس قدر بیہودہ سلوک کیا کہ مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں اُسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے دن شلر کو بخار ہو گیا ہوگا۔

وہ سارے دن پتے کی طرح کانپتا رہا۔ اُسے ہر لمحہ پولیس کا انتظار تھا۔ اور وہ خدا کے حضور میں منتیں مانگتا رہا کہ کل کا واقعہ کسی طرح خواب ثابت ہو۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اور اس میں تبدیلی ناممکن تھی۔ اُدھر پیروگو کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اپنی بے عزتی کا خیال آتے ہی وہ پاگل ہو جاتا تھا۔ اُس کے خیال میں شلر کم از کم دیس بدر کیا جانے کا مستحق تھا۔ وہ سیدھا گھر گیا تاکہ کپڑے بدل کر جنرل سے جا کر جرمنوں کی بغاوت کا ذکر سخت ترین الفاظ میں کرے۔ وہ چیف آف سٹاف کو اس سلسلے میں تحریری درخواست دینا چاہتا تھا۔ اور اگر یہاں سے شلر اور اُس کے ساتھیوں کو مناسب سزا نہ ملے تو وہ یہ شکایت افسرانِ بالا تک لیجانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن اس سارے واقعہ کا خاتمہ بڑے عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔ گھر واپس آتے وقت راستے میں وہ ایک سٹور

تک داخل ہوا وہاں کچھ پیسٹریاں کھائیں۔ "نادرہ" بی بی کی مسکی کافی پی۔ گھر پہنچنے تک اُس کا غصہ کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا علاوہ ازیں شام کی خنک ہوا نے ناوسکی پراسپیکٹ میں گھومنے کا موڈ پیدا کر دیا۔ نو بجے تک اُس کا غصہ بالکل ہوا ہو چکا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو جنرل کو تکلیف دینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ چنانچہ وہ شام گزارنے کے لئے کنٹرول ڈیپارٹمنٹ کے کسی ڈائریکٹر کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں اُس کی رجمنٹ کے بہت سے کلرک اور افسر جمع تھے۔ وہاں اس نے بہت پُر لطف شام گزاری۔ جہاں اس کے گیتوں نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں میں بھی بہت خوشی پیدا کر دیا۔

پرسوں ناوسکی پراسپیکٹ" میں گزرتے ہوئے ان دو واقعوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا "یہ دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ قسمت جو کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے وہ کتنا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ ایسا ہوگا۔ کیا ہم کبھی اس طرف کا خیال بھی کرتے ہیں جہاں قسمت کھیل کھیل رہی ہوتی ہے۔ ہر ایک بات ہماری خواہشات کی الٹ واقع ہوتی ہے۔ ایک تو وہ آدمی ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے بڑے خوبصورت گھوڑے عطا ہوتے ہیں۔ اور وہ ان پر سواری کئے جا رہے ہیں۔ لیکن انہیں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ وہ ان گھوڑوں کی خوبصورتی کی طرف متوجہ ہوں۔ یا خدا کا شکر بجا لائیں کہ اُس نے اُن پر اپنا خاص کرم کیا ہے۔ اور ایک وہ ہیں جس کے دل کو گھوڑے کے گوشت کی آرزو نے مجبور کر رکھ دیا ہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے جب کوئی تیز رفتار گھوڑا اُس کے قریب سے ہو کر گزر جاتا ہے تو اُس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ایک آدمی ہے جس کے پاس روٹی ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے اُس کا منہ اس قدر چھوٹا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک آدھ ٹکڑے سے زیادہ کھا نہیں سکتا۔ اور ایک وہ ہیں۔ جن کا منہ بھی دفتر کے گیٹ کے برابر کھلا ہوتا ہے، لیکن آلو کھانے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قسمت انسان سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ لیکن جو کھیل آپ سے ناوسکی پراسپیکٹ میں کھیلے جاتے ہیں وہ کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اس گلی پر کبھی اعتبار نہ کرو۔ جب بھی یہاں سے گزرو اپنے اوورکوٹ کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا کرو۔ ان لوگ راہ میں جو تمہارے سامنے سے دوچار ہوتے ہیں کسی پر بھی نگاہ نہیں ڈالو۔ یہ گلی ایک دھوکا ہے۔ جھوٹ ہے۔ خواب ہے۔ حقیقت سے بہت دور۔ — تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو اُس خوبصورتی سے سلے ہوئے کوٹ میں ملبوس چلا جا رہا ہے۔ بہت امیر ہے۔ وہ کوٹ ہی اس کا تمام سرمایہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہماری عمر کم آدمی جو اس زیرِ تعمیر چرچ کے سامنے کھڑے ہیں وہ اس کے فنِ تعمیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ نہیں صاحب وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ دو کوّے جو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں کتنے عجیب ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو بڑے سلیقے اور خوشی سے اپنے بال و ہار رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ کیسے اُس کی بیوی کا ایک اجنبی افسر پر کھڑکی سے کوٹ پھینکا۔ ہرگز نہیں۔ وہ [illegible] پر بحث کر رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ عورتوں پر بالکل بھروسہ نہ کرو۔ شو کیسوں میں بہت زیادہ مت جھانکو۔ جو چیزیں ان میں نظر آتی ہیں وہ خوبصورت ضرور ہیں لیکن اُن میں سے مزدوروں کی تو بڑی بو آتی ہے لیکن تم رکی بہت سے نیچے دیکھنے سے آپ کو خدا بچائے۔ میں کسی قیمت پر بھی ان کا پیچھا کرنے کو تیار نہ ہوں گا۔ خدا کے لئے لیمپ سے بہت دور رہیئے اور جتنی جلدی سے ہو سکے وہاں سے گزر جائیے۔ اگر تم وہاں سے اپنے خوبصورت کوٹ پر تیل کے ایک قطرہ بھی لگا کر بچ نکلے تو سمجھو کہ تم سستے چھوٹ گئے۔ صرف لیمپ ہی نہیں ہر چیز میں دھوکا ہے۔ "ناوسکی پراسپیکٹ" ہمیشہ بجائے خود ایک بڑا جھوٹ ہے لیکن خاص کر رات کے وقت جب کہ مکانوں کی سفید اور پیلی دیواریں اور چھائیاں ہو جاتی ہیں۔ جب تمام شہر شور و غل سے جاگ اٹھتا ہے۔ جب ہزاروں گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی ہیں جب برگھی چیختے ہوئے اپنے گھوڑوں پر سوار اُڑتے ہیں اور شیطان خود اپنے ہاتھوں سے لیمپ جلا کر ہر ایک شے کو ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے تو یہ جھوٹ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

سومرسیٹ مام

سومرسیٹ مام ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا۔ اُسے گزشتہ نصف صدی سے انگریزی کے نہایت ہی مقبول ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اُسے تمام اصنافِ ادب پر عبور حاصل ہے۔ اُس نے افسانہ، ناول اور ڈرامہ کے میدان میں اپنی بلند قامتی کو برقرار رکھا ہے۔

پیرس میں اُس کے والد برطانوی قونصل تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی اُس نے فرانس میں ہی حاصل کی۔ ابھی وہ آٹھ سال کا تھا کہ اُس کی ماں مر گئی۔ اور پھر دو سال بعد اُس کا باپ بھی رخصت ہو گیا۔ والدین کی موت کے بعد سے اُس کے چچا نے اپنے پاس انگلستان بلا لیا۔ اُس کے چچا ایک پادری تھے وہ مام کو بھی پادری کی تعلیم دلانا چاہتے تھے مگر مام بڑا خود سر واقع ہوا تھا کبھی مصوری کی طرف لپکتا اور کبھی ڈاکٹری کی طرف۔ اُس کا بچپن اور جوانی عجیب و غریب کشمکشوں میں گذری۔ اُس نے ماحول اور روایت سے شدید ٹکر لی۔ اور آخر اپنا راستہ خود متعین کیا۔

مام کا مرتبہ اتنا اونچا ہے جو موپاساں اور دیگر انفرادیت پسند ادیبوں کا ہے۔ اس کا شمار آج چوٹی کے ادیبوں میں ہے۔ اُس نے ادب کے ذریعہ لاکھوں روپے کمائے۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گذارتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اونچے طبقے کا نمائندہ ادیب ہے تو کسی حد تک بے جا نہ ہوگا مگر اس کے لئے ہم اسے سرزنش نہیں کر سکتے۔ وہ زندگی کے حسن اور قبح کی طرف بے نیازانہ نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کو جوں کا توں اپنی کہانیوں میں سمو دیتا ہے اور تجزیہ و تبصرہ کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ اُن کے آلام اور مصائب پر نہ روتا ہے اور نہ ہنستا ہے۔ مام نے دنیا کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ مام ادب برائے ادب کا قائل ہے مگر اس کے باوجود اُس کے ادب میں زندگی کی جھلک ہے۔

سومرسیٹ مام کا کوئی خاص اسلوبِ نگارش نہیں ہے۔ اور یہی بات اُس کا منفرد اسلوب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ایک طالبِ علم اور ایک ادیب کو کبھی بحر کے سیاحت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سومرسیٹ مام کے یہاں ان گنت کردار ملتے ہیں۔ جو ایک دوسرے قطعاً مختلف ہیں۔ سومرسیٹ مام مزاج کے اعتبار سے رومانیت پسند ہے۔

سومرسیٹ مام خود تنقیدی کا زبردست حامی ہے۔ اس لئے اس کے یہاں جتنے بھی کردار ملتے ہیں وہ اپنے آپ پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سومرسیٹ مام نے اپنے آپ کو ہر پہلو سے دیکھا ہے جب ہی اپنی بیشتر کہانیوں میں وہ خود موجود ہے۔ وہ ایک نیا کردار تلاش کرتا ہے اور اس کردار میں اپنے آپ کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

سومرسیٹ کا یہ ناولٹ "تسخیر"۔ ان ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے کرداروں کے دلچسپ پہلو بے نقاب کئے گئے ہیں۔



سمرسیٹ ماہم

تسخیر

مترجم اے نصیر خان

(۱)

وہ بنگلہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس کے چبوترے سے فلورنس (اٹلی کا ایک شہر) کا حسین منظر بہت بھلا لگتا تھا۔ بنگلہ کے عقب میں ایک پرانا باغیچہ تھا۔ باغیچہ میں پھول کم تھے مگر اس کے درخت بہت خوبصورت تھے۔ چوکور حاشیہ کی جھاڑیاں سلیقہ سے کٹی ہوئی تھیں۔ خوبصورت گھاس کے لان میں ایک مصنوعی فوارہ بنایا گیا تھا جس میں ایک مجسمہ سے سر (نقرئی) پانی گرا کرتا تھا۔ یہ بنگلہ سولہویں صدی میں کسی معزز اطالوی نے بنوایا تھا اور اس کے وریث ورثا نے اسے ایک انگریز کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ میری پلٹن نے اسی انگریز سے اسے کچھ مدت کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔ بنگلہ رقبہ کچھ بہت طویل نہ تھا مگر اس کے کمرے وسیع اور بلند تھے۔ میری کے لئے اس کی دیکھ بھال کو تین ملازم کافی تھے۔ اس میں پرانا فرنیچر قرینہ سے سجا ہوا تھا۔ ہر چند کہ فرنیچر زیادہ نہ تھا۔ مگر اپنی سجاوٹ کی وجہ سے خوب دیدہ زیب تھا۔ بنگلہ ایئر کنڈیشنڈ نہ تھا۔ مگر اس کے جدید مکان نے اس میں بجلی کے آتش دان اور گرم غسل خانے بنوا دیے تھے۔ میری مارچ میں وہاں پہنچی تھی اس وقت بھی موسم سرما کا اثر بہت زیادہ تھا۔ مگر آتش دانوں اور گرم غسل خانوں کی موجودگی میں میری کو کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اب جون کا مہینہ تھا اور میری دن کا بیشتر حصہ سامنے کے چبوترہ پر بیٹھ کر گزارتی تھی۔ جہاں سے فلورنس کے حسین گنبد اور مینار صاف طرح نظر آتے تھے یا پھر کبھی کبھی وہ باغیچہ میں چھوٹے چبوترہ پر بیٹھ جاتی تھی۔

اپنے قیام کے شروع کے چند ہفتے اس نے فلورنس کے عجائبات اور گرجا گھروں کی سیر میں گزارے۔ وہ خوشگوار موسمیں اُفیزی اور بارگیلو میں گھنٹوں بیتا دیں ... نظریں جمائے گزار دیتی۔ لیکن اب وہ شاذ و نادر ہی فلورنس جاتی تھی یا اگر جاتی تو وہ صرف کسی تقریب کے موقع پر ہی جاتی۔ وہ باغ میں بیٹھنے اور کتابوں کے مطالعہ سے مطمئن تھی اور اگر کبھی اس کا دل باہر جانے کو چاہتا تو وہ اپنی فیئٹ چھوٹی کار لے کر نواح کے دیہات کی طرف نکل جاتی۔ ٹسکن کے اس پرفریب معصوم منظر سے زیادہ دنیا میں اور کیا شے حسین ہو سکتی تھی۔ وہ بیلدار درختوں پر لدے ہوئے شگوفے اور کونپلوں کا نکھرتا اور تازہ چمکتا ہوا رنگ اور اس کے گرد زیتون کا مائل بہ سبزہ یہ سب کس قدر فرحت بخش تھا۔ وہ طبیعت میں ایک نیا نکھار محسوس کرتی۔ اپنے شوہر کی غمگین موت کے بعد سے، جسے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا وہ غیر معمولی پریشانیوں میں مبتلا رہی تھی۔ گزشتہ مہینوں میں اسے زیادہ وقت گھر پر رہنا پڑتا تھا تاکہ وہ وکیل جو اس نے شوہر کی فضول خرچیوں سے بچی کچھی جائداد کے حصول کے لئے کر رکھے تھے۔ اور ابت ہر وقت گھیرے رہتے تھے کسی فوری مشورہ کے لئے ہر وقت اس سے مل سکیں ——— چنانچہ ان تمام الجھنوں کے بعد وہ بیونارڈ سے اس مکان کو حاصل کرنے کے بعد بہت خوش ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے اعصاب کو آرام دے کر وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ طے کرے۔ آٹھ سال کی مسرت اور زندگی اور ناخوشگوار شادی کے بعد تیس سال کی عمر میں اس کے پاس صرف کچھ قیمتی موتی اور صرف اتنی آمدنی کی جائداد بچ گئی تھی کہ وہ سخت کفایت شعاری کے ساتھ اپنی گزر کر سکے۔ بہرحال یہ غنیمت تھا کیونکہ شروع میں تو وکیلوں نے بھی صاف گوئی کے ساتھ اسے بتا دیا تھا کہ قرضے ادا کرنے کے بعد کچھ بھی نہ بچا سکیں گے۔ دو ماہ تک فلورنس میں گزارنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ مستقبل کا مقابلہ وہ استقلال سے کر سکے گی جب وہ انگلینڈ سے روانہ ہوئی تھی تو اس کے پرانے خیر خواہ وکیل نے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے

"اب تمہارے لئے کوئی پریشانی نہیں رہی۔ تمہیں صرف اپنے مستقبل کا خیال کرنا ہے۔ میں تمہاری خوبصورتی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم ایک جوان اور بہت خوبصورت عورت ہو اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تم پھر شادی کرو گی۔ مگر آئندہ محبت کی خاطر شادی کرنا یہ ایک بڑی غلطی ہوگی شادی صرف ساتھ اور دولت کے لئے کرنا!"

وہ یہ سن کر ہنستی تھی۔ اسے شادی کا تلخ تجربہ تھا اور وہ آئندہ شادی کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اب وہ بالکل ویسا ہی کرنے کا ارادہ کر رہی تھی جو اس کے وکیل نے کہا تھا۔ ایک قیاس تھا کہ وہ اس شام اس کے متعلق فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایڈگر سوفٹ اس کے بنگلے میں پہنچنے والا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے اس نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اچانک لارڈ ڈسی فیر سے ملنے کینیسن جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس سے فوری ملنا چاہتا ہے۔ لارڈ ڈسی فیرو لندن سے ... اس اچانک بلاوے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آخرش ایڈگر کو وہ منصب دیا جانے والا ہے۔ جس کے لئے وہ متمنی تھا۔ سر ایڈگر سوفٹ، اس کے والد کی طرح ہندوستانی سول سروس کے آدمی تھے۔ سر ایڈگر کا ماضی بہت ممتاز تھا۔ وہ صوبہ سرحد کا گورنر رہ چکا تھا اور بدامنی کے زمانہ میں غیر معمولی قابلیت سے حالات کو قابو میں رکھا تھا۔ پانچ سال کی گورنری کے بعد وہ ہندوستان میں تعینات برطانوی افسران میں سب سے زیادہ فائق خیال کیا جاتا تھا۔ اس نے خود کو ایک عظیم منتظم ثابت کیا تھا۔ اُس میں متعدد خوبیاں تھیں۔ سخت گیری کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور موقع شناس بھی تھا۔ وہ ایک مصلحت پسندی کی حد تک منصف بھی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو اس نے اپنی سیاست میں جکڑ رکھا تھا۔ اور بظاہر یہ دونوں قومیں اُسے پسند کرتی تھیں۔ میری اسے بچپن سے جانتی تھی۔ جب اس کے والد جوانی میں مر گئے۔ اور میری اور اس کی ماں کو ہندوستان چھوڑ کر ولایت آنا پڑا۔ تو بھی ایڈگر سوفٹ نے ان سے اپنا تعلق ختم نہ کیا۔ وہ جب کبھی چھٹی گزارنے انگلینڈ آتا تو زیادہ وقت انہیں کے گھر گزارتا۔ جب وہ بچی تھی تو وہ اسے سرکس اور تھیٹر میں لے جاتا تھا۔ ... منتخب ... سینما میں اس ... جاتی تھی۔ وہ اسے اس کی سالگرہ پر ہمیشہ تحفے بھیجا کرتا تھا

جب وہ انیس سال کی ہوئی تو اسکی ماں نے اس سے کہا تھا

"نہیں اگر تمہاری عمر کی ہوتی تو ایڈگر سے اتنا زیادہ جلتی۔ پتہ نہیں تم نے کچھ محسوس کیا یا نہیں۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے!"

میری ہنستی تھی۔

"واہ، وہ تو ایک بوڑھا آدمی ہے بیچارہ!"

"وہ صرف تینتیس سال کا آدمی ہے!" اس کی ماں نے ترشی سے کہا تھا۔

لیکن جب اس کے دو سال بعد میری نے ہیوٹن سے شادی کی تو ایڈگر نے اسے کچھ خوبصورت ہندوستانی زمرد تحفہ میں دیئے تھے۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسکی شادی ناخوشگوار رہی تو اس کے ساتھ بہت ہی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اپنی پانچ سالہ گورنری کے بعد جب وہ لندن پہنچا تو یہ معلوم کر کے کہ وہ فلورنس چلی آئی ہے وہ اس سے ملنے کے لئے یہیں چلا آیا۔ وہ کئی ہفتہ سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور میری نے تاڑ لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کی درخواست کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اس سے کتنے عرصے سے خاموش محبت کر رہا تھا۔ ماضی کے متعلق سوچتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ پندرہ سال کی عمر سے ہی وہ اس کا دلدادہ ہے۔ اس وقت ہندوستان سے لندن چھٹی گزارنے آیا تھا اور اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ اب وہ بچی نہیں رہی۔ یہ طویل لگاؤ قدرے دل گیر تھا۔ دراصل انیس سال کی لڑکی اور تینتیس سال کے مرد میں اس وقت جو تفاوت تھا وہ اب تیس سال کی عورت اور ... سال کے مرد میں نہ تھا۔ یہ تفاوت اب بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ ایک نامعلوم ہندوستانی افسر نہ تھا۔ بلکہ ایک ممتاز اعلیٰ افسر تھا۔ اور وقت کے دھاروں کو موڑ سکتا تھا۔ یہ سوچنا غلط تھا کہ حکومت اُسے ملازمت میں نہ رکھے گی۔ اُسے یقیناً ایک اہم عہدہ ملنے والا تھا۔ میری کی ماں بھی اب مر چکی تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی عزیز اور مخلص دوست نہ تھا۔ اور اس کے لئے دنیا میں ایڈگر سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔

"تم کل کر بھی مجھ کو آزاد کر سکتی ہو!" اس نے ... کہا۔

وہ اب آنے ہی والا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اس ... جانے۔ آیا ... تصویریں ... تھیں ...

رہے تھے۔"

وہ سمجھ گئی کہ اُس کی گفتگو کا رُخ کدھر جا رہا ہے مگر اُسکی طرف برابر اپنی چمکیلی اور ہمدردانہ آنکھوں سے اور اپنے رد عمل سے ایسا ظاہر کیا جیسے وہ اُس کے عندیہ سے بے خبر ہے۔ دیکھتی رہی وہ دل ہی دل میں بہت مسرور ہو چلی تھی۔

"درحقیقت ایک گورنر کے لئے شادی شدہ ہونا ضروری ہے" وہ کہہ رہا تھا۔ "ایک مجرد کے لئے اس عہدہ کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔"

جب اُس نے جواب دیا تو اُس کی آنکھوں میں بڑی عجیب صاف گوئی کی جھلک تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے تمہیں بہت سی ایسی معقول عورتیں مل جائیں گی جو تمہارے اس ٹھاٹ باٹ میں خوشی سے حصہ بٹانا چاہیں گی۔"

"میں ہندوستان کے پچھلے تیس سال کے قیام میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ بہت سی عورتیں مجھ سے شادی کرنا پسند کریں گی۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی عورت ہے جس سے میں یہ درخواست کرنے کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔"

اب بات قریب آ چکی تھی۔ اُسے ہاں کہنا چاہیئے یا نہیں اُسے نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے اُسکی طرف توجہ کی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے تم ضرور جانتی ہوگی کہ مجھے تم سے اُس وقت سے بے پناہ محبت ہے جب سے تم نے بال گوندھنے شروع ہی کئے تھے۔"

وہ اس کا کیا جواب دیتی صرف ہنس سکتی تھی۔

"اوہ ایڈگر آؤ تم کیسی باتیں کرنے لگے۔"

"میں نے دنیا میں جتنی بھی جان دار چیزیں دیکھی ہیں تم اُن میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق ہو۔ دراصل میں سمجھتا تھا کہ ابھی یہ بتانے کا موقع نہیں آیا۔ میں تم سے پچیس سال بڑا ہوں۔ اور تمہارے باپ کا ہمعصر تھا۔ اور مجھے شک ہے کہ تم بچپن میں مجھے عجیب الگے وقتوں کا آدمی سمجھتی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔" میری دھیمی آواز میں بولی۔ اس میں کچھ کچھ سچائی بھی تھی۔

"بہرحال جب ہم محبت میں گرفتار ہو گئیں تو یہ قدرتی بات تھی کہ تم اپنے ہم عمر سے محبت کرتیں۔ میں تم سے یقین کرنے کی حد تک کہتا ہوں کہ جب مجھے تمہاری شادی کی خبر ہوئی تو میں صرف یہی چاہتا تھا کہ تمہاری ازدواجی زندگی خوشگوار گذرے۔ اور جب مجھے علم ہوا کہ تم خوش نہیں ہو تو مجھے سخت روحانی تکلیف پہنچی۔"

"ہماری شادی کی ناکامی کا سبب شاید ہمارا کم عمری میں شادی کرنا تھا۔"

"اُس وقت سے لے کر اب تک کتنے انقلابات گذر چکے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ ہماری عمروں کا تفاوت اب بھی اتنا اہم ہے جتنا پہلے تھا۔"

اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا اور میری نے سوچا اُسے کا سلسلہ کلام منقطع نہ کرے۔

"میری میں اپنی صحت کا بہت خیال کرتا ہوں۔ مجھے اپنی عمر کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا عجیب پہلو یہ ہے کہ وقت کا تم پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ تمہاری خوبصورتی تو پہلے سے بھی زیادہ دوبالا ہو گئی ہے۔"

وہ مسکرائی۔

"ایڈگر کیا یہ ممکن ہے کہ تم بھی جذباتی بن سکتے ہو۔ میں تمہیں فولاد کا آدمی سمجھتی تھی اور آج تم خلاف اُمید جذباتی ہوئی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم بڑی نمبریہ ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ جہاں تک فولادی آدمی کا تعلق ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری محبت میں ہمیشہ میں روئی کا گالا بنا رہا ہوں۔"

"کیا میں یہ سمجھنے کا حق بجانب ہوں کہ تم مجھ سے شادی کی درخواست کر رہے ہو؟"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہیں اچنبھا ہوا یا صدمہ؟"

"یقیناً مجھے کوئی صدمہ نہیں تم جانتے ہو ایڈگر میں تمہیں بہت عزیز رکھتی ہوں۔ میں کہتی ہوں۔ جتنے انسانوں سے بھی میں آج تک ملی ہوں تم اُن میں سب سے زیادہ باکمال ہو۔ میری انتہائی عزت افزائی ہے کہ تم مجھ سے شادی کی خواہش کر رہے ہو۔"

"تو کیا تم راضی ہو؟"

اُس کے دل میں عجیب قسم کا شک پیدا ہوا۔ وہ یقیناً بہت خوبصورت تھا۔ بنگال کے گورنر کی بیوی بننا یقیناً بڑا ہیجان خیز تھا۔ اس کے اردگرد اے۔ ڈی۔ سی رہیں گے۔ جو اس کے احکامات پہ سر تسلیم خم کیا کریں گے۔

ملتا تھا اور جس میں نشاۃ ثانیہ کے زمانہ کا شاہی فرنیچر اور شمعدان آراستہ تھے۔ لیکن وہ رسمی اور پر تکلف کمرہ تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اس کمرہ میں بیٹھنے سے ایک عجیب قسم کے سنجیدہ پن کا احساس ہوگا۔ اس نے سوچا اس کا انتظار چبوترہ پر بیٹھ کر ہی کرنا چاہیئے۔ جہاں وہ شام کو بیٹھا کرتی تھی اور اس پر سے نظر آنے والے منظر سے وہ کبھی نہ تھکتی تھی یہ نشستا بے تکلف جگہ ہے۔ کیا وہ واقعی اس سے شادی کے متعلق کہے گا۔ اگر ایسا ہے تو دونوں کے لئے ایسے ماحول میں بات کرنا آسان تر رہے گا۔ چائے کی میز پر جیکر وہ کیک کا نرم ٹکڑا دانتوں سے کتر رہا ہوگی۔ وہ بے تکلفی سے اس سے دل کی بات کہہ دے گا۔

چائے وقت مناسب اور کسی حد تک رومانی تھی چبوترہ کے سرے پر پیتل کے بڑے بڑے گملوں میں سنترے کے درخت رکھے ہوئے تھے۔ جن کے پھول گملوں کے کناروں پر جھول رہے تھے۔ چبوترہ ایک پرانے جنگلے سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑے بڑے پیالے بنے ہوئے تھے اور اس کے سروں پر کسی بدنما پتھر کے خستہ حال بت نصب تھے

میری ایک لمبی بید کی کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنی خادمہ نینا کو چائے لانے کا حکم دیا۔ دوسری کرسی ایڈگر کا انتظار کر رہی تھی۔ آسمان پر بادل بالکل نہ تھے۔ اور نیچے گھاٹی میں شہر جون کی سہ پہر کی نرم دھوپ میں نہا رہا تھا۔ معاً اسے بنگلہ کی سمت آتی ہوئی ایک کار کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحہ بعد اس کے خادم نینا کے شوہر سیرو نے ایڈگر کو چبوترہ پر پہنچا دیا۔ نیلی سرج کے سوٹ اور کالے فلیٹ ہیٹ میں اس کا لمبا جسم کسرتی اور ممتاز نظر آ رہا تھا۔ اگر میری اس سے واقف بھی نہ ہوتی تب بھی وہ یہ قیاس کر لیتی کہ وہ ایک اچھا ٹینس کھلاڑی شہسوار اور نشانچی ہے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا۔ اس کے سر کے بال کالے اور گھنگریالے تھے اور مشکل ہی سے کوئی بال سفید ہوگا۔ اس کا چہرہ ہندوستانی دھوپ سے تانبہ کے رنگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا، ٹھوڑی مضبوط اور ناک کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری اور تیز بین تھیں۔ پچپن سال!

وہ پچاس پچپن سال سے ایک دن بھی زیادہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک خوبصورت انسان جو کامیابی کے زینے پر کھڑا رہا ہے۔ اس کی شخصیت میں وقار تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک نظر آتی تھی۔ یہ وہ شخصیت تھی جسے کوئی اچانک حادثہ یا حادثہ نہ گھبرا سکتا تھا۔ وہ بے مقصد اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتا تھا۔

مسی فیر نے آج مجھے فون کیا اور بنگال کی گورنری کی پیشکش کی ہے۔ وہ طے کر چکا ہے کہ موجودہ صورت حال میں انگلینڈ سے کوئی نیا آدمی اس عہدہ پر نہ بھیجا جائے گا۔ کیونکہ اسے پہلے وہاں کے حالات کو سمجھنا ہوگا۔ اس لئے وہ ایسے آدمی کو اس عہدہ پر بھیجنا چاہتا ہے جو وہاں کے حالات سے واقف ہو" اس نے رسمی گفتگو کے بعد کہا۔

"تم نے یقیناً اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے" میری بولی

"بالکل۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے ہر شخص مشتاق تھا"

"مجھے بہت ہی خوشی ہوئی"

"مگر مجھے اس سلسلے میں بہت کچھ گفت و شنید کرنی ہے اور میں نے آج شام ہی ملان جانے کا انتظام کر لیا ہے۔ جہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز میں کشتی بمبئی پہنچ کر لارڈ مسی فیر سے ملوں گا۔ مجھے دو تین دن لگیں گے۔ اور وہاں میرا دل رہ نہ سکے گا۔ مگر مسی فیر مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا" وہ بولا

"یقیناً" میری بولی۔

اس کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ خود بخود ہی آ گئی اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جو عہدہ مجھے مل رہا ہے وہ بہت بلند اور اہم ہے مگر میں اس غرض سے عہدہ لے رہا ہوں گا۔ تو میری مقبولیت اور عزت میں نمایاں اضافہ ہوگا"

"مجھے یقین ہے تم ضرور کامیاب رہو گے"

"اس عہدہ کا مطلب ہے بہت زیادہ کام اور ذمہ داری۔ اور میں ان چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔ درحقیقت اس کا علم الہند ہی کو نہیں بنگال کا گورنر ایک بڑے عمارت میں رہتا ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں جھجک نہیں کہ مجھے یہ شان و شوکت بہت پسند ہے۔ بنگال کے گورنر کا گھر ایک محل سے کم نہیں اور میرے یہاں دوستوں کا ایک حلقہ بھی ہے

"تم کہہ رہے تھے تم دو تین دن کے لئے باہر جا رہے ہو؟"
"ہاں صرف تین دن کے لئے کیونکہ سوئیز پھر لندن جائے گا۔"
"کیا تم اپنی واپسی تک صرف تین دن تک میرے جواب کا انتظار کر سکتے ہو؟"
"یقیناً! میں سمجھتا ہوں موجودہ حالات میں یہ بہت مناسب ہوگا۔ مجھے یقین ہے یہ بہت اچھا ہوگا کہ تم اپنی رائے کو خوب پختہ کر لو۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر جواب نفی میں ہوتا تو تمہیں مزید سوچنے کی ضرورت نہ ہوتی۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی۔
"اچھا تو بات کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اب مجھے رخصت ہونا چاہئے ورنہ ریل کے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر ہے۔"
وہ اسکو ٹیکسی تک چھوڑنے کے لئے ساتھ ہولی۔
"خوب یاد آیا۔ کیا تم نے شہزادی کو کہہ دیا ہے کہ تم آج رات وہاں نہ جا سکو گے؟"
ان دونوں کو شہزادی سان فرڈینینڈ نے رات کے کھانے کی پارٹی میں دعوت دے رکھی تھی۔
"ہاں میں نے اسے فون کر دیا ہے کہ میں دو تین دن کے لئے فلورنس سے باہر جا رہا ہوں۔"
"کیا تم نے اسے بتایا کس لئے باہر جا رہے ہو؟"
"تمہیں معلوم ہے وہ کاؤنٹس بڑھیا کتنی شریر ہے" شوخ ماجوئی کے انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری دعوت کی عدم شرکت کی معذرت پر بہت مضطرب ہوتی اور مجھے صورت حال کا اعتراف کرنا پڑا اور اسے اصل واقعہ بتانا پڑا۔"
"خیر تمہیں تمہارا نعم البدل تلاش کرنا پڑے گا" میری نے یوں ہی کہہ دیا۔
"لیکن تمہیں مشورہ دوں گا تم اپنے ملازم سیرو کو ساتھ لے جانا۔ کیونکہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا۔"
"نہیں بھئی۔ میں نے سیرو کو اور نینا سے کہہ دیا ہے کہ شام کو ان کی ضرورت نہ پڑے گی۔"
"میرا خیال ہے کہ تمہیں ان سنسان سڑکوں پر رات کو تنہا موٹر نہ چلانا چاہئے۔ اچھا تو تم اپنے عہد پر عمل کرو گی میں سمجھتا ہوں۔"

"کون سا عہد؟ ارے وہ پستول والا عہد۔ اور سچ پوچھو تو بڑا مضحکہ خیز سا ہے۔ یہاں کی سڑکیں اتنی ہی محفوظ ہیں جتنی انگلستان کی۔ بہرحال تمہارے اطمینان کی خاطر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں پستول ضرور ہمراہ لے جاؤں گی۔"
ایڈگر کو معلوم تھا کہ میری کو تنہا موٹر میں گشت کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور انگریزوں کے عام خیال کے مطابق وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ غیر ملکی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اسے ایک پستول دے رکھا تھا اور اس سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی گھر سے باہر جائے گی اسے اپنے ساتھ باہر لے جائے گی۔
"یہ علاقہ بیکاروں اور مہاجرین سے پٹ رہا ہے" اس نے کہا "مجھے تمہاری طرف سے ہر وقت فکر رہتی ہے تاوقتیکہ مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ ضرورت پڑنے پر تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"
اس کے ملازم سیرو نے ٹیکسی کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ ایڈگر نے پانچ روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکالا۔ اور اسے تھما دیا۔
"دیکھو سیرو میں آج باہر جا رہا ہوں اور رات کو انہیں لینے نہ آ سکوں گا۔ جب یہ دعوت میں جائیں تو پستول انہیں ضرور یاد دلا دینا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"
"بہت بہتر حضور" ملازم بولا۔

۲

میری آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کی ملازمہ نینا اس کے پیچھے کھڑی ہوئی سے مناسب مشورے دے رہی تھی۔ نینا بنگلہ کے مالکان کی بہت عرصہ سے ملازم تھی۔ اور انگریزی بولنا سیکھ گئی تھی۔ اور اپنے پانچ ماہ کے قیام میں میری نے بھی اطالوی زبان خاصی سیکھ لی تھی۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کی بات خوب سمجھ لیتے تھے۔
"نینا کیا تمہارا خیال ہے میں نے سرخی زیادہ لگالی ہے؟"
"جب آپ کا رنگ قدرتی خوبصورت ہے تو پھر آپ نے سرخی لگائی ہی کیوں ہے؟"
"بات یہ ہے پارٹی میں جو دوسری عورتیں ہوں گی وہ خوب سرخی تھوپ کر آئیں گی اور اگر میں نے ذرا سی بھی سرخی نہ لگائی تو میں بہت پیلی سی لگوں گی۔"
اس نے اپنا فراک پہنا — جو زیورات کو کوئی پہننا چاہتی تھی وہ بھی زیب تن کئے۔ پھر ایک بہت خوبصورت ہیٹ اٹھایا کیونکہ وہ پہلی

اس قسم کی تھی جس میں یہ لباس موزوں تھا۔ پارٹی ایک ایسے ریسٹورانٹ میں دی جا رہی تھی جو ندی کے کنارے تھا۔ اور جہاں کھانا بہت اعلیٰ بنتا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے جون کے چاند کی روشنی میں ندی کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے مکانوں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ بوڑھی شہزادی نے ایک مغنی کا انتظام کیا تھا جس کی سریلی آواز کی وہ بہت مداح ہے۔ اور وہ اپنے مہمانوں کو پوری طرح خوش کرنا چاہتی تھی۔

میری نے اپنا پرس اٹھایا۔

"اب میں تیار ہوں۔"

"حضور آپ پستول لینا تو بھول ہی گئیں۔" پستول سنگار دان پر پڑا تھا۔ میری ہنس پڑی۔

"ارے پگلی اسی کو تو میں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی پستول نہیں چلایا۔ اور مجھے اسے لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میرے پاس لائسنس نہیں ہے اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو مجھے بلا وجہ پریشان ہونا پڑے گا۔"

"حضور نے سرکار سے وعدہ کر لیا تھا کہ اسے ساتھ لیجائینگی۔"

"سرکار تو وہمی ہیں۔"

"جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" نینا نے جذباتی ہو کر کہا۔

میری کچھ سوچنے لگی۔ وہ اس معاملہ کو زیادہ اہمیت نہ دینا چاہتی تھی۔ اطالوی ملازم بہت اطاعت شعار اور محنتی ہوتے ہیں۔ میری جانتی تھی کہ نینا اس موضوع پر اس سے دل کھول کر بات کرنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنا پرس کھولا۔

"اچھا تو اس کمبخت کو بھی ڈالے لیتی ہوں۔"

میرو نے گیراج سے گاڑی نکال دی تھی۔ کار چھوٹی اور کھلی چھت کی تھی۔ میری نے اسے بنگلہ کے برآمدے پر [illegible] وقت خریدا تھا۔ وہ اندر بیٹھ گئی اور اسٹارٹ کر کے احتیاط سے چل پڑی۔ اور لوہے کے پھاٹک کو طے کرنے کے بعد ایک پتلی سڑک پر مڑ گئی۔ اور جب وہ بڑی سڑک پر پہنچی تو اس نے جھک کر گھڑی میں وقت دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ ابھی بہت وقت باقی ہے۔ کار کو فرحت بخش انداز میں کم رفتاری سے چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن کو کسی گہرے تجربے میں محبت کی [illegible] گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آج اپنے بنگلے کے چبوترے پر کھانا کھانے کو پسند کرتی اور جون کی خوشگوار رات میں تادیر کھانا کھانے کے بعد وہیں بیٹھی رہتی۔ ایسا کرنے سے میری کبھی نہ اکتاتی تھی۔ وہیں میرے لئے بہت خوشگوار سکون ملتا تھا۔ یہ سکون اس قسم کا نہ تھا جو کاہلی کی پیداوار ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں اسکا ذہن اور اس کا احساس جاگتا رہتا تھا۔ غالباً یہ سکون کی فضا اور اس میں گھلی ہوئی ہوا کا اثر تھا کہ انسان کی جسمانی خواہشات میں بھی روحانیت سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سکون میں ایسا احساس کارفرما رہتا تھا جو موزارٹ کی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جس کی نغمہ خیز دھنوں کے نیچے غم کی لہریں اس طرح ابھرتی ہیں کہ آدمی خوشی اور طمانیت کے احساس سے جھوم اٹھتا ہے اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ گوشت پوست کے وجود سے ماورا بھی کوئی چیز ہے۔ اس سکون میں موسیقی کی دھنوں کی طرح کچھ منٹ کے لئے آدمی زندگی کی ہاہو اور الجھنوں سے بے نیاز ہو کر خود کو صرف محبت اور سکون کا محور سمجھنے لگتا ہے۔

"میں نے گھر سے نکل کر حماقت کی" میری خود سے کہنے لگی۔ "جب ایڈگر ہی اس دعوت میں نہیں جا رہا تو مجھے بھی منع کر دینا چاہئے تھا۔ مگر یہ بھی بڑی حماقت ہوتی۔ وہ اس تنہائی میں ایڈگر سے کی گئی باتچیت پر اب خوب غور کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس نے ایڈگر کے ارادہ کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا لیکن آج سہ پہر تک ــ اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ وہ آخرش [illegible] کر ہی دے گا۔ اور اسی لئے اس نے اس مسئلہ پر کسی جواب کے متعلق آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت اور غیر ضروری سمجھا تھا۔ اس نے اسے لمحاتی کیفیت پر اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب جبکہ وہ فیصلہ کر چکا ہے تو اسے کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ شہر میں پہنچ چکی تھی اور سائیکل سوار اور پیدل چلنے والوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی توجہ دوسری طرف سے ہٹا لے اور احتیاط سے گاڑی چلائے۔

جب میری ریسٹوران میں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سب سے آخر میں پہنچی ہے۔ شہزادی [illegible] امریکہ کی رہنے والی تھی۔۔ ایک معمر عورت تھی اور اس کے بال بالکل سفید تھے۔ اس کے [illegible] وہ چالیس سال سے اٹلی میں مقیم تھی [illegible]

تھی۔ اُس کا شوہر ایک روسی شہزادہ تھا۔ جس کا پچیس سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جو اٹلی کی فوج میں ملازم تھے۔ اُس کے پاس زیادہ دولت نہ تھی۔ اُس کی عادت بہت اچھی تھی مگر اُس کی زبان میں درشتگی تھی۔ اُس کا قد بھی چھوٹا تھا۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ جوانی میں اگرچہ وہ خوبصورت نہ تھی مگر اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اب پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ کہا جاتا ہے اُس نے شہزادے کے ساتھ وفا نہیں کی مگر اُس کی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ ہر شخص سے واقف تھی اور ہر آدمی اُس سے واقف تھا۔ اسکے علاوہ دعوت میں ایک انگریز سیاح کرنل گرلیس ترپل اور اُنکی بیوی ایک انگریز نوجوان روبے فنشٹ اور کچھ اطالوی معززین شریک تھے۔ میری اپنے اٹلی کے قیام میں روبے فنشٹ سے بخوبی واقف ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ اُس کی طرف بہت توجہ دے رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس پارٹی میں اچانک بلا لیا گیا ہوں!" اُس نے میری سے مصافحہ کے وقت کہا۔

"ان کی یہ بہت بڑی مہربانی ہے" شہزادی بولی "شعیب سر ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ پارٹی میں نہ آسکیں گے تو میں نے اس سے درخواست کی۔ اس نے یہاں آنے کی خاطر ایک دوسری دعوت کو ترک کر دیا۔"

"شہزادی صاحبہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آپ کی دعوت میں آنے کے لئے میں دنیا بھر کی دعوتیں ٹھکرا سکتا ہوں" وہ بولا۔ شہزادی [illegible] انداز میں مسکرائی۔

"بات یہ ہے کہ میری دعوت قبول کرنے سے پہلے یہ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتا تھا کہ دعوت میں کون کون آ رہا ہے"

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ دعوت میں شرکت منظور کر لی" میزبان نے کہا۔

شہزادی نے روبے کی طرف اُس مخصوص خاموش مسکراہٹ سے دیکھا جو اُن کی حیا فن مزاج کی غماز ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مسکراہٹ میں اُس کا شریر دل جھلک رہا تھا۔ جسے نہ اُس نے چھپایا تھا اور جس بہانے سے محسوس تھا بلکہ یہ مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ وہ ساری دنیا کو عجیب سمجھتی ہے اور خود سب سے زیادہ عجیب ہے۔

"[illegible] اگر [illegible] پاس [illegible] کے لئے

کوئی معقول بات نہیں۔ بہر حال ہم لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں" شہزادی بولی۔

یہ سچ ہے کہ روبے دیکھنے میں کچھ زیادہ خوش اندام نہ تھا مگر اس کی شخصیت گوارہ تھی۔ وہ متوسط قد کا آدمی تھا اور کپڑوں میں ملبوس تھوڑا سا موٹا معلوم دیتا تھا۔ اس کے خدو خال میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے اچھا کہا جا سکے۔ اُس کے دانت سفید تھے لیکن متوازی نہ تھے۔ اس کا رنگ تازہ تھا۔ مگر کھال صاف نہ تھی۔ اس کے بال گھنے تھے۔ لیکن بال بھدے بھورے رنگ کے تھے۔ جیسے کالے اور سفید رنگ کی آمیزش سے بنے ہوں۔ اُس کی آنکھیں خوب بڑی تھیں۔ مگر ان کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ جسے کچھ کچھ بھورا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت سے پراگندگی ٹپکتی تھی۔ اور جو لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اُسے مکار اور عیاش کا خطاب دیتے تھے۔ اُس کے عزیز ترین دوست اس بات کا اعتراف کرتے تھے وہ قابل اعتماد آدمی نہیں۔ اس کا ماضی خراب تھا۔ جب وہ بیس سال کا تھا تو ایک ایسی لڑکی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ جس کی منگنی کسی اور سے ہو چکی تھی۔ تین سال بعد وہ ایک طلاق کے مقدمہ میں ماخوذ پایا گیا۔ اور جب اس عورت کو اس سے ناجائز تعلقات کی بنا پر طلاق ہو گئی تو اسکی بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کر لی۔ پھر اُس نے بجائے اُس عورت سے شادی کرنے کے جس کو اس کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی۔ ایک اور عورت سے شادی کر لی اور دو تین سال بعد اسکو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ تیس سال سے کچھ اوپر تھا۔

درحقیقت وہ ایک بدنام اور جوان آدمی تھا اور وہ اپنے حالات کی وجہ سے اس بدنامی کا مستحق بھی تھا۔ غرض اُس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اُسے مقبول بناتی۔ کرنل ترپل جو ایک معزز اور [illegible] آدمی تھے حیران تھے کہ شہزادی نے اس جیسے بد قماش اور آوارہ آدمی کو دعوت پر کیسے مدعو کر لیا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی اس لائق نہیں کہ کوئی معقول عورت اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھ سکے" اگر موقع ملتا تو وہ یہ جملہ ضرور کہہ دیتا۔

اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اگرچہ اُسکی بیوی روبے کے برابر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر وہ اسکی باتوں کو پسند نہیں کرتی۔ اس کا سب سے بالا ترپل یہ تھا کہ یہ شخص کوئی ہم پسند انسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس کی بیوی لاؤڈر کے رشتہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اسکی ایک معقول

آملی تھی۔ کیونکہ اُس نے کبھی کماکر نہ کھایا تھا۔ بہر حال ہر خاندان
میں ایک نکما بھی ہوا کرتا ہے۔ کرنل کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آتی تھی
کہ عورتیں رونلے میں کیا خوبی دیکھتی ہیں جو اُس پر مرنے لگتی ہیں۔ اس
سیدھے سادے انگریز کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آتی تھی کہ رونلے
کی شخصیت میں بڑی جنسی اپیل ہے۔ اور عورتوں کے متعلق اُس
کے رویہ نے اسے اَور بھی اہمیت دے دی تھی۔ کوئی عورت اس
سے کتنی ہی بدظن کیوں نہ ہو اگر اُس کے ساتھ نصف گھنٹہ تنہائی
میں گزار لے تو اسکی بری طرح گرویدہ ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے
بعد وہ کہنے لگتی ہے کہ رونلے کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ
بالکل جھوٹ ہے۔ اور اگر اُس سے معلوم کیا جائے کہ اُس نے
رونلے میں کیا دیکھا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے گی۔ وہ دیکھنے
میں کوئی خاص خوبصورت نہ تھا بلکہ کسی کارخانے کا مزدور سا لگتا۔
وہ اپنے کپڑے لاپرواہی سے پہنتا تھا۔ اُس کے مزاج میں لاپرواہی
جھلکتی تھی۔ جیسے وہ کپڑوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو۔ یہ بات جھنجلاہٹ
کا باعث تھی کہ وہ کسی چیز کو بھی اہمیت نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ محبت
کرنے کو بھی۔ اُس کی شخصیت سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ عورت
سے صرف ایک چیز چاہتا ہے۔ اُسکی شہوت پرستی خطرناک حد
تک بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اُس میں ایک طرح کی شرافت ایسی بھی
تھی جس کی سند میں آدمی ایک دم بیٹھ لگتا۔ اُس کے بےباک رویے
کے پیچھے ایک گرم خلوص بھی تھا۔ وہ عورتوں کو مردوں کی نسبت
ایک عجیب مخلوق سمجھتا تھا۔ جس سے عورتیں بہت متاثر ہوتی تھیں
اُس کے چہرے میں ایک عجیب سحر اور آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

بوڑھی شہزادی نے معاملہ کو بڑی خوبصورتی سے نبھا دیا۔

"سچ مچ یہ بہت برا آدمی ہے۔ ایک بہت ہی بدترین قسم کا آدمی۔
اگر میں تیس سال چھوٹی ہوتی اور یہ مجھ سے بھاگ چلنے کو کہتا تو میں یہ جانتے
ہوئے بھی کہ یہ مجھے ایک ہفتہ بعد چھوڑ دیگا اور مجھے تمام عمر رسوائی میں
گزارنی ہوگی ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جھجکتی۔"

شہزادی عام بات چیت کی شوقین تھی اور جب تمام مہمان
اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو اس نے میری سے خطاب کیا۔

"مجھے سر ایڈگر کی عدم شرکت کا بہت افسوس ہے۔"

"ہاں انہیں بھی بہت افسوس تھا مگر انہیں گشتی جانا
پڑ گیا۔"

پھر شہزادی نے پوری پارٹی کو مخاطب کرکے کہا۔

"یہ ایک کھلا راز ہے کہ آپ سب اپنے تک ہی محفوظ رکھیں،
وہ بنگال کے گورنر نامزد کئے گئے ہیں۔"

"واللہ سچ مچ؟" کرنل تقریباً چیخ پڑا۔ "یہ تو بہت ہی اہم
عہدہ ہے۔"

"کیا تمہیں اچنبھا ہوا؟" شہزادی بولی۔

"نہیں انہیں معلوم تھا کہ وہ اس عہدہ پر فائز کئے جانے
والے ہیں۔" میری نے کہا۔

"وہ اس جگہ کے لئے موزوں ترین آدمی ہے۔ اس کے
متعلق کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔" کرنل بولا۔ "اگر وہ اس مقام پر
کامیاب رہا تو وہ دن دُور نہیں کہ اُسے ہندوستان کا وائسرائے
بنا دیا جائے۔"

"میں دُنیا میں وائسرائن بننے سے زیادہ اور کسی چیز کو پسند
نہیں کرتی۔" شہزادی بولی۔

"تو تم اُن سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟" میری نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"کیا وہ شادی شدہ نہیں ہیں؟" کرنل کی بیوی بولی۔

"نہیں!" شہزادی نے میری کی طرف معنی خیز نظروں سے
دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے یہ حقیقت نہیں چھپانا چاہتی کہ وہ
اپنے قیام کے پچھلے چھ ہفتوں میں مجھ سے شدید قسم کی محبت کرتا
رہا ہے۔"

رونلے ہنسنے لگا۔ اور اُس نے میری کی طرف منہ پھیر کر دیکھا

"تو پھر کیا شہزادی تم نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ
کرلیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس بیچارے کو زندگی کا لطف
اٹھانے کا زیادہ موقع نہ ملے گا۔"

"میرا خیال ہے بہت ہی مناسب جوڑ رہے گا۔" میری بولی۔

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ رونلے اور شہزادی دونوں
اس کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن وہ انہیں کسی بات کا علم نہ ہونے
دینا چاہتی تھی۔ ایڈگر سوفٹن نے اپنے قیام کے دوران میں جب یہ
یہ بات بالکل واضح کر دی تھی۔ کہ وہ میری سے محبت کرتا ہے اور

شہزادی یہ بات معلوم کرنے کے لئے بے قرار تھی کہ اس رومان کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا — یا نہیں۔"

"میرا خیال ہے شہزادی تمہیں کلکتہ کی آب و ہوا موافق نہ آئے گی۔" کرنل کی بیوی نے کہا۔ وہ اس گفتگو کو سنجیدگی پر مبنی سمجھ رہی تھی۔

"اوہ! اب میری عمر ایسی نہیں کہ میں شادی کر دوں۔" شہزادی بولی۔ "میں تو بس دل بہلانے کے لئے ملتی ہوں۔ اس لئے تو رومے کے لئے میرے دل میں خاص جگہ ہے۔ مگر اس کی نیت صاف نہیں۔"

کرنل نے اپنی پلیٹ پر چیں بجبیں ہو کر نظریں گاڑ لیں اور اس کی بیوی طنزاً مسکرا دی۔

اس ریسٹوران میں آرکسٹرا کا بھی انتظام تھا۔ باجے والوں کا لباس سلیقے کا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی بولی۔

"میرا خیال ہے اب مغنی کو بلوانا چاہیے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ وہ بہت میٹھے سروں میں گاتا ہے۔ ریسٹوران کا مالک اسے باقاعدہ گانے کی تعلیم دلانا چاہتا ہے۔" اس نے ہیڈ ویٹر کو بلایا۔ "اس آدمی سے گانے کو کہو جس نے اس دن میری موجودگی میں گایا تھا۔"

"یور ایکسیلینسی مجھے افسوس ہے کہ وہ آج آیا نہیں ہے۔ وہ بیمار ہے۔"

"یہ تو بڑی تکلیف دہ خبر سنائی۔ میں اپنے احباب کو خاص طور سے اس کا گانا سنوانا چاہتی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو اس ریسٹوران میں خصوصاً اسی لئے دعوت دی تھی۔"

"اس نے اپنے عوض دوسرا آدمی بھیجا ہے۔ مگر وہ صرف وائلن بجاتا ہے۔ میں اس سے وائلن بجانے کو کہتا ہوں۔"

"تو مجھے موسیقی میں صرف وائلن پسند نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

ہیڈ ویٹر فصیح مدعا سے زیادہ نیا [illegible] کچھ ہی بول سکتا تھا۔ مگر سمجھتا ایک کو بھی نہ تھا۔ اس نے شہزادی کی گفتگو سے یہ سمجھا کہ وہ اس کے مشورہ سے خوش ہو گئی اور وائلن والے سے وائلن شروع کرنے کو کہا۔ اس پر ایک کرسی سے کھڑا ہوا اور مسکرا کر [illegible]۔ وہ ایک گورا لمبا نوجوان تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے [illegible] چمکتی تھی [illegible] اس کے چہرے سے افسردگی جھلکتی تھی [illegible]

بھڑکیلے لباس میں وہ عجیب مذاق سا لگ رہا تھا۔ وہ بھوکا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چکنا چہرہ پتلا تھا اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اس نے وائلن پر ایک گت شروع کر دی۔

"ارے بھائی یہ تو بہت خراب نکلا۔" شہزادی نے ہیڈ ویٹر سے کہا۔

اس مرتبہ ویٹر نے بات کو سمجھ لیا۔

"بے شک شہزادی صاحبہ یہ کوئی خاص نہیں گاتا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ پہلا والا آدمی کل ہی آ جائے گا۔"

وائلن والے کو روک دیا گیا اور آرکسٹرا پھر شروع ہو گیا۔ رومے نے برابر بیٹھی ہوئی میری کی طرف دیکھا اور بینڈ کی اونچی آواز سے فائدہ اٹھا کر میری سے بولا۔

"آج تم بہت حسین نظر آ رہی ہو۔"

"شکریہ۔" میری نے جواب دیا۔

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"کیا میں تمہیں وہ بات بتاؤں جو میں خصوصیت سے تمہارے متعلق محسوس کرتا ہوں؟ دوسری عورتوں کی نسبت جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم خوبصورت ہو تو تم اسے جھوٹ نہیں سمجھتیں۔ تم اسے بالکل قدرتی بات سمجھتی ہو بالکل اسی طرح جیسے کوئی تم سے کہے کہ تمہاری انگلیاں پانچ ہیں۔"

"جب تک میں نے شادی نہیں کی تھی میرا حسن ہماری روزی کا ذریعہ تھا۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میری اور میری والدہ کی گزران کی پنشن میں تھی۔ جب میں نے مدرسہ کی تعلیم ختم کی تو مجھے صرف میری خوبصورتی کی بدولت فوراً اداکاری مل گئی۔ میرا حسن میری خوش قسمتی کا باعث ہے۔"

"میرا خیال ہے تم فلمی زندگی میں لاکھوں روپے پیدا کرتیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"بدقسمتی سے مجھ میں اچھی اداکاری کی صلاحیت نہ تھی بس صرف خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ اگر میں کچھ دن فلم میں اور کام کرتی تو شاید اداکاری میں بھی کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے شادی کر لی اور اداکاری چھوڑ دی۔"

اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی [illegible] ایک لمحہ

کے بعد اپنے ماضی کی یاد آگئی۔ رودے اس کی طرف برابر دیکھتا رہا۔
درحقیقت وہ بہت ہی خوبصورت واقع ہوئی تھی۔ صرف اس کے
خدوخال ہی موزوں نہ تھے۔ بلکہ اس کا رنگ بھی نہایت شاندار تھا۔
"تم سونے کا ایک حسین مجسمہ ہو۔ ٹھیک ہے نا!" رودے نے کہا۔
اُس کے بال گہرے سنہری تھے۔ اُس کی بڑی آنکھیں گہری عنابی
تھیں۔ اور اُس کی جلد زرد سنہری۔ یہ اُس کا رنگ ہی تھا جس کی وجہ
سے اُس کا حسن سرد اور بے جان نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے رنگ سے
حرارت اور اُس کے خدوخال سے شدید جاذبیت ٹپکتی تھی۔
"میرا خیال ہے میں نے دنیا میں جتنی بھی عورتیں دیکھی ہیں تم اُن
میں سب سے زیادہ حسین ہو۔" رودے بولا۔
"تم نے کتنی عورتوں سے یہ بات اور کہی ہے؟"
"بہتوں سے۔ مگر جب میں تم سے کہتا ہوں تو اس کی سچائی
پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"
وہ ہنسنے لگی۔
"بہرحال ہمیں اس موضوع کو ختم کر دینا چاہیے۔"
"کیوں! یہ تو میرا محبوب ترین موضوع ہے۔"
"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے برابر یہ کہہ رہے ہیں کہ میں
بہت خوبصورت ہوں۔ اور اب ان جملوں کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں
ہوتا۔ یہ ایک سرمایہ ہے اور یہ میری بے وقوفی ہوگی اگر میں اس کی قیمت
کا شعور نہ رکھوں۔ بہرحال خوبصورتی کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔"
"تم بہت سمجھدار لڑکی ہو۔"
"اب تم مجھ سے ایسی بات کہنے لگے جو میرے نفس کو بڑھائیگی۔"
"میں تمہیں بنا نہیں رہا۔"
"تم یہ پیغام لے کے بڑھے رہے ہو۔ بہت سے لوگوں نے اسی طرح
میری طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ تم بالکل اس کہاوت پر عمل کر رہے
ہو کہ ایک عام لڑکی کو حسین کہو اور ایک خوبصورت لڑکی کو کتاب
پیش کرو۔ اسے مطلق شرمندگی نہ ہوگی۔"
"اوہ تمہارے بارے مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"
"افسوس کہ تم یہ سمجھتے ہو۔ میں تم سے نہایت صفائی کے ساتھ
بتا دوں کہ مجھ سے تمہیں کچھ حاصل ہو سکے گا؟"
"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تم سے شدید محبت ہو گئی ہے؟"
"غالباً شدید کا لفظ موزوں نہ ہوگا۔ تم نے پچھلے ہفتے خود
یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم مجھ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو
کی رومانی آب و ہوا میں ایک خوبصورت بے سہارا بیوہ
فائدہ نہ اٹھانا بیوقوفی ہوگی۔ تمہارا مطمح نظر یہی ہے۔"
"تم مجھ پر بڑا بھاری الزام لگا رہی ہو۔ موسم بہار میں
نوجوان کا دل ایک حسین عورت پر آ جانا قدرتی بات ہے۔"
اُسکی حرکات میں بے تکلفی تھی۔ وہ خود کو اس قدر
تکلف ظاہر کر رہا تھا کہ میری مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔
"میں تم پر الزام نہیں رکھ رہی۔ جہاں تک میری ذات کا
ہے۔ تم ایک غلط درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور
مجھے تمہارے وقت ضائع کرنے پر نفرت ہوتی ہے۔"
"کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ درا صل میرے پاس ضائع
کرنے کے لئے وقت کی کمی نہیں۔"
"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے محبت کرنے کی کوشش
کر رہے ہیں۔ ہر آدمی چاہے وہ بدشکل ہو یا خوبصورت بوڑھا
ہو یا جوان ہو یہی سمجھتا ہے کہ میں اُس کی آرزوؤں کو پورا کرنے کے
لئے بنائی گئی ہوں۔"
"کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی؟"
"صرف ایک مرتبہ!" وہ بولی۔
"کس سے؟"
"اپنے مرحوم شوہر سے۔"
ایک لمحے تک خاموشی رہی۔ پھر شہزادی نے کوئی بات
کہنی شروع کر دی اور بات چیت کا رُخ پھر عام موضوعات
کی طرف مڑ گیا۔

۳

اُنہوں نے کھانا دیر میں شروع کیا تھا۔ وائلن نواز بجاتے رہے
شہزادی نے بل طلب کیا۔ جب یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ چلنے والے
ہیں تو وائلن والا لڑکا پلیٹ لے کر اُن کے پاس آیا۔ ہر میز
سے اُسے کچھ سکے ملے تھے اور اسکی پلیٹ میں سکوں کے علاوہ
ایک دو چھوٹے چھوٹے نوٹ بھی نظر آ رہے تھے اسی
طرح — جو کچھ وصول ہوتا تھا وہی اسکا معاوضہ تھا۔ پھر

اپنا پرس کھو دو۔

"تم کیوں دیتی ہو" ۔ رو لے بولا۔ "میں اسے کچھ دے دوں گا۔"

اُس نے اپنی جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میں بھی اسے کچھ دینا چاہتی ہوں۔" میری بولی۔

اور پھر میری نے سو روپے کا نوٹ اُس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ لڑکا حیران ہوگیا۔ اُس نے میری کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔ اور سر کو خم کر کے واپس ہوگیا۔

"تم نے اسے سو روپے کیسے دے ڈالے؟" رو لے نے حیرت ناک لہجہ میں کہا۔ "یہ تو فحش غلطی کی!"

"کیونکہ اسے وائلن بجانا نہیں آتا اور یہ بہت آفت زدہ معلوم دیتا ہے۔" میری نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن یہ لوگ اتنے انعام کی توقع نہیں رکھتے۔"

"مجھے معلوم ہے اسی لئے تو میں نے اُسے دیئے ہیں۔ اس بے چارے کے لئے یہ بہت زیادہ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس سے اس کی زندگی ہی بن جائے۔"

برطانوی لوگ اپنی اپنی کاروں میں رخصت ہو گئے۔ اور شہزادی بھی ان کے پیچھے چل دی۔

"میری تم فسا مدے کو اس کے ہوٹل میں چھوڑتی جانا" شہزادی بولی۔ "اس کا ہوٹل میرے راستے میں نہیں پڑتا۔"

"کیا تم محسوس کرو گی؟" وہ بولا۔

میری کو شبہ ہوگیا کہ یہ اسکیم پیشتر سے بنائی گئی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بڈھی عیاش مزاج شہزادی کو دو مرد عورتوں کے تعلقات بڑھانے میں مزا آتا ہے۔ اور رو لے اس کا جل پسند نوجوان تھا۔ مگر اس معقول درخواست کو ٹھکرانا بدتہذیبی ہوتی۔ اور مجبوراً میری نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ اُس کی کار میں بیٹھ گیا اور وہ دونوں ساحل کے کنارے کنارے چل دیئے۔ چاندنی شباب پر تھی۔ وہ زیادہ گفتگو نہ کر رہے تھے۔ رو لے سوچ رہا تھا کہ وہ ان خیالات میں غرق ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اس لئے اُس نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر جیسے ہی ہوٹل پر پہنچ گئے تو اُس نے کہا۔

"کیسی فضول بات ہے۔ ایسی حسین رات میں بستر پر دراز ہو جانا بدذوقی ہوگی۔ کیا تم تھوڑی دور اور نہ چلو گی۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟"

"نہیں۔"

"چلو ذرا دیہات کی طرف گھوم آئیں۔"

"نہیں ابھی بہت رات ہو گئی۔ دیہات کی طرف جانے کا وقت نہیں رہا۔"

"کیا تم دیہات سے ڈر رہی ہو یا مجھ سے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔"

اُس نے گاڑی پھر چلا دی وہ دریا کے کنارے کنارے چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھیتوں کی برابر سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"کیا تم ایڈگر سوفٹ سے شادی کر رہی ہو؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں اس وقت اُسی کی بابت سوچ رہی تھی۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

جواب دینے کے لئے پہلے وہ کچھ دیر رکے۔

"اس کیمس جانے سے پہلے اُس نے مجھے شادی کا پیغام دیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ میں واپسی پر اُسے جواب دوں گی۔"

"تو تمہیں اُس سے محبت نہیں ہے؟"

میری نے گاڑی کی رفتار ہلکی کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتی ہے۔

"تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟"

اگر تمہیں اُس سے محبت ہوتی تو تم تین دن کی مہلت نہ مانگتیں۔ تم اسی وقت ہاں کر دیتیں۔"

"میرا خیال ہے تم درست کہتے ہو۔ بے شک مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔"

"خیر اُسے تو تم سے محبت ہے۔"

"وہ میرے باپ کا دوست تھا اور میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ میرے اوپر بہت مہربان رہا ہے اور میں اُس کی

تنگ گذار ہوں۔"

"وہ تم سے بیس سال بڑا ہوگا۔"

"نہیں چوبیس سال۔"

"کیا تم اس کے مرتبہ سے مرعوب ہوئی ہو!"

"ہاں شاید۔ تم نہیں جانتے کتنی عورتیں اس مرتبہ پر پہنچنا چاہیں گی۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ جس آدمی سے محبت نہ ہو اس کے ساتھ زندگی گذارنے میں کوئی مزہ نہیں۔"

"مگر مجھے محبت نہیں چاہیئے۔ میں نے محبت کا مزہ خوب چکھ لیا ہے۔"

اس نے یہ بات اس قدر تلخی سے کہی کہ روحے چونک پڑا۔

"تمہاری عمر کی عورت سے میں بڑی عجیب بات سن رہا ہوں۔"

اب وہ دیہات میں بہت آگے نکل آئے تھے اور ایک پتلی سڑک پر چل رہے تھے۔ چودھویں کا چاند اپنی چاندنی فضائے بسیط میں بکھیر رہا تھا۔ اور آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ اس نے کار روک لی۔

"بات یہ ہے میں اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لوگ کہتے تھے میں نے اس سے شادی کر کے سخت بیوقوفی کی ہے۔ وہ کہتے تھے وہ جواری اور شرابی ہے۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کے پاس روپیہ کی کمی نہ تھی۔ اگر اس کے پاس ایک پائی بھی نہ ہوتی تو بھی میں اس سے شادی کر لیتی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ اس زمانے میں کتنا خوبصورت تھا۔ وہ بڑا پیارا لگتا تھا۔ وہ اس زمانہ میں بڑا خوش مزاج اور نرم دل تھا۔ ہم بہت تفریح کرتے تھے۔ اس میں بہت کشش تھی۔ جب وہ سنجیدہ ہوتا تو بہت ہی مہربان اور رحمدل بن جاتا۔ جب وہ شراب پیئے ہوئے ہوتا تو بے حد لڑاکا اکھڑ اور پرشور بن جاتا۔ ایسے وقتوں میں مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ اس کی اس حالت پر مجھے بڑی شرم آتی تھی۔ مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا تھا کیونکہ بعد میں وہ اپنے کئے پر بُری طرح پچھتاتا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتا تو شراب پینا نہ چاہتا تھا اور مجھی شرافت سے پیش آتا تھا۔ مگر جب دوسرے لوگ اس کے ساتھ ہوتے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ اور دو تین پیگ کے بعد اس کی عقل اور شرافت جواب دے جاتی۔ ایسے وقت میں میں اس وقت تک انتظار کرتی جب وہ بالکل مدہوش ہو جاتا اور اسے بستر پر لٹا دیتی۔ میں نے اسے ٹھیک کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مگر میری کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ میرا خیال ہے شرابی کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔ بہرحال میں اس کی خدمت کرنے پر مجبور تھی۔ جب کبھی میں اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے اپنی استانی سمجھ بیٹھے۔ مگر میرے پاس اس کی اصلاح کے سوا کیا چارہ کار تھا۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ضبط پر قابو نہ رہتا پھر ہمارا جھگڑا بڑی مہیب شکل اختیار کر لیتا۔ وہ ایک بیمطلب جواری تھا۔ اور شراب پینے کے بعد ہزاروں روپے ہار دیتا۔ اگر وہ اپنے وقت پر نہ مرتا تو ہم لوگ بالکل دیوالیہ ہو جاتے۔ اور مجھے پھر اداکاری کی طرف لوٹنا پڑتا۔ اب میری آمدنی کچھ ہزار سالانہ کی ہے یا پھر کچھ تھوڑے سے بہت زیورات بچ گئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ رات کو زیادہ شراب پی لیتا اور واپس نہ لوٹتا۔ میں سمجھ جاتی کہ وہ نشہ میں اندھا ہو گیا ہوگا۔ اور جو بھی عورت اسے ایسے میں مل گئی ہوگی۔ اسی کے ساتھ سو گیا ہوگا۔ شروع شروع میں مجھے بڑا حسد اور غصہ آتا۔ مگر بعد میں اسے غنیمت سمجھ بیٹھی۔ کیونکہ اگر نشے کے اندر اسے کوئی عورت نہ ملتی تو وہ گھر آ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑتا۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو آتی۔ اور اس کا منہ بگڑ جاتا۔ وہ مجھے بازاری عورتوں کی طرح پیار کرتا اور میرا دم سخت گھٹنے لگتا۔ اور جب وہ اپنی پیاس بجھا لیتا تو ایک دم خراٹے لے کر سونے لگتا۔ تم میرے اس کہنے پر کہ میں محبت کا مزہ خوب چکھ چکی ہوں حیران ہوگے۔ دیکھا تم نے یہ تھی محبت۔"

"مگر تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا؟"

"میں اسے کیونکر چھوڑ سکتی تھی۔ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتا تھا۔ جب کبھی وہ بیمار ہوتا یا اس پر کوئی مصیبت آتی تو وہ صرف میرا ہو جاتا تھا جو اس کا سہارا بنتی۔ وہ مجھ سے بچوں کی طرح چمٹ جاتا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ یہ اس کی ایسے وقت کی کیفیت پر میرا دل اس کے لئے رونے لگتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اسے مجھ سے شدید محبت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو وہ ایک دن بھی نہ جی سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس کی واحد ہمدرد صرف میں ہی ہوں اور جب

اُس نے میری کا خوشی میں دم توڑ دیا تو میرا دل چکنا چور ہو گیا۔"

"میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اُس نے انہیں روکنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ روبے نے سوچا کہ۔ بہہ جانے سے اُس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اور اُس نے سگریٹ سلگا لی۔

"مجھے بھی ایک سگریٹ دو۔ نہ جانے میں کیوں جذبات میں بہہ گئی۔"

اُس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اسے پیش کی۔

"ذرا میرا رومال بھی نکال دو۔ میرے پرس میں ہوگا۔"

پرس اُن کے بیچ میں رکھا تھا۔ اور جب اس نے رومال نکالنے کے لئے اُسے کھولا۔ تو اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اور وہ چونک پڑا۔

"تم نے پستول کس لئے رکھ چھوڑا ہے؟"

"ایڈگر کو میرا تنہا جانا پسند نہ تھا۔ اُس نے مجھ سے پستول لے جانے کا وعدہ لے لیا تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ بیوقوفی ہے۔"

مگر جو موضوع روبے نے چھیڑا تھا اُس پر بہکنے کا اُسے بہت احساس تھا وہ خود کو معمول پر لانا چاہتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود پر قابو نہ رہا" وہ بولی۔

"تمہارے شوہر کا انتقال کب ہوا؟"

ایک سال پہلے۔ میں اب خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ ورنہ میری زندگی میں سوائے لا انتہا مصیبت کے اور کچھ نہ تھا اب میں مطمئن ہوں۔"

"وہ جوانی عمری میں مر گیا ہے نا؟"

"اُس کی موت کار کے حادثہ میں ہوئی۔ وہ ساٹھ میل گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلا رہا تھا۔ کہ موٹر پھسل کر سڑک سے نیچے جا پہنچی۔ اور وہ چند گھنٹوں کے بعد مر گیا۔ میری قسمت کہ میں اُس تک مرنے سے پہلے پہنچ گئی۔ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

"میری! میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے" اُس نے آہ بھری۔ اُسکی موت نے [illegible] کو آزاد کر دیا۔"

کچھ دیر وہ سگریٹ پیتے رہے۔ روبے نے اپنے سگریٹ کے ٹکڑے سے دوسری سگریٹ سلگا لی۔

"کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم پھر خود کو غلامی میں سونپ رہی ہو اور ایک ایسے آدمی سے شادی کر رہی ہو جس سے تمہیں محبت نہیں۔" اُس نے پوچھا۔

"تم ایڈگر کو اچھی طرح نہیں جانتے۔"

"میں اس سے پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں بکثرت مل چکا ہوں۔ وہ معمار شہنشاہیت ہے اور مجھے اس قسم کا آدمی کبھی پسند نہیں آیا۔"

میری آہستہ سے ہنسی۔

"نہیں ایسی بات نہیں وہ تو کافی ہوشیار اور مستند آدمی ہے۔"

"غرض وہ سب کچھ جو میں نہیں ہوں" اس نے طنزاً کہا۔

"کیا تم تھوڑی دیر کے لئے اپنی ذات کو بیچ میں نہ لاؤ گے۔"

"اچھا تو تم اس کی خوبیاں ہی بیان کرو۔"

"وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ وہ عہدہ اور مقام کا شیدا ہے۔ اُس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اور آئندہ بھی وہ بڑے اہم کام کرتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے میں اس کی اس جدوجہد میں مددگار ثابت ہوں۔ اگر میں تم سے کہوں کہ میں دنیا میں با معرف زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو شاید تم اسے بیوقوفی سمجھو گے۔"

"تمہاری میرے متعلق رائے اچھی نہیں ہے۔ ہے نا یہ بات؟" اُس نے پوچھا۔

"بے شک میری رائے تمہاری نسبت کچھ ٹھیک نہیں۔" وہ بولا۔

"مجھے حیرت ہے آخر اس کا سبب؟"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں بتاؤں!" اُس نے سرد مہری سے کہا۔ "کیونکہ تم ناکارہ اور بے مصرف آدمی ہو کیونکہ تم سوائے اس کے کچھ اور نہیں سوچتے۔ کہ جتنی عورتیں تمہارے جال میں آ سکیں اُن سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکو۔

"میرا خیال ہے تم کچھ کچھ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ خوش قسمتی سے مجھے ترکہ میں اتنی معقول دولت ملی ہے کہ میں نے اور کمانا ضروری نہ سمجھا۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں ایسی دولت کمانے کے پیچھے پڑ جاتا جو کسی غریب کے منہ سے چھین لی جائے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آدمی صرف ایک مرتبہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے میرے حالات ایسے ہیں کہ میں اپنی زندگی سے پورا پورا فیض اٹھا سکتا ہوں۔ میں عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔ اور عجیب بات ہے کہ وہ بھی

مجھے چاہتی ہیں۔ میں جوان ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے جوانی ہمیشہ نہیں رہتی۔ تو پھر مجھے اگر زندگی میں لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے تو اسے رائگاں کیوں جانے دوں!"

"میرا خیال ہے تمہارے اور ایڈگر کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ایڈگر کے مقابلہ میں میرے ساتھ تم بہتر زندگی گذار سکتی ہو۔"

"تم بھول رہے ہو کہ ایڈگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے ایک مختصر اور عارضی زندگی کا مشورہ دے رہے ہو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟"

"اس لئے کہ تم شادی شدہ ہو۔"

"اوہ تمہیں غلط معلوم ہے۔ دو ماہ ہوئے کہ میری بیوی نے طلاق حاصل کر لی ہے۔"

"تم اس کے متعلق ہمیشہ خاموش رہے۔"

"قدرتاً۔ عورتیں شادی کے متعلق عجیب خیالات رکھتی ہیں۔ ان حالات میں یہی مناسب ہے کہ کبھی اسکا ذکر نہ لے۔"

"تو پھر تم نے میرا مقصد سمجھ لیا ہوگا۔"

"اب میں سمجھی۔" میری مسکرائی۔ "تم نے مجھے یہ کس لئے بتایا ہے؟ اسی لئے نا کہ اگر میں تمہارے ساتھ اچھی طرح پیش آؤں تو تم مجھے شادی کی انگوٹھی پیش کر دو۔"

"جانِ من۔ مجھے خوب معلوم ہے تم سب سمجھتی ہو۔"

"تمہیں مجھے جان کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چھوڑیئے بھی۔ میں تو آپ کو شادی کی پیشکش کرنے کے لئے راستہ صاف کر رہا ہوں۔"

"وہ کیوں کر؟ کس لئے؟"

"میرا خیال ہے اس میں کوئی عیب نہیں۔"

"یہ ذلیل خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

بات یہ ہے کہ جب تم اپنے شوہر کا ذکر کر رہی تھیں۔ میرے دل میں تم سے شادی کا خیال یکلخت پیدا ہو گیا۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ مجھے تم سے شدید ترین محبت ہو گئی ہے۔ ایسی بات نہیں کہ میرے دل میں پہلے سے تمہاری محبت

دبتی۔ بلکہ اسی محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔"

"تمہیں ہرگز ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتیں۔ تم پکے شیطان ہو تم خوب سمجھتے ہو کہ عورتوں کو کس قسم کی باتیں کر کے موہ کیا جاتا ہے۔"

"عجب میں عورتوں کے جذبات کو سمجھتا ہی نہیں تو پھر کیسے وہی باتیں کر سکتا ہوں۔"

"اچھا بس خاموش رہیئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ مجھے غصہ کم آتا ہے اور میرا مزاج بھی کچھ پُر مذاق ہے۔ چلئے میں آپ کو ہوٹل پر چھوڑ دوں۔"

"تو پھر میں کیا سمجھوں کہ جواب نفی میں ہے؟"

"یقیناً"

"کیوں"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجھے تم سے مطلق محبت نہیں ہے۔"

"مجھے ذرا بھی تعجب نہیں۔ مجھے اس کا علم تھا۔ اگر تم خود کو میری طرف ملتفت کرنے کا ذرا بھی موقع دو تو تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

"تم بھی کتنے بھولے بنتے ہو؟ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تمہاری طرف التفات برتوں؟"

"تو کیا تم نے ایڈگر سونٹ سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟"

"ہاں اب میں نے بالکل پکا ارادہ کر لیا ہے۔ بالخصوص تمہاری گفتگو کے بعد۔ شکر ہے تمہاری بات چیت سے میں اس نتیجہ پر جلد پہنچ گئی۔ تمہاری گفتگو میرے کام آ گئی۔"

"لعنت ہے مجھ پر اگر میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔"

"عورتیں مردوں کی طرح سوچنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ تم نے جو کچھ کہا اور میں نے بھی مرحوم شوہر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے میری ایڈگر کی عقیدت پر بڑی اثر پڑا۔ وہ چٹان کی بات ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میں اس پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ وہ مجھے کبھی دھوکہ نہ دے گا۔ وہ مجھے تحفظ بخش رہا ہے۔ مجھے اس لمحہ اس سے اتنی عقیدت بڑھ گئی ہے کہ اسے محبت کہا جا سکتا ہے۔"

"یہاں سڑک بہت پتلی ہے۔ اگر تم محسوس نہ کرو تو کار کا رُخ میں پھیر دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"جی نہیں شکریہ! میں اپنی کار خود پھیر سکتی ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔

اُس کے جملے نے ایک لمحہ کے لئے اُسے جھنجلا دیا۔ اس لئے نہیں کہ یہ اُس کے موٹر چلانے کی مہارت پر طنز تھی۔ بلکہ اس لئے کہ ایک لمحہ پہلے اُس نے ایڈگر کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس میں ذرا غرور کی جھلک آ گئی تھی۔ وہ ہنسنے لگا۔

"سڑک کے دونوں طرف گہرائی ہے۔ اگر خدانخواستہ تم کسی ایک طرف کو گریں تو مجھے سخت گھبراہٹ ہوگی۔"

"اپنی ذلیل زبان کو لگام دیجئے۔"

اُس نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ پوری قوت کے ساتھ اسٹیئرنگ کا پہیہ گھمانے لگی۔ وہ دیکھتا رہا۔ اس نے انجن بند کیا اور پھر اسٹارٹ کیا۔ کلچ کو دبایا۔ اور پیچھے لوٹانے کے لئے گیئر بدلا۔ اور آہستہ آہستہ ہوشیاری سے گاڑی کو پیچھے لوٹایا۔ آخرش گاڑی کو لوٹا کر واپس گھر کی طرف چل دی۔ وہ خاموش بیٹھا یہاں تک کہ روبے کا ہوٹل آ گیا۔ رات بہت ہو چکی تھی اور ہوٹل کا دروازہ بند تھا۔ وہ بدستور گاڑی میں بیٹھا رہا۔

"لیجئے آپ کا ہوٹل آ گیا۔" میری بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

وہ ایک لمحہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اُس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اُس نے گردن گھمائی اور میری سے بولا۔

"میری جان تم بیوقوف ہو۔ مجھے معلوم ہے تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ کہ میں تمہارے شکوک کے برخلاف اچھا شوہر ثابت ہوں گا۔ مگر تم اپنے سے پچیس سال بڑے آدمی سے شادی کر کے حماقت کر رہی ہو۔ تمہاری کیا عمر ہوگی؟ تیس سال نا؟ تم کوئی — ماہر تو ہو نہیں۔ تمہاری آنکھوں، تمہارے جسم اور تمہارے خد و خال سے صاف جھلکتا ہے کہ تم ایک جذباتی اور لذت پسند عورت ہو۔ یہ صحیح ہے کہ تم زمانے کی ستائی ہوئی ہو مگر جلدی تم ایڈگر کی آبادی اور بے محبت کے بکھیڑ

میں مبتلا ہوگی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم اپنی جنسی خواہشات کو نظرانداز کر سکو گی۔ تمہارا یہ حسین جسم صرف محبت کے لئے بنا ہے۔ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم زندگی کی لذتوں کے دروازے اپنے اوپر ابھی سے بند کر لو۔"

"تمہاری گفتگو سے مجھے کمزوری آتی ہے۔ تم ایسی بات کہہ رہے ہو کہ بس جنسی زندگی ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔"

"کیا تمہیں کبھی کوئی آشنا نہیں ملا؟"

"کبھی نہیں۔"

"تمہارے شوہر کے علاوہ تم سے بہت لوگوں نے محبت کی ہوگی؟"

"معلوم نہیں اکثر نے یہی کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تم نہیں جانتے میرے لئے وہ کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ میں نے ہمیشہ جذبات کو دبایا ہے۔ میرے جذبات کبھی برانگیختہ نہیں ہوئے۔"

"تم اپنی جوانی اور حسن کو کیوں ضائع کرتی ہو۔ ان کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ۔ جس سے آدمی پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکے۔ تم ایک رحم دل اور سخی مزاج عورت ہو۔ کیا تمہارے دل میں اپنی دولت غریبوں میں تقسیم کرنے کا خیال نہیں آتا؟"

میری ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی پھر بولی۔

"اگر میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تو میرا خیال ہے تم مجھے جتنا بے وقوف اب سمجھتے ہو یہ بات سن کر اُس سے بھی زیادہ سمجھنے لگو گے۔"

"ہو سکتا ہے۔ بہرحال بتاؤ۔"

"مجھے اگر اپنی خوبصورتی کا پوری طرح احساس نہ ہو تو مجھ سے بڑھ کر اور کون بیوقوف ہو سکتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں کسی آدمی کو کوئی ایسی چیز دے سکتی جو اُس کے لئے بہت اہم — کیا یہ بہت عجیب سا لگتا ہے؟"

"نہیں یہ تو ایک عام سچائی ہے۔"

"میں حال ہی میں طرح طرح کے خیالات میں بہت وقت ضائع کر چکی ہوں۔ اگر میں نے کسی کا دل بہلایا تو وہ تم جیسا آدمی نہ ہوگا۔ تم آخری آدمی ہوگے جسے میں اپنی تنہائی میں شریک کرتی۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر مجھے کسی ایسے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہو جو زندگی کی تمام لذتوں سے محروم ہو۔ سماج کا ٹھکرایا ہوا اور محبت کا ستایا ہوا ہو جسے زندگی کی کوئی نعمت نہ چکھنی ہو اور جو ہر دم

چیز سے محروم رہا ہو جسے روپیہ سے خریدا جاسکتا ہے۔ تو میں اُسے ایک عجیب تجربہ کراؤں۔ اُسے ایک گھنٹہ کی غیر محدود خوشی بخشوں۔ میں اسکی ہر جسمانی آرزو پوری کراؤں۔ اُسے ایک ایسا تجربہ کراؤں جو اُسے زندگی بھر یاد رہے اور جس کا کبھی اُس نے تصور کر بھی نہ دیکھا ہو! میں اُسے خوشی کے ساتھ وہ سب کچھ دے دوں گی جو میرے پاس ہے۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی عجیب اور پُرجنون بات نہیں سنی!"

"بہرحال آج تو سن لی۔ اچھا اب اُتریئے اور مجھے گھر جانے دیجئے۔"

"تم تنہا چلی جاؤگی نا!"

"بالکل۔"

"اچھا تو شب بخیر! اُس سمار شہنشاہیت سے شادی کرلو اور خوش رہو۔"

میری فلورنس کی ساکن سڑکوں پہ گاڑی چلانے لگی۔ سڑک کی چڑھائی اونچی تھی اور گھوڑے کی نال کی طرح چکردار تھی۔ آدھی چڑھائی چڑھنے پہ ایک چبوترہ ملتا تھا جو نیم گول تھا۔ اُس پہ سرو کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے اور ایک منڈیر بنی ہوئی تھی۔ رات کے حسن سے متاثر ہوکر میری نے وہاں کار روک لی۔ اور اُتر گئی۔ وہ چبوترہ کے سرے پہ آئی اور نیچے گھاٹی کو دیکھنے لگی۔ ساری وادی چاندنی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وسیع اور بلند آسمان کے نیچے وادی میں چاندنی کے نظارے نے اس کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا۔

معاً اُسے احساس ہوا کہ سرو کے درخت کے نیچے کوئی آدمی کھڑا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ جل رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا سی گئی مگر خود کو قابو رکھا۔ وہ اُس کے سامنے گیا اور ہیٹ اُتار کر سلام کیا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ وہی ہیں نا جو ریسٹوران میں فیاضی سے بل بانٹتی تھیں؟" وہ بولا۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

وہ اُسے پہچان گئی۔

"تم وہی وائلن بجانے والے ہونا؟"

اب اُس نے سازندوں والا بھڑکیلا لباس نہیں پہن رکھا تھا۔

وہ ایک عام لباس پہنے ہوئے تھا جس میں سیدھا اور شائستہ نظر آرہا تھا۔ وہ انگریزی خاصی بول سکتا تھا۔

"مجھے مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ میرے مالک مکان شریف ہیں۔ مگر انہیں روپے کی ضرورت تھی۔ اب میں انہیں باقی ماندہ کرایہ ادا کرسکوں گا۔"

"تم یہاں کیا کررہے ہو؟" میری نے پوچھا۔

"دراصل یہ جگہ میرے راستے میں پڑتی ہے۔ میں صرف نظارہ کی خاطر رُک گیا تھا۔"

"کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو؟"

"میں ان جھونپڑیوں میں رہتا ہوں جو آپ کے بنگلہ کے سامنے بنی ہوئی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا میں اُس بنگلہ میں رہتی ہوں؟"

"میں نے تمہیں کار میں گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارا باغیچہ بہت خوبصورت ہے اور تمہارے کمروں کی دیواروں پر بہت بڑھیا تصویریں بنی ہوئی ہیں۔"

"تو تم اُس کے اندر ہو آئے ہو؟" "ایک کسان سے مجھے اس کے متعلق پتہ چلا تھا۔"

"نہیں میں بھلا کیسے جاسکتا تھا۔"

میری کی گھبراہٹ اب ختم ہوچکی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور [illegible] نوجوان تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ریسٹوران میں وہ کس قدر جچا ہوا تھا۔

"کیا تم وہ باغیچہ اور تصویریں دیکھنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بے حد خوشی ہوگی جب بھی آپ مناسب سمجھیں میں حاضر ہوسکتا ہوں۔"

وہ لے اور اُس کی شادی کی غیر متوقع فرمائش سے طبیعت کوفت محسوس کررہی تھی۔ اس کا دل ابھی بستر پہ لیٹنے کو نہ چاہ رہا تھا۔

"ابھی کیوں نہیں؟" وہ اچانک وقتی کیفیت کے تحت کہنے لگی۔

"ابھی؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"باغیچہ چاندنی میں تو اور بھی حسین لگتا ہے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اُس نے رُک کر کہا۔

"آؤ گاڑی میں بیٹھو میں تمہیں لے چلتی ہوں۔"

وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ راستے میں بالکل خاموش رہے [illegible]

—— وہ جھونپڑیوں کے قریب پہنچے۔ تو وہ ڈیرہ [illegible]

"تمہیں ان جھونپڑیوں میں رہنا چاہیئے؟"

اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر لی۔ اور ان افلاس زدہ جھونپڑیوں کی طرف دیکھا، وہ بہت غلیظ اور تنگ معلوم ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

اُس نے گاڑی روک دی اور وہ دونوں پٹری پر چلنے لگے۔ میری کا سونے کا کمرہ اور دوسرے مخصوص کمرے دوسری منزل پر تھے۔ جن پر جانے کے لئے ایک خوبصورت زینہ بنا ہوا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اور بجلی روشن کی۔ ہال میں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اُس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں دیواروں پر مصوری کے نادر نمونے نقش تھے۔ یہ ایک اعلیٰ کمرہ تھا جسمیں مالکان نے اعلیٰ فرنیچر سجا رکھا تھا۔ بڑے بڑے گلدانوں میں پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بنی ہوئی رنگین تصویریں اگرچہ پرانی ہو چکی تھیں اور ان کے نقوش بھدے پڑ گئے تھے۔ مگر ان میں زندگی کا شدید احساس ہوتا تھا۔

"بہت خوب، بہت ہی خوب" وہ خوشی سے چلایا۔ "میرا خیال تھا ایسی چیزیں صرف عجائب گھروں میں ہوا کرتی ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ لوگ ان کے مالک بھی ہو سکتے ہیں"

اُسے اُسکی خوشی سے ایک کیف سا محسوس ہوا۔ اُس نے اُسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہاں اُس کے معیار کی کوئی کرسی نہیں [illegible] سردی میں سنگ مرمر کے فرش اور [illegible] کے باعث بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"کیا یہ سب تمہارا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں یہ میرے دوستوں کا ہے۔ انہوں نے مجھے عارضی طور پر دیا ہے"

"معاف کیجئے گا، آپ بہت حسین ہیں اور آپ کو ایسی اعلیٰ عمارت ہی میں رہنا زیب دیتا ہے"

"چلو میں تمہیں انگلینڈ کی شراب کا ایک گلاس پلاؤں گی، پھر اس کے بعد باورچی خانے میں چلیں گے"

"تمہیں [illegible] کہ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، شراب مجھے بیہوش کر دیگی"

"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

وہ اُس کی سادگی پر ہنسنے لگی۔

"میرے پاس روپے نہیں تھے۔ مگر آپ اسکی کوئی پروا نہ کیجئے، میں صبح کھا لوں گا۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ چلو باورچی خانے میں چلیں شاید کچھ کھانے کو مل جائے۔"

"مجھے بھوک نہیں لگ رہی، یہاں کا ماحول کھانے سے بہتر ہے۔ مجھے اس مکمل چاندنی میں اپنے باغیچے کا نظارہ کرا دو۔"

"باغ اور چاندنی ابھی کہیں نہیں جا رہے۔ میں پہلے تمہارے لئے کھانے کا انتظام کر دوں۔ پھر تم جو چاہو دیکھنا۔"

وہ باورچی خانے میں گئے۔ باورچی خانہ بہت بڑا تھا جس میں ایک بڑی سی [illegible] میز پڑی ہوئی تھی [illegible] پچاس آدمیوں کا کھانا تیار ہو سکتا تھا۔ [illegible] کے سو چکے تھے۔ اور اسکا باورچی [illegible] اُس اجنبی نے خود کو [illegible] کی طرح محسوس کیا [illegible] گوشت، [illegible] اور شوربہ [illegible] میری نے بجلی کا چولہا جلایا۔ اور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن لگایا۔ اور [illegible] تیار کیں۔

"تھوڑا سا گوشت بھی ہونا چاہیئے" [illegible] "کیا ہے؟"

ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں گوشت کا ٹکڑا پکڑے ہوئے وہ بولا "کامل رحم، میں کتنا [illegible] ہوں"

"اور میرا خیال تھا تم اطالوی ہو [illegible]"

"جی نہیں آسٹریا کا باشندہ ہوں" اسکی آواز میں تمکنت تھی۔

میری نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کیا کبھی تم انگلینڈ گئے ہو؟"

"جی نہیں، میں نے کالج میں پڑھی تھی۔ [illegible] آپ کھانا بنانے میں خوب ماہر ہیں"

"شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ میں ایک [illegible] کی لڑکی تھی اور مجھے [illegible] کھانا خود تیار کرنا پڑتا تھا"

"مجھے اس کا یقین نہیں آتا" وہ بولا۔

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے ہمیشہ سے امیرانہ زندگی بسر کی ہے اور نوکروں چاکروں پر حکومت کی ہے؟"

"بالکل، پریوں کی شہزادی کی طرح، تم شروع سے امیر معلوم دیتی ہو۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے، میں نے اپنے اسکول میں کھانا پکانے کی تعلیم حاصل کی تھی اور میری ماں نے مجھے پریوں کی شہزادی کی طرح ہی تربیت دی تھی۔"

جب ساری چیزیں تیار ہو چکیں تو انہوں نے ساری چیزیں ایک ٹرے میں رکھیں اور میری اُسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ ڈرائنگ روم کا کمرہ بھی بہت بڑا تھا۔ اور اس کی چھت پر بھی تصاویر بنی ہوئی تھیں، اس میں رنگین پردے لٹک رہے تھے اور لکڑی کی منقش الماریاں بھی ہوئی تھیں۔ وہ شاہانہ شکل کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"مجھے اپنے میلے کپڑوں سے شرم آ رہی ہے" وہ بولا، "اس عالیشان کمرے کیلئے رنگین سوٹ کا ہونا ضروری ہے۔"

اس کا سوٹ واقعی میلا تھا، اس کے جوتوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور قمیص بھی پیوند زدہ تھی، اس کے گلے کا بٹن کھلا ہوا تھا اور ریشم کی ٹائی ڈھیلی ہوئی تھی۔ لمبی موم بتیوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں سیاہ نظر آ رہی تھیں، اس کا سر عجیب تھا جس پر گھنے بال جمے ہوئے تھے، اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، اس کی جلد زرد تھی، اور اس کے چہرے سے افلاس اور مصائب ٹپک رہے تھے جس سے آدمی کا دل متاثر ہونے لگتا، میری نے سوچا اگر وہ قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہوتا تو خاصا خوبصورت نظر آتا۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" میری نے پوچھا۔

"تیئیس سال۔"

"پھر تمہیں اور کیا چاہیے۔"

"ایسی جوانی کس کام کی، جس کا کوئی لطف نہ اٹھایا جاسکے، میں تو ایک تنکے جیسی زندگی گذار رہا ہوں جس سے کوئی مفر نہیں۔"

"کیا تم کلاکار ہو؟"

وہ ہنسا۔

"کیا تم میرا وائلن سننے کے بعد بھی یہی سمجھتی ہو، میں وائلن بجانے والا نہیں ہوں، جب میں آسٹریلیا سے یہاں پہنچا تو ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا مگر ہوٹل والے کا کام اچھا نہ چلا اور مجھے علیحدہ ہونا پڑ گیا، میں ادھر ادھر کچھ کام کر لیتا ہوں، مگر پردیسی ہونے کی وجہ سے کام کا ملنا بہت مشکل ہے۔ وائلن تو میں صرف زندہ رہنے کے لئے بجاتا ہوں، مگر مجھے روزانہ یہ کام نہیں ملتا۔"

"تم نے آسٹریا کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہمارے کچھ طالب علموں نے حکومت کے خلاف احتجاج کیا تھا، حکومت سے ٹکر ہوئی مگر ہم مقابلہ نہ کر سکے، ہمارے دو ساتھی مر گئے اور باقیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا، مجھے بھی چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی مگر میں فرار ہو گیا اور اٹلی میں آکر پناہ لی۔"

"یہ تو بڑی دہشت ناک بات معلوم دیتی ہے" میری بولی۔

واقعی میری کو اسکی روداد سن کر دہشت ہوئی اور اس نے اس کی طرف مطعون نظروں سے دیکھا۔

"میں اپنے عقیدہ کا واحد آدمی نہیں ہوں، دنیا میں ہمارے ہم عقیدہ ہزاروں آدمی ہیں۔ بہرحال میں آزاد ہوں۔"

"مگر مستقبل کے لئے تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

اس کے چہرے پر ناکامی کی کیفیت ابھر آئی۔ اور وہ جواب دینے ہی والا تھا۔ مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس نے کندھوں کا مایوسی اشارہ کیا اور جھینپ کر ہنسنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے ابھی طرف سوچنے دو۔ مجھے ان قیمتی لمحوں سے پورا پورا حظ اٹھانے دو، مجھے زندگی میں ایسا خوشگوار موقع کبھی نہیں ملا، میں بس صرف تم سے پورا پورا لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں تاکہ میری زندگی میں اسکی یاد ایک قیمتی سرمائے کی طرح محفوظ رہے۔"

میری نے اسکی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے دل کی دھڑکن سن رہا ہے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہا تھا وہ صرف ایک مذاق تھا کسی بیکار لمحہ میں اس کے دل میں وہ خیال آیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وقت اسے یہ دعا کبھی نہ کر سکے گی۔ کیا وہ لمحہ آپہنچا ہے؟ اس نے خود کو بے قابو سا محسوس کیا، وہ شراب بہت کم پیا کرتی تھی، مگر اس کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے زیادہ پی لی تھی۔ اور اسکی طبیعت بے قابو ہو رہی تھی۔ اس بڑے کمرے میں جس نے ہزاروں نوجوان دیکھ رکھے تھے۔ اس اجنبی کے ساتھ شراب کے سرور کی کیفیت

یں بیٹھنا عجیب معلوم ہو رہا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، کھلی ہوئی کھڑکیوں سے خوشگوار اور ہلکی ہلکی ہوا اندر آ رہی تھی مریم نے اپنے ہیجان خیز جذبات کے پیچھے ہلکی ہلکی کسمندی سی محسوس کی، اسے محسوس ہوا جیسے آسکابل اس کے سینے کے اندر پگھلا جا رہا ہے۔ اسکی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو چکی تھی، وہ میز سے یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ اب میں تمہیں اپنا باغیچہ دکھاؤں، اور پھر تم کو چلے جانا چاہیئے۔"

باغیچہ کے لئے قریب ترین راستہ ڈرائنگ روم سے ہو کر تھا وہ اسی طرف لے جانے لگی، کمرہ میں پہنچ کر وہ ایک عطردان کو دیکھنے کے لئے رک گیا جو دیوار کے سہارے کھڑا تھا، پھر اسکی نظر گراموفون پر پڑی۔

"اس ماحول میں یہ کتنا عجیب لگتا ہے۔"

"کبھی کبھی میں جب باغ میں بیٹھتی ہوں تو کوئی ریکارڈ لگا دیتی ہوں۔"

"کیا میں ایک ریکارڈ بجا سکتا ہوں؟"

"ہاں اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے۔"

اس نے سوئچ کھول دیا۔ اتفاق سے مشین پر والٹز کا ریکارڈ چڑھا ہوا تھا، خوشی سے اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"دنیا، یہ میرا محبوب ترین والٹز کا ریکارڈ ہے۔"

اس نے اسکی طرف جھک کر آنکھوں سے دیکھا، اس کا چہرہ اب بدل چکا تھا، وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر اسے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، وہ مسکرانے لگی۔

"کیا تم ناچنا جانتے ہو؟"

"ہاں ہاں میں خوب جانتا ہوں۔"

"اچھا دیکھوں کیسا ناچتے ہو؟"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ اور پھر اس پرتکلف کمرے میں وہ دونوں والٹز کی دھن پر رقص کرنے لگے، پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باغیچہ میں لے گئی۔ دن کے وقت باغ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شرمیلی عورت ہو جس نے اپنے شباب میں خوب رنگ رلیاں منائی ہوں، مگر اس چاندنی رات میں

اسکی سلیقہ سے کٹی ہوئی جھاڑیوں، خوبصورت آبشار اور ہموار سبز گھاس کے لان نے اس میں ایک عجیب حسن پیدا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا صدیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔ اور وہ اس نئی نسل کے انسان ہیں جو جذبات کی تسکین کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اور نتائج سے بے نیاز ہوتی۔ بہت اونچی تمام جا ہیں سفید پھولوں کی جھک لیسی ہوئی تھی وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

"اوہ کتنا حسین ماحول ہے۔" وہ آغوش بڑبڑایا۔ "تقریباً ناقابل برداشت۔" پھر اس نے گوئٹے کے فاؤسٹ کی وہ مشہور لائن پڑھی، جس میں فاؤسٹ گزرتے ہوئے وقت سے رکنے کی درخواست کرتا ہے۔ "تم یہاں بہت خوش ہو گی۔"

"بہت۔" وہ مسکرائی۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ایک مہربان اور فراخ دل انسان ہو، تم مسرت کی مستحق ہو، میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ مل جائے جس کی تمہیں تمنا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی

"مجھے زندگی میں وہ سب کچھ حاصل رہا ہے جس کی مجھے خواہش ہوئی ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری۔

"میں آج کی رات مرنا چاہتا ہوں، آئندہ مجھے ایسی خوشی کبھی میسر نہ ہوگی، میں اسکو تمام عمر یاد رکھوں گا، مجھے یہ شام اور تمہاری خوبصورتی ہمیشہ یاد رہے گی، میں تمہیں ہمیشہ جنت کی دیوی سمجھوں گا اور میں مریم کی طرح تمہاری پرستش کرتا رہوں گا۔"

اس نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں کی طرف اٹھایا اور بے ڈھنگے پن سے جھک کر اسے بوسہ دیا، مریم نے بھی اس کا چہرہ نرمی سے چھوا۔ معاً وہ اپنے گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور اس کے لباس کے حاشیہ کو چوم لیا۔ اور وہ بے پناہ وجد کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے کھڑا کر کے اس کی آنکھوں اور چہرہ کو بوسوں سے پاٹ دیا اس عمل میں ایک عجیب سنجیدگی اور کیفیت تھا، اس کے دل میں عجیب سا احساس جاگ اٹھا، اس کا دل ہمدردی اور محبت سے لبریز ہو اٹھا، وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا، تشنگی کا عالم تھا اور

وہ بھی کوئی ایسی جلدی نہ تھی جس کی طرف لپکا جا سکتی ہے آغوش گزشت پوست کی ایک جوان عورت ہی تو تھی۔

وہ خاموشی کمرے کی طرف چل دیئے۔

— ۴ —

کمرے میں اندھیرا تھا، مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور چاندنی اندر آ رہی تھی۔ میری ایک پرانی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور نوجوان کا سر اسکی ران پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور نیم تاریکی میں اسکی سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ اس کے سوالوں کے جواب میں وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ آسٹریا کی پولیس میں ایک افسر تھا۔ اس کے باپ نے جملہ بغاوتوں کو سختی سے دبا دیا تھا۔ بڑا وطن پرست آدمی تھا اور جرمنوں کا قبضہ اپنے ملک پر ہونا نہ چاہتا تھا۔ اس کے باپ کے نازی بہت سخت دشمن ہو گئے تھے۔ اور جب جرمن کی افواج آسٹریا میں گھس آئیں تو اس نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اسوقت وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے آرٹ کی تعلیم ختم کر لی تھی اور ایک سکول میں جگہ ملنے والی تھی۔ اسی زمانہ میں ہٹلر آسٹریا آیا تھا۔ اور اسکی تقریر پر لوگوں نے بڑی تالیاں بجائی تھیں۔ مگر بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کا فاتح بڑا ظالم ہے۔ تمام قوم میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایک جماعت جرمنوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بنائی گئی۔ مگر ان کی حرکات و سکنات سے خفیہ پولیس خوب واقف تھی۔ ایکدن وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ دو آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ باقیوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ تین ماہ بعد وہ فرار ہو کر اٹلی کی سرحد میں پہنچ گیا۔ اس کے پاس کوئی پاسپورٹ نہ تھا اسے ہر وقت گرفتار ہونے کا ڈر تھا۔ اس صورت میں یا تو وہ آوارہ سمجھ کر جیل میں ڈال دیا جائے گا یا واپس نازیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور اس صورت میں اسے بڑی سخت سزا ملے گی۔

"اگر میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں بھی اپنے باپ کی طرح خودکشی کر لیتا۔"

اس نے میری کا ہاتھ اٹھایا اور اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ "بس یہی جگہ جہاں تمہارا ہاتھ ہے وہاں گولی مار لیتا۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔" میری نے اپنا کپکپاتا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"تم نہیں جانتیں میں نے کتنی دفعہ دریا کی طرف دیکھا ہے اور یہ سوچا ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ میں اس میں کود کر جان دے دوں۔"

میری نے گہری سانس بھری۔ اس کی قسمت ایسی خراب تھی کہ اس کے دوسرے کو اگر کوئی جملہ کہا جاتا تو وہ نشتر کا کام کرتا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ دبایا۔

"آہیں مت بھرو!" اس نے کہا۔ "مجھے کسی چیز کا غم نہیں۔ آج کی رات کی خوشی سے مجھے تمام تکلیفوں کا بدلہ مل گیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ میری اسکی مصیبت زدہ کہانی کے متعلق سوچنے لگی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی، وہ اس کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ کیا اسے کچھ روپیہ دیدے؟ مگر اس سے کتنے دن کام چل سکے گا۔ وہ ایک معانی نوجوان تھا جو اپنے پر مصائب تجربوں سے زیادہ کتابوں کو اہمیت دیتا تھا۔ اور یہ قطعی ممکن تھا کہ وہ اسکی دی ہوئی کوئی رقم قبول نہ کرے گا۔ معاً ایک مرغ کی اذان سنائی دی۔ اس آواز نے خاموشی کو اس تیزی سے چیرا کہ وہ بوکھلا گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"اچھا میرے عزیز اب تمہیں جانا چاہیئے۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں، میری جان میری روح!"

"صبح ہونے والی ہے!"

"ابھی نہیں!" اس نے خود کو گھٹنوں پر کھڑا کیا اور اس کی گردن میں ہاتھ حائل کر دیئے۔ "میں تمہاری پرستش کرتا ہوں!"

اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

"اب تمہیں چل دینا چاہیئے۔ رات بہت گزر چکی ہے۔ خدا امان جاؤ!"

اس نے اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ محسوس کی۔ وہ گھٹنے لگا۔ اور اپنا کوٹ اور ٹوپی تلاش کرنے لگا۔ اس نے بتی جلا دی۔ جب اس نے لباس پہن لیا تو اس سے پوچھا "تم خوش ہو گئے؟"

"میری پیاری میری جان!" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنی عظیم مسرت بخشی ہے!"

"مجھے خوشی ہے کہ تم خوش ہو گئے۔" وہ بولی۔

"تم نے وہ چیز بخشی ہے جس کے [illegible] ہوں۔ جب تم مجھے [illegible]

تعلقات کو اور استوار کرے گا، زندگی میں جینے کا لطف تو اب آیا ہے۔"

"تو مجھے کبھی نہ بھولو گے؟" اُس نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔"

اُس نے اپنے ہونٹ اُسکی طرف بڑھائے۔

"اچھا تو خدا حافظ۔"

"کب تک کیلئے خدا حافظ؟" اس نے جذباتی ہو کر عاجزی سے پوچھا۔

"پیارے ہمیشہ کے لئے، میں یہاں سے بہت جلد چلی جاؤں گی، بس دو دن کے اندر۔" اسکی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اور کیا کہے۔ "اب ہم ایک دوسرے سے ہی نہ مل سکیں گے، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں خود مختار نہیں ہوں۔"

"کیا تم شادی شدہ ہو؟ مجھے پتہ چلا تھا کہ تم بیوہ ہو۔"

وہ آسانی سے جھوٹ بول سکتی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں نہ کر سکی، وہ جھجک سی گئی۔

"تم نے اس سے کیا مطلب نکالا کہ میں خود مختار نہیں ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا اور تمہارا اب آئندہ ملنا ناممکن ہے۔"

"مگر میں تم سے ایک مرتبہ اور ملنا چاہتا ہوں صرف ایک مرتبہ ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"پیارے مدہوش نہ بنو، میں تم سے کہہ رہی ہوں یہ ناممکن ہے ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی، وہ نامہربانی کا ثبوت نہ دینا چاہتی، مگر اس نے مناسب سمجھا کہ اُسے صحیح حقیقتِ حال بتا دے۔

اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک لمحہ کے لئے مسکرائی۔

"نہیں۔"

اس نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اسکی بات سمجھ نہیں سکا۔

"تو پھر تم مجھے کیوں ملی تھیں؟"

"چونکہ تم تنہا اور پریشان تھے، میں تمہیں تھوڑی دیر کی خوشی دینا چاہتی تھی۔"

"اُف تم کس قدر ظالم ہو، کتنی سنگدل ہو۔"

وہ گھبرا گئی۔

"ایسا مت کہو، میں تم پر کوئی ظلم نہ کرنا چاہتی تھی، میرا دل ہمدردی سے پُر تھا۔"

"میں نے تم سے کبھی رحم کی درخواست نہیں کی، تم نے مجھے میرے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیا۔ تم نے مجھے جنت میں داخل کیا۔ اور اب پھر دوزخ میں پھینک رہی ہو۔ نہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اُس کے الفاظ میں وقار کی جھلک تھی۔ اُسکی جھنجھلاہٹ کے پیچھے غم کا طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ بُری طرح مرعوب ہو رہی تھی۔ اُس کے خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسی بات سوچے گا۔

"شاید میں نے سخت حماقت کی ہے۔" وہ بولی۔ "میں تمہیں ستانا نہیں چاہتی۔"

اس کی آنکھوں میں اب محبت کی کوئی جھلک نہ تھی بلکہ ایک سرد غصہ تھا۔ اس کا سفید چہرہ سفید تر ہو گیا تھا۔ اس کے چہرہ پر موت کے سے آثار چھائے ہوئے تھے۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اُس نے اب محسوس کیا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے۔ نوکر وغیرہ غلام گردش میں سو رہے تھے۔ اور اگر وہ چیخی تو اُن تک آواز نہ پہنچ سکے گی۔ وہ کتنی بڑی پاگل اور احمق تھی، اس کا علاج صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ خوفزدہ ہے۔

"مجھے بے انتہا افسوس ہے، میں تمہارے جذبات کو تکلیف دینا نہ چاہتی تھی۔ اگر میں تمہاری تکلیف کا کوئی کفارہ دے سکتی ہوں تو اس کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔" اسکی زبان میں لرزش تھی۔

اُس نے تلخی سے منہ بنایا۔

"تم زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتی ہو۔ یہی نا کہ مجھے کچھ روپے دے دو۔ مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ تمہارے پاس اسوقت کتنے روپے ہیں؟"

اُس نے اپنا پرس سنگھار دان سے اٹھایا اور جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا۔ اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اسکی ہمت بندھ گئی۔ اُس نے زندگی میں کبھی پستول نہ چلایا تھا۔ نہیں اسکی نوبت کبھی نہ آئی تھی پھر بھی خدا کا شکر ہے اُس کے پاس پستول تھا۔ خدا ایڈگر کو خوش رکھے وہ کتنا دور اندیش آدمی ہے۔ اُس کے دل میں مختلف شبہات پیدا ہو رہے تھے، بہرحال اس عجیب خیال سے وہ بہت خوش ہو گئی وہ اس کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ اب وہ اپنے آپ میں تھی۔

"میرے پاس اسوقت صرف دو تین ہزار روپے ہیں۔ ان سے تم بہ آسانی سوئٹزرلینڈ پہنچ سکتے ہو، تم وہاں زیادہ امن سے رہو گے۔ یقین کرو مجھے اس کا کوئی دکھ نہ ہو گا۔"

ہے۔ شک تمہارے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تم امیر ہو، سمجھ سے ہوتا ہو تم ایک رات کی خوشی کے لئے اتنی بڑی رقم برباد کر سکتی ہو، کیا تم ہمیشہ اسی طرح نوجوان لڑکوں سے لطف اندوز ہوتی ہو، اگر مجھے روپے کی ضرورت ہوتی تو کیا میں اسی پر قناعت کرتا۔ میں تم سے جواہرات مانگتا "

" تم انہیں بھی لے سکتی ہو۔ میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ سنگھار دان میں رکھے ہوئے ہیں۔ جاؤ لے لو۔"

" تم بہت کمینی عورت ہو۔ کیا تم اتنی ذلیل ہو کہ ہر کسی کو پیسے سے خرید لو۔ تمہیں نہیں معلوم اگر میں روپیہ کو کوئی اہمیت دیتا۔ تو نازی مجھے روپیہ دینا چاہتی تھی۔ مجھے وطن سے دور غلامی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

" یا اللہ! تمہاری سمجھ میں کوئی بات کیوں نہیں آتی۔ میں تمہارے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتی تھی اور تم سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہیں نقصان کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں مگر تمہیں میری ذات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ میں صرف تمہاری بھلائی چاہتی تھی۔"

" تم بہت بدذات ہو۔ تم ایک شخص سے بات اور آدھا جھوٹ ہو۔ تم نے زندگی میں کبھی کوئی بھلا کام کیا ہے؟ تم نئے نئے معصوم نوجوانوں کو پھانستی ہو۔ ان کے جذبات سے کھیلتی ہو اور نئے نئے تجربوں سے لطف اٹھاتی ہو۔ تمہیں جو بھی نوجوان ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اس کا چین اور سکون لے کر چلی جاتی ہو۔ تمہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس سے دوسروں کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس دفعہ تم نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ اجنبیوں کو اپنے گھر میں لے جانا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا مگر تم زندہ نہ بچ سکیں۔ اگر میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ابھی ختم کر دوں تو یہ بہتر رہے گا۔ تاکہ تم کسی اور معصوم کو نہ ستا سکو۔ میں بہت آسانی سے ایسا کر سکتا ہوں کسی کو مجھ پر شبہ تک نہ ہوگا۔ مجھے اس مکان میں داخل ہوتے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔"

وہ اسکی طرف ایک قدم آگے بڑھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔ اسکا نوکیلا چہرہ نفرت سے بگڑ گیا تھا اور اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اچانک پستول اسکے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پستول نکال لیا اور اس کی طرف تان لیا۔

" اگر تم فوراً نہ گئے تو میں گولی مار دوں گی!"

" تو پھر مارو گولی۔"

وہ اسکی طرف ایک قدم اور بڑھا۔

" اگر تم ایک انچ بھی آگے بڑھے تو میں گولی داغ دوں گی۔"

" مارو۔ کیا تم سمجھتی ہو میں زندگی کو پسند کرتا ہوں۔ تم مجھے ایک ناقابل برداشت مصیبت سے چھٹکارا دلا دو گی۔ سامنے سے مارو میں تمہیں ہر چیز کے لئے معاف کر دوں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔"

اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ بیل جیسی تھی کہ آثار ختم ہو چکے تھے۔ اور اس کی بجائے اب اسکی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس نے اپنا سینہ اس کے نشانے کے لئے پیش کر دیا تھا۔

" تم بڑی آسانی سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے گھر میں ایک چور گھس آیا تھا اور تم نے اسے گولی مار دی۔ لو اب جلدی کرو۔ مار دو نا گولی۔"

اس نے پستول کو اپنے ہاتھ سے چھوٹ جانے دیا اور ایک کرسی پر گر کر آنکھوں کو ڈھک کر بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اسکی طرف دیکھا۔

" کیا تم میں جرأت نہیں ہے؟ کمزور عورت۔ تم کتنی بیوقوف ہو۔ تمہیں لوگوں سے اس طرح کھیلنا نہیں چاہئے۔ اٹھاؤ اسے اور مارو گولی۔"

اس نے اپنے بازو اسکی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اور اسے پاؤں کے بل کھڑا کرنے لگا۔ وہ نہیں سمجھ سکی وہ کیا چاہتا ہے۔ اور کرسی سے چمٹی رہی اور برابر روتی رہی۔ اس نے اسکا ہاتھ جھٹکا اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور درد کے مارے وہ کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اسے اٹھا کر کمرے میں دوسری طرف لے گیا۔ اور بستر پر لے جا کر پٹک دیا اور خود بھی اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اور اسے زور سے چمٹا لیا۔ اور اس کے منہ پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ اس نے خود کو اس سے علیحدہ کرنا چاہا۔ مگر اس نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔ وہ اپنے وجود سے زیادہ طاقتور تھا۔ الفت اسکی مضبوط گرفت کے آگے بے بس

لیکن آخر اس نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا۔ اور خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

کچھ وقت گزرے وہ اٹھا۔ اس کی چال بدل چکی تھی۔ وہ پلنگ کے پاس کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھ کو کہا تھا کہ میں تمہیں کبھی نہ بھلاؤں گا۔ میں تو بھلا دوں گا — مگر تم نہ بھلا سکو گی۔"

وہ ساکت رہی اور خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ایک کرخت قہقہہ لگایا۔

"ڈرو مت! میں تم پر حملہ نہ کروں گا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی قہر آلود نظروں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے تاریک کمرے کے اندر دبے پاؤں چلنے کی آہٹ محسوس کی۔ اس کے کان میں گولی کی آواز آئی اور پھر ایک جسم زمین پر گرا۔ وہ چیخ مار کر ایک دم کھڑی سی ہو گئی۔

"ہائے اللہ تم نے کیا کیا۔"

وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور چاندنی اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پر جھک گئی، اور اسے نام لے کر پکارنے لگی۔

"کامل — کامل یہ تم نے کیا کر ڈالا۔"

اس نے اس کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور جب اسے چھوڑا تو وہ بے جان نیچے آن پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے چہرہ اور پھر دل پر رکھا وہ مر چکا تھا۔ وہ خوف سے پیچھے پلٹ گئی۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ بیہوش ہونے والی ہے۔

معاً وہ کھڑی ہو گئی کیونکہ باہر کسی کے ننگے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ آواز رک گئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ دروازہ پر کوئی کھڑا ہوا ہے۔ وہ خوف سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگی اور آہٹ سننے لگی کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ چیخ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ وہیں زمین پر نقش ساکت بیٹھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے برابر میں پڑی نعش۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ اس نے قوت لگا کر آواز نکالی۔

"ہاں! کیا بات ہے؟"

"حضور آپ خیریت سے ہیں؟ یہ نینا کی آواز تھی۔ میرا خیال ہے میں نے کچھ آواز سنی تھی۔"

میں نے اپنی انگلیاں اپنی ہنسلی پر گاڑ دیں تاکہ وہ دوڑ ہو کے لہجے میں بول سکے۔

"تم خواب دیکھ رہی ہو گی۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ جاؤ سو جاؤ۔"

"بہت بہتر حضور۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ اور پھر اس نے ننگے پاؤں دور جانے کی آہٹ سنی۔ دیر تک وہ اس آہٹ پر کان لگائے رہی۔ اس نے ان دو جملوں کے لئے اپنی قوت جمع کر لی تھی۔ اس نے گہری آہ بھری۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نعش کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اس نے ایک ہاتھ مرے ہوئے آدمی کے سر کے نیچے ڈالا اور اسے کھڑکی سے باہر [illegible] کی کوشش کرنے لگی نہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کسی شدید خوف کے باعث وہ اسے کمرے سے باہر ڈالنا چاہتی تھی۔ مگر نعش وزنی تھی۔ اس نے بے بسی سے آہ بھری۔ اس نے خود کو بے جان محسوس کیا۔ سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ معاً اسے خیال آیا کہ نینا کو اس طرح ٹال دینا سخت غلطی ہے۔ اس نے اس سے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ جب کہ گولی اس چار دیواری میں چلی ہے۔ اپنی بدنامی کے ہر قسم کے خیالات اس کے دل میں جگہ لینے لگے۔ بے عزتی شرم اور نہ جانے کیا کیا۔ آخر وہ کیا جواب دے گی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کچھ کہہ دے۔ اور پیا میں بدنامی تھی۔ ایسی حالت میں تنہا ہونا سخت پریشان کن تھا۔ اس کا کوئی معاون نہ تھا۔ اس مایوسی کی حالت میں اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے ملے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ سخت ضرورت ہے۔ مدد! ایسے میں صرف وہی واحد آدمی ہے۔ جو کام آ سکتا ہے اسے یقین تھا کہ اگر اس نے اسے بلایا تو وہ ضرور آئے گا۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے اس سے محبت ہے۔ ہر چند کہ وہ بُرا آدمی ہے مگر اس وقت ضرور کام آئے گا۔ بہر حال وہ اسے مشورہ ضرور دے گا۔ وہ رات میں اس سے کیسے مل سکتی ہے؟ مگر وہ دن نکلنے تک انتظار نہ کر سکتی تھی۔ مگر صبح ہونے سے پہلے پہلے کچھ نہ کیا تو کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

اس کے بستر کے قریب فون رکھا ہوا تھا۔ [illegible]

تھا کیونکہ ایڈگر وہیں ٹھہرا تھا۔ اس نے ہوٹل سے فون ملایا۔ شروع میں کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ایک اطالوی نے جواب دیا۔ غالباً وہ سوتے سے اٹھا تھا۔ اس نے اس سے فون روڈلے کے کمرے میں ملانے کو کہا۔ اس نے گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ مگر جواب نہ مل رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوف زدہ ہو گئی۔ کہیں وہ باہر نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں باہر چلا گیا ہو۔ کہیں جوا کھیل رہا ہو یا کسی عورت کے پاس ہو۔ مگر جب اس نے ایک تیز خواب آلود آواز سنی۔ تو ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"ہاں، کون ہے؟"

"روڈلے، میں میری بول رہی ہوں۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل دبک بیٹھا ہے۔ اور وہ آہستہ سے ہنسا۔

"اتنی رات گئے کیسی پریشانی، آخر کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بہت سخت بات ہے۔ میں چاہتی ہوں تم یہاں چلے آؤ۔"

"کب؟"

"ابھی — اسی وقت۔ جتنی بھی جلدی ہو سکے۔ خدا کے لئے جلدی آؤ"

اس نے اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا۔

"اچھا میں ابھی آیا گھبراؤ مت۔"

یہ دو بول کتنے سکون بخش تھے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے سوچا وہ کتنی دیر میں یہاں پہنچے گا۔ ہوٹل تین میل دور تھا۔ اور زیادہ راستہ چڑھائی کا تھا۔ اس وقت اسے کوئی ٹیکسی بھی نہ ملے گی۔ اگر وہ پیدل آیا تو ایک گھنٹہ سے کم نہ لگے گا۔ ایک گھنٹہ بعد دن نکل آئے گا۔ وہ کمرہ میں انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر پٹری میں آ گئی جس چاندنی سے تھوڑی دیر پہلے وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اب اس کے خوف سے درختوں کی چھاؤں میں چلنے لگی۔ بالآخر وہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اور یہاں اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ وقت کے تیزی سے گزرنے کے خوف سے پریشان ہو رہی تھی۔ معاً اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ اور چونک کر درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ کوئی شخص پہاڑی کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں اس کے بنگلے کے دروازے کے نیچے سامنے گھاٹی میں اترتی تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو وہ بنگلہ کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ جب وہ تاریکی سے باہر چاندنی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ روڈلے تھا۔ اسکو دیکھ کر اسے بے اندازہ سکون ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ تم یہاں اتنے جلدی کیسے پہنچ گئے؟"

"ہوٹل کا ملازم سو رہا تھا۔ میں نے اس کی سائیکل اٹھائی اور چلا آیا۔ سائیکل پہاڑی کی نشیب میں چھوڑ دی ہے۔ میں نے سوچا میں پیدل سے ہو کر جلدی پہنچ سکتا ہوں۔"

"اچھا آؤ۔" وہ بولی۔ اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"تم بہت گھمبیر نظر آ رہی ہو۔"

اس نے اپنا سر ہلایا۔ وہ اسے کچھ نہ بتا سکی۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور تیزی سے کمرے کی طرف چل دی۔

"زیادہ سے زیادہ خاموش رہنے کی کوشش کرو۔" اس نے سرگوشی کی۔ "بالکل مت بولو۔"

وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ اندر پہنچ کر اس نے قفل لگا لیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ روشنی کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بہرحال اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نے سوئچ دبایا۔ کمرے کی چھت میں ایک بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ ایک دم تمام کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ جب روڈلے کی نظر اس مردہ جسم پر پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یا معبود!" اس کی چیخ نکل گئی۔ اور اس نے اس کی طرف دیکھا

"یہ کیا ہے؟"

"یہ مر گیا ہے۔"

"یہی تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مگر —" وہ نیچے جھکا۔ اور اس مرد کی آنکھ کا غلاف اوپر کو اٹھایا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے بغل میں رکھا۔

"یہ تو بالکل مردہ ہے۔" پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔ "اس نے خود ہی گولی ماری ہے۔"

"کیا تم نے سوچا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے۔"

"فکر کہاں ہیں؟ کیا تم نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"مگر تمہیں فوراً بلانا چاہیئے۔" اسے یہاں کبھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بغیر یہ سوچے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے بے اختیار طور پر اس آدمی کی مٹھی سے پستول نکال لیا۔ اور اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا یہی پستول معلوم ہوتا ہے جو تم نے مجھے کار میں دکھایا تھا۔"

"وہی ہے۔"

اُس نے اُسکی طرف خالی الذہن ہو کر دیکھا، اسکی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ عصمت علی بالکل اجنبیا بنی ہوئی تھی۔

"اس نے خود کو کیوں ہلاک کیا!"

"خدا کے لئے مجھ سے اس وقت سوالات نہ کرو!"

"تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟"

"نہیں!"

اُس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بیہوش ہو جائے گی۔

"میری! تمہیں خود کو سنبھالنا چاہیئے۔ گھبرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایک لمحہ ٹھہرو۔ میں ڈائننگ روم سے تمہارے لئے کچھ برانڈی لے آتا ہوں۔ کہاں رکھی ہے؟"

وہ جانا چاہتا تھا مگر اس نے اُسے روک لیا۔

"مجھے تنہا نہ چھوڑو۔ مجھے سخت ڈر لگے گا۔"

"اچھا تو میرے ساتھ آؤ!" اس نے ایک دم کہا۔

اُس نے اُسکے گرد باہیں ڈالیں اور اُسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آیا۔ ڈائننگ روم میں ایک بتی جل رہی تھی۔ کمرے میں گھس کر اُسکی نظر سب سے پہلے اُن دو خالی پلیٹوں، طشتریوں، دو گلاسوں اور شراب کی بوتل پر پڑی۔ جس میں ان دونوں نے کھایا پیا تھا۔

روڈے میز پر پہنچا جس کرسی پر کارل بیٹھا تھا اس کے برابر والی کرسی پر اس کا میلا ہیٹ پڑا ہوا تھا۔ روڈے نے اُسے اٹھایا۔ ایک نظر اسکی طرف اور پھر میری کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔

"جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے نہیں جانتی تو یہ غلط تھا! مجھے کہنا پڑے گا کہ واقعی یہ بات صاف ظاہر ہے۔"

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو روڈے، میں سخت پریشان ہوں!"

"مجھے افسوس ہے!" وہ بولا "تو پھر یہ کون ہے؟"

"وہ [illegible] ریسٹوران میں ملازم ہے اور جو ہیٹ لٹکتا رہا تھا کیا تمہیں یاد نہیں!"

"میں سوچ رہا تھا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، مگر اس وقت وہ سادہ نوعیت کا لباس پہنے تھا۔ اسی لئے میں اسے نہ پہچان سکا اور اب وہ مختلف نظر آتا ہے۔ [illegible] کیسے [illegible]!"

[illegible]۔

"جب میں گھر کی طرف آ رہی تھی تو راستے میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ پریشان تھا، مجھے اس پر ترس آ گیا۔"

روڈے نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ میری دنیا میں آخری عورت تھی جس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتی ہے،

"میری میری جان۔ میں تمہارے لئے دنیا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا!"

"وہ بھوکا تھا۔ میں نے اُسے کچھ کھانے کو دیا!" وہ بولی۔

روڈے نے منہ بنایا۔ "تمہارا مطلب ہے اُس نے کھانا کھایا اور پھر گولی ماری!"

میری رونے لگی۔

"کچھ برانڈی پیو! پھر بعد میں رو لینا!"

اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں، اب نہ روؤں گی، میں اب سمجھ گئی کہ میں نے حماقت کی ہے۔ مگر اس وقت مجھے کچھ پتہ نہ چلا، میرا خیال ہے ایک منٹ کے لئے میں دیوانی ہو گئی تھی، تمہیں معلوم ہے۔ میں نے تمہارے کار سے اترنے سے پہلے کیا کہا تھا"

وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے!

"میرا خیال تھا وہ صرف ایک رومانی مذاق تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم ایسی احمقانہ حرکت کر سکتی ہو مگر اس نے خود کو ہلاک کیوں کیا!"

"مجھے نہیں معلوم! مجھے نہیں معلوم!"

اس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور پھر پلیٹوں کو اٹھا کر ٹرے میں رکھنے لگا۔

"تم کیا کر رہے ہو!" اس نے پوچھا

"تم نہیں سمجھتیں کہ تمہیں ایسی کوئی علامت گھر میں نہ چھوڑنی چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی اجنبی گھر میں آیا تھا۔ باورچی خانہ کدھر ہے؟"

"دروازہ کے سامنے نیچے زینہ سے اتر کر!"

وہ ٹرے باہر لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو میری اپنا سر پکڑے ہوئے میز پر بیٹھی تھی۔

"خوش قسمتی تھی کہ میں نیچے چلا گیا۔ تم نے تمام چیزیں جلا کر چھوڑ دیں

تھیں، تم اپنے جرائم کو چھپانے کی عادی نہیں معلوم دیتیں۔ تمہارے علاوہ یہاں سے آدھا برتن صاف نہ کئے تھے۔ میں نے وہ برتن انہیں میں چھوڑ دئیے اور امید ہے کہ انہیں پتہ نہ چلے گا، اب ہمیں پولیس کو بلانا چاہیئے۔"

وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"رو سے ـــــ!"

"میری جان ذرا ہوش میں آؤ، میں نے اس معاملہ پر خوب غور کر لیا ہے۔ اور تم میرا مشورہ سنو، اگر کہا کہ میں سو رہی تھی کہ ایک آدمی کی آہٹ سے جاگ پڑی، وہ یقیناً چور تھا۔ اور تمہارے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ تم نے بتی روشن کی اور برابر کی میز سے اس نے پستول اٹھا لیا پھر وہ تم سے لپٹ گیا۔ اور اتفاق سے پستول چل گیا۔ تم نے اسے مارا یا اس نے تمہیں مارا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ گھر گیا ہے۔ اور تمہاری چیخوں سے نوکر جاگ جائیں گے تو اس نے گولی مار دی!"

"اس کہانی پر کون یقین کرے گا، یہ ناقابل یقین ہے۔"

"بہرحال یہ سچائی کے مقابلہ میں زیادہ قابل یقین ہے، اگر تم اس بات پر جمی رہیں تو کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"نینا نے گولی کی آواز سنی تھی کہ وہ میرے کمرے کے دروازہ تک دریافت حال کے لئے آئی تھی، میں نے کہا کوئی بات نہیں ہے۔ جب پولیس اس سے پوچھے گی تو وہ یہ بات بتا دے گی۔ پھر میں کیا کہوں گی؟ آخر جب میرے کمرے میں ایک مردہ آدمی پڑا ہوا تھا تو میں نے اسے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں ہے، یہ بالکل مایوس کن بات ہو گی۔"

"آخر تم مجھے تو سچ سچ بتا ہی دو۔"

"یہ سخت ذلیل بات ہے، مگر اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ میں کوئی بہت نیک کام کر رہی ہوں۔"

وہ اور زیادہ نہ کہہ سکی اور وہ اس کی طرف نیم فہم انداز میں دیکھنے لگا، اس نے ایک گہری آہ بھری۔

اچھا تو پھر پولیس کو بلاؤ۔ اور معاملہ کو ختم کرو، اس کا مطلب بربادی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ میں اسی کی مستحق بھی ہوں۔ میں پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی، سارے اخباروں میں یہ خبر چھپے گی، اور ایڈگر کو بھی معلوم ہو گا، اور پھر میری شخصیت ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گی۔

رو سے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"بے شک اس کا مطلب یہ ہے (؟) ہوگا، یہ بدنام کہانی سب میں پھیل جائے گی، میری جان تم نے بہت بڑی مصیبت مول لی ہے، تمہارا کوئی بھی مدد نہ کر سکے گا، کیا تم ایک خطرہ مول لینے کو تیار ہو؟ میں بتائے دیتا ہوں کہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے اور اگر تم اپنے اقدام میں کامیاب نہ ہو سکیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

"میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر ہمیں نعش کو کہیں اور منتقل کرنا ہو گا، اس کے بعد کون شبہ کر سکتا ہے کہ اس کی موت کا تم سے کوئی تعلق ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! یہ ناممکن ہے۔"

"نہیں بالکل نہیں، اگر تم میری مدد کرو تو ہم اسے موٹر میں ڈال لیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں پہاڑیاں بہت ہیں، ہم نعش کو کسی ایسی جگہ ڈال دیں گے۔ جہاں اس کا مہینوں پتہ نہ چلے گا۔"

"مگر لوگ اس کی تلاش شروع کر دیں گے۔"

"انہیں کیا ضرورت ہے، ایک اطالوی سازندے کی کوئی پروا کرے گا۔"

"نہیں وہ اطالوی نہ تھا، وہ تو ایک آسٹرین مہاجر تھا۔"

"پھر تو یہ اور بھی بہتر ہے، کسی کو بھی اس کی تلاش نہ ہو گی۔"

"مگر رو سے یہ سخت خطرناک کام ہے، اور کیا تمہیں اپنا خیال نہیں تم کتنا سخت خطرہ مول لے رہے ہو۔"

"مگر میری جان اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے خطرہ مول لینے میں مزہ آتا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میری کا دل بند ہونے لگا۔ اس کی پریشانی کم ہو چلی تھی، اس تجویز میں امید کی کرن نظر آتی تھی مگر اسے ایک نئے خوف نے گھیر لیا۔

"مگر اب دن نکلنے والا ہے، دھندلکا ہوتے ہی کسان اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔"

اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"روشنی کب ہو گی؟ پانچ بجے کے بعد، ابھی ہمارے پاس ایک گھنٹہ ہے، اگر ہم نے مستعدی کی تو ہم نپٹا سکتے ہیں۔"

اس نے گہری سانس لی۔

"میں خود کو تمہارے حوالے کرتی ہوں، جو کچھ تم کہو گے میں کروں گی۔"

"اچھا تو اٹھو، اور خدا کے لئے دل کو قابو میں رکھو۔"

وہ نے شیر وہ آدمی کا ہیٹ اٹھایا اور وہ اس کمرے میں گئے، جہاں اس کی نعش پڑی ہوئی تھی۔

"تم اس کی ٹانگیں پکڑو۔" وہ بولا۔ "اور میں اس کی کمر پکڑتا ہوں۔"

انہوں نے اُسے اٹھایا۔ اور ہال کمرے میں لے گئے، روڈے نے بڑی مشکل سے اُسے الٹے پاؤں سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ پھر انہوں نے اسکی نعش نیچے رکھ دی،

"کیا تم کار یہاں تک لا سکتی ہو؟" روڈے نے کہا۔

"ہاں مگر یہاں واپس موڑنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے الٹی چلانی پڑے گی۔" غیر یقینی سے بولی۔

"یہ کام میں کر لوں گا۔" وہ بولا۔

وہ جلدی جلدی پیر پسار لینے چل پڑی۔ اسی اثنا میں روڈے مکان کے اندر گیا، سنگ مرمر کے فرش پر خون جما ہوا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ آدمی نے گولی اپنے دل پر ماری تھی۔ اور خون اندر ہی جذب ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ غسل خانے میں گیا اور ایک تولیہ کو پانی میں بھگویا اور اسے فرش پر رگڑا۔ فرش سنگ مرمر کا تھا اور اسے یقین تھا کہ بغیر گہری نظر ڈالے کوئی بھی خون کو محسوس نہ کر سکے گا۔ وہ خون سے بھیگے ہوئے تولیے کو [illegible] گیا۔ میری کار کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔

روڈے نے موٹر کی پچھلی کھڑکی کھولی، اور پھر اس مردہ آدمی کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال دیئے، اس نے اسے اوپر اٹھایا۔ اور میری نے یہ دیکھ کر کہ اسے سخت زور لگانا پڑ رہا ہے۔ اس کے پاؤں اٹھا لئے، انہوں نے نعش کو فرش پر لٹا دی۔ اور روڈے نے تولیہ کو اس کے سینہ کے گرد لپیٹ دیا تاکہ بھیگنے سے پھر خون جاری نہ ہو جائے۔ اس نے اس کے ہیٹ کو اس کے سر پر رکھ دیا۔ روڈے گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے [illegible] الٹی لے گیا۔ اب یہاں گھمانے کے لئے کافی جگہ تھی۔

"کیا میں بھی چلوں؟" وہ بولی۔

"ہاں، دوسری طرف کو بیٹھو۔"

"ہمیں جلد از جلد بڑی سڑک سے گزرنا چاہیئے۔"

"یہاں سے چار پانچ میل دور ایک چھوٹی سی سڑک نکلتی ہے جو ایک پہاڑی [illegible] کی طرف جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سڑک کے بعد ایک جنگل ہے۔"

جب وہ چوڑی سڑک پر پہنچ گئے تو روڈے نے گاڑی تیز کر دی۔

"تم بہت تیز چل رہے ہو۔" میری بولی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے جانِ من۔" وہ ترشی سے بولا۔

"مجھے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

"مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تم سنبھل بیٹھی رہو۔"

اس کے مزاج میں تلخی تھی، اسے خاموش ہونا پڑا۔ چاند چھپ چکا تھا اور رات تاریک ہو چلی تھی۔ میری رفتار کی سوئیاں نہ دیکھ سکی۔ اُس نے اندازہ کر لیا کہ وہ اسی میل فی گھنٹہ سے کم نہیں جا رہے۔ وہ ہاتھ بھینچے ہوئے بیٹھی تھی، وہ بہت زیادہ ڈر رہی تھی۔ مگر اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنے دل میں بڑبڑا رہی تھی۔

"میں نے کتنی بڑی حماقت کی۔"

"اب ہم پانچ میل نکل آئے ہیں۔ کیا وہ موڑ پیچھے تو نہیں چھوٹ گیا۔" وہ بولا۔

"اب ہم جلدی وہاں پہنچنے والے ہیں۔ گاڑی ذرا ہلکی کر لو۔"

وہ چلتے رہے۔ میری اس سڑک کے فکر میں لگ گئی۔ جو اس پہاڑی کی طرف جاتی تھی۔ وہ تین چار مرتبہ اس سڑک پر جا چکی تھی،

"یہ رہی۔" وہ اچانک بولی۔

مگر روڈے اس سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اس نے بریک لگائے۔ وہ گاڑی الٹی چلا کر [illegible]۔ پتلی سڑک پر چڑھ کر وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ وہ مطلق تاریکی میں اس جنگل کو دیکھنے لگے، میری نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور بائیں طرف اشارہ کیا، اس نے گاڑی روکی، سڑک کے ایک طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا بن کھڑا ہوا تھا اور زمین گھاس کی باڑ سے پٹی ہوئی تھی۔ سڑک سے جھاڑیوں کی طرف ایک دم سیدھی ڈھلان تھی۔ اس نے گاڑی کی بتیاں گل کر دیں۔

"میں نیچے جاتا ہوں اور جگہ کا معائنہ کرتا ہوں، میرے خیال میں وہ جگہ ٹھیک رہے گی۔"

وہ نیچے اترا اور جھاڑیوں میں داخل ہو گیا، اس تاریکی میں [illegible] نیچے کیا تھا [illegible] آواز بڑی اونچی اور ڈراؤنی معلوم دیتی تھی۔ [illegible] منٹ بعد وہ پھر واپس آ گیا۔

"میرے خیال میں یہ جگہ بالکل ٹھیک ہے" وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ بھلا کہ وہاں دور دور تک کوئی شخص نہ تھا۔ "اچھا ذرا اسے باہر نکالنے میں میری مدد کرو، اگر میرے بس کا ہوتا تو خود ہی لے جاؤں گا، تم نیچے نہ جا سکو گی۔ تمہاری کھال اور کپڑے سب پھٹ جائیں گے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں" وہ بولی۔

"تم اپنے نوکروں سے کیا کہو گی" وہ بولا۔ "تمہارے کپڑے اور جوتے سب پھٹ جائیں گے، میں تو سب سنبھال لوں گا۔"

وہ گاڑی سے اُتری اور انہوں نے پچھلی کھڑکی کھولی، وہ نعش کو اٹھانے ہی والے تھے کہ انہیں روشنی نظر آئی، یہ ایک کار کی روشنی تھی جو پہاڑی کی طرف سے نیچے آرہی تھی۔

"اُفوہ! اب ہم پکڑے جائیں گے" وہ گھبرائی، "روبے تم بھاگ جاؤ، ورنہ تم خواہ مخواہ پھنس جاؤ گے۔"

"ایسی پاگل باتیں نہ کرو۔"

"میں تمہیں مصیبت میں تنہا نہ چھوڑوں گا۔"

وہ رونے لگی۔

"پاگل نہ بنو! اگر تم نے خود کو قابو میں رکھا تو سب ٹھیک رہے گا، ہم انہیں دھوکا دے سکتے ہیں۔"

"نہیں روبے! اب میری خیر نہیں۔"

"ٹھہرو! تمہیں خود کو سنبھالنا ہو گا۔ چلو گاڑی میں پیچھے بیٹھو۔"

"مگر وہاں تو نعش رکھی ہے۔"

"خاموش رہو۔"

اس نے اُسے اندر دھکیلا، آنے والی کار کی روشنی ایک موڑ کی وجہ سے چھپ گئی تھی، مگر اگلے موڑ پر وہ بالکل سامنے آنیوالی تھی۔

"مجھ سے لپٹ جاؤ۔ وہ ہمیں آشنا سمجھیں گے، جو آوارگی کے لیے ایک تنہا جگہ نکل آئے ہیں۔ مگر بالکل خاموش رہنا۔ بالکل مت بولنا۔"

اب کار سامنے آ چکی تھی۔ دو تین منٹ میں وہ اُن تک پہنچ جاتی، سڑک بہت پتلی تھی۔ اور کار اُن کے بالکل برابر سے گزرے گی۔ بس بالکل اُن کی کار سے رگڑ کر ہی گزرے گی۔ روبے نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے خوب چمٹا لیا۔ اُن کے پاؤں کے نیچے نعش سکڑی ہوئی پڑی تھی۔

"میں تمہارا بوسہ لوں گا۔ تم بھی میرا بوسہ لینا۔ ایسا معلوم ہو جیسے ہم یہاں اسی لئے آئے ہیں۔"

کار اب قریب تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لہراتی ہوئی آ رہی ہے۔ اور پھر انہیں اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی آواز آئی۔ جو خوب اونچی آواز سے گا رہے تھے۔

"واللہ وہ پئے ہوئے معلوم دیتے ہیں، خدا کرے وہ ہمیں دیکھ لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو نشے میں ہم سے ٹکرا جائیں۔ جلدی کرو میرا بوسہ لو۔"

اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے، گویا کہ وہ آنے والی کار سے بالکل غافل ہیں اور اپنے مزہ میں وہ کھوئے ہوئے ہیں۔

گاڑی آدمیوں سے خوب بھری ہوئی تھی اور وہ بہت اونچی آواز سے بول رہے تھے، گویا مردہ بھی جاگ پڑے گا۔ شاید وہ پہاڑوں میں کوئی تقریب ہوگی۔ جہاں انہوں نے خوب شراب پی ہوگی اور اب واپس اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ وہ بیچ سڑک میں آتے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا کہ اُن کی گاڑی ان کی کار سے ٹکرا جائے گی، مگر کیا جا سکتا تھا۔ اچانک اُن سب کی چیخ نکل پڑی، موٹر کی بتیاں کھڑی ہوئی کار پر پڑیں۔ پھر بریکوں کی تیز چنگھاڑ نکلی اور وہ کار آہستہ ہو گئی۔ معلوم ایسا دیتا تھا۔ کہ اس غیر متوقع حادثہ سے ڈرائیور ہوش میں آ گیا تھا اور اب وہ بہت آہستہ چل رہا تھا، اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ کھڑی ہوئی کار کے اندر ایک جوڑا ایک دوسرے سے چمٹا بیٹھا ہے۔ تو وہ سب ایک ساتھ زور سے ہنسے، ایک آدمی نے ایک غلیظ جملہ کہا۔ اور دو تین آدمی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ روبے نے میری کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا کوئی یہ سمجھے کہ وہ محبت کے جوش میں گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہیں۔ ایک دوسرے آدمی نے ایک بازاری گیت شروع کر دیا، اور پھر سب نے اسے دہرانا شروع کر دیا۔ اور سیٹیاں بجانے لگے۔ انہوں نے کار بہت آہستہ سے برابر سے نکالی۔ صرف ایک انچ کا بچاؤ تھا۔

"اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دو" روبے نے اس کے کان میں کہا اور جب اُن کی کار اُن کے برابر سے گذری تو اُس نے خوشی سے اپنا ہاتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شرابیوں کی طرف ہلایا۔ "خوش رہو، شاباش خوب موج کرو" وہ چیخنے لگے، اور پھر انہوں نے وہی بازاری گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر اُن کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔

اس وقت روبے نے اپنے بازو علیحدہ کئے اور پھر میری کار کے کونے میں وحشت زدہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہم نے اس وقت بالکل ٹھیک کیا" وہ لے جاتے ہوئے حیرت کر رہا تھا
کہ کوئی نہیں آئے گا۔ "اچھا اب ہمیں یہ کام جلد ختم کرنا چاہیئے۔"

"کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟ اگر لاش اسی جگہ مل گئی تو........"

"کوئی بات نہیں، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ کوئی دوسری جگہ تلاش کریں۔ آؤ پیچھے چلتے ہیں۔ تمہاری جیسی فیٹ کا [illegible] سینکڑوں میں ہم پر کون شبہ کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کسی نے خودکشی کی ہے۔ گاڑی سے نیچے اترو۔"

"مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں کھڑی بھی ہو سکوں۔"

"مگر تمہیں اسے نکالنے میں میری مدد کرنی ہوگی، اس کے بعد تم پھر بیٹھ جانا۔"

وہ باہر نکلا اور اسے بھی کھینچا۔ معاً فٹ پاتھ پر پہنچ کر وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔ اس نے اس کا بازو پکڑا۔ اور ایک زور دار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ اتنی گھبرائی کہ ایک دم اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور رونا بند کر دیا۔ اس کے منہ سے آہ تک بھی نہ نکلی۔

"اب میری مدد کرو۔"

بغیر ایک لفظ کہے انہوں نے لاش کو باہر نکالا۔ [illegible] بغلوں کے نیچے سے پکڑا ہوا تھا۔

"اب اس کی ٹانگیں میرے دوسرے بازو پر رکھ دو۔ اس میں بہت [illegible] اچھا ان جھاڑیوں کو ایک طرف کرو تاکہ میں آسانی سے گزر سکوں۔"

اس نے وہی کیا جو کہا گیا تھا۔ اور پھر وہ یکدم گہرائی میں [illegible] اس کے گرنے سے اتنے زور کی آواز نکلی جس نے تمام فضا کو چونکا دیا۔ جتنی دیر وہ نظروں سے غائب رہا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت لامحدود ہو گیا ہے۔ آخر اس نے اسے اوپر آتے ہوئے دیکھا۔

"میں نے سوچا تھا جس راستے سے میں گیا ہوں اس سے واپس نہ لوٹوں گا۔"

"سب ٹھیک ہو گیا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے۔ خدا کی قسم میرا سانس تنگ گیا تھا۔ [illegible] تھا۔"

[illegible]

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہاں کار نہیں رکھ سکوں گا۔ اس کے علاوہ ہم [illegible] نہیں چھوڑ سکتے جس سے یہ معلوم ہو کہ ایک کار یہاں تک آئی تھی واپس ہو گئی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کوئی ایسی سڑک ہے جس سے گزر کر ہم پہلی سڑک پر پہنچ جائیں؟"

"میرا خیال ہے صرف یہی ایک سڑک ہے، یہ سڑک [illegible] میں جا کر ختم ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

"تم اسے ابھی تک کار میں لیے جا رہے ہو؟"

"میں اسے ساتھ لیتا جاؤں گا کہیں اور پھینک دوں گا۔"

"مگر اس پر [illegible] کا نام لکھا ہے؟"

"تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ میں اس میں ایک بھاری پتھر باندھ کر دریا میں پھینک دوں گا۔"

ایک دو میل کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک کچھ زیادہ چوڑی تھی۔ اور گاڑی بآسانی گھمائی جا سکتی تھی۔ [illegible] ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔

"ارے وہ چھوٹا پستول تو......"

"کیا؟ وہ تو میرے کمرے میں ہی رہ گیا ہے۔"

"اگر لوگوں نے اسے بغیر پستول کے دیکھا تو طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں پستول اس کے برابر میں رکھنا چاہیئے تھا۔"

"اب کیا کیا جائے؟" وہ بولی

"خدا کا شکر کرو کہ وہ ابھی تک ہمارے پاس ہی ہے۔ اگر لاش بغیر پستول کے ملی تو پولیس سوچے گی کہ کوئی آدمی یہاں آیا اور پستول اٹھا کر چلتا بنا۔"

وہ جتنی تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے واپس چل دیئے۔ کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف رات کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھ لیتا۔ ابھی رات باقی تھی، مگر تاریکی اب زیادہ نہ رہی تھی۔ ابھی دن نہ نکلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن نکلنے ہی والا ہے [illegible] بہت سویرے [illegible] تھے۔ اور [illegible] آخر وہ اس پہاڑی کے [illegible] واقع تھا [illegible] ہونے ہی والی تھی۔

"اچھا اب تم موڑ جاؤ، میں نے سائیکل یہیں چھوڑنی تھی۔"
اُس نے اُسکی بے جان مسکراہٹ دیکھی، وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، اُس نے اس کے کندھے کو تھپکا۔

"بس سب ٹھیک ہے۔ گھبراؤ مت، اور دیکھو دودھ پی کر اور گولیاں کھا لینا۔ جاگنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، گہری نیند کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اب میں کبھی نہ سو سکوں گی۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خواب آور گولیاں کھا لینا۔ میں دن میں کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔"

"میں تمام دن گھر پر ہی رہوں گی۔ اور اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں ایسا نہ کہنا چاہیئے، تمہیں ایسا ظاہر کرنا چاہیئے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی، یہ ایک معمولی بات ہے۔ فرض کرو کسی نے تم پر شک کیا تو تم اپنے رویے سے بالکل اس کا اظہار نہ کرنا۔ سمجھیں؟"

"ٹھیک ہے۔"

میری اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھ گئی اور روفے کو سائیکل اٹھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب وہ چلا گیا تو وہ بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے کار گیراج میں کھڑی کی جو دروازہ کے پاس بنا ہوا تھا، اور پچھلی [illegible] سے گھر کی طرف چلی۔ وہ اپنے کمرہ میں پہنچی اور ایک لمحہ کے لئے جھجکی۔ اُسے توہمات نے گھیر رکھا تھا، کہ دروازہ کھولتے ہی [illegible] اُسکی [illegible] پڑے گا، پھر بھی وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک انجانا سا خوف اس پر برابر طاری تھا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ اور جلدی سے بجلی روشن کی۔ اور جب دیکھا کہ کمرہ خالی ہے تو اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے مسہری کے پہلو میں رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھا، ایک بجنے [illegible] تھے۔ اس تھوڑے سے وقفہ میں کیسے خوفناک واقعات گزر چکے تھے۔ چند گھنٹے کی زندگی [illegible] دنیا کی [illegible] سے [illegible] چیز دے سکتی تھی [illegible] جیسی [illegible] ہو سکتی [illegible] پر پہنچ گئے۔ وہ [illegible] کی طرح تھکی ہوئی تھی اور اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اسے [illegible] ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تو اس نے آہستہ آہستہ کپڑے بدلنے شروع کر دیئے۔

وہ اس بستر پر لیٹنا نہ چاہتی تھی مگر اس کے علاوہ دوسرا حل نہ تھا۔ اُسے اس بنگلہ میں ابھی کئی دن اور ٹھہرنا تھا۔ روفے نے اُسے بتایا تھا کہ یہاں سے جانا کب مناسب رہے گا۔ اگر وہ ایڈگر اور اپنی منگنی کا اعلان کر دے گی تو اس پر کسی کو شک نہ ہوگا کہ وہ مقررہ [illegible] طے شدہ پروگرام سے زیادہ کیوں ٹھہر سکی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ہندوستان کب روانہ ہوگا۔ مگر غالباً جلد ہی جائے گا۔ وہاں پہنچ کر وہ بالکل محفوظ ہو جائے گی۔

جوں ہی بستر پر وہ لیٹ رہی تھی، اُسے وہ برتن یاد آ گئے جو روفے نے باورچی خانہ میں رکھ دیئے تھے۔ اس کے کہنے کے باوجود اس کا جی نہ مانا، اور وہ خود جا کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔ اگر کسی نوکر نے اُسے دیکھ لیا تو وہ کہہ دے گی کہ اُسکی آنکھ بھوک سے کھل گئی اور وہ کچھ کھانے کے لئے یہاں چلی آئی۔ اُس نے اپنا گاؤن پہنا اور ڈریسنگ روم سے ہو کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔ سارا گھر خاموشی اور [illegible] معلوم ہو رہا تھا اور باورچی خانہ کسی غار کی طرح عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے گوشت کو میز پر رکھا ہوا دیکھا اور اُسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ اس نے [illegible] کے [illegible] ٹب میں پھینک دیئے۔ اور وہ پلیٹیں اور گلاس جن میں اس نے اور اس مردہ آدمی نے کھایا پیا تھا۔ دھو کر صاف کئے اور انہیں پہلے والی جگہ پر رکھ دیا۔ [illegible] کر اسکی [illegible] پھینک دیا۔ اب وہاں کوئی ایسی علامت نہ تھی جو کسی قسم کا شک پیدا کرتی۔ اس نے خواب آور [illegible] کھائی اور واپس اپنی خوابگاہ میں آ گئی [illegible] گولیوں نے اسکی امید کے خلاف کوئی جلد اثر نہ کیا۔ [illegible] ایسا لگا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں کھو گئی۔

جب میری کی آنکھ کھلی تو اس نے نینا کو ہاتھ میں [illegible] لئے ہوئے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے غنودگی کی حالت میں پوچھا۔

"سرکار آپ بہت دیر تک سوتی رہیں۔ سرکار کو ایک بجے لنچ پر جانا تھا اور اب بارہ بج رہے ہیں۔"

[illegible]

اپنے حواس درست کئے۔
"جب تم نے مجھے جگایا تو میں پھر سو نہ سکی۔ اور باقی رات جاگ
کر گزارنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی خواب آور گولیاں نکال لیں"
"حضور مجھے افسوس ہے، جو میں نے آپ کو جگایا۔ مگر میں نے
کچھ آواز سنی تھی اور مناسب سمجھا کہ حضور کی خیریت دریافت کر لوں"
"کیسی قسم کی آواز؟"
"گولی چلنے کی سی۔ مجھے اس پستول کا خیال آگیا جو سرکار نے آپ
کو پیش کیا تھا، اور مجھے خوف سا لگا"
"یہ کسی کار کی آواز ہوگی۔ رات میں دور کی آواز بھی پاس کی معلوم
دیتی ہے۔ مجھے ایک پیالی چائے لا دو۔ مجھے نہانا بھی ہوگا اور جلد جانا ہوگا"
جونہی نینا کمرے سے باہر گئی میری لپک کر اس الماری کے پاس
پہنچی جہاں اس نے پستول رکھ دیا تھا، ایک لمحہ کے لئے اسے شک تھا
کہ شاید نینا نے پستول نہ دیکھ لیا ہو اور اسے کہیں اور رکھ دیا ہو۔
اس کا چہرہ سپرو نہ بتا سکتا کہ ایک کارتوس چل چکا ہے اور کوئی
اس سے پہلے کچھ سوچنے لگی، وہ پھر گنتی کر دینے اس نے کیسے لگا
کیا تھا کہ وہ لنچ پارٹی میں ضرور جائے۔ وہ خود کو اس کا بہت شکر گزار
محسوس کرنے لگی، وہ کس قدر مطمئن تھا، اس نے کس قدر اطمینان سے
یہ کام سرانجام دیا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس اوباش آدمی میں ایسی
صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جب وقت ضرورت پڑی تو اس کے برابر کوئی نہ تھا اگر
اس وقت وہ حاضر دماغی کا ثبوت نہ دیتا تو کیا حشر ہوتا۔ اس نے ایک
آہ بھری۔ شاید وہ سوسائٹی کا ایک بدنام آدمی ہے۔ مگر وہ ایک سچا
دوست ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔
جب میری نہانے کے بعد غسل کر کے سنگار میز کے سامنے
بال بنانے لگی تو اس نے خود کو مطمئن محسوس کیا۔ یہ عجیب سی بات محسوس
ہوتی تھی کہ رات کے واقعات گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی
واقع نہ ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ان تمام خطرات اور مصیبتوں کی کوئی
علامت نہ تھی۔ وہ خود کو بالکل چاق و چوبند محسوس کر رہی تھی۔ اس کی
ارغوانی رنگ کی جلد پر کسی تھکاوٹ کے آثار باقی نہ رہے تھے۔ اس کے
بال چمکدار اور آنکھیں روشن تھیں۔ اس نے خود کو ایک عجیب کیفیت میں
گھرا ہوا پایا۔ وہ اس پارٹی کے متعلق سوچ رہی تھی جہاں اسے مشرقی
طرز کی ضیافت دیا جانا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے

لنچ کے بعد لوگ یہ کہتے پھریں۔ جو جائیں تو آج میری بہت دلچسپی
کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ مدت سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ بھی پارٹی
میں آئے گا یا نہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی وہاں ملے گا۔ اس کی وجہ
سے اس میں اعتماد اور زیادہ آ جائے گا۔
اب وہ جانے کے لئے تیار تھی، اس نے آئینہ میں اپنے اوپر
ایک آخری نظر ڈالی۔ نینا نے اسے پسندیدہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا
"سرکار آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہیں"
"نینا تمہیں میرے نفس کو اتنا نہ بڑھانا چاہیے"
"مگر سرکار میں سچ کہہ رہی ہوں، میٹھی نیند نے آپ کو بہت
آرام دیا ہے۔ آپ تو لڑکی معلوم دیتی ہیں"
جن لوگوں کے پاس میری کو لنچ پارٹی میں جانا تھا وہ ایک امریکی
جوڑا تھا۔ جو پچھلے بیس سال سے اٹلی میں مقیم تھا۔ ان کا بنگلہ بھی بہت
حسین تھا اور اس میں بھی دیواروں پر اعلیٰ تصاویر بنی ہوئی تھیں اس
میں بہت قیمتی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ یہ امریکی جوڑا بہت متواضع اور ملنسار
تھا اور دونوں میاں بیوی اکثر پارٹیاں دیتے رہتے تھے۔ جب میری
کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا تو بہت سے مہمان پیشتر سے پہنچ چکے تھے
دو ملازم باہر کھڑے ہوئے مہمانوں کو کاک ٹیل پیش کر رہے تھے عورتیں
پیرس کے سلے ہوئے قیمتی لباسوں میں خوبصورت نظر آ رہی تھیں اور
مرد اپنے ٹھنڈے سوٹوں میں ملبوس عورتوں کے ساتھ خوش گپیوں میں
مصروف تھے۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے باہر
باغیچہ میں بڑے بڑے مجسمے اور پھولوں سے بھرے گملے عجیب منظر پیش
کر رہے تھے، جون کی اس گرم دوپہر میں ہر شخص کے اندر ایسی ٹھنڈک
کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو طرح طرح کی خوش گپیوں اور لطیفوں کو دعوت دیتی
تھی۔ وہاں پہنچ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہر آدمی فارغ البال ہے۔ اور زندگی
کا مقصد ہی خوش رہنا ہے۔ یہاں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل
تھا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔
میری جب کمرہ میں داخل ہوئی تھی تو اسے وہاں کے ماحول کا کچھ
طرح اندازہ تھا۔ مگر اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا، جیسے کوئی کشتی چھوڑنے
کے بعد چلچلاتی دھوپ میں پہنچ جائے۔ وہ غریب لڑکا ابھی تک جیل خانہ
میں مرا پڑا ہوگا، معاً اس کی نظر ردے پر پڑی جو کمرہ میں دو منزلہ صوفے پر
بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اس کی نصیحت یاد آ گئی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کا میزبان ایک ادھیڑ عمر کا امریکی تھا۔ جسے خوبصورت عورتوں سے بات چیت کرنے میں مزا آتا تھا اور وہ میرو سے چند لمحے گفتگو کر چکا تھا۔

وہ ابھی تک اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور اتنے میں روحے آ گیا۔

"میں اس لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ وہ تصویر سے بھی زیادہ حسین ہے" امریکی میزبان نے روحے کی طرف مڑ کر کہا۔

"درست تم اس پر اپنا وقت فضول خراب کر رہے ہو" روحے طویل مسکراہٹ کے بعد بولا "تم کسی تصویر کی ہی تعریف کرو"

"کیا تم اس کے گرویدہ ہو گئے ہو؟"

"بے شک"

"بات یہ ہے جناب والا" اس نے میزبان کو خطاب کر کے کہا۔ "مجھے لڑکے بالکل پسند نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ پچاس سال کی عمر تک آدمی بھی لڑکیوں سے میل جول رکھنے کے ٹھیک نہیں"

"ہمیں کسی وقت مل جل کر اس مسئلہ کو حل کرنا پڑے گا" میزبان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمارے خیالات بہت حد تک مشترک ہیں"

پھر وہ ایک دوسرے مہمان کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھا۔

"تم پر تو آج غضب کا رنگ آیا ہوا ہے" روحے نے دھیمی آواز میں کہا۔

اسکی پسندیدہ نظروں نے اسکی ہمت بڑھائی۔ مگر پھر بھی اس نے اسکی طرف کچھ خوفزدہ ہو کر دیکھا۔

"بالکل مت گھبراؤ۔ خود کو ایک ایسی اداکارہ سمجھو جسے ایک پارٹ ادا کرنا ہے"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اداکاری کا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اگر تم محبت ہو تو ضرور اداکاری کر سکتی ہو"

اور یہ سچ تھی، اس نے اس شام [illegible] ہو گئی۔ ایک طرف اس کا میزبان بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور اس کے بائیں طرف [illegible] بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہ آرٹ کے متعلق [illegible] باتیں کر رہی [illegible] زیادہ [illegible] میں [illegible] لگ رہے [illegible] سال [illegible] میں اسکی میزبان [illegible] امریکی میزبان کے [illegible] اسکی [illegible] سے [illegible] خوبصورت [illegible] جھک کر

میرو سے مخاطب ہوئی۔

"میں آپ سے ملنے کا شکر کر رہی تھی" اس نے امریکی میزبان کو خطاب کیا۔ "میں نے کچھ دوستوں کو ایک شخص کا گانا سننے کے لئے ریسٹوران میں دعوت دی تھی مگر وہ بیمار تھا"

"میں نے اسکا گانا سنا ہے۔ میری بیوی اس کے گانے کو بہت پسند کرتی ہے" امریکی میزبان بولا۔

"بیچارے اس کے انہوں نے ایک وائلن بجانے والے کو جدا کر دیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک جرمن مہاجر ہے اور صرف اسکی امداد کے لئے انہوں نے اسے وائلن بجانے کا موقع دیا تھا۔ اب وہ اسے ریسٹوران میں کام نہ دیں گے۔ میرا یقین ہے کہ وہ اسے [illegible] وائلن بجانا تو آتا ہی نہیں"

"واقعی وہ اچھی وائلن نہ بجاتا تھا" میرو بولی۔

"میں نے سوچا کہ اس کی امداد دوسروں کو بھی ایسی قدر تو محسوس ہوتی ہے جیسے خود اس کو ہوتی ہے"

"یہ کہنا تو کم ہے" وہ بولی۔ "اگر میں اسکی طرح وائلن بجاتی تو اپنے کو گولی مار لیتی"

میرو نے سوچا وہ کچھ بولے۔ اس نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"ایسے پریشان حال لوگوں کو کام دینا بہت مشکل ہے"

"آہ یہ چائے" امریکی میزبان بولا۔ "یہاں کا [illegible] تھا"

"ہاں یہ بھی [illegible]" [illegible] نے جواب دیا۔

"اس کا سر کتنا عجیب ہے؟ دیکھو؟"

"میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا" وہ بولی۔ "میرا خیال ہے وہ اپنے کپڑوں میں عجیب سا لگ رہا تھا"

"مجھے خبر [illegible] ہے۔ [illegible]"

[illegible]

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ میری سخت گھبرا گئی تھی، وہ ایک موضوع کے بعد دوسرے موضوع پر گفتگو کرتی رہی مگر تمام وقت اس کے ذہن کے پیچھے [illegible] میں رات کا ایک [illegible] آخر میں جب وہ وہاں سے چلنے لگی تو اس نے ضیافت کا شکریہ ادا کیا۔

"شکریہ! دعوت بہت ہی کامیاب رہی، مجھے یاد نہیں پڑتا اس سے زیادہ مجھے کسی اور دعوت میں کبھی مزہ آیا ہو۔"

میزبان کی بیوی نے اس کا ہاتھ زور سے دبا لیا۔

"شکریہ آپ کی عزت افزائی کا۔ جس پارٹی میں آپ جیسی حسین عورتیں ہوں گی وہ یقیناً کامیاب رہے گی۔ میرا شوہر فنکار قسم کا آدمی ہے آپ کسی بات کا خیال نہ کیجئے گا۔"

"نہیں وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے۔"

"میں یہ سمجھتی ہوں کہ تم ہم سے جلد جدا ہونے والی ہو؟"

اس کے لہجے سے میری کو اندازہ ہوا کہ اس کا مطلب ڈیگ سے ہے شاید شہزادی نے اسے کچھ بتا دیا ہے۔

"کون جانے؟"

"میرا خیال ہے جو کچھ میں نے سنا ہے وہ صحیح ہے، میں تمہاری کو خوب پہچانتی ہوں۔ تم ایک نیک اور خوبصورت عورت ہو، خدا تمہیں خوش رکھے گا۔"

میری نے اپنی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل ضبط کیا۔ اس کے چہرے پر ایک مایوس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ فوراً رخصت ہو گئی۔

— ۷ —

جب وہ گھر پہنچی تو ایک نوکر جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کل واپس پہنچ کر رہا ہے — بیگم!"

باغیچہ میں ایک اور چھوٹا سا گھر تھا۔ مسز میری اسے بھی بہت عزیز رکھتی تھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

گرم سرد تھی۔ میری کو یہاں بیت کی لمبی کرسی پر بیٹھ کر بڑا سکون حاصل ہوتا تھا، تنہائی کا حاصل ہونا بڑا اطمینان بخش تھا۔ اب وہ اپنے پسندیدہ خیالات میں غرق ہو سکتی تھی، تھوڑی دیر کے بعد نینا اس کے لئے چائے لے آئی۔ میری نے اسے بتایا کہ وہ نے آنے والا ہے۔

"جب وہ آ جائے تو کچھ بسکٹ، سوڈا اور وسکی دے جانا۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

نینا ایک نوجوان عورت تھی جسے باتیں کرنے کا شوق تھا اور میری کو ایک نئی خبر سنانا چاہتی تھی۔

"حضور، باورچی کہہ رہا تھا کہ اس کے رشتہ دار نے ایک جاہر کو ایک جھونپڑی کرائے پر دے رکھی تھی مگر وہ کل سے غائب ہے۔ وہ بے چارے غریب لوگ ہیں اتنا بڑا نقصان کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے پاس سوائے جسم کے کپڑوں کے اور کوئی سامان نہ تھا جو کچھ تھوڑا بہت سامان ہے بھی تو وہ پانچ روپے سے زیادہ کا نہ ہوگا، انہوں نے تین ہفتے سے اس سے کرایہ نہ مانگا تھا کیونکہ اس کی حالت سقیم تھی۔ مگر اب وہ روپیہ لے کر بھاگ گیا ہے نا اوچھی بات، مگر انہیں عقل آ گئی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بھلائی کرنے سے سرتا نقصان ہوتا ہے۔"

"وہ کب بھاگا؟" میری نے پوچھا۔

"وہ کل رات ایک ریسٹوران میں جو ولسن بیان نے کیا تھا، [illegible] میں جہاں رات سرکار کی دعوت تھی، نہ گیا تھا کہ وہاں سے پیچھے [illegible] گئے اور دو گھر دینا تھا کر دے گا، مگر وہ واپس نہ آیا۔ انہوں نے ریسٹوران جا کر معلوم بھی کیا۔ مگر وہاں کچھ پتہ نہ چلا، ریسٹوران والوں نے بتایا کہ اسے کام سے ہٹا دیا گیا ہے، اگر اس کے پاس سوائے کافی روپے تھے۔ صرف ایک [illegible] نے [illegible] سو روپے کا نوٹ دیا تھا۔"

میری نے اس کی بات کاٹی اور کچھ اور سننا چاہتی تھی۔

"باورچی سے پوچھو اس پر جو کتنے روپے چڑھے ہوئے تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی غریب آدمی کو اس طرح ستایا جائے۔ سارا کرایہ میں ادا کروں گی۔"

"حضور آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ لوگ بہت [illegible] ہیں اور وہ کی نا بھی ان کے ذمہ [illegible] کھاتا تھا اور [illegible]

"کتنی حماقت ہے! میں جنگ کی بہت بھاری قیمت ادا کر چکا ہوں۔"

"تمہیں معاوضہ مل جائے گا۔ اچھا اب تم جا سکتی ہو۔"

یہ دن میں دوسرا موقع تھا کہ اسے مردہ آدمی کا تذکرہ سننا پڑا تھا۔ میری پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں پریشان حال آدمی کی زندگی میں کوئی پیدا ہو کر رہا تھا۔ اب ہر شخص اسی کی فکر میں لگ گیا ہے۔ مگر وہ مرنے کے بعد ہر آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے۔ اسے شہزادی کا ایک عہد یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ چونکہ اس کا کام اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب وہ اسے تلاش کرے گی اور اس کی کچھ مدد کرے گی۔ اس وہ ایک خوبصورت تھی۔ اگر وہ اسے نہ پا سکی تو زمین آسمان کا کونہ کونہ چھان مارے گی۔ "مجھے یہاں سے چل دینا چاہیے، مجھے بہت خوف معلوم ہوتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

کاش وہ لے جلد۔ آ جلدی۔ اس وقت وہی اس کا واحد سہارا تھا۔ ایک کا تار اس کے پرس میں تھا۔ اس نے اسے نکالا اور ایک مرتبہ اور پڑھا۔ بس بچانے کی یہی ایک صورت تھی۔ وہ ہولناک سے سوچنے لگی۔ بالآخر اس نے اپنا نام پکارتے ہوئے سنا۔

"میری!"

یہ روے کی آواز تھی۔ وہ ہال کے دوسری طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور نہایت اطمینان سے آ رہا تھا۔ اسکی اس بے نیازانہ چال میں کوئی آدمی بھی اسے ایک بناوٹی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس چال سے میری بہت متاثر ہوئی۔ وہ فرشتے سے زیادہ معصوم تھا۔

"نینا نے مجھے بتایا کہ تم یہاں بیٹھی ہوئی ہو۔ وہ کچھ مشکوک سی ہے اور میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا۔ خدا کی قسم تمہارے بنگلے کی بلندی پر چڑھ کر تمہیں دیکھا ہے۔" اس نے اسکی طرف غور سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی ہو؟"

"خدا شبو! نینا آ کر چلی جائے۔"

وہ بیٹھ گیا اور ایک سگریٹ سلگا لی۔ جب نینا آئی تو اس نے اس سے مخاطب کہا۔

"نینا تمہارا شوہر کہتا ہے کہ ہر طالوی عورت کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے تم اس فرض میں کوتاہی کر رہی ہو۔"

"میرے یہاں آ کر کل تو اپنا پیٹ پالنا ہی مشکل ہے۔ تو میں دو بچوں کو کون کھلا سکتا ہے؟"

جب وہ چلی گئی تو وہ میری کی طرف مخاطب ہوا۔

"اب کہو کیا بات ہے؟"

اس نے اسے عمر رسیدہ والی بات بتائی جو شہزادی نے اس لڑکے کے متعلق کہی تھی، اور جو کچھ نینا نے انہیں کہا تھا وہ بھی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"مگر میری جان ان ساری باتوں میں کوئی بات بھی تشویشناک نہیں ہے۔ تم بہت نکتی صورت ہو، ہمیں لوگ یہی سوچیں گے کہ اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ اس پر مالک مکان کا قرض تھا اور اس نے ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا مگر اس کے پاس روپے نہ تھے۔ اگر اسکی نعش مل بھی گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے گولی مار لی اور اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں۔"

جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ یقیناً معقول لگتا تھا۔ میری نے مسکرا کر ایک آہ بھری۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ بے شک مجھے وہم ہو گیا ہے۔ مگر میں تمہاری بغیر مصیبت گھبرائی ہوئی ہوں۔"

"میں نہیں سمجھ سکتا کیوں؟"

"اگر ہم بات پکڑے جاتے تو پتہ نہیں کیا کیا حشر ہوتا!"

"جو کچھ بھی مصیبت آتی خیر مقدم کرتے۔"

میری نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہم جیل میں نہ جاتے؟"

اس نے اسکی طرف طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

"اگر نوبت یہاں تک پہنچتی تو جاسوس پہلے یہ معلوم کرتے کہ ایک نعش کو رات کی تاریکی میں لے جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ہم انہیں کیسے یقین دلاتے کہ اس نے خودکشی کی ہے اور ہم میں سے کسی ایک نے ضرور گولی ماری ہے۔"

"تم کیوں مارتے؟"

"پولیس خیال کرتی کہ اس کی نیت خراب تھی کہ وہ چیخ اٹھی ہم دونوں رشتہ داروں سے ملنے ساتھ گئے تھے مگر ہم نے چیخ ہی کی تھی کہ مکان کے سامنے میں کیا ہے یہ کام ہوں گا، تم مجھے میں ...

بصورت جوان ہیں ہم کچھ ثابت کر سکتے تھے کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔ ہوسکتا تھا کہ میں نے اُسے تمہارے کمرے میں دیکھا ہو اور رقابت کی وجہ سے ہلاک کر دیا ہو۔ اُس نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ لیا ہو اور میں نے اُسے تمہاری عزت بچانے کی خاطر مار دیا ہو، آخر دنیا میں ایسے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"تم نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔"

"اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں بات اتنی پریشان کن تھی کہ تمہارا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ مگر میں تمہاری بڑی احسان مند ہوں۔ ... تم نے میرے ساتھ بہت بڑی ہمدردی کی ہے۔ اگر تم میری مدد نہ کرتے تو شاید میں خودکشی کر لیتی۔ اپنے نہیں بتیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ جو تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لے لیا۔"

اُس نے ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر شفقت آمیز انداز میں مسکرا دیا۔

"میری جان میں کسی آدمی کے لئے بھی ایسا کر سکتا تھا اگر کوئی لڑکی ہوتا تو اس کی مدد میں ایسے وقت ضرور مدد کرتا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے خطرات پسند ہیں۔ دراصل میں قانون کی پابندی زیادہ نہیں کرتا۔ اور مجھے ایسے کاموں میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ پیرس میں میں نے تاش کھیلتے ہوئے دس ہزار روپے داؤ پر لگا دیئے تھے۔ مجھے اس میں بڑا مزا آیا تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اچھا وہ پستول کہاں ہے؟"

"وہ میرے پرس میں ہے۔ میں اُسے گھر میں نہ چھوڑ سکی۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ مینا کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

اُس نے اپنا ہاتھ اُسکی طرف بڑھا دیا۔

"ذرا اپنا پرس مجھے دینا۔"

اسکی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ایسے کیوں مانگ رہا ہے۔ مگر.... پرس اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اُسے کھولا۔ پستول نکالا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"آپ کیوں رکھ رہے ہیں؟"

وہ تبسم سے کرسی پر لیٹ گیا۔

"مجھے خیال ہے کہ شاید پولیس کو اسکی لاش کا پتہ چل جائے گا۔ میں اس کے متعلق [illegible] سمجھتا ہوں۔ [illegible]

کہ پستول بھی اُس کے پاس ہی پڑا ہوا ملے گا۔"

میری کے لبوں پر ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

"تو کیا تم پھر اُس جگہ جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں۔ شام بہت خوشگوار ہے اور میرا دل بھی کو چاہتا ہے۔ میں نے ایک سائیکل کرایہ پر لے لی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں اس سڑک پر سیر کو نہ جاؤں اور وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہوں۔"

"کوئی آدمی تمہیں جنگل میں گھستے دیکھ لے تو؟"

"میں یقیناً ضروری احتیاط برتوں گا اور اندر جانے سے پہلے چاروں طرف دیکھ لوں گا۔"

وہ چلنے لگا۔

"تو کیا تم ابھی جاؤ گے؟"

"ہاں یہی سوچ رہا ہوں۔ دراصل وہ جنگل اتنا گھنا نہیں ہے۔ میں نے تمہیں رات یہ بات نہ بتائی تھی کیونکہ تم اور زیادہ فکر مند ہو جاتیں۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے اسکی لاش جلد مل جائیگی۔"

"تمہاری واپسی تک میں سخت پریشان رہوں گی۔"

"بہتر" وہ مسکرایا۔ "میں واپسی میں تم سے ملتا ہوا جاؤں گا۔ اور تم کچھ پینے کا بھی انتظام کر لینا۔"

اور وہ بولے:

"درست، انسان فطرتاً خطرات کو پسند کرتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ چلا گیا۔ اس کا انتظار کرنا سخت مشکل کام تھا۔ وہ پھر اُن ہی مصائب سے گزر رہی تھی۔ جو رات اُس پر گزر چکے تھے۔ اس کو اس اقدام سے باز رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کام کو ایک تفریح کے طور پر کر رہا تھا اور جیسے وہ مذاق اپنا سر شیر کے منہ میں دیئے جا رہا تھا۔ اُسے خطروں کا مقابلہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اُسے اس پر سخت غصہ آنے لگا۔ اُسے ایسی احمقانہ حرکت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اُسے ہر حالت میں اُسکو روکنا چاہیئے تھا۔ مگر وقتی طور پر اُسکی سمجھ میں نہ آیا کہ خطرہ اتنا اہم نہ معلوم ہوا۔ جتنا کہ اُس کے جانے کے بعد معلوم ہوا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب اُس نے ایک کام کا ارادہ کر لیا تو اس سے اُسے باز رکھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ کون جانتا تھا کہ کتنے سیکڑوں آدمیوں کے اندر ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔

"درحقیقت وہ ماریس کس حد تک بگڑ چکا ہے؟" اس نے خود سے کہا

بالآخر وہ واپس آگیا، وہ اس کی طرف مڑ رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اور وہسکی اور سوڈا پینے لگا۔

"کام بہت اطمینان سے ہو گیا۔ وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہ مار رہا تھا۔ تم جانتی ہو کبھی کبھی مجرم کو ایسے مواقع ملتے ہیں جو اس کے کام میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لاش کے پاس آکر کچھ پانی بہہ رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہاں کہیں قریب ہی کوئی چشمہ ہے۔ اسی لئے تو ساری زمین میں اتنی نمی تھی۔ میں نے پستول نعش کے قریب پانی میں پھینک دیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس میں زنگ لگ جائے گا۔"

وہ اس نعش کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی مگر الفاظ اس کی زبان پر نہ آسکے۔ کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اور تھکے تھکے انداز میں سگریٹ اور ٹھنڈی شراب پیتا رہا۔

"میں تمہیں رات کا واقعہ حرف بہ حرف سنانا چاہتی ہوں" وہ بولی۔

"تمہیں اس کی ضرورت نہیں، میں اہم واقعات کو خود محسوس کر سکتا ہوں اور جزئیات کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔"

"مگر میں تو چاہتی ہوں، میں تمہیں اپنی شخصیت کے بدترین پہلو سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔ مجھے درحقیقت اس کا علم نہیں۔ اس بیچارے نے خودکشی کیوں کی۔ مجھے اس کے عبرتناک انجام پر سخت ذہنی صدمہ ہے۔"

وہ بغیر کچھ بولے سنتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خاموشی تھی۔ اس نے اسکو شروع سے لے کر آخر تک حرف بہ حرف پورا قصہ [illegible] کے ملنے سے لے کر اس کے گولی مار لینے تک سنا دیا، کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی تھیں، مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی بات چھپائی تو وہ ضرور ان آنکھوں کو جو اس کی طرف خندہ ناک رہتی ہیں فوراً تاڑ جائیں گی۔ ان خطرناک واقعات کو [illegible] سنانے سے اس کا جی بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ جب [illegible] کہہ چکی تو وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ [illegible] سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بناتا رہا۔

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس نے خودکشی کیوں کی۔ بالآخر وہ [illegible] خاندانی [illegible] کا [illegible] بیچ [illegible] اسے آئندہ زندگی سے کوئی امید وابستہ نہ تھی۔ اور پھر اس کی تم سے ملاقات ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی حسین عورت نہ دیکھی ہوگی تم نے اسے ایسی چیز دی جو وہ خواب میں بھی نہ پا سکتا تھا۔ اس کے لئے تمہاری محبت ملتے ہی ساری دنیا بدل گئی۔ وہ سمجھ بیٹھا کہ جیسے جاگ گیا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اسے محبت کا دخل نہ تھا تم نے بتایا کہ اس کے پیچھے صرف رحم تھا۔ میرے خیال میں لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ اور [illegible] خاص طور پر کیا تم اسے نہیں سمجھتیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے تم کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ مگر تم نے اسے ستاروں میں پہنچا کر غار میں دھکیل دیا۔ وہ ایک ایسے قیدی کی طرح تھا۔ جسے جیل دروازے تک لائے۔ اور جب وہ باہر نکلنے لگے تو دروازہ ایک دم بند کر دے۔ اسے یہ طے کرنے کے لئے کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں، یہ سب کافی تھا۔"

"اگر یہ صحیح ہے تو میں خود کو کبھی معاف نہ کروں گی۔"

"میرا خیال ہے یہ صحیح ہی ہے مگر میں نہیں کہتا۔ کہ صرف یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وہ اپنی پچھلی زندگی میں بھی غیر متوازن تھا۔ غالباً وہ پوری طرح صحیح الدماغ بھی نہ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہو، ہو سکتا ہے کچھ لمحوں کی انمول مسرت کے بعد اس نے مزید ایک دن بھی زندہ رہنا بے کار سمجھا ہو۔ ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کبھی ہماری زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب ہم عمر بھر کی تکمیل کے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو پھر ہم اپنے آپ سے کہتے ہیں خدایا کاش ہم بھی مر جاتے۔ قسمت سے وہی لمحے میسر آ گئے تھے۔ اور اس نے بھی یہی سوچا ہوگا اور پھر وہ مر گیا ہوگا۔"

میری نے رولے کو حیرت سے دیکھا۔ کیا یہ وہی آدمی [illegible] زندہ دل انسان ہے۔ جو ایسی اچھی باتیں کر رہا ہے۔ اس وقت کا رولے اس رولے سے مختلف تھا۔ جسے وہ اب تک جانتی تھی۔

"تم یہ باتیں کیسے کہہ رہے ہو؟"

"مجھے تو اس وجہ سے کہ تم اس حادثہ کو ضرورت سے زیادہ محسوس نہ کرو۔ [illegible] اب [illegible] تم کچھ کر نہیں سکتیں اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم اس حادثہ کو [illegible] کر دو۔ [illegible] اس کی طرف [illegible] مسکراہٹ سے دیکھا۔ [illegible]

سمجھتی تھی۔

"اور اس کے علاوہ میں نے آج کچھ زیادہ ہی رکھی ہے۔ اور تمہارا بھی بہت ہوں؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی اور اس کی طرف ایڈگر کا تار بڑھا دیا۔ اس نے لے لیا۔

"تو کیا تم اس سے شادی کرو گی؟"

"میں یہاں سے جلد چلی جانا چاہتی ہوں، مجھے اب اس گھر سے نفرت ہے، جب میں اپنے کمرہ میں جاتی ہوں، تو خوف سے چیخیں نکلتی ہیں۔"

"اور ہندوستان یہاں سے بہت دور ہے" اس نے طنزاً کہا۔

"دراصل ایڈگر بہت معتمد اور نیک ہے، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں خود کو کسی کے سپرد کرنا چاہتی ہوں، میں جینے کے لئے سہارے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔"

"اچھا تو بات یہی ہے نا؟"

اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، اس لئے استفساریہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اسکی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے کسی جذبہ کا پتہ نہ چلتا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مگر شاید وہ مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرے؟"

"یہ تم کیا کہنے لگیں، وہ تو تمہارے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔"

"بہرحال۔ مجھے اُسے یہ واقعہ ضرور بتانا چاہیئے؟"

"کیوں؟" وہ حیرت سے چیخ پڑا۔

"جب تک یہ واقعہ میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ میں اس سے شادی نہ کر سکوں گی۔ میرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی سکون نہ ملے گا؟"

"تمہارا سکون؟ مگر اُس کے سکون کا کیا ہوگا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے منہ سے یہ داستان سن کر خوش ہوگا۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ آئندہ زندگی میں اسکی موت سے تمہارا کوئی تعلق کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔"

"دراصل مجھے پُرخلوص ہونا چاہیئے۔"

[illegible]

"تم ایک خطرناک غلطی کر رہی ہو، تم [illegible]

سمجھتا ہوں، ان کے خلوص و جذبہ کو خوب پہچانتا ہوں، انہیں کبھی خلوص کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کا اپنے متعلق اعتماد ختم کرنا پاگل پن ہے۔ وہ تم پر لٹو ہو گیا ہے، وہ تمہیں بالکل ٹھیک سمجھتا ہے۔"

"اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ جتنے لوگ تمہیں بہتر سمجھیں گے تم اتنا ہی اور بہتر ہونے کی کوشش کرو گی، تم جانتی ہو کہ ایڈگر میں بہت سی صفات ہیں، لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس مرتبہ کا آدمی ہے اور اسی لئے اسے وہ عہدہ پیش کیا ہے، اگر تم برا نہ مانو تو اسکی شخصیت میں ایک احمقانہ ضد پائی جاتی ہے، اور اسی وجہ سے وہ کامیاب رہا ہے۔ بغیر اس کے وہ اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا تھا۔ تم اس کے مزاج کے خلاف عمل کر رہی ہو، تم اس سے توقع رکھتی ہو کہ وہ عورت کے دل کی گہرائی میں پہنچ جائے۔"

"اگر اسے واقعی مجھ سے محبت ہے تو وہ محسوس کریگا؟"

"اچھی بات ہے تم جانو، اگر میں عورت ہوتا تو اس جیسے آدمی سے کبھی شادی نہ کرتا، بہرحال اگر تم نے طے ہی کر لیا ہے تو کر ڈالو، تم اس سے شادی ہی کر رہی ہو تو یہ بات اُسے نہ بتاؤ۔ اور اس کے جذبۂ رقابت کو ہوا نہ دو۔"

وہ ہنسنے لگا اور اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ آہستہ آہستہ لہراتے ہوئے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گی، اس کے دل کو ہلکا سا دھچکا لگا۔ اس نے اس سے شادی کا کہہ کے اچھا مذاق کی تھی۔ اور اگر وہ ہاں بھر لیتی تو وہ مایوسی سے مسکرا کر رہ جاتا۔

——— ۷ ———

اس سے اگلے دن چار بجے کا وقت تھا، میری باغیچہ کے اسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اپنی توجہ ہٹانے کے لئے ایک غلاف کاڑھ رہی تھی، اتنے میں نینا اس کے پاس آئی اور اُسے بتایا کہ ایڈگر سونٹ فون پر اسکا انتظار کر رہا ہے، وہ ابھی ہوٹل ابھی پہنچا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ میری سے ابھی مل سکے گا۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کا جہاز کب پہنچ رہا ہے اور ٹھیک وقت سے اسکی آمد کا انتظار کر رہی تھی، اس نے نینا سے کہہ دیا کہ وہ اُسے کہہ دے کہ وہ اسکا انتظار کرے گی، اس کا دل [illegible] سے

دھڑکنے لگا۔ اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنے چہرے کا جائزہ لیا اس نے رخساروں پر کوئی سرخی نہ لگائی ہوئی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ایڈگر سرخی پسند نہیں کرتا اور صرف ہونٹوں پر سرخی لگا رکھی تھی۔ اسکا تنگ زرد تھا۔ اس نے ہلکے سلیٹی کا ہلکا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بہت ہی سادہ دکھائی دیتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خادمہ کا لباس ہے۔ مگر درحقیقت اسکا کپڑا قیمتی تھا۔ اور وہ پیرس کے اعلیٰ ترین درزی خانوں کا سلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے کار کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ بعد ایڈگر سامنے آگیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور اسکا استقبال کیا۔ حسب معمول وہ اپنے رتبہ کی مناسبت سے بہترین لباس میں ملبوس تھا۔ اسکو دیکھنے سے مسرت ہوتی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ اور وہ سینہ تان کر چلنے کا عادی تھا۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا اور اس کے نیچے سے چمکیلے گھونگریالے بال نمودار ہوئے گھنی بھوؤں کے نیچے اسکی آنکھیں دوستی اور خوشی کا پیغام دے رہی تھیں۔ اسکے چہرہ پر معمول کے مطابق کرختگی اور سنجیدگی کے آثار نظر آتے تھے بلکہ اس کی بجائے خوش اخلاقی ہویدا تھی۔ اس نے گرمجوشی سے اسکا ہاتھ دبایا۔

"تم کتنی مطمئن اور خوش نظر آرہی ہو۔ واللہ جیسے کوئی حسین مرقع ہو"

امریکی جینیفر اس سے ملنے پر یہی جملہ کہا کرتا تھا میری نے ایڈگر کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھکالیں اور سوچا کہ مرد ایک خاص عمر پر پہنچ کر اپنے سے کم عمر والوں کو اسی طرح خطاب کرتے ہیں۔

"تشریف رکھئے۔ نینا ابھی چائے لاتی ہوگی۔ تمہارا سفر کیسا گزرا"

"میں تم سے دوبارہ مل کر کتنا خوش ہوں" وہ بولا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے ایک مدت تم سے علیحدہ رہا ہوں۔"

"ہمیں جدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگا"

"خوش قسمتی سے ـــ ہر وقت تمہارا خیال میرے ساتھ رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کہاں کہاں رہی ہوگی اور میں اپنے خیال میں ہر جگہ تمہارے ساتھ رہا۔" میری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرا خیال ہے تم بہت مصروف رہے ہوگے"

"واقعی میں بہت مصروف رہا۔ مجھے وزیر ہند سے دو تین دفعہ کافی طویل گفتگو کرنی پڑی۔ بہرحال سارے معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں میں اکتوبر کے آخر میں ہندوستان روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھ سے یہ بالکل نہ چھپایا کہ یہ ذمہ داری بہت اہم ہے۔ اور یہ کہ میں اسکی اہمیت سے اتنا ہی واقف ہوں جتنا کہ وہ۔ اور اسی لئے وہ مجھے یہ ذمہ داری دینا چاہتا ہے۔ خیر میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں وہ سب باتیں بتاؤں۔ جو اس نے مجھ سے کہی ہیں۔ ورنہ تم خوامخواہ بور ہوگی"

"نہیں میں بڑے شوق سے سنوں گی"

"اس نے مجھ سے کہا کہ خصوصی حالات کی وجہ سے انہیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو بیک وقت صلح جو اور سخت ہو۔ اور اس نے کہا میرے علاوہ وہ کسی اور آدمی میں ان خصوصیات کو نہیں پاتا"

"مجھے یقین ہے وہ ٹھیک کہتا تھا"

"بہرحال یہ تو صرف حسن ظن ہے۔ تمہیں معلوم ہے مجھے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ تب کہیں اس منزل پر پہنچا ہوں۔ یہ ایک بہت اہم عہدہ ہے۔ اس جگہ پہنچ کر میں آن پر ثابت کر سکتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور یہ بات میرے اور تمہارے درمیان ہے کہ میں ہندوستان میں اہم ترین کام انجام دوں گا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکا اور پھر بولا۔ اور اگر میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ تو پھر میرے لئے اور بھی اعلیٰ مواقع پیدا ہو جائیں گے"

"تم بڑے جاہ طلب آدمی ہو، ہے نا؟" اس نے لطیف طنز کی۔

"بے شک، میں اقتدار کو پسند کرتا ہوں۔ اور انکساری سے نہیں کہتا۔ مجھ میں کچھ خوبیاں ہیں اور میں خوش ہوں کہ مجھے ان کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع بھی میسر ہیں"

"پرسوں کی رئیسوں والی دعوت میں ایک کرنل ترپل ہیں ملے جو کہہ رہے تھے اگر تم بنگال کی گورنری میں کامیاب رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں ہندوستان کا وائسرائے نہ بنایا جائے"

ایڈگر کی بے باک نظروں میں ایک روشنی پیدا ہوئی۔

"اب وہ گورنر جنرل کہلاتا ہے۔ میرا خیال ہے ایسا ہونا ممکنات کی حد سے باہر نہیں، انہوں نے وشنگٹن کو دیکھو کہ بنگال تھا اور وہ بہت ہی کامیاب وائسرائے تھا"

اب وہ چائے ختم کر چکے تھے۔ اس نے اپنی پیالی میز پر واپس رکھدی۔

"میری جان تم جانتی ہو کہ جو اعزاز اور تحفہ مجھے بخشا گیا ہے۔ اسکی مجھے بہت خوشی ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ تم اس خوشی اور اعزاز میں میری شریک نہ ہوگی تو اسکی مسرت میرے لئے آدھی رہ جائے گی۔"

اُس کا دل ٹھہرنے لگا، لو وہ لمحہ آگیا ہے، اپنے حواس پر قابو پانے کے لئے اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے اسکی طرف نہ دیکھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ مسلسل اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ میری واپسی پر جواب دو گی۔ وہ منصفانہ اور یہ حقیقت ہے کہ اس بات کا جواب جاننے کے لئے مجھے پورا ایک ہوائی جہاز کرایہ پر لینا پڑا ہے۔ اسکی اہمیت کا پورا پورا ثبوت ہے۔"

اُس نے جو سگریٹ ابھی سلگایا تھا بجھا دیا اور ایک چھوٹی سی آہ بھری۔

"قبل اسکے کہ ہم اس موضوع پر کچھ اور گفتگو کریں میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے تمہیں سخت تکلیف ہوگی، خدا را بغیر کچھ کہے میری بات پوری سن لینا جو کچھ تم کہنا چاہو یا پوچھنا چاہو بعد میں پوچھنا۔"

اس کا چہرہ یک لخت سخت ہوگیا اور اس نے اسکی طرف تیز نظروں سے گھورا۔

"اچھی بات میں کچھ نہ بولوں گا۔"

"مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اس بات کو اپنے حد تک رکھنے کے لئے میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتی ہوں۔ مگر تم سے اس بات کو چھپانا ریاکاری ہوگی۔ تم کو حقائق کا علم ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد تم جو چاہو فیصلہ کرنا۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ بولا۔

بالکل سرد مہری سے اس نے وہ تکلیف دہ طویل کہانی جو وہ کرولے کو ایک دن پہلے سنا چکی تھی، پوری کی پوری سنا دی۔ اس نے کوئی بات خلاف واقعہ [illegible] مگر کرولے کی نسبت ایڈگر کو یہ بات سنانی سخت تر تھی۔ وہ بغیر کسی جنبش کے سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سخت اور سنجیدہ تھا، اسکی آنکھوں اور چہرہ کی کیفیت سے بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ ان باتوں سے بے خبر تھا۔

کرولے کے مقابلے میں یہ کہانی ایڈگر کو سناتے وقت اُسکی زبان پوری طرح اُس کے قابو میں نہ تھی، وہ اُس کو اپنے اصل مقصد اور اپنی پاکیزگی کا یقین دلانے میں ناکام رہی۔ کچھ واقعات تو بالکل ناقابل یقین محسوس ہوتے تھے۔ اور اُس نے اچھی طرح تاڑ لیا کہ اُسے ان باتوں کا یقین نہیں آرہا۔ اُسے پتہ چلا کہ اس کا اُس مردے کی نعش کو کار میں ڈال کر باہر لے جانا محض غلطی تھی، اسکی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا تھا کہ وہ اس بدنامی سے کیسے بچتی اور پولیس کے چکروں سے کیسے پیچھا چھڑاتی۔ واقعہ ایسا تھا کہ کسی کو یقین ہی نہ آسکتا تھا۔ کہ اُس جیسی عورت کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور یہ عام دنیا سے ماوراء معلوم دیتا تھا، ایسا معلوم دیتا تھا کہ ایسے واقعات صرف خواب میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

جونہی اس نے بات ختم کی، تھوڑی دیر ایڈگر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا۔ اسکا سر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ پشت کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اسکے چہرہ پر بلا کی کرختگی تھی، اس سے پہلے میری نے کبھی اسکو اس کیفیت میں نہ دیکھا تھا، عجیب بات تھی کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ معمر سا لگ رہا تھا۔

بالآخر وہ اُس کے سامنے آکر خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر کمزور سی مسکراہٹ تھی مگر اس کی آواز اتنی ملائم تھی کہ اس کے دل کے تار ہلا گئے۔

"معاف کرنا۔ مجھے یہ واقعہ سن کر سخت حیرت ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تم آخری عورت ہو جس سے میں اس قسم کی لغزش کی توقع رکھ سکتا تھا۔ میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب تم ایک معصوم بچی تھیں۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ تم بھی دوسروں کی طرح . . . . "

وہ ٹھہر گیا، مگر اس نے سمجھ لیا کہ اُس کے ذہن میں کیا بات ہے۔ یہ بات ناقابل یقین معلوم دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی طرح ایک آوارہ نوجوان کی آشنائی پر اتر آئے گی۔

"میں اپنے متعلق کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہتی۔"

"معاف کرنا، میرا خیال ہے تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔"

"بہت ہی بڑی۔" اُس نے جھینپ کر کہا۔

"خیر ہمیں اس گھڑی میں زیادہ جانے کی فرصت نہیں، میرا خیال ہے۔ مجھے تم سے اتنی شدید محبت ہے۔ کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اور معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

آسیہ انسان کی آمادہ بھرانے لگی۔ اسکی مسکراہٹ میں اب غرور آ گیا تھا: "تم ایک حسین اور پیاری گڑیا ہو، میں اس سے متفق ہوں۔ مگر اس بدنصیب لڑکے کی موت کے بعد تم نے جو کچھ کیا وہ حالات کے عین مطابق تھا، یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا، بہرحال اب معاملات ٹھیک معلوم دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تمہیں ایک آدمی کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ اسکی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا تم ان سب واقعات کو جاننے کے بعد بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

وہ ایک بہت مختصر لمحے کے لئے جھجکا، اتنے مختصر کہ میری کے علاوہ کوئی دوسرا محسوس تک نہ کرتا۔

"تم یقیناً مجھ سے یہ توقع نہ رکھو گی کہ میں تمہیں اس جھمیلے میں پھنسا رہنے دوں۔ میری سیما جان میں ہی کبھی بھی یہ گوارہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اپنے آپ سے بڑی ہی شرمندگی ہے۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے ملک کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ کوئی ہرج نہیں۔ اگر میں اب اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لوں۔ اور اپنے سے کم عمر کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے دوں۔"

وہ اس کی طرف مبہوت ہوکر دیکھنے لگی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ڈارلنگ، بات یہ ہے کہ صورت حالات اب کچھ بدل گئی ہے میں اس عہدہ کو اب قبول نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک نہ ہوگا، اگر بات پھیل گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہو سکتے ہیں۔"

وہ جھلا گئی۔

"میں کچھ نہیں!"

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو، میں وزیر ہند کو استعفیٰ دے دوں گا۔ ہم شادی کر لیں گے اور اب ہندوستان نہ جا سکوں گا۔ میں تمہاری صحت کو ایک معقول بہانہ بنا سکتا ہوں۔ افسوس کہ تمہیں عافیت

نہیں بخش سکتا۔ جو میں چاہتا تھا، مگر اسکی وجہ سے کوئی خلل نہ پڑے گا۔ ہم بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں، ہم ساحل پر ایک بنگلہ خرید لیں گے، میں ہمیشہ سے ایک کشتی خریدنے کا مشتاق ہوں۔ ہم اس میں بیٹھ کر خوب تفریح کیا کریں گے۔"

"مگر اب جبکہ تم کامیابی کے عین قریب پہنچ چکے ہو تو تمہیں اس عہدہ کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

"سنو میری جان، جو ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے وہ بڑا اہم ہے۔ اس کے لئے مجھے اپنی تمام دماغی اور جسمانی قوتوں کو مجتمع رکھنا پڑے گا۔ مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہے گا کہ کہیں کوئی بات پھوٹ نہ پڑے۔ اور جب کوئی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہو تو کسی کام میں بھی پورے انہماک سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"اب بات کیسے پھوٹ سکتی ہے؟"

"پستول ہی کو لو، پولیس نے محنت کی تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ میری ملکیت تھا۔"

"مجھے قطعی امید نہیں ایسا ہو، میں نے اسکے متعلق سوچ لیا ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس آدمی نے بلیسٹومان میں اسے چرا لیا ہو۔"

"بیشک یہ صحیح ہے کہ پستول اس تک پہنچنے کے بہت ہی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر اس صورت میں مجھے صفائی دینی پڑے گی اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا، میں مخمصوں میں پھنسنے سے نہیں گھبراتا، مگر میں اس قسم کا آدمی نہیں کہ خواہ مخواہ جھگڑوں کا پلندہ اپنے ذمہ لے لوں، اور پھر یہ راز تمہیں تک محدود نہیں ہے اور بھی اس سے آگاہ ہے۔"

"تم اسکی ایک لمحہ کے لئے بھی فکر نہ کرو کہ وہ کبھی اس بات کو ظاہر کر دے گا۔"

"مجھے اسی کی تو فکر ہے، وہ ایک غیر معتمد آدمی ہے، ایک کاہل اور فلاش آدمی ہے۔ وہ اس قسم کا آدمی ہے جن کے لئے پیسہ پاس کوئی فکر نہیں، تم یہ فکر کہہ سکتی ہو کہ اگر اسے کوئی عورت مل گئی۔ تو وہ اپنے کام میں لگا رہے گا۔ اور اسکو بلد کہانی کے سب نشانات دیکھا، کچھ عرصے بعد جب وہ دولت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اس کو یہ کہانی سنانا رہے گا، اور تم یقین کرو کہ تم اس سے جواب طلب کرو سارے لندن کو اس راز کا علم ہو جائے گا یقین کرو۔ پھر اس خبر کو ہندوستان پہنچنے میں دیر نہ لگے گی۔

"ایڈگر تم غلط کہتے ہو جو تم نے اسے سمجھا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آزاد اور اصلاح پسند ہے۔ اگر وہ عام آدمی نہ ہوتا تو میرے ساتھ یہ غلطی کبھی نہ ہونے دیتا۔ میں اس پر پورا پورا اعتماد کرتی ہوں۔ وہ کبھی میری بُرائی نہ چاہے گا بلکہ وہ اس پر موت کو ترجیح دے گا۔"

"تم انسانی فطرت کے متعلق مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتیں۔ اس میں اتنے ضبط کا مادہ بھی نہیں کہ وہ کسی راز کو چھپا سکے۔"

"لیکن اگر تم یہ سوچتے ہو تو پھر ملازمت میں رہنے یا نہ رہنے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"ہو سکتا ہے اس معاملہ کا چرچا عام ہو جائے۔ لیکن اگر میں ذاتی زندگی گزار رہا ہوتا۔ تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ ہم اس کی مطلق پروا نہ کریں گے لیکن گورنر جنرل کی حیثیت میں یہ بہت مشکل ہو گا۔ آخر جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ایک مجرمانہ فعل تھا۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ناقابل معافی ہے۔ ان سے برطانیہ کے تعلقات خراب ہیں اور وہ اس مسئلے پر خوب کیچڑ اچھالے گا۔ کیا تم نے محسوس کیا ہے کہ اس آدمی کے قتل کا الزام تمہارے اوپر لگایا جا سکتا ہے؟"

اس نے اس کی طرف اس قدر تیز نظروں سے دیکھا کہ وہ کانپ اٹھی۔

"مجھے اپنا غداری سے کام لینا پڑے گا؟" وہ بولتا رہا۔ "اور حکومت نے ہمیشہ مجھ پر بھروسہ کیا ہے اور میں اس کے اعتماد کا احترام کروں گا۔ اور مجھے سے بچانا ہے۔ اس کے خلاف خطرہ یہی ہے کہ کوئی شخص میرے یا میری بیوی کے چال چلن کے متعلق کچھ کہہ سکے۔ ہندوستان میں اب ہماری قوم کی عزت کا انحصار شخصیتوں کی ذاتی خوبیوں پر ہے۔ اگر مجھے ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ تو اس سے بڑے تلخ نتائج پیدا ہوں گے۔ مجھے افسوس ہے پیاری میری، مجھے وہی کرنا ہو گا جو میں صحیح سمجھتا ہوں۔"

اس کا لہجہ یکدم بدل گیا تھا۔ اور اس کے چہرے کی سختی کے ساتھ آہستہ آہستہ وہ کرخت بھی ہو گیا تھا۔ میری نے اس بدلے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا جو اپنی انتظامی قابلیت کے علاوہ ... کے لئے بھی مشہور تھا۔ اس کے سخت چہرے کے ہر خط اور اس کی آنکھوں کی ہر حرکت سے میری نے اس کے ارادے کی پختگی کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ وہ اس معاملہ میں سخت [illegible] اس نے اپنے آپ کو ناقابل [illegible] جا [illegible] میری کی [illegible] بل سے [illegible]

پیشکش کو واپس لے لیں۔ جب اس نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کر کے بتا دیا تو وہ اس کی صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ مجھ سے شادی کی کے اتنی بڑی قربانی کر رہا تھا کہ اپنے عہدہ کو چھوڑ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے اس قدر محبت کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس قربانی سے اس کا نفس تسکین پاتا تھا۔ اور وہ بدلے یہ توقع رکھتا کہ مہربانی دے رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے کبھی اتنی بڑی قربانی دینے پر طعن نہ کرے گا۔ مگر ساتھ ہی وہ اتنے بڑے عہدے کو چھوڑنے پر تا حیات غم کھاتا رہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگر اس کے احساس خود غرضی کو دھکا لگے بغیر یہ شادی طے نہ ہو تو وہ آسانی سے اس سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر سکتا ہے۔ وہ عزت و جاہ کا غلام تھا۔

میری نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں تاکہ ایڈگر ان آنکھوں میں غم کی جھلک محسوس نہ کر سکے۔ اچانک میری کو حسب حال بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالکل اتفاقیہ طور پر اسے لگا کہ اگر وہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی ہو جائے تب بھی وہ اس سے شادی کرنا نہ چاہے گی۔ وہ اس کو چاہتی تھی اور اس کے احسانات کو بھی تسلیم کرتی تھی۔ وہ اس بات کی بھی احسان مند تھی کہ اس نے اس حادثہ کو بڑی ہمدردی سے سنا ہے مگر اسے احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اگر اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تو وہ ہر قیمت پر اس سے شادی کر کے چھوڑے گا۔ وہ بڑا ضدی آدمی ہے۔ مگر صورت حال کتنی ہی بدتر کیوں نہ ہو جائے۔ وہ اس سے شادی کبھی نہ کرے گی۔ چاہے وہ اس کی یہ بات ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے نکال دے۔ یہ بات خدا بھلا نہ رہے گی۔ مگر اس صورت میں وہ اس سے اور بھی زیادہ بدظن ہو جائے گا۔ اور اس کا چھٹکارا مشکل سے ہو جائے گا۔

ایک ٹھنڈا سانس لے کر وہ رونے کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایڈگر کے مقابلہ میں اس آوارہ آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا آسان تھا؟ وہ چاہے کیسا بھی ہو مگر سے کبھی نہ ڈرتا تھا۔ اس نے خود پر قابو پا لیا۔

"تمہیں معلوم ہے ایڈگر پیارے، مجھے یہ سوچ کر سخت تکلیف ہوئی کہ تم نے اپنا منصب عالی کھو دیا ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ تم اس کے متعلق کبھی نہ سوچو گی۔ مجھے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری زندگی میں آنے کے بعد میں اس کے متعلق سوچوں گا

ملک نہیں!

"مگر ہمیں صرف اپنے متعلق ہی نہیں سوچنا ہے، تم اس مخصوص عہدے کے لئے منتخب کئے گئے ہو۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی ذات کی خاطر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار نہ کرو۔"

"نہیں اس حد تک غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ کہ یہ ضرورت ناگزیر ہے۔"

"میں تمہاری کتنی قدر کرتی ہوں، میں اس خیال کو برداشت نہیں کرسکتی کہ تم اپنا فریضہ ترک کر دو۔ جبکہ تمہاری موجودگی سخت ضروری ہے یہ تمہاری کمزوری معلوم دیتی ہے۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اس نے محسوس کر لیا۔ کہ اسکی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔

"مگر اس کے سوائے چارہ کار نہیں، موجودہ صورت حال میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور بھی بے وقوفی ہوگا۔"

"مگر یہ سوال تو بالکل آسان ہے، تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے مجبور تو نہیں ہو!"

اس نے اسکی طرف اس انداز سے دیکھا کہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکی، وہ بات کو تاڑ گیا تھا۔ اور اس کی نظروں سے یہ بات ظاہر تھی۔ کاش وہ اس صورت حال میں کامیاب ہو جاتی۔ کیا وہ نہیں جانتا وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ مگر اسے اپنے تاثرات چھپانا آتا تھا۔ اور جب اس نے جواب دیا تو اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں پیار تھا۔

"مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، مجھے دنیا میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے!"

"تو کیا پھر اسے اپنا نسخہ استعمال کرنا ہی پڑے گا؟"

"ڈیئر پیارے، تم مجھے بہت ہی عزیز ہو، مجھ پر تمہارا بہت کچھ حق ہے بلکہ میرے عزیز ترین دوست ہو۔ مجھے معلوم ہے تم کتنے بڑھیا، کتنے اچھے، کتنے مہربان اور کتنے مخلص آدمی ہو۔ مگر مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"درحقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تم سے کتنے ہی سال بڑا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اس شدت سے محبت نہیں کر سکتیں جس شدت سے کہ اپنے ہم عمر سے کر سکتی ہو، مگر مجھے امید ہے کہ جو آرام تمہیں میری ذات سے حاصل ہوگا وہ بہت حد تک اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ جو کچھ میں تمہیں اب پیش کروں گا وہ تمہاری قبولیت کے معیار پر شاید اتنا پورا نہ اترے۔"

یا اللہ! وہ صورت حال کتنی پیچیدہ بنا رہا تھا، آخر وہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ وہ ایک گندی عورت ہے اور اچھا ہوا کہ اسے پہلے ہی ہوش آگیا۔ جلتے ہوئے تیل کا کڑھاؤ اب بالکل سامنے آگیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلے اور اس میں چھلانگ لگا دے۔

"ایڈگر میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتی ہوں، جب تم بنگال کی گورنری کے بارے میں کیلس گئے ہوئے تھے تو تم اپنے کام میں بہت مصروف رہے تھے اور اسی طرح مجھے بھی بہت سے کام کرنے پڑے تھے۔ آخر میں ایک انسان ہی تو ہوں، اور متوقع حیثیت کی آنکھیں خیرہ کرنے والی ۔۔۔ یہ بات کافی معلوم ہوتی تھی کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ ہمارے تمہارے درمیان بہت سی باتیں مشترک تھیں اور محبت کا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اب خطرناک ترین حقیقت آرہا تھا۔ لیکن اگر ہم صرف ساحل پر ہی پرسکون زندگی گزارنے والے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہو۔ جتنی کہ مجھ سے تمہیں ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ ہم صرف ساحل پر ہی آباد رہیں، جہاں تم چاہو ہم وہیں رہ سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا!"

وہ کافی دیر خاموش رہا، جب اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سوجھ بوجھ چمک رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے تم صرف گورنر بنگال سے شادی کرنے کو تیار تھیں اور ایک ہندوستانی صوبے کے پنشنر سے نہیں؟"

"اب جب صاف بات کہنے کی ضرورت ہے تو [illegible] کہوں گی کہ واقعی یہی بات تھی۔ [illegible]"

"ایسی صورت میں ہمیں اس مسئلے پر مزید گفتگو کرنا چاہیئے!"

"بے شک ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا، وہ بہت گمبھیر ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے سے اُس کے خیالات کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اُسکی سخت بیوقوفی تھی، بیچارہ، مجبور آدمی، اُسے اُس کی ذات سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن میری یہ بھی جانتی تھی کہ اُس کے کندھوں سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ اُس پر کوئی بات ظاہر نہ کر سکا۔ بالآخر وہ جھنجھلا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

اب میرے فلورنس کے قیام میں کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر تم محسوس کرو کہ خودکشی کرنے والے قضیے میں میری مدد کی ضرورت پڑے گی تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

"اوہ نہیں، میرا خیال ہے اسکی ضرورت نہیں ہے!"

"ایسی صورت میں کل لندن روانہ ہو جاؤں گا، شاید مجھے تمہیں ایسی اطلاع کہہ دینا چاہیئے۔"

"خدا حافظ ایڈگر! مجھے معاف کر دینا!"

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بوسہ دیا اور پھر بڑے پُرتمکین انداز میں لان پر سے گزرنے لگا، ایک لمحہ میں وہ درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اُس نے اسکی جاتی ہوئی کار کی آواز سُنی۔

——— ۸ ———

ایڈگر کی ملاقات نے میری کو تھکا دیا تھا۔ پچھلی دو راتوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی، موسم گرما کی ٹھنڈی اور شراب کے خمار سے سرشار ہو کر وہ وہیں آرام کرسی پر لیٹ کر سو گئی، ایک گھنٹہ بعد اس کی آنکھ کھلی، وہ اب خود کو تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ ٹہلنے باغیچے میں چلنے لگی۔ اور پھر اس کا جی چاہا کہ وہ بڑے چبوترے پر بیٹھ کر ڈھلتے ہوئے دن کی روشنی میں شہر کے نظارے سے لطف اندوز ہو مگر جونہی وہ اُدھر جانے لگی، اس کا ملازم سیرو اسکے قریب پہنچا۔

"حضور، رولے صاحب کا فون آیا ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں؟ وہ ہولڈ پر ہیں۔"

"اُن سے کہو اپنا پیغام تمہیں دے دیں۔"

"مگر وہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں!"

میری نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا، وہ اُس وقت رولے سے بالکل بات نہ کرنا چاہتی تھی، مگر اُس نے سوچا ممکن ہے وہ کوئی ضروری بات کہنا چاہتا ہو۔ اُس بدنصیب لڑکے کی نعش کا کیا ہوا...

اس کے ہمراہ سوار رہتا تھا، وہ ٹیلیفون پر پہنچی۔

"کیا تمہارے یہاں کچھ برف ہوگی؟"

"کیا تم نے صرف یہی پوچھنے کے لئے مجھے فون تک بلایا تھا؟" اُس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"نہیں صرف یہی نہیں بلکہ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے پاس کون کون سی شرابیں مل سکیں گی؟"

"اور کوئی بات؟"

"ہاں تو میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر میں تمہارے پاس ٹیکسی میں بیٹھ کر ابھی پہنچ جاؤں تو کیا تم مجھے کاک ٹیل پلاؤ گی؟"

"مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں!"

"یہ اور بھی بڑھیا رہے گا میں بھی تمہارا کچھ ہاتھ بٹاؤں گا!"

میری نے اپنے کندھوں کو نیم غصہ سے جھٹکا اور سیرو سے کاک ٹیل (شراب) بنانے کو کہا اور بڑے چبوترہ پر پہنچ گئی وہ جلد از جلد فلورنس کو چھوڑ دینا چاہتی تھی، اسے اس شہر سے نفرت ہو گئی تھی، مگر وہ اپنی جلد روانگی کے متعلق چہ میگوئیاں نہ چاہتی تھی۔ شاید رولے اسی لئے آ رہا ہے، وہ اس سے مشورہ لے گی، یہ بات بڑی عجیب تھی کہ وہ اس اوباش انسان پر اتنا اعتماد کئے ہوئے تھی۔

پندرہ منٹ بعد وہ اُس کے سامنے تھا، ایڈگر اور اُس کے چال میں بڑا فرق تھا۔ ایڈگر اپنے قد آور کھڑے رکھاؤ سے بڑا ممتاز نظر آتا تھا، اسکی شخصیت سے قدرتی عظمت نمایاں تھی، اُس کی شخصیت سے یہ بات ٹپکتی تھی کہ وہ دوسروں پر حکمرانی کرنے کا عادی ہے، اگر وہ کسی مجمع میں کھڑا ہو تو ہر آدمی ایک دوسرے سے کہے گا کہ یہ دیکھو آدمی کون ہے جس کی شخصیت سے اتنا رُعب ٹپکتا ہے۔ رولے ایک موٹا، متوسط قد کا بھدا سا آدمی تھا۔ وہ حسب عادت جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے رہتا تھا اسکی ذات سے بڑی آوارہ منشی ٹپکتی تھی اور میری کو اس میں کچھ کچھ جاذبیت محسوس ہوتی تھی، اسکی ہنستی ہوئی آنکھیں اور خوش شکل چہرہ سے یہ بات ظاہر ہوتی کہ وہ بہت بے تکلف آدمی ہے اور اس سے ہر آدمی کی خوب نباہ ہو سکتی ہے، میری کو اچانک

محسوس ہُوا کہ جہاں تک اُسکی غلطیوں اور میریکا کے ساتھ اس کی ہمدردیوں کے وہ بہت ہی مہربان دوست ہے۔ اس کی موجودگی میں تم خود کو بہت آزاد رکھ سکتے ہو، تمہیں اسکی موجودگی میں تصنع کی ضرورت نہیں ہے، اُس کے مزاج میں کوئی بناوٹ نہیں اور نہ ہی دوسروں کے بناوٹ کو پسند کرتا ہے۔

اُس نے کاک ٹیل تیار کیا اور ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار لیا اور پھر آرام سے کرسی پر دراز ہو گیا اور اس کی طرف تحیر نظروں سے دیکھا۔

"تو جانِ من، سمارٹ شہنشاہیت نے تمہیں ٹھکرا دیا نا؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ جلدی سے بولی۔

"میں نے خود ہی سب تاڑ لیا۔ جب وہ ہوٹل کے سیلوں کی روانگی کی بابت دریافت حال کیا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ پیرس جانے والی ٹرین آج رات کو چل سکے گی تو اس نے اسی وقت اسٹیشن جانے کے لئے موٹر منگائی، میں نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بزدل نہ ہوتا تو اس قدر جلد یہاں سے نہ بھاگتا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارا راز فاش کرنا سخت بے وقوفی ہوگا، تم اس قسم کے آدمی سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتیں کہ وہ تمہاری کہانی کو برداشت کرے۔"

اس سانحہ کو اتنی اہمیت دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا جبکہ وہ لے اُسے بالکل مذاحیہ انداز میں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میری مسکرائی۔

"اُس نے اپنا رویہ بہت اچھا رکھا۔"

"اُسے یہی چاہیئے تھا، میرا خیال ہے۔ اُس نے شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہوگا۔"

"وہ ایک مکمل شریف انسان ہے۔"

"وہ بظاہر مجھ سے زیادہ شریف لگتا ہے، میں پیدائشی شریف ہوں فطرتاً نہیں۔"

"رولے تمہیں مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا تمہیں ناگوار لگتا ہے؟"

"نہیں، نہیں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ گفتگو کے دوران ہی میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے کسی قیمت پر بھی شادی منظور نہیں۔"

"تو تم اس کھیل سے اب باہر ہو گئی ہو۔ میں تم سے یہی کہنا چاہتا تھا کیونکہ تم نے جو ارادہ کر رکھا تھا، یقین ہے بروقت عقل آ گئی، تم اس قسم کی عورت نہیں جو کسی اعلیٰ افسر سے شادی کرو۔"

"رولے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔" اور خود کو بڑا ہی ظاہر کرتا ہے، ایسے ہی جیسے چارلی چپلن خود اپنی نقل کرنے لگے۔

"میں یہاں سے جلد جانا چاہتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں تمہیں ضرور ایسا کرنا چاہیئے، تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

"مجھے تم سے بچھڑنا پڑے گا، تم نے میرے ساتھ بہت بھلائی کی ہے۔" وہ بولی۔

"مگر میں سمجھتا ہوں ہم ایک دوسرے سے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ قریب رہیں گے۔"

"یہ تم کیسے سوچتے ہو؟"

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب تمہارے لئے مجھ سے شادی کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی اور اسکی طرف گھورنے لگی۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"میری جب میں نے تم سے اس بات شادی کی درخواست کی جب سے اب تک واقعات نے کتنے ہی رخ بدلے ہیں، میرا خیال ہے تمہیں ابھی تک وہ بات خوب یاد ہوگی، میں نے تمہارے جواب کو اس وقت بھی جواب نہ سمجھا تھا، اب تک میں نے جتنی عورتوں سے بھی شادی کی درخواست کی ہے، ان میں سے کسی نے بھی اس کو رد نہیں کیا۔"

"میرا خیال تھا تم مذاق کر رہے ہو، میرا خیال ہے تم میرے ساتھ اب شادی کو کبھی پسند نہ کرو گے۔"

وہ آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی، اس کے بے تکلف جملوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا


ہندوستانی ادب کے ناولٹ

جیسے وہ محض مذاق کر رہا ہے۔

"جانِ من مجھ سے شادی کرنے میں تمہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں ایک بدنام آدمی ہوں۔ میری حرکتوں سے ایک دنیا نالاں ہے۔ میں شاید بھلا نہیں کہہ ٹھہراؤں میرا خیال ہے میں نے دنیا میں کسی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا، عورتیں مجھے چاہتی تھیں۔ اور فطرتاً میں بھی زندہ دل واقع ہوا تھا اس لئے جو کچھ بھی ہوا قدرتی بات تھی۔ بہرحال دنیا کو مجھے اس کا حق ہے اور نہ ہی خواہش کہ میں لوگوں کو ان کے کئے پر ملامت کرنے لگوں۔ میں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے قول کا قائل ہوں، نہ جانتے ہو میں معاشرتی شہنشاہیت نہیں ہوں، میں کوئی ایسا پاک انسان نہیں ہوں جس کو ہر آدمی فرشتہ سمجھے، میں صرف ایک سہل پسند انسان ہوں جس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ آرام سے زندگی گزارے۔ میں ایک کاہل نکما سا انسان ہوں، بہرحال اب میں اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہوں سارڈینیا میں میری ایک معقول جاگیر ہے۔ مجھے اپنے منیجر کو برخاست کرنا ہے۔ کیونکہ وہ دیانتدار آدمی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اس کا انتظام وہاں جا کر خود ہی سنبھال لوں تو یہ کچھ بے جا نہ ہوگا، شاید اب وہ وقت آ چکا ہے کہ میں زندگی میں ایک مرکز پر جم جاؤں۔ تم شاید وہاں کی زندگی کو پسند کر سکو؟"

وہ ایک لمحہ تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ کچھ نہ بولی۔ وہ بہت متعجب تھی اور اس نے غیر متوقع باتیں سنی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ بظاہر غیر سنجیدہ لہجہ میں بول رہا تھا۔ گویا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صرف ایک مذاق ہے اور وہ اپنی طبیعت بہلانے کی خاطر بول رہا ہے۔

"در اصل تم نے جب مجھ سے پہلی مرتبہ یہ کہا تھا کہ میں تم سے صرف دوستی کی قیمت سے ملنا چاہتا ہوں، تو یہ بالکل ٹھیک تھا۔ بات یہ ہے کہ تم بہت خوبصورت عورت ہو اور میں بڑا احمق ہوتا اگر تمہارے حسن سے لطف اندوز نہ ہوتا۔ مگر اس رات جب ہم اور تم نشل کے ریستوران میں جا رہے تھے تو تم نے وہ ایک ایسی باتیں کیں کہ میرا دل بہت متاثر ہوا، مجھے یقین ہو گیا کہ تم پاکدامن ہو۔"

"بہت وقت ہے لے کر چکا۔ کتنے واقعات گزر چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مجھے یہ جاننے میں کوئی جھجک نہیں کہ ایک عورت

مجھے تم پر سخت غصہ آیا تھا!"

اس نے اس کی طرف بڑی شفقت آمیز آنکھوں سے دیکھا۔

"کیا اسی لئے تم نے میرے طمانچہ مارا تھا؟"

"اس وقت جب تم سے کار سے اتری تھیں نا؟ ہاں میں نے تمہیں اس لئے مارا تھا کہ تم رونا بند کر دو۔"

"میرے بہت سخت چوٹ لگی تھی۔"

"اسی لئے تو میں نے زور سے مارا تھا!"

میری زمین کی طرف دیکھنے لگی، جب اس نے ایلڈر کو اس لڑکے کا واقعہ سنایا تھا تو اس کا چہرہ کرخت ہو گیا تھا۔ اسے سخت دھکا لگا تھا، مگر اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے اس کے اعتماد کو شکست دی تھی کہ وہ پاکدامن ہے۔ سچ یہ تھا کہ وہ معصوم میری سے محبت کرتا تھا۔ جو بھی ایک معصوم بچی تھی اور جسے وہ چاکلیٹ دیا کرتا تھا، اور دوسرے نے اس کے طمانچہ اس لئے مارا تھا کہ اسکی دبی ہوئی رقابت کے جذبے کو ایسا کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ میری عجیب سا تھا کہ وہ اس کے اس جذبۂ رقابت پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسکی طرف دیکھ کر محبت سے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"مگر مجھے تم سے اب کوئی شکایت نہیں، مجھے تمہاری یہ بات بہت ہی پسند آئی کہ تم نے مجھے اس لائق سمجھا کہ میں تمہاری اس مصیبت کے وقت کچھ امداد کر سکتا ہوں اور مجھے تمہاری مستقل مزاجی بھی بہت پسند آئی۔ ایسے نازک وقت میں تم نے بڑی جوانمردی کا ثبوت دیا، حالانکہ تم نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، مگر اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم بہت رحم دل اور فرشتہ طبع عورت ہو اور سچ تو یہ ہے کہ میں جتنی عورتوں کو جانتا ہوں۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ صفات موجود نہیں ہیں، میری مجھے تم سے شدید محبت ہے۔"

"تم کتنے عجیب آدمی ہو۔" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ایلڈر اور تم دونوں ہی ایک بات پر اتنا زور دیتے ہو جو اتنی زیادہ اہم نہیں۔ در اصل سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میری غلطی سے وہ بدنصیب لڑکا دھوپ میں بے کفن پڑا ہوا ہے!"

"وہ وہاں اتنے آرام سے ہے جتنا قبرستان میں ہوتا۔ مگر

اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں جو مصائب سے پُر تھی۔ آخر وہ تمہارے لئے اہمیت ہی کیا رکھتا ہے! کچھ بھی تو نہیں۔ اگر وہ کل سڑک پر تمہارے برابر سے گزرے تو تم اسے پہچان بھی نہ سکو گی۔ اپنے ذہن کو ناممکن سے پاک رکھو۔ ڈاکٹر جانسن نے یہی بات کہی تھی اور سچ مچ یہ بہت سچی بات ہے۔"

اُس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں۔

"تمہیں ڈاکٹر جانسن جیسے مفکر سے کیا واسطہ؟"

"اپنی کالج زندگی کے بے مصروف لمحوں میں میں نے بہت کچھ مطالعہ بھی کیا ہے۔ شہرہ آفاق جانسن میرا محبوب ترین مصنف ہے۔ وہ ایک مفکر تھا۔ اور انسانی فطرت کے بارے میں اچھا مشاہدہ رکھتا تھا۔"

"تم غیر متوقعات سے پُر ہو، دولے! میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ تم سوائے کھیلوں کی خبروں کے کچھ سنجیدہ ادب بھی پڑھتے ہو گے"

"میں اپنا تمام سامان ایک ساتھ کبھی دکان میں نہیں سجایا کرتا۔" وہ ہنسا۔ "میرا خیال ہے تم مجھے شادی کرنے میں پہلے کی نسبت اب کم قباحت محسوس کرو گی۔"

وہ پُر مذاق جملہ سن کر بہت خوش ہوئی۔

"مجھے یہ یقین کیونکر آسکتا ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار رہ سکو گے!"

"درحقیقت اس کا انحصار تمہاری صفات پر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو کام کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہے تو تمہارے لئے بہت سا کام رہے گا۔"

ایک لمحہ کے لئے اُس نے اُسکی طرف جوابی نظروں سے دیکھا

"دولے تم میرے ساتھ شادی کے جھنجٹ میں کیوں پڑتے ہو؛ اگر تمہیں واقعی اپنے قول کے مطابق مجھ سے اتنی ہی محبت ہے۔ تو میں تمہارے ساتھ چلنے میں کوئی قباحت نہ محسوس کروں گی۔ ہم لندن تم کار لے سکتے ہیں اور خوب سیاحت کر سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ مشورہ بھی ٹھیک ہے مگر یہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"

"بات یہ ہے کہ ایک ... عورت ... شوہر کی بجائے تم ایک اچھے دوست ثابت ہو گے"

"واقعی ایک عورت کو ... کہنا چاہیئے"

"میں اب اتنی معصوم نہیں رہی۔ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ میرے لئے اب ظاہر داری کا وقت گزر چکا ہے"

"نہیں، میں ہرگز یہ نہیں سوچتا۔ اور اگر تم احساس کمتری میں مبتلا ہو تو میں ایک مہینہ تک تمہیں اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔ مجھے تم سے شادی کرنے کی شدید آرزو ہے۔"

"مگر دولے مجھے تم سے محبت نہیں ہے"

"میں نے تمہیں اس رات بتایا تھا کہ اگر تم مجھے قربت کا موقع دو تو جلد ہی تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

اُس نے اس کی طرف تھوڑی دیر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر اچانک اُسکی آنکھوں میں ایک شرمیلی چمک پیدا ہوئی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کہاں تک سچے ہو" وہ زیر لب بولی۔ "اس رات جب اُن خوابوں کی کار ہمارے برابر سے گزر رہی تھی اور تم نے مجھے آغوش میں لے لیا تھا تو باوجود انتہائی خفگی کے تمہارے جسم کے لمس نے مجھے ایک عجیب خوشگوار لذت بخشی تھی!"

وہ بچے کی طرح خوشی سے ... تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر اُسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ پھر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

"بولو اب تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ بولا۔

"اچھا اگر تم مجھ سے شادی کرنا ہی چاہتے ہو تو ......

مگر ہم اب بہت ... کھو رہے ہیں"

"جان! ہماری زندگی تمام ... ہے۔ ... لینے میں مزہ آتا ہے!"

پریمیندر مترا

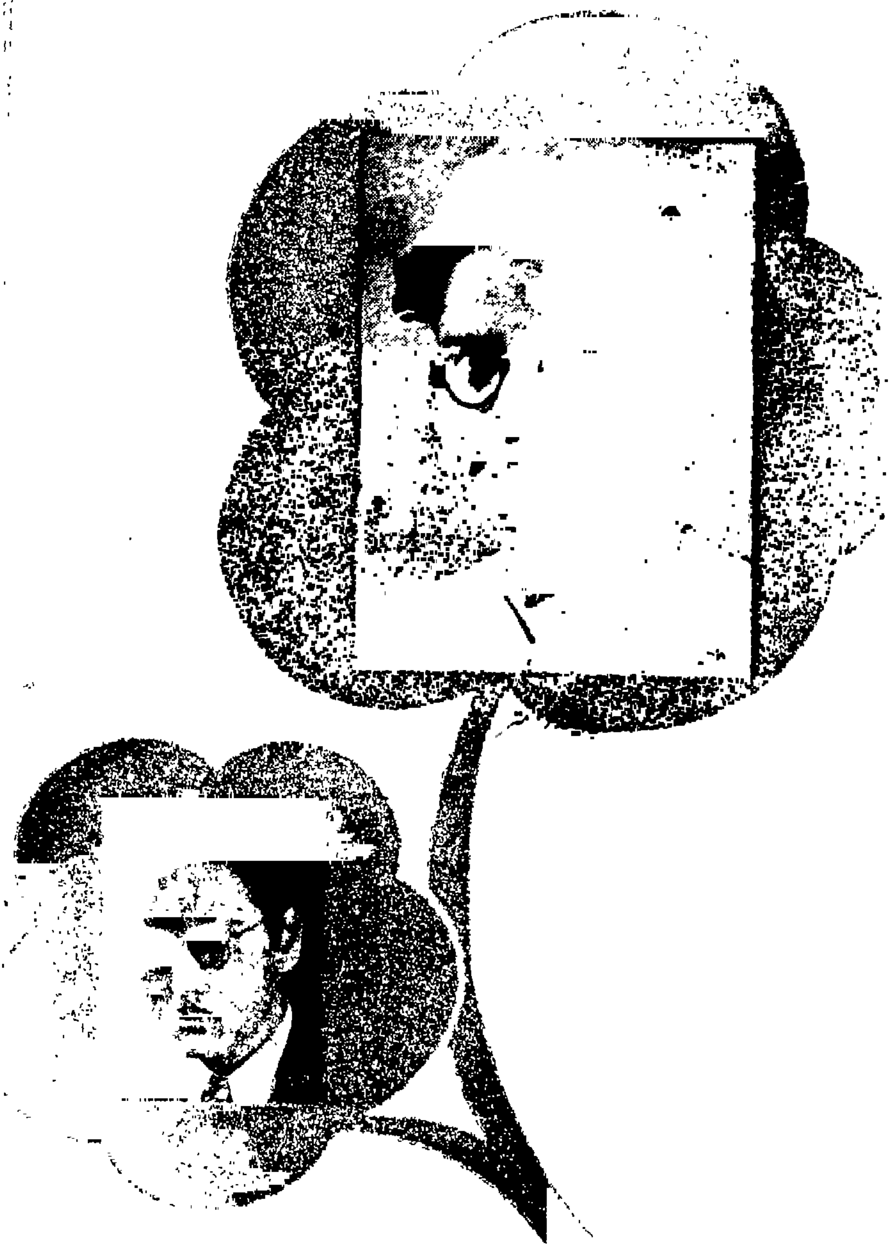
پریمیندر مترا ۱۹۰۴ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ شروع میں اسکول میں مدرس رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل فلموں کے لیے کہانیاں لکھنے کے علاوہ خود فلمیں بھی ڈائرکٹ کرتے ہیں۔ بیک وقت صف اول کے جرنلسٹ، افسانہ نگار، شاعر اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول اور افسانوں میں بنگال خصوصاً کلکتہ کی متوسط طبقے کی زندگی کی حقیقی جھلک ملتی ہے۔ جدید بنگال کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہے۔

"جلوس" پریمیندر مترا کا مشہور و معروف افسانہ ہے۔ اس جلوس زندگی کے جلوس کو کوئی معین شاہراہ نہیں ہے۔ شاہراہ معین کرنے کی کوئی خواہش بھی شکل اور نصب العین ہی نہیں ہے۔ حالات جہاں کو کہیں لے جاتے ہیں وہ بغیر [illegible] اسی بہاؤ میں بہہ جاتا ہے [illegible] ساحل پر لا کر پٹخ دیتے ہیں [illegible] کرتے جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں اکثر یہی تو ہوتا ہے۔ [illegible] جاتے ہیں [illegible] جاتے ہیں اس کا مطلب کون رکھتا ہے۔ اب ان کے اس ناولٹ کی بات سنیے۔

"[illegible] کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے شامل ہونے والے ان [illegible] کی اس جماعت کی داستان جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی اثر انگیز۔ آپ دیکھیں گے کہ [illegible] ملک کی خدمت کو [illegible] کے ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی [illegible] نہیں ہو سکتے [illegible] پسند زندہ دل اور عاشق مزاج نوجوان ہے۔ جس کا قول ہے زندگی اگر منانا ہے تو چالاکی سے منائی جائے۔ ان میں پارسی ہے لیکن اس کی زندہ دلی [illegible] ظرافت، بنسی مذاق اور ان سب کے [illegible] ایک خاموش تبسم اور [illegible] آپ اسے چاہے بغیر نہیں رہ سکتے ۔۔۔ ایک طرح سے اس ناولٹ کا ہیرو کہا جا سکتا ہے۔ [illegible] کا ذکر [illegible] گیا ہے کیونکہ [illegible] کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] کی چالاکیوں سے نفرت کرنے کے باوجود اس کی شخصیت کے دبا ؤ سے آخر تک آزاد نہیں ہو پاتا۔ معصوم [illegible] سے [illegible] کا مقابلہ کرنے کے نااہل۔ [illegible] کے بھولے پن کی وجہ سے اسے [illegible] سے گھبراتی ہے [illegible] کی یہ حسرت — "اچھا میں تو چلتی ہوں، شاید پھر ملاقات نہ ہو۔ ایک دن اسی طرح چھٹنے اور [illegible] کی حسرت [illegible] ایک [illegible] ہے۔ ساری دنیا [illegible] کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس نے صرف دینا سیکھا ہے لینا نہیں سیکھا۔

اس ناولٹ کا سب سے بڑا کردار [illegible] ماسٹر کا ہے جو ناولٹ کے آخر میں آتا ہے اور ہم سب پر گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ [illegible] کہا [illegible] ماسٹر صاحب سے زندگی میں پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ [illegible] کی دھوتی پہنے ننگے جسم، سر پر ٹوپی پہنے شاید آج بھی وہ اسی طرح [illegible] اسٹیشن پر ریل گاڑیوں کو پاس کراتے ہوں گے ...... لیکن پھر بھی انسان کی کمینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں، ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں۔ ہم اور آپ بھی ایسے موقعوں پر [illegible] ماسٹر کو یاد کر کے دل کو تسلی دیں گے۔
[illegible] کمال [illegible] وغیرہ بھی [illegible] آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔



پریمیندر متر   ترجمہ: شیام سُندر

جلوس

نہ جانے کب نیند آگئی۔

غنودگی کی حالت میں ایسا محسوس ہُوا گویا نیچے سمندر گرج رہا ہو۔ میں چونک کر اُٹھا۔ واقعی سمندر کی ہی گرج تھی۔ بحث مباحثہ کے سمندر کی گرج!

زندگی کے متنوع، عجیب و غریب اور مفصّل رُوپ کی بانی تیز رفتاری سے سیاہ حرفوں میں کاغذ پر اُتر رہی تھی۔

پروف کو میز پر رکھ کر اوناش نے کہا۔ "دیکھئے، ذرا جلدی سے دیکھئے۔ اس آرٹیکل کے واسطے فرما رُکا ہُوا ہے۔"

چھپن ایک کونے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے وہیں سے پھٹکار لگائی۔ "ذرا بچا ہے تو زنگار ہے۔ میری بلا سے۔ تمہارا فرما رُکتا ہی رہتا ہے۔ ایک پیس تو کاغذ پر اسی وقت بھیج گیا۔ قلم رکھتے ہی چھٹ جائے گا۔ اتنی جلدی پروف کیسے پڑھا جائے گا؟ خدا نہیں ابھی کوسوں"

اسکی بات کی تائید کرتے ہوئے کاشی ناتھ نے کہا۔ "دوسرا پروف نئے کے لئے کہو۔ کچھ! نہیں تو ہم لوگ جلدی نہیں کر سکیں گے۔"

سیاہی سے سنے ہوئے دونوں ہاتھوں کو بے بسی سے پھیلا کر اوناش نے کہا۔ "آپ ہی بتایئے۔ میں کیا کروں۔ میرے ہاتھ میں ہے کیا!" یہ کہہ کر کاشی ناتھ نے پروف اُٹھا لیا۔

چھپن کی پھٹکار سے سہم کر اوناش نے عزت بھی کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے غم کی داستان سُنائی۔

"مجھے جھڑکنے سے کیا ہوگا۔ آپ ہی بتایئے۔ مجھے اس جلد بازی کی عادت تھوڑا ہی ہے۔ کل مشین ٹوٹ جانے سے دیر ہو گئی۔ ڈاک نکل گئی [illegible] کے زمانہ کی تو مشین ہے۔ ہمیشہ بگڑی ہی رہتی ہے۔ لیکن سارا قصور میرے سر منڈھا جاتا ہے۔ اسی لئے جہاں تک ہو سکے چاہتا ہوں کہ کام جلد از جلد ختم ہو جائے۔"

اوناش میرا پرنٹر ہے۔ اخبار میں روزانہ اس کا نام بھی ایڈیٹر کے نام کے ساتھ ٹائپ کے حروف میں شائع ہوتا ہے۔ کوئی خطا ہو گئی تو اُسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ نوبت پڑنے پر شاید جیل بھی جانا پڑے۔ لیکن اسے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

داڑھی مونچھ سے عاری، رسّی کی طرح اینٹھا ہُوا اُس کا چہرہ دیکھ کر اُس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک خاص حد تک پہنچ کر اسکی عمر آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتی۔

"چھپ چھپا کر تھوڑی سی پی بھی لیتا ہے؟" پوچھنے پر بے باکی سے جواب دیتا ہے۔ "واہ نہ پیوں تو کیسے ساری رات کو جاگ سکتا ہوں!"

نشے کے اثر سے یا کسی دوسری وجہ سے، وہ ساری رات بھر لگاتار جاگ سکتا ہے۔ اس بات میں کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں۔ آج پچیس سال سے وہ اسی طرح رات رات بھر جاگتا آیا ہے۔ اُسے موقع ملتا اور سانس لینے کی فرصت ہوتی تو وہ یہ بات سُنانے سے باز نہ آتا۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتا۔ "آج تو یہ کاروبار بہت پھیل گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں، تین تین بڑی مشینیں اور تین سو آدمی۔ لیکن جب یہ اخبار ایک چھوٹے سے مکان میں ہینڈ پریس میں چھپ کر نکلتا تھا، تب رات رات بھر یہ اوناش اکیلا ہی اپنے دم پر سارا اخبار نکالتا تھا۔

ایک عجیب انداز سے انگلی سے سینے کی طرف جس کی

ایک ایک پسلی ابھری ہوئی تھی: اشارہ کرکے وہ کہتا: "آپ یقین نہیں کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رام بابو کو لکھنے کی فرصت نہ ہوتی۔ بس کھڑے کھڑے منہ سے بولتے جاتے اور میں سُن سُن کر کمپوز کرتا جاتا۔ اور تب وہ فتوے صادر کر دیتا، ایسا ایڈیٹر ایسا کبھی نہ پیدا ہوگا۔ اُن جیسا زور اب کس کی قلم میں ہے؟"

پچیس سال پہلے جب "بےباک" کلکتہ کی ایک معمولی سی گلی کے ایک بوسیدہ اور پرانے مکان کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں پیدا ہوا (نہ کہیں اُس گلی کا نشان ہے اور نہ اس گھر کا) ایک پرانے ہینڈ پریس کی کوکھ سے وہ دھرتی پر گرا۔ تب اُس کی پرورش صرف دو آدمیوں نے کی ایڈیٹر سوامی رام بابو اور ہمارا یہ اوناش۔ اس کے بعد "بےباک" ماوفر کی طرح دن بدن بڑھنے لگا۔ دو صفحوں سے سو صفحوں کا ہوا۔ ہینڈ پریس کی جگہ تین تین راٹری مشینیں ناکافی ہو گئیں۔ بنگال کے دور افتادہ اور دشوار گزار راستوں والے گاؤں تک "بےباک" کی بے خوف آواز دندناتی پہنچتی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ، دوسرے سے تیسرے، اس طرح اس کا حلقہ اور رسوخ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

"بےباک" کی ترقی کی منزل تک اگر کسی نے لگاتار اس کا ساتھ دیا تو صرف اوناش بابو نے۔

"لیکن جرمانے کی بات غلط ہے۔ میں کہتا ہوں تمہاری یہ بات جھوٹ ہے اوناش۔ بھلا تمہارے اوپر وہ لوگ جرمانہ کر سکتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی اوناش کا لہجہ بدل جاتا۔ سوکھی ہنسی ہنس کر کہتا۔ "ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ایسا ہونے پر ایمان زندہ رہ جائے گا! کہتے ہیں۔۔۔۔۔!"

لیکن اُسے اپنی بات ختم کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مضمون کا پروف سامنے پھینک کر۔ منہ بنا کر کاشی ناتھ کہتا: "اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لے جاؤ یہ سیکڑوں غلطیاں تم لوگ کہاں تک درست کریں گے؟"

اوناش جواب تک نہ دیتا۔ پروف لے کر ایک سانس میں نیچے اُتر جاتا۔ میز کے اوپر پیر پھیلا کر، کرسی سے سر ٹیک کر کاشی ناتھ کچھ دیر سو لینے کی کوشش کرتا۔

نیچے پریس۔ ہفتہ وار کی خاموشی کا سینہ چیر کر راٹری مشین کا شور بلند ہوتا رہتا۔ نیند میں سمندر کے گرجنے کی آواز سا عجیب محسوس ہوتی۔

چھپائی کے حروف میں بند ہونے سے پہلے گویا عبارت کی یہ آخری چیخ ہوتی!

× × × ×

صبح نیا ہی نقشہ ہوتا۔

نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اُٹھنے کو طبیعت نہ کرتی خاموش پڑا پڑا سب آوازیں سنتا رہتا۔

قریب کے مکان میں جھاڑو والے نے کاغذ کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر ایک بڑا سا ڈھیر لگا دیا تھا۔ نیچے راٹری مشین اب بھی نہ رکی تھی۔ لیکن ٹھیک دس بجے کے شور و غل، سائیکل والے اخبار فروش لڑکوں کی چیخ و پکار نے مشین کی آواز کو بھی دبا دیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بستر سے اُٹھا تو آفس کے دروازے کے سامنے اخبار فروش پھیری والوں کی بھیڑ بہت کم ہو گئی تھی۔ میرے سامنے سے شاید آخری پھیری والا کمر پر اخبار لگائے باہر نکل گیا۔ بھاری پیٹھ جہاں میں کاغذ کے پلندے جو سیلی بھرے ہوئے تھے بیل گاڑی سے اتارے جا رہے تھے۔ باہر جانے کے تنگ راستے پر ان بڑے بڑے پیپوں کے پاس سے نکل کر جاتے جاتے دیوار پر چپکے پوسٹر کا پیغام نظر سے گزرا: "ہندوستان کے نوجوانو! جاگو!"

رات کو جاگنے سے جسم کسلمند تھا۔ یہ پیغام پڑھ کر ایک پھیکی سی ہنسی چہرے پر آ گئی لیکن یاد آتا ہے کہ ایک دن اسی پیغام کو پڑھ کر میں خوشی سے جھوم اُٹھا تھا۔ اس دن مجھے محسوس ہوا تھا کہ "بےباک" اس پیغام کو بنگال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا رہا ہوگا۔ بنگال کے نوجوانوں میں نئی زندگی کی روح پھونکنے کی تحریک کو چاہے کتنی ہی کامیابی ہو، اس میں میرا بھی تھوڑا سا ہاتھ رہا ہے۔ یہ سوچ کر اُن دنوں میں نے خاص فخر محسوس کیا تھا۔

× × × ×

ایک دن اچانک [illegible] ملک کی خدمت کرنے کا خواب دیکھتا ہوں۔ گھر میں بیٹھ کر جو پڑھتا تھا [illegible] مجھ کو اپنے ہاتھ کا بنا [illegible] سوچ کر ملک کی خدمت [illegible]

کانوں کے ستم کرنے کے بوجھ میں آکر آدھی آدھی رات کو ٹھلی بنا کر دوسروں کے کھیتوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے جاتا اور دوسروں سے تالاب سے مٹی کا تیل چراتا ۔ اس کام میں کبھی کبھار مار اور پھٹکار بھی ملتی تھی۔

اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں بھٹکتا ہوا میں کلکتہ پہنچا جیل ہی میں شمبھو سے ملاقات ہوئی ۔ ایک ایسی کوٹھری میں پچیس آدمی سوتے تھے ۔

ایک دن پیچھے سے جیسے ٹوٹ گئی ۔ کوٹھری میں ہنگامہ برپا تھا ۔ میرے پاس کے بستر پر جو لڑکا سوتا تھا ۔ اس نے گھبراہٹ میں مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔ "اٹھئے صاحب! کوئی گلے میں رسی باندھ کر لٹک گیا ہے۔"

جلدی جلدی اٹھ کر دیکھا تو روشن دانی کھڑکی کی سلاخوں سے ایک لمبا کپڑا باندھ کر اس کا پھندا گلے میں ڈالے ایک آدمی جھول رہا تھا ۔ ایک چھوٹی سی [illegible]

دور سے دیکھنے میں اس کا چہرہ بڑا بھیانک معلوم ہوتا ۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی ۔ اس کی بند آنکھوں کے کناروں پر سیاہی جمی ہوئی تھی۔

[illegible] دم گھٹ کر مرا [illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible] کب تک رکھا جا سکتا تھا ۔

[illegible]

بھانجے [illegible] اس نے کہا [illegible]
میں حیران رہ گیا ۔ اترتے ہوئے اس نے کہا ۔ "گدھا کہیں کا ! بنا بنایا مزا کرکرا کر دیا ۔ سپرنٹنڈنٹ کو وہ ناچ نچاتا کہ یاد کرتا !"

چاروں طرف ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا ۔ اگر اس ہنسی میں کوئی شریک نہ تھا تو بیچارہ وارڈن ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو کیا کیفیت دے گا یہی سوچتا ہوا باری باری سب کے چہروں کو تک رہا تھا ۔

آنکھ کے کناروں سے لالٹین کی سیاہی پونچھتے ہوئے اس "خودکشی" کرنے والے لڑکے نے ہنسی میں ڈانٹتے ہوئے کہا ۔ "بڑے چودھری بنے پھرتے ہو ۔ تمہیں کیا ضرورت تھی مجھے اتارنے کی؟ بتلاؤ!"

یہ تھا شمبھو ۔ وارڈن کو پریشان کرنے کے لئے روزانہ کوئی نیا طریقہ سوچ لیا کرتا ۔ وہ جانتا بھی بہت کچھ تھا ۔ گانا بجانا ، [illegible] جمناسٹک وغیرہ ۔ ان تمام ہنروں سے وہ اکیلا ہی سارے وارڈ کا جی بہلائے رکھتا تھا ۔

یاد نہیں پڑتا کتنی مدت تک اس سے جیل میں دوستی رہی ۔ اس کے ساتھ تعلقات جیل سے باہر آنے پر مضبوط ہوئے ۔ ہم دونوں ایک ہی دن چھوٹ کر باہر نکلے تھے ۔

کلکتہ میں میرا ایک ٹھکانہ تھا تو ضرور لیکن میں جانتا تھا کہ جیل سے چھوٹ کر ایک سرکاری ملازم کے گھر کچھ اچھا خیر مقدم نہ ہوگا ۔ مجھے شش و پنج میں پڑا دیکھ کر اس نے خود مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی ۔ اس کے گھر کے بارے میں پوچھے بغیر مجھے اس کے ساتھ چل کھڑا ہونا پڑا ۔

کلکتہ کے ایک غریب محلے کے ایک ٹوٹے پھوٹے کچے گھر کی شکل دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ کلکتہ میں ٹھاٹ سے رہتے ہوئے بھی شمبھو کی حالت میری نسبت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ گھر اس کا اپنا نہ تھا ۔ ایک کوٹھری میں وہ کرایہ دے کر رہتا تھا بس ۔

[illegible] ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی نے [illegible]

اسے انسان جانکے۔ وہ تو مُعذور رہا۔ اسا سے میں کبھی نے بات تک نہ پوچھی۔ گھر آنے پر ایک صنفِ نازک کی شکل نظر آئی تو وہ بھی غائب ہوگئی یا چھپا تو آ۔"

یہ سوچکر کہ یہ لڑکی رشتے میں اسکی کچھ لگتی ہوگی مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ لیکن گھر میں جاکر بیٹھنے پر اسکی بات سے مجھے حیرانی ہوئی۔ گھر کے ایک کونے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی چٹائی کو کھول کر اس نے بچھا دیا۔ جس لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ شاید وہی دبے قدموں سامنے سے نکل گئی۔

اچانک میری دونوں آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے موند کر اس نے کہا۔ "گدھا کہیں کا۔ ادھر اس طرح کیا دیکھ رہا ہے۔ میں نے تجھے گھر میں پناہ دی۔ اور تو مجھے ہی تباہ کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ تیری قسم دو برس کی رفاقت کے بعد تو مقصد ہاتھ میں آنے کو ہے۔ میں کہے دیتا ہوں اب اگر تو نے کیا معاملہ چوپٹ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔"

اس کے بعد میرے چہرے کو دیکھ کر اتنے زور سے ہنسا کہ سارا کمرہ ہل گیا۔ بولا۔ "تو تو دوسرا رشی کا اوتار ہے۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

سوچا تھا۔ اسی دن اسکا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن جا نہ سکا۔ بات یہ نہ تھی کہ میرا کوئی ٹھکانا نہ تھا لیکن شمیمن کو چھوڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ شمیمن میں خامیاں کچھ کم نہ تھیں۔

کبھی کبھی ایسا لگتا کہ اس کے نزدیک زندگی کے کسی آدرش کی کوئی قیمت نہیں۔ کبھی کبھی اس کے مسخرے پن کے مذاق سے میرا دل تنگ ہو جاتا۔ لیکن پھر نہ معلوم کیسے میں اُسے چاہنے لگا۔

اُس کے سہارے دن گزرتے رہے۔ شروع میں تو کچھ دنوں تک میں نہ جان سکا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کسی دوسرے آدمی کا بوجھ اُٹھانا تو درکنار خود اپنا گزارہ کرنا بھی اسکے بس کی بات نہ تھی۔ ایک دن شرم کے مارے میں نے واپس وطن جانے کی اجازت مانگی۔

شمیمن پہلے تو سنجیدہ ہوگیا پھر ہنس کر زور سے آواز دی "منو! سنو کہیں تو ذرا ایک بات ہے" اس کے آتے ہی شمیمن نے بھاری آواز بنا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا ہے۔ یہ تمہارا بڑا بھاری نقصان ہے۔ کیونکہ [illegible] یہ ماں کی خدمت کرنے آیا ہے۔ لیکن وہ فاقہ کشی [illegible] سکا۔ دیکھو

وہ خفا ہوکر اپنے وطن جا رہا ہے!"

بے حد شرمندہ ہوکر میں نے کہا۔ "واقعی میں اس لئے جانا چاہتا ہوں!"

ادھر کئی دنوں سے منو میرے سامنے بلا جھجک نکلنے لگی تھی۔ ان کئی دنوں کے قیام سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ خدمت کرنے میں یہ نٹ کھٹ لڑکی کسی سے کم نہیں۔ چنانچہ اس نے ہنس کر کہا۔ "فاقہ کرنے پر بھی دیو جیسا چہرہ ہے۔ دیکھنے سے ہی خوف آتا ہے۔ پیٹ بھر کھانا دے دیا۔ تو زندہ نہ چھوڑیں گے!"

منو جا رہی تھی۔ اُسے واپس بلا کر شمیمن نے کہا۔ "دیکھو منو، یہ میں مانتا ہوں کہ تو دین نوجوان ہے۔ لیکن تم اس طرح میرے سامنے اسکے چہرے کی تعریف نہ کیا کرو۔ مجھے رشک ہوتا ہے!"

"میری بلا سے!" یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

شمیمن کو میں پہچانتا تھا۔ میری بات کو اس نے اس طرح دبا دیا۔ یہ بھی میں نے سمجھ لیا۔ لیکن اس طرح کتنے دن کام چلے گا۔ یہ سوچ کر میں فکر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اس کی اپنی آمدنی کچھ بھی نہ تھی۔ پرانے تعلقات کے ذریعے یا کسی بھی رشتے سے اس غریب کے جو اپنا بوجھ ڈال کر وہ رہ سکتا ہے۔ لیکن بلا وجہ ایک دوست کا بوجھ بھی ڈال دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ اس سے یہ بات کہنا بیکار ہے۔ میں نے ایک دن خود سے بات اٹھائی۔ اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔ "انسان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو، بتاؤ تو سہی۔ ہم تم سب انسان کی سیوا کریں اور ہماری بھلائی کوئی نہ کرے۔ یہ ادا بھی خوب ہے!"

لیکن یہ بھلائی میرے لئے برداشت کرنا میرے لئے ناممکن ہوگیا۔ ایک ہی آدمی کی کمائی سے منو وغیرہ کے گھر کا خرچ جیسے تیسے چل رہا تھا۔ مورچہ کے ایک کارخانے میں [illegible] کام کرکے منو کا بڑا بھائی جو کچھ گھر لاتا تھا وہ اسکی بیوہ ماں اور بہن کے لئے ہی کافی نہ تھا۔ اس کے اوپر [illegible] کا بوجھ اس گھر پر مصیبت کے بادل کی طرح چھایا ہوا تھا۔

اس کی پیشانی پر بل نہ پڑے [illegible] دیکھ [illegible] شمیمن [illegible]

کر بڑی عقیدت ہے۔ اُن کے لئے وہ کسی دیوتا سے کم نہ تھا۔

اپنا کام ختم کر کے گھر لوٹتے ہیں اکثر کرامات ہو جاتی تھی۔ اُن سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ شمیم کے ساتھ اُسے دو ایک بار بات کرتے سُنا تو میں حیران ہو گیا۔ انسان کو انسان سے اتنی عقیدت ہو سکتی ہے۔ اس کا میں نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔

شمیم کے لئے اس عقیدت کو برداشت کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی یہ جانتے ہوئے بھی اس عقیدت کی لڑکی سے دن کاٹنے کے خیال سے میرا دل غم سے بھر جاتا تھا۔

میرے وطن جانے کی بات کو دبا کر شمیم اطمینان سے بستر میں لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میں نے کہا "بھائی تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔ ذرا سی دیر کے لئے ہنسی مذاق کو بالائے طاق رکھ کر میری بات سُن لو۔"

میری طرف ایک بار دیکھ کر معلوم نہیں کیا سوچ کر چہرے پر آئی ہوئی ہنسی روک کر اُس نے کہا "کہو! کیا بات ہے؟"

"اس طرح کا ملبوں کی طرح دن گزارنا تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

"یہ تو ہوئی تمہید۔ اس کے بعد؟"

"اس کے بعد! . . . . . اسی طرح اگر رہنا ہے تو کچھ کام دھندے کی کوشش نہیں کی جا سکتی! تم چاہے نہ کرو لیکن کیا میں بھی نہیں کر سکتا؟"

تیزی سے اُٹھ کر بیٹھتا ہوا شمیم بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ کچھ کام دھندہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں کا ملبوں اور اپاہجوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس دھرتی کو خون پسینے سے سینچ کر سرسبز کر شاداب بنا دیا ہے۔ جنہوں نے اپنے ناخنوں سے دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں سے گوہرِ مقصود برآمد کیا ہے۔ ہم لوگ محتاج نہیں ہیں، جو ہاتھ ہم اپنے منہ میں نوالے دیتے ہیں وہ ہاتھ نازک نہیں ہیں بلکہ محنت سے سخت ہو گئے ہیں . . . مجھا"

اُس کی بات سُن کر میں کھسیانا ضرور ہوا لیکن جوش میں آ کر جب اُس نے منو کو کچا ہی تو میں ہنس پڑا "بولا"۔ "پھر منو کی ضرورت کیوں آ پڑی؟"

"منو بھی لوگوں کی تو بڑی ضرورت ہے۔ سب کاموں کے لوگ ہم جیسے ہی تو ہماری طاقت ہیں!"

"تمہارا جوش میں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت کس طاقت کی ضرورت ہے، ذرا سمجھاؤ تو سہی!" منو نگر چوکھٹ پر کھڑی ہو کر ہنسنے لگی۔

"جانتا ہوں تم سب باتیں سُن رہی تھیں۔ تمہیں یہاں سے دیکھ بھی تو رہا تھا۔ اچھا، تمہارا وہ کنگن ابھی ہے یا چلا گیا؟ مہینے بھر پہلے شاید تم سے لیا تھا۔ واپس دیا کہ نہیں، یاد نہیں آتا!"

"واپس دے دیا تھا۔ سمجھو لوٹا دیتی ہوں!" یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ "بولو تم بڑے بے حیا ہو شمیم۔ ان لوگوں کے اوپر اتنا ظلم کر کے بھی تمہیں چین نہیں آیا۔ منو کا کنگن تم نے کس منہ سے مانگا تھا؟"

"بڑے خوبصورت، ہنس کر منہ سے، ذرا دیکھو!" کچھ دیر چپ رہ کر اس نے پھر کہا۔ "ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی۔ دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں!"

منو کے کنگن لا دینے پر شمیم مجھے ساتھ لے کر باہر نکلا۔

دل ہی دل میں کڑھتا ہوا اُس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں کاغذ میں لپٹے ہوئے کنگن کو ایک بار نکال کر شمیم نے کہا۔ "تو تم بھی تو کام دھندے کی بات شروع کی تھی۔ ورنہ مجھے تو اس کا خیال تک نہ آتا!"

"خیال تو خوب ہے! چلو ہو ایک بے کس لڑکی کا زیور بیچنے!" شمیم مسکرا دیا اور میری کمر تھپتھپا کر بولا۔ "بڑے ڈرپوک ہو! اخبار کا بنڈل لے کر پھیری لگانے میں شرم لگے گا تو نہیں!"

مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے پھر کہا۔ "ارے پاگل تمام دھندے کے لئے بھی تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کنگن کا روپیہ اخبار کے دفتر میں جمع کرا دوں۔ دونوں آدمی اخبار بیچا کریں گے۔ دو مہینے میں کنگن تو کیا منو کے لئے سونے کا ہار بنا کر سارا قرض اتار دیں گے۔ سمجھا؟"

سمجھ کر بھی میں زیادہ خوش نہ ہو سکا۔

اس کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر ایک دکان میں جب پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "راستے میں کہیں اور سُنار کی دکان نہ تھی؟"

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ دکان میں گھس گیا۔ لیکن تھوڑی

اور کہنے لگے کہ باوجود سخت اداس پن سکا سنتا دیکھ دینا چاہتا تھا وہ غلطی بہت کم تھا۔ کنگن کو کاغذ میں لپیٹ کر وہ واپس چلنے لگا تھا۔ یکایک نہ جانے کیا سوچ کر وہ مڑا اور موٹا سا کاغذ اس کی طرف پھینک کر بولا۔ "دیکھئے جو آپ اپنا محرم سمجھیں۔ وہاں دیکھئے۔ بہت گھوم چکا ہوں۔ اب اللہ کرم کریں کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

سنار نے شاید کچھ بازی مار لی تھی، کہیں ہمارا ارادہ بدل نہ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے روپیہ نکال کر دیئے راستے میں چلتے چلتے میں نے کچھ تعجب سے پوچھا۔

"زیادہ قیمت حاصل کرنے کے ارادے سے اتنی دور آکر اتنے کم پیسوں میں کیسے راضی ہو گئے؟"

"کیا کرتا اور کہاں کہاں گھومتا؟" کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

گھبرا کر اس کی ہنسی کا مطلب سمجھ کر میرا دل تعجب، غم اور نفرت سے بھر گیا۔ منو کو بلا کر شمیم نے کہا "یہ روپے رکھ لینا منو۔ کل ان روپوں سے کوئی دھندہ شروع کریں گے۔ اور تمہارے کنگن کی آج ضرورت نہیں پڑی۔ اسے بھی رکھ لو۔" کاغذ میں لپٹا کنگن نکال کر اس نے منو کو دے دیا۔

منو کے جاتے ہی اس نے میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا "دنگ رہ گیا نہ [illegible]! جا [illegible]۔ ہاتھ کی صفائی یہیں تھوڑا بہت سیکھی ہے۔"

"تمہارا چہرہ دیکھ کر دنگ نہیں ہوا شمیم۔ لیکن خیر چھوڑو اس بات کو۔ کل سے میں یہاں نہیں رہوں گا۔" غم و غصہ سے میری آواز بھرا رہی تھی۔

میرے پاس آکر بیٹھ، میری طرف دیکھتا ہوا وہ ہنس پڑا۔ پھر غمگین لہجے میں بولا۔ "تم سب کارل مارکس اور لینن پڑھتے ہو۔ منہ سے کہتے ہو دنیا کی ساری ملکیت سب کو برابر تقسیم کر کے سب کو ایک جیسا ہونا چاہیئے۔ میں تھوڑا سیدھا سادا آدمی ہوں۔ یہ باتیں سن کر میں نے تمہارے [illegible] کے پہلو کا ایک [illegible] بات پر [illegible] لینن کی [illegible]

میری [illegible] ہاتھ کی صفائی کیا جرم ہو گی"

اس وقت اس کا مسخرا پن برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اتنا ہی کہا "نہیں شمیم میں اب اور یہاں نہیں رہ سکوں گا۔"

منو کھانا رکھنے کے لئے بلانے آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اس کے کانوں میں میری بات چیت کا آخری جملہ پڑ گیا تھا۔ اس نے پوچھا "نہ رہ سکیں گے! کون نہیں رہ سکے گا؟"

شمیم نے کہا "یہ ہیں کل یہاں سے چلے جائیں گے منو! خیر چلے جائیں۔ اچھا ہی ہے۔ رقابت کے مارے میری تو کئی راتوں سے نیند حرام ہو گئی ہے۔"

منو ہنس پڑی۔ بولی "بات بات پہ کیا مذاق کرتے ہو تم!"

اس رات کھانے کے وقت اور کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ شمیم نے ایک آدھ بار مذاق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی بات کوئی نہیں سنتا وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔

اچانک اس گھر کو چھوڑ کر چلے جانے کا اپنا ارادہ تھا پر کچھ مجھے نہ جانے کیوں اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ منو بھی میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے جاتے جاتے وقت ایک بار نظریں چار ہوئیں تو اس نے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے آپ جانے نہ کہ منو کے کھانے سے گھبرا کر بھاگ رہے ہیں؟"

"اور جانے کچھ بھی کہو، مگر یہ الزام تم نہیں لگا سکتیں منو۔ تمہارا کھانا تو کیا جیل کی قیمہ" اور [illegible]" کے کھانے کا فرق وہی سمجھ سکتا ہے۔ اس کا بڑے سے بڑا دشمن بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکتا!" کہہ کر شمیم ہنس پڑا۔

دوسرے دن سویرے جب سو کر اٹھا تو زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی اپنے معمول کے مطابق تو بچھے ہوئے بستر چھوڑنا جس کے اصول کے خلاف تھا۔ وہ شمیم اتنے سویرے اٹھ کر کہاں غائب ہو گیا! گھر میں اس کا پتہ نہ تھا۔

میرا تھوڑا سا سامان تھا وہ ایک گٹھڑی میں باندھ رہا تھا۔ اتنے میں منو آکر چوکھٹ پر بیٹھ گئی اور بولی "یہ تم کیا کر رہے ہو؟" [illegible] جا رہا ہوں [illegible] کر پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ میری طرف [illegible] خاموشی سے [illegible]

سے مجھے یہ عجیب لگا تھا وہ ابھی ذرا دیر پہلے تھا۔

میرا سامان بندھ چکا تھا۔ صرف شپین سے ملاقات کئے بغیر لیکن منو سے ایک بار اچھی طرح وداع لئے بغیر چلے جانا مناسب ہوگا یا نہیں یہی سوچ رہا تھا۔ کبھی یہ بھی شبہ ہونے لگتا تھا کہ شپین کا اس طرح صبح صبح اچانک غائب ہو جانا کہیں مجھے روکنے کا بہانہ تو نہیں ہے۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی منو پھر آئی اور دروازے سے میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "اگر بالکل جانا ہی چاہتے ہو تو کھانا کھا کر جانا۔ میں نے کھانا چڑھا رکھا ہے۔"

منو کی بات سے میرا ارادہ بالکل پکا ہو گیا۔ زیادہ دیر یہاں رہنے پر اتنی ہمت برقرار رہے گی کہ یہاں سے جا سکوں، مجھے اس بات میں شک ہونے لگا تھا۔ چنانچہ جلدی سے بول اٹھا "نہیں نہیں اب کھانے پینے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی جانا ہے۔" اور میں پوٹلی ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

منو کیا یک ہنس پڑی۔ بولی "اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے! ہم لوگ زبردستی تو تمہیں یہاں نہیں باندھ سکتے۔"

شپین ہوتا تو شاید اس بات کا جواب دیتا۔ منو کے سامنے خاموش رہ جانا پڑا۔

منو نے پھر ہنس کر کہا "اخلاق کی خاطر ہی سہی میری بات سے انکار تو نہ کرنا چاہئے تھا۔ ایسے منہ چڑھے آدمی ملک کو آزاد کرنے چلے ہیں۔ تم ذرا گھر واپس چلے جاؤ، سمجھے!"

میں گونگا تو نہیں ہوں۔ لیکن اس دن اس لڑکی کے سامنے میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ مجرم کی طرح خاموش سر جھکائے پوٹلی لے کر دروازے سے باہر آ گیا۔ منو پہلے تو دروازہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ لیکن پھر میرے قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہی اس نے جھٹ میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں سہم کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کی کیسی عجیب حرکت ہے! مجھے بھونچکا دیکھ کر منو پھر ہنس پڑی۔ "اب اگر تمہیں پکڑ کر باندھ رکھوں تو؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ پھر بول اٹھی "سوچ سمجھ کے [illegible] ہے تم لڑکی ہے۔ ٹھیک ہے نا بفطرت [illegible]

غصے سے شاید سارا جسم کانپ رہا ہو گا۔

اس کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ کر بولی۔ "لیکن تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ مذاق کرنا بھی پاپ ہے۔" اور پھر گھر کے دروازے تک میرے ساتھ ساتھ آ کر دروازے کے ساتھ کھڑی ہو کر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "میرے بارے میں چاہے کچھ بھی سوچنا لیکن میرے سلوک سے ساری عورت ذات کو قصوروار نہ دے بیٹھنا۔ حالانکہ تمہارے جیسے آدمی سے یہ بھی امید نہیں!"

میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنا ضرور دیکھا کہ اس وقت بھی وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن راستہ چلتے چلتے مجھے محسوس ہوا کہ آج تک ایسی ہنسی اس کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔

x x x x x

کہاں جاؤں گا، کچھ طے نہ کر پایا تھا، بلا مقصد راستے پہ چلا جا رہا تھا۔

شپین کب میرے پیچھے لگ لیا تھا، یہ بھی پتہ نہ چلا۔ اچانک میری کمر پہ ایک دھول جما کر اس نے پوچھا۔ "اس طرح کیا سوچتا چلا جا رہا ہے۔ بول نا؟ میں پانچ منٹ سے تیرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔"

میں جو کچھ سوچ رہا تھا وہ شپین کو بتانا تو در کنار خود میرے ذہن میں بھی زیادہ واضح نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اس کی طرف مڑ کر صرف اتنا کہہ سکا۔ "آج تم سویرے کہاں چلے گئے تھے؟"

اس بات کا جواب نہ دے کر شپین نے کہا "تو تو واقعی جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا مجھ سے ملے بغیر تو کبھی نہ جا سکے گا۔ لیکن تو ہے بیشتر کی ذات کا آدمی۔ تیرے لئے سب کچھ ممکن ہے۔"

اس سے پہلے منو نے بھی یہی بات کہی تھی۔ شپین کی بات کا جواب نہ دے کر آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شپین نے پوچھا "لیکن جا کہاں رہا ہے؟ پہلے جو تیرا ٹھکانہ تھا وہاں تو میرا خیال ہے جانے کا کوئی امکان نہیں۔"

بات صحیح تھی۔ میں نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ سوچ نہیں سکا ہوں۔"

"سوچنے کو رکھا ہی کیا ہے!" اس نے ہنس کر کہا [illegible]

کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی فٹ پاتھ ہیں۔ دیکھ بھال
کر ایک پورٹیکو میں بسیرا لینے پر میں نے دیکھا ہے۔ موسلادھار
بارش میں ایک بوچھار نہیں آتی۔ سر کے نیچے رکھنے کے لئے ایک
اینٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا ملنا بھی دشوار نہیں ہوتا
اس لئے تو جہاں بھی رہے گا اچھا ہی رہے گا۔

اس کے بات کرنے کے انداز پر میں ہنس پڑا۔

اس نے پھر کہا۔ میرے ساتھ تو تو اب کہیں نہیں رہ سکے گا لیکن میری ایک بات سن کر کہیں جا بجا رات کی جنگ تو نہیں چھیڑ دے گا، بولو؟

میں نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟

"فٹ پاتھ سے کچھ ہی بہتر ایک جگہ میری دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص تو جگہ نہیں ایک میس ہے۔ ملک کی خاطر جو تین بار جیل ہو آیا ہو۔ اس کے لئے وہاں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اس لئے امید ہے سن یات سین اور ڈی ولیرا کی میس میں تو آرام سے رہے گا!"

میس کا پتہ وغیرہ اس نے بتا دیا تھا۔ تجویز بری نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں تذبذب میں پڑ گیا۔

شوپین نے میرے دل کی بات کو بھانپ کر کہا۔ "نہیں نہیں، روپے پیسے کی فکر نہ کرو۔ جب بھی سہولت سے ممکن ہو کچھ دے دینا۔ فقط اگر کوئی چیز وہاں درکار ہے تو جذبۂ حب الوطنی۔ اور یہ تیرے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لوگ تجھے دیکھتے ہی یہ بات سمجھ جائیں گے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں" کہہ کر شوپین نے اجازت مانگی اور چلا گیا۔

پتہ لگاتے لگاتے جب میں اس میس میں پہنچا تو دوپہر ہو گئی تھی۔ کھدر کی گاندھی ٹوپی ایک دبلا پتلا لڑکا میس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس سے پوچھا کہ میس میں رہنے کے لئے جگہ ہے یا نہیں موٹے چشمے کے اندر سے لو بھر وہ غور سے میری طرف دیکھتا رہا اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ آپ کا ہی نام دوجن بابو ہے؟

اگلے ہی لمحہ بڑی کاوش سے مجھے سلام کرکے لڑکے نے کہا۔ "واہ میں آپ ہی کے انتظار میں تو کھڑا تھا۔ دیر کیسے ہو گئی؟"

معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن کچھ پوچھنے سے پہلے ہی لڑکے نے جلدی سے کہا۔ "اوپر آئیے۔ آپ کے لئے اوپر ہی ایک سیٹ طے کی گئی ہے۔" اور پوٹلی گویا زبردستی میرے ہاتھ سے چھین کر وہ زینہ کے زینے سے اوپر چڑھ گیا۔

مجبوراً میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ لیکن یہ راز سمجھ میں نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے تعارف سے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا بڑا باتونی ہے فضول کی بکواس کئے جا رہا تھا۔ "سنگل سیٹ کا روم تو اس میس میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ڈبل سیٹ کا بھی ایک ہی ہے۔ آپ کے ہم سے ترین کو زبردستی بھیج دیا گیا ہے۔ وہ آسانی سے تھوڑا ہی جانا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے وہ رجنی بابو کی سیٹ تھی۔ سرکاری قیدی رجنی مکرجی، سمجھ گئے آپ؟"

باتوں کی اس جھڑی میں کچھ پوچھنے کی گنجائش نہ دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ لیکن اسکی باتوں سے ہی راز کھل گیا۔

وہ کہہ رہا تھا "سنا ہے آپ تنہائی چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کریں بتائیے کمرہ تو ہے نہیں سبھی کمروں میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی ہیں۔ آخر شوپین بابو نے کہا یہ بات ہے تو پھر مجبوری ہے۔ یہی سیٹ دے دو۔ وہ تو ایک ماہ کا پورا خرچ دے رہے تھے ہم نے کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ یہاں دکان لگا کر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں"

× × × × × ×

ایک چھوٹا سا گھر۔

اسی کے اندر بقول شوپین مستقبل کے ہیں بائیں ڈی ولیرا اور سن یات سین رہتے ہیں۔

لیکن چھوٹا ہونے پر بھی اس گھر کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر کے کسی کمرے میں شاید لینن بند رہتے تھے۔ اس گھر سے ہی وطن کا ایک سپوت ملک کے لئے اپنی قربانی دینے مانڈلے کی جیل میں گیا تھا۔

سال بھر میں دو بار اس گھر میں پولیس کا آنا معمولی بات تھی میس کے قیام کے دوران میں یہاں کی [illegible] تباہ کئی بار [illegible] فضول کی بکواس کرنے کی عادت کے باوجود بھی وہ لڑکا اچھا لگتا تھا۔ کمرے میں میرا ساتھی [illegible]

ہوتا تھا کہ وہ عہدِ طفلی کے خوابوں کی دنیا سے باہر نہ نکلا تھا۔ وہ اپنی عمر کے ساتھ بڑھا نہ تھا۔ اور شاید کبھی نہ بڑھ سکے گا۔ اس کا پتلا دبلا طفلانہ جسم جس کے اندر انکساری اور دوسروں کی خاطر خود کو مٹا دینے کا جذبہ تھا۔ اسکی ان خصوصیات کو بزدلی سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ چھوٹا بن رہنا چاہتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا خوابوں اور عقیدت میں ہی اس کی زندگی کی حقیقت پوشیدہ ہو۔ اس نے ہمیشہ اوپر نظر اٹھا کر ہی انسان کو دیکھا تھا۔ نیچی نظروں سے کسی کو دیکھنا اس نے نہ سیکھا تھا۔

اس کے ساتھ تفصیلی گفتگو کر کے مجھے بڑا تعجب ہوا۔

اسکی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ وطن میں اسکی بیوہ ماں تھی کئی چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ بڑی امیدوں کے ساتھ تمام آسائشوں سے خود کو محروم کر کے اسکی ماں نے جس لڑکے کو پڑھنے کے لئے کلکتہ بھیجا تھا۔ وہ واپس گھر نہیں لوٹا۔ زندہ ہے یا مر گیا، اسکی بھی کوئی خبر اس نے اپنی ماں کو نہیں بھجائی۔

وِلے نے غمگین انداز سے مسکرا کر کہا۔ گھر پہاں فاقے کر رہا ہے اور یہاں میں ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ مذاق معلوم ہوتا ہے نہ ندی دادا؟

اس کے بعد وہ خود بخود کہتا گیا۔ لیکن سارے بنگال کی ماؤں کے بیٹے مر گئے ہیں ندی دادا۔ ان کے غم میں میری ماں کا غم بھی شامل ہے۔

اتنا نازک مزاج اور جذباتی تھا وہ۔

کسی دوسرے کے منہ سے سنتا تو شاید یہ باتیں مصنوعی معلوم ہوتیں۔ لیکن وِلے کے منہ سے سن کر کوئی غلط نہ معلوم ہوئی۔ وِلے کہتا گیا۔ اپنی قابلیت کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے ندی دادا! ملک تو دور رہا اپنی ماں کا دکھ دور کرنے کی بھی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔ دنیا کے ناکارہ اور نا اہل لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے وہ میں جانتا ہوں لیکن زندگی کے کسی بنیادی مقصد میں اپنی نا اہلیت ظاہر کر کے میں زندہ نہیں رہنا چاہتا ندی دادا!

[illegible] کہ میں نے پھر کہا۔ [illegible] کو اگر جیتا

ہیں ہے تو اسے کم از کم یہ اطمینان تو ہو۔ کہ وہ روشنی حاصل کرنے کی کوشش میں جلا ہے!

ہم دونوں لمحہ بھر خاموش بیٹھے رہے۔

کھڑکی کے باہر ویران نظروں سے دیکھتا ہوا وِلے شاید اپنی اہلیت اور وجود کو شاعری کا رنگ دے کر دلکش بنا رہا تھا۔ ادھر میں یکایک اپنے دل کی تیز دھڑکن کا خیال کر کے شرمندہ ہو گیا پچھلے کئی دنوں سے میرا تخیل جس مقصد کے حصول کے لئے چکر کاٹ رہا ہے۔ اسکا ٹھکانہ کہاں ہے۔ اس بات کو چھپا نہ سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں شرمندہ ہی نہیں خوفزدہ بھی تھا۔

عورت کے بغیر زندگی کا خواب میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میری زندگی کو ناکامیابی کے راستے سے ہٹانے والی جس عورت کے پیکر کی میں نے اپنے ذہن میں تشکیل کی تھی۔ وہ مجھے زندگی میں ابھی تک نہ ملی تھی۔ سوچا تھا عورت پر کٹے ہوئے پرندے کی مانند میری آغوش میں آکر گر جائے گی، میری پناہ کی طلبگار ہوگی لیکن یہ خواب زندگی میں شاید پورے نہ ہوں گے۔

اچانک شمبھو کی بات سے میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب سے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ ہنستے ہنستے اور پھر سنجیدہ چہرہ بنا کر اس نے کہا۔

"مجھے بڑا اطمینان ہوا وِلے۔ ملک کے لئے اسی لگن کی ضرورت ہے۔ نیچے مکان مالک میس کا کرایہ لینے آیا ہے۔ کرایہ کے بدلے تمہارے رسوئیے مہاراج نے اسکی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا ہے۔ تم لوگوں کے اس میس کے جھگڑے سے آدھا کلکتہ پریشان ہے۔ لیکن تم لوگوں کے کان پر اگر جوں نہیں رینگتی تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

وِلے کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ شمبھو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ کہتا گیا۔ "ملک کی خدمت کے لئے جو لوگ آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کوئی تو صرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں ہتھکڑی پہننے کے لئے! لیکن اس کے علاوہ کچھ دماغ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، یہ بات وہ لوگ نہیں جانتے۔"

شمبھو کی تقریر جاری تھی کہ ایک گندے اور [illegible] میلا کچیلا لحیم شحیم لڑکا گھبرایا ہوا آکر بولا۔ [illegible]

صندوق میں کیا ہے؟ جو کچھ ہے باہر نکال دو۔ آج اُس سالے کے سامنے سب روپیہ پھینک کر کل ہی یہ مکان چھوڑ دیں گے۔ جو کچھ بھی ہو تم نکال کر رکھو۔ میں ذرا سودا میں ابھی آتا ہوں!"
اُس کے آخری الفاظ باہر سے سُنے گئے۔

پوچھ تاچھ کرنے کے بعد جو کچھ معلوم ہوا اُس میں مالک مکان کی زیادہ غلطی نظر نہ آئی۔ اُس کا شاید ۸ مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا۔ وہ کرایہ مانگنے آیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرایہ مانگتے ہوئے ویسا ہی لڑکوں کے لئے اس کے منہ سے کوئی تلخ بات نکل گئی ہے۔ بے عزتی شاید اور سب برداشت کر سکتے تھے لیکن ہمارا سوشیا برداشت نہ کر سکا۔ اسی وجہ سے جھگڑا شروع ہوا۔

آخیر میں سب کا ملا کر جمع کرکے جو کچھ اکٹھا ہوا اس سے ۲ ماہ سے زیادہ کا کرایہ ادا نہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مالک مکان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اُسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ ہو رہا تھا۔

* * * * *

دو مہینے کے کرایہ کے ساتھ مکان مالکوں کے لالچ کے بارے میں سَو دو سَو چیدہ چیدہ گالیاں دے کر سبحان اُسے رخصت کر آیا اور ہمارے کمرے میں گھس کر اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا دھپ سے بیٹھ گیا اور بولا "آج تو ایکادشی ہے!"

دو چار دنوں کے اندر ہی میں نے مَیس کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تھا۔ صبح کا کھانا کھانے کے بعد کوئی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ شام کو کھانا بنے گا یا نہیں۔ اکٹھے دونوں وقت کے کھانے کا بھروسہ یہاں بہت کم لوگ کرتے تھے۔ اس لئے آج کھانا نہ بنے گا یہ جان کر کسی کو تعجب نہ ہوا۔ پھر بھی ہم میں سے کئی کے چہرے لٹک گئے۔

معلوم ہوتا تھا آج مَیس کی مالی حالت دوسرے دنوں سے کچھ زیادہ خراب تھی۔ بنگالیوں کو اپنے کھانے پینے کی عادت بدلنی چاہئے، پروٹین سے جسم کی طاقت بڑھتی ہے۔ ہندوستانیوں کی صحت کا ستیاناس کیا ہے۔ ان سب باتوں کے بارے میں تقریر کرکے سبحان نے سب کو ستو کی آزمائش کرنے پر آمادہ کیا۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر سب نے آزمائش کی منظوری دی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس آزمائش سے بہت سے لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ جیسے ستو کھانے کے بعد شام کو فاقے کی بات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی۔

مَیس کا انتظام سبحان کے ذمہ تھا۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اُسے کبھی ہمت ہارتے نہ دیکھا تھا۔ آج اُسے بھی مایوس دیکھ کر سب کا دل بیٹھ گیا۔ سبحان نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا "غصے میں آ کر کرایہ نہ دینا ہی بہتر تھا۔ اب تو سب کچھ بیچ دینے پر بھی ایک پائی نہ ملے گی!"
ونے دروازے کی طرف منہ کرکے بیٹھا تھا۔ یکایک چونک کر بولا "لیکن یہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے۔ مہاراج نے چولہے میں آگ تو نہیں سلگائی ہے؟"

چولہے میں آگ! یہاں کا حال مہاراج سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تین سال سے وہ یہاں کام کر رہا ہے۔ اور تین سال کے اندر اُس کی ایک سال کی تنخواہ باقی ہے۔ بےٹاٹال ہونے سے پہلے چولہا سلگانے کی طاقت تو وہ نہیں کر سکتا۔

لیکن رسوئی گھر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ تجسس کے مارے سب کے سب نیچے اُتر پڑے۔ مہاراج نے جھجکتے ہوئے کہا کہ آج تنخواہ ملنے پر وہ مودی کی دکان سے کچھ دال چاول خرید لایا ہے۔

ہمارے یہاں کام کرنے کے علاوہ صبح شام سڑک کے نل سے پانی بھرنے کا کام کرکے مہاراج کو ماہ بماہ کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔

سبحان نے ناراض ہو کر کہا "یہ تمہاری بڑی بے انصافی ہے مہاراج۔ ہم تمہاری ایک سال کی تنخواہ تو دے نہیں سکے۔ اس کے باوجود.......!"

ششین نے اُسے روک کر کہا "خاموش رہو سبحان! انسان کی عظمت کو سیدھی طرح تسلیم کر لینا چاہئے۔ تعریف کرکے اس کو مذاق بنانا گناہ ہے!"

ونے ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے کچھ جھنجھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا "اسے سُن: بدھن! تُو نے مجھے بتایا ہے ملک بار ہو آنا!" اور باہر جا کر ایک بار پھر چلا کر کہا "بہت شرم کی بات ہے۔ ابھی مل کے آیا ہوں!"

* * * * *

تنو سے ملنے نہیں گیا۔ لیکن اس بات کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ ایک بار جب کبھی آج تک بات [illegible] ختم ہو چکی۔ بار بار سوچتا کہ میری [illegible] ایک [illegible] ہے۔ [illegible]

لیکن اگر یہ ناتا ٹوٹ جاتا۔ دل کو مار کے بیٹھ رہتا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا رہا۔ یہ سوچتے ہیں کہ منو نے کیوں بلایا۔ کوئی نقصان نہ تھا۔ نقصان تو وہاں جانے میں تھا۔

اپنے دل کو میں نے اسی طرح بہلایا ہے۔

× × × × ×

تین دن کے بعد اچانک سویرے سویرے شمیپن پھر آموجود ہوا۔ سوچا منو کے بلانے پر میں نہیں گیا۔ اس کا طعنہ دینے آیا ہوگا۔ لیکن اس نے اس طرف اشارہ تک نہ کیا۔ اس سے اطمینان ہونا مناسب تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔

بستر پہ ایک کنارے بیٹھ کر شمیپن نے کہا "میں تمہیں جانتا تھا کہ تو اتنا بے فہم ہے سدی!"

اس کے اس مذاق کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ نہ سمجھ کر میں نے کچھ تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دھرمشالہ ہے یا لنگر؟ بیٹھا بیٹھا کب روٹی توڑتا رہے گا؟"

"لیکن فقد حب الوطنی تو اب بھی مجھ میں موجود ہے شمیپن! تم نے تو کہا تھا کہ یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"شمیپن کب دینے والا تھا۔ اس نے کہا۔ لیکن اس وقت یہ نہ معلوم تھا کہ تم اس مہاراج کے سہارے چلو گا۔"

سبحان شاید باہر کھڑا تھا۔ شمیپن کی آواز سن کر اندر آ کر بولا "فضول کا ہمیں بدنام نہ کرو شمیپن دادا! آجکل ہم حسب دستور دیا سلائی میں۔ ضرورت ہو تو مہینہ دو مہینہ ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔"

"مہاراج دن میں تو نل چلاتا ہے۔ رات کو تمہارے لئے فتنہ لگاتا ہے کیا؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے شمیپن دادا، مہاراج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔"

شمیپن نے بڑے تعجب سے پوچھا "کیوں کیسے؟ اس مٹھ کے اندر وہی تو سب سے بڑا محب الوطن تھا۔ تنخواہ نہ ملنے پر بھی اس نے سال بھر خوشی سے نوکری کی۔ یقین نہیں آتا کہ وہی تمہیں چھوڑ کے چلا گیا۔ کچھ دیر تک رک کر شمیپن نے پھر کہا۔ "تم لوگ شاید اس کی تنخواہ چکا دینا چاہتے تھے۔ شاید اس ہتک سے وہ جلا وطن ہونے پر مجبور ہوا!"

سب ہنس پڑے۔ ہنسی رکی تو دونے نے کہا۔ "نہیں شمیپن دادا۔ مہاراج کے جانے سے واقعی بڑی پریشانی ہو گئی ہے۔ اس مٹھ کے ہر آدمی کی اتنی خدمتگذاری اور کوئی نہ کر سکے گا۔ اور وہ گیا صرف سبحان کی غلطی سے۔"

سبحان نے تیز ہو کر کہا "میری غلطی سے؟"

اسے جواب نہ دے کر دونے نے اپنی بات جاری رکھی۔ اچانک اس کی مذہبیت جاگ اٹھی۔ خالی میز پر کھانا نہ کھا کر نیچے کپڑا بچھانا شروع کیا۔ اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ سبحان سے مہاراج کو عقیدت تھی۔ ہم لوگ اسے مسلمان کہہ کر چڑاتے لیکن وہ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔ لیکن آخر میں ان کا صبح شام نماز پڑھنا دیکھ کر اسے شبہ ہوا۔ پھر بھی اس کا اعتقاد صرف سبحان کے اوپر تھا۔ ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے سبحان سے پوچھ ہی لیا۔ "یہ شام سویرے آپ کیا کرتے ہیں بابو؟" تب بھی اگر سبحان بات ٹال دیتا تو کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن کم بخت نے پنڈت جی کے سر پر کھڑی اینٹ ماری "میں نماز پڑھتا ہوں۔ مسلمان جو ہوں۔" لیکن تب بھی مہاراج کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ ان کے نزدیک سبحان کسی اوتار سے کم نہ تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کچھ جھجک کر کہا۔ "آپ دل لگی کر رہے ہو بابو۔" لیکن سبحان بھی ایک ضدی ہے۔ وہ کب چھوڑنے والا تھا۔ ان کو یقین دلا کر ہی دم لیا۔۔۔۔"

بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ کر سبحان نے کہا "اور تب شمیپن دادا تم نے اپنے محب الوطن کا غصہ دیکھا ہوتا۔ اس نے ہماری چند لفظوں کو کوس ڈالا۔ اتنے دنوں کی حب الوطنی مذہب کے سیلاب میں نہ جانے کہاں بہہ گئی۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر شمیپن نے بڑی سنجیدگی سے کہا "ہندوؤں کی حب الوطنی کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے۔"

ہم لوگ ہنس پڑے۔ دونے نے کہا۔ "پوری بات کہنے دو سبحان۔ اس کے بعد شمیپن دادا، مہاراج تو ناراض ہو کر چلا گیا۔ ہم نے سوچا بیچارہ کھانا ادا کر کے اپنے وطن لوٹ جائے گا۔"

لیکن اس کے اگلے ہی دن وہ پھر آ موجود ہوا۔ وہ سیدھا سبحان کے کمرے میں گیا۔ اور سبحان کے پلنگ پر بیٹھنے کے علاوہ اس نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ سبحان کی شدھی کر کے ہندو بنا لینا چاہتا تھا۔ اپنے گاؤں کے ایک مسلمان کو اس نے ہندو بنتے دیکھا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اصل میں تو آپ ہندو ہیں بابو۔ سچے ہندو۔ اُن کا یہ رہن سہن دیکھ کر ہی میں نے سمجھ لیا ہے۔ پچھلے جنم میں کوئی چھوٹی سی خطا ہو گئی ہوگی بابو اسی لئے آپ کو ملیچھ کا جامہ پہننا پڑا۔ آپ کو شدھی کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔"

شمیم زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بولا۔ "سارے مسائل کا اتنا بڑھیا حل! یہ آئیڈیا صرف مہاراج کے ذہن میں ہی آسکتا ہے۔ تمہیں مہاراج کا ممنون ہونا چاہیئے سبحان!"

لیکن سبحان سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں ہے شمیم دادا۔ تمہارے اس مہاراج کی تجویز سے مجھے واقعی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کے چولہے میں آگ سلگا نے سلگاتے وہ ایک دن سارے ملک میں آگ لگا دے گا تم دیکھ لینا۔ یہ مہاراج عام ہندو کا مثالی روپ ہے اور شدھی تحریک ان کی ذہنیت کا آئینہ ہے۔ شدھی تحریک سے انسان پاک ہوتا ہے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی آزادی کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جائیں گے۔"

شمیم کچھ بے چین ہو گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اُس کے بدلے نصرت نے جواب دیا۔ وہ سبحان کے ساتھ ایک ہی ضلع، ایک ہی گاؤں سے آیا تھا۔ دونوں میں جتنی گہری دوستی خیالات میں اتنا ہی اختلاف تھا۔ کسی نے کبھی ان دونوں کو ایک بات پر متفق ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

اختلاف ظاہر کرتے ہوئے نصرت نے کہا۔ "تمہارے اصول اور تمہاری دلیل میں سے کسی سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ مہاراج چند آدمیوں کو ہندو بنانے اور ہمارے دو چار مسلمانوں کو ہندو بنانے سے ملک تباہ ہو جانے کی دلیل میں نہیں مانتا۔"

سبحان نے جوش میں آکر کہا۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا نصرت کہ صرف مسلمان کو ہندو بنانے سے ملک تباہ ہو جائیگا۔ تم لوگ کتنے بھی آدمیوں کو ہندو بناؤ۔ لیکن تمہارا مہاراج تو صرف ہندو بنانا نہیں چاہتا بلکہ وہ تو میری شدھی کرنا چاہتا ہے۔ ہم لوگ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے جاتے ہیں تو کہتے ہیں تمہارا مذہب خراب ہے ہمارا اچھا ہے۔ تم ہمارا مذہب اپناؤ۔ تم لوگ مذہب کی تبلیغ کے لئے کہتے ہو۔ تمہارا جسم گندہ ہے۔ تمہارا لمس ناپاک ہے۔ تمہیں پاک کریں گے۔ میرے چھونے سے تمہارا کھانا پینا خراب ہو جائے گا۔ چوکھٹ کے اندر قدم رکھنے سے تمہارا مندر ناپاک ہو جائے گا۔ ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ہم لوگ یہ توہین بہت دنوں سے برداشت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے مذہب کا پہلا سبق دیتے ہوئے بھی تم ناک سکوڑ کر کہو گے کہ تمہیں پہلے شدھ کرنا پڑیگا۔ اتنی بڑی توہین سے اگر ہمارا مذہب ہی نہیں بلکہ انسانیت بھی بغاوت کر بیٹھے تو اس میں تعجب کی بات نہ ہوگی۔"

وہ نے کچھ کہنے لگا تھا۔ اس نے روک کر سبحان نے پھر کہا۔ "آپس کے اس جھگڑے اور رنجش کا انجام یہ ہوگا کہ ہم لوگ مذہب کی دیواریں اتنی اونچی اُٹھا دیں گے کہ ہماری نظر اس میں اُلجھ کر رہ جائے گی۔ ملک میں نظر تک نہ جائے گا۔ مجھے نظر آتا ہے کہ اس حالت پر پہنچنے میں اب دیر نہیں ہے۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری تمہارے متعصب ہندو پن پر ہے۔"

نصرت نے تالی بجا کر اور منہ چڑا کر کہا۔ "واہ مولوی صاحب کیا مجھے دار باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے پچھلے کئی دنوں سے بڑے زور و شور سے کپڑا بچھا کر کھانے اور دھوتی کی لانگ کھول کر اُٹھنے بیٹھنے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ اچھا میں یہ تو مانتا ہوں کہ شدھی کی تحریک سے ملک تباہ ہو جائے گا۔ لیکن ملک کو تباہی کے غار سے نکالنے کی کیا ترکیب ہے۔ ذرا یہ بتایئے؟"

سبحان ہنس پڑا۔ نصرت کے سر پر ایک چپت لگا کر بولا "تیرے ساتھ اتنی دیر ناحق مغز پچی کی۔ لیکن اتنا کہے دیتا ہوں کہ ملک اگر کسی دن آزاد ہوا تو مسلمان ہو کر ہی ہوگا۔"

سب لوگ ہنس پڑے۔ شمیم نے کہا۔ "تم نے کوئی غلط بات نہیں کی سبحان۔ اسلام کے مقابلہ میں باقی سارے مذہب تنگ سے معلوم ہوتے ہیں۔ جو بات کو سر دکھاتی ہیں انکا کام معلوم ہو تا ہے بعض یہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو ان میں [illegible]

پیدا ہوتے ہیں اسلام نے دنیا کو سر کر ڈالا۔ مگر ابھی سے سیپن
کے سامنے کلکتہ مٹا ڈالے ؟

ثروت نے کہا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے شمیم [illegible] مسلمان
ہونے سے پہلے اگر آزادی مل سکتی ہے تو آؤ ہم سب لوگ [illegible] کلمہ
پڑھ ڈالیں۔ [illegible] آزاد ہونے پر [illegible] ہو جائیں گے خواہ
کتنے ہی ہندو بیکار رہیں"

سبحان کچھ جواب دینے والا تھا۔ لیکن اس کے بولنے
سے پہلے ہی بات کا رُخ بدل دینے کی غرض سے ثمین نے کہا "لیکن
اصل بات تو — ابھی تک کھلا ہی نہیں رہیں ابھی تک یہ نہ سمجھ
سکا کہ تمہارے مشین کی حالت اچانک کیسے تبدیل ہو گئی ؟"

"ارے یہ بھی نہیں جانتے! ہمارے گوپال لال نے شادی
کی ہے! گوپال کو تو جانتے ہو گے۔ وہی جو کچھ دن پہلے بڑے جوش و
خروش سے ملک کی فلاح و بہبود کی تحریک چلا رہا تھا۔ تم کہتے
تھے اس کا اعتبار نہیں۔ لیکن وہ بھی پگلا نکلا ہے" یہ کہہ کر سبحان
منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

"اسکو (گوپال کو) اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن اسکی شادی اور مشین کی
حالت تبدیل ہونے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہتیرا سوچنے پر بھی یہ بات
سمجھ میں نہیں آئی"

"تعلق بھلا کیا ہوگا۔ شادی کی خوشی میں اس نے اپنے
پرانے ساتھیوں کی امداد کے لئے تین سو روپیہ دے ڈالے"

شمیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ نے [illegible] اٹھا۔ [illegible]
بات ہے شمیم [illegible] ثروت اور سبحان دونوں نے بناوٹی [illegible]
سے کہا "سبحان یہ بہت اچھا ہے۔ یہ یقیناً نیک [illegible] ہے اور [illegible]
[illegible] اختیار کر سکے ایک پولیس انسپکٹر کی کنواری
لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تم نے سوچا [illegible] اس طرح [illegible]
کر خاص رقم بھی ملے گی اور اچھی لڑکی بھی۔ لیکن ثروت نے نہ معلوم
کہاں سے یہ خبر سبحان کو دے دی۔ اس نے ہنس کر کہا، پھر تو [illegible]
کی حالت ضرور بدل دیں گے۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے
گوپال کو لکھا [illegible] دیکھتے ہو اگر اس نے مشین کے لئے تین سو روپیے
نہ بھیجے تو وہ اس کے ہونے والے سسر کو جا کر بتا دیں گے کہ وہ انقلابی
پارٹی کا آدمی ہے۔ [illegible] بتا کر کہ

تاکہ پولیس کی گرفت سے باہر رہنے کی غرض سے گوپال یہ رشتہ کر
رہا ہے۔ اس مہینے میں گوپال ایک سال گذار چکا ہے اور اس بات کا
ثبوت ملنے پر اُس کے سسر کو ان کی بات میں شبہ نہ رہے گا۔ یہ سب
باتیں سبحان نے خط میں لکھ دیں۔ حقیقتاً لڑکی کوئی بات [illegible]
لیکن خط ملنے کے تین دن کے اندر گوپال کا منی آرڈر پہنچ گیا۔

ہم سب لوگ ہنس پڑے۔ اس دوران سبحان اور ثروت
نہ جانے کب چپکے سے کھسک گئے تھے۔

x x x x x

اگلے دن شمیم نے مجھے پھر پکڑ لیا۔ اُس کے ساتھ سویرے
سویرے باہر نکلا ہی تھا کہ طے ہوا کہ اخبار فروخت کیا جائے۔ راستے
بھر شمیم مجھے سمجھاتا رہا کہ اخبار فروخت کرنے سے ہم ایک دن
بڑے آدمی بن جائیں گے۔

شمیم سے معلوم ہوا کہ کلکتہ کی شیئر مارکیٹ میں دلالی کرنے
سے بڑھ کر اگر کوئی دھندہ ہے تو اخبار فروخت کرنا۔ شمیم چلتے
چلتے کہہ رہا تھا "کلکتہ کی ایک سڑک کے ایک سرے سے شروع کر کے
دیکھ لینا ہم ایک دن سارے ملک میں اپنی دھاک بٹھا دیں گے۔ ہم
لوگ اخبار کے آڑھتی بنیں گے۔ تم دیکھنا کہ ایک دن ہمارے
کارخانے میں بنگال کی ساری خبریں تیار ہوا کریں گی۔ ایک منٹ میں ہزار
ہزار خبریں۔ مائیکل بھی تو ایک دن لندن کی سڑکوں پر اخبار فروخت
کرتا تھا۔"

میں نے ہنس کر اثبات میں سر ہلایا۔

"زیادہ تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ کام کرنے میں حرج بھی
کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اچھا تو تم یہ بتاؤ تمہاری کیا تمنا ہے۔ بڑا آدمی
بننے کی یا خبریں تیار کرنے کی؟"

شمیم نے کہا۔ "معمولی سا آدمی اگر بنا تو زندگی بیکار
ہے۔ اور خبریں تیار نہ کر سکا تو ملک کے لئے کوئی تعمیر نہیں کر سکوں گا"

میری طرف مخاطب ہو کر ہنس کر اس نے پھر کہا "موجودہ
دور کی سیاست اخبار کے سہارے ہی چلتی ہے۔ جن کے بس کا
خبریں تیار کرنا نہیں وہ ملک کو بھلا کیا چلا سکیں گے۔ خبریں تیار کرتا [illegible]
انہیں کچھ نہ [illegible] جو چاہے کر سکتے ہیں"

"پھر تو اخبار فروخت کرنے سے اخبار نہ بیچنا بہتر ہوگا!"

"آہستہ آہستہ!" شمیم نے ہنس کر قریب کی ایک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مستقبل کے بنگال کے اخبار نویسوں کے شاندار عروج کا آغاز اس گلی سے ہوگا۔ چلو!"

× × × × ×

گلی کے اندر ایک بڑا پرانا مکان ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے اوپر بنگالی اور انگریزی حروف میں ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ "چلے باک!" سائن بورڈ نیا تھا۔ اس کا نیا پن اور چمک دمک مکان کی بوسیدگی پر گویا طنز کر رہی تھی۔ لیکن اگر سائن بورڈ نہ بھی ہوتا تو بھی یہ سمجھنا دشوار نہ ہوتا کہ یہ کسی اخبار کا دفتر ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار فروش ابھی موجود تھے۔ سائیکلیں گلی میں قطار در قطار کھڑی تھیں۔ اندر سے اخبار کے بنڈل باہر آتے اور نہ جانے کدھر غائب ہو جاتے۔ پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک اخبار فروش سے پوچھا۔ "بیچنے کے لئے اخبار کس طرح ملے گا بھائی؟"

سائیکل کے اوپر اخبار کا بنڈل دبا کر وہ ہماری طرف ایسی چوکنی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا گویا ہم نے اس سے جنت کا راستہ دکھانے کے لئے کہا ہو!

دوسرے آدمی نے تعجب کا اظہار تو نہیں کیا لیکن چھوٹے بڑے آدمی کا سوال اٹھا کر تفصیل سے سمجھایا کہ یہ کام شریف بنگالیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ ہم کسی دفتر میں نوکری کی تلاش کرتے۔ اس صلاح کے باوجود اس نے یہیں بتایا کہ اخبار دینا نہ دینا ارجن سنگھ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہیں تو ایک بار اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔ حالانکہ اس بات کی امید کم ہے کہ اس سے بات کرنے پر بھی اخبار مل سکے گا یا نہیں۔ نئے لوگ تو درکنار پرانے اخبار فروشوں کو بھی جتنی تعداد وہ چاہتے ہیں نہیں ملتی۔

اس کے اس پیش قیمت مشورہ کو گانٹھ میں باندھ کر اور پیدل اور سائیکل والے اخبار فروشوں کو دھکیل کر ارجن سنگھ کی تلاش میں ہم اندر گھسنے ہی والے تھے کہ کسی نے پکارا۔ "ٹھہریئے بابو صاحب اندر جانے کا حکم نہیں ہے!"

یہ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اخبار کے دفتر پر بھی پہرہ ہوگا۔

دربان کے سامنے میں اپنا مقصد بیان کرنے والا تھا کہ شمیم نے اشارہ سے مجھے روک کر کہا۔ "منیجر صاحب کے ساتھ ملاقات کرنا مانگتا!"

دربان اس بات سے بھی نہ دبا۔ "بولئے سلپ بھیجئے!"

آغاز میں ہی جہاں اتنی رکاوٹیں آئیں وہاں آخر میں کچھ کام بنے گا اس بات کی مجھے اُمید نہ تھی۔ شمیم کو میں روکنے ہی والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے کاغذ پر لکھ دیا۔ "اشتہار دینے کے لئے ملنا چاہتے ہیں۔ ایجنٹ، پاپولر کیمیکل ورکس۔"

دربان نے ایک چپراسی کو سلپ دے کر بھیج دیا۔ کچھ دیر تک ہٹ کر میں نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ پاپولر کیمیکل ورکس کہاں سے پیدا ہو گیا۔ اخبار بیچنے نکلے ہو۔ لیکن کیمیکل ورکس کے ایجنٹ کیسے بن گئے؟"

"اتنا بڑھو نہ ہوتا تو ملک کی خدمت کرنے کیسے آتا۔ پاپولر کیمیکل ورکس ابھی ابھی تیار ہوا ہے!" کچھ دیر رک کر بولا۔ "یہ میرے دماغ کی پیداوار ہے گدھے! اخبار کا منیجر لاٹ صاحب کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ لیکن اشتہار دینے والے کو نہیں لوٹا سکتا۔ سمجھا؟"

"لیکن اس کے بعد؟"

"ایک بار اندر گھس تو جائیں پھر دیکھا جائے گا!"

شمیم کا اندازہ غلط نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چپراسی نے آ کر کہا۔ "آپ لوگ منیجر صاحب سے ملاقات کر سکتے ہیں!"

چپراسی کو ہمیں راستہ دکھانے کے لئے چلنے پر آمادہ دیکھ کر شمیم نے کہا۔ "ٹھہرو، تم اپنا کام دیکھو۔ ہم منیجر کا کمرہ جانتے ہیں۔ پہلے بھی ہم پہلے ایک بار آ چکے ہیں!"

نہ معلوم چپراسی نے کیا سمجھا۔ لیکن جا رہے جانے پر اس نے اعتراض نہ کیا۔ شمیم نے کہا۔ "پاپولر کیمیکل ورکس کا اشتہار اس بار بیکار نہیں جائے گا۔ چپراسی کی قسمت میں ڈانٹ کھانا لکھا ہے تو کھائے۔ چیر لیڈر واسطے اب ارجن سنگھ کو تلاش کرنا ضروری ہے!"

اب میں نے چاروں طرف سے دیکھا۔ مکان پرانا ہے جب بھی چمک رہا تھا۔ اس کے کشادہ صحن میں ٹین کے کچھ سائبان ڈال کر چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا۔ جس شیڈ کے نیچے ہم کھڑے تھے اس میں چھت تک بڑے بڑے پہیوں کی طرح نیوز ریل کے بنڈل لگے ہوئے تھے اس کے باہر کے شیڈ سے مسیں گھسنے کی آواز آ رہی تھی۔

کلائی کی ایک گھنٹی کے ذریعہ ایک آدمی کو ناشتہ کے حصہ رکھے

ایک طرف سے دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ شیپن نے اس سے پوچھا: "ارجن سنگھ کہاں ہیں؟"

اس آدمی نے ٹھہر کر اوپر سے نیچے تک ہمارا جائزہ لیا اور کہا "ارجن سنگھ سے کیا کام ہے بابا جی۔ پولیس میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ آشو بابو کو پکڑ لیجئے۔ کام تو اچھی طرح جانتے ہیں نہ؟ پہلے کبھی اخبار میں کام کیا ہے؟"

پہلے کبھی کام نہیں کیا، ہمارے کہنے سے پہلے ہی تاڑ گیا اور بولا۔ "پھر تو کام نہیں بنیگا صاحب۔ اس فیلڈ مشین کا کام ٹھیک ٹھیک کرنے سے نہیں ہوتا۔ بالکل مشین کی طرح ہاتھ چلانا پڑتا ہے۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو اس ہندوستانی بابو دسنگھ کو پکڑ لیجئے یا کسی اور کو۔ کچھ نہ ہوگا۔" ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آدمی مشین کی طرح ہاتھ تو نہیں البتہ پیر چلاتا ہوا بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ ارجن سنگھ کا پتہ بتانے کی غالباً اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

بالآخر ارجن سنگھ نظر آئے۔ وہ ایک شیڈ کے پاس چارپائی ڈالے ننگے جسم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ہندوستانی نوجوان ان کی مالش کر رہے تھے۔ اور ان کا دیو ہیکل جسم تیل مالش سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ شیپن نے باقاعدہ سلام کر کے کہا۔ "سلام سنگھ صاحب۔ طبیعت اچھی ہے"؟

ارجن سنگھ نے بھویں سکوڑ کر ہماری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بولے "پہچانا نہیں آپ کو!"

"کیسے پہچانیں گے بھلا۔ سنگھ صاحب۔ پہلے کبھی آپ سے ملنے کا شرف کبھی تو حاصل نہیں ہوا!"

نہ جانے کیا سوچ کر سنگھ صاحب نے بنگالی میں کہا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"چاہتے کچھ نہیں سنگھ صاحب سنا ہے آپ کے سب اخبار فروش ایک سے ایک بڑھ کر قابل الوجود ہیں۔ بازار میں اخبار کھپا نہیں پاتے۔ آپ دو اچھے اخبار فروشوں کی تلاش میں ہیں۔ یہ سن کر ہم یہاں حاضر ہوئے ہیں۔"

پوری بات کا مطلب سمجھے بغیر سنگھ صاحب بگڑ کر بولے۔ "کون کہتا ہے ہمارا اخبار بازار میں نہیں کھپتا؟ کون کہتا ہے؟ کون...!"

اور پھر اپنا غصہ دبا کر بولے "جاؤ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے سنگھ صاحب! آج اگر ضرورت نہیں ہے تو ضرورت پیدا ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔ آج ہی خدا نہ کرے۔ آپ کے دو اخبار فروش گاڑی کے نیچے دب کر مر سکتے ہیں۔ اچھے آدمی مل سکتے ہیں تو انہیں ہاتھ میں رکھنا مناسب ہے۔ اچھا تو ہم لوگ کل ہی آ کر اخبار لے جائیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں اپنی ہنسی کو اس بار نہ دبا سکا۔ لیکن سنگھ صاحب نے غصہ ہو کر کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ ہم تمہیں اخبار نہیں دیں گے جاؤ پریشان مت کرو۔"

شیپن ابھی تک چارپائی پر ایک کنارے بڑے آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اب اٹھ کر بولا۔ "پھر تو مجبوری ہے سنگھ صاحب۔ اچھا چلیں پھر آئیں گے۔ لیکن ہماری بات بھولئے گا نہیں۔ ممکن ہوا تو پھر کسی دن آ کر آپ کی طبیعت کا حال چال پوچھ جائیں گے۔"

جواب میں سنگھ صاحب نے نہ جانے کیا کہا۔ کچھ صاف نہ سنائی دیا۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

میں باہر کی طرف جا رہا تھا کہ شیپن نے روک کر کہا "جب یہاں آئے ہیں تو کیوں نہ گھوم کر ایک بار اس مکان کو دیکھ لیا جائے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں کس لئے آئے۔ اس طرح بات کرنے سے کہیں کام بنتا ہے۔"

ضمیر کی آواز کسے کہتے ہیں، جانتا ہے؟ میں تو بھئی بانگیا۔ اس لئے اس بار میں نے ضمیر کے زہریلے دانتوں کو توڑ دینے کا انتظام کیا ہے۔ بڑے بڑے جب بیکار زندگی نہ کٹے گی اور جب میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیجے گا۔ تب دل کی پریشانی دور کرنے کی ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔ کام تو نہیں ملا لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کام حاصل کرنے کی ہم نے کوشش بھی نہیں کی۔"

خیر شیپن کو اپنے ضمیر کو زیادہ دھوکا دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ ادھر ادھر کچھ دیر گھوم کر ہم دوسری منزل سے نیچے اتر رہے تھے کہ ایک صاحب ایڈیٹر کے کمرے سے سپرنگ والے دروازے کو دھکیل کر نکلے اور بولے۔ "آپ لوگ کیا صداقت کی آواز سے آئے ہیں۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی شیپن بول اٹھا۔ "جی ہاں!"

"اچھا تو اندر آئیے۔ مسٹر سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں!"

اندر جاتے جاتے اُن صاحب نے سوال کیا۔ "لیکن آپ کے یہاں سے تو ایک اور آدمی کے آنے کی بات تھی؟"

شمیم نے جھٹ جواب دیا۔ "جی ہاں تھی تو سہی لیکن معلوم ہوتا ہے وہ نہ آسکے گا۔"

شمیم کی باتوں میں میں نے ابتک کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ لیکن اب مجبور ہو کر میں نے اس کے کان میں کہا۔ "اس بار تم حد سے تجاوز کر رہے ہو شمیم۔ اسکا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔" شمیم نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دفتر میں مسٹر سرکار کون ہیں، صداقت کی طرف سے کون آنے والا تھا۔ اور اس سے مسٹر سرکار کو کیا غرض ہے۔ اس نے بلا سوچے سمجھے زبردستی مجھے بھی اس خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات سوچ سوچ کر مجھے شمیم کے اوپر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ نہ معلوم معاملہ کیا شکل اختیار کرلے۔ لیکن شمیم کو دیکھا تو وہ بالکل بے فکر تھا۔ فکر یا تردد کی کوئی بھی علامت اس کے چہرے پر نہ تھی۔

مسٹر سرکار میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ سر اٹھا کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولے۔ "میں بہت دیر سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کو تو اس سے پہلے آنا تھا؟"

"جی ہاں! کچھ دیر ہو گئی۔" شمیم نے جواب دیا۔

"ہمیں پروف ریڈروں کی سخت ضرورت آ پڑی ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو آج سے ہی کام شروع کرنا ہوگا؟"

"جی آج سے تو نہیں البتہ کل سے آ جائیں گے؟"

"اور آپ کا تیسرا آدمی کہاں ہے؟"

شمیم کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اس نے یقینی لہجہ میں کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ وہ نہ آسکیں گے؟"

مسٹر سرکار نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ خیر اس وقت دو آدمیوں سے بھی کام چل جائے گا۔ لیکن ابھی تھوڑے دن آپ لوگوں کو رات کو کام کرنا ہوگا۔"

"ہم لوگ کر ہی لیں گے، لیکن ......"

مسٹر سرکار نے کہا۔ "ہاں میں نے طے کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں سے زیادہ تنخواہ ملے گی۔ اور آپ لوگوں کا اپائنٹمنٹ لیٹر دوپہر بعد تک آ جائے گا منیجر صاحب دستخط کرکے تیار رکھیں گے۔ آپ

کل لے جائیے گا۔"

"اچھا اچھا! ہمیں اسکی فکر نہیں ہے۔ اچھا تو ہم لوگ چلیں۔" شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں تو آپ کل ہی بات کر آئیں گے۔ رات کو دس بجے۔

سمعین بابو انہیں پروف ریڈروں کا کمرہ دکھا دیجیے۔"

مسٹر سرکار پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جن صاحب نے ہمیں بلایا تھا وہی ہمیں کمرہ دکھا کر چلے گئے۔ شمیم نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا۔ اخبار کی نوکری پہلے زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ اخبار فروشی سے مصنف بننے کا امکان زندگی میں بہت کم ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "لیکن یہ بات کیا ہے شمیم۔ تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟"

"ابھی تو نہیں ہوا۔ لیکن کچھ دن پروف ریڈنگ کرنے پر ہو جائے گا۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔ دماغ کا زیادہ اچھا ہونا بھی پریشانی کی بات ہے۔ تھوڑا سا فتور آ جائے تو کیا حرج ہے؟"

زینے سے نیچے اترتے ہوئے میں بولا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں شمیم۔ کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ دوسرے آدمیوں کی جگہ ہم کام کر سکیں گے؟"

شمیم میری بات کا کچھ جواب دینے والا تھا کہ یکایک مجھے چھوڑ کر دھم دھم کرتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نیچے تین اشخاص زینے کے نزدیک اوپر چڑھنے میں ہچکچا رہے تھے۔ شمیم سیدھا ان کے پاس جاکر بولا۔ "آپ لوگ کیا صداقت کی طرف سے آ رہے ہیں؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

"اوہ۔ آپ لوگوں نے تو بڑی دیر کر دی۔ مسٹر سرکار آپ لوگوں کا انتظار کر کے ابھی گئے ہیں۔"

تینوں آدمیوں کے چہروں پر مایوسی کا سایہ پڑتے ہی مجھ کو واقعی بڑا افسوس ہوا۔

شمیم نے کہا۔ "کل اسی وقت آپ لوگ ایک بار پھر آ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں پروف ریڈروں کی جو ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر اس کے پہلے ہی آدمی مل جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آپ لوگ بہت دیر کرکے آئے۔"

ایک آدمی منہ اٹھا کر یہ سکتے کیسے ہیں کہانی پھر کیا طریقہ ہے۔ کچھ بتا سکتے ہیں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر تینوں باہر کی طرف چلنے لگے۔

شمیں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے صداقت کی آواز" بالکل چھوڑ دی ہے کیا؟"

"نہیں بالکل تو نہیں چھوڑی۔ لیکن اگر یہاں بات پکی ہو جاتی تو ضرور چھوڑ دیتے۔"

تب اچانک شمیں نے بڑے جوش سے کہا۔ "تب تو بڑا اچھا طریقہ ہے صاحب۔"

تینوں نے ہم زبان ہو کر کہا۔ "کیا؟"

"صداقت کی آواز" نہ چھوڑیئے۔ شمیں نے اپنی آواز ذرا بھاری بنا کر کہا۔ "ذرا یہ تو بتائیے کس راہ سے یہاں آئے ہیں۔ میں دس سال سے یہ مہوت ریڈی کر رہا ہوں صاحب۔ لیکن یہاں سے نکل سکوں تو مجھے جان نہیں۔ اور آپ لوگ ہیں کہ بڑی آرزو رکھتے ہیں یہاں آنے کی۔ حالانکہ ہمیں یہ باتیں کہنا مناسب نہیں ہے۔"

اپنے متجسس سامعین کے سوال کے جواب میں شمیں نے پھر کہا۔ "میری بات مانیں تو صاحب صداقت کی آواز بھول کر بھی نہ چھوڑیئے۔ وہاں ماہ بماہ تنخواہ تو مل جاتی ہے۔"

"یہاں بھی گورنمنٹ سے تنخواہ باقاعدگی سے ملتی ہے۔"

شمیں نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے جب آپ نے سن لیا تو ہمارے کہنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں آپ یہاں کام کرتے ہیں۔ آپ یہاں کا حال زیادہ جانتے ہیں۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔"

شمیں نے یکایک اپنا لہجہ بہت دھیما کر کے آہستہ آہستہ کہا۔ "پھر تو صاحب یہی بیوقوفی بھول کر بھی نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ آخر میں پچھتانا پڑے گا۔ آپ لوگوں کو یہ مشورہ دینے میں ہماری کوئی غرض نہیں۔ آپ ہمارے ملازمت تو چھین نہیں رہے۔ ہم لوگ چونکہ خود مشقت سہے ہیں صاف صاف آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اب بھی اگر آپ کا دل چاہے تو کل مسٹر سرکار سے گفتگو کر کے دیکھ لیں۔"

تینوں پھر بہت جلد رخصت ہو گئے۔ اسے دیکھ کر ذرا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں دوبارہ آنے کی خواہش باقی رہ گئی ہے۔ شمیں نے میری طرف دیکھ کر ہنس کر کہا۔ "چلو دل میں ایک دوسرا تھا وہ بھی خود لے جا کسی کی روزی مارنے کا سوال نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو کسی کو تمہیں اعتراض نہ ہوتا۔"

شمیں نے حیرانی سے کچھ دیر میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اعتراض ہونا مناسب بھی نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے شمیں نے کہا۔ "اسی بڑھیا خبر کو نہیں سنائے گا؟ چل!"

نہ جانے اس دن انکار نہ کر سکا۔ اصل میں تو شمیں سے اس بات پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ خیر، بیاہ بڑھیا نہیں ہے، دوسرے خود کو یہ خبر سنانے کی خواہش کو دبانے کے لئے خود کو سمجھانے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس دن یہ سب باتیں فضول معلوم ہوئیں۔ ممکن ہے یہ میری کمزوری ہو۔ زندگی بھر کوشش کر کے اصولی زندگی کی جو ڈھال تیار کی ہو۔ اس میں اگر بہت بڑا سوراخ نکل آئے تو اسکی وجہ سے خود کو لعنت ملامت کرنے کی خواہش نہ تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی کوئی خوف محسوس نہ تھا کہ شمیں کی صحبت سے شاید میرے اندر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

چلتے چلتے شمیں نے یکایک کہا۔ "تیرے گاؤں میں کملا نام کی لڑکی ہے نا؟"

حیران ہو کر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں تو نہیں جانتا۔"

شمیں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "ارے کملا نہیں اس کا نام شاید بینا ہے۔ نہیں ربیا جیسا سیوا ہے۔ نام مجھے یاد تھوڑا ہی رکھا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ایسی تو نہ جانے کتنی ہیں۔"

"کتنی نہیں میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ جو کانوں میں کرن پھول پہنتی ہے۔ ماتھے پر بندی۔ پاؤں میں آلتا۔ اوڑھنا نہیں اکثر میں کس کر باندھی ہوئی نیلا امبری دھوتی۔ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی ہے۔ درختوں کے اوپر چڑھ کر چڑیوں کے بچے پکڑتی ہے۔ غصہ میں آ کر اس نے ایک دن تیرے ہاتھ میں کاٹ کھایا تھا۔ غصہ جس دن کو آیا تھا اس دن سد کر بولی تھی۔ "دادی دادا میں بھی میلے جاؤں گی۔" کیوں ہے نہ ایسی ایک لڑکی؟"

"نہیں، یاد نہیں آتا۔"

"اوہ پھر تو غلطی ہو گئی۔ پاؤں میں اس کے آلتا ہی تھا۔"

شرم کے مارے سامنے نہیں آتی۔ آتی ہے تو سر نیچا کئے رہتی ہے۔ پیچھے پھرنے پر مڑ کر چہرے کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن آنکھیں چار ہونے پر شرم سے سرخ ہو کر نظریں جھکا لیتی ہے۔ بات کرتی ہے تو گویا گلا جکڑ جاتا ہے۔"

شمیم نہ جانے اور کیا کہنے والا تھا۔ میں نے اُسے ٹوک کر کہا۔ "بات کچھ بھی نہیں شمیم دادا!"

"نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تو نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

"اچانک یہ سوال کیوں کیا؟"

"ایسے ہی پوچھ لیا۔ بتا نہ۔ کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اسکا جواب دینا آسان نہیں ہے شمیم دادا۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کچھ دیر میری طرف دیکھا پھر قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے تجھے یہ گھن لگ چکا ہے!"

حیران ہو کر میں نے پوچھا۔ "اسکا مطلب؟"

"اسکا مطلب یہ کہ اگر آنکھ نہ لڑتی تو تیرے دل میں کوئی بات اس طرح نہ الجھتی" میری کمر پر ہاتھ مار کر شمیم نے پھر کہا۔ "ہماری عدم تعاون کی تحریک والے رومی کو جانتا ہے نہ! وہ ہوتا تو صرف ایک بات کہتا۔ لیکن ہمارے رومی کو تو بات کا جواب دینا مشکل ہو رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد دوسری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بالکل ایک نئی بات کہی۔ "یہ لڑکی منو بڑی عجیب ہے۔ ہے نہ؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "میری نسبت تم زیادہ جانتے ہو۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ہاں شاید زیادہ ہی جانتا ہوں۔"

× × × × ×

منو کے گھر جس وقت پہنچے، دوپہر ہو چکی تھی صبح سے گھومتے گھومتے کچھ کچھ تھک گیا تھا۔ اس غریب کنبہ کی مہمان نوازی کا خیال آتے ہی کچھ خوشی سی ہوئی۔ گھر کے اندر داخل ہونے میں جو جھجک محسوس ہو رہی تھی وہ منو کی خاطر تواضع کے خیال سے جلد دور ہو گئی۔ کنڈی کھٹکھٹانے کے تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو تعجب سے دیکھا کہ جس شخص نے دروازہ کھولا وہ ہمارے لئے قطعی ناآشنا تھا۔ ہماری طرف حیرانی سے دیکھ کر کسی قدر بے اعتنائی سے اُس نے کہا۔ "کس سے ملنا چاہتے صاحب!" شمیم نے مسکرا کر کہا۔ "ایسے تو کسی خاص آدمی سے نہیں ملنا۔ لیکن اندر جانے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

اُس آدمی نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ لوگ کون ہیں جناب؟" وہ جس ڈھنگ سے دروازہ روکے کھڑا تھا۔ اُس سے ہمیں آسانی سے اندر جانے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اخبار کے دفتر میں ایک بابو نے روکا تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ منو کے گھر میں داخل ہونے میں بھی رکاوٹ پیش ہوگی۔ شمیم نے کہا۔ "دروازے پر کھڑے کھڑے اپنا پورا تعارف دینا مناسب نہ ہوگا۔ چلئے اندر چل کر آپ کے تجسس کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے ہماری بات سمجھی یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن گرم ہو کر بولا۔ "کس سے ملنا چاہتے ہیں آپ، بتا نہیں سکتے! دروازے پر کھڑے کھڑے کشتی لڑتے ہیں۔ عجیب آدمی ہیں آپ؟"

شمیم نے ہنس کر کہا۔ "پولیس کمشنر کا سرٹیفکیٹ کہیں گم ہو گیا ہے۔ ورنہ ابھی ثابت کر دیتے کہ چوری، جوا، ڈکیتی، رہزنی سبھی الزاموں سے ہم لوگ بری ہیں اور بالکل شریف آدمی ہیں۔ لیکن آپ کے سوال کا کہ کس سے ملنا چاہتے ہیں، ابھی جواب نہ دے سکیں گے۔"

شمیم کی تقریر کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہتا۔ اور نہ جانے اسکا کیا انجام ہوتا۔ دروازے پر کھڑا کھڑا میں اُسکی بکواس سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا۔ کہ اسی وقت منو نے آکر سارا جھگڑا ختم کر دیا۔ دروازے کے سامنے آکر اُس نے کہا۔ "آؤ۔"

اس بار اُس شخص نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا اور بولا۔ "انہیں جانتی ہو کیا؟ جبھی یہ لوگ یہ بتانے میں ہچکچا رہے تھے کہ انہیں کس سے ملنا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ چھوڑ دیا اور حقارت آمیز طنزیہ ڈھنگ سے مسکرا دیا۔ سارا ماحول اسکی بات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں مجھے عجیب پریشانی کا احساس ہو رہا تھا۔

شمیم نے گھر میں داخل ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے گا صاحب! بدقسمتی سے آپ کا تعارف حاصل نہ تھا۔ آپ کی تعریف؟"

اُس نے خشک ہنسی ہنس کر کہا۔ "بس، تعارف یہی کافی ہے۔ آپ کی طرح کسی اسکینڈل سے جس بے تعلقی سے چھپانے کی کوشش نہیں کیا۔

رشتہ میں یہ میری بھابی لگتی ہیں۔" اس کے طنز سے میں کانپ گئی۔ لیکن شمیم نے اسی طرح ہنس کر کہا۔ "اتنی دور کا رشتہ؟ تبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر قریبی رشتہ ہوتا تو شاید ابھی تین سال تک آپ کا نیاز حاصل نہ ہوتا۔" اس بار اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے اندر چلا گیا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ منو بھی نہ جانے کب چپ چاپ اندر چلی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس گھر میں قیام کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ شمیم کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوتے میں نے کہا۔ "میں اب جاتا ہوں شمیم!"

شمیم نے کہا۔ "جائے گا تو سہی۔ تیرا اس جگہ پر موجود رہنے کا حق تو ہے نہیں۔ لیکن پھر بھی کھا پی کر جانا۔" اس کے بعد منو کو پکارا۔ "منو، بھابی جی، درشن دے گی کیا؟"

منو نے دروازے پر آکر کہا۔ "کیا بات ہے؟"

آج میں نے منو کو غور سے دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ منو کو میں نے کبھی اس قدر کنارے کھڑے بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن آج میں نے حیرانی سے دیکھا اس کے چہرے پر درد و کرب اور بغاوت کا ایسا انقلابی سایہ تھا کہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ امید تھی کہ وہ مجھے پیار اور احترام سے پکارے گی۔ لیکن اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ میں اتنے دنوں بعد اس کے گھر آیا ہوں۔ لیکن اس قسم کے کسی بھی جذبہ سے اس کا چہرہ قطعی عاری تھا۔ یہ بات شمیم نے بھی محسوس کی۔ اور بوجھل ماحول کو کچھ ہلکا بنانے کی غرض سے اس نے کہا۔ "حالانکہ ہمارا درجہ تمہارے رشتہ داروں سے بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی تو ہم معاف نہ کریں گے منو رانی۔ یاد رکھنا۔ جاؤ جلد تین آدمیوں کے لئے آپ تندور دھوپ میں خشک کیا ہوا چاول، اور کیلے کا ساگ پکانے کا انتظام کرو۔ اس وقت کی مرحوم لنتاری میں ہمارے بدن کی مدد میں گنتی ہوئی ہے۔

تم جانتی ہو کہ یہ غلط بات نہیں ہے۔"

منو کے چہرے پر کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔ اطمینان سے اس نے کہا۔ "نہیں، اب لیکن دیکھنے کی گنجائش نہیں شمیم دادا۔ میری ساس کی حالت خراب ہے۔ میرا دلیپ مجھے گھر لے آیا ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"زندگی میں جسکو دیکھنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ اسے بستر مرگ پر دیکھنے کی ایسی کیا ضرورت آن پڑی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی منو۔"

"سمجھنے کی کوشش جب میں نے ہی نہیں کی۔ تو تم کیوں کرتے ہو شمیم دادا۔ اس بار میں نے طے کر لیا ہے۔ ضرور جاؤں گی۔"

شمیم نے یکایک جوش میں آکر کہا۔ "نہیں تم نہیں جاسکتیں منو۔ تمہارے اوپر ان کا کوئی اختیار نہیں۔ تم اس بات کو اتنی جلدی کیوں بھول گئیں؟"

"بھولی نہیں ہوں۔ تبھی تو جا رہی ہوں۔"

شمیم نے بے صبر ہو کر کہا۔ "مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ نہ بناؤ منو۔ میں تمہیں اس طرح اپنا خون نہ کرنے دوں گا۔"

"تو رہنے دو بھائی۔" سب نے چونک کر دیکھا۔ منو کا دلیپ دہلیز پر کھڑا تھا۔ بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولا۔ "تمہارے جانے کی ضرورت نہیں رہی بھابی۔ ان کی مرضی کے خلاف تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ماں کو بیمار رہنے دو۔ تمہارے نہ جانے سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔" کچھ رک کر ہم سب کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔ "تمہاری پرائیویٹ گفتگو میں دخل انداز ہو کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔"

"واقعی اچھا نہیں کیا۔ کچھ دیر اور آڑ میں کھڑے رہتے تو اور بہت سی باتیں سنتے۔ جلد بازی کر کے آپ نے بڑا سنہری موقعہ گنوا دیا۔" شمیم نے کہا۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ بغیر سنے ہی جو کچھ سمجھ لیا ہے۔ وہی کافی ہے۔ میں چلا بھابی۔ ماں اکیلی مر جائے تو اچھا ہے۔ اسکے ساتھ تمہارا خون نہ ہونا چاہیئے۔ واپس پہنچ کر اگر ماں زندہ ملی تو مرنے سے پہلے اس سے تمہیں آشیرواد دینے کے لئے کہوں گا۔"

وہ جانے لگا تو منو نے اسے روک کر کہا۔ "ٹھیرو للہ میرے کپڑے لتے ابھی نہیں بندھے۔"

شمیم اور میں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ شخص تذبذب میں پڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "اسکا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔ مجھے لینے آئے ہو تو لے کر ہی جانا۔"

منو کا دلیپ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ منو نے اسے روک کر کہا۔ "اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"

مُنو کے جانے تک کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ کاؤنٹی کے آنے پر مُنو کا دلیپ سامان رکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ مُنو کی ماں نے ہنستے ہنستے آکر لڑکی کو گاڑی میں بٹھایا۔ آخر میں جب شمیین سے نہیں رہا گیا تو اس نے ایک بار صرف اتنا کہا "تم نے غلطی کی ہے مُنو ؟"

مُنو نے کچھ مسکرا کر کہا۔ "اتنے دنوں میں میں نے یہ بات سمجھ لی ہے شمیین دراصل میرے لئے غلطی کرنا نہ کرنا برابر ہے"

اس کے بعد گاڑی روانہ ہونے پر یکایک میری طرف مُڑ کر بولی۔ "اچھا، تو میں چلتی ہوں۔ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو" اور اگلے ہی لمحہ اپنے پرانے انداز میں ہنس کر بولی۔ "تمہیں ایک دن دل بھر کر چھیڑنے اور چڑانے کی حسرت ہی رہ گئی۔"

میں ہنسنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ کہہ نہ سکا۔

× × × × ×

گاڑی چلی گئی۔ نہ جانے ہم کب تک اسے ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھتے رہے۔ مُنو کے جانے کے بعد لمحہ بھر کے اندر زندگی میں اتنی بےکیفی اور بیزاری آسکتی ہیں۔ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اس لڑکی کو میں کافی پہچان چکا ہوں۔ اس کے ساتھ کافی دنوں کا تعارف ہے۔ اور ایک دن گہرے تعلقات کا جو دھاگا ہم دونوں کے درمیان بندھنے لگا تھا۔ میں نے اسے بھی قبول کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ اُسے توڑ دیا تھا۔ پھر آج کیا یک میرا دل ویران کیوں ہو گیا؟ میری ساری قوتیں مجھ پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی دلیل اور تدبیر سے قطع نظر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی میرا دل ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔

اچانک شمیین کی طرف مُڑ کر دیکھا تو وہ بھی منہ لٹکائے نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اس طرح مستغرق دیکھ کر اس نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔ یہ خیال کر کے مجھے کچھ جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے آواز دی "شمیین!"

پہلے چونک کر پھر اگلے ہی لمحے ہنس کر اس نے کہا۔ "ہاں بھوک مجھے بھی لگی ہوئی ہے"

میں نے کہا "میں بھوک کی بات نہیں کر رہا ہوں"

شمیین نے کہا "بھوک ہو نہیں۔ چاہئیے تک تو ہے منو چلی گئی ہماری بلا سے۔ لیکن ہمیں بھوکا چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ اچھا نہیں ہوا مدین"

شمیین کا مذاق کچھ پھیکا محسوس ہوا۔ اُسکی آواز بھی بےسُری تھی۔ اُسکی ہنسی میں بھی وہ بات نہ تھی۔ میں نے کہا "اب کیا کرو گے؟"

اب یہ پتہ لگاؤں گا کہ کھانا اور کچھ ناشتہ کہاں ملے گا؟ اس کے بعد کچھ دیر آرام کرنے میں بھی اعتراض نہ ہوگا۔

"تب چلو۔ اپنے مَیس چلیں"

شمیین نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ کھانا، ناشتہ اور آرام تینوں بیک وقت ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی وہاں آرام کے بارے میں بےفکری ہو جاتی ہے۔"

× × × × ×

مَیس میں جا کر دیکھا، وہاں نقشہ ہی اُلٹا تھا۔ سارے مَیس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف اژدہام تھا۔ ان کا حلیہ اور لباس اور سلوک دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ کلکتہ کی بجائے کسی دوسری دنیا کا تماشہ خوبصورت کرنے ہیں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا۔ کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ نے کسی کام سے کلکتہ آیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو پنڈوں کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر یہاں پناہ دی تھی۔ وہ نے کی سخاوت سے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ اوپر نیچے جدھر بھی نظر اٹھی۔ میں نے دیکھا کوئی نہ کوئی چولہا سلگ رہا تھا۔ اور گیلی لکڑیوں سے اتنا دھواں نکل رہا تھا کہ سارا گھر دھوئیں سے بھر رہا تھا۔ آنکھوں سے کچھ دیکھنا اور سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

سب ملا کر پانچ خاندان تھے۔ چھوٹے بڑے ملا کر مرد عورتوں کی گنتی تک بیک تیس تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی پہلے قیامت کے بغیر ان تیرہ پاتریوں نے تعارف کے بغیر ہی ہمیں پہچان لیا تھا۔

مسکان پریشانی سے چاروں طرف دیکھتا ہوا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے، ... بھیڑ میں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

سبحان نے تفکرانہ انداز سے کہا "میرا ایک مگدر نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ کچھ معلوم ہے؟ ایک ہی مگدر نظر آتا ہے۔ دوسرا کہاں ہے؟"

شبھین نے کہا۔ "اس موضوع پر میں کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں۔ بے فکر رہو تمہارے مگدر نے بڑے نیک کام میں اپنی جان گنوائی ہے!"

سبحان بولا "مذاق چھوڑو شبھین دادا۔ کل ہی مگدروں کی نئی جوڑی خرید کر لایا تھا؟"

شبھین نے کہا۔ "اسکی کمسن زندگی کام آئی جس میں ان حضرت کو دیکھ رہے ہو جو انگوچھے سے اپنے تیل میں ڈوبے ہوئے جسم سے پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا کہ انہوں نے ایندھن کی کمی کلہاڑی سے ایک مگدر چیر کر پوری کی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارا ہی مگدر رہو!"

سبحان کا چہرہ دیکھ کر آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ اسے اس خبر سے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔

تبھی دیکھا کہ ونے بازار سے خریدا ہوا سامان لا رہے تھے پریشان حال ایک شخص کے پیچھے میس میں داخل ہوا۔ سبحان نے اسے پکڑ کر کہا۔ "کیا معاملہ ہے ونے!"

"چھوڑو مجھے فرصت نہیں ہے!"

لیکن سبحان اسے کب چھوڑنے والا تھا۔ بولا "معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ان ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں میرا ایک مگدر کام آ گیا ہے۔ وہ تمہیں جوڑ کر دینا ہوگا، سمجھے!"

ونے نے تعجب سے کہا۔ "ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں مگدر کام آ گیا! کیا مطلب؟"

شبھین نے مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ ہم لوگوں نے مگدر کی وفات حسرت آیات پر سبحان سے اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن ونے نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "اسے تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے!"

سبحان نے چڑ کر کہا۔ "ہاں وہ تمہارے لئے ہے!"

نسرت نہ جانے کہاں تھا۔ ابھی تک اسے نہ دیکھا تھا۔ یکایک اس نے آ کر کہا "چڑتے کیوں ہو سبحان۔ کسی دن تم اپنے حاجیوں کو بھی کھلا پلا دینا۔ جھگڑا ختم ہو جائے گا!"

جواب میں سبحان کوئی سخت بات کہنے والا تھا شبھین نے اسے روک کر کہا۔ "اچھا تم لوگ اپنا یہ دھرم یدھ" "آدھا جہاد" بند کرو۔ پہلے ونے کی اس بھیڑ کا تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔

لیکن تب تک ونے سبحان سے چھٹکارا حاصل کر کے بازار سے لائے ہوئے سامان سمیت غائب ہو چکا تھا۔ تعارف حاصل کرنے کے لئے خود کوشش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

شبھین نے کہا۔ "تمہارے مگدر کو جن حضرت نے ٹھکانے لگایا ہے معلوم ہوتا ہے وہی اس عوامی قافلے کے سردار ہیں۔ دوسروں کی ملکیت تقسیم کرنے کا ان کا ایک اصول معین ہے۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں بھی وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ انہی سے گفتگو شروع کی جائے!"

اس وقت وہ حضرت پسینہ پونچھ کر اسی انگوچھے سے ایک بہت بڑی ہانڈی چولہے سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شبھین نے آگے بڑھ کر کہا "گوسائیں جی پرنام۔ کھانے دانے میں کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو!"

ہانڈی اتار کر گھبراہٹ اور عجلت میں گوسائیں جی نے پرنام کا جواب دے کر کہا۔ "جی بالکل نہیں۔ آپ لوگوں اور گورو کی کرپا سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی" اس کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر لے جاتے ہوئے عقیدتمندانہ انداز سے بولے "اور تکلیف ہو بھی کیسے۔ گورو اپنے بھگتوں کا بندوبست خود کر لیتے ہیں صحرا ہو یا جنگل رو مطلق پرشاد تو کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتا ہے۔"

نسرت نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن آپ کو معلوم ہے جنگل میں جتنی آسانی سے مل جاتا ہے صحرا میں اتنی آسانی سے تھوڑا ہی مل سکتا ہے۔ جنگل کی تو بات ہی الگ ہے۔"

نسرت کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی احمقوں کی طرح اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش رہ گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اپنے دیوہیکل جسم میں کپکپی پیدا کرتے ہوئے وحشیانہ قہقہے سے ساری عمارت کو سر پر اٹھاتے ہوئے بولے "اس میں کیا شک ہے بابو صاحب۔ گورو کے لئے صحرا اور جنگل سب برابر ہیں۔ ان کے لئے بھلا کہیں کون و مکان کی قید ہو سکتی ہے!"

شبھین کا انہیں گوسائیں جی کہہ کر پکارنا کسی طرح غلط نہ تھا۔

گلے میں تین لڑیوں کی موٹی مالا تھی اور پیشانی پر تلک لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سویرے کالی گھاٹ پر گنگا اشنان کیا ہوگا۔ پسینے سے تر جسم کو بار بار انگوچھے سے پونچھنے کے باوجود "سیتارام" "سیتارام" کا چھاپہ ابھی تک نہ مٹا تھا۔ بات چیت اور رنگ ڈھنگ، سے انکساری ٹپکتی تھی۔

شمیم نے کہا "میں نے کہا اگر کسی چیز کی کمی ہو تو بتا دیجیے گا۔ چولھے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہو تو کہیئے۔ ایک گدڑ ابھی باقی ہے"

"گدڑ؟" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا اور پھر تیاں میں کر کے ہنس پڑے۔ بولے۔ہم تو فقیر ذات ہیں۔ گدڑ لے کر بھلا کیا کریں گے"

اچھا اچھا گوسہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا رہے آج کا دن گوسائیں جی کے پرشاد پر گذارا جائے۔ کیا خیال ہے؟

گوسائیں جی نے کہا۔ ہماری خوش نصیبی ہوگی"

"ضرور ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ ہمارے اندر بھی تو خالی ہیں گوسائیں جی۔ ہم کسی کی بات ٹال نہیں سکتے۔ بیٹھو دوپن۔ بیٹھ جاؤ۔ شمیم دادا سبحان اعتراض نہ ہو تو تو بھی بیٹھ جا۔ یہاں چھوت چھات بالکل نہیں ہے۔ سمجھ لے"

گوسائیں جی کے چہرے کی طرف دیکھ کر دم آتا تھا۔ بولے آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ دو چار آدمیوں کے لئے اندازہ سے کھانا بنایا ہے"

گوسائیں جی کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر شرت نے فوراً کہا۔کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تکلیف بھلا کا ہے کی۔ اس طرح پرشاد بانٹنے میں ہی انہیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔کیوں گوسائیں جی؟

گوسائیں جی نے غمگین انداز سے کہا "جی ہاں۔ یہی بات ہے اچھا تو ایک ہانڈی اور چڑھا دوں؟"

شمیم نے کہا۔خوب دیکھ بھال کر چڑھائیے گا۔ ہمارے کتنے آدمی ابھی پہنچنے والے ہیں"

گوسائیں جی کے چہرے سے بچی کچی ہنسی بھی کافور ہوگئی۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اور کتنے آدمی آئیں گے؟

"یہی بارہ تیرہ آدمی ہوں گے" یہ کہہ کر شرت نے آواز دی ارے بونے ذرا ادھر آنا"

ہمارا انداز دیکھ کر بونے کو بات سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ بولا "یہ تم لوگوں کی زیادتی ہے شرت۔مہمانوں کے اوپر؟"

شرت نے فوراً کہا۔ظلم کیا؟ اس دفعہ سبحان کا ڈرا گدڑ بھی کام آجائے گا!

سبحان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا "اگر اس سے بھی کام نہ بنا تو تیری چوکی اٹھا کر لے آؤں گا"

شرت نے اس انداز سے کہا "ٹھیرئیے آپ لیکن ٹھیرو پہلے اس کا ٹھکانہ نہ بتا دو۔کل پیسوں کی قلت کی وجہ سے میں اسے ایک دکان پر بیچ آیا تھا"

سارے دن کی دوڑ دھوپ اور فاقے کے بعد نہایت شاندار دعوت ہوئی۔ کچھ بھی ہو، میں نے دیکھا گوسائیں جی کھانا پکانے میں طاق تھے۔

شرت نے کہا "کچھ بھی کہو۔ بیچارہ بڑا آدمی ہے۔ بابا کھائے۔ بے ضرر!"

شمیم نے بونے کی کرشوک کر کہا۔ ہمارا ہوا بلی قافلہ زندہ باد بونے! صبح سے جیسی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوئی تھیں ان سے تو امید نہ تھی کہ آج تو الٹے منہ میں جائے گا"

سبحان نے کہا "بونے کے جمہور میں میرا ایک گدڑ شامل ہے شمیم دادا۔ یہ نہ بھولو"

"گدڑ کے بغیر کوئی بھی جمہور خوبی سے نہیں چل سکتا" بونے نے جھلاکر کہا۔ تمہارا یہ ہنسی مذاق مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا شمیم دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے تمہارے دل میں حقارت کا جذبہ ہے۔ اور در حقیقت ہمارا مدد انہی لوگوں پر مشتمل۔۔۔"

بونے کی تقریر پوری نہ ہوسکی۔ اچانک نیچے صحن سے اتنا شور اٹھا کہ اسے برداشت کر کے بیٹھا رہنا دشوار ہوگیا۔ ہم سب یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا بات ہے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر آکر دیکھا تو شور و غل میں کچھ سننا مشکل ہوگیا۔ یہ کچھ یاتریوں کا گروہ تھا جس میں مرد عورتوں کی زبانیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں

بلکہ کہیں کہیں تو بیچے بھی حصّہ لے رہے تھے ۔ البتہ اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ اس بے ضرر گانے صفت گوسائیں جی کے اوپر ہی اس جھگڑے کی بنیاد تھی ۔ کندھے کا انگوچھا انہوں نے کس کر کمر میں باندھ لیا تھا ۔ گلے کی کنٹھی کی ایک لڑی نہ معلوم کیسے ٹوٹ گئی تھی سرخ آنکھیں اور بھاری بازوؤں کے بار بار خم ٹھونکنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ گوسائیں جی مذہبی معاملات میں خواہ کچھ بھی ہوں ۔ لیکن کشتی کے فن میں طاق ہیں ۔ انکی یہ بدلی ہوئی صورت پہچانی نہ جاتی تھی ۔

دوسرے فریق کے چوہدری کی حیثیت سے جو شخص بحث کر رہا تھا اس کے نعرہ بازو پر کچھ زیادہ اعتماد نہ ہوتا تھا ۔ دبلا استخوانی چہرہ تھا اور پسلیاں جسم سے باہر نکل پڑتی تھیں ۔ لیکن جسمانی طاقت کی کمی وہ اپنے گلے سے پوری کر رہا تھا ۔ اس کی زبان جتنی تیزی سے چل رہی تھی آواز بھی اتنی ہی بلند تھی ۔

کچھ دیر اس لڑائی کا نظارہ کرنے کے بعد شچپن نے کہا "بھئی اس جنگ عظیم میں تیسری طاقت کی دخل اندازی کی ضرورت ہے ۔"

بڑی مشکل سے بکھرے ہوئے دونوں فریقوں کی باتوں سے جو زکوٹہ تھا اتنا سمجھ میں آیا کہ ہمارے گوسائیں جی کی رہنمائی میں انکے گاؤں اور نواحی کئی گاؤں کے دس خاندان تیرتھ یاترا کے لئے نکلے تھے ۔ کالی گھاٹ پر کالی دیوی کے مندر اور اسکے ساتھ کلکتہ کا عجائب گھر، چڑیا گھر، پارشی ناتھ کا باغیچہ اور دوسرے قابل دید مقامات دکھانے کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی ۔ ہر یاتری نے اُن پر اعتبار کر کے انہیں کچھ نقد روپیہ بھی سونپا تھا ۔ اس وقت ان روپوں پر ہی جھگڑا ہو رہا تھا ۔ گوسائیں جی صرف کالی گھاٹ دکھا کر خاموش ہو گئے اور اب گاؤں واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے ۔ لیکن روپیہ لوٹانے کا نام نہ لیتے تھے ۔ صرف یہی نہیں کالی گھاٹ پر پنڈوں کے گھر ٹھہرنے میں کرائے کی رقم میں جو بچت ہوتی تھی اسکو واپس کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے ۔

آخر میں گوسائیں جی ان سب باتوں سے عاجز آ کر بول اٹھے "جاؤ ! جاؤ میں روپیہ واپس نہیں کروں گا ۔ جو ہو سکے کر لو ۔ پنڈوں کے گھر ٹھہر کر کرایہ میں جو بچت ہوئی تھی ۔ لیکن میں نے اپنی دانشمندی سے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا ۔ پھر تمہیں یہ روپیہ کیوں واپس کروں ۔ بتاؤ ؟

وننے پر گویا سکتہ طاری تھا ۔ شرت نے اُسے آنکھ مار کر کہا ۔ "وننے بات سنو !" دُبلے پتلے شخص نے تیز ہو کر کہا ۔ "اچھا کرانے کا روپیہ تو خرچ نہیں ہوتا ، تم نے رکھ لیا تو خیر ۔ لیکن عجائب گھر اور چڑیا گھر دکھانے کے لئے جو روپے لئے تھے وہ کہاں ہیں ؟

گوسائیں جی نے اُسے پوری بات نہ کہنے دی اور بولے ۔ "ہٹ بھلا کتنا روپیہ دیا تھا تم نے ۔ عجائب گھر اور چڑیا گھر مفت تھوڑا ہی دکھائے جاتے ہیں ؟"

اس کے بعد ان روپوں پر جو شرمناک ہنگامہ شروع ہوا اور عورتوں اور بچوں کے سامنے ایک دوسرے کے لئے جس زبان کا استعمال کیا گیا اُسے دیکھ کر خاموش رہنا دشوار ہو گیا ۔

شچپن کی دخل اندازی کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ جھگڑا ختم کرنے کی کوشش میں وننے کی جس طرح بے عزتی ہوئی ۔ اس سے مشتعل ہو کر لڑنے کے لئے کمر کستے ہوئے شرت نے کہا ۔ "نہیں شچپن دادا زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا ۔ ٹھہرو میں ان بدمعاشوں کو دھکا دیکر باہر نکال آتا ہوں ۔"

لیکن یہ لوگ صرف دھکے کھا کر نکلنے والے نہ تھے ۔ گوسائیں جی نے کہا ۔ "کیوں بے بشو ۔ کتے میں خوب جانتا ہوں ۔ نند پال کی دونوں بھتیجیوں کو تو یہاں کس لئے لایا ہے ۔ بتا دوں ! کہدوں سب کے سامنے ! تو مجھ سے روپیہ لے گا ! اس سے پہلے میں تجھے جیل بھجوا دوں گا ۔ جانتا ہے ؟"

بشو کتے نے بھی جان پر کھیل کر کہنا شروع کیا ۔ "مجھے جیل بھیجکر تو بچ جائے گا بدمعاش ! تو نے خود پچاس روپے اس کے لئے پیشگی نہیں لئے ؟"

سبحان اور شرت اس بار واقعی غصّے سے آگ بگولہ ہو کر انہیں مارنے دوڑے کہ شچپن نے کہا ۔ صرف مارنے پیٹنے سے اس گتھی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا سبحان ۔ اتنی بات سننے کے بعد ہم خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے ۔

"مجھے بھی شچپن کی بات کی تائید کرنی پڑی بیرتھ یاتریوں کے اس گروہ میں نند پال کی بھتیجیاں کونسی ہیں ۔ یہ جاننے کی کوشش میں تھے ۔ ان کے سلسلے میں جو ذلیل سازش ہو رہی تھی ۔ اُسے معلوم کر کے خاموش نہیں رہا جا سکتا تھا ۔

نصرت نے گوسائیں جی کے پہلے کے مانند چھوڑے ہوئے گال
پر ایک زور کا طمانچہ لگا کر کہا "چپ رہ بدمعاش۔ بتا اس گروہ
میں نندپال کی بھتیجیاں کونسی ہیں؟"

ایک ہی لمحہ میں گوسائیں جی کا برتاؤ، چہرے کا انداز، گفتگو
سب کچھ بدل گیا۔ ایک بار سامنے دیکھ کر، ہماری طاقت کا کچھ
اندازہ کر کے اچانک نرم پڑ کر ملائمت سے بولے۔ "مار دیجے مجھے
آپ لوگ پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ بے ادبی کر کے دو ہاتھ بھی مار
سکتے ہیں؟"

سبحان نے کہا۔ "بہانے مت تراشو۔ نندپال کی دونوں بھتیجیاں
کہاں ہیں، جلدی دکھاؤ۔ ورنہ ہڈی پسلی باقی نہ بچے گی۔ سمجھ لے؟"

سارے جسم میں کپکپی پیدا کر کے ایک زوردار قہقہہ لگا کر
گوسائیں جی بولے، "آپ لوگ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لڑائی جھگڑے
میں تو نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ آپ ان باتوں کو صحیح سمجھ بیٹھے
نندپال کی بھتیجیاں بھلا یہاں کہاں! وہ تو اپنے گاؤں میں ہیں
کیوں لبشو؟"

آفت آتی دیکھ کر لبشو نے ابتک خود کو اچھی طرح سنبھال
لیا تھا۔ ہنس کر بولا۔ "جھگڑے میں ہمارے منہ سے نہ جانے کتنی
باتیں نکل جاتی ہیں۔ سبھی پر اعتبار تھوڑا ہی کیا جاتا ہے۔"

سبحان نے اس کے گال پر بھی ایک طمانچہ جڑ کر کہا۔ "جھوٹا
جھوٹ بولا تو پولیس میں دے دوں گا۔"

آسانی سے کامیابی ہوتے نہ دیکھ کر گوسائیں جی نے اس بار
بات کا رخ پلٹ کر کہا۔ "پولیس میں کیوں دیں گے۔ ہم نے رہزنی
کی ہے کیا! دیکھتا ہوں، کون دیتا ہے پولیس میں۔ میں جتنی شرافت
سے پیش آتا ہوں۔ اتنا ہی ظلم کرتے ہیں۔ واہ!"

نصرت نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں پولیس میں تو نہ دیں گے
گوسائیں جی۔ یہیں بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیں گے۔ جانتے نہیں ہم
سب دیہاتی لڑکے ہیں۔ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں؟"

نصرت کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن نہ معلوم گوسائیں
جی کا چہرہ کیوں فق ہو گیا۔ شاید دیہاتی لڑکوں کے بارے میں وہ کچھ
جانتے نہ رکھتے تھے۔ ایک بار آخری کوشش کرنے کی غرض سے
بھرائی ہوئی آواز میں بولے "جی... لیکن.... ارے لبشو۔

بولو نہ بھائی ہم بھلا نندپال کی بھتیجیوں کو کیا جانیں؟"

لیکن انہیں زیادہ بتلانے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ سفید دھوتی
پہنے گھونگھٹ نکالے دو لڑکیوں نے آگے بڑھ کر پھنسی آواز میں کہا۔ "دہائی
ہے بابا۔ ہمیں گھر پہنچا دو۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

ہم سب سکتے میں آ گئے۔ کچھ دیر تک کسی کے منہ سے بات نہ
نکلی۔ گوسائیں جی اور ان کے ساتھی کو آستانہ راستے دھمکاتے وقت
یہ نہ سوچا تھا۔ کہ یہ لوگ اتنے کمینے بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ لڑکیاں
ابھی اپنے وطن میں ہوں۔ انہیں یہاں لانے کی شاید ان ڈھونگیوں کی
ہمت نہ ہوئی ہو۔ لیکن اپنی آنکھوں سے انہیں اپنے سامنے موجود
دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

گوسائیں جی کچھ دیر تو شش و پنج میں پڑے رہے پھر اچانک
دونوں لڑکیوں کے سامنے جا کر ہاتھ پیر چلاتے ہوئے انہیں مارنے
کو آمادہ ہو کر بولے "کیوں ری بدذات لڑکیو! بڑی اچھی رہی ہو
دونوں۔ تمہاری شامت تو نہیں آئی؟" اور پھر ناک بھوں سکوڑ کر
بولے "ذرا پھر کہنا کہ ہمیں گھر پہنچا دو! ہم تمہارے نوکر ہیں یا غلام؟"
انہیں ہاتھ پیر چلاتے دیکھ کر لڑکیاں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئیں۔
سبحان اور نصرت نے دھکا دے کر گوسائیں جی کو پیچھے دھکیل
دیا۔ "خبردار جو آنکھیں نکالیں۔ کچومر نکال دیں گے" اس کے بعد دونوں
لڑکیوں سے مخاطب ہو کر پوچھا "بہنو تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ان لڑکیوں نے ڈرتے جھجکتے جس گاؤں کا نام بتایا اس سے
میں ناآشنا تھا۔ وہ لڑکیاں بھی گاؤں کے ضلع اور گھر کے مفصل پتے
سے ناواقف تھیں۔ بھولی بھالی لڑکیاں مدرسہ یا تربیت کے بجائے اعتبار
کر کے تیرتھ یاترا کے لئے چلی آئی تھیں۔ اس بات کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا۔
کہ ان کے ساتھ کوئی سازش بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے سوچا ان لڑکیوں
کو کتنا بھی ڈرایا دھمکایا جائے۔ صحیح بات کا علم نہ ہو سکے گا۔ ان کا پتہ
ٹھکانہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ نکالنا ہوگا۔

سبحان نے کہا۔ "پولیس کے سپرد کر دیں ان ٹھگوں کو؟"
شمیم نے ہنس کر کہا "ہاں تاکہ ان لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے
تم بھلا انہیں کیا کرو گے؟"

لیکن سوال درپیش تھا کہ کیا کیا جائے؟
بڑی پریشانی آن پڑی تھی۔ یاتریوں کے قافلے میں بعض وہ بھی تھے

لیکن انہوں نے اسوقت اپنا گروہ بنالیا تھا۔ وہ لوگ جیتے جی کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کلکتہ کے چند والنٹیر چھوکرے ان کے گاؤں کے مواد بے نقاب کر جائیں۔ ان سے کوئی بات پتہ لگانا مشکل تھا عورتیں جتنی بھی تھیں سب ان پڑھ۔ ان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ ریل پر چڑھ کر کالی گھاٹ آئی ہیں۔ گاؤں کے نام کے علاوہ انہیں زیادہ کچھ نہ معلوم تھا۔

تاہم دونوں لڑکیوں کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے۔ ان عیاروں کے چنگل سے انہیں چھڑانا مشکل نظر آتا تھا۔ پولیس کے سپرد کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ان دونوں لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے گا۔ موقع دیکھ کر گوسائیں جی نے کہا۔ "ہمیں فضول کیوں حیران کر رہے ہیں۔ آپ لوگ رئیسوں کے لڑکے ہیں۔ آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

سبھاش نے ڈپٹ کر اسے خاموش کیا اور کہا "شبھین دادا۔ نظر آتا ہے کہ انکی مرمت کئے بغیر سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا۔" شبھین نے سر ہلا کر اسے منع کیا۔ اور پھر اچانک نہ جانے کیا سوچ کر گوسائیں جی کے ساتھ والے شخص کو بلا کر اسے ساتھ لے کر چلا گیا۔

بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ گوسائیں جی پہلے تو گھبرائے لیکن پھر آہستہ آہستہ خوش ہو گئے۔ مار کھانے کا اندیشہ دور ہوتا دیکھ کر ہی شاید وہ خوش ہوئے تھے۔

دونوں لڑکیوں سے کافی پوچھ تاچھ کرنے پر بھی ہمیں اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔ دونوں بہنیں دو بیوائیں تھیں۔ اپنی جائیداد ہونے کے باوجود وہ چچا کے گھر رہتی تھیں۔ چچا کئی بار جائیداد اپنے نام کرانے کی کوشش کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئی تھیں۔ اسوقت انکے دل میں یہ شبہ تھا کہ شاید اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے چچا نے انہیں تیرتھ یاترا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن تیرتھ یاترا کی خوشی میں ان لوگوں نے یہ بات سوچنے کی کوشش نہ کی تھی کہ اتنا معلوم کر لینے کے بعد بھی انکے خلاف کی گئی سازش کی حقیقت نہ سمجھ سکا۔

گوسائیں جی معصوم لڑکیوں کی کہانی سنتے ہوئے بڑے [illegible]

انداز سے گھور رہے ہیں۔ اتنے دن تجھے گود میں کھلایا۔ اور آج میں تیرا دشمن ہو گیا۔ اور یہ اجنبی لڑکے یگانے ہو گئے۔ ہائے رے کلجگ! آج سے کان پکڑتا ہوں کبھی کسی کی بھلائی کی کوشش نہ کروں گا۔ میں نے سوچا بیچاری لڑکیاں گھومنے نہیں نکلتیں۔ میرے ساتھ کچھ تیرتھ یاترا کرلیں تو کیا حرج ہے۔ اور انہیں دیکھو تو مجھے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں!"

شرت اور سبھاش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شرت نے کہا "شبھین دادا نہ معلوم کہاں گئے۔ ہمیشہ دماغ کی طاقت سے کام نہیں چلتا۔ زور بازو بھی کبھی کبھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شبھین دادا یہ بات نہیں سمجھتے!"

لیکن شبھین کو زیادہ دیر نہ لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مسکراتا ہوا لوٹ آیا۔ سب نے پوچھا۔ "اس شخص کو کہاں چھوڑ آئے؟"

شبھین نے کہا۔ "اسے اسکے گناہوں سے نجات دلادی۔ اسے ایک نئے مذہب کا سبق دے کر آ رہا ہوں۔ اب تک وہ گیروے کپڑے پہن کر ہمارا پیغام پھیلانے نکل گیا ہوگا۔"

اس بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "ایں۔ بنسوا بھاگ گیا؟"

"بھاگ کر کہاں جائے گا گوسائیں جی۔ آپ لوگوں کی خفیہ سازش کا راز افشا کرنے کے بعد اس کے اندر آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس لئے میں نے اسے جانے کی اجازت دیدی۔"

اب تو گوسائیں جی کے چہرے کا رنگ دیکھنے لائق تھا۔ بڑے غمگین انداز سے لیکن ہمت کر کے انہوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے بیٹا مجھے پھنسوا کر دیکھوں گا، بھلا کہاں جائے گا۔ میں ڈوبوں گا تو سب کو لے ڈوبوں گا۔ نند پال کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

شبھین نے سنجیدگی سے کہا "چھوڑنا مناسب بھی نہیں ہے گوسائیں جی!"

"اور کیا میں نے روپیہ کھایا ہے تو اس حرامزادے نے نہیں کھایا! اور نند پال نے جائداد کے لالچ میں ہمیں جو رشوت دی وہ بھلا کیسے چھپ سکتی ہے!"

شبھین نے اسی سنجیدگی سے کہا "غور سے دیکھا جائے تو اصل بدمعاش نند پال ہے مانا کہ دیوتا جیسی پوتر زندگی میں ایک

کے لئے واپال کی نند میں بہہ کر آپ پھنس گئے اور آپ سے ایک معمولی سی غلطی سرزد ہو گئی۔ لیکن ....."

گوسائیں جی نے بھونچکے ہو کر دیکھتے ہوئے کہا "جی؟"

"میں نے کہا مانا کہ آپ نے کچھ روپے لئے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ کیا تو نہیں۔ ان لڑکیوں کو تباہ کرنے کی سکیم تو نند پال کے دماغ میں ہی آئی ہے۔ ساری بدمعاشی کی جڑ تو وہ ہے۔"

اندھیرے میں پھر کچھ روشنی ملنے پر گوسائیں جی نے کہا "بتائیے آپ ہی بتائیے نا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے روپیہ لیا ہے۔ اور حقیقت میں نے ابھی تک ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔"

شمیین نے کہا۔ "بے شک آپ کے خلاف کوئی الزام نہیں لگ سکتا۔ بشرطیکہ آپ ساری بات سچ سچ بتا دیں۔ لیکن اُس سالے نند پال کو چھوڑنا مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے؟"

گوسائیں جی نے اور خوش ہو کر کہا "جی اور کیا ہوا!"

شمیین نے کہا "اُسے اگر سزا نہ ملی تو دنیا سے انصاف اُٹھ جائے گا۔"

"جی ہاں۔"

شمیین نے گوسائیں جی کے کان کے منہ لے جا کر کچھ سرگوشی کی "مصیبت آئے گی تو نند پال کی آئے گی۔ اُس نے آپ لوگوں سے کیا کہا تھا؟"

گوسائیں جی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ بشو ہی تھا۔"

"یہ کیا ہم لوگ جانتے نہیں! لیکن پھر بھی آپ نے بات تو سنی ہے۔"

گوسائیں جی نے بڑے غمگین انداز سے کہا "جی سنا تو ضرور ہے لیکن بڑی گندی بات ہے کیا کہوں!"

شمیین نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "پھر بھی۔"

گوسائیں جی نے کہا "یہ نند پال بھی شیطان کا باپ ہے۔ اس سالے چھت تو دونوں لڑکیوں کو زہر دے دیتا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں بعد میں کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں لڑکیوں کو کالی دیوی کا مندر دکھانے کے بہانے کلکتہ بھیج کر وہاں کسی طرح چھوڑ آیا جائے۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کیا؟ کلکتہ لوٹنے پر یہ خبر اشاعت کی جاتی کہ وہ گھر سے نکل گئی ہیں۔ دوا پس لوٹنے پر ان کی ٹھیک چلنی پر بھلا کس کو یقین آتا کہ کون انہیں اپنے گھر میں رکھتا۔ ایک ہی داؤ میں ساری جائیداد نند پال کے قبضہ میں ہوتی۔"

شمیین نے کہا "اچھا آپ لوگوں کا گاؤں....؟"

گوسائیں جی نے بے خوفی سے گاؤں کا پتہ بتا دیا۔

اس کے بعد شمیین کو بلا وجہ ہنستے دیکھ کر سب کو بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ "ارے شرت تمہارے بشو حرف بنو لیشور بابو کو اب تنہائی کی قید ناقابلِ برداشت ہو گئی ہوگی۔ اپنے کمرے کی چٹخنی کھول کر اُسے باہر لے آؤ۔"

"اس کا مطلب ہے بشو گیا نہیں۔" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا۔

شمیین نے کہا "نہیں۔ لیکن اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں وہ کوئی بات بتانے پر راضی نہ تھا۔ تو میں نے اُسے نہ جانے دیا۔"

"تو بشو نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔"

"جی ہاں میں نے دیکھا اُس کا منہ آپ کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اس لئے مجھے آپ سے بات اُگلوانے میں تھوڑی سی چال چلنی پڑی۔ آپ اس کے لئے کچھ بھی کہیں لیکن میری درخواست ہے کہ اس کا بُرا نہ مانیں۔"

گوسائیں جی کا چہرہ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس وقت غصہ آ رہا تھا۔ یا تعجب۔

شمیین نے ہم سب کی طرف مڑ کر کہا۔ "تم لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو ان دونوں لڑکیوں کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری لینی ہوگی۔ گوسائیں جی شہر سے بے چارے جا رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد بھی نند پال کی دولت آسانی سے ہضم کرنا ان کے لئے دشوار ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں لڑکیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

سیمان نے کہا "میں جاتا ہوں۔"

شمیین نے مسکرا کر کہا۔ "اُنہیں اندازہ ناٹک ہے جاؤ گے عورت ذات کی حفاظت کرنے کے لئے۔ لیکن نئے اغوا کے الزام میں پکڑے جاؤ گے۔"

اُسی وقت شرت بشو کو قید سے آزاد کر کے لے آیا۔ بیٹھے بٹھا کر

وہی دونوں لڑکیوں کو اُن کے گاؤں پہنچا کر ان کا سارا بندوبست
کر کے واپس آ جائے گا۔"

اب گوسائیں جی اور اُن کے گروہ کے بارے میں بحث ہونے لگی۔ ونے نے کہا "اب انہیں زیادہ دیر تک پکڑا کر رکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ شہین دادا۔ انہیں چھوڑ ہی دیا جائے۔"

لیکن سبحان اور نصرت اس پر راضی نہ تھے۔

نصرت نے کہا: "ہم انہیں کچھ سزا دیئے بغیر نہ جانے دیں گے۔"

ونے نے کچھ گرم ہو کر کہا: "سزا دینے کا اختیار صرف ہم کو ہی ہے؟"

سبحان نے ونے کی کمر پر ہاتھ مار کر کہا: "اختیار ہو یا نہ ہو دیوانی عدالت کی مصیبت کون بھگتے گا۔ اس جرم کے مقدمہ کا فیصلہ اس جرم سے پہلے کرنے کی فرصت عدالت کو نہیں ہوگی۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم ہی لوگ اس جھگڑے کو نبٹا دیں۔"

ونے نے کہا: "اچھا تو یہ بتاؤ کہ سزا کیا دی جائے؟"

نصرت نے کہا: "یہی تو سوچنے کی بات ہے۔"

انہیں سوچنے کا موقع دے کر میں شہین کے ساتھ اوپر چلا گیا۔ سارے دن دل کے اندر جسم کے اوپر جو گذری تھی۔ اسکا اثر اب معلوم ہو رہا تھا۔ سارا جسم تھکن سے چور چور ہو رہا تھا لیکن آرام کرنے میں کچھ نہ معلوم کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آرام کرنے سے کبھی چین نہ ملے گا۔ دن بھر جس خلش کو باہر کے شور و غل میں بہلائے رہا۔ ذرا سا موقع پا کر وہ پھر دل پر چھا جائے گی۔ اس خلش کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی خوف تھا کہ اس خلش کی روشنی میں شاید اپنے دل کا وہ روپ نظر آنے لگے جس کا میں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا اور جسکو برداشت کرنے کی طاقت میں ابھی تک نہ جٹا سکا تھا۔

شہین دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ بلا کر اسے قریب بٹھایا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔ جس بات نے دل پر غلبہ کیا تھا اسے نبٹانے کے لئے کیا کہوں۔ اس مصیبت سے شہین نے ہی نجات دلائی۔ بولا۔ "دیکھو دونوں لڑکیوں کے ساتھ اکیلا نصرت کو بھیج کر ہم بے فکر نہیں ہو سکتے۔ انہیں لے جانے میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ نصرت اکیلا ساری ذمہ داری نہیں اٹھا سکے گا سوچتا ہوں میں بھی ساتھ چلا جاؤں۔"

"جان بچی۔ کچھ کر کوئی بات تو بنی۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "میرے جانے سے کام نہیں بنے گا؟"

شہین نے کہا: "بنے گا کیوں نہیں۔ لیکن بڑا جھنجٹ..."

میں نے ہنس کر کہا "جھنجٹ ہے تو میں جا رہا ہوں۔"

شہین نے نہ معلوم کیوں کوئی مذاق نہ کیا۔ میری طرف عجیب نظروں سے کہا: "اچھا تو تم بھی ساتھ جاؤ۔"

اس کے بعد بہت دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ شام کا اندھیرا گھر گیا تھا۔ اور اس اندھیرے میں گھر کا سارا ماحول دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس دھندلی روشنی میں مختلف سمتوں میں دیکھ رہے تھے۔ شہین کو اس طرح خاموش بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اسکا یہ انداز دیکھ کر حیران ہونا فطری بات تھی۔ میں خاموش بیٹھا کوئی بات چھیڑنے کی سوچ رہا تھا کہ اچانک شہین بول اٹھا۔ "ہو سکے تو ایک بار بستی پور ہو آنا۔ اس کا اثر ان پر پڑے گا۔"

میں نے تعجب سے کہا "بستی پور؟"

شہین نے کہا: "ہاں! ان کا سسرال وہیں ہے نا!" اور یہ کہہ کر وہ فوراً چلا گیا۔

× × × × × ×

نصرت اور سبحان نے گوسائیں جی اور اُن کے گروہ کا کیا بندوبست کیا، یہ تو وہی جانیں۔ البتہ دوسرے دن صبح اٹھ کر دیکھا تو ان کا پتہ نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ رات ہی میں گزارا کر صبح ہوتے ہی وہ لوگ چلے گئے تھے۔ کافی دیر تک نصرت اور سبحان ہم سے کتراتے رہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گوسائیں جی کے بارے میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا تھا لیکن ونے سارا معاملہ سمجھ گیا۔ بولا۔ "شہین دادا نصرت اور سبحان کی بے انصافی دیکھیے۔ مانا کہ سارا قصور گوسائیں جی اور [illegible] کا ہے لیکن اس کے لئے سارے قافلے کو سزا دینا کہاں تک مناسب ہے؟"

سبحان بچارا کیا تو انکار کیسے کرتا۔ ونے کی بات کی تردید کرتے ہوئے بولا۔ "کیسی سزا۔ ایسے نیک کام میں حصہ لینے کا ذوق بھلا کسے حاصل ہوتا ہے!"

شہین نے کہا "ذرا سنوں تو سہی کہ اس بار آپ نے کون سا نیک کام کیا ہے؟"

نصرت کے جواب دینے سے پہلے ہی ونے نے کہا [illegible]

کی زد سے نہیں؟ وہیں جو دیہان کا ماہر ہو گیا تھا اس وقت رنگ پورے ایک لیڈر نے پاؤں کی مورتی اٹھا لایا تھا۔ اس کے بعد بہت کوشش کرنے پر اور لیڈر کا رہنے پر جب اسے کالی ثابت نہ کیا جا سکا تو ہمارے عالموں نے اسے پھر انا سنگ میں؟ یا اس طرح کے دوسرے خطابات دیے تھے اور بعد میں اسے ایک اندھیری کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا۔"

تعجب سے میں نے کہا۔ "بہت بڑا تعلق ہے۔ خدا جانے؟" آدھی رات کو شرت کندھے پر اٹھا کر اس مورتی کو کوٹھڑی سے نکال لایا اور اسے سامنے رکھ کر بولا "یہ صدر کالی دیوی کی مورتی ہے۔ دیوی ظاہر ہوئی۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے اس کی مناسب پوجا نہ ہو سکی۔ گوسائیں جی اور ان کے قافلے کے افراد مل کر اس کی پوجا کا خرچ دے دیں تو ان کے سات جنم بھی معاف ہو سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "انہوں نے اس بات پر اعتبار کر کے پیسہ دیا؟"

اس بار شرت نے کہا۔ "دیں گے نہیں؟ دوسرے طریقے سے خواہ نہ دیتے۔ لیکن یہ سن کر کہ صدر کالی دیوی کی مورتی ہے۔ اعتبار کیا یا نہیں کیا ڈر سے پیسے نکال کر خود ہی دے دیے۔ افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ جو کچھ زیادہ سزا نہ ملنی چاہیے تھی۔ انہوں نے زیادہ روپیہ دیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمہاری زیادتی ہے شرت۔ انسان کے مذہبی اعتقاد کا اس طرح مذاق اڑانا میری سمجھ میں مناسب نہیں معلوم دیتا۔"

ونے نے میری بات کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "اس نے ... مذاق نہیں سمجھ لیا ہے۔"

شرت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "لیکن معلوم ہے کہ گوپال کے بھیجے ہوئے تین سو روپے ختم ہونے والے ہیں۔ کالی گھاٹ کے پنڈے دنیا کو لوٹتے ہیں۔ ہم نے بھی اگر صدر کالی دیوی کے نام پر کچھ لے لیا تو کیا ستم ہو گیا۔ صدر کالی ماں اتنی سنگدل نہیں ہیں کہ اس بات سے ناراض ہوں۔"

ونے نے کہا۔ "تو کالی گھاٹ کے پنڈے ہی بن جاتے۔ ملک کی خدمت کا ڈھونگ کی کیا ضرورت تھی۔"

"شاستر پڑھ کر تو ملک کی خدمت کرنے نہیں آیا ہوں۔ یا میں نے کسی ایسے عہد نامہ پر دستخط کئے ہیں کہ کبھی کسی کو دھوکا نہ دوں گا ہمیشہ سچ بولوں گا؟"

ونے کو واقعی غصہ آ گیا۔ بولا "تم لوگوں کا یہ مسخرہ پن تمہیں کہاں لے جا رہا ہے نہ جانتے ہو؟ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک عہد بنایا ہے۔ انہوں نے اس لفظ کا استعمال بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا۔ شاستروں کی باتوں کا مذاق اڑا سکتے ہو۔ لیکن دل کی پاکیزگی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو اس کے ٹکڑے خاک میں مل جائیں گے۔"

شرت ونے کی زبان بند کرنے کے لئے کچھ کہنے لگا تھا لیکن ونے نے اسے روک کر اپنی بات جاری رکھی۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ شاستروں کی پابندی سے انسان تنگ خیال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر ذہنی قوت بھی نہیں بڑھتی۔ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک پاکیزہ عہد سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں۔ تم لوگ جسے مسخرہ پن سمجھتے ہو وہ آہستہ آہستہ تمہارے دل پر چھاتا جا رہا ہے۔"

شرت نے ہاتھ کی انگلی پر گن کر کہا۔ "عہد۔ خاک۔ ترقی۔ تیرے خیالات کیسے بھی ہوں، ونے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تیری زبان بڑی سلیس ہے۔"

شپین نے سامنے آکر انہیں خاموش کرتے ہوئے کہا "جانتے ہو شرت کو گاڑی پکڑنی ہے۔ اس کی جگہ میں تمہارے ساتھ لڑتا ہوں۔"

ونے نے ہنس کر کہا۔ "نہیں شپین دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف شرت ہی نہیں بلکہ اس دل کے سبھی آدمی بہت زیادہ چالاک بن کر اپنی زندگی ضائع کر رہے ہیں۔"

شپین نے کہا۔ "زندگی ضائع ہی ہوتی ہے۔ تو بیوقوفی سے کیوں ہو۔ بہادری اسی میں ہے کہ چالاکی سے ہو۔"

"میری بات تم نے سمجھی نہیں شپین دادا۔ ہماری چالاکی کے پیچھے دلی خلوص نہیں ہے۔ یہ ایک افسردہ دل کی ظاہری شکل ہے۔ اس طرح ہم لوگوں نے منہ بچکانے کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا۔ لیکن منہ بچکا کر ہر بات کا مذاق اڑانے اور ہر چیز کو حقیر سمجھنے کی کوشش میں ہم خود بہت حقیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ پرانے لوگوں کے مقابلہ میں ہم بہت چھوٹے ہیں۔"

شرت نے کہا۔ "تمہیں دیکھ کر ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن تمہارے اس پیچیدہ احساس کا ذکر کرنا فضول ہے۔"

ہم سب ہنس پڑے۔ شپین نے کہا۔ "شرت کو لوٹ آنے دو ونے۔ تبھی اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث کی جائے گی۔"

نصرت کے ساتھ دونوں لڑکیوں کو پہنچانے میں ابھی دو دن ہوا۔ بڑودہ سے ریل پر سوار ہو کر کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جنکشن پر اترنا تھا۔ وہاں سے چھوٹی لائن کی گاڑی پر سوار ہو کر دونوں لڑکیوں کو ان کے گاؤں تک پہنچنے میں دیر نہ تھی۔

جب ہم لوگ گاڑی سے سٹیشن پر اترے تو شام ہو گئی تھی۔ ایک میدان کے بیچ میں ٹین کے سائبان سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ گوسائیں جی سے اتنا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اس سٹیشن سے دو کوس کے کھلے میدان کو پار کر کے دونوں لڑکیوں کا گاؤں ملے گا۔ یہاں کسی سواری کا بندوبست نہ تھا۔ اگر گاؤں میں کسی کا اثر و رسوخ ہو اور کافی پیسے خرچ کئے جائیں تو پالکی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی سات دن پہلے کہنا ضروری تھا۔ بیل گاڑی ضرور چلتی تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی خاص راستہ نہ تھا۔ کبھی میدان میں چلتی تو کبھی کچے راستے پر۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ بیل گاڑی سے سفر کرنے میں جسم کا کوئی عضو سالم رہ جائے گا۔ کچھ بھی ہو بیل گاڑی سے سفر کرنے کی خواہش ہوتے ہوئے اس خواہش کی تکمیل کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

سٹیشن پر ہمارے سوا کوئی نہ اترا۔ جو شخص ایک بڑی جھنڈی ہلا کر ہماری گاڑی کو ایک طرح سے زبردستی سٹیشن سے باہر ہانک کر لے گیا، اس کے علاوہ سٹیشن پر چڑیا کا بچہ بھی نہ تھا۔

اس شخص کا لباس کچھ عجیب تھا۔ جسم کی دھوتی جتنی چھوٹی تھی، اتنی ہی میلی۔ اسے گھٹنوں سے نیچے پہننا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ جسم پر دھوتی کی مانند میلی ایک صدری تھی۔ لیکن لباس خواہ کچھ بھی ہو سر کی طرف دیکھتے ہی اس کے عہدہ کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ سر کی ٹوپی دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ یہی سٹیشن ماسٹر ہیں۔ اس جھنڈے سے سٹیشن پر ٹکٹ بیچنے سے لے کر لائٹ واپس لینے تک تمام ضروری فرائض انہی کو انجام دینے پڑتے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ سب کام کرنے میں انہیں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے۔ پستہ قد، گول مٹول چہرہ، چہرے پر تازگی، بالکل بچے لگتے تھے لیکن چہرہ پر جھریاں نہیں پڑی تھیں۔ چہرے پر جو ہنسی تھی اس سے یہ شخص سادہ لوح نہیں بلکہ بیوقوف نظر آتا تھا۔ پھر بھی ہنسی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے ٹکٹ لینے کے بعد ان کا چلے جانے کا ارادہ نظر نہ آیا۔ ذرا ادھر ادھر دیکھ کر احمقوں کی طرح کئی مرتبہ ہنس کر انہوں نے پوچھا۔ "آپ لوگ کہاں جائیں گے"

بات کرنے کا انداز دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس ویرانے میں انسان سے دو لمحہ بات کرنے کی سعادت حاصل کرنا ان کے لئے بہت بڑی بات تھی۔

ہماری منزل مقصود کا نام سن کر انہوں نے کہا۔ "یہ تو قریب دو کوس کا راستہ ہے۔ اب شام کے وقت جانا تو مشکل ہو جائے گا۔ آپ کے پاس لالٹین ہے؟"

نصرت نے کہا۔ "نہیں لالٹین تو نہیں ہے۔ لیکن ہوتی تو بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ روشنی میں راستہ دیکھ کر بھی ہم راستہ پہچان لیتے۔ ہم لوگ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔"

سٹیشن ماسٹر صاحب کے معصوم چہرے پر فکر و تردد کی گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کہا "تب تو آپ راستہ نہ دیکھ سکیں گے۔ بڑا پیچدار راستہ ہے۔"

ہم کو پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا۔ سٹیشن ماسٹر کی بات سے یقین ہو گیا۔ اور فکر پیدا ہوا۔ ان دونوں بے سہارا عورتوں کو لے کر رات کے وقت راستہ تلاش کرنے میں اگر گاؤں نہ پہنچ سکے تو نہ جانے کس مصیبت میں پڑ جائیں۔ پھر بھی امید کے آخری تنکے کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا "کیا کوئی آدمی نہ دے سکیں گے جو ہمیں راستہ دکھا دے۔ ہم لوگ اسے کچھ بخشش بھی دے دیں گے۔"

"بخشش تو دے دیں گے لیکن لے گا کون؟" یہ کہہ کر سٹیشن ماسٹر نے اپنے مذاق پر خود ہنس کر کمال کر دیا۔ ہنسی رکنے پر بولے۔ "سالا کیشا ہوتا تو آپ کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن جب سے یہاں آیا ہوں۔ شام کے وقت کبھی اس کی صورت نہ دیکھی۔ اسکی یہاں نائٹ ڈیوٹی ہے نا!"

سٹیشن ماسٹر صاحب کی ہنسی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی ان کا پسندیدہ مذاق ہے۔

کیشا کا تعارف راز کے پردے میں پوشیدہ ہونے پر بھی انہوں نے اسکی نقاب کشائی کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ میں نے کہا۔ "تو کوئی دلیل تک گا؟"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا: "میں خود آپ کے ساتھ چلا چلتا۔ لیکن ساڑھے آٹھ بجے تری اپ پسنجر کو پاس کرانا ہے۔"

میں نے ان کی فیاضی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "نہیں نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ سٹیشن چھوڑ کر بھلا آپ کو چلنے کے لئے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"ضرور کہہ سکتے ہیں۔ شوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح مجھے جانا نہیں پڑتا؟ ابھی پرسوں سویرے کی بات ہے سوموار کے روز سیٹھ کرچی جاتے۔ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بازار سے ایک گدے کا بوجھ لے کر اترے اور لیٹے۔ ماسٹر گھر کے لڑکے گھر پر نہیں تھے۔ دوپہر کی گاڑی سے آنے کی اطلاع دی تھی۔ شاید ابھی ملنے نہیں آئے۔ سامان میں کیسے لے جاؤں۔ بتاؤ کیا کہتا! سوچا ابھی سات بجے ہیں۔ دوپہر کی گاڑی سوا بجے آتی ہے۔ اس سے پہلے گیارہ بجے ایک مال گاڑی کو پاس کرانا تھا۔ چنانچہ تیزی سے چل کر گیارہ بجے تک مرہٹی سے واپس لوٹا جا سکتا ہے۔"

نصرت نے کہا: "تو ان حضرت کا سامان لے کر ان کے گھر گئے یا نہیں؟"

بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا: "نہ جاتا تو کرتا۔ آپ ہی بتائیے۔ ان کی حویلی ۱۰ بجے تک سر نہ جا لگا۔ وہاں سے لوٹ کر مال گاڑی کو صحیح وقت پر پکڑ تو لیا لیکن قدرے دوڑنا پڑا۔"

نصرت نے کہا: "اس عمر میں بھی آپ کھانا کھانے کے بعد دوڑ سکتے ہیں؟"

"کھانا کھانے کے بعد؟" سٹیشن ماسٹر صاحب نے قدرے تعجب سے پوچھا؟

میں نے کہا: "انہوں نے کھانا کھلا کر ہی بھیجا ہوگا۔"

"ارے رام کا نام لو۔ کرچی جاتے جاتے کب کھلانے والے ہیں۔ اتنا کنجوس ہے کہ صبح اگر اس کا نام لے لو تو دن بھر روٹی میں نہ ملے۔"

نصرت نے کہا: "اتنی دور ان کی حویلی لاد کر لے جانے کے بعد انہوں نے آپ کو کھانا کھلائے بغیر جانے دیا؟"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے جواب میں "ہوں" کہا۔

ہم نے سوچا تھا کہ مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر ہے۔ لیکن ایسا آدمی ملتا کہاں ہے۔ یہ آدمی واقعی قدر کرنے کے لائق نہیں ہے۔ اتنی سی دیر میں ہی اس شخص کے ساتھ یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ بھلا کیوں نہ ہوتی!

× × × × ×

ہم نے سوچا رات بھر کے لئے سٹیشن ماسٹر سے پناہ مانگنا مناسب نہ ہوگا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب نے خود ہی یہ بات چھیڑی۔ بولے "اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ آج رات اگر ہمارے یہاں گزار دیں تو کل صبح میں ہی آپ کو پہنچا آؤں گا۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ! یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے بڑی خوشی سے یہ تجویز منظور کر لی۔

ماسٹر صاحب بولے: "ذرا ٹھہریئے آفس کا کچھ کام باقی ہے۔ ذرا اس سے فارغ ہو لوں۔"

یہ کام بھی کچھ معمولی نہ تھا۔ ہمارے چاروں ٹکٹوں کو ایک ٹین کے ڈبے میں ڈالا۔ ٹوپی میز پر رکھی۔ اور اس کے بعد سٹیشن کی سرخ اور سبز شیشوں والی لالٹین اٹھا کر کہا۔ "چلئے۔"

نصرت نے کہا: "آپ کا کام پورا ہو گیا ماسٹر صاحب؟"

ماسٹر صاحب نے کہا: "جی ہاں! اب صرف آٹھ بجے والی ٹرین پاس کرنے کے بعد مکمل چھٹی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: "آفس کے کمرے میں تالا نہ لگائیں گے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

سٹیشن کے تحفظ کے بارے میں مجھے جو غلط فہمی تھی وہ ان کا جواب دیکھ کر دور ہو گئی۔ بولا۔ "کچھ نہیں، ایسے ہی کہہ رہا تھا۔"

ماسٹر صاحب آگے آگے لالٹین لئے چل رہے تھے۔ بولے "اور صاحب تالا ہوتا تو لگاتا۔ کمبخت نے نہ معلوم کہاں غائب کر دیا ہے۔"

سٹیشن سے تھوڑی دور میدان میں ماسٹر صاحب کا کوارٹر تھا۔ سٹیشن کیا تھی جو کہ اجڑا پڑا تھا۔ دو کمروں کا پکا مکان، سامنے میں دالان، ساتھ ایک کمرہ۔

جیسا سٹیشن کا حال تھا ویسا ہی گھر کا تھا۔ تالا کہیں نہ تھا۔ باہر سے دھکیلتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ماسٹر صاحب نے اندر جا کر کہا: "جو سوچا تھا وہی ہوا۔ کمبخت کیشو نے آگ نہیں سلگائی۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میں معافی کا ... کہتا ہوں۔

چولہا پھونکنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بھائی تو اتنا مغرور کر دیا کرو لیکن موقع ملنے پر اسے میری آنکھ بچا کر بھاگ جانے میں بڑا مزا آتا ہے۔"

کیشو کا یہ نیا تعارف پاکر بڑا مزا آیا۔ معلوم ہوتا ہے اپنے افسر کی کمزوریوں کو اس نے خوب پہچان لیا تھا۔

ماسٹر صاحب نے الماری کے اوپر رکھا ایک سفری چولہا دکھا کر کہا۔ نظر آتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی ہوگی۔ میں تو اکیلا رہتا ہوں۔ میری گزر تو جیسے تیسے ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کھانے کے لئے کیا لا کر دوں۔"

ان کی پریشانی دیکھ کر انہیں تسلی دینے کے لئے میں نے کہا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ رات گزارنے کا ٹھکانہ تو ملا۔ ایک دن نہیں کھائیں گے۔ تو کیا حرج ہے۔"

میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن دن بھر ٹرین میں دھکے کھانے کے بعد رات کو فاقہ کرنے کا خیال کوئی زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم تو فاقہ کر کے رہ سکتے تھے۔ لیکن دونوں لڑکیوں کو کیسے بھوکا پیاسا رکھا جا سکتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے بے چین ہو کر کہا۔ نہیں نہیں بغیر کھائے پئے کیسے رہیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

نصرت نے کہا۔ ٹھیک ہے میں بغیر کھانا کھائے نہ رہ سکوں گا۔ آپ کا کوکر وغیرہ کہاں ہے ماسٹر صاحب ذرا بتلائیے۔ میں ہی چولہا سلگاتا ہوں۔"

گہرے سمندر میں گویا کنارہ پاکر ماسٹر صاحب ہنس کر بولے۔ کیا واقعی آپ چولہا سلگا سکتے ہیں؟" ان کی تعریفی نظریں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ شاید انہوں نے اس بات کا تصور نہ کیا تھا کہ ایک معمولی آدمی اتنی ہمت کر سکتا ہے۔

نصرت کو حرکت میں دیکھ کر میں جل کر بولا۔ نصرت چولہا تو سلگا سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ جس دن نصرت کا چولہا سلگ گیا اس دن کھانے کا وقت نہ بچے گا۔"

نصرت مجھے تیز نظروں سے گھور کر باہر چلا گیا۔

* * * * *

دونوں کمروں میں سے ایک لڑکیوں کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے رکھا اور دوسرے میں ہم لوگوں نے ڈیرہ لگایا۔ یہ ماسٹر صاحب کا اسٹڈی معلوم ہوتا تھا۔ ایک کونے میں ہوئی چوکی پر چند ٹین کے ڈبے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف میز کے اوپر اخبار اور کتابیں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں سبزیوں کے چھلکے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ماسٹر صاحب کو انہیں پھینکنے کی فرصت نہیں ملی۔ چوکی کے نیچے کہیں تھوڑا سا تیل گر گیا ہوگا جو ابھی تک اسے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ میز پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر ماسٹر صاحب کے گھر اور رہن سہن کا پورا اندازہ ہوگیا۔

کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہنے پر جب ماسٹر صاحب اور نصرت نہ آئے تو میں انہیں دیکھنے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی آنکھوں کے سامنے جو منظر آیا اسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔

ماسٹر صاحب زمین پر اکڑوں بیٹھے آنکھیں ادھ کھلی کئے ہوئے چولہا پھونک رہے تھے۔ اوپر سے نصرت چولہے پر جھکے زور سے پنکھا کر رہے تھے۔ چولہے کا یہ حال تھا کہ آگ کی بجائے دھواں، ذرا سا دھواں دے کر بھی ان کی محنت کامیاب ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

نصرت نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ بولا۔ ماسٹر صاحب تھوڑا سا تیل اور ڈال دیں؟"

ماسٹر صاحب نے مایوسی سے کہا۔ "اور تیل ہے کہاں!"

معلوم ہوا کہ تیل ڈالنے میں نصرت نے کنجوسی سے کام نہ لیا تھا۔ بولا۔ تھوڑا سا ہے۔"

میں نے بھانپ لیا۔ کہ نصرت کی قابلیت کے بارے میں ماسٹر صاحب کا تصور کافی ٹوٹ چکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ لیکن پھر بھی آگ نہ پکڑی تو؟"

نصرت عاجز ہو چکا تھا۔ جل کر بولا۔ تو اس چولہے کو پھینک دینا ہی مناسب ہوگا۔"

میں ان دونوں کی گفتگو سن کر ہنس پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور میٹھی ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا۔ دیکھا تو تھوڑا سا گھونگھٹ نکالے دونوں لڑکیوں میں سے ایک قریب کھڑی تھی۔ دھوتی منہ میں دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میٹھے لہجہ میں بولی: "آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیے"۔

نصرت شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ماسٹر صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے ملایمت سے کہا۔ "آپ کہہ رہے تھے تھوڑا سا تیل باقی ہے۔ کہاں ہے؟"

اُن کی تگ و دو لڑکیوں نے دیکھی ہو گی۔ اور اُن کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستی ہوں گی۔ اس خیال سے نصرت کی جو حالت ہوئی اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ شرم سے سرخ ہو کر اس نے تیل کی بوتل آہستگی سے آگے سرکا دی۔

اس کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ ماسٹر صاحب بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ جس ناخوشگوار کام کرنے کی کوشش میں انہیں اس قدر حیران ہونا پڑا تھا اسے ان لڑکیوں نے دیکھتے دیکھتے کتنی جلدی کر ڈالا۔ میں سوچ رہا تھا چولہا جلانے کی اتنی سہل ترکیب اس سے پہلے ہم میں سے کسی کو کیوں نہ سوجھی۔ دونوں لڑکیوں کی حفاظت کا خیال ہمارے ذہنوں پر اس طرح مسلط تھا کہ بے بس ہونے کے علاوہ وہ کچھ کر بھی سکتی ہیں۔ اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔

لیکن سارا قصور ہمارا ہی نہ تھا۔ ان دنوں میں انہوں نے ہمیں گھونگھٹ کے علاوہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ دونوں نند پال کی بھتیجیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہ معلوم تھا۔ اور نہ کچھ جاننے کا موقعہ ہی ملا تھا۔

اسی لئے میں نے محسوس کیا کہ ہماری مدد کے لئے آئی ہوئی اس لڑکی کے چہرے اور آنکھوں سے حیرت اور تجسس کے آثار ابھی مفقود نہ ہوئے تھے۔ اس کی عمر کم تھی اور وہ غیر معمولی حسین تھی۔

اس کے بعد چولہا سلگنے میں دیر نہ لگی۔

ماسٹر صاحب نے اچھل کر کہا: "بہو بیٹیوں کے علاوہ یہ کام کون کر سکتا تھا! مانا میں نہیں کر سکتا لیکن کیشتو بھی تو دس بوتل ختم کئے بغیر آگ نہیں جلا سکتا۔"

نصرت نے کہا "کیشتو کا زیادہ ذکر نہ کیجئے ماسٹر صاحب۔ آنکھوں سے تو اسے نہیں دیکھا۔ لیکن آپ کے منہ سے اس کی تعریف سن کر اس کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔"

ماسٹر صاحب نے معلوم کیا سمجھا لیکن اس خیال سے کہ کیشتو کے حق میں ہم کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ وہ جلدی سے بولے "نہیں نہیں کیشتو اچھا آدمی ہے۔ بس تھوڑا سا سنکی ضرور ہے۔ وہ گھڑی بھر کو ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔"

کیشتو کے لئے ماسٹر صاحب کی کمزوری بھانپ کر اور یہ سوچ کر کہ ایک بار اس کا ذکر شروع ہو کر ختم نہ ہوگا۔ میں نے بات کا رُخ بدل دیا۔

نصرت سامان وغیرہ اکٹھا کر کے دونوں لڑکیوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ابھی وقت ہے ماسٹر صاحب نصرت کو روکئے۔ چولہا سلگانے میں تو اس نے مٹی کے تیل کی ساری بوتل ختم کر دی۔ اب بھی اگر اس کے شوق کو نہ دبایا گیا۔ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کھانا نہیں مل سکتا۔"

میں نے محسوس کیا نصرت سے ماسٹر صاحب کا اعتقاد بالکل اُٹھ گیا تھا۔ میری بات سنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو کر بولے۔ "نہیں نہیں نصرت بابو اب آپ کی ضرورت نہیں۔ انہیں کچھ پریشانی ضرور ہوگی لیکن جو کام آپ نہیں کر سکتے۔ اسے کرنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اس سے ان کی پریشانی بڑھے گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

چنانچہ نصرت کو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ اپنے اوپر ساری ذمہ داری لے کر لڑکیاں کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ چہرے پر تھوڑا سا گھونگھٹ ہونے کے باوجود ان کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ شاید رسوئی میں داخل ہوتے ہی صنفِ نازک کی ساری جھجک خود بخود مفقود ہو جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب کے مشورے سے چاول بنائے۔ دال سبزی ترکاریوں کی بھی کمی نہ تھی۔ پھر بھی افسوس کرتے ہوئے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ تیل تو ہے لیکن اور کوئی مسالہ نہیں ہے۔"

لیکن ان کا اندیشہ فضول تھا۔ ان کا اندیشہ دور کرتے ہوئے چھوٹی لڑکی نے کہا۔ "مسالہ تو ہے۔" ماسٹر صاحب نے تعجب سے کہا "ایں! کہاں ہے! بھگوان جانے۔ میں نے تو کہیں نہیں دیکھا۔"

ہم سب لوگ ہنس پڑے۔

کھانا کھاتے وقت ہم نے دیکھا کہ مسالہ ہی نہیں ماسٹر صاحب

اپنے گھر کی بہت سی چیزوں کا علم نہ تھا۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ماسٹر صاحب خود بھی نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں لیے لذیذ کھانے کا سامان کیسے اکٹھا کیا گیا۔

کھانے کے دوران میں انہوں نے دونوں لڑکیوں کا نام پوچھ لیا تھا اور ان کی بات چیت اور سلوک کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ دونوں ان کے قریب ترین رشتہ دار نہیں ہیں۔

کھانا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ہماری تھالی کے قریب چٹنی کی کٹوری کھسکا کر لڑکی پلٹ کر جا رہی تھی۔ (بنگال میں چٹنی کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے) اس بار مجھے دھوکا نہیں دے سکتی بیٹی۔ چٹنی کے لئے املی ضرور اپنے ساتھ لائی ہو گی۔

کملا نے آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے کچھ ہنس کر کہا "نہیں ہم املی کہاں سے لاتیں؟"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ املی ہمارے ہی گھر میں تھی۔ اور کل سویرے چٹنی کے لئے املی توڑنے آنے کے لئے میں گھنٹوں کسی شخص کی خوشامد کرتا رہا؟"

کملا نے کہا "آپ نے کہاں تلاش کی تھی؟"

"سٹور میں۔ اور کہاں؟"

"املی تو آپ کے سونے کے کمرے میں تھی۔" یہ کہہ کر کملا چلی گئی۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ دیکھ کر ہم لوگ ہنس پڑے۔ اس بار تو واقعی گویا وہ آسمان سے گر پڑے تھے۔

کھانا ختم ہونے پر ہم لوگ کمرے میں بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے۔ کملا اور شانتا نے اس عرصے میں لڑکیوں کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ ماسٹر صاحب کی موجودگی سے ان کے اندر بے تکلفی بھی آ گئی تھی۔ چنانچہ دونوں ہمارے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔ اچانک ماسٹر صاحب پوچھ بیٹھے "تو پھر آپ کس کے گھر جا رہے ہیں؟"

اتنی دیر کے بعد یہ سوال پوچھنا ماسٹر صاحب کا ہی حق تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمیں کس کے گھر جانا ہے۔

نند پال کا نام سنتے ہی ماسٹر صاحب کا اعتقاد گہرا ہو گیا بولے "بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس جیسا گاؤں کا چودھری اور کوئی نہیں ہے۔"

ماسٹر صاحب کی بات سے متعجب ہو کر میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی جس طرح دس آدمیوں میں سے ایک آدمی چھٹا ہے گاؤں میں وہ تالاب بنوا دیتے ہیں غریبوں اور یتیموں کو دل کھول کر دان دیتا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے نند پال کا جو تعارف پیش کیا، اس سے میں کچھ خوفزدہ ہو گیا۔ "پھر تو پیسے والا آدمی ہو گا۔ کیوں؟"

"پیسے والا نہیں تو اور کیا ہے۔ دس ہزار روپے کاروبار میں لگا رکھے ہیں۔ زمین، جائیداد، باغ اور تالاب کا تو شمار ہی نہیں۔"

اب سمجھ میں آیا کہ نند پال کو اپنی بھتیجیوں کی جائیداد کی اتنی فکر کیوں ہے۔ یہ بھی سمجھ لیا کہ دونوں لڑکیوں کو ان کے مشفق چچا کے گھر پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے کہا تھا۔

× × × × ×

اگلے دن سویرے ماسٹر صاحب نے ہم لوگوں کو منزل پر پہنچا دیا۔ راستہ زیادہ مشکل نہ تھا۔ دن میں تو ہم خود لوگوں سے پوچھ تاچھ کر کے پہنچ سکتے تھے۔ البتہ رات کو دقت ہوتی۔

نند پال کے گھر کا ٹھاٹ باٹ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ دولت مند اور فارغ البال شخص ہے۔ امید نہ تھی کہ اتنے دور کے دیہات میں اتنا ٹھاٹ باٹ نظر آئے گا۔ [illegible] ٹین سے ڈھکی ہوئی اسکی شاندار حویلی پکی اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ نند پال نے ویشنو دھرم اختیار کیا تھا۔ مکان کے دو حصے تھے لیکن باہر کا حصہ اندرونی حصے کے مقابلہ میں بڑا تھا۔ پکے صحن سے آگے چل کر ایک مندر نما گھر تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کرشن جی کا مندر۔

ہم نے دیکھا کہ نند پال کو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی چندن اوتلک لگائے ہوئے دو برہمن ہمارے خیر مقدم کو آئے۔ ویشنو دھرم کے بارے میں کوئی سبق دینے کی بجائے وہ ہمارے ساتھ شائستگی سے پیش آئے۔ "بلاشبہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ہمارے گاؤں میں آنے کی تکلیف گوارا کی۔" یہ کہتے کہتے وہ سیدھے

اَور آسان راستے سے ہمیں اندر لے چلے۔

شروع میں اتنی خاطر ہوتے دیکھ کر ہمیں کچھ تعجب ہوا۔ گھر کے اندر جاکر دیکھا۔ ہمارے سواگت کے لئے کچھ کم تیاری نہیں ہوئی تھی۔ نند پال کو اتنا کھانا سر تیل سے چکنا بڑا جسم اَور بازو میں سونے کا کڑا دیکھ کر ہی پہچان لیکہ وہ بڑے شائستہ اَور شریفانہ طریقے سے ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔

سامنے ہی بڑے کمرے میں ایک فرش لگایا گیا تھا۔ چاندنی کی فرشی اور زری کے کام کا مسند نہایت قاعدے سے لگا ہُوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر بھی ہمیں تعجب ہُوا۔ انہوں نے اتنی تھوڑی دیر میں ہی ہمارے خیر مقدم کی اتنی تیاری کیسے کر لی؟ یہ سوچنا تو بیکار تھا کہ اس دیہات میں مہمانوں کی خاطر کے لئے روزانہ بندوبست قائم رہتا ہے۔ لیکن ہماری حیرانی بہت جلد دُور ہوگئی۔ ہمارے سائیکل ہی گلے میں کشتی پہلے ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا۔ اب میں سمجھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے انہوں نے ہی گاؤں پہنچکر ہمارے آنے کی خبر نند پال کو دی تھی۔

نند پال نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسکی چند لحظوں کے لئے صاحب مسند بن کر فرش پر رونق افروز ہوں۔

فرحت نے مجھ سے کہا۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو سارے سَیس کو ساتھ لے آتا۔ کھانے کا بندوبست کیا بیٹھنے کے بندوبست سے کچھ کم نہ ہوگا" میں نے گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنی عزت ہوتے ہوئے دیکھکر مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے"

فرحت نے چڑکر کہا "تیرا مزاج تو شکی ہے۔ تیری نجات مشکل ہے" لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کرسکا۔ اس آؤ بھگت اَور خاطر تواضع کے اندر جو فریب تھا اس کا پتہ چل گیا۔

نند پال کی دونوں بھتیجیاں کچھ دور ہمارے ساتھ آکر اَب گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے سنا۔ نند پال انہیں پکار کر کہہ رہا تھا "بیٹی لاکھو! اسی سے گھر میں جانے لگیں۔ یہ بابو لوگ اتنی تکلیف اٹھا کر تمہیں یہاں ساتھ لائے ہیں۔ انہیں پرنام کرکے جاؤ"

نند پال کے لہجے سے شفقت اور محبت کا اظہار ہو رہا تھا دونوں لڑکیاں شرمندہ ہو کر لوٹیں۔ اور ہم سے قریب ہو کر انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور ہمیں پرنام کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ اندر نہ جا سکیں۔ نند پال نے ہنس کر کہا "ارے اتنی جلدی کیا ہے بیٹھو۔ بیٹھو۔ یہیں بیٹھو۔ ان بابو لوگوں سے پورا قصہ تو سُنوں۔ میں یہاں کئی دنوں سے تمہارے بارے میں سوچکر پریشان ہو رہا تھا۔

نند پال کا چہرہ دیکھکر اس کے دل کا حال جاننا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل دھڑک رہا تھا وہ ضرور کوئی شیطانی چال چل رہا ہے اس بارے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا۔

ماسٹر صاحب ٹھہرے بیچارے سیدھے سادے آدمی۔ نند پال کی باتوں پر ہنس کر بولے "لیکن بھائی تمہاری دونوں بھتیجیاں ہیں بہت اچھی۔ کل ہمیں ایسا کھانا بناکر کھلایا کہ تم سے کیا کہوں" اس کے بعد لڑکیوں سے مخاطب ہوکر بولے "لیکن چچا کے گھر آکر اِن بوڑھے کو بھول نہ جانا۔ گھر کے کھانے سے جس دن طبیعت اکتا جائے گی یہیں آکر ڈیرہ ڈال دوں گا۔ پہلے بتائے دیتا ہوں" لڑکیوں نے شرم سے سر جھکا لیا۔

نند پال اس بار فرش کے قریب میز پر بیٹھکر بولا "لیکن بات کیا ہے ماسٹر کہو تو سہی۔ ان کے ساتھ انہیں دیکھنے کی تو اُمید نہ تھی"

ماسٹر صاحب نے کہا "ڈرو نہیں بھائی۔ ڈرو نہیں۔ میں آج ہی ڈیرہ نہیں ڈالوں گا" اپنی بات پر خود ہی ہنستے ہوئے ماسٹر صاحب نے پھر کہا۔ میرے مطلب تم جو سمجھے ہو وہ یہ ہے کہ بھتیجیوں سے دوبارہ کیسے ملے۔ میرا مطلب تو راستہ جاننے کا نہیں ہے۔

نند پال نے کچھ کہا نہیں کہ چہرے پر غم کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا "پچھلے کئی دنوں سے فکر ہو رہا تھا۔ ماسٹر کی بیٹیاں سنا ایک طرح سے چھوڑ رکھی تھا۔ سوچتا تھا دونوں لڑکیاں بگڑ نہ جائیں تو میں نہ جانے دیتا۔ لیکن نہ جانے کہاں نکل گئیں۔ آج جانے کونسی آفت ٹوٹ پڑی۔ کئی دنوں سے کچھ پتہ نہ تھا۔ گاؤں میں شک ہونے لگا تھا ہم تم جانتے ہو ماسٹر۔ انہیں تو کوئی بیاہ کرنے والا بھی نہ ملے گا"

اس بار فرحت نے فکرمندانہ انداز سے میری طرف دیکھکر کہا

کیا۔ اب بھی سمجھا میرا غصہ بے بنیاد تھا۔ لیکن ماسٹر صاحب کے پانی جیسے صاف دل پر کوئی داغ نہ پڑا۔ انہوں نے نند پال کی بات کا منشا نہ سمجھ کر کہا "کچھ بھی ہو بھائی۔ اب تو تمہیں مل گئیں نہ۔ اب تو تمہارا فکر دور ہو گیا۔ بیٹیوں کو کہو کہ گھر میں جائیں۔ کئی دن سے تم نے ڈھنگ سے کھایا پیا نہیں ہے۔ اب بے فکر ہونے کی کوشش کرو۔"

نند پال نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا "نہیں ماسٹر بے فکر کیسے ہو سکتا ہوں۔ دنیا بے فکر کیسے ہونے دیگی۔ کمبخت گوسائیں نے آکر ایسی چیز دی ہے کہ سر چکرا گیا۔ تھانے میں رپٹ کروں یا کلکٹر جاؤں، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔"

اتنی لمبی چوڑی تمہید سے ماسٹر صاحب نے متعجب ہو کر کہا "کیا بکواس کرتے ہو نند۔ بھتیجیوں کی فکر کرتے کرتے کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل پڑا ہے؟"

"اس میں اب کسر بھی کیا رہ گئی ہے ماسٹر۔ میری جگہ اگر تم ہوتے تو تمہارا دماغ بھی چل پڑتا۔ گاؤں میں کیسی آفت مچی ہوئی ہے۔ کچھ اسکی بھی خبر ہے؟"

اتنی دیر میں دونوں لڑکیاں مصیبت آتی دیکھ کر بے چین ہو اٹھیں۔ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا انہوں نے سادگی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

نند پال نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری تباہی کا سامان ہوا ہے۔ جن لوگوں کی بھلائی کے لئے دن رات مرتا ہوں۔ وہی لوگ سر پر چڑھتے ہیں۔ سمجھے ماسٹر؟"

سنجیدگی سے فلسفیانہ انداز میں ماسٹر صاحب نے نند پال کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا "ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ اسی لئے کسی کی بھلائی نہیں کرنی چاہیئے۔" اس مصیبت کے وقت بھی میں ماسٹر صاحب کی بات سن کر ہنس پڑا۔

نند پال کی تمہید اب شاید ختم ہو گئی تھی۔ اچانک اصلی موضوع پر آکر اس نے کہا۔

"جانتے ہو ماسٹر اس کمینے گوسائیں نے گاؤں میں آکر کیا گل کھلایا ہے؟"

ماسٹر صاحب نے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر کہا "گوسائیں نے کچھ بھی اڑائیں لیکن میرے خیال سے تو اس سے کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

نند پال نے یقینی لہجے میں کہا "میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ بھگوان جانتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی میرے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

ماسٹر صاحب نے چونک کر کہا "ارے کس نے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی؟"

نند پال ماسٹر صاحب کی سادہ لوحی سے تنگ آکر بولا "گھر میں آگ لگ دیتے تو بہتر تھا ماسٹر۔ لیکن اس کی بجائے یہ لوگ ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے خاندان پر بدنامی کا ٹیکہ لگانا چاہتے ہیں۔ گوسائیں کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے لڑکیوں کو بھیجا تھا۔ واپس آکر گوسائیں نے یہ خبر اڑا دی کہ وہ نہیں آئیں۔ میں نے پوچھا کیوں نہیں آئیں۔ اس نے کہا۔ اُن کا پتہ نہ چل سکا۔ غصہ میں آکر میں نے پوچھا تم لوگوں کے ساتھ بھیجا تھا اور تم ہی لوگ پتہ نہ لگا سکے۔ اس کا کیا مطلب؟ اس پر بھی اس نے کہا آنکھوں سے اوجھل تو ہونے نہ دیا تھا۔ پھر بھی کھلونا خریدنے کے بہانے نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ پھر نہ ملیں؟"

بہت دیر سے دل میں غصہ بھر رہا تھا۔

دونوں لڑکیاں اس بار سب کے سامنے ہی بے چین ہو کر رو پڑیں۔ اپنے چچا کے پیر پکڑ کر بولیں "یہ ساری بات جھوٹ ہے چاچا جی۔ ہم تمہارے پیر چھو کر کہتی ہیں چاچا جی۔"

نند پال نے جلدی سے پیر کھینچ لئے اور کہا "ارے پگلیو! میں کیا تمہاری بات پر یقین نہیں کرتا۔ کیسی پاگل لڑکیاں ہیں۔"

ہم دونوں ایسے گم سم بیٹھے تھے گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ ساری بات سمجھتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتے تھے۔ نند پال ایک تجربہ کار کھلاڑی کی طرح چاروں طرف سے مورچہ بنا کر چال چل رہا تھا۔

ماسٹر صاحب لڑکیوں کا رونا دھونا دیکھ کر پہلے تو گھبرا گئے لیکن پھر سنبھل کر نند پال کی بات پر دھیان دے کر بولے "ارے پگلیو! تمہارے بارے میں کوئی کچھ کہہ دے اس سے بات سچ تھوڑا ہی ہو جاتی ہے۔ جاؤ بیٹیو گھر کے اندر جاؤ۔"

اس بار نند پال واقعی ماسٹر صاحب پر بگڑ اٹھا۔ مجھے بھی اس کی امید تھی کہ شاید اس شخص کی غیر معمولی سادگی ہی شاید نند پال کی چال کا [illegible]

کر دے۔ لیکن نند پال نے اپنے غصے پر بڑی خوبی سے قابو رکھا۔

اچانک ہمارے گوسائیں جی اور ڈبلا پتلا بشنو جانے کہاں سے اس پہاڑ پر نمودار ہو گئے۔ دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر اُن کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

گوسائیں جی نے آنکھیں پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا "ادہو! یہاں موجود ہو! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لوگ ہو خوب۔ کھلونے خریدنے گئیں اور ایسی بھٹکیں کہ پتہ ہی نہ چلا"

دونوں لڑکیوں نے بے بسی سے روتے روتے صرف اتنا کہا۔ "کیا بات کرتے ہو گوسائیں کاکا!"

بشنو گوسائیں جی سے بھی ایک گز آگے نکلا۔ چیخ کر بولا۔ "بات کیسی۔ نند پال کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے تمہاری بات چھپ نہ سکے گی۔ میں تو صاف بات کرنا جانتا ہوں۔ اُس دن مجھ سے کہاں کھسک گئی تھیں۔ بتاؤ؟"

اچانک ایک غیر معمولی واقعہ ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا بہت دیر سے غیرت کے تنفس غصے سے پھول رہے تھے۔ لیکن وہ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس نے بشنو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا اور کہا۔ "زبان سنبھال کر بات کر بدمعاش۔ شیطانی کرنے کے لئے یہی جگہ ملی ہے؟" بشنو بھونچکا رہ گیا۔

معلوم ہوتا ہے نند پال نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ جب اس نے خود اٹھ کر بشنو کی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ اس بار میں نے سوچا کہ کہیں میں اب تک اُسے غلط تو نہیں سمجھتا رہا۔ تو کیا ماسٹر صاحب نے اس کے بارے میں تعریف کے پل باندھے تھے وہ صحیح تھے؟

لیکن یہ خیال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ دھکا دے کر باہر نکالے جانے کے باوجود بشنو کچھ دیر بعد گوسائیں جی اور دوسرے آدمیوں کو لے کر پھر آ موجود ہوا۔ اس بار وہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہو کر آئے تھے۔

دو بیکس لڑکیوں کو تباہ کرنے کے لئے ان لوگوں نے جو بھی سازش کی تھی اُس کی حقیقت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بشنو کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دینے کے بعد نند پال شاید تو مجھ سے ہمارا کہانی سُن رہا تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر ماسٹر صاحب بھی سکتے میں آ گئے تھے۔ ہماری کہانی کے بیچ بیچ میں اپنی رائے دیتے جا رہے تھے۔ "جی۔ جی۔ یہ آدمی اتنی غلط بات بھی اُڑا سکتے ہیں؟ کوشش نے لڑکیوں کے منہ کی طرف بھی نہیں دیکھا۔"

نند پال کا چہرہ دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بات سُن کر اُسکا سارا شبہ دور ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے معلوم ہو گیا۔ کہ ہمارا یہ سوچنا کتنی بڑی غلطی تھی۔

بشنو اور گوسائیں کے ساتھ اس بار ایک نیا آدمی آیا تھا۔ بالکل بوڑھا۔ سر کے بال اور داڑھی بالکل سفید۔ اُس کے پکے ہوئے بال اور داڑھی دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ یہ شخص بڑے ٹھنڈے دماغ کا ہوگا۔ لیکن اسکی ظاہری شکل کتنا بڑا دھوکا تھا۔ یہ معلوم ہونے میں دیر نہ لگی۔

نند پال نے اُس کا خیر مقدم کر کے بھی عزت کے ساتھ اُسے بٹھایا۔ اسے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا۔ کہ اس شخص کا گاؤں میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ بوڑھے نے اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔ "آپ لوگ شاید کلکتہ سے آ رہے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بوڑھے نے کہا۔ "کالج میں پڑھتے ہیں شاید؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "نہیں!"

بوڑھے نے تعجب سے کہا۔ "پھر کیا کرتے ہیں۔ نوکری؟"

یہ سُن کر کہ نوکری بھی نہیں کرتا وہ کچھ حیران ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ہماری بات چھوڑ کر نند پال سے بولے۔ "تم نے بشنو کو گردن پکڑ کر باہر نکال دیا ہے؟"

نند پال نے جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں نکالا ہے۔ کیوں نہ نکالوں۔ جانتے ہیں اس نے میری کتنی بڑی بے عزتی کی ہے"

"کیا کیا ہے اس نے بھائی؟" یہ کہہ کر بوڑھے نے حقے کی نے ہونٹوں میں دبا لی۔

لیکن نند پال کو کچھ کہنے کی فرصت [illegible]۔ بشنو نے خود آگے بڑھ کر کہا "انصاف کی بات [illegible]"

بھتیجیوں کو ہم لوگ کالی گھاٹ دکھانے لے گئے تھے۔ چار سے ں آنے کے دو دن بعد آج وہ نہ جانے کہاں سے آ گئی ہیں۔ پوچھئے تو سہی ؟

نثرت کو پھر غصہ آگیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا۔ مجھے بھی کم نہ آ رہا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھ رہا تھا کہ غصہ ہو کر ی سازش ناکام نہ کر سکوں گا۔

نند پال نے لبشو کی بات پر بے حد غصہ ہو کر کہا۔ "اور ے کیا کہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہے نا"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا "یہ لوگ یہی کہیں۔ یہ بات تو سچ ہے کہ تمہاری بھتیجیاں لبشو وغیرہ ساتھ نہیں لوٹیں"؟

خوش نہ ہونے پر بھی گویا نند پال نے مجبور ہو کر اس بات لیم کیا۔

بوڑھے نے کہا۔ "اونچے گھر کے مندر کی دو دوا دو دن بس میں کہاں رہیں بھائی ؟"

نند پال نے گویا بڑی مصیبت میں پڑ کر کہا۔ "ان لوگوں بتایا نہ . . . ؟"

"یہ لوگ کچھ بھی کہیں۔ تم انہیں بہتر جانتے ہو یا لبشو اور گوسائیں کو"

نند پال کو جواب نہ سوجھا۔ شاید اسی لئے خاموش ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا۔ "اتنے دنوں سے گاؤں میں رہتے ہو۔ کبھی سنا کہ لبشو یا گوسائیں نے کوئی گندہ کام کیا ہے ؟"

"نہیں کبھی نہیں سنا"

یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ ہم لوگ کتنی بڑی سازش میں آ کر پھنس گئے ہیں۔ ان لوگوں نے کتنی خوبی سے اس بھیانک کھیل کی ایک ایک تفصیل کی تکمیل کی ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا پھر بھی مجبور ہو کر بیٹھے رہنا پڑا۔

بوڑھے نے گویا نند پال کے جواب سے اپنی بات کی صداقت کی سند حاصل کر لی تھی۔ فخر کے ساتھ بولا "پھر لبشو اور گوسائیں کی بات پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے ؟"

"یہ لوگ [illegible] ہیں۔ جب [illegible] لوگ ہوں [illegible] لیکن ہم [illegible] تھے نہیں۔ ہم لوگ دیہاتی گنوار ہیں

تم انہیں کیسے بچاؤ گے ؟

نند پال سنجیدہ چہرہ بنائے خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک بڈھے نے اٹھ کر کہا۔ "تم گاؤں کے مکھیا ہو۔ تمہارے پاس روپیہ ہے، نوکر ہیں۔ جس طرح چاہو اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اپنی بھتیجیوں کو اگر تم عزت سے گھر میں رکھ لو۔ تو تمہیں روکنے والا کون ہے۔ لیکن یہ بتلائے دیتا ہوں نند۔ ہمیں بیچ میں مت ڈالنا۔ اس معاملہ میں ہی نہیں، کسی بھی معاملے میں ہم بیچ میں نہ پڑیں گے۔ تمہارے پاس روپیہ ہے روپیہ کے زور سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم لوگ غریب ہیں ہم کو تو سماج سے مل کر چلنا پڑے گا۔" بڈھا بڑے غمگین انداز سے اپنی تقریر ختم کر کے ہم سب کو بھونچکا چھوڑ کر چلا گیا۔

. . . . نند پال اس کے چلے جانے کے بعد بھی غم کے بوجھ سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

دونوں لڑکیاں یکبارگی مایوس ہو کر اور ہم سب کی طرف دیکھ کر اپنے چچا کے قدموں پر گر کر سسک سسک کر رونے لگیں اور بولیں "بھگوان کی دہائی ہے۔ ہم لوگوں نے کوئی گناہ نہیں کیا چاچا . . ."

ہم دونوں کے جسم گویا مفلوج ہو گئے تھے۔ دونوں لڑکیوں کے غمگین اور مایوس چہروں کو دیکھ کر اس ظالم اور بھیانک سازش پر اس قدر غصہ آ رہا تھا۔ گویا دل میں آگ لگی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ سازش اتنی مضبوط اور گہری ہے اس کے خلاف ہماری ساری کوشش بیکار ہوگی۔ پاپیوں کا گروہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے متحد ہو گیا تھا۔ ہمیں اپنے چنگل میں دبوچ کر ہماری ساری طاقت کھینچ لی تھی۔

اس معاملہ میں کچھ مارپیٹ ہو جاتی تو بھی نثرت کے جسم کی کھجلی مٹ جاتی۔ میری طبیعت بھی مارپیٹ کرنے کی ہو رہی تھی۔ لیکن اس سے ان دونوں لڑکیوں کے بجز نقصان فائدہ نہ ہو سکتا تھا۔ اور شاید نثرت نے یہ بات سمجھ بھی لی تھی۔

ہم لوگ گم سم بیٹھے ہوئے خاموشی دور کرنے کا کوئی طریقہ نہ سوچ رہا تھا۔

یکایک میں چونک پڑا۔ اتنی دیر سے ماسٹر صاحب کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی موجودگی بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اچانک ان کا چہرہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

ماسٹر صاحب نے چلا کر کہا: "نند!" اس آواز سے ہی ظاہر ہو
گیا کہ نند پال کا دولت کا نشہ ایک ہی لمحہ میں کافور ہو گیا۔ ماسٹر
صاحب نے کہا: "تم ان ذلیل آدمیوں کی بات پر اعتبار کرتے ہو؟"

نند پال نے ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن ماسٹر صاحب
آسانی سے چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ بے بس لڑکیوں کے اوپر
ظلم ہوتے دیکھ کر ان کی فطرت بدل گئی تھی۔ انہوں نے دوبارہ ٹوک
کر کہا: "بولو۔ اعتبار کرتے ہو؟"

نند پال نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "اعتبار نہ کروں تو کیا کروں۔
آپ ہی بتائیے۔"

"کروں نہ کروں کی بات چھوڑو۔ تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے۔ تمہارا
ایمان کیا کہتا ہے؟" نند پال کو خاموش بیٹھے دیکھ کر ماسٹر صاحب
اور بھی تیز ہو کر بولے: "پھر تو تم اچھے آدمی نہیں ہو نند۔ آدمی
کا چہرہ دیکھ کر تم اسے نہیں پہچانتے۔ تم کیسے ان لڑکیوں کے
اوپر اتنا بڑا کلنک لگانا چاہتے ہو؟"

نند پال نے مایوسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا: "میں کیا
کروں بتائیے۔ مجھے تو سماج کے ساتھ ہی چلنا پڑے گا۔ دونوں
لڑکیاں کلکتے میں دو دن گزار کر نہ آئی ہوتیں تو اتنا بڑا ہنگامہ کیوں
کھڑا ہوتا؟"

ماسٹر صاحب غصے کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس کا مطلب
ہے ہم دونوں لڑکیوں کو راستے میں چھوڑ آنے کے لئے یہ سازش
کی تھی۔ میں یہ بات سب کے سامنے کہتا ہوں۔ لعنت ہے۔ تم اپنی
بے سہارا۔ یتیم اور دودھ پیتی بھتیجیوں کو اس طرح تباہ کرنے پر تلے
ہوئے ہو۔"

نند پال نے اس بار غصہ ہو کر کہا: "پاگلوں کی طرح الٹی
سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالو ماسٹر۔ میں نے برداشت کیا ہے۔"

نند پال کے بہت سے تابعدار وہاں اس کے اشارے پر ہم
لوگوں پر جھپٹنے کے لئے ایک طرف تیار کھڑے تھے۔ لیکن ماسٹر
صاحب نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ میز کے اوپر زور سے
پیر پٹخ کر انہوں نے کہا: "الٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالوں؟
خوب! یہ میں تمہارے گھر میں کھڑا ہو کر کہے دیتا ہوں کہ تم پاجی
شیطان اور ڈاکو ہو۔ دونوں لڑکیوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کے
لئے یہ چال چلی ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ہے کہ تم کیسے
کامیاب ہو جاؤ گے۔ اپنے گھر میں ان لڑکیوں کو جگہ نہیں دو
نہ دو۔ میں انہیں لئے جاتا ہوں اور دیکھوں گا کہ تم لوگ ان کو
کس طرح دھکا دیتے ہو!"

اس سارے عرصے میں اندر ہی اندر دل ہی دل میں چیخ کے سامنے نند
پال دل میں خواہ کچھ بھی سمجھتا ہو لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

ماسٹر صاحب نے دونوں لڑکیوں کو پکار کر کہا: "چلو بیٹی
یہ سالا تمہارا چچا نہیں چمار ہے۔" لیکن لڑکیوں نے پھر بھی
قدموں میں گر کر کہا: "چاچا جی۔ کیا ہم کو اس طرح وداع کریں گے؟"

نند پال کو اب اپنا اصل چہرہ دکھانے میں کوئی عار نہ تھی۔
جس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے پیچھے سرکا کر دانت پیس کر بولا:
"مجھے اب کیوں پوچھتی ہو۔ کلکتے میں جو یار بنائے ہیں اب ان
کے پاس جاؤ نہ!"

لڑنے پر آمادہ ہو کر شرت اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے
ہی ماسٹر صاحب نے کڑک کر کہا: "زبان سنبھال کر بات کرو نند۔
زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔"

نند پال اس بار بھی بت کی مانند خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب
نے خود دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "چلو بیٹی چلو۔ قصائی کے
اندر رحم نہیں ہوتا۔"

آخر ماسٹر صاحب کے ساتھ جانے کے علاوہ ہمیں کوئی راہ نظر
نہ آئی۔ ہم لوگ ماسٹر صاحب کے ساتھ باہر چلے آئے۔ لیکن ہم نے دیکھا
کہ دونوں لڑکیوں کی جانے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ
کر اپنے چچا کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید اب بھی انہیں امید تھی کہ ان
کا چچا انہیں واپس بلا لے گا۔

باہر آتے ہی ماسٹر صاحب کا ایک نیا روپ نظر آیا۔ یکایک
جیب سے اپنی زنگ آلود گھڑی نکال کر انہوں نے بے تحاشا دوڑنا
شروع کر دیا۔ ہم نے تعجب سے پوچھا: "یہ کیا ماسٹر صاحب؟" لیکن وہ
اس وقت تک کافی آگے نکل گئے تھے۔ دور سے ان کی آواز سنائی دی:
"ساڑھے گیارہ بجے کی [illegible] ہے۔ آپ لوگ دھیرے دھیرے
گھر آ جائیے۔"

× × × × ×

ہم نے طے کیا تھا کہ دونوں لڑکیوں کو ماسٹر صاحب کے پاس چھوڑ کر کالج واپس لوٹ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ رات میں نہ جانے کیسے آگ لگ گئی۔ ان کا گھر کچی اینٹوں کا تھا۔ اوپر چھپریں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ کر بہت مشکل سے دروازہ کھول کر باہر نکل کر جان بچائی۔ لیکن سارا سامان جل گیا تھا۔ کمرے بھی رہنے کے لائق نہ رہے تھے۔

صبح ہمیشہ خوش رہنے والے ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ دونوں لڑکیاں روتے روتے کہہ رہی تھیں کہ ہماری قسمت کی وجہ سے ہی ماسٹر صاحب کا اتنا نقصان ہوا۔ لیکن ماسٹر صاحب یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بار بار یہی کہتے رہے کہتے "یہ بوڑھا تمہیں چند روز پناہ بھی نہ دے سکا بیٹی" میرے بولے "اب کیا کریں بھائی؟ کوئی چارہ نہ دیکھ کر آخر کو ہی میں نے یہ بات سوچ لی تھی۔ ماسٹر صاحب کو تسلی دے کر کہا "آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد انہی چھوٹے سے گاؤں کے تھوڑے دنوں کی جان پہچان کے ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر سے رخصت لیتے وقت تو ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ گاڑی چلنے پر ہماری کھڑکی کو پکڑ کر کھڑے بچے کی مانند روتے روتے ماسٹر صاحب پلیٹ فارم کے سرے تک دوڑتے آئے۔ دونوں لڑکیوں نے آنسو بھری آنکھوں سے کھڑکی سے سر نکال کر ان سے دعا لی۔ شرافت اپنی جگہ نیک دل کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس وقت دیکھا وہ بھی منہ پھیر کر بیٹھا تھا۔ اس طرف دیکھنے کی اسکی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ اس گاؤں سے انسان کی یہ بہت دیکھ کر جائیں گے۔ ایسے شخص کی یاد لے کر جاؤں گا۔ جو عمر بھر یاد آتا رہیگا۔

x x x x x

ماسٹر صاحب کے ساتھ اب شاید زندگی بھر ملاقات نہ ہوگی مگر کی دھوتی باندھے۔ ننگے جسم۔ سر پر ٹوپی پہنے شاید وہ اب بھی اس چھوٹے سے سٹیشن پر ریل گاڑیوں کو پاس کراتے ہوں گے۔ میں نے یہ بھی نہ معلوم کیا کہ اس سٹیشن سے ان کی تبدیلی کسی دوسرے سٹیشن پر کہیں ہو گئی۔ لیکن پھر بھی جب انسان کی کمینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں۔ ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔

ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر کی اتنی تعریف شاید سب کو اچھی معلوم نہ ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ خوش نصیب ہیں۔ جنہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کہ دنیا میں چالاک انسانوں کی کتنی کمی ہے۔

x x x x x

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دونوں لڑکیوں کو کہاں چھوڑا۔ انکی جلدی جا ئیداد انہیں آج تک نہ مل سکی۔ لیکن انہیں اسکا کوئی افسوس نہیں۔ کسی گاؤں میں گھر کے رشتہ داروں میں گھری ہونے پر بھی تنہائی محسوس کرنے والی ایک حسین لڑکی مایوس نظریں لئے خاوند کے بغیر اپنی سسرال کی گرہستی زندگی چلا رہی ہے۔ اس کے دل کی بات تو بھگوان ہی جانیں۔ اسکا چہرہ دیکھ کر کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایک دن شمیم نے اُسکے چھوٹے سے کنبے پر اپنا بوجھ ڈالا تھا یہی اس بات پہ ناراض ہوا تھا۔ آج اچانک پہلے سے پوچھے بغیر میں نے اسی کے سر پر دو اجنبی لڑکیوں کا بوجھ ڈال دیا۔ اور اس کے چہرے پہ شکن تک نہ آئی۔

پہلے کی طرح ہی اس نے ہنس کر پوچھا۔ "اتنے دُبلے پتلے کیوں ہو گئے جی۔ میرے بارے میں تو نہیں سوچتے رہتے ؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس بات کا حق تم نے مجھے کہاں دیا ہے ؟"

منو نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو اچھی بات ہے۔ کسی کی ہو گئی ہے تمہیں جو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ مجھے تو سچ مچ رشک ہو رہا ہے ؟" اسکے بعد کچھ دیر تک کہ منو نے مجھ سے کہا۔ "پھر کب تم راستے سے بے کس لڑکیوں کو سمیٹو گے۔ بتاؤ ؟"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا مطلب ؟"

"تبھی تو نہیں اس بدنصیب کے سر منڈھ دینے آ ؤگے۔ ورنہ تمہارے درشن بھلا کیسے ہوں گے ؟"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "واقعی کیا تم نے یہاں سے نہ جانے کی ٹھان لی ہے منو ؟" جواب میں اس نے بس تھوڑا سا سر ہلا دیا۔ اسکی آنکھوں میں نہ جانے کونسا جذبہ تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہی مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ لیکن شمیم والا

میرے بارے میں بہت فکر کرتے ہیں نا؟"

میں نے کہا "یہ خاندان کی بے انصافی ہے"

"میری زندگی رائیگاں گئی۔ شمیم دادا یہ سوچ کر بہت افسوس کرتے ہیں نا؟"

اس بات کا میں کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔

منو نے کہا "شمیم دادا سے ایک بات کہنا۔ کہنا کہ انسان کی ساری کہانیاں پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن قسمت کی ساری کہانیاں شروع ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بڑی مشکل سے ایک پوری ہوتی ہے۔ سارے دھاگے نہیں ملتے — شمیم دادا سے ایک بار مل جانے کے لئے کہنا"

کلکتہ واپس آنے پر شمیم نے پوچھا "منو مل گئی یا نہیں؟"

ساری داستان سنانے کے بعد میں نے کہا "منو نے تمہیں ایک بار مل جانے کے لئے کہا ہے"

شمیم نے کچھ دیر خاموش رہ کر یکایک بڑے جوش سے کہا "ارے تم سے کہنا بھول گیا۔ 'بے باک' کے دفتر میں ملازمت پکی ہو گئی ہے۔ میں نے اتنے دنوں جیسے تیسے کام چلایا۔ آج سے مجھے حاضر ہونا ہے"

'بے باک' کے دفتر میں ہی ملازمت کر رہا ہوں!

جے نیندر کمار

ہندی کے سربرآوردہ ادیب جے نیندر کمار ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ۱۹۱۸ء میں گھر ہی پر پڑھ کے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے دو سال تک بنارس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے کالج چھوڑ دیا۔ اور عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار اور پھر ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء میں دوسری اور تیسری بار جیل گئے۔ آج تک کوئی ملازمت نہیں کی۔ لہٰذا آپ کو مستقل بیکار سمجھتے ہیں۔

آپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پھانسی" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور اس وقت کے بعد سے آپ مسلسل ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ ان دنوں آپ ہاتھ سے بہت کم لکھتے ہیں۔ آپ بولتے جاتے ہیں اور کوئی دوسرا لکھتا ہے۔ آپ افسانے، ناول اور فلسفیانہ مقالوں کی درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔

وہ ہندی ادب کے میدان میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ ایک تہلکہ سا برپا ہو گیا۔ منشی پریم چند نے لکھا۔ "تم گورکی کو دیکھنا چاہتے ہو؟ ہندوستان میں کوئی گورکی ہے یا ہو سکتا ہے تو وہ جے نیندر ہے۔"

جے نیندر کمار نے ۱۹۲۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ اُنھوں نے انشا پردازی کو محض ایک تفریح سمجھا تھا۔ لیکن ان کی نگارشات کچھ اتنی مقبول ہوئیں کہ اُنھوں نے عوام کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔

جے نیندر کمار ادب اور سیاست کے تعلق کو ناگزیر تو سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ سیاست کو ادب کی بلندی عطا کرنی چاہیے جس طرح ٹالسٹائی نے سیاست کو بلندی تک اٹھایا۔ اس طرح ادب کی حیثیت ہتھیار کی ہونے کی بجائے دوا کی ہو جاتی ہے۔

جے نیندر کمار نے اپنی تخلیقات میں گاندھی جی کے فلسفے کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ آپ منشی پریم چند سے بھی متاثر ہیں۔ آپ بھی منشی پریم چند کی طرح فرقہ پرستی کے مخالف تھے۔ اور اردو ہندی کے درمیان کسی جھگڑے کو روا نہیں کرتے۔

جے نیندر کمار ادب میں داخلیت پسندی کے زیادہ قائل ہیں۔ آپ ہندی کے معاصر طرزِ انشا پردازوں میں ہیں اور آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں — آپ چونکہ ایک غیر سیاسی سماج کے حامی ہیں اس لئے آپ کی تخلیقات میں آپ کے اس نظریہ کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے نظریات میں کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں جس کی مثال آپ کا یہ ناولٹ "استعفا" ہے۔ اس ناولٹ میں خارجیت اور داخلیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ ناولٹ ہندی زبان میں بے حد مقبول ہوا ہے۔



جینندر کمار

جے نیندر کمار — مترجمہ: شریف احمد

استعفا

نہیں بھائی (گناہ اور ثواب) پر تبصرہ مجھ سے نہ ہو گا۔ بیچ ہوں، قانون کی ترازو کی اہمیت کو جانتا ہوں، مگر ـــــ تولنے والوں کی بے حسی سے بھی واقف ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ جن کے اوپر رائی رتی ناپ تول کر پائی پائی کو پائی کہہ کر سماج کا نظام برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے وہ جانیں۔ میرے بس کا یہ کام نہیں۔ میری بُوا (پھوپی) گناہ گار نہیں تھیں، یہ کہنے والا بھی میں کون ہوں؟ مگر آج میرا دل ان کی جُدائی کے لئے چار آنسو بہانا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف طرح طرح کی عزت کی دیوار کھڑی کر کے خوب مضبوط جمالی ہے تاکہ حادثوں کی کوئی لہر اسے پار کر کے مجھ تک نہیں آسکتی۔ لیکن بُوا کی یاد جیسے میرے سارے وجود کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ کیا یہ یاد مجھے اب چین نہیں لینے دے گی؟ ابھی ان کے مرنے کی خبر پاکر بیٹھا ہوں۔ یہ تو ان کی موت کے دسیوں سال پہلے سے جانتا تھا۔ پھر بھی جاننا چاہتا ہوں، کہ آخر وقت کیا انہوں نے اپنے اس بھتیجے کو بھی یاد کیا تھا؟ یاد کیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم لوگوں کا اصلی گھر پچھاؤں کی طرف تھا۔ پتا معزز شخص تھے اور ماتا ایک اچھی گھر بارن۔ جتنی وہ اپنے کام میں ماہر تھیں اتنی ہی نازک بھی ہوتیں تو [illegible] نہیں پڑھنا ہوا۔ بڑے کر گئے۔ پھر تو ساری کہانی اس منہ میں سما جائے گی اور اس میں سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ [illegible] ماہر تھیں، اتنی نازک نہیں تھیں۔ بُوا پتا جی سے کافی چھوٹی تھیں۔ مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑی ہوں گی۔ میری ماتا کی دیکھ ریکھ میں میری ہی طرح بُوا بھی رہتی تھیں۔ دیکھ ریکھ کوئی [illegible] کے فائدہ اور نقصانات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

پتا جی کے دو بھائی تھے اور تین بہنیں۔ بھائی پہلے تو دور سیر کو [illegible] میں [illegible] پھر ایک [illegible] کے مطابق انہیں [illegible] بھیج دیا گیا۔ تب سے وہ وہیں بس گئے اور رفتہ رفتہ آنا جانا ایک رسم و رسم کی بات رہ گئی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم سا ہو گیا۔ دو بڑی بہنیں شادی ہونے کے بعد زچگی میں چل بسیں۔ اکیلی یہ چھوٹی پھوپی رہ گئی تھیں۔ پتا جی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی سب ہی خواہشیں پوری کرتے تھے۔ پتا جی کی یہ محبت بگاڑ نہ دے، اس بات کا میری ماتا کو خاص خیال رہتا تھا۔ وہ اپنی دیکھ ریکھ میں رکھتی تھیں۔ میری پھوپی سے کم محبت کرتی تھیں۔ یہ تو کسی حالت میں بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن آریہ گھر بارن کا جو آدرش ان کے ذہن میں آ گیا تھا پھوپی کو وہ ٹھیک اسی کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھیں۔

پھوپی کا تب کا روپ سوچتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ ایسا حسن خدا کبھی کسی کو دیتا ہے اور جب دیتا ہے تب شاید اس کی قیمت وصول کرنے کی بھی نیت ہوتی ہے۔ پتا جی تو پھوپی کی موہنی صورت پر ریجھے ہوئے تھے۔ خیر! اس بات کو چھوڑیئے۔ میری اور پھوپی کی خوب بنتی تھی۔ وہ شہر کے بڑے اسکول میں بگھی میں بیٹھ کر پڑھنے جاتی تھیں اور گھر آکر جو نئی شرارتیں وہاں ہوتیں، اکیلے میں مجھے سناتی تھیں۔ کہ ماسٹر جی کو ایسا بنایا، ایسا بنایا، کہ بس مت پوچھو کیا بتاؤں؟ یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسیں کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔ اس وقت مجھے کہانی کی پریوں کا خیال آتا اور میں مورت کی طرح اپنی پھوپی کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

کہتیں "ادھر مڑ کر، وہ ہیں نہیں حساب کے ماسٹر، شیلا نے ان کی کرسی کی گدی میں پن چبھو کر رکھ دی۔ شیلا بڑی شریر ہے۔ ماسٹر کی ایک آنکھ تو نے نہیں دیکھی ہو گی؟ ماسٹر جی دیکھتے اس طرف ہیں تو وہ آنکھ کسی اور ہی طرف کو دیکھتی ہے۔ پن جو چبھی تو خوب بگڑے، خوب بگڑے، ڈانٹ بولے، یہ کس کی شرارت ہے ـــ جو وہ کھڑی ہو جائے؟ سب لڑکیاں سہم گئیں۔ شیلا تو بس ایسی ہو گئی جیسی مقابلے کے آگے [illegible] ماسٹر جی

بید کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "میں کسی ایک کو معاف نہیں کروں گا" اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں بڑا غصہ آ رہا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر سب لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ مجھے بڑا برا لگا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا، "یہ میرا قصور ہے ماسٹر جی۔" ماسٹر جی پہلے تو مجھے دیکھتے رہے پھر بولے، "یہاں آؤ" میں چلی گئی۔ کہا "ہاتھ پھیلاؤ" میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُس پہلی ہتھیلی پر انہوں نے دو تین بید جڑ دیئے۔ میں سمجھتی تھی کہ ابھی اور ماریں گے لیکن جب بید انھوں نے ہاتھ سے الگ کر دیا تو میں نے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ سچ! پر منہ میرے پہ اثر تک بھی نہ ہوا۔ میں ان کی اس آنکھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر جی مجھے دیکھ رہے تھے، لیکن وہ آنکھ نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی — پرمود! تو ماسٹر جی کو ایک بار تو ضرور دیکھ — پھر ماسٹر جی نے مجھ سے کہا: "اب تو نہیں کرے گی"؟ میں چپ چاپ کھڑی رہی اور سوچتی رہی کہ ایک بار تو مجھے بھی پانچ کا قصور ہی کرنا چاہیئے — ماسٹر جی بولے "جاؤ"۔ میں اپنی جگہ پر آ گئی۔ شیلا میرے پاس بیٹھتی ہے۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے کھا ہی تو جائے گی۔ میں نے کہا "ہٹ پگلی"۔ اُس نے میرے ہاتھ کو ڈسک پر رکھے رکھے اپنے ہاتھ سے دبا دیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑی پگلی لڑکی ہے شیلا بھی۔ میں نے کہا "شیلا کیا کر رہی ہے؟ اری دیکھ! ماسٹر جی کی وہ آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے"۔ پرمود، تو شیلا کو جانتا ہے۔ شیلا بڑی اچھی لڑکی ہے، لیکن بڑی نٹ کھٹ بھی ہے۔ — ہم دونوں بڑی اچھی سہیلی ہیں ایک دوسرے کی — لیکن وہ ہے پگلی — اسکول سے میں آنے لگی تو اور کچھ نہیں تو میرے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے گال پر ایک چپت رسید کیا اور بولی "یہ کیا ہے شیلا؟" وہ ایک بلک کر روتی رہی۔ ممی! "کچھ نہیں" پرمود بھیا کے ایک دن شیلا کے گھر لے چلوں گی۔ چلے گا نا؟ "

بیچ ایک دم جانے انہیں کیا یاد آ گیا — چونک کر کہتیں۔ "ارے چل! انہیں تو تیری ماں بگڑے گی"۔ میری ماں سے

وہ ہمیشہ ڈرتی تھیں اور انھیں میرے سامنے ہمیشہ "تیری ماں" کہا کرتی تھیں۔

بوا کا پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن اپنی کتابیں کاپیاں بڑے سلیقے سے رکھتی تھیں اسکول بڑے چاؤ سے جاتی تھیں۔ ویسے بڑی خوش مزاج تھیں۔ بس ماں کے سامنے کچھ جھجک سی محسوس کرتی تھیں۔

بچپن کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ کیسے مجھے کپڑے پہناتیں، کیسے چپت ار مار کر کھلاتیں، کیسے پیار کرتیں، اور کیسے اپنے راز کی باتیں مجھے بتاتی تھیں — یہ سب کچھ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ میں بڑا ہوتا گیا اور تھوڑی کو بھی شعور آتا گیا — مجھے انکی موجودگی میں ایک عجیب قسم کا اطمینان سا ملتا تھا، اور انکے ساتھ کا میں ہمیشہ بھوکا رہتا تھا جب بھی ملتیں، پیاری پیاری نصیحتیں کرتیں۔ "دیکھو بیٹا! بڑوں کا کہنا ماننا چاہیئے۔ اچھے لڑکے آگے چل کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔ کیوں پرمود بھیا! تم بڑے آدمی نہیں بنو گے —" کبھی وہ مجھے بیٹا کہتیں، کبھی بھیا اور کبھی گدھے کا لقب بھی دے دیا کرتیں۔

نویں درجے میں تھیں یا دسویں میں مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں میری عمر کوئی بارہ سال کی ہو گی۔ میرا دل اس وقت صرف انھیں کے بس میں تھا۔ دراصل وہ مجھے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ان کے پیار کا رخ بدل گیا ہے۔ وہ مجھے اب نصیحتیں نہ کرتیں بلکہ سینے سے لگا کر نہ جانے کہاں دیکھنے لگتی تھیں۔ نہ اب وہ مجھ سے زیادہ باتیں ہی کرتیں — میں پوچھتا "بھیا! کیا بات ہے آج اسکول میں کیا ہوا؟" اس پر وہ کہتیں "کچھ نہیں بھیا! کچھ بھی تو نہیں" یہ کہہ کر جیسے اُن سے میری طرف دیکھا نہ جاتا۔ تب میں ہاتھ پکڑ کر ٹھیک اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا "دیکھو بہن، تم کچھ چھپا رہی ہو"۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتیں اور داہنے ہاتھ سے چپت مار کر کہتیں "ہٹ پگلے، یہ کیا پوچھتا ہے!"

میں نے انھیں دونوں بعد بھی محسوس کیا کہ جیسے اب انھیں بُری نہ لگتی تھی۔ شام کے وقت چھت پر کھٹولا ڈالے کبھی آسمان پر اڑتی ہوئی چیلوں کو دیکھتیں، کبھی پتنگوں کے پیچ دیکھنے میں اتنی محو ہوتیں کہ کٹی ہوئی پتنگ کا تعاقب انکی نگاہیں اس وقت تک کرتیں جب تک کہ وہ غائب نہ ہو جاتی۔ اور نہیں تو کھرّے کھٹولے پر پیٹ کے بل لیٹ جاتیں اور کوئلے سے زمین پر بے ڈھنگے نقش و نگار بنانے لگتیں۔ جب میں اوپر پہنچتا تو انھیں اس حالت میں دیکھ کر ہکّا بکّا رہ جاتا۔ جب انھیں میرے آنے کا احساس ہوتا تو دفعتاً چونک کر کہتیں: "ارے پرمود! تو کہاں تھا"؟

"یہیں تھا۔"

"کیوں رے! تو اب مجھ سے بولتا بھی نہیں۔"

میں بغیر جواب دئے انکے پاس کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ وہ دھیرے دھیرے مجھے اپنے اوپر ہی گھسیٹ لیتی اور کہتی۔ "دیکھو! پتنگ دیکھو!"

کچھ دیر تامّل کے بعد کہتیں: "پتنگ تجھے اچھی لگتی ہے"؟

میں کہتا: "ہاں"!

"تو پتنگ اڑائے گا"؟

میں کہتا: "بابوجی منع کرتے ہیں۔"

اس پر وہ یکایک مجھے آغوش میں لے لیتیں اور کہتیں۔ "ہم تم دونوں ساتھ ساتھ پتنگ اڑائیں گے — ایسی پتنگ جو سب سے نرالی، سب سے دُور ہوگی، کیوں پرمود! سب سے اونچی پتنگ اڑائے گا نا"؟

میں کہتا، "پیسے دو، میں لادوں۔"

وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں بظاہر میری طرف ہوتی تھیں لیکن در اصل مجھ سے بہت دُور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہوتی تھیں۔ پھر ایک دم چونک پڑتیں۔ کسی قدر بلند کر دینی آواز سے کہتیں: "چل رے پتنگ سے پہلے گھر چلتے ہیں۔"

انھیں وہ [illegible] بات ہے۔ ایک روز اسکول سے وہ

خلافِ معمول کافی دیر میں لوٹیں۔ ماں نے پوچھا: "کہاں رہ گئی تھی"؟

"شیلا کے گھر گئی تھی۔"

ماں سن کر خاموش ہو گئیں۔

اس دن سے پھوپی میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی، لیکن یہ بے چینی تھی مسرت انگیز۔ وہ خوش رہنے لگیں۔ کام کاج سے طبیعت اُکتا گئی۔ انھوں نے میرے ساتھ طرح طرح کی تجویزیں رکھیں۔ طرح طرح کی باتیں کیں۔ پرمود! ایک دن نہر کے پُل پر چلنا چاہیے، چلو گے؟ بتاؤ تمہیں کونسی مٹھائی پسند ہے؟ — گھیور — ہشت — گھیور بھی کوئی مٹھائی ہے۔ دیکھو تم پتنگ نہیں لائے نا — پرمود میں شیلا کے یہاں رہ گئی تھی۔ تیری ماں کو تو کچھ خیال نہ ہوا ہوگا۔ چل رے چل پرمود، یہاں کیا کمرے میں بیٹھے ہیں چل کر اوپر ہوا میں بیٹھیں گے — ایک بات کہتیں کہ جھٹ بھول جاتیں۔ اس وقت انکے دل میں کچھ جیسے ہی نہ تھا، بے اثر بات ہو یا اثر۔ انکے لیے سب برابر تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا ان کا پورا وجود ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے اور دل ہے کہ باہر نکل کر اُڑ جانا چاہتا ہے۔ وہ بے بات ہنستی اور بے بات مجھے پکڑ کر اِدھر اُدھر کھینچتیں۔ اس دن وہ میری سمجھ سے باہر تھیں۔ میں نے کہا: "بوا، آج کیا بات ہے"؟

بولیں: "میں بوا نہیں ہے۔ بوا" مجھے اچھا نہیں لگتا پرمود تو مجھے جی جی کہا کر۔ شیلا بھی تو مجھے جی جی کہتی ہے۔"

میں نے کہا: "میری تو بوا ہو"

"میں بوا نہیں ہونا چاہتی — بوا ... اچھی دیکھ تو سہی۔ چڑیا کتنی اونچی اُڑ رہی ہے۔ میں چڑیا ہونا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "چڑیا"؟

بولیں: "ہاں، چڑیا! کتنے نرم اور نازک پر ہوتے ہیں اس کے کتنی آزاد! پر تولے اور جہاں جی چاہا آسمان میں اُڑ گئی کیسا مزے کی بات ہے۔ ننھی منی چڑیا، ننھی منی پونچھ۔ میں چڑیا بننا چاہتی ہوں۔"

اس دن وہ رات گئے تک مجھے اپنے سے چپٹائے رہیں

ایک بار پوچھ بیٹھیں "کیوں پرمود، تو مجھے پیار کرتا ہے؟"
اتنا سننا تھا کہ بغیر کچھ کہے سنے میں نے اپنا منہ اُن کی چھاتیوں میں چھپا دیا۔۔ اس پر وہ بولیں "پرمود، میں تجھے بہت چاہتی ہوں"

اس دن کے بعد کئی دن تک وہ روزانہ سکول سے دیر میں واپس آتی رہیں۔ اور ایک دن تو اتنی دیر ہوگئی کہ انھیں بلانے کے لئے نوکر بھیجنا پڑا۔ نوکر انھیں سشیلا کے گھر سے لے آیا۔

اس سے تین دن بعد کی بات ہے کہ میں گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ماں غیظ و غضب میں بھری چیختی جا رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر کسی قدر جھجکیں اور بولیں "کیوں کہاں رہے، کہاں تھا اب تک"؟

اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے جواب بن نہ پڑا۔

"بس۔ بھاگ کے بید تو لے آ۔"

مجھے کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ماں کی تیزی اور غصے سے یہی سمجھا کہ میری ہی کم بختی ہوگی۔۔۔ ایک دم باورچی کے کمرے میں جا، بید اٹھایا۔ ماں نے ایک جھٹکے سے بید میرے ہاتھ سے چھین لیا اور خاموش پچھلے کمرے کی طرف لوٹ گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے کواڑ بند کر لیے۔ اور پھر شڑاپ شڑاپ کسی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میرے پیر جیسے فرش میں گڑ گئے۔ بید کی پہلی ضرب پر تو ایک چیخ سنائی دی لیکن پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ بید کی شڑاپ شڑاپ پہلے سے تیز ہوگئی تھی مجھے شک ہوا کہ کہیں بوا تو نہیں ہیں۔ لیکن یہ شک شک ہی رہا، کوئی بات ایسی معلوم نہیں ہوئی جس سے میرا شک یقین میں بدل جاتا۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہاں کھڑا رہنا ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئیں۔۔۔ ان کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، جس ہاتھ میں بید تھا، وہ ابھی تک لرز رہا تھا۔ چہرے پر خاک سی اڑ رہی تھی۔ اُن کی حالت سے گمان ہوتا کہ اگر مجھے دیکھیں تو اپنے آپ کو ہی پیٹنا شروع نہ کر دیں۔ جیسے اپنے تن من تک یہ صدمہ اٹھانا اُن پر بڑا گراں

گزر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے میرے سامنے سے ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ پھر جاتے جاتے یک بیک دروازے پر رکیں اور بید زور سے دالان میں پھینک دیا۔ بید میرے پاس آ کر گر پڑا۔

کچھ دیر کے لئے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ بس یوں ہی سٹ پٹایا سا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہمت کر کے میں اُس کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر جا کر دیکھا تو بوا اوندھی پڑی ہیں۔ ساڑی جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اور کئی جگہ پے در پے خراش پڑنے سے اسکا کپڑا چھلنی ہوگیا ہے۔ جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں، کئی جگہ خون بھی چھلک آیا ہے۔ بوا بے ہوش سی پڑی ہیں۔ نہ روتی ہیں، نہ سسکتی ہیں۔ بال بکھرے ہیں۔ زمین پر پڑی دونوں باہوں پر ماتھا ٹکا ہوا ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھنا میرے لئے وبال ہوگیا۔ زبان پر جیسے کسی نے قفل لگا دیا۔ پھوپی سے گلے لگ کر تھوڑی دیر رو بھی لیتا تو بھی شاید طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ لیکن میرے لئے یہ بھی ناممکن تھا۔ اسی کشمکش میں وہاں سے دبے پاؤں لوٹ آیا۔

اس واقعے کے بعد پھوپی ہنسنا بھول گئیں۔ پانچ چھ مہینے کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ ماں نے بڑی مستعدی سے جلدی جلدی تمام انتظام کر دیا۔ اور وہی دن پھوپی کے اسکول کا آخری دن تھا۔ اس دن سے وہ سینے پرونے، جھاڑو بہارو اور خانہ داری کے دوسرے کاموں میں بڑی خاموشی سے مصروف ہوگئیں۔ کام کرنے کے علاوہ انھیں اور کسی بات سے مطلب تھا نہ غرض۔ نہ وہ کسی کی نگاہوں میں چڑھنا چاہتی تھیں۔ دھوبی کے یہاں کے دھلے کپڑے اب وہ پہلے کی طرح جلدی جلدی میلے نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے کچھ کچھ اور کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ بوا کا چہرہ بھی کافی گمبھیر ہوگیا ہے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی بوا سے ہنسی مذاق کرتے لیکن بوا کے پاس جواب میں صرف خاموشی اور متانت دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ماں کی حالت یہ تھی کہ بات بات پر مجھے ڈانٹتیں ڈپٹتیں۔ گرچہ اُن بیچاری کو تو نصیحت آتی تھی۔ خود کلامی کرتی رہتیں اور کرتوتوں پر لعنت بھیجا کرتیں

پارش کرتی ہوں، بیچ بیچ میں عجیب بے سبل انداز سے نہ
جانے کیا بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک دم پھٹ پڑتی
تھیں۔ میں سامنے ہوا اور فوراً آگ لگی داغی۔
"آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے، پرمود؟ بُوا سے
لے کر خود جھاڑو نہیں دے سکتا—؟ آجکل کے لڑکے بڑے
کام چور ہوتے ہیں۔"
کبھی حکم ہوتا۔
"کہاں گیا یہ پیسی؟ نہیں ہے؟ نہیں ہے؟ سارا کام
بیچاری لڑکی کو کرنا پڑتا ہے— خیر کوئی بات نہیں— ایک پیسہ
جرمانہ— یہ نوکر بڑے حرام خور ہوتے جاتے ہیں۔"
اس طرح کی بہت سی باتیں تھیں جو روزانہ ماں سے سُننے
میں آتی تھیں۔ یہ سب تو تھا لیکن بُوا سے وہ سیدھے مُنہ
بات بھی نہ کرتی تھیں۔
یوں ہی شادی کے دن قریب سے قریب تر ہوتے گئے
اور ایک دن شادی بھی ہو گئی۔ شادی سے پہلے بُوا نے مجھے
اپنے سینے سے لپٹا لیا اور گھنٹوں آنسو بہاتی رہیں۔ مجھے نصیحت
کی: "بیٹا، پرمود بزرگوں کا حکم ہمیشہ بجا لانا چاہیئے۔ ہمیشہ سچ
بولنا چاہیئے۔ یہی طریقہ اچھے لڑکے بننے کا ہے۔ پرمود، تو
ایک دن بڑا آدمی بنے گا نا؟"
میں اس وقت تک بچہ نہ رہا تھا، کافی بڑا ہو چلا تھا،
پھر بھی اُس وقت مجھ پر ایسی رِقت طاری ہوئی کہ میں
بُوا کی گود میں چُپ چاپ پڑا رہا۔
بُوا بولیں: "پرمود، تیری بُوا تو مر گئی۔ اب اُسے کبھی
یاد مت کرنا۔ میرا راجہ بھیا بڑا اچھا ہے۔"
میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن میں نے بُوا کو پتہ نہ
چلنے دیا اور اُن کی گود میں دبکا پڑا رہا۔
بُوا کی رخصت کے وقت میں خوب پھوٹ پھوٹ کر
رویا۔ میں نے کسی کی شرم نہ کی۔ میں نے مچل کر گھونگھٹ
والی بُوا کا آنچل پکڑ لیا۔ اور گلوگیر آواز سے کہا: "میں
بغیر بُوا کے نہ کھانا کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا۔"
ماں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، "[illegible]

اور میں اس گھر میں پیر بھی نہیں رکھوں گا۔" اس کا
جواب مجھے وہیں مل گیا۔ لیکن ماں سے نہیں۔ بابوجی نے
غصّے کرتے دو تین چپت رسید کر دیئے۔ لیکن میں بھی اتنا
سستا چھوڑنے والا تھوڑی تھا۔ چپت کھا کر آنچل چھوڑا
تو بُوا کے پیروں سے لپٹ گیا۔ پیروں کے بچھوؤں کو
میں نے زور سے پکڑ لیا، اس پر بُوا نے مجھے اپنے قدموں
میں سے اُٹھا لیا۔ میں نے دیکھا گھونگھٹ میں ان کی آنکھیں
روتے روتے سوج گئی تھیں۔ انھوں نے میری ٹھوڑی اپنے
ہاتھ میں لی اور میرے مُنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،
"پرمود، تو میری بات نہیں مانے گا؟ مجھے جانے دے بھیا۔
میں جلدی آجاؤں گی۔"
بُوا کے چہرے پر آنسوؤں کے موتی بکھرے پڑے تھے۔
ان موتیوں نے میری ضد کو موم بنا کر پگھلا دیا۔ میں نے
پوچھا۔
"جلدی آجاؤ گی"؟
"جلدی آؤں گی۔"
"میری قسم کھاؤ۔"
"اپنے پرمود کی قسم"
پاس ہی ماں کھڑی تھیں۔ اُن کا مُنہ بھی سُتا ہوا تھا۔
اُسے دیکھ کر جی میں آیا کہ کیوں نہ میں اُن کے گلے لگ جاؤں
اور چیخ کر کہوں "ماں، میری ماں" اتنے میں بُوا نے میرے
ہاتھ میں ایک ریشم کا رومال تھما دیا اور دوسرے لمحے خود
تیزی سے چل دیں۔ میں سنبھلنے بھی نہ پایا کہ وہ دروازے کے
آگے سے روانہ ہو گئیں۔

۵

بُوا کے چلے جانے کے بعد گھر سے میرا دل بالکل اُچاٹ
ہو گیا۔ ماں مجھے سمجھاتی تھیں اور کبھی کبھی میں بھی ماں کو سمجھایا
کرتا تھا۔ لیکن شادی کی دھوم دھام کے بعد گھر کی خاموشی
کاٹنے کو دوڑتی تھی۔
چوتھے روز بُوا آ گئیں۔ شادی کے وقت میں نے [illegible]
دیکھا تھا لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ عمر بھی کافی [illegible]

اچھے خاصے گرانڈیل تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بوا کی دوسری شادی تھی۔ ہماری بوا انکے سامنے بالکل بچہ سی معلوم ہوتی تھیں۔ سسرال سے وہ جب آئیں تو میرے لئے طرح طرح کی چیزیں لے کر آئیں۔ مجھے الگ لے جا کر کہنے لگیں۔

"پرمود۔ دیکھے گا میں تیرے لئے کیا کیا لے کر آئی ہوں"؛

لیکن میں اُن چیزوں کا بہت آرزو مند نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ بوا مجھ سے باتیں کریں جس طرح پہلے ہر سکھ دکھ کی بات کرتی تھیں اب بھی بتائیں کہ سسرال میں اُن پر کیا گزری۔؟ چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے؟ طبیعت بجھی بجھی سی کیوں ہے۔ دیکھو! بوا میں وہی پرمود ہوں — میں اب بچہ نہیں رہا۔ ذرا کہہ کر دیکھو میں تمہارا سارا دکھ سمجھ لونگا۔ میں اب زور دکر ناک میں دم کرنے والا بچہ نہیں ہوں جس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہوگی میں اس کی طبیعت درست کردونگا۔

یہ چیز ویز مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

مجھے اپنے دل کا حال نہیں بتاؤ گی بوا!

میں بغیر لب ہلائے یہ سب کچھ اُن سے کہہ دینا چاہتا تھا

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولیں "کیوں رے، اپنی چیز نہیں لے گا۔؟ چپ کیوں ہے"؟

میں نے ان کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا، دکھاؤ"

بوا حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر پوچھا "یہ تو کیسے بول رہا ہے،

ہوا کیا ہے تجھے؟"

میں نے کہا، کچھ نہیں"

"پھر کیا بات ہے"؟

میں نے کہا" تم مجھے پہلے جیسا اب نہیں چاہتی ہو"

شاید انھیں یہ بات لگ گئی۔ بولیں "یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟

اگر پہلے جیسا نہیں چاہتی تو اب کیسا چاہتی ہوں؟ تو مجھے غیر سمجھتا ہے"؛

شاید اس کی انھیں توقع نہ تھی۔ وہ بہت اداس

سکے لئے مچلے جذبات کے ساتھ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں،

پرمود، سچ تو یہ ہے کہ میں ہی پرائی ہوگئی ہوں۔ تم سب لوگوں کے لئے غیر ہوگئی ہوں۔ تیری ماں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دھکا دے کر غیر بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں مجھے بھیجا گیا ہے پرمو، وہاں کا میرا دل نہیں۔ تو ایک کام کرے گا۔؟"

میں بے چین اور مشتاق نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

چاہتا تھا کہہ دوں کہ اگر تمہارا کام نہیں کروں گا تو پھر پرمود بن کر میں نے یہ جنم پایا ہی کیوں ہے؟

"کرے گا"؟

دوبارہ یہ سوال سن کر میں بڑی سرعت سے انکی گود سے اُٹھ بیٹھا۔

اور کہا۔ کہو، بوا؟ ابھی کروں گا"

وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں، پھر کسی قدر خفیف ہو کر بولیں،

"نہیں نہیں، کچھ نہیں"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سچ کہو بتاؤ بوا، میں ضرور کروں گا"

"شیہکے جائے گا"؟

"جاؤں گا"!

"جا کر کیا کرے گا"؟

میں سوالیہ نشان بنا انکی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولیں

نہیں، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ کوئی کام نہیں"

اس کے بعد اپنی لائی ہوئی چیزیں زبردستی مجھے دکھلانے لگیں

ان چیزوں میں ایک بندوق بھی تھی۔ بندوق مجھے بہت پسند آئی

بوا نے دریافت کیا۔ "بندوق تجھے بہت اچھی لگی ہے"؟

میں نے کہا۔ بندوق سے کوؤں کو ماروں گا، یہ کوے مجھے بہت برے لگتے ہیں"

بوا بولیں "بندوق سے آدمی بھی مر جاتے ہیں، سامنے میں کھلونا لائی ہوں۔ مرنا کسے کہتے ہیں، تو جانتا ہے"؟

"جانتا ہوں۔"

مر جاتا کیا ہے؟

"مر کر آدمی — بس مر جاتا ہے۔"

تو اچھل پڑیں۔ لیکن پھر جلد ہی خاموش ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔

"میں مر جاؤں تو کیا کرے گا تو۔۔؟"

جواب میں میں انھیں گھورتا رہا۔ میں کہہ دینا چاہتا تھا کہ میں اب بچہ نہیں ہوں۔ اس قسم کی ساری باتیں جانتا ہوں۔ گستاخی معاف! یہ باتیں اچھی نہیں ہیں۔ اگر وہ مر سکتی ہیں تو کیا میں نہیں مر سکتا۔ میں بڑے آرام سے مر سکتا ہوں۔ انھیں معلوم نہیں کہ میں کس آسانی سے مر سکتا ہوں۔ میں انکے بعد زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب تک زندہ ہوں دیکھوں گا کہ انھیں کون مار آتا ہے!

اگلے دن ایک پرچہ دے کر انھوں نے مجھے شیلا کے یہاں بھیجدیا۔ میں شیلا کو جانتا تھا لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ اس کے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں۔ پرچہ صرف انھیں کے ہاتھ میں دینے کے لئے کہا گیا تھا۔ شیلا کے بڑے بھائی مجھے بہت اچھے لگے۔ لیکن پرچہ لے کر وہ ایسی سوچ میں پڑ گئے کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں انکے پاس کھڑا ہوں۔ میں نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ لیکن جلد ہی وہ لوٹ آئے۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز سے مجھے گود میں لے لیا، رخساروں پر بوسے دیئے، کندھے پر بٹھایا اور نہ جانے کتنی قسم کی چیزیں مجھے دے ڈالیں۔ شیلا بھی مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں سوچنے لگا کوئی بہانہ ملے تو میں روز یہاں آیا کروں۔ اتنی دیر میں شیلا کے بھائی نے ایک خط لکھ کر میری جیب میں رکھدیا۔ کہنے لگے: "تمہارا نام پرمود ہے نا! بڑے بہادر ہو تم" یہ کہہ کر مجھے پھر زمین سے بہت اوپر اٹھا کر چوم لیا، پھر بولے۔

"یہ خط اپنی جیا کو دے دینا۔ دو گے نا"!

اگر ماں کے لئے خط ہوتا تب بھی میں پہلے بُوا ہی کو دیتا اور اب تو خط ہی بُوا کے لئے تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا خاموش ہو رہا۔

شیلا کے بھائی نے میرے کوٹ کی دونوں جیبیں چاکلیٹ سے بھر دیں اور کہا۔

"۔۔۔ کونسی کلاس میں پڑھتے ہو۔"؟

"ساتویں میں"

"بہت خوب۔ پرمود، جاکر کہنا کہ میں ابھی ایک مہینہ یہاں اور رہوں۔ سمجھے نا؟"

میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"کیا سمجھے"؟

"۔۔۔ میں ایک مہینہ یہاں اور رہوں۔"

شیلا کے بھائی اس پر خوب ہنسے۔

"تم نہیں بھائی — میں، میں، میں۔"

دیا ہوا خط لفافہ میں بند نہ تھا۔ اور اسی طرح بُوا نے بھی کاغذ موڑ کر دیدیا تھا۔ لیکن شیلا کے بھائی مجھے اتنے اچھے لگے کہ میں انکی تحریر کی خوبصورتی بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے حروف مجھے بڑے پیارے معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کبھی اتنی اچھی انگریزی لکھ سکوں گا یا نہیں خط کے اوپر ایک کونے میں "مائی ڈیر" تو مجھے اتنا اچھا معلوم ہوا کہ بہت دنوں تک اپنے خطوں میں بالکل اسی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ گھر آکر میں نے خط بُوا کے حوالے کر دیا۔ اور فوراً ہی کھول کر انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کوئی بہت لمبا چوڑا نہ تھا، پھر بھی وہ کئی منٹ تک اسے پڑھتی رہیں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ یہ کام میں نے کیا تھا۔ میری بھی کچھ اہمیت ہے، اور میں پاس ہی کھڑا ہوں۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے اس پرچے سے نظریں ہٹائیں۔ پرچے کو آہستہ سے تہ کیا اور میری طرف دیکھا، اس طرح جیسے مجھے پہچان نہ رہی تھیں، جیسے سب کچھ بھول گئی تھیں کہ کیا تھا، کیا ہے اور کیا ہوگا —؟ پھر اسی کھوئے کھوئے انداز سے اس پرچے کے بہت سے ننھے ننھے ٹکڑے کر ڈالے۔ انکے ہاتھ مجھے مشین کی طرح تیز چلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کام وہ نہیں کر رہی تھیں، کوئی اور ہی کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ انکے حواس بحال ہوئے۔ گویا انھوں نے اب پھر کچھ کچھ دنیا کو سمجھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد بولیں "پرمود اب تو وہاں کبھی مت جانا، تم سے جواب لانے کو کس نے کہا تھا؟ کبھی کسی کا خط لانے کی ضرورت نہیں، سمجھا۔"

میں کچھ نہ سمجھا تھا۔

وہ بولیں: "تو اتنا ناسمجھ کیوں ہے پرمود، تو نہیں جانتا کہ میری شادی ہو گئی ہے۔؟"

میں نے کہا: "جانتا ہوں۔"

بولیں: "تو کچھ نہیں جانتا، تو گدھا ہے۔ میرے دل میں آگ جل رہی ہے۔۔۔!"

میں چپ رہ گیا۔

"۔۔۔۔۔ تو جانتا ہے دل کی آگ کیا ہوتی ہے۔"؟

دل کی آگ کو سچ مچ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس وقت ان کو دیکھ کر اور انکے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی اس مسکراہٹ کو دیکھ کر جو ایک پل میں غائب ہو گئی تھی، میرا دل بھر آیا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح میں انکے کام آ جاؤں، کوئی ایسا کام کروں کہ ان کا جی ہلکا ہو جائے۔ اور کچھ نہیں تو انکے گلے لگ کر رو ہی پڑوں۔

انھوں نے کہا: "دیکھ پرمود، شیلا کے بھائی کا کوئی پیغام آیا تو میں چھت سے کود پڑوں گی۔ سمجھے۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے؟"

میں کہنا چاہتا تھا کہ شیلا کے بھائی نے کہا ہے کہ ابھی ایک مہینہ وہ یہاں اور رہیں گے اور یہ کہ وہ مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن انھوں نے موقع ہی نہ دیا۔ فوراً بولیں۔

"جا کر شیلا سے کہہ دینا، سچ کہتی ہوں میں مر جاؤں گی — مرنال کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔"

یہ انھوں نے اس طرح کہا کہ جیسے ابھی انھیں بہت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ابھی تو انھیں پورے طور پر سمجھنا بھی ہے کہ اس حالت میں انھیں مرنا ہی ہوگا۔ کسی قسم کا سوچ وچار اس کے علاوہ بیکار ہے۔

اس بار ہمارے یہاں انھیں چار پانچ دن ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد پھوپا آ کر انھیں سسرال لے جانے والے تھے۔ سسرال جانے کے لئے وہ رضامند معلوم نہ ہوتی تھیں۔ جوں جوں جانے کا دن نزدیک آتا جاتا توں توں ان کی نگاہیں بے بس سی ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاں دیکھتیں بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ جیسے انھیں کچھ دکھتا ہی نہیں تھا۔ بس جیسے دیکھتی تھیں جن کے لکھے کو پڑھنا بہت مشکل ہے۔ وہ سر سے پیر تک سوال بن گئی تھیں، انکا چہرہ، ان کی نگاہیں نہ جانے کس سوال کا جواب پوچھنا چاہتی تھیں۔

اگلے روز پھوپا آنے والے تھے۔ رات کو انکی طبیعت گری گری سی ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے میں ایک کھردرے تخت پر بیٹھی تھیں۔ مجھ سے بولیں: "پرمود، کل میں چلی جاؤں گی۔"

میں کچھ نہ بولا۔ سر داب رہا تھا۔

کہنے لگیں: "بس، اب رہنے دے۔"

میں نے کہا: "درد تو تم کو ابھی نہیں ہوا۔"

اس پر مجھے مسلسل کئی منٹ تک دیکھتی رہیں۔ کچھ رک کر بولیں: "ایک کام کرے گا پرمود۔ شیلا کے بھائی ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ دوا کا نام لکھے دیتی ہوں، تو ان سے لے آئے گا"؟

میں کیوں نہ لے آتا۔ انھوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر انگریزی میں کچھ لکھ دیا۔ اور میں اسے لے کر دوڑ گیا۔ لیکن اس پرزے میں نہ جانے کیا تھا کہ شیلا کے بھائی اسے پڑھ کر مجھے مارنے پر تل گئے۔ دھمکا کر پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

"بوا نے دوا منگائی ہے۔"

"دوا؟"

"ہاں، دوا۔ ان کے سر میں درد ہے۔"

شیلا کے بھائی نے آگے کچھ نہ کہا۔ وہ تیزی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ کاغذ تڑ مڑ کر انکے ہاتھ میں گولی ہو گیا۔ اس کاغذ کی گولی پر انکی مٹھی سخت ہو گئی، اتنی سخت کہ انکے ہاتھ کا تناؤ دیکھ کر میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال پیدا ہونے لگے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے ہمت کر کے پوچھا: "میں جاؤں؟"

شیلا کے بھائی رک گئے۔ مجھے دیکھ کر نرمی سے بولے: "میں چل کر انکی طبیعت کا حال دیکھ نہیں سکتا ہوں؟ پرمود، مجھے لے چلو گے؟"

میں نے کہا: "نہیں۔ بی بی چھت سے کود کر مر جائیں گی۔"

اس پر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے پوچھا: "دوا نہیں دیجئے گا؟"

انھوں نے جیسے مجھے للکارا: "دوا؟"

"نہیں دیجئے گا تو میں جاؤں؟"

اس پر انھوں نے اپنی چٹکی سے اس کاغذ کی گولی کر کھولا اور اس چھوٹے سے پرزے کے اور بہت سے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ان سب کی گڑمڑ ای کر کے میری طرف پھینک کر کہا: "یہ ہے دوا، لے جاؤ!"

اس کے بعد مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔ اگلے روز پھوپا آئے میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں انکے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ بوا کی طبیعت اب اور گر گئی تھی۔ لیکن شکایت کوئی خاص نہ تھی۔ پھوپا نے سفر کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ بوا کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہاں سے تین سو میل دور ہی تو جانا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، ضرورت ہوئی تو راستے میں ایک دو جگہ رک جائیں گے، ڈاک بنگلے جگہ جگہ ہیں ہی۔ چچا جی مطمئن رہیں کہ پھوپا ہماری بوا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔

چچا جی نے کہا: "اچھا، اچھا۔ لیکن ....!"

پھوپا نے کہا: "جی! آپ بے فکر رہیئے۔ انھیں تکلیف کسی قسم کی نہ ہوگی۔"

چچا جی نے کہا: "میرا مطلب ہے کہ اس کی طبیعت ذرا..."

پھوپا نے کہا: "یہاں کی آب و ہوا کسی قدر ..... ذرا تبدیلی چاہیئے۔ ستمبر شروع ہوا کہ کشمیر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ستمبر اکتوبر کشمیر کے سب سے خوشگوار مہینے ہیں۔ گل مرگ کی ہوا وہ ہے ......"

اگلے دن پھوپا پورے انتظام اور ٹھاٹ سے بوا کو لے گئے۔

(۱۴)

کچھ دن بعد ہم لوگوں کو ادھر پورب کی طرف آنا پڑا۔ میں ہائی اسکول میں داخل ہو گیا اور اگلی جماعت میں پہنچ گیا۔ بوا کے خط بہر حال آتے تھے لیکن بڑے مختصر ان سے معلوم ہوتا کہ بوا اچھی ہیں، خطوں اور

کچھ نہیں لکھا۔ بابو جی سے بوا کے متعلق کچھ پوچھتا تو وہ خاموش ہو جاتے۔ وہ اس بارے میں کچھ خوش نہیں تھے۔ میں کچھ سنا تھا۔ میں کہتا "بابو جی" مجھے بھیج دیجئے کہ میں بوا کے پاس ہو آؤں۔ وہ کسی قدر دلچسپی لیتے اور پوچھتے، "تو جائیگا" ؟ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی اور کہتے تو کیا جائیگا کہاں جائیگا! مرنال تو اپنے گھر کی ہے۔ گھر پر خوش رہے۔

شادی کو آٹھ دس مہینے گذر چکے ہوں گے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بوا ایک نوکر کو ساتھ لئے چلی آ رہی ہیں۔ چچا جی کو ان کی یہ حرکت کچھ کچھ اچھی بھی نہیں لگی ۔۔۔ ماں نے ناراضگی یا خوشی کا کچھ اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ٹھال ڈھال کر پھوپا کو ساتھ سرد و گرم کہہ کر بوا کی آسائش کی۔ میرے پر لے دن لوٹ آئے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ بوا میں بڑی تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ ان کی طبیعت کو قرار نہ تھا۔ ابھی خاصی ہنسی خوشی بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ کہ یکایک کچھ سوچ کر فوراً سنجیدہ ہو جاتیں اور کمرے میں جا اکیلی پڑ رہتیں۔ ان کی تندرستی بھی اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ تمام جسم پیلا پڑ گیا تھا اور ایک دن میں نے سنا کہ انھیں حمل ہے۔

ان کی طبیعت اکثر مالش کرتی۔ کھانا پینا کچھ اچھا نہ لگتا کسی بات اور کسی کام میں دلچسپی نہ لیتیں۔ میں نے ایک دن تنہائی میں پوچھا۔ "اب تو یہیں رہو گی نا۔

بوا، جلدی تو نہیں جاؤ گی؟"

بوا نے کہا: "نہیں جاؤں گی ۔۔ لیکن تو آنے جانے کی بات کیوں کرتا ہے۔ !

اپنے پڑھنے لکھنے کی بات کیا کر!" یہ کہتے کہتے انکی آنکھیں نہ جانے کیسی ہو گئیں۔

آواز سانپ کر رک جانا چاہتی تھی۔

میں نے اپنے طور پر نہ جانے کیا سمجھ کر کہا "تو بوا، پھر وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں جانے دوں گا۔"

بوا نے کہا، "بھلا کیسے نہ جانے دو گا؟"

"بس کہہ دیا نہیں جانے دے گا۔"

بوا طنز سے ہنسی۔

"تو روکنے کی بات کرتا ہے۔ تو پہلے ہی کیوں نہ روک لیا"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بے بسی نے ان کے چہرے پر جیسے دھواں اُڑا دیا۔ مجھے دیکھ کر جوش آ گیا۔ "بوا، کیوں نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھوں تو پھوپا کیسے لے جاتے ہیں۔"

بوا بولیں، "بہت بہادر بنتے ہو پرمود۔ لیکن اس کے متعلق کیا بات کچھ نہ پوچھو گے۔ اب بوا یہاں کی نہیں ہے، وہاں کی ہے۔ اپنے پھوپا کی چیز کو چھیننے والے بھلا تم کون ہو؟"

میں ان ساری باتوں کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن ان کی آواز کا درد اور اضطراب مجھ سے کچھ کہتا ضرور تھا۔ اتنا میں سمجھ ہی گیا تھا کہ سسرال کا ذکر آتے ہی انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کیا پس و پیش ہے۔

میری سمجھ میں یہ آتا تھا۔ وہ جگہ پسند نہیں ہے۔ وہاں نہ جائیں۔ بس

لیکن جس آسانی سے میں بس کہہ دیتا تھا، بات اتنی آسان نہ تھی۔ یہ میں آج جانتا ہوں۔ شادی کا رشتہ صرف دو کے درمیان نہیں ہے۔ اس کا تعلق سماج سے بھی ہے۔ یہ رشتہ چاہنے سے کیا ٹوٹ سکتا ہے؟ اس کی بنیاد محض جذبات پر ہی نہیں ہے بلکہ سماج پر بھی اس کی بنیاد ہے۔ یہ سوال اس طرح ٹالے ٹل سکتا ہے؟

وہ گرہ ہے کہ بندھ جائے تو کھل نہیں سکتی۔ کوشش کی جائے تو ٹوٹ سکتی ہے لیکن ٹوٹنا کس چیز کا اچھا ہوتا ہے؟

لیکن آٹھویں جماعت کا طالب علم بھلا یہ باتیں کیسے سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے پورے اعتماد سے بوا کو یقین دلایا کہ وہ یہیں رہیں گی۔ "دیکھوں کون ہوتے ہیں پھوپا جو تمہیں لے جائیں؟ کیوں سوچ سوچ کر اپنی جان گھلاتی ہو بوا؟ تمہیں آخر فکر ہے کیا؟ پرمود بڑا ہو کر خوب کمائے گا، تمہاری خوب خدمت کرے گا، تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔"

بوا کو میری باتوں سے بالکل بھی تسلی نہ ہوئی، یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے چہرے پر کیا فوراً اطمینان کی جھلک سی آ گئی تھی۔ آہستہ سے ہنس کر بولیں،

"تو ایسا بہادر ہے رے پرمود تو پھر فکر کیا ہے۔ کیوں، اچھا اب یہ بتا کہ تو پڑھنے میں کلاس میں اول ہے یا نہیں؟"

اول یا چھٹا کیسے ہوتے ہیں مجھے اس وقت دلچسپی نہ تھی۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ بوا کے دل میں اب کوئی [illegible] نہیں رہا۔ میں نے پوچھا،

"سچ سچ بتاؤ بوا، تم وہاں جانا چاہتی ہو یا نہیں؟"

"سچ بتاؤں؟"

"ہاں، بالکل سچ سچ۔"

بوا نے ہنس کر کہا، "کیوں بتاؤں سچ سچ؟"

میں نے ناراض ہو کر کہا، "نہیں بتاؤ گی؟"

بولیں، "اچھا بتاتی ہوں۔ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں رکھے گا؟"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے یوں دیکھا کہ میں جھینپ گیا۔ مجھے کھینچ کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر ایک دم مجھے چونکا کر بولیں، "ایک بات بتا۔ تجھے بید کھانا اچھا لگتا ہے؟"

میں نے کہا، "بید؟"

بولیں، "میں ایک بار تجھے بید سے پیٹوں گی۔ دیکھوں گی تجھے اچھا لگتا ہے یا برا؟"

بوا کے بات کرنے کا انداز کچھ عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "بوا، یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

بولیں، "سچ کہتی ہوں پرمود، یہ باتیں میں نے کسی سے نہیں کہیں۔"

"بس تجھ سے کہی ہیں۔ بید کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہاں نہ وہاں۔"

میں تعجب میں رہ گیا۔ "بوا، کیا کہتی ہو بوا، وہ مارتے ہیں؟"

"ہاں مارتے ہیں۔"

"بید سے مارتے ہیں؟"

"ہاں بید سے مارتے ہیں۔"

"کیوں مارتے ہیں؟"

"میں خراب ہوں نا، اس لئے۔"

یہ سن کر دہل گیا [illegible] آنکھیں [illegible] چہرے کی طرف نظر نہ اٹھا سکا۔ جذبات سے مرعوب ہو کر [illegible] پہلو میں چھپا لیا [illegible]

اور دھیرے دھیرے ان کی پیشانی تھپک کر کہوں "یہ سب بھول جاؤ بی۔ اچھا بُرا سب بھول جاؤ۔ ایسی بھی جگہ ہے جہاں کوئی خراب نہیں، جہاں کوئی بید نہیں۔ ہم دونوں وہیں چل کر رہیں گے۔"

یہ سوچتا رہا اور میں اُن کے ہاتھ سے لپٹا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ بوا کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک آدھ قطرہ بھی مجھ پر گرا۔

مجھے ساری باتیں تو یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ پتا جی اور پھوپھا میں کچھ خط و کتابت ہوئی تھی جو کافی عرصے تک جاری رہی۔ تین مہینے بوا ہمارے یہاں رہیں۔ آخر میں فیصلہ ہوا کہ پھوپھا انہیں لے جا سکتے ہیں۔ پتا جی شاید اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ اگر آئندہ وہ پھوپھا کی مرضی کے بغیر چلی آئیں تو وہ اپنے گھر میں جگہ نہ دیں گے۔

پھوپھا نے پتا جی کے سامنے بوا پر کچھ الزامات بھی لگائے تھے جن کو انھوں نے معافی مانگ کر واپس لے لیا تھا۔

ایک بار میں بابوجی کے پاس تھا۔ بوا آئیں اور خاموش بابوجی کے پاس بیٹھ گئیں۔ بابوجی نے کہا "مرنال! کہو طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"یہاں شاید تمہارا دل نہیں لگتا معلوم ہوتا ہے۔"

بوا خاموش رہیں۔

"سُسرا کی چٹھی آئی ہے۔ اتوار کو آ رہے ہیں۔ پانچ روز ہیں۔ منی دیکھو اب ایسی غلطی مت کرنا۔ وہ بھلے آدمی ہیں، اس سے بات بن بھی گئی۔ نہیں تو بیٹیا!

ایسا کیا کرتے ہیں، تھوڑا بہت جھگڑا ہوتا ہی ہے۔ لیکن پھر پتی کے گھر کے علاوہ استری کو اور کیا آسرا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے مرنال کہ پتنی کا دھرم یہی ہے۔ اس کا گھر صرف پتی کا گھر ہے۔ اس کا دھرم کرم اور نجات سب وہی ہے۔ سمجھتی تو ہو نا بیٹیا۔"

کہتے کہتے ان کی آواز معذرت خواہ ہو گئی۔ بوا اب بھی چپ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر پتا جی نے کہا، "کہو کہو، مرنال، تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

بوا نے کہا "میرا جی اچھا نہیں رہتا۔ میں ابھی جانا نہیں چاہتی۔"

"ابھی نہیں جانا چاہتی ہو؟"

بوا خاموش رہیں۔

"لیکن وہ تو کبھی کے لے جانا چاہتے ہیں۔"

بوا اب بھی چپ رہیں۔

بابوجی اس خاموشی پر کچھ مضطرب ہو گئے۔ انھوں نے پہلے تو میری طرف دیکھ کر کہا۔ "جاؤ، پرمود اپنا سبق دیکھو۔" میں فوراً نہیں اٹھا تو خفا ہو کر بولے، "سنتے نہیں ہو — جاؤ!" میں کمرے سے باہر ضرور آ گیا لیکن دبک کر کھڑا ہو گیا۔ پتا جی نے کہا، "سنو مرنال، ابھی بھیجنا میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری حالت نازک ہے۔ لیکن تمہیں بتاؤ میں کیا کروں؟"

بوا کچھ نہ بولیں۔

بابوجی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر تک وہ بھی نہیں بولے پھر کہنے لگے "منی، سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" یہ کہہ کر رک گئے۔ بوا چپ رہیں تو پھر ٹہلنے لگے۔ پھر یکایک رک کر بولے، "مرنال! میں دیکھتا ہوں تمہیں تکلیف ہے۔ لیکن بتاؤ گی نہیں تو میں کیسے جانوں؟ میں کیا کروں گا؟ منی! تجھے پتا جی تو کیا یاد ہوں گے۔ ابھی تو ننھی سی تھی کہ پتا جی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ اور ماں تو اُن سے بھی پہلے چل بسی تھیں۔ اب تو ماں، باپ، سب کچھ تیرے لئے میں ہی ہوں۔ مجھ سے نہ کہے گی اور کس سے کہے گی؟ مرنال بیٹیا! سچ بتا کیا بات ہے۔"

بوا نے کہا "کچھ بھی بات نہیں بابوجی، لیکن میں جانا نہیں چاہتی۔"

"جانا نہیں چاہتی ہو۔ یہ تو میں دیکھتا ہوں، لیکن بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟"

"اور کب تک نہیں جاؤ گی؟"

"بالکل نہیں جاؤں گی۔"

بابوجی نے زچ ہو کر کہا "تو کیا کرو گی؟"

"آپ نکال دیں گے تو یہاں سے بھی نکل جاؤں گی۔"

"بابوجی کو غصہ آ گیا۔ "کہاں نکل جاؤ گی؟"

جہاں پتاجی چلے گئے ہیں۔ کوئی راہ بتائے تو میں بھی وہیں چلی جاؤں۔"

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ البتہ پتاجی کے قدموں کی چاپ ضرور سنائی دیتی رہی۔ وہ ایک بار کھانسنے کی آواز بھی آئی جیسے کچھ گلے میں بھرا آ رہا ہو۔ چند لمحوں تک میں بھی اور سننے کا منتظر رہا۔ لیکن پتاجی کے قدموں کی چاپ، کھانسی اور سرد آہوں کے علاوہ میں اور کچھ نہ سن سکا۔ آخر میں وہاں سے کھسک آیا۔

اس کے بعد میں نے بوا سے پوچھا "بوا! پتاجی کیسے کو کہتے ہیں؟"
بوا نے ڈپٹ کر کہا "چپ رہا کرو جی، پرمود! اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

ان کا یہ اچانک غصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ردعمل کے طور پر میں بھی اس دن الگ الگ رہا۔ لیکن سرِ شام مجھے سینے سے لگا کر پھر رونے لگیں،
اور بولیں، "تو روٹھ گیا پرمود؟"
تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگیں "بابوجی مجھے بھیج رہے ہیں چلی جاؤں؟"
میں کیا کہتا۔؟
انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا "مجھے چلا جانا چاہیئے۔
کیوں پرمود؟"
مجھے خاموش دیکھ کر بولیں، "اچھا جانے دو اس بات کو۔ یہ بتا میں چلی گئی تو مجھے یاد کرے گا؟"
اس بار میں نے کہا "بوا! میں تمہارے پیچھے تمھیں بہت یاد کرتا تھا۔"
"میں مر جاؤں، تب بھی یاد کرے گا؟"
اب مجھے سمجھ آ گئی تھی۔ "بوا! بوا! ایسی باتیں مت کرو۔ میں نہیں سننا چاہتا۔"
"اچھا ایک بات بتاؤ۔ جب بڑا ہو جائے گا اور میں بلاؤں گی تو آسکے گا؟"
"فوراً آؤں گا۔"
"کسی بھی حالت میں میں ہوں، تو آسکے گا؟"
"ہاں! آؤں گا۔"

تو سن، میں کہتی ہوں تو نہیں آئے گا۔ تجھے بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں تم سب لوگ مجھے بھول جانا۔ میں یہاں سے گئی یا مری، برابر ہی ہے۔
اس کے بعد میں تم لوگوں کو بالکل تکلیف نہیں دوں گی۔"
تھوڑی دیر بعد پلٹ کر مجھ سے پوچھا، "تو جانتا ہے پتی کا گھر کیا ہوتا ہے؟"
میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔
"سورگ ہوتا ہے۔"
میں نے مان لیا کہ ہاں ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے اس آسانی سے مان لینے سے انھیں کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ بولیں، "وہ سورگ ہی ہوتا ہے جس کے لیے ایسا نہیں ہوتا، وہ بدقسمت ہے۔"
مجھے خاموش پا کر وہ پھر بولیں، "جانتا ہے سورگ کیا ہوتا ہے؟"
پھر خود ہی جواب دیا، "سورگ بڑے آرام کی جگہ ہوتی ہے۔ وہاں دیوتا رہتے ہیں۔"
اگلی صبح ان کی حالت بہت سنبھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ماں سے انھوں نے کہا کہ دھوبی سے کہہ دیں کپڑے اتوار تک آ جائیں کیونکہ مجھے جانا ہے۔ دو چار چیزیں بھی مجھے بازار سے منگوانا ہیں۔ اس وقت وہ اپنا سامان رکھنے رکھانے میں بڑی مصروف نظر آتی تھیں۔ ایک بکس میں سامان نکال کر دوسرے میں رکھ دیا گیا۔ کتابیں سب نکال کر علیحدہ رکھ دی گئیں۔ کہنے لگیں۔ کتابیں اچھی نہیں ہوتی۔ انھیں "لے جا نہیں سکتیں، ان سے وقت برباد ہوتا ہے۔
نہیں۔ اس بار کچھ نہیں۔ نہ نئی، نہ پرانی۔
دوپہر تک وہ اسی طرح مصروف رہیں۔ لیکن کھانا کھا کر جو لیٹیں تو سر میں درد شروع ہوا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا بوا؟ تو بولیں۔
"سر میں درد ہے۔"
"ماتھا دابے دوں؟"
"نہیں۔"
"بام لگا لیجیے۔"
"نہیں۔"
"لیڈی ڈاکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں۔"
"ارے نہیں، نہیں، نہیں۔"
معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے انھیں سخت تکلیف ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہوجاتی ہے

میں نے کہا، ڈاکٹر...؟"
بولیں، کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں۔"
میں نے پوچھا "پھر.....؟"
بولیں "سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

درد بڑھتا ہی گیا۔ جیسے جیسے پیٹ کے درد کی شدت بڑھتی تھی وہ تڑپتی تھیں۔ لیکن کسی کو پاس بلانا منظور نہ تھا۔ گھنٹوں پڑی رہیں۔ میں کئی بار باجی کو اطلاع دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن بوا نے ایسا مجبور کیا کہ میری ہمت نہ ہوئی۔ اب ان کے پیٹ میں بڑی تکلیف معلوم ہوتی تھی۔ درد رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ جیسے کوئی پیٹ میں بیٹھا ہوا ٹانگ رگڑ رگڑ کر آہستہ آہستہ مروڑ رہا ہو۔ درد سے بے چین ہو کر ان کا چہرہ [illegible] ہو جاتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کر لیا اور کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ میں کہنے کے لئے جانا چاہتا تو وہ اپنی قسم کھلا کر روک لیتیں۔ یہ ہوا اگر کیا تو مجھے میری صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہو۔

"میں نے کہا کہ پھر کیا ہو؟"
"پیٹ کا درد ہے۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائیگا۔"
"دیکھو اگر بازار جانا ہو تو جمال گوٹہ لیتے آنا۔ یاد رہے گا نا۔
جمال گوٹا۔"

میں اب بوا کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔ پوچھا "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

درد کی حالت میں بھی وہ مسکرائیں اور کہا "تو اب سمجھدار ہوتا جاتا ہے۔"

"پر ہو لیکن وہ [illegible] کی چیز نہیں ہوتی ہے آ جائیگا۔"
میں نے پوچھا "اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔؟"
"ہاں ہو جائیگی۔ جائیگا؟"

جمال گوٹے کے استعمال سے ان کی جو بری حالت ہوئی تھی وہ [illegible] ہے۔ ماں اور باجی دونوں پریشان ہو گئیں۔ میں نے مارے ڈر کے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ دل میں اندیشہ تھا کہ کہیں حمل نہ جاتا رہے۔ حمل تو نہ گرا لیکن اور سب کچھ ہو گیا۔ تین دن میں بوا کا [illegible] نکل آیا۔ انکو دیکھ کر دل بھر آتا تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ [illegible] حد پار کر کے [illegible] کا روپ دھار لیتا ہے! میں ان دنوں آٹھ پہر [illegible] رہتا تھا بوا کو نہ جانے کتنی بار [illegible] رہی تھیں

بولیں "تو بھی مجھے ہی کہے گا یہ ہو جا۔"
"تم سے نہ کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا؟"
"اچھا اس سے بھیا تو بھی کہہ لے۔"

بوا نے مجھے اس انداز سے کہا کہ میری تمام خوش مزاجی اور ساری شوخی کافور ہو گئی۔

ندامت سے مجھے پسینہ سا آ گیا۔ کہا "لیکن بوا، یہ تم نے کیا کیا۔
کیا کیا؟"

"میں جانتا ہوں۔" یہ جھک کر یہی ہوا، صرف تمہاری وجہ سے ہوا۔ اس پر کچھ دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں، "کیا جان پر ہو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ سب کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں کیا جان بوجھ کر کرتی ہوں۔ یہاں کوئی بھی تو نہیں جو مجھے کچھ بتائے۔ اپنے دل کی بات کس سے کہوں؟ پر ہونی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ایسے میں تو بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہرائے گا تو میں کیا کر لونگی؟"

ان کی باتوں کے یہ معنے میں کسی طرح بھی حل نہ کر سکا۔ وہ درد کی لہروں میں ڈوبنے لگیں۔ میں نے پوچھا "بوا تم کیا چاہتی ہو؟"
"کیا چاہتی ؟"
"اپنی صحت کیوں برباد کرتی رہو؟"
"صحت کیوں برباد کرتی ہوں؟ میں نہیں جانتی۔ اچھا بتاؤ صحت کا کیا کروں؟"

میرے سوالات جھڑ رہی تھیں، ایسی تکلیف ہو رہی تھی جس کا ذکر ہرگز منظور نہ تھا۔ میں نے کہا "کیوں بوا، باجی سے ایک بار بات کیوں نہیں کہہ دیتی ہو۔" "دنیا کہا اور کس سے؟ پھر میں دیکھ لوں گی کہ کون زبردستی کرتا ہے۔"

بوا عجیب انداز سے مجھے گھورنے لگیں۔ پھر بولیں "کس سے کہدوں کیا کہدوں؟ کیسی ملعون بات؟ یہ سب تو کیا کہہ رہا ہے؟ پر ہو، تو ابھی کچھ نہیں جانتا، تو ابھی بچہ ہے۔"

اپنے کو بچہ محسوس کر کے میں نے بے عزتی سی محسوس کی۔ بولا۔ ہاں بچہ ہوں لیکن ایک بار تم کھل کر کہہ دو کہ تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کون پھر تمہیں لے جاتے ہیں؟ تم ابھی [illegible] اس وقت وہ نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو گئیں۔ بولیں "مجھو بھیا

"کہیں ایسی بات کہتے ہیں ؟ عورت ذات کیا اپنے گھر کی ہوتی ہے؟ میں کیا نرالی عورت ہوں —؟ پھر میرے تایا جی کہاں ہیں؟ وہ جھوٹے۔"

میں بے اختیار چلا اُٹھا "کون تایا؟ کیسے تایا؟ کیا کہہ رہی ہو۔"

"بوا! کیا بابوجی تمہارے نہیں ہیں؟ ماں نہیں ہیں؟ میں نہیں ہوں؟"

وہ آہستہ سے بولیں "کوئی نہیں ہے۔"

میں ان کے گلے سے لگ کر بولا "میں نہیں ہوں؟"

اُنھوں نے مجھے بانہوں میں جکڑ لیا۔ اور کہنے لگیں "تو ہے بھیا! تو ہی تو ہے۔ ورنہ میں یہاں پیٹ کا دوزخ بھرنے کیوں پڑی ہوتی۔"

اتوار کو پھوپا آگئے۔ بوا کی حالت دیکھ کر انہیں بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے اس جگہ کا پانی انہیں موافق نہیں آیا۔ دیکھیے نا کیا حالت ہو گئی ہے؟ آخر ہوا کیا تھا؟" "تین روز تک دست اور قے۔"

"اُف ... ڈاکٹر آیا تھا۔ کیا یہاں ڈاکٹر بھی سلیقے کے نہیں مل سکتے۔

ضلع کے سول سرجن....."

پھوپا بوا کی حالت دیکھ کر واقعی پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار ان کی بری حالت پر تبصرہ کرتے جس سے ان کی دلی بے چینی اور ذہنی خلفشار معلوم ہوتا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ بابوجی سے بولے "ایسی حالت میں مجھے تار کیوں نہیں دیا گیا؟ میں کچھ بندوبست کر دیتا ہمارے یہاں کا پانی اور گھی دودھ کیسا ہے، آپ جانتے ہی ہیں مثل مشہور ہے کہ گھی اور مرغیاں ... کیسی ہی گری طبیعت کیوں نہ ہو، وہاں دیکھتے دیکھتے سنبھل جاتی ہے۔"

بابوجی سے کوئی خاص جواب نہ بن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ محسوس کر رہے ہوں کہ انہیں کا قصور ہے۔ بس دو ایک بار بولے کہ "پھر حالت کمزور ہے، کچھ دن اور رک کر لے جائیں تو کیا مناسب نہ ہوگا۔"

لیکن کمزور حالت ہی کی بنا پر پھوپا کا فرض کچھ اور شدید ہوا جاتا تھا۔

"آپ کا یہ سوچنا کہ ایسی حالت میں انہیں یہاں چھوڑ جاؤں کہاں تک مناسب ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہاں پہنچ کر تھوڑے ہی دنوں میں ان کی طبیعت درست ہو جائے گی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے موٹے مرضوں کے لئے اتنی بھاگ دوڑ ان کی پرورش کرنا ہے۔ ان کا علاج ہی کا ایک علاج ہے بے فکری۔"

پھوپا نے پھر کہا "آپ نے انھیں سمجھا تو ہوگا ہی ہوگا۔ ذرا صحت کا خیال رکھا کریں۔ پھر دنیا کا بھی لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بہو بیٹیوں کی نیک چلنی ہی سب کچھ ہے۔ اپنے تو وہی پرانے عقیدے ہیں۔ ہماری تو ایک پرانی روایت چلی آتی ہے اگر وہی نہ بچی تو پھر کیا؟ ذرا یہ باتیں سمجھانی چاہئیں۔ میں تو اپنی طرف سے تھوڑا بہت کہہ دیتا ہوں۔ لیکن آپ جانئے آپ کی بات کا کہیں زیادہ اثر ہوگا۔"

میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا کیا سمجھتا ہوں گا کیا نہ سمجھتا ہوں گا۔ پھر بھی یہ باتیں مجھے کسی طرح بھی اچھی نہ معلوم ہو سکی تھیں۔ بے مطلب اور بے مقصد غصہ آ رہا تھا۔ جی چاہتا کہ بڑھ کر سب کچھ تلپٹ کر ڈالوں۔ اس کی وجہ تو کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن بابوجی کے چہرے پر ایک قسم کی افسردگی اور شکست خوردگی دیکھ کر میرے باغیانہ جذبات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ جانے کس چیز نے روک لیا کہ میں پھٹ نہ پڑا۔

بابوجی نے پھوپا کو جواب دیا "جی ہاں!"

فوراً ہی پھوپا میری طرف مخاطب ہوئے کہنے "جناب آپ کا اسم شریف —؟ اوہ، یاد آیا ہاں بھئی! پر بھئی نام تو اپنی جگہ ہے۔ مگر اس سے کسی کو کیا مطلب ہے؟" — میں کچھ نہیں بولا۔

"کس درجے میں پڑھتے ہو؟"

"اس چھ ماہی امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔"

"فیل ہو گئے ہو — بہت بری چیز ہے۔ لیکن کس جماعت میں؟"

میں چپ رہا — کیسا نالائق! نہیں بولتا۔

"گھبراؤ نہیں — کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"میں فیل ہونے سے نہیں ڈرتا۔"

اُنھوں نے بڑی نرمی سے کہا "فیل ہونے سے ڈرنا چاہیے بھائی! جو خود سے چل نکل کر پڑھتے ہیں وہی آگے چل کر کچھ نام کرتے ہیں۔ سمجھے؟ اچھا یہاں آؤ، آؤ، ہمارے پاس آؤ۔"

میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

بتاجی نے کہا، "جاؤ بیٹا! جاؤ۔ جواب دو۔"

اس پر میں سینہ تان پھوپھا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے دونوں کندھے پکڑ کر کہا "درجہ سات میں پڑھتے ہو، یا آٹھ میں؟"

"آٹھ میں۔"

"دیکھو، کلاس میں فیل نہیں ہونا چاہیے۔ اچھا بتاؤ! گنتی کہاں تک یاد ہے؟" یہ کہہ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

بات تو بُری تھی لیکن دل میں آئی کہ یہ گنتی سنانے دیں یا نہ دیں لیکن اگر میں انگریزی اور گنتی میں بھی کچھ پوچھیں تو کیسا رہے گا؟ بس اس کا جواب دینے میں اگر راضی ہیں تو پھر میں ہی انھیں اٹھنی دینے والا تھا۔

پھوپھا نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا "بولو کونسی لوگے؟"

میں دیکھتا رہا۔ جواب کچھ نہ دیا۔

"جلدی بتاؤ ورنہ دونوں کا مال اڑ جائیگا، اور پھر دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"آپ کو چاہیے تو دونوں میں آپ کو دے سکتا ہوں۔"

وہ جھینپ گئے اور کھسیانی ہنسی ہنس دیے۔ ان کی جھینپ اور کھوکھلی ہنسی نے میرے اندر ایک طرح کا بڑائی کا احساس پیدا کر دیا۔ میں نے کہا۔

"میں آٹھویں درجے میں پڑھتا ہوں اور اس امتحان میں اول آیا ہوں۔"

پھوپھا اس پر پھر ہنسے، "ہو، ہو، ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ اور ان کی ہنسی کی گونج سے مجھے پتہ نہیں کیوں اور خوشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بتاجی کا بدلہ میں نے لے لیا۔ اگلے دن جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھ سے بوا نے کہا "پوتو، میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ جانے تم لوگوں سے کب مل سکوں گی۔"

میں نے سوچا کہ ان کے لئے مجھے مضبوط بننا ہوگا لیکن بوا کے سامنے آتے ہی میری سب مضبوطی ختم ہو جاتی تھی۔ بوا کی یہ بات سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ بڑی مشکل سے صورت دیکھتے ہی کہہ پایا "بوا، خط لکھتی رہنا۔"

بوا نے کہا "خط؟ دیکھو۔"

میں نے کہا، "ضرور لکھتا رہا۔ بلاؤ گی تو میں فوراً آجاؤں گا۔ ریل میں اکیلا سفر کر لیتا ہوں۔"

"تجھے نہ بلاؤں گی تو اور کسے بلاؤں گی۔ لیکن بیٹا تو اکیلا سفر کر کے مجھ تک پہنچ بھی سکے گا؟"

"ہاں ہاں، ضرور بوا، میں آؤں گا ——— بلاؤ گی تو سارے کام چھوڑ کے آؤں گا۔"

بوا نے میرے گال پر ہلکا سا چپت مارا اور بولیں، "پگلا کہیں کا۔" جاتے ہوئے بوا نے روتے ہوئے ماں کے پیر چھوئے اور سامنے کھڑی ہو گئیں۔ لیکن بولیں کچھ نہیں۔ ماں نے بے تاب ہو کر انھیں گلے لگا کر کہا، "منی! میں تجھے جلد ہی بلاؤں گی۔ وہاں اپنی گرہستی اچھی طرح سنبھالنا اور بچوں کو سکھی رکھنا۔ منی......"

ماں نے ایک ہی سانس میں انھیں بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ بوا گردن جھکائے سب سنتی رہیں۔ شوہر کی فرماں بردار رہنے، پوتوں بچوں، خوش قسمت ہونے وغیرہ کی دعائیں لیتے وقت وہ ایسی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں کہ اگر ان دعاؤں کے بوجھ سے دب کر کبھی مر جائیں تو امر ہو جائیں۔

بتاجی کے سامنے بوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بتاجی نے رومال نکال کر چہرے کو پونچھا۔ اور بے مطلب طریقے پر کہنا شروع کیا، "کیا ہے، کیا ہے؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ منی مت رو۔ ہشت، اکیلی ہو گئے ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے فوراً بوا کے سامنے سے چلے گئے۔ ساتھ جانے والی گٹھریاں، بکس، بستر اٹھوانے میں لگ گئے۔ ایسے ہی اور بہت کام ہیں جیسے فرصت کہاں رکھی ہے؟

میں نے عہد کیا تھا کہ میں کبھی نہیں روؤں گا، ہرگز نہیں روؤں گا۔ میں نہیں رویا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ میں کیوں نہیں کوئی حرکت کر رہا ہوں۔

بار بار خیال آ رہا تھا کہ اب تک میں کسی سے جھگڑا کیوں نہیں، خواہ مخواہ کسی نہ کسی سے الجھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ رہیں بوا، سو تو وہ جا ہی رہی تو جائیں۔ میرا ان سے کوئی مطلب نہیں۔ میرا کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ میں کیا سب سے نپٹ لوں گا اکیلا، بالکل

اکیلا۔ مجھ سے کوئی نہ بولے۔ میں بوا کو بھی یاد نہیں کروں گا۔ وہ کیوں جا رہی ہیں؟ میرے رہتے کیوں جا رہی ہیں؟

پھوپا آون بلا ہیں جو لے جا رہے ہیں؟ لیجاتے ہیں تو لے جائیں — جائیں کہیں ٹلیں تو — ایک بے نام سا خوف مجھے دبائے لے رہا تھا۔ نہ رونے دیتا تھا نہ کچھ کرنے دیتا تھا۔ اور پھر یہاں تک ہوا کہ بوا کی رخصت کے وقت جھنجھلا کر میں ابا کے کمرے میں بھاگ آیا اور اپنے آپ کو بند کر لیا۔ کواڑ بند کر لینے سے اندھیرا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ گم سم کمرے کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا' زلزلہ آ جائے گا' کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا' اور آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چاہتا تھا کہ سانس روک لوں۔ بے جان ہو جاؤں۔ دنیا میں رہوں ہی نہیں۔

اتنے میں ماں کی تیز اور چیختی ہوئی آواز آئی — پرمود پرمودا میں نہیں بولا — میں نہیں بولوں گا۔ پرمود کہاں ہے؟ کہیں نہیں —"

میں پرمود کو نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

"ارے پرمود! او بھیا پرمود!"

ماں کی آواز اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ میں وہیں سے کھڑے کھڑے چیخا: "کیا ہے؟ میں نہیں سنتا۔"

"کہاں ہے رے تو؟ تیری بوا بلا رہی ہے۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ بغیر بولے چپکے ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ باہر آ کر دیکھتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔ پھوپا کہہ رہے ہیں — جلدی کرو جلدی" بوا کھڑی ہیں' منہ پر گھونگٹ ہے۔ کیا میری ہی راہ دیکھ رہی ہیں؟ میں نے پاس آ کر کہا' بوا کیا ہے؟" وہ جھپٹ کر میرے گلے لگ گئیں۔ بلند آواز سے رونے لگیں۔

پھوپا نے کہا "ریل کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو چلو۔ کندھے سے لگے لگے ہی میں انہیں موٹر تک لے گیا۔ پھوپا نے بابوجی کو پرنام کیا اور موٹر میں جا بیٹھے۔ موٹر نے گھر گھر شروع کی۔ پھوپا نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا "آداب عرض ہے پرمود صاحب! میں خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں اب سانس لوں گا۔ بہت گھٹ چکا۔ میرا دل بڑا دکھی ہے یوں تو جب یہ شوخی ہے تو پوری بھی کرتی ہوگی۔ جینا جب تک کہ ایک بار موت آ کر رہا نہ کر دے جینا ہی رہتا ہے۔ پھر میں رہائی کہاں

لیکن میں ذرا سانس لینا چاہتا ہوں۔

یہ جو کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے ویسا ہی کیوں ہو رہا ہے مختلف کیوں نہیں ہوتا۔ اس کا کیا جواب ہے؟ جواب ہو یا نہ ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو مقرر ہے' وہی ہوتا ہے جو لکھا ہوا ہے۔ ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا۔ لکھنے والے نے جو لکھ دیا وہ نہ بدلے گا' مٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ ہے کون جس کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس گتھی کو بھی تو سلجھانا چاہئے۔

شاید نہیں۔ عقل مند کہہ گئے ہیں کہ وہ اس کائنات پر اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ سنتا ہوں تو رہوں کیسے؟ چاہتا تھا کہ پکار کر کہوں کہ اے کرشمہ ساز! تیری کرشمہ سازیاں میری سمجھ سے باہر۔ رونے بلکنے کی آواز چاروں طرف سے میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اے دنیا کے مالک! یہ سب کیا ہے۔؟ تیری بھرپور جاہل مخلوق میں یہ نالہ و فریاد کیسی؟ کرشمے تو دکھا رہا ہے' نیرنگیاں تیری نظر آتی ہیں' اور جیتے مرتے ہم ہیں — کیوں جیتے ہیں' کیوں مرتے ہیں؟ ہماری کوشش کیا ہے' ہمارا ارادہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ پوچھے جاؤ' جواب کچھ نہیں — پھر وہی خاموش زبان میں ہمیشہ ظاہر ہے۔ اندر بھی جواب ہے اور باہر بھی۔ جس کا جی چاہے پڑھے' سمجھے۔ جیسا سمجھ میں آئے ویسا ہی پڑھ لے' سمجھ لے۔"

اپنے سوال کا وہ خود ہی جواب ہے۔

لیکن اسے اب چھوڑیں بھی۔ کہیں وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر کرنی کا پھل ہے۔ میں آج جھوٹی اور بے کار عزت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوں۔ یہ سب فریب ہے' چھلاوا ہے۔ دل کہاں ہے ان میں؟ سچی عزت کہاں ہے۔ لیکن یہی سب کچھ تو کیوں بنتے گئے ہیں ہے۔ ناموری کیا رہ گیا اب جو بھولے لوگوں کو پھانسی دیتا اور... نہیں۔ سچ میں اچھے عورت ہے۔ ان سب باتوں کے تحت چلو تو کہو کہ یہ کرم کا پھل ہے۔ لیکن کیا بھول جاتا ہے کہ یہ کیسا کرم کا پھل ہے؟

کامیاب وکالت اور ججی کے اس قدر عظیم شہرت ...

کامیابی بھی ہے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنی کوئی کہانی غیر متوقع طور پر ختم کی ہے تبھی کامیاب ہو سکا ہوں۔ اس کہانی کو میں یہاں کیوں چھیڑ رہا ہوں، جب کبھی موقع ہوگا تب ہی کہوں گا۔

میرا دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ سماج کی رکی ہوئی موت کے جس مینار سے پہ آج میں کھڑا ہوں، وہ کسی کی قربانی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی دل خوف زدہ ہو جاتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔ لیکن کروں کیا! اس سماج کی نیو کھودنے سے ہاتھ کیا آئے گا! نیو ڈھیلی ہی ہوگی۔ ہاتھ آنے والا کچھ نہیں ہے۔

سوچتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔

لیکن کیوں؟ میں یہ نہیں جانتا کہ سب لٹنے کو لوٹنا اور ٹھگنا ہے۔ سماج پہ میں چاہے بھی جیسوں تو اسے دبا تو سکتا ہوں بدل نہیں سکتا۔ اس کے بچانے پھولنے کی تو ایک ہی ترکیب ہے کہ میں اپنے خون سے اس کی بنیادیں سینچ دوں۔ جاہل رہ کر عالم بنوں۔ جھوٹا بن کر نام کمانے میں کیا رکھا ہے؟ آہ! ایسی ناموری بیکار ہے، فضول ہے۔ طرح طرح کر کے اگر دنیا کی دولت پالی تو کیا پائی۔ یہ تو لعل کو گنوا کر خزف ریزہ پانے سے بھی کمتر ہے۔

زندگی میں ایک ہی بات تو نہیں ہے۔ دسیوں باتیں ہیں جو بار بار ذہن میں چل پھر رہی ہیں۔ ان کو قصداً نظر انداز بھی کیا جائے تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میرے اندر میں سلگتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ان سے ایک شعلہ بھڑکتا ہے جس کی روشنی میں میں دیکھ سکتا ہوں کہ سچائی کیا ہے، حقیقت کیا ہے؟ تب میری سمجھ میں صرف ایک بھلا سا معلوم ہوتی ہے جس میں معلوم ہوتی ہے۔ سچائی کو چھپا نے میں جو بے نیاز بنے بیٹھے ہیں، تو ان کا نقشہ میں ہے۔ بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سنا لیکن وہ سب جھوٹ ہے۔ سچ اتنا ہی ہے کہ مبارک ہے وہ انسان جو محبت کی آگ میں تپ کر زندگی کا عرفان پا جائے، گمراہ ہے وہ آدمی جو کچھ دولت کے لئے میں جو زندگی کی بھول بھلیوں پہ بھٹکتا ہے۔

لیکن ان بے مقصد اور بے مطلب باتوں سے کیا فائدہ؟
اس طرح کوئی ہو سکتے ہیں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور تنہائی برداشت

ہو جاتا ہے لیکن اس کا فیضان پہلے سے کہیں کم ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں — کیا انسانی زندگی کی رفتار اندھی ہے جس کیا اس کی کوئی سمت مقرر نہیں؟ اندھی ہے۔ یہ تو بس نہیں ہاروں گا، تحرک اور رواں ضرور ہے۔ جوں جوں انسانی زندگی گزرتی جاتی ہے درد لوٹ لوٹ کر اکٹھا ہو کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جاتا ہے یہی نچوڑ ہے۔ یہی انسان کا جوہر ہے۔ اسی کی روشنی میں حیات انسانی کی راہ متعین ہوگی۔ ورنہ چاروں طرف گھنا جنگل ہے جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اور انسان بھوک، پیاس، موت، لالچ اور حسد کے جنگل میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہاں جاتا ہے، وہاں جاتا ہے لیکن دراصل وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ کہیں نہیں جاتا۔ ایک ہی مقام پر کولہو کا بیل بنا چکر کاٹتا رہتا ہے۔

اتنی عمر گزار کر، بہت سوں کو پیدا ہوتے اور بہت سوں کو مرتے دیکھ کر، میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ درد میری زندگی کا مقصد بن جائے۔ دھن نہ چاہوں، من چاہوں۔ دھن میل ہے اور من کا درد امرت۔ سچائی کی جگہ اور کہیں نہیں۔ اس درد کے وجود کے اعتراف اور احساس مندی سے حقیقت اور عرفان کی کرنیں پھوٹیں گی۔ اس کے علاوہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سچائی صرف یہاں ہے۔ اگر اور کہیں سے آواز آئے کہ یہ ہے سچائی، تو وہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن سچائی نہیں۔

ہونی کے لئے کسے قصوروار ٹھہرایا جائے۔ پیدا کرنے والے کو تو دوش نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس تک تو میں اپنی صدائے بازگشت بھی نہیں پہنچا سکتا۔ دوش دوں بھی کیوں؟ اور اگر دوش دینا ہی چاہتا ہے تو لکھ کر دوش اپنے آپ ہی کو کیوں نہ دوں ـــــ میں یہ راز پا جاؤں کہ ہر ایک جنم پیدا کرنے والے ہی نے دیا ہے۔ لیکن جو دنیا کی سختیوں کا بوجھ ہنستے کھیلتے برداشت کر کے چپ چاپ چلے جاتے ہیں، اور پھر وقت آنے پر اسی طرح ہنستے ہنستے دھرتی ماں کی گود میں سو جاتے ہیں، میں انھیں سلام کرتا ہوں۔ میں انھیں بدنصیب بھی کہوں گا، پاپی بھی کہہ لوں گا، لیکن میں انھیں سلام کرتا ہوں۔

بوا کا جو حشر ہوا، اس پر میں کیا سوچوں؟ میں کچھ نہیں سوچ پاتا۔ شاید جو ہوا، ٹھیک ہی ہوا۔ اس لئے کہ اب کسی طرح نہیں رہا جا سکتا۔ لیکن اتنا سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو محبت مجھے ان سے ملی تھی، کیا وہ

اب بھی مل سکتی ہے؟

کیا اس محبت کو بھلایا جا سکتا ہے؟ کیا محبت بذات خود اتنی پاکیزہ نہیں ہے کہ جنت کے دروازے اس کے استقبال کے لئے کھل جائیں۔

میں نہیں جانتا۔ جنت، دوزخ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ قدرت کا نظام میری سمجھ سے بالا ہے۔ لیکن اتنا البتہ جانتا ہوں کہ اگر بے دل اور بے ضمیر نہ ہوتا تو اس کرسی عدالت پر متمکن نہ ہوتا۔

اس دن کے بعد جب بوا جمال گوٹا لینے کے باوجود بھی یا ——— کے ساتھ چلی گئیں تو ایک عرصہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ نویں جماعت سے دسویں میں آیا اور دسویں سے ایف۔ اے میں۔ یعنی کالج میں داخل ہو گیا اور پھر انٹرمیڈیٹ بھی پاس کر لیا۔ نیا ماحول، نئے دوست ملے۔ نظر میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ زندگی کے ولولے اور خواہشیں منہ کھول کر سامنے آ گئیں۔ بوا کی یاد رفتہ رفتہ دھندلی ہو گئی۔ پہلے تو میں بے قرار ہو کر ان کی خیریت بتا جی اور ماں سے پوچھتا رہا۔ معلوم ہوتا رہا کہ خیریت ہیں، اچھی طرح سے ہیں۔ پھر میں اپنے آپ سے پوچھتا رہ جاتا کہ یہ "بخیریت" اور "اچھی طرح سے" ہونا کیا ہوتا ہے۔ کیا بوا واقعی خوش ہیں؟ اگر ہیں تو پھر میں خوش کیوں نہیں ہوں ۔۔۔؟ کچھ دن بعد پتہ چلا کہ ان کے ایک مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اور خود ان کی حالت بھی قریب المرگ جیسی ہو گئی ہے۔ لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ بوا بھی بچ گئیں۔ کہا کرتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، زندگی ہے پھر بھی اکسیر ہے اور زندگی کو برا نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دن میں نے ماں سے پوچھا "ماں! بوا کا کچھ حال معلوم ہوا ہے؟"

اسپتال کی چھٹیوں میں میں ان کے پاس جاؤں گا۔" سن کر ماں مجھے گھور کر دیکھنے لگیں، بولیں کچھ نہیں۔

میں نے پھر لجاجت سے کہا "بتاؤ، بوا کا کچھ حال معلوم ہوا؟"

ماں نے بے پروائی کے ساتھ کہا "نہیں۔"

میں نے پھر کہا "معلوم ہوا ہے؟"

بولیں "نہیں معلوم ہوا" "نہیں معلوم ہوا کیوں میری جان کھائے جا رہا ہے؟"

میں نے کہا "کیا بات ہے؟ بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

بولیں "بات! ارے کہہ تو دیا کہ بات کچھ بھی نہیں ۔۔۔

"اچھی ہی ہوں گی اور کیا ۔۔۔؟ پوچھنا کیسا، کچھ نہیں، جب سے گئی ہو، مڑ کر بھی نہیں دیکھا" مر گئی تیری بوا ۔۔۔ خبردار جو اب بوا کی بات مجھ سے کی۔"

میں سکتے میں رہ گیا، پوچھا "کیوں؟ کیا ہے ۔۔۔؟"

کہنے لگیں "کچھ نہیں، چل جا اپنا سبق دیکھ۔"

کسی طرح ماں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ کچھ جواب ہی نہ دیتی تھیں۔ بابو جی سے پوچھا، وہ بھی جواب میں خاموش رہ گئے۔

بابو جی آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے، بولے "کس نے کہا ۔۔۔؟"

"کسی نے بھی کہا، آپ سچ سچ بتا دیجئے ۔۔۔ کیا مر گئی ہیں ۔۔۔؟"

"نہیں تو!"

"تو کیا بات ہے ۔۔۔؟"

"بات کچھ نہیں ہے۔"

مدت گزر گئی۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر رہا۔ اب بوا کا ذکر گھر میں ممنوع ہو گیا تھا۔ ان کا نام آتا تو سب چپ رہ جاتے۔ بتا جی میں ایک خاص قسم کی تبدیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ سنجیدہ، کچھ غمگین ہو چلے تھے۔ ماں چڑچڑی سی ہوتی جاتی تھیں۔

بہت دنوں بعد جو کچھ مجھے معلوم ہوا، وہ یہ تھا کہ بوا کو ان کے پتی نے چھوڑ دیا۔ بوا کا چال چلن خراب ہے اور مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا چال چلن ہمیشہ سے خراب ہے۔ "چھوڑ دیا ہے" کا مطلب ٹھیک میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہاں چھوڑ دیا ہے؟ کہاں چلی گئی ہیں وہ؟ یا کسی الگ جگہ انہیں رکھ دیا گیا ہے۔ یا اُسی گھر میں ہیں اور بس ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے ۔۔۔؟ معلوم ہوا کہ اسی شہر میں انہیں ایک علیحدہ چھوٹے سے گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔ کوٹھری ہے ہی۔ وہاں چاہے جیئیں، چاہے جیسا کھائیں پئیں۔ کہاں سے دیں اور کیا کھائیں، اس کا بھی پتہ چلا کہ پھوپھا نے ان سے کہا تھا کہ میکے چلی جاؤ لیکن بوا اس پر راضی نہ ہوئیں۔ دھمکایا گیا، مارا پیٹا گیا لیکن انہیں مرنا منظور تھا، ہمارے یہاں آنا منظور نہ تھا۔ تب خود پھوپھا نے انہیں الگ گھر میں چھوڑ دیا ہے۔

یہ سب کچھ میں نے یوں سنا جیسے کہانی سن رہا ہوں۔ پھر ایک عجیب سا خلفشار اور ہیجان میرے ذہن میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جلد ہی ہیجان ٹھنڈا پڑ گیا اور زندگی پھر رفتہ رفتہ اسی ڈھرے پر آ گئی ۔۔۔ میں نے اس کہانی کو قبول کر لیا۔

زندگی رواں ہے۔ لیکن کس کا انتظار کرتا ہے؟ مرنے
ے مر جاتے ہیں لیکن جینا ہے جنھیں، وہ تو مُردوں کو لے کر
ں مر سکتے۔ مَرتے کے ساتھ کوئی مَرتا ہے؟ یہ تو چکر ہے۔ آگے
انے کے لئے سوچا اور پھر چڑھے۔ بس چلے چلو۔ اس پل چلاؤ
ا مجھے یکایک معلوم ہوا کہ بُوا اس جگہ نہیں ہیں (فلاں) شہر
گئی ہیں جو سکنے والا ایک بنیا ساتھ ہے۔ وہ "فلاں" شہر
اں ہم رہتے تھے، اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بُوا نے بھی
کا ایک گوشہ آباد کر دیا ہوگا۔ یہ بات بڑی تعجب اور ناممکن معلوم
ئی۔

اس کے تھوڑے دن بعد چاچی کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ ذرا
بکے بجھے رہنے لگے کیوں کہ ماں بڑی سوجھ بوجھ والی عورت تھیں
ہوئی خاں سے بچتیں اور مجھ سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کیے
ے تھیں۔ اس اثنا میں میں نے ایف۔ اے پاس کر لیا تھا اور
ب تھرڈ ایئر میں پہنچ گیا تھا۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے اس شہر کا بورڈ دیکھ کر دل
ح طرح کے جذبات موجیں مارنے لگے۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اب تو
ہاں واپسی میں یہاں اُتر جاؤں گا۔ بُوا کو ڈھونڈھ نکالوں گا اور کہوں گا "بُوا
ا— ! یہ تمہارا کیا حال ہے؟ چلو یہاں سے چلو۔"
اں نے مجھے سمجھا رکھا تھا کہ چھٹی ہوتے ہی گھر چلے آنا۔ بات یہ تھی کہ
ے بیاہ کے سلسلے کی تیاریاں اس سال کی کانفرنس دینا چاہتی تھیں
ان لیتے میں جاتے کہ اس اسٹیشن پر اُترے بغیر آگیا۔ اور میں نے
اکثر موندھی نکالا۔

شہر کے اس محلے میں جاتے ہوئے میرا دل کسی ان جانے ڈر
سے بوجھ سے دبا جاتا تھا کہ کہاں بُوا؟ اور کہاں یہ زندگی؟ رہا سہا
ے کے لوگ رہتے تھے۔ گلی میں اندر بہار بُوا کی کوٹھری تھی۔ بنیے نے باہر
ے دکان کر لی تھی اور رات میں وہاں کپڑے کا بیوپار کرتا تھا۔ میں کوٹھری
کے دروازے پہ پہلے تو ٹھٹکا پھر ہمت کر کے اندر داخل ہو ہی گیا—
وہ بُوا ہی تھیں— کیا یہی ہیں؟ لیکن وہی تھیں۔ ایک دھوتی
سے بدن ڈھانپے کوئلے کی آنچ پر روٹی سینک رہی تھیں۔
کسی کو آتے دیکھ کر انھوں نے جھٹ ماتھے کے آگے آنچل کھینچ لیا
لیکن جب غور کیا اور مجھے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پہچانا نہیں؟
ان لیا؟ میری ... میں اپنے آپ پر لعنت

کرنے لگا کیوں آیا یہاں۔ کیوں آیا؟ تاثیری ایسی نگاہ میں ملی تھی
کچھ دیر کے بعد انھوں نے اپنی نظریں پھر انگیٹھی پر ڈالیں اور
روٹی پکانے لگیں۔
تھیں بُوا ہی— لیکن ان کا یہ کیا روپ تھا۔ جسم بھر گیا تھا
منہ ستر کر نکل آیا تھا۔ یہ سب اور چال ڈھال اس بات کا اشارہ
تھا کہ وہ پھر حاملہ تھیں۔ پورا جسم ایک دھوتی میں چھپائے بیٹھی تھیں
چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا— کوٹھری کوئی
بارہ مربع گز ہوگی۔ باہر تھوڑی سی کھلی جگہ تھی، جہاں دھوتی اور لنگوٹ
سوکھ رہے تھے۔ اندر کمرے میں کچھ میلے کپڑے بستر پر پڑے تھے
انکے پاس کچھ بکس تھے۔ اوپر ایک بانس لگا ہوا تھا جس پر کسی قدر
اچھے کپڑے پڑے تھے۔ بُوا کی پشت کے پیچھے کچھ زنگ خوردہ کنستر
کچھ مٹی کے برتن اور دو تین ٹین کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ پاس ہی
کچھ پیتل اور المونیم کے برتن، ایک ٹین کی بالٹی، اور ایک پانی کا گھڑا رکھا
تھا۔ کونے میں ایک کوئلے کی بوری آدھی جھکی ہوئی کھڑی تھی۔
میں یہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا کہ جیسے یہ چیزیں اس سے
پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں، جیسے کوئی مجھ کو دیکھ رہا ہوں— میں دیکھتا
رہا، بُوا خاموش روٹی پکانے میں لگی رہیں۔
میں نے کہا "میں پرمود ہوں، بُوا— !"
وہ کچھ نہ بولیں۔
میں بھی چپ رہا۔
پھر کچھ دیر بعد بولا "میں جاؤں؟"
اس بار بھی انھوں نے نہ نظر اٹھائی، نہ لب ہلایا۔
لیکن مجھ سے جایا بھی نہ گیا— پاؤں زمین میں گڑ گئے میرے
منہ سے دفعتاً نکلا، "لو— ! نہیں جاتا— لیکن کچھ بیٹھنے کو دو تو
جب ہی آ کر بیٹھوں۔"
میں سوچ رہا تھا کہ اب تو انھیں بولنا ہی پڑے گا۔ لیکن
وہ اب بھی خاموش رہیں۔ اتنے میں باہر کسی کے پیروں کی
چاپ سنائی دی اور آواز آئی:
روٹی پک گئی— ؟ اور دوسرے لمحے ایک آدمی ایک دم اندر داخل
اور مجھے دیکھ کر مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔
بُوا نے انگیٹھی پر نظریں جمائے ہوئے کہا، تمھیں معلوم ہے

کہہ دو کہ جائیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اُس آدمی کا تعجب پہلے سے اور زیادہ ہو گیا۔ وہ بار بار مجھے اوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ اس وقت مجھے غلطی کا احساس ہوا اور غصہ آیا کہ چلتے وقت کوٹ، پتلون اور ٹائی، ہیٹ کیوں نہیں آیا۔ وہ شخص ابھی تک مجھے بدستور حیرت اور استعجاب سے گھور رہا تھا۔ جسم پر کپڑے کاٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں نے کہا، "بوا! کیا میں چلا جاؤں؟"

بوا نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، "لو تو میں جاتا ہوں لیکن کل سے مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا ہے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ یہ بھی بات ہے بوا۔"

یہ کہہ کر میں جانے کے لئے مڑا۔

بوا نے بغیر کسی طرف دیکھے کہا، "سنتے ہو، کھڑے کیا ہو، باہر جا کر چار پیسے کا دہی لے آؤ۔ اور تھوڑا سا بھی لیتے آنا۔"

وہ شخص بغیر کسی تامل کے باہر چلا گیا۔

میں نے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے اور بے تکلفی سے صاف کپڑوں پر جا بیٹھا جو ایک کونے میں پڑے تھے۔ میں بوا کے بالکل مقابل تھا میں نے کہا، "سچ جاننا بوا، میں کل کا بھوکا ہوں۔"

بوا نے اب آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا، اُف آنکھوں میں کیا تھا؟ بولیں، "آپ یہاں کھائیں گے؟"

میں نے کہا، "میں آپ ہی سہی! لیکن میں بھوکا ہوں۔ نہیں کیسے کھاؤں گا۔"

بوا نیچے دیکھنے لگیں۔ انھوں نے انگیٹھی پر سے توا اُتارا اور روٹی سینکنے لگیں۔ روٹی پھول گئی۔ وہ اسے اِدھر اُدھر کر کے سینکتی رہیں، بولیں کچھ نہیں۔ روٹی سینک کر الگ رکھ دی۔ توا پھر انگیٹھی پر رکھ دیا اور پھر۔۔۔

مجھے محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں یکدم اوپر نہیں اُٹھیں۔ مجھے اس پر بڑی کلفت سی ہوئی۔ چاہتا تھا کہ انھیں جتلا دوں کہ میں پر موجود ہوں، یہ موجود۔ بوا سنو تو، دیکھو تو میں وہی پر موجود ہوں۔ اور تم بھی تو بوا وہی بوا ہو۔

کیا نہیں۔۔؟

میں نے کہا، "بوا!"

اُنھوں نے سن لیا۔

میں نے کہا، "بابوجی تو چلے گئے بوا۔ تمہاری یاد میں دل میں لئے چلے گئے۔ بتاؤ میرے اب کون ہے؟ ایک ماں اور دوسری تم!"

بوا خاموش بیٹھی رہیں۔ اور کچھ نہ بولیں۔

دل میں آیا کہ کھل کر ان کے سامنے بچھ جاؤں تاکہ بوا کچھ کہیں تو۔ ملال کیوں مجھے سزا دے رہی ہیں۔

میں نے کہا، "بی۔ اے میں پڑھ رہا ہوں، بوا۔ ابھی یونیورسٹی سے آ رہا ہوں۔ ماں بیاہ کی بات کر رہی ہیں۔ سنتی ہو نا؟ ماں اسی سال بیاہ کرنا چاہتی ہیں، لیکن میں نہیں چاہتا۔ جب تک بی۔ اے پاس کر لوں، تب تک اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا، بوا؟ تم مت بولو، لیکن میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں کہ میں ابھی بیاہ نہیں کروں گا۔ لیکن ماں سے میرے دل کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے دبا لیتی ہیں۔ بوا اگر میرے ساتھ زبردستی ہوئی تو ذمہ دار تم ہو گی۔ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے دیکھا کہ بوا کے ہاتھ بیلن پر جیسے تھمتے ہوئے بالکل رُک گئے۔ اور توے پر روٹی پھول کر اب جلنے کا انتباہ دے رہی ہے اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی۔ بوا جیسے چونک کر باخبر ہو گئیں۔ اور چلے پر پڑی ہوئی روٹی پھر قاعدے سے بیلنے لگیں۔ اتنے میں وہ شخص اندر آیا اور دہی اور پیڑا بوا کے پاس رکھ دیا۔

بوا نے کہا، "ابھی دکان پر بیٹھو۔ سنا کھانے کے لئے تھوڑی دیر میں آنا۔"

وہ شخص مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

بوا نے آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں، "لو آؤ۔"

میں نے کہا، "پہلے تیار کر لو، پھر اطمینان سے کھاؤں گا۔"

بوا نے کہا، "نہیں! تم بیٹھو۔"

میں نے کہا، "میرے ساتھ نہیں بیٹھو گی؟"

"نہیں"

"تب کھاؤ گی؟"

"پیچھے میں کھاؤں گی۔"

میں نے کہا "تم میں کب کھاؤ گی، ابھی نہ کھاؤ؟"

"تمہیں کھلا کر کھاؤں گی؟"

میں نے موزے اتارے۔ کوٹ اتار کر بانس پر ٹانگ دیا۔ مالی اٹھائی اور ایک لمحے سوچتا رہا کہ کہاں کیسے بیٹھوں۔

"وہاں سے ایک دری لے لو نا، اور یہاں بچھا کر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے دری لی اور بتائی ہوئی جگہ پر بچھا کر بیٹھ گیا۔

کھاتے وقت بوا نے پوچھا "ماں اچھی ہیں؟"

"اچھی ہیں۔"

"یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟"

"اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں سامان پڑا ہے۔"

"کل ہی آئے ہو؟"

"کل ہی آیا۔"

"یہاں کا پتہ کس نے دیا؟"

"ڈھونڈ لیا۔"

"کب جاؤ گے؟"

"جب تم چلو گی؟"

یہ سننا تھا کہ جیسے انھیں بجلی نے چھو لیا۔ چہرہ فق ہو گیا جیسے خون منجمد ہو گیا ہو۔ نگاہیں نیچی کر لیں اور کچھ نہ بولیں۔ میں بھی چپ ہو رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا "چلو گی نہیں؟"

بوا نے قدرے درشتی سے کہا "کہاں؟"

میں نے کہا "کہاں کیا! گھر ــ!"

بوا نے اسی درشتی سے کہا "ماں نے کہا ہے؟"

"میں تو کہہ رہا ہوں!"

یہ سن کر گویا انھیں کچھ تسلی ہو گئی۔ چہرے کی کڑواہٹ اور درشتگی کچھ کم ہو گئی۔ بولیں، "پہلے شادی تو کر لو۔ تب گھر بسے گا۔ اور اس وقت کہنے آؤ گے، تب میرے سننے کا بھی وقت ہوگا۔"

میں نے زور سے کہا "میرا گھر نہیں ہے تو کس کا ہے؟"

وہ بدستور خاموشی سے مجھے تکتی رہیں۔ میں نے پوچھا "تو نہیں چلو گی؟"

وہ اس پر کچھ مسکرائیں۔ بولیں، "تم تو کہتے ہو کہ بی۔ اے میں پڑھتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے تم نے ابھی تک کچھ نہیں سیکھا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا یوں ہی سہی لیکن تمہیں گھر لے کے جاؤنگا۔"

بوا نے کہا، "اچھا، پہلے کھانا تو لو، پھر جو ہوگا دیکھا جائیگا۔"

میں نے کہا، "تمہیں پتہ نہیں بیس برس کا ہو گیا ہوں ــ بالغ ہوں گھر کا مالک میں ہوں۔ ماں میری ہے۔ میں تمہیں یہاں کیسے رہنے دونگا۔"

بوا بولیں، "تو ضرور لے چلے گا؟"

"ضرور لے چلونگا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکیں۔

"ضرور لے چلے گا تو لے سن ــــ میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جا سکتی۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بی بی کے گھر کو چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ بی بی موجود ہیں، لیکن دوسرے کے سہارے رہ رہی ہوں۔ تم نہ سمجھو لیکن میں تو سمجھتی ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کر لو لیکن مجھ سے اپنا یہ پاپ نکل جانے کو نہیں کہہ سکتے۔ پھر جن کو ساتھ لے کر بی بی کو چھوڑ آئی ہوں، انھیں میں چھوڑ دوں؟ انھوں نے کون سی قربانی نہیں دی میرے لئے ـ؟

انھوں نے تو مجھے دوسری زندگی دی ہے۔ میں مر سکتی تھی لیکن مر نہیں مرنے کو میں انسانیت کے خلاف سمجھ کر ہی نکل سکی۔ جس کے سہارے میں موت کے منہ سے بچی، اسی سے الگ ہو جاؤں ـ؟ میں الگ نہیں ہو سکتی ــ پاپن ہو سکتی ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہو سکتی نہیں بھیا ــ تم سب لوگ کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ میں مر گئی ـ"

میں بھونچکا رہ گیا، اس قسم کی باتیں میں نے پہلی بار بوا کے منہ سے سنی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندرونی طاقت انھیں قائم رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ آدھی مر تو گئیں ہی۔

میں نے کھانا کھا لیا۔ بوا نے بھی اپنا چولھے کا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ مگیں برتن اٹھا کر مجھ سے کہنے لگیں، "سنو، ابھی تو نہیں جا رہے ہو؟"

"ابھی تو نہیں ـ"

"تو ایک کام کرو ــ باہر کی دکان پر جا کر انھیں کھانے کے لئے بھیج دو۔ تم اتنے پانچ منٹ وہاں بیٹھنا پھر یہاں آ کے آرام کرنا ہو سکے تو دوپہر رہتے جانا۔"

میں نے باہر آ کر اس شخص سے کھانے کے لئے کہہ دیا۔ میں خود سوچنے لگا کہ اس کوٹلے کی دکان پر کیسے بیٹھوں؟ ایک ٹاٹ تھا جس

بار بار سوچا کہ بلا اتنا اس چبوترے پر مجھ سے نہیں بیٹھا گیا۔ میں دکان کے آگے ٹہلنے لگا۔

عجیب و غریب محلہ تھا۔ دن وہاں شاید ہی نکلتا ہو، دن میں رات معلوم ہوتی تھی، رات میں کیا ہوتا، کچھ پتہ نہیں۔ کوٹھریاں ایک دوسرے سے اتنی ملی ہوئی تھیں کہ ایک دوسری میں گھستی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر یہ کوٹھریاں ہی دکانیں بھی تھیں اور رات کو یا پہلے کے اڈے بھی۔ کسی پر پیالا دکانے کی سستی چیزیں تھیں تو کسی پر باسی بنولیاں اور خشک دبے رس بھال رکھے تھے۔ کہیں نائی بیٹھا ہوا استرے پہ دھار رکھ رہا ہے، کہیں درزی بیٹھا سلائی کی مشین پر انگریزی وضع کے کپڑے سی رہا ہے۔ یہاں آسمان بھی ایک گلی معلوم ہوتا ہے۔ وقت کا شمار دو آنوں کے حساب سے ہوتا ہے۔

میں بی۔ اے کا طالب علم چپلوں پر صرف قمیض اور قمیض پہ شاق لگائے اس دکان کے آگے چکر لگاتا رہا اور بغیر سوچے بھی بولا اور اس ماحول کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

اتنے میں وہ شخص آیا اور بولا کہ بوا مجھے بلا رہی ہیں۔

میں چلنے لگا۔ یکایک اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے روک کر کہا "ایک منٹ، بس ایک منٹ" یہ کہہ کر مجھے وہیں چھوڑ وہ آگے لپک گیا۔ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا پان تھا، مجھے سامنے کر کے بولا "لیجئے۔"

میں نے پان لے لیا۔ پوچھا "تمباکو؟" میں نے کہا "جی نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ شاید مجھے بالکل بے تکلف دیکھنا چاہتا تھا، اس نے اپنی صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی اور کہا "سگریٹ تمباکو ہے، بابو!"

میں نے کہا "میں....."

"..... دو پیسے سیر والا ہے، بابو، ہماری دکان کا۔"

مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ تمباکو کتنے روپے سیر تھا۔ ضرور وہ تمباکو اعلیٰ درجے کا ہی ہوگا۔ اپنی مجبوری پر میں شرمندہ ہو گیا۔ میں نے کہا "جی..... میں....."

وہ شخص ہمدردی سے میری مجبوری پر ہنس دیا۔ "ہیں، ہیں، ہیں۔"

میں چلا آیا۔

آ کر دیکھا کہ کپڑوں کا ڈھیر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اور اس کے نیچے کچی کپڑے ڈال کر بوا اوپر ایک نئی چادر بچھا رہی ہیں۔ مجھے آتے دیکھ کر بولیں "آؤ، اب ذرا آرام کر لو۔"

میں نے پوچھا "تم نے کھانا کھا لیا؟"

"ابھی کھاتی ہوں۔"

"تو کھا لو۔"

"بس کھاتی ہوں — تم یہاں بیٹھو تو۔"

میں بچھی ہوئی چادر پہ آ بیٹھا۔ انھوں نے دو دو ہی تکیے میرے سامنے پھینک دئے اور کہا "لیٹ جاؤ نا۔"

میں نے کہا "لیٹ جاؤں گا۔"

اس پر بغیر کچھ کہے وہ جھوٹی تھالی مانجھنے لگیں۔ مانجھنے کے بعد میں کھانا نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں "آؤ، میرا ساتھ دو گے؟"

میں نے کہا "میرا ساتھ تو تم نے دیا نہیں۔"

بولیں "اب تم ساتھ نہیں دے سکتے۔"

میں نے کہا "دیکھ لیا بوا، تم میرا ساتھ نہیں چاہتیں۔"

"تمہارے ساتھ کھلانے میرا کیا منہ؟" یہ کہہ کر تھالی اٹھا اور کونے میں چلی گئیں۔ کھا پی کر اسی وقت برتن مانجھنے لگیں۔

میں نے کہا "یہ بعد میں نہیں ہو سکتا۔"

بولیں "ابھی دو منٹ میں ہوا جاتا ہے۔"

میں نے ادھر سے آنکھیں پھیر لیں، ایک تکیہ دبا کر وہیں لیٹا رہا۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ آنے والا کل آج سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ بلکہ کل ہی کو سرے سے بھول گیا۔ یہی حالت کچھ دیر بعد اتنی گہری ہوگئی کہ مجھے قصداً اسے بدلنا ہی پڑا۔ ورنہ معلوم یہ ہوا تھا کہ میں بھی یہیں کا، اسی محلے کا ایک فرد ہوں — کہاں میرا کالج؟ کہاں شادی کی بات چیت؟ کہاں ماں اور میری زندگی کے منصوبے، کیا واقعی ان کا وجود ہے؟ نہیں، سب دھوکا ہے، مستقبل بے معنی لفظ ہے۔ جو کچھ ہے، بس یہی ہے۔ اور وہ بھی وقت کا اسیر — گویا کہ گویا یہی لمحہ، بحث، مباحثے اور اختلاف رائے کے لئے کوئی موضوع باقی نہ بچا تھا۔ سب کچھ ایک خلا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا

ہم عمروں کا وہاں ہونا بھی اس سب ٹھیک ٹھاک کا ایک جزو تھا ماضی، حال اور مستقبل کی حدیں ٹوٹ سی گئیں تھیں، اس تثلیث سے اب صرف ایک حال ہی بچتا تھا۔۔۔

"ارے! ابھی۔ اماں جی کے اشارے پر میں یہاں چلا آیا ہوں۔"

اس بیداری کے خواب میں آواز آئی۔۔۔ "سو گئے؟"

کروٹ لے کر دیکھا تو تواّ میرے پاس زمین پر بیٹھی ہیں۔ "نیند آ گئی تھی کیا"؟

انھوں نے پھر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"نہیں آئی، تو اب ذرا آنکھ لگا لو۔"

"تمھیں اب کچھ اور کام ہے؟"

"کام۔۔۔؟"

"ہاں کچھ اور کام نہ ہو تو۔۔۔"

"کام کی تو کمی نہیں ہے۔۔۔ لیکن وہ دیکھا جائیگا۔ یہ تم:"

"توّا، تم یہیں بیٹھو۔۔۔ آج کام دھام رہنے بھی دو۔"

"چھوڑ تو دیا ہے اور بیٹھی بھی ہوں۔"

میرے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات ابھر آئے۔۔۔ آج توّا جس حالت میں ہیں اس کی ذمہ دار وہ نہیں ہیں۔۔۔ دل یہ بات مانتا ہی نہیں۔۔۔ انکی زبوں حالی نے مجھے مجسم ترس، رحم اور رقت بنا دیا تھا لیکن باوجود کوشش کے بھی یہ نہ ہو سکا کہ ان سے ہمدردی کا اظہار کروں۔ اس گو مگو کی حالت میں میرے منہ سے اچانک نکل گیا!

"توّا۔۔۔!"

"ہاں بولو۔۔۔ کہو۔"

میں نے قدرے جھجک کر کہا، "میری سمجھ میں نہیں آتا یہ جگہ اچھی ہے یا بری؟"

"کون کہتا ہے جگہ اچھی ہے۔۔۔ لیکن جگہ تو ہے۔ کبھی کبھی جگہ کا سوال ہی بہت بڑا ہوتا ہے۔ صاف صاف کہو نا، پھر کیا تمہارے کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟"

پھر کچھ انھوں نے نہ جانے کس انداز سے مجھے دیکھا۔ یہ انداز مجھے اچھا لگا۔

میں نے کہا، "تم یہیں رہو گی، اسی جگہ؟ کب تک رہو گی۔۔۔؟"

"ابھی تو اسی جگہ ہوں۔ اس کوٹھری میں میں رہوں گی اور کوئی رہے گا۔ یہ کوٹھریاں تو آباد ہی رہیں گی ان میں رہنے والی آدمی بہت ہیں۔ آگے کا حال میں نہیں جانتی۔۔۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ زیادہ دن یہاں نہ رہ پاؤں گی۔"

"کہاں جاؤ گی۔۔۔؟"

"کون جانتا ہے۔۔۔؟"

"کیوں جاؤ گی۔۔۔؟"

"تمہیں خبر ہے، وہ آدمی جس کے ساتھ میں یہاں رہتی ہوں زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکے گا۔ میں جانتی ہوں ایک دن چھوڑ کر چلا جائے گا تب ہی اس کوٹھری سے میرا نکلنے کا دن ہوگا۔"

وہ جس تحمل اور بے تعلقی انداز سے بات چیت کر رہی تھیں، میں اسکی تاب نہ لاکر دبا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "پھر کیا کرو گی۔۔۔؟"

"میں کیا کروں گی۔۔۔؟ میں ابھی سے کیسے بتا دوں؟ کوشش بھی کروں تو کچھ نہیں بتا سکتی۔ لیکن ایک بات کہہ سکتی ہوں۔۔۔"

یہاں جیسے ان کی آواز کو اندر سے کسی نے دبا دیا۔۔۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا۔۔۔؟"

"طوائف کا پیشہ نہیں کروں گی، اس بات کا یقین رکھو۔"

یہ میرے لئے بہت تھا۔ سن کر کچھ خوف زدہ اور حیرت زدہ سا ہو گیا۔۔۔ جس کو تن دے دیا جائے اس سے پیسہ کیسے لیا جا سکتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تن دینے کی ضرورت تو سمجھ میں آتی ہے۔ تن دے سکوں گی، شاید وقت ایسا کرنا ضروری بنا دے۔۔۔ لیکن لینا کیسا؟ ان عورت کا فرض ہے۔ اور فرض ہی کیا ہے؟ اس سے من مانگا جاتا ہے، تن مانگا جاتا ہے۔ ٹھیک کہا نہ ہی تو ہے۔ لیکن بکری؟ نہیں نہیں! یہ نہ ہوگا۔۔۔"

اگر چہ کچھ وہ مجھ سے رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم نہ ہوتا تھا وہ تو اپنے باغی اور سرکش خیالات کو ظاہر کر کے خود ہی لا جواب کر رہی تھیں۔۔۔ میں نے کہا، "توّا ناراض نہ ہونا۔۔۔ میں پوچھتا چلوں ایسی کیوں ہو گئی ہو۔۔۔؟ بستی کو کیوں چھوڑ آئیں؟"

توّا نے ٹکٹکی باندھ کر کہا، "میں تم سے ناراض ہوں گی؟ یہ ہو سکتا ہے؟ بستی کو میں نے نہیں چھوڑا۔۔۔ انھوں نے مجھے چھوڑا ہے۔۔۔ [illegible]

مانتی ہوں کہ عورت کا مذہب ہے شوہر کی فرماں برداری۔ عورت کا دھرم اپنے پتی کے دھرم سے کیسے الگ ہو سکتا ہے؟

شوہر کی فرماں بردار بیوی یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ شوہر نہ چاہے اور وہ پھر بھی اُس کے پاس بیٹھی رہے۔ یہ جان کر کہ وہ مجھے نہیں چاہتے ہیں، ان کی آنکھوں سے دور ہو گئی۔ انھوں نے کہا میں تیرا پتی نہیں ہوں۔ تو پھر میں کیوں انھیں اپنا پتی مانتی۔ شوہر پرست بیوی بھلا یہ کیسے کر سکتی ہے!

"بُوا! یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو۔؟ یہ سب کیوں ہوا۔؟"

"کیوں ہوا، یہی تو تمھیں بتاتی ہوں ۔۔ بیاہ کے بعد میں نے بہت سوچا۔ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں دھوکا نہیں دے سکتی۔ دھوکا پاپ ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ بیاہتا عورت کا تو پتی ہی سب کچھ ہے۔ سب بعد کی باتیں ہیں، پتی کے لئے سچا ہونا پہلی چیز ہے۔ سچائی پر ہی قربانی دی جا سکتی ہے۔ پرمود، شیلا کے بیاہ کو تم جانتے ہو؟"

اس اچانک سوال نے مجھے پھر حیرت میں ڈال دیا۔

اُن کا ایک خط آیا تھا۔ کوئی خاص بات تو نہ لکھی تھی یہی لکھا تھا کہ میں اب سول سرجن ہو گیا ہوں۔ شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی کرنے کا خیال ہے۔ تمھاری شادی ہو گئی ہے۔ تم خوش رہو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کرنا۔ اس خط کو پڑھتے ہی ذہن میں خیالات کی چکی چلنے لگی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ آپ کے خط کے لئے احسان مند ہوں لیکن آئندہ کوئی خط نہ بھیجئے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ خوش رہوں۔ جواب دینے سے پہلے دونوں خطوں کا ذکر تمھارے بھیا سے کر دینا ضروری تھا۔ سُن کر بولے کہ مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟ پھر کہہ کر میں حرام زادی کا ہوں ۔۔ میں نے کوئی چوں چرا نہ کی۔ اُس دن سے تمھارے بھیا مجھ سے کھنچے کھنچے چلے گئے۔ مجھے ناراض ہونے کا کیا حق تھا؟

انھوں نے میری پروا کرنی چھوڑ دی۔ میں اس قابل تھی بھلا۔ لاپرواہی کے متعلق پوچھنے کا حق کیا تھا مجھے۔ گھر کا کام کاج شروع کر دیا تھا جو کچھ اس سے مل جاتا اسی سے پیٹ بھر کر پڑ رہتی تھی ۔۔ لیکن اس پر بھی میں ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ اداس کی ہر بات مجھ سے کبھی نہ رہی کہ میرا وجود کیوں انھیں ناگوار تھا اور ایک

روز میں نے اُن سے کہا کہ آپ چاہیں تو مجھے گھر سے دور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا' جاؤ اپنے میکے چلی جاؤ ۔۔ میں نے کہا کہ وہاں سے تو ہمیشہ کے لئے آ چکی۔ آپ کی یہی خوشی ہو تو میں وہاں جا سکتی ہوں لیکن آپ کو ناراض کر کے وہاں جانا تو میرا دھرم نہیں۔ بولے' پھر جو چاہے کر جہاں چاہے جا۔ میں نے پوچھا کہاں جاؤں' کیا کروں۔؟

انھوں نے کہا' جان مت کھا' دُور ہو جا ۔۔ کچھ دن یونہی بیت گئے میں انکے راستے کا پتھر تھی۔ ایک دن انھوں نے اچانک کہا' چل نکل یہاں سے میں نے حکم عدولی کی ضد نہ کی۔ شہر سے دور ایک اکیلی کوٹھری میں لا کر خود ہی چھوڑ گئے۔ ساتھ ہی ضروری سامان بھی انھوں نے لا کر دے دیا۔ یہ ہے کل کہانی ۔۔"

میں بُوا کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کا چہرہ ہر قسم کے تغیر سے عاری تھا۔ میں حیران تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا انکو اس کی شکایت نہیں ہے۔ میں نے بے تاب ہو کر کہا "تم گھر کیوں نہیں آ جاتیں بُوا' اس آدمی کے ساتھ یہاں رہنے کیوں آ گئیں ۔۔؟"

بولیں "پرمود' میں تجھے کیسے بتاؤں' میں گھر نہیں آ سکتی تھی۔ ایک بار گھر آ کر میں سمجھ گئی تھی کہ اب میکے جانا ٹھیک نہیں ہے عورت جب تک سسرال کی ہے تبھی تک میکے کی ہے۔ سسرال سے ٹوٹی تو میکے کا رشتہ خود بخود ختم۔

میں تعجب سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے الفاظ سے میں کوئی خاص بات نہ سمجھ سکا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہی ہو۔؟" "تم گھر نہیں جا سکتیں ۔۔؟ یہاں آ کر ایک غیر شخص کے ساتھ رہ سکتی ہو؟ بس سکتی ہو۔ آخر یہ کیا ہے۔؟"

"گھر تو نہیں جا سکتی۔ ایک غیر آدمی کے ساتھ رہنے کی بات کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گی۔ لیکن وہ آدمی غیر کیوں ہے۔؟"

"وہ غیر کیوں ہے۔؟"

"ہاں غیر تو وہ نہیں ۔۔ کیا میرا برتاؤ اس کے ساتھ غیر معلوم ہوتا ہے۔؟"

"وہ کون ہے۔؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی ۔۔ لیکن میرا وجود میرے لئے نہیں ہے۔ اس وقت تو بے شک میں اس کی خدمت کر رہی ہوں ۔۔"

"خدمت ۔۔؟"

"۔ مذمت کیوں نہیں ـــ میں جب کوٹھری میں اکیلی چھوڑ دی گئی تو مری کیوں نہیں ـ؟ جانتے ہو ـ؟ میں نے تو سوچا بھی تھا اور چاہا بھی تھا کہ مر جاؤں گی ایسے جینے میں کیا ہے ـ؟ لیکن ایکایک مجھ پر کھلا کہ جس نے پیدا کیا ہے، وہی مارے گا۔ تو موت کا سوا گت کیوں گی اپنے زعم میں اگر مرنے والی میں کون ـ؟ بھوک سے مرنا پڑے تو میں مر بھی جاؤں ـ اپنے ہاتھوں کیسے گلا گھونٹ لوں ـــ اسی حالت میں تین دن بعد جان جوکھوں میں ڈال کر اسی آدمی نے میری خبر لی تھی ـــ اور اس خبر گیری میں بُرائی بھی کیا تھی ـــ شاید میرے روپ کا لالچ بھی ہو لیکن اس کے لئے میں اُسے کیا الزام دے سکتی ہوں ـ آنے والی مصیبتوں کی تلتا پرواہ کئے بغیر وہ میرے پاس آیا تھا ـ اس کا اپنا گھر بار تھا ـ عزیز تھے یار دوست تھے ـ اس نے ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں طعنے تشنیع سہنے، لیکن میری مدد سے باز نہ آیا، پہلے چھپ چوری اور پھر کھلم کھلا ـ اس کے اس اچھے یا بُرے کام میں میرا ہاتھ نہ تھا ـــ مدد اس نے میری یوں کی کہ کپڑے لائے اور رکھ دیئے ـ اور بعد ایک باتیں ڈھاؤں کی کہدیں ـ میں نے موت سے منہ موڑ ہی لیا لیکن موت سے منہ موڑ کر میں نے دیکھا کہ زندگی بھی میرے لئے سازگار نہ تھی ـ اور ٹھیک اس وقت اس آدمی نے میری مدد کی ـ میں نے احسان مند ہو کر اسکی مدد قبول کر لی پرمود، تم نے تو دیکھا تو ہے ـــ میرے روپ کا لالچ اس پر سوار ہو گیا اور وہ اس نشے میں چور ہو گیا ـ مجھے اس پر ترس آ گیا ـ پرمود تمہیں کیسے بتاؤں، تم بچے ہو ـــ اس بدقسمت پر یہ نشہ ایسا چڑھا کہ اس کہ نہیں سکتی ـ وہ اپنے گھر کو بھول گیا، اپنا کاروبار بھول گیا اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تُل گیا ـ ایک روز مجھ سے بولا "چلو بھاگ چلیں ـ" میں اگر سمجھاتی بھی تو کیا وہ سمجھتا ـ؟ گرم توے پر جیسے پانی کی بوند گر کر جیسے غائب ہو جاتی ہے، میرا اعتراض سے عاجزانہ مشورہ بھی اسی طرح اس پر بے اثر ہوتا ـــ میں نے پوچھا "کہاں چلو گے ـ؟"

"جہاں کہو، چلیں ـــ میرا سب کچھ تمہیں ہو ـ" جیسے میں اس کی پیاری تھی اور پیاری ہوں ـ میں یہ جانتی ہوں ـــ اس وقت میرے دل پر جو کچھ گذری، اس کا ذکر بیکار ہے ـ ایسی بے چینی تو میں نے کم ہی محسوس کی تھی ـــ اسکی محبت کو قبول کرنے کا خیال بھی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا ـ لیکن کیا اس کا حق نہ تھا ـ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس وقت وہ اسے سب کچھ سمجھتا تھا ـ میں اگر اس کی طرف سے بے رُخی اختیار کرتی

تو وہ ضرور کچھ کر بیٹھتا ـ یا اپنے ساتھ یا میرے ساتھ ـ سچ کہتی ہوں پرمود، اس وقت مجھے اس آدمی پر کتنا رحم آ گیا تھا ـ تمہاری جانتی ہوں ـ میں اسکے اس بھرم کو کسی طرح بھی نہ کھول سکی کہ میں بھی اس پر فریفتہ ہوں ـ کیونکہ ایسا کرنا میرے نزدیک ظلم ہوتا ـ میرے پاس جو کچھ بچا کچھا تھا ـ میں نے اسی کو سونپ دیا ـ ہزار بارہ سو سے زیادہ کا مال نہ ہوگا ـ سب کچھ اس کے حوالے کرنے کے بعد اس جگہ کا نام میں نے ہی اُسے بتایا کہ وہ جگہ ہے، وہیں چلو ـ جانتے ہو پرمود اس جگہ کا نام کیوں بتایا ـ اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ وہ جگہ تم سے زیادہ دور نہیں ـ اور ایک نہ ایک روز میں تمہیں ضرور دیکھ لوں گی ـ"

میں بُوا کا منہ دیکھتا رہ گیا ـ میرے اندر ایک ہلچل سی مچ رہی تھی ـ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں ـ مجھے کیا کرنا چاہئے اُس سامنے بیٹھی ستائی ہوئی عورت سے نفرت کرتا ہوں یا ہمدردی ـ؟ وہ عورت بدستور مجھے دیکھتی رہی، اپنا دکھڑا سناتی رہی۔

"لیکن اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ تم ایک دن مجھے خود ہی ڈھونڈھ نکالو گے ـــ میں سوچتی تھی کہ جب دل نہ مانے گا تو تمہیں دور سے دیکھ کر ہی اپنے آپکو بہلا لیا کروں گی ـ تم مجھ سے نفرت کر سکتے ہو، پرمود ـــ لیکن ہوں میں تمہاری بُوا ہی ـ

میں اپنے کو بے بس پا رہا تھا ـ جی میں آیا کہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوں ـ لیکن ایک ایسی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی تھی جو دکھتی تو نہ تھی لیکن محسوس ہو سکتی تھی ـ منوں بوجھ تھا کہ مجھے دبائے دے رہا تھا ـ نہ غصے سے چلا سکتا تھا ـ نہ محبت کے مارے رو سکتا تھا ـ

"۔۔۔۔ پرمود، میری حالت دیکھتے ہو ـ تم سے چھپاؤں گی کیا! یہ حمل اسی آدمی سے ہے ۔۔۔۔"

یہ کہکر اُنھوں نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جس میں ہزاروں حسرتوں اور ارمانوں کا خون تھا ـــ میں تاب نہ لا سکا اور تکئے میں منہ چھپا لیا ـ

"تمہیں لاج آتی ہے ـ؟ لاج کی بات ہی ہے ـ لیکن اب یہ آدمی بھی مجھ سے کھنچ رہا ہے ـ وہ لئے میری بچوں کو یاد کرنے لگا ہے یہ نہیں کہ میں اس وقت جبکہ وہ سب کچھ چھوڑ مجھے ساتھ لے چلنے پر تُل گیا تھا، یہ نہ جانتی ہوں کہ اس کا یہ جوش اور ابال کچھ دن کا ہے

اُسے بہت جلد اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ اور یہ بھی کہ بے بس اور مجبور آدمی ایک دن پھر آزاد اور خود رائے ہو جائیگا۔ یہ سب سمجھتے ہوئے اُسے ساتھ لے آئی۔ اس کی بے رُخی شروع ہوگئی ہے۔ اُسے اب چلا جانا ہی چاہئیے۔ اس کے بیوی بچے اکیلے ہیں۔ وہ میرے ساتھ نہیں نباہ سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اُکتا جائے۔ اپنی حالت میں جانتی ہوں، پیٹ میں بچہ ہے۔ لیکن خود غرضی مجھ سے نہ ہوگی مجھے چین تب ہی آئیگا جب وہ اپنے خاندان میں واپس چلا جائے وقت آگیا ہے کہ اُسے عقل آجائے۔ اب اس کی محبت کے منہ سے نقاب اُٹھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ میں اس کا سب کچھ نہیں ہوں ——— میں تو ایک بدذات، بدچلن اور آوارہ عورت ہوں۔"

تکیے میں منہ چھپائے یہ سب سُنتا رہا۔ اتنی تکلیف شاید ہی کبھی پائی ہو ——— دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ چاہتا تھا کہ پھوٹ پڑوں کہ وہ لاوا باہر آجائے لیکن آنسوؤں نے تو باہر نکلنے کی قسم کھالی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں یہ آدمی دو مہینے کے اندر یہاں سے چل دے گا۔ اور میرے پاس کوڑی بھی نہ چھوڑے گا۔ اُسے معلوم ہے کہ دنیا پیسے کی ہے۔ اس لئے سات سو آٹھ سو جو کچھ بچے گا وہ اسی کے آڑے وقت کام آئیگا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک آوارہ عورت کسی نہ کسی طرح جی بہلا لے گی۔ پھر پیسہ اس کے پاس چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— میں سب جانتی ہوں اور اسی لئے فکر نہیں کرنا چاہتی..... لیکن اس بچے کا کیا ہوگا۔؟"

اُنھوں نے ایک گہری سانس لی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔

"... کیا ہوگا۔؟ بھگوان ہی جانتا ہے کیا ہوگا۔ میرا اور کوئی آسرا نہیں ہے۔ لیکن بھگوان دلوں کا حال جانتا ہے۔ مجھے کسی اور آسرے کی ضرورت بھی کیوں ہو۔؟"

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ میں تکیے میں منہ دیئے پڑا رہا [illegible] پرمود! اسی لئے کہتی ہوں، جب تک وہ آدمی یہاں ہے تب تک فکر نہیں۔ میرا سب کچھ اس کا ہے۔ اس کی سیوا میں کمی نہیں کر سکتی۔ ہمارا دھرم یہی تو کہتا ہے۔"

اس کے بعد بہت دیر تک نہ وہ بولیں، نہ میں بولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سناٹا بھی سانس سانس کر رہا ہے، جیسے وقت کے پاؤں جم گئے ہیں۔ اس سناٹے میں ہم نے ایک دوسرے کے سانس کی آواز سنی۔ اس طرح کتنا ہی وقت گذر گیا۔ سناٹا کاٹنے لگا۔ تب بُوا نے خاموشی کی بوجھل چٹان کو توڑ دیا۔

"تم سوئے تو نہیں ہوگے۔ میں جانے کیا کیا بکتی رہی۔؟"

کہنی ان کہنی سب کہہ گئی۔ دنیا میں ایک تمہی تو ہو جس سے میں دو رنگی نہیں برت سکتی۔ اچھا! تم آرام کرو، میں ذرا پڑوس میں ایک بچے کو دیکھ آؤں۔"

میں پڑا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ بُوا چلی گئیں۔

٦

میں وہاں سو نہیں سکا۔ دل بہت گھبرانے لگا۔ جو کہانی سنی تھی اُسے حقیقت سمجھنے کے لئے دل تیار نہ تھا۔ لیکن ایسا ہوا تھا، اُسے جھٹلانا بچگانہ حرکت تھی، بیوقوفی تھی۔ علاج یہی تھا کہ اس سے بچ کر چلا جاؤں۔ اُس دنیا میں چلا جاؤں جہاں ہر چیز اور آدمی کی عزت ہے، (خواہ کیسے بھی سہی) جہاں کوئی بھیس نہیں، جہاں راستہ بنا بنایا ہے، ڈھونڈنے یا بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہر خواہش پر دم نہیں نکلتا۔ بُوا کا کیا کروں۔؟ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنا کیا رنگ کروں؟ یہاں کی ہر چیز تلپٹ ہو چکی ہے۔ شوہر کے گھر کو چھوڑ کر اس ذلیل بستی میں آکر رہنے والی عورت، شوہر پرستی اور دھرم کی باتیں کرتی ہے؟

اور مجھ جیسا پڑھا لکھا جاہل اُنھیں سُن کر اس عورت پر لعن طعن نہیں کرتا بلکہ اس سے اور ہمدردی کرتا ہے۔ آہ کتنی بڑی اور ناقابل معافی غلطی ہے۔

ایک دم غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ میں چلا جاؤنگا۔ میں یہاں نہیں رہونگا۔ بُوا گھر جانے پر آمادہ نہیں۔ میں اپنی سی کر کے دیکھ لوں، میں انھیں نہیں لے جا سکتا۔ میں ایک قدم بھی ان کے راستے سے انھیں ادھر اُدھر نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں معلوم میں شاید کچھ نہ کر سکوں گا۔ وہ مجھے کچھ نہ کرنے دیں گی۔ اُن کی عقل ماری گئی ہے۔ وہ سدھرنا ہی نہیں چاہتیں۔ تو میں انھیں کیا سدھاروں۔ مجھے تو اب یہ بھی شک ہونے لگا ہے کہ سُدھار کی انھیں ضرورت ہے یا مجھے۔؟ یہ شک جان لیوا ہو رہا ہے۔ میں بی۔ اے۔ کا ایک نوجوان طالب علم اپنے خیالات میں مست حالات اور زندگی کی طرف دیکھتا تھا۔ [illegible] مجھ پر [illegible] تھی۔

...س اہمیت کے ادھر اُدھر جھانک میں بھی کچھ تو چھپائی ہے، مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے بڑا اچنبھا تھا۔

لیٹے لیٹے میں دفعتاً اُٹھ بیٹھا۔ نیچے بچھے کپڑوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا اور تہ کر کے رکھ دیا۔ سوچنے لگا کہ اس کوٹھری کی سجاوٹ کے لئے کچھ اور بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا کوئی کام سمجھ میں نہ آیا۔ کوٹھری کی ہر چیز اپنی جگہ پر بد تھی۔ کیوں نہ صاف کر دے کو کیا ! جھاڑو دے کر اسے صاف کر دوں۔؟ ہرج ہی کیا ہے۔ جلدی سے جوتا پہن کر تسمے باندھے جھاڑو ہاتھ میں لے کام شروع کر دیا۔ بالکل چپ چاپ وہاں سے جانے کی ہمت نہ تھی۔ احسان کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ مجھ سے تو یہ سہا نہیں جا رہا۔ جھاڑو لے کر ابھی ہاتھ ہی چلایا تھا کہ نُوا آ پہنچیں میں شرمندہ سا ہو گیا۔ جلدی سے جھاڑو پھینک ایسا کھڑا ہو گیا جیسے کہہ رہا ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں، اور غلطی سے ملزم کے کٹہرے میں آ کھڑا ہوا ہوں۔

پرمود یہ کیا سوجھی تمہیں۔؟ کیا ابھی جا رہے ہو۔؟ نیند نہیں آئی۔؟

"ہاں اب جانا چاہئیے۔"

"جانا تو چاہئیے ۔۔۔ مگر کوٹھری میں ایسا کوڑا تو نہیں کہ جھاڑو کی ضرورت ہو۔ اور کیوں بھلا؟ اب جانا ہی چاہئیے؟"

"ماں نے گھر بلایا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔

اُسی سلسلے میں جانا ہے۔"

"بیاہ کی بات چیت۔؟"

"میں نے کہا تو تھا۔"

"میں نے سُنا نہ ہوگا۔ تو بیاہ کی بات چیت چل رہی ہے تمہارے بیاہ میں میں بھی شریک ہونا چاہتی تھی۔"

"چاہتی تھیں کیا مطلب؟ ضرور شریک ہونا پڑے گا۔"

اُنھوں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں رے۔ ضرور شریک ہوں گی۔ میں کیا ایسے کہہ گئی ہوں۔ بات ہی کچھ ہو گئی ہے۔؟"

"بغیر میرے کیسی پکی ہو گی۔ نُوا! میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔ فضول بات نہیں، تم پڑھنے دی اور نوکری لگ جائیگا۔؟ ابھی عمر ہی کیا ہے۔؟"

اس کا جواب دئے بغیر اُنھوں نے پوچھا "نُوا! کیا تم شادی میں بھی نہ آنے دو گی۔؟"

"کیسے آؤں گی۔؟"

"کیسے کیا ہوتا ہے۔؟ آنے کی طرح سے آؤ گی۔ میں سماج کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔"

تم پرواہ نہ کرو تو چل سکتا ہے۔ لیکن مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ پرواہ نہ کروں۔ میں سماج کو توڑنا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ سماج ٹوٹ گیا تو ہم کس طرح رہیں گے۔ کوئی چیز ہمیں بنا سکے گی اور کونسی بگاڑے گی۔ اس لئے میں اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ اس کی بھلائی کے لئے اپنے ہی کو توڑ دوں۔ کبھی سوچا تھا کہ تمہارا بیاہ ہوگا، اپنے میں الگ دل پکڑ کر رہ جاؤں گی۔ لیکن خیر جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے ہوگا۔"

اس دوران میں میں کپڑوں کے ڈھیر پر آ بیٹھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے کہا "تو پھر مجھے تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ یہی نا!"

نُوا نے کسی قدر کھڑے پن سے کہا "ہاں یہ بھی ۔۔۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں کہ غیر ضروری ہوتے بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہاں تمہارا آنا ہی کیا غیر ضروری بات نہیں ہے۔

لیکن کوئی بات بھی اُسے نہ روک سکی۔ اور تم یہاں آ ہی گئے۔ بس ایسے ہی ۔۔۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا "اب نہ آؤں گا۔"

"آنا بھی نہیں چاہئیے ۔۔۔ میں تم کو خود ہی سمجھانے والی تھی۔ جو سماج میں ہیں سماج کا بھرم رکھنے کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ یہاں کا فرض ہے۔ سماج کے کرتا دھرتا ہی زندگی کے نئے نئے تجربے کر سکتے ہیں ۔۔۔ پرمود، یہ بات تو صحیح ہے کہ بیچ کے لئے نئے تجربے ہونے چاہئیں ۔۔۔ لیکن ان تجربوں میں انھیں کو پڑنا چاہئیے جو سماج سے بلند ہو چکے ہیں ۔۔۔"

میں اس قدر گھبرا گیا کہ بیٹھ اُن کی کوئی بات نہ سمجھ سکا۔ آج وہ باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ اور دیکھتا ہوں کہ جو شاستروں میں نہیں ملتا وہ درد کی تڑپ اور درد کریب میں مل جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کی اتنی گمبھیر سچائی کو وہ آسانی سے کس طرح لبوں پر لا سکتی تھیں۔

میں نے اُس وقت کہا تھا "نُوا۔ اب میں نہیں آؤں گا۔ میں ایک فیصلہ مشکل سے کر آیا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ میری ہمدردی کا کسی کو ضرورت نہیں

تھے۔ لیکن حالات کے اس بے رحم دھارے میں اپنے آپ کو اس طرح بہا دینے پر بھی آمادہ نہ تھا۔

..... وہاں کیا ہوا ہوگا۔؟ کیا وہ آدمی اب تک چلا گیا ہوگا۔؟ پھر اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔؟ کچھ بھی ہوا ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں....؟

دل میں ایک گرہ سی پڑ رہی تھی — نہ کھلی تھی، نہ کھلنی تھی۔ کچھ چھیڑو تو اور الجھتی اور کستی جاتی تھی — کچھ تو ہونا چاہیے — ضرور کہیں گڑبڑ ہے — کہیں کہیں، ہر جگہ گڑبڑ ہی ہے — زندگی میں غلطی ہے، سماج میں غلطی ہے، اس پوری کائنات میں غلطی ہے یہ رات دن کا چکر محض اُوٹ پٹانگ ہے۔ میل جول جھوٹ ہے، ایثار و قربانی بے معنی — اس بے ہنگم پن کا کچھ نہ ہوگا کچھ تو اس کا کرنا ہوگا۔

لیکن کسی بات کا سرا ہاتھ میں نہ آتا تھا۔ دل گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ اس انتشار میں ساتھیوں سے ملنا جلنا میرا بہت کم ہو گیا وہ چڑانے لگے۔ میں نے پروا نہ کی۔ یہ خیال کہ امتحان دینا ہے ہر وقت ذہن میں چکر کاٹتا رہتا — امتحان دینا ہے اور اچھے نمبر لے کر نام پیدا کرنا ہے۔ لیکن سماج سے میری بے تعلقی بڑھتی جا رہی تھی۔ انفرادیت کا وہ پودا ہی سوکھ چکا تھا جو سماج کی کھلی فضا میں پھل پھول لاتا ہے۔ کم تعلقی یا بے تعلقی سے گھٹن کو دور کرنے سے جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ مجھے نہ ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کرنے یا نہ کرنے کے قابل کام میں کر رہا ہوں — ایک دن ایسی ہی حالت میں میرے پاؤں کلکتے سے اس قصبے کے اسٹیشن کی طرف اٹھ گئے

لیکن وہ لڑکی کی دکان کہاں تھی —؟ اس کو ٹھری میں کچھ اور لوگ آ گئے تھے۔ کرایہ دار تھے جنھیں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اس آدمی کے متعلق معلوم ہوا کہ بہت دن ہوئے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ اور اپنی عورت کو مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔ لیکن پھر اس عورت کا کیا ہوا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ مرد کے جانے کے بعد بھی وہ عورت [illegible] کپڑے سی کر پیٹ بھرتی تھی۔ [illegible] عورت تھی [illegible] کام آتی [illegible] اور [illegible] کام کو تیار رہتی — لیکن [illegible] کسی کو نہیں معلوم۔

جب اور کھود کھود کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ [illegible] سے تھی اور اکثر اسی فکر میں مبتلا رہتی — اور کبھی کبھی اسپتال جانے کی بات بھی کرتی تھی۔

میں نے اسپتال میں جا کر چھان بین کی — بشیر کے اسپتال میں پانچ مہینے ہوئے کہ مرنال نام کی ایک عورت آئی تھی اس کے یہاں ایک لڑکی ہوئی تھی۔ چار دن کے بعد اس لڑکی کے چیچک نکلی۔ وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ نرسوں کو کچھ زیادہ یاد نہیں۔ پندرہ روز بعد لڑکی اچھی ہو گئی۔ اسی روز سے اس بچی کا نام رجسٹر میں نہیں ہے —؟

کہاں گئی —؟

میرے سوال پر اسپتال کی بڑی لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھتی رہ گئی، بولی "کیا آپ سچ مچ سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب ہم دے سکتے ہیں —؟"

میں نے کہا "ہاں! ہو بھی سکتا ہے کہ آپ جواب دے سکیں!"

"مجھے آپ پر تعجب ہوتا ہے!"

میں نے کہا "میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اپنی بچی کو مشن میں تو نہیں دے دیا تھا!"

بولیں "ہاں — یاد آیا — مہینہ کون سا تھا —؟ ہاں ستمبر۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے — وہی کیس ہوگا — عمر کیا تھی —؟"

"کوئی چوبیس پچیس!"

"ٹھیک — صاف رنگ —؟"

"ہاں اچھا کھلا ہوا رنگ تھا۔"

"ٹھیک — پھر تو وہی کیس ہے — ہم سے وہ کچھ کام مانگتی تھیں — نرس بننے کو تیار تھیں — انگریزی بھی جانتی تھیں نا؟ اچھی لڑکی تھی — مجھے یاد ہے۔ ہم نے کہا بچہ مشن کو دے دو اور تم عیسیٰ مسیح کو پہچان لو تو یہاں رہ سکتی ہو — اور کام کر سکتی ہو — وہ نہیں مانی۔ ہندوؤں میں بھی کوئی لڑکی ہے — وہ تو کون تھی —؟ [illegible] سمجھا کہ مسیح خدا کا [illegible] ہے۔ دنیا کو راہ بتلانے والا — اس کو پہچان لینا چاہیے۔ سمجھے نا —!

میں نے دریافت کیا "پھر کیا —" "وہ نہیں مانی —! چلی گئی"

یا اب میں نہیں آؤں گا۔"

اب سوچتا ہوں کہ اتنا سمجھدار ہوتے ہوئے بھی ایسی بیوقوفی کی بات میں نے کیسے کہہ دی۔ اس کے جواب میں بُوا نے جو کہا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔

اُنھوں نے کہا تھا۔

"پر مود! مدد کی میں بھوکی نہیں ہو لیکیا۔ تجھ سے ہی مجھے مدد نہ ملی تو کس سے ملے گی۔ لیکن تو مدد دے کر مجھے اُس بار بھائی ہونے کا جتا جانا چاہے ں۔۔۔۔ بھائی! مجھے معاف کر دے۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ مدد مجھے اس لئے چاہئے کہ کوئی مجھے کچلے تو کچلی نہ جاؤں۔ اور مجھ میں اتنی ہی ہمّت ہو کہ اس کے گناہ کے بوجھ کو بھی سہار لوں۔ اور سب کے لئے اچھائی کی لوں۔ بڑائی مجھے کیوں چاہئے؟ بس یہ چاہئے کہ جیسی بھی زندگی ہے شکر سے گذر جائے۔"

اُن کے یہ الفاظ بھی اُس وقت میری سمجھ سے اونچے تھے۔ میں نے اُس سے کہا تھا "میں جاؤں۔؟"

اُنھوں نے کہا تھا "ہاں! جانا ہے تو جاؤ۔۔۔ خوش رہو"

جاتے جاتے میں نے دل کو سخت کر کے کہا تھا "کچھ ضرورت ہو تو لکھنا۔"

بُوا نے ہنس کر جواب دیا تھا "ہاں لکھوں گی۔"

میں کھڑا ہو گیا تھا، کوٹ اُنھوں پر ڈال لیا تھا، ہیٹ ہاتھ میں تھا۔

اس ہیئت میں ان کے سامنے چلنے کو تیار کھڑا اپنے آپ کو عجیب بے زیب سمجھ رہا تھا۔ جھک کر ان کے پیر چھو لوں۔؟ ضرور چھونے نہیں۔۔۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ بن پڑا۔ اس وقت میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو اس طرح دیکھا جیسے دیر ہو رہی ہے۔ پھر ذرا مسکرا کر کے کہا "اچھا بُوا، پرنام!"

اور کہتے ہی مڑ کر چل دیا۔

بُوا نے کہا "سکھی رہو بھیا۔" اس دعا اور شفقت نے جسم میں ارہ بھر دیا۔ قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں یوں چلنے لگا گویا مڑ کر دیکھا اور کسی نے پکڑا۔ لپک ڈگ بھرتا باہر آیا اور سیدھی سٹیشن کی راہ لی۔ راہ چلتے کی دکان پر بھی نظر پڑی، جہاں وہ شخص اللہ کی خدمت کے مقابلے ٹکا ٹکا کر کے تول رہا تھا۔ اس خدشے کہ

کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ میں نے ہیٹ نیچا کر لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا چل گیا۔

۷

گھر پر ماں نے پوچھا: "کہاں رہ گئے تھے؟ ہوسٹل میں کہتا تھا کالج سے تو اُس سے ایک روز پہلے تم نکل گئے تھے۔"

میں نے کہا "بُوا کے ڈھونڈنے میں لگ گیا تھا۔ وہ اس شہر میں رہتی ہیں۔"

میری بات کے بچھو نے ڈنک مارا۔ ماں نے پوچھا "کون؟"

"بُوا۔۔۔ میں اُن سے مل کر آ رہا ہوں۔"

"کیا۔۔۔۔!۔۔۔۔ میں۔"

"ماں وہ یہاں نہیں آ سکتی۔؟"

ماں نے زور سے کہا "کان کھول کر سن پرمود۔ تیری بُوا اب کوئی نہیں۔ میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔"

لیکن سنتی ہو ماں۔ میں نے کہا "میں انھیں نہیں بھول سکتا۔"

ماں نے کہا "تو جو چاہے کر۔۔۔ لیکن خبردار جو کبھی اس کی کوئی بات کہی۔۔۔ کلنک کہیں کی۔!"

بُوا کے نام سے ماں کو جو نفرت تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے انھیں اس نام سے تکلیف ہو رہی تھی، اور اس تکلیف کا اظہار ان کے الفاظ میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں یہ نہ سمجھ سکا تھا۔ لیکن ان کا یہ رویہ مجھے اچھا معلوم نہ ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں اپنے کو ماں سے الگ سمجھ رہا تھا۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ شادی کی جو قرارداد اٹھائی گئی میں نے اسے منظور نہیں کیا۔ ماں ناراض ہو گئیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ دنیا میں میں اکیلا ہوں، کوئی کسی کا نہیں۔۔۔ ناتے رشتے محض نام ہیں۔

زندگی وقت کے بہاؤ میں بہتی رہی۔ بی۔ اے کا امتحان نزدیک تھا۔ میں اس میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کہ بُوا کی یاد مجھے بار بار پریشان نہ کرے۔ لیکن بے سود۔ اُن کی یاد تو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اُن کی وجہ سے اس دنیا کا بہت کچھ بے رنگ، بے کیف اور فضول معلوم ہوتا تھا۔۔۔ جیسے سب چیز لٹی لٹی، اُجڑی اُجڑی۔ خواہشات دم توڑ چکی تھیں۔ دلچسپی کے تعلقات جن سے زندگی کو رس ملتا ہے، وہم معلوم ہوتے

نحوست تو بنا کام بگاڑ دیتی ہے بھیا۔ سوچ رہی ہوں کہ کہیں نہ چلی جاؤں۔"

"لیکن سن پرموا میں کہتی ہوں اب کوئی بیوقوفی مت کرنا۔ اس بار آگیا تو آگیا، آئندہ کبھی مت آنا بھیا۔ میرے حسب نسب کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اور سن، شادی کی بات چھڑی ہے تو کرنی ہی ہوگی۔ لڑکی میری دیکھی بھالی ہے۔ خوبصورت ہے، خوش مزاج ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "تو تمہاری رائے ہے کہ یہ رشتہ قبول کر لیا جائے۔؟"

"ضرور۔!"

"اچھی بات ہے۔ کروں گا۔ اب تک تو کچھ اور سوچا تھا لیکن اب مجھے سب سے کھل کر کہہ دینا ہوگا کہ تم میری بوا ہو۔"

انھوں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور بولیں، "نا، نا۔ نہیں بھیا، نہیں۔!"

"میں دھوکا نہیں دے سکتا۔ شادی کے معاملے میں تو دھوکا دے ہی نہیں سکتا۔ شادی جیسا اہم مسئلہ، جو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے، دھوکے کی چٹان پر کھڑا کیا جائے۔؟"

بوا نے کہا، "دھوکا تو آج یہ ہے کہ میں تیری کوئی بھی ہوں۔ بتا کیا اب بھی میں تیری بوا ہوں۔؟ بتا میں تیری کون ہوں اب۔؟ کبھی میں تیری کچھ تھی۔ اس وقت یہ سچ تھا کہ میں تیری پھوپھی تھی لیکن اس رشتے کے ان مول موتی کو میں نے گمراہی کے ایسے اتھاہ سمندر میں پھینک دیا، جہاں سے اُسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ تو چاہتا ہے کہ جبراً مجھے اکرام سے سچا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دھوکا ہے۔ پرموا، مجھے میرے حال پر چھوڑ، یہاں سے چلا جا تیرا یہاں زیادہ رکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے۔"

انکی آخری بات نے مجھے زیادہ اداس کیا۔ میں سچ ہی تو کہ رہی تھی بے شک میرا یہاں رکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔؟ میں آج یہ سوچ کر تعجب کرتا ہوں کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔؟ اپنے اوپر ہے کہ ہم اپنی پیدائش کو ٹھیک کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں کے اپنے منہ ہیں، اپنی زبانیں۔ وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ کیا کریں۔؟ پھر ان پر کس کا زور چل سکتا ہے؟ انسان کہاں یہ بوجھ خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کرتا۔ وہ کیوں اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنتا۔ کیوں اپنے اندر کے سچ کا خیر مقدم نہیں کرتا۔؟

میں وہاں دو روز ٹھہرا رہا۔ سب نے دیکھا کہ میری ماسٹرنی سے جان پہچان ہے۔ اور اب بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر یہ کسی نے اس طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی کیونکہ ماسٹرنی جی اپنی اصول میں اتنی بھلی اور اونچی تھیں کہ میرا ان کی طرف میلان کسی کو برا نہیں لگا۔ یہ دن ہنسی خوشی گزر گئے۔ اور وہ جو تھی، خود بوا کی طرف سے میری فکر بھی کم ہو گئی۔ وہ چار آدمی ایسے ہی کہ ان کا حال پوچھ لیتے ہیں بھلا برائی آسانی سے مل جاتی ہے۔ سب مجھ سے خوش تھے۔ بچے ہر وقت مجھے گھیرے رہتے۔ سالے سالیاں اب مجھے نئے رشتے کے مطابق پکارنے لگی تھیں۔ اس درمیان میں راج متنی بھی صرف ایک بار نظر پڑی۔ بڑی بھولی بھالی اور بے حد زیب معلوم ہوتی تھی۔ شرمیلی اتنی تھی کہ بمشکل ایک پل رکتی اور بھاگ جاتی۔ منگنی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔ مجھے بہت سے روپے اور ناریل بھینٹ چڑھائے۔ اُس وقت میرے دل میں پھر بہت سے سوالوں نے سر اٹھایا۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ دل کا بھید چہرے سے ظاہر نہ ہو۔ پتہ نہیں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا۔ لیکن باوجود کوشش کے طبیعت تھی کہ بند ہی ہو جاتی تھی۔ مجھے بار بار الٹا سا خیال آتا تھا کہ میں کیوں سچائی کو چھپا رہا ہوں۔ یہ الجھن آخر میں اتنی تیز ہو گئی کہ چلتے وقت میں نے جرأت کر کے ڈاکٹر سے کہہ دیا کہ ماسٹرنی میری بوا ہے۔

توقع کے خلاف ڈاکٹر نے میری بات سن کر تعجب یا پریشانی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ میری ہمت بڑھ گئی، اب میں نے بات کی اور وضاحت کر دی کہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں، بلکہ ماسٹرنی میری بوا ہے اور بوا سمجھ کر سے ہمیشہ اپناؤں گا۔

پھر ڈاکٹر کے چہرے پر رنگ بدلنا شروع ہوا۔ لیکن صرف اتنا۔

"آئی سی۔ دیٹس ویری ڈیپ ٹاک۔؟"

ڈاکٹر کی اس روشن خیالی نے میرے شبہات دور کر دیئے بلکہ میں دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا کہ میں خواہ مخواہ لوگوں کے متعلق کیا کیا سوچ رہا تھا۔ راج متنی نے مجھے مسکراہٹ کے ساتھ الوداع کہا۔

لیکن تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ ـ حالات میں ایک غیر متوقع تبدیلی ہوئی جو کسی سے سنبھالے نہ سنبھل سکی ـ رخشندہ فوت ہو گئیں میری ساس (دو جو مرتے مرتے رہ گئیں) رخشندہ کی ماں اس صدمے کی تاب نہ لا سکیں اور ختم ہو گئیں ـ اور نہ صرف یہ بلکہ پوری برادری نے اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا ـ ڈاکٹر صاحب البتہ حالات کی اس تبدیلی پر بہت مغموم تھے ـ آخر تک ان سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار رہے ـ وہ خطوں میں ہمیشہ وہی لب و لہجہ اختیار کرتے جو ایک بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے ـ سندھی کے دوسرے رشتے پر بھی انہوں نے اپنی آمادگی ظاہر نہیں کی اور یاد پڑتا ہے کہ بعد میں اس شادی کا نتیجہ بھی کچھ خوشگوار نہ ہوا تھا ـ بہر حال، جو کچھ اور جیسا کچھ بھی رہا ہو ـ ڈاکٹر کی رائے خاندان کی عزت اور شرافت اور برادری کی رضا کے آگے نہ چلی ـ یہ سب کچھ تو تھا لیکن ٹیچنگ کی وہ ملازمت بہت جلد ختم کر دی گئی ـ نوکری پہلے ہی چھوٹ گئی تھی ـ

اس ملازمت کے چھوٹ جانے کا مجھے سخت افسوس ہوا ـ فوراً ایک خط لکھا، پھر ایک تار دیا ـ خود اس پار جانے کا موقع نہ مل سکا ـ نہ خط کا جواب آیا اور نہ تار کا ـ تب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے ـ چھوڑ کر کہاں گئیں کون جانے ـ؟ اس دنیا میں کس گھر کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے ـ کہ وہ سر چھپا سکیں ـ؟ لیکن دنیا صرف گھروں اور دروازوں میں ہی تو بند نہیں ہے ـ ہو سکتا ہے کہیں چلی ہی گئی ہوں گی، پوری دنیا انہی کی ہے ـ

کہانی طویل ہوتی جاتی ہے ـ ختم کر دینی چاہیے ـ اب زندگی بھی تو ایک کہانی سے زیادہ اور کیا ہے ـ ان کی کہانی میں اب وہ دلچسپی بھی کہاں رہ گئی ہے ـ

واقعات اور سانحات ہوتے ہیں، گذر جاتے ہیں ـ ہم زندگی گذارتے ہیں اور مر جاتے ہیں ـ زندگی کا آغاز کس موڑ سے اور کس طرح ہوا سب کہتے ہیں، لیکن وہ کون سا دوسرا کنارہ ہے جہاں پہنچ کر طبیعت آسودہ ہو جاتی ہے [illegible] کوئی سراغ نہیں ملتا [illegible] ہاتھ [illegible]

[illegible] ہم اپنی زندگی [illegible]

تارک سی تاؤ اس میں کچھ نے کے لیے اترتے ہیں ـ لیکن تیرتے ساحل ہی پر ہے آگے تھاہ نہیں ہے ـ ہمت والے آگے بھی بڑھتے ہیں ـ کچھ موجوں کا شکار ہو جاتے ہیں ـ کچھ ہاتھ پیر مارتے نظر آتے ہیں ـ لیکن ساحل پر سے دیکھنے والوں کا ایک اژدحام ہے کہ سانس لینے کی جگہ کے لیے ہائے ہائے کر رہا ہے ـ چھین جھپٹ کر رہا ہے ـ اور کرے بھی کیا ـ؟ یہ ہجوم غیر آپس میں لڑتا جھگڑتا ایک محدود دائرے میں چکر بھی کاٹ لیتا ہے، جگہ لیتا ہے ـ تینوں طرف سمندر کس جوش میں ہے ـ ہے ـ ہمیں کہاں اتنی فرصت ہے کہ اس کے جوش اور اس کی گہرائی کو دیکھیں ـ ہمیں اور کام بہت ہیں ـ

اس طرف توجہ بھی کریں تو معلوم ہوا اس سمندر کا کہیں اور چھور بھی ہے ـ؟ دوسرا کنارہ ہے کہیں ـ؟ کوئی دوسرا ساحل بھی نہیں کہ ہماری تھکی آنکھیں کچھ دیر اسی سے تازگی اور روشنی حاصل کر لیں ـ ایک لق و دق میدان ہے جس کا کنارہ افق سے ملا ہوا ہے ـ ہاں دھندلکوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ضرور ہے لیکن چھور اس کا بھی نہیں ـ چھور اگر ہے تو ہماری نظر کا ـ عقل مایوس، ناکام واپس آ جاتی ہے ـ

ہاں کچھ شور مست فریب ہستی ـ اس سمندر کی تہ نہیں ہے یہاں آواز، فریاد، نالہ پانی کی سطح پر تیرتا ہے ـ ایک سناٹا ہے جو دور دور تک مسلط ہے ـ آوازیں، فریادیں اور نالے سب اس اژدہے کے منہ میں چلے جاتے ہیں ـ

سبکساران ساحل ہی رہیں تو ٹھیک ہے ـ یہاں ہمارے پیر زمین کو تو ـ چھو لیتے ہیں، یہاں ہمارا لنگر [illegible] کا سہارا تو دے لیتا ہے ـ یہاں کھڑے کھڑے ہم اس بحر ناپیدا کنار کی بے کناری پر ایک نظر بھی ڈالیں تو کیا کم ہے ـ؟ اتنا ہی بہت ہے ہمارا دل تو اسی سے سہم جاتا ہے ـ ہماری نظر تو اسی سے تھک جاتی ہے، ہمارا سر تو اسی سے سہم جاتا ہے ـ قوت برداشت ساتھ چھوڑ دیتی ہے ـ پھر بھی برداشت کر لیتے ہیں، جھیلتے رہیں، کنارے کنارے بڑھتے رہیں، موجوں سے بچتے بچاتے، سسکتے، سنبھلتے ـــ بس یہی انسان کی زندگی ہے ـ

تو اس سمندر کی طغیانی میں کیوں آنکھیں ساحل پر [illegible]

یاد ہے کہ یہاں پاؤں ٹکانے کے لئے دھرتی نہیں ہے — پانی ہی پانی ہے — میں نے ساحل پر کھڑے پکار کر کہا۔

"یہاں آجاؤ نوا — یہاں آجاؤ — میں پرمود ہوں — تمہارا بھتیجا — جسے تم نے پیار کیا ہے، جسے تم نے لوریاں سنائی ہیں — آجاؤ — یہاں آجاؤ — یہاں ہم سب ہی ہیں — یہاں دھرتی ہے اور مضبوط بھی ہے — یہاں کسی بات کا خوف نہیں۔ آرام ہی آرام ہے۔ اطمینان ہے، آسودگی ہے — زمین خشک ہے۔"

میری پکار بہت دیر میں پہنچی۔ نوا کے گلے تک پانی آچکا تھا۔ وہ ہاتھ پیر مار رہی تھیں — اسے تیرنا کیسے کہا جائے؟ تیرنے کی تو انھوں نے کبھی مشق بھی نہیں کی۔ موجوں کے دوش پر لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"نہیں، پرمود نہیں — تم میرے وہی پرمود ہو۔ لیکن کنارہ ایک دفعہ چھوٹا تو چھوٹا — پرمود، میرا سانس پھول رہا ہے۔ بہت تھک چکی ہوں — اگر تھک کر اس سمندر کی گود میں سو بھی جاؤں تو کیا ہرج ہے۔ میرا پریم او پرمود — تم نہیں جانتے کہ جہاں سویر نہیں نکلتا وہیں تیرا جاتا ہے — میں بھی تیر رہی ہوں — انجام سے بے خبر! اس بھنور سے واپس کنارے پر آجاؤں —؟ نہیں نہیں، میں اتنی کم ہمت اور کم ظرف نہیں ہو سکتی۔"

میں نے رسی پھینکی، انھوں نے نہیں پکڑی — مسکرا دیں اور کہا "تمہاری بڑی احسان مند ہوں پرمود —!"

میں پوری طاقت سے چلایا "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔ اگر کرتی ہو تو آجاؤ۔"

وہ ڈبکیاں کھانے لگیں۔ ان کی ڈبکیاں لگاتی آواز آئی "تم سے پریم کرتی ہوں، بہت پریم کرتی ہوں، اسی لئے تمہیں نہیں بلا سکتی۔ اور تمہارے پاس تو آ ہی نہیں سکتی — پانی کی چادر کھینچ ہی جاتی ہے۔ مجھے اس پار جانا ہے۔"

میں نے خفا ہو کر کہا "جاؤ — میں اب تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

انھوں نے کہا، "دیکھنا بھی نہیں چاہئے — برابر دیکھتے رہو تو کنارے سے پیر اکھڑ جائیں گے۔"

میں غضبناک ہو کر چیخا "جاؤ، ڈوبو — مرو —!"

میری غضبناکی نے ان کی ہنسی کو اور تیز کر دیا۔ بولیں، میرا لعل، مرنا اتنا آسان ہوتا تو اچھا ہی نہ ہوتا — نہ جانے ابھی کتنے تھپیڑے کھانے ہیں — لیکن تم ان تھپیڑوں سے دور رہو — تم سے محبت کرتی ہوں، اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔

..... آخری بار جب ان سے ملا تو ان کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا — کوئی خطرناک مرض ان کے پیچھے پڑ گیا تھا — وہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑی تھیں — دوا دارو کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کچھ پڑوسیوں کی ہمدردی انھیں ضرور حاصل تھی۔ لیکن ان کی یہ ہمدردی اس حد تک تھی جہاں پیسے کا سوال آتے ہی ہر اچھی چیز ایک بڑا صفر بن کر رہ جاتی ہے۔ بڑا تعجب یہ تھا کہ اس بار انھوں نے قصداً مجھے خط لکھا تھا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی خبر انھیں بہت دنوں میں ملی تھی، لیکن ملتے ہی انھوں نے فوراً خط لکھا تھا — اس خط کو کتنی بار پڑھ چکا ہوں، میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔ پڑھتا ہوں لیکن اس سچ کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھوں۔ خط میں لکھا تھا۔

"پرمود! ماں نعمت ہوتی ہے — میں تو پیدائش سے ہی اس نعمت سے محروم ہوں۔ مجھے بڑا رنج ہے کہ میں سورگ باشی کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ چاہتی تھی کہ جیتے جی ایک بار ان کے قدموں پر گر کے معافی مانگ لوں، لیکن وہ میری بدقسمتی۔ میرا یہ چاہا بھی پورا نہ ہو سکا۔ میں اپنی بدقسمتی کو گلے لگاتی ہوں۔

"پرمود، کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ اس لئے میں نے اوپر اپنا پتہ بھی لکھ دیا ہے۔ میں جانتی ہوں تم آؤ گے — میرے پہلے پتہ بھی تم نے ضرور جہاں تہاں سے کی ہوگی — اور وہ خط اور تار تم نے کیوں بھیجے تھے، ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ان باتوں سے فائدہ —؟ میری بات بھی چھوڑو، یہ بھی اب بیکار ہو چکی ہے۔ زندگی ایک آزمائش ہے — میں نے تو کہا زخم بنا ہی لی ہے۔ آتے ہو تو آجاؤ — لیکن مجھ سے کوئی امید لے کر نہ آنا۔ اس بار جن لوگوں کے بیچ بسیرا ہے، وہ سماج کا بچا کھچا جھوٹا کھاتا ہیں، اور کون جانتا ہے وہ جھوٹن بھی ہیں یا نہیں — بہرحال! انسان ہیں۔ یہ بات میں جو ان کے درمیان رہ رہی ہوں، تم سے صاف طریقے پر کہہ رہی ہوں — میں کسی اور سہارے پر نہیں رہنا چاہتی۔ اب تو ان کی انسان سوز انسانیت ہی کے سہارے جینا ہے۔ مدت کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم سے لوگوں کے ٹھیک ٹھیک بات ہو ہی نہیں

زندگی گزار سکتی ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ میری اور
کوئی پناہ گاہ نہیں ہو سکتی۔۔۔ اس کے علاوہ اور کسی سہارے پر جینے
کی ہمت بھی نہیں رہی۔۔۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان
میں سے بدمعاش اور رنگین لوگوں کے دلوں میں بڑائی، بدمعاشی
اور کمینہ پن کی تجارت کے جیسا ایک بازار بھی ہوتا ہے۔ اس تمہ کو
دنیا بھی یاد رکھے گی [illegible] سفید صورت [illegible]
بنتی ہے۔ اس سے میرے لئے اب یہ کہنا بہت مشکل نہیں رہا ہے
کہ سب کے حالات [illegible] ہے۔۔۔ نہ [illegible]
میں۔۔۔ اس لئے یہاں سے نکل کر اور کہیں نہیں جا سکتی۔ اور
جاؤں بھی کہاں۔؟

"تم پوچھتے ہو، یہاں رہنے میں کیا فائدہ۔؟" تو فائدہ بہت ہے
یہاں کسی کو کچھ کا حق نہیں کہ میں آوارہ ہوں یا پاکباز۔ یہاں
پاکیزگی سے انسان کی قدر و قیمت نہیں ناپی جاتی۔۔ یہاں تو یہ
جانچی جاتی ہے۔ اس کی کیا بازاری قیمت کتنی بڑھتی ہے
میں [illegible] ہوں کہ یہاں کا سب سے [illegible] سب سے بڑا
[illegible] ہے۔ لیکن اس [illegible] فائدوں کی کمی نہیں ہیں
اس [illegible] اگر یہ ممکن ہے کہ اپنے کو [illegible] ظاہر کرے۔۔ وہ [illegible]
سے [illegible] نہیں ہوتا۔ پاکبازی [illegible] اس بازار
میں کوئی چیز نہیں [illegible] دل کی گہرائی [illegible]
[illegible]

کھل جاتی ہے، ٹھیک یہاں جو کبھی نہیں سکتا۔ اس بازار میں صرف
اور خالص سونے کا سکہ چلتا ہے، کیونکہ اُسے پرکھنے کی ضرورت ہی
نہیں کہ وہ اصلی نہیں ہے۔ یہاں نہ سونے کے [illegible] ہے
ملاوٹ۔ گھبراہٹ کہ جب جب اس بات کا خطرہ کہ تمہارے
پاؤں اس بازار میں اگر سونے کی جگہ لے لے گا۔ یہاں کا تو بہرحال کسوٹی
ہے جو پیتل کو اپنی صفوں میں قدم ہی نہیں رکھنے دیتا۔۔ میرا ایمان
ہے کہ پیتل وہ ہے پاؤں اس بازار میں اگر سونے کی جگہ لے لے گا یہاں
کا تو بہرحال کسوٹی ہے جو پیتل کو اپنی صفوں میں قدم نہیں رکھنے دیتا
میرا ایمان ہے کہ جو اس کسوٹی پہ پورا اترے گا، وہ ہر ایک کو پہلا ہے
میرے مرد! تمہاری کمی میں شادی کروں گا۔ تم شادی کرو تو یہ بہتر ہے
تم نے ابھی زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ پڑھنے کے ابھی سر
اُٹھایا ہے۔ تمہارا مزاج نازک، خیالات بلند اور پاکیزہ ہیں۔ یہاں
بلندی اور پاکیزگی نہیں ہے۔ یہاں گندگی اور غلاظت ہے۔۔ اتنے دن ساتھ
رہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بلند خیالات اور پاکیزگی کا احساس
ہی مٹ گیا ہو۔ تم شادی کر لو یہی ٹھیک ہے۔ تمہارا [illegible] دنیا کی
سے برداشت نہ ہو سکے گا [illegible] زندگی اور [illegible] دنیا کے لوگوں [illegible]
ہے ایک تم ہی تو ہو جسے میں جانتی ہوں، جس سے میں محبت
کرتی ہوں ورنہ نہ میں کسی کو جانتی ہوں اور نہ کوئی مجھے جانتا ہے
لیکن صرف تمہاری وجہ سے اب تک میں اس دنیا کے لوگوں سے
نفرت نہیں کر سکی ہوں۔ تم نہیں جانتے پرمود! تم ان جانے میں
مجھ پر کتنا بڑا احسان کر رہے ہو۔ جس سطح پر تم ہو، تمہارے
ساتھ میں انسان سے نفرت کا تصور بھی کر سکتی ہوں۔ جب بھی کبھی اس
نفرت کی سوچ میرے دل میں جیسے اُبھرتی [illegible] جاتی ہے لیکن
تمہاری یاد اسے نیچا [illegible] دیتی ہے۔ اور اس طرح نفرت
کے اس زہر سے میرا وجود محفوظ ہے۔ اور تمہیں یاد کر کے
اسے طاقت ملتی ہوں۔ تمہارا یہ [illegible] پاک رکھتا ہے۔ لیکن ڈر
ہے کہ تم یہاں آؤ اور رہا تو تمہارا یہ [illegible] بھی میرے ہاتھوں سے
جاتا رہے۔ پھر میرا کیا حشر ہوگا۔۔۔؟ زندگی اندھیرا ہو جائے گی
بکھر جائے گا۔۔ نراشا چاروں طرف سے مجھے گھیرے گی پھر
اتنی بڑی بہار سی زندگی کے بیچ میرا کتنا سہارا ہوگا۔۔؟ اب تو
اس سہارے ہی کی وجہ سے دل اُٹھا کر کے [illegible] اور کچھ [illegible]

سے رہتی ہوں، پھر تو یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ مر جاؤں گی، اس کا ڈر نہیں
ڈر اس کا ہے کہ جیون کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ مرنے اور مٹنے
میں فرق ہے۔ زندہ رہ کر مرنا کیا ہوتا ہے اور مر کر مرنا کیسا ہے
دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے خوف ہے کہ تم آئے تو کہیں یہ
زندہ رہنا مجھ سے نہ چھوٹ جائے۔ جہاں میں ہوں، وہ جگہ تمہارے
آنے کے قابل اور دیکھنے قابل نہیں ہے۔ میں صرف تمہارے سہارے
ہی یہاں رہتے ہوئے بھی یہاں کی نہیں ہوں۔ تم مت آؤ پرمود۔
مت آؤ ۔۔۔ آئے تو تم جانو.....

یہ اتنا لمبا چوڑا خط میں نے کیسے لکھ لیا۔ میں خود نہیں جانتی
لیکن کسی اور کو اتنا لمبا خط تھوڑی لکھ سکتی تھی۔ یہ باتیں صرف تم
سے ہی کہہ سکتی تھی۔ لیکن میں نے لکھ کیسے دیا؟ انھیں تو میں سوچ
بھی نہ سکتی تھی۔!

"پرمود! اسے نامکمل مت سمجھنا۔ میں تمہیں پکاروں اور کہوں
کہ میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے لے چلو، کہوں گی لیکن تب جب جی کا حوصلہ ساتھ
چھوڑ دے گا، جب یہ زندہ رہنا چھوڑ دے گا ۔۔۔ یہ میں تم سے
وعدہ کرتی ہوں ۔۔۔ تم مت آنا پرمود!"

لیکن میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ فضول کیوں طول دوں۔
جہاں اور جس حالت میں میں نے بوا کو پایا، اس کا بیان کرتے
ہوئے قلم کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ میں بیان نہیں کروں گا، لیکن
اس خطے سے اس جگہ کا اندازہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا، جہاں شہر
کی ساری غلاظت اور سارا تعفن جمع ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کی بیوائیں
بے کار، مجبور، معذور، پیشہ ور بھک منگے، قانون کی آنکھ اور جیل
سے بچ کر چھپے کام کرنے والے یہاں آباد تھے۔ بوا وہاں کیسے گئیں
وہ بیمار تھیں، پلنگ سے لگی تھیں۔ اوپر بیان کی ہوئی صفتیں رکھنے
والے چار پانچ عورت، مرد ان کے پاس تھے۔ ان کے چہروں
سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوا کی وجہ سے وہ فکرمند ہیں۔ لیکن بات بڑی
دوری واقف سے کرتے تھے۔ اور وہ باتیں اس ڈھنگ سے کہ اور
ان کی باتوں سے کچھ سمجھ آتی تھی۔ اگرچہ وہ بوا کی عزت کرتے تھے
لیکن بات ایسے تھے اور تو شرافت سے کرتے تھے۔ میں اور
شہر کو یہاں آتے شرم آتی تھی۔ بوا کے پلنگ کے پاس بھی ان کے
ساتھ ایسا ان کی اشارے ہوا کئے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر

اپنے سرہانے پا کر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے میں کسی
غیر ملک کا ڈراؤنا اور بھیانک جانور تھا۔ ان میں سے بہت سوں
کی باتیں اور اشارے بتلاتے تھے کہ وہ مجھے اس پلنگ پر پڑی بیمار
عورت کا پرانا عاشق سمجھ رہے ہیں، ایسا عاشق جس کے عشق نے
اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے۔ ان کے ان اشاروں اور کچھ
دار باتوں نے مجھے کاٹ کاٹ دیا۔

پلنگ پر خاموش پڑی بوا۔ یہ سب کچھ سنتی اور دیکھتی تھیں
اور کسی سے کچھ نہ کہتی تھیں ۔۔۔ لیکن کبھی کبھی کسی کی حد سے زیادہ
چھچھوری بات پر ڈپٹ بھی دیتی تھیں اور ان کی ڈپٹ بے کار بھی
ثابت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اکثر وہ اس طرف سے اداس رہتی تھیں
میں نے کہا۔ بوا! چلو۔ میں لینے آیا ہوں۔"
"کہاں لے چلو گے۔؟"
"اب تو گھر بسا بسایا ہی رہ گیا ہے۔ شادی ہو گئی ہے۔ اپنی
حکومت ہے۔ تیسرا کوئی نہیں۔ اب بس تمہارا ہی راج ہوگا۔"
"اس بڑھاپے میں چلوں۔؟"
"بڑھاپے سے کیا ہوا۔؟ بڑھاپے میں تو آرام کی اور بھی ضرورت
ہے ۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا ۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری نکات
ابھی چل نکلے گی ۔۔ کوئی فکر نہیں ۔۔۔ بڑے بڑے افسر دوست
ہوتے جاتے ہیں ۔۔۔ میں کسی سالے کی پرواہ نہیں کرتا۔"
بوا چپ چاپ سنتی رہیں۔ پھر بولیں، پرمود، تم نے کہا
بھارت تو بڑے جلدی ہے نا؟ یہ شہر بھی سونے لگے تو کیسے کوئی
ساتھ لے گئے ۔۔۔ یہ تمہارا گھر کتنا ہے ۔۔۔ ان سب کو لے چلو
گے۔؟ یہ رک نہیں سکتے، ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔"
میں نے ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو
بوا! آخر میں تمہارا کچھ تو ہوں۔۔ دیکھتا ہوں اس حالت میں تم
میرے ساتھ کیسے نہ جاؤ گی۔"
بوا مسکرائیں۔ میں نے اس مسکراہٹ میں زہر کی لکیریں
دیکھیں، بولیں،
"ضرور لے چلو گے۔"
"سچ، ضرور لے چلو گے۔؟"
"ہاں، ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ ضرور لے چلوں گا۔"

"پھر تو بتا، تیرے پاس کتنا روپیہ ہے؟"

"میں نے کہا، "روپیہ ۔۔۔؟"

بولیں "جتنا دے سکے مجھے دے جا۔ پھر تو میں تیرے گھر تک جا بر جاؤں ۔۔۔ ہوں یا نہیں ۔۔۔؟ اب بول؟"

میں تعجب سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا۔

"روپے کا کیا کرو گی ۔۔۔؟"

بولیں "کیا کروں گی ۔۔۔؟ یہ تو میں بھی نہیں جانتی؟ لیکن پہلے تو تیرے دل کا بھرم مٹ جائے گا کہ مجھے تیری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔ پھر روپیہ دینے میں تیرا اپنا بھی بھلا ہے ۔۔۔ خوب کما۔ کما کے جمع کر اور اس گڑھے کو پاٹ دے ۔ سنتا ہے یا نہیں ۔۔۔؟ روپے کے زور سے دوزخ کے اس گڑھے کو پاٹ کر جنت میں بدلا جا سکتا ہے یا نہیں ۔۔۔؟ مجھے خود نہیں معلوم ۔ پھر بھی روپیہ کچھ تو کام آ ہی سکتا ہے ۔۔۔"

ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی ۔ میں نے ٹال کر کہا "چلو تمہیں یہاں کے اسپتال میں بھرتی کرا دوں ۔"

انھوں نے کہا "میرا کہا تیری سمجھ میں نہ آیا نا ۔۔۔؟ ۔۔۔ چلو ٹھیک ہے ۔ نہیں بھائی اسپتال میں میں نہیں جاؤنگی۔ اسپتال میں علاج اچھا ہو جائیگا ۔۔۔ پرائیویٹ وارڈ میں داخل کرا دو گے ۔ خرچ کی فکر مت کرو تو ۔۔۔۔"

بوا نے میری بات کاٹ دی "لیکن وہی تو فکر مجھے بھی ہے پر موت ۔۔۔ تو بہت سارا پیسہ دے علاج تو کیا بھاگ کر اسپتال کے پرائیوٹ وارڈ میں چلی جانے والی ہوں ۔۔۔؟ پر سدا، جب تک جیتا ہے، دس بیماریاں لگی ہوتی ہیں ۔ گھبراہٹ کس بات کی ہے؟ بات کیوں بڑھاؤں ۔۔۔؟ اس سے میری ہی نالائقی اور بدبختی کا اظہار ہوگا۔ مختصر یہ کہ میں بوا کو ملتیں نہیں پا سکا ۔۔۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے لئے میں نے ان کے لئے کوئی خاص بندوبست کر دیا۔ ایک مقامی وکیل دوست کو سو دو سو روپے دے آیا تھا کہ ان کی خبر گیری رکھنا۔ انھوں نے خبر تو رکھی ہوگی اور پیسے بھی خرچ کیا ہوگا لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ خبر گیری اور روپیہ محض دوزخی ہی دوزخی بنا ہوگا۔

آخر میں خفا ہو کر، بہت سی نصیحتیں کر کے وہاں سے چلا آیا۔ آکر خود کو وکالت میں اس خیال سے محو کر دیا۔ کہ مجھے ادھر اُدھر کا کچھ نظر نہ آئے ۔ آنکھ صرف مطلب کی چیز پر پڑے ۔۔۔ اور اس لیکن کیوں ۔۔۔؟ کیوں بوا کی پہلی اور آخری مانگ مجھ سے پوری نہ ہو سکی ۔۔۔ انھوں نے مجھ سے اتنی محبت کی، مجھ پر اتنا بھروسہ کیا اور مجھ سے انھوں نے ایک سوال کیا تو مجھے دولت عزیز ہو گئی ۔۔۔ مجھ سے کیوں نہ روپیہ بہایا جا سکا ۔۔۔؟ کیوں میں نے مٹھی بند کر لی ۔۔۔؟ اچھا یہ سب کچھ بھی سہی، لیکن پھر کیوں میری روح بے قرار اور مضطرب نہیں رہی ۔۔۔؟ کیوں، کیوں؟ اس "کیوں" کا جواب میں دونگا اور ضرور دونگا ۔۔۔ جواب ہے کہ میں شرودر تھا۔

وکالت میں اپنے آپ کو کیوں گم کر دیا تھا؟ کیوں دل میں کچھ نہ رہا سکا میں ٹھیک نہیں کہتا ہوں ۔۔۔؟ میں نے کیوں خود غرضی سے جان بوجھ کر آنکھیں پھیریں ۔۔۔؟ جواب یہ ہے کہ میں عقلمند تھا، بیوقوف نہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا، تول تول کر چلا اور دولت اپنے ہاتھ میں رکھی۔

لیکن آج اصلی ترازو میں اپنے کو ہلکا پا رہا ہوں ۔۔۔ کہ اس وکالت کی عقل اور دولت کے ڈھیر پر بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ مجھ سے بڑا بیوقوف کیوں نہ بن گیا ۔۔۔؟ اس بے جان اور بے روح ڈھیر کا میں کیا کروں جب وقت آنے پر یہ کی ایک معمولی سی قربانی سے مکر گیا ۔۔۔ یہ سب عقل ہے جو میں نے نہ جانے کس کس طرح جوڑ رکھا ہے یہ عقل میری روح کی موت کو ڈھانپ رہا ہے ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم اس بات کو سترہ سال سے کچھ اوپر ہی ہو گئے ہیں۔ آج تعجب و حیرت کا مقام یہ ہے کہ یہ سترہ برس میں نے بغیر بوا کے کیسے گزار دیئے وہ بوا جنھوں نے بغیر لئے دیا۔ جنھوں نے کچھ تو کیا، مجھ سے محبت ہی کی ۔۔۔ جن کی یاد میرے دل میں آگ سی بن کر جل رہی ہے۔ جن کی زندگی کس طرح بھی گذری لیکن ہمیشہ اُٹھی ہوئی ہی رہی۔ وہ جوان بھی اٹھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ روشنی مدھم پڑ گئی ہو۔ انھیں بوا کو نظر انداز کر کے میں کس طرح زندگی گذارتا رہا ۔۔۔؟

آج خبر آئی ہے کہ وہ مر گئیں ۔ کیسے مر گئیں ۔۔۔ یہ جاننے

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو جانے بیٹھا ہوں اسے کیا لکھنا ہے۔
اگر اسی کو سمجھ جاؤں تو غنیمت ہے۔

ہاں! تم گینی۔ تمہارے جیسے لوگ میں راہ پر نہ آیا۔ اب سنو، میں اس کو بھی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دنیا کے اچھے برے سے مجھ کو مطلب ہی نہیں۔ دو روٹی کے لئے تیرے سے زندگی گذار رہا شاید کچھ سے نہ سیکھا جائے۔ عادتیں پک گئی ہیں۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے اس زندگی سے نکل کر تنہائی میں رہوں گا۔ جتنا ممکن ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔

بنگالن! تم میری بات سنتی ہو۔ اپنے دیکھے چلی چلو دو لیکن وعدہ کا پاس رکھنا تو ترک ضرور رہے گا۔

دستخط ایم۔ ڈیل

مورخہ ۲-۳

نوٹ:- اطلاعاً عرض ہے کہ جی نے اپنا استعفیٰ نے داخل کر دیا ہے۔

ایم۔ ڈی مورخہ ۴-۴

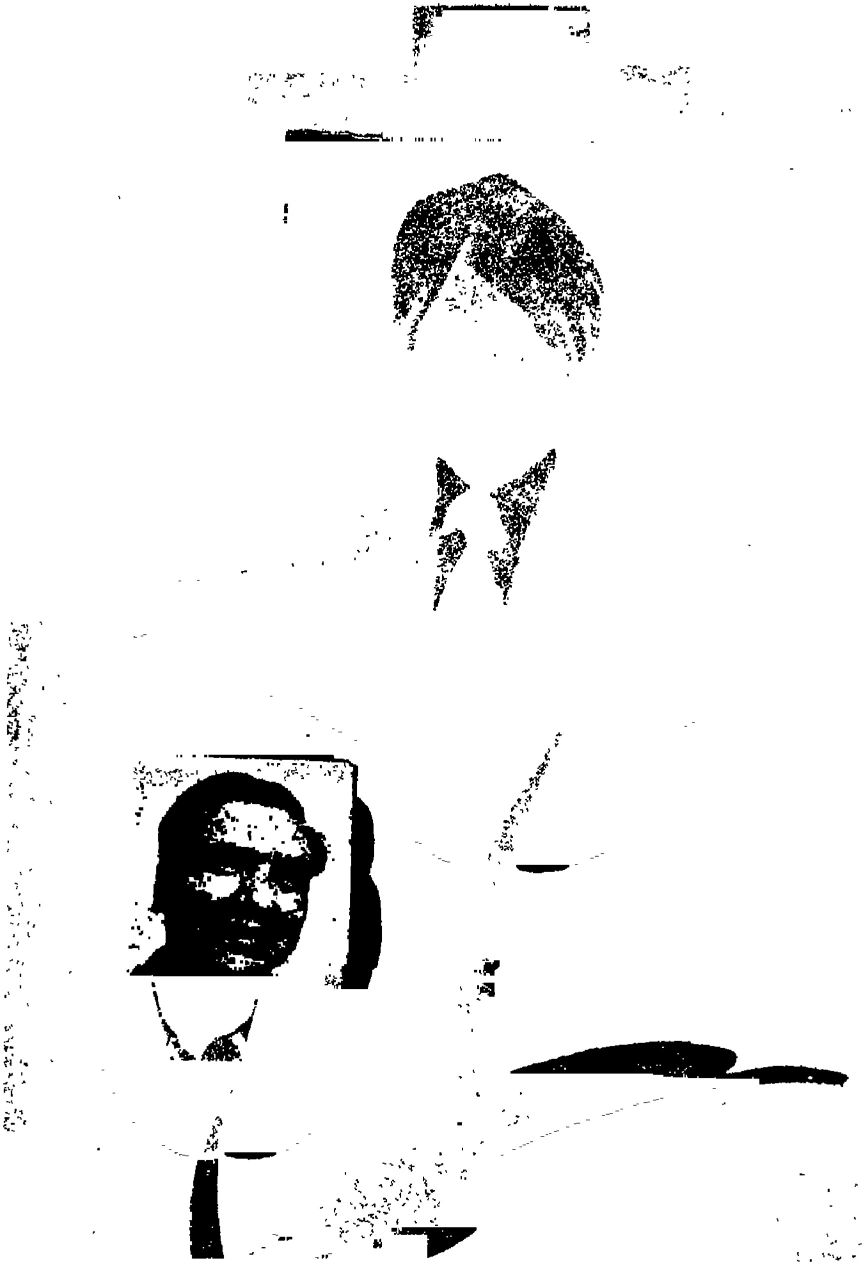
(ختم شد)

لوچن بخشی

لوچن بخشی نے ۱۹۲۳ء میں ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں گھونگریلا میں جنم لیا۔ پوٹھوہار کی یہ سرزمین صدیوں سے ادب، آرٹ اور کلچر کا گہوارہ چلی آ رہی ہے۔ ٹیکسلا کی مشہور اور قدیم درسگاہ بھی یہیں ہے۔ اس سرزمین نے پنجابی کے کئی عظیم ادیب پیدا کئے ہیں۔

اردو کی طرح پنجابی کے بھی بیشتر ادیب متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوچن بخشی نے بھی درمیانی طبقے کے ایک گھر میں آنکھ کھولی۔ اس کا بچپن پنجاب کی صحت مند اور شاداب آب و فضا میں گزرا۔ لوچن بخشی کی تمام کہانیاں دیہات اور اپنی فوجی زندگی کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کے والد چونکہ ملازمت پیشہ تھے اس لئے لوچن بخشی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے کئی مقامات کی سیر کی جس نے اس کے لئے زندگی کے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کے مواقع فراہم کئے۔ وہ ابتدا ہی سے ایک دوربین نظر رکھتا تھا۔ اس نے وہ چمن زار حیات کے پھول چنتا رہا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد وہ لاہور آیا تو اس کے سامنے شہری زندگی بے نقاب ہوئی۔ اس نے مشاہدات کا جو ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اس میں نئے لعل و گہر کا اضافہ ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ فوج میں ملازم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک نئے ماحول اور ایک نئی زندگی کا منظر کھلا ـــــ اس فوجی زندگی نے اس کے مشاہدے کو مزید سان پر چڑھایا۔ اس کی بہترین کہانیاں اس دور سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک دانش ور اور ایک ادیب تھا۔ یہ فوجی ملازمت اس کی زندگی کا ایک مختصر سا پڑاؤ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ تلوار کی بجائے اپنے قلم سے زندگی کی خرابیوں کے ساتھ بہتر طریقہ سے لڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۴۵ء میں جنگ سے واپس آتے ہی اس نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی ادھورے پن کا قائل نہیں۔ اگر یہ کہاوت تسلیم کر لی جائے کہ "وہی ادیب عظیم ہوتے ہیں جو بھرپور زندگی بسر کرتے ہیں" تو لوچن بخشی اس کا بہترین ثبوت ہے۔ خلوص عظیم ادب کا خالق ہوتا ہے ـــ اور خلوص لوچن بخشی کی فطرت ثانی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب گریجویٹ ہو جانے کے بعد اس نے سول سپلائی محکمہ کی ملازمت کی تو جہاں اس کے ساتھی اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے وہاں وہ صرف خلوص کی دولت لئے بیٹھا تھا اور اپنی کہانیاں ادب کے بینک میں جمع کرا رہا تھا۔ تقسیم ملک نے اس کی انسان دوستی پر مزید جلا کی ـــ اس کے ذہن و فکر میں کہیں کہیں جو دھندلاہٹ ابھی باقی تھی وہ بھی تابندہ ہو گئی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا قصد کیا۔ نئی بلندیوں کو چھونے کا اس کا قصد ادب کے میدان میں بھی جاری ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹھہرنے کا قائل نہیں۔

لوچن بخشی کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے نگار خانے میں بیشتر الٹی ہوئی تصویروں کو نہ صرف سیدھا دیکھتا ہے بلکہ انہیں سیدھا کر کے دوبارہ لٹکا دیتا ہے ـــ اس کے ناولٹ "بہرے میلے" میں "کئی بھی تصویریں الٹی لٹکی ہوئی ہیں جنہیں وہ چابکدستی سے آہستہ آہستہ سیدھا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آپ کو آخر میں ہر تصویر سیدھی لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لوچن بخشی کی ہر کہانی کا ایک پلاٹ اور ایک ہدف ہے۔ وہ ایک نیا تا زندگی کے کردار چنتا ہے اور ماحول میں کچھ ایسی تاثیر سرایت کر دیتا ہے کہ کہانی کا ماحول بھی اپنے طور پر ایک کردار بن جاتا ہے ـــ اس کے اس ناولٹ میں "بنتو" جس عورت کے روپ میں پیش کی گئی ہے وہ ہر عورت میں چھپی ہوئی عظیم عورت کی ایک روشن اور جاندار شبیہ ہے۔



لوچن بخشی

مترجمہ محمود جالندھری

بھرے میلہ میں

پیرجی

بھئی دین ایمان کی قسم! میں تم سے کچھ جھوٹ کہوں تو مجھ پر واہگورو کا عتاب نازل ہو۔ لیکن ایک بات سنو۔ میری تم سے ابھی ابھی جان پہچان ہوئی ہے۔ تم کہوگے کیسا عجیب آدمی ہے۔ ملتے ہی قسمیں کھانے لگا۔ اور پھر قسم تو جھوٹے کھاتے ہیں۔ میں تو تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھئی یہ بات ہے سولہ آنے سچی تم اس پر اعتبار کرو نہ کرو!

ہاں جناب تو اس جگہ جہاں سے ستلج دریا پربت پہاڑیوں کی کوکھ سے نکلتا اور سمٹتا ہوا گزرتا ہے۔ وہاں پہاڑ اور میدان کے اتصال پر ایک چھوٹا سا گاؤں تمھیں ضرور دکھائی دیا ہوگا۔ اور تم اسے دیکھنے کے لئے ادھر چلے آئے۔ مگر دیکھو تو یہی گاؤں ہی کیا ہے۔ مشکل سے آٹھ دس گھر ہوں گے ان گھروں سے تھوڑا اور آگے بڑھو تو تم ایک بڑا کھنڈر دیکھو گے۔ ٹوٹے ہوئے مکان۔ پانی اور مٹی سے گری پڑی دیواریں اور ان پر جا بجا اگی ہوئی کائی۔ مٹی کے برتنوں کی ٹوٹی پھوٹی ٹھیکریاں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر تمھیں حیرت نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ایک بار تو تمھارے دل میں خوف و ہراس کی لہر ضرور دوڑ جائے گی۔ معاف کرنا تمھیں اس طرح خوف زدہ دیکھ کر اگر تم میرے دوست ہوتے تو میں تمھیں ایک موٹی سی گالی دے دیتا۔ لیکن تم تو راہگیر ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں دل ہی دل میں تمھیں یہی کہانی سنانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں اب تم سے کیا کہوں۔ لیکن میں تمھیں تھوڑی دور تک اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ڈرنے اور جھجکنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ اجی راستے پہ چلے آؤ۔ سامنے بیریوں کے جھنڈ ہیں۔ وہاں جہاں تم چند دیواریں سی [illegible] دیکھ رہے ہو۔

دراصل [illegible] عمارت تھی۔ [illegible] تم [illegible] کہ یہ کوئی قتل کا [illegible] ہے۔ یہ تو تم پیرجی کے [illegible] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پیرجی مسلمان تھے۔ اور وہ اس جگہ "روضہ شریف" کہتے ہیں لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق پیرجی ہندو تھے۔ پیرجی ہندو تھے یا مسلمان۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ لیکن پیرجی تو پیرجی تھے۔ خدا رسیدہ فقیر تھے۔ سادہ طبیعت تھے۔ دریا دل اور سخی تھے۔ اور ایک دفعہ جس پر بھی ان کی مہر کی نظر ہو جاتی وہ نہال ہو جاتا۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ جگہ کس قدر حسین ہے۔ لیکن شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ جگہ کس قدر بھیانک بھی ہے۔ ویران اور سنسان۔ غیر آباد۔ مگر جناب میں نے ٹھیک کہا ہے نا۔ اگر سچ پوچھو تو یہ جگہ مجھے بہت بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ میرے یہ بات اور ہے کہ اگر کوئی مسافر دن دہاڑے لوٹ لیا جائے یا کسی کو قتل کر کے اس کی لاش کو ستلج دریا میں پھینک دیا جائے اور یا کوئی ایک اکیلی عورت اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے۔ میں یہ باتیں تمھیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس دھرتی پر ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اس میں پیرجی کا کیا قصور ہے۔ یہ بات تو اب دھرتی کے خمیر میں ازل سے موجود ہے۔ اس دھرتی کا چپہ چپہ ایک آرزو اور حسرت کی تصویر ہے نہ جانے کیوں اس چار دیواری میں آ کر میرے دل میں کچھ گڑبڑ سی ہونے لگی ہے اور میں بہکتا چلا جاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ اس سکوت سے اس دھرتی کی ویرانی میں اضافہ ہوتا ہے اور آواز تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بجلی کی کڑک کی مانند فضا کے سینے کو چیرتی چلی جاتی ہے۔

تم تو کہو گے کہ کس عجیب بیوقوف کے ساتھ واسطہ آ پڑا ہے لیکن میں تمھیں زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر میں اس جگہ کے حسن کا تمھیں قصہ سناؤں۔ یہ ان ہی باتوں [illegible] اچھی رہے گی۔ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ ایک

بہت ہی حسین وجمیل اور پیاری وادی ہے۔ لیکن اس پر شباب سال بھر میں صرف ایک ہی بار آتا ہے۔ بہار کے دنوں میں جب پھاگن چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دھرتی کی تمام کلیاں بیدار ہو گئی ہیں۔ اس کے سینے میں چھپی ہوئی خوشبوئیں ابھر آتی ہیں ہر طرف خودرو جنگلی پھول کھل اٹھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں پیر جی اپنی چلہ کشی ترک کر کے باہر آ جاتے تھے۔ ان کے چیلے چانٹے دور دراز سے دیش کے ہر حصے سے آیا کرتے تھے۔ ان سے پیر جی بات چیت اور تبادلہ خیالات کیا کرتے۔

انہی دنوں ایک جمعرات کو پیر جی کا عرس ہوتا ہے۔ کاش آپ نے اس رات کی چہل پہل اور رونق دیکھی ہوتی۔ ایک نئی نویلی دلہن کی طرح اس دھرتی کا یہ خطہ سج دھج کے اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے۔ ایسے تو ہر جمعرات کو اس چار دیواری میں کوئی نہ کوئی گمنام عقیدت کیش چراغ جلا جاتا ہے۔ مگر رات کو جیسے ساری کی ساری دھرتی پر چراغاں ہوتا ہے۔ سارا دن ساری رات قوالیاں گائی جاتی ہیں اور وجد میں آ کر سامعین جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ اس میلہ میں پریم کے بندھن مضبوط بھی ہوتے ہیں اور ٹوٹتے بھی ہیں ——

مدت سے سینے میں دبے ہوئے ارمان یہاں نکلتے ہیں۔ لاؤ چاؤ سے پالی ہوئی آرزوئیں اس میلہ میں پروان چڑھتی ہیں۔ یہاں چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی آدمی کو قتل کیا جا سکتا ہے اور بڑی سی بڑی تقریب بھی یہاں بے اثر ثابت ہو سکتی ہے۔ معاف کرنا میں نے یہ سب باتیں اپنی ان آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس لئے تمہیں یہ سب باتیں بتا رہا ہوں۔ تم اب تک یہ بھی جان گئے ہو گے۔ کہ میں سلیقہ کا قائل ہوں اور سلیقہ سے تمہیں اس بات کا پس منظر بتانا ضروری تھا۔ اسی سلسلے میں تمہیں اس ویرانے میں کھینچ لایا ہوں۔ دراصل میری اس کہانی کا تعلق اس میلہ سے ہے جس کا ذکر تم ابھی تک سنتے رہے ہو۔ میری اس کہانی سے تم نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہو گا۔ کہ میں یہ میلہ ہر سال ضرور دیکھنے آتا ہوں گا۔ ہاں جناب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں سال کے ان دنوں میں کہیں بھی کیوں نہ ہوں۔ اس میلے میں ضرور شامل ہوتا ہوں۔ اس میلہ کا میری زندگی سے نزدیکی اور گہرا تعلق ہے۔ تعلق بھی کیا ہے حقیقتاً یہ میلہ ہی میری زندگی ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس میلہ کو دیکھتا ہوا آیا ہوں۔ ان گنت آرزوؤں کا اس میلہ میں جنم ہوا۔ ان گنت حسرتوں نے اس میلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفنا دیں مثلاً تم میرے دوست جیلے ہی کو لو۔

جیلا

اگر تم اس علاقہ کے رہنے والے ہوتے تو جیلے کا نام سنتے ہی تمہارا دم خشک ہو جاتا اور تم غش کھا کر گر پڑتے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل کی دھڑکن ہی بند ہو جاتی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ اور میں تمہیں ابتدا میں بتا چکا ہوں کہ قسم تو جھوٹے کھاتے ہیں۔ اب میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ ایسے واقعات کئی بار ہوئے ہیں۔ ادھر جیلے کا نام لیا گیا اور ادھر سننے والے کی دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں۔

جیلا میرا دوست بھی تھا۔ اس علاقہ کا بدنام ڈاکو بھی تھا۔ اس کی دھاک دور دراز ان پہاڑیوں میں بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں سے ستلج دریا نکلتا ہے۔ اس کی شہرت پنجاب کے ان میدانوں میں بھی تھی جہاں ستلج دریا مست و مدہوش ہو کر اٹھلاتا ہوا بہتا ہے۔ ستلج کے بہاؤ کی طرح لوگ اس سے واقف تھے۔ جب وہ چلا ہوتا تھا تو دریا کے بہاؤ کی طرح آگے بڑھتا جاتا تھا۔ اس کو کبھی کوئی روک نہیں سکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار قتل کئے تھے۔ بے شمار ڈاکے ڈالے تھے لوگ کہتے ہیں کہ وہ شرابی اور بدکار تھا۔ اس میں ہزاروں عیب تھے۔ لیکن جناب وہ پیارا یار تھا۔ جیسے اس کی برائیوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو اس کی یاری کا معترف ہی تھا۔ ایسا دوست اگر تم چراغ لے کر بھی تلاش کرو تو حشر تک ڈھونڈتے رہو گے اور پھر بھی حسرت تمہارے دل میں کھٹکتی رہے گی۔

اس کے ساتھ میری دوستی اس چوپال کے ... بھی ... اور وہ بھی محض اتفاقیہ۔ اس وقت میری شیں ... ہم دونوں کو پہلوانی کا بیحد شوق تھا ... ان اکھاڑے میں کسرت کرتے ... ہماری آپس میں ... ... [illegible]

[illegible]

کوئی میرا زور سے کچھ بگاڑ رہا ہو۔ اتنے میں ایک گرجدار آواز سنائی دی۔
"ابے او بندے کے بچو! یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ پہلوان کے سامنے
نہ ہوں تو۔ تکیلے سے اکیلا لڑے تو بات بھی ہے۔"

لیکن وہ لڑکے باز نہ آئے اور مجھ پر بیت میں دگیرتے رہے۔ اتنے
میں اس اجنبی نے آگے بڑھ کر ایک ایک دھول ان کی گدی پر یوں جمائی
کہ مزہ ہی تو آ گیا۔ ایک لڑکے کی تو گردن کا منکا ہی ٹوٹ گیا۔ دوسرا بھی
بلبلا کر دوڑتا رہا۔ دو لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس نے مجھے اٹھا کر
کھڑا کر دیا اور بولا "جوان تو اچھا ہے" پھر اس کے بعد اس نے
مجھے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور کہا "بات سن بے او پہلوان
کے بچے۔ آج تو تجھے بچا دیا ہے لیکن آئندہ دوست بناتے ہوئے
ذرا سوچ لیا کرنا۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے کئی بار ملا۔ مجھے پہلوانی سکھاتا رہا۔ کئی
داؤ پیچ بتاتا رہا۔ دراصل وہ مجھ پر مہربان ہو گیا تھا۔ جیسے پیر جی کی کسی
پر مہر کی نظر ہو جاتی ہے۔ خود بخود اور بے غرض۔"

لیکن اس دوران میں مجھے ایک بار بھی اس نے یہ نہ بتایا کہ اس کا
نام جیلا ہے۔ میں سوچتا ہوں ایک طرح تو اس نے اچھا کیا۔ جناب اگر وہ
اس وقت مجھے اپنا نام بتا دیتا تو میرے دل کی دھڑکنیں ہی بند ہو جاتیں
اس تک میں جیلے کے متعلق ان گنت قصے سن چکا تھا مگر جس شخص کے ساتھ
میری دوستی ہو گئی تھی وہ جیلا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کوئی خدا دوست انسان
تھا۔ جس کو ہمیشہ کمزور پر ترس آتا تھا۔ جو پیر جی کا عقیدت مند تھا اور
ہمیشہ غریبوں کے لئے لنگر لگاتا تھا نیز اماماں کے میلے پر ہزاروں روپے
خرچ کرتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں مجھے اس وقت معلوم ہوئیں جب میں اپنا
گھر بار چھوڑ کر اس کی ٹولی میں شامل ہوا۔ اس کے ساتھ جا ملنے کا قصہ
بہت ہی عجیب ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں یہ قصہ سناؤں تمہیں اپنے
متعلق ایک دو باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں

میرا باپ ایک معمولی حد تک زمیندار تھا۔ ہمارا ایک کھاتا پیتا گھرانہ
تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچپن سے میری طبیعت میں لاابالی پن تھا اور
[illegible] مجھے صرف ایک ہی بات یاد ہے۔ [illegible] اس

وقت آٹھویں جماعت میں تھا [illegible] میں سب سے آگے تھا۔
پڑھنے لکھنے میں پسند تھی۔ میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ میں اچھا کھاتا
تھا اور [illegible] تھا۔ اچھا کھانے پینے کی بات تو تم سن ہی چکے ہو۔ اب
ذرا میرے ایڈ ہونے کا قصہ سنو۔

ایک دن منشی جی (منشی جی) کے پاس ایک لڑکے نے یہ شکایت
کی کہ میں نے شراب پی کر اس کو گالیاں دی ہیں۔ معاف کرنا ہر ایک
جاٹ کا بیٹا خود بخود ہی یہ کام سیکھ جاتا ہے۔ میرا یقین اس وقت اور
بھی پختہ ہو گیا۔ جب ہمارا منشی میرے باپ سے ملنے آیا۔ منشی جی نے میرے
باپ سے کہا "آپ کا بیٹا شراب پیتا ہے۔ آپ کا بیٹا چوری کرتا ہے
اور آپ کا بیٹا جوا کھیلتا ہے۔ معاف کرنا آپ کے بیٹے میں ایک ایسی
بری عادت بھی ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔"

شاید تم یہ سمجھ رہے ہوگے کہ یہ بات سن کر میرے والد کو تشویش
ہوئی ہوگی۔ "نہیں جناب اگر تم یہ سوچ رہے ہو تو معاف کرنا تمہارا
واسطہ کسی خاندانی جاٹ سے نہیں پڑا۔" منشی جی کی باتیں سن کر
میرا باپ تو بہت خوش ہوا۔ اور ہنس کر بولا "منشی جی! اگر آپ
اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے تو آپ تشریف لے جا سکتے ہیں
اپنے بیٹے کے متعلق یہ باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا بیٹا واقعی
میرا بیٹا ہے۔"

اس دن کے بعد سے میں کبھی اسکول نہ گیا۔ اس دن کے بعد سے
میرا کام صرف پہلوانی رہ گیا تھا۔ گھی پیتا تھا۔ بادام کھاتا تھا۔ اور پہلوانی
کرتا تھا۔" ایک دن کی بات ہے میں اپنے کنوئیں پر بیٹھا تھا۔
گرمیوں کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں بیلوں کو چارہ ڈالنے اٹھا ہی تھا
کہ اچانک میرے پیچھے ایک لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ مجھے یوں محسوس
ہوا جیسے میرے کانوں میں گھنگرو چھنکنے لگے ہوں۔ مگر یہ ہنسی خود بخود
بند ہو گئی اور ایک بھیانک چیخ مجھے سنائی دی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر
دیکھا۔ نمبردار کی بیٹی جنتو کو جیسے کوئی مرد اپنی آغوش میں لینے کی کوشش
کر رہا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے اٹھا کر بھاگ جانے کی
خواہش رکھتا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر منڈاسا باندھا ہوا تھا
میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ایک لمبے قد کا طاقتور مرد تھا۔ خیر صاحب!
ایک تو لڑکی ہو۔ اپنی جان پہچان کی لڑکی اور پھر جنتو جیسی لڑکی سے
میں تیزی سے اٹھا اور جاتے ہی اس شخص کے پیٹ میں [illegible]

جا سکے۔ ورنہ وہ لمبے قد کا مرد دو مُکّے بھی نہ سہہ سکا۔ وہ سڑک پر منہ کے بل جا پڑا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون کا دھارا بہہ نکلا۔ ایک پہاڑ ساز کی طرح وہ اپنی آنکھیں چڑھا کر لیٹا رہا۔ بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میرے مُکّے میں کتنی طاقت ہے۔ آدمی کو ہلاک کرنا کتنا آسان ہے اور بنتو کتنی حسین ہے۔ اس دن کے بعد سے کئی لوگ کہتے ہیں کہ مجھے بنتو سے پیار ہو گیا تھا۔ لیکن جناب مجھے واہگورو کی سوگند ہے میں ابھی تک یہ نہیں جانتا کہ پیار کس بھوت کا نام ہے۔ معاف کرنا میں پھر قسم کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات تمہیں سولہ آنے صحیح بتا رہا ہوں مجھے تو بنتو سے نفرت ہو گئی تھی تم پوچھو گے کیوں ——؟ لو یہ بات بھی سن لو ——

جس وقت بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے وہ کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی۔ اب میں آپ سے کیا کہوں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ اس کی آنکھیں کبھی تو مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں اور کبھی ان میں سے اندھیری راتوں کی تاریکی جھانکنے لگتی تھی میں سوچ رہا تھا کہ اس سے پوچھوں —— بنتو تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میری طرف یوں نہ دیکھ —— دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیچھے پڑی ہوئی لاش نے ایک جھرجھری سی لی ہو۔ اور پھر ایک سایہ سا میرے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا لمبا ہوتا ہوا دور کھیتوں تک پھیل گیا تھا۔ میں نے لاش کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح دھرتی پہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ میرا جی چاہا کہ چارہ کترنے والا ٹوکہ لا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور دریا میں بہا آؤں۔ یہی بات میں نے بنتو سے کہی تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ کہنے لگی —— یہ بات بعد میں کرنا۔ پہلے مجھے گاؤں تک چھوڑ آ۔ میری تو ڈر سے جان نکلی جاتی ہے —— اور وہ گاؤں کی طرف چل دی اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ لیکن میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال موجزن تھا میرے والد کہا کرتے تھے کہ جب جاٹ کا کوئی لڑکا پہلا قتل کرے تو یہ سمجھو کہ وہ جوان ہو گیا۔ میں آج جوان ہو گیا تھا۔ جب میرے والد نے پہلا قتل کیا تھا تو اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس بات کو سمجھ جاتا جناب جس ماحول کا پروردہ ہوں جہاں اگر سات سال تک کی چودہ سال کی بھی سزا ہو جاتی تو میں شاید ہنس سکتا۔ بنتو جیسی حسین لڑکی کے لئے چودہ سال کی سزا کیا تھی۔ مجھے اس کا ذرہ بھر غم نہ ہوتا۔ مجھے تو غم اس بات کا تھا کہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس نے کہنا شروع کر دیا —— قتل میرے لئے ٹھوڑا ہوا ہے۔ مجھے کیا خبر کہ اس کو کس نے ہلاک کیا ہے ——"

مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا تھا۔ بنتو نے میری محبت اور ہمدردی سے اپنی عزت کو زیادہ بہتر خیال کیا تھا۔ میری غیرت کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میرا جی چاہتا تھا کہ میں واپس کنویں پر جاؤں اور بنتو کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دوں لیکن میری حیرت کی حد ہی نہ رہی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ کنویں پر لاش کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔ جس شخص کو میں اپنی طرف سے قتل کر کے کھیتوں میں پھینک آیا تھا وہ ایک پیشہ ور استاد کی طرح مجھے جُل دے گیا تھا۔ میں نے سوچا اس مسئلہ کو جیسے استاد سے حل کروایا جائے۔ تو پھر کیا تھا جناب —— میں بھیلا کے پاس چلا گیا۔ وہ میری بات سن کر بے تحاشا ہنسا۔ اس نے پوچھا —— وہ کون تھا۔ یہ بات تمہیں کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کوئی بھی —— اس کے بعد وہ پھر یوں ہنسا جیسے بادل پھٹ پڑا ہو۔ اس کی آنکھیں کبھی مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی نظر آتی تھیں اور کبھی ان میں کالی راتوں کا گہرا اندھیرا پھیل جاتا تھا۔

تبصرہ

زر، زمین اور زن —— یعنی عورت۔ ان کے متعلق ہمارے علاقوں میں یہ عام مشہور ہے کہ یہی ہمیشہ آدمی کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ تم میری اس بات سے اتفاق کرو۔ اگر اتفاق نہ بھی ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ معاف کرنا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لئے سوچا ہوں کہ چلتے چلتے یہ بات بھی بتا جاؤں۔

زمین کے متعلق جھگڑے ہوتے تو ہم روز دیکھتے ہیں۔ یہ تمہاری نظر سے بھی گزرے ہوں گے۔ جس طرح فصل کے اُگنے پر بس کا [illegible] ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اس طرح زمین کے متعلق کسی کا قتل ہونا ہماری زندگی کا ایک معمولی بات ہے۔ چونکہ بہت آسان اور سادہ ہوتی ہے

ایک عام بات بھی دلچسپ ہوتی ہے اس لئے اس کا بیان بھی غیر دلچسپ ہوگا۔ اس لئے اس پر خاک ڈالو۔

دوسرے حضرات قتل تو روز ہی ہوتے تھے یہ ہمارا پیشہ تھا۔ ہم ڈاکہ ڈالتے تھے ندی کے لئے دن کی روشنی کی طرح یہ بات بھی صاف ظاہر ہے۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ چلو اسے بھی چھوڑ دو۔

ابھی ہی دن کی بات ہے — ہاں جناب یہ عورت کوئی سیدھی سادی عورت نہیں ہے بلکہ خود بنتو ہے اس لئے اس کا بیان ضروری ہے — بنتو تو خود دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں آپ سے زیادہ کیا کہوں بس اتنا کہہ لو کہ بنتو بہت حسین اور بہت جوان تھی۔ میں تمہیں پہلے یہ بھی بتا چکا ہوں کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مجھے بنتو سے محبت ہے مگر تم ان لوگوں کے سر پر خاک ڈالو۔۔۔ وہ تو یونہی بکتے ہیں۔ تم بنتو کی بات سنو۔ ہاں جی اس قتل کے کچھ دنوں بعد بنتو کی شادی ہو گئی اور وہ چلی گئی۔ میں جیلے کی ٹولی میں جا شامل ہوا اور بنتو کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ دیکھنا یہ بات بھی بھولنے والی تھی۔ چونکہ ہمارے علاقہ میں عورتیں ہوتی ہی کم ہیں خاندانوں میں اگر ایک بھی بھائی کا بیاہ ہو جائے تو بس یوں سمجھیے کہ سارے خاندان کو ایک نعمت مل گئی۔ سو جناب اگر کوئی شخص ساری عمر اس دھرتی پر پیار کے تھپڑے والوں سے ناواقف رہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ دوسری بات یہ بھی کہ جیلے کا سخت حکم تھا کہ کوئی شخص کسی عورت کی بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔

منہ تم نے تو سنا ہی دھار لیا ہے — " یہ بات جیلا کئی مرتبہ کہہ چکا تھا۔ یہ اس کا اصول تھا اور معاف کرنا جیلا اپنے اصول کی خاطر کچھ مرنے مارنے سے بھی نہیں ٹلتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ کافی دولت مند گھر تھا جب ہم سارا سامان باندھ کر چلنے لگے تو اندر کمرے سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ ایک پلک جھپکنے میں جیلا اندر کمرے میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ ہمارا ایک ساتھی ہے گھر کی ایک عورت کا بازو پکڑے کھڑا تھا۔ جیلے کا بیان ہے کہ وہ اس کی چیخ نکال رہا تھا۔ جیلے نے اس سے کہا — "تم جانتے ہو۔ یہ اصول کے خلاف ہے" اور فوراً گولی مار کر اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اس عورت سے معافی مانگی اور کہا

"بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میرے ساتھی چاہے سارا گھر لوٹ لیں چاہے سارے گھر کے آدمیوں کو قتل کر دیں۔ لیکن کسی عورت کے بدن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ دیکھ میں جیلا تیرے سامنے ہاتھ باندھ کر شرمندہ کھڑا ہوں"

"جیلا" اس لڑکی نے کہا اور خود کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے کہ وہ عورت بہت ہی عجیب نظر آئی۔ عام عورتیں تو جیلے کا نام سنتے ہی بے ہوش ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں تو جیلا خود اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خیر جیلے نے اس گھر کا سارا سامان واپس کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو خالی ہاتھ لے جا کر پیر جی کے مزار پر چلا گیا۔ یہ بھی اس کا ایک اصول تھا۔ ڈاکہ مارنے سے پہلے پیر جی کے مزار پر سلام کرنے جاتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد لٹی ہوئی دولت کا دوسرا حصہ پیر جی کی نذر کرتا۔ کہتے ہیں کہ اس نے آج تک کبھی اس اصول میں ہیرا پھیری نہیں کی تھی لیکن — اب پتہ نہیں کیسے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیلا اپنے اصول میں ہیرا پھیری کرنے لگا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسی عورت کے حسن پر فدا ہو گیا ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ چونکہ وہ بے حد خوبصورت بتائی جاتی تھی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے کی اس ادا پر وہ عورت فریفتہ ہو گئی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے نے اس عورت سے ملنے کے لئے ہی یہ سارا ڈھونگ رچایا ہو۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جیلا آدمی بڑا ہوشیار تھا اور اس لئے اس کی چالوں کا کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اگر اُسے مغرب کی طرف جانا ہوتا تو وہ مشرق کی طرف یلغار کرتا۔ اس لئے میں اُسے شک کی نگاہ ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن میں پیر جی کے جشن میں گیا تھا کہ جیلا میرے پاس آیا۔ اُس نے اس روز اپنا سر دھویا تھا اور اپنی داڑھی میں جو تنکے کئے ہوئے گھاس کی طرح بھورا اور بے ترتیب نظر آ رہی تھی اُس نے سرسوں کا تیل لگا رکھا تھا۔ وہ کمبخت اپنے اس روپ میں بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کا ٹھاٹھ بڑا قد، بھرپور جوانی، پہلوانی جسم اور دو قاتل آنکھیں نشیلی اور قہر آلود تھیں۔ اونچا لمبا قد۔ دو پتلے پتلے ہونٹ اور ان پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی مسکراہٹ — اس پر طرہ یہ کہ یکساں ترشی ہوئی اور تیل سے چپڑی ہوئی داڑھی۔

"خدا خیر کرے — " جب بھی جیلا اس روپ میں نمودار ہوتا تھا تو یہ سمجھ لینا پڑتا تھا کہ ضرور کوئی اہم معاملہ ہو گا — اور جناب میرا خیال — وہ چپکے سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کیا بات

ہے؟" — اس نے کچھ نہ کہا اور دھرتی پر بیٹھا جنگلی پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں کی بے چینی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ضرور اس کے دل میں کوئی بات کھٹک رہی ہے جو اُسے چین نہیں لینے دیتی۔ میں نے پھر پوچھا: "جیلے تم پر کیا بیت گئی ہے؟" جیلے نے جواب دئے بغیر میری طرف ٹکر ٹکر دیکھنا شروع کر دیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک دفعہ بنتو نے میری طرف دیکھا تھا: "جیلے تجھے خدا کی قسم میری طرف یوں نہ دیکھ اور منہ سے کچھ پھوٹ۔" خیر صاحب وہ بڑی ناز و ادا کے ساتھ بولا: "میں آج سے جیلا نہیں — جرنیل سنگھ ہوں بس!"

"یہ تجھے کیا ہو گیا جیلے —"

"اب سے مجھے جیلا نہیں جرنیل سنگھ کہو۔ یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ نہایت ہی سیدھی سادی بات ہے۔ مجھے ایک گورو مل گیا ہے بس یوں سمجھو کر نچلے پہ دھرنا پڑ گیا ہے۔ ایک بات سُن۔ تجھ سے کیا چھپاؤں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں پیر جی کے مزار والی چاردیواری میں سجدے میں پڑا تھا۔ بالکل بے خود تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی عورت میرے پاس آکھڑی ہوئی ہے میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو وہی اس رات والی لڑکی میرے سر پر کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی —

"کتنا حسین جوان ہے اور کون سے دھندوں میں پڑ گیا ہے۔" مجھے بہت غصہ آیا۔ اور میں ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کرنے لگا تھا کہ ایک دم کسی نے مجھے پکڑ کر زور سے جھنجوڑ دیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ وہاں نہ وہ لڑکی تھی اور نہ کوئی اور۔ بس میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پیر جی کا مزار بھیگ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو پیر جی کی کوئی کرامات ہے۔ اگر کوئی عورت پیر جی کے مزار تک پہنچ سکتی ہے تو اس میں ضرور کوئی بھید ہے جبکہ یہاں تو ایک عورت کیا اس کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ عورت کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں جیلے تیری بات تو ٹھیک ہے ——— تو نے وہ بات تو سنی ہوگی ہے نا۔ جب سیار پور (ہوشیارپور) کا ایک ساہوکار اپنا بیری کے ہمراہ "چراغاں" کے میلہ میں آ نکلا تھا اور جب وہ تیار ہو کر واپس گیا تو اس نے کیا دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کی بیوی کے گرد چکر کاٹ رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ بیچارے جناب سیٹھ دھنو حیران ہو گیا اور جب بڑی مشکل کر اپنی بیوی کے ہمراہ گھر میں بیٹھنے لگے تو جناب پیر جی سے ایک گھوڑ سوار جوان نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس عورت کو اپنے گھوڑے پہ ڈال کر ہوا ہو گیا — آج تک نہ اس عورت کا پتہ چلا اور نہ اس جوان کا۔

جیلا ایک دم زور سے ہنسا جیسے بادل پھٹتا ہے۔

"ہاں یہ بات آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کون تھا۔ سب بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ پیر جی کی کرامات تھی۔ پیر جی نے اُسے سزا تو دینا ہی تھی آخر وہ اپنی اس مال کو اپنے ساتھ لیکر آیا ہی کیوں تھا پیر جی کے مزار پر اس دن کے بعد سے آج یہ لڑکی ہے جو پیر جی کے مزار پر آئی ہے۔"

"جیلے یہ بالکل جھوٹ ہے سب" میں نے کہا — وہ بولا: "میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا ہے۔ آخر یہ کیا بھید ہے سب؟" میں نے اُس کو بہت سمجھایا لیکن وہ تو کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھا تھا۔ وہ میری کیا سُنے اور یہ کہے جاتے: "وہ عورت نہیں تھی۔ ایک چھلاوہ تھی۔ خیر میرا نام بھی جرنیل سنگھ ہے۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم۔ ایک دفعہ تو اُسے نتھ پہنا کر چھوڑوں گا —۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیلے پر کیا بیت گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کام ڈاکہ ڈالنے لگا — اس کے بعد سے جیلے نے چوری کرنی چھوڑ دی — اس کے بعد سے جیلا شراب بھی کبھی نہ پیتا۔ ایک صبح کو جب ہم سارے ساتھی ڈاکہ ڈال کر لوٹے تو جیلے نے اپنا گھر آباد کر لیا تھا۔ جو گھنڈر آپ ابتدا میں دیکھ کر آئے ہیں وہ یہی جیلے کا گھر تھا۔

چھلاوہ

اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ چھلاوہ کیا ہوتا ہے تو میں بھی مجھ نسبت کرنا میں بھی یہ کہا تو نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ چھلاوہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو چاہے تو یہ کہ تمہیں نظر آئے اور پھر تم سے غائب ہو جائے یا ہوش نہ کرے اور پھر وہ بے ہوش ہو جائے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شیر بن کر تمہارے سامنے آ نکلے اور یہاں تمہیں چھلک جائے۔ ایک بات اور ہے۔ اگر کوئی چھلاوہ غلطی سے عورت کا بھیس بنا لے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس عورت سے ... جا سکتے ... یا پہلے کوئی عورت کے بھیس میں چھلاوہ ... گیا تھا۔ ... جب ... رات اس کے پاس ... رہتا ... آ ...

کیا تک ۔ اس کے سامنے بہت بڑا تو بجائے بچوں کیا کہنا ہوگا ۔ خیر جی
جیا جتنی بار اس کا تعریف کرتا مجھے اتنا ہی غصہ آتا ۔ بس رہنے دے ۔
جیلے: ایک دن میں نے تنگ آ کر اس سے کہہ دیا ۔ "تیری یہ محبت
ہم سب کو لے ڈوبے گی ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ عورت تیری
ہونی ہی کراتی ہے اور تجھے تباہ کر کے چھوڑے گی ۔"

"بکواس بند کرو" وہ فوراً چیخ اٹھا ۔ اس کے تن بدن میں جیسے
آگ لگ گئی تھی ۔ غصے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا ۔ اگر ایسی حالت
میں جیلا شیر کی طرح گرج اٹھتا تھا اور دیکھتا ہی نہ تھا کہ سامنے کون ہے ۔
بس ایک دم جھپٹ پڑتا تھا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کا سر توڑ
دیا کرتا تھا ۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جیلے نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو
پا لیا اور بڑے سکون کے ساتھ بولا ۔ "تو نے ابھی اُسے دیکھا ہی نہیں ۔"
میں نے جواب دیا ۔ "اُسے دیکھنے کی میرے دل میں کوئی آرزو
بھی نہیں ۔"

وہ چپ چاپ لوٹ گیا ۔ جیلے میں جو تبدیلی آ گئی تھی وہ میری سمجھ
میں نہیں آ رہی تھی ۔ اس دن یہ بات ضرور ہوئی کہ میرے اپنے دل میں اس
عورت کو دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھی ساتھ ہی ساتھ اس عورت کے خلاف
میرے دل میں نفرت کا لاوا ابل اٹھا ۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا خواہش
تھی ۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم ۔ میں تمہیں سولہ آنے سچی بات بتا رہا
ہوں ۔ بس یہی میرے جی میں آ رہی تھی کہ ایک دفعہ جیلا جائے تو میں
اس سے یہ پوچھوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے ۔ وہ اگر جیلا وہ تھی تو جیلے کیلئے
ہو سکتی تھی ۔ میرے لئے تو ایک عام عورت تھی ۔

معاف کرنا میں عام عورتوں کے متعلق اپنے خیالات پہلے ہی
بتا چکا ہوں ۔ شاید ایک بات میں نے تمہیں نہیں بتائی ۔ جیلا اس عورت
کو لے تو آیا تھا لیکن نہ جانے اس کے دل میں کون سا چور چھپا بیٹھا تھا ۔
ہر وقت یہ بات ہی دل میں [illegible] ۔ گھر کی چار دیواری کے باہر آج
تک کسی نے نہیں دیکھا تھا ۔ باہر تو کیا کسی نے اس کے گھر میں بھی اس
عورت کو نہیں دیکھا تھا ۔ وہ اسے جیلے کی حرم سرا میں کوئی گھس نہیں
سکتا تھا [illegible] رات کے وقت میں جب اُدھر سے
گزرتا تو مجھے اس کے گھر سے جیلے کی بڑی ہوئی ہلکی ہلکی آواز سنائی
دیا کرتی تھی [illegible] تھا ۔
[illegible] اب وہ رستوں کے

پھندے میں جکڑا چھٹکارا دیا ہو ۔ اب وہ نڈھال ہو کر بیٹھا پیاسا پنچھی
ہوا تھا ۔ سچ مانتا مجھے تو اب اس کی آواز میں بہت سناٹا دے رہا تھا ۔
ہاں کبھی کبھی ایک عورت کی ہنسی کی آواز بھی میرے کان میں پڑتی تھی ۔ میں
نے اکثر ہنسی سننے کی خواہش کی تھی ۔ مجھے قسم ہے اگر میں یہ جھوٹ کہوں ۔
مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے یہ آواز کہیں سن رکھی ہے ۔ میرے کانوں
میں اس آواز سے گھنگرو سے چھنکنے لگتے تھے ۔ جیسے میں ستی کی لہروں
کو [illegible] سن رہا ہوں ۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا تھا کہ جیسے
میں کسی [illegible] نڈھال ہو چکا ہوں چاند
رات ہو اور میری اونٹنی [illegible]
اور کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ یہ جھنکار کبھی اتنی
دور ہوتی ہے کہ میرے لئے اس کے شور تھمنے کا اندازہ [illegible]
دشوار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جھنکار اتنی نزدیک سنائی دیتی ہے کہ
میں چونک اٹھتا ہوں جیسے یہ جھنکار خود میرے اندر سے ابھر رہی ہو ۔

خیر صاحب ۔ یہی بہار کے دن تھے ۔ پُرتیا چل رہی تھی
جب صدی کی ساری دھرتی جنگلی پھولوں سے ڈھک گئی تو جیلے نے ڈیرہ
کیلئے باہر جانا چھوڑ دیا ۔ پیر جی کا عرس آ گیا تھا اور "چراغاں" کے میلے
کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں ۔ دور دور نزدیک سے لوگ آنے لگے تھے ۔
انہی دنوں ہمارے ایک ساتھی نے بات چھیڑ دی ۔ "جیلا کتنا بدنصیب
ہے ایک عورت کیلئے ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ۔ دیکھو تو پیر جی کے مزار
پر بھی نہیں آتا ۔"

"اس پر پیر جی کا قہر نازل ہوگا ۔"

"جو لوگ اس دھرتی پر پیدا ہوئے ہیں وہ پیر جی کے مزار سے
دور نہیں رہ سکتے ۔"

"میں کہتا ہوں ۔ جیلا آئے گا اور ضرور آئے گا ۔ آج نہیں تو
کل آئے گا ۔ ۔ ۔ !"

اور سچ مچ ہوا بھی یونہی ۔ دوسرے روز "چراغاں" کا میلہ
تھا ۔ ان گنت لوگ آئے ہوئے تھے ۔ لوگ آتے اور نذرانہ پیش کرتے ۔
نذرانہ دیتے ۔ اور پھر باقی کاموں میں مصروف ہو جاتے ۔ تم پوچھو
گے [illegible] اس بارے [illegible]
شاندار ہوتا تھا ۔ اس میلہ میں دور دور نزدیک سے [illegible]
[illegible] لوگ [illegible] اشیاء کا تبادلہ کرتے [illegible]

میلے کا سارا بیوپار ہوتا ہے۔ کوئی کچھ خریدنے آتا ہے اور کوئی بکریاں بیچنے۔ کوئی گھوڑے کے بنے ہوئے شال [illegible] لیکر آتا ہے تو دوسرا چاندی کے چین اور گڑ۔ مگر ایک بات سب میں مشترک ہے۔ سارے ایک ہی پیر کے مرید ہیں۔ سب لوگ ایک سا تھیلے لنگر میں بیٹھ کر بڑے پیار سے کھانا کھاتے ہیں۔ اور گھر کی نکالی ہوئی شراب جو یہاں عام بکتی ہے ضرور پیتے ہیں۔ پیر جی کے مزار پر قوالیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کلکاریاں مارتی ہوئی کوئی ٹولی ادھر آتی ہے تو دوسری ٹولی ستلج دریا کے کنارے وارث شاہ کی ہیر گانے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

غرض صاحب میلہ اپنے پورے جوبن پر تھا کہ جنگل کی آگ کی طرح ایک بات سارے میلے میں پھیل گئی کہ ایک جاٹ اپنی بیوی کو ساتھ لیکر میلے میں آیا ہے۔ وہ جاٹ بڑا بانکا ہے ہاتھ میں سمر جڑی لاٹھی جو اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ لاٹھی کو اس نے تیل پلا رکھا ہے۔ اس کے گلے میں تعویذ ہے۔ لمبا کرتہ اور کمر میں تہبند ہے۔ جٹی بیحد حسین تھی!

میں یہ بات سنتے ہی جان گیا کہ ہو نہ ہو ضرور جیلا ہی ہے میں اس خبر کے لئے جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ میں اٹھا اور میلے کی طرف چل دیا۔ میں نے اُن کو دُور سے دیکھا۔ ہاں جیلا ہی تھا۔ وہی لمبا قد۔ چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط بدن۔ عورت بھی انتہائی حسین معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان سے دور ہونے کے باعث میں اُسے پہچان نہ سکا۔

وہ پہلے پیر جی کے مزار پر گئے۔ چڑھاوا چڑھایا۔ نذر نیاز دی اور واپس آ گئے۔ لوگ ان کے سامنے سے جیسے خود بخود ہٹتے جاتے۔ جیلے کا رعب ہی کچھ ایسا تھا اور پھر جب وہ گھوم پھر کے میلہ دیکھنے لگے۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی اور جیلا اپنے کاندھے پر لاٹھی رکھے اس کے نقش پا پر چل رہا تھا۔ جدھر سے وہ گذرتے لوگ ان کی طرف دیکھتے ہی رہ جاتے۔ خبر نہیں۔ یہ جیلے کے چہرے کا جلال تھا کہ اس کی نکھرتی ہوئی لاٹھی کا رعب تھا یا عورت کی صورت کا جادو۔ لوگ انہیں خود بخود راستہ دیتے جاتے اور وہ گھومتے جاتے۔ اسی طرح جیسے کوئی گم کی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ پیچھے جب سارا میلہ گھوم کر باہر نکلے تو یہ محض ایک اتفاق تھا کہ وہ اُدھر آ نکلے جہاں میں کھڑا تھا۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جیلے کے ساتھ ساتھ چلنے والی لڑکی کوئی اور نہ تھی بلکہ خود جنتو تھی۔ ہاں جی تیرہ سال کی لڑکی جنتو جس کے تم کئی قصے سن چکے ہو۔ جیلے نے میری طرف دیکھا اور ہجوم سے باہر آتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر شیر کی طرح ہنستے ہوئے گرجا۔ یوں جیسے بادل پھٹتا ہے۔ اس کا رنگ لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیئے۔ جب تو بے کی آواز نکالی اور پھر جنتو سے مخاطب ہوا۔ "لے دیکھ لے جنتو نار! آج تک کسی ماں نے ایسا بیٹا جنم نہیں دیا جو اس جیلے کے سامنے ٹھہر سکے۔ میں تجھے بھرے میلہ میں سے نکال لایا ہوں۔ سن [illegible] دی جنتو! اگر تیری طرف کوئی آنکھ بھر کے دیکھتا تو اس کی گردن زمین پر لڑھکتی نظر آتی۔ ہا ہا ہا۔"

اور اس نے جنتو کو آغوش میں لے لیا۔

میں نے دیکھا کہ جیسے کسی ان جانے ڈر سے جنتو کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہوں۔ میں اور آگے بڑھا۔ بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "جنتو!" اس سے پہلے کہ جیلا اپنی لاٹھی اوپر اٹھاتا جنتو میری آغوش میں تھی۔

"اوہو — تو — " جیلا چیخ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے جیلے کی لاٹھی میری گردن میں دُور تک اتر گئی ہو جیسے میری گردن چیخ گئی ہو۔ لیکن اس کے بعد جیلا لاٹھی کا دوسرا وار نہ کر سکا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک ہی ضرب سے اس کا دم ٹوٹ گیا تھا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور وہ لڑکھڑا کر پیر جی کے مزار پر جا گیا اور جلتے ہی یوں بے حس ہو کر گرا کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔

جنتو کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں اٹھا اور میں نے جنتو کے پانچ سات ہاتھ لگا دئے۔ وہ بلبلا اٹھی اور سسکتی ہوئی بولی۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے۔" وہ مجھے اس وقت بہت ہی پیاری نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تو مجھے مشعلوں کی طرح روشنی دکھا دے رہی تھیں اور مجھ میں اس سے تاریک رات کا اندھیرا چھا کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتی جیسے آنسو تھے۔ وہ جس انداز سے مجھے دیکھ رہی تھی اس پر مجھے پیار آ گیا۔

"جنتو —" میں نے کہا۔ اور اس کے بعد پھر وہ میری آغوش میں تھی۔

"اور اس کے بعد جنتو میرے ساتھ [illegible] میری [illegible] کرتی رہی۔ اپنے ہاتھ سے مجھے [illegible]

رہی۔ وہ مجھے کبھی چھپا رہ سکا ہو نہ دی ۔۔۔ وہ مجھے ایک سیدھی سادی اور عام سی عورت نظر آتی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے عام چیزوں سے چڑ ہے۔ ایک بات ہے اس کے بہتے میں بھی فکر ڈالنے لگیا۔ کبھی چھوڑ نہ دی۔ یہاں تک کہ اب مجھے شراب بھی اچھی نہیں لگتی تھی ۔۔۔ انہی دنوں بنتو ایک صبح کو خود بخود مجھے چھوڑ کر چلی گئی ۔۔۔ اس کے جانے کے بعد اب کئی مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوتا بنتو کی ایک چھپا رہ تھی ۔۔۔ اسے پیشہ ور ملزم اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسے چوروں اور ڈاکوؤں سے محبت تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے کوئی بڑا ڈاکہ ہو سکے چونکہ وہ خود ایک ڈاکو تھی۔ معاف کرنا بنتو کا خیال آتے ہی پھر سینہ سلگ اٹھا ہے میرا بند بند پھڑک رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بنتو اگر مجھے کہیں اتفاق سے مل جائے تو میں اس سے پوچھوں ... میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی "چھپا خان" کے میلے پر میری بنتو سے ضرور مڈبھیڑ ہوگی۔ اور اس کے ساتھ اس کا نیلا ماند بھی ضرور ہوگا مجھ پر جھپٹے گا کہ قسم میں ایک ہی وار میں اسے ہمیشہ کے لئے سلا دوں گا۔ میرا بازوؤں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ میں اب بھی اپنی آغوش میں اٹھا کر بھرے میلے میں سے لے جاؤں گا۔

دریا

لیجئے۔ بنتو تو چلی گئی ۔۔۔ مگر تم تو جانتے ہو کہ اس کے جاتے جاتے اس کی کئی نشانیاں میرے پاس رہ گئیں۔ بنتو کی یاد میرے سینے میں آشیانہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔ لوگ کہا کرتے ۔۔۔

"تیری ہک تے آلا پاوے گونہ دے
جنگلی کبوتر نے ۔۔۔"

اسے گونہ دو تیرے سینے پہ جنگلی کبوتر نے آشیانہ بنا لیا ہے یا لگے ۔۔۔ یہاں تو وہ گونہ دو جنگلی کبوتر کے سینے پہ آشیانہ بنائے بیٹھا ہے ۔۔۔ نہ جانے کب سے مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سینے کی لہروں کی طرح خود بخود ہنستی کھیلتی میرے پاس آتی اور چلی جاتی ہے ... اب کچھ پیار کرنے لگی۔ مگر ... دریا کی زندگی کے متعلق سوچا ہو تو تم قیاس کر سکتے ہو کہ بنتو بھی اصل میں ایک دریا ہی تھی ۔۔۔ اس کا مفہوم یہ بھی شاید اس طرح ہوگا جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بلند بلند رستانے پتھروں غرقیوں کی طرح درخشاں اور اچھلتا ۔۔۔ اور پھر وہ میرے سامنے چل پڑی پھر وہ پہاڑ بن گئی ۔۔۔ ٹپ ٹپ رستا ہوا پہاڑی چشمہ بڑھتا بڑھتا ایک دریا بن گئی۔ اس دریا میں سے لہریں اچھلتیں اور پھر روپوش ہو جاتیں اور جب کبھی ایک طوفان اٹھتا تو پانی میں ہلچل پیدا ہوتی جیسے کناروں کو نگل ڈالے گا۔ اور جب یہ دریا پُرسکون ہو جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس جیسا کوئی بھولا مانس کوئی اور نہ ہو۔ پتہ نہیں کیوں جب جب میں بنتو کے متعلق سوچتا ہوں تو وہ ٹھیک بھرپور دریا کی طرح بے حد چنچل اور کبھی گمبھیر معلوم ہوتی ہے۔

لیجئے میں اپنی دریا جیسی بنتو کی ایک اور جھلک تمہیں دکھاتا ہوں۔ ایک صبح کو جب جیلے کی موت کے بعد میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو کہیں نظر نہیں آرہی۔ ادھر ادھر جھانکا۔ اسے پکارا لیکن وہ تو جیسے روپوش ہو گئی تھی۔ اسے ڈھونڈتا ہوا میں جیلے کی حویلی میں جا نکلا۔ میں ابھی اس کی حویلی کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے مجھے بنتو کی دبی دبی ہچکیوں کی آواز سنائی دی ۔۔۔ میں بھاگ کر اس حویلی کے اندر گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو دھرتی پر پڑی ہوئی بلک رہی ہو یوں جیسے کسی نے اس کے کاری ضرب لگائی ہو۔

"بنتو ۔۔۔" میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہ کرے اور مجھے دیکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جائے ۔۔۔ میں نے اُسے پیار کیا، دلاسہ دیا۔ تب جا کر اس نے مجھے بتایا کہ اسے یہ سوت پیاری ہو گئی ہے ۔۔۔

"جیلے کی یاد مٹانے کے لئے اس نے جیلے کی حویلی انتخاب کی ہے ۔۔۔" ایک دم یہ بات میرے دماغ میں آئی۔ مجھے جیسے اس وقت بنتو سے نفرت ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کیا اسے جیلے کی یاد و حیثیت چاکر سکے میں رہا آدمی۔ اس نے میری آنکھوں میں نفرت کی چمک دیکھ لی تھی ۔۔۔ وہ بولی: "اب کے لئے تو میں یہاں چلی آئی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اور میں نے سوچا کہ واقعی اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔

اس کے بعد وہ دھرتی پر پڑی بلکتی رہی ۔۔۔ کبھی ہنستی تھی کبھی ہچکیاں لیتی تھی اور کبھی مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاتی تھی ۔۔۔ کیفیت انتہا ہو کر ... میں اس طرح اُسے گھنٹوں تک جدوجہد کرتے دیکھتا رہا۔ کبھی

زندگی سے اور کچھ موت سے ——— وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اور اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے پانی مانگا اور میں پانی لانے کیلئے ستلج کے کنارے کی طرف دوڑا۔ جب میں واپس آیا تو بنتو ماں بن چکی تھی۔ ایک میٹھی سی مسکراہٹ اس کے سانولے چہرے پر ناچ رہی تھی۔ ایک صناع کی طرح جو اپنی تخلیق کے مکمل ہونے پر خوش ہوتا ہے۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے آج تک اُسے کبھی یوں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ اندازہ لگایا کہ کسی کو زندگی دینا کسی کو ہلاک کر دینے کی بہ نسبت کتنا عظیم کام ہے۔ میں آج تک تاریکی میں رہا تھا۔ مجھے تو صرف موت ہی کا علم تھا۔ میں نے ان گنت لوگوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا لیکن بنتو کی اس مسکراہٹ نے میرا تاریک ساحل جگمگا دیا تھا۔

"کسی کو مٹانے کے لئے صرف ایک پل چاہیئے" میں نے سوچا "مگر کسی کو بنانے کیلئے ایک ماں کا کلیجہ چاہیئے۔ دل گردہ اور جتنی وسعت چاہیئے۔ کسی صناع کی صناعی چاہیئے" اور میں بہت خوش تھا۔

بنتو نے اپنے جیسی ایک اور بنتو کو جنم دیا۔ جنم دیا اور خود چل دی۔ دریا کی بھی یہی خاصیت ہے۔ بہتے ہوئے دریا میں سے اگر کوئی نہر نکلتی ہے تو دریا اس کے لئے رک نہیں سکتا۔ دریا کا کام آگے بڑھتے رہنا ہے۔ اور وہ مسلسل بہتا چلا جاتا ہے۔ نہر اپنے راستے پر ہو لیتی ہے کبھی تم نے دریا میں طغیانی دیکھی ہے؟۔ اس وقت اس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ کوئی رکاوٹ اس کی حائل نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس وقت دریا چڑھ کر اترتا ہے تو وہ اپنے کنارے پر منوں ریت چھوڑ جاتا ہے۔ ریت جس میں سرسوں کے دانے ہوتے ہیں۔ کنکر اور پتھر ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اسی ریت پر تاج محل تعمیر کیا تھا۔ اس میں میری بنتو کی نشانی کے طور پر ایک ننھی سی بنتو پرورش پا رہی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دریا اپنی پرشباب روانی میں اپنے دل کا بھید اپنے ساحلوں پر لے آیا ہو۔ آج میں نے بھی تمہیں اپنے اس بھید میں شریک کر لیا ہے تاکہ اس زمانے تم مجھے بھی ایک دریا کہہ سکو۔ لیکن یہ بھید میرا اپنا بھید ہے ——— جس بھید کی میں آپ کو کہانی سنا رہا ہوں وہ چھوٹی اور بنتو کا مشترکہ بھید تھا۔ مگر میں بھی اس بھید میں شامل ہوں۔ میں اُسے اپنی بنتو کہتا ہوں۔ وہ بنتو نہیں بلکہ ایک نہر کی طرح میرے اور بنتو کے درمیان نکل آئی تھی۔ اور میں [illegible] کی طرح جس نے

ایک دوسرے سے جدا نہ کیا۔ بلکہ وہ بنتو جو فطرت کے رنگوں کی اپنی محبت سے سرشار ہو گئی۔ آؤ میں تمہیں اپنی بنتو سے ملاؤں۔ اب میری بنتو سیانی ہو گئی ہے۔ جس کے خدوخال اپنی ماں کی طرح ہیں۔ میرے سامنے وہ بچپن سے جوانی چڑھ رہی ہے۔ آزاد جنگلی ہرنی کی طرح سارے علاقہ میں چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ وہ اس سارے علاقہ کی ملکہ ہے۔ کبھی ابھی اس دریا کے کنارے پر گھوڑے سے غبار ہی تھی ہو سکتا ہے جھاڑیوں میں تتلیاں پکڑنے چلی گئی ہو۔ یا کہیں دریا کے کنارے بیٹھی ہوئی شاید لہریں گن رہی ہو۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ دریا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکا کر گھنٹوں بیٹھی رہے گی۔ اصل میں وہ خود بھی تو دریا کی ایک لہر ہے۔ میں نے کئی بار اسے لہروں سے باتیں کرتے سنا ہے۔ لہریں اس کو بہت عزیز ہیں۔ جب بھی وہ لہروں کی اس دنیا میں کھو جاتی ہے تو میں اس سے کئی بار یہ کہتا ہوں "پگلی ——— لہروں کا کیا بھروسہ ——— چھوڑ انہیں ——— ان کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا"

مگر وہ جیسے لہروں کی زبان سمجھتی ہے۔ لہریں اس کے دل کے ساز کو جانتی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ اور خود لہروں کی "ترل ترل" کی طرح اس کی ہنسی دریا کی سطح پر پھیل جاتی ہے۔ لہریں اس کی ہنسی کو کہیں دور لے جاتی ہیں ——— اپنے ساتھ ——— اور وہ ہنستی ہوئی ہاتھ کر دیکھتی رہتی ہے ——— دور تک پانی کے بہاؤ کو۔

"چلو سے گیا ہوا پانی لوٹ کر نہیں آتا" میں پھر اس سے یہ کہتا ہوں کر اور وہ اداس ہو جاتی ہے۔

"کیا مطلب ہے پنڈت کے اس دلیش کا ——— چھوڑ انھیں ——— آؤ چلیں پیر جی کے مزار پر۔"

شام ہو جاتی ہے اور وہ میرے ساتھ لوٹ آتی ہے۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پیر جی کے مزار پر چراغ جلاتی ہے ——— چراغ کی لو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی ہے ——— مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چاروں طرف چاندنی چھٹک گئی ہو اور اس وقت وہ مجھے اصل بنتو نظر آتی ہے ——— میرے سامنے اس بنتو کا چہرہ آ جاتا ہے جو [illegible] جنم دیا تھا۔ اور میں [illegible]

[illegible]

دیا جاتی ہے تو مجھے بے حد پیار آتی ہے۔ ... میں نے ان کو
بار ہا دل کو اس خدا سے پر چراغ جاتے دیکھا ہے لیکن ان کے ہاتھوں میں
مجھے ہمیشہ سنگدلی اور بے رحمی نظر آتی ہے۔ لیکن فتنہ کے ہاتھوں میں
ایک دلکش ادا ہوتی ہے — ایک حقیقت ہوتی ہے — محبت کا ایک
جذبہ ہوتا ہے جو کسی ہماری گناہ کا کوئی معاف کر سکتا ہے۔ جس کے
دل میں کسی کو دکھی دیکھ کر رحم کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔
میں سوچتا ہوں کہ میری اس فتنہ کے صدقے ایک دن ایسا آئے گا جب
یہ مزار، یہ چادریں اور ویرانہ جھونپڑے اس کا گو دوں کی پناہ گاہ نہیں
رہے گا اسی یک مقدس مقام بن جائے گا۔ عورتیں یہاں بلا روک ٹوک یہاں
آ سکیں گی — اور کیا عجب کسی روز فتنہ بیگم پھر کسی "بچہ اغواں" کے بعد
پر گھومتی ہوئی مجھ سے یہاں آملے۔ دریا کے دو کنارے آپس میں ملتے نہیں
یاد میں۔ لیکن لہر کو لہر سے ہر دم ملنا جاتی ہے۔ مجھ تو ان تمام برسوں میں
دریا کی ان لہروں کی زبان سے اپنا سندیشہ بھیجتا رہا ہوں —

• بھٹکے دلیس دو آبے — امیاں نواں شیخ :

• مدد آبے کی سرحد میں چھوڑ کر تو آموں کو ترس جائے گی :

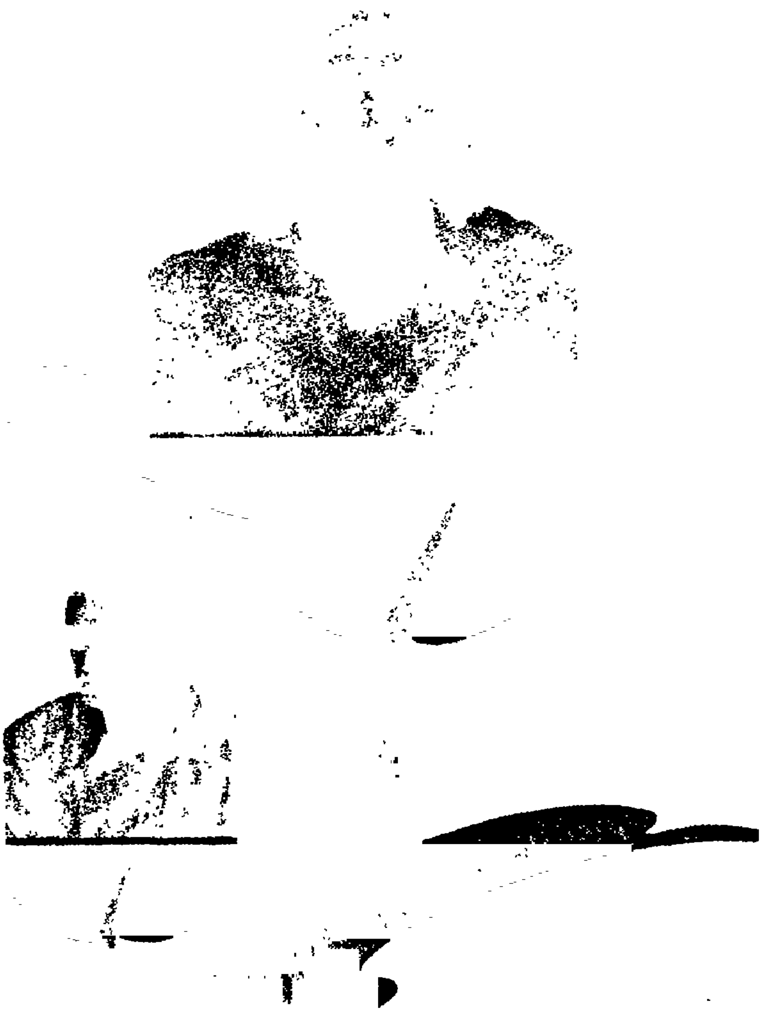
سندری اتم چندانی

سندری اتم چندانی ۲۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسکول میں پڑھتے ہوئے مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۴۶ء میں "ساتھی" رسالے کی نائب مدیر مقرر ہوئیں۔ یہ رسالہ کراچی سے طالب علموں کے لئے نکلتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں مشہور ادیب کی شادی جناب اے۔ جے۔ اتم سے ہوئی جو خود سندھی زبان کے بہترین ادیب تھے بلکہ وہاں کی ترقی پسند ادبی تحریک کے روح رواں تھے۔ اس شادی سے ان کی ادبی زندگی کو ایک نیا موڑ ملا۔ اور انہوں نے مراٹھی اور بنگالی زبانوں کے ترقی پسند مصنفین کرشن چندر، حنیفہ، بہادر، ٹیگور، آچاریہ اور کئی دوسروں کی کہانیاں سندھی زبان میں منتقل کیں جو وہاں کے ترقی پسند رسالے "نئی دنیا" میں شائع ہوتیں۔ ۱۹۵۳ء میں "ممتا" کہانی پر پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسری بہترین کہانی "کرشان" پر ۱۹۵۷ء میں پہلا انعام ملا۔ یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے براڈکاسٹ ہوئی۔ مصنفہ نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں ۲۵ کہانیاں تحریر کیں اور دو ناول "کرتی دیواریں" "پریت پرانی ریت نرالی" کے ناموں سے لکھیں۔ یہ دونوں ناول سندھی زبان میں بہترین سمجھے جاتے ہیں۔

"کرتی دیواریں" میں مصنفہ نے عورت کی اہمیت اور اس کی جدوجہد افسانوی رنگ میں پیش کی ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ عورت صرف بیوی ہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں اس کی بہترین ساتھی ہے۔ ناولٹ کے دو اہم کردار "ریکھا" اور "چندن" دو متضاد خیالات کے حامل ہیں۔ ریکھا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گھریلو طرز کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اور اس کی دلی خواہش یہ ہے کہ چندن صرف اس کا ہی ہو جائے۔ لیکن چندن بیوی کا ہونے کے ساتھ ہی ایک ایسا احساس دل رکھتا ہے جس میں ریکھا جیسی ہزاروں عورتوں، مردوں اور بچوں کے لئے بھی محبت ہے۔ زندگی کی یہ کشمکش پھر سے ریکھا کو مجبور کرتی ہے کہ وہ چندن کے دوش بدوش چلے۔ اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ چندن کے پاس اس کے لئے کچھ نہیں بلکہ سب کے لئے ایک محبت بھرا گھر بھی ملا ہے۔

سندری کی تحریروں میں زندگی جیون کی تخلیقی تصویر کشی، قوت دار کردار نگاری اور اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ سنجیدہ بیانی بھی ہے۔ یہ ناولٹ ان تمام خوبیوں کا حامل ہے۔



سُندری اُتم چندانی — مترجم: درباری لال اجوانی

گرتی دیواریں

(۱)

دیپک نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا:

"چاچا جی! دوکان کا سارا سامان جا تا رہا اور بازار کا قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بیوپار سے سنیاس لینے کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہا۔"

گوپال داس نے اپنی ساری زندگی بازار میں دوکان چلانے میں بتا دی تھی تاکہ جب دیپک قابل ہوگا تو دوکان اس کے ہاتھوں میں سونپ کر باقی زندگی اپنے دیس میں چین سے گزاریں گے مگر دیپک نے پانچ سال میں ہی دوکان چوپٹ کر دی۔ دیپک کے بھاگ جانے کی اطلاع جب حیدرآباد (سندھ) پہنچی تو اس ہرے بھرے گھر کا نصیب ڈوبنے کی راہ پر ڈھلک رہا تھا۔

گوپال داس ویسے تو اتنے معمر نہیں تھے مگر اس واقعے نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اور وہ اتنے نحیف ہو گئے کہ اٹھنے کے لئے کمر پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ زیادہ باتیں کرتے تو کھانسی کا دورہ پڑنے لگتا۔ چوٹ بھی کوئی معمولی چوٹ نہیں تھی ان کی ساری جائیداد بک گئی۔ اس جائیداد کے بل بوتے پر ہی تو انھوں نے ریکھا کی ماں برسوں تک لاڈ پیار سے پرورش کی تھی اور پندرہ ہزار روپے اپنی بڑی لڑکی کے جہیز میں خرچ کر کے چار سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ہونہار شوہر کے ہاتھ سونپا تھا۔

گوپال داس اب کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے جو رشتے دار ان کے گھر میں ڈیرا ڈالے پڑے رہتے تھے اب بھولے بھٹکے ہی ادھر چلے آتے تھے۔ دوستوں کے گھر میں آنا جانا بند ہو چکا تھا۔ جب بچوں کو کھیلتے دیکھتے تو اپنے ننھے پوتے گوبند کی یاد ستانے لگتی۔ جب اس کے ساتھ ختم ہو گیا تو بچپن کہیں آتیں گے۔ دادا جی ہم تم ۔۔۔ کھیل کرس پیلا تیں؟"

بچہ پوچھ بیٹھتا: "دادا، میرے ساتھ کھیلنے کے لئے میرے پاپا کب آئیں گے؟"

پوتے کا یہ سوال سن کر ان کا دل بھر آتا اور دکھ کی گھٹائیں انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ کہتے: "جب اس کا کام ہو جائے گا۔ تبھی آئے گا بیٹے!"

ان کا دل تڑپ اٹھتا۔ آخر اس بچے نے کیا گناہ کیا ہے؟ ماں کے پیار سے تو بچپن میں ہی محروم ہو گیا تھا اور زمین پر اسے جال میں پھنسا پڑا ہے۔"

ریکھا کی ماں جب کبھی دیپک کی تصویر دیکھتی اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اس کی آنکھوں کی روشنی بجھتی جا رہی ہے۔ ریکھا جب اپنے کمرے میں بیٹھی، بینا کے تار چھیڑتے ہوئے سُر بھری آواز میں کوئی گیت گاتی تو گوپال داس کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ ریکھا کی ماں آنسو بہانے لگتی۔ گوپال داس کہتے "اگر ریکھا کے نصیب میں سُکھ لکھا ہوتا تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ تب اسے ایسا شوہر ملتا کہ ساری دنیا اس پر رشک کرتی رہ جاتی۔"

اور تب اچانک نفرت کی ایک آندھی آئی۔ دیس کے بٹوارے کی بھیانک آندھی۔

پہلے تو لوگ سہم گئے پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد کی گلیاں سونی ہونے لگیں۔ ریکھا کی ماں کہنے لگیں تب ۔۔۔ [illegible] آتی تھی تب بھی لوگ ایسے نہیں بھاگتے تھے۔ اب ایسا کیا ہو گیا کہ لوگ اپنی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ کر بھاگے جا رہے ہیں [illegible]

گوپال داس نے اخبار پڑھ کر سنایا کہ کس طرح لاہور میں [illegible] اسباب اور انسانوں کی تباہی اور دوشیزاؤں کی لوٹ [illegible]

اور پھر وہ اندر ہی اندر ریکھا کے خوبصورت سڈول جسم پر بار
بار جاتیں اور ان کا دل کسی خوفناک تصور سے کانپ اٹھتا جب
ریکھا ابھی بچی تھی اور ماں کے ساتھ باہر نکلتی تو لوگ کہتے "یہ لڑکی
تو تمہارے دودھ اور گھی میں پل کر پیدا ہوئی ہے۔"
بیٹی کی خوبصورتی کے متعلق تعریف سن کر وہ کتنی خوش اور
فخر سے نہال ہو اٹھتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ اس کا دل بھی گرم
ہوا نہ تھے۔

ایک دن گوپال داس کی بہن نے آکر کہا۔ "بھیا، یہ بارہیں
بھاری نقصان اٹھانے پر بھی آپ کے پاس اتنا کچھ باقی ہے کہ
کوشش کرنے پر آسانی سے پاکستان چھوڑ سکتے ہیں۔ پرماتما
کی مہربانی سے آپ پر کسی کا قرض بھی نہیں ہے مگر میرے پاس تو
سو دو سو روپے بھی نہیں کہ لڑکیوں کو لیکر کہیں جا سکوں۔"
گوپال داس بولے۔ "بہن ایسا نہ کہو۔ تمہاری لڑکیاں تو ابھی
چھوٹی ہیں۔ میرے گھر میں سیانی لڑکی ہے، وہی سب سے بڑا
قرضہ ہے۔ اگر ریکھا کے لئے دس ہزار بھی پاس رہتے تو اس بھگدڑ میں
بھلا اس بوجھ کو سر پر لادے پھرتا ہے تاہم بہن کا کنجوس نہیں ہوں
وقت آنے پر سو دو سو دینے سے نہیں چوکوں گا۔"
بہن نے سر جھکا لیا اور بولی — "بھیا، برا نہ مانو تو ایک
بات کہوں؟"
"کیسی باتیں کرتی ہو بہن۔ تم بھی میرے لئے ریکھا سے کم نہیں ہو۔ بولو
کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"تو پھر ریکھا کی سگائی میری دیورانی کے بھتیجے کے ساتھ کر دو۔
لڑکا تین تین کالج پڑھا ہے اور کالرکی ہے لیکن دین دہیج کی کھینچا تانی
بھی نہ ہوگی۔ بڑی بہو بیٹے چل گئی ہے۔ کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی
کوئی نہیں ہے۔"
بہن چلی گئی تو ریکھا کی ماں نے گلا پھاڑ کر اپنا فیصلہ سنا دیا کہ
وہ ایسے کنگال گھر میں اپنی لڑکی کبھی نہیں بیاہے گی۔
پھر قافلہ ہٹتا رہا
گوپال داس اخبار پڑھ پڑھ کر ریکھا کی ماں کو سمجھاتے رہے کہ
کس طرح ہر ایک ہندو بچے کی مانند ... کھلے کر اپنے پاس
... [illegible]

کرکے تباہی کی آگ بجھاتے رہے۔
ملک بھر میں سنسنی پھیلانے والی خبریں سن سن کر ... ہر وقت
سینکڑوں شادیاں ہونے لگی تھیں۔ لوگ لڑکیوں کا بوجھ ہلکا کرنے کو
کنواروں سے بیاہ رچانے کی دوڑ میں گویا ایک دوسرے سے بازی جیتنے
کی فکر میں بدحواس ہو رہے تھے۔
ایک روز پڑوس سے لوٹ کر آنے پر رکمنی سیدھی پتی کے کمرے
میں جا کر بولی۔
"اب تو میرا دل بیٹھتا جا رہا ہے۔ سبھی یہاں سے بھاگنے کی تیاری
کر بیٹھے ہیں۔ ہم جوان کنواری لڑکی کو لے کر کہاں کہاں بھٹکیں گے؟"
گوپال داس نے کہا "پگلی کہیں کی، یوں رونے سسکنے سے تو یہ
مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تم سے یہ تو ہوتا نہیں کہ اس کے لئے کسی گھر
بر کی تلاش کرو۔ بہن والی بات بھی تمہیں پسند نہیں۔"
"آپ کا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہے۔ اور بھی تو کئی گھر ہیں۔
ان کی کوئی پوچھتا بھی نہیں بس اسی کی رٹ جاری ہے۔ ہر وقت
دیدی والی سگائی۔ میں کہتی ہوں آپ کو سیتل داس کے گھر کا
خیال کیوں نہیں آتا؟"
"لیکن، — چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گوپال داس نے کہا۔
"سیتل داس کو چاہیں۔ بیس ہزار روپے، یہاں تو نقد میں بیس سو
بھی نہیں، چلو ہے ہاتھیوں کے ساتھ گنا کھانے۔"
"روپے تو بہت تھے مگر انہیں ختم ہوتے کتنی دیر لگتی ہے یہی
وجہ ہے کہ لڑکی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔"
رکمنی جیسے بھرا آنکھوں سے آنسو بہاتی رہی رات کو وہ دل میں
چبھتے ہوئے نشتر کو برداشت نہ کر کے شوہر سے بولی "اگر دیدی کی
بات مان لیں تو ریکھا کیا تو نہیں مانے گی؟"
"جا کر ریکھا سے پوچھ لو۔"
گوپال داس کے ہاتھوں پر گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں ٹپکیں
پونچھ کر بولے "ارے پگلی روتی ہے؟ اگر ریکھا کا نصیب اچھا
ہوگا تو ... [illegible]"
"— مگر ریکھا کیا کہے گی؟" ... [illegible]
"... [illegible]"
"... [illegible]"

گوپال داس سکھا نقش پہ گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں ٹپکیں، چونک کر بولے

ریکھا نے ہمت باندھ کر جواب تو دے دیا تھا مگر اب وہ ڈٹ کر سامنا نہ کر سکی اور کمرے میں جاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ شادی کی ساری تیاریاں جلدی میں ہونے لگیں اس دن جیسے ہی ریکھا کی آنکھ کھلی اسے محسوس ہوا گویا سارا آسمان جگمگا رہا ہے جو کچھ وہ رات بھر سوچتی رہی تھی اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تو پانی میں تیرتے ہوئے پھولوں کی طرح اس کے دل کے تالاب میں ایک ہی بات تیرنے لگی———

——— آج میری شادی ہے ———"

اس نے سوچا آج تک میری زندگی کی ناؤ بھٹکتی رہی ہے اب کنارہ سامنے ہے۔

اتنے میں اندرا، شیلا اور گوپی تینوں رشتے کی بہنیں اس کے سرہانے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہنسی مذاق سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔ ایک دوسرے کو چٹکی کاٹتے ہوئے وہ ریکھا سے مذاق کرنے لگیں۔

ایک نے کہا۔ "تم نے آج رات بڑا سا سپنا دیکھا ہوگا"

دوسری بولی۔ "ذرا دیر سے اٹھی آج تو ساری رات جاگنا پڑے گا"

تیسری، "اس اور پیاز میں ہینگ ملانے کی خاطر بولی "ابھی ایک آگئی رات ہی کیا اب تو نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر گزارنی ہوں گی۔ ان ساری راتوں کے لئے آج ہی نیند پوری کر لیتی کیا؟"

ریکھا شرمائی، مسکرائی، ہنستی، چہکتی، بہنوں کی چٹکیوں کو سہتی چونک کر جاگ اٹھی، چہرے سے لاج اور مسکان کی ملی جلی دھوپ سے کے لئے گلاب کی پتیاں سی بکھرنے لگی۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے اندر جھانکا تو اس کی گوپی، بہن، بیاہی اور شیلا تینوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

ریکھا کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر ریکھا کو کچھ شک سا ہوا۔ اس کے آتے ہی سب کے چہرے دل میں نشتر کی مانند چبھنے لگے سب سے بڑی کمرے کے پیچھے سے ہوکر گزری تو دیکھا، اس کی ماں کرسی پر بیٹھی دوسرے ہاتھ کو پکڑے بیٹھی تھی۔ ریکھا کو دیکھتے ہی دونوں چپ ہو گئے۔ ریکھا نے منہ پھیر کر دیکھا دونوں کے چہرے پر غم کے

گہرا بادل کا سایہ پڑا ہوا تھا، اس کا شک یقین میں بدلنے لگا، ضرور کوئی بڑی بات ہوئی ہے۔

مگر ایسا بھی کیا راز ہے جو اس سے چھپایا جا رہا ہے؟

دوسرا کمرہ بھی، جو ابھی ہنسی مذاق سے گونج رہا تھا یکایک گمبھیر ماحول میں بدل گیا۔ ریکھا وہاں پہنچی، سب خود سے چاچی کی باتیں سن رہی تھیں۔ ریکھا کا وہاں پہنچنا تھا کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کمرے میں اتنی عورتیں موجود ہونے کے باوجود ریکھا کو بھیانک سناٹے کا احساس ہوا وہ سوچنے لگی، کہاں جاؤں، کیا کروں؟ یہ سب میری طرف ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ اور دیکھ کر اپنا منہ کیوں موڑ لیتی ہیں؟

اس نے چاہا، سب کا دامن کھینچ کھینچ کر پوچھے کہ اس نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں گئی، رکمنی غمگین سی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر ریکھا کے دل کی رفتار رک سی گئی۔ جب ماں کو سارے گھر میں دوڑ دوڑ کر سب کے کھانے پینے کی فکر کرنی چاہئے اس وقت اس حالت میں کیوں؟ رہ رہ کر ہوا میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ ... کیوں؟ کیوں؟ اور کیوں؟—

ایک انجانے خوف کے تصور سے اس کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ وہ دوڑ کر ماں کی گود میں جا گری۔ سسکتے ہوئے اس نے پوچھا "ماں، آپ سب لوگ اس طرح چپ کیوں ہیں؟"

رکمنی، ریکھا کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہلاتے ہوئے بولی "یونہی بیٹی، کوئی خاص بات نہیں ہے"

"میری قسم! اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے ریکھا نے پوچھا۔

رکمنی کا دل پسیج گیا۔ بولی۔ .. "رات کو ایک بری خبر سنی ہے"

"کیا سنا ہے؟ ایسی کونسی بری بات سنی ہے ماں؟" ریکھا بے صبر ہو کر بولی۔ اس نے ماں کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔

ماں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "رات کو تمہارے پتاجی کے پاس جو بھی رام بیٹھا تھا وہ تمہاری بیٹی کا ... وہ کہتا تھا چھتن شکل سے اتنی روپیہ طلب کر رہا ہے ...

مفلسی سے اکر اپنی بہو کو کہا نے پینے کی تنگی کی وجہ سے اپنے میکے چلی گئی ہے۔"

ریکھا کچھ دیر خاموش رہی پھر چنچل بچے کی مانند مسکرا کر بولی —
"بھلا اس میں ایسی کیا بڑی بات ہے جو سارے گھر میں اداسی چھائی ہے؟"

بیٹی کی معصوم نگاہوں میں جھانکتے ہوئے رکمنی بولی "میں نے تمہیں پھول کی طرح پالا پوسا اب تمہیں ایسے کنگال گھر میں کیسے جانے دوں؟ میں تو پہلے ہی انکار کر رہی تھی۔"

ریکھا چونک اٹھی۔ گوپال داس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بیوی کے آخری الفاظ سن لیے تھے۔ بولے "پگلی۔ تو کیا شادی کے دن سگائی توڑنے کا خیال ہے؟ اب تو رچن دے دیا سو دے دیا۔"

"ہم بیٹیوں والے گھر میں لڑکی جا رہی ہے، اب کو رہنیں رہے گی۔ جو کچھ نصیب میں لکھا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ ہم بھی تو مجبور ہیں... اچھا بر، خوش حال خاندان بنا جہیز کے کہاں ملتے ہیں؟"

رکمنی خاموش رہی۔ دل ہی دل میں کہا یہ مجبوری اور بے بسی ہی تو سب سے بڑا دکھ ہے۔"

ریکھا چپ چاپ باہر چلی گئی۔ سوچنے لگی۔ اب تک ماتا پتا نے مجھے پالا پوسا ہے اب میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کا بوجھ ہلکا کروں۔

دوپہر کے کھانے تک ہری رام والی بات تقریباً سبھی بھول چکے تھے، صرف رکمنی ہی اس فکر میں گھلتی رہی تھی۔ بار بار اسے چکر سا آ جاتا تھا۔ ریکھا کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ جو اونچے گھرانے کی رہن سہن میں، ذرا سی کمی بھی برداشت نہیں کرتی تھی، ایسی غریبی میں بھلا کس طرح گذارہ کرے گی؟...... اس خیال سے وہ اور اداس ہو جاتی۔ جب کبھی ریکھا اس کے پاس اور اداس بھری نگاہ دیکھ لیتی تو اس کے دل کی بیتا پڑھتے ہوئے گلی کے شہنائی کے گیت خاموش ہو جاتے تھے مگر پھر گھر کے شور و غل، سہیلیوں کے ہنسی مذاق اور کھل کھلا ہنسنے کے درمیان وہ سب کچھ بھول جاتی۔

گھر کے رسم و رواج کے خلاف کام کرنا رکمنی کے بس کی بات نہیں تھی، جو خاندانی چلے آ رہے تھے۔ اس نے رشتے داروں کو بلا کر گھر بھر دیا تھا۔ دن بھر ننھی نوٹیاں، شوخ لڑکیاں، سہیلیاں ریکھا کو چاروں طرف سے گھیرے رہتیں اور اپنے اپنے معصوم تجربے سنا کر اس کے جذبات کو اکساتی رہتیں۔

۲

سہاگ رات کو ریکھا نے جو کچھ دیکھا، اسے الفاظ کی شکل دے کر دل کے ایک کونے میں محفوظ کر لیا کہ چندن کے پاس میرے جذبات کو سمجھنے والا دل نہیں ہے۔"

بات معمولی تھی۔ چندن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آؤ۔ چارپائی پر آکر سو جاؤ۔"

ریکھا نے انکار کیا۔ "نہیں، میں الگ چارپائی پر سوؤں گی۔" اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

چندن اداس ہو کر بولا: "بدنصیب، اس کمرے میں دوسری چارپائی رکھنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟"

ریکھا شوہر کی اس صاف گوئی پر حیران سی رہ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کا دولہا اس کی دل لگی کر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی چارپائی پر لٹائے گا، پھر ہنس ہنس کر کہے گا: "پاگل! کہیں میاں بیوی بھی الگ الگ سوتے ہیں۔" اور برسوں سے اس کا سنجوگ کا سپنا پورا ہو جائے گا۔ مگر ریکھا کا تصور صرف تصور ہی رہا۔ وہ آہستہ سے کرسی پر سے اٹھ کر بستر پر جا لیٹی۔

اس رات میاں بیوی میں بہت باتیں ہوئیں۔ باتوں ہی باتوں میں زندگی کے مقصد پر خیالات کی لڑی ہونے لگی۔ ریکھا نے کہا "میرے لئے، میرے خیال میں، پتی پتنی کا باہمی پریم ہی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔"

چندن بولا: "میں تو پیٹ بھر اسیل کی سیوا کرنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتا ہوں۔"

یہ بات ریکھا کے گلے میں نہ اتری بولی: "تو سیوا کی الجھنوں سے ہمیں سروکار؟ دوسروں کی زندگی سے ہمیں کیا تعلق؟ یہ بڑی بڑی آدرش کی باتیں مجھے نہیں بھاتیں۔" اور اچانک ریکھا کو اپنے چاروں طرف بازاروں کا بندھن ڈھیلا ہوتا محسوس ہوا۔ اس کا دل زخمی ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ دلہن کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر بازاروں کا بندھن کسا۔ آہستہ آہستہ پلنگ کی پائنتی سے آ کر دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔

صبح جب وہ اُٹھی تب اُسے ایسا لگا گویا رات بھر وہ بُرے سپنے دیکھتی رہی ہو۔ اُسے اپنے سارے بدن میں درد سا محسوس ہُوا۔ کھڑکی کھلنے پر سورج کی سُنہری کرنوں کو اپنے سہاگ مندر میں چمکتے دیکھ کر بھی وہ خوش نہ ہو سکی۔

بڑے دھیان سے اپنے نئے گھر کی چھت اور دیواروں کو دیکھنے لگی۔ چاروں طرف ایک عجیب اُداسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ریکھا نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بیس سالہ سانولی لڑکی ہاتھ میں بُرش لیے منہ دھونے جا رہی تھی۔ اُس نے ریکھا کو نکلتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لیے جھولے میں جا بیٹھی۔ دونوں مُسکرانے لگیں مگر دونوں کے دل ساون کی گھٹاؤں سے گھرے آسمان کی طرح برسنا چاہیئے تھے۔ کملا سوچ رہی تھی۔ کاش میں بھی اسی طرح کسی کے آغوش سے نکل کر آفتاب کی نئی کرنوں میں اس کائنات کو دیکھتی اور ریکھا سوچ رہی تھی کہ دنیا بیتی رات کو بھول جائے اور میں اپنے پچھلے سنسار میں لوٹ جاؤں! مگر دونوں بے بس تھیں۔ ایک کا باپ غریب تھا، دوسری شادی کے بندھن میں جکڑی جا چکی تھی۔ دل بھاری ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر بعد دونوں ہنس رہی تھیں۔

تین دن کے اندر ہی ریکھا اور کملا ایک دوسرے کو بُری طرح چاہنے لگیں مگر اُن کی یہ محبت دونوں کے لئے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ چوتھے دن کملا نے ریکھا کی ساس سے کہا: "پھوپھی، آج بھیا مجھے لینے ضرور آئیں گے۔"

اور سچ مچ ہی کملا اُسی روز اپنے گھر چلی گئی۔

ریکھا کی جیٹھانی اُس دن دوپہر کو ہی جھگڑا کر کے میکے چلی گئی تھی۔ ایسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گلاب (جیٹھ) کی ماں دھوپ میں گیہوں چھان رہی تھیں، ساتھ ساتھ اپنے بوڑھے جسم کو دھوپ میں گرما بھی رہی تھیں۔

اگرچہ سردی زیادہ نہ تھی پھر بھی گلاب کی بیوی دھوپ میں گرم پانی سے اپنے بچے کو نہلا رہی تھی، اتفاق سے پانی کی کچھ بوندیں چھٹک کر گیہوں میں جا گریں۔ گلاب کی ماں نے کہا: "دیوی ذرا ہٹ کر بچے پر پانی ڈال، سردی تو اتنی زیادہ نہیں ہے جو دھوپ میں گرم پانی سے نہلا رہی ہو؟"

[illegible] ماں جی، پھر آپ کو کیسی سردی لگ رہی ہے جو دھوپ میں بیٹھ کر گیہوں چھان رہی ہیں؟ کیا صرف بچے کے لئے ہی سردی کم ہے؟"

اُس وقت ریکھا نے بھڑکیلے لباس میں ساس سے میکے جانے کے لئے چھٹی مانگنے آئی۔ دیوی اپنی جلن میں جل رہی تھی اُسے یہ معلوم نہ ہوا کہ ریکھا پیچھے کھڑی ہے۔ جان بوجھ کر اُس نے سارا پانی بچے پر اُنڈیل دیا۔ ریکھا کی ساڑھی پر پانی کی کچھ بوندیں جا پڑیں۔ اُسے گھر میں آئے ابھی تین ہی دن تو ہوئے تھے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر اُس کا چہرہ ضرور اُتر گیا۔

ساس سر اُٹھا کر بولی: "ہاں ہاں، جاؤ چھوٹی بہو، بھگوان تمہیں خوش رکھے!"

ریکھا تو چلی گئی مگر بڑھیا خاموش نہ رہی۔ بولیں۔ "بیچاری کتنی بھولی لڑکی ہے نئی ساڑھی خراب ہو گئی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔"

بڑی بہو کے سینے میں گویا تیر سا چبھ گیا۔ چار دن سے لگاتار ساس ریکھا کے رُوپ اور گُن کی تعریف کرتی آ رہی تھیں [illegible] میں دونوں کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ بڑی بہو بولی۔

"ہاں جی، دُوسری تو تمہارے ساتھ جھگڑتی ہے نہ؟"

بڑھیا اُڑتی چڑیا کو پہچاننے والی عورت۔ بولیں۔

"میں نے تمہیں تھوڑے سے ہی کہا، اگر کہوں بھی تو کیا؟ بیچاری کی ساڑھی خراب ہو گئی، دُکھ نہیں ہوگا؟"

"دُکھ نہیں ہوگا!" ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دیوی بولیں۔ "جو گھر میں کچھ لائے گی وہی کچھ بول سکے گی، جو لائے گی ہی کچھ نہیں وہ بولے گی کیا؟"

ساس بولیں: "تم لین دین کی باتیں نکالنے والی کون ہوتی ہو؟ بھگوان نے میرے چندن کے نصیب میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ اُسے دیگا ہی!"

دیوی نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے کہا: "جانتی ہوں، مجھے دیکھتے ہی اُن کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے! میں تو آ ہی نہیں رہی تھی پہلے آپ کے ساتھ نہیں رہی ہوں کیا؟ بڑے سُکھ دیئے ہیں؟ کہتی تھیں، شادی میں چل کر ہماری عزت رکھ لو۔ اب شادی ہو گئی تو اب مجھے کیوں رہنے دینے لگیں۔ اماں نے بہتیرا سمجھایا، سسرال کے باپ ہی آکر تیری خبر لیں گے۔" مگر میں نہ مانی چلی [illegible]

لے آ، تیری ننھیال چلیں گے۔"

شام کو جب ریکھا میکے سے گھر لوٹی تو دیوی گھر میں نہ تھی۔

چندن نے انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا: "ماں، بھابی اتنی جلدی کیوں چلی گئیں؟"

ماں نے سارا واقعہ لفظ بہ لفظ سنا دیا۔ پھر بولیں "نجانے کہاں سے بدذات میرے گلاب کے گلے آ پڑی۔

"بھیا کو اس بھابی کی خدمت تھوڑے ہی تھی، اُسے تو پانچ ہزار چاہیے تھے۔"

"بیٹے، اس میں اُس بیچارے کا کیا قصور؟ اُن پانچ کو پچاس بنانے کے لیے ہی تو وہ سمندر پار گیا ہے۔ آجکل روپے کو روپیہ ہی کھینچتا ہے ورنہ اس کالی کلوٹی کو کیوں لاتا؟ آج بھی اُس سے جو کچھ ہوتا ہے بھیجتا رہتا ہے۔"

ریکھا نے کھانا پروستے ہوئے یہ سب کچھ سُن لیا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں یہ قیاس کر لیا تھا کہ گلاب ضرور کوئی بُرا آدمی ہوگا۔ جس نے روپوں کے لئے شادی کی ہے مگر جب اُس کی تصویر کی طرف آنکھیں اُٹھا کر باتیں کرنے لگیں تو وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ خوبصورت چہرہ، مسکرانے کے لئے تیار، ریکھا تصویر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اتنے میں چندن بولا: "ماں، تم پانچ منٹ میں ہی دُنیا بھر کی باتیں بتا دیتی ہو۔"

"اب بھی گھر گرہستی کی طرف توجہ نہیں دو گے تو کب دو گے؟ تمہارے ایسے خیالات کی وجہ سے تو میں نے تمہیں شادی بیاہ کے بندھن میں باندھا ہے۔"

چندن ٹھنڈی سانس لیکر، کپڑے بدلنے کے لئے جاتے ہوئے کہتا گیا۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے خیالات کی قربانی دینے کے لئے ہی مجھے بیاہ کرنا پڑ رہا ہے تو میں ہرگز شادی نہ کرتا۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا لیکن ... خیر، میرے بجائے تمہاری گھر گرہستی میں چاہ لینے والی ایک نوکر مل گئی؟"

ریکھا تعجب بھری نگاہوں سے پتی کی طرف دیکھتی رہی، تب تک جب تک اس کے ساتھ چلتی ہوئی پرچھائیں بڑی ہوتے ہوتے

اُس سے پہلے ہی کمرے میں غائب نہ ہو گئی۔

کھانے کی تھالیوں سے اُڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر، ریکھا سوچنے لگی کہ لیکن دن میں جیسے زمانہ ہی بدل گیا ہو۔ اس گھر میں اور اُس گھر میں کتنا فرق ہے؟ وہ گھر بلندی کی چوٹی سے گزر رہا تھا جبکہ یہ گھر نیچی گھاٹی میں کھڑا ہو کر بھی اوپر اٹھنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ خواب تو پہلا گھر بھی کچھ کم نہیں دیکھتا تھا مگر دونوں کے سپنوں میں بڑا فرق ہے اس گھر کے سپنوں میں طلوعِ آفتاب کی سُرخی اور اُمیدوں کی کرنیں ہیں۔ ریکھا کی ساس سوچتی رہتی ہے میرے سبھی بیٹے کمائیں گے۔ میں نوکر رکھوں گی میرے گھر میں چاندی کے برتن اور چینی کے چائے کے سیٹ چمکتے نظر آئیں گے۔ مگر مورت جیسی بھیانک تو اسی بھی اس گھر میں بستی ہے۔

چندن کپڑے بدل کر کرسی پر آ بیٹھا۔ تو ماں بولی: "چندن، اب پاکستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ پاس پڑوس میں گنتی کے چند گھر ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔"

چندن نجانے کن خیالات میں گم تھا۔

ماں پھر بولی: "ایسی پھول سی خوبصورت بہو لا کر دی پھر نجانے کیوں اتنے اُداس رہتے ہو؟"

چندن کی آنکھیں ایک بار ریکھا کے گلابی چہرے کی طرف اُٹھیں۔ پھر اُس نے ماں سے کہا۔

"ماں، اگر خوبصورت پھول میں خوشبو نہ ہو تو اُس کے پانے میں کونسی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟"

ماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چندن نے پھر کہا۔ "اس دیش کو چھوڑنے کے لئے میرا جی نہیں کرتا۔ ماں! یہاں اچھی روپے کی نوکری بھی ہے اور رہنے کے لئے مکان بھی۔ اگر بزرگوں کا مکان چھوڑا تو مکان اور نوکری کے لئے بھٹکنا پڑے گا۔"

ماں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اپنی بہو کا دھیان آتے ہی وہ چپ رہ گئی۔

کھانا کھا کر سبھی اُٹھ گئے۔ ریکھا اپنے لئے [illegible] جگہ دیکھ کر ساس کے پائنتی بیٹھ گئی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتی تھیں تو وہ اپنے [illegible] بل سے [illegible]

تھی کہ چندن نوکری پر چلا جاتا تھا۔ گھر میں اکیلی ریکھا ساس اور اپنے دو چھوٹے دیوروں کے لئے کھانا بنا دیتی تھی۔ چھوٹے گروپ اور شیام ریکھا کے گورے گورے مکھڑے کو بڑے چاؤ سے دیکھتے تھے۔ مگر ریشمی کپڑوں میں سمٹی ہوئی نئی دلہن کبھی کبھار ہی اپنی خوابوں کی دنیا سے آزاد ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں اوپر اٹھاتی۔ اس وقت روپ اور شیام تالیاں بجاتے ہوئے ماں جی، ماں جی کرتے ہوئے جھٹ سے ماں سے لپٹ جاتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جھٹ سے باہر نکل کر کرسی یا چارپائی کے پیچھے چھپ کر، ریکھا کے خوبصورت جسم کو دیکھتے رہتے تھے۔ ریکھا کی کالی کالی آنکھیں اوپر اٹھنے پر بچوں کے تن بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ ریکھا سوچتی، کاش! میرے حسن کا جادو چندن کو بھی موہ لیتا!

ریکھا ساس کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ گلاب کی ماں پہلے تو اسے بڑے لاڈ پیار سے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ صرف کھانا بنانے کے وقت ایک آدھ چھوٹا موٹا کام کرا لیتی مگر دھیرے دھیرے ریکھا کے روپ کا جادو کم ہونے لگا۔ وہ ڈرپوک بھولی نو لکھ کروڑ کی پھانس سی کھٹکنے لگی۔ اس نے جلدی ہی گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا شروع کر دیا۔ باورچی خانے میں رکھے اناج کے پیپے اور مسالے کی شیشیاں ریکھا کے ہاتھ لگنے سے جگمگا اٹھیں۔ گھر کی تمام اشیا کہاں کہاں رکھی جانی چاہئیں۔ وہ کہاں اچھی لگیں گی اس کام میں ریکھا ساس سے بازی مارتی ہوئی جان پڑی۔ یہاں تک کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے، اس بارے میں گلاب کی ماں کو ریکھا سے ہی پوچھنا پڑتا۔ اب ساس ریکھا کی سمجھدار آنکھوں، سڈول بدن چمکدار رنگ اور پھڑکتے ہوئے کپڑوں میں سمٹے ہوئے حسن کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ریکھا سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی نا سمجھی سی دکھائی دیتی رہی اور چپ چاپ مطمئن پالتو پرندے کی طرح کر دیتی پھاندتی رہی۔ انجانے میں کبھی منہ سے آہ نکل جاتی تو روپ اور شیام کو گلے لگا کر من کو ڈھارس دے دیتی تھی!

ایک دن سوتے سے پہلے گلاب کی ماں نے ریکھا کو اپنے پاس بٹھا کر چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا "گنگو کی ماں کے گھر گھڑوں پانی پڑا تھا کیونکہ بہوئیں ایسی ملیں کہ جہیز میں سات سات پیٹیاں اور بھیڑ بکریاں لے کر آئیں۔ آج تو گنگو کی ماں کا پاؤں دھرتی پر نہیں پڑتا۔ وہ لاہٹ میں دو کامیں کھول لیں اور دو نوکر رکھ لیے ہیں؟"

ریکھا ساس کے پاؤں دباتی ہوئی مسکراتی رہی۔ دل میں کچھ ناراض ہو کر کہہ رہا تھا گنگو کی ماں کو میری جیسی خوبصورت بہوئیں تھوڑے ہی ملی ہیں اگر حسن کی قدر ہو تو اس کی قیمت لگائی جا سکتی ورنہ خوبصورتی کی قیمت ہی کیا!

ریکھا کے چہرے پر دکھ کی لکیریں ابھر آئیں۔

"تم اسے تانا سمجھ بیٹھیں کیا؟ میں نے تمھیں تو نہیں کہا۔"

ریکھا باہر سے ہنس پڑی مگر دل اور بھی بے چین ہو اٹھا۔

"تو پھر اس مثال کی کیا ضرورت تھی ماں جی؟" تھوڑا ٹھہر کر ریکھا نے سوال کیا۔ اور دل ہی دل میں بڑھیا کی چالاکی پر ہنس دی۔

"بڑی سیانی ہو! اگر ایسا ہی سمجھتی ہو تو بھی میں نے کچھ غلط تو کہا نہیں۔ میں نے بھی بیٹے پیدا کیے اور پالے پوسے ہیں، کہیں سے اٹھا کر تو لے نہیں آئی۔" گلاب کی ماں نے چوٹ لگائی۔

ریکھا سہم سی گئی۔

دوسرے دن ریکھا کے میکے سے چیزوں کا بھرا ہوا تھال آیا جس میں ڈبل روٹیاں، گوشت اور کباب وغیرہ تھے۔ گلاب کی ماں پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر جب ساری چیزیں دیکھ چکیں تو ہنس کر کہنے لگی: "رام کی ماں کو تو سمدھیوں نے ایک بڑا سا چاندی کا ٹفن بکس بھی کھانے کی چیزوں کے ساتھ دیا تھا۔"

رام کی ماں گلاب کی ماں کی چچیری بہن تھی۔ اس کے گھر میں نوکر تھے اور گھوڑا گاڑی تھی۔ ریکھا نے سوچا، وہ کہہ دے "ماں جی، رام کی ماں تو تمھارے برابر کی نہیں ہے پھر ان کی باتیں کیوں کرتی ہو؟" مگر اپنے پتا کی حالت کا دھیان آتے ہی چپ رہ گئی۔ اس نے سوچا اگر ساس کہہ دیں کہ تمھارے ماں باپ تو ان کے برابر ہیں تو پھر اس کے دل کا کیا حال ہوگا؟ اس نے چپ رہنا ہی ٹھیک سمجھا۔

اتنے میں دوسرا دن ہوا۔

گوشت کے ساتھ برانڈی کی ایک بوتل آنی چاہیئے تھی۔ اتنا کچھ پانے کے بھی ہم حقدار نہیں ہیں؟

ریکھا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نہ جانے اور کن کن سی چیزیں آنی چاہیئے تھیں۔ اُس نے پتی کی طرف دیکھا تو وہ کھانا کھانے میں مگن تھا۔ گویا ایسی باتوں پر دھیان دینا اس کی شان کے خلاف تھا۔ پتی کی اس لاپرواہی سے اُسے کچھ ڈھارس ملی۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

(۳)

شام کا وقت تھا۔ سارا آسمان شفق کی لالی سے گلابی ہو رہا تھا۔ گویا سینکڑوں حسیناؤں نے ہولی کھیل کر اپنے حسن کا گلال آکاش کے آنگن میں بکھیر دیا ہو۔ ماٹونگا کی بستی سے کچھ ہی دور ناریل کے پیڑوں کا چھوٹا سا جنگل ہے اس کے بعد ایک لمبی سڑک ہے۔ سڑک پار کر کے سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ریکھا سوچ رہی تھی۔ عرصے کے بعد اسے اس سنہرے آسمان کے نیچے سانس لینے کا موقع ملا ہے جس کی وجہ سے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔
وہ چاہتی تھی کہ آج جی بھر کر اس شفق کی سرخی کو دیکھتی رہے۔

جب سے پاکستان چھوڑا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنے کا موقع اسے نہیں ملا تھا۔ ماٹونگا میں پگڑی دینے پر جو مکان انہیں ملا تھا اس میں صرف دو کمرے تھے۔ حیدرآباد والے لمبے چوڑے اور کھلے صحن والے مکان میں رہتے ہوئے ریکھا نے ایسے چھوٹے چھوٹے گھروں کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اُسے جب چھت کے اوپر جگمگاتا آسمان نظر آتا تو وہ کھو سی جاتی۔ آج پہلی بار گھر والوں سے چھپ چھپا اس پتھر پر آ بیٹھی تھی۔

دھیرے دھیرے آسمان سے گلابی رنگ اُڑنے لگا اور اس پر سمندر جیسی گہری نیلاہٹ چھانے لگی تبھی دور سے کسی کی آہٹ سن کر ریکھا سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھروں کے اندھیرے میں چندن لڑکھڑایا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ ریکھا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا: "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دامن سے مٹی جھاڑنے لگی۔

چندن خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بولا: "تمہیں میرے ساتھ کی تو ضرورت نہیں پھر گھر میں کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلے آنے اور خواہ مخواہ سب کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ریکھا کوئی جواب دیئے بغیر چپ چاپ پتی کے ساتھ چلنے لگی۔

دہلیز پر گلاب کی ماں گنّا چوس رہی تھیں۔ ریکھا کو دیکھتے ہی ادھ چوسا گنا ہاتھ میں لئے بولیں۔ "کیوں بہو جی گھومنے نکلی تھیں کیا؟"

آنچل ٹھیک کرتے ہوئے ریکھا بولی: "ماں جی آج گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔"

"واہ ری دنیا! گھر میں دل نہیں لگتا اور باہر پتھروں پر دل بہل رہا تھا۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ رشی تم اور گوپی نے بتایا کہ وہ بچی پر پتنگ اُڑا رہے ہیں اور تم پتھروں پر بہار ڈھونڈتی رہیں۔"
پھر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے گنا چوسنے لگیں۔

ریکھا کو گویا جی جلانے کا موقع مل گیا۔ چندن تو دور والے کسی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں کہہ کر چلا گیا تھا۔ ریکھا اپنے کمرے میں جا کر آنسوؤں سے اپنے من کی آگ کو بجھانے لگی تبھی اُسے محسوس ہوا کہ ساس پیچھے کھڑی ہے۔ وہ سہم گئی۔

"میں نے ایسی کون سی جلی کٹی کہہ دی جو رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے جا رہی ہو؟ آجکل کی بہوؤں سے تو توبہ ہی بھلی۔"

ریکھا اور زور سے رو پڑی۔ ساس جل بھن کر رہ گئی۔ ریکھا نے بہتیرا چاہا کہ کسی طرح آنسو تھم جائیں مگر آنسوؤں کا سیلاب رُکتے نہیں رکتا تھا۔

اُس رات چندن کافی دیر تک جاگتا رہا۔ ماں کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ آجکل کی لڑکیاں کتنا تن پانچ سیکھ گئی ہیں۔ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی مگر پتی کو دیکھتے ہی سب بند ہو گیا۔

چندن جتنا ہی اُن الفاظ کے متعلق سوچتا اتنا ہی اس کے خیالات کا گھوڑا اُلجھنوں کے صحرا میں بھٹک جاتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا چاہیئے؟ وہ خود کیوں نہیں دیکھتی کہ بمبئی کی زندگی کتنی کٹھن زندگی ہے۔ صرف جگہ لینے کے لئے ہی کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ ڈیڑھ ہزار پگڑی دے کر یہ مکان ملا ہے۔ رات دن بھٹکنے کے بعد ایک چھوٹی موٹی نوکری ملی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اب جا کر منسپلٹی میں ملی ہیں پیر بچے ہیں بی اے کا امتحان پاس کر کے یہ کلرکی قبول کرنی پڑی ہے یہ لڑکی

ان سب پریشانیوں کی طرف آخر کیوں نہیں دیکھتیں؟

اس سے زیادہ اس موضوع پر سوچنے کے لئے چندن کے پاس وقت نہیں تھا۔ اُسے کتنے ہی مسائل پر سوچنا تھا۔ بمبئی کی کٹھن زندگی نے اس کے اُصولوں کی بُنیاد کو ہلا دیا تھا۔ اس کے باوجود اُسکا راستہ اُلجھنے کی بجائے چوڑا ہو گیا۔ جن نئے سیاسی اور اقتصادی نظریات کو اُس نے اپنایا تھا اُن کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے اُس کے لیئے کافی لمبا چوڑا میدان موجود تھا۔ اُس کی منزلِ مقصود پر کامیابی کے سگنل دیک چمکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور وہ آگے بڑھتا رہا۔

مل کے کارکنوں کی یونین سے ابھی معمولی سی واقفیت ہوئی تھی کہ اُسے یونین کا جوائنٹ سیکرٹری چن لیا گیا۔ مل میں جتنے پڑھے لکھے کارکن تھے، چندن اُنکے لئے سٹڈی سرکل چلاتا تھا۔ اسی سرکل میں دوسرے دن اُسے "سرمایہ اور محنت" پر تقریر کرنا تھی۔ اُس نے بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر نشان لگا کر رکھے تھے۔ بتی جلا کر روشنی میں پڑھنے بیٹھ گیا۔

بجلی کی روشنی سے ریکھا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چندن گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد کر کے اُٹھ بیٹھا اور بولا۔

"جب میں اپنے دوست کے ہاں گیا تھا تب تم رو رہی کیوں تھیں؟"

ریکھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چندن پھر بولا "شاید تمھیں یہاں آرام نہیں ملتا؟ اور اچھے اچھے کپڑے بھی نہیں"

ریکھا کی پلکیں ذرا سی دیر کے لئے اُوپر اُٹھیں۔ چندن نے دیکھا اس میں دُکھ نہیں تو حیرت کی بُو آ رہی تھی پہلے تو اُسے غصہ نہیں آیا مگر جب بار بار سوچنے کے باوجود بھی اُسے اِس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تو وہ چڑ اُٹھا۔

سکول و کالج کا ہیرو چندن، دیش بھگت اور گمبھیر سے گمبھیر بین الاقوامی مسائل اور حالات کو سلجھانے والا چندن اپنی ریکھا رانی کے اِس راز کو نہ سمجھ سکا۔ شکست کے احساس اور غصہ کو دبانے کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ ریکھا نے مُنہ پھیر لیا۔ وہ اور بھی بے چین دل سے وہ سوچتی رہی۔ اچھا بس

کون الگ لگتا ہے؟ ٹھاٹ باٹ کسے چاہئیں؟ جتنا وقت وہ گھر میں گزارتا ہے، اخباروں اور کتابوں کو تکتا رہتا ہے کالے کالے ٹیڑھے اور گجراتی دوستوں کو ساتھ لے آتا ہے اُنکے ساتھ بیٹھ کر بحث مباحثہ کرتا ہے۔ بڑی دلچسپی سے اُنکے دُکھ درد سُنتا ہے مگر میرے متعلق وہ اتنا بے پروا کیوں؟ میں بدصورت یا لولی لنگڑی بھی نہیں ہوں پھر بھی پوچھتا تک نہیں آخر اس آدمی کو کبھی پیار کرنے کی فرصت بھی ملے گی یا نہیں؟ پیار و محبت کی باتوں کو وہ بیکاروں کا کھیل سمجھتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ آس پڑوس والے کیا کہتے ہیں۔ ریکھا کو یاد آیا۔ آج صبح ہی پڑوسن ماد ھا نے کہا تھا: "چھوٹی بہو، تمھارا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا مگر اپنے شوہر کا یہ کیا حال کر دیا ہے؟ مرہٹوں کی طرح شرٹ کے ساتھ چپل پہن کر آفس جاتے ہیں کندھوں پر کتابوں کا تھیلا لٹکتا رہتا ہے..."

ریکھا کیا کہتی۔ اُس کی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔

مگر رادھا نے ریکھا کی اُداسی نہ دیکھی تھی۔ بولی۔ "برا مان گئی کیا بہو؟ تمھارے شوہر سیدھے سادے ہیں تو کیا ہوا، بہتوں سے اچھے ہیں۔ یہ تو تقاضا نہیں کرتے کہ ساس نے یہ نہیں بھیجا سسر نے وہ نہیں بھیجا۔ آجکل کے لڑکے تو سسرال کے پیسوں پر گلچھرے اُڑاتے پھرتے ہیں مگر یہ چاہے پھوٹی کوڑی نہ ہو مگر نام کرنے والے ہی ہوں گے۔"

اس بات سے ریکھا کو کافی تسکین ملی۔ آج اُس نے نیلے آکاش کے نیچے بیٹھ کر سمندر کی چنچل لہروں کا لطف اُٹھایا تھا وہ سوچنے لگی آخر اتنا فرق کیوں؟ جو منظر مجھے اتنا سہانا لگا کہ پتھروں سے بچا کر میں قدرت سے باتیں کرنے لگی تھی چندن کو وہ ذرہ بھر بھی متاثر نہ کر سکا؟

کافی دیر تک یہ سوال اُس کے خیالات کے آسمان میں پرندے کی مانند پرواز کرتا رہا اور سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ریکھا صبح کو اُٹھی تو آفتاب آسمان پر ہنس رہا تھا۔ پڑوس کے مندر میں گھنٹے بج رہے تھے گھنٹوں کی آواز نے ریکھا کو میکے کی یاد دلا دی اس وقت وہاں گنیا اور لکشمی کا پاٹھ ہوتا تھا۔

ریکھا اُٹھی تو اُس نے دیکھا چندن اور ایک نوجوان کچھ

کھانا رہی۔ میاں سے دیکھ رہے تھے وہ منہ دھو کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُسے اپنی صورت پھیکی جان پڑی۔
اتنے میں چندن کمرے سے بولا۔
"ماں، ہیرے کے لئے بھی چائے بھیجنا"
ریکھا چائے بنانے گئی تو ساس بولیں "ابھی جاگ کھلی ہے رانی صاحبہ کی؟ دیکھو تو سہی کتنا دن چڑھ آیا ہے"
ریکھا بہت شرمندہ ہوئی اور چپ چاپ باہر چلی گئی۔
جب ریکھا نے چائے کا پیالہ ہیرے کے سامنے رکھا تو اُسے دو خوبصورت اور سڈول آنکھیں تشکر آمیز جذبات کے ساتھ اپنی طرف اُٹھتی نظر آئیں۔ اُس لڑکے کے کپڑے صاف دُھلے تھے جب وہ جانے لگا تو ریکھا کو اُس کی چال بھی اچھی لگی مگر پاؤں میں چپلیاں پُرانی تھیں۔
ریکھا ہنس پڑی، آخر دوست کس کا ہے۔

---

(۴)

گلاب کی ماں کے گھر آج مدت کے بعد چہل پہل دکھائی دی۔ لذیذ کھانے تیار کئے جا رہے تھے اور مصالحوں کی خوشبو سے تر چوکے میں بیٹھی ہوئی پلاؤ پر سے اُڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھتی ریکھا سوچ رہی تھی، آنے والے جیٹھ نجانے کس طرح کے ہوں گے اُسے ریکھا کا پکایا ہوا کھانا پسند بھی آئے گا یا نہیں۔ کیا انہیں اتنی فرصت ملے گی کہ ریکھا کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کر کہیں کہ ریکھا، تم نے کھانا بہت بنایا ہے؟
تین نئے ٹرنک ایک ریڈیو اور چھ سات چھوٹے چھوٹے تھیلے لئے گرمیوں کی کڑاکے دار دھوپ میں ٹیکسی سے اُتر کر گلاب نے ماتھے سے پسینے کی بوندیں پونچھ کر گھر کی طرف دیکھا، ریکھا کھڑکی کے کونے سے انہیں دیکھ رہی تھی، گلاب کی نگاہ اپنی طرف اُٹھتے دیکھ وہ کمرے میں چلی گئی۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے اوپر آ گئے "ماں، دادا آ گئے!"

ماں نے بیٹے کا ماتھا چوما اور گلے لگا کر بولی، کاش آج تمہارے پتا ہوتے۔ پھر ریکھا کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں "گلاب، یہ ہے چندن کی بہو"

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔
ساس نے بڑی شان سے کہا "کیوں گلاب، چندن کے لئے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ہیرا لائی ہوں نا" دوسروں کے کھلنے سے پھیلا کر میں فخر کے ساتھ بیٹے کا دل جیتنا چاہتی ہے، دیا ہی فخریہ الفاظ کہتے وقت گلاب کی ماں کے دل میں تھا ساس کی طرف نگاہ رہتے ہوئے بھی ریکھا نے دیکھ لیا کہ گلاب اُس کی خوبصورتی سے متاثر ہو چکا ہے۔
ایک ہفتہ گذر گیا۔ ریکھا اب گلاب کے سامنے بھی آنے لگی تھی گلاب کے کپڑے وہ مانگتی تھی، نئے نئے جوتے صاف کر کے تپائی پر رکھتی، کنگھیاں اور رومال بیٹھتے وقت اُن میں سے نکلتی خوشبو سے مست ریکھا کے دل میں ایک خواہش سی اُبھرتی، کاش، چندن کو بھی اچھے کپڑے پہننے اور عطر لگانے کا شوق ہوتا۔
"ریکھا، یہاں کیا کر رہی ہو، مجھے کل جیسی نمکین دال تو پکا دو" گلاب چوکے کے قریب کھڑا ہو کر کہتا۔ ریکھا سنبھل جاتی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ جلدی ہی الماری بند کر کے چوکے میں چلی جاتی تھی گلاب ولایت سے ریڈیو لایا تھا۔ گھر کو رشتی پر دوں سے سجایا گیا تھا۔ اس طرح گھر میں ایک نئی زندگی آ گئی تھی۔
گلاب کی ماں کہتی "گلاب، اچھا کیا جو ریڈیو لے آئے۔ میں سوچتی تھی کہ کب ہمارے گھر میں ریڈیو کا گانا گونجے گا۔ ریکھا غسل خانے میں ریڈیو کے گانے گنگناتی تھی تو میں منع کرتی تھی۔
"اچھا، تو ریکھا گانا بھی جانتی ہے" گلاب اُچھل پڑا۔ "میں آج تمہارا گانا ضرور سنوں گا"
ریکھا کا دل ناچ اُٹھا۔ وہ ہنسنے لگی۔
ہنستی ہی رہ گئی یا کچھ گنگنائی بھی گلاب کے الفاظ میں اصرار تھا مگر ماں نے منہ پھلا کر کہا "بس بھی کرو۔ بہت ہوا۔ میں ایسی ویسی باتیں اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری چاچی کتنی بڑی ہیں مگر اُن کی بہوئیں ایسی ڈھنگ سے چلتی ہیں کہ کیا کہنا۔
رات کو جب اور شیام جلدی ہی کھانا کھا کر سو گئے۔ ریکھا ماں اور گلاب کے لئے کھانا میز پر رکھ کر اپنے کمرے میں جا کر فلمی اخبار پڑھنے لگی۔
گلاب نے کہا "ماں، ریکھا خوبصورت اور پیاری ہے مجھے ایسی لائق بہو ملتی ہے وہ بڑا خوش قسمت ہے۔

ماں نے جواب دیا تھا "ہے تو ایسا ہی مگر تمھیں کیا کم خوبصورت بیوی ملی ہوتی؟ تم نے خود ہی تو جا کر اُس کی ماں سے کہا کہ لڑکی چاہے جیسی بھی ہو مگر روپیہ بہت ملنا چاہئے۔"

"ماں، آدمی دو کشتیوں پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ گھر بھی بچانا تھا۔ جو پونجی تھی اُس سے چوگنا کر کے آیا ہوں۔ ولایت کا ایک دوسرا چکر لگایا تو تم سونے کی تھالیوں میں کھانا کھاؤ گی۔"

ریکھا اُس وقت، پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے جیٹھ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی "جیٹھ کے پاس پیسہ ہے مگر آگے عورت، روپے کے چکر میں پیتی جا رہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر انھیں بھی خوبصورت اور قابل بیوی ملتی۔"

اتنے میں ساس ذرا چلا کر، ریکھا کو سنانے کی غرض سے بولی۔ "ہاں بیٹے، کمالی ہاتھ آنے والی لڑکیوں کو لا کر کیا سُکھ ملتا ہے۔ شوہر رات دن نوکری کرتا ہے پھر بھی اتنا نہیں بچتا کہ کہیں سیر سپاٹا کر کے دل بہلائیں۔ ایسی خوبصورتی کس کام کی؟"

ریکھا یہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی اخبار کے ورق اُلٹتی رہی۔ آخر اُسے کیا حق ہے کہ وہ ساس اور جیٹھ کی باتوں میں دخل اندازی کرے۔

مگر اُس کے دل میں ایک ایسی جلن پیدا ہو گئی کہ وہ وہاں بیٹھی نہ رہ سکی اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

(۵)

اشٹمی کا دن تھا۔ گلاب کی ماں کے گھر آس پڑوس کی سبھی لڑکیاں آ کر اکٹھی ہوئی تھیں۔ گلاب کی ماں اُن سب کے آگے سفید چاولوں کے بھات کے تھوڑے تھوڑے پھر بھر کر پانی ڈالتی جا رہی تھی۔ پھر اُس نے تیل میں انگلی ڈبو ڈبو کر سب کے سر پر لگایا۔ ریکھا سے بولی۔

"ریکھا بٹیا، پانی کے دو چار گلاس تو لانا۔ لڑکیاں ہاتھ دھو لیں۔"

لڑکیاں چڑیوں کی طرح شاخوں پر چہچہا رہی تھیں۔ کچھ شرارتی تھیں۔ اخیر پیتے ہی سفر کے چھ سال گزرنے کے بعد گیا ہوا گلاب واپس گھر لوٹ چکا تھا۔ ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

لڑکیوں نے تھالی میں ہاتھ دھو کر آنکھ کے چاروں طرف پانی کے چھینٹے دے کر جوتے پانی کی بوندیں اٹھاتے ہوئے کہا

اتی دیے، دھن دے — ڈولیوں میں منہ دے
کاکا کھائے سر کٹے — ہو سے جو کرے
ادکھل میں گکھ — کاکا ے آیا لکھ
ادکھلی میں دھانیاں — ڈھاکر ٹیگیں کنواریاں

"سنتے ہو کیا کہہ رہی ہیں؟ بیوی بھی ملی اور بیٹا بھی ہوا۔ لاکھوں کما کر لاتے ہو، سبھی لڑکیوں کو اکنی اکنی دو۔"

گلاب اکنی دیتے وقت اداس ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ بیوی بھی ملی۔ بیٹا بھی ہوا۔ مگر اس وقت دونوں کہاں ہیں؟ ساڑھے چھ سال پہلے جب دیوی اس گھر میں آئی تھی تب بھی ماں نے لڑکیوں کو کھلایا تھا مگر اُس وقت انھیں ایک ایک پیسہ دیا تھا پھر جلدی ہی گلاب ولایت چلا گیا تھا۔ چھ ماہ کے بعد اس کی ماں نے لکھا تھا "بیٹے تم تو چھوڑ کر گئے ہی نہیں بیوی ہے یہاں تمھاری پتنی نے جھگڑا شروع کر دیا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کو ذرا بھر بھی کم ملتا ہے تو ساس کا سر پھوڑنے آتی ہیں۔ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک دن خود دیوی کا باپ آیا۔ کہنے لگا، میں نے تمھیں موتیوں سے لدی ہوئی بیٹی دی، پانچ ہزار نقد دئے پھر بھی تم لوگ میری بیٹی کو دکھی رکھتے ہو۔ گھر میں نوکروں جیسا کام لیتے ہو۔ گھر میں نہ پھل آتے ہیں نہ دودھ — میری بیٹی کو اندر ہی اندر ختم کرنے کی ٹھان رکھی ہے؟ نکالو میرے پانچ ہزار روپے نہیں تو کورٹ میں گھسیٹوں گا۔ تب میں نے غصے میں آ کر کہہ دیا تھا ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو، خونی ہم ہیں یا تم؟ آئے ہیں ہمیں عدالت کی دھمکی دینے، لے جاؤ اپنی لاڈلی کو ہمارے یہاں بھوکوں مر رہی ہے نا۔ دیکھیں تم کتنے دن اس کا پیٹ بھر سکتے ہو۔ تب دیوی کا باپ اُسے کھینچتا ہوا لے گیا تھا اور دیوی بھی سب کے سامنے گھونگھٹ کی اوٹ سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی جنگ میں جیتے ہوئے سپاہی کی طرح چلی گئی تھی۔"

تین مہینے کے بعد ماں نے پھر لکھا تھا۔ "بیٹے، مبارک ہو۔ تمھارے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ دیوی اپنے میکے میں ہے۔ اپنے پوتے

کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکی مگر برسوں کی آرزو پوری ہوئی کہ
میں اب دادی بن رہی ہوں۔"

اُس وقت افریقہ کے جنگلوں میں بھرتی کرنے کے لئے گلاب نے کپڑے کی گٹھڑی اپنے کندھے پر اُٹھا رکھی تھی مگر خط پڑھنے کے بعد وہ بہت دیر تک آرام کرسی پر لیٹا رہا۔ وہ ایک سہانے تصور میں کھو سا گیا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گھوم گیا۔ اپنے دھوپ سے کمہلائے ہوئے بدن کو دو نرم ہاتھوں کے چھونے کے احساس نے اُس کے دل میں گدگدی پیدا کر دی تھی۔ آج بھی لڑکیوں کا گایا ہوا، بیوی بچے چھوڑ کرے، مصرع سُن کر اس کے دل میں یاد کی ایک میٹھی سی ٹیس اُبھر آئی۔

رات کو بستر پر سوتے وقت گلاب نے ماں سے پوچھا۔
"ماں، کیا دیوی اب ہمیشہ کے لئے میکے میں رہے گی؟"
ماں کے چوٹ سی لگی۔ بولی۔
"بیٹے، چندن کی شادی پر اُسے ہاتھ جوڑ کر بلوائی تھی۔ اگر اتنے دن میکے میں نہ رہتی تو گھر کا بھی کچھ نام ہوتا اور چندن کو بھی جہیز سے لدی ہوئی بہو ملتی۔
بھگوان کرے، ایسی بیوی کسی کو نہ ملے، اُسے اپنے پتا کی دولت پر اتنا غرور ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔"
"میں بھی تو تیس ہزار لایا ہوں، جب نیا مکان بنے گا تو دیکھنا کیسے اکڑ پاؤں چومتی ہے۔"
ریکھا اُس وقت دودھ کا پیالہ لے کر پتی کے پاس جا رہی تھی۔ اُس کے دل میں دیوی کے خلاف بڑی نفرت تھی۔ شوہر کو ساری کہانی سُناتے ہوئے بولی۔
"دیوی اتنی کیوں ہے؟ جب پتی غریب تھا تو میکے چلی گئی اور اب وہ کما کر لایا ہے تو اس کے پیسوں پر پڑے گی۔ دولتمند گھروں کی لڑکیاں کیا اتنی گری ہوئی ہوتی ہیں"!
چندن بولا "عورت کو صدیوں سے اپنا پیٹ پالنے کے لئے مرد کا محتاج ہونا پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فطرت ایسی ہو گئی ہے۔"
ریکھا اپنے متعلق سوچتی ہوئی بولی "مگر سب عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔"

جن میں بھرا ہوا ہے وہ یقیناً ایسی نہیں ہوتیں۔"
ریکھا جیٹھ اور شوہر کی باتوں کے متعلق سوچتی ہوئی سو گئی جب سویرے اُٹھی تو اُسے شور و غل سُنائی دیا۔ اُس نے سوچا نئی جگہ لینے اور نیا فرنیچر خریدنے کے لئے ان بھائیوں میں بات چیت ہو رہی ہوگی کیونکہ پچھلے تین دن سے گھر میں یہی ہو رہا تھا۔ مگر اب تو ایک عورت کی آواز سُنائی پڑ رہی تھی۔ اُس نے باہر آکر دیکھا تو سامنے دیوی چارپائی پر بیٹھی ہوئی زور زور سے تُو تُو، مَیں مَیں کر رہی تھی۔
ساس بولیں "اُس وقت تو آپ بھاگ گئی تھیں جیسے پرائی ہوئی روٹی کھانے جا رہی ہو۔ چندن کی شادی پر بلا لائی تو تین دن بھی پیر نہیں ٹکے۔ سمجھتی تھی غریب ہیں سو بدنامی کروا کے پھر دنگی سے آ نہ اپنے باپ کو جو تمہیں لینے آئے تھے۔ آئیں تو ذرا اُس سے بھی سمجھ لوں۔"
دیوی روتی سی آواز میں بولی "وہ تو بھرے بازار میں بکتے ہیں کہ اب تیرا شوہر کما کر لایا ہے جا کر اُسی کے پاس رہو میرے پاس اب تمہارے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے شہر بھر میں بدنامی ہو رہی ہے کہ شادی شدہ بیٹی کو گھر میں بٹھا لیا ہے۔"
"اب ہو رہی ہے بدنامی؟" ساس ان الفاظ کو زور سے دُہراتی ہوئی بولیں "تو پہلے کیوں رعب سے لینے آیا تھا؟ اوکھلی میں سر دیا جاتا ہے تو موسل سے نہیں ڈرا جاتا۔ کرو نہ اب بدنامی کا سامنا۔"
ریکھا نے دیکھا جیٹھ اپنی بیوی کے پیچھے کھڑے ہو کر ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگی آخر شوہر بیوی کی برائیوں پر پردہ نہ ڈالے گا تو اور کون ڈالے گا؟
اتنے میں گلاب کی ماں بولی "اگر رہنا ہے تو اپنی شیخی بالائے طاق رکھ کر چھوڑنا ہوگا۔ شام کو جا کر میکے سے کپڑے وغیرہ لے آنا۔"
دیوی گھر میں آکر رہنے لگی تو ایک مہینے کے اندر ہی اُس کے ٹھاٹھ بدل گئے۔ اب وہ بن ٹھن کر رہنے لگی۔ ہانڈی چولھے آنے کی بات وہ بھول چکی تھی اور [illegible] گلاب کی ماں پڑوسنوں کی پرچار کرتی تھی۔ گلاب کی ماں ویسے تو خوش تھی کہ گلاب کا [illegible] دیکھ کر ایک [illegible] خوف سے کانپ اُٹھتی تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ [illegible]
وہ بھی نہیں [illegible]

تھی۔ ایک دن دیوی کو سمجھانے کے لئے اُس نے منہ کھولا ہی تھا کہ دیوی بول اُٹھی:

"قسمت نے جو میل پتی کما کر لا دیا ہے ورنہ کیا یہاں سب دودھ پیتے تھے؟"

دیکھا جب دیوی کے اس طرح کے زہریلے جملے سنتی تھی تو سوچتی تھی کیا یہ بھی عورت کا ایک روپ ہے؟

آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا۔ گلاب دن بھر گھر میں بیٹھے بیٹھے تنگ آجاتا تھا اگر ایسے میں دیوی آکر کچھ کہتی تھی تو غصے میں اپنے ضمیر کو ضابطے میں رکھنا اُس کے لئے ناممکن ہو جاتا۔

ایک دن دیوی سسکتے ہوئے پتی سے کہنے لگی "آپ اس گھر والوں کو کبھی بھی مطمئن نہیں کر سکتے یہاں کبھی بھی معاملہ نہیں ہے تو کبھی کچھ نہیں ہے اور آج پاپڑ نہیں ہیں۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی: "دو پاپڑ پڑے تھے سندر نے مانگے تو میں نے دے دیئے اب گروپ اور شیام بھی ضد کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی پاپڑ چاہئیں۔"

گلاب کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اُس نے بنا سوچے سمجھے گروپ اور شیام کو ایک ایک تھپڑ دے مارا۔

ماں بولی: "ہائے رام۔"

گلاب کا سر چکرا گیا۔ چڑ کر بولا "بڑا میرا تم نے ہائے رام کیوں کہا؟"

"بیٹا، ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سندر بڑی خوشی سے کھائے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں مگر گروپ اور شیام بھی تو کسی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اتنا سا سندر دو پاپڑ کھائے اور یہ دونوں دیکھتے رہیں کیوں؟" ماں اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولیں۔

"میں نہیں کہتی تھی کہ یہ میرے سندر کو کبھی دیکھ نہ سکے گی؟" دیوی کی طرح خوفناک شکل بناتے ہوئے دیوی بولی۔

"کل کی چھوکری، تو نے ہی تو سارا گھر بگاڑ رکھا ہے نہیں تو چھوٹے بھائیوں پر ہاتھ چلانے کی گلاب کی کیا مجال تھی؟ دن بھر تیرے کان بھرتی رہتی ہے۔" گلاب کی ماں کے صبر کا پیالہ چھلک گیا۔

مگر گلاب پر اسکا الٹا اثر ہوا۔ بولا "تمھارا مطلب ہے کہ میں بیوی کے کہے پر چلتا ہوں۔ اُسی کے اشاروں پر ناچتا ہوں۔"

"اور نہیں تو کیا۔ سال بھر اپنے ہوٹل رہو اس گھر بیٹھیں۔ ورنہ میرے بچوں پر کبھی ہاتھ اُٹھاتے، کیا سمجھے بچہ ادھر اُدھر سے آتے ہیں؟"

"میرے بچے!" گلاب کا دل گویا ہتھوڑوں کی چوٹ سے کراہ اُٹھا۔ "میں کیا غیر ہوں؟" — پھر وہ خاموش ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دوپہر کو کھانا بھی نہ پکا۔ ہمیشہ کی طرح آج وہ تاش بھی نہیں کھیلے۔ جب چندن لوٹا، ماں نے ساری کہانی تفصیل وار سنادی۔ چندن نے کچھ بھائی کے برتاؤ پر بے چینی ظاہر کرنے اور کچھ ماں کو صبر کا کام لینے کے خیال سے کہا۔

"ماں، ضرورت سے زیادہ دولت آجانے پر انسان کبھی کبھی اپنے ہوش گنوا بیٹھتا ہے!"

چندن نے یہ الفاظ آہستہ سے کہے تھے مگر نجانے کس طرح اسکی بھنک گلاب کے کانوں میں پڑ گئی وہ اپنے کمرے سے ہی چیخ اُٹھا۔

"اگر میرے ہوش ٹھکانے پر ہوتے تو اپنے پسینے کی کمائی یوں تم لوگوں پر کیوں لٹاتا؟ جب سے آیا ہوں، یہ شور وہ پہ ہنگامہ ہو گئے۔"

چندن نے دیکھا، خواہ مخواہ جھگڑا بڑھے گا۔ اس لئے بولا "ہوسکتا ہے ماں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہو مگر تمہیں بھی اپنے پر قابو رکھنا چاہیئے تھا۔"

گلاب چپ رہنے والا نہیں تھا۔ بولا "جی ہاں، ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا مگر جب الگ مکان لیکر رہنے لگیں گے تو یہ تہذیب یافتہ نوجوان نجانے کیا کیا کہے گا۔ میں نے دیوی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ اُسکا کہنا لفظ بلفظ صحیح تھا۔ میری دولت دیکھ کر تمھارے سینے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ ہمت ہے تو کما کر دکھاؤ۔ دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلتے ہو؟"

اب ماں نے بھی منہ کھولا۔ بڑا شور مچ گیا۔ گلاب سب کو جو منہ میں آیا، سناتا رہا آخر میں تڑکتے ہوئے بولا، "کنگال تھے کنگال ہی رہو گے۔ ابتک اپنا پیسہ دیتا رہا مگر تم نے قدر نہ کی۔ اب خود ہی تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔"

دوسرے دن جب گلاب، سندر اور دیوی چپ چاپ ہی ہوٹل میں جانے کی تیاری کرنے لگے تو گلاب کی ماں آٹھ آٹھ آنسو رونے لگیں۔ وہ سارا دن سسکتی رہیں۔ "ساری عمر غریبی میں گزاری، پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ڈھکے رہے پیٹ پر پٹیاں باندھ کر گزارہ کرتے رہے اب جا کر بڑی مشکل سے بیٹے کی کمائی سے کچھ سکھ ملنے

گئی تھا تو انیندر سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔
"بھگوان سے نہیں دیکھا گیا یا اس کنگال چندن سے جو پہلے
مذاق اُڑانے کر زیادہ دولت ہاتھ آنے کی وجہ سے میں اپنے
ہوش کھو بیٹھا ہوں ؟"
ماں بولی: "اس نے تو ستیاناس کیا ہے اگر یہ بھی جا کر کہیں سے
کما کر لاتا تو یہ نوبت کیوں آتی ؟"
ریکھا نے پہلے ساس کی طرف دیکھا پھر جیٹھ کی طرف گھورتی
ہوئی چوکے پر چلی گئی۔
"یہ اُس کی شوخی تو ایسے گھورتی ہے جیسے میں نے اُس کے
میکے کی جائیداد چھین لی ہے۔"
ریکھا نے جاتے جاتے سب سُن لیا۔ وہ سوچنے لگی جھگڑا کہاں
سے شروع ہوا کہاں جا پہنچا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چندن
بھی تمام باتیں سُن رہا ہے مگر تعجب کی بات دیکھو کہ اُس نے چوں
تک نہیں کی۔ سوہر کے بس استقلال کو وہ دل ہی دل میں نمسکار کر کے
رہ گئی۔

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ گلاب رائے نے بھو کو آباہین فلیٹ لے لیا۔
وہ چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ ماں بھی اُن کے ساتھ جانے والی تھی۔
ریکھا کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا
لگ رہا تھا جیسے بڑی مدت سے رو رہی ہو۔
جب دیواروں سے تصویریں اُتاری جا رہی تھیں تو وہ اس بات
کی یاد دلا رہی تھیں کہ دو دنوں کے بعد یہ گھر سنسان کھنڈر سا ہو جائے
گا۔ اتنا دکھ ہوتے ہوئے بھی ریکھا بڑی احتیاط سے رو رہی تھی کہیں
دیوی اُس کے آنسو نہ دیکھ لے۔ اُس کے سامنے رونا اُسے پسند نہیں
تھا۔ برتن بانٹے گئے۔ اپنے حصے میں رکھے ہوئے دو چار چھوٹے موٹے
برتنوں کو دیکھ کر ریکھا کا دل ٹوٹ گیا۔ دیوار سے گھڑی اُتارتے ہوئے
کھڑکیوں سے ریشمی پردے کھولتے ہوئے دیوی ریکھا کی طرف دیکھ کر
ساس بولی: "یہ سب نندن کے دلوائے تھے۔"
ریکھا کا اس طرف کوئی دھیان نہ تھا۔ وہ تو جدائی کی آگ میں تڑپ رہی
تھی۔ اچھے تھے یا بُرے تھے اپنے ہی تو تھے۔
ساس کے کپڑے ٹرنک میں رکھتے ہوئے ریکھا بولی: "ماں جی جب جی
مت جانا ہر روز آتی رہنا۔ اکیلا گھر تو مجھے کاٹ کھانے لگے گا۔"

دیوی جو جلدی جلدی اپنے کپڑے بند کر رہی تھی بولی "ہم تو جیسے
میں بیکار ہیں جو یہ روز آتے رہیں گے اور تم چوہدرائن کر بیٹھی ہو۔"
ریگستان کی گرم لو کی مانند ایک ایک لفظ جلانے والا تھا مگر ریکھا
اور ساس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی خاموش ہو گئیں۔
دیوی پھر بولی: "ماں جی، اس سے کچھ غرض نہیں ہے۔ اکیلی تم
رہو گی ہم کیسے یہاں آ کر جھانکیں گی؟"
ریکھا نے چاہا کہ وہ بھی کہہ دے "دیوی، بغیر آگ کے جل بھن کر
تم کوئلہ کیوں بنی جا رہی ہو؟ گھر جاتے ہوئے کو کیا کہے۔ وہ خاموش رہی
آج دیوی کا پلڑا بھاری تھا ریکھا کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔
جدا ہوتے وقت گلاب کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا
بہہ نکلا۔ ریکھا سے گلے ملتے بولیں۔
"تم جیسی کومل کلی کو چھوڑ کر جانے کو تو جی نہیں کرتا مگر کیا کروں کہیں
گلاب بُرا نہ مان لے۔ ساری زندگی تو پریشانیوں میں گزار دی اب باقی
گھڑیاں تو کچھ آرام کر لوں۔"
شیام نئے مکان کے جانے کی خوشی میں اچھل کود رہا تھا۔ ہاں گرجو
کچھ اُداس تھا۔ دونوں کا افعا چلتے وقت بھی ریکھا دوڑی دوڑی دونوں
چلے گئے۔ دیوی تو اپنے چپل پھٹ پھٹاتی ہوئی رعب جما رہی تھی۔
سارے گھر سے اچھی اچھی چیزیں چھننے سے ہی اُسے کہاں فرصت
تھی اسی مستی میں اچار رکھا مُرکر مصالحے کی شیشیاں ماسٹی میں ڈال
کر چلتی بنی۔
چھوٹا سندر بولا: "ریکھا کاکی آ... تا..."
ریکھا نے جب اس چھوٹے شیطان کا منہ چوما تب گویا کسی ندی
کا باندھ ٹوٹ گیا ہو گھائل سپاہی کی طرح وہ اوندھے منہ بستر پر جا گری
اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
تکیہ گیلا ہو گیا مگر دکھ کم نہ ہوا۔

(۶)

رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے چندن ابھی تک نہیں لوٹا تھا
بارش تھم چکی تھی۔ باہر ہوا گھوم گھوم کر کھڑکیوں سے ٹکراتی ہوئی بوندوں
کو اپنی گردن میں لئے بھی جا رہی تھی۔ ریکھا اپنے کمرے میں پڑی اُسے
ٹھنڈے احساس کی وجہ سے اور بے چینی سے سوچنے لگی کہ ابھی تک
اور نجانے ان راتوں کا خاتمہ کب ہو گا؟

عمر بھر وہ اپنے اس خیال پر وہ کانپ اٹھی۔

نہیں، نہیں! ایسا کیوں ہوگا؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے، ریت جیسی طرح ویران، آجاؤ، سارا دن کام کی چکی میں پستے رہنا۔۔۔ ریکھا چہرہ یوں سردیوں میں سمندر کی طرح خاموش رہتا ہے مگر وہ سمندر ہی کیا جس میں کبھی جوار نہ آئے، طوفان نہ آئے؟

رات کی تاریکی اور بھی گہری ہوتی گئی۔ ریکھا نے جمائی لی تو چھاتی کے دائیں طرف ہلکا سا درد ہونے لگا۔ وجہ معلوم کرنے کے لئے اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو دل نے صفائی میں ایک عجیب تصویر پیش کی۔

صبح جب وہ اپنے لمبے، گھنے اور کالے بالوں کو سنوارتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو اس کے دل میں ایک خواہش جاگ اٹھی تھی، جب سے اس نے جوانی میں قدم رکھا تھا تب سے وہ چاہتی آ رہی تھی کہ اپنے بالوں میں خوشبودار تیل لگائے تاکہ جب محبوب نزدیک آئے تو پیار سے انہیں چومے اور اپنے ہاتھوں سے انہیں سہلائے اور تب تک سہلاتا رہے جب تک کہ اس کے جسم کے رگ رگ میں خوشی سرایت نہ کر جائے۔

مگر چندن کو فرصت کہاں؟

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوارتی رہی جب بالوں میں ربن سے پھول بنا چکی تو اس نے ایک چھوٹی سی ڈبیا اٹھا کر اپنی مانگ میں سیندور لگایا اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ کھل اٹھی اس کے سانولے چہرے پر پھیل گئی پھر یکایک وہ اداس ہو گئی۔ آئینے سے ہٹ کر جس نے ربن کے پھول اتار کر پھینک دئے۔

اسی وقت کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ چندن خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے دھیمی چال چلتا ہوا اندر آیا۔ ریکھا اس کے لئے کھانا پروسنے کے لئے چوکے میں جانے لگی تو چندن نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ٹھہرو"۔

ریکھا شوہر کی طرف بغیر دیکھے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ اتنی غمگین تھی کہ اسے اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ کتنی دیر سے چندن اس کا چہرہ دیکھتا رہا ہے روشنی میں ریکھا کے بال اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ چندن کے دل میں ایک بار اپنی بیوی کے لئے پیار

کی لہر اٹھی مگر اسے دوسری طرف دیکھتے پا کر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اچھا، جاؤ کھانا لے آؤ"۔

کھانا کھانے کے بعد ریکھا منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی چندن تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ پڑوس کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔

ریکھا کو نیند تو ابھی نہیں آئی تھی مگر جب چندن نے پوچھا سو گئی کیا؟ تو جواب نہ دے کر چپ چاپ پڑی رہی۔ مگر یہ بچاؤ بہت دیر تک نہ سکا۔ جب چندن نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو اس نے پیچھے سے ہٹا دیا۔ چندن نے ایک گناہگار کی مانند یہ جرم قبول کر لیا پھر خود ہی پشیمان ہوتے ہوئے بولا "آج مجھے بہت دیر ہو گئی"۔ ریکھا خاموش رہی۔

"آج ایک مزدور کی بیوی مر گئی تھی اس کے اگنی سنسکار کے لئے جانا پڑا۔ اس لئے دیر ہو گئی"۔ چندن نے یہ الفاظ بالکل آہستہ سے کہے اور اس کی آنکھوں کے آگے ناگر مزدور کا اداس چہرہ سینما کی تصویر کی طرح ابھر آیا۔ ناگر اپنی بیوی کی ارتھی کو اس طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سارے سکھ اس ارتھی کے ساتھ جا رہے ہوں۔

چندن کا دل بے چین ہو اٹھا۔

اس نے ریکھا کو کھینچ کر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ پہلے تو ریکھا بے جان مورتی کی طرح خاموش پڑی رہی مگر تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سسکنے لگی چندن ریکھا کے اس برتاؤ سے پریشان ہو گیا دھیمی آواز میں اس نے پوچھا، تم روتی کیوں ہو؟

ریکھا اور بھی زور سے رونے لگی پہلے تو وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ وہ کیوں رو رہی ہے کس لئے رو رہی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کی دھڑکنیں اسے کہنے لگیں کاش چندن کی کاغذوں پر چلنے والی انگلیاں کبھی اس کے بکھرے بالوں کو بھی سہلاتیں وہ اس کے خوبصورت چہرے کو اپنی چھاتی سے لگا کر کہتا ریکھا رانی، تم کتنی سندر ہو تمہارا حسن مجھے چور کی طرح کھینچ لیتا ہے مگر ریکھا اپنی زبان سے یہ سب کچھ کیسے کہے؟ یہ باتیں بھی کیا شوہر کو سمجھانی پڑتی ہیں؟۔۔

چندن جھنجھلا کر بولا "تم تمہیں بتلانا ہی پڑے گا کہ تمہیں کیا چاہیے"

"کچھ نہیں"، ریکھا نے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ تمہارے رونے سے مجھے کتنی تکلیف پہنچتی ہے؟"

ریکھا کا دل آج اتنا دکھی تھا کہ اس پر اس ہمدردی کا بھی کچھ اثر

نہ ہوا اشا اُسے مذاق سمجھ لگی۔ اپنے کو شوہر کی آغوش سے چھڑا کر ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کا گھر اندھیرا دیکھ کر اُسکا دکھ اور بڑھ گیا۔ اُس کے دل میں ایک لہر سی اُٹھی، کاش چندن باہر آکر اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اندر لے جاتا۔

مگر چندن باہر نہیں آیا۔

وہ پتھر کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بدن کا ایک ایک حصہ درد سے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے وہ غسل خانے تک جا پہنچی۔ اُس تنگ کوٹھری میں داخل ہوتے وقت اُسکا دل چیخ اُٹھا۔ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے؟ ماں تم ہی بتاؤ کہ تم نے مجھے پھولوں کی طرح کیوں پالا؟ مجھے کلیوں کی کومل پنکھڑیوں جیسا دل کیوں دیا؟ کیا اِس لیے کہ کانٹے اُسے چیر ڈالیں۔ دل پھٹا جا رہا ہے مگر خون کی ایک بوند بھی نہیں گرتی کہ دُنیا اُس کے دُکھ کا اندازہ کر سکے۔ ماں، تم ہی نے تو ایک دن کہا تھا، ریکھا میرے ایک سہانے خواب کی تعبیر ہے، میں نے جس خوبصورتی کا تصور کیا تھا وہ ریکھا کے انگ انگ میں سمائی ہوئی ہے۔ ماں، آکر دیکھو کہ کس طرح تمہارا خواب ٹوٹ رہا ہے۔

آسمان میں بجلی چمک اُٹھی۔

غسل خانے کے کواڑ کانپ اُٹھے۔ ریکھا کی سسکیاں سو گئیں گویا وہ چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ انسان کی شکل کی بجائے کچھ الفاظ ہوا سے ٹکراتے ہوئے اندر آ پہنچے۔ تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا چاہیئے؟ مجھے محبت چاہیئے۔ ایسا پیار جس میں میں اور تم دونوں ایک ہو جائیں اور سب کچھ بھول جائیں۔ بھول جائیں کہ اس دُنیا کا بھی کوئی وجود ہے ہمارے بدن پر خوبصورت، خوشبو سے پُر کپڑے ہوں چاروں طرف کا ماحول خوشی سے چہک رہا ہو۔ دنیا کی سماجی اور سیاسی سب تحریکوں سے دُور۔ تمہاری زندگی میرے لئے اور میری زندگی تمہارے لئے۔ ہوا کے جھونکے کواڑوں سے ٹکراتے رہے۔

کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی ریکھا کو لوٹتے نہ دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے چندن کا دل کانپ اُٹھا۔ اتنی رات گئے وہ کہاں گئی ہوگی؟ آسمان گھنگھور گھٹاؤں سے گھرا ہوا تھا۔ جی لرزا دینے والی سنسناتی ہوا غمگین ماحول کو اور بھی ٹھنڈا بنا رہی تھی۔ چندن جھنجھلا کر باہر نکل آیا۔ بادل برسنا شروع ہو گیا۔

چندن کے سامنے ایک سال پہلے کی ریکھا کا چنچل ڈالی کا سلسلہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھدکتے ہوئے گھوم رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے اُڑتی ہوئی چادروں کو ٹھیک کرتے ہوئے، کمرے میں جا کر میلے کپڑوں کی پوٹلی کو رکھتے ہوئے، بچوں کے کپڑے سیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ناچتے ہوئے فلمی گیتوں کے مصرعے گویا اب بھی چندن کے آس پاس گونج رہے تھے۔

اپنے خیالوں میں گم وہ جیسے ہی آگے بڑھا، ریکھا کی سسکیوں کی بھنک اُس کے کانوں میں پڑی گویا سخت گرمی سے تھکے ہوئے مسافر کو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا مل گیا ہو۔

چندن نے کواڑ کھول کر ریکھا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اُسکے سہارے اُٹھا کر بستر پر جا لٹایا۔ بہت دیر کے بعد ریکھا کے آنسو تھمے۔ چندن نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم روتی کیوں ہو ریکھا؟ تمہیں کیا چاہیئے؟ اور اُس نے ریکھا کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"کچھ بھی نہیں" ریکھا نے اپنا سر شوہر کی گود میں چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"اب اس کچھ نہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا" تھوڑی دیر کے بعد چندن بولا۔

"تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اچھے کپڑے، اچھا کھانا سبھی کچھ تو ہے۔"

"میں نے شادی صرف کھانے اور کپڑوں کے لئے نہیں کی۔ یہ تو مجھے میکے میں بھی مل رہے تھے۔"

ریکھا نے ہمت کرکے جواب دیا جیسے وہ آج کوئی فیصلہ کر کے ہی رہے گی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تم نے شادی کیوں کی تھی؟"

ریکھا چھت کی طرف گھورتی ہوئی بولی "بیاہ کا مطلب ہے سکھ اور سکھ اور سکھ وہاں ہے جہاں پیار ہے۔"

چندن نے کہا "تم کیسے سمجھتی کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتا؟ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ میرا پیار صرف تم تک محدود نہیں ہے میرے پیار کا دائرہ وسیع ہے جس میں لاکھوں عورتیں بوڑھے اور بچے آ جاتے ہیں جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام کی چکی میں پس رہے ہیں

ہیں، میں اس نظام کو مٹانے کے درپے ہوں اور میں نے اس بدانتظامی میں تبدیلی لانے کی راہ میں خود کو پھینک دیا ہے۔ صرف تمہاری محبت کے لئے میں اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دے سکتا ریکھا جب تک محبت اور فرض کے درمیان ٹکر نہیں ہوتی تب تک میں دونوں کو نبھاتا رہوں گا محبت اور فرض ایک دوسرے کے راستے میں رکاوٹ بن کر نہیں آئیں تبھی ٹھیک ہے کیونکہ ٹکر ہو جانے پر ایک کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

ریکھا چونک اٹھی اور شوہر کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ چندن کو محسوس ہوا گویا وہ انہی نگاہوں سے پوچھ رہی ہو، پھر میں کہاں جاؤں گی؟

چندن نے نرم لہجے میں کہا: "کیوں نہ تم بھی شخصی محبت کو چھوڑ کر دیش کے بھوکے ننگے اور مظلوم عوام کو اپنا سمجھ کر ان کی خدمت میں لگ جاؤ؟"

"ہم عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟" ریکھا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہماری منزل شادی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اس منزل پر پہنچ کر میری زندگی چمک اٹھے گی مگر میرے ہاتھ میں صرف ناامیدی ہی آئی۔"

"مگر شادی کا مقصد صرف نفسانی محبت ہی تو نہیں ہے۔ شادی تو اس لئے کی جاتی ہے تاکہ مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھی بن کر انسان کی زندگی کو اور زیادہ خوشحال بنانے کی کوشش کریں اور اس راستے پر گامزن ہونے کے لئے شادی ایک ذریعہ ہے۔"

"میرے لئے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔ شادی شدہ عورت کے لئے اس کا مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"تم ایسی ہی باتیں اس لئے کرتی ہو کیونکہ تمہارے دل میں بغیر مشقت کی اور عیش و عشرت کی زندگی بتانے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش ہی تمہیں بے حرکت بنائے ہوئے ہے ورنہ تم اپنی ترقی کا بوجھ مجھ پر نہ چھوڑتیں۔ یہ صحیح ہے کہ آجکل ہمارے سماج میں اسی محدود خیال کی بہتات ہے مگر اس خود غرضی کے تنگ ماحول سے باہر نکل کر عورتوں کو اپنی آزادی کا پھیلاؤ کرنا چاہئے انہیں اپنے علم کے دائرے کو وسیع کرنا چاہئے انہیں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے کہ دنیا کن انقلابات سے گزر رہی ہے اور انہیں اس میں کس طرح کا حصہ لینا ہے؟"

"آپ کی طرح اخباروں اور کتابوں کو گلے لگا کر دنیا کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اپنے گھر والوں کی خبر تک نہ لی جائے؟"

"ریکھا، کیا تم مجھے اتنا لاپرواہ سمجھتی ہو؟ جو کتابوں کو پیار کرتا ہے کیا وہ انسانوں کو پیار نہیں کر سکتا؟ میری محبت کی وسعت نے کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے میں سما لیا ہے۔"

"جس کی محبت خود مجھے ہی مطمئن نہیں کر پائی، اس میں وسعت کہاں سے آئے گی؟"

"میری ریکھا رانی، میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہوں مگر ایسا کرنے میں کام کا وقت جا رہا ہے گا اور یوں مجھے اپنے فرض سے منہ موڑنے کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔"

"اچھا اب میں کبھی کچھ نہیں کہوں گی، کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔"

"بحث کے دوران کچھ مسائل کو نہ سمجھ پانے پر خود کو چڑانے کی کوشش کرتی ہو ریکھا؟ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، قصور تو ہمارے سماج کا ہے جو..."

"اچھا جو جی میں آئے وہی سمجھ لیجئے۔" ریکھا زور سے بولی۔

چندن کو ایسا لگا گویا بڑی محنت کے بعد جس کشتی کو کنارے لانے کی اس نے کوشش کی تھی، منہ زور لہروں نے اسے اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر ٹھیک منجدھار میں پہنچا دیا ہے۔ وہ مجبور مانجھی کی طرح اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا جس کی آنکھیں آنسو پی پی کر پھول گئی تھیں۔

آخرکار دونوں کو نیند آ گئی۔

(۷)

ساس کے الگ ہو جانے کے بعد ریکھا بالکل اداس رہنے لگی۔ چندن کی تنخواہ کے ایک سو پچیس روپوں میں سے چالیس روپے کرایہ دینا مشکل ہو گیا۔ خرچ بڑھ جانے اور تنہائی نے اس کی رہی سہی خوشی بھی چھین لی۔

کبھی کبھار کوئی پڑوسن آ جاتی تھی۔ رادھا سے اس کا خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چندن کے دوست بھی آ کے بھابی جی کہہ کر بلایا کرتے تھے مگر ریکھا کو وہ کسی الگ راستے کے راہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہیرا تھا جو اسے بھابی کہہ کر پکارا کرتا تھا اور اپنے [illegible] کا

حق جتا تھا۔ ریکھا اُس سے چھوٹا موٹا کام بھی کروالیتی تھی۔ سکول کی نوکری سے چھٹی ہونے کے بعد ہیرے کا کافی وقت یہیں رہتا تھا جب ریکھا بیمار پڑی تو ہیرے نے ہی اُس کی دیکھ بھال کی تھی۔

ایک دن دوپہر کا وقت ڈھل چکا تھا اور کوئی چار بجے کے ہونگے ناٹونگا کے علاقے کا ماحول خاموش تھا۔ کچھ بچوں کے گلی ڈنڈا کھیلنے کی آواز آرہی تھی ورنہ ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ اسی وقت تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہیرو آپہنچا۔

ریکھا بولی: "اچھا ہوا جو تم آگئے میرا دل آج بڑا اُداس ہے!"

ہیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بھابی آج کیا یہ اُداسی تو تمہارے پیچھے پرچھائیں کی طرح ہر وقت لگی رہتی ہے۔ شاید تمہارے دل میں کوئی بات ہے جسے تم دبائے رہتی ہو۔"

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟" ریکھا حیران سی ہوگئی۔

"کہو سچ سچ بتادوں؟"

"نہیں نہیں جھوٹ موٹ بتاؤ" ریکھا ہنسنے لگی۔

"ایک دن صبح سویرے جب میں تمہاری دوا لیکر آیا تھا تب تمہیں کافی تیز بخار چڑھ رہا تھا تم نے مجھے چندن سمجھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں تم نے کہا تھا 'تم دیتا ہو۔ مجھے ایک چھوٹی سی کومل ہستی چاہیئے ..... ایک بچہ چاہیئے ..... وغیرہ۔'"

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔

"ایک بات پوچھوں بھابی؟ سچ سچ بتاؤگی نا؟"

"پوچھو" ریکھا بولی "جب اتنا کچھ جان لیا ہے تو باقی چھپانے سے کیا فائدہ؟"

"بیمار ہونے سے پیشتر کیا تمہارے اور چندن کے بیچ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

ریکھا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی "گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ سی ہوجاتی ہے۔ خصوصاً شام کے چھ بجے کے بعد جب دوسرے گھر لوٹ آتے ہیں۔ تب تمہارا ساتھی مزدور یونین کے دفتر میں جاکر غریبوں کے دکھ درد سنتا ہے۔ انہیں درخواستیں لکھ کر دیتا ہے ... مگر اس وقت گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا بچہ بھی میرے سامنے ہوتا تو میں اُسے گلے سے لگا کر ساری دنیا کو بھول جاتی مگر وہ کہتے ہیں کہ کسی کو جنم دے کر کیا اُسے بھکاری بنانا ہے؟ میں تو دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہوں۔ دل پوچھتا ہے جس کی کوئی خواہش پوری جو نہیں پاتی، خواہش اُس کے دل میں پیدا ہی کیوں ہوتی ہے؟ اس سوال نے مجھے اتنا بے چین کر دیا تھا کہ دل کرتا تھا دوسرے کمرے میں جاکر خوب چیخ چیخ کر روؤں تاکہ میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہو ——— میں تمام رات آنسو بہاتی رہی یہاں تک کہ میرے سینے میں درد ہونے لگا۔ اُس کے بعد میں بے ہوش ہوگئی جب میرے ہوش ٹھکانے نہیں رہے ہوں گے تبھی بڑبڑا رہی ہوں گی اور تم نے سُن لیا ہوگا۔"

ہیرا خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا:

"مگر اس میں چندن نے کوئی غلطی نہیں کی بھابی!"

ریکھا نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں: "تم بھی ایسا کہتے ہو؟ کیا غریبوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے؟ یا صرف امیروں کے پاس ہونے چاہئیں"

"دیکھو بھابی سوال صرف بچے ہونے کا نہیں ہے اُنکی پرورش کا بھی ہے یہ سوال جس تنگی اور بھیانک شکل میں متوسط طبقے کے سامنے آتا ہے اتنا غریبوں اور امیروں کے سامنے نہیں آتا۔ دولتمند اپنے بچوں کی پرورش اچھی طرح کر سکتے ہیں اُنکے ہاں بچہ ہونا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ غریبوں کی زندگی ہی تمام دنوں کی گندی نالیوں میں پلتی ہے اور اچھے رہن سہن کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اُنکے بچے ننگ دھڑنگ کنکروں پر چلتے ہیں۔ اُنکے سامنے تعلیم کا کوئی مسئلہ ہی نہیں اُٹھتا۔ اور بڑے ہوتے ہوتے سات آٹھ برس کی عمر میں ہی کمانا شروع کر دیتے ہیں مگر تم متوسط طبقے کی عورت ہونے کے ناتے اپنے بچے کی خوراک اور تعلیم، کپڑوں وغیرہ میں ذرہ بھر کی کمی بھی برداشت نہیں کر سکوگی۔ تمہیں پندرہ بیس برس تک بچے کو پالنا ہوگا تب کہیں جاکر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا۔ چندن جس نے ایک عظیم کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، اُسے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس سے زیادہ کما سکے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ تو اپنے عظیم فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف رہتے ہیں اور اس چار دیواری کے اندر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

ریکھا بہا بھی، ایک تم ہی نہیں تم جیسی بےشمار عورتیں ہیں جن کی پوری زندگی اسی گھٹن میں بیت جاتی ہے مگر وہ اس چار دیواری سے ایسی چپکی ہوتی ہیں جیسے کنجوس اپنی دولت سے!

"تم تو عجیب باتیں کرتے ہو بھیا، یہ چار دیواری ہی تو ہمیں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے ہم نے اس کی چوکھٹ کے باہر پاؤں رکھے نہیں کہ رشتہ داروں میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگ جاتی ہیں۔ ویسے بھی ہم وہ لڑکیاں ہیں جو بولی سے زیادہ نہیں سمجھتے ان کی نگاہوں میں ہمارے وجود کی کوئی اہمیت نہیں ہے"

"مگر میں کہتا ہوں، تم جن لوگوں کی چمک دمک دیکھتی ہو وہ بھی اکثر تم جیسے ہی ہیں فرض اور رشتے داروں کے بوجھ کے نیچے وہ اتنے دبے ہوئے ہیں کہ ان کی ترقی کا راستہ ہی مسدود ہو گیا ہے اگر وہ بھی حقیقت کو سمجھ کر چلنے کی کوشش کریں تو سماج کا کافی دکھ گھٹ سکتا ہے۔ ایسے کتنے گھر ہیں جہاں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنا سارا وقت بناؤ سنگار اور سیر سپاٹے میں گزار دیتی ہیں پھر بھی گھر کی بگڑی ہوئی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے آگے ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ پھر بھی کسی فن میں مہارت حاصل کر کے اس کا انسانی زندگی بھلائی کے لئے استعمال کیونکہ ان میں ممکن نہیں۔ آج وہ وقت آگیا ہے جب عورتوں کو بیدار ہو کر اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر مرد کا سچا ساتھی ثابت کرنا چاہئے۔

"ہمارے سماج میں عورت صرف اپنے شوہروں پر کڑی ہوتی ہے جب اس کا شوہر کمانے سے معذور ہوتا ہے عورت کا اصل کام تو تخلیق کرنا ہے۔"

"اس فرض کو نبھانے کے لئے اسے بھی کمانا پڑے تو اس میں برا ہی کیا ہے"

"میں جا کر کماؤں؟" "بس، بس تم نبھانے اور کیا کیا کہو گے۔ کہاں ہمارا خاندان اور کہاں عورت کی کمائی! میں اپنے شوہر کے خاندان کی لٹیا نہیں ڈبو سکتی۔"

"مگر اب تو زمانہ ایسا ہے کہ اگر انسان اپنے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہے کالے بازار اور بے ایمانی سے دور رہنا چاہے تو وہ اپنی ضروریات کے مطابق ہرگز کما نہیں سکیگا۔"

ریکھا نے گہری سانس لی اور بولی "ٹھیک ہے۔ جو ہے وہ اچھا ہی ہوا ہے جو ان اور ساری تکلیفیں برداشت کر رہی ہوں لیکن یہ بھی ہوا کہ" خاموش ہو گیا۔ اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا "اوہ بہت دیر ہو گئی اور جلدی سے قریب ہی کتاب اٹھا کر تیزی سے باہر چلا گیا۔

ریکھا سوچنے لگی۔ آخر یہ انسان کون سی مشین ہے پرزے ہیں جو وقت بے وقت چلاتے رہتے ہیں۔ اِدھر میں ہوں کہ کسی اپنے آدمی کے سہارے باتیں کرتے ہوئے بنا ہے جیسے اپنی زندگی کا سفر کرنے کو تیار بیٹھی۔

سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔

ریکھا دیکھ رہی تھی کہ سامنے والے گھروں میں آفسوں سے ــــ لوگ کھانے کے خالی ٹفن اور تھیلیاں ہاتھوں میں لئے مسکراتے چلے آ رہے ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا ناریل کے پیڑوں سے گزرتا ہوا ریکھا کے کانوں تک آ پہنچا۔ اور کہتا گیا "ریکھا اتنے لوگ تمہارے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں پھر بھی تم اپنے کو اکیلا محسوس کرتی ہو؟"

(۸)

دوسرے دن ریکھا باہر آ کر ڈیوڑھی میں بیٹھ گئی اتنے میں گوپی ترکاریوں کی پوٹلی سامنے والی ڈیوڑھی پر رکھ کر سستانے لگی۔ ریکھا کو سامنے بیٹھا دیکھ کر مسکرانا بھول کر بھاگنے سی لگی لیکن ریکھا نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

گوپی اور ترکاری کی تھیلی؟ ریکھا کے لئے یہ ایک عجیب بات تھی۔ گوپی اس کی دور کی رشتے دار تھی۔ حیدرآباد میں ان کا اپنا ایک اچھا خاصا مکان تھا جس کے کرائے سے ہی گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ویسے تو ریکھا اسے کبھی بازار میں دیکھتی تھی تو اس سے آنکھ بچا کر نکل جاتی تھی مگر آج اس کے دل میں نجانے کیوں انسانی سا ایک قسم کا لگاؤ جاگ اٹھا تھا جو دن اس نے بستر پر سو کر بتائے تھے ان دنوں میں اس کی یہ خواہش بھی ترک اٹھی تھی۔ اس کا دل اتنا آرام پانے کے بعد تو نا امید سیپی کے جسم کی طرح کومل ہو گیا تھا۔

ریکھا کے دل میں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا سوال اٹھنا اب ناممکن تھا۔ اس نے پورے زور سے آواز دی "گوپی!"

گوپی رک گئی مگر اس نے ریکھا کی طرف نہ دیکھ کر پہلے ترکاری کی پوٹلی کو دیکھا پھر سر اٹھا کر بولی "ریکھا ہو کیوں ٹھیک تو ہو نا؟"

"آج تو ٹھیک ہوں مگر گوپی میں رہ کر بھی تم نے یہ خبر نہ لی کہ میں کتنے دن بیمار رہی۔"

ریکھا نے دیکھا گوپی جھنجھلا رہی تھی وہ جلدی سے ہٹنا چاہتی تھی۔ ریکھا سمجھ گئی کہ گوپی مارکیٹ میں اتنی ترکاریاں خرید لینے

مدت نہ ملی مگر مجھے دیکھتے ہی شرم سے ڈوب گئی! ہم متوسط طبقے کی عورتیں بھی کتنی عجیب ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی اصلی حالت دکھاتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں۔ گوپی تو پاکستان بننے کے بعد ہی اس قطار میں آ گئی تھی۔ اس کا شوہر جو وہاں بیکار رہ کر اپنی موروثی دولت کو عیش و عشرت میں لٹایا کرتا تھا۔ یہاں مجبور ہو کر سندھ ورتی ہو کر کام کر رہا تھا۔ تین بچوں کی ماں گوپی اس تیلی کی طرح، گھر کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔

ریکھا کے دماغ میں پاس پڑوس کی کتنی ہی عورتیں گھومنے لگیں۔ بہت سی باتوں نے اُسے متوسط طبقے کی عورتوں کی حالت پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ متوسط طبقے کی عورتیں کتنی دکھی ہیں۔ ہزاروں قسم کی پریشانیاں انہیں گھیرے رہتی ہیں بہت مشکل سے اپنا گذارہ کر پاتی ہیں۔ باہری لین دین سے انہیں کبھی چھٹکارا نہیں ملتا اور ہمیشہ گھر کے کھانے پانی میں کٹوتی کرنے کو سوچتی رہتی ہیں۔ پڑوسن رادھا کو ہی دیکھو، بیچاری کٹوتی کرتے وقت سوچتی ہے، بچوں کو کم دوں؟ پھر سوچتی ہے نہیں، یہی تو مستقبل کے سہارے ہیں انہیں کیسے کمزور رکھا جائے۔ شوہر کی آدھی پیالی دودھ بھی کم کرنے کو تیار نہیں۔ آخر وہی تو کولھو کے بیل کی طرح کما کر لاتے ہیں۔ گھر میں ساس ہے، نند ہے، ان کی کٹوتی کرنا اسے مناسب لگتا ہے مگر اس سے پہلے وہ اپنی تھالی پر اپنی ہی شروع لگا دیتی ہے ڈال کر کانپ اٹھتی ہے۔ سب سے زیادہ کام کرنے والی سب سے زیادہ گھر میں کھپنے والی عورت سب سے پہلے اپنی ہی تھالی میں کٹوتی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ آدھ پاؤ کی، کل دودھ کی اور پھر اچار پاپڑ .....

ہر روز نئی کٹوتی ہونے پر بھی کٹوتی کا دائرہ شوہر، ساس، نند اور بچوں تک وسیع ہوتا جاتا ہے تب بھی آسانی سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو پاتا۔

گھر میں کنواری لڑکی بیل کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی بیچاری عورت، گھر کی تمام پریشانیوں میں پسنے والی رات کو تھکی بانہوں میں تھوڑی دیر کے لیے سہارا ڈھونڈتی ہے مگر وہ دس بارہ گھنٹے کام کر کے لوٹتا ہے اُسے بھی تو آرام چاہیئے یہ سوچ کر شوہر کا جسم دبانے لگتی ہے۔ اس کا دل کئی کہانیاں سنا جاتا ہے مگر جھجک کے مارے شوہر کے آگے کبھی منہ سے نکل نہیں پاتیں۔ اُس کا جسم ایک انوکھی آگ سے دہک اٹھتا ہے اور وہ ایک مجبور سانس بھر کر رہ جاتی ہے۔ اُس کی پیاسی روح صبح کے کھانے تک شوہر کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے۔ تصور میں بچی کا ہاتھ اس کے سر پر ہوتا ہے گویا دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے، دیوی تم واقعی ایک عجیب بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہو، تمہارے ہونٹ پیلے پڑ رہے ہیں

اور بال سفید ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں! میں بھی تو خون پسینہ ایک کر کے چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں مگر.....

اچھا اب کام پر جانے کے لیے دیر ہو رہی ہے اور وہ کواڑ تک جا کر ناامید نگاہوں سے لوٹ آتی ہے۔

ریکھا کو محسوس ہوا جیسے ویسی ہی ناامیدی اُس کی آنکھوں میں گھر کئے بیٹھی ہے۔ پڑوس میں سبھی گھروں کی روشنیاں جل چکی تھیں سب سہاگنیں اپنے شوہروں کے لئے کھانا پرو رہی تھیں مگر وہ ...

ریکھا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دل کی گہرائی سے ایک چیخ سی نکل پڑی۔ وہ اپنے اندھیرے گھر میں داخل ہوئی۔ اُس تاریکی میں اُسے گوپی کا سایہ گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ ریکھا کچھ دیر کے لئے ہنس پڑی۔ عورتوں کا من بھی عجیب ہوتا ہے! دوسروں کا دکھ یاد آتے ہی اپنا دکھ بھول جاتی ہیں

اُسے وہ چار دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ زندگی میں پہلی بار چندن نے دھمکی دیتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ اگر گھر کی سبزی ترکاری اور اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں وہ خود اپنے ہاتھ سے نہیں لائی تو وہ روٹی نہیں کھائیگا۔

اُس روز تو وہ غصے سے لال ہو کر بولی تھی "کسی کو اس بمبئی کی ہوا نہ لگے کتنے ذلیل ہو کہ بیوی سے ترکاری لانے کو کہتے ہو۔ اس سے تو موت بھلی ہے۔"

مگر جب چندن سچ مچ ہی بنا کھائے جانے لگا تو وہ سارا غصہ آنسوؤں سے بہاتی ہوئی باہر نکل پڑی تھی۔ اُس کے تعجب کی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا اُس سے کم عمر والی دو لڑکیاں پنساری سے مول بھاؤ کر رہی تھیں۔ آگے جا کر اُسے رادھا ملی۔ ریکھا نے جھٹ سے سوال کیا۔

"تمہارے شوہر کہاں ہیں جو تم خود ترکاری لینے آئی ہو؟"

رادھا نے عام لہجے میں جواب دیا "مرد بیچارے سارا دن تو کام کرتے رہتے ہیں وہاں سے لوٹتے ہی ادھر سامان سبزی لینے آئیں یہ اُن کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ تو کل تم کہیں یہیں بیٹھ بیٹھ کر اُن کی ہڈیاں دکھنے لگتی ہیں۔ ہم کیا چارپائیاں توڑنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں؟"

اُس وقت ریکھا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا وہ چندن سے کہیں کہ تم چلو گے کہ گی، رادھا ٹھیک کہتی ہے یہاں تو گھر کی گاڑی کھینچنے کے لئے بھی دو بیل چاہئیں۔

ابھی یہ الفاظ اس کے دماغ میں آتے ہی تھے کہ چندن بس سٹاپ کی طرف دوڑتا دکھائی پڑا۔ وہ جیسے دفتر گھر لوٹتے آئی گھر بازار کی چہل پہل، آدمیوں اور موٹروں کی تیز دوڑ دھوپ، دوڑ دوڑ کر بسوں کو پکڑنے کے تواتر دماغ میں گھوم رہے تھے گھر کی دیواروں کے اندر اسے زندگی خاموش ہوا کی طرح گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آج بھی اندھیری کوٹھری میں جاتے وقت اسکا دل اداس ہو رہا تھا۔ اچانک گروپ اندر چلا گیا اور بولا "ریکھا بھابی یہ لو میرے کپڑے، اب میں تمھارے پاس ہی رہونگا، چاہے مری کیوں نہ جاؤں مگر گلاب دادا کے ساتھ کبھی نہیں رہونگا۔"

ریکھا نے جلدی جلدی بتی جلائی اور گروپ کا سر چوم کر اسے گلے لگایا۔ بولی۔

"بہت دنوں کے بعد آئے ہو گروپ۔"

وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اسے دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ گروپ کا دل بہت ہی بجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا اسکا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کسی نے بچے کا دل دکھایا ہے۔"

"پہلے یہ تو بتاؤ، تمھارا چہرہ روانسا کیوں ہو رہا ہے؟"

گروپ نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں وہ ریکھا کے گلے میں باہیں ڈال کر سسکنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ رہے۔ جب گروپ کچھ چپ ہوا تو بولا

"بھابی، میں بیٹھے ہی شیام کو پکڑنے کے لئے دوڑنے لگا، شیشے کی میز سے ٹکرا گیا۔ میز گر پڑی۔ یہ دیکھو میری ٹانگ میں زخم ہو گیا ہے۔ ماں تو دیکھتے ہی ہوش گنوا بیٹھی۔ وہ دوڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی کہ کرسی سے ٹکرا گئی۔ کرسی چکر کھا کر گر گئی اور اسکا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بڑی بھابی چیخ کے آندھی کی طرح دوڑتی دوڑتی آئی اور شوکیس دیکھ کر بولی: "جنگلیوں کو لا کر محلوں میں بٹھایا ہے! اندھی ہو، آنکھیں پھاڑ کر تو چلا کرو۔ تم سب جانور ہو جانور"۔ ماں نے چپ تک نہ کی۔ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے کپڑا پھاڑ کر میرے پاؤں پہ باندھنے لگی مگر بڑی بھابی کا کلیجہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا ہیں کر سکتی رہی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے بھی کر دیا ــــ

ــــ مجھے کیا معلوم کہ یہ شیشہ اتنا کچا ہو گا۔ آئی ہے سٹھاتی چانٹا مارنے۔ بولی بکے کے بچے، زیادہ چیں چیں کی تو دانت توڑ دونگی اس گھر میں تیری ایک بھی نہ چلے گی۔ اس پر میں نے کہا کیا تیرے باپ کا گھر ہے؟ بس پر اس نے جھٹ سے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ اُدھر ماں بھی مجھے ڈانٹتی رہی۔ پروگریس بک پر دستخط کروانے کے لئے بھی ماں نے گلاب کے باپ کے پاس جانے کے لئے کہا۔۔۔ اب میں اس گھر میں کبھی پاؤں بھی نہ رکھوں گا۔

بڑی بھابی، گلاب دادا اور ستیندر چاچا ہیں کمائیں مگر ہمیں مانگنے کا بھی حق نہیں۔ ہمیں ایسی گھٹیا نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے ہم بھکاری ہوں۔ ہم جنگلی ہوں چاہے جو کچھ بھی ہوں مگر ان کا کیا؟"

ریکھا اب ہنس پڑی۔ "تم جنگلی کا ہے کو ہو جنگلی تو وہ ہیں جو تمھیں جنگلی کہتے ہیں"

گروپ کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

"جنگلی نہیں تو اور کیا ہیں۔ سارے دن دولت دولت پکارتے رہتے ہیں اگر کوئی امیر آدمی گھر میں آتا ہے تو اس کی جوتیاں چاٹنے لگتے ہیں اور جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کی برائی کرنے لگ جاتے ہیں۔ دادا کے دوست کیا ہیں چور سے کچے ہیں۔ کرائے کا مکان ہے لیکن کہیں گے ہماری بلڈنگ ہے۔ کسی سے ایک ہزار چھینیں گے تو بتائیں گے دس ہزار۔ دوسرا کہے گا، فلاں کو آیا آج بتایا کہ اب کورٹ میں نکلنا ہو گا۔ سارا دن لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں۔ بڑی بھابی تو ایسی ہیں جو ہمیں دیکھ کر جل اٹھتی ہیں۔ ہمارے پیٹ سے نکال کر جانور کو دیتے خوش ہوتی ہے ایک دن بلی کے دودھ کی لٹیا گر گئی تو اس نے ماں کا دودھ بلی کو دے دیا۔ ماں تو صبر کے گھونٹ پی گئی مگر میں دودھ پیتا بچہ تھوڑے ہی ہوں اس دن مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں نے دودھ پیا ہی نہیں۔ بھابی، بڑی بھابی جو ہمارے ساتھ اتنا برا برتاؤ کرتی ہیں

ذکیا ؟ اُسے اس کا اچھا پھل ملے گا؟ گلاب دادا

دوسروں کے گھر جاکر جوا کھیلتے رہتے ہیں اور بڑی بھابھی جل بھن کر رہ جاتی ہیں
ایک دن کالی رات گئے میں جاگ رہا تھا کہ دادا شراب پی کر آئے بڑی
بھابی نے شور مچایا تو دادا گنگناتے ہوئے بولے "شیلا تو مجھ سے نہیں
لڑتی۔ جیا تو تم سے بھی خوبصورت ہے اور شیلا تو جیتی جاگتی شراب ہے
اُس دن بڑی بھابی اتنا روئی کہ ہچکیوں کے مارے گھر کانپ رہا تھا صبح کو
اُٹھی تو پھر اُسی طرح گرجتی ہوئی۔

"اچھا، اچھا وہ سبھی باتیں پھر بتانا۔ اُٹھو کپڑے بدل لو میں کھانا
بناتی ہوں۔"

آج ریکھا کو محسوس ہوا کہ گھر کی دیواریں بھی باتیں کرنے لگی ہیں۔

(۹)

گوپ اب چندن کے گھر میں رہنے لگا۔ چندن نے دو تین روز
تک تو کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب ریکھا نے تمام باتیں بتاتے
ہوئے کہا کہ گوپ بھی آپ کے ساتھ رہ کر آپ جیسا بننا چاہتا ہے
تو وہ بہت ہی خوش ہو گیا تھا لیکن تیسرے دن رات کو کام سے لوٹتے
ہی چندن نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر ریکھا کو دیا اور کہا۔
اب گوپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

ریکھا نے خط پڑھا تو اپنے کو روک نہ سکی اُس کی آنکھوں سے
آنسوؤں کی دھارا بہ نکلی وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور خط کو ہاتھوں میں
ہی مسل دیا۔ خط میں گلاب رائے نے لیے تو بہت سی اول شول باتیں
لکھی تھیں مگر ساتھ میں یہ بھی لکھا تھا کہ گوپ چونکہ دو سال کے بعد کمانے
لگ جائیگا۔ اس لئے اسے بڑا کر تم لوگ نے ہم سے چھین کر لے گئے ہو۔ یہ
بات دونوں کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً ریکھا کے تو تن بدن میں
آگ لگ گئی کسی طرح من کو تھام کر وہ لیٹ گئی۔

دوسرے دن بڑی منت کر کے گوپ کو گھر لوٹ جانے کے لئے
راضی کر سکی اور اس شرط پر کہ وہ بھی اُسی کے ساتھ جائیگی۔

ریکھا کے گلاب رائے کے گھر پاؤں رکھتے ہی دیوی بولی "اچھا
ہوا جو گوپ ہم سے جھگڑا کر کے گیا تمہیں دیکھنے کا موقع تو ملا۔ ہاں
آپ لوگ ٹھہرے بڑے آدمی ہمارے گھر بھلا کیوں آنے لگے!"
ریکھا تو شرم سے زمین گڑ ہو کر رہ گئی۔ اس پیٹ میں ہی گھسی جا رہی تھی۔ بھابی کے

روز نئے اِشک سے رنگے چہرے کے مقابلے میں اُسے اپنا چہرہ پھیکا
لگا۔ سکپی کر بولی "ناتا جی اور چھوٹا کہاں ہیں؟"

"کیوں ری، ماں جی سے ہی خاص کام ہے کیا؟ اگر گوپ کے متعلق
کچھ کہنا ہو تو مجھ سے کیوں نہیں کہ دیتی۔ اس بارے میں ماں جی کر ہی کیا
سکتی ہیں؟"

معلوم نہیں، ناتا جی کہاں سے آ پہنچیں۔ دودھ کا پیالا دیوی کے سامنے
رکھ کر بولیں "بدر کو گود سے اُتار کر دو لیں" اس نے تو پریشان کر دیا ہے کہتا ہے
دودھ نہیں پلائے پیئو نگا۔"

ریکھا نے چھوٹے کو گود میں لے لیا اور دودھ کا پیالا لے کر کھڑکی کے
پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ نیچے ایک چھوٹا پارک نظر آ رہا تھا۔ ریکھا بولی "منو
تو میرے ہاتھ کا دودھ پی لے تو نیچے پارک میں چل کر جھولا جھولیں گے۔
آسمان تک پہنچ جائیں گے پھر وہاں سے تارے توڑ لائیں گے۔
اور چھوٹا دودھ پینے لگا اُدھر دیوی گوپ کو کھری کھوٹی سنانے
لگی۔

"میرے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہے جو دونوں بھائی اگر میرے
سر پہ بیٹھے ہو اور ایک بھائی کا خون چوسنے چلے ہو؟ اب کہتا ہے کہ
چندن بھیا اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ بھلا کاہے کو رکھیں گے کچھ دن
رکھ کر دیکھتے تو اچھی طرح آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

"بیٹی، تم کیوں اس طرح بولنے لگی ہو۔ ممکن ہے ہمارے نصیب میں
ہی گلاب کے پاس اتنی دولت آئی ہو۔ پالنا تو بھگوان کا کام ہے۔"

"ماں جی، تم تو صرف باتیں بنانا جانتی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو کہ کیسے مکان
کرائے پر رکھ کر آپ لوگوں کو پال رہے ہیں اور کیسے شاٹھ سے رہ رہے ہیں؛
ہمارا بیٹ بھی کیا کھاتا ہے یہی دو چار چپاتیاں۔ پھر ہمارے لئے
ہی کیوں شاٹھ لیے لا۔ جو شراب پیتے ہوں گے کھانے پینے میں عیاشی کرتے
ہوں گے انہیں کے لئے ہی شاٹھ کرنا ہوگا۔" کہتے کہتے ساس نے ریکھا کو پیچھے
آنے کا اشارہ کیا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دیوی، دیوی رانی کا ہاتھ پکڑ کر بولی "ریکھا تم نے کیسے طعنے
دیتی ہے۔ ہم لوگوں کو کھانے پینے کو دیکھتی ہے تو جل جاتی ہے یہ اتنا غرور
چڑھ چکا مگر ابھی تک اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔"

ریکھا کچھ نہیں بولی۔ ساس کے پیچھے چل دی۔ دیوی جل بھن کر
اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رہ گئی۔

"میں کہتی ہوں گوپ کو واپس لے جانا ہی ہوگا میں اس زمان دار کو یہاں ایک گھڑی بھی نہیں رہنے دوں گی۔"

گوپ غصے سے بڑی بھابھی کی طرف دیکھنے لگا۔ ریکھا اُسے بھی کھینچ کر ساس کے کمرے میں چلی گئی۔ ساس نے بھی اسی طرح ریکھا کا ہاتھ پکڑا بیٹھے کچھ دیر پیشتر دیوی نے پکڑا تھا اور بولی۔

"دستی بہو! کیا کہتی ہے۔ ایسی بہو ملنے سے گلاب کنوارا ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا۔ گلاب کہتا ہے کہ اگلے مہینے میں موٹر لوں گا اور اس رانی صاحبہ کے باپ کا ہر روز دیوالہ نکل رہا ہے۔"

ریکھا کو ساس اور بہو کی زبان اتنی کڑوی تھی کہ تا گوار گزری۔ ماننے میں گلاب بھی ماں کے کمرے آ بیٹھا۔ ٹھٹھا مار کر گوپ سے بولا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ چند دن تمہیں تین دن بھی اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔"

اس طعنے پر ریکھا چونک اُٹھی۔ دیوی بھی اپنے شوہر کے پیچھے کھڑی ہو کر تیکھے آواز میں بولی "ایک بار جو تھوک زمین پر پھینک دی گئی ہے اُسے چاٹنا نہیں ہوگا۔ ہمیں کوئی پرواہ نہیں اگر گوپ جا کر کمائے اور ہمیں کھلائے۔"

ریکھا گوپی کے اس بیٹر کو بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی تو اس کے کمانے کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اس وقت تو اس کی تعلیم کے لئے روپوں کی ضرورت ہے۔"

"واہ بڑے چالاک ہو تم لوگ جو گوپ کی کمائی کے لئے تو تیار بیٹھے ہو لیکن ایک دو برس اس کی تعلیم کے لئے پیسہ خرچ کرنے کے لئے سانپ سونگھ جاتا ہے جیسے ایک ہی بھائی نے سب کو پالنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

گلاب اب بھی خاموش نہ رہ سکے بولے۔

"اچھا اچھا! اس کی ساری کمائی تم لے لینا۔ دو سال کے اندر اندر میٹرک تو کر ہی لے گا پھر کام پر لگ جائے گا۔ ہاں اور چھوٹے بھیا کو کچھ دینے کی فکر تمہیں نہیں کرنی ہوگی۔"

ریکھا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کچھ وہ کیسے برداشت کرتی جا رہی ہے گوپ تو ان کے سامنے گھر کا ایک لڑکا تھا کمانے نہ کمانے کی ترازو میں اُس کی قیمت کیوں لگائی جا رہی ہے؟ آخر چپ کار کر بولی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوپ کی آپ لوگوں کو بہت بے فکر ہے تو پھر آپ اُسے اپنے پاس ہی کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"نہ بابا" دیوی دونوں ہاتھ زور سے ہلا کر بولی۔ "ہمیں تو اتنی فکر ہی سکتی ہے اب اور مصیبت کون مول لے؟ کبھی سوٹ نہیں ہے تو کبھی بوٹ نہیں ہے کبھی سکول کی فیس چاہیئے۔ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔"

"اچھا اچھا، مت رکھنا۔ تیرے پاس رہتا ہی کون ہے۔ جہاں اتنے لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ وہاں ایک میں بھی گذر کر لوں گا" گوپ بولا۔

"اچھا یہ بات ہے؟ تین دن ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی تمہارا غرور نہیں ٹوٹا؟ اب فٹ پاتھ کی بھی ٹھوکریں کھا کر دیکھو۔ تیرے جیسے بھائی کے بدلے اگر کسی جانور کو پالا جائے تو کہیں بہتر ہے۔" گلاب غصے میں کانپتا ہوا بولا۔

اب ماں بھی اُبل پڑیں: "بیٹا گلاب، ذرا زمین کی طرف دیکھ کر چلو کیا معلوم ہمارے ہی نصیب سے تمہیں اتنی دولت ملی ہو۔ میرا کوئی اور ٹھکانہ ہوتا تو اسی وقت بچوں کو گود میں چھپا کر چلی جاتی۔"

ریکھا جانتی تھی کہ روز کی اس کھینچا تانی سے کیا نتیجے نکلتے ہیں۔ اس لئے اُس نے گوپ کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کیا وہ اُسے لیکر گھر چلی آئی۔

گوپ بولا۔ "ریکھا بھابھی، کیسے ہیں یہ لوگ! تھوڑا سا پیسہ اکٹھا کر لیا ہے تو چاہتے ہیں ہم لوگ ان کے سامنے ناک رگڑ کر چلیں اپنے اوپر تو قرضہ لیکر بھی روپیہ لٹاتے ہیں لیکن ہم ٹھہرے بھیک منگے بھر بھلا ہماری تعلیم کے لئے وہ کیوں خرچ کرنے لگے۔"

ریکھا دل ہی دل میں ہنس دی۔ وہ سوچنے لگی، کوئی بچے سے پیار سے باتیں کرے تو کتنی سیانی باتیں کرتا ہے وہ مگر ان دو برس کے اندر بیٹھ کی نیت کتنی خراب ہو گئی ہے۔ اُس کی حالت تو اُس پیڑ کی مانند ہوتی جا رہی ہے جس کی جڑیں تو کیڑے کھا گئے ہوں۔ مگر اُوپر سے سوکھے ہوئے اس کی ڈالیاں سر اُونچا کر کے آسمان کو چھونا چاہتی ہوں۔

گوپ کے آ جانے سے ریکھا کی تنہائی کافی کم ہو گئی۔ وہ جب اُس کے ساتھ بیٹھ کر سکول کی باتیں کرتا تو ریکھا کو بھی اپنے طالب علمی کے زمانے کی یاد آ جاتی تھی اور وہ اپنی اُس چھوٹی سی مگر بڑی لطیف زندگی کے متعلق سوچتے سوچتے کھو سی جاتی تھی مگر اس تفریح کے ساتھ ساتھ گھر کے

معلومات کا سلسلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

ایک دن وہ گوتپ کا پھٹا پاجامہ سی رہی تھی اتنے میں گوتپ سکول سے لوٹ آیا اور اپنا جوتا ہاتھ میں اُٹھا کر بولا بھابی دیکھو یہ یہاں سے پھٹ گیا ہے۔

ریکھا نے دیکھا جوتے کا تلا گل گیا تھا اور اس میں پیسے کے برابر سوراخ ہو گیا تھا۔ گوتپ تھیلا رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

"کیوں، آج تھکے ہوئے ہو یا بھوک لگی ہے؟ کیا تمہاری جگہ کمیشا پر اعلان ہو رہے ہیں؟"

ریکھا نے بڑی نرمی سے کہا۔

گوتپ نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا بھابی، مجھے نئی چھتری لیکر دو۔ بس چھتری کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہے لڑکے مجھے بوڑھا بوڑھا کہکر پکارتے ہیں۔ اور گوتپ کی آنکھیں بھر آئیں۔

ریکھا کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اُس نے اُٹھ کر گوتپ کو چوم لیا اُس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ گوتپ کو دلاسہ دینے کے خیال سے بولی۔

"دسویں جماعت میں پڑھتے ہو پھر بھی کبھی کبھی چھتری لے جاتے ہو۔ آخر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

وہ گوتپ کے لئے خیالوں کا انبار لگا کر آئی تو اُسے ہیرے سے کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آگئے لڑکی کے خاندان کی لٹیا تھوڑے ہی ڈوبے گی؟ وہ سوچنے لگی، اب تو خاندان کی لٹیا خود بخود ہی ڈوب رہی ہے۔ خاندان کے ہونہار اور پیارے بچے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن گوتپ کو سکول روانہ کر کے وہ پھر خیالات کے سمندر میں ڈوب گئی اتنے میں ڈاکیے نے آکر ایک خط دیا جسے پڑھ کر اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی جب ہوا کے جھونکے سے خط اُڑنے لگا تب کہیں ہوش میں آئی خط کو مٹھی میں دبا کر رنجیدہ ہوتی رہی۔ شیلو تو اب کیا کرے گی؟ بیچاری اپنے بچوں کو تڑپتے کیسے دیکھ سکے گی؟ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

صرف شیلو ہی کیا جسے دیکھو وہ اِس قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے سب رونے کا راگ الاپ رہے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہر ایک اپنی سطح سے گرتا جا رہا ہے۔۔

اگرچہ اس کی بیٹھک کواڑ کی طرف تھی پھر بھی کسی کے قدموں کی آہٹ سُن کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی "گوتپ، پانی کا گلاس تو دینا۔"

مگر جب چندن نے آکر اُسے پانی کا گلاس دیا تو اُس کی آنسوؤں سے تر اور متعجب آنکھیں چندن کے چہرے پر جا کر اٹک گئیں۔ چندن نے دیکھا ریکھا کی آنکھیں کرب اور درد سے پھٹ رہی تھیں چندن دل ہی دل میں ہنس دیا۔

یہ بد نصیب لڑکی کبھی دُکھ کا دامن چھوڑے گی بھی یا زندگی بھر تڑپتی رہیگی۔

اتنے میں ہیرا بھی آپہنچا اور بولا۔

"چندن، کل والی میٹنگ کس جگہ پر ہوگی؟ کوشاری تو اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ اُس کا مکان پانچ ہفتوں تک بند رہیگا۔"

"اب تو میرے ہاں کافی جگہ ہے۔"

تیز ہوا کی وجہ سے کھڑکیوں کے کواڑ کھٹکھٹا رہے تھے اور آسمان پر بادل چھاتے جا رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر میں بارش ہوگی۔ اس لئے چندن نے ہیرے کو ٹھہرا لیا۔

"چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو دامن سے پونچھتے ہوئے ریکھا بولی۔

"مُنّے لال یہ سب کیا ہو رہا ہے ہیرا! دو ایک رشتے داروں کے علاوہ باقی سب چھوٹ ہوتے جا رہے ہیں آخر ایسی ہوا چلنے کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟"

ہیرے نے دیکھا، ریکھا کی سوالیہ نگاہیں جواب سننے کے لئے بیتاب تھیں۔ چندن چپ کھڑا تھا ہیرے کی نگاہوں نے گویا اشارے سے چندن کو کہہ دیا ہو کہ ریکھا اور تمہارے درمیان جو دیوار حائل ہے آج اُسے گرانے کا موقع ملا ہے۔

چندن نے نچلا ہونٹ دانتوں کے تلے دبا کر منہ پھیر لیا گویا ہیرے کی بات کا جواب اُس نے دیدیا ہو جب وہ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

ہیرے نے کہا بھابی تمہارے گھر میں ٹھیک ہے بہت سے ایسے سوالات کا جواب میری نسبت چندن بہت اچھی طرح سے دے سکے گا۔"

یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے اُس نے ریکھا کو

وہ مجبور تھا ہوں سے کہتا تھا "ان کے پاس میرے لئے فرصت کہاں
ہے انہیں کیا شاید بھگوان کو بھی میری جان لینے کی فرصت نہیں۔
بہر حال یہی دل میں سوچتا رہا ہوں کہ ایسی شیلی لڑکی کو بہلانے
کے لئے ماسٹر جیسے دھیرج کی ضرورت ہے۔"

بارش کا ایک زوردار جھونکا آسمان کی تاریکی کو دھو کر دو چار منٹ میں ہی خاموش ہو گیا کمرہ پھر روشنی سے جگمگا اٹھا چندن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ بولا۔

"شنا تم نے، آج تمہارے چندن کو راستے میں اُلجھی ہوئی اپنی زندگی کو منزل تک پہنچانے کی فرصت مل گئی ہے۔"

ریکھا چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی جیسے اُسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کالی کالی گھٹاؤں میں بھی آفتاب چمک سکتا ہے مسکرا کر کہتا ہوں سے تبھی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ساون کا سورج گھٹاؤں میں چھپ جائے اور راستے پر چلنے والے مسافر کا ہاتھ چھوڑ کر اُسے وہیں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے۔"

"راستہ دکھانے والے کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اندھیرے میں بھی مسافر کو راہ دکھا سکے بشرطیکہ مسافر خود اپنا دامن نہ کھینچ لے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ آج دنیا کے حالات سمجھنے کی فرصت تمہیں کہاں سے ملی؟"

ریکھا نے لور انشیلو نیلا خط چندن کے ہاتھ میں تھما دیا شیل نے لکھا تھا۔

"بہن! عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرے شوہر نے دو ہزار روپے لگا کر ریشم کے کپڑے کی گٹھری اور لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی دکان حیدرآباد میں جو دکان پانچ ہزار میں بیچ آئے تھے اس کی یاد آتے ہی منہ کو کلیجہ آتا ہے سیٹھ دو مہینے کام چلا مگر اس سے آٹھ بچوں کی پرورش کہاں سے ہوتی! میں نے اپنے زیور گروی رکھ کر کچھ اِدھر اُدھر کر کے دو ہزار روپے اکٹھے کر کے دیئے تاکہ وہ دکان کے لئے ضروری مال سکیں۔ تین روز کے بعد جا کر دیکھا، بکس کا تالا ٹوٹا ہوا ہے دونوں کواڑ کھلے ہوئے ہیں اور سارا سامان غائب!"

"میں کیا بتاؤں بہن، وہ کپڑے کا ٹھیلہ چلانے لگے۔ جو حیدرآباد میں ہزاروں روپے مٹھی میں مال کا آرڈر دیتے تھے وہ ٹھیلا کیا چلا سکتا! ٹھیلہ چلانے سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں تیر

کی کڑی دھوپ میں بھٹکتے بھٹکتے اُن کی گوری جلد سیاہ پڑ گئی ہے۔

چار پانچ دن ہوئے رات میں ان کے ٹھیلے ماند سے جسم کو دبا رہی تھی تو وہ بولے۔

"آج کندھوں میں بہت درد ہے"

میں نے کہا "شاید ٹھیلہ چلانے سے ہوا ہو"

وہ بولے "نیکی، ٹھیلہ کہاں سے آیا مجھے کچھ کپڑے کی گٹھڑی بنا کر پھیری کرتا ہوں!"

یہ سُن کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہ پھر بولے۔

"ابھی کیا ہوا ہے وہ ایسا بُرا وقت آ گیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اِدھر اُدھر مارے پھر رہے ہیں۔ ہم جیسے ان پڑھوں کے لئے تو بوجھ ڈھونے کا کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ وہ بھی جب میاں بیوی دونوں مل کر کمائیں گے۔ تب جا کر گزارہ ہو گا۔ نہیں تو تم نے جو یہ چھوٹے چھوٹے لال رکھے ہیں سب بھوکوں مر جائیں گے۔"

"بہن کیا بتاؤں نہ جانے اُن کی طبیعت میں اتنا چڑچڑاپن کہاں سے آ گیا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھی کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اسکے دل ڈانٹ میں نے تمہیں اپنے دُکھوں کی کہانی نہیں سُنائی مگر آج صبر اپنی حد سے پار کر گیا ہے۔ زور زور کر دل پھٹا جا رہا ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا کبھی میرے دل پر کلیوں کی طرح کھلے پھیلے ہوئے گلوں کی خاک چھانتے پھریں گے اور ہم میاں بیوی اندھے بیلوں کی طرح بیل بن کام کریں گے۔ بچوں کے پاس جوتے نہیں کپڑے نہیں وہ پڑھنے نہیں جا سکتے دن بدن حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ چار دن سے اناج کے ڈبے خالی پڑے ہیں۔ میری دو دیورانیوں کی حالت ہم سے بھی بدتر ہے۔ بتاؤں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔

تمہاری دُکھیاری بہن
شیل۔

چندن کے لئے ایسی داستانیں سُننا کوئی نئی بات نہیں تھی وہ ٹھگا گیا۔

"تب تمہیں شیل دیدی نے ہی دنیا کی یاد دلائی ہے؟"

ریکھا اُٹھ کھڑی ہوئی "بس، بس مجھے اور کچھ نہیں سُننا!"

چندن کچھ دیر کے لئے گمبھیر ہو گیا۔ پھر مسکرا کر بولا "اچھا!"

ریکھا دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چندن کتابوں کی الماری کی

طرف بڑھ گیا۔ ساری رات زبردست طوفان جاری رہا۔ وہ وہ کر بارش کی زوردار لہر آتی تھی اور پھر ایک سناٹا چھا جاتا تھا دیواروں سے ٹپکتی ہوئی بارش کی بوندیں پانی کے گڑھوں میں گر رہی تھیں تمام رات ریکھا سسکتی رہی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی تو وہ انوکھے انوکھے خواب دیکھنے لگ جاتی۔ کبھی وہ بڑے بڑے پہاڑ دیکھتی تو کبھی آگ کی چنگاریاں کبھی دیکھتی کہ بارش کی بوندوں کو طوفان تیز رفتار میں اُڑائے جا رہا ہے پھر جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلتی کھڑکیوں کی آواز سے اُس کا دل کانپ اُٹھتا تھا۔ اس کا دل بار بار اُس سے پوچھتا جو باتیں چندن سمجھ سکتا ہے، ہیرا سمجھ سکتا ہے اور گلیوں میں پھیری کرنے والا شیل کا بچہ سمجھ سکتا ہے وہ میری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟ آنکھ کھلتے ہی شیلوتی کو کہتے سنتی۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں... چار دن سے اناج کے ڈبے خالی پڑے ہیں...

صبح کو جب اُس کی آنکھ کھلی تو سامنے کوٹ کی ٹوٹی ہوئی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

آج وہ روزانہ کے کاموں سے فارغ ہو کر چندن کی کتابوں کو دیکھنے لگی۔ اتنے دن وہ جن کتابوں کو کوڑا سمجھتی رہی تھی آج ان کو بڑے چاؤ سے پڑھنے لگی۔

چندن نہا دھو کر کمرے میں آیا۔ اُس کے بالوں میں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں انکو پونچھتے ہوئے بولا "کتابوں کی پوجا ہو رہی ہے یا اُن کا مطالعہ؟"

ریکھا ہاتھ والی کتاب الماری میں رکھ کر اپنے آنچل سے الماری کی دھول اُڑاتی ہوئی چلی گئی۔ چندن اس کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنے بالوں کو پونچھنے لگا۔ باہر جانے سے پہلے وہ ریکھا سے بولا "آج چار بجے میرے دوست آئیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے، مگر ہوں گے کتنے؟ اُن کے لئے..."

ریکھا کے باپ بھی کبھی کبھی ایسا ہی کہتے تھے تو ریکھا کی ماں گھر میں سارا دن مصروف رہتی تھی۔ ریکھا دیکھتی تھی کہ محفل میں کس طرح گوشت کباب، برفی، سوڈا اور سگریٹوں کا دور چلتا تھا۔

چندن بولا "زیادہ دکھاوا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بارہ چودہ کپ چائے بنا دو گی تو بس کام چل جائیگا۔"

"میں ان کی خاطر تواضع بہت اچھی طرح کرونگی آپ بے فکر رہیں۔ مہمان روز روز تھوڑے ہی آتے ہیں۔"

"میں نے کہا نہیں کہ خواہ مخواہ کے دکھاوے کی بالکل ضرورت نہیں۔ تم عورتیں کبھی اپنے اصل حالات کے مطابق چل ہی نہیں سکتیں۔"

ریکھا چڑ گئی۔

اتنے میں گوپ سکول کی کتابیں اُٹھائے منہ پھلا کر اس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ بھابی اور بھائی کی طرف دیکھتا ہوا بولا "مجھے چار کاپیاں چاہئیں۔ میں نے پتنگیں بنا کر بیچیں تو دو کاپیوں کے دام نکل آئے باقی دو کاپیوں کے لئے پیسے چاہئیں۔"

ریکھا نے اُسے پیسے دے تو دئے مگر گھر کے خرچ کے لئے بقیہ پیسے دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالنا ہی ہوگا ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اس گھر کا بربادی کے گڑھے میں گرنا یقینی ہو جائے گا۔"

(11)

دوسرے دن سکول میں تیرے کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ بے چین ہو ہو اُٹھتا۔ رہ رہ کر ریکھا کی مایوس نگاہیں اُس سے پوچھ رہی تھیں، دُنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک دو کو چھوڑ کر سبھی رشتے دار کیوں گرتے جا رہے ہیں؟"

چھٹی کی گھنٹی بجنے پر وہ گھر نہ جا کر ریکھا کے پاس پہنچا۔ بولا "کہاں چلی تھی بھابی؟"

"شیلوتی کی۔ مگر صرف شیل وتی ہی تو نہیں ہے میں تو دیکھ رہی ہوں۔ کئی کماتے پیتے گھر بھی چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس دن میری پھوپھی کی دیورانی آئی تھی۔ جبل پور سے لوٹ رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہاں بھی لوگوں کا ایسا ہی بُرا حال ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں کے لڑکے بوجھ ڈھو رہے ہیں تو کچھ کے مٹھائیاں بیچ رہے ہیں اور کوئی گلی گلی بیٹھ گئے ہیں۔ کم و بیش بمبئی کے حالات بھی یہی ہیں۔ یہاں بھی اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں پاپڑ اور بڑیاں بیچ رہی ہیں۔ پہلے درجے کے لڑکے فٹ پاتھ پر اور مٹھائیاں بیچتے پھرتے ہیں۔"

"تو ریکھا بھابی میرا اچھی طرح آرام کر سکی؟" بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس زمانے میں پیسہ ہی پیسے کو پیدا کرتا ہے۔ امیروں کی دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور غریبوں کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں وہ اپنی محنت بیچ کر روکھی سوکھی کھا رہے ہیں۔ سب سے بڑا سوال

متوسط طبقے کا ہے جن کی رہی سہی پونجی بھی ختم ہوتی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ طبقہ بھی آخر نچلے طبقے میں مل جائے گا۔"

ریکھا نے فکر سے پوچھا "تو اس کا مطلب ہے میرے بہنوئی ٹھیک کہتے ہیں کہ انہیں مل میں ہی کام کرنا پڑے گا۔"

"ہاں کیونکہ محنت اور مزدوری ہی نچلے طبقے کو زندہ رکھتی ہے ورنہ وہ کہیں کے نہ رہیں۔"

ریکھا نے جلدی سے سانس لیتے ہوئے کہا "بس بس، اور زیادہ کڑوی باتیں مت کرو۔"

ہیرا اُسے یہی ہوتی دیکھ کر چپ ہو گیا اور دل ہی دل میں بولا بیچاری لاڈ پیار سے پلی ہوئی کو دل ڈالی! پھر ریکھا سے مخاطب ہو کر بولا "جس حقیقت نے انسان کی زندگی کو زہر بنا کر دیا ہے اس کو سننے میں بھی تم گھبرا رہی ہو؟"

ریکھا آنسوؤں سے تر آنکھوں سے ہیرے کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ ہیرے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"صرف ہم سندھی ہی نہیں، مراٹھوں، بنگالیوں اور گجراتیوں سبھی کی یہی حالت ہے۔ جن کے پاس پونجی ہے اور پیداوار کے ذرائع یعنی کھیت کارخانے خریدنے کی طاقت ہے ان کی دولت دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے اور جن کے پاس اتنی دولت نہیں وہ چاہے کتنی بھی کوشش کریں، کتنا ہی امیروں جیسا دکھاوا کریں مگر بڑھتی ہوئی بیکاری اور مہنگائی سے ان کی اقتصادی حالت ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"پیداوار کے طریقے ہی ایسے ہیں۔ جو چیز کارخانے میں انسان کی اجتماعی محنت سے پیدا ہوتی ہے اس کی بکری ہونے پر حاصل شدہ نفع سب میں ٹھیک ڈھنگ سے تقسیم ہونے کی بجائے ایک دو یا کچھ ہی اشخاص کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح محنت کشوں کو تھوڑی سے تھوڑی اُجرت دیکر اُن سے زیادہ کام لیا جائے اور پیدا شدہ اشیاء مہنگی بیچی جائیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ لوگ بیکار رہ کے اور ننگے رہتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ امریکہ کے دولتمند ہر سال اناج کی کافی مقدار عوام میں تقسیم کرنے کی بجائے سمندر میں ڈبو دیا جاتا

دنیا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ جنگ کا بھوت دکھا کر دنیا میں ملامت کا ماحول پیدا کر رہے ہیں اور اس بہانے سے اشیائے صرف کی جگہ جنگی ہتھیار اور اسلحہ جات بنا رہے ہیں۔"

ریکھا مایوس ہو گئی۔ وہ بولی "ایسی سازشوں کا کبھی خاتمہ بھی ہوگا یا ایک دن یہ دنیا جہنم کے گڑھے میں جا گرے گی؟"

ہیرے نے کہا "انسان کی روح مردہ نہیں ہے۔ وہ تھوڑے وقت کے لئے مظالم برداشت کر سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں رہے گا۔ بھوک وہ آگ ہے جو انسان کو کبھی خاموش نہیں رہنے دیتی۔ آج فضا اور بالآخر محنت کش طبقہ جاگ اُٹھا ہے اور وہ ایک ایسی آگ جلا رہا ہے جس کے شعلوں میں یہ گلا سڑا نظام جل بھُن کر بھسم ہو جائے گا۔"

ریکھا کو ہیرے کی باتوں میں ایک روشن دنیا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ ہیرا اب کافی دیر ہو چکی ہے کہہ کر چلا گیا۔

شام کے چار بجے کا وقت تھا۔ چندن کے سارے دوست ٹھیک وقت پر آ پہنچے۔ ریکھا نے سوچا وقت کے اتنے پابند شاید سبھی اکٹھے رہتے ہوں۔ مگر لباس سے کوئی مرہٹہ لگ رہا تھا تو کوئی گجراتی اور کوئی مدراسی۔ وہ بہتیرا سوچنے کے بعد بھی سمجھ نہ سکی کہ آخر ایسی کونسی بات ہے جو ان مختلف فرقوں کے لوگوں کو ایک جگہ پر منظم کرتی ہے؟

ریکھا جب چائے کی پیالیاں لیکر کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے ایک کو کہتے سُنا "سولہ ہزار کلرکوں کے سبھی یونٹ کل ہڑتال میں حصہ لیں گے چونکہ ہم سب اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں اس لئے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد ہی ہمیں منظم کرتی ہے۔"

دوسری بار جب وہ اندر گئی تو کوئی کہہ رہا تھا "پچھلے سال مل کو اتنا فائدہ ہوا پھر بھی ہمیں بونس نہیں ملا۔ سارا منافع شیئر ہولڈرز میں بٹ گیا۔ مل کے ڈائرکٹر، منیجر اور افسر تو بڑی بڑی تنخواہیں لیکر چین کی بنسری بجاتے ہیں مگر ہمیں پیٹ بھرنے تک کو مناسب تنخواہ نہیں ملتی، ہمیں ہڑتال کرنی چاہئیے۔"

تیسری بار کوئی کہہ رہا تھا "ہمارے لئے ہڑتال کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ ہڑتال کے بغیر مالک ہماری مانگیں کبھی قبول نہیں کریں گے۔ ہڑتال ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں کیونکہ ہڑتال کی حالت میں اُن کا منافع رُک جاتا ہے۔ ہم محنت کشوں کی

حالت میں ہی کونسی اچھی ہے جو بعد میں خراب ہو جائے گی؟“
ریکھا جب باہر نکلی تو اس کے دل میں سوال اُٹھا۔ وہ شوہر اور بہادر یہی لوگ تو ہیں جو اس نظام کو ختم کریں گے۔

(۱۴)

ساون کی بارش اپنے پورے عروج پر تھی۔
ریکھا گاڑی سے اترنے کے بعد لوکل سٹیشن کے شیڈ میں کھڑی ہو کر دھرتی کی طرف اور اوپر آکاش کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بارش کی بوندیں ہیروں کی شکل میں زمین پر گر کر اپنا وجود کھو رہی تھیں۔ کچھ بوندیں پانی کے بلبلے بنا رہی تھیں جو فوراً ہی پانی میں مل جاتے تھے۔

بارش کی تیزی کے ساتھ ریکھا اپنے چھوٹے سے گھر اور دنیا کے اہم حقیقت کے متعلق جس میں اُس کے کئی پسندیدہ گھر شامل تھے، سوچ رہی تھی۔ ریکھا کو ایک چھتری کی ضرورت تھی جس سے وہ بارش سے اپنا بچاؤ کر سکتی، مگر تک پہنچ سکے۔ اس کے گھر کو ریکھا کی ملازمت کی ضرورت تھی۔ ایسے ہزاروں گھروں کی بیشمار ضروریات تھیں۔ ریکھا کو محسوس ہوا اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے انسان اپنی ضروریات زندگی پوری نہ کر پانے کی وجہ سے بارش کی بوندوں کی ان لہروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر بارش تھم گئی اور ریکھا نے گھر کی راہ لی۔ اس کے پاؤں ایڑی تک پانی میں چل رہے تھے مگر وہ اپنے خیالات میں کھوئی تھی۔ آج اُس کے دل میں بڑی وسعت آ گئی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنے پر تعجب ہوا کہ کس طرح وہ آج ایک افسر کو کھری کھری سنا کر اپنی نوکری کو ٹھکرا کر چلی آئی؟ اس بات کا اسے کوئی رنج نہیں تھا کہ اسے ملازمت نہیں ملی۔

اُس کا دل تھوڑی سی ٹھوکر سے بہتے ہوئے تنکے کی مانند لگ رہا تھا جو کنارہ چھوڑ کر تیزی کے سمندر میں بہا جا رہا تھا۔

رات کو چندن کے لئے کھانا پکاتے وقت بولی ”آج میں نوکری تلاش کرنے گئی تھی۔“
”تم؟“
”ہاں میں۔“
”پھر کیا ہوا؟“
”میرے سامنے ایک افسر انگریزی میں ایک مرتبہ لکھ رہا تھا۔“

سندھیوں کے آنے سے یہاں کے مقامی باشندوں میں بیکاری اور بڑھ گئی ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ انہیں پاکستان چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب کہتے ہیں ہم پاکستان میں اچھے تھے۔ ویسے تھے۔ ہماری وہاں اتنی دوکانیں تھیں، اتنی زمین تھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان ہی شرنارتھیوں کو یہاں رہنے دیکر مقامی باشندوں کو بیکار کر دینے سے سرکار کو کیا ملا ہے؟“
چندن کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ اس کی بات کو غور سے سُن رہا تھا۔

ریکھا بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔
”میں سمجھ گئی کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔ ابھی میں نے یہی کہا تھا کہ شہیدوں کے خون سے ہندوستان کی تاریخ کے ورق رنگے ہوئے ہیں۔ ہم اگر اپنی دھرتی چھوڑ کر وہاں بیٹھے رہتے تو ہم بھی اپنی جان بچا کر یہاں نہ آ سکتے۔ میرا کہنا ہے کہ اگر آپ بھی ہماری جگہ ہوتے تو شرنارتھیوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور یہاں ہندوستان کی بیروزگاری کے اسباب ہم سندھی ہرگز نہیں ہیں۔“
اتنا کہہ کر چندن کا فیصلہ سننے کے لئے ریکھا خاموش ہو گئی۔
چندن اطمینان سے کھانا کھا رہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد آنگن میں رکھی ہوئی گھاس پر منہ صاف کرتے ہوئے بولا ”پھر کیا کہا افسر نے؟“
”بولا لڑکی! تم یہاں نوکری تلاش کرنے آئی ہو یا لیکچر دینے۔“
چندن پھر چپ ہو گیا۔
ریکھا چپ نہ رہ سکی۔ ”مگر یہاں کے لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟
ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ ہم سندھیوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“
چندن نے جواب دیا ”ان کا کہنا ہے کہ شرنارتھیوں کے آنے سے بیوپار میں، نوکریوں میں اور مارکیٹ میں بلکہ یہاں بھی انہوں نے ہاتھ ڈالا ہے۔ مقامی لوگوں کی مشکلات میں کمی واقع ہوئی ہے۔“
”مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہماری بھی تو یہی مٹی ہے؟“
”ریکھا، ہمارا اور حاکم کی ذاتی مفادات پر بنا ہوا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ کسی کی روٹی چھن جائے چاہے کوئی گر جائے

ہر ایک اپنا کندھا لگا کر آگے کو نکل جانے کی کوشش کرے گا۔ خود غرضی نے یہاں انسانیت اور بھائی چارے کے جذبے پر پردہ ڈال رکھا ہے ہم تو دور سے آئے ہیں مگر یہاں کے رہنے والے بھی آپس میں لڑتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ ایک طرف ہزاروں گجراتی سیٹھ اور کنٹر وغیرہ عمارتوں میں رہتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف انہیں کے بھائی فٹ پاتھ پر رات کاٹ رہے ہیں ان کی زندگی فٹ پاتھوں سے بھی گئی گذری ہے اس طرح تم دیکھو گی کہ حقیقی طور پر یہ جھگڑا امیروں اور غریبوں کے درمیان ہے۔ لہٰذا ہم سندھیوں کو یہاں کے غریب لوگوں سے مل کر امیروں سے ٹکر لینی ہوگی۔ جب تک ایسا انتظام نہیں ہوتا کہ سرکار ہر ایک شہری کے اناج کپڑے اور مکان دینے کی ضمانت دے تب تک یہ حالات اور نفرت کی یہ دیواریں قائم رہیں گی۔"

چھنتن نے دیکھا۔ رنگیلا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے شاید اُس کا دھیان اس طرف نہ ہو۔ یہ خیال کر کے وہ بات بدلنے کے لئے بولا "اندھیری میں ایک سندھی نے بنیان اور سویٹر بنانے کی فیکٹری کھولی ہے۔ چھبیس تاریخ تک درخواستیں طلب کی ہیں۔ تم بھی ایک بھیج دو نہ؟"

رنگیلا پگلی سی ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ کا کور تھالی میں رکھ دیا "میں نے کیا بنیان اور سویٹر بنانے کے لئے ہی میٹرک پاس کیا تھا؟ یہ کیسی زندگی ہے؟

میں کام کرنا چاہتی ہوں تو کوئی اچھا کام بھی نہیں ملتا۔ میں فیکٹری میں جا کر کیسے بنیان اور سویٹر بناؤں گی؟"

گوپ بستر بچھاتے ہوئے کہنے لگا "بھابھی، اگر کل بھی آج جیسی بارش ہوئی تو میں سکول نہیں جا سکوں گا۔ پہلے ہی تو چھت ٹپکتی تھی اُس پر آج کے طوفان نے تو اس کا کچھ حصہ ہی نکال دیا ہے اور میرے پاس سکول جانے کے لئے قمیص بھی نہیں ہے۔"

رنگیلا کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ ایک نادان سی بچی ہے جسے ماں نے کان پکڑ کر راہ راست پر کر دیا ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر ڈالا کہ وہ کچھ بھی نوکری کرے گی مگر گوپ کو ضرور پڑھائے گی۔

چھبیس تاریخ میں ابھی دس دن باقی تھے۔ اسی دن رنگیلا بیکار ٹہلتی۔ نوکری کے لئے دفتروں کی خاک چھانتی رہی۔ مگر کہیں نوکری ہو تو رنگیلا کو ملے۔ ملازمت کی جگہ ہر دفتر سے بیکاروں کے جھنڈ کے جھنڈ دکھائی دیتے۔ رنگیلا دل میں ان مجبور انسانوں کے لئے ہمدردی رکھتے ہوئے وہ سوچتی کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیکار پھر رہے ہیں اگر ان کی قوت کا بھی استعمال کیا جاتا تو ملک کتنا ترقی کر جاتا؟ گاڑی جب تیز رفتار سے چلتی تھی تو دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گھر اور پھوس کی جھونپڑیاں دیکھ کر اُس کی روح پوچھ اُٹھتی کیا۔ ان سب کو میرین ڈرائیو اور چرچ گیٹ کے رہائشی علاقوں میں بسایا نہیں جا سکتا؟

مہالکشمی کے پاس چھوٹے چھوٹے مکان بارش کے پانی کے نیچے ڈوب گئے تھے۔ اخبارات میں اُن کی تصویریں دیکھ کر رنگیلا ایک دن وہاں اُتر پڑی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر رنگیلا کے ہوش اُڑ گئے۔ پیڑوں کے نیچے دھوپ میں کھلے کھلے انسانوں کے خاندان اپنی ٹوٹتی ہوئی جھونپڑیوں کو ٹکٹکی باندھی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کھانا پکا رہے تھے۔ رنگیلا کی رگ رگ کانپ اُٹھی۔ اُس نے سوچا اگر اس ملک پر حکومت کرنے والے خود بھگوان بھی ہوتے تو وہ بھی مجرم سمجھے جاتے۔ مگر اس سرکار کے خلاف لوگ بغاوت تک نہیں کرتے اندھوں اور بہروں کی طرح ہم یہ بد انتظامی اور مظالم چپ چاپ دیکھتے اور برداشت کرتے رہتے ہیں۔

وہ رات کو چھنتن سے کہنے لگی "آج جو کچھ دیکھ کر آئی ہوں اُس نے میرے دل کو سخت چوٹ پہنچائی ہے۔ جب انسان تڑپ تڑپ کر اپنے آشیانوں کو ڈھہتے ہوئے دیکھتے ہیں تب ان امیروں اور منتریوں کی آنکھ اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر کے کہاں چھپنے چلی جاتی ہے کیا؟"

"اور جس کی انسانیت جاگ اُٹھتی ہے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے کو برباد کر لیتا ہے پھر اُسے اس کا خیال ہی نہیں رہتا کہ اُسے دوسروں کی زندگی سے کیا لینا دینا، ہر ایک اپنے اعمال کا پھل بھوگے۔"

یہ سوچ کر کہ آخری الفاظ ایک دن اُسی نے چھنتن سے کہے تھے وہ شرما گئی۔

چھنتن رنگیلا کے جذباتی چہرے کی طرف دیکھ کر شفقت سے بولا۔

ابھی کیا دیکھا ہے ہمارے محنت کشوں کی زندگی کو قریب سے دیکھو گی تو تمہیں رونا آجائے گا۔

دوسرے دن ہیرا آیا تو ریکھا اُس سے بھی یہی باتیں کرنے لگی۔

"ہیرا! غریبی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سائنس نے جو اتنی ترقی کی ہے۔ وہ کیا صرف امیروں کے لئے جن کے پاس عیش و آرام کے سب ذرائع موجود ہیں۔ غریبوں کے لئے نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا۔ پہلے کی جھونپڑیاں بھی گندی گلیوں میں پہلے میں اُن کی عادتوں کو بُرا بھلا کہتی تھی مگر اب دیکھتی ہوں کہ یہ عادتیں بھی حالات کی پیداوار ہیں۔"

چندن بولا "ہیرا اب تمہاری بھابی آہستہ آہستہ سچائی کو پرکھنے اور سمجھنے لگ گئی ہے۔"

"مگر جیسے جیسے سچائی کھل کر میرے سامنے آتی جاتی ہے میں اور بھی اُداس ہوتی جاتی ہوں۔ زندگی کی ندی کو پہاڑوں کے آنچل سے نکل نکل کر آتے بہتے زمین کو سرسبز اور شاداب بناتے ہوئے سمندر میں جا کر ملنے کی بجائے اُسے چھوٹی چھوٹی نالیوں اور گھٹ میں سمٹتے دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔"

"ریکھا، سچائی کے راستے پر چلنے والا ہر ایک مسافر پہلے دُکھ کی آگ میں جلتا ہے لیکن اُسے چین تبھی نصیب ہوتا ہے جب وہ زندگی کے دریا کو میدانوں کی طرف موڑنے کے لئے خود کام کرنے لگتا ہے"

ریکھا نے ان الفاظ میں اتنی سچائی دیکھی کہ بہت دیر تک چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ چندن کے یہ الفاظ صرف الفاظ نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے ایک اٹل سچائی چھپی ہوئی تھی ریکھا نے اُسے کبھی ایک منٹ بھی بیکار ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ریکھا نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم کہ زندگی کی جن گھڑیوں کو میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے حاصل کرنے کے ارادے کر رہی تھی ان کا استعمال سماج کی بھلائی اور عوام کے شکھ کے لئے ہو رہا ہے۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی چارپائی کے پاس اُس پر جھکا ہوا ہے اُس کی گرم سانس اُس کے چہرے کو چھو رہی ہے وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔ بتی جلائی تو دیکھا چندن اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا وہ اُس کے قریب

گئی اور پھر تھکی تھکی سی لیٹ گئی۔

وہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ چاہے کتنا بھی چھپائے مگر اُس کا چہرہ پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔۔۔۔ اب وہ یقیناً اُسے بہت چاہنے لگے ہیں۔ پھر یکایک اُسے خیال آیا۔ ابھی دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہے جس کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے، یہ کیسے ہوگا! یہ کیسے ہوگا؟

(۱۳)

چندن جس مِل میں کام کرتا تھا اُس میں ہڑتال شروع ہوئی تھی اور ہڑتال کو پورے سولہ دن ہو گئے تھے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی ہڑتال اکیس تاریخ کو شروع ہوئی تھی مہینے کے سات دن اور بیت گئے مگر تنخواہ نہیں ملی۔ بازار سے دودھ اور دہی وغیرہ منگوانا بند ہو گیا۔ اب اناج گھی اور تیل سلیٹ کی بھی تنگی ہونے لگی۔

ریکھا نے جھنجھلا کر شوہر سے کہا "اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟"

چندن نے تیوری چڑھا کر کہا "تکلیف؟ تکلیف کا تو تمہیں ابھی علم ہی نہیں۔ تکلیفیں تو حقیقی معنوں میں ہمارے مِل کے مزدور اُٹھا رہے ہیں ہم کلرکوں کو تو صرف تکلیف کی ہوا سی لگی ہے آج ہمارا جلسہ ہونے والا ہے چل کر دیکھو تاکہ مزدوروں کی بستی کی کیا حالت ہے؟"

ریکھا شام کو وہاں گئی۔ بستی کو دیکھ کر وہ سُن ہو گئی۔ مرجھائے چہروں والی عورتیں، کمر خمیدہ، مرد، کالے کلوٹے اور ننگے ادھ ننگے بچے، اُداس اور مایوس چہرے، گندے میلے اور بکھرے ہوئے ڈھانچے۔ یہ سب دیکھ کر ریکھا کا دل کانپ اُٹھا۔

بستی کی جھگیوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور اس کے پیچھے میدان۔ وہاں بہت سارا مرد اور عورتیں جمع ہو گئے تھے۔ شروع میں ایک لڑکی نے گیت گایا پھر کئی لوگوں نے تقریریں کیں۔

ریکھا جلسے سے لوٹی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان پر چھائی ہوئی کالی گھنگھور گھٹائیں بھی غائب ہو گئی ہوں۔ دل کی صاف اور دل کی روشنی کو پا کر گلیاں اور کھڑکیاں۔۔۔۔ سبھی روشن ہو اُٹھی ہوں۔

ایک تپتی ادھیڑ عورت نے کہا تھا۔ "ہم یہ تکالیف صبر سے برداشت کرنا چاہتی ہیں چونکہ ہم سب سچائی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

شاعری

رموز کنایات	فراق گورکھپوری	۳/۸
مشعل	〃	۲/۱۲
جوئے شیر	آنند نرائن ملا	۵/-
محراب غزل	روش صدیقی	۳/-
کارواں	〃	۱/۱۲
بادۂ محمود	محمود دہلوی	۳/-
دونیم	ڈاکٹر مسعود حسین	۳/۴
مثنوی زہر عشق	شوق	-/۸/-
[illegible] کا شعری ادب		۱/۴
انتخاب کلام ظفر	شاہد علی خاں	۲/۴
انتخاب فانی	〃	۲/۴
آتش و نم	نشور واحدی	۲/۸
نوبہاراں	اثر لکھنوی	۲/۴
گلبانگ حرم	صدیقی	۳/-
آتش گل	جگر مراد آبادی	۲/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۲/۸
پرچھائیاں	〃	۱/۴
ساز و صدف	عدم	۲/۴
قول و قرار	〃	۲/۸
گلنار	〃	۲/۴
گردش جام	〃	۲/۴
بطلے	〃	۲/۴
گجر	قتیل شفائی	۳/-
روزن	〃	۳/-
جلترنگ	〃	۲/۴
شعلۂ حرف	کیف	۱/-
گلہائے پریشاں	انتخاب الیاس احمد	۱/۸
اعجاز نوح	نوح ناروی	۵/-
سحاب	حسن شمیم	۳/-
نقش حکمت	آتق پھپھندوی	۳/-
آہنگ سرمدی	〃	۳/-
خرابات	عدم	۴/-
رم آہو	〃	۴/-
جھومر	قتیل شفائی	۳/-
سوز و گداز	سوز رامپوری	۲/۴

ناول :-

چوگان ہستی مکمل	منشی پریم چند	۱۱/-
گوشۂ عافیت حصہ اول و دوم	〃	۴/-
گئودان	〃	۶/-
میدان عمل	〃	۵/-
بازار حسن	〃	۲/۸
غبن	〃	۵/-
پردۂ مجاز	〃	۴/-
نرملا	〃	۲/۸
بیوہ	〃	۲/-
روٹھی رانی	〃	۱/۸
جلوۂ ایثار	〃	۳/-
طوفان	ٹیگور	۳/-
جیون پربھات	〃	۳/-
چندر ناتھ	سرت چندر چٹرجی	۱/۸
گھر کی آگ	〃	۲/-
حسرت	〃	۲/-
سماج کا ڈر	〃	۲/۴
رادھا رانی	بنکم چٹرجی	۱/-
چندر شیکھر	〃	۳/-
راج سنگھ	〃	۲/-
زہر کا پودا	〃	۳/-
جب کھیت جاگے	کرشن چندر	۲/۱۵
الٹا درخت	〃	۲/۱۲
دل کی وادیاں سو گئیں	〃	۳/-
گدھے کی سرگذشت	〃	۳/۱۵/۳
آسمان روشن ہے	〃	۲/۱۲/۳
باون پتے	〃	۶/-
ایرانی	فاطمہ سہیل	۳/-
ثریا	〃	۳/-
نگار	〃	۳/-
آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	۲/۱۲
وعدہ	〃	۴/۸
شبانہ	نسیم انہونوی	۵/-
تمنا	〃	۴/-
نجم السحر	〃	۵/-
مہ پارہ	〃	۴/-
نشاط	〃	۴/-
شگفتہ	〃	۳/-
شبنم	〃	۲/-
بانو	〃	۶/۸
شوہر کا روگ	〃	۱/۴
کہکشاں	〃	۶/-
سراب زندگی	〃	۴/-
طرز زندگی	〃	۲/-
نئی زندگی	خان محبوب طرزی	۲/۸
انجمن	〃	۳/-
گلنار	〃	۲/۴
شعلہ	〃	۵/-
رسی جل گئی	〃	۳/-
لیلیٰ کی کتیا	〃	۲/--

ہوگیا؟

اِس سے تو ملک کا کافی نقصان ہوگا۔ مزدوروں کو صرف اپنی تنخواہ بڑھنے کی لگی ہوئی ہے۔ انہیں اپنے ملک کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیئے۔"

ریکھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"دیدی، اب تو تم بڑی دیش بھگت بن گئی ہو مگر ذرا اس بات کا جواب تو دو کہ کیا صرف مزدوروں نے ہی حب الوطنی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ کیا سرکار اور سرمایہ دار جاہل اور عقل کے دیوالئے ہیں۔ جو انہیں دیش کی آمدنی کا خیال نہیں رہتا اتنے دنوں بند رہنے کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اُس کو برداشت کرنے کے لئے وہ تیار ہیں مگر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کو پیٹ بھرنے تک کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتے؟"

رادھا لاجواب ہوگئی مگر یوں ہار ماننے کے لئے وہ تیار نہ تھی۔ بولی "ریکھا! جس آدمی کو خدا جس طبقے میں پیدا کرتا ہے اُسے اُس میں ہی صبر کر کے رہنا چاہیئے۔"

ایسی باتوں کے سلسلے میں پہلے ریکھا چپ ہو جاتی تھی مگر اب اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اُس کا شعور اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہر انسان کی اُمیدیں اور خواہشات اس کے جسم کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔ بولی۔

"دیدی ہم کتنے گر گئے ہیں! دوسروں میں اور اپنے میں کتنا فرق سمجھتے ہیں؟

کیا غریبوں اور مزدوروں میں ہماری جیسی جان نہیں ہے ہمیں خدا کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی جبکہ ہم ایک دوسرے کو بھائی بھائی بھی نہیں سمجھتے۔ ہم مزدوروں کے دکھوں کو جانوروں کی مانند دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے نام پر کلنک نہیں؟ کہتے کہتے ریکھا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

رادھا نے کہا "بہو، تمہاری ایسی باتوں نے تو موہ لیا ہے۔ چاہتی ہوں جو وقت مندر میں جا کر کاٹتی ہوں وہ تمہارے پاس بیٹھ کر گذارا کروں۔"

چندن نے یہ ساری باتیں سُن لی تھیں۔ دل ہی دل میں بولا "جب پھول میں خوبصورتی اور خوشبو دونوں آجاتی ہیں تو وہ کتنا پیارا لگتا ہے!" اور وہ لمبی سانس لیکر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیرا، رادھا اور ریکھا کو وہیں چھوڑ کر چندن کے پاس جا پہنچا۔ "کیوں جی! آج آسمان میں اتنی دلچسپی کیسی؟ خیر تو ہے؟"

چندن ...... بازو سے پکڑ کر اس کو اندر لے گیا کافی دیر تک دونوں باتوں میں مشغول رہے۔ ریکھا وہاں آئی تو بولی۔

"ہم نے پڑوس میں گیت سکھانے کی ایک کلاس شروع کی ہے میرا خیال ہے وہاں وہی گیت سکھلائے جائیں جن میں نئے خیالات اور نئی اُمنگیں ہوں جو عام گیتوں کی طرح سُلا نہ دیں بلکہ بیداری کے جذبات پیدا کریں۔"

چندن نے جواب دیا "تمہارے جیسے ہی باہمت اور مشتاق لوگوں کی ایک سوسائٹی ہے جس کا نام انڈین پیپلز تھیٹرس ایسوسی ایشن ہے۔ وہ بمبئی میں یہی کام کرتی ہے۔ اُن کے گیتوں، ڈراموں اور ناچ میں فن کے ذریعے انسانی ذات کی خدمت کرنے کا پیغام ہوتا ہے۔ کل چلو گی؟"

ہیرا سوچتا رہ گیا۔ "یہ چار دیواری سے باہر نکلی [illegible]۔"

(۱۴)

"ریکھا بہن! اٹھ کر بتی تو جلاؤ۔ ایسے اندھیرے میں ہی کیا منہ پر رکھے بیٹھی ہو؟"

ریکھا نے اٹھ کر روشنی کی اور کہا "دیدی، آج تو مجھے بتی کی روشنی بھی دھندلی معلوم ہو رہی ہے۔"

رادھا وہیں آنچل گلے میں ڈال کر سنبھال کر بیٹھ گئی۔ کیا منڈلاتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگی [illegible] آنکھیں سکھانے [illegible] وہاں

بڑھتے ہوئے جاتے وقت اس نے محسوس کیا تھا کسی کی دو آنکھیں اس کے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھ رہی ہیں۔ ان نگاہوں نے جیسے اسکو کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلا دی۔

اس نے آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں کہ کسی نے باہر سے پکارا "مسٹر چندن!"

دو تین سپاہی اندر داخل ہوئے۔ "مسٹر چندن ہنسراج ... بی مل کامگار یونین کے جائنٹ سیکرٹری، آپ کو قانون کے خلاف ہڑتال کروانے اور مزدوروں کو بھڑکانے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

پاس پڑوس کے سبھی لوگ آ جمع ہوئے۔ ریکھا کچھ گھبرائی مگر چندن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ سپاہیوں نے گھر کی تلاشی لی۔ الماری سے کتابیں نکال کر کمرے میں ڈھیر لگا دیا۔

گوپ نے بھرائی ہوئی آواز میں ریکھا سے کہا: "بھابھی، جن کتابوں کو بھیا جان کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں ان کو انھوں نے کتنی حیوانیت کے ساتھ پھینک دیا ہے۔"

رادھا سیدھے سپاہیوں کے سامنے جا کر کہنے لگی: "تم لوگ ان کو کیوں پکڑ کر لے جاتے ہو، یہ ایماندار آدمی ہیں یہ کسی کی ہرگز ہتک نہیں کر سکتے۔"

چندن نے جاتے وقت ایک ایسی پیار بھری نگاہ سے ریکھا کی طرف دیکھا تھا جسے وہ ابھی تک آنکھوں میں سمائے پتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رادھا نے سندھیا ختم کر کے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارا شوہر تو اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جیل گیا ہے کوئی چوری تھوڑی ہی کی ہے آجکل تو [illegible] ہیں وہ دو دن جیل میں رہ کر آ گئے [illegible] مالک کی طرح [illegible]"

ریکھا نے کہا: "دیدی، تم [illegible] جیل جانے کی بالکل [illegible] [illegible]"

[illegible]

اور ماں کے ساتھ آ پہنچا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ دوسروں کے لئے مرنا چھوڑ دے۔ آجکل چور ہی دنیا کے مالک بنے بیٹھے ہیں اگر ہمیں بھی سکھ سے جینا ہے تو چور ہی بننا پڑے گا۔ مگر وہ تو مجھے ہی قصوروار کہتا تھا۔ اسے اپنا خیال نہیں تو نہ سہی مگر اپنی روپ رانی کا تو کچھ خیال کرنا چاہیئے تھا۔" یہ کہہ کر گلاب رائے نے ترچھی نگاہوں سے ریکھا کی طرف دیکھا۔

ریکھا کا دل نفرت سے بھر اٹھا۔ دیوی تو اپنی چکنی ساڑھی کو ہی ٹھیک کرنے میں مصروف تھی ماں نے کہا۔

"بیچارہ جیل میں کیسے رہے گا۔" پھر دامن میں گانٹھ باندھ کر بولی "گرو مہاراج! میرے بچے کے بندھن کاٹ دو، پرساد چڑھاؤں گی! سچ کہتے ہیں ماں بچے کو تو جنم دیتی ہے مگر اس کے ساتھ کی ساتھی نہیں۔" گلاب سے بولیں: "اب کسی نہ کسی طرح میرے چندن کو آزاد کرواؤ۔"

ریکھا درمیان میں ہی بولی: "ہاں جی! وہ بہت دن تو جیل میں نہیں رہیں گے۔ دوسری ملوں نے بھی ہمدردی دکھانے کے لئے ہڑتال کر دی ہے مزدوروں کے اتحاد کے آگے مالکوں کو جھکنا ہی پڑے گا۔"

جب سب چلے گئے تو گوپ بولا "بھابھی، دکھ تو انھیں ذرا بھی نہیں ہوا سب صرف دکھاوا ہی کر رہے تھے۔"

ریکھا نے گوپ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم نہیں چاہتے کہ تمہارے پاس بھی خوبصورت کپڑے ہوں؟"

گوپ نے جواب دیا "بڑھیا کپڑے کون نہیں چاہتا مگر ایسے بھی ہزاروں لوگ ہیں جو مجھ سے بھی بُرے کپڑے پہنتے ہیں۔ تو کیا کپڑوں کے لالچ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

ریکھا کو اپنی طرف ممتا بھری نگاہ سے دیکھتے پاکر وہ پھر بولا۔ "بھابھی، تم کیا مجھے دوسری جماعت کا بچہ ہی سمجھتی ہو؟ تمہارے لئے تو سنسار میں کبھی بھی بڑا نہیں ہو پاؤں گا جو اپنے بھلے برے میں تمیز کر سکوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ بولی: "بڑے کیوں نہیں ہو گے، میری آنکھوں اور امیدوں کے چراغ تو تم ہی ہو۔" پھر خوش ہو کر اپنے کام

میں لگ گئی۔

رات کو ریکھا کتاب لیکر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی ان کے جیل جانے کے تھوڑے دن پہلے میری زندگی میں ایک عجیب دلکشی پیدا ہونے لگی تھی۔ کئی بار انھوں نے بڑی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ایک بار نگاہ ملتے ہی گویا اُس کی آنکھیں بے چین ہو کر پوچھ رہی تھیں کہ اب بھی ہم اتنے دُور دُور رہیں؟ لیکن میرا دل یکایک بول اُٹھا تھا، بس اتنی میں ہی سیر ہو گئی؟

وہ جلدی ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے اپنے سر کو اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ اگر اُس پر روئی کے ذرے بھی ہوتے تو گر پڑتے پھر کتاب پڑھنے لگی۔

رادھا نے کہا "آج تو تمھاری آنکھ بھی نہیں لگ رہی۔ شاید شوہر سے کبھی الگ نہیں رہی مگر یونہی ساری رات جاگتی رہوگی؟"

"اور دیدی، تم بھی تو میرے پاس سوؤگی تب تو تمھیں نیند نہیں آسکے گی؟" ریکھا ہنس پڑی۔

"نا۔۔ نا، میں نے تو سر تکیے پر رکھا نہیں کہ نیند آئی نہیں۔۔ ہاں تمھیں ذرا دیر سے نیند آتی ہے"۔۔۔ کہتے کہتے رادھا سو گئی۔

ریکھا نے اپنا منہ کتاب کی طرف پھیر لیا۔

(۱۵)

انگیٹھی سے لال انگاروں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چندن کھانے کے انتظار میں انگیٹھی سے ہاتھ سینک رہا تھا۔ ابھی سردیوں کا موسم شروع تو نہیں ہوا تھا مگر بارش کے آخری دنوں کے بعد پالا ہونے لگا تھا۔ چندن پورے ہفتے کے بعد جیل سے رہا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ ہڑتال کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی تھی مزدوروں کی بڑی بڑی مانگیں، مثلاً تنخواہ، بونس اور بھتے وغیرہ میں بڑھوتی قبول کر لی گئی تھی۔

ریکھا نے کھانے کی تھالی سامنے لا کر رکھی تو چندن کو جیل کی موٹی روٹیاں یاد آگئیں۔ ساتھ ہی اُس کال کوٹھڑی کی یاد بھی جاگ اُٹھی۔ اُن یادوں کے اُفق پر لمبی لمبی اُنگلیوں والی وہ تصویر بھی اُبھری تھی۔ چندن نے پوچھا تھا تم کون ہو؟ اور اُس نے آسمان کے نیلے پردے پر لکھا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی ایک عورت! رات کے وقت وہ حسینہ اپنی کرسی پر جھکائے کتابوں پر پلکیں نچا رہی تھی۔ چندن نے پوچھا، تم کون ہو؟ اُس نے رات کے سیاہ دامن پر لکھا، علم اور روشنی کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی عورت!

پربھات کی سنہری کرنیں جب جیل کی کھڑکیوں سے اندر آئیں تو چندن کی روپ رانی نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر اپنے نور بھرے نین دکھائے تھے، چندن نے پھر پوچھا، تم کون؟ اُس نے شفق کے گلابی گالوں پر لکھا، اپنی زندگی کی قندیل سے اپنی قوم میں بیداری لانے والی عورت! اور تب چندن نے اُس چندر مکھی کے سائے کو چوم کر قسم کھائی تھی کہ آزاد ہو کر اُسے باہوں میں لے کر کہے گا "اب دُور نہیں رہ سکیں گے میری رانی"۔

ریکھا پانی کا گلاس لیکر کھڑی ہوئی تھی بولی "یہ کیا ابھی تک ویسے ہی بیٹھے ہو؟"

چندن اپنی خوابوں کی ریکھا کو سامنے دیکھ کر ہنس پڑا اور پھر سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

ریکھا بھی اپنے کو روک نہ سکی۔ ساڑھی کے چھور سے ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ کو چھپاتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔ چندن بھی کھانا ختم کر کے تھالی اُٹھا کر چوکے میں پہنچ گیا۔ گوپ اور ریکھا کو باتیں کرتے دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا۔ ریکھا توے سے روٹی اُتارنے میں لگی ہوئی تھی اور گوپ کہہ رہا تھا "بھابھی تم نے جو یہاں سنگیت کی کلاس کھولی ہے اور اس میں جو گیت سکھاتے ہیں وہ لوگوں کو بہت پسند آئے ہیں۔ پڑوس کے سبھی گھروں میں وہ گیت گونج رہے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی تقریب کرنا چاہتے ہیں تم ایسے ہی کچھ نئے گیت ہمیں سکھا دوگی؟"

"کیوں نہیں؟" ریکھا نے جواب دیا۔

چندن نے سب کچھ سُنا۔ دل ہی دل میں وہ عورت ہر راہ پر دور سے آتی ہے مگر جب آتی ہے تو بہت تیز رفتار سے چلتی ہے وہ چوکے میں تھالی رکھ کر بولا "آج میں جلدی سوؤں گا، اس لئے میرے لئے دودھ جلدی ہی میز پر رکھ دینا"۔

ریکھا بولی "اچھا"۔

"تم کتنے بجے سوؤ گی؟"

"میں تو آج بارہ بجے سے پہلے نہ سو سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"کل ہم عورتوں کی سوسائٹی میں نئے سماج میں عورتوں کا مقام، پر بحث ہونے والی ہے کچھ تیاری کرنی ہے۔"

چندن جاکر اپنی میز پر اخباروں کو دیکھنے لگا۔ ریکھا بھی فارغ ہوکر چارپائی پر جا بیٹھی۔

پڑوس کے گھڑیال نے دس بجائے تو چندن بھی اٹھ کر اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔ ریکھا جمائی لیکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپ کا کاٹ ٹھیک کر کے اس نے چندن کے لیئے دودھ لا کر میز پر رکھ دیا۔ روشنی میں ریکھا کی نیند بھری آنکھوں کو چندن بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ریکھا کو محسوس ہوا، اس کی خوبصورتی کو آنکھوں میں پی جانے والی نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہے اُسے اپنے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے جان پڑے۔

تبھی کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دونوں چونک اٹھے۔ "اس وقت کون ہوگا؟" ریکھا نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کون؟"

باہر کئی آدمیوں کی آہٹ سنائی دی مگر ایک ہلکی سی آواز آئی۔

"بھابی میں ہوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ کواڑ کھول کر اس نے گلاب کو چھاتی سے لگا لیا۔ گلاب کی ماں چیختی چیختی اندر داخل ہوئی "بیٹے! ستیاناس ہو گیا! دیکھو تو سہی، بھیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ریکھا بٹیا، گلاب کے لیئے بستر تو بچھا دو۔ تمہیں کیا بتاؤں بٹیا، میرا تو کلیجہ پھٹ گیا ہے۔"

ماں کو ہانپتے دیکھ کر چندن پانی کا گلاس بھر لایا۔ اُس نے لے کر پیا کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی ادھر ریکھا کے تو جیسے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے مشکل سے ایک چارپائی پر بستر بچھا کر وہ ساس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ گلاب دیوی کا سہارا لیکر آہستہ آہستہ بستر کی طرف بڑھنے لگا۔

ریکھا گلاب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسا تندرست گلاب اتنا کمزور دیکھے ہوگیا کہ بغیر دوسرے کے سہارے کے بستر تک جا نہیں سکتا۔ اس کے پیلے پیلے ہاتھ پیر دھوپ میں جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ گلاب راسے بستر بیٹھ کر سسکتے ہوئے کہنے لگا۔

"چندن، کل ہی ضبطی کا آرڈر نکلے گا۔ میرے کوالٹی والے مکان کا سارا سامان کورٹ میں پہنچ جائے گا۔ پھر نیلام"... وہ زیادہ نہ بول سکا۔ پھر پانی کے لئے اشارہ کر کے لیٹ گیا۔

دیوی بھی آنسو بہاتی ہوئی بولی "دادا، ایک ہی چوٹ میں بھکاری بن گئے۔"

ماں آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "چندن، ریشم کے اتار چڑھاؤ میں میرا گلاب پس گیا ہے۔ بھگوان اس کی عمر دراز کرے۔ ایسی حالت میں تمہارے یہاں نہ لاتی تو اور کہاں جاتی؟ پانچ روز بیمار رہا۔ دھوپ کرتا رہا ہے۔ آج شام تک سیٹھ ساہوکاروں کی خاک چھانتا رہا مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آکر اوندھے منہ بستر پر گر پڑا۔ اب تو بار بار پانی مانگتا رہتا ہے۔"

اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی رہی۔ گلاب کو سویا ہوا جان کر ماں نے کہا۔

"جاؤ، تم سب جاکر آرام کرو۔ میں جاگتی ہوں۔"

آدھی رات کو جب چندن کی آنکھ کھلی تو ماں کواڑ کھٹکھٹا کر پکار رہی تھی۔

"چندن بیٹا، جلدی اٹھو۔ یہاں آؤ۔ میرا تو کلیجہ بیٹھا جا رہا ہے۔"

چندن بھائی کے پاس آ بیٹھا۔ دیوی اور گلاب دونوں بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب کے ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں جھلک رہی تھیں گویا سخت جانفشانی کا کوئی کام کیا ہے۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ بھائی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر گلاب بولا۔

"چندن، میں نے ایسا بھیانک خواب زندگی بھر نہیں دیکھا۔"

ماں بیچ میں ہی بولی "ارے، یہ تو ایسا چلایا کہ میری جان ہی نکل گئی۔"

"چندن، گہرا سمندر تھا جس کا نہ اور تھا نہ چھور۔ تیس تیس فٹ کی مچھلیاں تھیں انکے علاوہ چھوٹی مچھلیاں تو بے شمار۔ کیا دیکھتا ہوں۔ بیٹھا دریا سے قد کی مچھلی بن گیا تھا اور بھاگا جا رہا تھا۔

اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی نگلتا جا رہا تھا جو میرے پیٹ کے اندر تڑپ تڑپ کر خاموش ہوتی جا رہی تھیں۔ میری خواہش یہ تھی کہ میں بڑی سے بڑی مچھلی بن جاؤں اس لئے مجھے اور کچھ نہ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اچانک ایک بڑی مچھلی میری طرف بڑھی۔ میں پیچھا چھڑا آیا مگر وہ برابر میرے پیچھے بھاگتی رہی۔ پھر تو کئی مچھلیوں کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ جان بچانے کے لیے میں نے سمندر کا کونا کونا چھان مارا زوردار گرج کی آوازیں ہوتی رہیں اور لہریں تیزی سے آسمان کی طرف اٹھ کر پھر دھڑام سے پانی میں جاتی تھیں۔ مگر وہ برابر میرا پیچھا کیے رہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ہی چھلانگ میں میرے قریب پہنچ جاتیں۔ بہت دیر تک یہ مقابلہ جاری رہا۔ آخرکار ایک بڑی مچھلی میرے آدھے حصے کو نگل گئی۔ میں خوب چلایا۔ چھوٹی مچھلیوں کی چیخیں گونجنے لگے اور میں گرم لوہے کی مانند غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ بڑی مچھلی کے دہکتے ہوئے پیٹ میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میری رگ رگ کانپ اٹھی۔ موت سامنے تھی اور میں تڑپ رہا تھا کہ میری نیند کھل گئی۔"

ریکھا تکیہ سے لگی۔ چندن نے بھائی کا پسینہ پونچھ کر اُسے بستر پر لٹا دیا اور بولا "بھیا، سرمایہ داری نظام کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ چھوٹے بیوپاری اپنی حفاظت کے لیے کتنی بھی کوشش کریں مگر انھیں بڑے ایشوں کے پیٹ میں جانا ہی پڑتا ہے۔ اسی لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ چھوٹے بیوپاریوں کو بھی اس سماج کو بدلنے کے لئے مزدوروں، کلرکوں اور کسانوں کا ساتھ دینا چاہیے۔"

گلاب حق کیسے کر دیتا، مار و گلی اپنے ساہوکار کی۔ آج اُسے چندن کے الفاظ میں آنکھوں دیکھی حقیقت کی جھلک ملی تھی۔ ٹھنڈی سانس لیکر بولا "آگ لگے ایسے سرمایہ داری نظام کو! ساری زندگی داؤ پر لگا کر جس سیڑھی پر چڑھ رہا تھا وہ ایسی گری کہ میرے ہاتھ پاؤں ہی توڑ دئے۔" اور وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

صبح کی کرنوں نے بتی کی روشنی کو ختم کر دیا۔

چندن نے کہا "بھیا صبح ضرور آئے گی جیسے جیسے یہ امیر اور غریب کا فاصلہ بڑھتا جائے گا یعنی دولتمند گھٹتے اور غریب بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے ان حالات کا خاتمہ ہوتا جائے گا۔ اس کی جگہ [illegible] اور یہ ضرور گر پڑیگی اور اُس کی جگہ ایک ایسا سماج قائم ہو گا جس میں ہر ایک انسان اپنی محنت کے عوض خوشگوار جیون کی زندگی بسر کرے گا۔ ان کا مستقبل مکمل طور پر درخشاں ہو گا۔"

گلاب رائے ناریل کے پیڑوں کے پیچھے طلوعِ آفتاب کو دیکھ رہا تھا۔ بولا "تمہارا ایسا سماج بھگوان کرے جلدی ہی قائم ہو۔"

کچھ دیر کے بعد گلاب رائے پھر بستر پر لیٹ گیا اور چندن نے رضائی آہستہ آہستہ اُس کے کندھے تک سرکا دی۔

"یکایک گلاب نے پکارا "دیوی۔"

دیوی نے شوہر کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا "جی!"

گلاب نے اُسے ہاتھ سے کھینچ، بستر پر بٹھا اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ریکھا اور چندن اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کواڑ بند کر کے چندن چارپائی پر جا بیٹھا۔ ریکھا زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں غرق تھی۔ چندن نے پکارا "ادھر آکر بیٹھو۔"

ریکھا کرسی چادر کے بل پہ کھینچ کر چندن کے بستر پر جا بیٹھی مگر ابھی تک وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ چندن نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

ریکھا نے سر اٹھا کر لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میں اور گلاب دادا میں اتنا فرق کیوں ہے؟"

"ریکھا، یہ ہمارے خاندان کی ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ سنو گی تو تمہیں بھی دکھ ہوگا۔"

"انسان صرف خوشی کی کہانیاں سننے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔"

چندن اداس ہو گیا۔ زمین کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بولا "تیس برس پہلے کی کہانی ہے۔ اُس وقت ہم بہت غریب تھے۔ ماں بیچاری ہر دو دو برس کے بعد گھر کے آدمیوں میں اضافہ کرتی جاتی تھیں اور پتا جی لقوے کی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمانے سے معذور تھے۔ جب میں اور گلاب دنیا کو سمجھنے کے قابل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی ٹھکرا دیا جاتا تھا۔ جب ہمارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کھلونوں کے لئے اوپر اٹھتے تھے تو ماں بیچاری اپنے دامن میں منہ چھپا کر رو پڑتی تھیں۔ ہم پاس پڑوس کے بچوں کے کپڑے دیکھتے تو خوب لڑائی ہوتی تھی۔ پورا کھانا نہ ملنے کی وجہ سے [illegible] کتنے سے سوکھ چکے تھے [illegible]

پتنگوں اور کپڑوں سے لیکر اسکول کی کتابوں تک کے لئے ہمیں لڑنا
پڑتا تھا اور یہ جھگڑا ہماری شخصیتوں میں سما گئی۔ اسکول
کے زمانے میں اس مقابلے نے مختلف شکل اختیار کر لی۔ میں
ہمیشہ سب سے اوّل آنے کے لئے کوشش کرتا تھا اور گلاب
جماعت میں مجھ سے زیادہ طاقتور تھا اور لڑکوں کا سردار بن گیا۔
اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے ہمارا رہا سہا
بچپن بھی جاتا رہا۔"

چندن کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پُرانی باتوں کو یاد کر کے
اُسکا دل دُکھ درد کی گھٹاؤں میں گھِر گیا تھا۔ اُس نے پھر کہنا
شروع کیا۔

"ایک دن ہمارے گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ بچا۔ ماں
نے چاول اُبال کر بھات پکایا۔ گلاب دوسرے دن چوکے
میں کھانے کے لئے گیا تو اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ وہ مجھ سے
جھگڑنے لگا کہ میں نے رات کا بچا ہوا بھات کیوں کھایا ہم دونوں
کتوں کی طرح لڑے۔ گلاب کی قمیص پھٹ گئی۔ میری قمیص تھی جسے
پہن کر وہ سکول جاتا تھا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اپنی
ناخنوں والی انگلیوں کو گول بنا کر مجھ پر جھپٹا۔ آنکھ سے اوپر جا پڑا
آنکھوں کے نیچے گہرا نشان یاد کے طور پر رہ گیا ہے۔"

ریکھا نے جھک کر دیکھا۔ چندن کی آنکھ کے نیچے گہرے زخم کا
نشان اب تک دکھائی دے رہا تھا۔

چندن بولا "ہم دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش
کر رہے تھے [illegible]
کے پاس ماں کا جسم [illegible] گیا
آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا
تھا۔ [illegible]
چھت کا [illegible] گر پڑی تھی۔ اُس رات ان کا [illegible]
بیہوش رہیں۔ ہم دونوں بھی رو رو کے [illegible] میں سوئے۔ ماں
نے [illegible] گلاب
نے کہا "[illegible] تم سے کبھی نہیں لڑوں گا۔" میں نے
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم غریب ہیں اس لئے
لڑتے ہیں۔"

وہ بولا "اس کے بعد میں چوری کروں گا۔ ڈاکہ ڈالوں گا مگر غریب
ہرگز نہ رہوں گا۔" اُس نے پڑوس کے ایک ساہوکار کے [illegible] کے
لئے ہاتھ پاؤں جوڑے جس نے اُسے ملک سے باہر اپنی دکان پر
بھیج دیا۔ وہاں اُس کے مقابلے کا میدان اور بھی وسیع ہو گیا۔ وہ
انسانوں سے ہی نہیں بلکہ روپے اور چاندی سونے جیسی مادی
چیزوں سے ٹکر لینے لگا۔"

ماں کے تندرست ہو جانے کے بعد جب کبھی میں اپنا زخم دیکھتا
تھا تو مجھے اُس بہت پرانے واقع کی یاد آجاتی تھی۔ میں اپنے
دل سے پوچھتا تھا۔ جو چیز انسان کو جانور بنا دیتی ہے اُسکا وجود
اِس دُنیا سے کیوں نہیں مٹ جاتا؟ میری دوستی بھی ایسے
لڑکوں سے ہونے لگی جن کے گھر میں بھوک بستی، جو پُرانے کپڑے
پہن کر سکول آتے تھے مگر ذہنی طور پر ہوشیار تھے۔ اُن کے
دلوں میں بھی شاید میرا سوال ہی اُٹھتا تھا۔ ہم جب کالج
میں گئے تو خوب کتابیں پڑھتے اور بحث مباحثے کرتے تھے۔
ہم نے فیس کم کروانے کے لئے ہڑتالیں کیں۔ اُس وقت کانگریس
برطانوی سامراج سے ٹکر لے رہی تھی اس لئے اُسکا ہندوستانی
عوام پر کافی گہرا اثر تھا۔ ہم نے گاندھی واد کا مطالعہ شروع
کیا اور انگریزوں کے خلاف جلوس میں چل پڑے۔ ریکھا ہم نے
سوچا تھا کہ آزادی کے بعد ہماری حالت سُدھر جائے گی۔ ہم نے
اپنے سُنہرے خوابوں کو گرمی میں پلتے دیکھا ہماری زندگی بدل دی
گئی۔ روشنی سے جگمگاتے مکانوں کے بجائے کال کوٹھڑیوں کی
بیرکوں میں رہنا پڑا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرنے کے
بجائے اپنا پیٹ پالنے کی خاطر کھیتی [illegible] بیچنے پر مجبور
ہوئے۔ ہزاروں لوگوں کی خوشحال زندگی کی آرزوئیں بیکاری اور
بیروزگاری کی چکی میں پسنے لگیں۔ ہزاروں مائیں اپنی مامتا کو دبا کر
آسمان کی طرف دیکھتی رہیں کہ وہ سُنہری صبح کب آئے گی جب
کوئی میٹھی اور توتلی زبان انکو نیند سے جگائے گی اور وہ چھوٹے
چھوٹے نرم ہاتھ اُنکی پیاسی چھاتی کو ڈھونڈیں گے۔ بدقسمتی
ماؤں کے لال کمزور ہوتے گئے۔ اُن کی جوان لڑکیاں ہاتھوں میں
مہندی لگانے سے محروم ہو کر سر پر ٹوکریاں اُٹھا کپڑوں کے
تھانوں پر قطاریں باندھنے لگیں۔ اچھے گھرانوں کے بوڑھے مرد

پلیٹ فارموں پر بستر اٹھانے کا کام کرتے تھے، جو اپنے لڑکے
گلیوں میں پھرتے تھے اس طرح زندگی گھسٹتی اور پستی رہی تاوقتیکہ
چین کے عوامی انقلاب نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہماری
ٹولی کے ہر نوجوان نے قسم کھائی کہ اپنی زندگی انسانی ذات کی
خدمت کے لئے وقف کر دیگا۔ جب تک بھوک اور بیکاری
دور نہیں ہوتی، جب تک جہالت اور بیماریوں سے چھٹکارا
نہیں ملتا، یہ آزادی کس کام کی؟ اُن دنوں گلاب کا ایک خط
آیا تھا۔ پڑھوگی؟"

چندن پیٹی میں ایک پرانی فائل ڈھونڈھنے لگا۔ ریکھا نے
سوچا میں کیسی بیوقوف تھی! جس کی زندگی چین سے بالکل ہی محروم
رہتی آئی ہے اُس سے آرام حاصل کرنے کی خواہش کر رہی
تھی۔

چندن نے خط لاکر ریکھا کے ہاتھ میں دیا۔ خط کے آخری حصے
میں لکھا تھا:-

چندن، تمہیں سمجھانے کے لئے ایک بار پھر لکھنا پڑتا ہے کہ
تم جس راہ پر چل رہے ہو اُس سے گھر کی تباہی ہونا لازمی امر ہے۔
کئی بار لکھ چکا ہوں کہ تم بھی میری تقلید کرو تو گھر کو سونے سے بھر دو۔
بھلے مانس! اس دنیا میں غریب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ سب پیسوں
کے ہی دوست ہیں۔ تم یہاں افریقہ آجاؤ تو دونوں کما کر گھر کا نام روشن
کرینگے۔ یہاں افریقہ میں تو چاندی ہی چاندی ہے۔
بیچارے دیہاتی پانچ گز مانگتے ہیں تو میں چار گز دیتا ہوں کیونکہ
وہ نرے بدھو ہیں۔ افریقہ تو جاہلوں کا ملک ہے۔ ہاں بھیا یہاں
بچت ہیں مگر دو تین روپے ہر روز دوائیوں پر خرچ کرکے چین سے
رہا جا سکتا ہے۔ مجھ سے بیوپاری تو ہوتے ہیں ہر وقت دوسروں
کو ہڑپ کرنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کماتے ہیں پھر بھی
پیٹ بھرے بیل کی طرح لاتیں مارتے رہتے ہیں۔ مگر میرا نام بھی
گلاب ہے۔ دیکھنا پانچ چھ سال کے اندر کتنا کچھ کماتا ہوں۔ اگر
اب بھی تم اخباروں، کتابوں، جاسوسی ناولوں اور بحث مباحثوں
میں اپنا وقت ضائع کرتے رہوگے تو ایک وقت ایسا آئے گا
کہ ریل چلانی پکڑا ہوں گا اور تم بھکاری کے سے میلے کچیلے کپڑوں
میں قمیص پہنے اداس آنکھیں لیے دوسروں کی طرف تاکتے
رہ جاؤ گے۔"

خط پڑھکر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ گہری سانس
کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلا، "جھلا ہوا شاعر!"

چندن نے پوچھا "تمہیں گلاب پر رحم آتا ہے نہ؟"

"نہیں، مجھے اپنے سماج پر رحم آتا ہے جس نے ترقی کے
راستے اتنے تنگ کر دیئے ہیں اور لوگوں کا مستقبل اتنا غیر محفوظ
کر دیا ہے کہ کوئی بھی امن و چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔"

"جو سماج رحم کے قابل ہے..."

"اُسے بدلنا ہی پڑے گا!" ریکھا نے چندن کا جملہ پورا
کرتے ہوئے کہا۔

چندن نے ریکھا کا گلابی ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔
ریکھا سوچتی رہ گئی۔ جو سوال برسوں تک میرے دل میں کانٹے
کی طرح کھٹکتا رہا، اُس کا جواب تو ماضی کے اوراق میں چھپا
ہوا تھا۔

چندن نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ریکھا اُس کی
گود میں منہ چھپاتی ہوئی بولی "میں نے تو کہا تھا، آپ کے پاس
دل ہی نہیں ہے..."

چندن ریکھا کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں پر تھامے مسکرا رہا۔
ریکھا شرماتی ہوئی بولی "مگر اب..."

چندن نے پوچھا "مگر اب..."

"مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے پاس بھی دل ہے،
ایک خوبصورت اور جیتا جاگتا دل!"

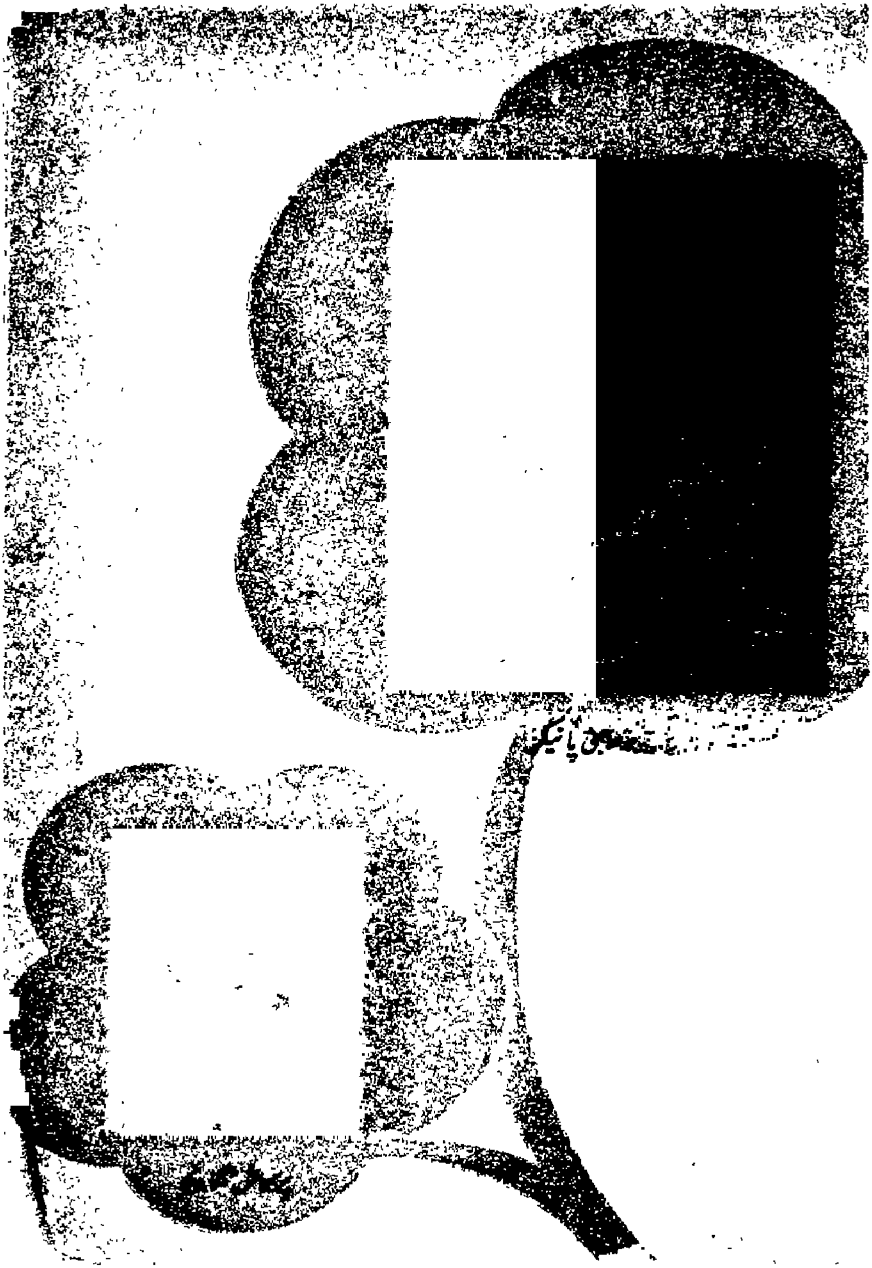
رجنی پنیکر

رجنی پنیکر نے لاہور کے ایک خوشحال پنجابی گھرانے میں جنم لیا۔ اس گھرانے کے افراد تعلیمی میدان میں بڑا نام پیدا کر چکے ہیں۔ علم و دانش کا بے پناہ سرمایہ رجنی کو ورثے میں ملا۔ انھوں نے ہندی اور انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ آپ کا بچپن لاہور ہی میں گذرا جو ایک مدت سے پنجاب میں علم و ادب کا گہوارہ چلا آ رہا تھا۔ بٹوارہ کے بعد آپ پنجاب سرکار کی طرف سے شائع کئے جانے والے ہندی کے رسالہ "پردیپ" کی مدیرہ رہیں اور ۱۹۵۰ء میں آپ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئیں۔ اس وقت آپ پروگرام ایگزیکٹیو ہیں۔ رجنی پنیکر کا رجحان ابتدا ہی سے علم و ادب کی طرف تھا لہٰذا انھیں ملازمت بھی اُن کی مرضی کے مطابق ملی۔

رجنی پنیکر نے اپنی مستقل مزاجی سے یہ ثابت کیا ہے کہ ریڈیو کے ماحول میں تخلیقی قوتیں سلب نہیں ہوتیں۔ اُردو کے بیشتر ادیبوں نے ریڈیو کی ملازمت کی۔ اور اکثر کا انھوں نے اُسے ترک کر دیا چونکہ ان کا خیال تھا کہ ریڈیو کا ماحول اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لئے سازگار نہیں ہے۔ مگر رجنی پنیکر نے اس خیال کو سراسر غلط ثابت کر دیا ہے۔ آپ نے ریڈیو کے ماحول میں رہتے ہوئے پانچ اچھے ناول لکھے ہیں۔ جو ہندی میں ٹھوکر، پانی کی دیوار، موم کے موتی، پیاسے بادل، اور کالی لڑکی کے نام سے چھپ کر بے حد مقبول ہوئے۔ ناول "پیاسے بادل" پر آپ کو یو۔پی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سگریٹ کے ٹکڑے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کہانیوں میں انھوں نے ہیئت اور موضوع کے دلچسپ تجربے کئے ہیں۔ اُن کا ایک ناول "مہاڑے کی دھوپ" زیر طبع ہے۔

رجنی پنیکر اونچے درمیانہ طبقہ کی عکاسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اونچا درمیانہ طبقہ یوں بھی ہمارے سماج کا ایک پُر لطف حصہ ہے جو اونچے طبقہ میں شامل ہونے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ نقالی اور تصنع جس کی فطرتِ ثانی بن چکا ہے۔ اونچے طبقہ میں جانے کی دوڑ دھوپ میں درمیانہ طبقہ جو قلا بازیاں لگا رہا ہے وہ ناول کا نہایت ہی حسین موضوع بن سکتی ہیں۔ رجنی پنیکر چونکہ خود درمیانہ طبقے سے ہیں اس لئے وہ اس طبقہ کی رگ رگ سے آگاہ ہیں۔ اُن کا مشاہدہ نہایت پختہ ہے۔ وہ تمام اقتصادی، سیاسی اور سماجی حقائق سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کا مزاح ایک تیز مہک اور اُن کا طنز ایک تیز نشتر ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ایک منظم پلاٹ کی قائل نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے تمام ناول دلچسپ ہیں۔ اور اُن میں لطف و مسرت کا عنصر بہت غالب ہے۔

رجنی پنیکر کا ناول "کالی لڑکی" کا موضوع بھی اچھوتا ہے — یہ ایک غم زدہ کالی لڑکی کی داستان ہے جو ہمارے آج کے سماج میں اپنا مقام ڈھونڈتی ہے۔



رجنی پنیکر

پرکاش اگلاؤنج

کالی لڑکی

میں اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر چکی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے زندگی میں صرف چند بار ہی میری آنکھیں اشکبار ہوئی ہیں۔ جب کبھی ایسے موقعے آتے جب کبھی آنسو بہانے کی خواہش پیدا ہوتی میں ٹپکنے سے پہلے ہوئے آنسوؤں کو دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتی۔ ان آنسوؤں کا شور ... [illegible] ... میں نمکین ... سرخ خون ہوتا۔ سیاہ جلد کے نیچے بھی خون تو لال ہی رہتا ہے نہ۔

ہمدردانہ ستم میں آپ کی ہمدردی جگانا نہیں چاہتی ہمدردی کے الفاظ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس دنیا میں کسی کے دل میں کسی کے لئے سچی ہمدردی ہو سکتی ہے جو مجھے تو وہ صرف ایک ... [illegible] ... ہے . . . میں اپنی ... [illegible] ... نہیں کرنا چاہتی انسانی جسم کے رنگ پر اس کے اعمال کو پاکیزگی منحصر نہیں۔ اس پر غور کرنے کی فرصت کسے ہے۔

میں پیدائشی کالی ہوں۔ ماں کا رنگ گورا، پتا کا ... [illegible] ... [illegible] ... سال ... ہے۔ [illegible] ... نہیں ہوتی۔ زندگی میں پہلی ... [illegible] ... کالا ... [illegible] ...۔ سب ... [illegible] ... کالی کہہ کر پکارتے تھے ... گھر میں ایک ... [illegible] ... لڑکی ... [illegible] ... [illegible] ... لڑکے کی ... [illegible] ... لڑکی ... [illegible] ... نہیں ہونا چاہئے۔

بچپن کے تمام واقعات تو میری یادداشت سے دور ... [illegible] ... [illegible] ...

ناسور کی طرح گلا تی رہتا ہے، وہ ہے میری جلد کا سیاہ رنگ آپ فرمائیں گے ہندوستان جیسے ملک کی نصف آبادی سیاہ فام ہے یہ تو بحث کی بات ہے۔ درمیانی درجے کے گھرانے میں جس میں سبھی گورے ہوں، ایک لڑکی کا کالی ہونا گویا اس کی بدقسمتی کی پہچان ہے۔ اس کے تاریک مستقبل کا روشن نشان ہے۔ شاید میری ماں میرا رنگ دیکھ کر سکتے میں آگئی ہوں گی۔ انہوں نے بد ... کے اس سایے کو ... کرنے کے لئے میرا نام رانی رکھ دیا ... میں راجہ رانیوں کے فسانے سنتے اور ... کے لائق ہوئی تو یہ بات ... سمجھ گیا کہ رانی کالی بھی ہوتی ہے؟ رانی کو تو پریوں کی طرح گوری ... اور خوبصورت ہونا چاہیے۔ میرا نام رانی کیوں رکھا گیا؟

بچی ہوتے ہی مجھے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا ... میں ایک شرارتی لڑکا مجھے ... کر بولا کیا تم رانی ... ہو ... رانی ... گوری ہونا چاہیے ... میرے ... معصوم ... [illegible] ... کے ... [illegible] ... لیکن اس کی اس بات پر میں ... [illegible] ... تبدیل ہو گیا ... سکول میں میرا پہلا دن ... میرے ... کے لئے ... نفرت جاگ اٹھی۔ اس وقت تو ایسا محسوس ہوا کہ ... [illegible] ... لیکن در حقیقت وہ نفرت اور حقارت تھی میرا دل ... [illegible] ... کہ میری ماں نے میرے ساتھ نا انصافی کیا ہے ... چاند ... [illegible] ... جب کبھی ... گود میں ... [illegible] ... کو سہلاتے ہوئے میری پیشانی چوم کر کہتی میری رانی ... راجہ کی رانی بنے گی ... اور گہری گہری آنکھوں میں ... [illegible] ... کا کھوج کرنا چاہتی تھی۔

اس وقت تو اس کی یہ بات میری ... [illegible] ...

اپنی کالی صورت دیکھنے کی خواہش ہوتی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ میری چہرے کے نقوش برے نہیں۔ ڈیڈی ہمیشہ گہرے رنگوں والی ساڑھیاں پہنتیں، ماں بھی تقریباً ایسا ہی لباس پسند کرتی تھیں۔ مجھے کئی گڑیاں بھی کرسمس پر اور ماں کی اترن بچے کو دے دی جاتی جنہیں میں کبھی پہنتی تو میری کالی رنگت اور بھی گہری ہو جاتی۔ جب کبھی ڈیڈی کہتیں کہ رنگ گہرا ہو جاتا ہے تو میرا سیاہ رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا۔

اسکول میں چند لڑکیاں مجھ سے دوستی رکھتی تھیں۔ خوبصورت چہرہ لیے گھومتا ہوا جسم پا کر بھی وہ گھر سے حساب کے سوالات حل کر کے نہیں لا سکتی تھیں۔ انہیں جغرافیہ عجیبہ نظر آتا ——— سائنس کے گھنٹے میں تو اکثر ان کا وقت سکول کے نل کے قریب یا کلاس روم میں گزرتا ——— ایسی لڑکیوں کو ہر وقت کسی کی اضافی ضرورت ہوتی جو میں انہیں فوراً دیتی ——— اس لیے ان لڑکیوں کو مجھے اپنے ساتھ شریک کرنے میں کبھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کانچ کی چوڑیاں اور ربن بطور تحفہ مجھے دیتی رہتیں۔ ڈیڈی کو ہمیشہ شکایت رہتی کہ یہ خوبصورت لڑکیاں میرا سبق کس طرح بنا جاتی ہیں؟ انہیں لڑکیوں میں سے ایک سندری خوبصورت کا میری زندگی سے خاص تعلق رہا۔

میری عمر اس وقت چودہ پندرہ سال کے درمیان ہو گی۔ اکثر ڈیڈی کی شادی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ بی۔ اے۔ میں دو مرتبہ فیل ہو چکی تھیں۔ پڑھنے میں ان کا دل نہ لگتا تھا۔ ہر وقت آئینے کے سامنے سنگار کرتی رہتیں ——— ماں کے ساتھ محلے کی آنے جانے والی عورتوں کے ساتھ گپیں لڑاتیں یا تاش کھیلتیں، تاہم ان بیٹھکوں میں مجھے کبھی کسی نے شامل نہیں کیا مگر جب کبھی کوئی پارٹی یا رشتہ دار وغیرہ جمع ہو جاتے تو ڈیڈی اور ماں کو میرا خیال اس وقت آتا جب کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے کسی کی ضرورت محسوس ہوتی اکثر جاندی میرے حصے کا کام بھی پورا کر دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ بن پہاڑ اور ساز لگتا ہوا تھا تیزی سے کام کرتے پتہ نہ لگتا کے ہونٹ سے ٹھرے کھا کھلا کر ادھیان سے ملتے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے وہ کام ختم کر دیتی اور مجھے پڑھنے کے لیے فارغ کر دیتی۔

اس وقت بھی میں جانتی تھی کہ مجھے گھر میں واپس کیوں کھینچا جاتا ہے کہ سب جانتے تھے کہ میں پڑھنے میں تیز ہوں

زمین سوں چندن کی کو جو دیکھ پر دسبے میں پا سکتی ہوں۔ پھر مجھے بار بار پڑھنے کے لیے مجبور کیوں کیا جاتا تھا؟ وجہ یہ تھی کہ ماں آنے جانے والوں اور رشتہ داروں کے اس طعنے سے بچنا چاہتی تھیں کہ "بندی گوری! اپنی اس کالی لڑکی کی شادی کیسے کرو گی؟ اسے تو کوئی بھی قبول نہ کرے گا" یا "سلمیٰ گوری جی جی! تم نے شاید چاند اور سورج کے گہن لگتے وقت پرہیز نہیں کیا ہوگا ورنہ لڑکی اس قدر کالی نہ ہوتی"

اس طرح کی گفتگو کے وقت میں نے کئی بار چپ کر ماں کے چہرے پر تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے جذبات دیکھے۔ میری ماں میری موجودگی میں تو صرف ایک سرد آہ بھر کر اتنا ہی کہتیں ——— جہاں اس کی قسمت لے جائے گی وہیں شادی ہو گی ——— لڑکیاں بھی کبھی کسی کی کنواری رہی ہیں ——— لیکن جب میں ان کی نظروں سے پرے ہوتی تو وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتیں ——— یہ بدنصیب ہے نہ جانے پچھلے جنم میں کیسے کھوٹے کام کیے تھے کہ جن کا انجام اس زندگی میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ہم لوگ معمولی حیثیت کے آدمی ٹھہرے، ایسی کالی لڑکی کی شادی تو جبھی ممکن ہے جب ہمارے پاس جہیز میں دینے کے لیے آٹھ، دس ہزار روپے ہوں۔ پتہ نہیں اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی۔ بہن! جب سے پیدا ہوئی ہے فکر کی وجہ سے بھر پیٹ کھانا بھی حرام ہو گیا ہے۔ کنول کی بیل سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہیں یہ لڑکیاں یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر اپنی پیشانی کو ٹھونکنے لگتیں۔

ایسے موقعوں پر اگر پتا جی موجود ہوتے تو فوراً کہہ دیتے ——— لڑکی پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ کیا ہوا اگر شکل اچھی نہیں؟ ہندوستان میں تو بہت سے آدمی اس سے بھی زیادہ کالے ہیں ——— لیکن ماں کا دل اس قدر وسیع نہ تھا۔ پتا جی کی بات کا ماں فوراً جواب دیتیں ——— کسی بڑھیا سے ہو گی اس کی شادی ——— اور بھلا اسے کون قبول کرے گا ———

پتا جی اکثر بات کا جواب دیے بغیر گفتگو تبدیل کر دیتے ———

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس طرح ... [illegible] ... معلوم کیوں اور کس طرح
سب کو دیکھ رہا تھا...

ہاں تو جس دن کمل بابو دیدی کو دیکھنے آئے مجھے اپنے کمرے سے باہر آنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ ماں نہیں چاہتی تھیں کہ میرے سائے کو بھی کمل بابو دیکھ پائیں۔ انہیں شک تھا کہ کہیں کالی سیاہی کو دیکھ کر وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دیدی کی ماں کی لڑکی نہیں کسی کی مانگی ہوئی لڑکی ہے جو انہیں دکھائی گئی ہے۔

ماں کی سخت ہدایت اور بندشوں کے باوجود بھی میں نے کمل بابو کو ایک نظر دیکھ ہی لیا۔ مجھے کوئی خصوصیت اُن میں نظر نہ آئی۔ گندمی رنگ، درمیانی قد، بالکل معمولی۔ ان نے دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کیوں تجویز کیا ہے؟ انہیں کمل کیوں پسند ہے؟ ان میں کیا خوبی ہے؟ وہ بے شمار سوالات یک بارگی میرے ذہن میں جاگ اٹھے۔ جب کمل بابو دیدی کو پسند کر کے رخصت ہو گئے تب میں نے موقع پا کر چاندی سے دریافت کیا۔ چاندی! ماں کو دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کس طرح پسند آ گیا؟

چاندی نے جواب دیا۔ تم ابھی نادان ہو رانی بیٹیا! کمل بابو کے پاس دولت ہے، وہ کا ڈھیری بیٹیا کو چاندی میں تول سکتے ہیں، سونے سے لاد سکتے ہیں!

ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

کالے بازار سے بیٹیا!

چاندی سے میرا یہ رشتہ اتھا۔ گو میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن مجھے کالے بازار کے معنی معلوم نہ تھے — [illegible] ... لیکن حسب معمول میری خاموشی تھی۔ [illegible] کے پاس اتنی فرصت نہ تھا کہ وہ اپنی بات کا اثر جو میرے چہرے پر نمایاں ہوا تھا دیکھ پاتی۔ وہ مختصر سا جواب دیکر

اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

وہ رات میری زندگی کی ایک بھیانک رات تھی — باہر آسمان کی گود میں چاند ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا گلابی سردی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں اپنے پلنگ پر بیٹھی خود کو لعنت ملامت کر رہی تھی۔ اس قدر بد قسمت ہوں کہ مجھے اپنے ہونے والے بہنوئی کے سامنے بھی نہیں جانے دیا گیا۔ آخر وہ کیا کرتے؟ مجھے کھا جاتے؟ دیدی کو کس طرح کا شکوہ کر رہے تھے؟ میں کالی ہوں، میرا سایہ بھی دیدی پر نہیں پڑنا چاہئے۔ لیکن اس طرح دیدی کا سفید رنگ سیاہ کس طرح ہو جائے گا۔

لیکن میرا اور دیدی کا... وہ کون جس نے کبھی چوٹ نہ کھائی ہو، وہ دوسرے کا درد کس طرح جان سکتا ہو۔

کمل بابو! اسی نام سے انہیں ہمارے گھر میں پکارا جاتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد ماں اور دیدی کافی رات گزرے تک بات چیت میں مشغول رہیں۔ دیدی اور میں ایک ہی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ ساڑھے گیارہ بجے تک دیدی کمرے میں نہیں آئیں تو میں نے بتی گل کر دی — ماں بیٹی میں ہم جولیوں جیسا تعلق تھا — ماں دیدی سے صرف چودہ سال بڑی تھیں اور مجھ سے اکیس سال۔

میں بے چینی سے دیدی کا انتظار کرتی رہی۔

شادی دیدی کی ہو رہی تھی۔ لیکن دھڑکن میری تیز ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب دیدی جب کمرے میں داخل ہوئیں تو میں نے ایکدم سوال کیا — دیدی تمہیں اپنے ہونے والے شوہر پسند ہیں؟ نہ معلوم دیدی اور ماں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔

وہ فوراً بولیں اتنی گوری ہونے پر تو کمل بابو جیسا شوہر ملا ہے، اگر تمہاری جیسی ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا؟

دیدی کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بے تکلفی سے پھر سوال کیا۔ بتاؤ نہ دیدی! تمہیں پسند ہے؟

پسند کیوں نہیں رانی! تم کو جھوٹ موٹ کی رانی ہمارے ہیں، حقیقت رانی بننے جا رہی ہوں۔ جانتی ہو کمل بابو کا [illegible] ہے۔ لاکھوں کا بینک بیلنس ہے۔ چار مکان ہیں، دو کاریں [illegible] اب میرے لئے ایک نئی کار خرید رہے ہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ـــــ دیدی اور میرے لئے وہ جہیز کی سوغاتیں بھی جوڑی جاتی ہیں کیا ؟

ہاں ـــ اس کا سوتیلا اور سرپرستی مجھے بھی کوئی حیرت نہیں ہے ۔ میں اس شادی پر غور کرنے کی بجائے دیکھ کر کی بات تھی دیدی کا کہ ہر ایک بات سے ماں کے اثرات کی پہچان ہو رہی تھی ـــ جیسے ہی ماں اور دیدی ہم خیال تھیں ۔ دیدی کی ان باتوں سے میری گھبراہٹ قریب کے تقاضے میں تیزی کا گھنٹہ بجا ۔ بس اس کی آخری گرہ بھی میں سن سکی اور پھر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیا ۔

دیدی کی شادی ہو گئی رخصتی کے وقت وہ اس قدر زار و قطار رو رہی تھی کہ پتا جی کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں ۔ میں نے پتا جی کو اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ روتے ہوئے دیکھا ہے ۔ ایک دفعہ تو دیدی کی رخصتی کے وقت اور دوسری دفعہ . . . . . پھر بتاؤں گی ۔

ماں کی نظر میں میں کسی مشورہ کے قابل نہ تھی ۔ دیدی کا جہیز کپڑے اور زیورات بنوائے گئے ـــ اس وقت بھی انہوں نے میرے متعلق کچھ ضرورت محسوس نہ کی جس کا رنگ سیاہ ہو وہ بھلا کیا جانے کہ کسی ساڑی کے ساتھ کون سا بلاؤز خوشنما دکھائی دے گا ـــ ماں کھلے ہاتھوں خرچ کر رہی تھیں ۔ بوا نے ٹوکتے ہوئے کہا ـــ رانی کی شادی بھی تو کرنی ہے ۔ اسے کس طرح کرو گی ؟ . . . کیا اس کی شادی میں خرچ نہ کرو گی جو اسی شادی میں تمام رقم اٹھائے دے رہی ہو ؟

ماں نے نہایت افسردگی سے جواب دیا ـــ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے ـــ کوئی اسے اپنائے تو سمجھوں گی ۔

واہ بھابی ! واہ ـــ رانی کنواری ہی رہے گی ؟ ہماری سبنا (بوا کی بہو) تو رانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ سانولی ہے ۔ پھر رانی کے نقوش تو نہایت دلکش اور خوبصورت ہیں ۔ آنکھیں بھی بڑی خوبصورت ہیں ۔

لیکن اس کے بعد ماں نے جو کہا اس نے میری جرأت کو کچل دیا کیا کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے اس طرح کے الفاظ استعمال کر سکتی ہے ! میری پیدائش کے وقت کیا ماں نے تکلیف محسوس نہ کی تھی ؟ ـــ

میں نے تو سنا تھا کہ ماں کو اپنے سبھی بچوں سے یکساں محبت ہوتی ہے ۔ ان کے درمیان اگر ہوتا تو صرف پیار کا فرق ہو سکتا ہے ـــ

ماں نے کہا ـــ کیا ہوا ؟ پھر بھی کسی نے ماں کو کبھی جا کر کبھی پوچھا نہیں ہو ۔ جب بھی دیکھا تو محض سر پر ہی فکر سی ہے جو دیکھ رہے ہیں خوف زدہ ہو اٹھتی ہوں ۔ میں اس سوچ میں ہوں کہ نہ جانے کس منحوس گھڑی کی پیدائش ہوئی ہے اس لڑکی نے پیدا ہو کر مجھے پیدا ہوئی ـــ

بوا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ـــ رنجیدہ ہو کر بولیں کیا بچہ اپنے مقدر کا خود ذمہ دار ہوتا ہے ۔ تمہارے لئے بیٹا بناکر ـــ ڈاکٹر بنا دو

اس پر ماں نے کہا ـــ نہیں ہی ہی ! اول تو ہماری حیثیت اس قابل نہیں کہ ڈاکٹری پڑھا سکیں ـــ دوسرے ۔ ڈاکٹر بن کر جب یہ اپنے کالے ہاتھوں سے بچے پیدا کرے گی تو وہ بھی کالے ہو جائیں گے ـــ

ماں کی اس بات کا بوا نے کیا جواب دیا سننے کو میں ہوش میں نہ تھی ساری ہمت جواب دے گئی ـــ میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا ۔ اُف کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کے لئے اس قدر سخت اور بے رحم الفاظ استعمال کر سکتی ہے ؟ یہ میرے لئے بڑا دردناک لمحہ تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ ماں کی الفت اور شفقت مجھے نصیب نہیں ہوئی لیکن ماں کی ممتا اور محبت کیسی ہوتی ہے یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں ۔ ماں کے دل میں دیدی کے لئے بے پناہ محبت تھی ۔ میں نے کئی مرتبہ ماں کو دیدی کی طرف ممتا بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھا تھا ۔ دیدی کی نازک سی کوئی ضد بھی ٹالا نہیں کرتی تھیں ؟ ایک مرتبہ شہر میں نمائش ہو رہی تھی دیدی نے اس میں ساڑھی دیکھی ایک ساڑی کی قیمت تو اتنی ہی تھی کہ دل پر اثر تھا ـــ ساڑی پچیس روپے کی تھی ماں کے پاس اتنے روپے نہیں تھے مگر دیدی کا اسی وقت ساڑی دلا دینی تھی ۔ پتا جی ایک معمولی کلرک تھے صرف چار سو روپے تنخواہ ـــ اس سے گھر کا خرچ بمشکل چلتا رشتہ داروں کی شادیوں وغیرہ کا کام تو کرنا ہی ہوتا تھا مگر دیدی کی ساڑی کے لئے ماں نے کسی طرح روپے جمع کئے تھے ۔ مگر وہیں جا کر دیدی نے لہنگا پسند کیا ـــ چنانچہ ماں نے دیدی کے لئے خوشی خوشی لہنگا بھی خرید کر دے دیا گیا کہ ماں رہتا خوب ہے ـــ ماں دیدی کے لئے تو سب کچھ ہی کر سکتی تھیں ۔

ہو گیا۔

گریگوری تھوڑی دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر مسکرا کر اس کے پیچھے دوڑا اور لوٹا۔

"شکریہ ڈاکٹر"

"کس لئے ؟"

آپ نے اتنی زحمت کی۔ میں آپ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ جو آپ نے مجھ پر کیا۔ اور میرے متعلق جن نیک خیالات کا اظہار کیا۔ بہرحال آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ڈاکٹر اسے تھوڑی دیر حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پہ مسرت اور خوشی کی جھلک تھی اور پھر وہ مسکرا پڑا۔

تم عجیب آدمی ہو۔ اس نے کہا۔ بہت زیادہ مخلص اور راست گو۔ تمہاری بات مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تمہارا خلوص۔ اب اور محنت اور خلوص سے کام کئے جاؤ۔ میرے لئے نہیں۔ بلکہ ان مریضوں کے لئے جن کی خدمت پر تم مامور ہو۔ ہمیں ایک بڑی جنگ کرنی ہے لوگوں کو اس موذی مرض کے چنگل سے چھیننا ہے۔ اور ہم اس کام میں اپنی جانیں تک دے دیں گے۔ اور اُن ایک نہ ایک دن ناکام ہو جائیں گے۔ اور تم ہمارا ساتھ دو گے۔ اچھا اب سب سے پہلے تم جاکر تھوڑی دیر سو رہو۔

اس کے ایک منٹ بعد ہی گریگوری اپنے بستر پہ لیٹا اونگھ رہا تھا۔ اس کے تمام عضو پر ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور ڈاکٹر کی تھوڑی دیر کی اس گفتگو نے اسے ایک حسین جنت میں پہنچا دیا تھا۔

سوتے سوتے اسے یہ دھیان آیا کہ افسوس مڑونز نے یہ گفتگو نہ سنی۔ اور اب اگر میں اس سے کہوں گا بھی تو وہ پوری طرح یقین نہ کرے گی۔ چڑیل کہیں کی۔

صبح آٹھ بجے بیوی نے جگایا۔

"اٹھو چل کر چائے پی لو۔"

اس نے سر اٹھا کر مڑونز کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بالوں میں کنگھا کئے ہوئے وہ سفید لباس میں بہت صاف اور حسین نظر آ رہی تھی۔ بس وہ بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں جلن اٹھی کہ وہ ایسی حسین تو اوروں کو بھی نظر آتی ہوگی۔

"کہاں چل کر چائے پی لیں۔ میرے پاس خود چائے موجود ہے۔ لیکن جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہم دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گریگوری نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا "اچھا چلتا ہوں۔"

مڑونز کے جاتے ہی گریگوری پھر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔

پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ کیوں مجھے چائے کے لئے بلانے آئی۔ اور پھر مجھے دیکھ کر کیوں مسکراتی تھی۔ وہ کچھ دبلی نظر آ رہی تھی۔ اسے اس پہ افسوس آ رہا تھا اور وہ اسے خوش کرنے کی کوئی بات سوچنے لگا۔ وہ چائے کے لئے اگر کچھ مٹھائی خرید لے تو بہتر ہو۔ لیکن منہ دھوتے دھوتے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس سے عادت خراب ہو جائے۔ بلاوجہ کیوں ایک عورت کو بری چیزوں کا عادی بنایا جائے۔ بغیر مٹھائی کے اچھی طرح سے کام چل سکتا ہے۔

چائے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی اور میز پہ سیاں بیوی اور مڑونز کی ایک سہیلی تھیں۔ تیسری عورت کا نام فلیتا ویگرووا تھا۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھی اور اسکا باپ نسی کالج میں فیلو تھا۔ وہ سمیفر اپنے سماور کا گرم کیا ہوا پانی پیتی تھی۔ وہ اسپتال کے گرم پانی سے پرہیز کرتی تھی۔ اس نے یہ تمام باتیں گریگوری کو چائے پینے کے دوران بتائیں تھوڑی دیر میں اس نے گریگوری سے کہا کہ اب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر لے۔ اور پھر خود باہر چلی گئی۔

"کیا کل تم بہت تھک گئی تھیں؟" گریگوری نے مڑونز سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بس کچھ پوچھو نہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب میرے پیر رہ جائیں گے۔ اور مجھے چکر آ رہا تھا۔ بلکہ آخر میں تو وہ لوگ جو مجھ سے کہتے تھے وہ میری سمجھ میں بھی نہ آتا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گئی۔ اور سارے وقت خدا سے دعا کرتی رہی۔"

کیا تم ڈرتی ہو؟

"ہاں مجھے صرف مردوں سے ڈر لگتا۔ ارے تم نے نہیں سنا مرنے کے بعد بھی مردے ہاتھ پیر ہلاتے رہتے ہیں۔"

گریگوری نے بھی ایک عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا۔ میں نے تو خود دیکھا ہے۔ کل میں نے اور ڈاکٹر نے جب ایک لاش کو دفن کرنے کے لئے اٹھایا تھا۔ تو لاش کا ہاتھ ہلا۔ [illegible] یہ کیا تھا۔ گریگوری نے فقط بات بنانے کیلئے کہا۔

گئے ہوئے ہیں ۔۔۔

دیدی کا رنگ تو پہلے ہی گورا تھا۔ اب ایسا دکھائی دیتا گویا کسی نے ان پر چندن پوت دیا ہو۔ باتیں وقت وہ مجسم مسرت نظر آتی تھیں ۔ بے ساختہ ہنسی اور قہقہے ان کی عادت میں شامل تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں گویا شمعیں روشن ہو گئی ہوں۔ ہونٹوں پر ایک، دلکش اور مستقل تبسم قیام پذیر ہو گیا تھا۔ دیدی کے گھنگھرالے بالوں میں گویا ستارے ٹانک دے گئے تھے۔ میں اپنی بہن کی خوبصورتی سے کافی حد تک متاثر ہو گئی تھی ۔۔۔

ہمارے گھر کی چھوٹی سی دنیا میں دیدی اور کمل بابو کی آمد نے رونقیں جگا دیں۔ گھر کی اوپری منزل میں دو کمرے تھے اور نیچے تین لمبے کمرے۔ ایک کمرے میں میں اور دیدی رہتے تھے۔ دوسرے میں کچھ اسباب پڑا رہتا تھا۔ برسات میں ماں اور پتا جی وہاں سوتے تھے۔ نیچے والے کمروں میں ایک گول کمرہ تھا۔ دوسرے کمرے میں ماں اور پتا جی رہتے تھے۔ تیسرا کمرہ آنے جانے والے مہمانوں کے لئے تھا۔ اس کمرے میں گھر کا اسباب بھی رکھا رہتا تھا۔ شادی کے بعد جب دیدی کمل بابو کے ساتھ آئیں تو میں نے ان کے رہنے کا انتظام میرے کمرے میں کیا۔ اور مجھے اپنے کمرے کے ساتھ لگی ہوئی برساتی میں پہنچا دیا گیا۔ اوپر نیچے آتے جاتے کمل بابو سے سامنا ہو جاتا۔ وہ دیکھتے ہی دوسری طرف منہ کو پھیر لیتے۔ دل ہی دل میں مجھے ان پر بہت غصہ آتا اور کچھ نہیں تو کم سے کم تہذیب کے لحاظ سے تو انہیں مجھ سے بات چیت کرنی چاہئے۔ یوں منہ پھیر لینے سے آخر فائدہ بھی کیا؟ شاید اس طرح کے سلوک سے وہ میرے لئے اپنے دل کی نفرت اور حقارت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے خود کو کیا تصور کرتے ہیں؟

جو چہل مذاق کمل بابو کی اپنی سالیوں کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں وہ ماں سے ہوتی تھیں۔ ہماری ماں دیکھنے میں نہایت خوبصورت تھیں۔ گورا چٹا رنگ، چھریرا جسم، چست گٹھن، لمبے بال جن کی نمائش کر کے وہ پینتیس سال کی عمر میں بھی نہ بھولتی تھیں۔ ماں نے پتا جی کے ساتھ رہ کر انگریزی بھی سیکھ لی تھی ۔۔۔ وہ ہماری طرح با آسانی انگریزی میں گفتگو کرتی تھیں۔ کمل بابو ان کے داماد تھے۔ لیکن ماں ان کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے پیش آتیں ۔۔۔ ماں، دیدی اور کمل بابو کبھی کبھی چھٹی کی شام کو تاش کھیلتے۔ دیدی کی زبردست خواہش ہوتی کہ میں بھی شرکت کروں۔ لیکن میں کبھی تاش کھیلی ہی نہ تھی۔ نہ مجھے کھیل سے واقفیت تھی اور نہ دلچسپی ہی ۔۔۔

ماں جس طرح کمل بابو کی آرتی اتارتیں مجھے نہایت ناگوار گزرتا ۔۔۔ داماد سب کے ہوتے ہیں۔ سندری کی بھی دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس کے بہنوئی بھی سسرال آتے جاتے ہیں۔ سندری کے چھوٹے بہنوئی تو نہایت خوش مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ سبھی لوگوں کو ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ نہایت ادب، محبت، تہذیب اور نرمی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی ساس بھی ان کی خاطر تواضع کرتی ہے۔ لیکن ہماری ماں کی طرح نہیں ۔۔۔

کمل بابو کی بات ہی دیگر تھی۔ وہ گھر کے پہلے داماد تو تھے ہی، ساتھ ہی گھر میں کوئی لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے کی کمی بھی پوری کرتے تھے ۔۔۔

پتا جی کی زبردست خواہش تھی کہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کروں۔ لیکن ماں رضامند نہ تھیں۔ اور میں بھی اپنی طرف سے کوئی زور نہ دیتی تھی۔ کیونکہ رہ رہ کر مجھے ماں کے اس جملے کا خیال آ جاتا۔ یہ ڈاکٹرنی بن کر کیا کرے گی۔ جو بچے اس کے ہاتھ سے پیدا ہوں گے وہ بھی سب کالے ہو جائیں گے۔ میرا دل غصہ اور نفرت سے بھر جاتا ۔۔۔ میں نے تاریخ، موسیقی اور ہندی میں انٹر پاس کیا۔ بی۔ اے۔ میں ہندی اور موسیقی لی اور ایم۔ اے۔ میں صرف ہندی ۔۔۔

طالب علمی کے زمانے کے تلخ واقعات مجھے بھی اسی طرح عزیز لگتے ہیں جیسے اوروں کو ہوتے ہیں ۔۔۔ اس دور میں ماں کا طرز عمل میرے ساتھ یکساں رہا۔ یہ ایک دو جملوں میں تحریر کر کے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ماں کا تعلق تو بیٹی کے ساتھ زندگی کے ہر لمحے میں ہوتا ہے۔ اور زندگی کے ہر لمحے کے ساتھ، ہر اہم واقعے کے ساتھ اس کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتی جاؤں گی ماں خود بخود میرے ساتھ آتی رہیں گی ۔۔۔

کمل بابو نے میرے کمرے میں داخل ہونے سے پیشتر ہی ظاہر کر دیا تھا کہ اُن کی قطعی دلچسپی مجھ میں نہیں ہے۔ کہنے کو تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میری بھی کوئی دلچسپی ان میں نہ تھی۔ لیکن یہ غلط بیانی ہو گی۔ کمل بابو میں دلچسپی تو میرے فسانے کا خاص اور اہم جز ہے۔ اگر اُسے باہر کر دوں تو باقی جو کچھ رہ جائیگا وہ فضول اور بے معنی نظر آئے گا۔

اس دن بی۔ اے۔ کا نتیجہ سنایا گیا تھا۔ ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن پاس ہونا تو میرا ایک دستور سا بن گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی اور کالج میں اول آئی۔ گھر پر مبارکباد دینے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری ہم جولیوں کے علاوہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر بھی آئے۔ جن میں عورت اور مرد، دونوں ہی شامل تھے۔ میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتی، پھر سر جھکا لیتی۔ ہر مرتبہ ادا کرنے کی وجہ سے مجھے اس اداکاری کی اچھی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ ماں بھی آج کے دن مجھ سے نفرت نہ کر پائیں۔ آنے والوں سے میری تعریفیں بیان کرتیں۔ ایک ہی جملہ انہیں ہر مرتبہ بار بار دہرانا پڑتا۔ ماں کو بھگوان نے ذہن دیتے وقت کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اس جملے میں میرے کالے پن کا کہیں ذکر نہ ہوتا۔ میں ان کے اس احسان کے بوجھ سے دب جاتی۔ یہی ایک دو دن ایسے آتے تھے جب میری قدر ہوتی تھی۔ میرے ستار کا گرد و غبار صاف کیا جاتا اور اُسے گول کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ چاندی کے کپ بھی گول کمرے میں آراستہ کر دئے جاتے۔ آنے جانے والوں کے روبرو ہر چیز کی تاریخ دہرائی جاتی۔

بی۔ اے۔ کا نتیجہ میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک دو لڑکوں کو چھوڑ کر اور کوئی بھی ہمارے خاندان میں بی۔ اے۔ پاس نہ تھا۔ پتا جی البتہ ضرور بی۔ اے۔ تھے، لیکن وہ سیکنڈ ڈویژن میں بھی پاس نہیں ہوئے تھے۔ دیدی بھی بی۔ اے۔ پاس نہ کر سکی تھیں۔ اُن دنوں وہ ہمارے پاس ہی تھیں۔ کیونکہ منا پیدا ہونے والا تھا۔ دیدی جے والے دن وہ چھٹا دن کا ہو چکا تھا۔ دیدی کی شادی شدہ

زندگی میں منا پہلی اولاد اور ماں کا اپنا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے منا کی پیدائش کمل بابو اور دیدی کے لئے ہی نہیں ماں کے لئے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ منا کی پیدائش کے بعد سے وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ ابھی تک دیدی کی شادی کا قرضہ بالکل نہ اترا تھا کہ ماں نے حلوائی، کپڑے والے اور سنار کا قرضہ اور چڑھا لیا۔

کاریگی کو دینے کے لئے ہار اور ایک جوڑی کنگن بنے۔ منا کے ہاتھوں کے کڑے اور چین بنوائے گئے۔ یہ سب فضول خرچی دیکھ کر میں از حد پریشان تھی کہ آخر پتا جی کس طرح روپیہ مہیا کریں گے اور اس قرض سے نجات پا سکیں گے؟

ماں کو برادری میں اپنی شان قائم رکھنی تھی۔ کمل بابو کی ماں کئی مرتبہ کہہ چکی تھیں کہ کمل بابو نے محض خوبصورتی کے چکر میں آکر اپنے سے کم حیثیت والوں کے ساتھ رشتہ کر لیا۔ انہیں کا دیدی کی فیشن پرستی بھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کا دیدی کو ماں سے تعلیم ملی تھی کہ گھر میں خواہ دھن دولت نہ ہو لیکن گھر کی عورت کے پاس بیش قیمتی پوشاکیں اور زیورات ہونا ضروری ہیں۔ ماں اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی تھیں اور شادی بھی ایسے ہی خاندان میں ہوئی تھی۔ انہیں یہی تعلیم ملی تھی کہ خاوند اسی بی بی کے زیر رہتا ہے جو خوش سلیقہ ہوتی ہے۔ ماں کا کہنا تھا کہ ہر شوہر کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بی بی خوش پوش ہو۔ ان کا خرچہ کرائے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو خاوند بھی اس کی عزت نہیں کرتا۔ ماں کا خیال تھا کہ ایسی صورت میں خاوند موقع ملنے پر دوسروں کی بیویوں کے نہیں تو دوسری عورتوں کی ناز برداری کرنے لگتے ہیں۔ ماں کی دی ہوئی تعلیم پر بھلا دیدی کیوں نہ عمل کرتیں۔ دو چار مہینے سسرال میں رہنے کے بعد جب وہ واپس آتیں تو ہر مرتبہ نئی ساڑیاں، نئے زیورات، نئی سینڈلیں اور چپلیں پہنے ہوتیں۔ پرانی ساڑیاں مجھے مل جاتیں۔ میری صورت ہو گئی تھی۔ جب سے دیدی کی شادی ہوئی تھی میرے پاس بے شمار کپڑے ہو گئے تھے۔ پرانی ساڑیوں کے علاوہ وہ نئی ساڑیاں اور کتابیں بھی دیتی رہتیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر ناول ہوتے۔ ہندی اور انگریزی کے۔ دیدی کی رائے میں ناول کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ اکثر جاسوسی اور عشق محبت کے ناول ہوتے۔ جن میں مسوری کی کسی حسین کا حال بیان کیا جاتا یا ہے کسی کی داستانیں ہوتیں۔

ایسی دستاویز نہیں تھی کہ اس کا انکار کیا جائے۔ حسینکا یہ کتابیں مجھے دیتیں تو میں انکار کس طرح کر سکتی تھی۔ جب چاہا انہیں اٹھا، اس کے نتیجے اور وقت سے پہلے ان کا مطالعہ کرتی۔

میں اپنے بی۔ اے۔ کے نتیجے والے دن کا ذکر کر رہی تھی۔ پتا جی دراصل بے حد خوش تھے۔ کسی طرح اپنی خوشی پوشیدہ رکھ پانے میں کامیاب نہ ہو پا رہے تھے۔ اس دن وہ اپنے دفتر بھی نہیں گئے۔

ماں نے کہا۔ آج بینک نہیں جاؤ گے؟

نہیں، سونا! تو ہماری بیٹی فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے۔ پاس نہیں کر گئی؟ لوگ آئیں گے۔ مبارک باد دیں گے۔ کوئی تو ان سے بات چیت کرنے والا ہونا چاہئے۔

ماں نے کہا۔ کمل بابو جی ہیں۔ وہ بات چیت کر لیں گے۔ تم بینک جانا چاہو تو چلے جاؤ۔"

میں نے مشتاق نظروں سے کمل بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ پتا جی درست فرماتے ہیں۔ میں کسی سے بھی گفتگو نہ کر پاؤں گا۔ اور پھر امتحان میں پاس کوئی ہوا ہے۔ فرسٹ کلاس کسی کا آیا ہے اور خوش کوئی ہو رہا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

کمل بابو کے اس کورے جواب کو سن کر ماں تو مسکرا دیں۔ گویا بابو نے کوئی بہت بڑی بات کہہ دی ہو۔ کاویری حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر ذرا سا مسکرا دی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی نظروں میں تعلیم اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ تم نے سالی کو مبارک باد دی؟

کمل بابو کی طرف دیکھنے کی ہمت تو مجھے ہوئی نہیں۔ لیکن ان کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔

کاویری میری کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس نے پتا جی سے کہا۔

پتا جی! سالی کو ایم۔ اے۔ تو دہلی سے کرنا چاہئے۔

نہیں بیٹی! تم دہلی چلی جاتی ہو تو گھر سونا سونا لگتا ہے۔ سالی بھی چلی گئی تو گھر بالکل ویران ہو جائے گا۔

منا کو آپ لوگ اپنے پاس رکھ لیجئے۔ کاویری سے اس کی پرورش نہ ہو سکے گی۔ کمل بابو نے کہا۔

بیٹا تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں جانتی ہوں کہ کاویری کی پرورش بڑے ناز نخرے سے ہوئی ہے۔ بچے کی ـــ دو سال بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ انہیں سالوں میں بچے کی پرورش بنتی ہے تو جو

دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ہمارے کون سا کوئی ننھا نہیں منا ہمارا بیٹا ہی تو ہے۔ کیوں جی؟

بیٹے کے نام سے پتا جی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت چھا گئی۔ شاید وہ دل میں کسی ایسی خواہش کو پرورش دے رہے تھے کہ کاویری کے کوئی بیٹا ہو تو وہ اسے گود لیں۔

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے فوراً کہا۔ دیدی سے تو دریافت کر لیجئے۔ ماں بولیں کہو منا دیدی؟

مجھے سخت تعجب ہوا، جب دیدی نے کمل بابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ان کی مرضی۔ جو آپ لوگوں کی مرضی، میری بھی وہی مرضی ہے۔ میں آپ لوگوں سے باہر نہیں ہوں۔

دیدی! تم منا کو یہاں چھوڑ جاؤ گی؟

ہاں، تم میرے ساتھ چلو گی۔ اور منا یہاں ماں کے پاس رہے گا۔

مجھے دہلی جانا چاہئے یا نہیں۔ اس پر ماں نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہ کی۔ ماں کی یہ خاموشی مجھے کھٹکی کہ شاید ماں مجھے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالنا چاہتی ہیں۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے لئے اگر دیدی کے پاس جاؤں گی تو دلی میں کہیں نہ کہیں نوکری بھی تلاش کر لوں گی۔ یہ ماں کی شاید یہی خواہش تھی۔

اس دن میرے پاس ہونے کی خوشی کو بھول کر ماں اور پتا جی منا کو گود لینے کی تجویز میں مشغول ہو گئے۔ میں نے ایک مرتبہ کو دادی کا ذکر کیا تو ماں نے فوراً کہا۔ منا جس دن کا ہو گیا دادی کے دل میں ایک دفعہ یہاں آ کر پوتے کو دیکھنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ کچھ دینا لینا تو دور رہا۔

کمل بابو نے ماں کی بات کی تائید کی۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو بغیر کسی رنجش کسی دوسرے کو اس طرح دے سکتا ہے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

کمل بابو ہماری مالی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ پھر ان کی اس دلچسپی کی وجہ کیا تھی؟ میں سمجھ نہ پائی۔

پتا جی بھی بیٹا گود لینے کی خوشی میں کچہری سے دستاویز لکھا آئے اور منا کو گود لے لیا گیا۔ کمل بابو نے کس پھرتی سے دستخط کر دیئے۔ ساتھ ہی پتا جی اور ماں نے بھی۔

اس شام چار سال کے بعد پھر ہمارا گھر بچوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ چار سال پیشتر دیدی کی [illegible] بنایا گیا تھا۔

گھر چلا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ بند کمروں میں رہو اور اسپتال میں مر جاؤ۔ ہندوستان کے گاؤں کے رشتے اپنے انسانوں کی تمام دنیا ہوتی ہے جہاں وہ رہتے ہیں اور ہیں سب کو اپنا بنا لیتے ہیں۔۔۔

کاویری، دیدی اور ویرینا اکثر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی گھر بار کی باتیں ہوتی رہتیں۔ کیونکہ دیدی کوئی فن، ادب، سیاست اور مذہب پر تو گفتگو کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ تو صرف زیورات، ساڑیوں اور بال بچوں پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی تھیں۔ یقیناً طبیعت پر منحصر ہے اور طبیعت عادتوں پر ۔۔۔ ماں کو مہر چھپا رکھا تھا۔ سال میں آکر کمل بابو کی غیر حاضری میں سارے بازار میں جو بھی چیز سب سے زیادہ قیمتی ہوتی خرید لانا گویا ان کا فرض تھا۔ یہ فرض وہاں آکر اور بھی منجمد اور ضروری ہوگیا تھا۔ کرسمس پر بڑی بڑی کپڑا فروشوں کی دکانوں پر جو بھی نیا کپڑا ملتا وہ دیدی خرید لاتیں۔ خواہ وہ اس پر خوبصورت لگیں یا نہ لگیں۔۔۔

میری موجودگی میں ویرینا بھی خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کیا کرتا۔ دیدی نے شاید اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی میں ہی ان کی عزیز ترین ہوں۔۔۔ میرے بغیر وہ نہیں رہ سکتیں اور اسی لئے مجھے لکھنؤ سے دہلی لے آئی ہیں۔۔۔ دیدی نے شاید یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ میرے دہلی آنے پر ماں باپ نے سخت مخالفت کی تھی لیکن دیدی نے کسی بھی طرح ان کی مخالفت منظور نہ کی تھی۔۔۔ ممکن ہے دیدی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں گلی کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ لیکن نہ سمجھے آج کل چراغ کہاں جلائے جاتے ہیں۔ آج کل تو بجلی کے ہزار کینڈل پاور کے ٹیوب روشن ہوتے ہیں۔ ہاں تو اس میں کہا تھا ویرینا سے دیدی نے کہہ رکھی تھیں۔ کیونکہ ایک دن ویرینا نے مجھ سے کہا تھا۔ "رانی! تمہیں بھابی اس قدر محبت کرتی ہیں کہ پچھلے سال میں تمہارے بغیر نہ رہ سکیں۔۔۔ آج کل جگ میں اس قدر محبت کرنے والی بہن خوش قسمتی سے ہی ملتی ہے۔"

"جی ہاں" میں نے مختصر سا جواب دیا اور میری آنکھوں کے آگے بچپن کے تمام واقعات ایک ایک کرکے رقصاں ہو گئے۔۔۔

عاطف بتاتی تھی کہ دیدی نے میرے ساتھ کس قدر محبت اور صبر کا سلوک کیا تھا۔ آہ! اس جملے پر کتنی مرتبہ میری آنکھیں اشکبار ہوا تھیں۔۔۔

اس وقت تک میری زندگی میں آنے والا صرف ایک ایسا شخص تھا جس نے پوشیدہ یا ظاہر۔۔۔ کبھی مجھے حقارت سے نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ ایک لیمپ پوسٹ کی طرح ہمیشہ میرا رہنما تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا اور آج بھی ہے کہ میں کالی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی بھی ان اشتہاری دوائیوں کو استعمال نہیں کیا جو کالے رنگ کو گورا بنا دیتی ہیں۔ نہ ہی دودھ اور بالائی کا لیپ ہی لگایا تھا۔۔۔ جسے استعمال کرنے کے لئے میری بھابی بار بار اصرار کرتی تھیں۔۔۔

بچپن کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ کمل بابو نے اسے اپنا کاروبار اور خیرات سپرد کر دیدی کا اور مجھے اس کی زیر سرپرستی مسوری بھیجا تھا۔ مسوری پہنچ کر اس نے ہماری سرپرستی کی۔ ہمیں مکان وغیرہ تلاش کرنے میں بھی مدد دی تھی۔۔۔ سہولیت دیکھ کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

میں مسوری پہلے بھی کئی مرتبہ گئی تھی جبکہ پتا جی اور ماں وہاں تھے۔۔۔ اس مرتبہ دیدی کے ساتھ جانا کچھ اسی اہمیت رکھتا تھا۔۔۔

اس مرتبہ خاص بات یہ تھی کہ پہلے کی بہ نسبت میرا نظریہ قطعی تبدیل ہو گیا تھا۔ میرے دل میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس مرتبہ صرف دیدی کی دیکھ بھال اور تیمار داری میں ہی اپنا وقت ضائع نہ کر دوں گی۔ اور وہی ہوا بھی۔۔۔ میری خوش قسمتی سے ماں نے چاندنی کو مسوری بھیج دیا تھا۔۔۔ چاندنی اس مرتبہ آئی تو پھر ماں کے پاس واپس ہی نہیں گئی۔۔۔ آج اس واقعہ کو قریب آٹھ سال ہو چکے ہیں، چاندنی میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔۔۔ اب وہ کافی بوڑھی ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن اب بھی گھر کا تمام کام کر لیتی ہے۔ چاندنی کے مسوری آجانے سے جو تھوڑا بہت کام میں کرتی تھی وہ بھی بند ہو گیا۔۔۔ وہ ہمیں صبح صبح پانچ بجے کی چائے بنا کر دے دیتی، پھر ہمارے غسل کے لئے پانی گرم کرتی۔۔۔

ویرینا کو تو نو بجے سو کر اٹھنے کی عادت تھی۔۔۔ وہ رات بھر گھومتا رہتا یا ڈھلتی رات تک تاش کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی دیدی بھی تاش کھیلتیں۔ چاندنی کا ساتھ دیتی۔۔۔ اس وقت بڑا مزہ آتا جب وہ ٹوٹی پھوٹی چاندنی انگلش بولتی اور کھیلتی۔۔۔ ان کھیلوں میں انگریزی کے چند الفاظ بھی اس نے سیکھ لئے تھے۔۔۔ کھیل میں جیت ہو رہی ہو یا ہار، اسے کبھی وہ بڑی لگتی تھی۔ میں دل ہی دل میں خیال کرتی۔۔۔ "ہمارا گھر بھی کسی غیر ملکی کا گھر لگتا نہیں ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ کھانا ایک میز پر ساتھ نہیں کھاتی۔۔۔

میں نے محسوس کیا گویا مسوری آکر میں اپنی پریشانیوں سے نجات پا چکی ہوں۔ میں ایک آزادی محسوس کرنے لگی تھی۔ ہم نے جو مکان کرائے پر لیا وہ لائبریری کے بائیں طرف گڑھ سے والی چوٹی کی سڑک پر تھا۔ اس لئے مال روڈ ہمارے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ لائبریری تو قریب ہی تھا۔ بڑے بڑے ہوٹل بھی قریب تھے۔ میری خریداری تو شروع سے ہی تھیں۔ اب کل بابو کا ان لوگوں سے انھیں روکنے والا کون تھا۔ ہماری سماجی زندگی میں ہر گرمی آ گئی تھی۔ سارے دن یا تو ہم کسی کے یہاں کھانے پر مدعو ہوتے یا کوئی ہمارے یہاں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی پارٹیاں ہوتیں جن سے نہ میزبان کو مسرت حاصل ہوتی اور نہ مہمان کو۔ زیادہ تر لوگ اس لئے نہیں آتے تھے کہ انہیں ہوتی ———— میں دلچسپی ہوتی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے ملازمین کو اس دن آرام مل جاتا تھا۔ جانے والے بھی صرف پارٹی میں اسے بلاتے تھے کہ وہ اپنے مہمانوں کے گھر بچہ چاہے ہوتے تھے۔ جیسے ہی پارٹی دیا تو وہ میاں، اور بچے اور والد اپنے اصول سے۔ ان پارٹیوں میں عورتیں ڈٹ کر گپ شپ کرتی ہیں اور کرسیوں پر خاموش بیٹھ جاتی کبھی آپس میں ایک آدھ بات کرتی تو غنیمت، ورنہ اکثر خاموش بیٹھی رہتیں۔ ہاں ایک دوسرے کے زیورات اور لباس خوب غور سے دیکھتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر دوسری عورت کے شوہر کی مالی حالت اور سماجی رتبہ کا بھی اندازہ کر لیتی ہیں۔

ایسی پارٹیوں میں گفتگو کے موضوع بھی اکثر ایسے ہی ہوتے جن پر نہ کسی قسم کی بحث ہو سکے اور نہ فساد وغیرہ تہذیب کی آخری حد ہے۔ اس طبقے کے شخص اگر قتل ہو کر زندہ ہو جائیں تو شاید قاتل کو بھی سکرا کر یہ کہہ کر چلا دیں گے۔ دل میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن زبان شیریں ہونا ضروری ہے۔ آدمی تو پھر بھی شراب پی کر کچھ بات چیت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن عورتیں بت بن کر بیٹھی رہتی ہیں۔

اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہو کر میں نے محسوس کیا کہ میں خواہ مخواہ گفتگو میں کسی بھی طبقے کے لئے کافی ہوا کھو نہیں ہے۔ شریفانہ نشست گیر، شریفانہ گوش اور شریفانہ تو بہت ہی کہیں زیادہ کافی ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرے دل کو تسکین ملتی ہے۔ اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کسی سے کسی بھی صورت میں کم نہیں ہوں۔ گفتگو کا سلیقہ مجھے ان سے زیادہ ہے۔ میں دنیا کے واقعات سے واقف ہوں۔ مردوں سے بھی ہم کلام ہو سکتی ہوں۔ کالج میں ان کے ساتھ خوب بات چیت کرتی بھی تھی۔ میں یا تو تقی کر معلوم کر

کن کن موضوعات پر گفتگو کرنی پسند ہے۔ میں ان مضامین کا اچھی طرح مطالعہ کرتی۔ یہ عورتیں ان میں دہلی کے ساتھ ملی جلتی تھیں۔ ان عورتوں کی عورتیں اخبار گھر میں منگاتی ضرور ہیں۔ لیکن اس میں صرف سینما کے اشتہارات یا بڑی بڑی دکانوں کے اشتہارات ہی دیکھتی ہیں۔ انھیں سیاسی اور دنیاوی واقعات میں دلچسپی اسی وقت ہوتی ہے جب ان کے خاندان کا اس واقعہ سے قریب یا دور کا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن میں ان اخبارات کو شروع سے لیکر آخر تک خوب غور سے مطالعہ کرتی تھی۔ اور شائع شدہ واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان پارٹیوں کی بات چند جملے کہے بغیر دل ہی نہیں مانتا۔ اس طبقے کے لوگ دوسروں کو اسی وقت مدعو کرتے ہیں جب ان کا کوئی ذاتی فائدہ اور مطلب ہوتا ہے۔ اس کو تہ میں پوشیدہ ہو اپنے افسر کو دعوت دیتا ہے۔ اس کی بیوی افسر کی خوشامد کرتی ہے۔ مرد افسر کی بیوی کے حسن و شباب کی تعریف کرتا ہے بغیر کسی واقفیت افسر کی بیوی کے والدین کی تعریفیں کرتا ہے۔ یا پھر پارٹی میونسپل بورڈ کے کسی سپرنٹنڈنٹ یا مرکزی، کار کے کسی وزیر یا ڈپٹی وزیر کو دی جاتی ہے۔ جس سے وہ کسی دن کام آسکے۔ کام اس سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اسکے کام آنے کی امید تو ہوتی ہی ہے۔

جس سے کوئی اس قسم کی امید نہ ہو محض دوستانہ تعلقات ہی ہوں اسے اس طبقے کے لوگ بہت کم دعوت دیتے ہیں۔ ہاں اگر ان کا کوئی دوست سماج میں غیر معمولی مرتبہ رکھتا ہو یا مالدار ہو کیونکہ یہ اپنا نہیں تو کسی رشتہ دار کا بھی کام نکلتا ہو تو اس رشتہ دار کو احسان مند بنانے کیلئے بھی یہ لوگ اس امیر دوست کو دعوت دیتے ہیں۔ زندگی کے اس معاملے میں یہ سب اسے باعث خوشی کرتے ہیں اور اسکے لئے انھیں یہ کچھ بھی ناجائز محسوس نہیں ہوتا ہے۔

یہاں مسوری ہی میں پتہ چلا کہ ایک مدراسی گھرانہ ایک گورنر صاحب کی خاطر خوشامد میں گزشتہ چھ سالوں سے لگا ہوا ہے۔ گھر کے لڑکے کی عمر صرف دو سال کی تھی۔ ان کا خیال تھا اب تک بھی ہو کہ جس وقت ان کا لڑکا بیس سال کا ہوگا، گورنر صاحب اس وقت تک مدد کے عہدے پر پہنچ جائیگے۔ اس وقت تک اپنا مطلب نکالنے کیلئے انہیں ایسا مشکل ہو جائیگا اسلئے سالوں پہلے سے خاطر خوشامد شروع کر دی گئی۔ مکمل طور پر تو معلوم نہیں لیکن شاید اب بھی وہ گورنر صاحب کی خاطر خوشامد میں [illegible] لگے ہوئے ہیں۔

[illegible] خوشامد میں ماہر اور بڑی باتوں کی داستان کہلا کر سب بولا جائے۔
یہ لوگ چند مصور جو پیروں کا پیٹ کاٹ کر اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔ مجھے
[illegible] مصور کی مشتاق ہیں۔ کے لئے فرضی کے بے مصروف
سادہ سمجھ [illegible] لگے اور افسر کے گھر پہنچ کر اس کی [illegible]
بھیجیں گے —

مسوری ، شملہ اور نینی تال کی زندگی میدانی شہروں کی زندگی سے
قطعی مختلف ہے ۔ یہاں آنے والے خود کو بہیں کی زندگی میں [illegible] ہیں۔
کیپٹن وحید بیند اور کا دیری و دیدی کی باہم خوب پٹ رہی تھی ۔ دیدی
کی اس کی تعلیم ہی کتی کہ منہ میں پان رکھ پلنگ پر سوئے پر یوں کر دنیا بھی کتی
کرتی اور ساتھ میں تاش کے پتے ہیں یا ان کی سلائیاں ، ہاتھ خود بخود مشین
کی طرح کام کرتے رہیں گے اور زبان اپنی جگہ کام کرتی رہے ۔ میں معلوم
کئی ۔ ہماری رشتہ دار عورتیں کچھ اور کرتی تھیں صرف چارپائی پر بیٹھ کر
باتیں بناتی رہتی ہیں ۔ انھیں دنیا کی کسی سیاست اور فلسفے سے کوئی
دلچسپی [illegible] دیدی اور وحید بیند سے وہ دو دو رہتی ۔ نہ جانے کیوں
دیدی کو مجھے اپنے قریب دیکھ کر جھنجھلاہٹ سی ہوتی ۔ میں کسی طرح بھی
یہ جھنجھلاہٹ برداشت نہ کر پاتی ۔ اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی رہتی
رہتی — وہاں سے اٹھتی —

کچھ دن مسلسل بارش کے بعد آسمان نکھر آیا تھا ۔ اپریل کا آخری
— سے میرے [illegible] تھی ۔ میں ہلکے دھانی رنگ کا شال اوڑھ کر
باہر گھومنے نکل گئی ۔ تمام راستے یہی خیال میرے ذہن پر چھایا رہا کہ کیا
مرد کی محبت صرف دیدی کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے ؟ کیا محبت حاصل کرنے
کیلئے نگوڑا ہونا ضروری ہے ؟

میں [illegible] کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی ۔ بچی آ رنگ سا لڑکا تھا
[illegible] کے بہت قریب ہی تھے ۔ ان کے ساتھ نہایت ہی حسین نظر
آ رہا تھا ۔ میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ محبت پانے کے لئے گورا
ہونا [illegible] نہیں ۔ جہاں تک میں نے سنا تھا لیلیٰ بھی کالی ہی تھی ۔
[illegible] بازار میں پہنچ گئی ۔ ایک چھوٹے سے
کافی ہاؤس میں جا بیٹھی ۔ میرا دل [illegible] پریشان
تھا ۔ [illegible] کسی طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی ۔
میں نے کافی کا آرڈر دے کر [illegible] کہ نہ
[illegible] — [illegible] کالی لڑکی کے

متعلق کوئی تذکرہ نہیں — میرا دل مصنفوں کے اس فقرے سے
بھرا تھا ۔ سب ایک جیسے ۔ کسی نے بھی یہ خیال نہیں کیا کہ کالی لڑکی کو بھی
کسی ناول کی ہیروئن بنایا جا سکتا ہے ۔ بنکم چندر نے اندھی لڑکی کو منتخب
کیا اور رویندر ناتھ ٹیگور نے بے زبان لڑکی کو ۔ لیکن دونوں میں سے
کسی نے بھی کالی لڑکی کو ہیروئن بنانے کی ضرورت نہ سمجھی ۔
کافی کا ایک گھونٹ گلے سے اترنے کے بعد میرے ذہن نے دل
سے کہا — تو خواہ مخواہ درد و غم سے شکستہ ہوا جا رہا ہے — تجھے
تو ٹھوس اور مضبوط ہونا چاہئے ۔ دیدی کی بھی کوئی زندگی ہے ؟ بچے
نے تنگ کیا تو خاموشی سے برداشت کر لیا — جیسا بھی نیا چلا ہوا
اس نے خود کو ڈھال لیا — دل ابلا تو اسے ابلنے دیا اس کی بھاپ بھی کسی کو
نظر آنے دی — آخر دیدی اور قدیم زمانہ کی عورتوں میں فرق ہی کیا
ہے ؟ خاندان کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کر رہی ہیں ۔ دل ہی دل میں سسکتی
ہیں ۔ ظاہر کچھ نہیں کرتیں ۔ گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلتی ہیں تو کیا؟
گھر میں پتی سے محبت کہاں مل پاتی ہے ۔ پہلے بھی عورت اسی طرح تھکی
جاتی ہے پہلے بھی اس کے جسم ہی حسن کو تلاش کیا جاتا تھا — آج بھی
اسکی شخصیت بے معنی ہے اور جسم با معنی جسم مرد کا دل بہلایا کرتا ہے ۔
شاید اسی وجہ سے عورت آج بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے —
ممی ، پپی ، دیدی وحید بیند جیسے آوارہ شخص سے اس قدر کھل کھل
کر گفتگو کس طرح کرتی ہیں —
جس وقت میں نے کافی پینی شروع کی تھی میرا دل تکلیفوں اور
پریشانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ اب تو کافی ہی کڑوی تھی وہ سب منہ کا
ذائقہ بھی تلخ تھا — باہر آسمان کچھ صاف ہو گیا تھا — میں نے کافی ہاؤس
میں نگاہ دوڑائی ۔ میرے قریب والی میز پر ایک مصور بیٹھا تھا ۔ اور
اس کی بغل میں اس کا ایک دوست ۔ مصور کے دوست نے تصویروں کی
نمائش کا ایک اشتہار میری طرف بڑھا دیا ۔ نمائش ایک روز پہلے شروع
ہو گئی تھی — دوپہر گیارہ بجے سے ایک بجے تک اور شام کو تین بجے سے پانچ
بجے تک کھلتی تھی — میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں دیکھا سوا گیارہ بجے کا وقت
تھا ۔ مصور کے دوست نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور آہستہ سے کہا ۔
" آپ نمائش میں جانا چاہتی ہوں تو ہم بھی وہیں جا رہے ہیں — آپ ہمارے
ساتھ چل سکتی ہیں "
میں نے دیکھا مصور سمپورن کا فی پلا اور مجھ پر سے جسم کا [illegible]

پہلا ٹکڑا اگرچہ علاوہ دست نہایت خوبصورت اور مضبوط نظر آرہا تھا — میں نے بیرا سے بل منگوایا تو وہ ان دونوں کا بل بھی لے آیا — میں نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی طرف دیکھا کیا وہ اسقدر بے تکلف ہو سکتے ہیں؟ فوراً ہی نمائش کا انتظامیہ اسباب اپنی کرسی کا بل بھی آگے بڑھا دیا — وہ شخص جس نے مجھے اشتہار دیا تھا اسکا نام چیتن تھا — یہ اس نے بعد میں مجھے بتایا —

چیتن نے آگے بڑھ کر ذرا مسکراتے ہوئے کہا "ارے، نمائش کا ٹکٹ بھی تو ایک روپیہ ہے صاحب نہ دیجئے گا — یہ بل چکا دیجئے — مر بند وہ آنے کا ہیں — آپ کو جانے کی جلدی ہو"

میں حیران رہ گئی — کیسا شخص ہے یہ قطعی ناواقف اور وہ بھی ایک عورت سے ایسی بات کرتا ہے — دل میں ایک بار اشتہار اس کے منہ پر دے ماروں اور اپنا بل ادا کر اپنی راہ لوں — لیکن نہ جانے دل کیوں کسی کا پیڈ دیکھنے کا متلاشی تھا، میں نے ان کا بل بھی ادا کر دیا —

نمائش زیادہ دور نہ تھی — جس ریسٹوران میں ہم لوگ بیٹھے تھے اس سے صرف فرلانگ بھر [illegible] فرلانگ تھی — صبر نے میرے ساتھ قطعی گفتگو نہ کی — وہ اپنا پیالہ ختم کر کے تنگ آگے چلنے لگا — اب تک وہ اس طرح خاموش تھا گویا کچھ جدا ہی شخص ہے اس کی خاموشی اور سنجیدگی پر مجھے غصہ آرہا تھا — نمائش کے باہری دروازے پر ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص ٹکٹ فروخت کر رہا تھا — مجھے چیتن اور صبر کے ساتھ آتے دیکھ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا — میں نے بہت فخر محسوس کیا — میری خودداری کچھ نرم ہو گئی — دل نے کہا چلو یہاں تو کم از کم مجھ سے بے رخی اور نفرت، حقارت کرنے والا تو کوئی نہیں ہے — ان لوگوں کو کیا معلوم کہ گھر پہ میرے ساتھ کس قدر لاپرواہی کا سلوک ہوتا ہے —

نمائش ہال میں جا کر دیکھا تو دو غیر ملکی مرد اور عورت گھوم پھر کر نمائش دیکھ رہے تھے — ہندوستانی اس جگہ ہمارے سوائے اور کوئی نہ تھا — مجھے سخت غصہ آیا کہ اس طرح کی قیمتی نمائشوں کو لوگ اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ کہیں کوئی سنیما ہو تو ہزاروں کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے گی —

نمائش میں داخل ہوتے ہی صبر کی سنجیدگی اور خاموشی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی — نہایت جوش و خروش اور خوشی سے مجھے ان تصویروں کی اہمیت سمجھانے لگا — وہ تصویریں نہ تو فوٹو تھیں اور نہ کارٹون، جو میرے گھر کی خوشنمائی ہے جو گھروں میں تقریباً سبھی تصویریں بنی ہوئی تھیں — میں نے سنا اور دیکھا تھا کہ اکثر موجودہ مصوروں نے [illegible] تصویروں کے ذریعہ [illegible]

کو پیش کرتے ہیں یا خود محسوس کرتے ہیں — اور تیز ہی ٹیڑھی لکیروں سے کچھ جو کچھ نقش کرتے ہیں اس میں جذبات سے کہیں زیادہ اہمیت خاکہ اور صورت کو دیتے ہیں — کیونکہ ان کا مقصد ذہن میں نہیں آتا — صبر مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا — "کیونکہ درست متعدد چیزوں کو ان کی خوبیوں کو چھوڑ کر کسان لکیروں یا دائروں کو منتخب کر لیتا ہے جو اس چیز کی خصوصیت ظاہر کر سکے — پھر چیزوں کے نقوش اور خاکے کی بجائے وہ لکیروں اور زاویوں کا ہی استعمال کرتا ہے"

پورے کمرے بھر میں صرف ایک ماں اور بچے کی تصویر کو چھوڑ کر اور کوئی بھی دوسری ایسی تصویر نہ تھی جسے سمجھا جا سکے — میں نے سوچا کون اس گورکھ دھندے کو دیکھنے آئے اور اپنا وقت فضول برباد کرے —

صبر کو امید تھی کہ میں تعریف میں چند الفاظ کہوں گی — مجھے خاموش دیکھ کر وہ پست ہمت ہو گیا — ہر تصویر پر قیمتیں لکھی ہوئی تھیں — کسی کی قیمت پانچ سو تھی، کسی کی دو سو — ان بے تکی تصویروں میں سے ایک خرید لینے سے کیا ہوگا؟ کچھ خاص نہیں — شاید ان لوگوں کا چند دنوں کا کھانا فراہم ہو جائیگا —

میں نے صبر کی طرف دیکھا — وہ میرے چہرے پر ہونے والی تبدیلیوں کو نہایت باریکی سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا —

پھر وہ آہستہ سے بولا "آپ کل ابرار کی بیٹی کی بہن ہیں نا؟"

مجھے گویا کسی نے آسمان سے لا کر زمین پر پٹک دیا ہو — یہاں بھی میرا وجود گویا کچھ ہے ہی نہیں — اگر کچھ ہے تو کل ابرار کی وجہ سے [illegible] میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اس کے سوال کا جواب دینا مشکل معلوم ہو رہا تھا — لیکن جواب تو آخر دینا ہی تھا —

"جی ہاں"

"تو ایک تصویر خرید لیجئے نا" چیتن نے بیچ میں شوشہ چھوڑا —

میرے پاس اتنی رقم کہاں تھی — میں نے محسوس کیا گویا یہ دونوں مل کر میرا مذاق بنا رہے تھے — میرے دل میں [illegible] رہے تھے —

میری ساری [illegible] ختم ہو کر [illegible] رہ گئی تھی — مجھے [illegible] رہی تھی — اپنی حیثیت سے [illegible] کی وجہ سے [illegible] — یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت [illegible] زندگی کی حقیقتوں سے [illegible] نظروں میں بہت بڑی قیمت رکھتی تھیں —

حقیقت [illegible]

[illegible]

[illegible] برداشت نہ کر سکیگے

[illegible]

کچھ بھی نہیں ہے

[illegible] نہیں کیا ہے

جی نہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

* —— * *

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آپ [illegible]

[illegible]

[illegible]

بہ نسبت پہلے [illegible] کہیں زیادہ [illegible]
مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے ہیں کہ [illegible]
خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ہم مستقبل کو ہمیشہ [illegible]
[illegible] کی [illegible] میں بہت [illegible]
بچے اپنے مستقبل [illegible] سے غور کرنے کی عادت سی
ہو گئی تھی۔ [illegible] محسوس کرنے لگی [illegible] تعلیم کے [illegible]
[illegible] کی گنجائش نہیں۔

انہیں خیالات میں گھومتے گھومتے یکایک مجھے خیال آیا کہ
کہیں [illegible] چاندی کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ [illegible]
[illegible] تعلیم [illegible] آ [illegible] سکتی ہیں گی۔

دوسرے دن [illegible] بحث [illegible]
[illegible] دیکھی [illegible] اور [illegible]
[illegible] شوہر کے خلاف [illegible] کیا۔

جب میں [illegible] کا [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
مرد [illegible] عورت [illegible] حاصل کر لیتا ہے اور سب [illegible]
اس کے حوالے کر کے اس کی [illegible] تو مرد کو ایک [illegible]
[illegible] حاصل ہوتا ہے۔ مرد کو عورت کا [illegible]
[illegible] جس [illegible] اپنے [illegible] کے [illegible]
[illegible] ایک [illegible] ہے جس میں [illegible]
ہے جس [illegible]
ہے اس کے [illegible] کی طرح [illegible] ہے۔

شادی شدہ زندگی کے ابتدائی [illegible] میں [illegible]
کہہ کر پکارتا ہے تو عورت بھی اسے [illegible] کہہ کر پکارتی ہے۔
[illegible] ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اور جب [illegible]
گزر جاتا ہے تو مرد محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت اب صرف ایک
[illegible] کر رہ گئی ہے اس کے [illegible]
وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت نے اس کی سب سے [illegible]
[illegible] ہے۔ اس کی [illegible]
[illegible] کر رہ گیا ہے۔ [illegible]
[illegible] کو [illegible]

سمجھا جاتا رہتا ہے۔

کل شام کاویری کی گفتگو چلتی رہتی۔ مجھے تو وہ کبھی کبھی کام [illegible]
پتہ نہ تھے۔ میں خود بھی ان سے کچھ نہ کہہ پاتی تھی اور نہ میرا منہ
کاویری کے سامنے کھل سکتا تھا۔

کبھی کبھی میں خود کو ایک مجرم سمجھتی۔ سندری شہر کی آمد و رفت
میرے وہاں پہنچنے کے بعد ویدی کے گھر پہ شروع ہوگئی تھی۔ وہاں میں آکر
سندری نے اپنا [illegible] تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے گھنے لمبے
بال لڑکوں کے بالوں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔ کبھی وہ ساڑی میں ہوتی
تو کبھی اسکرٹ میں اور کئی مرتبہ تو وہ اونچی پتلون پہن کر بھی چلی آتی
تھی۔ اس کی پتلون گھٹنوں سے اوپر ہوتی۔ پتلون کے ساتھ وہ
چھوٹا سا بلاؤز پہنتی تھی اور بیک سے [illegible] ہوئے [illegible]
بنا دیتے۔ سندری کی نگاہیں [illegible] کی طرح [illegible] کی فوراً
شناخت کر لیتی تھیں۔ جب تک میں لکھنؤ میں تھی سندری ایک مرتبہ بھی ویدی
سے ملاقات کرنے نہیں آئی تھی۔ اب جب وہ آنے لگی تھی تو یہ کس طرح
ممکن ہو سکتا تھا کہ [illegible] متاثر نہ ہوتے۔

سندری میرے ساتھ ہی ایم۔ اے میں پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں
کا مضمون ایک ہی تھا۔ سندری کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی ادب لے
لیکن یہ خیال آنے پر کہ انگریزی کے نوٹس کون لکھے گا۔ اس نے انگریزی
لینے کا خیال تبدیل کر کے ہندی لے لی۔ کیونکہ میرے ہندی کے نوٹس
اس کے بھی کام آجائیں گے، یہاں تکلیف کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ایک دن سندری نے مجھے ایک مجلس ادب میں اپنے ساتھ چلنے کی
دعوت دی۔ ادب سے سندری کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے سوائے
اس کے کہ اس نے ایم۔ اے میں صرف پڑھنے کے لئے یہ مضمون منتخب
کیا ہے۔

مجھے سندری کے ساتھ جانے میں کچھ [illegible] تھا۔ لیکن
[illegible] دیکھنے کی مجھے خواہش تھی۔ ویدی کبھی کبھی [illegible] کے ساتھ
[illegible] اور کبھی [illegible] کے ساتھ باہر چلی جاتیں۔ میرے ساتھ تو
کبھی سینما دیکھنے چلا جایا کرتی تھیں۔ [illegible] خواہش ہی ویدی کو
[illegible] ہوتی تھی جب [illegible] کر دیتی۔ اس [illegible]
[illegible] تمام [illegible] کسی بھی طرح [illegible]
[illegible] تھیں۔ [illegible] مجھے سینما دیکھنا [illegible] تھا۔

کالج کا پہلا سال ختم ہو چکا تھا۔ میں ایم۔ اے۔ کے آخری سال
میں پہنچ گئی تھی۔ سندری ایم۔ اے۔ کے پہلے سال میں [illegible]
[illegible] اس کے لئے محض معمولی سی تھی۔ وہ [illegible] کافی [illegible]
رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ [illegible] کی
زندگی میں [illegible] ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ
میں گھوم پھر کر زندگی کو دیکھوں [illegible]
فطرت کی آگ میرے دل میں اس وقت بھی [illegible] رہی تھی۔ جب سے
میں یہاں آئی تھی ماں کے صرف دو خط آئے تھے۔ ماں ویدی کو ہر ہفتہ
[illegible] خط لکھتی تھیں۔ اس میں میرے لئے صرف چند سطریں ہوتی تھیں۔
گرمیوں کی تعطیلوں میں لکھنؤ جانے کی خواہش تھی۔ لیکن ماں اور پتا جی
مسوری چلے گئے۔ اتنے میں اور ویدی بھی چلے گئے۔ کمل بابو بھی چند
دنوں کے لئے وہاں آگئے تھے۔

مسوری میں [illegible] ہمارے ساتھ [illegible] رہا تھا۔ ہم لوگ
سارا دن اس کے ساتھ کھیلتیں بات چیت کرتیں۔ ویدی تو ہر وقت
اسی میں مصروف رہتی تھیں۔ میں تو کبھی کبھی اپنی کتابوں میں الجھ
جاتی تھی۔

کاویری ویدی کو کمل بابو [illegible] دی تھی جس میں
وہ گھومنے جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔
آج جب سندری نے مجھے مجلس ادب میں چلنے کے لئے کہا تو میں نے
اسے صلاح دی کہ ویدی سے [illegible] لے لی جائے۔ لیکن اسے میری تجویز
پسند نہ آئی۔ شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے اس نے کہا۔ لیکن
خواہ مخواہ [illegible] ہم اکیلے ہی چلیں گے [illegible]
ہے۔

سندری نے [illegible] کہ میرے دل میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

میں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ابا نے پیکٹ کھول کر اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ڈیڈی کو اس
طرح پیش کیا جیسے سگریٹ پیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ یہ بات کس طرح
ناقابلِ یقین ہے اس کا مجھے اندازہ ہو گیا۔

میں جانتی تھی کہ پوچھو گی تو پھر سے سندری نے سگریٹ کی
میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا —

میں سگریٹ پیتی ہوں؟

کیوں اس میں کیا حرج ہے — یہ کہتے ہوئے ڈیڈی میرے
کمرے میں آگئیں۔

میرا کمرہ مکان کی پہلی منزل پر برآمدے کے ایک گوشے میں تھا۔
دوسری جانب جو کمرہ ڈیڈی کا تھا ان کا بھی یہاں آنے جانے
والی عورتوں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ مگر جب سے ڈیڈی کی ساس یہاں
آنے جانے لگی تھیں وہ کمرہ میں بھی رہنے لگی تھیں۔ برآمدے میں جو دروازہ کھلتا تھا وہ میں نے
تبدیل کروا دیا تھا۔ پھر بھی نہ معلوم ڈیڈی کو کس طرح ہمارے جانے کی
بابت معلوم ہو گیا تھا۔

وہ کئی ہفتوں سے بڑی کمزور ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر گھبرا گئی کہ
جانے وہ کیا کہیں گی لیکن جب ڈیڈی نے خود سندری سے سگریٹ مانگی
تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ سندری کو قطعی تعجب نہ ہوا۔ اس نے مسکرا کر
ڈیڈی کو سگریٹ پیش کی اور اپنی جلا کر اسے سلگا بھی دیا۔

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ڈیڈی نے دریافت کیا — کہاں جا رہی
ہو تم؟

کہیں نہیں — سندری نے مرمریں کی طرح دھوئیں کے بادل
ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

تم نے کیا کر دیا؟ جیسے عجیب چاہتی ہے —

وہ سنو، میں تم جو تیں سے ملوں گی — سندری نے ہنستے
ہوئے جواب دیا ... کوئی خاص مزہ نہیں ہے، لیکن وہاں
جا کر ... سگریٹ پیتی ... اور اگر ...
... کیسے ... چاہو گی —

... سن کر میں ... سندری کا منہ تکنے لگی — میں
... سگریٹ ... اجازت
... سب
... ڈیڈی سندری کی باتیں سن کر

خاموشی اور اطمینان سے سگریٹ پیتی ہوئی برآمدے میں چلی گئیں
ڈیڈی کے جانے کے بعد سندری نے سوال کیا —
تمہاری بہو کیسی پیچھے ہونے والا ہے؟
نہیں تو —
تم بے وقوف ہو — تمہیں کچھ نہیں معلوم — دیکھ لینا میرا اندازہ
درست نکلے گا۔

تمہیں ان سب باتوں کا علم کس طرح ہو جاتا ہے سندری؟
کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں کیا؟
ہیں تو اور خوبصورت بھی ہے۔

جاننے والے آدمی بھی یہی کہتے ہیں — اور میں ان کے ان لفظوں کا
پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہوں۔ تمہاری آنکھیں بھی تو حسین ہیں۔ لیکن
تم نے ان سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا — — — بزدل کہیں کی۔

سندری کے لفظوں سے میرے دل میں نفرت بھری اور میں
تنہائی سے عاجز آ چکی تھی۔ اور پریشان تھی — میں گھر کی چہار دیواری
اور خاص طور پر ڈیڈی کی ساس سے تنگ آ چکی تھی — وہی
پرانی باتیں — بہو، تیرے سسر نے اتنا کمایا تھا کہ ...
ہو جاتا تھا — میں ان باتوں کو سننے کے بجائے ٹال کر سکتی تھی
لیکن میں تمام رقم ... اور ... پر ... کرتی تھی
ان کا سننا ضروری تھی، اور ... میرے کان ... —

ہر مرتبہ ان لفظوں کو سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔

بڑی ... آتیں، ان کے ... میں سونے کی چوڑیاں
ہوتی تھیں، ... کے کڑے ... ہوتے اس عمر میں بھی
وہ یہ سب پہننے سے باز نہ آتی تھیں۔ ... کے وقت
خلاف اور خفا تھیں — پہلے ہی ... اور ایک دو خود بھی خیال
... میری ... حال ... ساس کی ... کرتی ہے وہ
ان کے بارے میں اکثر کہا کرتیں —

ڈیڈی کی ... سے ... میں ... تھی۔ آخر ... کیا
اسی نے کہ میں ان کے گھر میں رہتی ہوں ... سے اس ... تک
... یاد ہو گیا — ڈیڈی کے خلاف ایک ... کے ...
... ابھر آیا —
کپڑے بدل کر میں نے آئینہ دیکھا — رنگ ... تھا — لیکن

چہرے پر ایک عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ کشتو کے چہرے پر بھی پہلی کی بہ نسبت زندگی سے زیادہ بھرپور مسکراہٹ اور مسرت تھی۔

سندری کیسا تعجب ہے کہ اس جھیل میں حقیقتاً نیلی کورٹ۔ دیکھو تو شام کے چھ بجے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ کالج کی ڈبیٹنگ کلب کی میں سیکریٹری رہ چکی تھی۔ کئی مرتبہ چار پانچ سو طالبعلموں کے بیچ تقریر کر چکی تھی۔ وہاں کے حاضرین میری تعلیم اور ذہانت کا امتحان لیتے تھے۔ یہاں میرے رنگ روپ اور میرے لباس میں دلچسپی ظاہر کی جاتی تھی۔ یہاں کی باتیں میں سندری سے بہت کچھ سن چکی تھی۔

[illegible] "سرکاری اعلیٰ افسروں اور بہت سی مشہور لوگوں کے سامنے کا ایک ہوٹل کا بار میں بیٹھا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں محفل سجائی گئی۔ بہت سے ہی بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زور دار بحث چل رہی تھی مجھے اطمینان ہوا کہ چلو ان لوگوں کو مجھ میں دلچسپی ظاہر کرنے کا وقت تو دے گا۔

جب اسے داخل ہوتے ہی کمرے میں تیزی سے چلتی ہوئی بحث جہاں کی تہاں رک گئی۔ ایک بارگی دل تیزی سے دھڑکا۔ پھر مجھے میں نے بہت سے کام لیا۔ سندری نے تعارف کرانے کے بعد میں سب کو نمستے کی۔ میں ہاتھ جوڑتی لیکن وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہاتھ ملانے کے لئے مجبوراً مجھے بھی ہاتھ ملانا پڑا۔

[illegible] کمرے میں ایک شخص سگار کا کش لگا رہا تھا۔ سامنے بیٹھی تھی [illegible] سے [illegible] بیٹھا آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا۔ مگر اس نے ہاتھ نہیں ملایا بلکہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔

[illegible] کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ نیلی کورٹ کون ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہاں تو حقیقتاً کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ گوا ان میں سے کے [illegible] شیشہ کا گلاس لئے ہوئے تھا۔ [illegible] بھرے ہوئے تھے۔ شاید وہ نشے میں تھے [illegible] ملنے دیکھ رہی ہے کہ وہ کتنا کام کرتے ہیں سکتا پہچان سکتی ہے۔

چند لوگ ستر سال سے لیکر چالیس سال کی عمر کے موجود تھے۔ قریباً سبھی لپٹے لباس میں تھی۔ سب کی زبان پہچانی جا سکتی تھی۔ [illegible] جسموں پر سفید لباس اچھے تھے۔ سلکی ہوں جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کہ کہیں بے قصور کتنے بے چین سے تھے۔ تو کسی کے ہاتھ چھوٹے تھے کہ پر شفقت کر کا حکم کر دیا گیا ہو۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پیچیدہ لباس اور خاص بالیاں رکھنا یہ سب جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ چند لڑکیاں دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی سگار پی رہی تھی۔ سگریٹ پیتے ہوئے تو میں بہت سی لڑکیوں کو دیکھ چکی تھی۔ لیکن سگار پیتے ہوئے آج پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکی دبلی پتلی اور مریل سی نظر آ رہی تھی۔ سندری نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ایک نوجوان کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ نہایت گھٹیا قسم کی جنس کر سکتی تھی۔ رنگ ہونٹوں پر کونسا قسم ہے کہ اس نے اگر وہ لال رنگ سے رنگے تھے لگتا ہے خوفناک سا لگ رہا تھا۔ اگر بڑھیا۔ سندری کے منہ کے قریب منہ لا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ سندری! یہ تو کوئی معصوم کی بچی لگتی ہے۔

سندری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سب کو خاموش کر دینا چاہا۔ اس کی تعریف تو میں نے پہلے ہی سن رکھی ہے۔ سندر سے بہتر [illegible]

سندری کا کہنا تھا کہ کہیں یہ نا خوش نہ ہو گی۔

تیرا تو یہ ہی ہے [illegible] کی شرحیں ہیں۔ [illegible] سالی ہے۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

باہر کو ہوئی نسیں صاف چمک رہی تھیں۔ ناخون اسقدر بڑھے ہوئے تھے کہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں میرے ہاتھ میں چبھ نہ جائیں۔ اور وہی ہوا۔ اپنے ہاتھ اس زور سے ملایا کہ میری ہتھیلی میں اس کے ناخون چبھ گئے اور شاید اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں —

سندری نے میرے تعارف میں کمل بابو کا نام کچھ اس انداز سے شامل کیا کہ سنتے ہی لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

پریا نے آہستہ سے میری تھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا "کیا پیوگی؟"

میرے بجائے سندری نے جواب دیا "کافی"

"اوہ، امیر آدمی کافی پیتے ہیں کہیں؟" پریا نے چوٹ کی

"نہیں یہ ذرا پرانے خیالات کی ہیں۔ پہلی ہی مرتبہ باہر آئی ہیں۔ اسے تو آج کافی ہی دو"

وہ لڑکی میرے لئے کافی لے آئی۔ اس کے چہرے سے کچھ ایسے جذبات نمایاں ہو رہے تھے گویا میں قطعی انجان اور پچھڑی ہوئی ہوں۔ کافی دیتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی —— تمہارے جی جاجی بڑے دل والے ہیں۔ میں بھی چھ مہینے ان کیساتھ رہ چکی ہوں۔ انھوں نے مجھے ریس ہوٹل میں رکھا تھا۔ چھ مہینے چٹکیوں میں ختم ہو گئے۔ آج کل میں ایک سیٹھ کے ساتھ ہوں —— وہ موا میری آمدنی پر بھی ہاتھ صاف کر دیتا ہے"

کمل بابو اس پریا کے ساتھ ہوٹل میں رہتے تھے؟ چھی! چھی!! یہ لڑکی تو نہایت ذلیل نظر آتی ہے۔ میرا جسم فرط سے لرز رہا ہے۔ لیکن میں اسقدر گندی تو نہیں ہوں۔ بھگوان جانے وہ اس کے ساتھ کسطرح رہے ہونگے؟

پریا اپنی کرسی کو اور بھی قریب کھسکاتے ہوئے بولی —— آج کل کمل بابو سندری کے ساتھ رہتے ہیں —

گویا میں آسمان سے زمین پر آگری —— وہ بیٹی میری طرف دیکھ کر سگار کے دھوئیں کے مرغولے بناتی ہوئی — اور آہستہ سے ہنس پڑتے ہوئے بولی —— لیکن وہ سندری کو کبھی ہوٹل میں نہیں رکھتے — بلکہ وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے"

میں نے کسی طرح ہمت کر کے پوچھا "کہاں رہتی ہے یہ"

"یہ تینوں اور لڑکیوں کیساتھ رہتی ہے۔ انہوں نے کناٹ پلیس کے قریب ہی ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے۔ کمل بابو اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ اُس کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ہے"

"سندری کی بہن تو یہیں رہتی ہے نہ؟"

"ہاں، لیکن اس نے دو سال ہوئے بہن کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا ہے اور پھر بہن کا کام تو اسے دہلی میں لانا تھا سو اب اسے آئے ہوئے چار سال سے زیادہ ہو گئے، لیکن ابھی تک یہ اپنا سلسلہ تلاش نہیں کر سکی۔ یہ اس کی اپنی کمزوری ہے، بہن کی نہیں"

"سلسلہ" اور "کمزوری" کے لفظوں نے میرے دل پر ایک عجیب و غریب اثر ڈالا — مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے منہ کا ذائقہ کافی سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا ہے۔ میرے دماغ میں سب سے پہلا سوال اٹھا کہ کیا دیدی کو اس واقعے کا علم ہے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ اسکے شوہر کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور رکھتے ہیں؟ کیا یہاں یہی فیشن ہے کہ امیر آدمی اپنی بیوی کے علاوہ ایک نہ ایک دوسری لڑکی کو بھی رکھیں؟ کیا یہ سب کرنا تہذیب میں شامل ہے؟ میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی ایک سوالات اٹھ کھڑے ہوئے —

پریا کا سلسلہ گفتگو ابھی اور جاری رہتا کہ ڈاکٹر اندر دھش آگئے۔ سب کے سب مرد اور عورتیں ان کی پیشوائی میں کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر اندر دھش بھی قریب پینتالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کے ہونگے۔ وہ بھی کھادی کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر کالی موٹے شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا — بال کھچڑی ہو گئے تھے — ان کے ہونٹوں پر ایک پُر معنی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جو ان کی شرافت میں شک پیدا ہونے کی گنجائش نہ ہونے دیتی تھی — بلکہ دیکھنے والے کے اس خیال کو اور بھی مضبوط بنا دیتی تھی۔ پریا نے میرا تعارف ان سے کرایا — اور گویا میرے قریب بیٹھنا ان کا مکمل حق ہو وہ میرے قریب ہی آبیٹھے۔ بات چیت کرنے لگے — میری تعلیم کی بابت دریافت کیا — مجھے کلام پڑھنے کے لئے اصرار کیا۔

دوران گفتگو انھوں نے کہا —— یہ ہندوستان ہے ورنہ مجھ جیسے ادیب اور مصنف کو کس چیز کی کمی ہو سکتی تھی! میں نے چھ ناول لکھے۔ میرا سب سے پہلا ناول "کسوٹی" کئی ہزار کی تعداد میں بک چکا ہے۔ "پریم کی بھگتان" کی تو امید ہے فلم بھی بن جائے"

میں نے ڈاکٹر اندر دھش کی دو تین کتابیں پڑھی تھیں۔ مجھے ان کی ٹیکنیک بے حد پسند تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نہایت مستقل مزاج

اور سنجیدہ مصنف ہونگے۔ دکھاوٹ اور بناوٹ کو ناپسند کرتے ہونگے۔
لیکن یہاں حالات ہی مختلف تھے۔ وہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے
تھے۔ میرے یہ ظاہر کرنے پر کہ میں نے ان کی دو ایک کتابوں کا مطالعہ کیا ہے
وہ بڑی ناراضگی سے بولے "کل تم میرے گھر پر آؤ۔ میں تمھیں اپنی کتابوں کا
مکمل مجموعہ دونگا۔ پھر کر تم تنقید لکھو۔ تمھاری جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو
ادب کی دنیا میں آنا چاہئے۔ مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ تم تنقید بھی لکھتی ہو"
میں نے پھیکی پھیکی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورتیں بڑی
دلچسپی بھری نظروں سے تاک رہے ہیں۔ اس روز میٹنگ کے بعد جب
میں سندری کے ساتھ گھر واپس آئی تو راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ جب
ڈاکٹر اندر دھنش کو ادب سے کوئی آمدنی نہیں ہوئی تو انھوں نے ہومیوپیتھی
کی ڈگری لے لی۔ لیکن کبھی پریکٹس نہیں کی۔ اب ملک کی زبان ہندی ہو جانے
سے وہ کافی مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کی جو کتابیں ان کے گودام میں پڑی ہوئی
تھیں، وہ آج اچھے اچھے گھروں کی الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔
سرکار کی طرف سے ان کو انعامات بھی مل چکے ہیں۔ سندری نے یہ بھی بتایا کہ
وہ خود بھی انعامات دینے کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں ہوتے ہیں۔

اسی میٹنگ میں ڈاکٹر اندر دھنش کے ذریعہ ایک ریزولیوشن رکھا گیا
کہ مقامی ادیبوں کی طرف سے ایک ادبی رسالہ شائع کیا جائے جس کا ایڈیٹنگ
ڈاکٹر اندر دھنش کریں یا ان کی امداد کے لئے دو تین نوجوان مقرر کئے
جائیں۔ اس رسالے کے سرپرست کمل بابو ہونگے مطلب ان سے روپیہ مانگنے
کا کام میں اور سندری کریں گے۔

مجھے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ یہاں پر ہر شخص کمل بابو اور سندری کے
باہمی تعلقات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر بھی کوئی انھیں ناجائز نہیں مانتا اور اس
سلسلے میں انھوں نے اس طرح بات چیت کی گویا ان تعلقات کی کوئی خاص
اہمیت نہ ہو۔

میرا یہ خیال کہ ادیبوں کی میٹنگ میں کچھ ادبی تذکرہ و تبصرہ ہوگا
قطعی غلط نکلا۔ وہاں جو لوگ اکٹھے ہوئے تھے وہ ادب کے نام پر دوسرے
لوگوں کو قریب دیکھ کر ملتے تھے۔ اور مل کر شراب پی جاتے تھے۔
جو عورتیں تھیں ان میں سے کچھ تو کانوں پر ٹیلیفون گرل کا کام کرتی تھیں اور
وہ ماسٹرنیاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک تھوڑی بہت گفتگو سندری
کر رہی تھی۔ سندری نے بتایا کہ اس لڑکی کے لئے ایک نیا شاعر لکھ دیتا
ہے اور وہ اس لڑکی کے نام سے شائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لڑکی ہے۔

ڈاکٹر اندر دھنش نے بھی کہا تھا کہ انھیں شاعروں سے سخت نفرت ہے۔
کیونکہ صرف ایک دو کو چھوڑ کر باقی ہوتے کچھ اور ہیں، خود کو کچھ اور ہی
ظاہر کرتی ہیں اور خطرناک طریقے سے نازک مزاج ہوتی ہیں۔

اس دن مجلس سے واپس آتے آتے نو بج چکے تھے۔ دیدی اپنی
ساس کے ساتھ سینما گئی ہوئی تھیں۔ اکیلے کمل بابو چپ چاپ کھانا کھا رہے
تھے۔ مجھے اور سندری کو آتے دیکھ کر وہ لمحہ بھر حیرت سے دیکھتے رہے۔
پھر مسکرا کر بولے "آئیے، آپ لوگ بھی کھانا کھائیے۔"

کمل بابو سے میں گزشتہ چھ سال سے واقف تھی۔ آج وہ مجھے
پہلی مرتبہ اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دے رہے تھے۔ اور وہ بھی تنہائی
میں نہیں سندری کی موجودگی میں۔ کچھ دیر پہلے ہی میں سندری اور
ان کے متعلق سن کر آرہی تھی میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ میں ان
لوگوں کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاؤں۔

میں نے آہستہ سے سندری سے کہا "تم کھانا کھاؤ۔
مجھے بھوک نہیں ہے اور جی بھی نہیں چاہتا۔"

سندری کمل بابو کے پاس ہی اسی میز پر بیٹھ گئی۔ میں نے چھپ کر
دیکھا چند لمحوں میں وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگے تھے۔ انھیں اس طرح بات
چیت کرتے ہوئے دیکھ کر افسوس اور درد میری آنکھوں آنسو بن کر چھلک
اٹھے۔

میں کافی دیر تک روتی رہی۔ دس بجے کے قریب جب دیدی
واپس آگئیں تو سندری اور کمل بابو وہاں سے جا چکے تھے۔

میں اس رات دیدی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ جیسے
گویا کوئی کڑوی چیز نگل کر حوالات میں لے آیا تھا۔ دیدی نے کمل بابو
کے متعلق کچھ بھی دریافت نہ کیا۔ صرف نوکر سے اتنا ہی پوچھا صاحب نے
کھانا کھا لیا؟

ملازم کے ہاں کہنے پر وہ خود بھی کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ ملازم نے
دیدی سے کہا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ لیکن دیدی نے نہ کھانے
کی وجہ دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ نہ انھیں یہ خیال ہوا کہ کہیں
میری طبیعت تو خراب نہیں۔ اس بے رخی نے میری حیرانگی میں اور بھی
اضافہ کر دیا۔ میرے ضمیر نے مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا۔ کب تک
دوسروں کے سہارے پڑی رہوگی؟ آنسو اپنے تکیے پر گرتے جاتے۔
وہ رات میری زندگی کی ایک اہم رات تھی۔ دیدی کی پھٹکار میں نے

سو رہی تھیں۔ وہ اپنے خاوند کے سلوک سے خوش تھیں یا عادی ہو چکی تھیں۔ اور خاوند سندری کے ساتھ نہ جانے کہاں قیام فرماتے۔ کافی رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ کمل بابو اور سندری کا تعلق بی جی پر اتنا ظلم نہیں ہے جیسا ان پر۔ ماں اپنے داماد کو اپنے نازک جذبات کے پھولوں میں تولتی رہی ہیں۔ داماد کے ہر قدم کے نیچے وہ کلیاں بچھاتی رہی ہیں۔ داماد مجھے نفرت اور حقارت سے ٹھکراتی رہی ہیں۔

بستر پر پڑے پڑے میرے دل و دماغ کی تاریکی گویا روشنی میں تبدیل ہو اٹھی۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

اور یہ طے کر کے کہ صبح ہوتے ہی ماں کو ایک خط لکھ کر بتا دوں گی کہ ان کے عزیز ترین داماد کیا کیا گل کھلا رہے ہیں۔ میں سو گئی۔

غم کی تپش انسان کو کندن بنا دیتی ہے۔ ایسا عوام کا خیال ہے۔ جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ غلط بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ غم برداشت کرتے کرتے انسان زندگی سے مجبور ہو اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی چڑچڑی بن جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی وہ نہایت گھٹیا گری حرکات پیدا اتر آتا ہے۔ رنج و غم نہیں، خوشی انسان کو خوشحالی میں انسان اپنے دل سے دوسروں کے لئے دشمنی اور کدورت کے جذبات دھو ڈالتا ہے کہ دیدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں گھلتی رہتی میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اکثر انھیں جھجک محسوس ہوتی۔ اپنے غم سے غم زدہ ہو کر انھوں نے سگریٹ پینی شروع کر دی تھیں۔ ابھی تک صاحب ساس سے چوری چوری سگریٹ پیتی تھیں لیکن کمل بابو کو علم تھا۔ انھوں نے دیکھتے ہوئے بھی منع نہیں کیا۔ نہ انھوں نے یہ دریافت کیا کہ سگریٹ کیوں اور کیسے پینا شروع کیا؟ میں سمجھ گئی تھی کہ سندری نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوا اٹھتا کہ کیوں نہ دیدی پر ظاہر کر دوں کہ یہ گوری سی سندری ولن بنے چکا ہی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے ارادہ کیا، لیکن نہ جانے کیوں ہر مرتبہ تہذیب نے میری زبان بند کر دی۔

کوشش کر کے بھی میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اپنی کتابوں کے بیچ میں سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن ہزار چاہنے اور کوشش کرنے پر بھی میں تعلیم میں اپنی تمام طاقت صرف نہ کر پا رہی تھی۔ مجھ سے نفرت کے باوجود سندری کی آمد و رفت ہمارے گھر میں ہوتی تھی۔ لیکن وہ کبھی کمل بابو سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔

سندری اور میرے کہنے پر کمل بابو نے پانچ ہزار روپیہ ڈاکٹر مشرا کو رسالہ نکالنے کے لئے قرض دے دیے تھے۔ میں خود تو کمل بابو سے صاف صاف کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ ہاں سندری کی کالا لیکر ہو اچھے بہت چیتا ہوئی۔ اور روپیہ سندری نے ہی مانگے تھے۔ رسالے کا پہلا نمبر ابھی شائع نہیں ہوا تھا۔

جب کبھی سندری مجھ سے ملنے آتی ان اداریوں کی سرگرمیاں اور نئی نئی خبریں بیان کرتی۔ اس کے بیانات ان میں میری دلچسپی بڑھا دیتے تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کی باتیں آتی رہتی تھیں۔ میرا دل بھی تعلیم کو الوداع کہہ کر ادبی دنیا میں کود پڑنا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں جہاں سب کچھ عجیب و غریب ہے۔ اپنے گھر والوں کی طرف سے بھی میرا دل رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ پتا جی کے خطوط روز بروز مختصر ہوتے جا رہے تھے۔ اس ڈھنگ سے اس کے بیٹا پانے کی تمنا بر آئی تھی۔ اب ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا وہ مجھے لمبے لمبے پیار بھرے خطوط لکھ پاتے۔ انھوں نے ایک خط میں بھی امتحان کے بعد کلکتہ آنے کے لئے نہیں لکھا۔ ہمارا کنبہ صرف ہم دو بہنوں تک ہی محدود تھا۔ پھر بھی بیٹے کو پا کر ماں باپ کا رخ فطرتی تبدیل ہو گیا تھا۔ گویا انکا لی لڑکی کو گھر سے الوداع کہہ کر وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے تھے۔

کم از کم پتا جی سے مجھے ایسے سلوک کی امید نہ تھی۔ وہ میرے لئے بالکل ماں جیسے بن گئے تھے۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ ساری دنیا میرے لئے غیر بن گئی ہے۔ جنھوں نے پیدا کیا جب وہی اپنے نہ رہے تو اور کون اپنا ہو سکے گا۔

شادی سے پیشتر دیدی کو ماں باپ کی تمام محبت ملی تھی۔ پانچ سال تک کمل بابو نے بھی دیدی کو نہایت محبت اور عزت کے ساتھ رکھا تھا۔ اب دوسرا بچہ پیدا ہونے کا وقت دن بدن قریب آتا جا رہا تھا۔ کمل بابو سارا سارا دن اور ساری ساری رات گھر سے غیر حاضر رہنے لگے۔ اور جب واپس آتے تو بھی دیدی سے ان کا حال چال معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں میں دیدی کے غم سے زیادہ اہمیت اپنے غم کو دیتی تھی۔ یہ کمزوری آج بھی مجھ میں اسی مقدار میں ہے جتنی پہلے تھی۔ دیدی کا بچپن کا برتاؤ آج بھی کھلتا ہے۔

ادیبوں کی اس بیٹھک میں شامل ہونے کے بعد سے میں رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کو قطعی جداگانہ تصور کرنے لگی تھی — مجھے گھر میں وہ عزت نہیں مل پا رہی تھی جو کہ مجھے ملنی چاہئے تھی — اکثر ہر نوجوان لڑکی کی زندگی میں اس طرح کے لمحات آتے ہیں، جب وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی زندگی رائیگاں جا رہی ہے۔ اسے جس قدر عزت غیروں سے ملتی ہے اتنی اپنوں سے نہیں — میرے دل میں ابھی تک کوئی بات صاف نہیں تھی — آئندہ زندگی میں مجھے کیا کرنا ہے — میں ابھی تک طے نہ کر پائی تھی — انسانی منصوبے تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن ہوتا کچھ اور ہے — میرے طے کر لینے سے بھی کیا ہوتا؟ پتا جی جو اپنے لئے قطعی غیر بن بیٹھے تھے — دیدی کے خیالات خود ساختہ محدود تھے کہ کچھ کہنا مناسب نظر نہ آتا تھا — تعلیم کسی طرح پوری کر کے ڈگری لے چکی ہوئے امتحان دیا — امتحان سے پیشتر میری دماغی پریشانیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ ساری ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی —

دیدی کو دیکھنے ایک لیڈی ڈاکٹر روز آتی تھی وہی میرا بھی جائزہ لیا کرتی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ مسوری چلے جائیں — وہاں مجھے بہت تبدیلی کی آسانی ... میں گرمی بہت بڑھتی جا رہی تھی — سگریٹ پینے کی وجہ سے انہیں ... محسوس ہوتی تھی — ڈاکٹرنی کا کہنا تھا کہ میں بھی دیدی کے ہمراہ مسوری چلی جاؤں تو میری دماغی اور جسمانی تھکان دور ہو جائیگی۔ دیدی کو ڈاکٹرنی کے اس مشورے سے اتفاق ہو گیا تھا — کمل بابو کی بے رخی سے وہ تنگ آ چکی تھیں گو انہوں نے اس بے رخی کو ظاہر میں کبھی منظور نہ کیا تھا — مجھے سنانے کے لئے وہ نوکروں سے اکثر بلند آواز میں کہا کرتیں — "بے شک تمہارے مالک کا روبار آج کل کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ انہوں نے ایک دوکان اور خرید لی ہے جس کی وجہ سے ان کی مصروفیت اور بھی بڑھ گئی ہے" شبنم ... کمل بابو کے ... سے بخوبی واقف تھا — دیدی کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک ... مسکراہٹ کھل جاتی۔ جیسے کہ معنی ... تھی — حالانکہ دیدی ... کمل بابو کے کارناموں سے قطعی ناواقف ہوں —

لیڈی ڈاکٹر کے مشورے کو کمل بابو کو سمجھانے کیلئے ہم دونوں بہنوں کو ... کمل بابو تو خود ہی جلد سے جلد دلی سے دور کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے مجبور رہتے

لیڈی ڈاکٹر کی تجویز کی شکل میں کمل بابو کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ انہوں نے دیدی کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ مسوری میں رہنے کے لئے ایک بنگلہ کا بندوبست کر دیں گے — ان کی سامنے بھی یہی تھی کہ ہم دونوں بہنوں کو اپنی صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے جلد از جلد مسوری چلا جانا چاہئے — کمل بابو نے یہ دریافت کرنا ضروری نہ سمجھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی تجویز میں کہیں کوئی غلط تو نہیں؟ دیدی کے جسم میں خون کی کمی تو نہیں ہو گئی ہے؟

اگر دنیاوی آرام اور آسائشوں کا ذکر کروں تو دکھاوے میں دیدی کے گھر مجھے بخوبی اور باآسانی مل رہے تھے۔ جو اپنے پتا کے گھر پر کبھی نصیب نہیں ہوئے تھے — پھر بھی میں اس فرق کو بھلا نہیں پاتی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے میری وقعت ان لوگوں کی نظر میں زیادہ نہ تھی جو گاہ بگاہ دیدی کے گھر میں آتے اور مہینوں پڑے رہتے تھے جن کی خاطر بھی خوب اچھی طرح ہوتی — ملازم بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کمل بابو کے ایک دوست تھے کیپٹن مہیر بندرا وہ شاید کبھی کالج میں حاکی ٹیم کے کیپٹن رہ چکے تھے — فوجی ملازمت تو انہوں نے ایک منٹ بھی نہ کی تھی — کالج کے وقت سے ہی انہیں کیپٹن کہہ کر پکارا جاتا تھا — دوسروں کی رقم پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی — کلکتہ سے دہلی آتے تو کمل بابو سے پیشگی سفر خرچ منگا لیتے تھے — ان کی صرف ایک ہی خوبی تھی — گھر کے مالک کو وہ ہمیشہ خوش رکھتے تھے — خوشامد کر کے ... کر ... کی بڑی بار ... پسندوں کا اظہار کر کے یا گھر کے مالک کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزیں خریدنے میں امداد دے کر — کسی نہ کسی طرح وہ گھر کے مالک اور مالکن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے —

بدچلن اور بداخلاق انسانوں کا کوئی خاص درجہ نہیں ہوتا — وہ بھی شریف انسانوں کی طرح، فنکاروں کی طرح اپنی فطری خصوصیتوں کو بنیاد بنا کر دنیا میں کرشمے دکھایا کرتے ہیں —

مہیر بندرا دیدی کے گھر آ کر مہینوں رہتا — وہ کمل بابو کے ساتھ پڑھا کرتا تھا — حاکی کی ٹیم میں بھی وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے اسی رشتے کو نبھانے اب بھی دلی آ دھمکتا تھا — اور مہینوں رہتا — وہ بخوبی جانتا تھا کہ دیدی کس بات سے خوش ہو گی — کمل بابو جب گھر پر نہ ہوتے تو وہ دیدی کے حسن کی تعریفیں کیا کرتا — کمل بابو کے ساتھ طرح طرح کے سگریٹوں کی تعریف وہ عجیب عجیب الفاظ میں بیان کرتا — میں حیران تھی کہ اتنی بڑی عمر کا شخص اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کس طرح کہہ جاتا ہے؟ اس وقت کمل بابو کی عمر قریب پینتالیس کی تھی — مہیر بندرا کی عمر بھی اس سے کم نہ تھی — بلا کی زیادہ شراب پینے کی عادت اور کبھی ... کھانے نے اس کے جسم اور عمر کو کھا لیا تھا — میں اکثر غور کیا کرتی کہ بغیر مقصد کی زندگی لیکر مہیر بندرا کس طرح

گھبرا کر کہا ـــ "انہوں نے کو سنبھال کر یا حفاظت سے ڈبیا میں بند کر کے رکھو میں ان وہ قصاص سے استعمال نہیں ہوتے ہوئے انہیں زیورات کے پیچھے دیوانہ وار گھومتے ہیں تمہارا ہو اپنے پاس رکھو ـــ جو تمہارے پیسے پر نہیں جیتے ـ کیا وہ دنیا میں زندہ نہیں رہتے؟ ہم لوگ شاید تمہارا گھر خالی کر دیں گے ـ"

میں چاندی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی ـ بہتا ہوا خون صاف کیا، اس پر مرہم پٹی لگائی اور اسے کمرے میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا ـــ وہ خاموش تھی ـــ اس کی آنکھیں اشکبار ہو رہی تھیں ـــ

میں باہر کے کمرے میں بینا آوازیں اب شاید بجھ رہی تھیں ـــ بیساکھیوں کی گونج آوازیں اگلی باتیں بھی واضح کمرے میں نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ جو کچھ بینا کہہ رہی تھیں اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی ہوں ـــ مجھے بینا کی پرزور ڈکٹیشن کی کوئی فرصت نہ تھی ـــ وہ خود ہی دیکھ لیں گی کہ ان کا مکان چھوڑ دینے کے بعد مجھے کہیں جگہ ملتی ہے یا نہیں ـــ میں ماں کو بھی ایک خط لکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ بھی اپنی بھتیجی بیٹی کے کارنامے سے بخوبی واقف ہو جائیں ـ اور اس لگاتار بارش میں میں "یہاں نئے مکان" کی تلاش میں نکل پڑی، اس دن سندری سے اس کا پتہ معلوم کرنا بھی میں بھول گئی تھی ـــ

مصیبت و غم میں انسان کی عقل بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے ـ" سارے ساتھ بیچارے رکھیں ہیں، ملک گھر میں ٹیلیفون کا ہونا لازمی اور ممکن ہے ـ" مجھے اس وقت اس بات کا خیال بھی نہ آیا ـ لگاتار بارش میں بھیگی برساتی اوڑھ کر میں نے دو ڈھائی میل کا سفر طے کر لیا ـ کافی پریشانی کے بعد ایک سکول سے بالآخر [illegible] کا پتہ معلوم ہوا ـــ وہ ہمارے گھر سے صرف آدھ میل دور بھی نہ تھا ـــ

سندری مجھے بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوئی ـــ [illegible] لاج بہت بڑا بنگلہ نہ تھا ـــ یہاں صرف چھ کمروں کی کاٹیج تھی ـــ جس کے ساتھ تین کمرے بھاڑے کے لئے شامل تھے جو بنگلے سے ہٹ کر بائیں طرف اخروٹ کے پیڑ کے ساتھ بنے ہوئے تھے انہیں میں سے ایک کمرے میں سندری رہتی تھی ـ

سندری کو میں نے تمام واقعہ کہہ سنایا ـ سندری نے کہا ـــ "تم کاہے کا یہ شور شرابا ہو گیا نہیں تو چند دن بعد ضرور ہی ہوتا ـ کیونکہ اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ گھر والوں کو تم سے دلچسپی ہونے لگی ہے ـ بینا کی بیٹی کو کوئی حق نہیں کہ وہ اسکی موجودگی میں یہ سب کچھ کہے ـ تمہارے لئے اب وہ گھر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے ـ اور یہ تم بتاؤ اب، تو تم چلی جاؤ گی ـ"

میرے سر پہ گھر ہے کہ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ سندری نے کہا ـــ لیکن ڈرامہ کرنا ہوگا ـ میں کہوں گی کہ تم بغیر اطلاع دیئے دلی سے چلی آئی ہو ـــ اس لئے تمہارے رہنے کا میں کوئی معقول انتظام نہیں کر سکی ـ اب پردیس میں کہاں ٹھہراؤں؟ اس لئے میں اپنے مکان مالک سے کہتی ہوں تاکہ وہ تمہارے یہاں رہنے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کریں ـــ

سندری اپنے مالکان سے اجازت لینے گئی تو میں نے اس تمام عرصہ میں دیوی دیوتاؤں کو دل ہی دل میں یاد کیا، جن کے نام میں نے ابھی نہ جانے کہاں سے یاد کر رکھے تھے ـ میں نے دل ہی دل میں ایک دیوی دیوتا کو چڑھاوا چڑھانے کا ارادہ کر لیا ـــ اگر سندری کے پاس رہنے کو جگہ مل جائے تو میں دیکھوں گی کہ آگے چل کر کیا ہوتا ہے ـ چاندنی کے لئے بھی میں نے سندری سے کہہ دیا تھا ـــ

تھوڑی دیر بعد سندری واپس آ کر مجھے اپنے ہمراہ اپنے مالک مکان کے کمرے میں لے گئی ـ اور میرا تعارف کرایا ـــ "سانی، میری سہیلی ہم عادتوں کی زندہ تصویر ہیں ـــ ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل ہے ـ ہندی اور سنسکرت میں ایم ـ اے کیا ہے ـ ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ ـ دلی کے کسی بابو جی کی بیٹی ہیں ـ انہیں معلوم تھا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہوں سو بغیر اطلاع دیئے چلی آئی ہیں ـ ساتھ میں خادمہ بھی ہے ـ یوں تو یہ کسی ہوٹل میں بھی ٹھہر سکتی ہیں ـــ لیکن میں نے اصرار کیا ہے کہ میرے پاس ہی رہیں ـ [illegible] کی ذرا ٹھیک کب میں بھی کام کر سکیں گی ـ [illegible] صاف اور دلکش ہوا [illegible] یہ شملہ کے سرد [illegible] کیلئے قطعی موزوں رہیں گی ـ ان کے بال تو دیکھئے، کس قدر خوبصورت اور لمبے ہیں ـــ

اور میرا ڈھیلا سا جوڑا فوراً ہی سندری نے کھول دیا ـــ یہ نمائش مجھے بے حد عجیب معلوم ہو رہی تھی ـ آخر یہ بھی کوئی بات ہے؟ اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا ـــ "خاموش رہنا صرف ڈرامہ کر رہی ہوں ـ"

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں باہر بارش میں بھیگتی رہوں ـــ مجھے سندری پر غصہ آ رہا تھا ـــ

مکان مالک چالیس اور پچاس کے بیچ ہوں گے ـ لیکن ان کی عمر کا صحیح اندازہ میں نہ کر سکی ـــ مسکرا کر بیٹھے سگار پی رہے تھے اٹھ کھڑے ہوئے ـ اور بولے ـــ "اوہ مس شوالہ یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ مس سانی آپ کی سہیلی ہیں تو ہماری مہمان ہیں ـ آپ سامنے جا کر کہئے کہ وہ آپ کے ساتھ والا کمرہ مس سانی کے لئے خالی کروا دیں، اور ان کی نوکرانی اپنی آیا کے کوارٹر میں رہے گی ـ"

میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا ـ شری [illegible] نے کہا کہ وہ [illegible] فوراً کرکے چار [illegible] گھر [illegible] گے ـــ

سندری سلائی بھی خوب جانتی تھی۔ فرمائیں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ یہ شاید
کسی کمرے میں سامان رکھ کر آئی ہیں۔ ابھی جا کے اٹھ گی۔ ورنہ ان کو لڑکیاں
نہ سمجھانگی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ٹنڈن صاحب نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔ شاید میرا جائزہ
لے رہے تھے۔

× × ×

چاندنی کو اور مجھے ٹنڈن صاحب کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا
تھا کہ ٹنڈن صاحب دلی چلے گئے۔

میں جس دن چاندنی کے ساتھ سامان لینے دیدی کے گھر گئی تو وہ اپنے کمرے
میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ ایک مرتبہ بھی مجھے ملنے کے لئے اپنے کمرے سے باہر نہ آئیں۔
سامان جب ٹیکسی پر چل دیا تو میں نے سوچا ایک دفعہ دیدی سے کہہ آؤں کہ ہم لوگ
جا رہے ہیں۔ گو چاندنی مجھے روکتی ہی رہی لیکن پھر بھی میں دیدی کے کمرے میں چلی گئی۔

"دیدی ہم لوگ جا رہے ہیں"

لیکن بجائے کچھ کہنے کے وہ دیوار کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید انہیں یہ
ہرگز پسند نہ تھا کہ ہم کہیں جا بھی سکتے ہیں۔

بلنٹ ہاؤس میں مجھے سندری کے کمرے کا بغل والا کمرہ ملا۔ کمرہ اچھا اور
کھلا ہوا تھا۔ چارپائی بچھ جانے پر بھی دیوان بچھانے کی جگہ رہ جاتی تھی۔ میں نے اپنے
دو بکسوں کو ملا کر بیٹھنے کی جگہ بنا لی۔ ان لوگوں سے فرنیچر مانگنا تو برا معلوم دیتا تھا۔

مالکن سے میرا تعارف کرا دیا گیا۔ سلوچنا دیوی کی عمر تیس سال رہی
ہوگی۔ سانولا رنگ اور چھوٹے قد کی خوبصورت، دنیاداری میں ہوشیار
خاتون تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ شہریان کی طرح شریف ہی کو جھوٹ
بول کر اتنا سیدھا نہیں بہلایا جا سکتا۔ ان سے دو دن بات چیت کرنے کے بعد
میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پہلے تو چاندنی سے ملاقات ہونے کے بعد گھر ہی کی ہو جاؤں گی۔ گو انہوں
نے کھلنے کی بابت مجھ سے کسی قسم کی بات چیت نہیں کی تھی۔ اور کھانا کھلانے کے وقت
کھانا کھانے کے وقت وہ مجھے بلا بھیجتی تھیں۔ میں جب کھانے کی میز پر پہنچتی
تو نہایت تپاک سے پیش آتیں۔ حسب معمول مسکراہٹ ان کے ہونٹوں
پر رہتی۔ لیکن اور پرواہ ہو وقت کبھی کبھی ایسی طرز سے باتیں تھی جس سے
صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں کوئی گرہ
رکھتی ہیں۔ میری ہرگز خواہش نہ تھی کہ میں ان کی فکروں میں اور بھی اضافہ کروں۔
سندری ان کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ان کی ملازم تھی۔ اسے کھانا دینا مناسب
اور لازم تھا۔ لیکن مجھے دینا قطعی ضروری نہ تھا۔ تین چار دن میں ہی

چاندنی کا گھر کھانا کے علاوہ اتنی بہتر نہیں ہے جتنی یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ سب بے
اس بات کی خوشی تھی کہ سندری کو ان کے گھر میں کسی طرح کام مل گیا ورنہ
ان لوگوں کی حیثیت گورنس رکھنے کے قابل نہ تھی۔ اپنی پرانی شان و
شوکت پر جو کہ قطعی کھنڈر بن چکی تھی اب وہ نئے محل تعمیر کئے جا رہے تھے
جنہیں کھڑا کرنا ان کی طاقت اور ہمت سے باہر تھا۔

اول تو مسوری میں دودھ اچھا ملتا ہی نہیں ہے اور ٹنڈن صاحب کے
گھر جو دودھ آتا اس میں اور بھی پانی ملا دیا جاتا۔ گھر کی مالکن سلوچنا دیوی کی
پرانی ساڑیوں پر نئے رنگ کرائے گئے تھے۔ ان کے زیورات کی
حالت بھی بہتر نہ تھی۔ کسی زیور میں نگ نہ تھے اور کوئی اتنا گھسا ہوا تھا کہ
دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے وہ دس سال سے استعمال کر رہی
ہیں۔

دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے تو نوکروں کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا۔
یہ سب چاندنی نے مجھے بتایا۔ چاندنی نے یہ بھی بتایا کہ ملازموں کو جو چائے
دی جاتی ہے اس میں دودھ نام کے لئے بھی نہیں ہوتا ہے۔ سلوچنا
دیوی کے چار بچے تھے۔ جن میں بڑا لڑکا اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں
رہتا تھا۔ جو کبھی گاہ بگاہ گھر آتا تھا۔ چھوٹی تینوں لڑکیاں تھیں جن کے
لئے سندری کو رکھا گیا تھا۔

سلوچنا دیوی میرے آنے کے پہلے دن سے ہی مجھے مشکوک
نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ ان کے لئے میں انہیں قصوروار نہیں سمجھتی۔ آخر وہ
بیچاری کہاں سے ۱۰۰ کر روپیہ خرچ کریں۔ گھر میں کھانے والے صرف
ان کے بچے تھے۔ بھلا دیور وکالت پاس کر کے ٹھیلے کے پیچھے دیوانہ تھا۔
میں نے سنا تھا کہ وہ دلی میں ایک ڈرامے کا ڈائریکٹر بھی رہا تھا۔ جسے عوام
نے پسند بھی کیا تھا۔ اس کے ٹکٹ خوب فروخت ہوتے تھے۔ جمعہ پاس
سے وہ احساس کے ساتھ ایک ہفتہ بمبئی کی سیر کر آئے تھے۔ فلموں میں
کیا کچھ ہوتا ہے یہ دیکھنے کیلئے۔ اب وہ ان گرمیوں میں کالیداس کا امیر
ڈرامہ شکنتلا پیش کرنا چاہتا تھا جس میں شکنتلا کے کردار کیلئے مجھے پیشکش
دیا تھا۔

گھر میں دو چیزیں اور بھی تھیں۔ ایک تو سلوچنا دیوی کی نند کی ہوگی۔ اس نے
میٹرک کے بعد آگے پڑھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ابھی تک اس کی شادی بھی نہیں
ہو سکی تھی کیونکہ ایسے لڑکے کوئی دولہا نہیں مل سکا تھا۔ وہ ہمیشہ
دولت کی تعریف کرتی رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ کام ایسا ہو جو فائدہ مند ہو۔

سنتشا دیوی ہر وقت اس طرح بنی ہوئی رہتی گویا ابھی کسی اشتہار کے لئے فوٹو اتروا کر آ رہی ہو۔ تین چار دن رہنے کے بعد مجھے اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ سلوچنا دیوی کی بہن منتشا کے استعمال شدہ کپڑے بھی پہننے پڑتے ہیں۔ منتشا کی چھوٹی بہن جس بائیس سال کی عمر میں 'بی بی' کے نام سے اسے پکارا جاتا تھا۔ سکول میں اس نے کبھی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کوئی امتحان ہی پاس کیا تھا۔ لیکن ہندی، انگریزی اور فرنچ کا کام چلا لیتی تھی۔ بیبی کا اصل نام کیا تھا میں آج تک نہیں جان سکی۔

بی بی سگریٹ پیتی، گھڑسواری کرتی۔ بھائی کی بچیوں کے بال کھینچتی اور ان کے ساتھ کھیل کر ادھر ادھر گھومتی رہتی تھی۔ سنا ہے کوئی گھر والا بھی ایسا کرنے سے روکتا تھا اور نہ خود ہی خیال کرتی تھی کہ ایسا کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ شاید اسی لئے کہ بڑی بہن کی ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی۔

گھر کے مالک یعنی سلوچنا دیوی کے پتی اپنی چھٹیاں ختم کر کے دہلی واپس چلے گئے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کی آواز کم سنائی دیتی تھی۔ کسی کو برا بھلا وہ کہتے نہیں سنے گئے پھر بھی سارے گھر پر ایک خوف طاری رہتا اور سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔

سنتشا بھی بڑے بھائی سے ڈرتی تھی جس وقت وہ گھر میں رہتے ان کی زبان خاموش رہتی تھی۔ بھابھی کو ڈانٹنا اور پیا کی امیری کے گیت گانا کم ہو جاتا۔ سلوچنا دیوی سنتشا سے ایک بات میں بلند رہتی تھیں کہ وہ اتنی تعلیم یافتہ نہیں تھیں جس قدر سنتشا تھی۔ گھر کی عورتوں میں سے سنتشا کے علاوہ کسی نے بھی سکول کی شکل نہ دیکھی تھی۔ ملازمین جب سلوچنا دیوی سے خود پوچھتے کہ کیا پکایا جائے کیا بنایا؟ تو وہ یہی کہہ دیتیں کہ سنتشا سے ہی پوچھ لیا جائے۔ سنتشا جب میٹرک میں پڑھتی تھی جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کو پندرہ سال گزر چکے تھے۔ پھر بھی سنتشا کو سلوچنا دیوی اچھی طرح جان نہیں پائی تھیں۔ کیونکہ نند نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ وہ بھابی کے ہر کام میں 'نکتہ چینی' کرتے ہوئے کمائی کی چیز نہیں ضرور ہی خامیاں نکالیں گی۔ بھابی گھر کی بیٹی تو نہیں تھی کہ انہیں اتنی آزادی دی جائے کہ وہ اپنی نند کی رائے اور اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کچھ کر لیں؟ سنتشا کی ماں اگر زندہ ہوتیں تو شاید ان کی حکومت بھی اس قدر سخت نہ ہوتی۔ سنتشا کا کہنا تھا کہ بڑے گھر کی بیٹی کو حکومت کرنے کا طریقہ جاننا نہایت ضروری ہے۔ پھر سسرال میں نہیں تو کم از کم پیا کے گھر میں تو عورت کی حکومت ہونی لازمی ہے۔

گھر کے مالک دہلی چلے گئے تو میں نے سوچا کہ اب کمل بابو کو خط لکھنا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان دنوں... تو ایسی صورت میں میری حالت کیا ہو گی؟ مجھے کم از کم اپنی صفائی تو دے دینی چاہیئے۔

محض اسی خیال سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ میں ان کمل بابو کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی جو مجھ سے سخت نفرت کرتے تھے میرے جسم سے نفرت کرتے تھے، جنہیں میرے رنگ سے نفرت تھی۔ جنہیں میرے ساتھ بات کرنا بھی ناگوار تھا۔ انہیں کمل بابو کو میں خط لکھوں گی لیکن ان کے خط کا جواب تو دینا ضروری تھا۔ ان کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ خط لکھنے کی کوشش کی تو سنتشا دیوی تینوں بچیوں کو میرے پاس چھوڑ گئی۔ وہ کہیں گھومنے جانا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھومنا کسی اور کے ساتھ نہیں صرف پران بابو کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اور اس وقت بھی میں خط نہ لکھ سکی۔ بچیوں کے ساتھ کھیلنا، پھر انہیں ناشتہ کرا کر بنگلے میں ادھر ادھر گھمانے لگی۔ کئی بار خیال آیا کہ آخر انہیں خط کس القاب کے ساتھ شروع کیا جائے؟ پی جی کے نام سے تو میں نے انہیں کبھی پکارا ہی نہیں، اور پکارنے کا موقعہ بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ اب اس نام سے پکارنا تو مشکل ہو گا۔ مجھے مسوری میں بیٹھے بیٹھے ہی ان کی بہت پر شرم محسوس ہو رہی تھی۔

ابھی لکھنے بیٹھی تو بنگلے کے اندر سے سلوچنا دیوی کا پیغام آ گیا کہ میں بچیوں کو کہانی سنا دوں۔ بچیاں مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سندری تتلیوں کو ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہی بہلا دیتی تھی ——— خاص دلچسپی سے بچیوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ میری معمولی دلچسپی اور توجہ سے وہ کافی متاثر ہو چکی تھیں۔ اور بار بار مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی سو کو دیکھتے ہی مجھے منّا کی یاد آ جاتی۔ وہ بھی دو سال کا ہو چکا تھا۔ وہ بھی اسی طرح تتلا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہو گا جو ماں کے کانوں میں امرت برساتی ہوں گی۔

کھانا کھانے کے بعد جیسے ہی میں نے خط لکھنے کا ارادہ کیا کہ سلوچنا دیوی میرے پاس آ بیٹھیں۔ لگتا تھا کہ کوئی گھر گئے ہوئے ابھی صرف دو ہی دن گزرے تھے۔ شاید وہ تنہائی سے تنگ آ کر میرے پاس چلی آئی تھیں۔ وہ غم زدہ ہیں یہ تو میں اس گھر میں آتے ہی جان گئی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ کبھی انہوں نے مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن غم کے مارے لوگوں کی ایک اپنی خاص اور خاموش زبان ہوتی ہے۔ خاموش رہتے ہوئے بھی ایک کو دوسرے کے دکھ درد اور دکھ کا

احساس ہو جاتا ہے۔ سلوچنا دیوی کے آتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کسی خاص مطلب سے آئی ہیں۔

"مالی بہن! تم اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہو پھر بھی تم نے میری بچی کو جتنی محبت دی ہے، میں تو اسے دیکھ کر حیران ہو گئی ہوں۔" انھوں نے کہا۔

لیکن یکایک کسی خاموش زخم سے ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے دل پر غم کا بہت بڑا بوجھ ہے، جسے ہٹانے میں ممکن ہے میری مدد سے کچھ ہو سکے۔ احساس سے بہتر بات بھی میں اس وقت کیا کر سکتی تھی۔ مجھے ان کے بچی نے پناہ دی تھی۔ اپنی سگی بہن نے زبردست بارش میں گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ نہ جانے اسے دولت کا اتنا نشہ کیوں تھا جب شاید انھی کو دکھ کو ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دولت دیکھی ہو۔

سلوچنا دیوی کافی رات گئے تک مجھ سے بات چیت کرتی رہیں۔ جب وہ اٹھ کر گئیں تو رات کے دو بج چکے تھے۔ سندری ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا سلوچنا دیوی اپنی نندوں سے بہت دکھی تھیں۔ ان کی حکومت بہت سخت تھی۔ ان کی ساس کا انتقال ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ ان کی زندگی میں بھی نندوں کی حکمرانی تھی۔ سلوچنا دیوی کو شادی کے دو سال بعد سے بچے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ ان کی پرورش میں مصروف ہو گئی تھیں۔

گھر میں جیسا بھی سلوک ان کے ساتھ ہوتا گیا وہ چپ چاپ برداشت کرتی گئیں اگرچہ کبھی اپنے پتی یا گھر میں کسی دوسرے سے انھوں نے ان زیادتیوں کا ذکر تک نہ کیا۔ گھر کے مالک کے خیال میں ان کی بہن ودیدی کا ان کر تھی۔ اس جیسی کوئی دوسری ہونا مشکل تھی۔ سلوچنا دیوی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر اپنے میکے چلی جاتیں لیکن ادھر ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے وہ اب میکے نہ جا پاتی تھیں۔ بھابھیوں کے سر پر جا کر وہ مہینوں کس طرح پڑی رہ سکتی تھیں۔ سنتا کا ہاتھ اپنے اوپر خرچ کرنے میں بہت کھلا ہوا تھا۔ اور پران بابو کو بھی وہ کھلے ہاتھوں روپے دیتی رہتی تھی۔

یہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی۔ لازم تھا کہ اس کی خواہش کو پورا کیا جائے۔ سلوچنا دیوی اگر کبھی بھول کر بھی یہ مشورہ دیتیں کہ سنتا ذرا کم خرچ کیا کرو تو وہ ناراض ہو کر کہہ دیتی "بھابی! تم کیا اپنے گھر سے لے کر آئی ہو۔ وہ بیاہ پر بھی کیا کرنا چاہتی ہو؟ یہ تو ہمارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ پھر کب خرچ کریں گے!"

سلوچنا دیوی نے تمام بندشیں خود پر ہی لگا رکھی تھیں۔ وہ اپنا گلا گھونٹ دیتیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا کوئی فضول خرچ نہ کرتیں۔

یوں تو سلوچنا دیوی کو زندگی میں کوئی بھی کمی نہ تھی۔ بچے نہایت شریف اور قدامت پسند تھے۔ لیکن انھیں بچے ترقی پسند نہ ملی تھی جس کا انھیں افسوس رہتا تھا۔ سنتا نے اپنی بھابھی کو اپنے گھر کے ماحول میں ڈھلنے کی از حد کوشش کی تھی جس میں کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن موجودہ سوسائٹی کا چڑھاوا یہ رنگ ویسا ہی تھا جس طرح چاندی کے زیورات پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے اور چند دن پہننے کے استعمال کے بعد چاندی پھر اپنی اصلی شکل میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان کے ہر کام سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ سب بناوٹ ہے۔ اور اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ وہ سگریٹ بھی پکڑتیں تو اس کے ہاتھ اس طرح عاری نظر آتے جیسے کوئی سندری اور بچی کے۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر مسکان بنائے رکھنے کی جو کوشش کرتی رہتیں اس کا بھی کھوکھلا پن دوسرے شخص پر ظاہر ہو جاتا۔ کیونکہ اس مسکراہٹ میں بناوٹ بہت زیادہ ہوتی۔ میں سوچنے لگی کہ کبھی ایسے گھرانوں کا یہی حال ہے۔ ہمارے والدین معمولی حیثیت کے ہیں لیکن خوشحال ہیں انھیں اس دکھاوے کی کوئی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اور اسی لئے وہ دوسروں کی بہ نسبت خوش ہیں۔ میرے خیال میں تو انسان کا اصل سکون یہ موجودہ ترقی پسندی چھین چکی ہے، دیکھا دیکھی اپنی حیثیت کے گھرانوں میں اپنی عزت اور اپنا مقام بنائے رکھنے کیلئے انھیں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ شاید ان گھرانے جیسی حالت ابھی دوسرے گھرانوں کی ہوگی جہاں ضرورتوں کے بڑھنے کی گنجائش تو کافی ہوتی ہے لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بڑھتا گھر کا کوئی بھی شخص آمدنی بڑھانے میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ سبھی اپنے شوق پورے کرنا چاہتے ہیں اور جب کا شوق پورا نہیں ہوتا وہ گھر والوں کو بھلا برا کہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور طعنے دیتا ہے۔

بیسویں صدی سائنس کی صدی ہے انسان کے عیش و آرام کیلئے سائنس نے سب کچھ سہولتیں دے رکھی ہیں لیکن انسان نے اپنی خواہشات میں اس قدر اضافہ خود ہی کیا ہے کہ اس میں سائنس کا کوئی ہاتھ ہے میں سمجھ نہیں پاتی۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی لیکن کسی بھی طرح سائنس کو قصوروار ثابت نہ کر سکی۔ ہم لوگوں نے مغربی تہذیب کو تو اپنایا لیکن اس تہذیب سے وابستہ باریکیوں کو اور صحت مند پہلوؤں کو ہم نہیں اپنا سکے۔

سنتا ساڑیاں خوب خریدتی تھی خواہ وہ انھیں پہن سکے یا نہ پہن سکے وہ تر ساڑیاں الماریوں کی صندوقوں میں اضافہ کرتی تھیں۔ سنتا سگریٹ بھی پیتی دوکانوں سے بالا منگوا لی۔ ہر دوسرے تیسرے اپنے بالوں کا اسٹائل بھی بدلتی

پانچ سو روپیہ کا خرچہ بیٹھا تھا۔ اپنے ہاتھ سے وہ اتنا بھی کام نہ کرتی تھی کہ بچت کی گھر کو بھی روپیہ کی بچت ہو جاتی۔ غیر ملکی عورتیں اگر اپنے بالوں کی آرائش پر پچاس روپیہ خرچ کرتی ہیں تو دوسرے بہت کام وہ ایسے کرتی ہیں کہ وہ اپنے سنگار کے لئے بچا لیں۔

میں انہیں خیالات میں کافی رات تک مبتلا رہی۔ جب سوئی تو شاید دن نکلنے والا تھا۔

× ×

سلوچنا دیوی کے مسکون اور الجھی پریشانیوں سے چھٹکارا پاکر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کمل بابو کو خط لکھنا شروع کیا۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی کہ خط شروع کس طرح کروں۔ کس القاب کے ساتھ شروع کروں۔ جب سے دیدی کی شادی ہوئی تھی میں نے ان سے کبھی بات بھی نہ کی تھی۔ یہ خط لکھنا بھی میرے لئے ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔ اس خط میں میں نے جو کچھ لکھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔

کمل جی!

آپکا خط مل گیا تھا۔ اُسکے لئے شکریہ۔ آپ نے اس تصویر کی قیمت ادا کرکے دراصل مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ اگر اس کی قیمت نہ ادا کرتے تو مجھے بہت سے آدمیوں کے روبرو ذلیل اور شرمسار ہونا پڑتا۔ کاویری نے ممکن ہے اُسکے بہکاوا تو آپ کو تحریر کیا ہوگا۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ اس نے کس صورت میں میرا جرم پیش کیا ہوگا۔

آپکا خط دیکھتے ہی وہ تلملا گئی تھی۔ انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ میرا۔ آپ سے کچھ ناجائز تعلق ہے اور دیدی کو کھلا نہ چکے سے اُسکی موجودگی میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔

اس روز زبردست بارش ہو رہی تھی۔ چاندنی نے میری طرف داری کی تو دیدی اس سے بھی خفا ہو گئیں۔ اور اسے ایک طمانچہ مارا۔ ہم لوگوں کو انھوں نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اب اس کے بعد ہماری غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ہم اس گھر میں رہتیں۔

میں درحقیقت آپ لوگوں کی بے حد احسان مند ہوں۔ دیدی کی بھی احسان مند ہوں۔ اگر اس وقت غصے میں آکر گھر سے باہر نہ کرتیں تو میری حالت ابھی تک ویسی ہی بنی رہتی۔ بلا وجہ دوسروں پہ بار بنی رہتی۔ ابھی تک تو مجھے کوئی نوکری نہیں ملی

لیکن میری کوشش جاری ہے۔ سنگیت سکھانے کا کام شاید مل جائے۔ میں فی الحال بانٹ لاج میں اشٹیشن میلی کیساتھ رہ رہی ہوں۔ جہاں میری سہیلی سندری گورنس کا کام کرتی ہے۔ میرے آجانے سے سندری کو بھی سہولیت ہو گئی ہے۔ وہ بچے میرے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قطعی درست ہے۔ اس کا ہر لفظ سچا ہے۔ اس میں حقیقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں آپ لوگوں کا احسان کو بھول نہیں سکتی۔ پتا جی اور ماں کو میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ انھوں نے بھی تو قریب چھ مہینے سے مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ آپ مناسب سمجھیں تو انہیں خط میں تحریر کرکے یا ملاقات ہونے پر سمجھا دیجئے گا۔

رانی

یہ خط میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ میں نیچے ہی کچھ لکھ سکی اور نہ شروع ہی کچھ کوئی لفظ لکھ سکی۔ خط لکھ کر میں ڈاکخانے میں ڈالنے کیلئے گئی۔ سندری کو گھر سے گئے ہوئے دس بارہ دن گزر چکے تھے۔ لیکن اس دوران میں میں گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ سندری کے بار بار اصرار کرنے پر بھی میں گھر سے نہیں گئی۔ دھڑکتے دل سے میں نے خط لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑا بار جو میرے سر پہ رکھا تھا میں نے اُسے اُتار کر پھینک دیا ہے۔

میں اپنی دلی حالت پر خود ہی پریشان تھی۔ مجھے اس بات کا افسوس تو بہت زیادہ نہ تھا کہ میرا اپنے گھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ماں نے جب چلا کر مجھے گھر سے نکالا تھا حیرت ناک بات تھی۔ ڈاکخانے سے گھر لوٹتے وقت اکثر مجھے تعجب تھا اور حیرت اس بات کا کہ کیا دوسری اور مائیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کیا انہیں بچوں کی اولاد سے محبت نہیں ہوتی؟ دیدی نے اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو پال پوس کر ماں کو دے دیا تھا۔ میں بہ جان خاموش اور کھوئی کھوئی سی کس طرح بانٹ لاج پہنچی

سلوچنا دیوی میرا بچپن سے انتظار کر رہی تھیں۔ میرے گھر پہنچتے ہی انھوں نے پوچھا کہ میں نے سندری کو کبھی دیکھا ہے؟ میرے انکار نے ان کی فکر اور پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہ خوف سے لرز اٹھیں۔ پربھا بابو کے ساتھ اسکا اُٹھنا بیٹھنا تیزی سے بڑھ رہا تھا شاید ان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ لیکن میں نے دل کی بات دل ہی میں رکھی

سلوچنا دیوی کسی کتاب کی طرح میرا مطالعہ کر رہی تھیں۔

"سندری اور پربھا بابو اکیلے بھی تو جا سکتے ہیں۔ کیوں؟"

میں نے جھجک اور شرم سے پانی پانی ہوا تھی کسی طرح میں نے جواب دیا

"جب سے وہ (سلوچناد یوی کی بہو) ہو کر گھر میں آئی ہیں ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مجھے اکثر شک ہوتا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ ساتھ ہی یہ اور آپ کی سہیلی ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

لیکن مجھے اس وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا کہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سہیلی کے ذکر کو چھوڑ کر میں نے فوراً ۔۔۔ "کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

سلوچنا دیوی نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر بولیں ۔۔ "آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے اسقدر حقیر نہ سمجھئے۔ آپکی سہیلی چلی گئی ہیں تو اسکے یہ معنی نہیں کہ بچیوں کی دیکھ بھال آپ کریں۔ یہ تو میں بھی کر لوں گی۔"

اُس وقت نہ جانے تمام دنیا کی نرمی میری زبان پر کہاں سے آگئی تھی۔ میں نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ "نہیں جی بی! آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میرا کوئی چھوٹا نہیں بڑا ہے۔ میں تو محض انسانیت کے ناطے کہہ رہی ہوں کہ میں بھی بچیوں کی دیکھ بھال میں آپکا ہاتھ بٹا سکتی ہوں۔"

سلوچنا دیوی نے اتنی محبت اور ہمدردی سے یہ الفاظ شاید پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ان کا دل بھر آیا ۔۔

اس دن سے بچیوں کی دیکھ بھال میں کرنے لگی۔ سندری کا کوئی خط نہیں آیا۔ اُسکے کمرے میں سوائے اُس فرنیچر کے جو سلوچنا دیوی کا دیا ہوا تھا سندری کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس لے گئی تھی یہاں تک کہ تیل صابن تک بھی وہاں نہ تھا۔

میں نے زندگی میں کبھی خیال بھی نہ کیا تھا کہ مجھے کسی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑے گی۔ چاندنی ان کاموں میں ماہر تھی۔ وہ بچیوں کو غسل کراتی، ان کے بال سنوارتی اور کھانا دے جاتی۔ میں کھانا پکاتی، کمرہ صاف کرتی اور بچیوں کو سنگیت سکھاتی۔

سنتا دیوی کبھی کبھی ننگے دھڑنگے کر کھڑکی کے آگے ۔۔۔ کھڑی رہتیں۔ ہاتھ میں کوئی اردو کا فلمی رسالہ ہوتا یا کسی قریب رشتہ دار کا خط ہوتا جس میں کچھ روپے مانگے گئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ سنتا کسی بھی خاص موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ اُسے مستقبل اور انجام کا خیال ہی نہیں رہتا۔ نہ فکر ہی رہتی ہے۔ اُسکا خیال تھا کہ دنیا میں ایسا کچھ باقی نہیں ہے جو اُسے سیکھنا ہے۔ دنیا کی تمام خوبیاں اور قابلیت اُس میں موجود ہے۔۔ میں سوچتی کہ اگر کبھی یہ کانٹوں کے ہاتھ پڑ گئی تو ۔۔۔۔ ؟ اور تبھی اسے جانے اور کیا اس کا احساس ہوگا۔ ورنہ شاید نہیں۔۔۔

جس دن سے سندری اور پران جا چکے گئے سنتا دیوی کی شہری کو قصور وار کہتی رہتیں۔ انکا کہنا تھا کہ وہی انکے بھائی کو بہکا کر لے گئی ہے۔ ورنہ وہ ایسا نہ تھا۔ جو لڑکیاں دوسروں کے گھروں میں ملازمت کرنے نکلتی ہیں انکی ذات سے اسکے علاوہ اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

یہ چوٹ مجھ پر کی جاتی۔ سنتا کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ امیر عورتوں کی زندگی کس قدر بیکار ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندا۔ بس وہ دن بھی گپیں اڑانا۔ اور محنت کش عورتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ ہفتہ میں تین چار دن سینما دیکھنا۔ جس سے چند لمحات کے لئے جذبات جاگ اٹھیں۔ سنتا کو بچوں کا دیوی کی طرح پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی کسی لائبریری سے کوئی ناول لے آتی یا خرید لیتی تو اسمیں سوائے معاشقوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ جن ناولوں کی ہیروئن جھوٹی گڑیا کی طرح بات بات پہ بیہوش ہو جاتیں۔ جن میں ہیرو کے ایک اشارے پر گھونٹ دو ہوتے۔ ہر دن کو بیٹھے دل کی بیماری لگی ہوتی وہ اشتہاری کرتی اور اپنی ۔۔ کی قسم اسعا صدو کو یاد کر کے انھیں سیدھا ئیں دیتی رہتی۔ اور پھر ہیرو مر تے ہوئے ایک راہگیر غدار ہوتا اور اس سے شادی کر لیتا۔

یہاں شادی کا لفظ آتے ہی اکثر میرے خیالات کی روانی ٹھہر جاتی۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میری شادی نہیں ہوگی۔ مجھ سے کون شادی کریگا! میں اسقدر کالی ہوں۔ میری شادی کیلئے ماں کو انتہائی کوشش کرنی پڑیگی۔ جسے وہ ہرگز گوارہ نہ کریگی۔ ممکن ہے مجھے اسی جگہ سلوچنا دیوی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی پڑے گی۔

میں نے اپنے مستقبل پر کبھی غور نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے اپنا موجودہ غم پہاڑ جیسا نظر آتا تھا۔ اسلئے میں ہمیشہ اپنے حال کو ہی اہمیت دیتی تھی۔ کبھی میری زندگی میں بھی بہاریں آسکتی ہیں اسکا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میری زندگی کی حدود مقرر تھیں کہ اسوقت میرے ذہن میں یہ خیال ہرگز نہ آتا تھا کہ ہر انسان کی زندگی اسی طرح محدود ہوتی ہے۔

میری لائبریری اکثر درختوں کو دیکھتی۔ انہیں یہاں لگ رہے تھے، پھل پھول رہے تھے۔ میں سوچتی اور خود اپنے درختوں کی زندگی میری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ جنکے نام پر کم از کم اس گھر کا نام پانت ہاؤس ہے اور جن کے پھولوں کو سنتا کے طرح طرح کے گلدانوں میں سجایا جاتا ہے۔ خوبصورت ہاتھوں کی نرمی اور گرمی نصیب ہے۔ میں بدنصیب کچھ بھی تو نہیں کر پاتی تھی۔ میرا زندگی کا کام بھی چاندنی ہی کرتی ہے۔

اور اُسی وقت ۔۔۔۔۔ میری خاموش زندگی میں یکایک طوفان

نے اُس انتظار میں نے سب کچھ تبدیل کر دیا ——

صبح کے دس، ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا — آفتاب بھی دھند کے غلافوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی اُس کی سرخی چمک رہی تھی — ٹھیک اُسی طرح، جس طرح کوئی چھپا ہوا ... دکان میں سنتروں کی ٹوکری رکھی ہے — گھر سے تیار ہو کر میں نوکری کی تلاش میں باہر جانے کو ہی تھی کہ میں نے کمل بابو کو بانٹ ... کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا — دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا گویا میرے کانوں میں کوئی انجن چل رہا ہو — میرے پاؤں کانپ اُٹھے۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ کمل بابو خود یہاں چلے آئیں گے۔ خط بھیجے بھی صرف چار پانچ دن ہی گزرے تھے۔ میرے پیروں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا تھا — انہیں جا کر اپنے کمرے تک لے آنے کی طاقت بھی میرے پیروں میں باقی نہ تھی —

یکایک مجھے خیال آیا کہ یہ سندری سے ملنے آئے ہوں گے۔ انہوں نے اُس پر کافی روپیہ خرچ کیا تھا — ڈاکٹر اندر دھش والی رقم بھی ممکن ہے سندری اُٹھا چکی ہو — اس نے شاید پران بابو کو دیدی ہو — اب کون اس کا ذمہ وار ہوگا؟ بہت سے خیالات ایک ساتھ میرے ذہن میں جاگ اُٹھے —

کمل بابو — ہاں، وہی میری طرح بغور دیکھ رہے تھے — ہماری جان پہچان کے اس طویل عرصے میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ مجھے اتنے قریب سے اور اس طرح دیکھ رہے تھے — مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے کہ میں نے خود کو سہارا دینے کے لئے برآمدے کی جھکی ہوئی چھت کا کھمبا پکڑ لیا تھا

اس سے پیشتر میں نے بھی کمل بابو کو اچھی طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بھی دیکھا تھا، چوری چوری، چھپ چھپ کر دیکھا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ کمل بابو کی آنکھیں ایک ایسے جذبے سے دوسرے کو دیکھتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں —
"ہم بھی دیکھ لیں کہ تم کیا ہو؟ کون ہو؟"

کمل بابو کے جسم کا رنگ گندمی، چہرے پر نہایت لاپرواہی سی، اور اس لاپرواہ انداز کے ساتھ جھک کر آتے ہوئے بال اور بھی بکھر جاتے —

وہ میرے قریب آئے تو ایک لمحہ کے لئے میری آنکھیں بند سی ہو گئیں تھیں۔ پھر میں نے بہت ہمت کر کے اپنی آنکھیں کسی طرح کھولیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی — ویسی کی ویسی ہی تھی۔ میرا جسم جیسے سکڑ کر بالکل چھوٹا سا ہو جانا چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔۔

"رانی!" کمل بابو نے محبت آمیز آواز میں پکارا — "رانی! تم اپنی بہن کے سلوک کا بدلہ کہیں مجھ سے تو نہیں لے رہی ہو؟"

ان کے سوال کا جواب دینے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔ مجھے تو یہ سب ایک خواب جیسا نظر آ رہا تھا —

"کیا کہیں بیٹھاؤ گی نہیں؟"

"جی — آئیے — یہ ہے میرا کمرہ"

کمل بابو نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھا —

"یہ ستار ادھر رکھا ہے؟"

"جی میں یہاں بچیوں کو سکھاتی ہوں —— سندری چلی گئی ہے — مجھے اکیلے یہاں بھی کرنی پڑتی ہے"

"میں جانتا ہوں سندری یہاں سے چلی گئی ہے۔ میں نے اسے بمبئی کے ہوائی اڈے پر دیکھا تھا۔ پران صاحب کا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔ شاید دونوں ولایت جا رہے ہیں —"

کاش تو یہ دن یہاں نہ آتے۔ میں نے محسوس کیا گویا دنیا کی ہر چیز کی رفتار رک گئی ہے — سب کچھ بے جان ہو گیا تھا — کیونکہ اس وقت میرے دل کی رفتار بے حد تیز ہو گئی تھی خون کی روانی اس قدر آہستہ معلوم ہوتی تھی گویا رک گئی ہو۔ کافی دیر تک میں خاموشی کے عالم میں کھڑی رہی —

"تو آپ جانتے ہیں کہ سندری یہاں نہیں ہے؟"

"ہاں تمہارا خط مجھے بعد میں ملا تھا — میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہیں سندری کو دیکھا۔ واپس ہونے پر تمہارا خط ملا"

میں نے نگاہیں اٹھا کر کمل بابو کی طرف غور سے دیکھا — کون جانے پھر کبھی دیکھنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے —

"رانی! اس دفعہ تمہارے امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں رہا — مشکل لگا کیا؟"

"ہاں — تم اخبار نہیں پڑھتیں؟"

"دو مہینے چار دن سے نہیں پڑھا — کیا ہوا، فیل ہو گئی؟"

کمل بابو نے قہقہہ لگایا — میں نے محسوس کیا گویا میرے دل کی افسردگی اس قہقہے میں ڈھلتی جا رہی تھی —

"تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو کہ فیل ہو جاؤ، پاس ہو گئی ہو — لیکن اس بار فرسٹ ڈویژن میں نہیں، صرف پاس ہوئی تھی —"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بلا ٹلی۔ اس روز پہلی بار معلوم ہوا کہ لوگ پکوانوں کے بجائے بھرپیٹ روٹی کھا کر اسے ذائقہ، کیوں کہتے ہیں؟

"کب نکلا نتیجہ؟"

"تمہیں دیدی ہوسٹل آتی ہی بہی تکلیف سے دوچار ہوتی ہیں۔ مگر دیدی بھی وہیں ہیں یہ نتیجہ دیکھ کر دونوں کو اس وقت سخت افسوس ہوا۔"

اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں خود پر قابو نہ پا سکی اور بے ساختہ ہنسی پڑی۔

"تم!۔۔۔ تم، بہت آزاد ہوتی جا رہی ہو رانی!"

"کیوں؟"

"بھئی اور ماں کے افسوس کا تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا؟"

"خیر، دیدی وہاں پہنچ کیسے گئیں؟"

"تمہیں فرصت کا احساس کر کے وہ وہیں بیٹھ رہے کے ساتھ ساتھ اس طرح وہ کسی تھی حالت سے مجبور ہو کر رشتے دوبارہ تکلیف نہ پہنچا۔ لیکن اس کے لئے اسے قصوروار تو نہیں کیا جا سکتا۔"

رہ رہ کر خیال آتا کہ میں دریافت کروں کہ دیدی نے میری بابت کیا کیا کہا۔ لیکن میری حالت تو اس بھوکے انسان کی صورت ہو رہی تھی جسے بھرپور ہاتھ نکلی مل جائے۔ مگر چھوڑ دینے سے میری اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کمل بابو دلی سے چلے آئے تھے۔

"کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"ہوٹل میں۔"

"کب آئے تھے؟"

"آج صبح۔"

"یعنی آپ کو مسوری آئے ہوئے صرف ایک ہی گھنٹہ ہوا ہے؟"

"جی ہاں آپ کا حساب درست ہے۔"

"چائے، ناشتہ۔۔۔؟"

"دوسروں کے گھر کا کھلا دوگی؟"

نہیں میرے کھانے پینے کا انتظام علاحدہ ہے۔ اس ساتھ والی کوٹھی میں جا کر چولہا جلا کر ابھی بنانے دیتی ہوں۔"

کمل بابو نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے تو دیکھا ہے، کھانا پکاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔"

جی میں تو آیا کہ کہہ دوں کہ آپ نے مجھے پڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ یہ کہ آپ نے مجھے آج سے پیشتر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ یہ تو صرف میری دلی کیفیت آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں کچھ بھی کہہ نہ سکی۔

"چائے کا پانی تو رکھ آؤں؟"

"نہیں چلو تمہیں ہوٹل میں چائے پلاؤں گا۔"

"تھوڑی سی یہاں پی لیجئے۔ تھکے ہوں گے۔"

"نہیں۔"

آپ پہلے سے بھی اسی طرح انکار کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ مانتی ہی کہاں تھیں جو ان کی طبیعت چاہتی ہے وہی کرتی ہیں۔

"لیکن تمہیں تو باہر لے جاؤں گا۔"

"آپ گھر سے زیادہ اہمیت ہوٹل کو کیوں دیتے ہیں؟"

"یہ گھر تمہارا کہاں ہے؟"

"میں کام کرتی ہوں رہتی ہوں۔ مفت تو رہتی نہیں۔"

"کام کرنے کی تنخواہ بھی کچھ ملتی ہے؟"

"نہیں۔"

"صرف رہنے کو جگہ؟"

"جی!"

"بہت سستی آیا ہے۔"

"میں آیا تو نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو؟"

"صرف اسا دنی۔"

"میں تو اسے آیا ہونا ہی سمجھتا ہوں۔"

شاید غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں تمہیں ناراض کرنے کیلئے یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"۔۔۔ میں چائے کا پانی رکھ آؤں"

اگر تم نے اپنا خیال ابھی تک تبدیل نہ کیا ہو تو رکھ آؤ۔"

میں چائے کا پانی رکھنے گئی تو میں نے دیکھا ہیٹر پر پانی پہلے سے ہی رکھ رہا تھا۔ میں اپنا ناشتہ بنانے کے لئے پانی رکھ گئی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ چائے بنائی، کچھ مٹھائی اور بسکٹ لے کر آئی نہیں۔ شہر میں جا کر کمرے میں واپس آئی تو دیکھا، سنتا دیوی رونق افروز ہیں۔ آج وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں تشریف لائی تھیں۔ شاید کمل بابو کی آمد نے کافی اہمیت رکھی تھی۔

کافی عرصہ تک بغیر شادی شدہ لڑکیوں کے ذہنی حالات اور سوچ کا رخ کچھ عجیب ہو جاتا ہے۔ ان کے احساسات بھی عجیب و غریب ہو جاتے ہیں ان کی زندگی میں صرف مرد ہی ایک آورش رہ جاتا ہے۔ اسی سے گفتگو کرنا جس طرح ممکن ہو

لگے تقریباً سب ایسی لڑکیوں کی زندگی کے فرد ہی بن جاتے ہیں۔

بڑی جلدی چائے بنالائی رانی؟ کمل بابو نے مسکرا کر کہا۔ یہ شکایت نہیں تعریف تھی۔ لیکن انداز سے میں نے محسوس کیا ستندا نے کمل بابو کو مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ وہ گڑیا کی طرح سجی ہوئی تھی۔

"بھائی سے کہہ دیتیں رانی! وہ انداز سے چائے بنا کر پیش کر دیتی۔"

"ٹھیک ہی بات ہے ۔۔۔ آپکا تعارف کرا دوں۔"

"کمل بابو نے فوراً جواب دیا — ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف ہو چکے ہیں۔"

"ستنا جی! آپ کے لئے ایک پیالہ چائے لاؤں؟"

"نہیں، میں ابھی ابھی ناشتہ کر کے آ رہی ہوں۔"

"رانی! میں نے نہیں بتایا تھا کہ انکے بھائی پران بابو سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ سندری کیساتھ ولایت جا رہے تھے۔"

کمل بابو مجھے پیشتر ہی بتا چکے تھے۔ لیکن دوسری مرتبہ پھر اُسی بات کا ذکر کر کے وہ شاید ستنا کے غرور پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔

کمل بابو کی عادت میں یہ تبدیلی ایک اہم تبدیلی تھی۔ ماں سے لیکر اور دوسری کوئی بھی عورت ان کی زندگی میں آتے ہوئے نہیں دیکھی تھی جس سے انھوں نے اس طرح گفتگو کی ہو۔ شروع میں ہی بے رخی اور لاپروا ظاہر کرنا اور بات ہے، لیکن دوران گفتگو اس طرح کچھ کہنا و گھریلت ہے۔ پھر ستندا بیوی کی اس سلوک کے قابل نہ تھیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے انکے چہرے کی طرف دیکھا۔ ستنا کی زبان سے جواب میں ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔ بولے تو کیا بولے؟ یوں تو انھوں نے ستندا سے جو بھی کچھ کہا تھا کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ خود ایسی تھی کہ اس سے بھی زیادہ .... کہا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے کمل بابو پر تعجب ہو رہا تھا۔ جس وقت سندری کو غرور نے گھونٹ تھے تو کوئی بات نہ تھی، اور آج جب وہ کسی دوسرے کیساتھ چلی گئی ہے تو اُن کے متعلق باتیں بنانے لگے ہیں۔ شاید سبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کوئی نہیں دیکھتا کہ خود کیا ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ دوسروں کی خامیاں تلاش کر کے انھیں ظاہر کرنے میں ایسے شخصوں کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اسکے بعد مجھے خاموش ہو جانا پڑا، کیونکہ ستندا کی تقریر شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گھڑ سواری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ مسوری میں گزارے ہوئے دن، سانپوں کی داستانیں سناتی رہی۔ جن میں سے کچھ

سے وہ خود واقف تھی اور کچھ کا اس نے اِدھر اُدھر سے صرف نام ہی سن رکھا تھا۔ کمل بابو اسکی باتوں پر ہنستے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے مذاق بھی کرتے جاتے تھے۔ وہ مذاق کر رہے ہیں مجھے معلوم تھا۔

ستنا شاید ساری دوپہری بات کرتی رہتی۔ لیکن اسی دوران سلوچنا دیوی کا بھائی آ گیا۔ وہ تجارت کرتا تھا۔ سلوچنا دیوی اسے اپنے گھر آنے پر کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھیں کیونکہ انھیں ستنا اور اپنے بھائی کے باہمی تعلقات قطعی ناپسند تھے۔

ستندا نے اُٹھتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی کمل بابو سے معافی مانگ کر باہر چلی گئی۔

"اب کہو رانی! واپس کب چلو گی؟"

"میں کبھی نہیں؟"

"تم اتنی نادان نہیں ہو۔"

"مجھے آپ کیساتھ جانا ہو گا؟"

"ہاں، میں تمھیں ہی لینے آیا ہوں۔"

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسکا کیا جواب دوں۔

"بولو رانی جواب دو؟"

"میں اب وہاں جا کر کیا کروں گی؟"

"جو پہلے کرتی تھیں۔"

"پہلے تو میں پڑھتی تھی۔ لیکن اب تو پڑھائی ختم ہو گئی۔"

"تو کیا ہوا؟ آیا گیری کرنے کیلئے تم نے ایم اے پاس کیا ہے؟"

جب دوسری مرتبہ بھی انھوں نے ایک ہی بات کو دُہرایا تو میں خود پر قابو نہ پا سکی۔ جب کادیری نے گھر سے نکال دیا تھا تو میں کہاں جاتی۔ . . بتایئے؟

کمل بابو پھر ہنسنے لگے۔ "کادیری تمھاری بہن ہے، اگر میں ایسی حرکت کرتا تو دنیا مجھے جینے نہ دیتی۔ . . ہاں تو رانی! اُسے کس بات کا شک تھا؟"

میں اُن کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی، شرم و حیا نے میری زبان بند کر دی۔ اُنکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجھ میں ہمت باقی نہیں تھی۔

"رانی!"

"جی!"

"مجھے معاف کر دو۔"

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

"میرا قصور تمھارے نہ ماننے سے ہرگز کم نہیں ہو سکتا۔ میرے قصور کو یا تو تم محسوس نہیں کرتیں یا تم اسقدر باتہذیب اور بھولی ہو کہ مجھ پر میرا جرم ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔"

"میں بھی نہیں"
"مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، پھر بھی . . ."
"لیکن دنیاوی تجربات تو میری بہ نسبت آپ کے کہیں وسیع ہیں۔"
"تمھاری خاموشی میرے جرم کی سنگینی کم نہیں کر سکتی۔۔۔ میں اس کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ تم سامان باندھ لو اور تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ ڈھائی بجے چل دیں گے"
"لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔"
"میں کوئی مخالفت نہیں چاہتا"
"لیکن میں جاؤں گی کہاں؟"
"گھر"
"نہیں بابو جی، اب میں جس گھر سے نکل آئی ہوں اس گھر میں نہیں جاؤں گی"
"لیکن جب تک تمہارے پاس کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ تم یہاں بھی تو نہیں رہ سکتی ہو۔"

دہلی کل بابو جو میری طرف نگاہیں اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ کبھی بابو میری ... دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں جو کہ اس دنیا کی نظروں میں حقیر ہو چکی تھی جسے کسی کی محبت حاصل نہ ہوئی تھی ... سلوک سے چھوڑ کر صرف پیار ہی چھپا رکھتے تھے ... مجھ پر ... کی جا رہی تھی ... جذبات ہو ... میں دیوار سے ٹیکی ہوئی تھی بابو جی کی طرف کھسک کر میں نے اپنا ... دیوار سے لگا لی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھے جا رہے تھے۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن انکی نظریں میرے جسم کی باہری سطح کو پار کرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک پہنچ رہی تھیں۔

"مانی میں نے سب کچھ سوچ سمجھ کے طے کر لیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو گی، میں تمہارے رہنے کیلئے کوئی مکان ٹھیک کر دوں گا اور نوکری کا بھی انتظام کر دوں گا۔ سنا؟"

"ہاں مانی! میری معمولی غلطی نے تمہیں گھر سے علاحدہ کرا دیا"
"اس میں آپکا قصور ہی کیا ہے؟"
"مجھے اُس خط میں یہ نہ لکھنا چاہئے تھا کہ تمہیں گھر سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہیں"
"میں نے زیدی سے کبھی پیسے مانگے ہی نہیں۔ وہ تو خود ہی دے دیا کرتی تھیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی"
"اوہ! میں تو سمجھا ہی نہ تھا ۔۔۔ آج کل تم اپنا خرچ کیسے چلا رہی ہو؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ ... اپنے ہاتھوں کو ... کر سینے پر ڈالے تھے ... یہ ایسا پر درد واقعہ تھا کہ مجھے اس کا ذکر کرنا بھی تکلیف دہ محسوس ہوا۔

کل بابو نے میرے سامنے سو روپے رکھ دیے کہا تم کسی کا ... ادا کر دینا۔ تیار رہنا میں ٹھیک ڈھائی بجے لینے آؤں گا۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ چلے گئے۔

× × ×

کل بابو کے ساتھ مسوری سے آنے کے بعد دہلی کی دو سال کی زندگی ... ہی مکمل تھی۔ نوکری مجھے نہیں ملی اور نہ کوئی ... کل بابو کو بھی ... محسوس ہوا کہ نوکری دلوانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ وہ مسوری میں سمجھ رہے تھے۔ ۱۹۵۲ میں دہلی میں لڑکیوں کو بھی نوکری ملنی اتنی ہی مشکل تھی جتنی شاید ۱۹۴۶ میں لڑکوں کو۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ معمولی سی نوکری کیلئے سیکڑوں لڑکیوں کی عرضیاں آتیں۔ اور لڑکیوں کی عرضیوں کے ساتھ میری عرضی بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی کیونکہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔

میں دو تین مہینے کل بابو کے ایک دوست کے گھر رہی۔ لیکن اس گھر کی ایک بزرگ عورت کو میرا اپنی بہن کا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھر رہنا کھلتا رہا۔ ... میرے آزاد خیال گھر کی دوسری لڑکیوں کو بگاڑ رہے ہیں ... حقیقت تو یہ ہے کہ ان لڑکیوں نے کبھی اچھی طرح ... نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ایک غیر شادی شدہ ایم اے پاس اور نوجوان لڑکی گھر ... کے مطابق چلو جہاں ... تو ایسی صورت میں اگر لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں تو ان کا قصور ہی کیا؟

... گھر چھوڑنے کے بعد میں ایک ہوسٹل میں رہنے لگی۔ ... مشکل تھا۔ اسلئے مجھ کو بھی ... چھوڑ دینے پڑے۔ ... تو ہوسٹل میں ہر طرح کا آرام تھا۔ ... ایک دوسری لڑکی کے ساتھ ... کسی بات کی ... بیٹھ کر ... بیٹھے ہوئے بالوں کی تعداد گنا کرو ... پابندی تھی۔ ہوسٹل صرف اسلئے میرے لئے موزوں نہ تھا کیونکہ مجھے سنگیت سکھانے کے لئے، سیکھنے والوں کے ... کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے سنگیت سکھانے کیلئے ایک دو ٹیوشن مل جاتے تھے۔ لیکن نوکری ملنی مشکل تھی کیونکہ ایم اے میں میری ڈویژن ابھی نہیں آئی تھی۔ ... ہوسٹل کو بھی خیرباد کہہ دینا پڑا۔

میں نے ... ایک دفتر میں نوکری کی ... ملا تھا ... نوکری ... ملی ہی میں نے دنیا کی نفرت

اس حقارت برداشت کی توفیق نہیں ہے آرام کی زندگی گزارنے کی عادی ہو گئی تھی آج بیس سے بیکار ہو
تو بھلا مجھ سے کام نہ ہو سکا۔ مجھے اب محسوس ہوا کہ محنت کی کمائی کی اہمیت کیا ہے —

میں ایک پل ادھر جاتی تو دوسرا سامنے آ جاتا۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی کہ میں اکیلی ہوں۔ کیوں نہ ماں کے پاس چلی جاؤں؟ اُن پر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔ میری پڑھائی پر بہت کچھ خرچ کیا ہے۔ جب تک مجھے نوکری نہیں ملتی تب تک مجھے بھی ان کی امداد کی ضرورت تھی —

ایک دن ماں سے ملاقات کرنے گئی۔ اُس دن میں نہایت غمگین تھی۔ میں جس مکان میں رہتی تھی اُسکا کئی مہینے کا کرایہ میں ادا نہیں کر سکی تھی مکان مالک نے دھمکی دی تھی کہ میں دوسرا مکان تلاش کروں۔ انھیں کوئی ایسا کرایہ دار مل رہا تھا جو تین مہینے کا کرایہ پیشگی دینے کو تیار تھا۔ اور میں پچھلے تین مہینوں کا بھی کرایہ ادا نہ کر سکی تھی۔ میرے پاس کوئی زیور بھی نہیں بچا تھا کہ اُسے ہی فروخت کر ڈالتی —

میں طے کر کے گئی تھی کہ ماں سے کچھ روپیہ مانگوں گی —

ماں نے مجھے دیکھا تو انکی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں نے ہمت کر کے اُنکی خیریت دریافت کی تو وہ بولیں "تو باہر سے کما نہیں رہی تیرا دل بھی کالا ہے۔ رقم لوٹنے کیلئے کوئی اور نہیں ملا سوا اپنے بہنوئی کے"

ماں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کمل بابو کو برباد کرنا بند کر دوں اور ان کے پیچھے کا لالچ اپنے دل سے دور کر دوں —

ماں اسقدر بے رحمی سے پیش آئی تھیں کہ میں اُن سے کچھ نہ کہہ سکی میں نے صفائی دینے کی کوشش کی تو انھوں نے ڈانٹ دیا۔ "تو مجھے کیا بتائیں؟ کیوں اُس بیچارے کو نظر لگاتی ہے"

میں ماں کو قصوروار نہ کہہ کر حقیقت ہی بیان کر رہی ہوں بیسویں صدی میں ہندوستانی ماں ایسی ہی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ ہوگا۔ میری کتنی ہزاروں نے اپنے بچپنے سے اپنے بچوں کو مصیبت میں کود دیتے ہیں۔ یہ اعتماد کے سوال پر ہی بچی میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ ایسا اکثر میں نے سنا تھا۔ اکثر اخباروں میں بھی ایسے واقعات پڑھے تھے۔ لیکن مجھے تو مالک کا بیٹا ہونے کی وجہ سے بیسویں صدی کی ماں درمیانی طبقے کی ایک ماں کے مرد تعلیم یافتہ بنا کر ہی اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتی ہیں، معقول بہانے پر گھر سے علاحدہ کر دیتی ہیں —

ماں کے سلوک سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے ان سے قطعی تعلق نہ رکھنا چاہیئے ان کی خواہش بھی وہی تھی جو کادمبری کی تھی —

میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ پچیس سال کی عمر میں میں گھر و گھر والوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھی، بے گھر تھی، بے سہارا تھی —

ایک دفعہ بھی ماں نے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں کہاں رہتی ہوں، میرا گزارہ کس طرح ہوتا ہے، مجھے کوئی نوکری ملی یا نہیں؟ ماں کو شاید خوف تھا کہ میری بابت کچھ دریافت کرنے کے بعد میرا بار اُن پر آ پڑیگا —

کادمبری نے مجھے ماں کے پاس بیٹھے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ اسکا خیال تھا کہ میں نے کمل بابو کو اُس سے چھین لیا ہے —

اُس وقت مجھے اپنی اصلی حالت کا احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں قطعی تنہا ہوں، میرا کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ گھر والے میرے سایہ سے بھی دور بھاگتے ہیں —

اُس دن کے بعد میں نہ تو ماں سے ملنے گئی اور نہ کادمبری کے دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت اماں نے مجھے بلایا۔ بھیا پتا جی کا خیال آتے ہی ملنے کی جرأت پڑ جاتی تھی۔ لیکن وہ بھی نہ مجھے کبھی خط لکھتے تھے نہ دہلی آنے پر مجھ سے ملتے تھے۔ ماں اور کادمبری نے میری طرف سے اُنکے خیالات قطعی تبدیل کر دئے تھے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ ماں، پتا جی اور دوسرے آدمیوں کو بھی کہتے سنا تھا کہ اکثر ولایت میں ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کو تعلیم دلانے کے بعد والدین علاحدہ کر دیتے ہیں۔ اور والدین سے علاحدہ ہونے کے بعد بچوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چاہے جہاں رہیں، ملازمت کریں۔ اگر بیسویں صدی نصف گزر جانے کے بعد ہندوستانی والدین بھی ایسا ہی کریں تو ناجائز نہیں ہے۔ اس بے دردی، نفرت اور حقارت نے جہاں میرا دل پاش پاش کر دیا تھا وہاں مجھے ایسی طاقت بھی بخشی تھی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ اور لڑکیوں کی بھی حالت میری جیسی ہی ہوگی۔ لیکن میں ان کی بابت بخوبی نہیں جانتی —

آہستہ آہستہ میں نے بھلا دیا کہ والدین پر میرا بھی کچھ حق ہے۔ اگر ہم والدین سے کسی طرح کی کوئی امید نہ رکھیں تو ہمیں کسی طرح کا کوئی دکھ نہ ہو۔ کیونکہ اُن میں ناامیدی کی گنجائش نہیں ہوتی —

کبھی کبھی میری بوا کے خط آتے تھے۔ لیکن ان کی ہمدردی سے دل کو سکون ملتا تھا۔ ان کی اُس ہمدردی اور رحم کو حاصل کر کے میں خود کو حقیر بنانا نہیں چاہتی۔ وہ لکھتیں — "رانی بیٹیا! تمام دنیا ایک طرف اور تو میرے لئے ایک طرف۔ بیٹیا! میرا گھر تمہارا گھر ہے۔ جس وقت مرضی ہو آ سکتی ہے۔ میں تمہاری آمد کی منتظر ہوں۔ تمہارے آ جانے سے گھر کی رونق دوبالا ہو جائیگی۔ گوری بیٹیا کے تو شروع سے ہی ایسے ہی آثار نظر آتے تھے۔ اس نے کبھی بھی اپنی بیٹی کی طرح محبت نہ کی۔ گوری اپنا گھر گھاٹ چھوڑ کر دہلی اپنی بیٹی کے پاس جا بیٹھی ہے۔ بھلا ایسا بھی کوئی کرتا ہے؟ وغیرہ، وغیرہ — ہر خط میں ایسا ہی کچھ تحریر ہوتا تھا —

مجھے ماں کے دہلی آ جانے پر قطعی تعجب نہیں ہوا۔ ماں کو شروع ہی سے خوبصورت ہے

شادی کے بازار میں اُسکی اچھی قیمت ملی ہے۔ وہ اگر اپنے ایک منزلہ مکان اور لکھنؤ جیسے معمولی شہر کو چھوڑ کر دہلی آ گئی ہیں تو اُنھیں کسی کو حیران ہونیکی قطعی گنجائش نہیں۔ دہلی میں میں نے دیکھا ہے کہ جن عورتوں کی لڑکیاں خوبصورت ہیں، اور اگر حسین نہ بھی ہوں تو صرف چست اور جوان ہی ہیں کیونکہ کام اتنے سے ہی چل جاتا ہے — ایسی لڑکیوں کی والدائیں اپنی بیٹیوں کی عزا و شکل و صورت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔

ایک شریمتی حکومت سنگھ تھیں۔ ان کی لڑکی دیکھنے میں گوری اسکی کالی کالی بھوری آنکھوں والی ہے۔ چھوٹی لڑکی کے ناک نقش بھی اچھے ہیں۔ بڑی لڑکی کے شوہر وہ بخوبی واقف ہیں۔ سارا سال اپریل میں وہ کہیں نہ کہیں بڑی لڑکی کی منگنی کرنے لگتی ہیں۔ بگرہ اس سال کے مئی اور جون کے مہینے ان کے گھر والوں کے کسی پہاڑ پر گزر جائیں تو شادی کا جاڑے کا ستمبر کے مہینے کا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے ہونے والے داماد کو لازم ہوجاتا ہے کہ وہ ہونے والی بیوی کے خاندان بھر کو پہاڑ پر سے جاتے ستمبر آتے آتے وہ اپنی بیٹی کو کچھ اس قسم کی پٹی پڑھاتی ہیں کہ منگنی ٹوٹ جاتی ہے شادی رک جاتی ہے اور شریمتی حکومت سنگھ کسی دوسرے نوجوان کی تلاش میں لگ جاتی ہیں۔ سلسلہ پھر شروع ہوجاتا ہے۔ شریمتی حکومت سنگھ ہی کیوں اور بھی نہ جانے کتنی ہی ایسی ہیں جو مستقل طور پر کچھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ ماں بہرا ایک کاروبار ہوا کرتا ہے۔ جو لڑکی کی ذاتی قابلیت حسین و شباب اور ماں کی ہوشیاری پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ طبقہ فروشی نہیں کہ خوب تعلیم یافتہ ہو صاف روزمرہ کام آنے والی انگریزی کی جانکاری ہی کافی ہوتی ہے کہ اس سے انھیں اچھے عہدے پر ملازم شوہر کا تلاش کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

لہٰذا آج جب میں اُس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میری ماں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا اگر وہ اپنے داماد کے گھر آ کر رہنے لگی ہیں۔ معمولی بیشک معمولی تنخواہ پانے والا اگر انھیں چالیس سال کی عمر میں لکھنؤ جیسے معمولی شہر میں بند کر کے نہ رکھتا تو اس غریب کا کیا قصور ہے زندگی کے پچیس سال انھوں نے ایسے شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔ اور اب اُن کی ویران زندگی میں کچھ بہار آئی تھی تو دوسروں پر ناگوار گزرے زندگی بار ہے۔ اور پھر زمانے — کے ساتھ ساتھ اگر انھوں نے خود کو تبدیل کر لیا تو ناجائز نہیں۔

جب کبھی کمل بابو سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتے "رانی! تم استقدر سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟ تمھاری ماں جب ہنستی ہیں تو میں انکی عمر بھول جاتا ہوں اور انکی ہنسی میں کھو جاتا ہوں۔ جیسے ایک پندرہ سالہ لڑکی کی ہنسی جیسی دلکش اور شیریں ہوتی ہے۔ تمھاری طرح کمل کیا کر سکتی ہیں جیسے ایک معصوم بچی ہو۔"

شاید ہر عورت دل سے جوان رہتی ہے اور موقع پا کر اُس کی جنسی عمر کی قید بے قابو ہو کر آزاد ہو جاتی ہے۔

ہندوستان سے باہر کے ملک کی عورتیں بڑھاپے میں جا کر بہت شریف پاک دامن نظر آتی ہیں اور ہندوستانی عورتوں کی بابت عام روایت ہے کہ وہ جب نانی دادیوں کو کھلانے لگتی ہیں تو خود بخود ضعیف ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہماری ماں اسکے برخلاف جب نانی کہلانے لگی تھیں تو بجائے بڑھاپا آنے کے انکی کھوئی ہوئی جوانی لوٹ آئی تھی۔ اُن کا لباس، رہن سہن اور انکی طبیعت سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔

گزشتہ دو سالوں نے میری عمر میں صرف دو سال ہی نہیں دیئے بلکہ بے شمار تبدیلیاں دی تھیں۔ اکیلی لڑکی ایک خادمہ کیساتھ رہے خواہ وہ کالی ہو کیوں نہ ہو، مرد کی نگاہوں سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ اور لوگوں کی مکان کی تکلیف ہو سکتی ہے لیکن مجھے کمل بابو کی مہربانی سے کہیں نہ کہیں مکان مل ہی جاتا تھا۔ سب سے تین مقام تبدیل کرنیکے بعد میں کمل بابو کے ایک دوست کے مکان میں خوار رہنے میں کامیاب ہو گئی۔ ان کے یہ دوست پارلیامینٹ کے ممبر تھے۔ یہ کمل بابو کے کس قسم کے دوست تھے، میں اسکی تفصیل میں اس وقت نہ جاؤں گی۔ وہ کمل بابو کی قانونی اور غیر قانونی حرکات میں کہاں تک ساتھ دیتے تھے یہ بھی اس وقت بیان نہ کر سکوں گی۔ وہ مدھیہ پردیش کے ممبر تھے۔ انکا ستمبر آئندہ چھ سالوں کیلئے محفوظ تھا۔ اسلئے جب تک میں کوئی ناجائز کام نہ کروں میرے رہنے کا انتظام مستقل تھا پھر یہاں جو سب سے بڑی سہولت تھی وہ یہ تھی کہ مکان کا کرایہ مجھے نہیں دینا ہوتا تھا۔ کمل بابو اسکا کرایہ بھیا جی کو کس صورت میں ادا کرتے تھے مجھے اسکا علم نہیں۔ اور نہ مجھے اسکی بابت معلوم کرنیکی ضرورت ہی تھی۔ کمل بابو بھی انھیں بھیا جی کہتے تھے۔ انکے ساتھ کام کرنے والے بھی انھیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ بھیا جی کے مکان تلک الیونیو میں آ کر میری زندگی کے طوفانوں میں کچھ خاموشی آ گئی۔

× ×

بھیا جی کے مکان میں رہتے ہوئے تقریباً چار مہینے گزر گئے تھے کمل بابو مصروفیت کے سبب پندرہ دنوں کے بعد آ کر مل جاتے تھے — کبھی کبھی ہفتے میں دو تین مرتبہ بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ یہ ملاقاتیں ان کی مہربانیوں اور گزری باتوں پر منحصر تھیں۔ میرا اصرار تو ہمیشہ خاموش ہی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زبان سے کبھی نہیں کہا کہ "آپ آئیے یا آپکو فرصت ہے —" کبھی کبھی میرے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد کہہ دیتے تھے "اچھا رانی! میں کل بھی آؤنگا" اور اُن کے یہ الفاظ سن کر دل مسرت سے جھوم اٹھتا۔ لیکن گھر والوں میں مصروف کمل بابو تھے۔ جب سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی میری آمدورفت بھی کم ہو گئی تھی۔

[illegible] ہو جاتی تھیں کہ کتاب [illegible]
[illegible] جاتے لیکن کبھی ہمیشہ گھر پر ہی کھاتے
تھے۔ لیکن اب جب کہ [illegible] ہوٹل میں [illegible]
[illegible] سہارا لگتا تھا۔ وہ [illegible] بند کر [illegible]
[illegible] اعتراض کرتے تو وہ سندری کا حوالہ دے کر ان کی زبان بند کر دیتے۔

مجھے آہستہ آہستہ اس تہذیب اور تمدن سے نفرت ہو چلی
کیونکہ اس نے خوشحال گھرانوں کو برباد کر دیا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ کمل بابو
بھی تباہی کے راستے پر تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ میرے والدین کا گھر تو ادھر ادھر
بکھر گیا [illegible] تہذیب اور رہن سہن کے نئے طریقوں نے ان کی آنکھوں میں چکا
چوند پیدا کر دی تھی۔

لیکن میری حالت کچھ اور تھی۔ گو مجھے آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن
میں نے اپنی آزادی کا کبھی بھی غلط استعمال نہیں کیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اگر میں نے
ایک مرتبہ بھی خود کو ان [illegible] اور رنگینیوں میں کھو دیا تو میرا نام و نشان
بھی تلاش کرنے پر نہ ملے گا۔ میری حالت بھی سندری [illegible] جیسی ہو جائے گی۔
صرف چند سال ہم کو یہ خوبصورتی اور جوانی کام آ سکتی ہے [illegible] اس کے بعد
[illegible] زندگی گزارنی پڑے گی۔

کمل بابو کیا تھے میرے تعلقات [illegible] ہم خود
[illegible] زیادہ [illegible] جاتے تھے۔ [illegible] لیکن اپنے
[illegible] زیادہ [illegible] کی تھی۔ کمل بابو شراب کے [illegible] ہی شوقین تھے۔
لیکن اب [illegible] بڑھا دی تھی۔ [illegible] کرتے۔
میں منع کرتی لیکن وہ کسی کی بات نہ سنتے تھے۔ میں جب بہت کچھ کہتی تو ہنس کر کہتے
"[illegible] الگ ہی رہنے [illegible] گزر رہا ہوں۔"

میں خاموش ہو جاتی۔ [illegible] عمر
میں [illegible] سال [illegible] تھے۔

[illegible] کمل بابو [illegible] زیادہ شراب پیا کرتے تھے۔
[illegible] زار زار رونے لگے [illegible]
[illegible]

میں نے اس سے پیشتر کبھی کسی مرد کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا
تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "خاموش ہو جائیے۔ کوئی [illegible]؟"
لیکن ان کی آنکھوں کے آنسو اور بھی تیزی سے ابل اٹھے۔

"آخر بتائیے بھی تو ہوا کیا ہے؟"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں دور کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اٹھ کر
ان کے قریب صوفے پر آ بیٹھی۔ کمل بابو کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے
میرا جی [illegible] اٹھا۔ کسی طرح میں نے خود کو سنبھالا۔

کمل بابو کس قدر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ہر طرح میری امداد اور [illegible]
کرتے ہیں۔ وہ آج [illegible] اس قدر غم زدہ ہیں۔ ایسی صورت میں مجھے ان سے بیگانگی نہیں
برتنی چاہیے۔

وہ روئے جا رہے تھے۔ جب مجھ سے کچھ نہ سوجھا تو میں نے ان کا ہاتھ اپنے
ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ آہستہ دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگی۔ زندگی میں پہلی
مرتبہ اس دن میں نے کسی مرد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا
گویا میری زندگی یکبارگی تبدیل ہونے لگی ہے۔ جیسے میں [illegible] ہوا میں پرواز
کر رہی ہوں۔ [illegible] کانپ رہا تھا اور [illegible] کی دو
انگلیاں [illegible] کے [illegible] ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی مجھے ایک عجیب
خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ان کا رونا کم ہو گیا۔ انھوں نے اپنا چہرہ [illegible] جو
آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سوتی ساڑی کے پلو سے ان کے آنسو
پونچھے۔

"آپ کے لئے پانی لے آؤں؟"

"نہیں رانی! تم یہیں بیٹھو۔"

"پانی پینے سے طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"نہیں رانی —" اور ان کے آنسو پھر ابل اٹھے —

میں نے ان کی آنکھوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر اپنے دامن سے [illegible]
پونچھا۔ اس روز ضرور کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس روز [illegible] کے بارے
میں کمل بابو کے خیالات [illegible] خوش نہیں ہوتی تھی۔ [illegible] ہمیشہ [illegible]
[illegible] کی نظر سے دیکھتی آئی تھی۔ [illegible] مجھے اس [illegible]
[illegible] تھا۔

"آپ رو کیوں رہے تھے؟"

"میں بہت پریشان ہو گیا ہوں رانی!"
"کیوں؟"
"کاوری مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔ مگر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں۔"
"کیوں؟"
"اس کا خیال ہے کہ میرے [illegible] ساتھ تمہارا [illegible] ہے۔ حالانکہ میں [illegible] قسم [illegible] تم سے محبت کر رہا ہوں۔"
[illegible] بات کہہ کر میں [illegible] لیکن میری [illegible] آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔
"تم کیوں [illegible] گئیں؟"
"نہیں تو ——— میرا تو خیال ہے کہ اس میں رونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔"
جب سچ [illegible] برداشت کی [illegible] ہو جاتا ہے تو [illegible] کے پاس رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔"
"لیکن اب میں آپ کو ——— ہرگز رونے نہ دوں گی۔"
"کیا تم میری قسمت تبدیل کر دو گی رانی؟"
"ہاں۔"
"سچ؟"
"یقین کیجئے۔"
"رانی ——— [illegible] [illegible] اور [illegible] نے آہستہ سے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگی۔
"رانی ——— کتنی [illegible] ہے تمہارے دل میں۔"
[illegible] کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔
"تم دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے۔"
"ہاں [illegible] میری [illegible] نسبت بہت خوبصورت ہے [illegible] رانی [illegible] چاہیے تھا۔"
"نہیں، تم واقعی رانی ہو۔ [illegible] پیار کی [illegible] [illegible] کی طرح [illegible] ہے۔ [illegible] تم [illegible] نہیں ہو اور اگر دل ہے [illegible] نہیں، احساس نہیں۔"
"[illegible]؟"
"اس سے تمہیں [illegible] اور اس کے [illegible] تم [illegible] [illegible] ہو۔ [illegible] ذرا ذرا سی بات پر [illegible] [illegible]۔"

"[illegible] [illegible] کیوں نہیں ہو سکتا؟"
"میرا خیال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اگر مجھے شکر [illegible] لیکن تم خود بھی تو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] سے [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible]۔"
"آپ نے ایسا سوچا کیوں نہیں کیا۔ مجھے آپ صرف [illegible] سمجھتے ہیں؟"
"نہیں [illegible] میں تم سے بخوبی واقف ہوں اور اسی لئے تو تم سے [illegible] [illegible] چاہتا ہوں تاکہ [illegible] ہو جائے یہ تمہارے [illegible] میں [illegible] [illegible] ہو جائے۔"
"تو کیا ہوتا؟ آپ کا [illegible] ہو جاتا۔"
"نہیں رانی! میں تمہیں کسی طرح کا [illegible] نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہاں تک کہ میں تمہیں کسی طرح [illegible] [illegible] نہیں ہوں۔ ایسی صورت میں تمہیں پریشان کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔"
"[illegible] آپ خود ہی اپنے حقوق سے ناواقف رہیں اور [illegible] [illegible] کیا [illegible]؟"
"رانی!"
"جی؟"
"جانتی ہو۔ تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو۔"
"[illegible] جانتی ہوں۔ [illegible] کی طرف [illegible] نظر کیا سکتی [illegible] نے [illegible] کیا جا سکتا ہے [illegible] [illegible] درد [illegible] کی طرح ہی ہوتی ہے۔"
ہم اپنی باتوں میں اس قدر مشغول تھے کہ ہمیں جانے کی آمد کی قطعی خبر نہ ہوئی [illegible] [illegible] کس وقت آ گئی۔
"میں [illegible] پانی [illegible]۔"
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اسی وقت جانے [illegible] پانی [illegible] ہوں [illegible] تم [illegible] [illegible]۔"
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔

ہوسکتا ہے کہ کمل بابو کے اس جملے سے چاندنی کو بے حد خوشی ہوئی ہو
مسکرا کر بولی — میری [illegible] دیدی، بتایا کہ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔
یقیناً ان خوبصورت آنکھوں کو دیکھ کر ان کی تعریف کئے بغیر نہ رہیگا —— کون
ہے جو ان معصوم آنکھوں میں بسا نصیب کا نشہ نہ کرنا چاہیگا! لیکن تم اس
[illegible] تب نہ؟ تم تو کبھی [illegible] سراسر [illegible] ہے۔

کمل بابو بے ساختہ نہ جانے کیا کہہ گئے تھے۔ اپنی جسمانی خوبصورتی اور خصوصیت
کی تعریف سن کر [illegible] عجیب عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی صورت
نظر نہ آتی تھی [illegible] سامنے بال سنوارنے لگی کمل بابو
کی نگاہیں اس وقت بھی میری طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔

مانی تمہیں یہ کیسے معلوم نہ تھا کہ کسی عورت کی خوبصورتی کا اندازہ صرف اس کے
گورے چٹے جسم پر نہیں ہے۔ تم سانولی ہونے کے باوجود بھی اس قدر خوبصورت ہو
میں حیران ہوں کہ آج تک میری نگاہیں تمہاری خوبصورتی سے بیگانی کیوں
رہیں۔ شاید میں نے اس نظریے سے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں — — تمہارے
بال کتنے خوبصورت ہیں مانی —

بال سنوارتے ہوئے میرے ہاتھ ٹھہر گئے۔ کمل بابو کے لفظوں نے ان کی
حرکت چھین لی تھی۔ میری نگاہیں میرے ہاتھوں میں ہی رہ گئیں۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ
کسی مرد کی زبان سے اپنے حسن کی تعریف سن رہی تھی۔ اور وہ مرد کوئی دوسرا نہیں
ماں کے عزیز ترین [illegible] کمل بابو، جن کے نزدیک ایک دن میری کوئی اہمیت
نہ تھی۔ میرا کوئی وجود نہ تھا۔ جو ڈھائی سال پیشتر میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی
گناہ سمجھتے تھے۔ مگر اس وقت میں دنیا کی [illegible] کا تصور [illegible] خود کو تصور
کرنے لگی [illegible] میری زندگی [illegible] ہو گئی تھی۔

کمل بابو [illegible] انھوں نے گزشتہ ڈھائی سال
میں کبھی مجھ سے اس طرح گفتگو نہ کی تھی اور نہ کبھی میں نے ہی۔ میں محسوس کر رہی
تھی کہ [illegible] وہ مناسب طریقہ نہ تھا۔
[illegible] میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے
انھوں نے [illegible] دل کی دھڑکنیں
تیز ہو گئیں [illegible] میری سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ میری آنکھوں سے نکل کر آنسو
ان [illegible] کا کانپتا ہاتھ میری [illegible] میری
دونوں [illegible] گرفت میں [illegible] سکی تھا۔
[illegible] کر رہے تھے۔ لیکن اسی وقت

چاندنی نے آکر کہا — بھائی بابو کی تلاش ہو رہی ہے —— اماں جی تو ابھی
بیٹیا جوان ہو گئی ہے۔ کہیں اس کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔
کمل بابو چاندنی کی بات سنکر ایکدم ٹھٹک کر رہ گئے اور چپ چاپ کمرے سے
میں اٹھ کر چلے گئے۔ میں کافی دیر تک بہت خاموش اور گم سم سی کھڑی رہی میں محسوس
کر رہی تھی گویا مجھے کسی نے پکڑ لیا ہے۔ لیکن میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ گرفت جائز ہے
یا ناجائز —— میرے پاس اس کا کوئی جواب تھا اور نہ غور کرنے کا وقت ہی۔
چاندنی نے میرے [illegible] آنسوؤں کو دامن میں چھپاتے ہوئے کہا ——
"[illegible] دیدی، بیٹیا ابھی تم [illegible] کبھی بھائی بابو روتے ہیں۔ میں نے
تو کبھی انہیں روتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ پھر آج کیا بات ہے؟"
میں شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی ——
چاندنی نے محبت سے [illegible] کہا "چلو چل کر ہاتھ منہ دھو لو ——"
اور میں غسل خانے کو بھاگ گئی۔

× ×

اس دن کے بعد کمل بابو پھر [illegible] نہیں آئے۔ ان تین دنوں کی یاد میرے
دل پر ان مٹ نقش بن گئی [illegible] میں کسی صورت میں بھلا نہ سکونگی۔ میری حالت ایسی ہو گئی تھی
گویا کسی نے میرے جسم میں سے جان کھینچ لی ہو۔ تین دن تک متواتر میں انہیں خیالات
میں ڈوبی رہی۔ بار بار کوششوں کے باوجود بھی میں کسی کام میں دل کو نہ لگا سکی [illegible]
[illegible] ان کی نگاہوں میں میرے لئے کس قدر محبت اور چاہت جاگ اٹھی تھی۔
"اتنی محبت اور چاہت تمہارے دل میں —— ؟ تم سانولی ہونے کے باوجود
بھی کس قدر حسین ہو؟"
اور پھر ان کے بازوؤں کی گرفت [illegible] سب کچھ یاد آ رہا
تھا۔ میں گویا زمین پر جنت کا احساس کر رہی تھی۔ انہیں تین دنوں میں مجھے [illegible]
میں حسن نظر آنے لگا تھا۔ گویا یہ ستارے [illegible]
[illegible] جاتی تھیں۔ کبھی میں [illegible] اور پھر آکر اپنے پلنگ پر لیٹ
جاتی۔ نہ جانے مجھ پر کیسا نشہ طاری تھا۔ ان تین دنوں [illegible]
میں کمل بابو کی گزشتہ زندگی سے بخوبی واقف تھی۔ میں جانتی تھی کہ انھوں نے اپنا
کو ہوسٹل میں رکھا تھا [illegible] لیکچرر [illegible] سلوچنا دیوی کی نسبت
ستندا دیوی سے ملنے وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ
میری بڑی بہن کے شوہر تھے۔ ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود بھی میں
اپنے دل [illegible] پا رہی تھی۔ وہ بار بار انہیں کے تصور میں کھو جاتا تھا [illegible]
[illegible] دل کو اپنا لیا تھی۔

کلی نے کہا ــــ ان کا خیال تھا کہ تم دونوں بچپن سے [illegible]
بات تسلیم کر لینا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ بچپن کی ہمدم و ہمراز میرے دل میں ان کے لئے
خلوص اور محبت تھی۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا ــ تم [illegible] کو
دیکھا ہی نہیں اس لئے تم اس طرح کہہ رہی ہو ۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو ممکن ہے
[illegible] خود [illegible] کو برا بھلا کہتی ہو۔

لنڈن کی [illegible] انگریزی [illegible] آنکھیں ۔۔ ۔ [illegible] کیا
[illegible] قریب سے دیکھا ۔۔ [illegible] محسوس [illegible] تھا ۔ [illegible] کو بھی
[illegible] کے علاوہ [illegible] کے دوست [illegible] وغیرہ کو بھی
تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکا تھا اور نہ میرا دل ہی
ان کے قریب پہنچ سکا تھا۔ [illegible] میرے جذبات کو [illegible] دل کی [illegible]
گہرائیوں [illegible] نغمے [illegible] تھیں۔ [illegible] آنکھوں میں [illegible] امیدوں کی [illegible] رات
[illegible] حسین اور [illegible] خواب [illegible] میری نگاہیں
[illegible] تار تار ہو کر رقصاں ہو جاتی تھیں۔

..... [illegible] کے ساتھ جب [illegible] شادی کے [illegible] تو [illegible]
[illegible] نے میرا دل پاش پاش کر دیا تھا۔ ۔

.. [illegible] مبارک باد بھی نہ دی تھی۔ اور ان کی خاموشی
سے میری خوشی کو آدھا کر دیا تھا۔ ۔

میرے [illegible] رونمائی کیلئے [illegible] تھے۔ ان کی [illegible] کی وجہ سے
[illegible] تعلیم بھی ٹھیک طرح سے پوری نہ کر سکی تھی۔ اور [illegible] میں پاس
[illegible] پاس ہو گئی تھی۔

مجھے [illegible] کہتے [illegible] انھوں نے زبردست [illegible] شاید [illegible]
[illegible] ان کی پرستش
کرنے لگی تھی۔ جس کا احساس مجھے نہ تھا۔

[illegible] نے کہا ۔ یہ سب [illegible] گزشتہ [illegible] کا انجام ہے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
خیال کرتی ۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] ۔۔ لیکن [illegible]

تمہاری [illegible] ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

وہ [illegible] دیکھ رہے تھے۔
میں نے [illegible] ۔ وہ [illegible] پریشانی [illegible]
نظر آ رہے تھے۔

میرے دل کی [illegible] طرح [illegible] کہ میں نے
سوال کیا [illegible] مسکرا کر [illegible] آپ؟

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا ــ میرا تو خیال تھا کہ تم گزشتہ [illegible] تک
[illegible] دریافت کرو گی۔

انھوں نے ذرا سا [illegible] کی طرف [illegible]
"تم اتنی [illegible] کیوں ہو رہی ہو!"

ان کے اس عجیب و غریب سوال کا جواب میں نہ دے سکی۔
انھوں نے اپنے ہاتھ سے میرا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا [illegible]
کیا ان گزشتہ [illegible] میں تم نے مجھے کبھی یاد کیا تھا؟
میں کسی طرح سر ہلا کر صرف ہاں کہہ سکی۔
"تم [illegible] سکول بھی نہیں گئیں ۔ میں نے پرسوں [illegible]"
"دل نہیں لگتا [illegible]"
"کیوں؟"
"میں کیا جانوں۔"
"کیا کرتی رہیں؟"
"[illegible] ـــ [illegible] ـــ خیالوں میں [illegible] رہی"
"یہی؟"
"جی!"
"اور کچھ نہیں کیا؟"
[illegible] مسکراہٹ [illegible] ۔ وہ [illegible]
[illegible] تھے۔
"[illegible]؟"
"جی ہاں"
"بہت [illegible]"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے پانی کو نہیں میرے ملنے کا آپ تو ابھی بہت اچھے ہیں۔
تمہاری شہزادی کی بیٹی کی اور کو ڈھونڈنے کی بھی میرے تعلقات رہ چکے ہیں"

"میں جانتی ہوں"

"پھر ... پھر بھی تم ...؟"

"میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا — میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی — میں راحت محسوس کر رہی تھی۔

"ثانی؟"

میری سانس گھٹ رہی تھی۔ کوشش کرنے پر بھی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔

ثریا! میں تمہارے پاکیزہ جذبات کے قطعی قابل نہیں ہوں جانتی ہو میں نے تمہاری ماں کے خوابیدہ جذبات میں طوفان جگا دئے ہیں۔ گو عمر میں وہ مجھ سے صرف پانچ سال بڑی ہیں۔ لیکن مذہبی رشتے کی نظر سے میری ماں کے برابر ہیں۔ میں نے انہیں پیسے والوں کی دنیا کی کمائی کا سب سے موجودہ سوسائٹی کے رنگ میں اس قدر رنگ چکی ہیں اپنی بیٹی کے ساتھ غیر ملک جا رہی ہیں۔ میں دونوں شکلوں کا دیرینہ احسان پلٹ رہا ہوں جہاز میں سیٹ بک کرا کر آ رہا ہوں۔"

"آپ بھی ———؟"

افسوس یہ ممکن نہیں ... میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا ... گزشتہ تین ایسی گھڑیوں میں ... میں ان کے ساتھ نہ جا سکوں گا۔"

"آپ موت میرے سینے ... تک ... رہے ہیں؟"

"کیا تمہیں ... حقیقت نظر آ رہی ہے؟"

[illegible]

ساتھ لے کر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر وقت پر تمہارا علاج نہ ہوتا تو تمہیں ٹی بی ہو جاتا۔ ـــ اور اُس روز میں نے تمہارے روحانی جذبات کو سمجھا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ تمہاری ماں اور بیوی کی طرح تمہیں روپیہ کی طاقت سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ باتیں کر رہے تھے اور اُن کی نگاہیں بجھی بجھی ہوئی تھیں۔

"وہ کب جا رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مہینے بعد۔"

"کیا ماں تمہیں چھوڑے جا رہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"ان کا خیال ہے کہ پتا جی خود اُن سے ملاقات کرنے وہاں جائیں گے۔"

"پتا جی کو لکھ دیا ہے؟"

"نہیں جب تک سیٹیں بک نہ ہو جاتیں لکھنا بیکار تھا۔"

"ماں ایسی صورت میں باہر جا کر کیا کریں گی؟"

"اپنے والد کے پیسے کو پر لگائیں گی۔"

"تین چار آدمیوں کے جانے میں خرچ تو کافی ہو گا؟"

ہاں، تم کیوں فکر کرتی ہو۔ کسی طرح پورا ہو ہی جائے گا۔ میری ابھی کچھ ... رہ جائیں۔ سمجھ لیجئے کہ ... حاصل ہو جائیں گی۔"

چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے سوال کیا ثریا تم اِن دنوں ... میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے؟

"نہیں تو۔"

"تمہارے بنگلے میں اب وہ اداس ... نہیں ہے۔"

میں کس طرح ... آپ کی ... مجھے نئی زندگی بخشی ہے میری زندگی بدل ...

—۴—

"تم ماں سے ملنے نہ جاؤ گی؟"

"کیا وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"میرے خیال میں تو انھیں میری صورت سے بھی نفرت ہو ... کہنا ہو کہ انھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے پیار سے کبھی نہیں پالا ... کیونکہ میں کالی تھی — اور انھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے چاندنی کے حوالے کر دیا تھا۔"

بہت اچھا ثریا! ورنہ تمہارے ... میں بھی ...

[illegible] دیکھے گی۔

[illegible] تعجب سے میری طرف [illegible]

[illegible] بیان [illegible]

" [illegible] آپ [illegible] نہیں [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] "

" مجھے تعجب ہے کہ تمہیں ان لوگوں [illegible] لیکن [illegible] انہیں [illegible]

[illegible] بہت ہے "

[illegible] کہ [illegible] آپ [illegible] ایک مدت تک [illegible]

[illegible] کیا آپ [illegible] زندگی [illegible] برداشت [illegible] کیوں؟

[illegible] تک [illegible] میرے پاس ہی رہے۔ [illegible]

[illegible] ہے۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا —

× × ×

[illegible] میں اپنے [illegible] کرلیا تھا [illegible]

جب [illegible] نفرت [illegible] تھی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible] میں [illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں آئے۔ انہوں نے اپنے خط میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیا [illegible] نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میرے [illegible] میں نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] تھی۔

[illegible]

[illegible] وقت چیک بک نکال کر اس رقم کی ادائیگی کر دی۔ مسٹر [illegible] دستخط کر دا لیے کہ مہر گوائی۔ لیکن وہ تین تو تحمہ سے بھی کسی کے پیسے گئے تھے اس میں کرا کی بھی نہیں ہوئی کہ سجاد کی مرتی [illegible] حرکت سے سخت رقیب تھے۔ لیکن اس شام انھوں نے شراب نہیں پی۔ دوسرے ہی لمحے میں میرا ہاتھ پکڑ کر تم کہاں تک راتی آج تمہاری سالگرہ ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔"

"اتنی بڑی بات یوں ہی نہ کہہ ڈالئے" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی راتی! جب میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں تو مجھے کسی بھی ملال نہیں رہتا۔"

"سچ؟"

"ہاں راتی!"

"اور میں اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔"

راتی! میرا تو خیال ہے کہ مجھ جیسے شرابی شراب پینا ترک کر سکتے ہیں اگر ان کی زندگی کی کوئی زبردست کمی پوری ہو جائے۔ میں خود ہی اس بات کی مثال ہوں۔ میں اپنی زندگی میں شروع سے ہی محبت کی پیاس محسوس کرتا رہا۔ ماں کو میرے بچپنے سے ہی ماں سے محبت تھی۔ میں ان کو کھو بیٹھا۔ میری پرورش اور تعلیم کا وقت آیا تو ایک پیا بھی بچپنے سے سرپرست ہو گئے تھے۔ دولت کی گھر میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں کو روپے پیسے نکلتے ہوئے دیکھتا۔ بعد دولت سے سخت نفرت ہو گئی۔ میں کھلے ہاتھوں دولت لٹاتا رہا۔ لیکن میری نہ بجھنے والی پیاس نہ بجھتی تھی۔ نہیں ہوا کیا؟ کہ میں جو کچھ پانا چاہتا تھا وہ نہیں مل پایا۔ خوبصورت لڑکی دیکھ کر میں نے شادی کی۔ کتنے خوش نصیب تھے کہ شاید وہ میری مرضی کی ہے لیکن پیاس پھر بھی نہ بجھی۔ مجھے بھی [illegible] نہ ملا۔ سچ کہتا ہوں نہیں راتی! دولت مند شخص یا اس کے دوست پلتے ہیں کہ وہ پالتو کتوں کی طرح ان کے اشاروں پر دم ہلاتے رہیں۔ میں وقت نہیں کر سکتا ہوں۔ لیکن دوستوں [illegible] پاس کا پہلا قدم۔ کبھی کبھی شوقیہ شراب پیتا تھا۔ پھر [illegible] میں پیتا رہا کہ [illegible] ان پی [illegible] نہیں کر پایا ہی ان [illegible] [illegible] نہیں آیا۔"

[illegible] زندگی میں پہلی مرتبہ وہ میں نے خوبصورتی کا پیار [illegible] وہ کشش اور اپنائیت نظر آتی ہے۔ میں نے [illegible] جب انھوں نے [illegible] کر کے [illegible] خواہش [illegible] لیکن انھیں وجہ سے [illegible] سے [illegible] ہیں۔ اس بات سے

میرے دل کی گہرائیوں کو چھو لیا۔ میں نے عاجزی سے کہا "آپ جیسے [illegible] کہ آپ اتنا سوچنے کی کوشش نہ کریں۔"

"نہیں راتی! مجھ کو یہ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنا دل کی خلش مٹا رہا ہوں۔ تم نے میرے دل کو چھو لیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ کس وقت محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر مرد عورت سے اسی چیز کا تو طالب ہے۔ محبت ایک پُر خلوص جذبہ ہے جس کا جسم سے قطعی تعلق نہیں۔ جیسے ظاہری کا تعبیر [illegible] نہیں جا سکتا۔ مرد کا دل بیٹھ جاتا ہے اور دوسرے دل کی تلاش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ مل جائے تو اسے زندگی مل جاتی ہے۔ ورنہ ہمارے سماج میں اتنی [illegible] محض غیرت کے نام پر یا کسی دوسرے خوبصورت نام کا واسطہ دے کر [illegible]

میرا طلاق کیا میرا زندہ رہنا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ تو کل بابو کا ہے۔ لیکن جس پر میرا حق تھا وہ کہاں؟ کم ہوتا گیا کیا دل کی اسی حالت اور اسی جذبہ کو محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے؟

کل بابو شراب نہ پینے کا عہد کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن وہ نہ آئے۔ تیسرا دن بھی گزر جانے پر میں نے سوچا ممکن ہے کاروباری اور دفتری معاملات میں مصروف ہوں۔ ملازم نے بتایا کہ شکوک بڑھ گئے تھے۔ میں نے چاندنی سے ان کے گھر جا کر [illegible] دیکھنے کو کہا تو وہ بڑی پریشانی سے بار بار اصرار کرنے لگی کہ تم دیوانی ہو گئی ہو۔ وہ پیسے میں مر رہے ہیں۔ تم سے دل بہلا لیا کرتے ہیں تو تمہارا دماغ گھوم گیا ہے۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ تم تو جانتی ہو کیا ان کی بیوی آتی ہیں تو ملاقات ہو جائے گی۔ [illegible] کیا تو دیکھنا۔ [illegible] کی [illegible]

وہ چار دن کسی طرح خیالات اور شکوک کی [illegible] میں گزر گئے۔ پانچویں دن ہسپتال سے ایک شخص مجھے اطلاع دینے آیا کہ کل بابو نے مجھ کو بلایا ہے اور وہ سخت زخمی ہوئے ہیں۔ جب بھی انھیں ہوش نہیں آیا پھر انھیں نام لیا۔ چاندنی [illegible] دی گئی تھی کہ وہ سو رہے ہیں۔ اب وہ اس حالت میں ہیں کہ کچھ منٹ بات چیت کر سکیں۔

میرے دریافت کرنے پر کہ وہ زخمی کس طرح ہوئے۔ [illegible] وہ شاید خود ہی آپ کو بتا پائیں گے کہ وہ کس طرح زخمی ہوئے۔

میری حالت اس خبر کو سننے کے بعد [illegible] مجھے یاد نہیں۔ میں نے محسوس کیا گویا میں نیچے گر رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں ہسپتال کس طرح پہنچی تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب میں وہاں پہنچی تو پتہ چلا کہ میں نے جوتا نہیں پہنا تھا۔ میرے پاؤں میں چوٹ لگی تھی۔

میری آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اس وقت ہوش میں تھے۔ انھوں نے مجھے تسلی دی۔ نہایت آہستہ اور نحیف آواز میں انھوں نے کہا

[illegible] نہیں۔ تم کیسے سوچ سکتے ہو۔ کالوری [illegible] کہ [illegible]
[illegible] آنسو۔ [illegible] جانے [illegible] یہاں سے [illegible]
[illegible] میں سوار ہونے سے پیشتر وہ یہاں آ گئی تھی جہاں ملازموں کی کوٹھی میں
اس نے [illegible] ملا تھا۔ وہ کہہ گئے تھے کہ اب میری ضرورت نہیں [illegible]
[illegible] پاس رہنا چاہیے جو کہ [illegible] سال تک آرام سے گزار [illegible]
[illegible] نے میری [illegible] بند کی تھیں۔ [illegible]
[illegible] میں [illegible] پلنگ کے پاس بیٹھی [illegible] کالوری نے گولو [illegible] مارا تھا
[illegible] کی خواہش [illegible] ہی ہے۔ میں نے ان کی حالت دیکھ کر پاپا جی کو تار دیا
تھا وہ آ [illegible] چار سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی
اس دوران بہت سے واقعات گزر چکے تھے۔ پاپا جی مجھے اپنے سینے سے لگا کر [illegible]
[illegible] لیکن انھیں ماں کے پیرس جانے اور کالوری کو ساتھ لے جانے کا کوئی
علم نہ تھا

کل ماں کی صحت کچھ درست ہونے پر پاپا جی نے اصرار کیا کہ وہ بتائیں کہ
کالوری نے گولو کیوں مارا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جب [illegible] انھیں کالوری
کی [illegible] والی بات بتائی تو [illegible] بیگ میں [illegible] دیکھے گئے [illegible]
[illegible] انھوں نے محسوس کیا کہ کالوری کے دل میں کوئی راز ہے کیونکہ اس کی
[illegible] انھوں نے تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ [illegible]
[illegible] انھیں اپنا شک [illegible] کا اظہار [illegible]
[illegible] کالوری نے [illegible] روپے [illegible]
پیرس کس طرح جا [illegible] کالوری [illegible]
[illegible]
[illegible] کالوری سے
انھوں نے [illegible] کالوری کو [illegible] نہیں [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو کر جا [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] مکان [illegible]
[illegible] بیٹا! [illegible]
[illegible] ہو [illegible]

پاپا جی نے [illegible]
[illegible] جب [illegible] ملاقات ہوئی [illegible]
[illegible] میں نے تمہارے ساتھ [illegible]
[illegible] درست ہو جائے [illegible]
[illegible] میری بیماری اور دکھ برداشت کیے ہیں۔
میں —— میں ہر چیز [illegible] نصیب کہاں [illegible]

× × ×

اب ہم لوگ [illegible] کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ کل کسی ضروری
کام سے [illegible] گئے ہیں۔ [illegible] حقارت اور [illegible] میں نے
[illegible] برداشت کیا ہے۔ میں تنہا ہوں [illegible] مجھے کالوری کے قہقہے سنائی
دیتے ہیں۔ [illegible]

[illegible] اب کافی [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible]
[illegible] کر کے دل نہیں بہلایا جا سکتا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ کیا یہ سب خاموش
دیواریں [illegible] ہیں۔ کل ایک ہفتہ [illegible] میں گزشتہ ایک
سال [illegible]
تنہائی [illegible]
[illegible]
دولت مند شخص [illegible] شادی [illegible]
[illegible]

کالوری [illegible]!

پاپا [illegible]
[illegible] داستان [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

شری پات شیورام آپا چوگلے

شری پات شیورام آپا چوگلے ۱۸ مئی سنہ ۱۹۰۱ء میں اچل کرنجی ضلع کولہاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم بیلگاؤں، پونا اور بمبئی میں ہوئی تھی۔ ایک سال تک انھوں نے ایشنٹ برا میں رہ کر بھی مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ مختلف تعلیمی اداروں کے صدر رہے اور اب کستوربا ٹیچرز کالج سانگلی کے پرنسپل ہیں۔

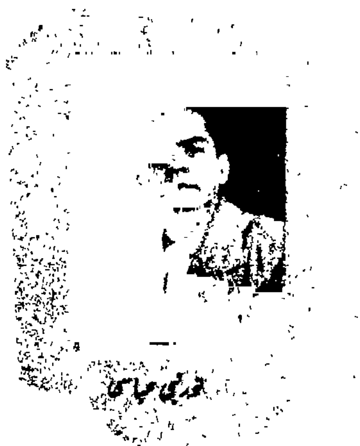
ان کی واحد تصنیف "پاٹلاچی ایک" (زمیندار کی بیٹی) مراٹھی زبان میں بہت مشہور ہے۔ اور جس طرح اردو میں پطرس بہت ہی قلیل ادبی سرمایہ کے باوجود مقبول اور مشہور ہوئے اسی طرح چوگلے بھی صرف اسی ناول کی بدولت مراٹھی ادیبوں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔

اس ناول میں انھوں نے دیہی ماحول کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی غلاظت، جہالت، ان کا بھولا پن اور سادگی کی عکاسی میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اس ناول کا ہیرو دیال ایک اچھوت خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی محنت و جانفشانی کی بدولت وہ مناسب تعلیم حاصل کرکے گاؤں کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنایا جاتا ہے اور وہاں اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دیتا ہے اسی کا حصّہ ہے۔ ہیروئن کنول جو ایک زمیندار کی بیٹی ہے اور مذہب کے لحاظ سے جین ہے اپنی تمام تنگ نظری ترک کر کے زندگی کا یہی نصب العین طے کرتی ہے۔ اور اپنی تعلیم اور تجربہ سے گاؤں کے اَن پڑھ لوگوں کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اٹھاتی ہے۔ اور اپنی تمام زندگی اسی خدمت کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ یہ ہے ناول کا روشن پہلو لیکن گاؤں میں برائیاں بھی ہوتی ہیں۔ بھولے اور سیدھے دیہاتیوں کو لوٹنے کھسوٹنے والا گروہ پنت اور اس کے ساتھی بھی اس ناول کے کردار ہیں۔ جنھوں نے اپنی ذلیل حرکتوں سے گاؤں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے لیکن مصنف نے ان متضاد کرداروں کو پیش کر کے ان کی کشمکش دکھا کر باطل پر حق کی فتح دکھائی ہے۔

یہ ناول مراٹھی ادب کا شاہکار کہا جاتا ہے۔





شری پات شیورایا چوگلے
مترجم: نور نبی عباسی

زمیندار کی بیٹی

پوں.... پوں.... پوں

دور سے موٹر کی آواز آئی۔ اسے سنتے ہی مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ سبھی طرف سے لوگ فرطِ خوشی سے چلّا پڑے "آگئے۔ آگئے!"

ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ سامنے کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے بچے اٹھ پڑے۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی خواتین بھی اپنے ننھے منے بچوں کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سب کی نظریں دور سے آتی ہوئی موٹر پر جم گئیں۔ اسی وقت ایک شخص نے باآوازِ بلند ایک نعرہ لگایا اور سب لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

"جٹا شنکر مہاراج کی....."

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی....."

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی....."

"جے!"

مگر لوگوں کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ موٹر جب قریب آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر نہیں ہے بلکہ سانگلی جانے والا مال کا ایک ٹرک ہے۔ تب تو سبھی ہنس پڑے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے۔ کسی قدر خاموشی ہونے کے بعد بچوں کے کھیل کود اور موسیقی کا پروگرام دوبارہ شروع ہو گیا۔ جس سے کہ مہرشی جٹا شنکر کے آنے تک جلسہ میں مجمع لوگوں کی تفریح ہوتی رہے۔

عوام اپنی تفریح میں محو تھے۔ مہرشی ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں۔ تب تک چلئے میں اپنے قصبہ سے آپ کو متعارف کروا دوں۔

یہ دھرم پور ہے، میرا گاؤں ہے۔ پارس کے چھونے سے تو صرف لوہا ہی سونا ہوتا ہے، مگر لفظ "میرا" جس چیز کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے وہ سونے سے بھی زیادہ خوبصورت اور قیمتی دکھائی دینے لگتی ہے۔

لوگ جس بچہ کو کالا کلوٹا اور گندہ سمجھنے لگتے ہیں وہی بچہ اپنی ماں کو پھول ایسا خوبصورت نظر آتا ہے اور وہ اسے "میرا بیٹا" کہہ کر بڑے پیار سے خوب چومتی رہتی ہے۔ اس کے بچہ کو دیکھ کر دوسرے لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر لفظ "میرا" کی وجہ سے وہ ماں ان بوسوں میں غیبی لطف محسوس کرتی ہے۔

میری بھی یہی کیفیت ہے۔ دھرم پور کے لئے میرے دل میں عزت ہے، محبت ہے اور اس پر ناز بھی۔ یہ ایک نہایت قدیم مقام ہے اور اس کے پیچھے ایک ہزار سال کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہاں کی صاف شفاف ہاضم پانی اور دلکش قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھ کر کولہا پور کے شلا ہار خاندان کے ایک جینی راجہ کی رانی نے اس جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں بسانے کی ضد کی تھی اور اپنی محبوب رانی کی ضد پوری کرنے کیلئے اس راجہ نے نویں عیسوی صدی میں یہ دھرم پور گاؤں بسایا تھا۔ رانی نہایت مذہبی تھی۔ اس کے روزمرہ کے پوجا پاٹھ کے لئے راجہ نے ایک عالیشان جین مندر بھی بنوا دیا جو آج تک اس میدان کے قریب واقع ہے جہاں جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ اس جین مندر میں کانڈی زبان میں لکھے ہوئے جو متعدد شلا لیکھ ہیں وہ آج بھی اس تاریخ کی شہادت دے رہے ہیں۔ جین مندر کے گنبد دیکھئے گویا وہ اس کا ہاتھ ہیں جیسے ہو وہ فلک کی جانب اٹھا کر اس تاریخ کی شہادت دیتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ "میں نے متعدد انقلابات دیکھے ہیں۔ کئی انسانی پیڑھیاں آئیں اور چلی گئیں۔ سب کا انجام موت تھا۔"

دھرم پور میں جینیوں کی ہی آبادی زیادہ ہے اور اس قدیم جینی مندر کے آس پاس ہی ان کے مکانات واقع ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں جینیوں کا خاص پیشہ کاشتکاری ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہ لوگ اپنی کالی ماتا کی خدمت بڑے خلوص اور ایمانداری سے کرتے آرہے ہیں۔ اور یہ ماں بھی ان پر ہمیشہ اپنا پیار برساتی رہتی ہے۔ آپ ان جینی کسانوں کو

صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ کوئی تیوہار ہو، چھٹی ہو ــــ کچھ بھی ہو کسانوں کی یہ خدمت بند نہیں ہوتی۔ اس خدمت میں کوئی کمی نہ ہو اس لئے بعض لوگوں نے تو اپنے رہنے کے مکان بھی کھیتوں اور باغیچوں میں ہی بنا لئے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے جب تک یہ نہیں دیکھ لیتی کہ اس کے بیٹے نے اس کی خدمت انجام دینے میں اپنے خون کا پسینہ کر ڈالا ہے، تب تک وہ خوش نہیں ہوتی اور نہ ہی موتی کے مانند اناج کے دانے دیتی ہے۔ میرے گاؤں کے تمام کسان اپنی کالی ماں کی خدمت میں اپنے خون کا پسینہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے خوش رہتی ہے، اور انھیں پیار کرتی ہے۔ یہاں کے جینیوں کے بارے میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کھیتی جینی ہی کرتے ہیں اور پھر سونے سے اپنی تجوری بھرتے ہیں۔ اور یہ مثل بالکل سچ ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ محنتی اور دبنگ ہیں۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی کرنا، دریا سے پانی لانا، دودھ دوہنا، گایوں کی خدمت کرنا، کھانا پکانا، کھیتوں پر کھانا پہونچانا، دریا پر کپڑے دھونا، بعض اوقات کھیتوں پر کام کرنے بھی جانا ــــ فصلوں کو پانی دینا، بازار ہاٹ کرنا، شام کے وقت جین مندر میں جاکر "پُران" سننا اور بچوں کو سنبھالنا وغیرہ متعدد کام وہ کس طرح کر لیتی ہیں یہ وہی جانیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے ان سب کاموں میں تنظیم، صفائی اور خلوص خصوصاً پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانگلی کے بازار میں دھرم پور کی چیزوں کو ــــ خصوصیت سے مکھن کو دو پیسے زائد میں خریدا جاتا ہے۔

جینی بیواؤں کے کام تو بالخصوص قابل ذکر ہیں ــــ گھر گرہستی کو کفایت شعاری سے چلانے میں یہ مہارت رکھتی ہیں۔ یہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی ہیں اور ان کی ازدواجی کاموں میں سرگرمی سے امداد کرتی ہیں۔ ان کے جسم پر ایک صاف سفید کپڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں چاندی کے کنگن ہوتے ہیں۔ اس قسم کا جذبۂ ایثار رکھ کر خدمت کرنا انہیں کا حق ہے۔ جینیوں کی اصل تہذیب اپنی خواتین کی وجہ سے جن میں ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، قائم ہے، پوجا پاٹھ۔ اپواس برت، پُران کی سماعت اور مختلف مذہبی رسومات وغیرہ اگر کوئی سچے دل اور خلوص سے ادا کرتا ہے تو وہ جینی بیوائیں ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان سب باتوں کا مقصد ہوتا ہے ــــ ایثار، خدمت اور عبادت۔

ایشور نے دھرم پور کو جو ایک خاص عظیم دیا ہے وہ ہے دریائے کرشنا۔ ہندوستان میں متعدد مرتبہ متعدد مقامات پر قحط پڑا۔ کئی مرتبہ پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض خوفناک طریقہ پر جانی بربادی کے باعث بنے۔ لیکن میرا دھرم پور ان سب تباہیوں سے آج تک بالکل اچھوتا رہا ہے۔ حالات جس طرح بدلتے گئے ان کے مطابق ہی یہاں کے جینی کسانوں نے دریائے کرشنا کے ساحل پر جگہ جگہ انجن اور پمپ لگا کر اپنی فصلوں کی آب پاشی کا بندوبست کر لیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اناج کے علاوہ وہ بڑھیا سے بڑھیا گُڑ، ہلدی، مرچ اور تمباکو بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا سارا مال سانگلی کے بازار میں پہونچتا ہے اور اس پر گاہک ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کیا گرما، کیا برسات، کیا خزاں اور کیا سردی سبھی موسموں میں دھرم پور کے قرب و جوار کے علاقہ میں ہمیشہ ہریالی چھائی رہتی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بڑے بڑے آم کے درختوں اور اونچے اونچے ناریل کے پیڑوں نے اس گاؤں پر ہری مخمل کا خوبصورت شامیانہ تان دیا ہے۔ اس گھنی ہریالی میں سے اوپر اٹھتی ہوئی یہاں کے قدیم جین مندر کی محراب بہت دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ گاؤں کے مغرب میں بہنے والا دریائے کرشنا، اس کا خوبصورت اور شاندار پاٹ اور اس پانی میں متواتر اپنے قدم دھوتا ہوا لمبا چوڑا اور مرد عورتوں نیز بچوں سے بھرا پورا گھاٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اسے ایک ناقابل بیان اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکون و اطمینان مہابلیشور اور شملہ ایسے ٹھنڈی آب و ہوا والے مقامات پر بھی میسر نہ ہوگا۔

تیرنے کے لئے پانی اور کشتیاں لڑنے کے لئے ریتیلا کنارہ دیکھ یہاں کے باشندوں کو کھلاڑی بنا دیا ہے۔ ملک میں ایسا کوئی بھی تیرنے کا مقابلہ یا کشتیوں کے دنگل نہیں ہوتے جن میں دھرم پور کے نوجوان جوش و خروش سے حصہ نہ لیتے ہوں۔ اگر میں کہہ دوں کہ ۱۹۴۲ء کے انقلاب میں حصہ لینے والے زیادہ سے زیادہ انقلابی ہیرو یہیں کے تھے تو میں سمجھتی ہوں اپنے گاؤں کے نوجوانوں کی بہادری کی مزید تعریف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

دھرم پور کے خاص رہنما ــــ انہیں کہنا چاہئے دیوتا یہاں کے زمیندار شری سیوک رام جی ہیں جنہیں لوگ محبت اور عزت سے داداجی



مکتبہ شاہراہ

حوصلہ افزائی کی ہے اور ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔

گاؤں کے سبھی لوگ میری ماں کو ماتا جی کہتے ہیں ـــــ گورا رنگ، اکہرا سڈول جسم، پیشانی پر کم کم کی بندی، گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھ میں سونے کے کنگن اور قیمتی، خوبصورت، ریشمی ساڑی میں ملبوس، ہاتھ میں چاندی کا برتن لے کر جب وہ مندر میں جاتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکشمی دیوی خود ہی دیو لوک سے اتر کر ہمارے گاؤں میں نازل ہو گئی ہیں۔ اسے دیکھ کر گنہگاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور شرم سے ان کا سر جھک جاتا ہے۔

میری ماں نیک دل اور مذہب کی پابند ہے۔ گذشتہ بیس تیس برسوں میں یہاں کے قدیمی جین مندر میں متعدد جشن کرائے ہیں۔ مہاویر جینتی اور دیگر تیوہاروں کے موقع پر جشن جتنے ٹھاٹھ باٹ سے ہمارے گاؤں میں ہوتے ہیں ویسے دوسری جگہ شاید ہی کہیں ہوتے ہوں۔ جین مندر میں اگر کبھی کسی چیز کی کمی ہوتی ہے اور پجاری اگر اس طرف میری ماں کو متوجہ کر دیتا ہے تو دوسرے ہی روز کمی پوری ہو جاتی ہے۔ جین مندر میں دگمبر منی، مجبر، کشھادا چک، بھجن منڈلی وغیرہ کوئی نہ کوئی ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور میری ماں ان کے ٹھہرنے، کھانے اور دوسرے پروگراموں کا موزوں و مناسب انتظام کرتی ہیں اور ان کے رخصت ہوتے وقت انہیں مناسب رخصتی تحفے بھی دیتی ہیں۔ جب تک منی کا کھانا نہیں ہو جاتا تب تک وہ خود پانی بھی نہیں پیتیں۔ سخت سے سخت برت اور اپواس کرنا کوئی میری ماں سے سیکھ لے۔ اپدیش، دھرم شاستر وغیرہ میں جتنا ایمان میری ماں رکھتی ہیں اتنا شاید ہی کوئی رکھ سکتا ہو۔ آبو، گرنار، شکھر جی وغیرہ ہندوستان کے مقدس مقامات کی ان نے زیارت کی ہے۔

میری ماں ایسی اناج کی خیرات دینے والی شاید ہی کہیں ہوں۔ بھادوں مہینہ کی پونم کو ہر سال جین مندر سے پالکی نکلا کرتی ہے۔ اس جلوس میں جینیوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے بھی ذاتوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ کوئی ڈھائی تین سو آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے جس میں ہریجن بھی شامل رہتے ہیں۔ جلوس میں شامل سبھی لوگوں کو ماں گھر لے آتی ہیں اور انہیں مٹھائی کھلاتی ہیں۔ جب کوئی ہریجن بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کے گھر والے اچار مانگنے ماں کے پاس آتے ہیں۔ تب انہیں اچار تو ملتا ہی ہے، ساتھ میں دو روٹیاں بھی مل جاتی ہیں۔ دسہرے کے دن شمالی ہندوستان میں شام کو نیل کنٹھ کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ درخت کی پوجا کرتے ہیں اور اس کی پتیاں لا کر بڑی عزت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ یہ پتیاں سونا کہلاتی ہیں۔ ہر سال دسہرے کے روز گاؤں کے سب لوگ ماں کو سونے کا پتا دینے کے لئے گھر آتے ہیں۔ جن میں ہریجن بھی ہوتے ہیں۔ ماں ان سب کے ہاتھوں سے وہ پتا بڑے پیار سے قبول کرتی ہیں اور سب کو مٹھائی کھلاتی ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو تو اس روز وہ اپنے ہاں سے بغیر کھانا کھلائے جانے ہی نہیں دیتیں۔ اس طرح ہمارے گھر کو دھرم پور کا سدا ورت ہی سمجھئے۔

میری ماں بڑی رکھ رکھاؤ والی ہیں۔ سویرے بہت جلدی اٹھ جاتی ہیں اور رات کو قریب گیارہ بجے سوتی ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک وہ کام میں لگی رہتی ہیں۔ گھر کے سب کاموں پر اور نوکر نوکرانیوں پر ان کی سخت نگرانی رہتی ہے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں پھر بھی سب کا حساب وہ رکھتی ہیں۔ زمین سے کتنی پیداوار ہوئی اور کتنا خرچ ہوا یہ دیکھ کر ہی ان کے کام کاج ہوا کرتے ہیں۔

ان کے سارے کاروبار نقد ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی کبھی ہمارے گھر اپنا قرض وصول کرنے آیا ہو یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ قرض لینا تو وہ جانتی ہی نہیں ہیں۔ کسی ملازم یا ملازمہ سے غلطی ہو جانے پر اسے معاف نہیں کرتیں۔ پھر بھی انہوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنی امیری کی شیخی نہیں بگھاری۔ غریبوں کی وہ ماں ہیں۔ ان کے لئے سایہ ہیں۔

میرے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میں ہی ان کی پہلی اور آخری اولاد ہوں۔ پھر بھی اس کی وجہ سے وہ کبھی مغموم نہیں ہوئیں۔ نہ ہی انہوں نے کبھی شکایت کی۔ بچہ حاصل کرنے کے لئے بیتاب دوسری عورتیں جس طرح نجومیوں، ویدوں اور سادھوؤں وغیرہ کے پیچھے چکر کاٹا کرتی ہیں اس طرح میری ماں نے کبھی نہیں کیا۔ وہ اپنی ہمسائیوں سے اس سلسلہ میں اپنا جو خیال ظاہر کرتی تھیں اسے میں نے کئی مرتبہ سنا ہے۔ وہ کہتیں "ہماری پڑھی لکھی منی ہی ہمیں بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ کسی غریب کو گھر داماد بنا کر لے آئیں گے تو بیٹے کی کمی دور ہو جائے گی"۔

میں منی ہوں۔ مجھے گاؤں کے لوگ منی کہتے ہیں۔ جس طرح میری ماں سارے گاؤں کی ماتا جی ہیں اسی طرح میں گاؤں بھر کی منی ہوں۔ میرا اصل نام کنول ہے، مگر وہ صرف لکھنے کے لئے ہی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب ایک روز میں نے بھولے پن سے اپنی ماں سے پوچھا تھا ـــــ

"ماں۔ تم نے میرا نام کنول کیوں رکھا؟"

تب انہوں نے ہنس کر کہا تھا ـــــ

"اس لئے کہ جس طرح پانی میں رہتے ہوئے بھی کنول پانی سے بے نیاز رہتا ہے اسی طرح تو بھی ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوتا ہے ماں؟" میں نے دوبارہ استفسار کیا۔

ماں نے جواب دیا ـــــ "دنیا میں رہتے ہوئے بھی تجھے ایثار کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔"

"تمہیں یہ نام کیسے سوجھا؟" میں نے پوچھا۔

"پرانوں میں میں نے سنا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اور کیا میرا نام کنول رکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں کنول کی مانند حسین ہوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

انہوں نے ہنس کر کہا ـــــ "سچ مچ تو کنول کی طرح خوبصورت ہے اس لئے تیرا نام کنول رکھا ہے۔"

تیئتس سال پہلے میرا جنم ہوا تھا۔ یہاں کے جین مندر کے مغرب میں راستے کے اس پار جو بڑا مکان ہے، وہ ہمارا ہے۔ میں اس مکان میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں اور باپ کی شادی کے نویں سال بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی پہلی اولاد ہونے کے باعث میری پیدائش کی خوشی میں ـــــ میرے لڑکی ہونے کے باوجود خوشیاں اسی دھوم دھام سے منائی گئیں جس طرح لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہیں۔ لوگ مجھ سے بڑی امید کے ساتھ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ جیسے لڈو میری پیدائش کے وقت کھانے کو ملے تھے ویسے تو اب تیری شادی کے موقع پر ہی ملیں گے۔

ایسا بھی نہیں کہ میں آہو چشم ہوں، اور نہ میری آنکھوں میں شراب کی مستی ہے۔ میرا چہرہ کنول سا بھی نہیں۔ اور نہ میرے چہرے کو چاند سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اہلیہ، دروپدی، تارہ اور مندودری جیسی عورتوں کے جو "پرانوں" میں مشہور ہیں مانند میں خوبصورت نہیں ہوں۔ سنسکرت یا پراکرت زبانوں کے ادب میں شاعروں نے خوبصورت عورت کا جو بیان کیا ہے اس کا مجھ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ میں تو صرف اپنی ماں کا عکس ہوں ـــــ اندر اور باہر سے بالکل ماں کی طرح۔ میری ماں نے اپنی خوبصورتی، عادات اور جذبات مجھے عطا کئے ہیں۔ ماں کی نرمی اور والد کی سختی کا امتزاج مجھے وراثت میں ملا ہے۔ ہمارے خاندان کی نرم دلی، ایثار، محنت، باقاعدگی اور تعلیم وغیرہ اوصاف مجھ میں آ گئے ہیں۔ میں ایک معزز خاندان کے زمیندار کی بیٹی ہوں۔

میرا بچپن لاڈ پیار میں گذرا۔ دو نوکر اور اس کی بیوی یا نیچا یہ دو ملازم میری دیکھ ریکھ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ مجھے دودھ پلانے کے لئے ایک گائے خریدی گئی۔ والد صاحب نے میری پرورش میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ میرے کپڑوں پر توجہ دیتے تھے، میرے کھلونوں میں دلچسپی لیتے تھے اور میں کیا کھاتی پیتی تھی اس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اگر مجھے ذرا کھانسی ہو جاتی یا کچھ سردی ہو جاتی یا جسم میں کچھ حرارت معلوم ہوتی تو سانگلی کا مشہور ڈاکٹر فوراً بلوایا جاتا تھا۔ جب والد صاحب کسی کام کے سلسلہ میں سانگلی، پونہ یا بمبئی جاتے تو میرے لئے ضروری چیزوں کی ایک فہرست تیار کر لیتے اور واپسی پر ان چیزوں کو اپنے ساتھ لانا کبھی نہ بھولتے تھے۔

بچپن ہی میں اپنی ماں کے ساتھ روزانہ بلا ناغہ جین مندر جایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے دل پر مذہبی رسومات کا جو اثر پڑا وہ اب تک قائم ہے۔ بچپن میں لاعلمی کے باعث میں اپنی ماں کی نقل کیا کرتی تھی۔ بھگوان کے قدموں میں ماں سرنگوں ہوتی تو میں بھی سرنگوں ہو جاتی تھی۔ آنکھیں موند کر ماں جپ کرتی تو میں بھی اس کے قریب بیٹھ کر اپنی آنکھیں موند لیتی تھی۔ مندر میں درشن کے لئے آنے والے دوسرے لوگ میری اس بھگتی کو دیکھ کر ہنس پڑتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بیٹی اپنے ماں باپ کے بالکل موافق ہے۔

جب میں چھ سال کی ہوئی تو پڑھنے کے لئے اسکول جانے لگی۔ مدرسہ کے ابتدائی دنوں کی یاد میرے دل و دماغ پر آج تک قائم ہے۔ پہلے روز جب میں اسکول گئی تو میرے ساتھ مجھے اسکول پہنچانے کے لئے دو نوکر بھیجا گیا تھا اور باتجا بھی گئی تھی۔ مگر اسکول میں داخل ہوتے وقت میں نے خوف سے رونا شروع کر دیا جو لوٹ کر گھر آنے پر ہی بند ہوا۔ اس کے بعد والد صاحب نے مجھے گھر پر ہی پڑھانا شروع کیا۔ دیشپانڈے نام کے ایک ماسٹر صاحب مجھے گھر آ کر پڑھانے لگے۔ دیشپانڈے ماسٹر بہت خوش مزاج شخص تھے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جو آگے چل کر اس قدر بڑھا کہ بعض اوقات تو اسکول چھوڑ کر مجھے گھر آنے کی خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ دیشپانڈے ماسٹر فن تعلیم میں ماہر تھے۔ وہ دقیق سے دقیق مضمون کو اتنی اچھی طرح سمجھاتے تھے کہ طلبا کو اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ لگتا تھا اور وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔ یہ خوبی بہت کم استادوں میں پائی جاتی ہے۔

میں خوب دل لگا کر مطالعہ کرنے لگی۔ جماعت میں میرا پہلا نمبر آنے لگا۔ گو وہ مدرسہ لڑکوں کا تھا پھر بھی وہاں کے سکریٹری کا کام میرے سپرد تھا۔ اس لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر درسی کاموں میں بھی میں تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ اسکول میں کسی مہمان کا استقبال کرنا ہو، کوئی جلسہ منعقد کرنا ہو یا کوئی جشن منانا ہو تو ان سب کا انتظام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ بارہ برس کی عمر ہی میں نے مراٹھی کی ساتویں جماعت پاس کر لی۔ میں سارے سینٹر میں اول آئی تھی۔ مجھے وظیفہ اور کیا سکالرشپ کے تحت نمبر ملے تھے۔

اس غیر معمولی کامیابی کے باعث ہمارے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ والد صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے بینڈ بجواتے ہوئے تمام گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ اسکول کی جانب سے میرے اعزاز کے لئے سارا گاؤں امڈ پڑا تھا۔ اس موقع پر کئی لوگوں نے مجھے انعامات دیئے اور تحائف بھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سمجھ رہے تھے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔

ماں نے جین مندر میں پانچ روز تک پوجا کرائی۔ چھٹے روز گاؤں کے تقریباً دو سو معزز حضرات نے ہمارے گھر کھانا کھایا۔

مراٹھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری دلیش پانڈے نے، جین مندر کے پجاری نے اور گاؤں کے چند ممتاز شخصوں نے مل کر میری والدہ اور والد صاحب سے مجھے آگے پڑھانے کی درخواست کی۔ وہ کہنے لگے "منی کو پڑھنے کے لئے سانگلی کے ونیتا آشرم میں بھیج دیجئے۔" آگے پڑھنے کے لئے میں بھی بیتاب تھی لیکن میرے والدین مجھے آنکھوں سے دور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے مجھے آگے پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔

دھرم پور سے سانگلی صرف دس میل دور ہے۔ میری ماں والد صاحب کے ساتھ سانگلی جا کر وہاں کے ونیتا آشرم کا انتظام وغیرہ دیکھ آئی تھیں۔ اور دونوں نے اسے پسند کیا تھا۔ میری آئندہ تعلیم سانگلی میں شروع ہو گئی۔ جس روز میں دھرم پور سے پہلی مرتبہ رخصت ہوئی تھی اس روز میری ماں کو، میرے والد کو اور مجھے بھی جو ملال ہوا تھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔

میری زندگی کے آئندہ دس گیارہ برس بڑی سرعت سے گذر گئے۔ میں تعلیم یافتہ ہو گئی۔ بالغ ہو گئی۔ میٹرک کے امتحان میں میں اوّل نمبر پاس ہوئی۔ کالج کے ہر امتحان میں میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھی۔ بی۔ اے ہوئی اور پھر ایم۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

ہر امتحان ختم ہونے کے بعد میں دھرم پور آ جایا کرتی تھی۔ نتیجہ گاؤں میں ہی آ جاتا تھا۔ اور ہر نتیجہ کے وقت گاؤں کے لوگ میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کیا کرتے تھے جس سے ان کی خوشی اور جوش ظاہر ہوتا تھا۔ سانگلی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے میں صرف لمبی چھٹیوں میں ہی دھرم پور آیا کرتی تھی۔ درمیان میں میرے والدین سانگلی آ کر مجھ سے مل آیا کرتے تھے۔

میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اودھی ماگدھی اور مراٹھی مضامین لئے تھے۔ دلیش پانڈے ماسٹر کی وجہ سے مجھے مراٹھی سے محبت تھی جب میں مراٹھی مدرسہ میں تھی تبھی میں نے مدرسہ کی لائبریری کی اور دلیش پانڈے ماسٹر صاحب کے گھر کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ میری ماں کی سنگت کی بدولت جین مذہب، جین فلسفہ اور جینی ادب سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مراٹھی اسکول میں پڑھتے ہوئے ہی میں نے متعدد مذہبی کتب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ ان کے علاوہ جین مذہب کی چھوٹی بڑی کئی کتابیں میں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ میرا یہ شوق رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا۔

بچپن سے ہی مجھے چونکہ شہرت اور وقار حاصل ہو گیا تھا اس لئے میرے مزاج میں کسی قدر سنجیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کے علاوہ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے کہ وہ لوگ جو میری عزت کرتے ہیں مایوس ہو جائیں، یا میرے متعلق وہ کوئی غلط رائے قائم کر لیں، چنانچہ اس سلسلہ میں میں بہت محتاط رہتی آئی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب کئی مرتبہ مجھے کہا کرتے تھے۔ "منی تو حسب منشا جتنا چاہے پڑھ، کچھ بھی کر، کہیں بھی رہ مگر کبھی کوئی ایسا کام نہ کر جس سے تیرے خاندان، ذات اور مذہب پر داغ نہ لگے۔"
تعطیلات میں جب میں گھر جاتی تو میری ماں بڑی سخت نظر سے دیکھتی رہتیں کہ کالج کی ہوا کے باعث میری چال میں، گفتگو میں، طور طریقہ اور عادات میں کہیں کوئی نامناسب بات تو نہیں آ گئی ہے۔ مگر مجھ میں کوئی بات انہیں نہ ملی جس پر کہ وہ نکتہ چینی کر سکیں۔

جب میں ہائی اسکول اور کالج میں تھی تو بعض لڑکے مجھے ایچی بینٹ کہا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے مجھے اس خطاب سے کیوں سرفراز کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی نظر میں میں ایچی بینٹ کی طرح تھی۔

اس وقت ہی بالغ دکھائی دیتی تھی۔ کالج کی میری سہیلیاں مجھے "ستاتنی" اور دقیانوسی کہا کرتی تھیں۔ پھر بھی میں نے کسی کی پندار پروا کئے بغیر اپنی حدود سے باہر نہ گئی۔ اصلاح کے نام پر وہ جو چھچھورا پن کیا کرتی تھیں، وہ مجھے بالکل ناپسند تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ میں ہمیشہ او ہر بات میں لکیر کی فقیر ہی تھی۔ پرانی بات اگر حقیقتاً پرانی اور معیوب ہوگئی ہے تو اسے ترک کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار رہتی تھی۔ مگر میرا یہ عقیدہ تھا کہ اس کی جگہ جو نئی بات لائی جائے وہ موزوں و مناسب ہونی چاہیئے۔

جینی سماج میں اتنی پڑھی لکھی میں ہی پہلی لڑکی ہوں۔ دھرم پور کی میری عمر کی کئی جینی لڑکیاں آٹھ چار پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہیں۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ میں ابھی تک کنواری ہوں۔

ویسے دیکھا جائے تو میرے والدین نے میری شادی کرنے کا کئی مرتبہ ارادہ کیا تھا۔ جب کبھی کسی اچھے معزز گھرانے کا کوئی لڑکا مل جاتا تو میری ماں تو بس یہی چاہتی تھیں کہ میری شادی کر دیں۔ مگر میں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ جین مندر میں قسم کھائی ہے کہ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی نہیں کروں گی۔

"آخر اتنا پڑھ کر تو کرے گی کیا؟" یہ سوال صرف میری ماں یا والد ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کئی لوگ مجھ سے کیا کرتے تھے اور میں انہیں یہ جواب دیا کرتی تھی ——

"ابھی پڑھائی تو مکمل ہو جانے دیجئے۔ پھر آگے کیا کرنا ہے اس بات پر بھی غور کر لوں گی۔" در اصل آئندہ کیا کرنا ہے، یہ میں خود طے نہیں کر پائی تھی، چنانچہ انہیں کیا جواب دیتی۔

لیکن ایم۔ اے پاس ہو جانے کے بعد دھرم پور کے عوام نے میرے اعزاز میں جو تقریب کی تھی اس میں تقریر کرتے وقت میں نے اپنا مقصد واضح الفاظ میں رکھ دیا۔ میں نے کہا ——

"میں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ میں اس لئے بھی نہیں پڑھی ہوں کہ اپنی گرہستی کے جنجال میں پوری طرح پھنس کر جو کچھ میں نے پڑھا ہے اسے بھلا دوں۔ میں لوگوں کو یہ دکھا دینا چاہتی ہوں کہ اگر موقع دیا جائے تو گاؤں کے لڑکے لڑکیاں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ فہم و فراست کا ٹھیکہ صرف شہر والوں کو ہی ہمیشہ کیلئے نہیں دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ دھرم پور میں ایک ہائی اسکول کھولوں اور اس ہائی اسکول میں میں خود تعلیم دوں۔ آپ لوگ آج تک میری جو عزت افزائی کرتے آرہے ہیں اس کے صلے میں میں آپ کے لڑکے لڑکیوں کی حتی الوسع خدمت کروں گی۔ زندگی عیاشی کے لئے نہیں ایثار و قربانی کے لئے ہے ......"

اس کے بعد میں تارہ پور کے مہرشی جٹا شنکر کے پاس گئی جو ایک عظیم و مشہور شخصیت ہیں۔ گاؤں کے بعض معزز لوگ اور میرے والد صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ والد صاحب میرے اس خیال سے متفق تھے۔ ہم لوگوں کی درخواست پر دھرم پور میں ہائی اسکول قائم کرنے کے لئے مہرشی آج یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ جین مندر کے سامنے کھلی جگہ پر جو جم غفیر امڈا پڑتا ہے وہ انہیں کا انتظار کر رہا ہے۔

قارئین! میں نے دھرم پور سے آپ کا کافی تعارف کرا دیا ہے۔ آپ یہاں کے خاص مقامات اور شخصیتوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ پلیٹ فارم پر تشریف فرما میرے والد صاحب کو جنہیں سب لوگ دادا جی کہتے ہیں اور خواتین میں بیٹھی ہوئی میری ماں اور سب کی ماتا جی کو آپ پہچان لیں گے نہ؟

ہاں، پر ادھر دیکھیئے۔ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر آگئی ہے۔

"مہرشی جٹا شنکر کی ......"

"جے!"

"مہرشی جٹا شنکر کی ......"

"جے!"

۲

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بلند ہونے والے نعروں کی طرح ساری فضا میں گونج پیدا کر کے جلسہ میں جمع لوگوں نے سارے دھرم پور کو ہلا دیا۔ مہرشی جٹا شنکر موٹر سے نیچے اترے۔ میں نے انہیں مجمع سے لا کر پلیٹ فارم پر بٹھا دیا۔ لوگ انہیں سلام کر رہے تھے۔ ان کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ سے ساری فضا گونج اٹھی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مہرشی جٹا شنکر کی شخصیت بہت عظیم ہے۔ ان کا شاندار جسم، سفید داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال، بلند اور صاف آواز نیز ان کا سفید کرتا اور دھوتی دیکھ کر عوام فوراً ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

پہلے مدرسہ کے بچے بچیوں نے دعا کی اور پھر استقبالیہ نغمہ ہوا۔ آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں شخص گاؤں بھر میں دادا جی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دادا جی سے درخواست کی گئی تھی مگر جلسہ میں ایک عظیم شخصیت

ے موجود ہونے کے باوجود وہ کچھ جھجکے اور انہوں نے صدارت کی کرسی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے میں نے مہرشی کو پیچھے سے ہٹا کے جا کر صدر کی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کی بائیں جانب ایک گورے رنگ کا کھدر میں ملبوس نوجوان بیٹھا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔ داہنی طرف دادا جی بیٹھے تھے۔ میں مہرشی کو سامعین سے متعارف کرانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ میں نے تقریر شروع کی ــــ

"مہرشی جناشنکر، مکرمی دادا جی، بہنو اور بھائیو!

مراٹھی زبان میں ایک ضرب المثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عظیم انسانوں کی آمد سے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ دیوالی دسہرے پر ہوتی ہے۔ گھر میں کہوں گی کہ بڑے لوگوں کی آمد سے ہمارا نصیب جاگ جاتا ہے، یعنی جن لوگوں کے گھر میں سادھو سنت آتے ہیں ان کا نصیب جاگ جاتا ہے۔

آج ہمارے لئے بڑا مبارک دن ہے کہ مہرشی جناشنکر نے اپنی آمد مبارک سے ہمارے گاؤں کی سرزمین کو شرف بخشا ہے۔ قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ مہرشی یہاں کیوں تشریف لائے ہیں، میں یہ بتلا دینا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہیں۔ ہم سب نے ان کا نام سنا ہے، اخباروں میں ان کی تصاویر دیکھی ہیں اور ان کے کارناموں کے متعلق پڑھا اور سنا ہے۔

مہرشی جناشنکر ایک معمولی کسان خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ نے کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ مگر اپنی کاوشوں سے کئی نوجوانوں کو سند یافتہ بنا دیا ہے۔ سمندر کو منتھن کر دیوتاؤں نے صرف چودہ جواہرات ہی نکال کر دنیا والوں میں اشانتی کیا تھا۔ لیکن آپ نے عوام کے بحر بیکراں کو منتھن کر اس میں سے متعدد ہیرے نکالے ہیں، جو آج بھی ان کے عوامی تعلیمی ادارہ میں اور دوسرے مقاموں پر جلوہ گر ہیں۔

مہرشی نے اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ ملازمت کی۔ چند دنوں تک آپ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیتے رہے۔ مگر آپ کو اس سے پورا اطمینان نہ ہوا۔ اس کے ذریعہ وہ عوام الناس کی جس طرح خدمت کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ان کو یقین کامل ہو گیا کہ تمام اصولوں کی جڑ تعلیم ہے۔ لہٰذا جب تک اس ضمن میں مناسب کام نہ کیا جائے گا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ اس جڑ کو مضبوط کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ یہ کام معمولی نہ تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے نہ سرمایہ تھا، نہ کچھ خاص قابلیت تھی اور نہ ہی ان کا کوئی پیشہ تھا۔ تاہم انہیں اپنے جذبۂ ایثار، خلوص، لگن، خود کفالت اور سخت محنت پر پورا اعتماد تھا اور آپ نے اپنی انہیں خوبیوں کی بدولت مخالف حالات سے استقلال کے ساتھ مقابلہ کر کے ایک بہترین تعلیمی ادارہ قائم کر دیا۔ آپ کے اس ادارے کا نام ہے "عوامی تعلیمی ادارہ"۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور مختلف قسم کے دیگر اسکول چل رہے ہیں۔ اور ان میں پچاس ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔

آپ کے ادارہ میں ذات، مذہب اونچ نیچ کا کوئی لحاظ نہیں۔ وہاں امیر، غریب، ہندو، مسلمان، ہریجن وغیرہ سب ایک ہیں۔ ان کی تعلیم کا اصول ہے ـــــ سب یہاں آؤ، کام کرو، خود کفیل بنو، کاہلی کو چھوڑ دو، تعلیم یافتہ بنو، انسانیت کو نہ چھوڑو۔ جب پوری طرح سے تعلیم حاصل کر لو تو یہاں سے جاؤ اور دوسروں کو تعلیم دو۔ مہاتما گاندھی سے لے کر تقریباً سبھی ذاتوں اور نظریہ کے لوگوں نے آپ کے اس تعلیمی ادارے کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ جینی انہیں مہاویر کا اوتار مانتے ہیں۔ "لنگایت" انہیں بسویشور سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے آپ پیر ہیں اور دوسرے لوگ آپ کو بدھ، عیسیٰ مسیح اور بھگوان کرشن کی طرح انسانیت کا پرستار سمجھتے ہیں۔

آپ نے پیہم کوشش کر کے علم کا دریا عام عوام میں بہایا ہے اور اس کی نہریں اور دھارے وادیوں، جنگلوں اور گاؤں تک پہنچا دیئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علم کے اس دریا کا ایک دھارا یہاں بھی بہے اسلئے ہماری درخواست پر آپ آج یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کے ادارے کی ایک شاخ ہمارے گاؤں میں بھی قائم کر دی جائے۔ ہم لوگ آپ کی ہر طرح سے امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں خود اس اسکول میں بغیر معاوضہ کے پڑھانے کے لئے تیار ہوں۔ حضرات! تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان کو انسانیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ تعلیم بہت گراں ہو گئی ہے۔ جہالت، غربت اور روز افزوں گرانی کے باعث معاشرہ کے نچلے طبقہ تک یہ پہنچتی ہی نہیں ہے۔ آج ہم آزاد ہیں مگر عدم تعلیم کے سبب ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ آزادی کیا چیز ہے اور اس کی کیا قیمت ہے۔

حضرات! آپ سب لوگوں کی طرف سے میں مہرشی سے ایک مرتبہ پھر یہ گذارش کرتی ہوں کہ وہ اپنے ادارے کے زیر اہتمام ہمارے دیہات میں

ایک ہائی اسکول جلد از جلد قائم کر کے ہمیں ممنون فرمائیں۔ آپ لوگ مہرشی کے تجربات اور ان کے ہمت افزا الفاظ سننے کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میں مہرشی سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ ہم لوگوں کو اپنی تقریر سے محظوظ فرمائیں۔"

اتنا کہہ کر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ غالباً وہ ایک دوسرے سے اپنے گاؤں کی قابل فخر چیزیں بیان کر رہے تھے۔ کہ ان کے گاؤں کے جلسے میں تقریر کرنے والے صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہیں۔ مگر مہرشی جیسا فکر کے کھڑے ہوتے ہی یہ سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ تقریر سے پہلے اس عظیم الشان ہستی کو دیکھ کر سامعین نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اور پھر خاموش ہو کر یکسوئی سے اُن کی تقریر سننے لگے۔ مہرشی نے کہا۔

" دھرم پور کے معوشن دادا جی، ان کی صاحبزادی، بہنو اور بھائیو! میں آپ کے پاس ووٹ کی بھیک مانگنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں سیاسیات میں حصہ لینے والا محب وطن نہیں ہوں۔ میں کوئی سرکاری افسر بھی نہیں کہ آپ کے پاس زیادہ اناج پیدا کرنے کا یا زیادہ لیوی (ٹیکس) دینے کا کوئی حکم یا پیغام لے کر نہیں آیا ہوں —— میں یہاں حاضر ہوا ہوں صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے۔ میں تو عوام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔

دادا جی میرے بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ جب جب مجھے جیسی کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے تب تب میں دادا جی کے گھر آیا ہوں۔ ان کی اہلیہ رتنا دیوی سے میں بخوبی واقف ہوں۔ دادا جی کی اکلوتی تعلیم یافتہ بیٹی مجھے بچپن سے پہچانتی ہے۔ بچپن میں وہ میری داڑھی دیکھ کر ڈرتی تھی۔ لیکن آج صرف مجھے ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کسی بھی مرد سے نہ ڈر کر اس نے آپ لوگوں سے مجھے متعارف کرا دیا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں مجھ سے یہ گزارش کی ہے کہ میں اپنے ادارے کے زیر اہتمام دھرم پور میں ایک ہائی اسکول قائم کر دوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں آپ جیسے جوشیلے اور سچے کارکن موجود ہوں وہاں ایک کیا میں دس ہائی اسکول کھول دوں گا۔

حضرات! ہمارے گاؤں گاؤں ہی رہے اور شہروں نے سرعت سے ترقی کی۔ شہر بجلی کی روشنی سے جگمگانے لگے، مگر دیہات میں تاریکی ہی رہی۔ شہر کے لوگوں نے کارخانے کھول دیئے اور گاؤں کے لوگ مزدور ہی بنے رہے۔ شہر کے لوگ وکیل، ڈاکٹر اور تاجر بنے اور ان کے موکل، مریض اور گاہک ہونا گاؤں والوں کی قسمت میں لکھا ہے۔ شہریوں نے تعلیم حاصل کی تو دیہاتی بے پڑھے لکھے رہے۔ اس لئے شہریوں نے گاؤں والوں کی جہالت سے فائدہ اٹھایا اور وہ رئیس ہو گئے۔ جبکہ گاؤں کے لوگ غربت کے غار میں ہی دبے رہے۔ گاؤں کے کسان سال بھر سخت مشقت کرنے کے باوجود بھوکے رہتے ہیں۔ یہ حالت ہو گئی ہے۔ جب تک ہماری جہالت دور نہیں ہوتی تب تک ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ اس لئے میرے خیال سے ملک کے سامنے آج پہلا اور اہم سوال تعلیم کا ہے۔ ہمارے ملک میں نوے فیصدی لوگ جاہل ہیں۔ ان سب کو تعلیم دینا حکومت کا اور عوام کا اولین فرض ہے۔ سوراج کا آفتاب طلوع ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارا یہ اندھا سماج اس کی روشنی کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کہتے ہیں گاؤں میں چلو۔ میں کہتا ہوں گاؤں میں ہی رہو۔ گاؤں کے لوگوں کو گاؤں میں ہی پڑھنا چاہیئے۔ گاؤں میں ہی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہیئے اور وہیں رہنا چاہیئے۔ اگر گاؤں کے دانشور —— باہر شہر میں چلے جائیں تو گاؤں کی نشوونما کیسے ہو گی۔ شہر میں ہونے والے سدھار گاؤں تک کیسے پہنچیں گے۔ شہر میں ہونے والی اصلاحات کسی قانون کے ذریعہ گاؤں میں نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ سرکار ہی یہ کام کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ گاؤں والوں کا ہے اور انہیں ہی اسے حل کرنا پڑے گا۔ دادا جی زمیندار نے اپنے گاؤں میں اکھاڑے کھولے ہیں۔ تیل کی گھانیاں قائم کی ہیں۔ دال کی ملیں کھولی ہیں۔ زراعت کو فروغ دیا ہے اور آج یہاں ایک ہائی اسکول کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ اس اسکول کو میں یہاں کے نہایت مقبول رہنما دادا جی کا ہی نام دینے والا ہوں۔ دھرم پور کا ہائی اسکول دادا جی ہائی اسکول کہلائے گا۔

صاحبان! ایسے ہائی اسکول گاؤں گاؤں میں قائم ہونے چاہیئیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لئے ہی اور گاؤں کے لوگوں کے ذریعہ چلائے جانے چاہیئیں۔ ان مدرسوں کے ذریعہ گاؤں کی مذہبی، صنعتی اور سماجی باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ زندگی اور تعلیم کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس کام کے لئے کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جوش و خروش اور جذبۂ ایثار کے ساتھ کمربستہ رہنا چاہیئے۔ تبھی ہمارے ملک کا نصیب جاگ سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ہمارا ادارہ گزشتہ پچیس تیس برس سے عوام کو تعلیم دینے کا کام

کر رہا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اور گاؤں میں رہنے والے کسی بھی ذات کے لڑکے لڑکیاں بھی اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کامیاب طلباء کی فہرست میں انہیں اول نمبر بھی مل سکتا ہے۔ ہمارے ادارہ کے کئی طلباء آج انگلستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ادارہ کی بیس شاخوں میں آج پچاس ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔ اور ہمارا سالانہ بجٹ پندرہ لاکھ روپے ہے۔ ویسے ہمیں سرکار سے کچھ امداد مل جاتی ہے۔ لیکن ہمارا سارا دار و مدار خاص طور پر خود کفالت پر ہے۔

میرے نزدیک بیٹھا ہوا نوجوان میرا ایک محبوب طالب علم ہے۔ اس کا نام ہے اندرجیت دیال، یہ ہریجن ہے۔ بچپن سے ہی اس نے ہمارے اسکول میں تعلیم پائی ہے اور ہمارے ہی اسکول سے وہ بی۔اے، بی۔ٹی ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ادارہ میں چار پانچ سال تک ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ایک سال تک آپکے دھرم پور ہائی اسکول کے یہی ہیڈ ماسٹر رہیں گے اور آپکی منی دیوی ان کی معاون رہیں گی۔ ایک سال کے بعد دیال جی مزید تعلیم کے لئے ولایت روانہ ہو جائیں گے تب منی دیوی ہی آپکے اسکول کی ہیڈ مسٹریس بن جائیں گی۔

حضرات! آپ لوگوں نے مجھے اپنی خدمت کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آج سے ایک مہینے کے اندر یعنی مارچ کے مہینے سے آپکے ہائی اسکول کا کام شروع ہو جائے گا۔ ہائی اسکول آپکا ہے، آپ ہی اس کے مالک ہوں گے۔ آپ ہی کے لڑکے اس میں پڑھیں گے۔ آپ کو اپنے لڑکے لڑکیوں کو اسکول میں بھیجنا ہوگا۔ اسکول کا سارا خرچ بھی آپ ہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس گاؤں میں جینیوں کی تعداد زیادہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ بہت امیر ہیں۔ انہیں اپنی اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، مگر انہیں خیال کرنا چاہیئے کہ اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کے بجائے اُسے ان کی تعلیم پر خرچ کر کے انہیں زیادہ دولت کمانے کے قابل بنانا کہیں بہتر ہے۔ اس لئے تعلیم ایسے مقدس اور نیک کام کے لئے انہیں نہایت فیاضی کے ساتھ مالی امداد دینی چاہیئے۔ مجھے پورا امید ہے کہ دھرم پور کے جینی اور دوسرے معزز حضرات اس وقت اپنی تھیلی کا منہ پورا کھول دیں گے۔ آپ لوگوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کر کے میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔"

مہرشی جیا شنکر کی زوردار تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی تقریر کے درمیان میں سامعین نے کئی مرتبہ تالیاں بجائی تھیں۔ کبھی مرتبہ وہ ہنسے تھے اور کئی مرتبہ سنجیدہ بھی ہو گئے تھے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد چندہ دینے والوں کی فہرست تیار ہونے لگی۔ اور کئی لوگ اپنے اپنے چندہ کی رقوم لکھوانے لگے ـــــ کسی نے ہزار، کسی نے پانچ سو تک، کسی نے سو، کسی نے پچاس۔ اس طرح سب نے اپنی اپنی رقمیں لکھوا دیں، اور چندہ کے اعداد تھوڑی دیر میں چالیس ہزار تک پہنچ گئے۔ آخر میں والد صاحب نے مہرشی جیا شنکر کا شکریہ ادا کیا اور اپنی طرف سے وادا جی ہائی اسکول کے لئے دس ہزار نقد اور اپنا ایک بڑا مکان وقف کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح جلسہ کی کارروائی ختم ہوئی۔ لوگ ہائی اسکول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مہرشی، میں، والد صاحب اور دیال موٹر سے ہمارے گھر آئے۔

مہرشی کو ایک ضروری کام کے لئے فوراً تارہ پور واپس جانا تھا۔ چنانچہ جب میری ماں نے ان سے کھانے کے لئے درخواست کی تو انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا ـــــ "اب تو ہم اپنا اسکول ہی یہاں کھول رہے ہیں۔ اس لئے میں تو اب ہر روز یہیں یہاں کھانا کھایا کروں گا۔ صرف آج کیلئے معاف کر دیجئے۔"

میں، مہرشی، دیال، والد صاحب اور گاؤں کے چند معزز لوگ ہمارے گھر میں میرے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ دو کپ چائے لے آیا۔ باورچی نے میز پر ناشتہ پہلے سے ہی سجا کر قاعدے سے رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے کئی مرتبہ اس کی ٹریننگ دے رکھی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مہرشی نے کہا ـــــ

"دیال، تمہاری اسسٹنٹ تم سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں"۔ دیال نے کہا۔

نہایت سادگی کے ساتھ دیال شیلف پر رکھے ہوئے اخبار کے ان شماروں کو دیکھنے لگا جن میں میرے مضامین شائع ہوئے تھے انہوں نے الماریوں کے شیشے میں سے میری کتابوں کے ذخیرہ پر نظر ڈالی۔ پھر مجھ سے کہا ـــــ "گرو جی، ہمارے اسکول کی لائبریری تو پہلے سے ہی تیار ہے۔" "آپ کے اسکول کے لئے والد صاحب نے دس ہزار روپے دئے ایک مکان دیا، گاؤں والوں نے چالیس ہزار روپے دئے اور میں نے بغیر معاوضہ کے کام کرنا منظور کر لیا اور اس کے اوپر آپ کی نظر میری لائبریری پر بھی ہے۔ میں اسے نہیں دوں گی۔ وہ تو عورت کی دولت ہے" منی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔

اس کے بعد مہرشی نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب ہمیں رخصت کیجئے۔ تین چار روز کے بعد دیال یہیں رہنے کے لئے آجائیں گے۔ تب تک آپ اسکول کی عمارت کو صاف کرا دیجئے گا۔ رقم جمع کر لی جائے۔ اسکول کے لئے ضروری فرنیچر خرید لیجئے اور مارچ سے کام شروع کر دیجئے۔"

سب لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو دیال" مہرشی نے کہا۔

مہرشی اور دیال موٹر میں بیٹھے۔ ہم لوگ انہیں رخصت کرنے کے لئے گھر کے باہر کھڑی ہوئی ان کی موٹر تک گئے۔ موٹر کے ارد گرد لوگوں کی کافی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ہم سب نے مہرشی کو سلام کیا اور مہرشی نے اس کا جواب دیا۔

میں نے دیال کی طرف دیکھا، انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں دل ہی دل میں ہنس پڑے۔ موٹر اسٹارٹ ہو گئی، ہم لوگ واپس آگئے۔

رات کے نو بجے تھے۔ باہر سفید چاندنی چھٹک رہی تھی — میں دوسری منزل پر اپنے مطالعہ کے کمرے میں آئی اور بیٹھ کر اخباروں کے لئے آج کے جلسہ کی رپورٹ لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ کھڑکی سے میں نے یونہی باہر جھانک کر دیکھا اور گیلری میں چلی گئی۔

باہر بڑا خوبصورت منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا پہاڑ، درخت اور مکانات چاندنی میں ڈوبے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہوا ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ مغرب میں دریائے کرشنا کا ساحل درختوں سے ڈھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مشرق کی جانب ہری فصلیں ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ ادھر میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے سنی ہوئی مہرشی کی تقریر بڑی تیزی سے ہلچل مچا رہی تھی۔ گاؤں کی یہ خوبصورتی آج تک مجھے اتنی دلکش کبھی نہ معلوم ہوئی تھی۔ میں اس گاؤں میں چھوٹی سے بڑی ہوئی، سانگلی میں پڑھی اور کئی مرتبہ اس گاؤں میں آئی۔ مگر بہت زیادہ پہچان ہونے کی وجہ سے مجھے گاؤں کا یہ حسن کبھی نظر نہ آیا۔ اس کی قیمت کا میں اندازہ نہ لگا سکی۔ کیونکہ اس سے پہلے مہرشی ایسے کسی عظیم شخص نے میرے کان میں یہ بات نہیں کہی تھی کہ شہر کی نسبت گاؤں قدرتی طور پر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور انہیں ہر طرح سے خوبصورت بنانا چاہیئے۔

بہت دیر تک گیلری میں کھڑی ہوئی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ خیالات کا تسلسل برابر جاری تھا۔ اسی وقت صحن میں ایک کتا رونے لگا۔ دو کو نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میں کمرہ میں آئی اور رپورٹ لکھنے لگی۔ لیکن رہ رہ کر ایک خیال میرے دل میں جھانک جھانک رہا تھا کہ قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھنا چھوڑ کر کتا رو کیوں رہا تھا؟

آدھی رات گذر جانے کے بعد میں اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ میرے دل میں یکے بعد دیگرے خیالات ابھرنے لگے — کبھی اپنے بارے میں خیالات اٹھتے، کبھی دیال کے بارے میں اور کبھی مہرشی کے متعلق۔ اسوقت میرا دل خیالات کی لہروں میں غوطے لگا رہا تھا۔ بادِ نسیم چلی، اور میری آنکھ کب لگ گئی اس کا مجھے پتہ تک نہ چلا۔

دن پر دن بیتے جا رہے تھے۔ اسکول کا کام سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ والد صاحب نے مزدور لگا کر اسکول کی عمارت کی مرمت، صفائی اور روغن و سفیدی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ سانگلی جا کر مدرسہ کے لئے ضروری فرنیچر کا وہ آرڈر بھی دے آئے تھے۔ معمولی طور پر سو لڑکوں کے بیٹھنے کا بندوبست تو ہو گیا تھا۔ میں، والد صاحب اور گاؤں کے دو معزز صاحبان لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔

چار روز کے بعد اندرجیت دیال ایک صندوق میں اپنا سامان لے کر پہنچے۔ اس وقت والد صاحب گھر میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے چند لوگوں کے جھگڑے فیصل کر رہے تھے۔ میں اٹاری پر اپنے کمرہ میں تھی۔ والد صاحب نے اندرجیت کا خیر مقدم کیا، اور مجھے آواز دی —

"منی، منی!" میں نیچے آئی اور دیکھا تو دیال سامنے کھڑے ہیں۔

میں نے سلام کیا۔ انہوں نے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا کر ہاتھ جوڑے۔

میں نے ان سے کہا — "آیئے اوپر میرے کمرہ میں چلئے۔"

انہوں نے کہا — "نہیں، میں اسکول میں ہی رہوں گا۔"

میں نے اور والد صاحب نے اصرار کیا کہ وہ ہمارے گھر پر ہی قیام کریں، مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار دو کو انہیں اسکول لے گیا۔ تین چار روز تک ہم اپنے گھر سے ہی انہیں کھانا بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنا کھانا خود تیار کرنے لگے۔ ہمارے گھر کھانا کھانے کے لئے وہ کبھی نہ آتے۔ ہمارے گھر کبھی نہ آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات میں ہی اسکول میں ان کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ انہوں نے ایک کمرہ میں اپنا آفس سجا لیا تھا اور

دوسرے کمرہ میں اپنے رہنے، سونے اور کھانا پکانے کا انتظام کر لیا تھا۔

ہم دونوں کبھی کبھی چندہ وصول کرنے ساتھ ساتھ جاتے۔ لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ ویسے بظاہر تو وہ لوگ اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کو اس طرح ساتھ ساتھ رہتے ہوئے دیکھ کر خوش نہ تھے۔ جب ہم لوگ چندہ مانگتے تو بعض لوگ طرح طرح کے عذر پیش کرتے۔ کچھ لوگ آج دیں گے، کل دیں گے، کہہ کر ٹال دیتے۔ اور بعض لوگوں سے ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ کچھ لوگ تھوڑی سی رقم دیتے اور باقی پھر دینے کا وعدہ کر دیتے۔ بعض لوگ ایسے بھی ملتے جو جاتے ہی پوری رقم دے دیتے تھے۔ اس سے مجھے اور دیال کو پورا تجربہ ہو گیا کہ سماجی کام میں کتنی محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسکول میں کبھی کبھی گاؤں کے لوگ بھی جا کر بیٹھ جاتے اور اس کے بارے میں کئی قسم کے استفسارات کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ وہاں بیٹھے بیٹھے پان اور تمباکو کھایا کرتے اور بیڑی پیا کرتے تھے۔ بعض لوگ محض گپ لڑانے کے لئے ہی آ جاتے تھے۔ گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں مجھے اور دیال کو گھیر لیتے اور کہتے —— "ہم بھی تمہارے اسکول میں پڑھنے کیلئے آئیں گے۔"

دیال کا روزانہ کا پروگرام گھڑی کی طرح وقت پر ہوا کرتا تھا۔ پو پھٹتے ہی وہ جاگ جاتے۔ دریا پر جا کر نہاتے اور اس کے بعد اپنا کھانا تیار کرتے اور اس کے بعد اسکول کا کام کرتے تھے۔ کتابیں اور اخبارات پڑھتے رہتے تھے۔ اور جب شام ہوتی تو گاؤں کے باہر ٹہلنے نکل جاتے۔ واپسی پر جین مندر میں جاتے اور دور کھڑے ہو کر درشن کرتے تھے۔ ان کی زبان بہت شیریں تھی جو دوسروں کو قابو میں کرنے کا کام کرتی تھی۔ سب سے ان کا سلوک محبت اور احترام کا تھا۔ اس لئے ذات کے اچھوت ہونے کے باوجود لوگوں کے خیالات ان کے لئے اچھے ہوتے گئے۔ ماسٹر بھلا ہے، کوئی ذات ہو ہمیں اس سے کیا سروکار، ہم تو اتنا چاہتے ہیں کہ وہ لڑکوں کو اچھی طرح پڑھاتا رہے۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔

ایک روز میں اسکول گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ڈاکیا آ کر اسکول کی ڈاک دے گیا تھا۔ اور دیال اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا جو کہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر سے خط نکالا اور پڑھنے لگی۔ وہ خط مندرجہ ذیل تھا ——

تارہ پور
۱۰ فروری ۱۹۴۸ء

پیارے دیال، دعائیں

دھرم پور سے واپس آتے وقت موٹر میں میں نے تمہیں اپنے کام اور ذمہ داری کا صحیح نقشہ بتا دیا تھا۔ پونہ سے یہاں واپس آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور پہنچ گئے ہو۔ یہ مناسب ہی ہوا۔ جاتے وقت میں تمہیں کچھ اور بھی باتیں بتانا چاہتا تھا۔ ویسے تو تم خود ہی عقلمند اور سمجھدار ہو۔ پھر بھی میں نے خیال کیا کہ ایک خط لکھ ہی دوں اور تمہیں صورت حال سے آگاہ کر دوں تاکہ تم اپنا کام زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکو۔ میری خواہش ہے کہ تم اس خط پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

دھرم پور کے جلسہ میں تم خود بھی موجود تھے اور تم نے وہاں کے لوگوں کے جوش و خروش کو دیکھا تھا، پھر بھی تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھلے کے ساتھ برا بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔ نیک اور بدی جنگ شروع ہوتی ہے اور جو زبر ہوتا ہے اسی کی فتح ہوا کرتی ہے۔ ہم نے اسکول قائم کر دیا ہے لیکن ہم اگر اپنے فرض اور ذمہ داری سے ذرا بھی ہٹے تو آئندہ کیا نتیجہ برآمد ہوگا اس کے متعلق آج ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لوگوں کو شک کے لئے ذرا بھی موقع نہ ملنا چاہئے۔ گاؤں کے لوگ پتھر کو دیوتا کہیں گے اور اس کی پرستش کریں گے۔ مگر جب ایک بار اس کے اوپر سے ان کا ایمان اٹھ جاتا ہے تو وہ اس دیوتا کو بھی پتھر سمجھ کر توڑ ڈالتے ہیں۔

دیال تم پر مجھے پورا اعتماد ہے اور اسی لئے دھرم پور کے نئے اسکول کا کام چلانے کے لئے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تم سے میں بڑی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہوں۔ میں اس غم میں گھلتا رہتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے بلکہ میری تو شب و روز یہی دعا ہے کہ تمہاری دن بدن ترقی ہو۔

دھرم پور میں سناتنی جینیوں کی کثیر تعداد ہے۔ ان جیسے پاک صاف لوگ تمہیں دوسری ذاتوں میں کم ملیں گے۔ تم یہ نہ بھولنا کہ پیدائشی تم اچھوت ہو۔ ہم مساوات کا خواہ کتنا ہی پروپیگنڈہ کیوں نہ کریں پھر بھی جاہل ہونے کی وجہ سے گاؤں والے اس جذبہ کو جلد نہیں [illegible] اور نہ ہی اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ [illegible]

کی مانند نہایت سست رفتاری سے ہوا کرتا ہے۔ بلا وجہ تم انہیں ڈ جایا کرو۔ تمہارے جانے سے اگر کسی کے جذبات برہم ہوگئے ہیں تو تم اس کے گھر ہرگز نہ جایا کرو۔ صورت حال دیکھ کر کام کرنا سیکھو۔

تم نے جین مذہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ روز جینیا مندر میں جاکر درشن کر لیا کرو۔ جینیوں کے تیوہار پر انہیں چھوئے بغیر انکے سامنے جین مذہب کے اوصاف بیان کرکے انہیں اپنے مذہب سے واقف کرا دیا کرو۔ بعد ازاں وہ تمہارا احترام کرنے لگیں گے اور پھر تمہیں جین سمجھنے لگیں گے۔

ایک اور اہم بات تمہیں تحریر کر دینا چاہتا ہوں ــــــ تم غیر شادی شدہ ہو۔ تمہاری معاون کنول بھی کنواری ہے۔ چنانچہ تمہیں ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔ تاکہ تم پر کوئی کسی قسم کا شک نہ کرے۔ تم چاہو تو یہ خط کنول کو بھی دکھا سکتے ہو۔ میں کنول تمہاری مددگار رہے پھر بھی کسی طرح اسے تکلیف نہ دینا۔ وہ ایک ہونہار لڑکی ہے۔ معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہے یہ نہ بھولنا۔ اس کی رائے کے مطابق سب کام کرتے رہو۔

دادا جی کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان سے بھی بعض اوقات مل کر صلاح مشورہ لے لیا کرو۔ علیمی اور اخلاق سے پیش [illegible]۔ تم عقلمند اور سمجھدار ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ [illegible] کروگے یہ مناسب ہوگا۔ پھر بھی میں نے تمہیں یہ خط لکھ دیا ہے تاکہ نئے کام کی کوشش میں تم اپنے فرض کو نہ بھول جاؤ۔ دادا جی کو میرا اسلام اور کنول کو دعا۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ خط لکھ کر اسکول کی ترقی کی خبر دیتے رہا کروگے۔

تمہارا
جٹا شنکر

خط پڑھ کر میں نے دیال کو واپس دیدیا۔ وہ دوسرے خط پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ــ "مہرشی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔"

ایک ہفتے کے اندر ہی اسکول کا فرنیچر آگیا ــ بنچ، کرسیاں، سیاہ تختے، میزیں وغیرہ۔ سامان دو کمروں میں قاعدے سے رکھ دیا گیا۔ فی الحال دو جماعتوں کا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی میری تمام الماریاں بھی اسکول کی لائبریری کے لئے ایک کمرہ میں باقاعدہ رکھ دی گئی تھیں۔ سائنس پڑھانے کے لئے ضروری ساز و سامان بھی منگوا لیا گیا تھا۔ اب تک آٹھویں جماعت کے لئے سو طلباء کے نام درج ہو چکے تھے۔ پہلے تو ایک ہی جماعت رکھنے کا خیال تھا مگر طلباء کی تعداد بڑھ جانے کے سبب سے اس کے دو سیکشن کرنے پڑ گئے۔ پرائمری اسکول کے چند اساتذہ نے ہائی اسکول کی جماعت میں بھی بعض مضامین پڑھانے کا بیڑا اٹھا لیا۔

درمیان میں ایک روز میں نے دیال کو اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کا مطلب میں سمجھ گئی۔ اور میں نے انہیں راضی کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر اس میں مجھے کامیابی نہ ہوئی۔

اب تک چندے کی نصف سے زیادہ رقم وصول ہو چکی تھی۔ والد صاحب نے فرنیچر اور سائنس کے آلات وغیرہ دے کر اپنے چندے کے دس ہزار پورے کر دیئے تھے۔

ماں اور دھرم پور کی دوسری جین خواتین کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ ان کے ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک اچھوت ہو۔ مگر اس امید پر کہ ایک برس بعد اس کا تبادلہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا کوئی اچھی ذات کا آدمی آجائے گا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تنقید نہیں کی۔

اسکول کا کام شروع ہونے کے لئے صرف تین روز باقی رہ گئے تھے۔ میں اسکول گئی تھی۔ دیال اسکول کا ٹائم ٹیبل بنانے میں مصروف تھے۔ جب وہ مکمل ہو گیا تو اسے میری طرف بڑھا کر انہوں نے مجھ سے کہا۔
"دیکھئے تو آپ کو یہ پسند ہے یا نہیں؟"
"جو ہیڈ ماسٹر کو پسند ہے وہ نائب مدرس کو بھی پسند ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد لائبریری سے دو کتابیں لے کر میں گھر جانے کے لئے آفس سے باہر نکل رہی تھی کہ دو کو ڈاکخانہ سے گھر کی ڈاک لے کر وہاں آگیا۔ اسکول کی ڈاک میں نے دیال کو دیدی اور اپنی ڈاک دیکھنے لگی ــــ دو خطوط تو میری سہیلیوں کے تھے جنہوں نے اخباروں میں دھرم پور کے جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر مجھے مبارکباد دی تھی۔ تین خط ایڈیٹروں کے تھے جنہوں نے اپنے اخباروں کے لئے مضامین بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ دو ہفتہ وار اخبار تھے اور تین ماہنامے تھے۔ ان کے ساتھ دو لفافے اور تھے۔ پتہ نہ چلا کہ وہ کس نے بھیجے تھے۔ میں نے انہیں

کھول کر دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ مگر دیاں پاس ہی بیٹھے تھے اسلئے میں کچھ نہ بولی اور میں نے اپنے چہرے پر خوف کے کوئی بھی تاثرات پیدا نہیں ہونے دیئے۔ میں فوراً گھر کی جانب چل پڑی ــــ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی میں گھر پہنچی۔ اپنے کمرے میں جاکر میں نے ساری ڈاک میز پر پھینک دی اور دھم سے چارپائی پر پڑ گئی۔

۳

اس روز رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ درمیان میں کئی مرتبہ جاگ کر میں گھڑی کی طرف دیکھتی تھی۔ نیم بیداری اور متعدد خیالات کے باعث میرا سر چکرا رہا تھا۔ کئی مرتبہ معمولی بات جو ہمارے روزمرہ کے مطلب کی ہوتی ہے ہمیں خاص اہم نہیں معلوم ہوتی مگر جب اس کی کمی ہوجاتی ہے تو وہ ہمیں بہت کھٹکنے لگتی ہے اور ہم اس کی اہمیت کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اس روز نیند کے متعلق میرا کچھ یہی حال تھا۔ چنانچہ میں نے نیند کی اہمیت کو منظور کر لیا۔ مریض کے لئے جس طرح دوا ہوتی ہے اسی طرح ہر جاندار کے لئے نیند ایک ایسی ہی قدرتی دوا یا معجون ہے۔

سویرا ہوا۔ مرغے نے بانگ دی۔ چکیاں پیسنے والی عورتوں کے سریلے گیت کانوں میں پڑنے لگے۔ گاؤں کے مویشی دریا اور کھیتوں کی جانب روانہ ہونے لگے۔ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی میٹھی آواز سنائی دینے لگی۔ دریائے کرشنا میں نہانے والی اور پانی بھرنے والی لڑکیوں کی باتیں سنائی پڑنے لگیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہو گئی۔ غرضیکہ حضرت شکم نے سب کو بیدار کر دیا اور کہا۔ اٹھو، ہماری فکر کرو، لگو اپنے کام میں۔

میری آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ میں نے منہ دھویا۔ اٹھ کر خود چائے تیار کر کے پی لی۔ قریب ہی میز پر پڑے ہوئے گمنام خطوں پر دوبارہ میری نظر پڑی۔ کل سے میں نے انہیں کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ پھر بھی میں نے انہیں ایک مرتبہ اور پڑھا۔ دونوں خطوں کا مضمون ایک ہی تھا کہ ہمارے گاؤں سے اس چمار کو جلد بھگا دو۔ اگر تم یہ نہ کرو گی تو ہم وہی سمجھیں گے جو عموماً ہمیں سمجھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ ہم ایک دن تمہارے اسکول کو......

توقعت کیوں کروں؟ آگے کے الفاظ تھے۔ آگ لگا دیں گے۔ یہ خطوط کسی ایسے آدمی نے لکھے ہوں گے جسے دوسروں کے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنے میں لطف آتا ہوگا۔ ان کے ساتھی بھی ضرور ہوں گے۔ کل سے میرے دل میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ اوپر سے خاموش نظر آنے والے سمندر میں آگ چھپی ہوتی ہے۔ یہ بیان بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جلسہ میں بیٹھ کر بلند آواز سے نعرے لگا کر اور دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر ہمارے مقدس کام کی تعریف کرنے والے لوگوں سے ایسے خطوط مجھے کبھی وصول نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ میرا جی چاہا کہ یہ خطوط والد صاحب کو دکھادوں، مگر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب جیسے سادہ دل والے شخص کو دنیا کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنا میں سکھا دوں۔ یہ مناسب نہیں۔ ان کے جوش کو ختم کرنا مجھے کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ شنکر جی نے جس طرح زہر خود ہی پی لیا تھا میں بھی اسی طرح یہ زہر پی کر ہضم کر لوں گی۔

دیال سے تو اس خط کے بارے میں ایک لفظ کہنا بھی مناسب نہ ہوگا۔ بعض معمولی باتیں ناقابلِ توجہ ہوتی ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر کئے بغیر ہی انہیں ختم کر دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی ان خطوط کے متعلق یہی فیصلہ کیا۔ لیکن مجھے یہ خیال بار بار پریشان کر دیتا تھا کہ زہر کی ایک بوند اور آگ کی ایک چنگاری بھی بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ ایک طرح سے میری سادہ لوح زندگی کا پہلا موڑ تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسے ہی کئی موڑ میری زندگی میں آئیں گے اور مجھے ان کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

میرا خیال تھا کہ ان خطوط کو ضائع کر دوں پھر میں نے سوچا کہ انہیں کسی محفوظ جگہ کیوں نہ رکھ دوں۔ اگر ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں تو دنیا تھوڑی اپنی آنکھیں موند لے گی۔ تو کیا پھر ہمیں بھی اپنی آنکھیں کھول کر چلنا چاہیئے۔ بالآخر میں نے ان خطوط کو ایک مضبوط صندوق میں رکھ کر اس میں ایک ڈبل تالا ڈال دیا اور تہیہ کر لیا کہ اب نہ کبھی ان خطوں کو نکالوں گی، نہ پڑھوں گی اور نہ کسی کو دکھاؤں گی۔ مگر ہاں خطوط کو تالے میں بند کرنے سے پہلے میں نے کئی مرتبہ انہیں پڑھ لیا۔

اطلاع گذشتہ کے مطابق ہمارا اسکول یکم مارچ کو شروع ہو گیا تھا۔ آٹھویں جماعت کے دو سیکشن تھے۔ دونوں درجوں کو میں اور دیال ساڑھے گیارہ بجے سے لے کر شام کے ساڑھے چار بجے تک باری باری سے پڑھاتے تھے۔ درمیان وقفہ کو چھوڑ کر مجھے اور دیال کو ان اوقات میں آرام بالکل نہ ملتا۔

چونکہ ہم دونوں بڑی دلچسپی اور محنت سے پڑھاتے تھے اس لئے طلبا بہت خوش رہتے تھے۔

ہمارے اسکول میں صرف نصاب پر ہی توجہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ ہمارا نصب العین تو یہ تھا کہ طلبا کی ہر طرح سے ترقی ہو۔ یہاں صرف ہمارے گاؤں کے ہی لڑکے نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسرے گاؤں سے آکر بھی چند لڑکے داخل ہو گئے تھے۔ ایسے لڑکوں کے لئے اسکول کی عمارت کے ایک حصہ میں بورڈنگ بنوا دیا گیا تھا۔ جہاں ان کے رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ اسکول میں پڑھائی مختلف موضوعات پر دلچسپ اور مفید تقاریر کے علاوہ کبھی جلسے، کبھی تفریح کی دوسری تقریبات، کبھی پکنک اور کبھی کبھی جشن وغیرہ بھی منائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا کو کبھی اسکول سے اکتاہٹ نہ ہوتی تھی۔

اسکول میں بے غرض کام کرنے کے باعث دیال کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اہمیت حاصل ہو گئی۔

دیال ہر مذہب کا احترام کرتے تھے اور جب کبھی کوئی تیوہار ہوتا تو وہ اس تیوہار کی اہمیت پر تقریر کرنے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کی تقریر سن کر سبھی سامعین متاثر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاویر جینتی کے موقع پر انہوں نے جو تقریر کی تو اس جلسہ کے مقرر خاص نے ان کا شکریہ ادا کرتے وقت یہاں تک کہہ ڈالا کہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جینی مذہب کے متعلق ایسی تفصیلی، مناسب اور خوبصورت معلومات دینے والے آج کے مقرر سچے جینی ہیں اور محض جینی کہلانے والے جینی ——— ہم لوگ اچھوت ہیں۔

دراصل دیال ہر لحاظ سے ایک عام جینی سے ہزار گنا بڑھ کر جینی تھے۔ مگر وہ جینی خاندان میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ اور اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

اور اگر ان کا جینی خاندان سے تعلق ہوتا تو.....

تو کیا؟ میری ماں کی ہوس پوری ہو جاتی۔ انہیں حسب منشا ایک گھر داماد مل جاتا۔ کون سی کمی ہے دیال میں؟ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے اور ذہین ہے۔ موجودہ پڑھے لکھے لوگوں کی مانند ڈھونگی ہوتا تعلیم یافتہ نہیں بلکہ اس کا دل تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گیا ہے۔ بس وہ پیدا چمار کے خاندان میں ہوئے ہیں یہی ان کا عیب ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرے سنہرے سپنے ٹوٹ جاتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا دل پر لگا کر جانے کتنی بلندی پر اڑتا رہتا۔ میں ان سے شادی کر لیتی۔ وہ گھر داماد بن جاتے۔ والد صاحب بڑی خوشی سے انہیں دھرم پور کی زمینداری سونپ دیتے۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے کس قدر لطف آتا۔ میری آئندہ پشت کس قدر ذہین، خوبصورت اور مہذب ہوتی۔ مگر راون سیتا کو اغوا کرتے وقت جس طرح جٹایو کے پر توڑ کر سیتا کو لے کر بھاگ گیا تھا اسی طرح پر کٹے جٹایو کی مانند لاچار ہو کر تخیل کی پرواز سے میں نیچے گر پڑی اور میرے خیالات و احساسات جانے کہاں غائب ہو گئے۔

وقت پرواز کر رہا تھا اسکول کا کام باقاعدگی سے ہو رہا تھا گاؤں والوں نے اسکول کی اہمیت قبول کر کے اپنے اپنے چندے کی بقیہ رقمیں ادا کر دی تھیں۔

دیال ہمارے گھر بہت کم آیا کرتے تھے اور جب آتے تو والد صاحب سے مل کر چلے جاتے۔ میرے پاس آنے سے وہ گریز کرتے۔ میں بھی اسکول کے وقت پر اسکول جاتی اور چھٹی ہوتے ہی گھر واپس آجاتی وقفہ کے دوران یونہی کسی اخبار کی خبروں یا رسالے کے مضمونوں پر معمولی سی گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات اخباروں میں میرے مضمونوں، نظموں یا افسانوں پر دیال اپنی رائے ظاہر کیا کرتے تھے۔ کبھی میں ان سے اتفاق کرتی اور کبھی ان کی مخالفت کرتی تھی لیکن بلاشبہ مجھے ان کی قابلیت کی داد دینا پڑتی تھی۔ جب وہ میری کسی تصنیف کی تعریف کرتے تو مجھے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی ہو جانے پر ہم سب لڑکوں کو لے کر دریا پہ گئے تھے۔ لڑکے کھیل کود کے پروگرام میں مصروف تھے اور ہم دونوں گفتگو میں مصروف تھے۔ ہماری گپیں ہوا کے بادل کی طرح تھیں جن میں جس طرف جو چاہیں بھر دیتے ہیں اسی طرح جب گپیں ایک بار شروع ہو جاتی ہیں تو پھر یہ خیال نہیں رہتا کہ ان میں کون کون سے موضوعات شامل ہوں گے اور وہ کس طرف بہا لے جائیں گے۔ ہماری باتیں جاری تھیں کہ لڑکوں کے کھیل ختم ہو گئے اور وہ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ناظرین بھی منتشر ہو گئے مگر ہم دونوں ساحل کی ریت پر اپنی گفتگو میں محو بیٹھے رہے تھے۔

ایک عرصے تک ساتھ رہنے اور وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیالات کی بدولت ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ دونوں کا مذاق ایک تھا اور مزاج میں بھی یکسانیت۔ دیال سے باتیں کرنے کے لئے میں قبل از وقت ہی اسکول پہنچ جایا کرتی تھی مگر ایک بات یہاں بتلا دینا

ضروری ہے کہ ہم دونوں کی دوستی کا معیار بلند تھا اس میں عریانی یا فحاشی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

سورج غروب ہو گیا تھا ہر گھر میں چراغ جل گئے تھے۔ میں نے دیال سے کہا۔

"چلئے اب اٹھیں کافی وقت ہو گیا۔ لڑکے سب چلے گئے۔"

"ہاں بیٹی ہمیں اب بھی چل دینا چاہئے" دیال نے کہا۔

"ہاں ورنہ لوگوں کو انگشت نمائی کا یہ سنہری موقع مل جائے گا۔

سچ سچ دیال بابو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے" میں نے پوچھا۔

دیال کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ غالباً انہوں نے میری بات کا کوئی غلط مطلب سمجھا لیکن وہ خود کو سنبھال کر بولے۔

"میری شادی۔۔۔۔؟"

"جی ہاں، اب شادی کر لینے میں کیا حرج ہے؟ اب تو آپ کمانے بھی لگے ہیں نا؟" میں نے کہا۔

دیال اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"ابھی ولایت جانا ہے نا؟ سجدہ ماں کے لئے ارجن کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی تھی۔"

میں بھی اٹھی اور گھر کی طرف چلتے ہوئے میں نے سوال کر ہی دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کی سجدرا ولایت سے ہی آنے والی ہیں؟"

دیال نے ہنس کر کہا ــــ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہر شخص کو اپنی حالت دیکھ کر ہی کام کرنا چاہئے؟"

دونوں گھر کی جانب چل دیئے۔

میں نے سوچا اگر وہ مجھ سے شادی کے بارے میں سوال کر بیٹھتے تو میں کیا جواب دیتی۔

اب ہم گاؤں میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگ ہماری طرف تیز تیکھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور دیال کو یہ اچھا نہیں لگا۔ اسی وقت مجھے کسی نے پکارا۔

"منی! او منی!"

میں ٹھہر گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک دور کی رشتہ دار بوڑھیا تھی۔ دیال کو میں نے رخصت کیا اور بوڑھیا سے کہا۔

"کہئے کیا حال ہے چچا بیگم؟"

بچی نے اپنی مادری زبان کا نظر کوٹ کہا ــــ وقت بے وقت اس طرح غیروں کے ساتھ گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب تو کوئی بچی تھوڑی ہے۔ تیرے باپ سے اور رشتہ سے میں کئی روز سے کہہ رہی ہوں کہ لڑکی کو اتنا پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی شادی کر دو اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ۔ پر میری سنتا کون ہے؟ اب بڑی ہو گئی ہے جلد کر کے اپنی شادی کر لے۔ لوگ تجھے طرح طرح بدنام کر رہے ہیں"۔ آخری بات اس نے اپنے بڑے پن سے کہی تھی۔

"لوگوں کا منہ کون بند کر سکتا ہے چچی جھکنے دو مجھے ان کی پروا نہیں۔ اس طرح قدرت سے کیسے کام چلے گا!" میں نے کہا۔

"دیکھ بیٹی، تو ہی جان" چچی نے کہا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

گھر آ کر میں اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لینے لگی۔ کیا مجھ سے کوئی بھول ہو رہی ہے ــــ میں اسکول میں کام کرتی ہوں اس لئے دیال سے بولنا لازمی ہے۔ جب میں اپنے رویہ میں اس قدر صاف اور پاک ہوں تب بھلا لوگوں کو مجھ پر کیوں شبہ ہوتا ہے؟ میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں اور اس لئے میں اپنی ذمہ داری سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ میری شادی ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ لوگوں کو اس میں دخل اندازی کرنے کی یا اس کے بارے میں متفکر ہونے کی کیا ضرورت؟

مگر دوسرے ہی لمحہ میرا دل مجھ سے کہتا ــــ "منی تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟ لوگ تو ایسی باتیں چرا کر تلاش کرتے رہتے ہیں۔ تیرے گاؤں کے لوگ تو خیر جاہل اور گنوار ہیں لیکن شہر کے تعلیم یافتہ کہلانے والے لوگ بھی اسی طرح پرائی بہو بیٹیوں کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ سانگلی میں جب تو زیر تعلیم تھی تو کیا تجھے یہ تجربہ نہیں ہوا؟ تجھے نہ سہی تیری کسی سہیلی کو تو البتہ ہوا ہی ہوگا۔

لیکن ایسی بیہودہ باتوں سے انسان کھل کے بے حجاب ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ وہ اس قدامت پرست معاشرہ کا مقابلہ کرے۔

چند روز سے اسی قسم کے خیالات نے میری نیند حرام کر دی تھی۔ بچپن میں میں کتنی سوتی تھی۔ ماں کہا کرتی تھیں ــــ منی، تو بہت سونے والی ہے۔ تیری نیند کچھ کر کے بیٹھے گی۔ عورت ذات کو اتنا سونا مناسب نہیں ہے۔

میری نیند غائب ہونے کا باعث صاف تھا مگر کیا یہ سب باتیں ماں سے کہنے کے قابل تھیں ؟ یہ سب تو میرے لئے ہی تھا میری ذات کے لئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں کے منہ میں جو کچھ آتا ہے بک دیتے ہیں۔ لیکن اگر میں دیال سے شادی کر لوں تو کیا ہوگا ؟ لوگ کیا کریں گے، کیا کہیں گے ؟ ماں اور والد صاحب پر اس کا کیا اثر پڑے گا ؟ اس سے میری زندگی آرامدہ بن جائے گی۔ اسی قسم کے خیالات میں محو میں سو گئی۔

سویرے میری جو آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہوں کہ بائیجا صبح کی چائے لئے کھڑی ہے۔ رات کو میں نے جو ایک حسین خواب دیکھا تھا اس کا کیا انجام ہوا ؟ یہ میں جان بھی نہ سکی تھی کہ بائیجا نے مجھے اٹھا دیا اور میں اپنی خوابیدہ نظروں سے اسے دیکھ کر یہی سوچتی رہ گئی کہ آخر میں خواب کی دنیا سے اس حقیقت کی دنیا میں کیوں آگئی۔ کاش میں اسی میں ختم ہو جاتی ......

۴

ہمارے سماج میں جو تنوع نظر آتا ہے، جس قدر مختلف و متضاد کردار ہمیں یہاں دکھائی دیتے ہیں اس کا صحیح علم مجھے ان خبروں سے ہو گیا تھا جو بائیجا نے مجھ تک پہنچائی تھیں۔ مجھے پورا پورا احساس تھا کہ اس دنیا میں تصنع، بناوٹ، فریب اور ڈھونگ اپنی پوری خوفناکی کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے وہ ڈھونگی لوگ جو لمبے لمبے تلک لگاتے ہیں، جسم پر خاک ملتے ہیں اور لمبے لمبے بال رکھتے ہیں وہ اپنے بھائیوں کا گلا بڑی آسانی اور مہارت کے ساتھ کاٹ دیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ بعض اوقات یہ لوگ تہذیب اور کلچر کا خول پہنے کھلے بندوں گھومتے ہیں اور کبھی ٹھگ، چور اور لٹیروں کی شکل میں سماج کو دھوکہ دیتے ہیں، اسے لوٹتے ہیں۔ اپنی خامیاں انہیں نہیں دکھائی دیتیں، دوسروں میں کیڑے نکالنے میں انہیں لطف آتا ہے۔ اگر دوسروں کی بھلائی ہو تو ان کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور اگر کسی کا نقصان ہو جائے تو یہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ہر گاؤں میں کچھ غنڈے ہوتے ہی ہیں۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور میں بھی ایسے کچھ لوگ ہیں تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوا۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دھرم پور میں اس قماش کے لوگ محدودے چند ہی نہیں بلکہ ان سفید پوش شیطانوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس میں متعدد لوگ ہیں جو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سازش کرتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کے گناہ کرنے کے باوجود وہ بگلا بھگت بنے رہتے ہیں۔

ہمارے گاؤں کا پٹواری گوپال راؤ کلکرنی اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی تھی۔ وہ سانولے رنگ کا دبلا پتلا شخص تھا جیسے کوئی معمولی ہٹا کٹا آدمی ایک طمانچہ مار کر زمین سنگھا سکتا تھا۔ مگر اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ ہر قسم کے دھوکے فریب میں وہ ماہر تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگ پنت کہا کرتے تھے۔ پنت ہر فن مولا تھا۔ دنیا کا کوئی عیب ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہوتا۔ وہ گانجا پیتا تھا، شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا اور رنڈی باز بھی تھا اور موقع آنے پر وہ خون کرنے میں بھی نہ چوکتا تھا۔

گاؤں میں کہیں معمولی جھگڑا ہو، کوئی مار پیٹ ہو جائے یا کوئی مقدمہ ہو تو پنت کسی نہ کسی فریق کی طرفداری ضرور کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جس کام کو وہ ہاتھ میں لیتا تھا پھر وہ خواہ سچا ہو یا جھوٹا، کسی نہ کسی طرح اسے پورا کرتا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کر لیتا تھا۔ اس لئے اسے اپنی طرف کرنے اور اس کی امداد حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں اکثر کشمکش رہتی تھی۔

اس نے سینکڑوں گھروں میں نزاع کے بیج بوئے تھے، مقدمہ بازی کرائی تھی۔ کئی لوگوں کو اس نے فقیر بنا دیا تھا اور کئی گداگروں کو اس نے اتنی دولت دلوا دی تھی کہ وہ انہیں کئی پشتوں کے لئے کافی تھی۔ انہیں ذلیل حرکات سے اس نے بھی کافی پیسہ کمایا تھا مگر وہ اس کے پاس بچا نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو اس میں بُری عادتیں بے شمار تھیں، دوسرے وہ خرچیلا بھی بہت تھا۔ اس کی ذہانت، بُری عادت اور خرچیلے پن کے باعث اسے کئی ساتھی مل گئے تھے اور اس طرح اس کا ایک اچھا خاصا گروہ بن گیا تھا۔

جب پنت کبھی کسی میلے، سنیما یا ڈرامہ وغیرہ دیکھنے جاتا تو اس کے ساتھ اس کے گروہ کے پندرہ بیس شخص ضرور رہا کرتے تھے اور ان سب کے کھانے پینے، آنے جانے وغیرہ کا پورا خرچ وہ خود ہی برداشت کرتا تھا۔ پھر ایسے موقع پر اگر اس کے پچاس روپے بھی خرچ ہو جاتے تو وہ اس کی

چندا وصول کرتا تھا۔

اس گروہ میں گاؤں کے کئی لوگ شامل تھے اور مذہب و ملت کا فرق ختم کرکے وہ سب متحد ہوکر اپنا کام کیا کرتے تھے۔ گروہ کے لوگوں کا پورا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ گروہ کے اندر وہ اپنی عرفیت سے ہی پکارے جاتے تھے۔ مثلاً حسینیا حسین خاں کے لئے، شنکریہ شنکر لال کے لئے اور بابیا بابو لال کے لئے وغیرہ۔ اس گروہ میں ہنومیا، گمپو، سیکیا، بابیا، ملیا، کلیا وغیرہ نام کے جلاہے، مسلمان، دھوبی، درزی، بڑھئی، سنار، حبشی، چمار وغیرہ کئی ذاتوں اور مذہب اور پیشے کے لوگ شامل تھے۔

پینت کے مشیر خاص اور اصل میں اس کی قوت بلیا، ملیا اور کلیا تھے۔ وہ بڑے لحیم شحیم اور طاقت ور تھے اور پینت نے بڑی چالاکی سے انہیں اپنی خدمت میں رکھ لیا تھا۔

ان کا خاص کام چوری اور لوٹ مار تھا۔ یہ چوری کرکے زیورات لاتے اور پینت کے حوالے کر دیتے تھے، پھر پینت انہیں گمپو سنار سے راتوں رات گلوا کر سکھو بنئے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس میں ان تینوں کا آدھا حصہ ہوتا تھا۔ کچھ حصہ گمپو کو مل جاتا تھا، کچھ سکھو کو اور بیشتر حصہ پینت خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ حصہ سب کو دے دیتا تھا اس لئے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوتی تھی۔ اس گروہ کے ممبروں کے پاس پستول، بم، تلواریں وغیرہ سبھی ہتھیار موجود تھے۔ دن کے وقت تو ان ہتھیاروں کو کوئی نہ دیکھتا تھا لیکن رات کو یہ نہ جانے کیسے نکل آتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب میں بلیا، ملیا اور کلیا کو سنہری موقع مل گیا تھا۔ وہ وقت تھا جب انہیں اپنے جوہر دکھانے تھے۔ انہوں نے کئی ڈاک خانے، ریلوے اسٹیشن اور سرکاری عمارتیں ایک رات میں ہی پھونک دی تھیں۔ ریل کے پل مسمار کر دیئے تھے، سڑکوں پر ڈاکے ڈالے تھے۔ ریل گاڑیاں لوٹ لی تھیں۔ جو شجاعت کسی شیواجی کے پیرو نے بھی نہ دکھائی، وہ ان تینوں نے دن دہاڑے، رات میں اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دکھائی تھی۔ لوٹ مار تو بے شمار کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ تینوں تین بورے نوٹ بھر کے لے آئے تھے۔

ان کاموں میں انہیں پینت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ پینت نے یہ سب ذلیل کام کئے تھے اور اسے ان پر کبھی افسوس نہ ہوا تھا۔ کسی کو اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ سب اپنے اپنے حصوں سے مطمئن تھے۔ پینت نے اس کا انتظام پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر کر دیا تھا تاکہ شکایت کا کسی کو موقع نہ ملے۔ سب خوش رہیں۔ اور کوئی بھی بگڑ نہ جائے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب میں جو لوٹ مار ہوئی تھی اس میں پینت نے اگرچہ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن ہر کام اسی کی رائے سے ہوا کرتا تھا اور ہر کام وہی انہیں بتایا کرتا تھا۔ اس گروہ کے کئی لوگوں کو جنگ آزادی میں جوش آیا تھا اور اس جوش سے مغلوب ہوکر انہوں نے بڑے جوش و ولولے سے اس جنگ میں پورا تعاون کیا تھا۔ مگر بیچارے بھولے بھالے لوگ کیسے جان سکتے تھے کہ اس خدمتِ ملک کے پس پردہ ان کے گروہ کا خوفناک خود غرضی اور ظلم پرستی چھپی ہوئی تھی۔

دھرم پور میں کئی انقلابی روپوش ہونے کے لئے آئے تھے اور پینت نے ان کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اس لئے متعدد انقلابی پینت اور اس کے گروہ کے لوگوں سے بہت خوش ہوئے تھے۔

پینت اس گاؤں کا پٹواری تھا۔ اس لئے اس نے گاؤں کے سرکاری ملازموں سے کہہ کر کئی مرتبہ ان انقلابیوں کا تحفظ کیا تھا۔

دادا جی دھرم پور کے سب لوگوں کو نہایت نیک اور مخلص سمجھتے تھے۔ گہرائی میں جاکر لوگوں کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اسلئے پینت جو کچھ کہتا تھا دادا جی اس کی حمایت کرتے تھے اور اسی لئے اگر کسی قسم کی تفتیش کے موقع پر کوئی سرکاری افسر کبھی آتا بھی تو وہ معمولی جانچ پڑتال کرکے اور کسی بھی گاؤں والے کو پریشان کئے بغیر اپنے ہیڈ کوارٹر کو واپس چلا جایا کرتا تھا۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور آزادی مل جانے پر دھرم پور میں انقلابیوں کا استقبال کرنے کے لئے ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے کئی انقلابیوں نے پینت اور اس کے ساتھیوں کی بہت تعریف کی تھی۔

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد جنوبی ہند میں جو بلوے اور فساد ہوئے تھے ان سے دھرم پور بالکل پاک تھا کیونکہ پینت کے حکم کے بغیر آگے کون بڑھتا؟ پینت نے اس وقت کوئی دلچسپی نہ لی تھی کیونکہ پیچھے کی ذات والوں کے خلاف وہ کیسے کھڑے ہو جاتے؟

شراب بندی قانون کے بعد بلیا، ملیا اور کلیا نے دھرم پور کے جنگلوں، پہاڑوں اور ترائیوں میں شراب کشید کرنے کی کئی بھٹیاں کھول کر کافی روپیہ کمایا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے سبھی کاموں میں پینت کا تعاون ضرور مل جاتا تھا۔ دھرم پور نے

کیا تھا۔ دور ایک جنگل میں پنت اور اس کے گروہ کے جوئے کا اڈہ تھا جہاں دوسرے گاؤں کے لوگ بھی اپنی قسمت آزمانے آجایا کرتے تھے۔ رات بھر جوا ہوتا رہتا تھا۔ بلیا، ملیا اور کلیا بندوق اور تلوار سے لیس رات بھر اس اڈے پر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ جواریوں کی ہار جیت کچھ بھی ہوتی رہے مگر ان تینوں پہرہ داروں کو پنت مٹھی بھر بھر کر روپیہ ضرور دیا کرتا تھا۔

گاؤں کے مشرق میں ایک چھوٹی پہاڑی پر ہنومان جی کا مندر ہے جس کے سامنے بہت جگہ خالی پڑی ہے۔ جنگل کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس طرف لوگوں کی خاص آمد و رفت نہیں ہوتی تھی۔ اس مندر میں پنت اور اس کے ساتھی کبھی کبھی تفریح کے لئے رقص و موسیقی کے پروگرام کر لیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار فرش پر نوٹوں کو بچھا کر ان لوگوں نے اس پر ایک طوائف کا ننگا ناچ کرایا تھا۔

پنت اپنے بدمعاش ساتھیوں کے درمیان اسی طرح رہتا تھا جس طرح پانی میں کنول رہتا ہے۔ قرب و جوار کے علاقہ میں بلیا اور اس کے ساتھیوں نے نقب لگا کر کئی چوریاں کی تھیں۔ ہنومنیا درزی نے اپنی پہلی بیوی کو پاگل قرار دے کر چھوڑ دیا اور بڑے ٹھاٹ باٹ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ بانویا جنیا جانے کہاں سے ایک نوجوان مراٹھی لڑکی بھگا لایا اور اس سے شادی کر لی۔ اس میں پنت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ لکھپو نے پنت کے مشورے سے ایک بیوہ سنارن کی گود میں زبردستی اپنا بچہ دیدیا اور اس کی ساری جائداد ہڑپ کر لی۔ پنت کے اشارہ پر بلیا نے ایک مارواڑی کو قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں اس کی صلاح سے اس مارواڑی کی لاش کھیت میں پڑے بھوسے گھاس کے ڈھیر کے اندر رکھ کر راتوں رات پھونک دی تھی۔ ملیا چپا نے ایک ساہوکار کی ناک ہی کاٹ ڈالی تھی۔ پنت کے کہنے سے کلیا نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس طرح سیکڑوں بے گناہ لوگوں کے خون ان بدمعاشوں کی گردن پر تھے۔

بظاہر پنت بڑا سیدھا اور معصوم دکھائی دیتا تھا۔ کھادی بھی پہنتا تھا، مگر اندر سے وہ کیا تھا اس کا شاید اسے بھی علم نہ تھا۔ اس کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ تینوں لڑکیوں کی اس نے شادی بڑے ٹھاٹ باٹ سے کی تھی۔ وہ تو صاحب اولاد بھی ہو گئی تھیں۔ دونوں لڑکے سانگلی کے کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس کی بیوی بڑی سیدھی سادی عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لحاظ سے بالکل مختلف اور متضاد تھے۔

گھر میں اس کا بڑا رعب تھا۔ کسی کو چوں چرا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس کی داشتہ کا نام چندرا تھا۔ وہ دھرم پور کے ایک غریب مالی کے خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ تھی بہت خوبصورت۔ رنگ گورا اور جسم متناسب تھا۔ بچپن ہی میں گاؤں کے ایک مالی لڑکے سے اس کی شادی ہو چکی تھی۔ لڑکی بھولی بھالی تھی مگر اس کی ساس اور خسر نے اسے بہت تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اس نوجوان لڑکی کے سر پر ترکاری کی ٹوکری رکھ کر گاؤں میں گھمانا شروع کر دیا۔ وہ بیچاری بکری کی طرح تھک جاتی تھی۔ اس کا شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ اس لئے یہ دیکھنے کے باوجود کہ اس کی بیوی کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ کبھی بھی اس کی طرف داری نہیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اسے ضرورت پڑنے پر مار پیٹ کیا کرتا تھا۔ اس کے ساس سسر ہمیشہ اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ بیچنے جا کر روپے اور کپڑے لائے۔ اور اگر وہ اس میں ناکام رہتی تو وہ اسے اور پریشان کرنے لگتے تھے۔

بیچارے ماں باپ کہاں تک دیتے رہتے؟ کوئی سیٹھ ساہوکار تو تھے نہیں۔ مزدور تھے۔ انہیں تو دو وقت روٹی بھی میسر نہ تھی۔ پھر بھی بیٹی کی تکلیف دیکھ کر انہوں نے دو ایک بار قرض لے کر اس کی ساس سسر کو خوش کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ چندرا کی تکالیف میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد چندرا کے والدین انتقال کر گئے۔ اس کے ساس اور سسر بھی مر گئے۔ لیکن شوہر شرابی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کی مصائب میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ وہ سبزی بیچ کر اپنی روزی چلاتی تھی اور ان سب کے باوجود وہ پاکدامن بنی رہی۔ گاؤں اور گرد و نواح کے منچلے لوگوں نے اسے خراب کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ان کے چنگل میں نہ پھنسی۔ گاہک عموماً اس کی سبزی نہ دیکھ کر اس کی صورت دیکھ کر سبزی خریدا کرتے تھے۔

پنت کے گھر بھی وہی سبزی دینے آیا کرتی تھی۔ پنت کی نظر بد اس پر پڑی اور اس نے اپنی شیریں زبان اور عیاری سے چندرا کو اپنے دام فریب میں پھنسا لیا اور اس طرح کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکی۔

پنت سے چندرا کے تعلقات بڑھتے گئے اور نتیجتاً پنت کی ہی ہو رہی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ پنت نے اسے تکلیف دینے والے شوہر کو اسی کے ہاتھوں مروا ڈالا۔

ایک مرتبہ چندرا کا شوہر بخار میں مبتلا تھا اور پنت کے کہنے سے چندرا نے دوا میں زہر ملا کر اسے پلا دیا اور اس نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ اس نے راتوں رات اپنے شوہر کی لاش پھنکوا دی۔ پنت کے ساتھی ماتم پرسی کے لئے اس کے ہاں گئے اور سارے گاؤں میں یہ مشہور کر دیا کہ چندرا سے انہیں پوری ہمدردی ہے اور یہ کہ بیچاری پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔

چندرا اب مکمل طور پر پنت کی ہو گئی تھی۔ پنت کے گروہ میں اس کا بڑا اہم مقام تھا۔ وہ ترکاری بیچنے کی غرض سے گھر گھر جایا کرتی تھی اور وہاں کی ساری خبریں پنت کو لا کر دیتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ قرب و جوار کے علاقہ میں سبزی ترکاری بیچنے کے بہانے سے جا کر کہاں کس طرح چوری یا لوٹ مار کی جا سکتی ہے اس کا بھی پتہ وہ پنت، بیلیا، ملیا اور کلیا کو دیتی تھی۔ اس گروہ کے دو شعبے —— پروپیگنڈہ اور جاسوسی اس نے سنبھال لئے تھے اور وہ یہ دونوں کام بطریق احسن انجام دے رہی تھی۔

سینے میں تنگ چولی، جسم پر سفید چھپی ہوئی ساڑی، سر پر ترکاری کی ڈلیا، منہ میں پان اور کمر میں بٹوہ دبائے جب وہ چپلیں چٹخاتی ہوئی اور عالم شباب میں اٹھلاتی ہوئی یہ مالن جب بھری جوانی اور ترکاری کی ڈلیا کا بوجھ لے کر نکلتی تھی تو مڑ کے اس کی طرف نہ دیکھ کر آگے بڑھ جانے والا شاید ہی کوئی ہوتا ہو۔

چندرا نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورتیں کسی بھی کام میں مردوں کی برابری کر سکتی ہیں۔ وہ پنت کے ساتھ ناچ گاتی، شراب پیتی، جوا کھیلتی اور عریاں سے عریاں رقص دیکھنے کے لئے بھی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی اور......

جب پنت کسی میلے میں یا ڈرامہ یا سینما دیکھنے سانگلی جاتا تو اپنے ساتھ چندرا کو ضرور لے جاتا تھا۔ چندرا کے ساتھ ہونے سے پنت اور اس کے ساتھیوں کو کافی سہولت ہو جاتی تھی۔ کیونکہ ایسے موقع پر پنت دل کھول کر خرچ کرتا تھا، چنانچہ اس کے پیرو کہا کرتے تھے ——

"چندرا کے بغیر رات سونی رہتی ہے"

چندرا کی اہمیت کو محسوس کر کے پنت نے اس کی ہر ایک خواہش پوری کی تھی۔ جتنا خیال وہ چندرا کا رکھتا تھا اتنا اس نے کبھی اپنے گھر کا بھی نہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہنستا اور اسی کے ساتھ روتا تھا۔ اپنی قانونی بیوی کے سر پر جوتے مارنے والا مرد داشتہ کے جوتے اپنے

سر پر رکھنے کے لئے کیسے تیار ہو جاتا ہے اس کی جیتی جاگتی مثال پنت تھا۔

تاریک شب میں بجلی کی روشنی جس طرح انسان کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے اسی طرح بائیجا کی یہ تمام باتیں سن کر میری جہالت اچانک غائب ہو گئی۔ بائیجا نے میرے تاریک دماغ کو روشن کر دیا تھا، ورنہ میں دیوانی اس دنیا کو بہشت اور اس دنیا کے انسانوں کو فرشتہ سمجھ رہی تھی۔ اور اسی کے مطابق عمل کر رہی تھی۔

بائیجا نے مزید کہا۔

"ممتی بہن! کل میں ندی پر کپڑے دھونے گئی تھی۔ میں اپنا کام جلدی ختم کرنا چاہتی تھی اس لئے دوسری عورتوں کی طرف میں نے دیکھا تک نہیں۔ میں سر نیچا کئے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھی کہ تھوڑی دیر میں ایک عورت گھٹنوں تک ساڑی چڑھائے ہوئے میرے پاس آئی اور بولی۔

"بائیجا کیا تیری ممتی بہن دیال ماسٹر سے شادی......"

"کون کہتا ہے؟" میں نے خشمناک ہو کر کہا۔

"سارا گاؤں چہ میگوئیاں کر رہا ہے" اس نے کہا۔

"گاؤں کو دوسرا کام ہی کیا ہے" میں نے کہا۔

"کیوں لڑتی ہو۔ بلا آگ کے بھی کہیں دھواں اٹھتا ہے" اس نے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"رسی کو سانپ سمجھ کر مار رہے ہیں سب لوگ۔ اس کے علاوہ کیا کہا جائے؟" میں نے کہا۔

"کس نے دی ہے تجھے یہ خبر؟" میں نے پھر اس سے دریافت کیا۔

"چندرا مالن نے"

"اس مغلی کے پاس اور کام ہی کیا ہے۔ اس گاؤں کی گوری کی بات کا کیا اعتبار۔ وہ تو سمجھتی ہے کہ سب عورتیں اسی جیسی ہیں"

بائیجا نے کہا کہ ایک روز وہ ہنومان جی کے مندر میں گئی تھی اور اس سے چند عورتوں نے ٹھیک یہی سوال وہاں کیا تھا۔ اور اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس افواہ کو بے بنیاد اور جھوٹی بتا دیا تھا۔ جب اس نے ان عورتوں سے اس خبر کے بارے میں دریافت کیا کہ انہیں کیسے معلوم ہوا تو انہوں نے بھی چندرا مالن کا ہی نام لیا تھا۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ پنت کے گروہ نے اور خصوصاً چندرا مالن نے

میرے خلاف سارے گاؤں میں کس طرح زہر پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ میں اب پوری طرح سے جان گئی کہ جن گمنام خطوں کو میں نے اپنے صندوق میں محفوظ رکھا ہے وہ مجھے کن لوگوں نے بھیجے ہیں۔

اب مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دو روز قبل ماں نے مجھے جو لمبا سا لیکچر دیا تھا اس کی جڑ کیا تھی۔ اس دن دوپہر کو ماں اپنی بیٹھک میں آرام کر رہی تھیں۔ تھوڑی دور پر ایک طرف بابی جی بیٹھی تھی اور دوسری طرف گاؤں کی چند عورتیں ہمارے گھر کا اناج صاف کر رہی تھیں۔ اسکول کی چھٹی ہونے کی وجہ سے میں بھی گھر پر ہی تھی۔ چونکہ میں کچھ تھکان محسوس کر رہی تھی اس لئے اپنے کمرے سے اٹھ کر نیچے آئی۔ میں چاہتی تھی کہ ماں کے پاس بیٹھوں کہ اتنے میں ماں نے کہا۔

"منی! ادھر آؤ۔"

"آئی ماں کہتے ہوئے" یہ کہہ کر میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ماں نے کہا۔

"اب میں تجھے کیا کہوں؟ جب تو چھوٹی تھی تب میں نے تجھے بہت سی باتیں کہی تھیں۔ لڑکیوں کو کس طرح رہنا چاہیئے اور کس قسم کا سلوک کرنا چاہیئے یہ سب باتیں میں نے تجھے اس وقت بتلائی تھیں اور اب تو بڑی ہو گئی ہے، تعلیم یافتہ ہو گئی ہے۔ ساری باتیں اب تجھے اپنے آپ سمجھ میں آجائیں گی۔"

میں نے درمیان میں ٹوک کر کہا "ہاں ماں، ہے تو یہی بات۔"

ماں نے جواب دیا "تو تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ لوگ تیرے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ تو دیال ماسٹر سے زیادہ قریب نہ رہ۔ اس کے ساتھ تنہا گھومنے نہ جایا کر۔"

"اس سب کا کیا مطلب ہے ماں؟ کیا میں اسکول نہ جایا کروں؟ ایک ہی مدرسہ کے استاد اگر آپس میں گفتگو نہ کریں گے تو وہاں کا کام کس طرح چلے گا؟ اسکول کے اوقات کے علاوہ کیا میں دیال کے پاس جاتی ہوں؟ کب اس کے ساتھ گھومنے جاتی ہوں؟ لوگوں کو بدنام کرنے میں کیا لگتا ہے۔ وہ کچھ بھی بک سکتے ہیں۔ یہاں میں چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ دوسرے گاؤں میں رہ کر میں نے تعلیم حاصل کی۔ کیا کبھی تمہیں میرا سلوک نامناسب معلوم ہوا تھا؟ آج....."

درمیان میں مجھے روک کر ماں نے کہا "یہ بات نہیں ہے منی۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں۔ مگر لوگوں کو باتیں کرنے کے لئے بھی موقع کیوں دیا جائے؟"

"لوگوں کی تو یہ عادت ہے۔ وہ ہمیشہ بدنام کیا کریں گے۔ میں اسکول جاؤں گی تو بھی اور گھر پر رہوں گی تب بھی۔ پھڑے اور اس کے سائیں کا قصہ تم نے نہیں سنا کیا؟" میں نے ذرا چڑھ کر کہا۔

"اس طرح چڑھو نہیں منی۔ ابھی تیری شادی ہونی ہے۔ کنواری لڑکیاں کو بدنامی سے بچنا چاہیئے۔ جب تیرے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے تو پھر تجھے بدنام کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے گا۔ ابھی تو تو کنواری ہے۔ اگر لوگوں کی باتوں کی طرف توجہ نہ دے گی تو کام نہیں چلے گا۔ نہیں تو تیری شادی..."

"نہیں ہو گی۔ یہی نا؟ کوئی حرج نہیں۔ میں پجارن ہو کر کہیں مندر میں بیٹھ جاؤں گی" میں نے ماں کا فقرہ پورا کیا۔

"اسے مذاق نہ سمجھو بیٹی" ماں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر، نہ سہی تو بتلایئے کیا کروں؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہی جو میں کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں اپنی ذمہ داری کو خوب جانتی ہوں۔ آج تک میں جس طرح رہتی آئی ہوں اسی طرح اب بھی اپنا کام کئے جاؤں گی۔ لوگ اگر کچھ بکتے ہیں تو بکنے دیجئے انہیں۔ ان کی زبان پکڑنے سے تو رہی۔ سیتا ایسی پاکدامن کو بھی جب لوگوں نے بدنام کرنے سے نہ چھوڑا۔ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں تمہیں مجھ پر تو اطمینان ہے نا؟"

"یہ بات نہیں منی، تمہارے والد صاحب کا خیال ہے کہ آئندہ بیساکھ میں تمہاری شادی کر دی جائے۔ وہ تمہارے لئے موزوں شوہر کی تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس سلسلہ میں تم سے بھی گفتگو کریں اور تمہارا مشورہ لیں۔ اسلئے کہتی ہوں کہ کچھ احتیاط رکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تو بہت احتیاط برتتی ہوں۔" میں نے انہیں یقین دلایا۔

اسی وقت والد صاحب باہر سے آگئے۔ اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے کپڑے اتارے اور ماں کے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے فرمایا۔

"کیوں منی، آج کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟"

"اب منی کے بیاہ کے علاوہ کیا باتیں ہوں گی؟" ماں نے جواب دیا۔

"یہی تو معلوم کر رہا تھا۔" والد صاحب نے کہا۔

"کیوں، مل رہا ہے کیا کوئی موزوں بر؟" ماں نے استفسار کیا۔

"ملے گا کیوں نہیں؟ بروں کی کیا کمی ہے؟" والد صاحب نے جواب دیا۔

"آئندہ بیساکھ میں اس کے ہاتھ پیلے کر ہی دینے چاہئیں۔" ماں بولیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" والد صاحب نے اتفاق کیا۔

"تو کیا منی؟" ماں نے مجھ سے پوچھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ میری شادی ہو گی، میں سسرال جاؤں گی تو......" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، ہم گھر داماد ہی کی تلاش میں ہیں۔ کیوں یہ ٹھیک ہی بات ہے؟" ماں نے والد صاحب کی رائے طلب کی۔

"ہاں ہاں!" والد صاحب نے گردن ہلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

ماں اور والد صاحب کو ہنستا ہوا چھوڑ کر میں بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

میں نے کمرہ میں اپنے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کی، مگر میرا دل اس میں نہ لگا۔ میں تو اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بنانے میں محو ہو گئی۔ شادی، برات، خاوند، سسرال وغیرہ متعدد مناظر میرے سامنے فلم کی مانند آ جا رہے تھے۔

باتیں جو آج جو باتیں مجھے بتائیں ان کو سن کر میری سمجھ میں آ گیا کہ ماں اور والد صاحب میری شادی کی اس قدر کیوں جلدی کر رہے ہیں۔ پنت اور اس کے گروہ پر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔

تقریباً آٹھ دن کے بعد پنت، بھیکم سیٹھ اور گنپت راؤ ستار دادا جی سے ملنے آئے۔ دوسری باتوں کے ساتھ پنت نے کہا "دادا جی منی کی شادی اس سال کر دیجئے۔"

"ہاں کرنا ہے تو پنت، مگر کوئی موزوں دولہا تو ملے۔" والد صاحب نے کہا۔

"دولہوں کی کیا کمی؟" پنت گنپت راؤ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"برتلاش کرنا پڑے گا۔" گنپت راؤ نے کہا۔

"دو جوان معلم ایک ہی اسکول میں ہیں، کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" سیٹھ نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔

"اس روز ہم نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ کہیں کی کسی شہزادی نے اپنے موٹر ڈرائیور سے ہی شادی کر لی ہے۔ کیوں پنت تمہیں یاد ہے نا؟" گنپت راؤ نے پنت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں!" پنت نے جواب دیا۔

"ہماری منی اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔" والد صاحب نے کہا۔

"ایسا نہ کہئے دادا جی۔ عورت کے کردار اور مرد کی تقدیر کا علم بھگوان کو بھی نہیں ہوتا۔" پنت نے کہا۔

"اور پھر آج کل لوگ بھی......" گنپت راؤ نے منہ کھینچا۔

"بدنام کرتے ہیں۔" سیٹھ نے لقمہ دیا۔

"دادا جی ہم لوگوں کے گاؤں کے آپ زمیندار ہیں، ہمارے بادشاہ ہیں۔ ہمیں آپ پر بڑا ناز ہے۔ ہم جب ایسی باتیں سنتے ہیں تو......"

"اس لئے ہماری التجا ہے کہ منی بیبی کی شادی جتنی جلد ہو سکے کروا لیجئے۔" سیٹھ جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سال جیسا کہ میں کر ہی لیں گے۔" والد صاحب نے وعدہ کیا۔

"خوب شان و شوکت کے ساتھ ہونا چاہئے دادا جی۔" ستار بولا۔

"پانچ گاؤں کے لوگوں کو لڈو کھلانا چاہئے سرکار۔" سیٹھ جی بولے۔

"ابھی کئی سال سے اس گھر میں کوئی تقریب ہی نہیں ہوئی ہے۔ اب موقع آیا ہے۔" پنت بولا۔

"ہاں ہاں سب ہو جائے گا۔ کیا میں تنہا یہ سب کچھ کر سکوں گا۔ تم سب لوگ مدد کرو گے تو یہ سب کام ٹھاٹ باٹ سے ہو جائے گا۔ تمہاری مدد تو ضروری ہے۔" والد صاحب نے کہا۔

"بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے دادا جی؟ ہم کیا کبھی آپ کے حکم کی عدولی کر سکتے ہیں؟" پنت نے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مگر پہلے سے ہی کہہ دینا بہتر ہے۔"

پھر ادھر ادھر کی کچھ بات چیت کے بعد چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ رخصت ہوئے۔

یہ سب باتیں بائیجا نے اپنی زبان میں مجھ سے اختصار کے ساتھ کہی تھیں۔ ماں کے آواز دینے پر وہ کسی کام کے لئے نیچے اتری۔

آج اتوار تھا اور اسکول کی چھٹی تھی۔ پچھلے دن میرے سب کام بڑی کاہلی سے ہوا کرتے تھے۔ اور اس روز مجھے اس کا پورا احساس ہو گیا کہ خواب کی دنیا کی نسبت بائیجا کی بتائی ہوئی حقیقت کی دنیا کتنی خوفناک ہے۔

اس روز ماں نے میرے لئے شریکھنڈ اور پوریاں پکائی تھیں۔ انہیں کھا کر میں حسب معمول سونے کے لئے لیٹ گئی لیکن آج مجھے نیند نہ آئی۔

لگنے میں مجھے دل نہیں لگا۔ قریب تین چار بجے میرا جی متلایا اور مجھے الٹی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈ کے ساتھ بخار آ گیا۔

گھر میں دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ وہاں کے پاس ہر شنکر جٹا شنکر کا ایک خط آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحب کو نیا اسکول دکھانے کے لئے کل ان کے ساتھ دھرم پور پہنچ رہے ہیں۔ یہی اطلاع دینے وہ فوراً ہمارے گھر آئے تھے۔ مگر ہمارے گھر آکر انہوں نے دیکھا کہ سب طرف دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ انہیں دیکھ کر گھبرا کر والد صاحب نے کہا ——

"ماسٹر صاحب! سانگلی جاکر ڈاکٹر سینی کو فوراً لے آیئے۔ منی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حسین کی کار لے جایئے اور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر جلد واپس آیئے۔ فرصت کیلئے یہ روپے رکھ لیجئے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر وہاں کو دیئے۔

جس کام کے لئے وہاں آئے تھے اسے کسی کو بتائے بغیر ہی وہ کار لیکر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے سانگلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کسی کا مریض کو دیکھنے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں دھرم پور پہنچنے میں بہت دیر لگی۔

میرا بخار بڑھ رہا تھا۔ آس پڑوس کے لوگ خیریت معلوم کرنے اور میری عیادت کے لئے آنے لگے تھے۔ ماں اور والد صاحب کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔ سب کی آنکھیں ڈاکٹر کا انتظار کر رہی تھیں۔ پنت اور اس کی چنڈال چوکڑی کے اراکین کو بھی میری علالت کا پتہ چلا اور انہوں نے میری الٹی اور بیماری کا کچھ اور ہی مطلب......

۵

دوسرے روز محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ساتھ لے کر ہر شنکر جٹا شنکر دھرم پور تشریف لائے۔ اسکول کی تنظیم اور وہاں کی صفائی دیکھ کر اور طلباء سے کئے گئے سوالوں کے اطمینان بخش جوابات پا کر وہ بڑے متاثر ہوئے۔ لڑکوں نے تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے کمروں میں جو چیزیں سجا کر رکھی تھیں اور اسکول کے سامنے جو باغیچہ لگایا تھا اس میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی سبزیاں دیکھ کر بھی وہ بڑے خوش ہوئے۔ مجھے وہاں کو بات بھی کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ سانگلی سے ڈاکٹر کو لے کر وہ بجے رات کو واپس آئے تھے۔ اس کے بعد وہ سوئے ہی نہیں —— ڈائرکٹر صاحب کے استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ راتوں رات انہوں نے لڑکوں کی مدد سے جھنڈیوں سے اسکول کی سادہ عمارت سجا دی تھی۔ گاؤں کی چند ممتاز ہستیوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا تھا جو ڈائرکٹر صاحب کے معائنہ کے وقت اسکول میں موجود تھے۔ معائنہ ہو جانے کے بعد ڈائرکٹر صاحب نے مدعو صاحبان اور لڑکوں کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں تھوڑے سے عرصہ میں اسکول نے جو ترقی کی تھی اس پر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور دونوں معلموں نیز گاؤں کے ان لوگوں کا جنہیں اسکول سے دلچسپی تھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا۔ ان نے امید ظاہر کی کہ دوسرے گاؤں والے بھی اگر دھرم پور کی تقلید کریں تو ہندوستان کی قسمت جلد جاگ جائے۔

میری طبیعت ناساز ہونے کے باعث میں اس روز اسکول نہ جا سکی تھی۔ مگر والد صاحب کا یہ معمول تھا کہ گاؤں میں آنے والے سرکاری افسر کو اپنے ہاں چائے پر ضرور مدعو کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ڈائرکٹر صاحب کو بھی اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا۔ طبیعت علیل ہونے کے باوجود میں ان سے اپنے گھر ملی تھی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے میری تعریف کی جس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

اپریل کا نصف مہینہ گذر گیا۔ اسکول کا کام باقاعدگی سے جاری تھا۔ میرا اور وہاں کا قرب بڑھتا جا رہا تھا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور ہمدردی کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو ایک دوسرے کے بغیر بمشکل دل لگتا تھا۔ دن میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اسلئے یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ دن کب ختم ہو گیا۔ مگر چھٹی کے دن چونکہ ایک دوسرے سے ملاقات ناممکن تھی اس لئے وہ دن بڑی مشکل سے کٹتا تھا۔

ادھر گھر میں شادی کی فضا تیار ہو رہی تھی۔ والدین اور پنت سبھی میرے لئے موزوں شوہر تلاش کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں والد صاحب پنت سے بھی مدد لیتے تھے۔ مئی کر لڑکے کو دیکھنے بھی وہی جایا کرتا تھا۔ والد صاحب کی بیٹھک میں آجکل گفتگو کا موضوع میری شادی کا ہی ہوتا تھا۔ ماں کے پاس بھی پڑوس کی عورتیں آتیں تو اسی پر بات چیت کرتیں۔ اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ہمارے سماج کے رسم و رواج کے تحت مجھے اس لڑکے کو اپنا شوہر بنا لینا پڑے گا جس کو میرے والدین نے میرے لئے پسند کر لیا ہے۔ اور میرے ہونے والے شوہر محترم اگر میرے مزاج کے

مطابق ہوتے تو ٹھیک ہے ورنہ۔ کہتے ہیں کہ لکشمی[1] اور سرسوتی[2] کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، کیا اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوگا؟ اگر میری سسرال کے لوگ جاہل ہوئے تو؟ اسی قسم کے خیالات میرے دماغ کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔

مجھے دیکھنے کے لئے سب سے پہلے جو صاحب تشریف لائے تھے وہ نوجوان تھے اور پولیس ٹریننگ اسکول سے پچھلے سال ہی پاس کرکے نکلے تھے۔ وہ کسی تحصیل میں حال ہی میں تھانیدار کے عہدے پر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ مرد اور چار پانچ عورتیں تھیں۔ رواج کے مطابق وہ مجھے دیکھنے کے لئے والد صاحب کے کمرے میں بیٹھے۔ میرے بیٹھنے کے لئے ایک پیڑھی رکھوا دی گئی تھی۔ چنانچہ میں جاکر اس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ گو میں ایک جاہل لڑکی کی طرح گردن نیچی کرکے نہیں بیٹھی تھی پھر بھی اس خیال سے کہ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں کچھ شرما ضرور گئی تھی۔

ان مہمانوں میں ایک بزرگ بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوالات کئے اور میں نے ان کے اطمینان بخش جوابات دیدئے۔ آج تک میں نے متعدد امتحانات دیئے تھے۔ میرے ممتحن مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہوا کرتے تھے مگر آج......

اس کے بعد لڑکے والوں میں سے ایک عورت نے ناریل، کیلے اور مصری سے میری گود بھری اور میں سب کو سلام کرکے اندر چلی گئی۔ گھر میں لڑکے کی طرف سے آئی ہوئی جو عورتیں بیٹھی تھیں انہوں نے بھی مجھ سے طرح طرح کے استفسارات کرکے مجھے پریشان کیا، مگر میں لاچار تھی۔ ایک نے پوچھا ــــ

"کیا تو کھانا پکا سکتی ہے؟"

"ہاں۔"

"بیٹی تجھے ماہواری کتنے سال سے ہو رہی ہے؟"

"یہی کوئی آٹھ دس سال سے۔"

"تب تو تیری عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی؟"

"ہاں۔"

قصہ مختصر یہ کہ اس لڑکے کے ساتھ شادی نہ ہو سکی۔ اول تو والد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کا داماد تھانیدار ہو۔ کیونکہ آج تک تھانیداروں کا جو تجربہ تھا وہ کچھ اچھا نہ تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکثر تھانیدار شرابی، بدکار اور رشوت خور ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس لڑکے کے بارے میں کافی تحقیقات بھی کی تھیں اور انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ محض نام کا ہی جینی ہے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کوئی پرہیز نہ کرتا تھا۔ اور......

جب والد صاحب نے ہی اس بر کو پسند نہیں کیا تو پھر دوسروں کی رائے کا سوال ہی نہیں اٹھا۔

اس روز میں نے ویاں کو ایک خط لکھ کر مطلع کر دیا تھا کہ آج مجھے اسکول پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ خوب ڈٹ کر چائے اور ناشتہ کھا کر مہمان لوگ "سوچیں گے" کہہ کر چلے گئے اور میں ان کی واپسی کے فوراً بعد ہی اسکول چلی گئی۔ ویاں کو ان کی آمد کی اطلاع تھی۔

"کیوں طے ہوا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی دلی دور ہے۔" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"یہ ہمارے یہاں شادی کا کیسا غلط قاعدہ ہے۔ کیا تم اس کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پسند نہ بھی ہو تو بھی چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہ اس غلط رسم کو توڑا جائے؟" ویاں نے کہا۔

"باتیں کرنا بہت آسان ہے، مگر اس خیال کو عملی جامہ پہنانا اتنا ہی مشکل۔" میں نے کہا۔

"جب تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھلا یہی کہنے لگیں تب تو کسی رسم کو توڑا یا بدلا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جب تک ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کی جاتی تب تک شادی کی رسوم میں بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سارے سماج کو تو سدھارنے میں کئی برس لگ جائیں گے تو کیا تب تک......؟"

"اور اگر اس میں تبدیلی کر دی گئی تو......؟" ویاں کا یہ فقرہ بھی میں نے ہی مکمل کیا۔

"تو پھر تکلیف، رنج و غم۔"

"تمہارا مطلب ہے زندگی ان رسومات کے بغیر بے کیف اور نا خوشگوار رہے گی؟"

۱۔ دولت کی دیوی۔ ۲۔ علم کی دیوی۔

اپریل کا مہینہ ختم ہو گیا۔ مئی کا مہینہ شروع ہوا تو گرمیوں کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ دو ماہ کی چھٹی میں مہرشی نے دیال کو تارہ پور بلا لیا۔ اس لئے اسکول بند کرکے وہ مجھ سے اور والد صاحب سے رخصت لینے کے لئے ہمارے گھر گئے۔ والد صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میں اپنے کمرہ میں تھی۔ ان کے آنے کے بعد والد صاحب نے مجھے بھی آواز دی ——— "شکتی!"

میں نیچے آئی۔ دیال نے والد صاحب کے قدم چھوئے اور چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار کرکے مجھ سے اور ان سے رخصت چاہی۔ میں نے بائیجا کو چائے لانے کے لئے کہا۔ دیال نے چائے پی۔ اسی اثنا میں وہ اندر جا کر ماں کے بھی قدم چھو آئے۔ تمام چھٹیاں وہ تارہ پور میں ہی گزارنے والے تھے۔ جب وہ جانے لگے تو والد صاحب نے کہا۔

"ماسٹر صاحب، ان چھٹیوں میں آپکی اسسٹنٹ کی شادی کر رہا ہوں۔ اگلے ہفتے ہو جائے تو ضرور تشریف لایئے گا۔ بھولیئے گا نہیں"۔

"ضرور حاضر ہوں گا" دیال نے وعدہ کیا اور ہنستے ہنستے میری طرف ایک نظر دیکھا، اور چل دیئے۔ لیکن .....

مجھے محسوس ہوا گویا میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں واپس آ گئی۔ اور شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میرا دل مجھ سے دریافت کر رہا تھا "کیوں اتنی ملول ہے تو؟ کیا اس لئے کہ لوگوں نے ایک افواہ اڑا دی۔ دیال سے تو محبت کرتی ہے؟ لیکن وہ خواہ کتنا ہی خوبصورت، ذہین اور قابل ہو مگر ہے تو اچھوت۔ اور تو بیٹی ہے۔ کیا تو اس سے شادی کرنے کی جرأت کرسکے گی؟ یہ تیرا ڈھونگ ہے۔ بیچارہ دیال! اس کو ابھی تیرے دل کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کے سر پر مہرشی، داداجی، اس کی ذات اور سماج میں ہونے والی بدنامی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ وہ غریب بے دست و پا ہے۔ وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرسکتا۔ تجھے اپنے راستہ پر چلنا ہوگا۔ اور اس کو اپنے۔ یہی تمہاری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد اگر تم ایک دوسرے سے ملے تو ......"

میری آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ بیساکھ کا مہینہ آ گیا تھا۔ اور اسی مہینہ میں میری شادی کرنے کا والد صاحب تہیہ کر چکے تھے۔ رشتے والوں کی یورش دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

فصل کے کٹ جانے کے بعد بوائی ہونے تک کاشتکار خالی رہتے ہیں۔ یہ وقت وہ کہیں جمع ہو کر گپ بازی میں گزار دیتے ہیں۔ کہیں آس پاس کے دیہات میں بھی اگر کسی کے ہاں شادی بیاہ ہو تو وہ ضرور شریک ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر میں مہمانوں کی یہ آمد و رفت دیکھ کر کئی گاؤں والے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمارے گھر آ جاتے اور چائے پانی کرکے اپنا دن خوشی خوشی بسر کر لیتے تھے۔

رشتے والوں کی آمد ہمارے ہاں کا معمول سا بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے مناسب و نامناسب سوالات کرتے اور مجھے مجبوراً انہیں جواب دینے پڑتے۔ پھر وہ سب چائے پانی اڑا کر "سوچیں گے" کہہ کر یہ جا وہ جا۔ کوئی جا کر جواب بھیج دیتا۔ والد صاحب استفسارات کرتے اور ....

آخر ماجرا ہی کیا ہے بتا ہی دیتی ہوں۔

تھانیدار کے بعد ایک وکیل صاحب بر کی حیثیت سے آئے۔ وہ بھی جوان تھے۔ حال ہی میں بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہوئے تھے۔ ابھی تک وکالت شروع نہیں کی تھی۔ دنیا کا کچھ خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ خود کو بہت ذہین اور چالاک جانتے تھے۔ رنگ سانولا تھا اور دنیا کو کن انکھیوں سے دیکھنے کے قائل تھے۔ مجھ سے شادی کرنے کی ان کی شرائط مختصراً یہ تھیں۔

خسر شادی طے کرے۔ بر اگر بیرسٹری پڑھنے ولایت جائے تو اس کا تمام صرفہ خسر ہی برداشت کرے۔ وکالت پاس کرنے کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو شادی کر دی جائے۔

والد صاحب نے یہ شرائط اسلئے نامنظور نہیں کیں کہ انہیں بیرسٹری کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا بلکہ اس لئے کہ اس کا مطالبہ عام رواج کے مطابق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ لڑکا کالا سا اور بد دماغ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔

ان وکیل صاحب کے بعد جو حضرت تشریف لائے وہ ڈاکٹر تھے۔ مگر والد صاحب کو ان کا خاندان پسند نہ تھا۔ لہٰذا وہ بھی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب میں نقص یہ تھا کہ ان کے باپ نے انٹرکاسٹ میرج کی تھی۔ یعنی باپ جینی تھا اور ماں مراٹھن۔

چوتھے صاحب جو آئے وہ ایک پروفیسر تھے۔ بظاہر وہ ٹھیک تھے اور ممکن تھا والد صاحب کو پسند بھی ہوتے مگر وہ عمر میں مجھ سے دو چار برس چھوٹے تھے۔ ویسے تھے ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ان کے والد کسی پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی پڑھائی بہت کمسنی میں ہی شروع کر دی تھی اور دن رات پڑھائی میں مشغول رہنے کے باعث ان کی صحت کی طرف بالکل توجہ نہ دی گئی تھی۔ اس لئے وہ دکھائی

دینے میں بالکل ناکام تھے۔ دبلے پتلے اور ناٹے۔ مجھ سے بھی قد میں کچھ نیچے ہی تھے اس لئے وہ بھی ناپسند ہو گئے۔

بالآخر والد صاحب کو ایک بر پسند آیا۔

یہ ایک بڑے کاشتکار کا گھرانا تھا۔ گھر میں بہت بڑی زمین تھی۔ بھینسیں اور بیل اس قدر کثیر تعداد میں تھے کہ ان کے لئے جگہ کم پڑتی تھی۔ گھر میں اتنے آدمی اور نوکر چاکر تھے کہ انہیں روز کھانے کا انتظام کرنے میں گھر کی عورتیں مصروف رہتی تھیں۔ پیسنے سے لے کر کپڑے دھونے تک سبھی کام گھر کی عورتیں ہی کرتی تھیں۔

گھر کے لوگ صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے اور خوب اناج پیدا کرتے تھے۔ بہت محنتی، جاہل اور مذہبی تھے۔ گھر کے چھوٹے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا لیکن ان کے والد تین چار جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکے تھے۔

لڑکے کی عمر تیس برس کی تھی۔ میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سارا کاروبار وہی سنبھالتے تھے۔ ماں باپ، چچا تایا تمام لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ حالانکہ کاشت وغیرہ میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ لیکن گھر کے کاروبار کے منیجر ہونے کی حیثیت سے دیگر کئی کام انہیں کو کرنے پڑتے تھے۔

سر پہ صافہ، جسم پر گرم کوٹ، ریشمی کرتا، سفید دھوتی اور اچھا سا خوبصورت چپل یہ ان کی پوشاک تھی۔ گھسے ہوئے دانتوں اور ہونٹوں کو دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ پان کھانے کی ان کو عادت ہے۔ ان کی کوٹ کی جیب بھی پھولی ہوئی [illegible] دیتی تھی۔ غالباً اس میں گلوریوں سے بھری ہوئی پان کی ڈبیا رکھی رہتی ہوگی۔

رنگ تو ان کا ٹھیک تھا۔ ناک، آنکھوں، چہرے اور جسم کی بناوٹ میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ تعلیم کے سلسلہ میں وہ چار پانچ برس کسی شہر میں رہ آئے تھے اس لئے خاص تعلیم نہ ہونے پر بھی شہری طور طریقوں اور وہاں کی رفتار سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں کمہار، دھوبی، بڑھئی، لوہار اور چمار وغیرہ کئی پیشے اور ذاتوں کے لوگ تھے جو انہیں گھیرے رہتے تھے۔

وہ بھی اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے چنانچہ اس بہانے مجھے ایک مرتبہ پھر حصہ لینا پڑا۔ چائے ناشتہ وغیرہ کے بعد مہمان رخصت ہو گئے۔

چند دن بعد ان کے گاؤں کے چند معزز لوگ ہمارے گاؤں آئے اور ان کا کاروبار دیکھ گئے۔ اسی طرح ان کے کچھ رشتہ دار بھی ہمارے گھر آئے اور ہماری زمینداری، مکان، آمدنی وغیرہ دیکھ گئے۔ والد صاحب نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ لڑکے کو گھر جوائی بنائیں گے۔ گھر جوائی ہونے کی حیثیت سے ساری زمینداری اور آمدنی لڑکے کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس امید پر ان لوگوں نے مجھے پسند کر لیا تھا اور جہیز میں والد صاحب سے صرف دس ہزار کا مطالبہ کیا تھا۔ غرض یہ کہ ان کی نظر ہماری زمینداری اور جہیز پر تھی۔ ایسی صورت میں اگر کوئی کالی اور بدشکل لڑکی بھی ہوتی تو وہ بھی انہیں پسند آ جاتی۔

ہماری طرف والوں نے لڑکے کی عمر اور اس کی آمدنی دیکھ کر اسے پسند کیا تھا۔ لڑکا زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن انہوں نے سوچا اس میں حرج بھی کیا ہے۔ لڑکی ایم اے بھی ہو تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے؟ آخر وہ ہے تو لڑکی ہی۔ کالج ختم ہونے کے بعد اسے کوئی ملازمت تھوڑی کرنی ہے۔ بس اسی قسم کی باتیں کر کے انہوں نے اس لڑکے سے میری شادی کی بات پکی کر لی۔

ایک روز دوپہر کو ماں اور والد صاحب ایک کمرہ میں بیٹھے ہوئے یونہی باتیں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ باتیں میری شادی سے متعلق ہی تھیں۔ اب وہ مجھ سے بھی رائے لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے بلایا۔

"منی!"

"آئی پتاجی!" یہ کہہ کر میں ان کے کمرے میں گئی اور انہیں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا کر رہی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ تو جانتی ہے کہ تیرے لئے کتنے بر آئے اور چلے گئے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص تھا یہ تجھے معلوم ہے۔ آجکل اچھے لڑکے ملنا بہت مشکل ہے۔ دانت ہیں تو چنے نہیں ہیں۔ اور چنے ہیں تو دانت نہیں ہیں بس یہی عالم ہے۔ اگر ہم اپنے والے لڑکوں سے کسی کو بھی پسند کر لیں تو لوگ اس کا کچھ اور ہی مطلب نکالیں گے اور ہمارے لئے زمانہ دوبھر ہو جائے گا۔ اور یہ بھی [illegible] کہ اس کے [illegible] دے۔ دراصل شادی میں عزت لڑکے والوں کی ہوتی ہے، لڑکی والوں کی نہیں۔ اس لئے آخر میں ہم نے سب کچھ سوچ بچار کر تیرے لئے جو بر پسند کیا ہے وہ تجھے کیسا پسند ہے؟ [illegible]

اس کی تعلیم ہی کافی ہے۔ اگر کم پڑھا لکھا ہے تو کیا حرج ہے؟ کمائی میں وہ اچھے پڑھے لکھوں سے بھی لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ہاں تو بتا اس لڑکے سے شادی کرنے کی تیری رضا ہے یا نہیں؟" والد صاحب نے پوچھا۔

"وہ اپنی قسم بدو لی تھوڑی ہی کرے گی؟ ہم لوگ اس کے دشمن تو ہیں نہیں۔ ہمیں جو پسند ہوگا وہی اس کو بھی پسند ہوگا۔ کیوں صحیح ہے نہ منی؟" ماں نے کہا۔

"جی ہاں، بجا ہے" میں نے جواب دیا۔

اسوقت کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے اثبات میں جواب دینا پڑا۔ میں نے اپنی بیتی ہوئی عمر کو دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے والدین کے لئے ایک بوجھ بنتی جا رہی ہوں۔ مجھے گاؤں والے بدنام کر رہے تھے۔ تعلیم یافتہ لڑکوں کے ماں باپ کے مطالبات دیال اور میرے درمیان رخنہ ڈالنے والے ذات پات کے خیالات وغیرہ پر غور کر کے میں نے ہاں کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی تیار تھی کہ جو کچھ ہو دیکھا جائے گا۔ میری رائے معلوم کر کے میرے والدین بہت خوش ہوئے۔

چند روز بعد لڑکے والے کچھ لوگ شادی کے متعلق باتیں پکی کرنے کے لئے ہمارے گھر آئے۔ پتا جی نے ان کے سب مطالبات منظور کر لئے۔ ان کے مطالبات کے مطابق برات لانے کے لئے سو بیل گاڑیاں، دس موٹریں اور دولہا راجہ کے لئے ایک اسپیشل ٹورنگ کار کا بندوبست کرنا تھا۔ میرے سے اسپیشل بینڈ اور کولہا پور سے ہاتھی بلانا تھا۔ شادی کا یہ سارا صرفہ دادا جی کو ہی کرنا تھا۔ اوپر سے دس ہزار روپیہ نقد جہیز میں دینا اور "کنیا دان" کرنا تھا۔ میرے آرام کے لئے دادا جی نے یہ سب قربانیاں دینا قبول کر لیا تھا۔ بمبئی کی پچیس تاریخ شادی کے لئے متعین ہو گئی۔ لیکن...

کیا میں خوش تھی کہ میری شادی ہو رہی ہے؟ میں، میرا حسن، میری تعلیم اور میری آزادی کو کیا اس رسمی شادی میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل ہو رہی تھی؟ کیا میری تمنائیں اور میرے ارمان نہیں کچلے جا رہے تھے؟ مگر میں کر ہی کیا! میری آئندہ زندگی میں مجھ پر کون کون سی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ کن کن الجھنوں کا مجھے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ سب اندیشے مجھے پریشان کئے دے رہے تھے۔

اسکول کی چھٹیاں ہو جانے کے بعد تقریباً دس دن تک میں گھر سے باہر بھی نہ نکل پائی تھی۔ میری شادی کی خبر سارے گاؤں میں بجلی کی طرح پھیل گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر راہ چلنے والی عورتیں آپس میں کانا پھوسی کرنے لگتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے چندرا مالن کو دیکھا۔ میں نے سوچا اب وہ گاؤں میں افواہیں اڑاتی ہوگی۔ یہی کہتی ہوگی — لے ہو گئی شادی! اچھا ہوا نجات ملی اس چھوکری سے......

شادی کی خبر سب کے لئے باعث خوشی ثابت ہوئی۔ سبھی اس خیال سے مسرور تھے کہ میری شادی سے ان کے کھانے پینے کا موقع مل جائے گا۔

دعوت نامے چھپ چکے تھے۔ ایک دعوت نامہ اور اس کے ساتھ ایک طویل خط میں نے دیال کو بھی بھیج دیا۔ خط میں میں نے اپنے ہونے والے شوہر اور سسرال کے بارے میں سب کچھ سچ سچ لکھ دیا۔ مگر ساتھ ہی ان کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ بس ان سے شادی میں شریک ہونے کی درخواست کی تھی۔ تین روز بعد ان کا جواب موصول ہوا۔

خط میں انہوں نے دعوت کے شکریہ کے بعد لکھا تھا کہ میں اپنی ولایت جانے کی تیاری میں ہوں۔ شادی میں شریک نہ ہونے کی معذرت چاہتا ہوں اور شادی کے مبارک موقع پر ایک چاندی کی ڈبیا انہوں نے تحفتاً ارسال کی تھی۔ خط پڑھ کر ان کے دستخط دیکھے تو میری نظر کے سامنے دیال کا مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا......

میری آنکھوں سے آنسو اس خط پر گر پڑے اور ان کے دستخط کچھ پھیل گئے۔

شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ دادا جی نے سارے گاؤں کو شادی میں مدعو کیا تھا۔ گاؤں کے تمام مندروں میں پوجا ہو رہی تھی۔ سارے مندر، مکان اور دوکانیں سجائی گئی تھیں۔ گاؤں میں ہر طرف شہنائی ہو رہی تھی۔ لوگ خوش تھے اور سارا گاؤں خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آج برات آنے والی تھی، اس لئے گاؤں کے مرد عورتیں اور بچے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس گاؤں کی سرحد پر برات کے خیر مقدم کے لئے شام سے پہلے جمع ہونے لگے تھے۔

رات کے آٹھ بجے بیتا سیٹھ کے چوکیدار نے سائیکل سے آکر خبر دی کہ برات آ رہی ہے اور بیل گاڑیاں گاؤں کے بہت قریب آ گئی ہیں۔

دیکھتے دیکھتے رات کے دس بج گئے۔ برات کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ دادا جی نے ایک آدمی کو پھر سائیکل پر دوڑایا۔ وہ آدھے گھنٹے میں واپس آیا اور اس نے کہا — "برات آ گئی ہے"

بیل گاڑیوں میں جو براتی آئے تھے ان کی تعداد تقریباً آٹھ سو تھی۔

گیارہ بجے کے قریب موٹریں بھی آگئیں ان میں بھی کوئی تین سو سے کم آدمی نہ ہوں گے۔ اور ابھی تو دولہا کی ٹورنگ کار پیچھے ہی تھی۔ لڑکے والوں میں سے چند ذمہ دار اشخاص نے رات ڈھلتے دیکھ کر دادا جی کو پیغام بھجوایا کہ وہ بڑھیں۔ دولہا کی کار بھی آتی ہی ہوگی۔ یہ پیغام سن کر دادا جی گاؤں کے بڑے بڑے لوگوں کو لے کر برات کے استقبال کے لئے گاؤں کی سرحد کی جانب چل پڑے۔

آگے آگے میرٹھ کا مشہور بینڈ بج رہا تھا۔ شہنائیوں کے شور میں سنائی دے رہے تھے۔ ہر طرف آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ دولہا کو لانے کے لئے جلوس کے درمیان میں سجا ہوا ہاتھی چل رہا تھا۔ تین سو گیسوں کی روشنی چاندنی کی مانند پھیل گئی تھی۔

ابھی تک دولہا کا پتہ نہ تھا۔ آئے ہوئے براتی اور لڑکے والے اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ دولہا کے آنے کے پہلے دوسرے لوگ گاؤں میں کیسے جا سکتے تھے اور اس طرح ٹھہرتے بھی کب تک۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

بالآخر بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد والد صاحب نے کچھ لوگوں کو خبر کو لانے کے لئے اس کے گاؤں کی جانب موٹر میں روانہ کیا۔ رات کا ایک بجا چاہتا تھا اور دولہا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی تلاش میں گئی ہوئی موٹر بھی واپس نہ آئی تھی۔ لوگ اکتا گئے۔ آخرکار لوگ تھک ہار کر گھروں کو واپس جانے لگے اور دولہا کو قصوروار ٹھہرا کر کہتے گئے ـــ عجیب آدمی ہے، وقت کا اسے کوئی خیال ہی نہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا ـــ کیا دولہا میاں شادی سے پہلے ہی روٹھ گئے!

اور ادھر اس قسم کی غیر متوقع تاخیر کی وجہ سے والد صاحب کی طبیعت مکدر سی ہو رہی تھی۔ بھائی بار بار یہی کہہ کر دلاسا دیتے کہ بس اب کار آتی ہی ہوگی۔ لڑکی والوں نے براتیوں سے کہا۔

"دولہا کو پیچھے چھوڑ کر آپ لوگ کیسے بڑھ آئے؟"

دو بج گئے۔ سب پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح کب تک جاگتے رہیں گے۔ ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دولہا کی تلاش میں بھیجی گئی موٹر واپس آگئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے بڑی افسردگی سے لکنت بھرے لہجے میں کہا ـــ "ٹورنگ کار راستہ میں الٹ گئی۔ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ دولہا کو میرٹھ کے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔"

ہو چکا۔ سب کے چہرے مرجھا گئے۔ آئے ہوئے براتی انہیں موٹروں اور بیل گاڑیوں میں مغموم و ملول چہرہ لئے ہوئے اپنے گاؤں کی جانب لوٹ گئے۔ دادا جی پر بجلی گر پڑی۔ شادی میں ایسے ناگہاں حادثہ کی خبر سن کر وہ دھم سے نیچے بیٹھ گئے۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ اور میں جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹاری پر کھڑی ہوئی اپنے ہونے والے شوہر کو چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی، یہ خبر سن کر بیہوش ہو گئی۔

۶

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نیکی کی نسبت بدی کی طرف جلد رجوع کرتا ہے۔ اچھی باتیں اتنی سرعت سے لوگوں تک نہیں پہنچتی ہیں جتنی کہ بری افواہیں۔ میری شادی کے رکنے، برات کے واپس چلے جانے اور دولہا کے حادثہ کے شکار ہونے کی خبر آگ کی طرح ایک لحظہ میں سب طرف پھیل گئی۔ قرب و جوار کے گاؤں میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ اخبار والوں نے بھی اس خبر کو عجیب عجیب عنوانوں اور سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

دادا جی نے آج تک عوام کی جو خدمت کی تھی، جو نام اور شہرت انہیں ملی تھی وہ سب ذرا سی دیر میں دھول میں مل گئی۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا لیکن وہ ایسے کمزور دل کے نہ تھے۔ اس حادثہ سے وہ ذرا نہ گھبرائے اور اس خبر کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ایک اسپیشل کار میں گاؤں کے دو اشخاص کو لے کر تر کو دیکھنے میرٹھ کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے گھر جو مہمان آئے تھے اور بینڈ، ہاتھی وغیرہ کو رکنے کا حکم انہوں نے دے دیا تھا۔ چنانچہ سب ٹھہرے رہے۔

چلتے چلتے تو وہ میرٹھ کے ہسپتال میں پہنچے۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس دن کے حادثہ کا کوئی بھی کیس ہسپتال میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اب وہ تاڑ گئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حادثہ کی بات بالکل جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے۔ لڑکے والوں نے یا لڑکے نے خود ہی یہ دھوکا دیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ذرا ہراساں نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی کار تر کے گاؤں کی طرف بڑھا دی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بے خوف و خطر تر کے مکان کے اندر چلے گئے اس طرح جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں۔

ہونے والا داماد اندر ایک کمرے میں دری پر تکئے سے ٹیک کر بیٹھا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا ایش ٹرے رکھا تھا جس میں بیڑیوں اور ماچس کی تیلیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ دوسری طرف ایک پاندان رکھا تھا۔ اس کے ارد گرد اس کے دوست احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ براتی بھی جو ابھی آئے

چکے وہیں بیٹھے تھے۔ دولہا سب کو تسلی دے رہے تھے اور صورت حال سمجھا رہے تھے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے بیڑیوں کے کش کھینچ رہے تھے۔ کوئی پان، تمباکو کھا کر باہر صحن میں پیک تھوک

دادا جی کو دیکھتے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے نرکو اور موجودہ حضرات کو سلام کیا اور نیر کے قریب جاکر ان کا برابری والے لوگوں کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے دولہا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ آئے کیوں نہیں؟"

ہونے والے داماد نے ہنس کر کہا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے کچھ دیر سے روانہ ہوا تھا۔ آپ کے گاؤں کے نزدیک ہم لوگ پہنچا ہی چاہتے تھے کہ اچانک میرے دل میں زبردست تکلیف ہوئی۔ ایسی کہ میں کچھ بول بھی نہ سکا۔ وہ تو یہ کہیئے کہ خوش قسمتی سے میرے چند احباب ساتھ تھے ورنہ شاید وہیں ختم ہو جاتا کیونکہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ لوگ مجھے میرٹھ کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ وہاں مجھے دس انجکشن دیئے گئے تب جاکر کہیں میری جان بچی۔ ہم لوگ ابھی بیس منٹ پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ میرے دوستوں نے آپ کو خبر تو پہنچا دی تھی نہ؟"

"اچھا اب تو آپ کی طبیعت ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ہمارا سب انتظام تیار ہے۔ آپ ابھی چلیں سب ٹھیک ہو جائے گا" دادا جی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کے لئے کہا ہے" انہوں نے عذر پیش کیا۔

"ہم آپ کو پھولوں کی طرح لے چلیں گے۔ تب تو کوئی حرج نہیں" دادا جی نے پھر درخواست کی۔

"جی نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا" داماد کے لہجے میں یقین تھا۔

اس کے بعد والد صاحب نے نیر کے اور دیگر اعزا سے استدعا کی کہ اس خوشگوار موقع کو اس طرح ناشگفتہ اور بدمزہ نہ کریں۔ اور ان سے دولہا کو منانے کی التجا کی مگر سب بیکار رہا۔ سب نے لڑکے کی طرف انگلی اٹھا دی۔

اس کے پہلے والد صاحب نے زندگی میں کبھی کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ تم کی شادی کا نازک معاملہ تھا۔ بیچارے کرتے بھی کیا۔ انہوں نے کہا۔

"اگر اس صورت پر نہیں تو اگلے کسی موقع پر سہی" اس سوال کے ذریعے وہ لڑکے والوں کے دل کی تھاہ لینا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے یہ تجویز بھی رد کر دی۔ نیر نے بھی کہا ـــ اب تو ہمیں معاف ہی کر دیجئے دادا جی۔ ہم مجبور ہیں۔"

دوسروں نے بھی ایسی بے رخی سے جواب دیئے۔ دادا جی عجیب کشمکش و پیچ میں تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ ایک مرتبہ شادی طے ہو جانے کے بعد اس کے منقطع ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ بالآخر انہوں نے ایک ترکیب سوچی۔

نیر کے ایک دوست کو انہوں نے آہستہ سے اپنے پاس بلایا۔ اسے بھیا، دادا سے مخاطب کیا اور اس سے سچی سچی باتیں نکلوا لیں۔ دوست نے کہا۔

"لڑکے کے دل میں نہ کوئی درد ہوا نہ ہم کسی ڈاکٹر کے ہاں گئے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ کی بدنامی سے بچنے کے لئے ہم نے یہ خبر اڑا دی تھی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ ہم لوگ کار سے آپ کے گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ آپ کے گاؤں سے دو میل دور ایک بس اسٹاپ ہے۔ وہاں ہم نے اپنی کار تھوڑی دیر کے لئے روک دی اور ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے۔ ہوٹل ایک عورت کا ہے۔ ہم لوگ چائے اور کچھ کھانے کی چیزوں کا آرڈر دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کے پاس ایک نوجوان بیوہ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ان میں آپس میں بہت بے تکلفی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ اسی وقت بیوہ بولی ـــ "شادی کیلئے جا رہے ہیں آپ لوگ؟"

"ہاں" ہم میں سے ایک نے کہا۔

"مہمان ہیں آپ؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں ہم لوگ براتی ہیں۔ یہ دولہا ہیں" میں نے نیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اوہ! یہ بات ہے" اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں ذرا دیر ہو گئی ہے، دوسرے لوگ آگے چلے گئے ہیں" ہم میں سے کسی اور نے کہا۔

"کیا آپ کو کوئی اچھی لڑکی نہیں ملی؟ معاف کیجئے گا آپ لوگ بھلے تو معلوم ہوتے ہیں اس لئے دریافت کر رہی ہوں" اس بیوہ نے کہا۔

"یعنی تمہارا مطلب کیا ہے؟" ہم میں سے ایک نے پوچھا اور ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"اب سمجھنے سے کیا فائدہ آپ کی شادی تو پہلے ہو چکی ہے۔ جاؤ اور شادی کر لو۔ اب بھلا اس ضد سے حاصل بھی کیا؟" اس نے کہا۔

"نہیں نہیں، جو سچی بات ہے اُسے تو کہہ ڈالو۔ ابھی تو بھانڈا پھوٹنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اجی بابو صاحب، کیا دادا جی کبھی تمہیں دس ہزار روپے جہیز میں دیتے۔ مگر کیا کریں بیچارے۔ بیٹی پھنس گئی تھی اسکول کے اچھوت ماسٹر سے۔ اور......" اس نے اپنی زبان چبائی۔

"سچ کہتی ہو؟" دولہا نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے سر کی قسم! بالکل سچ ہے۔ جھوٹ بولنے سے مجھے کیا فائدہ؟" اس نے اپنے سر کو ہاتھ لگا کر کہا۔

بس ہو گیا۔ دولہا بدک گیا اور انہوں نے موٹر اپنے گھر کی طرف لوٹا دی۔ ہم نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ بڑا ہیکڑ باز ہے۔ اب وہ آپ کی بیٹی سے ہرگز شادی نہ کرے گا۔ چنانچہ میرا تو یہی خیال ہے کہ اب اس مسئلہ کو مزید طول دیئے بغیر آپ خاموشی سے واپس چلے جائیے۔ اس سے کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔"

یہ سب قصہ سنا کر وہ دوست پھر اپنے ساتھیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔

دادا جی نے ایک لمبی آہ سرد بھری۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر انہوں نے انہیں منانے کی ناکام کوشش کی اور موٹر وہیں پور کو روانہ ہو گئی۔

اس خبر کو سن کر بتا جی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کے ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ دوسرا بر فوراً تلاش کر کے شادی کر دی جائے۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئے۔ انکا خیال تھا کہ دوسرا اچھا بر فوراً ملنا بہت محال ہے بلکہ ملنا ناممکن ہے۔ کسی سے بھی اس کی شادی کر دینے کی بجائے وہ مجھے لڑکا سمجھ کر گھر میں ہی رکھنا بہتر سمجھتے تھے۔ آخر میرے لئے اس کے علاوہ ہے بھی کون؟ دوسرے یہ کہ اتنی عجلت کرنے سے لوگوں کو بیکار کا شبہ ہو جائے گا۔

مگر آکر جس سے جو کچھ طے ہوا تھا ادا کر کے چکتا کر دیا۔ ہاتھی اور بینڈ والے سب چلے گئے۔ سارے گاؤں کی دعوت کے لئے جو لڈو تیار ہوئے تھے وہ غریب غرباء کو تقسیم کر دیئے گئے۔

شادی کا یہ گرشنڈ ریہرسل ہو گیا۔

"مجھے بچا لیا، دولہا دل کا بہت نیک ہے، اس لئے وہ واپس چلا گیا۔ قسمت اچھی ہے ہماری ورنہ شادی کے بعد اگر یہ راز فاش ہوتا تو ہم

کیا کر سکتے تھے؟ بھگوان نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔" بتا جی نے سب سے یہی کہنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو اس کو مان لیتے تھے لیکن کچھ ذلیل لوگ اسے بھی دادا جی کی چالبازی سمجھتے تھے۔ شادی کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بتا جی کا کافی مرض ہوا۔ صرف جہیز کی رقم ہاتھ سے نہ نکلی تھی۔ مگر انہوں نے کسی سے اس بات کی شکایت نہ کی تھی۔ انہیں تو صرف یہی ایک فکر کھائے جاتی تھی کہ وہ جھوٹی افواہ اڑانے والی رنگیلی جوان بیوہ کون ہو گی؟ اگر کھلے طور پر اس کی جانچ کرتے ہیں تو بھی آفت اور نہیں کرتے تو بھی مشکل۔ بس اسی پس و پیش میں وہ پڑے ہوئے تھے۔

مجھ سے اور ماں سے بھی والد صاحب نے یہی کہا تھا جو وہ اور لوگوں سے کہہ رہے تھے "ہماری تو تقدیر اچھی تھی جو ہماری منی بچ گئی۔ ورنہ اگر اس دل کے مریض کے پیچھے بندھ گئی ہوتی تو؟ اس کی زندگی کا کیا اعتبار؟" اس طرح وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر سب طرف پروپیگنڈہ تو کر رہے تھے، مگر دل ہی دل میں وہ گھلتے جا رہے تھے۔ میں اور ماں دونوں مشوش تھے۔ تمام گھر میں افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تینوں پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ میں کسی مزدوری کام سے نیچے آجایا کرتی تھی۔ ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی تھی۔ بابیجا، دولو اور ہماری ہمسایہ آکر میرے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتیں اور دادا جی کو بھی دم دلاسا دیتی تھیں۔

چار پانچ روز کے بعد ایک دن بتا جی اور ماں دونوں میرے کمرے میں آئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے شادی کے منقطع ہو جانے کا اصل سبب مجھے بتا دیا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میں نے درمیان ہی میں انکی بات کاٹ کر کہا۔

"وہ رنگیلی، نوجوان بیوہ ہمارے گاؤں کی چندرا مالن ہی ہو گی۔ بتا جی اس گاؤں میں دیوی دیوتاؤں کا سا لباس پہن کر دیو لوگ اور چڑیلیں بستی ہیں۔ جانتے ہیں آپ؟"

"تو مجھے سکھا رہی ہے۔ میں نے اس گاؤں کی زمینداری کرتے ہوئے اپنے بال سفید کئے ہیں۔" دادا جی نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ نے ان بدمعاشوں کو کیوں چھوٹ دے رکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس جھگڑے میں پڑ کر کہیں گاؤں میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔" [illegible]

"لیکن [illegible]"

"رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ ہونے دو میرا نقصان۔ ایک بار تیری شادی کر دوں پھر دیکھتا ہوں ان لوگوں کو۔" انہوں نے کچھ چڑھ کر کہا۔ ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میری شادی! اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر میں نے سنجیدگی سے غور کیا ہے چچا جی۔ آپ بھی اپنے سماج سے اب اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ خود کو مہذب کہنے والے کتنے جاہل اور گنوار ہوتے ہیں۔ اور دولت کے بل پر ناچنے والے گنوار کتنے بے وقوف ہوتے ہیں۔ گاؤں کی ایک طوائف کی بات پر یقین کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز کئے بغیر وہ لڑکا شادی کے لئے آتا ہوا بھی واپس چلا گیا۔ کیا معنی ہیں اس بات کے؟ میں تو اس لئے اس نادیا خیال سے بیاہی جانے کو راضی ہو گئی تھی کہ آپ دونوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اور اب جبکہ یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے تو میرے خیال میں تو بہت عمدہ ہوا ہے۔ اس سے میری زندگی میں آنے والے مصائب ٹل گئے۔ نہ معلوم میرے ساتھ سسرال میں کیا سلوک ہوتا۔ میری ہر بات معیوب سمجھی جاتی اور میری ہر نقل و حرکت پر وہ لوگ اعتراض کیا کرتے۔ اب تو آپ میری شادی کا خیال ہی ترک کر دیجئے۔ میں خود اپنا بیاہ رچا لوں گی، ورنہ کنواری ہی رہوں گی۔ جی چاہا تو پجارن ہو جاؤں گی ورنہ تا زیست استانی بنی رہوں گی۔

"چچا جی آپ کے قدموں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرا اور دیال کا تعلق بالکل پاک صاف ہے۔ گاؤں کی چنڈال چوکڑی نے یہ ہنگامہ کھڑا کر کے میری زندگی سے کھلواڑ کی ہے۔ وہ ذلیل لوگ کیا جانیں کہ یہ آپ کے لئے کس قدر مہلک ثابت ہوا ہے۔ ہجوم کا دل ہلکا ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ سنتا ہے اسے فوراً قبول کر لیتا ہے۔ اس میں نیک و بد کی تمیز کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ واقعہ رونما ہوا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اب آپ اس معاملہ کو مزید الجھانے کی کوشش نہ کریں۔" میرے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ میری پلکیں بھیگ گئی تھیں اور آواز درمیان میں بھرا جاتی تھی۔

"کیوں اتنی تعلیم دی تھی ہم نے؟ اگر بچپن ہی میں اس کی شادی کر دیتے تو بہتر تھا۔" ماں نے والد صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ تو قسمت کا لکھا ہے پوچھو۔" انہوں نے جواب دیا۔

میں نے کہا "آپ سچ کہتی ہیں ماں۔ ہمارے سماج میں لڑکے جتنے تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں اتنے ابھی تک نہیں ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکیاں زیادہ پڑھ لیں گی تو یہی حشر ہوگا۔"

"خیر جب تک تیری شادی نہ ہو جائے تب تک تو اگر اسکول میں نہ جائے تو کیا حرج ہے۔" والد صاحب نے مجھے مشورہ دیا۔

"کیا حرج ہے؟ لوگوں کا شبہ اور بڑھے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم جو کہتے تھے وہ سچ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عام جلسہ میں استانی کا کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اب اس کا کیا ہوگا؟ مہرشی جٹا شنکر کا ہم پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو سچ کہتی ہے تو۔" چچا جی بولے۔

اسی وقت دیوار پر ٹنگے ٹائم پیس نے کر کر ٹن کر کے رات کے دو بجائے۔

"چلو اب سو جائیں۔ رات بہت جا چکی ہے۔" ماں نے کہا۔

"ہاں ہو تو گئی۔" یہ کہتے ہوئے چچا جی بھی اٹھے۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ اب تک جو واقعات ہو چکے تھے سب کے سب فلم کی طرح میرے دماغ میں آنے لگے۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اگر شادی کروں گی تو دیال ہی سے کروں گی۔ اس فیصلہ میں دیال سے محبت کے ساتھ ہی گاؤں والوں سے انتقام کا جذبہ بھی مضمر تھا۔ سماج اور گاؤں والوں نے میرا اب تک جو نقصان کیا تھا اس سے زیادہ وہ اب کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح میرا اور دیال کا رشتہ بھی جوڑ ہی دیا تھا۔ پھر اب کس بات کا ڈر تھا۔ مگر کیا دیال یہ اقدام کر سکیں گے؟

ہاں میں یہی کروں گی۔ وہ تعلیم کے لئے ولایت جلد ہی جا رہے ہیں۔ ان کے وہاں پہنچنے پر میں بھی کسی مضمون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلی جاؤں گی۔ وہاں ہم دونوں ساتھ رہیں گے اور کورس پورا ہونے پر شادی کر لیں گے۔ اگر جی چاہا تو ہندوستان واپس آئیں گے ورنہ وہیں رہنے لگیں گے۔ وہاں ہمارے تعلقات پر نکتہ چینی کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔

لیکن ابھی دیال سے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہئے۔ ولایت ہی میں اگر یہ باتیں ہوں تو اچھا ہے۔ اگر کسی وجہ سے میں وہاں نہ جا سکی تو اس کے بارے میں بعد میں غور کر لیا جائے گا۔ مگر میرے لئے ولایت جانا ناممکن کیوں ہے؟ صرف ایک ہی تو بات ہے کہ ماں باپ میری جدائی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر میری شادی ہو جاتی تو کیا مجھے سسرال نہ جانا پڑتا؟ بس یہی بات ہے جس سے وہ دونوں راضی کئے جا سکتے ہیں۔

اور اسی قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی میں صبح کے وقت نہ جانے کب سو گئی۔

جولائی کا مہینہ آ گیا۔ اسکول کے کھلنے کے پہلے ہی دیال دھرم پور آ گئے۔ میری شادی کے ٹوٹنے کی خبر وہ اخباروں میں پڑھ ہی چکے تھے۔ اس لئے دھرم پور آتے ہی انہوں نے مجھے تسلی و تشفی دی۔ ہمارے اسکول کا کام باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ اب میں حسب معمول اسکول جانے لگی تھی۔

ایک دن میں نے ان سے کہا۔

"میں بھی انگلستان جا رہی ہوں"

"سچ؟"

"ہاں"

"تو میرے ساتھ ہی چلو نہ"

"نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ آپ وہاں پہنچ جایئے اور وہاں سے کسی کورس کے بارے میں تفصیل سے مجھے لکھئے، تب میں آؤں گی"

"ٹھیک ہے، یہی سہی" دیال نے کہا۔

"گزرے ہوئے واقعات کو بھلا دینے کی مجھے ایک ہی ترکیب سجھائی دے رہی ہے۔ آپ کو پسند ہے یہ خیال؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں خیال تو ٹھیک ہے" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات ہے جس طرح آپ کی بدولت میری شادی ٹوٹ گئی اسی طرح آپ کی وجہ سے کہیں میرا ولایت جانا نہ رک جائے" میں نے کہا

"کیا کہا؟ میری وجہ سے تمہاری شادی ٹوٹ گئی" دیال نے حیرت سے پوچھا۔

"لوگوں نے ہم دونوں کا رشتہ جوڑ دیا" میں نے کہا۔

"وہ لوگ کتنے ذلیل ہیں۔ انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ تم کس قدر پاکیزہ جذبات کے ساتھ اسکول میں کام کرتی ہو۔ اچھا تو میں کل ولایت چلا جاتا ہوں تاکہ ان کا منہ بند ہو جائے۔ دراصل دقت یہ ہے کہ ابھی تک پورے خرچ کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ اور جب تک وہ نہیں ہو جاتا مجھے یہیں رکنا پڑے گا۔ تمہارا باہر جانے کا خیال بہت مستحسن ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔ میں وہاں پہنچتے ہی تمہارے لئے جو مناسب مضمون ہو گا اس کے کورس وغیرہ میں تمہیں ارسال کر دوں گا"

دیال نے بے چارگی سے کہا۔

"دیکھوں آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور

ہم اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ دن بھر لڑکوں کو پڑھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر اپنا کام مکمل کر کے جب سب گھر کو واپس جاتے ہیں تو کچھ ہلکا پن محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اسی خیال میں منہمک چلی جا رہی تھی کہ ایک لڑکے نے آ کر کہا۔

"آپ کو ماسٹر بلا رہے ہیں" اور میں اس کے ساتھ ہو لی۔

دیال [illegible] کو پڑھا کر ابھی لوٹے تھے۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہئے کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں ایک گزارش ہے منی جی" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے پہلے ایک درخواست میری ہے" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"آج سے آپ مجھے منی نہ کہا کریں۔ میرا نام کمل ہے۔ مجھے اسی نام سے پکار لیجئے"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی یوں"

"بہت بہتر" اور یہ کہہ کر وہ ہنس دیئے۔

"آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"ہاں سچ بلایا کیوں تھا میں نے؟" پھر سر کھجا کر وہ یاد کرنے لگے۔

اسی وقت ڈاکخانہ سے تار لے کر چپراسی آیا "تار ہے صاحب" اس نے کہا۔

"کس کا تار؟" دیال نے پوچھا۔

"آپ کا" اس نے جواب دیا۔

دیال نے دستخط کئے اور تار وصول کیا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہم چلے انگلینڈ دسہرے پر۔ جہاز میں سیٹ مل گئی ہے تمام خرچ جٹا شنکر کا ہے۔ اب ضروری کپڑے بنوانے اور کچھ سامان وغیرہ خریدنے کے لئے مجھے ایک مرتبہ بمبئی جانا پڑے گا" انہوں نے کہا۔

"مبارک ہو"

"شکریہ"

اسی وقت ایک لڑکا دوڑتا ہوا وہاں آیا۔ اس نے دیال کو اشارے سے بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ میں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہری۔

"تو میں چلتی ہوں۔ میں نے اس سے رخصت لینا چاہی۔

"جائیے، کل ذرا جلدی آجائیے گا۔"

"بہت بہتر۔ آج آپ انگلستان جانے کے خواب دیکھئے" یہ اور میں وہاں سے چل دی۔ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا تو دیال کی نگاہیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔

۷

بدمعاشوں اور مفسدوں کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ ان کی اصلاح کرنے کی اگر کوشش کی جائے تو انسان خود بیوقوف بن سکتا ہے۔ یا اس کا نتیجہ خلاف امید برعکس بھی نکل سکتا ہے اور وہی لوگ ناقابل اصلاح بھی بن سکتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں پنت اور اس کا گروہ کئی برس سے رہ رہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ اس عرصہ میں کیا تھا اسے دہرانا بیکار ہے۔ مگر ان کی بداعمالیوں کو روکنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہ کرتا تھا۔ داداجی نے بھی کسی نہ کسی وجہ سے اس کی طرف سے بے توجہی برتی تھی۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ اس گروہ نے میری شادی کا رشتہ منقطع کرا دیا ہے تو اس طرف انہوں نے رجوع کیا۔ بظاہر تو ان کے پنت کی طرف سے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن درپردہ وہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اور کسی موزوں گھڑی کے منتظر تھے۔ جب دل میں انتقام کی آگ کا دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ بیتاب ہو کر قبل از وقت ہی اپنا وجود ظاہر کر دیتی ہے۔ والد صاحب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

والد صاحب نے گاؤں کے کچھ لوگوں کے سامنے واضح طور پر یہ الزام لگایا کہ میری شادی میں رخنہ چندرا نے ہی ڈالا ہے۔ اور صرف الزام لگا کر ہی وہ خاموش نہیں ہو گئے، بلکہ انہوں نے کچھ کھلا برا بھی پنت اور اس کے گروہ والوں کو کہا۔ اس کی خبر پنت اور چندرا کو لگی۔ پھر کیا کہنا تھا۔ والد صاحب نے ناگ اور ناگن کے بل میں صرف ہاتھ ہی ڈالا تھا کہ اس سانپ کی جوڑی نے ہمیشہ کے لئے انہیں اپنا دشمن بنا لیا۔

آج تک داداجی نے پنت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ اور

ادھر پنت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ داداجی اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہیں اور وہ انہیں حسب منشا نچا سکتا ہے۔ چونکہ اب تک اسے اپنے ہر ناپاک ارادہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے اس پر کچھ نشہ سا چڑھ گیا تھا۔ حال ہی کے دو ایک معاملات میں پنت کی جھوٹی رپورٹ پر داداجی نے اپنے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسے مجبوراً سچی رپورٹ لکھنا پڑی تھی۔ نتیجہ کے طور پر اس نے جو رشوت لی تھی اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور جن لوگوں نے اسے رشوت دی تھی وہ کھلم کھلا اسے گالیاں دینے لگے۔

ایک بات اور ہو گئی تھی۔ پنت اور اس کے گروہ کی کرتوتوں کا علم جب دیال کو ہوا تو انہوں نے فرصت کے وقت گاؤں کے لوگوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو مناسب صلاح دیتے۔ ان کے باہمی جھگڑے نپٹاتے اور کچہری میں جانے والے معاملوں کا آپس ہی میں سمجھوتہ کرا دیتے تھے۔ ایسے فیصلے سے دونوں فریقین مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس طرح دیال کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی، اور پنت کی آمدنی گھٹتی جا رہی تھی۔ لہٰذا پنت دیال سے حسد رکھنے لگا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ گاؤں میں ہر سو تاریکی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دھرم پور گاؤں کالی کملی اوڑھ کر گہری نیند سو رہا ہے۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے درخت بھی ساکت تھے۔ کتوں کا بھونکنا بند تھا۔ رات کے کیڑوں کی کرکٹ آواز آ رہی تھی۔ الو کہیں کسی درخت پر الو چلا رہا تھا۔ گاؤں میں صرف گشت والے گھوم رہے تھے اور گاؤں کے باہر۔۔۔۔۔

نہیں بہاں دور جنگل میں ایک پہاڑی پر ہنومان جی کے پرانے مندر میں بڑی چہل پہل تھی۔ پنت اور اس کے گروہ کے لوگ حسب معمول وہاں جمع تھے۔ آج ناچ گانے کا پروگرام نہ تھا۔ درمیان میں قالین پر پنت بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں اس کی داشتہ چندرا جو زرکی ساڑی اور سونے کے زیورات سے آراستہ تھی، بیٹھی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر اس کے گروہ کے لوگ بیٹھے تھے۔ آج ان کا کھانا پنت کی طرف سے تھا۔ خود چندرا نے سارا انتظام کیا تھا۔ کھانا ابھی ابھی ختم ہوا تھا اس لئے لوگ پان تمباکو کھاتے ہوئے بیڑی اور سگریٹ کے کش کھینچ رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور گپوں کا بازار گرم تھا۔ بعض لوگوں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کل ملا کر کوئی تیس آدمی تھے۔

"چندرا آگ بیٹھا تو ہو گیا۔ اب ایک دن گھیں بھی ہو جائے" ملیا نے کہا۔

"وہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن ......" چندرا نے کہا۔

"ہمارے ہوتے ہوئے تمہارے لیکن کا مطلب؟" ملیا نے سوال کیا۔

"راشننگ کا زمانہ ہے نہ؟ کہیں پتہ لگ گیا تو؟" چندرا نے جواب دیا۔

"بس اتنی سی بات؟ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ تمہارے کس کام کا پتہ لگتا ہے آج تک؟" کلیا نے کہا۔

"مگر اب حالات بدل گئے ہیں، اس لئے ......" پنت نے کہا۔

"آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے جناب؟ اس طرح مایوس ہونے کی وجہ؟" شنکر نے پوچھا۔

"آخر ایسی کون سی صورت پیدا ہو گئی ہے اب کچھ بتاؤ بھی تو؟" گھنشیام نے پنت سے پوچھا۔

"وہی اب میں کہہ رہا ہوں" پنت نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر کہئے؟" سومنت درزی نے بے چین ہو کر کہا۔

"اچھا تو سب کو خاموش کرو اور سنو" پنت نے کہا۔

"بھائیو سنو! پنت کچھ کہہ رہے ہیں۔ چپ ہو جاؤ، سنو سنو" کلیا چلایا۔

سب لوگ اٹھ کر قاعدے سے بیٹھ گئے۔ شور و غل بند ہو گیا۔ پنت کی تقریر سننے کے لئے سب لوگ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھ جلی بیڑی اور سگریٹ کے ٹوٹے لوگوں نے باہر پھینک دیئے۔ بعض لوگوں نے پان بھی تھوک دیئے۔ سب لوگ پنت اور چندرا کو گھیر کر ایک غول میں بیٹھ گئے۔

"ہاں کہئے، اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" چندرا نے پنت سے کہا۔

پنت کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے کہا ——

"بھائیو! ہم لوگ اپنی دنیاوی تکالیف کو فراموش کرنے کے لئے اٹھتے بیٹھتے اور اپنا دل بہلاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دوسروں کا کلیجہ کیوں پھٹتا ہے؟ گذشتہ کئی برسوں سے ہم بڑے اطمینان اور خوشی سے بسر کرتے ہیں۔ مگر اس سال سے گاؤں کی فضا کچھ مکدر ہو گئی ہے۔ جب سے اپنا اسکول کھلا ہے اور وہ چمار ماسٹر آیا ہے تب سے اس نے رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ ماسٹری کرنا چھوڑ کر وہ سالا گاؤں کے معاملوں میں بھی مخل ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے اور تم سب لوگوں کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ یہ تو تم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ اس اور زمیندار کی بیٹی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اس چھوکری کی برات گاؤں میں آکر واپس ہو گئی تھی۔ اگر ایسی گندی باتیں ہم اپنے گاؤں میں ہونے دیں گے تو ہمارے لئے بہت شرم کی بات ہے۔ داواجی زمیندار جیسا بدھو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کا اپنا لونڈا یا کوئی زور نہیں اور اوپر سے بکتا پھرتا ہے کہ چندرا نے اس کی بیٹی کی شادی توڑ دی۔ گویا ہمارے چندرا کو دنیا کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

"آج تک میں نے اس کا ساتھ دیا۔ میری بدولت ہی وہ زمینداری بھی کر سکا، اگر میں اس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر آج وہ ان تمام احسانوں کو فراموش کر رہا ہے۔ وہ بوڑھا شیطان بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ میری بات تو چھوڑو، وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، مگر تم لوگ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ اس کی بیٹی کی شادی کا رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ سارے گاؤں پر خار کھائے بیٹھا ہے۔ لیکن کیا اس کی یہ جھلاہٹ نامناسب نہیں ہے؟ اگر اس کا سکہ کھوٹا ہے تو گاؤں والوں کا اس میں کیا قصور؟ اس کے لئے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ سنو اور بتاؤ تمہیں پسند ہے یا نہیں؟"

"بتلائیے بتائیے وہ کون سی ترکیب ہے؟" سب لوگ ایکدم چلا پڑے۔

"دیال ماسٹر کو گاؤں سے نکال دینا چاہئے" پنت نے آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، ضرور نکال دینا چاہئے" سب نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

"دیلیا، ملیا، کلیا!" پنت نے بآواز بلند ان تینوں کو پکارا۔

"جی" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تمہیں کو یہ کام کرنا پڑے گا" اس نے "تمہیں" پر زور دیا۔

"کل ہی نکال دیتے ہیں یہ کون بڑی بات ہے" کلیا نے کہا۔

"کیا کرو گے تم؟" پنت نے کڑک کر کہا۔

"ایسے اٹھا کر گاؤں کے باہر لے جائیں گے۔ مار مار کر اس کا بھوسہ نکال دیں گے اور کہیں گے کہ گاؤں سے چپ چاپ بھاگ جانا ورنہ تیری خیر نہیں۔ اگر زیادہ گڑبڑ کرے گا تو وہیں ختم کر دیں گے" بدھیا نے کہا۔

پنت نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا اور کہا ——— "نہیں، یہ کافی نہیں۔ کل رات اسکول میں آگ لگا دو۔ اس سے دو کام ہو جائیں گے۔ ایک تو زمیندار کی کوٹھی جل کر خاک ہو جائے گی۔ اور دوسرے اسکول بند ہو جائے گا۔ اور پھر ماسٹر خود ہی چلا جائے گا"

"ٹھیک ہے۔ کل رات ہی اسکول میں آگ لگا دیں گے۔ صبح آپکو اس جگہ راکھ کا ڈھیر ملے گا" کلیا نے کہا۔

"ہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ——— تم میں سے کئی کے لڑکے رات کو اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں اور وہیں سوتے ہیں۔ کسی بہانے انہیں کل رات کو اسکول میں نہ جانے دینا۔ اور اگر جائیں تو بھی کم از کم انہیں وہاں سونے نہ دینا" پنت نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں سے اس کے متعلق کچھ بھی نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ اگر ہم نے لڑکوں کو پہلے سے ہی متنبہ کر دیا، تو ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ لڑکوں کو وہاں حسب معمول جانے دیا جائے، مگر آگ لگانے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ سب لڑکے باہر نکل آئے ہیں یا نہیں۔ اور جب وہ سب کے سب باہر نکل آئیں تب آگ لگا دی جائے" گروہ کے ایک ممبر نے صلاح دی۔

"ہاں ہاں ایسا بھی کر سکتے ہو۔ کچھ بھی کرو، یہ کام ہونا چاہیئے" چندرا نے کہا۔

"اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہیں کام بتلا دیا گیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کام بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نیز خفیہ طور پر کیا جائے۔ سب کام اس خوبصورتی سے ہو کہ اسکول میں کب آگ لگی؟ کس نے لگائی؟ کس طرح لگائی؟ اس کا کسی کو سراغ نہ ملے۔ اگر ذرا بھی پتہ چل گیا تو آفت آ جائے گی۔ سمجھے؟" پنت نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اور سب لوگ اپنے اپنے ہتھیار لے کر اٹھ گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

پنت نے چندرا کی طرف اور چندرا نے پنت کی طرف اطمینان کی نظروں سے دیکھا۔

دوسرے دن سورج نکلا۔ اسکول حسب معمول کھلا اور بند ہوا۔

انگلینڈ کی تاریخ میں پارلیمنٹ اڑا دینے کی ایک سازش مشہور ہے۔ ایک گروہ نے یہ سازش کی تھی اور اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اس گروہ کے ایک شخص نے اپنے ایک عزیز کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی تھی کہ فلاں دن تم پارلیمنٹ میں حاضر نہ ہونا۔ اور اسی بے احتیاطی سے اس سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ سچ ہے ممتا پاگل ہوتی ہے۔

پنت کے گروہ کے ان لوگوں نے جن کے لڑکے اسکول ہی میں رات کو پڑھنے اور سونے کیا کرتے تھے، اپنے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ بعض لوگوں نے تو اپنے لڑکوں کو اس رات اسکول میں سونے سے منع کر دیا تھا۔ چند لوگوں نے کسی کام کے بہانے اپنے لڑکوں کو اسکول نہ بھیجنے کا ہی انتظام کر لیا تھا۔ کسی نے یہ کہہ کر اپنے بچوں کو چیتاونی دی تھی کہ دیکھو سنبھل کر رہنا آج رات تمہارے اسکول میں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

ان اطلاعات کا مطلب لڑکے نہ سمجھ پائے تھے۔ کیونکہ وہ انہیں یوں ہی رواروی میں دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود چند لڑکے گھر والوں کی آنکھ بچا کر رات کو ہمیشہ کی طرح پڑھنے اور سونے چلے آئے تھے۔ بعض لڑکوں نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کی تھی اور ان کی چیتاونی پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر بھی روز کی بہ نسبت آج لڑکوں کی تعداد کم تھی۔

روزانہ کی بہ نسبت لڑکوں کی تعداد کم دیکھ کر دیال نے یونہی دریافت کیا۔

"کیوں بھئی آج لڑکے بہت غیر حاضر ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا گاؤں میں کوئی سینما یا سرکس آیا ہے؟"

"نہیں سر۔ بلکہ ......" ایک لڑکے نے کہا۔

"بلکہ کیا؟" دیال نے پوچھا۔

"آج کچھ ......" لڑکا کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟ کیا بات ہے؟" دیال نے چڑھ کر پوچھا۔

"آج کچھ ہنگامہ ہونے والا ہے سر" لڑکے نے کہا۔

"کہاں؟" دیال نے پوچھا۔

"یہیں ہمارے اسکول میں سر" یہ جواب ملا۔

"کیوں جی یہ کیا کہہ رہا ہے" دیال نے سب لڑکوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں سر" سب نے یکدم کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے؟" دیال نے سب لڑکوں سے دریافت کیا۔

"ہمارے گھر والوں نے ہمیں اطلاع دی ہے" مدھوکر ستار نے کہا۔

"سچ بچ؟"

"جی ہاں سر" ہر لڑکے نے جواب دیا۔

پہلے تو دیال کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ ان کے خلاف کون سی سازش کی گئی ہے۔ مگر وہ پنڈت اور اس کے گروہ کی کرتوتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کس وقت کیا کر بیٹھیں گے اس کا پتہ نہیں۔ اس لئے انہیں آنے والی مصیبت کا کچھ اندازہ ہو گیا۔ پھر بھی وہ ذرا نہ گھبرائے اور انہوں نے سب طلباء سے کہا ـــــ

"تم لوگ بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم اسے ممکن سمجھتے ہو؟ پڑھو اور بے خوف سو جاؤ" دیال کا حکم سن کر لڑکے اپنی کتابوں میں منہ چھپا کر آپس میں کچھ سرگوشیاں کرتے رہے۔ دیال بھی اپنے کمرہ میں جا کر انہیں خیالات میں منہمک ہو گئے۔

لڑکے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو یا جھوٹ لیکن مجھے اس کے لئے محتاط رہنا چاہیے۔ جاہل لوگوں کا کیا بھروسہ؟ آج جس کے نام کے نعرے لگاتے ہیں اسی کو کل قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔ مہاتما گاندھی جیسے قابل پرستش ہستی کو بھی انہوں نے خون کر دیا تھا....

دیال اٹھے انہوں نے دو خط جلدی جلدی لکھے۔ پھر دو لڑکوں کو بلایا اور انہیں خط دیکر کہا ـــــ "بالکل خفیہ طریقہ سے رکھیں گے جاؤ۔ دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے۔" لڑکے خط لے کر دوڑتے چلے گئے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں گاؤں کے متعدد غنڈوں نے بڑا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس وقت گاؤں کے تحفظ کے لئے دھرم پور کے چند نوجوانوں نے رضاکار پارٹی قائم کی تھی۔ اس پارٹی کے لیڈر دیال کے گہرے دوست تھے، اور انہیں بہت چاہتے تھے۔ انہوں کے ہاتھ

دیال نے انہیں لوگوں کو رقعے بھیجے تھے۔ انہوں نے اس میں انہیں اسکول پر آنے والی مصیبت سے آگاہ کیا تھا۔ اور ان سے امداد طلب کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد لڑکے ان خطوں کو لے کر دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ ان لوگوں نے دیال کو صرف مدد دینے کا ہی وعدہ نہیں کیا بلکہ رات بھر اسکول کی نگرانی کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔

دس بجے حسب معمول دعا ہوئی اور دیال نے سب لڑکوں کو سونے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے بستر پر آکر لیٹ گئے۔

ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے ـــــ میں اچھوت ہوں کیا اسی لئے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن میری تقریروں میں تو آج تک کسی نے گڑبڑ نہیں کی۔ پھر کیا کنول سے میرا رشتہ جوڑ کر لوگ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں؟ مگر گاؤں کے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں میں کتنا محتاط ہوں۔ کہیں پنڈت اور اس کی ٹولی کا تو ناپاک ارادہ نہیں؟ لیکن میں نے ان کی کھلم کھلا کبھی مخالفت نہیں کی۔ کہیں دعوا جی ہی تو مجھے بھگانے کے فراق میں نہیں ہیں۔ لیکن ان جیسا نیک، قومی ایسا تو نہیں کر سکتا۔ خیر مجھے جرأت سے کام لینا چاہیئے اور جو کچھ ہو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے۔

نیم بیداری کے عالم میں وہ انہیں متفرق باتوں پہ غور کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی ـــــ

"ماسٹر صاحب! او دیال ماسٹر صاحب"

دیال نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ماسٹر! دیال ماسٹر!" یہ چلاتے ہوئے کسی شخص نے دروازے کی کنڈی کو زور زور سے بجانا شروع کیا۔ اندر کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیال نے پوچھا ـــــ

"کون ہے؟"

"میں چھوا ہنومنت باؤ دریز کا"

"کہئے ہنومنت راؤ جی اتنی رات گئے کیسے؟" دیال نے بڑی نرمی سے دریافت کیا۔

"پہلے دروازہ تو کھولئے، پھر بتاتا ہوں" اس نے جواب دیا۔

"کئی دروازوں میں تالے پڑے ہیں۔ آپ بتایئے تو کہ آخر چاہتے کیا ہیں؟"

"ابھی ہمارا نامو گھر سے روٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ اسے بھیج دیجیے۔" ہنومنت نے اصرار کیا۔

"بہت اچھا ذرا ٹھہریئے۔" دیال نے کہا۔

دیال نے نام دیو کو جگایا اور اس سے معلوم کیا — "کیا تو روٹھ کر گھر سے آیا ہے؟"

"نہیں سر۔"

"تیرے پتا جی تو کہہ رہے ہیں۔" دیال نے ڈانٹا۔

"کہاں ہیں پتا جی؟" نام دیو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"نیچے کھڑے ہیں۔"

"آپ کی قسم سر میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ روٹھا اوٹھا نہیں ہوں۔" نام دیو نے کہا۔

"تمہیں مجھے یقین نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ چل نیچے اپنے باپ کے پاس۔"

"چلئے سر ابھی آپ کو یقین آجائے گا۔" نام دیو نے نڈر ہو کر کہا۔

دیال اور نام دیو نیچے آئے۔ دیال نے دروازہ کھولا اور ہاتھ سے لالٹین کو سامنے بڑھا کر ہنومنت سے مخاطب ہوئے — "آپکا نامو تو کہہ رہا ہے کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے۔"

ہنومنت نے نام دیو کا کان پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گھر لے گیا۔ تھوڑی دور جانے پر اس نے اس سے کہا — "ابے گدھے میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کیوں آیا تھا یہاں مرنے؟"

دیال کے کانوں نے یہ الفاظ سنے اور ان کا دماغ روشن ہو گیا۔ ہنومنت جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا لڑکا کسی طرح اسکول میں نہ رہے۔ خیر۔ انہوں نے کواڑ بند کئے اور اس واقعہ پر غور کرتے ہوئے لیٹ گئے۔ اسی وقت نیند میں ایک لڑکا چیخ اٹھا۔

"سر دروازہ نہ کھولئے۔ ٹھہریئے، ٹھہریئے۔"

وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ دیال نے اسے تھپک کر سلا دیا۔

دیال کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ وہ کروٹیں بدل رہے تھے کہ رات کے دو بج گئے اور..... اسکول کے سامنے انہیں کچھ شور و غوغہ سنائی دیا۔

"ماسٹر دروازہ کھولو۔"

دیال نے لالٹین کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر گھنا اندھیرا ہونے کی وجہ سے دس پندرہ مشعلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں — ان مشعلوں کی روشنی میں بھالے، تلوار، پستول اور بندوق وغیرہ ہتھیار چمک رہے تھے۔ ان ہتھیاروں سے لیس کوئی دس پندرہ آدمی کالے نقاب اوڑھ کر اسکول کے صدر دروازہ کو بھڑ بھڑا رہے تھے۔ اب دیال کو آنے والی مصیبت کا علم ہو گیا۔ انہوں نے آہستہ سے تین لڑکوں کو جگایا اور انہیں عقبی دروازے سے رضاکاروں کو بلانے کیلئے بھیج دیا۔

دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ دیال نے سوچا کہ اب ڈرنے سے کام نہ چلے گا۔ اس مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ دیال نے لالٹین روشن کی اور سب لڑکوں کو بیدار کر دیا۔ لڑکے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ دیال نے ان سے کہا —

"چلو جلدی کرو، ورنہ جل مرو گے۔" سب لڑکے دروازے کے پاس آئے۔ دیال نے کواڑ کھول دیئے اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ دیال نے لڑکوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا — "لڑکو! ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کوئی بھی ہوں مگر ایک بات یقینی ہے کہ یہ تمہارے اسکول میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم پڑھ لکھ کر قابل بنو۔" پھر انہوں نے نقاب پوشوں سے خطاب کیا —

"بھائیو! ان معصوم بچوں نے آپ کا کون سا نقصان کیا ہے۔ ان کے قصور کی آپ لوگ مجھے سزا دیجئے، اور اگر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو میں ہر قسم کی سزا کے لئے تیار ہوں، مگر اس اسکول کو۔ لڑکوں کے اس مدرسہ کو نہ جلایئے۔"

"سب لڑکے باہر آگئے؟" نقاب پوشوں میں سے ایک نے گرج کر کہا۔

"نہیں ابھی سب باہر نہیں آئے ہیں۔ ابھی بھی کچھ بچے اندر سوئے ہوئے ہیں۔" دیال نے کہا۔

"ابے او ماسٹر کے بچے! نکال انہیں باہر۔ کھڑا کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟" ان میں سے کسی نے کہا۔

دیال گھبرا گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ دیال اسکول کے اندر گئے اور یہ دیکھ کر کہ کوئی وہاں سوتا ہوا تو نہیں رہ گیا ہے۔ نیچے آگئے۔

"چل دور ہو یہاں سے، سنبھال اپنے لونڈوں کو۔" یہ کہہ کر نقاب پوش اپنی اپنی مشعلیں لے کر اسکول کی جانب بڑھنے لگے۔ ان

وقت سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور ٹارچ کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ رضاکاروں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا مدد کے لئے آرہا تھا اور ادھر لڑکوں نے نقاب پوشوں پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر حملہ آوروں نے انہیں پولیس کی ٹولی سمجھا اور وہ ڈر کر اپنی اپنی مشعل وہیں پھینک کر اندھیرے میں بھاگ گئے۔

ویال نے رضاکاروں کی بروقت آمد کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اسکول کی عمارت بچ گئی۔

پھنسے اور اس کے گروہ کے ناپاک ارادے خاک میں مل گئے۔

۸

جب خوشی اور غم کا احساس بیک وقت ہونے لگتا ہے تو دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی عالم ویال کا بھی تھا۔ گزشتہ واقعات کو یاد کر کے وہ بے حد مغموم و ملول ہو جاتے تھے اور جب ولایت جانے کا خیال آتا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک روز اسکول میں، جو باتیں ہوئیں تو وہ بعد میں انہوں نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے گاؤں سے تو اب میرا دل بالکل اکتا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی یہاں سے جا بھی سکوں گا یا نہیں؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"لوگ سب کچھ کر چکے۔ اب کرنے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"بس؟ آپ اتنے سے ہی گھبرا گئے؟ زندگی میں خوشی و غم تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ جہاز پر قدم رکھتے ہی آپ یہ سب بھول جائیں گے۔" میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم کہتی تو ٹھیک ہو۔ میں ولایت جا رہا ہوں۔ پھر بھلا وہاں سے واپسی کی کیا امید؟"

"جی ہاں کیوں نہ ہو؟ آپ مرد ہیں خود مختار ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن میں؟" میں نے کہا۔

"تمہیں کس بات کی تکلیف ہے؟"

"لوگ پرائے دکھ کو ہمیشہ ایسا ہی سمجھا کرتے ہیں۔ خود کو نہیں دیکھتے؟ لوگوں نے اسکول کے بارے میں تھوڑی سی گڑبڑ کر دی اور اتنے ہی آپ اس قدر بے چین ہو گئے کہ اتنے جلدی گاؤں چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ذرا میری طرف تو دیکھئے کہ میرے ہاتھ پیلے ہونے سے پہلے ہی گاؤں والوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کس قدر کوفت ہوئی ہوگی مجھے؟ کیا آپ میری تکلیف کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ بتائیے کہاں جاؤں، میں کیا کروں؟ ایسی صورت میں گاؤں میں ہی پڑے رہنے کے علاوہ میرے پاس چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم بھی تو انگلینڈ آ رہی ہو نا؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو تبھی ممکن ہے جب آپ وہاں سے مجھے کورس بھیجیں گے، اور دادا جی مجھے ولایت جانے کی اجازت دے دیں گے۔" یہ کہہ کر میں رک گئی۔

"تم ضرور آؤ گی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ تو تعلیم ختم کرنے کے بعد وہاں سے واپس نہیں آئیں گے لیکن میں کیا واپس آ جاؤں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"تم بھی وہیں رہ جانا، تمہیں روکتا کون ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سوچ نہ کیجئے اس اور......" میں نے کہا۔

کسی کام سے ویال وہاں سے چلے گئے اور میں بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد میں گھر واپس آئی۔ ماں جلد ہی جین مندر سے واپس آئی تھیں انہوں نے مجھے بلا کر کہا — "منی تو آجکل جین مندر میں نہیں جاتی کیا بات ہے؟"

"کس طرح جاؤں، اسکول میں پڑھانے کے بعد اس قابل ہی نہیں رہتی کہ کہیں جاؤں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک روز کی چھٹی لے کر ہی آ جا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت اچھا، کل آؤں گی۔" زیادہ بحث سے بہتر میں نے ان سے وعدہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

رات کو اپنے کمرے میں میں لڑکوں کی کاپیاں جانچ رہی تھی۔ ماں جلد ہی سو گئی تھیں۔ تقریباً دس بجے مجھے چاچا جی نے بلایا۔ میں ان کے کمرے میں گئی۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ کچھ کوئی خاص بات ہوگی۔ انہوں نے کہنا شروع کیا —

"کیا تو جانتی ہو کہ تیرے پیروں تلے کیا جل رہا ہے؟ لوگ تیرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟"

"جنہیں یہ بھی کیسے اس کا علم ہو سکتا ہے۔ اسکول اور گھر کے علاوہ میں گاؤں میں جاتی ہی کہاں ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتا تھا کہ تو یہی کہے گی۔"

"اگر لوگ میرے متعلق غلط باتیں کرتے پھرتے ہیں تو میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اب اسکول جانا بند کر دے۔" دادا جی نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے گستاخی سے کہا۔

"اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ تو وہاں ایسے اچھوت کے ساتھ شادی رچانے کا فیصلہ کر کے ہمارے خاندان کے منہ پر کالک پوتنا چاہتی ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"کہتا کون؟ لوگ کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ سب جھوٹ بولتے ہیں؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ لوگوں نے ہی میری شادی کا رشتہ توڑا اور آج جب وہ میرے متعلق یہ افواہ اڑا رہے ہیں تو آپ نے اس پر یقین کر لیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں سب جھوٹے ہیں، ایک تو ہی سچائی کی دیوی ہے اس دنیا میں۔"

"اگر مجھے وہاں سے شادی کرنا ہوتی تو جس نے آپ سے میرا رشتہ طے کیا تھا اس سے شادی کرنے کے لئے میں کیوں تیار ہو جاتی۔ مگر میں نے آپ سے کبھی اس کے بارے میں کچھ کہا؟"

"وہاں ہی کی وجہ سے تیرا وہ رشتہ منقطع ہوا۔ اسی کی وجہ سے اسکول میں آگ لگنے کی سازش ہوئی۔ لیکن اب وہ بھی یہاں سے جانے کیلئے تیار نہیں۔ آخر کیوں رکا ہوا ہے وہ؟"

"وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ اگر فوراً چلے جاتے تب بھی لوگوں کا شبہ قائم رہتا۔ دوسرے میں نے ہی مجبوراً انہیں یہاں چند روز ٹھہرنے کے لئے کہا ہے۔" میں نے کہا۔

"زہر کو زیادہ چاٹنے سے حاصل؟ بہتر تو یہی ہے کہ اسکول جانا فوراً بند کر دے۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"اگر آپ کا یہی حکم ہے تو میں اسکول نہ جاؤں گی۔ لیکن وہ تو اب جانے والے ہی ہیں۔ اس لئے کچھ عرصہ کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے تو لوگوں کو مجھے بدنام کرنے کا اور موقع مل جائے گا۔"

"بہت اچھا، اس سے کہہ وہ جلد منہ کالا کرے۔" والد صاحب نے حقارت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ آفت جلد از جلد یہاں سے ٹل جائے اسی لئے اس وڈیرے کو مجھے پانچ ہزار روپے دینے پڑے۔" انہوں نے خشمناک ہو کر کہا۔

"آپ کو چاہئے تھا کہ نہ دیتے۔"

"تیری خاطر ہی مجھے ایسا کرنا پڑا۔"

"اچھا ہوا۔"

"اچھا ہوا نا؟ کسی سے کہنا مت۔ جا اب جا کر سو جا۔"

میں اٹھی اور جا کر اپنے کمرے میں سو گئی۔

صبح اسکول پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہاں جانے والے ہیں اور ان کی جگہ میں ہیڈ مسٹریس مقرر کر دی گئی ہوں۔ ساتھ ہی میری مدد کے لئے ایک اور خاتون کا تقرر بھی ہو گیا ہے۔

وہاں کے دھوم پور سے چلے جانے کے بعد گاؤں میں فتنہ و فساد کرنے والوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہمارے اسکول کا کام بھی بڑی باقاعدگی سے چلتا رہا۔ ماں اور دادا جی بھی اب بہت خوش رہتے تھے۔

ایک روز شام کو ماں کو کچھ حرارت سی ہو گئی۔ ہم سمجھے کہ یہ سب تھکاوٹ اور اُپواس (روزہ) رکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن وہ تو تین چار روز تک باقی رہا۔ پہلے تو ان کا علاج گاؤں کے وید نے کیا۔ لیکن جب اس سے ماں کو کوئی افاقہ نہ ہوا تو دادا جی نے سانگلی سے ڈاکٹر بلایا۔

ڈاکٹر روزانہ سانگلی سے دھوم پور آتا تھا اور ماں کو انجکشن اور دوا دے کر واپس ہو جاتا تھا۔

پندرہ روز گذر گئے مگر ماں کا بخار نہ اترا۔ آج سولہویں رات تھی۔ باہر اندھیری رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایسے سکوت کے وقت کہیں سے الّو کے بولنے کی آواز آئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ماں نے بڑے نحیف لہجے میں کہا — "سنی تو الّو کی آواز سے ڈرتی ہے۔"

"نہیں تو ماں۔" میں نے جواب دیا۔

ماں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ——

"منی بٹیا! اب میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں نے منی کا لوت اپنے خاندان کی خدمت کی۔ اور میں ایشور کی کرپا سے آج تک سکھی رہی۔ اب مجھے فکر ہے تو صرف تیری۔ اگر میری زندگی میں ہی تیرے ہاتھ رنگ جاتے تو.....'' اور پھر انہیں ہچکیاں آنے لگیں۔ اور انہیں ہچکیوں کے درمیان انہوں نے نقاہت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"انہیں تو بلا....''

میں نے گھبرا کر والد صاحب کو جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور ماں کے بستر کے پاس آئے تو ماں.....

ماں ہمیں چھوڑ کر ملک عدم کو جا چکی تھیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کی جدائی کا غم سہنا پڑا۔ ماں اس دنیا سے کیا گئیں میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا اور میں دن رات حزن و ملال میں کاٹتی رہی۔

اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا جس سے کہ دھرم پور کے لوگ میری ماں کی موت کو بھول گئے۔ وہ تھا بھی اسی قدر اہم۔ وہ تھا——

پنت کا قتل۔

۹

پنت کے قتل کی خبر پاتے ہی گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہنومان جی کے مندر پر لوگوں کا جم غفیر اُمڈ پڑا۔ واردات کے مقام پر ہر آدمی پہنچنا چاہتا تھا۔ مندر کے اندرونی حصہ میں پنت کی لاش پڑی تھی جس کے ہاتھ پیر کٹے ہوئے تھے اور دھڑ سر سے غائب تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ اور اس کا کٹا ہوا سر مندر کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ منظر بہت ہی بھیانک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

خون کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ ان سوالوں کے جوابات لوگ اپنی اپنی عقل کے مطابق خود دے رہے تھے۔ بعض لوگوں کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ کئی خون اور چوریاں ہضم کرنے والے شخص کا یہ انجام کیسے ہوا۔ پنت نے جن لوگوں کی مدد کی تھی، خواہ وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہو، وہ اس دردناک قتل پر افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ اور جن لوگوں کو اس نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی یا پہنچایا تھا وہ اس کی موت پر شادماں تھے اور کہہ رہے تھے —— "ایسے ظالموں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔"

سارا گاؤں وہاں ٹوٹ پڑا تھا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ پنت کے گروہ کا ایک بھی رکن وہاں موجود نہ تھا۔ گویا اپنی عدم موجودگی سے لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ان کا پنت کے قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور نہ ہی وہ اس حادثہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس خوفناک حادثہ کے رونما ہونے کے پہلے ہی چندا کسی دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔

دادا جی نے اس قتل کی رپورٹ فوراً پولیس کو دیدی۔ اور خبر پاتے ہی تھانیدار اور پولیس کے چند سپاہی موٹر سے دھرم پور آگئے۔ انہوں نے اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ پنت کی بیوی کا بیان ہوا۔ وہ بیچاری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے منہ سے ٹھیک طرح الفاظ بھی ادا نہ ہو پاتے تھے۔ تین روز تک تفتیش ہوتی رہی۔ اور آخرکار پولیس نے محض شبہ پر پنت کے تمام ساتھیوں کو حراست میں لے لیا۔ تیس مجرموں پر خون اور چوری کے الزامات لگا کر پولیس نے انہیں مجسٹریٹ کے سامنے عدالت میں پیش کیا اور پھر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔

پولیس نے گنپت سنار کو سرکاری گواہ بنا لیا اور اس نے عدالت کے سامنے جو بیان دیا اس میں پنت اور اس کے گروہ کی ساری پول کھل گئی۔ بیان مندرجہ ذیل تھا——

"ہمارا گروہ گذشتہ تیس سال سے دھرم پور میں کام کر رہا ہے۔ مجرم مانے کہ مجرم جتنا تک سب لوگ ہمارے گروہ کے ارکین تھے۔ پنت اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس نے سیکڑوں چوریاں اور متعدد خون ہضم کر لئے تھے۔ کئی مرتبہ موٹی موٹی رشوتیں لی تھیں۔ بلیا، ملیا اور کلیا نے کئی جگہ ڈاکے ڈالے ہیں اور لوٹ مار کی ہے۔ لوٹ مار میں جو زیورات حاصل ہوتے تھے وہ گلانے کے لئے مجھے دیئے جاتے تھے۔ اور اس کام کیلئے مجھے مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی لوٹ کا حصہ بھی ملتا تھا۔ گلا ہوا سونا، چاندی بھیکو بنیا بیچا کرتا تھا۔ چونکہ لوٹ میں سب کو مناسب حصہ مل جایا کرتا تھا اس لئے کسی کو کوئی شکایت پنت سے نہ تھی اور ہم سب لوگ ایک کنبہ کی طرح رہتے تھے۔

چندا مالن ایک عرصے سے پنت کی داشتہ ہے۔ اور چند دنوں سے پنت اور چندا میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ بلیا، ملیا اور کلیا کو پنت نے

رکھو یوسکے اسکول کو جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ اس کام میں ناکام رہے۔ انہیں پنڈت ان پر بہت بگڑا اور اس نے ان کو بہت مغلظات گالیاں دیا۔ ایک چوری کے معاملے میں بھی ییلیا، طیبا اور کلیا کو پنڈت نے بہت پریشان کیا اور ان کا سارا حصہ وہ خود ہی ہڑپ کر گیا۔ للہذا یہ تینوں اس پر کافی ناراض ہو گئے اور انہوں نے اس سے انتقام لینے کی ٹھانی ——— وہ موقع کے منتظر تھے۔ چندرا مالن کو اب بڈھے پنڈت سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا تعلق ییلیا، طیبا اور کلیا سے قائم کر رہی تھی اور وہ اس طرح ان تینوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو کر اس کا تعلق دوسرے سے ہے۔ پنڈت کے قتل کی سازش کا منصوبہ تیار کرنے والی بھی یہی مالن تھی کیونکہ وہ ان تینوں کے ساتھ نڈر ہو کر اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ دادا جی رشیندر کی بیٹی کی شادی کا رشتہ بھی راہی نے توڑا تھا۔ یہ بات اس نے ہمارے گروہ میں کئی مرتبہ کہی تھی اور نہایت فخریہ انداز میں۔

پنڈت کے قتل کی سازش بنا کر چندرا دوسرے گاؤں کو چلی گئی تھی۔

جس روز قتل ہوا اس روز ہم سب حسب معمول ہنومان جی کے مندر میں جمع ہوئے تھے۔ جب پنڈت بلاتا تھا تو ہم اسی طرح مندر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ہر ماہ کم از کم ایک مرتبہ یہ پروگرام ضرور ہوتا تھا۔

اس روز پنڈت نشے میں مست تھا اور اس نے ہم سب کو اور خصوصاً ییلیا، طیبا اور کلیا کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا، ایسی گندی گندی گالیاں سنائیں کہ وہ آگ بگولا ہو گئے اور ان کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ انہوں نے ہم سب کے سامنے ہی پنڈت کو پکڑ لیا اور بڑی بے دردی سے اس کا قتل کر دیا۔ ہم سب خوفزدہ ہو کر اپنی اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

بعد میں کئی لوگوں کی شہادتیں ہوئیں۔ بہت سے ثبوت پیش کئے گئے۔ اور آخر میں فیصلہ سنا دیا گیا۔ ییلیا، طیبا اور کلیا اور چندرا کو پھانسی کی سزائیں ہوئیں۔ دوسروں کو بھی لمبی لمبی سزائیں ہوئیں۔ اور اس طرح گاؤں میں غلاظت پھیلانے والا یہ گروہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور گاؤں پاک ہو گیا۔

پنڈت کے قتل کے بعد وہ ساری باتیں جن کے بارے میں لوگ تاریکی میں تھے یا غلط فہمی میں مبتلا تھے واضح طور پر سامنے آ گئیں ——— دیال جا رہا تھا اس لئے دادا جی بھی اب خوش تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک دن ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ ہی گئی۔

"پتا جی، ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"پوچھو۔"

"آپ اجازت دیں گے؟"

"اگر اجازت دینے کے قابل بات ہوگی تو ضرور دوں گا۔"

"ویسے اجازت کے قابل تو نہیں ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے؟ آخر سنوں تو۔" ان کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"بات یہ ....." میں کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو نہ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں انگلینڈ جانا چاہتی ہوں۔"

"کس لئے؟"

"اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔"

"تو جتنا پڑھ چکی ہے، وہی بہت کافی ہے۔ ہمیں سماج میں تیرے برابر پڑھی لکھی لڑکیاں کہاں ہیں؟ اب اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تجھے کیا کرنا ہے؟ کہیں ملازمت تو کرنا نہیں ہے تجھے۔ تیری ماں کہتی تھی کہ جتنا تو پڑھ چکی ہے وہ بہت ہے اور مجھے بھی اب محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں پہلے ہی تیری شادی کر دیتا تو بہتر ہوتا۔ ایک تو اب تیری عمر کافی ہو چکی ہے دوسرے ایک بار تیری برات گھر آ کر واپس جا چکی ہے۔ اس لئے اب تیری شادی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ تاہم میں کوشاں ہوں۔ شادی کے بعد دولہا دلہن دونوں اگر انگلینڈ چلے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، میں بڑی خوشی سے اجازت دے دوں گا۔ ہمارے سماج کی حالت تجھ پر عیاں ہے۔ جہاں لڑکے نہیں پڑھ سکتے وہاں لڑکیاں کیا پڑھیں گی۔ کوئی ایک آدھ اگر اتفاق سے پڑھ گئی تو لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر حال ہی میں تیری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ تو بھی اگر ولایت چلی جائے گی تو میرا کیا ہوگا؟ میں تنہا کیسے جیوں گا۔ پھر غیر ملک میں تجھے وہ کھانا کھانا پڑے گا جو ہمارے مذہب کی رو سے ممنوع ہے۔ کیا تو وہاں جا کر اپنے مذہب اور ذات کو ترک کر دینا چاہتی ہے؟ دیال بھی انگلینڈ میں ہی ہے۔ تو خواہ کتنی ہی پاک ارادے سے وہاں جائے لیکن لوگ کیا سمجھیں گے؟ اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ اس غلط خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔"

"پتا جی فضول شک میں پڑنے سے کیا فائدہ؟ مجھے آپ اجازت

"دیکھئے میں ایک سال میں ہی واپس آجاؤں گی۔"

"تو یہاں جو چاہو کر سکتی ہے۔ اگر چاہے تو ایک اسکول اور قائم کر لے۔ میں روپیہ دوں گا، اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔ مگر ولایت جانے کا خیال ترک کر دے۔"

"میں تو جاؤں گی۔ آپ دو چار دن اور غور کر لیجئے۔" یہ کہتی ہوئی میں کمرے سے چل دی۔

پتا جی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی زینہ طے کر کے اپنے کمرے میں آئی اور پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن جب میں نیچے آئی تو دیکھا کہ روزانہ سویرے اٹھ جانے والے پتا جی ابھی تک بستر پر لیٹے ہیں۔ میں ان کے پاس گئی اور پوچھا۔

"پتا جی، آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟"

"منی، کل رات نیند ہی نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تو ولایت جا رہی ہے۔"

"تو کیا رات بھر آپ میرے متعلق ہی سوچتے رہے تھے؟"

"اور کیا؟"

"تو آخر کیا طے کیا آپ نے؟"

"یہی کہ ولایت جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"یہ فیصلہ کرنے کیلئے آپ رات بھر جاگتے رہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا تو اب اٹھئے۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔"

"میرا جسم کچھ بھاری ہے، شاید بخار بھی ہو۔" والد صاحب نے بمشکل کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

میں نے ان کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ انہیں بخار بہت تیز تھا۔ میں نے انہیں بستر پر ہی اٹھا کر بٹھایا اور منہ دھونے کے لئے بائیجا سے گرم پانی لانے کے لئے کہا۔ پتا جی نے منہ دھو کر چائے پی۔

ڈرائیور کو بلانے کیلئے نوکر گیا۔

ڈاکٹر آکر انجکشن دے گئے۔ ڈاکٹر کی آمد کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ سارا گاؤں عیادت کو آیا۔ میں اسکول میں بھی تھی کہ ملازم نے آکر خبر دی کہ والد صاحب پر بخار کی شدت کی وجہ سے ہیجانی کیفیت

طاری ہو گئی ہے۔ میں فوراً گھر آئی تو دیکھا کہ وہ بار بار بستر سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ — "میں چلا، مجھے چھوڑ دو، تم کہیں بھی جاؤ، مجھے کوئی سروکار نہیں۔"

بچوں کے دو آدمی جن کو دوا اور مدد کے لئے بلا لیا تھا، پتا جی کو پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ایک آدمی کو سائیکل کا رسے ساتھ بھیجا اور خود ان کے پاس بیٹھ گئی۔ پتا جی کی وہی حالت جاری تھی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں اور بائیجا انہیں پکڑ کر لٹا دیتی تھیں۔

میں اور بائیجا ساری رات ان کے پاس بیٹھے رہے۔ باہر دو نوکر اور دوسرے ملازم بیٹھے تھے۔ پتا جی کا بڑھتا ہوا بخار اور ان کی بڑ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر رہی تھی۔ بائیجا کے کندھے پر سر رکھ کر میں دو تین بار روئی بھی۔ وہ بیچاری مجھے بار بار دم دلاسا دیتی رہی۔ رات جیسے تیسے گذری۔ دوسرے دن ڈاکٹر پھر آئے اور انجکشن لگا کر چلے گئے۔

شام کو بخار کی شدت قدرے کم ہوئی اور اس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر رات کے بارہ بجے کے بعد بخار پھر تیز ہو گیا۔ اور وہ پہلے کی طرح پھر بڑبڑانے لگے۔ میں یہ خیال کر کے کہ کیا ماں کی طرح پتا جی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھی اور پوجا گھر میں جا کر تھوڑی دیر رو لی۔ پھر برآمدے میں گئی، جہاں ماں کی تصویر لگی ہوئی تھی، اس کے سامنے میں دوزانو ہوئی، اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا —

"ماں تم تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں لیکن پتا جی کو تو کچھ دن میرے پاس رہنے دو۔ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گی۔ جب سے میں نے ان سے ولایت جانے کی بات کہی ہے تبھی سے ان کا یہ حال ہے۔ انہیں جلدی اچھا کر دو۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے وہ مالا لا کر پتا جی کو لگا دی اور دوسرے روز سے وہ اچھے ہونے لگے۔

وقت بڑی سرعت سے گذرتا جا رہا تھا۔ ایک روز میں اتوار کو اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک ماہنامہ کے ورق الٹ رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک نظم پر پڑی اور میں اسے پڑھنے لگی۔ نظم پڑھ کر میں بہت متاثر ہوئی۔ یکا یک میرے ذہن میں یہ خوش خیال پیدا ہوا کہ اگر والد

صاحب نے مجھے انگلینڈ جانے کی اجازت نہ دی تو؟
میں نے وہ رسالہ میز پر رکھ دیا اور ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ دیکھنے لگی۔ ابھی سرخیاں ہی پڑھ رہی تھی کہ میری نظر ایک خبر پر پڑی اور میں اسے شروع سے آخر تک پڑھ گئی۔ پڑھتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ پرچہ میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑا ہے۔ اس خبر کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا اور آخر میں اپنا سر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خبر تھی ——

ہیون جہاز کا حادثہ

"کل قریب دو بجے رات کو انگلینڈ جانے والا پی۔ او کمپنی کا ہیون نامی جہاز بسکے کی خلیج میں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا اور غرقاب ہو گیا۔ بروقت امداد نہ پہنچنے کی وجہ سے جہاز کے سارے مسافر پانی میں ڈوب کر مر گئے۔"

اس خبر کے آخر میں مسافروں کی فہرست تھی۔ جس کے آخر میں لکھا تھا۔

اندرجیت دیال۔

۱۰

دیال کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر مجھے جو صدمہ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ میں گھنٹوں تنہائی میں بیٹھی ہوئی روتی رہتی تھی۔ میرے اس غم میں نہ کوئی شریک ہو سکتا تھا اور نہ ہی میں اس کا اظہار کسی دوسرے سے کر کے دل کو ہلکا کر سکتی تھی۔ وہ میرا پوشیدہ غم تھا۔ اندر ہی اندر اسے برداشت کرنا تھا۔
اس دردناک خبر نے مہرشی جٹاشنکر کے دل کو بہت بھاری ٹھیس پہنچائی تھی۔ میں نے انہیں خط لکھ کر تسلی دی۔ انہوں نے بھی مجھے ایک خط لکھا اور ہدایت کی کہ جس اسکول کی بنیاد دیال نے رکھی تھی اسے جاری رکھنا اور ترقی دینا ہی دیال کی روح کو ثواب پہنچانا ہے۔
میں اسکول باقاعدگی سے جاتی تھی۔ سارے کام ٹھیک ہو رہے تھے لیکن میرا دل اداس تھا۔ بظاہر میں ہنسنے کی کوشش کرتی لیکن اندر ایک طرح کی آگ لگی ہوئی تھی۔ دیال کی موت پر اسکول میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا اور اس میں جو تجویز پاس کی گئی وہ مہرشی کو بھیج دی گئی اور ایک دن کے لئے اسکول بھی بند رکھا گیا۔
میں کبھی کبھی رات کو جاگ اٹھتی تھی۔ روشنی تیز کر کے گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ کئی راتیں تو میں نے اسی طرح گذار دیں۔ دیال کا چہرہ میں اپنے تصور کے سامنے رکھ کر جب بہت دیر تک آنسو بہا لیتی تب کہیں میرا دل ہلکا ہوتا تھا۔
آزادی کے بعد مہاجرین کی جو حالت ہوئی تھی ٹھیک ویسی ہی اس وقت میری تھی۔ میرے سارے ارمان معدوم ہو گئے تھے۔ اب تو میری زندگی کا کوئی جینہ باقی نہ رہا تھا۔ دیال نے اپنے آخری خط میں مجھے اپنا دل کھول کر دکھا دیا تھا۔ لیکن وہ خط بھی میں نے پھاڑ دیا تھا۔ مجھے اپنا دل کھول کر دکھانے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس موقع کے انتظار میں ہی تھی مگر میری مراد بر آنے کے پہلے ہی سارا کھیل ختم ہو گیا۔ وصل کے پہلے ہی غم فرقت نے مجھے آن دبوچا۔
سماج اور یہاں کے رسم و رواج کے ہی باعث میری زندگی تباہ ہوئی تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ تو میرے جی میں آیا کہ اب اس دنیا کا منہ پھونک دوں۔ لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کر کے مجھے کیا ملے گا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ خود غرضی چھوڑ کر میں اجتماعی مفاد کو اہمیت دوں اور اسی کے لئے زندگی وقف کر دوں۔
اب میں سوچنے لگی کہ اگر ہمیں موزوں نظام قائم کرنا ہے۔ سماج کو بدلنا ہے تو یہ تبھی ممکن ہے جبکہ ہم بچپن سے ہی بچوں کے دل و دماغ میں صحیح قسم کی باتیں پیدا کریں۔ اونچ نیچ، چھوت اچھوت وغیرہ کا فرق دور کرنے کے لئے بچوں کو کمسنی میں ہی مناسب تعلیم دینی شروع کر دینی چاہئے۔ بچہ اس نازک بیل کی مانند ہوتا ہے جسے ابتدا میں حسب منشا گھمایا جا سکتا ہے۔ بڑا ہو جانے پر اس میں پختگی آ جاتی ہے اور تب اسے ڈھالنے میں دقت ہوتی ہے۔
چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جس سماج کے رسوم و قیود کی بدولت میری زندگی کا چمن تباہ و برباد ہوا، میرے ارمان معدوم ہو گئے، اس سماج کے نظام کو بدلنے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرنے سے زیادہ بہتر اور ضروری کچھ معلوم ہوتا ہے اور میں وہی کروں گی۔
میرے دل و دماغ کے سامنے دھرم پور کا اسکول تھا۔ جس دیال سے میں مخفی محبت کرتی تھی اور جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے یہ اسکول ان کی یادگار ہے۔ ہم دونوں سماج سے پچاس برس آگے —— [illegible]

موجودہ حالات کو بدلنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے متعدد قسم کی رکاوٹیں ہمارے راستے میں روڑہ بن کر سامنے آئے۔ کم از کم آنے والی پشت کو اس دور سے محفوظ رکھنے کے لئے میں جی جان سے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کروں گی۔ دیال یہ کام میرے سپرد کر کے گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بچپن میں مناسب تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے کس طرح بدمعاشوں کے گروہ تیار ہو جاتے ہیں۔ دھرم پور کے بدمعاشوں نے میرے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ لیکن میں نے وسیع النظر ہو کر انہیں کے بچوں کو اسکول میں اچھی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ بھلا بے کا غصہ داڑھی پر اتارنے سے کیا فائدہ؟ ان چھوٹے چھوٹے، معصوم بچوں نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ میں انہیں صحیح تعلیم دے کر اچھے شہری بنا دوں گی۔ آگے چل کر جب ان کے باپ سزائیں ختم کر کے واپس آئیں گے تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے میرے لئے کیا کیا تھا اور میں نے ان کا بدلہ کس طرح اتارا ہے۔ شاید میرے احسان کے بوجھ سے وہ شرمندہ ہوں۔

میں نے دھرم پور کے مدرسہ کے لئے اپنا تمام وقت دے دیا تھا۔ روز صبح اٹھتے ہی میرا پروگرام گھڑی کی طرح شروع ہو جاتا۔ اب تو روزانہ دو تین لڑکوں کے گھر جا کر میں ان کی جانچ کرنے لگی۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ وہ کب سو کر اٹھتے ہیں، کب اور کس طرح پڑھتے ہیں، نہاتے ہیں، ان کے گھر میں کس قسم کی مشکلات درپیش ہیں، رات کو وہ وقت پہ سوتے ہیں یا نہیں۔ ان کے والدین یا سرپرستوں کی کون سی بری عادتیں ہیں جو ان کو لگ سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ سینکڑوں باتوں کی میں تحقیق کرتی اور بڑی خوش مزاجی اور محبت کے ساتھ انہیں صحیح راستہ دکھاتی تھی۔ ننھے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ میری اس قدر بے غرض اور قابل قدر محبت دیکھ کر وہ لوگ میری عزت کرنے لگے۔

اسکول کے ہر ایک طالب علم کو میں نے اندر باہر سے بخوبی پہچان لیا تھا۔ عقلمند لڑکوں کو میں زیادہ کام دیتی تھی۔ متوسط قسم کے لڑکوں کی میں حوصلہ افزائی کرتی رہتی اور غبی الذہن لڑکوں پہ کبھی ناراض نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس انہیں پیار محبت سے سب کچھ سمجھایا کرتی تھی۔ ہر لڑکے کا رجحان کس طرف ہے، یہ میں نے ایک رجسٹر میں نوٹ کر لیا تھا اور اسی کے بموجب میں انہیں مختلف قسم کے کئی کام دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے بہت تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگے۔

گاؤں والے بھی اب اسکول کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے اور ہر کام میں ہمیں ان کا تعاون ملنے لگا۔

صوبائی سرکار کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کا معائنہ کر کے اسکو منظوری اور مالی امداد دیدی تھی۔ معائنہ کرنے والوں نے اسکول کو مثالی ادارہ کہا تھا اور اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس موقع پہ اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر اندر جیت دیال کی تصویر کی نقاب کشائی بھی ہوئی۔ یہ تصویر گاؤں کے ہی ایک معزز شخص نے اسکول کو نذر کی تھی۔

اسی دوران دھرم پور میں ہیضہ کی بیماری پھیل گئی۔ اسوقت تک جو میری اسسٹنٹ اور اسکول کے طلباء نے گاؤں والوں کی جو خدمت کی وہ بے مثال تھی۔ دو چار کیس ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں نے اپنی کوششوں سے اس بیماری کو ہمیشہ کے لئے گاؤں سے ختم کر دیا۔ گاؤں والوں نے ہماری بڑی عزت افزائی کی اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔

بونے کے وقت کئی کاشتکار مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ بہت سے رقبہ میں بونے کو باقی تھا۔ وقت کم تھا اور ان کے پاس مزدوروں کی کمی تھی۔ اسوقت بھی اسکول کے طلباء نے ان کی مدد کی تھی۔

گاؤں کے اسی قسم کے متعدد کاموں میں مدد کر کے ہم نے مقبولیت حاصل کی۔

سالانہ امتحان ہوا۔ اکثر طالب علم کامیاب ہو کر آگے کی جماعت میں پہنچ گئے۔ محکمۂ تعلیم نے نویں جماعت کھولنے کی اجازت دے دی۔ آٹھویں جماعت میں داخل ہونے کے لئے طالب علموں کی بھیڑ لگ گئی چنانچہ آٹھویں میں دو سیکشن اور نویں میں دو سیکشن کھولنے پڑے۔ اس طرح دو جماعتوں میں پانچ سیکشن ہو گئے اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اب اسکول میں جلد دسویں جماعت کھل جائے گی۔ پانچ سیکشن ہوتے ہی محکمہ نے چار استاد اور مقرر کر کے بھیج دیئے۔

والد صاحب پھر میرے لئے بر تلاش کرنے لگے تھے۔ ایک روز کھانے کے بعد انہوں نے مجھے یہ بتایا تو میں نے ان سے کہہ دیا ——

"پتا جی، اب آپ میری شادی کی فکر نہ کریں۔ اب میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیا مطلب؟ کیا تو عمر بھر کنواری ہی رہے گی؟"

"جی ہاں۔"

"پھر اتنی بڑی جائداد کا کیا ہوگا؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پتاجی اگر میری شادی ہو جاتی اور میں صاحبِ اولاد ہوتی تو آپ کی اس جائداد سے ان کو فیض پہنچتا۔ لیکن یہ فیض محدود ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ اس جائداد کے مالک ہیں، مگر دراصل یہ تمام جائداد دھرم پور کے گاؤں والوں کی ہے۔ غریب کسانوں کی سخت محنت و مشقت کی ہی بدولت ہمیں ہر سال لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ ان غریبوں کی حالت ہم پر ظاہر ہی ہے ــــ وہ بھوکے ہیں، ننگے ہیں اور بے گھر و بے در ہیں۔ ان کی اولاد کی تعلیم کا کوئی موزوں بندوبست نہیں ہے۔ دھرم پور کے اسکول کو آپ ہی کا نام دیا گیا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ آپ اپنی ساری دولت "عوامی تعلیمی ادارہ" کے لئے وقف کر دیں تاکہ آپ کا نام ہو، شہرت ہو اور آپ کی اس سخاوت سے تمام گاؤں والوں کا بھلا ہو۔ آج کل کا زمانہ یہ نہیں کہ پڑوسی بھوکوں مرے اور ایک شخص پیٹ بھر کر کھائے۔ اگر آج آپ خود ایسا نہیں کریں گے تو کل جب لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے اس نظریہ کو نیست و نابود کر دیں گے۔

گاؤں والوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی غرض سے ہی آپ نے اسکول قائم کیا ہے۔ اس کا نام بھی آپ پر ہی رکھا گیا ہے۔ آپ کی بیٹی ہی اس کو چلاتی ہے۔ اور ادھر آپ کی دولت و جائداد کا کوئی صحیح وارث بھی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں عوام کو ہی اس کا وارث سمجھ کر ان کے مفاد کے لئے اپنی ساری جائداد وقف کر دینے میں کیا حرج ہے؟ آج تک آپ نے نہ جانے کتنے اداروں کو پیسہ دیا ہے۔ آپ ہی کے پیسے کے بل پر متعدد ادارے اب تک زندہ ہیں، اس لئے آپ کے لئے ایسا کرنا ہی بہتر ہے۔"

پتاجی بڑے سخی تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انہیں میری رائے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ پھر بھی مجھے تسلی دینے کے لئے انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے جو کچھ مناسب ہوگا کروں گا۔"

میں نے تو اپنی شادی سے انکار کر کے والد صاحب کو ایثار کا سبق پڑھایا تھا۔ مگر وہ انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ حسبِ معمول اپنا کام کاج تو کرتے تھے لیکن ان کا چہرہ افسردہ رہتا تھا۔ اب ان کا رجحان مذہبی چیزوں کی طرف پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اکثر کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔

ماں کے انتقال کے بعد سے ان کی صحت بھی گرنے لگی تھی ــــ کبھی کھانسی، کبھی ٹھنڈ، کبھی جسم میں درد تو کبھی ہلکا سا بخار۔ اب انہیں کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہی تھی۔ اور ایک روز.....

میں اسکول میں تھی۔ والد صاحب میرے اسکول جانے سے پہلے ہی پنچایت گھر چلے گئے تھے۔ میں آفس میں بیٹھی ہوئی اسکول سے متعلق خط و کتابت کر رہی تھی۔ اسی وقت دولو دوڑتا ہوا آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو کر سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں اپنے کام میں محو تھی۔ دولو کب آیا اور وہ کیوں رو رہا تھا؟ یہ میری ذرا سمجھ میں نہ آیا۔ میں ایک دم گھبرا اٹھی اور اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ کہنے لگا ــــ

"منی بیبی، والد جی چل بسے....."

مجھے ایکدم دھکا سا لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہونٹ لرزنے لگے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر میں رونے لگی۔

دوسرے استاد بھی وہاں آن پہنچے۔ اسکول کے طلباء نے مجھے گھیر لیا۔ دوسرے استادوں نے بچوں کو چھٹی دیدی۔ ہم سب لوگ پنچایت گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی اور آنسو بہاتی ہوئی میں پتاجی کی لاش کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پنچایت گھر کے سامنے اسکول کے تمام طالب علم جمع ہو گئے۔ والد صاحب کی حرکتِ قلب رک جانے سے ان کا انتقال ہوا تھا۔

سب طرف بذریعہ تار یہ خبر پہنچا دی گئی۔ ہم پتاجی کی لاش کو اپنے گھر لے آئے۔ گھر کے صحن میں لوگوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ دو تین گھنٹے میں ہی کئی موٹریں مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں جن میں ہمارے رشتہ دار، ہمدرد اور والد صاحب کے دوست احباب تھے۔ مہرشی جٹاشنکر بھی فوراً کار سے آ گئے۔

دریائے کرشنا کے ساحل پر ٹھیک اسی جگہ جہاں میری ماں کو جلایا گیا تھا وہیں پتاجی کو بھی جلایا گیا۔ سب لوگ مجھے تسلی و تشفی دینے کی کوشش کر رہے تھے، پھر بھی اس صدمہ سے میں بیمار ہو گئی۔ میرے دوسرے

عزیزوں نے پتاجی کی آخری رسوم ادا کیں۔ میرا بھی علاج شروع ہوا۔ دس پندرہ روز بعد مجھے افاقہ ہونے لگا لیکن پھر بھی دل اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ والد صاحب کا خیال آتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

اب اس دنیا میں میرا کوئی پرسان حال نہ رہا تھا۔ میں یتیم ہو گئی تھی اور اسی کا غم مجھے بار بار ستاتا تھا۔

ایک روز میں نے ان کی تجوری کھولی تو سامنے ہی ایک لمبا سیل بند لفافہ دکھائی دیا۔ اس پر بڑے حرفوں میں لکھا تھا ——

میرا وصیت نامہ۔

میں نے وہ لفافہ کھولا اور اندر سے کاغذ نکال کر اسے جلدی جلدی پڑھ ڈالا۔ اس کی کچھ اہم باتیں یہ تھیں۔ ——

میری موت کے بعد میری جائداد کو مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کر دیا جائے .....

۱۔ دھرم پور کے اسکول کے سائنسی ساز و سامان کے لئے پانچ ہزار روپے نقد۔

۲۔ دھرم پور میں ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کیا جائے جس میں غریبوں کا علاج مفت ہو۔ مندر کے پاس واقع مکان میں اس ہسپتال کے لئے وقف کرتا ہوں۔ ہسپتال کے اخراجات کے لئے میری جائداد میں سے پچاس ہزار روپے لئے جائیں۔

۳۔ میری اکلوتی بیٹی کنول کے لئے گاؤں کے نزدیک والے دو کھیت اور ایک باغیچہ اسے دیئے جائیں۔ میرے رہنے کا مکان بھی اسے ہی دیا جائے۔

۴۔ میری بیوی کی بیوہ بہن کے گزارے کے لئے دو ہزار روپے دیئے جائیں۔

۵۔ سانگلی کے وِنتا آشرم کو میری بیوی کے نام پر پانچ ہزار روپے دیئے جائیں۔ ان روپوں کا خرچ کسی طرح بھی ہو مگر اس کے ساتھ میری بیوی کا نام ضرور وابستہ ہونا چاہئے۔

۶۔ دھرم پور کے قدیم جین مندر کو دو ہزار روپے دیئے جائیں۔

۷۔ گھر کی تمام چیزوں اور زیورات پر میری بیٹی کا حق ہے۔

۸۔ بانکا اور دولو نے ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے چنانچہ ہماری زمین میں سے انہیں کاشت کے لئے چار ایکڑ زمین مفت میں دے دی جائے۔

۹۔ دیگر چھوٹے بڑے اداروں کے لئے میری جائداد میں سے دس ہزار روپے علیحدہ رکھ دیئے جائیں۔ کس ادارہ کو کتنی رقم دی جائے اس کا فیصلہ میری بیٹی کنول کرے گی۔

۱۰۔ مہر شی جی شنکر نے جذبۂ ایثار کے ساتھ عوام کی خدمت کی ہے، لہٰذا میری بقیہ تمام جائداد ان کے تعلیمی ادارہ کو دے دی جائے اور اسی جائداد کی آمدنی سے دھرم پور کا اسکول چلایا جائے۔ اس اسکول میں کم از کم ایک ہزار طلبا ہوں۔ وہاں کے ہونہار طالب علموں کو اسی فنڈ میں سے ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ دیئے جائیں۔ ولایت جانے والے طلبا کو بھی اسی فنڈ میں سے مدد دی جائے۔ وظیفے دیتے وقت طالب علموں کی قابلیت مدنظر ہو۔ ذات پات، مذہب یا خاندان کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

× × ×

والد صاحب کی اس قربانی کو دیکھ کر مجھے ان کی یاد آ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

میں نے وصیت نامہ کے مطابق کارروائی شروع کر دی۔ جن اشخاص اور اداروں کو جو دینا تھا دے دیا اور بقیہ ساری جائداد مہر شی جی شنکر کو دھرم پور بلا کر ان کے حوالے کر دی۔ اخبارات میں اس کی تفصیل شائع ہوئی اور ان کی خوب تعریف کی گئی۔ مہر شی نے دھرم پور میں ایک جلسہ منعقد کروایا اور اس میں جو تقریر کی اس میں والد صاحب کی سخاوت اور عظمت پر بہت کچھ کہا۔ اس ضمن میں میری تعریف کر کے انہوں نے میری بھی حوصلہ افزائی کی۔

مہر شی نے مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے اپنی بیٹی کی طرح گلے سے لگایا اور اپنا سارا پیار مجھ پر انڈیل دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ بہتری ہوتی ہے۔ تیری ماں چلی گئی۔ پتاجی بھی چل بسے۔ اب تو یتیم ہو گئی ہے۔ لیکن تو اس قدر سمجھدار ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ تو ان کے غم کو بھول کر اپنا کام مستعدی سے کرتی رہ۔ تیرا مستقبل شاندار ہے۔"

مجھے پتاجی یاد آ رہے تھے اور میری آنکھیں پُرنم تھیں۔ مہر شی نے مجھے دلاسا دیا اور چلے گئے۔

ہمیشہ کی طرح اسکول کا کام شروع ہو گیا۔ جیسا کہ مہر شی نے اپنی تقریر میں کہا تھا گاؤں کے لوگ مجھے دیوی سمجھنے لگے۔ مردوں کی نسبت عورتیں جذباتی ہوتی ہی ہیں چنانچہ ایک روز میں اسکول سے واپس گھر جا رہی تھی کہ راستے میں ایک عورت دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی ——

"مسّی جیسا، ذرا ٹھہریئے"
"کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"مجھے آپ کے قدموں کی خاک لینا ہے"
"میں دیوی نہیں ہوں"
پھر بھی اس نے مجھے روک لیا اور میرے پیروں کے دونوں انگوٹھوں پر ہاتھ ڈال کر اسے ایک کٹوری میں رکھ لیا۔
"اس کا کیا کرو گی؟" میں نے استفسار کیا۔
"میری بہو بڑی تکلیف میں ہے۔ بچہ نہیں ہوتا ہے" اس نے جواب دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ اس کی بہو کے بچہ بآسانی ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے اس عورت نے مجھے دو پیڑے لا کر دیئے، جس سے مجھے اس کا اندازہ ہوا۔

ایک سال میں میرے اوپر کیا گذری اور میری زندگی کہاں سے کہاں پہنچی اس کی ایک دھندلی سی تصویر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ عظیم شخصوں کے تجربات بھی بڑے مفید ہوتے ہیں۔

میں عظیم نہیں ہوں۔ میں تو ایک ادنیٰ سی عورت ہوں۔ میں سمجھتی ہوں میرے ان تجربات سے مجھ جیسے چھوٹے کئی لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ غلط بھی ہو مگر کم از کم یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ آج میری طرح کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو گاؤں میں بس کر تعلیم کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ پہلے پہلے گاؤں کے لوگ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مذاق بھی اڑانے لگتے ہیں لیکن جب کوئی بات انہیں جنچ جاتی ہے تو وہ ہماری تقلید بھی کرنے لگتے ہیں۔

ہمارا ملک آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن جب تک ہندوستان کا بچہ بچہ تعلیم یافتہ اور نیک سیرت نہیں ہو جاتا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ہم میں سے مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگ یہاں کا نظام باقاعدگی سے چلائیں گے اور اس سوراج کو قائم رکھ سکیں گے تو یہ آپکا محض خیال خام ہے۔

متفرق قسم کے مذہبوں اور طبقوں کے باعث ہمارے ملک کا جو نقصان ہو سکتا تھا ہو چکا ہے۔ آج بھی جو تنازعہ دکھائی دے رہا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہونے والا نظام تو کھڑا کر گر جائے گا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی شاہد ہماری تاریخ ہے۔

سماجی، مذہبی اور دوسرے سدِ راہ قیود توڑ کر جب مجھ جیسی لڑکی دیہاتی جیسے نوجوان سے شادی کر سکے گی تبھی ہم کہیں گے کہ سیکولر ریاست قائم ہو چکی ہے۔ وقت کا پلٹتا دھارا دیکھ کر ہر ایک کو پہلے اپنے ملک پر نظر ڈالنی چاہیئے اور پھر اپنی طرف۔ قومی مفاد کے آگے ذاتی مفاد کو بہتر سمجھنے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

سچا قومی سوراج تبھی وجود میں آئے گا جبکہ جہالت، مفلسی اور بیماریوں سے محفوظ ہو کر ہم سب اپنے اور سب کے مفاد کو پہچان سکیں گے۔

آپ کبھی دھرم پور تشریف لائیں تو مجھ سے ضرور ملئے گا۔ میں آپ کا دل سے خیر مقدم کروں گی۔ اپنا اسکول دکھلاؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ میرا اسکول دیکھ کر آپ کو انتہائی مسرت ہو گی۔

میں جو کہنا چاہتی تھی کہہ چکی اسے پڑھ کر کچھ ظریف نقاد کہیں گے کہ یہ ناول نہیں سوانح ہے اور کچھ کہیں گے سوانح نہیں ناول ہے۔ اس لئے میں آخر میں ایک مختصر سی کہانی اور سنا دوں۔

ایک جگہ ایک ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف سونا چڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف چاندی۔ دونوں طرف سے دو بہادر گئے اور آپس میں لڑنے لگے ـــــ ایک کہتا تھا کہ ڈھال سونے کی ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ چاندی کی۔ بہت دیر تک یہ تکرار ہوتی رہی حتیٰ کہ دونوں نے نیام سے تلواریں نکال لیں۔ اور لڑنے لگے۔ اگر کچھ دیر اور لڑتے رہتے تو دونوں کام آ جاتے لیکن خوش قسمتی سے ایک تیسرا شخص جو بہت سمجھدار تھا وہاں آ پہنچا۔ اس نے لڑائی کا سبب پوچھا۔ جب اسے سبب معلوم ہوا تو اس نے ڈھال کو دونوں طرف سے گھما کر دکھا دیا۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ یہ ناول ہو یا سوانح۔ اصل میں زندگی ہے۔ تجربہ ہے۔ میری زندگی میں متعدد واقعات رونما ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہو گیا ہے اور اسی عالم میں میں نے اپنی زندگی کی یہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں، دل پریشان ہے اور دماغ بالکل ماؤف سا ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں میں نے جو اپنی زندگی کی یہ جھلک پیش کی ہے اس کی وجہ ہے میری زندگی کا ادھورا پن۔ میری طرح دوسروں کی زندگی بھی ادھوری نہ رہ جائے اس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ آپ تو مجھ سے ہمدردی ظاہر کریں گے ہی بس یہی میری تمنا بھی ہے۔

ایلنگو وادیگل

تامل زبان کا یہ رزمیہ آج سے سترہ سو (۱۷۰۰) سال پہلے (تقریباً سنہ ۲۰۰ء میں) لکھا گیا تھا۔ اور اب دنیا کی بہت کم ترقی یافتہ زبانیں ایسی ہوں گی جن میں اس کا ترجمہ نہ ہو چکا ہو۔

رزمیہ کا مصنف ایلنگو وادیگل جنوبی ہند کی حکومت چیرا کے بادشاہ چیرالاوتن کا چھوٹا بھائی تھا جو کہ حکومت کا جائز وارث تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی اس سے حسد کرتے تھے۔ ایلنگو وادیگل کو حکومت اور اس کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی پوری زندگی ہی موسیقی اور شاعری میں گزری تھی۔ وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور جنگلوں میں رہنے لگا۔ وہیں کچھ ایسے لوگوں نے اُسے یہ کہانی سنائی جنہوں نے اس کہانی کی ہیروئن کناکی کو دیکھا تھا۔ کہتے ہیں ایلنگو وادیگل کناکی کے حالات معلوم کرنے کے لئے برسوں سفر کرتا رہا۔

یہ ناولٹ ایک عظیم ترین کارنامہ ہے جس پر ان سترہ سو سالوں نے اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا۔ آج بھی اس میں تازگی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ناول اتنی مدت پہلے لکھا گیا تھا۔ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اتنی مدت میں سماجی اور سیاسی شعور کوئی ترقی نہیں کر سکا۔

ایلنگو وادیگل کو انسانی نفسیات پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس کے کردار ترقی پسند نظریات رکھتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں پر اُن کا ایمان ہے لیکن اُن میں تمام انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔

تامل میں اس رزمیہ کا نام "سلاپادھی کارم" یعنی "ایک پائل کی خاطر" ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "کوولن اور کناکی" کے نام سے ایس۔ پی۔ آئیر صاحب نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔ جہاں دیوی اور دیوتاؤں کا بہت ذکر ہے ان حصوں کو دانستہ طور پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ نام ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔

اس رزمیہ کا ایک اور انگریزی ترجمہ "سلاپادھی کارم" کے نام سے سری رام چندر دکشتر نے کیا ہے۔

ہم نے ایلنگو وادیگل کی تصویر حاصل کرنے کی
پوری کوشش کی۔ مگر بے سود .... بسنہ ۱۲ء کے
ایک مصنف کی تصویر دستیاب بھی کیسے ہوسکتی ہے
تامل انسائیکلوپیڈیا کا بیان ہے کہ مصنف کی دُنیا
میں کوئی تصویر موجود نہیں ہے۔



خلیق انجم

ایلنگو وادیگل
مترجم خلیق انجم

لاکھ بلائیں ایک نشیمن

اٹھارہ سو سال پہلے چولا کے عظیم و طاقتور بادشاہ کا دارالخلافہ پوہر تھا جو خود کو سورج دیوتا کی نسل سے بتاتا تھا۔ اسی بادشاہ کے جنگی ہاتھی پر خوفناک شیر کی تصویر والا جھنڈا ہوتا تھا۔

پوہر کا یہ خوبصورت شہر دریائے کیوری کے دہانے پر آباد تھا۔ اور اس کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں غرض ہر طرف تجارتی تعلقات تھے۔ پوری مملکت چولا کے لئے یہ شہر تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب چولا کوئی چھوٹی سی حکومت نہیں تھی۔ شمال میں تیرو پتی کے پہاڑوں سے لیکر جنوب میں دریائے ویلے تک اور مشرق میں بنگال سے لیکر حکومت چیرا کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

کاریکالا نام کے بادشاہ نے اس شہر کی شہرت اور خوبصورتی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے عالیشان محلات اور مندر تعمیر کرائے جن کے ساتھ عجیب و غریب باغات بھی تھے۔ دریائے کیوری کی طغیانی کو روکنے کیلئے اس نے ایک بہت بڑا ڈیم بھی بنوایا۔ آبپاشی کے لئے بہت سی نہریں بھی نکلوائیں۔ اس کی تعمیر میں اس کی رعیت کے مزدور بھی تھے اور بارہ ہزار وہ قیدی بھی تھے جو سیلون کی لڑائی میں اس کے ہاتھ آئے تھے۔ ان نہروں کی وجہ سے تنجور جنوب کا سب سے بڑا غلہ برآمد کرنے والا صوبہ اور پوہر سب سے بڑی بندرگاہ بن گئی۔ موتی اور مونگے کی تجارت کیلئے تو یہ شہر پہلے ہی سے مشہور تھا۔

یہی وہ بادشاہ تھا جو کوہ ہمالہ پر گیا تھا اور جہاں اس نے ایک چٹان پر اپنے جھنڈے کی نشانی شیر کھدوائی تھی۔ اس نے ناگا قبیلے کو شکست دے کر چیتا پلم کا الحاق اپنے ملک سے کر لیا تھا۔ دینا کی لڑائی میں چیرا کے بادشاہ کو شکست دی تھی اور سیلون پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔

اندرا کا تہوار تو پہلے ہی منایا جاتا تھا۔ اس نے کچھ اور تہوار منانے شروع کئے جن سے پوہر میں اور بھی رونق آ گئی۔ پوہر شہر تین میل چوڑا تھا اور دو بڑے حصوں میں تقسیم تھا ایک تو مارو ور پکم...... جو ساحل سے ملا ہوا تھا۔ جہاں غیر ملکیوں کے عالیشان مکانات، گودام اور ایسے بازار تھے جن میں ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ یہاں بہت دُور دُور کے ممالک کے ملاح دکھائی دیتے تھے۔ اس بازار میں سلک، مونگے، موتی، سونا، جواہرات، صندل، وغیرہ بھرا پڑا تھا۔ اور گندم کی خرید و فروخت الگ تھی جو اٹھارہ قسم کا تھا۔

دھوبی، بڑھئی، لوہار، کمہار، جوہری، شراب فروش، مچھلی والے، موچی، درزی، موسیقار، نمک فروش، گوشت، تیل، چھیلے، اور کپڑا بیچنے سب کے بازار الگ الگ تھے۔ اور خوانچہ فروش پھول، خوشبوئیں، وغیرہ بیچتے ہوئے ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔

شہر کا دوسرا حصہ پٹینا پاکم تھا ایک کھلے میدان نے اسے دوسرے سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس میدان میں روز ایک بازار لگتا تھا پٹینا پاکم میں بادشاہ کا محل تھا اسی حصے میں تجارت کرنے والے شہزادے اپنے عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ برہمن، کھتری، جیوتشی، وید، جواہرات کا کام کرنے والے، مشہور درباری اور رقص کرنے والے وغیرہ سبھی یہیں رہتے تھے۔

شہر کے وسط میں بڑے چوراہے پر [illegible] کا مندر تھا جس کے متعلق لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ سات گز دہاڑتا ہے جو آواز مندر سے دس میل دور تک سنی جا سکتی ہے۔ اور اپنے رستے سے تمام چوروں، ٹھگوں اور بدمعاشوں کو باندھ لیتا ہے۔

کھلے بازار میں سامان کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ بس ہر چیز پر اس کا وزن اور مالک کا نام لکھا رہتا تھا۔ اس قیمتی سامان کیلئے کوئی چوکیدار تھا نہ کوئی تالا...... لوگوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی چور وہاں سے کوئی سامان اٹھاتا تو [illegible] اسے اپنی طاقت سے رات بھر وہیں گھماتا رہتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی اور بادشاہ کے آدمی چور کو گرفتار کر کے جاتے

مار دیتے۔ شہر میں اور بھی مندر تھے۔ ان میں سے ایک وشنو کا مندر تھا۔ جس میں وشنو کہکشاں سے سانپ پر ایک خاص رومانی انداز سے سو رہے تھے۔ باقی مندر شیو جی، اندرا اور گنیش کی دیوی کو سادی کے نام سے تھے۔

اس شہر میں ایک بہت مشہور تجارت کرنے والا شہزادہ مینا کن رہتا تھا۔ اس کے تمام جہاز اور سامان فروخت سمندر میں تھے۔ اسے حکومت کی طرف سے بے انتہا فوج ملی ہوئی تھی۔

مینا کن اور اس کی بیوی اندل عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ مدتوں سے انھیں صرف ایک بچے کی آرزو تھی۔ لکشمی دیوی کی بے انتہا پوجا اور بہت کچھ نذر پیش کرنے کے بعد ان کے ہاں ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام کنا کی رکھا گیا۔ وہ چودہ سال ہی کی تھی کہ ہر شخص کے ہونٹوں پر اس کا نام رہنے لگا۔

کنا کی اس قدر خوبصورت اور حسین دوشیزہ تھی کہ تمام دنیا کے لوگ اسے لکشمی دیوی کہا کرتے۔

پوہر شہر میں ایک اور دولت مند تاجر ماساتھون رہتا تھا۔ جس کے کاروباری قافلے ہر طرف جایا کرتے تھے۔ آپ یاشی کی تہریں بننے سے پہلے ایک دفعہ زبردست قحط پڑا تھا۔ اور ہزاروں غریب بھوکے مرنے لگے تھے۔ مگر ماساتھون نے ان غریب لوگوں کی مدد کی اور انھیں موت کے چنگل سے آزاد کیا۔ اسی لئے بادشاہ کی نظر میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اور دربار کے شرفا میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا ایک حسین لڑکا کوولن تھا۔ جو ابھی سولہ سال کا ہی تھا۔ شہر کے لوگ اس خوبصورت نوجوان کو شیو کا لڑکا کہا کرتے تھے۔

عام طور پر لوگوں کی یہ پیشین گوئی تھی کہ کنا کی اور کوولن کی شادی ہو جائے گی۔ ایک دن کوولن کے ایک دوست نے اسے کنا کی کے حسن کی داستان سنائی اور بتایا کہ صرف یہی ایک ایسی لڑکی ہے جو اس کیلئے مناسب ہے۔ اسی طرح کنا کی کی سہیلی نے اسے کوولن کی خوبصورتی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ پوہر میں صرف یہی وہ لڑکا ہے جس سے وہ شادی کر سکتی ہے۔

فطری طور پر دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا ایک دن دونوں ایک تہوار منانے میں شریک تھے۔ کہ دونوں نے چند لمحوں کیلئے ایک دوسرے کو دیکھا اور کیوپڈ نے فوراً دونوں کو شکار کر لیا

دونوں مجبور تھے اور اپنے والدین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

کنا کی کا چودھواں سال پورا ہونے والا تھا۔ اب اس کی شادی لازمی کرنی تھی۔ اس کی ماں اندل بہت پریشان تھی۔ وہ اپنی پریشانی کو سینے میں چھپائے رہتی۔ اور کبھی شوہر سے نہ کہتی جسے کنا کی کی شادی کی قطعی پرواہ نہ تھی۔

اندل کے شوہر نے ایک دن پوچھا

۔ اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہو؟

۔ لیکن میرے خوشی سے ناچنے گانے کی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

شوہر کو غصہ آگیا۔

۔ کیا تم میں عقل نہیں ہے؟ دیوتاؤں نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا پھر بھی تم ناشکر گذار ہو۔

نوکروں کے سامنے اپنی بے عزتی دیکھ کر اندل غصہ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مینا کن رات کا کھانا کھا کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک اندل کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی۔ آخر اس نے ملازمہ کو بھیج کر بلا یا۔ حقیقت یہ تھی کہ مینا کن بھی اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کافی پریشان تھا۔ اور اسی سلسلہ میں اپنی بیوی سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

۔ آپ نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔" اندل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"۔ ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

۔ بقول آپ کے مجھ میں تو عقل ہی نہیں ہے پھر مجھ سے مشورہ کرنے سے کیا فائدہ؟"

" ارے غصہ مت ہو۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ دیکھو بات یہ ہے میں کنا کی کی شادی کے سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

۔ کنا کی کی شادی" اندل نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہی تو مسئلہ ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

"۔ ارے بیوقوف" مینا کن نے کہا۔ تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے خیال سے کیا میں پریشان نہیں ہوں"

" آج شام ہی کو ماساتھون مجھے ملا تھا۔ گفتگو کے دوران میں

اس نے اشارتاً یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی ہماری لڑکی سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیتا بھی کیسے؟ تم سے مشورہ تو کیا نہیں تھا۔ اس کا لڑکا کوولن معقول لڑکا ہے اور میرے خیال سے تو بہت اچھا جوڑا رہے گا۔"

"واقعی بہت ہی خوب رہے گا یہ رشتہ فوراً طے کر دیجئے۔" مینا نے بڑی بے قراری سے کہا۔ "بس وقت مت ضائع نہ کیجیے یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی آپ کو جواب دے دینا چاہیئے تھا۔"

"نہیں نہیں میں تم سے پوچھے بغیر کیسے ہامی بھر لیتا؟ اور ہاں اپنی طرف سے اس لڑکے میں خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ٹھیک ہے کوولن بہت اچھا داماد رہے گا۔ لیکن ہماری لڑکی یقیناً اس سے اچھی بہو رہے گی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے لیکن کل جب آپ مسادھون سے ملیں تو یہ رشتہ طے ہی کر دیں۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

اور پھر رات بھر یہ لوگ اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی کے مستقبل کے پروگرام بناتے رہے۔ صبح سے تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں سو گئے۔

دوسرے روز مینا کن نے مسادھون کو بلایا اور شادی کی تجویز پیش کر دی۔

مسادھون تو اس پیشکش سے اچھل پڑا۔ مگر اس نے تجویز پیش کی پہلے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔ تاکہ ان دونوں کی مرضی پر رشتہ طے کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کی مرضی نہ ہو تو خبر۔ کم سے کم اعتراض بھی تو نہ ہو۔"

"تم جانتے ہو" مسادھون نے کہا۔ "ان معاملات میں ان دونوں کا مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔ مجھے تو لڑکے کے باپ کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

کوولن اور کنا کو بلایا گیا۔ وہ دونوں عجیب کشمکش میں تھے اگرچہ انھوں نے والدین کو نہیں بتایا تھا لیکن وہ تو بہت پہلے یہ رشتہ طے کر چکے تھے۔ اس وقت ان میں کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ اب ان کا رشتہ کس کے ساتھ طے ہونے والا ہے۔ لیکن جب انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ان کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ دونوں کی نگاہوں سے جھلکتی ہوئی خوشی سے مسادھون اور مینا کن کو بالکل حیرت نہیں ہوئی ان کا خیال تھا کہ یہ رشتہ تھا ہی اتنا مناسب۔ غرض رشتہ طے ہو گیا اور بہت ہی تھوڑی مدت بعد شادی قرار پائی۔

خوبصورت خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر شہر کے تمام معززین کو مدعو کرنے گئیں۔

دولہا اور دلہن کا بہت شاندار جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں موسیقی کا پورا انتظام تھا۔ اور لوگ سفید ریشمیں چھتریاں لگائے ہوئے تھے یہ پرشکوہ جلوس شہر کی تمام بڑی سڑکوں سے گذرا۔

شام کے وقت یہ سب لوگ ایک میدان میں گئے جو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا نیلے رنگ کے شامیانے میں ہیرے اور جواہرات آویزاں تھے۔ شامیانے کے کھمبے خوبصورت پھول کے ہاروں اور قیمتی جواہرات سے سجے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پریوں کے دیس میں آگئے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد ان دونوں کو ستا پتی کیلئے منڈپ میں لایا گیا دولہا نے بادشاہ اور تمام معزز شہریوں کے سامنے دلہن کو ہار پہنایا۔ اس ہار کو عام طور پر "تالی" کہا جاتا ہے۔ کچھ حسین دوشیزاؤں نے رومانی گیت گانے شروع کئے اور کچھ صندل، پان، عطر اور پھول تقسیم کر رہی تھیں۔

نوجوان لڑکیاں تھالیوں میں چراغ جلائے دولہا دلہن کے گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہی تھیں۔ اے خدا اس جوڑے کو ہمیشہ ہمیشہ سلامت رکھیو۔ یہ دونوں ہمیشہ خوش و خرم زندگی گذاریں۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔

ان تمام رسوم کی ادائیگی کے بعد دولہا دلہن کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ جسے آج غیر معمولی طور پر سجایا گیا تھا۔

حجلۂ عروسی میں کوولن اور کنا کی ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

کوولن یاسمین کے پھولوں کا ایک ہار پہنے ہوئے تھا۔ اسکا تاگا کنول کے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کوولن نے اپنے گلے سے ہار اتار کر کنا کی کو پہنا دیا۔ وہ ایک گیت گنگنا رہا تھا۔

میرے محبوب آ کر چاند چمک سا جنے۔
مجھ سے عشق پیچاں کی بیل کی طرح چمٹ جا۔ تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے میں سما جائیں۔
مجھے زیادہ پریشان نہ کر۔۔۔۔
کوولن نے کناکی کو اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔
کناکی بھی جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی گیت تھا۔

"میں بہت پہلے تم سے ملی تھی
اور میں ہمیشہ سے تمہاری محبت میں غرق رہی ہوں
میرا دل درد و غم میں ڈوبا ہوا تھا
اور زندگی جہنم تھی
مگر اب جبکہ تم میرے پاس ہو، مجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے
میرے تمام خوف دور ہو چکے ہیں۔
میری پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں
تم سدا میرے دل میں رہے ہو
میرے سینے میں رہے ہو
خدا کرے ہم کبھی جدا نہ ہوں!"

۔آمین!۔ کوولن نے کہا مجھے بھینچ لو۔ میں تمہارے بوسوں کیلئے اتنا بے قرار ہوں جیسے کوئی بدمست شرابی شراب کا متمنی ہوتا ہے۔ کتنے شیریں ہیں یہ بوسے جیسے محبت کے پیالے میں شہد اور دودھ ملا دیا ہے۔

اف کتنی حسین ہے یہ دنیا۔۔۔ کیا محبوب کی آغوش سے زیادہ وشنو کی جنت ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر کی خوشی تم میں سما کر رہ گئی ہے۔ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیا محبت کا دیوتا کما اپنی رتی سے جدا ہو سکتا ہے۔

پھر دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ کوولن نے کناکی کے شانوں پر صندل سے محبت کی دیوی کی تصویر بنائی۔

میری زندگی۔۔۔ کوولن نے اسے بری طرح بھینچتے ہوئے کہا۔ تمام دیوی اور دیوتاؤں نے تم کو حسین بننے میں مدد دی ہے ۔۔۔ تمہاری موجودگی سے تو مور شرما جائے۔ سفید خوبصورت بگلے تمہارے حسن سے نادم ہو جائے گی۔ کس قدر میٹھی ہے تمہاری آواز۔ کوئل تمہارے سامنے کوا معلوم ہوتی ہے۔

تمہارے اس تابناک جسم کو کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں خوشبو کی ضرورت ہی کیا ہے تم میں سے تو خود خوشبو پھوٹتی ہے۔ یہ ہیرے اور جواہرات تمہارے حسن میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں تم پاربتی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ لکشمی دیوی بھی تمہارے آگے کچھ نہیں ہے۔ کناکی مجھے اپنے نرم و نازک بازوؤں کی گرفت میں لے لو۔

کناکی نے اپنی باہیں اس کے گرد حائل کر دیں ۔۔ یہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح کھوئے کہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا بھی انہیں خیال نہیں رہا۔

دوسرا باب

کناکی اور کوولن مسادھون کے گھر میں انتہائی خوشی اور مسرت کے دن گذار رہے تھے۔ کوولن کی ماں نے اس نئے جوڑے کی رہائش کا انتظام ایک علیحدہ محل میں کر دیا تھا۔ جسے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے نوکر اور خادم ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے۔ تاکہ کناکی اور اپنے عزیز، رشتہ دار، اور مہمانوں کی تواضع اچھی طرح کر سکتی۔

کوولن کی ماں بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نیا شادی شدہ جوڑا الگ ہی رہے تو اچھا ہے تاکہ ان کے بڑے مداخلت نہ کر سکیں۔

وقت تیزی سے بھاگتا رہا اسی طرح مسرتوں اور خوشیوں میں تین سال بیت گئے۔ اس عرصے میں وہ محبت کے دیوتا کما اور رتی دیوی کی طرح ایک دوسرے کی محبت میں غرق رہے۔ کناکی نے اس سلیقہ سے گھر کا کاروبار سنبھالا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ بحیثیت بیوی، میزبان اور غریب پرور کے وہ تمام شہر میں مشہور ہو گئی۔

کوولن کو بھی شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ وہ عوام میں دلچسپی لیتا تھا۔ فنکاروں کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا۔ خاص طور پر اسے موسیقی اور رقص میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی وینا اور بنسری کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بلکہ موسیقی کا ایک ماہر نقاد بھی تھا۔ رقص میں بھی اسے کچھ کم مہارت نہیں تھی۔ شہر میں کہیں بھی محفل رقص و سرود ہو۔ وہ ضرور اس محفل میں شریک ہوتا۔

اسی زمانے میں چترا پتی نامی ایک حسینہ اپنے گانوں اور رقص کی

وجہ سے پورے پور میں بہت مشہور تھی۔ جس محفل میں وہ ہوتی شائقین کا بے پناہ ہجوم ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ بادشاہ اور شہزادے بھی اس کے شائقین میں سے تھے۔

چترا پتی کی ایک بہت خوبصورت لڑکی مادھوی تھی جسے رقص و سرود پر غیر معمولی مہارت تھی۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنت میں رہنے والی اروسی تھی۔ جسے اگستیا نے بد دعا دی تھی کہ وہ زمین پر رقاصہ بن کر جائے۔ ہوا یہ تھا کہ اندر کی محفل میں اروسی اور نرادا اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اگستیا نے دیکھا کہ نرادا اور بنیا ٹھیک سے نہیں بجا رہی اور اندرا کے لڑکے جینتا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ نرادا کی وجہ سے اروسی کا رقص بھی خراب ہو گیا۔

یہی وہ اروسی ہے جو پوہر میں مادھوی کے نام سے پیدا ہوئی۔ وہ سولہ سال کی ہوئی تو اس فن میں کوئی اس کا مقابل نہیں رہا۔ وہ جب سات سال کی تھی تو اس کی ماں نے اس میں تمام صلاحیتیں دیکھ لی تھیں۔ اسے لئے شہر کے سب سے بڑے استاد کو اس کی تعلیم پر مامور کیا تھا۔

اور چودہ سال کی عمر تک وہ اس فن کی ماہر ہو چکی تھی۔

خوبصورتی، رقص اور سرود میں تمام حکومت میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں تھا۔ اسے دلیسی اور مارگی دونوں طرح کے ناچ پر پورا عبور حاصل تھا۔ بلکہ وہ فن رقص پر پوری طرح حاوی تھی۔

کوولن جب چترا پتی کے گھر ناچ اور گانے کے لئے جاتے تو مادھوی سے گانا ضرور سنتا اور اس کا رقص بھی دیکھتا۔ مادھوی نے اسے اچھا خاصا متاثر کر رکھا تھا۔ وہ سوچتا کاش کناکی کو بھی اس کی طرح رقص و سرود پر مہارت حاصل ہوتی۔ اسے اپنے ملک پر غصہ آتا جہاں ایسے فنون کو گھر کی بہو بیٹیوں کے لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کناکی مادھوی کی طرح ناچنا گانا جانتی تو اس کی دلکشی میں کتنا اضافہ ہو جاتا۔ ابتدا میں تو وہ مادھوی سے صرف ایک فنکار کی حیثیت سے ملتا تھا اس کے جذبات اس قدر معصوم تھے کہ ایک دن وہ مادھوی کو اپنے گھر لے آیا تاکہ کناکی کو اس کا فن دکھا سکے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حسن میں بھی مادھوی، کناکی سے کسی طرح کم نہ تھی اور فن کار کی حیثیت سے تو خیر وہ بے مثال تھی ہی۔

مادھوی نے جب پہلی بار کوولن کو دیکھا تھا تو نجانے اس پر کیا جادو سا ہو گیا تھا اور تب سے وہ کوولن کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش کرتی رہی اور آج تو خلاف معمول اس کی ہر حرکت پر کوولن اسے ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

کناکی نے سب کچھ غور سے دیکھا اور اسے پہلی بار خطرہ محسوس ہوا۔ لیکن فوراً کناکی نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوولن کو کناکی کے فن سے محبت ہے اور بس۔ اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں جب کسی اور نے کوولن پر شک نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔

مادھوی رقص کر رہی تھی۔ مگر یہ رقص کناکی کے لئے ایک ذہنی کرب بن کر رہ گیا۔ رقص ختم ہونے پر اس نے ایک سرد آہ لی جیسے مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔

کوولن نے چترا پتی اور مادھوی کو بہت قیمتی جواہرات کے نیکلس تحفتاً دیئے اور وہ دونوں اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

رات کو جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو کناکی نے کوولن کو پان بنا کر دیا۔ لیکن کوولن نے بہت لاپرواہی سے پان لیا جیسے وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ" کناکی نے پوچھا۔

"اوہ! کچھ بھی تو نہیں" اس نے جواب دیا اور بڑی گرمجوشی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ہمارے خواب بہت جلد پورے ہو جائیں گے" کناکی نے کہا۔

"خواب... کیسے خواب" کوولن نے پوچھا۔

کناکی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"میں بھی کتنا بیوقوف ہوں" کوولن نے کہا۔ "خدا نخواستہ تمہارا مطلب ایک خوبصورت بچے ہی سے تھا نا! کتنی پرانی بات ہے۔"

"مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو" کناکی نے کہا۔

زندگی میں آتے ہوئے اس نئے طوفان پر قابو پانے کی کناکی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میرا اس دنیا میں سوائے آپ کے کوئی نہیں ہے" کناکی نے

کہا۔ میرا سب کچھ آپ ہی ہیں۔ میرے باپ، ماں، بھائی، شوہر غرض ہر چیز آپ ہی ہیں۔

کودلن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کا چہرہ اپنے چہرے سے قریب کر لیا۔ وہ کناکی کی معصوم اور محبت سے لبریز آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کناکی کے ہونٹوں پر خشک آنسوؤں کے نشان تھے۔ پھر کودلن نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

تم رو رہی ہو۔ مگر کیوں؟

میں خوشی میں رو رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

نہیں ان آنسوؤں میں نمک بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں میری جان مجھے معاف کر دو۔ واقعی آج شام کے رقص نے بہت زیادہ متاثر کر رکھا تھا۔ اور اسی لئے میں تھوڑی بہت سرد مہری سے پیش آیا تھا۔ مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے رقص اور سرود سے اتنی محبت ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ کاش میرے دل میں محبت نہ ہوتی۔

مگر اس محبت میں خرابی کیا ہے۔ کناکی نے کہا۔ مجھے کوئی حسد نہیں ہے۔ آپ مادھوی کے ناچ اور گانے سے جتنا بھی چاہیں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری تمنا صرف یہ ہے کہ آپ خوش رہیں۔

میری زندگی۔ کودلن نے کہا تم کس قدر نیک اور شریف ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ خود کو تمہاری محبت کے قابل بنا سکوں۔ اس نے ایک بار پھر کناکی کو سینے سے لگا لیا۔ کناکی کے پیروں میں پڑی ہوئی پائلیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج اٹھیں۔

کتنی خوبصورت ہیں تمہاری پائل۔ ان کی قیمت کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

یہ پائل مجھے ماتا جی نے دیئے تھے۔ کناکی نے کہا وہ کہتی تھیں کہ یہ کسی بادشاہ نے تحفہ میں دیئے تھے۔ ان پائلوں میں ایسے جواہرات جڑے ہوئے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ دنیا میں ان کی کوئی مثال نہیں۔ کوئی ایسے پائل بنا ہی نہ سکا۔

کیا وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ تم جیسی خوبصورت اور حسین کناکی دنیا میں صرف ایک ہے۔ کودلن نے اسے ایک طویل بوسا دیتے ہوئے

لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اب مادھوی کے گھر میں تھا۔ کئی ماہ تک وہ چترا پتی کے گھر نہ گیا۔ بلکہ اس راستے سے بھی نہ گزرتا جہاں وہ رہتی تھی۔ کناکی سے اس کے تعلقات ہمیشہ کی طرح خوشگوار تھے۔

دن تیزی سے گزرتے رہے۔ کناکی تو اس خطرے کو بھول بھی گئی جو مادھوی کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

ماساتوان اور اس کی بیوی دن بھر اپنے بچوں کے ساتھ رہتے وہ اس نوجوان جوڑے کو "طائران محبت" کہتے تھے۔

وہ بے صبری سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب خدا ان کو پوتا یا پوتی دے گا۔ جنہیں وہ اپنے گھر لے جا سکیں گے تاکہ انہیں بے کاری سے نجات مل جائے۔

تیسرا باب

ابھی چھ ماہ بھی نہ بیتے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک خوفناک طوفان آ گیا۔

اندرا کا تہوار آ رہا تھا مادھوی پہلی بار اس تہوار میں ایک رقاصہ کی حیثیت سے حصہ لے رہی تھی۔ رقص کے اس مظاہرے کے بعد اسے ایک باقاعدہ پیشہ ور رقاصہ کی زندگی شروع کرنی تھی۔ کسی بڑے آدمی کا انتخاب کرنا تھا۔ جو اس کی سرپرستی کر سکے۔

تمام شہر کے لوگ بے چینی سے اس تہوار کا انتظار کر رہے تھے۔ جوان، بوڑھے، عورتیں غرض ہر ایک کے منہ پر مادھوی کا نام تھا۔

اس محفل میں بادشاہ کو بھی آنا تھا۔ اس لئے کودلن کو سرکاری طور پر حکم دیا گیا کہ وہ شرکت کرے۔ اس کے سب دوست پہلے ہی جا رہے۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شریک نہ ہوگا۔ اسے ڈر تھا کہ مادھوی کی محبت کی آگ پھر سے نہ سلگ اٹھے۔ لیکن اب تو وہ مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اگر نہ گیا تو لوگ نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ پھر یہ بھی تھا کہ مادھوی کی دلکش آواز اور خوبصورت رقص اس کا دامن دل کھینچے جا رہا تھا۔

کناکی بھی اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی وہ تو دل اور جان سے چاہتی تھی کہ اب کودلن اس محفل میں شریک ہو تاکہ کچھ لطف

اٹھاسکے۔ کنا کی کا خیال تھا کہ اب کودلن کے دل میں مسعادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں کودلن کے رویئے نے اس کے دل سے تمام خوف دور کر دیئے تھے۔

کناکی اپنے معصوم انداز میں سوچتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کودلن کا یہ پیار، یہ خلوص کبھی بھی ایک ناٹک کیلئے نہیں ہوسکتا۔ لیکن شاید کناکی نے خوبصورت آم نہیں دیکھے جو باہر سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اندر سے خراب ہوتے ہیں۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ کودلن نے کبھی اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ اس تمام عرصے میں اس کے دل میں مادھوی کی محبت کی چنگاری سلگتی رہی ہے۔

جوں جوں تہوار قریب آرہا تھا کودلن کی الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ تہوار کا دن قریب آتا گیا اور اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اس نئی الجھن کا کوئی حل اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ یا خدا! میں بھی کتنا بدنصیب انسان ہوں۔ میرے قدموں میں جنت ہے۔ کناکی جیسی محبت کرنے والی عورت جنت سے کم نہیں ہے۔ مگر میں مادھوی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آخر رقص و سرود میں کیا ہے جو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اس کے فرض کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مادھوی کے اس رقص کو نہ دیکھوں۔ مگر حالات بھی کتنے ناسازگار ہیں۔ خود میری پیاری کناکی چاہتی ہے کہ میں اس محفل میں شریک ہوں۔

میری وجہ سے کناکی کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔ اے خدا اس سے پہلے مجھے موت دے دے۔ مگر کیا کروں۔ جب میں مادھوی کا رقص دیکھتا ہوں مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ میں اس کا غلام ہوں۔ مگر اے خدا میں کیا کروں۔ میری حالت اس شرابی کی سی ہے جو ہوش میں ہونے پر شراب کو برا بھلا کہتا ہے۔ لیکن شراب اس کے قریب آتی ہے تو وہ خود کو روک نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ مادھوی کی ایک ہی مسکراہٹ مجھے تباہ کر دے گی۔ میں خود کو بالکل بھول جاؤں گا۔

رقص کے دوران میں اس کے ہاتھ پاؤں کی جنبشیں مجھے بدحواس کر دیں گی۔ اے خدا کیا کروں۔

وہ یونہی باغ میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جسے ایک سپاہی جان سے مار رہا تھا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے جھوٹی گواہی دی تھی۔ اس کی بیوی قریب ہی کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔

اسے اسے مت مارو۔ اس کے بعد میرے اس بچے کی پرورش کون کرے گا۔ عورت آہ و زاری کرتی رہی۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر کودلن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا میری پریشانی کا حل نکل آیا۔

اسے مت مارئیے۔ اس نے افسر سے کہا۔ میں خود کو اس کی جگہ پیش کرتا ہوں۔ کودلن نے آگے بڑھ کر سپاہیوں کے افسر سے کہا۔

کچھ دماغ خراب ہے تمہارا۔ افسر نے حیرت سے کودلن کی طرف دیکھا۔

مگر جب افسر نے کودلن کو غور سے دیکھا تو اس کا قیمتی لباس اور چہرہ دیکھ کر اسے یہ تو یقین ہوگیا کہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس نے مؤدبانہ سلام کیا۔ معاف کیجئے۔ جناب میں نے گستاخی کی۔ دراصل میں نے آج سے پہلے کبھی ایسی پیشکش نہیں سنی تھی۔

کوئی بات نہیں کودلن نے کہا۔ مگر منظور ہے آپ کو۔

ہرگز نہیں جناب۔ افسر نے جواب دیا۔ کیا میں اپنے ملک کے ایک نیک شہری کو قتل کرسکتا ہوں۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے بدلے میں جو بادشاہ کے دربار میں جھوٹ بولتا ہے۔ اور پھر کیا آپ کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔ میں نے بیس سال تک بادشاہ کی وفاداری سے خدمت کی ہے۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ۔

اسے جان سے مار دو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

ایک درد انگیز آواز بلند ہوگئی اور سپاہیوں نے اپنا کام کر دیا مرنے والے کی بیوی بے ہوش ہو کر گر گئی۔ کودلن اسے ہوش میں لایا۔ کودلن نے اسے سو اشرفیوں کی ایک تھیلی دی تاکہ وہ آرام سے زندگی گزار سکے۔ اور اس کا پتہ لکھ لیا تاکہ ایک ہزار اشرفیاں اور بھیج سکے۔

غریب عورت اس فیاضی کو دیکھ کر پھر رونے لگی۔

آپ نے میرے بچے کو بھوکے مرنے سے بچا لیا۔ عورت نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو اس کی جزا میں ایک خوبصورت

بچہ دے۔

افسر خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جناب مجھے کوئی انعام نہیں۔ افسر نے کہا۔ میں نے بھی تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

نہیں آج میں کچھ نہیں دے سکتا۔ کودلن نے کہا

میرا بھی ایک بچہ ہے جناب۔ اور غریب آدمی ہوں۔ افسر نے کہا

اچھا اپنے بچے کیلئے یہ لے جاؤ اور اس نے دس اشرفیاں دے دیں۔

افسر کو کودلن کی اس فیاضی پر خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔

دنیا واقعی اتنی بری نہیں ہے جتنی میں اب تک سمجھتا آیا تھا۔ آپ یقیناً ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو جسمانی طور پر جنت میں جائیں گے۔ خدا کرے لوگ ہزار ہا سال تک آپ کو یاد رکھیں۔

اندرا کا تہوار بڑی دھوم سے شروع ہوا۔ تماشائیوں سے سڑکیں بھری ہوئی تھیں۔ اور لوگوں کا سب سے بڑا ہجوم تو اس ہال کے قریب تھا جس میں مادھوی کا رقص ہونے والا تھا۔ سٹیج بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ پلیٹ فارم بہت بڑا تھا۔ جو شیشے کی طرح چمکتے ہوئے لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اور سٹیج پر عبادت اور روحانی فیض کیلئے تصویریں رکھی تھیں شمعیں اس طرح رکھی گئی تھیں کہ کھمبوں کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔ اور سلک کے شاندار شامیانے پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

بادشاہ کا جلوس بہت ہی پر شکوہ تھا۔ بادشاہ اور اس کے وزیر رتھ پر سوار تھے۔ ہاتھیوں پر سوار موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ رتھ اور ہاتھی پورے شہر کا چکر لگا کر اس ہال میں آئے۔

تمام موسیقار ساز لیکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آج مادھوی نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم پر سجے ہوئے جواہرات چمک رہے تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوئی اور رسم کے مطابق ایک کھمبے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس کی ماں چترا پتی اور باقی دوسرے کھمبے کے پاس کھڑے ہوگئے۔

دستور کے مطابق پہلے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا لوگوں کو نیکی دے اور برائیوں سے بچائے۔ دعا کے بعد تمام ساز ایک ساتھ بجائے گئے۔ تمام سازوں کی دھن میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔

مادھوی نے پہلے دیسی رقص پیش کیا۔ اور اس رقص کیساتھ ایک گانا گایا گیا۔ اس کے بعد دودکا رقص شروع ہوا۔ جو سنسکرت کا کلاسکی رقص تھا۔

وہ اتنی تیزی سے رقص کر رہی تھی جیسے عشق پیچاں کی بیل میں زندگی آگئی ہو۔ آج اس کا فن اپنے عروج پر تھا۔ بادشاہ اس رقص سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مادھوی کے گلے میں سبز پتوں کا ہار ڈالا۔ جس کا رواج تھا۔ اور ایک ہزار آٹھ اشرفیاں دیں۔ اس کے بعد بادشاہ اپنے محل کو واپس چلا گیا۔

مادھوی ماں کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی۔

گھر پہنچ کر اس نے گلے کا ہار اتارا۔ اور اپنی ملازمہ چیلم کو دیدیا۔ یہ رسم تھی کہ بادشاہ کا دیا ہوا ہار نیلام کیا جاتا اور جو کوئی اسے خرید لیتا وہ رقاصہ کا عاشق قرار پاتا۔

مادھوی کے گھر کے باہر شہر کے تمام سوداگر، زمیندار اور شرفاء کھڑے تھے۔

چیلم وہ ہار لیکر آئی اور بلند آواز سے کہا۔

یہ ہار ایک ہزار آٹھ اشرفیوں میں برائے فروخت ہے جو کوئی یہ ہار خریدے گا وہ خوبصورت مادھوی کا عاشق ہوگا۔

مادھوی کو امید تھی کہ کودلن یہ ہار خریدے گا۔ بلکہ چترا پتی کا تو خیال تھا کہ کودلن یہ ہار خریدنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیگا۔

کودلن نے جب سے مادھوی کا رقص دیکھا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی محبت کے جن جذبات پر اب تک اس نے قابو پائے رکھا تھا۔ آج انھیں جذبات نے اسے اپنے قابو میں لے لیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا سوائے مادھوی کے اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مادھوی کے عاشق ہونے کی سعادت وہی حاصل کرے گا چاہے نتائج کچھ بھی ہوں۔ جونہی اس نے چیلم کی آواز سنی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہار لے لیا چیلم کودلن کو مادھوی کے شبستان میں لے گئی۔

مادھوی اپنے بستر پر نیم دراز تھی جس پر پھول بچھے ہوئے تھے وہ بہت ہی باریک ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا خوبصورت جسم جھلک رہا تھا۔ کودلن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔ پوہر کا مشہور اور خوبصورت نوجوان کودلن آج اس

سے محبت مانگنے آیا تھا۔ وہ کودلن کو دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ کودلن نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیا۔ اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کودلن اس وقت خود کو جنت میں محسوس کر رہا تھا۔ آج مادھوی کیلئے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اپنا گھر اور اپنی وفادار بیوی تک کو فراموش کر بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ مادھوی کا ساتھ دے گا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے گھر واپس نہیں گیا۔ بلکہ اس نے اپنے ایک خالی مکان میں رہائش کا انتظام کر لیا۔

مادھوی اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ سوتے، جاگتے، کھاتے، پیتے ہر وقت اس کا تصور رہتا۔ بیوی، کاروبار اور والدین وغیرہ کو بالکل بھول گیا۔

دن بھر وہ تھا اور مادھوی . . .

چوتھا باب

کودلن اور مادھوی کو ساتھ رہتے ہوئے تین ماہ گذر چکے تھے۔ اور اب تو ان کی خوشی کی انتہا ہی نہیں تھی کہ مادھوی بہت جلد ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ لیکن چترا پتی کو اس بچے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مادھوی ابھی بہت کم عمر ہے اور بچے کی پیدائش کے بعد اس کی خوبصورتی کم ہو جائے گی۔ وہ پھر ایسا رقص بھی نہ کر سکے گی۔ پھر ماں کی خوبصورتی اور جوانی کی جڑوں کے لئے کلہاڑا ہوتا ہے۔

لیکن پھر کیا کیا جائے؟ مادھوی کی ملازمہ وسنت مالا نے پوچھا۔ اگر بچے کی پیدائش کے وقت ہم معمادی کی ہر ممکن حفاظت کریں تو اس کی صحت پر کم سے کم اثر ہو گا۔

یہی میرا خیال ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں میرا ذاتی تجربہ ہے۔ جب معمادی پیدا ہوئی تھی تو میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ مادھوی کی پیدائش کے بعد میرے رقص میں پہلی سی بات نہ رہی۔

لیکن اس سلسلے میں کوسیکر کا خیال بھی بڑا عجیب ہے وسنت مالا نے کہا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سب بڑی جسمانی، تہذیبی، ادبی، اور نئی پیدا اخلاقی ہے کہ ہم زندگی کی شمع آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دنیا کے اور سب نظریات محض بکواس ہیں۔

ممکن ہے یہ ٹھیک ہو۔ اور کوسیکر کا یہ نظریہ تو اس لئے ہے کہ وہ خود میری فنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی وجہ سے میں ایک ماہر رقاصہ نہ رہ سکی۔ کتنی مضحکہ خیز ہیں یہ باتیں۔ انسان اپنی ناکامیوں کو چھپانے کیلئے مختلف نظریات کے شیش محل میں پناہ لے لیتا ہے۔ چترا پتی بولے ہی جا رہی تھی۔ مگر وہ آدمی سمجھدار ہے اس سے پوچھیں گے کہ اس وقت مادھوی کی تیمارداری کس طرح کی جائے۔ اور اسے کیا خوراک دی جائے۔

اسی لمحے کوسیکر گھر میں داخل ہوا۔ وہ پینتالیس سال کا ایک برہمن تھا۔ چہرے سے مہذب انسان معلوم ہوتا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے جسم اور لباس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی صحت کا ہر ممکن خیال رکھتا ہے۔ اس وقت وہ پان کھا رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔

ارے آپ نے خود ہی پان کھا لیا۔ یہ بھی انتظار نہ کیا کہ چترا پتی آپ کو پان بنا کر دیں وسنت مالا نے کوسیکر سے کہا۔

لیکن دوسرے پان سے بھی مجھے انکار نہیں کوسیکر نے جواب دیا۔ ہاں مادھوی کا کیا حال ہے۔

اف یہ مرد کیسے ظالم ہوتے ہیں چترا پتی نے تنک کر کہا۔ آپ میری صحت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتے۔ یہ تو پرانی ریت ہے۔ جب ہم عورتیں ایک خاص عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو مرد ہمارے لئے پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔

نہیں بھئی۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ تم ابھی خاصی ہٹی کٹی ہو۔ پھر میں کیا پوچھوں۔ مادھوی اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

کیا صرف شکل سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کتنی الجھنیں ہیں جنہوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے چترا پتی نے کہا۔

تمہارا خیال ہے۔ آدمی کی ذہنی پریشانیاں صرف چہرے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا چہرہ دل و دماغ کا آئینہ ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ ایسی بھی پریشانیاں ہوتی ہیں جو مگر مچھ کا

طرح ہمیشہ پانی کی اندرونی سطح پر رہتی ہیں جنہیں پانی سے باہر آنے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ وسنت مالا ان دونوں کے بیچ میں بول پڑی۔

میں پچھلے بیس سال سے چترا پتا کے ساتھ ہوں۔ اس لئے پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

یہ تو خیر مجھے معلوم تھا کہ یہ ایسی باتیں کریں گے۔ چترا پتی نے وسنت مالا سے کہا۔ مگر مجھے تم سے ایک بہت اہم مشورہ لینا ہے۔ چترا پتا کوسیکر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تم جانتے ہو مادھوری ماں بننے والی ہے۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ پچھلی دفعہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو اس کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ ماں بننے والی ہے۔

بس آپ تو بہت بڑے وید ہیں چترا پتا نے کہا۔

تم یقین کرو کہ میں سمجھ گیا تھا۔ کوسیکر نے کہا دیکھو تم جانتی نہیں۔ ایسے موقعہ پر عورت میں بہت سی جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

ہم نہیں جانتے۔ آپ کے اس خیال کا بھی جواب نہیں ہے۔ حضور ہم لوگ براہ راست ان تجربوں سے گذرتے ہیں۔ ہماری معلومات تجربہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ آپ کی طرح نہیں کہ کرم خوردہ کاغذوں پر لکھے ہوئے پچھلی نسلوں کے تجربات پڑھ لئے اور وید بن بیٹھے۔

تم بھی مذاق کر رہی ہو مریض اپنے مرض کو وید سے بہتر نہیں جانتا۔ اگر تمہارا خیال ٹھیک ہوتا تو پھر وید کی ضرورت نہ رہتی ہر مریض اپنا علاج آپ کر لیتا۔

تو کیا ماں بننے کی تیاری کرنا کوئی مرض ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

نہیں میں نے کب کہا کہ یہ کوئی مرض ہے۔ میں نے تو صرف ایک مثال دی تھی۔ ورنہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ صحت مند چیز ہے۔ اگر مادھوری ایسے وقت میں کھانے اور پینے کی پابندی کرے تو خطرہ ہو یہی تو میرا بھی مطلب ہے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ اسے کھانے کو کیا دیا جائے۔ جس سے اس کی صحت برقرار رہے اور بچے کی پیدائش سے اس پر کوئی اثر نہ پڑے۔

اس وقت اسے اپنا ذہن تمام الجھنوں سے دور رکھنا چاہیئے اور اس سے کہنا کہ روز دو گلاس دودھ اور چار گلاس تازہ پانی پئے

اتنا پانی کیوں؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

اپنے لئے اور اس بچے کے لئے۔ اس نے جواب دیا۔

بچے کیلئے۔ ابھی تو وہ دو ماہ کا بھی نہیں ہے۔

ہاں! لیکن اتنی مدت میں بچہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ کوسیکر نے ہاتھ کا انگوٹھا دکھلاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی بن جاتے ہیں۔ بلکہ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بھی بن جاتی ہیں۔

کیا مطلب؟ اس انکشاف نے دونوں عورتوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

ہاں جناب ابھی تو وہ باتیں ہیں۔ جو آپ عورتیں نہیں جانتیں۔ حالانکہ آپ سب ماں بنتی ہیں۔ کوسیکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن اتنا چھوٹا بچہ غذا کیسے کھا سکتا ہے۔ وسنت مالا کی حیرت ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔

خدا نے ایسے ذرائع پیدا کر دئے ہیں کہ بچہ خود غذا لیتا رہتا ہے تم نے وہ نال تو دیکھی ہوگی جو ماں اور بچے کو ایک کر دیتی ہے۔ بس اسی نال سے بچے کو بہترین غذا اور ہوا ملتی رہتی ہے۔ کوسیکر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

کتنی عجیب بات ہے؟

اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ چھ ماہ سے پہلے بچے میں حرکت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور پھر بھی غذا لیتا رہتا ہے۔ پانی، کھانا اور ہوا سب کچھ اسے ملتا رہتا ہے۔

کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ بچے کی جنس کیا ہے وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوسیکر نے کہا۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد سب نہ دیکھے جنس پڑھ سکے۔

لیکن کچھ جیوتشی تو بالکل ٹھیک پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وسنت مالا نے پوچھا۔ انہیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ تو ایک طرح کا جوا ہے۔ بالکل ایک کاروبار ہے جس میں پچاس فیصدی نفع کی امید ہوتی ہے اور پچاس فیصدی نقصان کی۔

کیا مطلب یہ نفع نقصان کیا ہے۔ وسنت مالا نے پوچھا۔

ایک دفعہ ایک جیوتشی صاحب تھے انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک صاحب کے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور واقعی لڑکا ہوا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی میں ان کے پاس گیا۔ بڑی منت اور سماجت سے انہوں نے راز بتایا اور راز صرف یہ تھا کہ وہ ایک پرچے پر لڑکا لکھ دیتے اور دوسرے پر لڑکی دونوں کو بند کر کے ایک اٹھا لیتے اور پیشین گوئی فرما دیتے۔ مگر میں

مجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس لئے میں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔

اچھا ایک بات اور بتائیے۔ وسنت مالا نے پوچھا ہم نے سنا ہے قوتِ ارادی سے بچے کی جنس بدلی جا سکتی ہے کیا یہ ممکن ہے؟

ہاں ممکن ہے؟ مگر صرف دیوتاؤں کیلئے! انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اچھا مادھوی کے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ چتراتی نے پوچھا۔

میرا خیال ہے لڑکی ہوگی۔ کوسیکر نے کہا۔ کیونکہ مادھوی زیادہ طاقتور ہے۔

طاقت کا کیا تعلق؟

جنسی اعتبار سے جو بھی طاقتور ہو بچہ اس کی جنس پہ ہوگا۔

تو اس کا مطلب ہے کہ چتراتی آپ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہاں بھی تو لڑکی ہوئی تھی۔

بالکل اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں طاقتور ہوتا تو دوسری شادی کر کے باقاعدہ گھریلو زندگی نہ گزارتا۔ کوسیکر نے کہا۔

آپ کا شکریہ! مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ چتراتی نے کہا۔

اب ہم دونوں اس عمر سے گزر چکے ہیں جب اپنی تعریف سے ہمیں شرم آتی تھی۔ اب تو ہم سچی بات کہہ سکتے ہیں۔

اچھا اور بتاؤ مادھوی کو کیا غذا دی جائے۔ چتراتی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

اس کو جتنے پھل اور ترکاری دے سکتی ہو دو۔ شراب اور گوشت بالکل مت دینا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہی ہدایات تم نے مجھے بھی دی تھیں۔ چتراتی نے کہا۔

اور ہماری ہدایات پر عمل کر کے تم کتنے خوبصورت بچے کی ماں بنیں۔

لیکن میں ماں بننے کے بعد پہلی سی فنکار تو نہ رہی۔

تمہارا خیال غلط ہے۔ تمہارے فن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تم بہت عرصے تک پورے شہر کی قاصد رقاصہ رہی ہو۔ کسی نے تمہیں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب مادھوی نے اپنے فن کا چراغ جلایا تو تمہارا چراغ مدھم پڑ گیا۔ تمہیں مادھوی کے فن سے نقصان پہونچا ہے اس کی پیدائش سے نہیں۔۔۔۔

اچھا مادھوی کیلئے کوئی اور ہدایات۔ چتراتی نے پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

پھر ماہ کے بعد مادھوی کو اپنے کمرے میں سلانا۔ اس کے بعد کوولن کو صرف باتیں کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خیر کچھ کروں گی۔ مگر جناب یہ بالکل نئی ہدایت ہے میری دفعہ آپ نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چتراتی نے مسکرا کر کہا۔

ہاں بڑی عجیب بات ہے۔ لیکن اگر وید خود کوئی دوا استعمال نہ کریں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوا خراب ہے۔

ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ کچھ اور؟ چتراتی نے پوچھا۔

اب کچھ بات صرف تم سے کہنے کی ہے ذرا ادھر آؤ۔ اور کوسیکر چتراتی کو ایک طرف لے گیا۔

دیکھو ایک بات کا دھیان رکھنا۔ کوولن کو مجبور کر کے بچے اور اس کی ماں کے اخراجات کیلئے کچھ جائداد ان کے نام کرا لینا تاکہ یہ دونوں آرام سے زندگی گزار سکیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بچہ ہونے کے بعد مرد کی توجہ اور اس کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ دوسری خوبصورت عورت کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ کوسیکر نے کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے تھوڑا بہت تو کر لیا ہے۔ لیکن باقی انتظام بھی کر رہی ہوں۔ مگر ایک بات تو بتاؤ تم کوولن سے کیوں خائف ہو مادھوی کی پیدائش کے بعد تم نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔

ہاں میں نے ایسی حرکت نہیں کی۔ معلوم ہے کیوں؟ میرے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کوولن کے پاس ہے۔ اور پھر کسی عورت نے ہمیں حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جبکہ کوولن اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہے۔

تمہارا اپنے بارے میں اندازہ غلط ہے۔ تم بہت زیادہ قیمتی چیز ہو۔ چتراتی نے کہا۔

آج میں زندگی میں پہلی بار اپنے بارے میں یہ الفاظ سن رہا ہوں۔ دونوں پھر وہیں آ گئے جہاں وسنت مالا بیٹھی ہوئی تھی۔

اچھا ایک بات اور بتائیے۔ بچہ کو جسمانی طور پر اپنے والدین سے کیا ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ ماں سے کیا لیتا ہے اور باپ سے

کیا؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

گوشت، خون اور جسم کی کھال بچے کو ماں سے ملتی ہے۔ ہڈیاں۔ ان کا مغز اور طاقت باپ سے۔ کوسیکر نے کہا۔

لیکن دوران حمل میں عورتوں کو طرح طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں ایسے موقع پر عورتوں کی خاص عادتیں اور خواہشیں ابھر آتی ہیں۔ بعض عورتیں کچے چاول کھانا پسند کرتی ہیں۔ بعض عورتیں ایسے پھل مانگتی ہیں جن کا فراہم کرنا مشکل ہو۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر ہر وقت ان کے پاس ہی بیٹھے رہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کی خواہش پوری کر دینی چاہیئے کیونکہ عورت اور بچے کی ناامیدی نقصان دہ ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مادھوی آگئی۔

کیا باتیں ہو رہی ہیں مدھادی نے پوچھا۔

اسے کیا تم ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔ کوسیکر نے پوچھا۔

میں نے آپ لوگوں کی تمام باتیں سُنی ہیں۔ البتہ وہ باتیں نہیں سُن سکی جو آپ نے ماتا جی کو الگ سے جا کر کی ہیں۔

چلو اچھا ہوا تم نے خود سب کچھ سُن لیا۔ میری آدھی مشکل تو حل ہوگئی۔ چترا پتی نے کہا

لیکن ایک بات بتلائیے کیا بچہ صرف انگوٹھے کے برابر ہے اور ابھی حرکت بھی نہیں کر سکتا ، مادھوی نے کوسیکر سے پوچھا۔

بالکل۔ کوسیکر نے جواب دیا۔

بڑی عجیب بات ہے۔ مادھوی نے کہا۔

تم کو کیا بڑے بڑے عالموں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی۔ مجھے تو ان کا خیال ہے کہ ہم دیوتا انگوٹھے برابر ہے اور ہمارے جسم میں حرکت نہیں کرتا۔ کوسیکر نے کہا۔

اچھا! وہ جو تم ایک بھجن سناتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے چترا پتی نے کہا۔

اور کیا؟ کوسیکر نے کہا۔

میں اب جا رہا ہوں مجھے ایک ضروری کام ہے۔ دیکھو مادھوی میں نے جتنی ہدایات دی ہیں ان پر عمل کرنا۔ ہماری زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہمیں آنے والی نسل پر بھاری

خواہش قربان کرنی پڑتی ہیں۔

اور کوسیکر چلا گیا۔

مادھوی نے تمام باتیں کوولن سے کہہ دیں۔ خاص طور پر اس نے بچے کے انگوٹھے کے برابر ہونے پر زور دیا۔ اور کوولن کو بتایا کہ بچے کو غذا۔ اور ہوا کس طرح ملتی ہے۔ کوولن کو خود ان باتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔

کنا کی کے ساتھ اتنے عرصے رہنے کے بعد اسے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ آج باپ بننے کے خیال سے اس کو خود پر فخر ہو رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوسیکر کی تمام ہدایات پر عمل کرائیگا۔

جب تک وہ باتیں کرتے رہے ان کا موضوع اکثر بچہ ہی تھا۔

چھ ماہ بعد بچہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا۔ مادھوی نے کوولن کو بچے کے دل کی دھڑکنیں سنائیں۔ جو اس وقت اس کے جسم کا ایک حصہ تھا۔ وہ کوولن کو دیکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ ہر وقت اس بچے کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کرتا رہتا تھا۔

یہ دنیا کتنی پر اسرار ہے۔ کوولن نے کہا۔ دیکھو یہ بچہ کس طرح حرکت کر رہا ہے۔

مادھوی دن رات بچے کی ان حرکتوں کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ کوولن کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ بچہ جلد از جلد اس دنیا میں آجائے۔

اسی دوران میں اس نے اپنی آدھی سے زیادہ جائداد مادھوی اور بچے کے نام کردی تھی۔ گھر کا کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جسے اس نے بیش بہا تحفے نہ دئے ہوں۔ مندروں میں بار ہا اس نے دعائیں مانگیں کہ مادھوی محفوظ رہے۔ اس نے غریبوں اور ضرورت مندوں کو بے انتہا خیرات دی۔ کوسیکر کی کوئی ہدایت ایسی نہ تھی جس پر اس نے سختی سے عمل نہ کیا ہو۔ بلکہ اس سختی سے تو مادھوی بھی اکتا گئی تھی۔

کوولن اپنی خواہشات سے زیادہ مادھوی اور بچے کا خیال تھا۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا کوولن صاحب کو بے انتہا انتظار تھا شہر کی ماہر نرسوں کو بلایا گیا۔ تمام گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کوولن دن بھر کمرے کے باہر بیٹھا رہتا۔ ممکن ہے کسی چیز کی ضرورت

پڑے۔ بیچارے کو پورے دو دن بے حس و حرکت کمرے کے باہر بیٹھا رہنا پڑا۔

اچانک بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ نرسوں نے بچے کو نہلایا اور بچہ پہلے سے بھی زیادہ رونے لگا۔ نہلانے کے بعد بچے کو ایک خوبصورت کپڑے میں لپیٹ کر باپ کو دکھایا گیا۔ کتنا خوبصورت تھا بچہ! تمام نرسیں بچے کو پیار کر رہی تھیں۔ ماں اور باپ تو خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

اس نو وارد کی خوشی میں باپ نے برہمنوں رشتہ داروں اور غریبوں کو کھانے پینے کا بے انتہا سامان اور بے شمار سونا تقسیم کیا

اس خوبصورت لڑکی کا نام کیا رکھا جائے۔ کوولن نے مینی میکھلائی تجویز کیا۔ اس نام کے پیچھے ایک کہانی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ کوولن کے آباؤ اجداد میں سے ایک صاحب پانی کے جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ اچانک جہاز ٹوٹ گیا۔ دو دن تک وہ پانی پر ایک تختے کے سہارے تیرتے رہے۔ آخر مینی میکھلائی دیوی کی مدد سے وہ ساحل پر پہنچے۔ اس وقت بھی کوولن کا خیال تھا کہ مینی میکھلائی دیوی نے اس کی مدد کی ہے۔ اور دو دن کے بعد اس ننھی سی بچی کو مصیبت سے نجات دلائی۔

چھ دن گذر گئے۔ اور کوولن دنیا کی ہر شے سے بے خبر مینی میکھلائی میں کھویا رہا۔ مگر ساتویں دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بچے کے سینے پر ایک سرخ رنگ کا داغ دکھائی دیا۔ جو پہلے نہیں تھا۔ کوولن اور مادھوی بڑی بے قراری سے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

رات اندھیری تھی۔ کوولن کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے مخاطب ہے۔

میں مینی میکھلائی دیوی ہوں۔ تم نے اس بچے کا نام میرے نام پر رکھا ہے۔ اس لئے اسے میری طرح نیک اور مقدس ہونا چاہیئے۔ اسے کنا کی کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ بچے کو اپنی گود میں لیکر پیار کرے گی تو بچہ ہر خطرے سے دور ہو جائے گا۔ ورنہ ۔۔۔۔۔۔

آواز بند ہو گئی۔

ورنہ۔ ورنہ کیا ہوگا۔ کوولن کا ذہنی توازن خراب ہوا جا رہا تھا۔

کیا کوولن اس بچے کو گود میں لے لیگی۔ اپنی دشمن کے بچے کو۔ مگر وہ ایک نیک اور شریف عورت ہے۔ کوولن کو خیال آیا۔ اس نے فوراً ایک آدمی کو کنا کی کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ کنا کی کو سب کچھ بتادے۔

کنا کی خاموش کھڑی سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی خادماؤں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ آخر ہے تو اس کی دشمن کا بچہ ۔۔۔۔ اور اگر بچہ کو گود میں لے بھی تو اس شرط پر کہ کوولن مادھوی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر گھر واپس آجائے گا۔

کنا کی سب کچھ سنتی رہی۔

کیا تم لوگ مجھے اتنا ذلیل سمجھتی ہو کہ میں ایک بچے کی جان بچانے کیلئے اس قسم کی شرائط پیش کروں گی۔ اگر میرے شوہر کو واپس آنا ہے تو وہ اپنی مرضی سے آجائیں گے۔ جاؤ بچے کو لے آؤ۔ وہ آدھا میرا ہے۔ میرے آقا میرے مالک کا خون اس کی رگوں میں ہے۔ مجھے اس بچے سے محبت ہے۔ کاش میرے آقا مجھے اجازت دے دیں کہ میں اس بچے کو اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ بچہ میرے لئے دنیا کا سب سے اچھا تحفہ ہے۔

کوولن نے بچہ بھیج دیا۔

کنا کی اس کی خوبصورتی دیکھ کر متحیر ہو گئی۔ اس نے بچے کو بڑی محبت سے اپنی گود میں لے لیا اور اس کے پھول جیسے رخساروں کو بوسہ دیا۔

بچہ کنا کی کی گود میں ہمک رہا تھا۔

دیکھو۔ کیسا خوش ہے یہ بچہ۔ تم کیسے کہتی ہو کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے؟ اس کے خط و خال تو دیکھو۔ بالکل میرے آقا جیسا

واقعی بچہ تو بہت خوبصورت ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔ مگر خدا جانتا ہے کہ اس بچہ کا مستقبل کیا ہوگا؟۔

میں جانتی ہوں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بچہ دنیا والوں کیلئے ایک نعمت ہوگا۔ اس کی پاکیزگی اور تقدس دنیا کے لئے روشنی بن جائے گا۔

کنا کی کی باتوں نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔

بچہ واپس کر دیا گیا۔ چلتے ہوئے کنا کی نے کوولن کو یہ پیغام بھی بھیج دیا۔ اگر ممکن ہو تو اس بچے کو دن میں ایک دفعہ ضرور بھیج دیا کرنا۔

مینی میکھلائی اسی دن تندرست ہوگئی۔ جب مادھوی اور چترا تی نے پوری داستان سُنی تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب بچے کو کبھی کنا کی کے پاس نہیں بھیجا جائے گا۔

ان کا خیال تھا کہ اگر بچے کی پرورش کنا کی کے گھر میں ہوئی تو ان کا بڑا سخت نقصان ہوگا۔ اس بچے کو ان کے فن کا وارث ہونا ہے۔ ایک ماہر رقاصہ بننا ہے۔ اسے بڑا ہو کر شہزادوں کے دل پر فتح پانی ہے۔ اگر کنا کی کا اس پر اثر ہوگیا تو یہ بھی ایک ایسا خوبصورت پھول بن کر رہ جائے گی۔ جو گھروں میں کھلتے ہیں۔ اور دنیا کو اپنی خوبصورتی دکھائے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔

کنا کی نے ایک دو دفعہ بچے کو منگایا بھی۔ مگر ان لوگوں نے صفائی سے انکار کردیا۔

کنا کی اس انکار سے اداس ہوگئی۔ مگر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔ آخر میرا اپنا بچہ تو ہے نہیں۔ میرا اس پہ حق بھی کیا ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ ورنہ خدا ان تین سالوں میں مجھے بھی ایک خوبصورت بچہ دے سکتا تھا۔ اب میری زندگی اس پودے کی طرح ہے جو ایک اجاڑ اور ویران گھر میں ہو جس کے مقدر میں سوائے تنہائی کے کچھ نہ ہو۔ انسان کا دل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذہنی اور روحانی تسکین کے لئے بھی دنیا کے دوسرے لوگوں اور چیزوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے کتنی پُراسرار ہے یہ دنیا؟ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ میری ہی وجہ سے مادھوی اور کوولن میں یہ تعلقات پیدا ہوئے اور میں ان دونوں کے تعلقات کے غم میں سلگتی رہی۔ اور آج مجھے ہی ان دونوں کے بچے کو دیکھنے کی اتنی تمنا ہے۔ کاش یہ میرا اپنا بچہ ہوتا۔

قسمت کے مذاق بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ مادھوی نے مجھ سے میرے آقا کو چھین لیا۔ اور اب میرے آقا کے بچے کو بھی دیکھنے نہیں دیتی۔ اے خدا اس بچے پر اپنا کرم کیجیو۔ اسے ایک شمع بنا دیجیو کہ اس کی روشنی تمام دنیا میں اُجالا ہوجائے۔

پانچواں باب

کنا کی کی زندگی آلام و مصائب کی نذر ہوگئی۔ اس کا غم اور مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ کوولن ہی تو اس کا سب کچھ تھا۔ اس کا شوہر۔ اس کا آقا۔ اس کا مالک۔ اس کا تو سب کچھ کوولن۔ اب اس کی زندگی میں تھا ہی کیا؟

کوولن۔ مادھوی اور بچہ میں اس طرح گم ہوا کہ اسے کی پرواہ نہ رہی۔ اسے بھول کر بھی کنا کی کا خیال نہ آیا۔ اس نے مینی میکھلائی کو بلایا تھا۔ مگر اتنے عرصہ بیت چکا تھا۔ انہوں نے بچے کو نہ بھیجا۔ البتہ کوولن روپے منگانے کیلئے اکثر آدمی بھیجتا رہا۔

کنا کی غم میں سلگتی رہی۔ اس کے پھول جیسے رخساروں میں کا نام بھی نہ رہا۔ اب اس کے چہرے پر کبھی مسرت کی لہریں نہ دوڑتیں۔ اس کی زندگی کو خزاں نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ بہاروں کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھی۔

اکثر مہمان آتے۔ مگر نہ جانے اسے کیا ہوگیا کہ وہ ان کی تواضع کیا کرپاتی۔ کرتی بھی کیسے؟ قسمت نے زندگی کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی تھیں۔

ایک دن وہ بہت اداس تھی۔

جانے مجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ محبت اور نا امیدیاں مجھے ختم کردیں گی۔ اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔

مالکہ اس غم نے آپ کی کمر دوہری کردی ہے۔ ملازمہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کیا کروں۔ اس غم پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ مگر جتنا ضبط کرتی ہوں اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔ میں بے بس ہوں۔ تم سے اپنا غم نہیں چھپا سکتی۔ لیکن میں ان مصیبتوں کا ذکر اپنے آقا سے نہیں کرسکتی۔ ایک وفا شعار بیوی کبھی بھی اپنے شوہر سے اس کی بے اعتنائی کی شکایت نہیں کرسکتی۔ میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اپنی مصیبتوں کا ذکر والدین سے بھی کروں۔ اور فائدہ بھی کیا۔ ہم اپنے مصائب کی وجہ سے دوسروں کو کیوں پریشان کریں۔

کنا کی نے ہمیشہ صبر و استقلال سے کام لیا۔ اس نے کوولن کو کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی خادمہ کو اپنی مالکہ کی یہ حالت دیکھ کر اتنی جرأت ہوگئی تھی کہ وہ کبھی کبھی کوولن کو برا بھلا کہہ دیتی۔

ایسی عقل، ایسے فن، دولت اور خوبصورتی سے کیا فائدہ جب انسان اپنے ان عزیزوں کو بھول جائے جو اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہوں۔ جو ہر حالت میں اس کے لئے دست بدعا ہوں

کیا یہ فن اور یہ دولت شیر کی خوبصورت کھال اور دانتوں کی طرح نہیں ہے۔ جو آپ جیسی معصوم کو موت کا شکار کر دیتی ہیں۔
آج خادمہ کو کو ولن پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

اچھا خاموش رہو۔ کنا کی نے کہا۔ انھیں کچھ مت کہو۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔

لیکن میری مالکہ آپ برباد ہوئی جا رہی ہیں۔ صرف ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے۔ خادمہ نے کہا۔

نہیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ میں نے یقیناً پچھلے جنم میں کچھ ایسے ہی گناہ کئے تھے۔ جن کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ اور جن کی وجہ سے مجھے دنیا کی تمام خوشیوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ کنا کی نے کہا۔ پھر میں اپنی بدنصیبی کیلئے اپنے آقا کو کیوں الزام دوں۔ میرے دل میں ان کی محبت بدستور ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ بلکہ یہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وہ اگر مادھوی سے محبت کرتے ہیں تو کیا ہوا۔ کنول کا پھول کیچڑ میں ہو یا صاف اور شفاف پانی پر۔ . . . . اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں نے آپ کو اکثر ان کے سلئے پریشان تو دیکھا ہے۔ اگر آپ کو کسی بات کا خیال نہیں ہے تو پھر کیوں اتنی اداس رہتی ہیں۔ خادمہ نے پوچھا۔

میں کیوں پریشان ہوتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ وہ ایک ایسی عورت سے محبت کرتے ہیں جو صرف ان کی دولت سے محبت کرتی ہے۔ اسے ان کی محبت۔ ان کی انسانی خوبیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن بھی ان کے پاس دولت ختم ہو جائے گی۔ اس کی محبت بھی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے آقا اس بازاری عورت پر کتنی دولت تباہ کر چکے ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ اتنی دولت اور محبت ملنے کے باوجود ایسی عورتیں محبت کے سچے جذبات سے محروم رہتی ہیں۔

یہ تو عام بات ہے۔ مقناطیس صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سونے اور دوسری قیمتی دھاتوں کو نہیں۔ ایک رقاصہ کیلئے دولت سب کچھ ہے وہ انسان کی ذاتی خوبیوں سے کیا دلچسپی رکھ سکتی ہے۔ محبت، نیکی اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کے لئے بے معنی چیزیں ہیں۔

آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ مگر آپ یہ سب باتیں ہمارے آقا کو کیوں نہیں لکھتیں۔

وہ تو خود ہی اس حقیقت کو سمجھ لیں گے۔ وہ اس ہاتھی کی طرح جال میں گرفتار ہیں جو اپنی گرفتاری کو بھول کر گنے کھانے میں مشغول ہو گیا ہو۔ وقت گزرنے دو۔ ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہے۔

لیکن کون جانے یہ سب کتنے عرصے میں ہو۔ خادمہ نے کہا میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ سب ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ میری زندگی میں اس جال سے چھٹکارا پا بھی سکیں گے۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔

میری مالکہ ۔۔ ایک اور خادمہ بولی جو اب تک خاموشی سے سب گفتگو سن رہی تھی۔ مجھے یقین ہے یہ ڈرامہ چند سالوں میں ختم ہو جائے گا۔ جس طرح یہ دولت لٹائی جا رہی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو۔ مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ خدا میرے آقا کو ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔ کنا کی نے کہا۔

آپ نے مندر بھی تو جانا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی سہیلیاں آتی ہیں۔ مگر آپ پہلے کی طرح ان کی تواضع ہی نہیں کرتیں۔ آپ مصیبت میں زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اس مصیبت کے دینے والے کو دعا دے رہی ہیں۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں سکی۔ ایک خادمہ نے کہا۔

یہ تو بالکل سمجھنے والی بات ہے۔ اگر عورت میں ایک اچھی بیوی کی خوبیاں نہیں ہیں تو وہ عورت کچھ بھی نہیں ہے۔ عورت کیلئے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے پاکدامن ہو۔ تم نے تو سنا ہوگا۔ جو عورت دیوتاؤں کے بجائے اپنے شوہر کی پوجا کرتی ہے۔ اسے فطرت پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ بادلوں پر اپنا حکم چلا سکتی ہے۔

اگر یہ ٹھیک ہے تو مجھے امید ہے کہ ایک دن آپ ہمارے آقا کو واپس بلانے پر بھی قدرت حاصل کر لیں گی۔

مجھے بھی یہی امید ہے کنا کی نے کہا۔

کتنا اچھا وقت ہوگا وہ جب آپ دونوں ایک بار پھر ملیں گے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

اس میں کیا شک ہے۔ کل ساری رات میں ان کے آغوش میں رہی مگر کم بخت صبح ہو گئی۔ اور سپنا ٹوٹ گیا۔ لیکن مجھے تو

سپنا ہی یاد کر کے کتنی مسرت ہوتی ۔۔۔

اس سے زیادہ دنیا میں کون بدنصیب ہوگا۔ جو محبت کیلئے ترستا ہو۔ اور اس سے زیادہ کون غریب ہوگا۔ جس کے ہاتھوں سے اُمید کا دامن بھی چھوٹ گیا ہو۔ اسی لئے میں اس امید میں زندہ ہوں کہ ایک دن وہ ضرور واپس آئیں گے۔ اس وقت ان کا دل ٹوٹا ہوا ہوگا۔ انھیں پھر تسلی کون دے گا۔ صرف اسی امید پر زندہ ہوں۔ ورنہ میں کبھی کی موت کی آغوش میں پناہ لے لیتی۔

سب خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کنا کی نے ہلکے سُروں میں ایک گیت چھیڑ دیا۔

صرف وہ ہی میرا محبوب ہے
میں ہمیشہ اسی سے محبت کرتی رہی ہوں۔
اسکے ساتھ زندگی کتنی خوبصورت تھی۔
کاش وہ واپس آجاتے
اور اپنے ساتھ میری خوشیاں بھی لے آتے۔
جو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

پھر پریشان مت ہوئیے۔ آپ کو اُمید تو ہے کہ وہ واپس آئیں گے۔ ایک خادمہ نے کہا

صرف اپنے آقا ہی کا غم نہیں ہے مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میرے آقا نے مجھے اپنی کوئی نشانی نہیں دی۔ کاش میں ان کے بچے کی ماں ہوتی۔ اس بچے کو دیکھ کر کتنا سکون ملتا مجھے ۔۔۔۔ اس تاریک زندگی کو کچھ تو روشنی مل جاتی۔ بچہ دنیا کی سب بڑی نعمت ہے۔ عالم کہا کرتے ہیں۔ جس عورت کی گود میں لڑکا ہو اس کا رتبہ کسی دیوی سے کم نہیں ہوتا۔

ایک باعزت گھرانا خدا کی دین ہے لیکن اس گھر میں ایک خوبصورت بچہ اس گھر کا تاج ہے۔

بچہ ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ بچے کو گود میں لیکر کیسا روحانی سکون ملتا ہے۔ بانسری کی آواز کتنی دلکش ہوتی ہے مگر بچے کی آواز اس سے بھی زیادہ شیریں ہوتی ہے۔

مگر میں کیسی بدنصیب ہوں۔ مجھے خدا نے کوئی بچہ نہیں دیا۔ ان کے بچے کو صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی تصویر دیکھ رہی ہوں ۔۔۔ اب زندگی میں سوائے ان کی

محبت اور کچھ نہیں ہے۔

میں تو آپ سے یہی کہوں گی۔ ایسے ظالم سے محبت کرنا بے کار ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

ایسا مت کہو۔ زندگی محبت کا دوسرا نام ہے۔ محبت کے بغیر انسان گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہے جیسے کھال کی ایک تھیلی سے بھر دیا گیا ہو۔ جو لوگ محبت نہیں کرتے وہ اس دنیا میں صرف اپنے لئے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ محبت کرتے ہیں ان کا سب کچھ دوسروں کے لئے ہوتا ہے ۔۔ یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ انسان صرف ایسے لوگوں سے محبت کرے جو محبت کا جواب دیتے ہیں۔ اس طرح محبت جیسی نایاب شے ایک معمولی سی چیز بن کر رہ جائے گی۔ جو بازاروں میں کوڑیوں کے دام بکتی ہے۔

جس نے اپنے دل سے محبت نکال پھینکی۔ اسے زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکتا۔ وہ کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

مہینے گزرتے رہے۔ کوولن کے بھیجے ہوئے آدمی پہلے سے بھی زیادہ آنے لگے۔ روپیہ اور بھی تیزی سے خرچ کیا جانے لگا۔ کنا کی تھوڑا تھوڑا کر کے ساری دولت دیتی رہی۔ کوولن کی اپنی پوری دولت ختم ہو گئی۔ لیکن کنا کی نے روپیہ دینا بند نہ کیا۔ اسے بھی تو اپنے میکے سے بہت کچھ ملا تھا۔ اس نے وہ روپیہ بھی دینا شروع کر دیا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام قیمتی جواہرات بھیجنے شروع کر دئے۔

مینی میکھلائی کی پیدائش کو تین سال بیت چکے تھے۔ کنا کی کے پاس روپیہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کفایت کے خیال سے اس نے خادماؤں کو الگ کر دیا۔ خادمائیں اس کی خدمت مفت کرنے کیلئے تیار تھیں مگر وہ نہ مانی۔

تم لوگ میری وجہ سے کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ جاؤ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔

نہیں یہ تکلیف نہیں ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ کی خدمت کریں۔ ہم نے آپ کے ہاں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا۔ بہت دولت حاصل کی پھر اور اب اگر بغیر مزدوری کے تھوڑا سا کام کر دیں گے تو کیا حرج ہو۔ کنا کی اس پیشکش پر قطعی راضی نہ ہوئی۔ انہیں رخصت کر ہی دیا۔

انہوں نے چلتے ہوئے کنا کی سے درخواست کی کہ دن میں ایک دفعہ تو انھیں آنے کی اجازت دیجائے۔ مگر کنا کی نے صفائی سے انکار کر دیا۔

میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں تم لوگ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ میری مصیبت دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوگی۔ اور میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ کنا کی نے کہا۔ اس لئے جب تک تم لوگ یہ نہ سن لو کہ میرے آقا واپس آگئے ہیں ہرگز نہ آنا۔

خادماؤں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اب وہ جانے پر مجبور تھیں۔

اب کنا کی بالکل تنہا رہتی تھی۔ اس کے جسم پر پرانی اور پھٹی ہوئی ساڑی ہوتی۔ زیورات میں سوائے چوڑیوں اور پائل کے سب کچھ بک چکا تھا۔ وہ خود سارے گھر کا کام کرتی خود ہی کھانا پکاتی۔

اتنے سادہ کپڑے اور اتنا معمولی کھانا صرف اس لئے کھاتی کہ وہ اپنے آقا کا انتظار کر رہی تھی۔ اب بھی وہ کوولن کی مالی ضرورتیں پوری کرتی رہی۔

دس سال اور بیت گئے۔ اداس غم زدہ۔ یہ دس سال صدیوں سے کم نہیں تھے۔ مگر کوولن اب بھی واپس نہ آیا۔

کچھ دن سے وہ سن رہی تھی کہ چترا پتی اور اس کی خادمائیں کوولن کی بے عزتی کرتی ہیں۔ مگر وہ بے چاری کر بھی کیا سکتی۔ صرف خدا سے دعا کر سکتی تھی کہ اس کے شوہر کی عزت برقرار رہے۔

کوولن شاید اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب خود مادھوی بھی اس کی بے عزتی کرے۔ اتنے طویل عرصے تک وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا اس کی امید کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا۔ اسے یقین سا ہو رہا تھا جیسے اب کوولن کبھی واپس نہ آئے گا۔

چھٹا باب

مادھوی کے ساتھ ابتدائی سالوں میں تو کوولن مادھوی کو بیش قیمت تحائف دیتا رہا اور ان تحائف کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔ بیش قیمت ریشمی ساڑھیاں، موتی جواہرات اس کے لئے تلاش کر کے لائے جاتے۔ طرح طرح کی شرابیں اور پھل اس کے لئے فراہم کئے جاتے۔ جبکہ غریب، مصیبت کی ماری کنا کی تنہا مصیبت میں گرفتار زندگی کے خارزاروں سے گذر رہی تھی۔ کنا کی کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کے لئے خدا سے دعائیں مانگنا تھا۔

دس سال بعد کوولن کو تحائف کا یہ سلسلہ ذرا ہلکا کرنا پڑا۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا کہ وہ مادھوی کے ہاں خالی ہاتھ جاتا تو وہ چترا پتی کو گھر کے باہر دیکھتا۔ جو اسے باہر ہی سے بتاتی کہ مادھوی کو کل کے رقص کیلئے کن کن ساڑھیوں اور جواہرات کی ضرورت ہے وہ بے چارہ اپنے گھر واپس جاتا اسی گھر میں جہاں دس سال سے تنہا رہ رہا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کا انتظام کر کے لاتا۔

تم نے ان چیزوں کی فرمائش کل کیوں نہیں کی۔ کوولن مادھوی سے پوچھتا۔

میں کیسے فرمائش کرتی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ محبت اور کاروبار کو دو مختلف چیزیں سمجھتی ہوں۔

کوولن خوشی سے جھوم اٹھتا۔ پھر مادھوی اسے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ میرے آقا۔ میرے شوہر...... پھر کچھ دیر رک کر وہ کہتی۔ مگر دنیا میں صرف کنا کی کو یہ الفاظ کہنے کا حق ہے۔ مجھے یہ حق نہیں ہے۔

پاگل مت بنو۔ تم میری سب کچھ ہو۔ کنا کی تو صرف بھولا ہوا افسانہ ہے۔

مگر اب تو کوولن کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے اس کی تمام جمع کی ہوئی دولت ختم ہو چکی تھی۔ اور اب دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ایک پیسہ بھی قرض دے سکتا۔ اس لئے تحفے دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

وہ کچھ دن سے محسوس کر رہا تھا کہ اب چترا پتی اور خادمہ اس کی پہلی سی عزت نہیں کرتیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے بے عزت کر دیتی تھیں اور اب تو وہ مادھوی کے چہرے پر اسی قسم کے اثرات دیکھ رہا تھا۔

چترا پتی کچھ دن سے مادھوی کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ

کودلن سے نجات پالے جو ایک مصیبت بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کسی اور دولت مند سوداگر کی باری تھی۔

موتی کا خوبصورت ہار صرف خوبصورت گردنوں کیلئے ہوتا ہے۔ یہی حال رقاصہ کا ہے۔ اس کی زندگی فقیر ملنگ کے لئے نہیں دولت مندوں کے لئے ہوتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

ماں۔ دیکھو تو اس نے ہمیں کیا کیا دیا ہے۔ ہمارے پاس جتنی بھی دولت ہے اسی کی دی ہوئی ہے۔ اس نے تمام جائیداد ہمارے نام کردی ہے۔ ہمارے پاس اس سے پہلے تھا کیا۔ اور اس سب سے بڑھکر تو یہ بات ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اور مینی میکھلائی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے میں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔

تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ایمانداری سے پیش آرہا ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں نے سُنا ہے اس نے بہت سی دولت اپنے دوستوں اور خود کنا کی سے بھی چھپا رکھی ہے۔ وہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس سب کے علاوہ وہ سختی سے مخالفت کر رہا ہے کہ ہم مینی میکھلائی کو اپنے آبائی پیشہ پر نہ لگائیں۔ ذرا سوچو تو اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو کیا ہوگا؟

چترا پتی اور مادھوی کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہیگا۔ شاہی رقاصہ کے خاندان کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔

ماں کچھ بھی ہو۔ میں کودلن کی جُدائی برداشت نہیں کرسکتی میں اس غم سے مرجاؤں گی۔

تم نہیں مروگی۔۔ میری بیٹی۔ کنا کی تو گھر کی شریف بہو ہے وہ تک نہ مری۔۔۔۔ ایک ہفتہ اس کے بغیر رہ کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم پھر زندگی بھر کے لئے اس سے نجات پالوگی۔

اچھا اگر فرض کرو ایک ہفتہ بعد تجربے نے یہ ثابت کردیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی کیا مجھے اس کے ساتھ زندگی بھر رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس طرح ماں کے دباؤ سے نجات مل جائے گی۔ اور وہ اس ایک ہفتہ میں خود اپنی محبت کا بھی امتحان کرسکے گی۔ ایک دفعہ کودلن سو رہا تھا۔ وہ خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

کتنی خوبصورت ہے میری بیوی۔ چاند کی طرح۔ مگر میں اسے چھوڑکر تمہارے پاس آگیا ہوں۔

کودلن کے یہ الفاظ مادھوی کو یاد آرہے تھے۔

چترا پتی مادھوی کو یہی مشورہ دیتی رہی کہ وہ اپنے کسی اور عاشق کی تلاش کرے۔

قطعی نہیں۔۔۔۔ اتنا تو ظلم نہ کرو۔ اگر جانور کا ساتھی مرجاتا ہے تو دوسرے کو ساتھی بنانے میں وہ بھی کچھ دیر لگاتے ہیں۔

رقاصہ ایسا نہیں کرسکتی۔ چترا پتی نے کہا۔

اس کا مطلب ہے تم لوگ کتنے ذلیل ہوگئے ہیں۔ مادھوی نے غصّہ سے کہا۔

ایسی باتیں مینی میکھلائی بہت کرتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

اس میں کیا بات ہے۔ وہ میری ہی تو لڑکی ہے۔

تمہارا کودلن سے کوئی محبت کا رشتہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا آدمی بھی اس ہار کو خرید سکتا تھا۔ آج کودلن کی جگہ وہ آدمی ہوتا۔

نہیں مجھے ہار بیچتے وقت پورا یقین تھا کہ کودلن ہر قیمت پر ہار خریدے گا۔ اور ایسے بھی ایک شخص کو اس لئے تو معاف کیا جاسکتا ہے کہ اس نے سورج نکلنے سے پہلے چراغ جلایا لیکن اگر کوئی سورج نکلنے کے بعد چراغ جلائے تو کیا اسے معاف کیا جاسکتا ہے؟۔

ہمیں اس معاملے میں بحث نہیں کرنی چاہیئے چترا پتی نے کہا۔ یہ تو صرف ایک ہفتہ کا وقفہ ہے۔ ایک مناسب عاشق کی تلاش کیلئے کافی عرصہ چاہیئے۔ اور کھیتی کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ کھیت کو بالکل صاف کردیا جائے۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ کس چیز کی کھیتی کی جائے۔ تو اب تم اندرا کے تہوار کے آخری دن سے کودلن سے نجات پالو۔

لیکن ماں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اس سے کس طرح کہوں گی کہ چونکہ تم غریب ہوگئے یا تمہارے پاس چھپی ہوئی دولت ہے۔ اس لئے میں تم سے نہیں مل سکتی۔

مجبوراً اس کے مٹتے ہوئے تعلق کا کتنا بڑا احسان ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔

اس سے چھٹکارا پانا تو بہت آسان کام ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جانتی ہوں وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا خیال ہے

تم اس کی ذات سے نہیں اس کی دولت سے محبت کرتی ہو۔

لیکن میں اس کی دولت سے نہیں اس کی ذات سے محبت کرتی ہوں۔ مادھوی نے کہا۔

آخر اس میں خوبی کیا ہے۔ چترا پتی نے پوچھا۔ یہ وہی شخص ہے نا جس نے تمہاری خاطر اپنی تجارت پہلات مار دی جس نے اپنی وفادار اور نیک بیوی کو ٹھکرا دیا۔ اور سب محض تمہاری وجہ سے

ماں.. مادھوری نے کہا۔ مگر یہ سب کچھ تو میری وجہ سے ہوا ہے۔ اس سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اگر کوولن میں خرابی نہ ہوتی تو تم جیسی دس اور خوبصورت عورتیں بھی زور لگا لیتیں۔ تب بھی اس کے پاؤں کو جنبش نہ ہوتی۔ دیکھو میناکن اور سادھون جیسے لوگ مضبوط کردار کے ہوتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو آزمایا ہے۔ تم خود بھی انھیں آزما سکتی ہو۔ اگر پتھر ایک جھٹکے میں ٹوٹ جائے تو پتھر کا قصور ہے آدمی کا نہیں۔

خیر چھوڑو اس ذکر کو! میں ایک ہفتہ کیلئے کوولن کو چھوڑ دوں گی۔ کم سے کم وہ کناکی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی تو کر سکے گا۔ اپنی تجارت کو پھر شروع کر سکے گا اب وہ خاص ترکیب بتایئے۔ جس سے میں علیحدگی حاصل کر دوں۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب تم کوولن کے ساتھ باہر جاؤ گی تو چلیم ایک گیت گائے گی۔ وہی گیت رقاصہ اور اس کا مفلس عاشق وہی گیت ہے نا۔

جاؤ میرے پیارے مفلس عاشق خدا حافظ!

شاید تم ہم لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتے

ہم رقص کرنے والے لوگ ہیں۔

ہمارا دل ہمیشہ بکا ہوا رہتا ہے۔

اور جانتے ہو اس کا خریدار کون ہوتا ہے؟

جس کے پاس زیادہ سے زیادہ پیسہ ہو۔

یہ گیت سُن کر مجھے یقین ہے کہ کوولن ایک لمحہ کو بھی یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کرے گا۔

"ماں آپ کو غلط فہمی ہے" مادھوی نے کہا۔ وہ کمبخت میری خاطر اپنی بے عزتی بھی گوارا کر لے گا"

"ہرگز نہیں" یہاں ایک سیکنڈ کو نہیں ٹھہرے گا وہ تو یہاں سے اُس کتے کی طرح بھاگے گا جس کے پیچھے کوئی آدمی پتھر لے کر دوڑ رہا ہو"

"اچھا وقت آنے پر ہم خود ہی سب کچھ دیکھ لیں گے" مادھوی نے کہا۔

اچھا اگر وہ نہ جائے تو تم ایک کام اور کرنا۔ اس کے سامنے وہ گیت گانا جو ایک محبوبہ سمندر کے کنارے اپنے غیر ملکی عاشق کی یاد میں گاتی ہے۔ جو ایک چاندنی رات میں تنہا اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ مگر ایک بات کا تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم یہ گانا بالکل اس انداز میں گاؤ گی کہ تصنع اور بناوٹ کا نام بھی نہ ہو۔ اور جیسے واقعی تم اپنے کھوئے ہوئے عاشق کی یاد میں تڑپ رہی ہو"

"خیر ٹھیک ہے۔ مت گھبراؤ میں یہ ایکٹنگ بڑی مہارت سے کر دوں گی۔ اور مجھے امید ہے ایک ہفتہ کی جدائی میں کوولن مر تو نہیں جائے گا"

اندرا کے تہوار کا آخری دن تھا۔ تمام شہر کی سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے قیمتی ترین لباس پہنے ہوئے تھے۔ ناچتے گاتے سڑکوں سے گذر رہے تھے۔

آج صبح ہی جب کوولن کی آنکھ کھلی۔ تو آج پہلی بار اسے سخت ذہنی تکلیف ہو رہی تھی۔ آج اس کی زندگی کا پہلا دن تھا جبکہ وہ مادھوی کو تحفہ پیش کرنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ آج کا دن تو تحفہ دینے ہی کا تھا۔ لیکن وہ اپنی محبت کو کیا کرتا۔ اسے یقین تھا کہ مادھوی بھی اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ صرف اسی خیال سے اسے کچھ سکون ہو گیا۔ دوپہر کو وہ حسب معمول مادھوی کے گھر گیا تاکہ اس کے ساتھ سمندر کے ساحل پر جا سکے جہاں آج سارا شہر غسل کرنے کیلئے جمع ہوتا ہے وہ ابھی گھر میں بھی گھسنے نہ پایا تھا کہ چیلم نے اسے روک لیا۔

"کہیئے آج مادھوی کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟" کوولن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ چترا پتی کی آواز نے اس کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دئے۔ "آج کا دن تو تحفے دینے کا ہے اور آج تم اس لئے آئے ہو کہ شہر کی سب سے حسین عورت کو اپنے ساتھ

ملک کے سب سے بڑے میلے میں لے جاؤنگی۔ آج وہ اس میلے میں کیا پرانے کپڑوں سے جائے گی؟ کودلن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اگر مادھوی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یقیناً اتنی بے عزتی برداشت نہ کر سکتا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے مادھوی کے کمرے میں چلا گیا اسے حیرت ہوئی کہ مادھوی نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے تھے۔

"مجھے معاف کردو مادھوی میں آج تمہارے لئے ساڑھی نہیں لا سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" مادھوی نے آج غیر معمولی طور پر سرد مہری سے جواب دیا۔

"آپ دوسرے کمرے میں میرا انتظار کیجئے میں ذرا کپڑے بدل لوں۔" مادھوی کے کمرے میں خوبصورت ساڑھیاں اور بیش بہا زیورات بکھرے پڑے تھے لیکن یہ سب چیزیں وہ تھیں جو دوسرے لوگوں نے اسے دی تھیں۔ کودلن نے اسے لاکھوں روپوں کے تحفے دیئے تھے۔ لیکن یہاں ان میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ یہ آج پہلا اتفاق تھا کہ کودلن سے دوسرے کمرے میں بیٹھنے کیلئے کہا گیا تھا۔ ورنہ ہمیشہ مادھوی اس کی موجودگی ہی میں لباس تبدیل کرتی تھی۔ یہ سب کچھ چترا پتی کے حکم سے ہوا تھا۔ اور کودلن کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ برابر کمرے میں گھنٹہ لگائے مادھوی کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اسے شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسکا ذہن پچھلے دس سال کی زندگی کے اوراق الٹ رہا تھا کتنے عجیب تھے وہ دن۔ اسے وہ لمحات یاد آ رہے تھے جب مادھوی اس کے سینہ سے لگ کر کہا کرتی تھی۔ "میرے آقا دنیا میں میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔"

آج کودلن پہلی بار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاعر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ دولت مند لوگ ہی شریف تعلیم یافتہ نیک پارسا، مہذب اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا انحصار دولت پر ہے۔

"میں کتنا بے وقوف رہا ہوں اس زندگی میں میں نے کبھی اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔" وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ

چیلم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے مجروح جذبات پر ایک اور ضرب لگائی۔

"آج آپ کا میلے کا لباس کہاں ہے شاید آپ وہ قیمتی جواہرات پہننا بھی بھول گئے۔ اس لباس میں میری ملکہ آپ کے ساتھ کیسے جا سکیں گی؟" اب انتہا ہو چکی تھی لیکن کودلن اس بے عزتی کو برداشت کرنے پر بھی مجبور تھا۔

"مادھوی کو اس کا کوئی خیال نہیں وہ میرے کپڑوں سے نہیں میری ذات سے محبت کرتی ہے۔"

چیلم زور سے ہنس پڑی۔

واقعی! اس نے کودلن کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کو اور ہوا دیدی۔ اسی لمحہ چترا پتی بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ انتظار کرتے ہوئے تھک گئے ہوں گے۔ کوئی گانا ہی سناؤ انہیں۔" چترا پتی نے کہا۔

چیلم نے پروگرام کے مطابق وہ گانا سنایا۔ اس گیت کے پردے میں جو کچھ مفلس عاشق سے کہا گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ کودلن کے دل پر تیر کی طرح لگ رہا تھا۔ چترا پتی اور چیلم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ کودلن اس ذہنی تکلیف سے تلملا رہا ہے۔ چیلم زور سے ہنسی۔ "کیا پرانا گیت مزیدار نہیں ہے؟"

"ہاں مزیدار بھی ہے اور حقیقت بھی؟" ابھی یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ مادھوی کمرے میں داخل ہوئی اور وہ دونوں چلی گئیں۔

ساتواں باب

مادھوی بہت ہی حسین لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ریشمی بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا۔ بیش قیمت ساڑھی اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس کی خوبصورت گردن میں ایک موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ ناک میں جگمگاتے ہوئے ہیرے کی تھلی تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی خوبصورت چوڑیاں — انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں۔ کانوں میں ہیرے کی بالیاں تھیں۔ کمر کے گرد موتیوں اور سونے کی پیٹی تھی اور پیروں میں سونے کی پائل تھی۔ کودلن نے مادھوی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اس کی پیش کی ہوئی ایک چیز بھی اس نے نہیں پہنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کو

دوسروں کی دی ہوئی چیزیں پہن گئی ہیں۔ شرم اور روحانی کرب کی وجہ سے اس نے گردن جھکا لی۔ "چلئے" مادھوی نے کہا "میں نے ساحل پر ایک جگہ ریزرو کرائی ہے۔ ہم لوگ رات کافی دیر تک وہیں رہیں گے۔"

کوولن اپنے خچر پہ بیٹھ گیا مادھوی اور وسنت مالا رتھ پر سوار ہو گئیں۔ رتھ تیزی سے ساحل کی طرف دوڑ رہا تھا اور کوولن پیچھے پیچھے اپنا خچر دوڑا رہا تھا۔ وہ شہر کے بڑے بازاروں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور آخر وہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری سمندر سے ملتا تھا۔ جو لوگ اس جگہ پر نہاتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنے محبوب سے ایک کو جدا نہ ہو سکیں گے۔ کوولن آج اس جگہ پر نہانا چاہتا تھا تاکہ وہ مادھوی سے کبھی جدا نہ ہو سکے۔ لیکن مادھوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنے ہجوم میں نہانا کچھ اچھا نہیں لگتا اور وہ کوولن کو اس جگہ لے گئی جو پہلے ہی سے ریزرو کرا رکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر جب وہ لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو مادھوی نے کوولن کو بانسری دیتے ہوئے کہا "لو ایک گیت سناؤ۔"

کوولن نے بانسری لے لی اور ایک انتہائی درد بھرا گیت چھیڑ دیا۔ وہ گیت دریائے کیوری کی شان میں گایا گیا تھا۔ کچھ اس قسم کا تھا۔

"اے دریائے کیوری تجھ پر خدا کی سلامتی ہو۔ تو ہمارے ملک اور بادشاہ کی عزت ہے۔ تو ایک وفادار بیوی ہے جس کی محبت میں کبھی فرق نہیں آتا۔ تو کسانوں کے گیت سنتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ تو ہر سال اس تہوار کے موقع پر ہزاروں لوگوں سے اپنی تعریف سنتا ہے۔"

گیت ختم کرنے کے بعد کوولن نے مادھوی سے گیت سنانے کو کہا۔ مادھوی نے گیت شروع کیا۔

"اے سمندروں کے خدا ہم ان عاشقوں کے دلوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو دور دراز جگہوں سے سفر کر کے اس ساحل پر آتے ہیں جن کے ہاتھ میں تحفے ہوتے ہیں۔ اور جو یہاں ریت کے گھروندے بناتے ہیں۔ لیکن ہمیں غصہ آتا ہے اور ہم اپنے لہروں سے انہیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تو وہ لوگ ان ہاروں کے پھولوں کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بیماری کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے ہم آغوش ہوں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ یہ درد تمہارا دیا ہوا ہے اس کا علاج بھی تمہیں کرو۔ اے سمندر کے خدا ہم کیا کریں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ساحل کی پر لطف فضائیں اس پر چمکتا ہوا ریت۔ سمندر کی تیز موجیں آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور دل کو لبھانے والی مست ہوائیں ان سب چیزوں نے ان کے خلاف سازش کی ہے۔ ان کو بیمار کیا ہے وہ ہم سے التجا کرتے ہیں اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے ہم پر ظلم نہ کرو۔ اور اس کا علاج کرو۔"

گیت ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اور مادھوی نے پھر ایک گیت اور چھیڑ دیا۔

"اے سمندر کے دیوتا لوگ ہمارے پاس موتی لیکر آتے ہیں اور معاوضہ میں ہمارے گلابی ہونٹ مانگتے ہیں۔ وہ ہم سے شادی کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کھوٹے سونے کی بالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے شراب مہیا کرتے ہیں۔ ان کی باتیں شراب سے کہیں زیادہ نشہ آور ہوتی ہیں۔ اور جب وہ ہمارے جسم کو حاصل کر لیتے ہیں تو پھر کبھی واپس نہ آنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ میرا عاشق جو ایک دفعہ مجھے اس ساحل پر ملا تھا مجھے ہنستا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اے دیوتا وہ مجھے بھول گیا ہے۔ لیکن میں اسے کیسے بھولوں۔ اے درخت کے پتو تمہیں یاد ہوگا۔ تمہارے ہی سایہ میں تو ہم دونوں ملے تھے۔ تمہیں ہماری جدائی کا کوئی افسوس نہیں۔ تمہارے چہرے پہ تو آج بھی وہی خوشی ہے۔ تم تو آج بھی خوشی سے جھوم رہے ہو۔ اے سمندر کی لہرو تم میرے درد کو کیا سمجھو گی۔ تم نے تو اپنے سینے سے اس کی کشتی کے نشان بھی مٹا دئے۔ اے پانی پہ تیرتی ہوئی بطخوں تم ہی جا کر میرے عاشق کو سمجھاؤ۔ رات کی تاریکی ہر طرف بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ لو سورج بھی ڈوب گیا۔ چاند آہستہ آہستہ آسمان پر ابھر رہا ہے چاند کی یہ روشنی مجھے دیوانہ کر دے گی۔ پرندوں نے بھی تو چہچہانا بند کر دیا۔ یہ کیا ہوا سمندر کی لہرو تم کیوں خاموش ہو گئیں۔ تم سب نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ یہی تو وہ چاندرات ہے جس میں میرا عاشق مجھ سے

جدا ہوا تھا۔ اور پھر وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اے سمندر کے دیوتا اس کے جھوٹے وعدے کو معاف کر دے۔ اس کے دل میں میری یاد پھر پیدا کر دے تاکہ پھر وہ مجھ تک آ سکے۔

کوولن خاموشی سے بیٹھا اس کا گانا سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا میں نے تو ایسا گیت نہیں گایا تھا جس میں کچھ معنی چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ لالچی عورت میرے سامنے ہی کسی اور کے گیت گا رہی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مجھے چھوڑ کر پھر اسے حاصل کر لے۔ میں اب سمجھا کہ میرے خلاف اس سازش میں چترا بھی اور چیلم ہی نہیں بلکہ خود مادھوی بھی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اس نے مادھوی کے شانوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ اب گھر چلنا چاہیے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مادھوی بدستور بیٹھی رہی۔ وہ تیزی سے اپنے گھوڑے پر چڑھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد مادھوی خاموش اور افسردہ رتھ میں آکر بیٹھ گئی اور پچھلے دس برس میں یہ پہلا دن تھا جب کہ وہ اپنے عاشق کے بغیر تہوار سے لوٹ رہی تھی۔

آٹھواں باب

کوولن شہر کی طرف تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ آج کے واقعہ نے اس کے ذہنی توازن کو کھو دیا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ آج وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا۔ آج پہلی بار اسے اپنی حرکتوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ کاش ایک رقاصہ کی خاطر وہ اپنی نیک اور وفادار بیوی کو نہ چھوڑتا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد جب وہ ایک مندر کے قریب سے گزرا تو خود بخود رک گیا وہ گھوڑے سے اترا اور مندر میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیو جی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بھجن شروع کیا۔

"اف میں کتنا بدنصیب ہوں۔

کیا میری قسمت میں صرف سر دھننا ہی ہے۔

میں وہ نہیں جانتا کہ کبھی سکون نہیں آتا۔

شیو جی! میں بچوں کی طرح تمہارے پاس آیا ہوں۔

جو اپنی ماں کی آغوش میں سکون حاصل کرنے آتا ہے۔

مجھے عہد گذشتہ پر افسوس ہے۔

مجھے بڑا مت سمجھو۔ میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔

میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔

میں اس دنیا میں لذت کا شکار ہو گیا تھا۔

دیوتاؤں کے دیوتا مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔

مجھے بچا لو۔ میں ان طوفانوں میں بری طرح گھرا ہوا ہوں۔

میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھے بچا لو۔

بھجن کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل ہلکا ہو گیا ہو۔ اسے واقعی بچے کی طرح سکون مل گیا۔ جیسے ہچکیاں لیتا ہوا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں آ گیا ہو۔ پوجا کے بعد وہ مندر کے صحن میں بیٹھ گیا۔ جہاں کچھ لوگ بھجن گا رہے تھے۔

ایک پنڈت جھوم جھوم کے گا رہا تھا۔

جو عورت اپنا جسم فروخت کرتی ہو۔ اسے سینے سے لگانا ایسا ہے جیسے کسی مردہ لاش کو سینے سے لگا لیا ہو۔

کتنی سچی بات ہے۔ کوولن کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

جو عورت اپنی حفاظت کرتی ہے اور جو اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اور جو اپنے وعدہ کی پکی ہوتی ہے۔ جو کسی دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ حقیقت میں وہی بیوی کہلانے کی مستحق ہے۔

ٹھیک ہے۔ کنا کی واقعی ایسی پاکباز عورت ہے۔ کوولن بڑبڑایا۔

ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے تعلق رکھنا شراب اور گناہوں میں ڈوبے رہنا یہ سب خدا کی لعنت ہے۔

اتنے میں کوولن نے ایک ہچکی لی۔ یا خدا مجھے معاف کر دے کوولن نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

جس کے برتن میں سادہ پانی بھی شراب سے کہیں بہتر ہے۔ جو انسان سے نفرت کرتا ہو۔

کوولن کی پھر ہچکیاں بندھ گئیں۔

یہ بھی تو ایسا ہی بدنصیب ہے۔ میں سمجھتی تو اپنی تجارت
چھوڑ کر ... مہلت ... ہے۔
پنڈت بھی کچھ کہنے جا رہا تھا۔
"ممکن ہے کہ بدنصیب ہو تو دنیا میں کوئی اس کا نہیں۔ مگر وہ
دولت مند ہو تو دنیا کا ہر آدمی اس کا ہے۔"
"میری تقدیر میں بھی یہی بربادی لکھی تھی۔" گوولن اس طرح
بڑبڑایا کہ پنڈت نے بھی اس کے الفاظ سن لئے۔
"قسمت کو برا بھلا کہنا اپنی ناکامیوں کو چھپانا ہے۔ انسان
خود ناکام ہوتا ہے۔ خود محنت سے جی چراتا ہے اور تقدیر کو
کوستا رہتا ہے۔" پنڈت کہہ رہا تھا۔
گوولن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ناکامی دور کر کے رہے گا۔
وہ اپنی بدقسمتی ختم کر دے گا اور وہ محنت کرے گا۔
"جس انسان کی بیوی نیک ہو۔ اسے اور کیا چاہیئے۔ اور
جس کی بیوی بدچلن ہو اس کے پاس دنیا میں کیا ہے۔"
میری بیوی نیک ہے۔ مجھے اور کیا چاہیئے؟ لیکن کیا
کنکا مجھے معاف کر دے گی۔ میں کس طرح اس سے معافی مانگوں گا؟
معافی مانگنا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں اور پھر
ان لوگوں سے جنہوں نے خواب میں بھی کسی کو معاف کرنے سے انکار
نہ کیا ہو۔
گوولن فوراً فرش سے کھڑا ہو گیا۔ اور مندر کے باہر آ گیا۔ اس
نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کنکا کے پاس جا کر معافی مانگے گا۔
وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ جہاں وہ برسوں سے تنہا رہتا
تھا۔ وہاں وسنت مالا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک یاسمین کے
پھولوں کا ہار تھا جس پر لال رنگ کی لکیر سے کچھ لکھا ہوا تھا۔
غالباً یہ مادھوی کا پیغام تھا جو اس نے گوولن کے نام بھیجا تھا۔
پیغام کی عبارت یہ تھی۔
"ہر ہم پیار، وہ محبت جو دو دلوں کو یکجا کرتا ہے اور یہی
محبت پیار انہیں جدا بھی کر دیتا ہے۔ پھر اگر ایک محبت بھرا دل کچھ
غلطی کر بیٹھے تو کیا اس کی سزا یہی ہے کہ دوسرا انسان غصہ میں
بار بار جو کر چلا جائے ... کرنیں ہی اس درد بھرے
دل کی سزا ...

وسنت مالا ہار سامنے لئے ہوئے کھڑی تھی اور گوولن وہ
پیغام پڑھ رہا تھا۔
"مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لے جاؤ میرے سامنے
سے یہ ہار۔ مادھوی سے کہہ دینا تم ایک حسین رقاصہ ہو تم اپنی
آنکھوں میں دوسروں کیلئے جھوٹی محبت پیدا کر سکتی ہو۔ تمہاری
آنکھیں ہر انسان کو دھوکا دے سکتی ہیں۔ تمہاری دلفریب مسکراہٹ
پتھر کا جگر چیر سکتی ہے۔ پھر تمہیں میری کیا ضرورت ہے؟"
وسنت مالا خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اور اس نے گوولن
کے تمام الفاظ مادھوی کے سامنے دہرا دیئے۔
"تو کیا وہ نہیں آئیں گے؟" مادھوی نے حیرت سے پوچھا۔
"خیر کوئی بات نہیں۔ محبت میں ایسی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔
اگر وہ آج رات نہیں آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کل ضرور آ جائیں گے۔
تم جاؤ آرام کرو۔" اور اس نے وسنت مالا کو بھیج دیا۔
وسنت مالا کے جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس
کا دل غم سے بوجھل تھا۔ اس کے بستر پر بچھے ہوئے پھولوں کا تختہ
اور ان کی خوشبو آج اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ ساری رات وہ
سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ مگر نیند تو جیسے اس سے کوسوں
دور بھاگ گئی تھی۔
اسی شام دیونند کی تائی ایک عورت کنکا سے ملنے آئی۔
دیونند کو شہر کے باہر ایک مندر کی پجارن تھی۔ اس کی زندگی بھی
بڑی عجیب تھی۔ ایک برہمن عورت مالتی تھی جس کا بچہ پیدا ہوتے
ہی مر گیا تھا۔ اور وہ سوکن کے لڑکے کو اپنے بچے کی طرح پالتی رہی۔
ایک دن وہ اپنی چھاتی سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ بچے کو ہچکی
لگی اور وہ مر گیا۔ مالتی خوف سے لرزنے لگی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ
لوگ اس پر الزام لگائیں گے۔ کہ اس نے اپنی سوکن کے بچے کو
لاپرواہی کی وجہ سے مارا ہے۔ مالتی اس بچے کو سینے سے لگائے
شہر کے ایک مندر میں گئی۔ دیوتاؤں کے قدموں پر سر رکھا ان کے
آگے روئی گڑگڑائی۔ مگر کوئی بھی دیوتا اس مردہ بچے میں جان
نہ ڈال سکا۔ پھر وہ تنگ آ کر شہر کے باہر اس مندر میں آ گئی جہاں
ایک خوبصورت عورت ظاہر ہوئی۔ جسے اس نے آج سے پہلے
کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لاؤ بچہ مجھے دو۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ خدا تم پر ضرور کرم کرے گا۔" وہ عورت بچے کو مرگھٹ پر لے گئی۔ مالتی اسکے پیچھے پیچھے تھی اور عورت نے اس بچے کا کریا کرم کردیا۔ مالتی کی دلدوز چیخوں سے فضا گونج رہی تھی۔

"مت رو! بس مت رو!! دیکھو تمہیں اپنا زندہ بچہ مل جائے گا۔"

وہ عورت غائب ہوگئی۔ اور اس نے اس بچہ کا روپ بدل لیا۔ مالتی نے خوشی سے دیوانہ وار ہوکر بچہ کو گود میں لیا اور اس کی ماں کو واپس کردیا۔ یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی شادی دیوندی سے کردی گئی۔ وہ کچھ دن تو دیوندی کے ساتھ رہا۔ لیکن ایک دن اس نے دیوندی کو اپنا راز بتایا اور غائب ہوگیا۔ اور اس سے کہا کہ تم شہر سے باہر اس مندر میں پوجا کرنا اور لوگوں سے کہہ دینا کہ تمہارا شوہر بنارس یاترا کیلئے گیا ہے۔

یہ تھی وہ دیوندی جو آج کنا کی سے ملنے آئی تھی۔ وہ کنا کی سے ہمیشہ متاثر رہی تھی۔ اسے کنا کی کی اس بدنصیبی پر بے انتہا افسوس تھا۔ اس دن اس نے پوجا کی اور اس کے بعد دعا کی اے خدا اس کے شوہر کو واپس کردے۔

"لیکن اگر وہ واپس آ بھی گئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں گی۔ میرا دل میرا ساتھ نہیں دے رہا۔" کنا کی نے کہا۔

"میں نے کل بڑا عجیب خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اور کوولن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی شہر میں گئے ہیں۔ نجانے کیا ہوا کچھ لوگوں نے کوولن پر کسی جرم کا الزام لگایا اور اسے پکڑ لیا۔ میں اس ظلم سے تڑپ اٹھی اور بادشاہ کے سامنے پہنچ گئی۔ اور پھر وہ تمام شہر اور بادشاہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔"

"میری پیاری!" دیوندی نے کہا۔ "ابھی تک تمہارے شوہر نے تمہیں بالکل نہیں چھوڑا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔ یہ سب تمہارے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ہے۔ اگر تم دریائے کیوری اور سمندر کے سنگم پر غسل کرلو تو تمہارا شوہر واپس آجائے گا۔"

"نہیں نہیں! یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ میرا دیوتا صرف میرا شوہر ہے۔ میں کسی اور کے آگے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا پسند نہیں کرتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں ایک ایسے انعام کے لئے کسی کا احسان اٹھاؤں۔" کنا کی نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوندی واپس چلی گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کنا کی اندر گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کوولن اور اس خواب کو یاد کرکے پریشان ہورہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کنا کی نے دروازہ کھولا۔ کوولن سامنے کھڑا تھا۔ کنا کی اس کے قدموں میں گر گئی۔ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ کوولن کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ کنا کی ان برے حالوں میں ہوگی۔ اس نے کنا کی کی دونوں باہیں پکڑیں اور اسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔

"تم نے ہر جھوٹی بات کو سچا کرکے دکھا دیا اور مجھ کمبخت نے اپنے باپ دادا کی تمام دولت لٹا دی اور خود تمہاری بھی۔ اب میرے پاس سوائے بے عزتی کے اور ہے کیا؟" کوولن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"۔ کنا کی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ بیش قیمت پائل حاضر ہیں انہیں بیچ دیجئے۔ آپ کے پاس اتنی دولت ضرور ہو جائے گی کہ لوگ آپ کی عزت کرنے لگیں۔"

کوولن نے اپنا چہرہ کنا کی کے کندھوں پر رکھ دیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ "میری جان میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں مادھوی کو چھوڑ چکا ہوں۔ میں اپنے ماضی سے دامن چھڑا کر آیا ہوں۔ میری کنا کی مجھے معاف کردو۔ میں تمہاری آغوش میں پناہ لینے آیا ہوں۔ تم دھرتی ماتا ہو۔ جو ہر ایک کو معاف کردیتی ہے۔ تم اس نیک اور شریف درخت کی طرح ہو جو اس انسان کو سایہ دیتا ہے جو اس کی جڑیں کاٹتا ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رہے۔ اور روتے رہے۔

"دروازہ کھلا ہے بند کردوں؟" کوولن نے پوچھا۔

"نہیں نہیں آج تمام دنیا کو دیکھ لینے دو کہ ہم ایک بار پھر مل گئے ہیں۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ مل کر پھر زندگی کی اسی شاہراہ پر چلیں گے جہاں سے ہم جدا ہوگئے تھے۔"

"میں اس شہر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایسے شہر میں جہاں

برطانیہ میں عزت کی گئی ہے۔ جہاں مجھے یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ میں ایک مفلس اور اچھا آدمی ہوں۔ میں یہاں سے بہت دور جانا چاہتا ہوں۔ میں ماورا شہر جانا چاہتا ہوں جہاں کسی شخص کو نہیں معلوم کہ مجھے اس طرح بے عزت کیا گیا ہے۔ میں وہاں پھر تجارت شروع کروں گا اور جب تک معقول دولت نہ کما لوں گا واپس نہ آؤں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سرمایہ کہاں سے لاؤں۔ مگر تم فکر مت کرو۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"آپ سرمایہ کیلئے کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ میں نے کہا نا کہ میرے پائل بیچ دیجئے آپ کو بہت معقول رقم مل جائے گی۔"

کودلن نے کہا نہیں میں تجارت کیلئے تمہارے آخری جواہرات بیچنا نہیں چاہتا۔ میں کچھ اور بندوبست کر لوں گا۔

"کیا آپ کوئی اور انتظام کر لیں گے؟ کیا آپ صرف اس لئے واپس آئے ہیں کہ مجھ پر طنز کریں میری بے بسی کا مذاق اڑائیں کیا آج دنیا میں کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جو میری نہ ہو آپ کی ہو۔ یا آپ کی ہو میری نہ ہو۔" اور کنا کی پھر رو دی تھی۔

"تمہیں خدا کی قسم ہے مت رو کناکی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو میں وہی کروں گا۔" کودلن نے اس کے رخساروں پہ بہتے ہوئے آنسوؤں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ماورا جانے کی اجازت دے دو میں ایک سال میں لوٹ آؤں گا۔"

"میں آپ کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ لیکن میری پیاری تم اتنی زیادہ چلنے کی عادی بھی تو نہیں ہو۔ سفر طویل ہے۔ اور پھر راستے میں پہاڑ دریا اور جنگل بھی پڑیں گے اور ان سب سے بڑھ کر جنگلی جانور اور وحشی انسان بھی ہیں۔"

"یہ خطرات میرے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ضرور چلوں گی۔" کناکی نے کہا۔

"اچھا تو پھر آج رات ہی ہم لوگ چلے جائیں گے۔ یعنی چاند نکلنے کے بعد اور سورج ڈوبنے سے پہلے تاکہ کسی کو بھی ہمارے جانے کا علم نہ ہو۔"

نواں باب

رات کی تاریکی میں کودلن اور کناکی شہر سے نکل گئے۔ شہر کی تمام سڑکوں سے گذرتے ہوئے جا رہے تھے جنگل اور دریا پار کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔ آخر وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوئے جہاں ایک جینی پجاری رہتا تھا اور جس کا نام کاوندی تھا۔ "اب ماورا کتنی دور رہ گیا؟" کناکی نے پوچھا کیونکہ وہ پیدل چلنے کی بالکل عادی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔

"بس تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے ہاں کوئی ستر اسی میل ہوگا۔" دونوں پجاری کے پاس گئے اور اسے نمستے کیا۔ پجاری نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔

"تم لوگ کسی شریف خاندان سے معلوم ہوتے ہو اور شاید تمہیں اتنا زیادہ چلنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ پھر تم اتنا لمبا سفر کیوں طے کر رہے ہو؟"

"ہم لوگ ماورا جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہاں اپنی قسمت آزما سکیں۔"

"لیکن اس خوبصورت لڑکی کے نازک پاؤں راستہ کے مصائب اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر میرے ان الفاظ کا تم پر اثر کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔ میں تو خود کافی عرصہ سے ماورا جانا چاہتا تھا۔ چلو اچھا ہوا تم لوگوں کا ساتھ ہو جائے گا۔" پجاری نے کہا۔

"بڑی خوشی ہے مجھے بھی اس لڑکی کی پریشانی سے تھوڑا بہت نجات مل جائے گی۔" کودلن نے جواب دیا۔

"ہمیں جانا کس راستے سے چاہیئے۔" کاوندی نے کہا۔

"اگر ہم ایک سایہ دار راستہ انتخاب کرتے ہیں تو جنگلی جانوروں کا خوف ہے اور دوسرا راستہ اس قابل نہیں ہے کہ یہ نازک سی لڑکی اسے آسانی سے طے کر سکے۔ راستہ میں طرح طرح کے جانور ملیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ خدا ہمارا محافظ ہے۔" کاوندی نے اپنا کاسہ اٹھایا گلے میں جھولا ڈالا اور ہاتھ میں مور چھل لیکر تیار ہو گیا۔ اور وہ تینوں روانہ ہو گئے۔

تینوں دریائے کیوری کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ وہ
مختلف گاؤں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ دن میں
تھوڑا سا زیادہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ کئی دن لگاتار سفر کرتے
رہنے کے بعد وہ سری رنگم پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری شہر میں
چھپ جاتا ہے۔ تینوں ایک جین مندر میں گئے۔ جہاں بڑے
پجاری نے ان کا استقبال کیا۔ کاوندی اور اس کے ساتھی پجاری
کے قدموں میں گر گئے۔ اے خدا تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے
کاوندی نے دعا مانگی۔

"تم تینوں کہاں جا رہے ہو؟" اس پجاری نے پوچھا۔ وہ
ایک پہنچا ہوا پجاری تھا۔ جو ہر انسان کے ماضی اور مستقبل سے
واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مادورا میں کونسی مصیبت کودلن اور
کنائی کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر اس کے لئے خوشی اور غم کوئی معنی نہیں
رکھتے۔ اس لئے اس نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی۔ صرف اتنا
کہا۔ آدمی کو اپنے کئے کا پھل بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ اور اس سلسلہ
میں دوسرے لوگوں کی نصیحتیں اور کوششیں بے سود ہوتی ہیں۔
زندگی تیز و تند طوفانوں میں ایک شمع کی طرح ہے جو آسانی سے
بجھ سکتی ہے۔ کوشش کرو کہ خدا تک پہنچ سکو۔ بس یہی میری نصیحت
ہے۔ کاوندی اور اس کے ساتھی ایک کشتی میں سوار ہو کر دریائے
کیوری کے پار چلے گئے۔ اور پھر وہ ورائم شہر میں داخل ہو گئے۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس شہر کا نام ورائم کیوں رکھا گیا؟"
کاوندی نے پوچھا۔

"نہیں" کودلن نے جواب دیا "بتلائیے یہ نام کیوں رکھا
گیا۔" کودلن نے کہا۔

"بڑی عجیب کہانی ہے" پجاری نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ ایک ظالم پرندے نے یہاں ایک ہاتھی کو مار
دیا تھا۔ دراصل پہلے یہ شہر ایک جنگل تھا۔ جہاں ایک بڑے درخت
پر دو پرندے رہتے تھے۔ ان میں سے مادہ نے انڈے دئے ہوئے
تھے کہ اتفاق سے دوسرے دن ایک ہاتھی اس درخت کے نیچے
سے گذرا۔ اور ہاتھی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے اس درخت
کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے ہاتھی نے اس شاخ کو
اپنی سونڈ میں لیکر توڑ دیا جس پر پرندے کا گھونسلہ تھا انڈے

زمین پر گر کر چور چور ہو گئے۔ مادہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے
اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا جن میں ایک شہد کی مکھی اور ایک
مینڈک تھا۔ ان سب نے ہاتھی کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا۔ ان
میں ایک چوہا بھی تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر تینوں نے ہاتھی پر حملہ
کر دیا۔ شہد کی مکھی نے ہاتھی کی ایک آنکھ پر کاٹا۔ پھر دوسری پر۔
ہاتھی بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔ پھر پرندے نے ہاتھی کی ایک ایک
کر کے دونوں آنکھیں نکال لیں۔ ہاتھی بری طرح سے بھاگ رہا تھا
کہ ایک چٹان پر مینڈک ٹرٹرایا۔ ہاتھی سمجھا کہ کوئی تالاب ہے وہ تیزی
سے آگے بڑھا اور کافی بلندی سے زمین پر آ رہا۔ جب سے
اس جگہ کو ورائم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے چولا بادشاہ نے اس جگہ
کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

دسواں باب

کاوندی ایک درخت کے نیچے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ اپنا پورا
دن وہاں گذارنے کے بعد وہ کودلن اور کنائی کے ساتھ مادورا کے
لئے روانہ ہو گیا۔ سورج نکلنے کے بعد وہ ملاتم پہنچ گئے۔ جہاں
ان کی ملاقات ایک برہمن سے ہوئی۔

"یہاں سے پانڈیا شہر کتنی دور ہے؟" کاوندی نے سوال کیا۔
ابھی برہمن جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ کودلن نے پوچھا
"میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں
کیوں آئے ہیں؟"

"میں بہت سے مقامات کی یاترا کیلئے گھر سے نکلا ہوں
فی الحال میں مادورا سے آ رہا ہوں۔"

کودلن نے اس سے راستہ پوچھا۔

"میرا خیال ہے سب سے اچھا راستہ کھیتوں اور جنگلوں
سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ بہتر ہے آپ اسی راستے سے چلے جائیے۔"

کاوندی اور اس کے ساتھی پھر سفر کو روانہ ہو گئے۔ چلتے
چلتے کاوندی اور کنائی بری طرح تھک گئے۔ انہیں اس وقت پیاس
بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے وہ سڑک کے کنارے ایک درخت
کے نیچے بیٹھ گئے۔ کودلن قریب ہی ایک ندی پر گیا۔ اس نے خود پانی
پیا اور ان دونوں کیلئے پانی لیکر واپس [illegible]

چلا تھا کہ وسنت مالا اچانک اس کے سامنے آئی اور اس کے
قدموں میں گر گئی۔ راستے میں ایک برہمن نے کودلن کو بتا دیا تھا کہ جنگل
کی دیوی تمہارے عزیز اور رشتہ داروں کا بھیس بدل کر تمہیں
دھوکا دینے آئے گی۔ مگر ہوشیار رہنا۔ اس لئے کودلن خاموش
کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وسنت مالا بری طرح سے رو رہی تھی۔

"کودلن خدا کیلئے واپس چلو۔ مادھوی کا بہت برا حال ہے۔
وہ تمہارے غم میں پاگل ہو جائے گی۔ کودلن خدا کیلئے مان جاؤ۔
مادھوی بے ہوش پڑی ہے۔"

"پہلے اس نے مجھے ذلیل کیا اور جب میں وہاں سے چلا آیا
تو وہ جھوٹے آنسو بہا رہی ہے؟" مگر اسے پھر برہمن کی نصیحتوں
کا خیال آیا۔ اور اس نے کچھ دعائیں پڑھیں۔ اور اچانک جنگل
کی دیوی اپنا بھیس بدل کر اصلی روپ میں آگئی۔ اور کودلن سے
معافی مانگی۔ اس نے کودلن سے وعدہ کیا کہ وہ اس واقعے کے بارے
میں کنا کی اور کاوندی سے کچھ نہیں کہے گا۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔
کودلن پانی لیکر کنا کی اور کاوندی کے پاس لوٹ آیا۔ قریب ہی
کالی ماتا کا مندر تھا۔ انہوں نے سوچا کہ سفر کی تھکان اتارنے کیلئے
تھوڑی دیر اس مندر میں آرام کر لیں۔

جوں ہی وہ اندر گئے مندر میں ایک لڑکی نے کالی ماتا کا روپ
دھار کر رقص شروع کیا۔ وہ شیر کی کھال پہنے ہوئے تھی اور اس
کے سر پر بارہ سنگھے کا سر لگا ہوا تھا۔ اور گلے میں شیر کے دانتوں
کا ہار پہنا ہوا تھا۔ وہ رقص کر رہی تھی اور لوگ مندر میں داخل
ہو رہے تھے۔ یہ وہ مندر تھا جہاں وہ ہر سال کسی نہ کسی
آدمی کی جان کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ غرض آدھی رات تک
رقص ختم ہوا اور کودلن نے کاوندی سے کہا اگر ہم اس وقت
اپنا سفر شروع کر دیں تو صبح کو سورج کی گرمی سے بچ جائیں گے۔
وہ تینوں پھر سفر کو روانہ ہو گئے۔

وہ دن بھر سفر کرتے جا رہے تھے۔ اب تو مدورا بہت
قریب رہ گیا تھا۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچے جہاں پر چرواہے
رہتے تھے۔ یہ سب یہاں ٹھہر گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے
بعد کودلن گاؤں میں ٹہلنے نکل گیا۔ وہ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا
[illegible]

"ارے تم کہاں؟" کودلن نے حیرت سے پوچھا۔
"آپکو تلاش کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہوں۔" کوسیکر نے
جواب دیا۔ اتنے طویل سفر کی وجہ سے بڑا برا تھکا ہوا تھا۔
"مگر مجھے تلاش کرنے کی اب کیا ضرورت ہے؟"
"مجھے مادھوی نے بھیجا ہے۔ آپ کے والدین کی بہت بری
حالت ہے۔ آپ کے سب رشتہ دار پریشان ہیں۔" کوسیکر نے
کہا۔

"ہوں..." کوسیکر نے غور سے اس کی بات سنتے ہوئے کہا
"آپ کے والد نے ہر طرف آدمی بھیج رکھے ہیں تاکہ وہ آپ کو
تلاش کر کے لائیں۔
آپ کی لڑکی مینی میکھلائی کی بھی بہت بری حالت ہے۔ اس
نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے ——— ! خدا کیلئے واپس آجایئے
میں دیوتا کی طرح آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اگر میری ماں سے
کوئی غلطی ہو گئی تو اس کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے آپ
مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا کیلئے واپس آجایئے۔ اب ہم سب
اکٹھے رہیں گے۔ ہم کنا کی کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں۔"
کودلن خاموش کھڑا یہ پیغام سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"مینی میکھلائی خیریت سے تو ہے؟" کودلن نے پوچھا۔
"ہاں خیریت سے ہے۔ مگر آپ کے چلے آنے سے اس معصوم
کا دل ٹوٹ گیا ہے۔" کوسیکر نے جواب دیا۔ "اور مادھوی کی
حالت تو بہت خراب ہے۔ میں نے زندگی بھر ایسی کوئی عورت
نہیں دیکھی۔ جس نے شوہر کی جدائی میں اپنی حالت ایسی کر لی ہو۔
لیجئے یہ مادھوی کا خط ہے۔" کوسیکر نے ایک خط دیتے ہوئے کہا۔
مادھوی کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ
کودلن کو یاد آ رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کانپتے
ہاتھوں سے اس نے خط کھولا۔

"میری زندگی کے مالک۔ مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی تو
جگہ دے دو۔ خدا را وہ باتیں بھول جاؤ جو میں نے صرف مذاق میں
کہی تھیں۔ اور جن باتوں نے تم کو مجبور کر دیا تھا کہ تم مجھے اپنے
والدین اور اس شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تم جنگلوں میں [illegible]

پھر رہے ہو۔ اپنے ساتھ کنا کی جیسی شریف اور نیک عورت کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ۔

تمہاری بدنصیب

مادھوی

کوولن نے پورا خط پڑھا۔ وہ واقعی غلطی پر نہیں تھی یہ خط لے جاؤ۔ اور میرے والدین کو دے دینا۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ مادھوی بے قصور ہے۔ میں کسی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے مادورا میں رہ کر تجارت کرنی ہے۔ مادھوی اور مینی میکھلائی سے صرف اتنا کہہ دینا کہ میں چاہتا ہوں میری لڑکی ایک شریف عورت بنے رقاصہ نہیں۔ اچھا اب تم جاؤ۔

کوسیکر نے بہت اصرار کیا۔ مگر کوولن نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ آخر مجبور ہو کر کوسیکر واپس چلا گیا۔

کوولن کنا کی کے پاس آیا۔ اور وہ تینوں پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان کے کانوں میں انتہائی شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑے بڑے نقارے بجائے جا رہے تھے۔ شیوجی کے مندر میں بھجن گائے جا رہے تھے۔ شاہی اصطبل سے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ پیدل سپاہیوں کے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ دریائے ویگی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

تینوں دریا پر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھی، شیر اور گھوڑے کی شکل کی کشتیاں مسافروں کو دریا پار کرا رہی تھیں۔ یہ تینوں بھی ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے گئے۔

آخر وہ مادورا پہنچ گئے۔

آپ کنا کی کے ساتھ رہیں۔ میں رہنے کیلئے کسی جگہ کا انتظام کر آؤں۔ کوولن نے کاوندی سے کہا۔

کوولن صدر دروازے سے شہر میں داخل ہو گیا۔ جس پر سپاہی تلواریں لئے حفاظت کیلئے کھڑے تھے۔ وہ کئی گھنٹے تک شہر میں گھومتا رہا مگر ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ آخر شام ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک باغ میں شہر کی خوبصورت رقاصائیں اپنے دولت مند عاشقوں کے ساتھ آ رہی ہیں۔ چونکہ باغ میں ہر طرف شمعیں جل رہی تھیں اس لئے کوولن کو یہ منظر دیکھنے میں آسانی ہوئی۔ اس نے بہت سی نوجوان لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔

بازاروں میں بہت بھیڑ تھی۔ دکانوں پر سونا، موتی، ہیرے جواہرات اور اسی قسم کی چیزیں بھری پڑی ہوئی تھیں۔ سناروں اور ساہوکاروں کا اپنا الگ بازار تھا۔

کوولن واپس آگیا۔ اس نے شہر میں جو کچھ دیکھا تھا سب کچھ کنا کی اور کاوندی کو بتایا۔

اتفاق سے اسی وقت ایک برہمن سامنے سے گزرا۔ وہ کوولن کو پہچان گیا۔

میں مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ برہمن نے کہا۔ اور آپ کو تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ آپ جیسے مشہور تاجر کو کون نہیں جانتا۔ مجھے وہ واقعہ بھی معلوم ہے جب آپ نے اپنی لڑکی کا نام مینی میکھلائی رکھا تھا۔ اور ایک دن جب آپ نے اپنی حیثیت برہمن کو مست ہاتھی کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ تو میں وہاں موجود تھا۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب ایک برہمن نے ایک نیولے کو جان سے مار دیا تھا۔ اور پھر شرم کے مارے اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تو آپ اس برہمن کو واپس لائے تھے۔ اور اسے بہت سا انعام و اکرام بھی دیا تھا۔ حضور آپ جیسے شریف انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب جھوٹی گواہی دینے پر ایک برہمن کو قتل کیا جا رہا تھا۔ تو آپ نے خود کو اس کی جگہ پیش کیا تھا۔ اور بعد میں اس کی بیوی کو بہت سی دولت دی تھی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ملنے والی ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو کوولن نے کہا۔ میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ ایک نیچی ذات کے آدمی نے بادشاہ کے حکم سے مجھے لمبے لمبے سینگوں والے بھینسے پر بٹھا دیا ہے۔

میں بھینسے پر بیٹھا ہوا ہوں اور کنا کی بُری طرح رو رہی ہے۔ اور نہ جانے کیا ہوا۔ کہ جن لوگوں نے مجھے سزا دی تھی وہ سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔

آپ لوگ بہتر ہے شہر میں رہیں۔ یہاں دھوکہ باز بہت ہیں۔

برہمن نے کہا۔

کاوندی نے بھی یہی مشورہ دیا۔ اچانک کاوندی کی ایک پیرد مادری آ نکلی۔ اور کاوندی نے ان دونوں کو مادری کے سپرد کر دیا۔

مادری ان دونوں کو اپنے گھر لے گئی۔

نئے گھر میں پہنچ کر ان دونوں نے غسل لیا۔ کناکی نے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد کوولن بیٹھا پان کھا رہا تھا۔

کناکی میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟ اور پھر ایک ایسے انسان کی تقدیر میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ جس نے زندگی ایک رقاصہ کے ساتھ گزاری ہو۔ اور جس نے اپنے ضعیف والدین کی بھی خدمت نہ کی ہو۔ میں نے تم کو بھی تکلیف دی ہے۔ تم عمر میں چھوٹی ضرور ہو مگر عقل کے اعتبار سے تمہاری عمر بہت بڑی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو اتنے لمبے سفر کی تکلیف نہ دوں۔ مگر کرتا کیا۔ تم میں ہمت کتنی ہے؟ اور اس سب سے بڑھ کر تم نے مجھ جیسے انسان پر بھروسہ کتنا کیا۔

میں جانتی تھی کہ آپ میں تبدیلی آ گئی ہے۔ کناکی نے کہا۔

تم نے میری خاطر اپنے والدین کو، رشتہ داروں، نوکروں اور اپنے آرام و آسائش کو چھوڑ دیا۔ تم نے اس صبر و استقلال سے میری کشتی بہت بڑھائی ہے۔

میں اب تمہاری خاطر کاروبار شروع کروں گا۔

کوولن نے ایک پائل لی اور شہر میں فروخت کرنے چلا گیا۔

اس نے چلتے ہوئے کناکی کو سینے سے لگا کر بوسہ دیا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر پورا قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ تو امنڈے ہی چلے آ رہے تھے۔

کوولن گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک بہت تنہا بیل دوسری سمت کو روانہ ہو گیا۔ کوولن کو خیال بھی نہ آیا کہ یہ بڑا شگون ہے۔ وہ سیدھا ساہوکاروں کے بازار چلا گیا۔ سب سے بڑا ساہوکار بازار میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور بہت سے ساہوکار تھے۔

دیکھئے میرے پاس یہ بیش قیمت پائل ہے۔ کوولن نے ساہوکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کیا آپ اس کی قیمت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ملکہ کیلئے یہ بہت مناسب رہے گا۔

ساہوکار نے پائل بڑی غور سے دیکھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ مسرور ہو گیا۔

پچھلے ہفتہ ملکہ نے اسے اپنے جواہرات کا ڈبہ دیا تھا تاکہ وہ کانوں کی بالی بنانے کیلئے کچھ جواہرات چھانٹ۔ ساہوکار نے ملکہ کی نگاہ بچا کر بیش قیمت پائل چرا لی۔

دوسرے دن یہ پائل ایک ایسے مسافر کے ہاتھ بیچ دی گئی جو اسی دن سمندر کے راستے دوسرے ملک جا رہا تھا۔

ملکہ کو اس چوری کا علم دو دن بعد ہوا۔ اس نے بادشاہ سے شکایت کی۔ مگر بے چارہ بادشاہ کیا کرتا وہ بے قصور تھا۔ چور کی بے انتہا تلاش کی گئی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بادشاہ کو ساہوکار پر شبہ تھا۔

ایک ہفتہ میں چور کا پتہ چل جائے ورنہ اچھا نہ ہوگا مجھے تم پر شبہ ہے۔ ایک ہفتہ بعد میں یہ معاملہ شہر کوتوال کے سپرد کر دوں گا۔ پھر تم جانتے ہو کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ بادشاہ نے ساہوکار سے کہا۔

ساہوکار کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ وہ ہر وقت خدا سے دعا کرتا رہتا تھا کہ اے خدا اس مصیبت سے نجات دلا۔

آج خدا نے اس کی سن لی تھی۔ کوولن کی لائی ہوئی پائل بالکل ویسی ہی تھی جیسی ملکہ کی کھوئی تھی۔

اس بے ایمان ساہوکار نے سوچا اس آدمی کو میں اپنے گھر بٹھا دوں اور بادشاہ کو اطلاع دے دوں کہ ان کا گم شدہ مال مع چور کے مل گیا ہے۔ بادشاہ اپنے سپاہی میرے ساتھ کر دے گا یہ چور اور مال پکڑا جائے گا۔ اور مجھے مصیبت سے نجات مل جائے گی۔

میرے عزیز اس پائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی خریدار صرف ملکہ ہو سکتی ہے۔ میں ابھی بادشاہ کو جا کر اطلاع کر دیتا ہوں۔ لہٰذا آپ میرے غریب خانے پر تشریف رکھیں۔

ساہوکار نے پائل احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ کر کوولن کو واپس کر دی اور کوولن کو اپنے گھر لے گیا۔

ساہوکار کوولن کو گھر میں بٹھا کر بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

اس کی ان نوازشوں سے کوولن بہت خوش تھا۔

اسی دن ملکہ کی بادشاہ سے اس بات پر جھڑپ ہو چکی تھی کہ کتنے دن گزر گئے اور ابھی تک پائل کا چور نہیں پکڑا گیا۔ دراصل ملکہ کو یہ غرض تھا کہ بادشاہ ایک رقاصہ سے بہت دلچسپی رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ پائل اس کے پاؤں کی زینت بنا ہو۔ اس چھوڑپ کے بعد بادشاہ مشکے کمیت سے نکل ہی سہا تھا کہ ساہوکار بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔

حضور میں نے چور پکڑ لیا ہے۔ ساہوکار نے کہا۔

کیسے پکڑا؟ بادشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

حضور وہ پائل لیکر میرے پاس آیا تھا۔ اور آدھی قیمت پر اسے فروخت کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہے کہاں؟

میرے گھر میں بیٹھا ہے۔ پائل بھی اس کے پاس ہے۔

بادشاہ پائل کے ملنے سے بہت خوش تھا۔ وہ ملکہ کو خوش کرنے کیلئے چور کو فوراً سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ملک کا یہ قانون بھول گیا کہ باقاعدہ مقدمہ چلائے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس نے فوراً تین سپاہیوں کو بلایا۔

ساہوکار کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم ملکہ کی پائل چور کے قبضے میں دیکھو تو اسے فوراً جان سے مار دینا۔ اور وہ پائل لے آنا۔ بادشاہ نے کہا۔ اور تم ملکہ کی پائل پہچانتے ہو نا!

جی حضور ہم پہچانتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

ساہوکار اور سپاہی محل سے روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچکر ساہوکار نے کودلن سے کہا۔ یہ سپاہی بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہیں پائل دکھا دو۔

سپاہیوں نے پائل دیکھی۔ وہ پہچان گئے۔ یہ تو واقعی ملکہ کی پائل تھی۔

وہ سپاہی غور سے کودلن کو دیکھ رہے تھے۔

مگر یہ شخص چور نہیں معلوم ہوتا۔ ایک سپاہی نے ساہوکار کے کان میں کہا۔

تم لوگ بے وقوف ہو۔ تم چور کے بارے میں جانتے کیا ہو۔ ساہوکار نے جواب دیا۔ تم کو یہ یقین ہے کہ یہ پائل ملکہ کی ہے؟

ہاں پائل تو ملکہ کی ہے۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

تمہیں وہ چور یاد ہے جو سیٹھ کا بھیس بدل کر آیا تھا۔ اور جواہرات ہیروں کا ہار چرا کر لے گیا تھا۔ کیا تمہارا مطلب ہے وہ چور شکل سے بھی چور معلوم ہوتا؟ اس قانون پر تمہیں کوئی باقاعدہ

کتاب پڑھنی چاہیئے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ اگر یہ سے ہم پہ شبہ ہو گیا تو غائب ہو جائے گا۔

ایک سپاہی آگے بڑھا۔ تلوار سے اس نے کودلن کی گردن پر وار کیا۔ کودلن زمین پر گر گیا۔ اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔۔

سپاہی پائل لیکر واپس چلے گئے۔

بادشاہ نے پائل دیکھی۔ پائل واقعی ملکہ کی تھی۔ وہ پائل لیکر ملکہ کے پاس گیا۔ ملکہ پائل دیکھ کر خوش ہو گئی۔

تم اس کے گم ہونے پہ مجھے الزام دے رہی تھیں۔ بادشاہ نے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اور پھر بادشاہ ملکہ کے کمرے سے باہر آ گیا۔

بارھواں باب

کودلن کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا کنا کی سخت پریشان بیٹھی تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میرا دل خوف سے لرز رہا ہے۔ میرے آقا ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔ انہیں کیا ہوا!

مادری مندر سے واپس آئی۔ تو وہ کنا کی کے پاس خاموش کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

ادہ۔ کنا کی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خدا کیلئے بتاؤ تو۔ میں تو اپنے آقا کیلئے پریشان بیٹھی ہوں۔ کیا ان کے بارے میں کوئی خبر دینا چاہتی ہو۔ کیا ہوا؟!

کودلن کو بادشاہ کے سپاہیوں نے جان سے مار دیا۔ مادری نے بمشکل تمام الفاظ ادا کئے۔

مگر کیوں؟

اس پر الزام تھا کہ اس نے ملکہ کی پائل چرائی ہے۔

یہ ظلم ہے۔ یہ نا انصافی ہے۔ کنا کی غصے سے سرخ ہو گئی۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہاں ہو میرے آقا تم کہاں ہو؟ اور کنا کی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو غصہ سے نجانے وہ کیا کیا کہنے لگی۔

کیا میں زندگی بھر اس لئے بیوہ رہوں گی کہ میرا شوہر بادشاہ کی ناانصافی کی نذر ہو گیا ہے؟

دھرم کی بے وقوف دیوی کیا میں نے اتنا طویل سفر صرف اس لئے کیا تھا کہ یہاں آکر بادشاہ کی ناانصافی کی شکار ہو کر بیوہ ہو جاؤں؟

اے سورج تو ہی بتا کیا میرے آقا معصوم نہیں تھے؟ کیا انہوں نے چوری کی تھی؟۔

میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس پورے شہر میں آگ لگ جائیگی۔

کنا کی نے اپنی دوسری پائل اٹھائی۔ محلے کی دوسری عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

شریف عورتوں واقعی تم قابل داد ہو، جو ایسے ظالم بادشاہ کے ملک میں رہتی ہو۔ بادشاہ میرے پائل کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اس نے بہانہ بنا کر میرے آقا کو قتل کرا دیا تاکہ وہ پائل حاصل کر سکے۔

اگر میں نیک عورت ہوں تو تم لوگ دیکھنا کہ میرے آقا مرنے کے بعد بھی بولیں گے۔

کنا کی مادری کے ساتھ شہر چلی گئی۔ مادری اسے سابجوار کے گھر لے گئی۔ جہاں کوولن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

کنا کی نے کوولن کو دیکھا۔ مگر کوولن اس کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ شہر میں سناٹا تھا۔ اس لئے کنا کی کے رونے کی آواز پر تمام شہر جمع ہو گیا تھا۔ آج صبح ہی تو کنا کی کوولن کی آغوش میں تھی۔ اور آج ہی شام کو اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی۔

کنا کی کوولن سے چمٹ گئی۔ اس نے اپنے آنسوؤں سے خون کے دھبے دھوئے۔

کیا تمہارا خوبصورت جسم اس طرح خاک اور خون میں لتھڑنے کیلئے تھا۔ میرے آقا۔ کچھ تو بولو۔ کیا اس شہر میں ایک بھی آدمی کے دل میں انصاف نہیں۔ کیا کوئی عورت اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتی۔ کیا اس شہر میں کوئی خدا نہیں ہے۔ جو مظلوموں کو بادشاہ کی تیز تلواروں سے بچا سکے۔ میرے آقا صرف ایک دفعہ تو بول دو۔ صرف ایک دفعہ..

کوولن کو ہوش آگیا۔ میری محبوبہ کا چاند سا چہرہ میری نظروں سے غائب ہو رہا ہے۔ کوولن نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ کنا کی نے کوولن کے پاؤں پکڑ لئے۔

میری پیاری تم کہیں مت جانا۔ بس یہیں رہنا۔ کوولن نے پھر آہستگی سے کہا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

کیا میرے آقا واقعی بولے تھے۔ یا مجھے دھوکا ہوا تھا۔ کنا کی نے سوچا۔

اے خدا میں کہاں جاؤں؟ کس سے فریاد کروں؟ اچھا پہلے بادشاہ کے پاس جاتی ہوں۔ اسے بتاتی ہوں کہ وہ کس قدر ظالم ہے۔ میرے آقا کی لاش تنہا نہیں جلے گی، اس آگ میں اس شہر کو بھی جلنا پڑیگا۔

کنا کی کو وہ خواب یاد آرہا تھا۔ جو اس نے دیونندی کو سنایا تھا۔ کتنا سچا تھا وہ خواب۔ کنا کی وہاں سے کھڑی ہوئی اور بادشاہ کے محل کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر پہلے ملکہ نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا اور وہ بادشاہ کے پاس بھاگی ہوئی آئی اور اسے پورا خواب سنایا۔

میں نے خواب دیکھا ہے۔ آپ کا تاج گر گیا ہے۔ کوئی فریادی محل کے باہر لٹکے ہوئے گھنٹے کو برابر بجائے جا رہا ہے۔ شاید آپ سے کوئی بے انصافی ہو گئی ہے۔ ملکہ نے کہا۔

خدا جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔

ٹھیک ایسا ہی خواب آپ کے آبا و اجداد نے بھی دیکھا تھا۔ جب آپ کے خاندان کے ایک بزرگ نے اگر ... پر اپنا نیزہ پھینکا تھا اور سمندر کے دیوتا نے غصہ میں ان کا پورا ملک نگل لیا تھا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ محل کا ایک سپاہی آیا۔

حضور ایک عورت آئی ہے۔ سپاہی نے کہا۔

کون ہے وہ عورت؟ بادشاہ نے پوچھا۔

حضور شکل سے تو وہ کوئی دیوی معلوم ہوتی ہے۔

وہ عورت کیا چاہتی ہے؟

وہ غصہ میں سُرخ ہے۔ کالی مائی کی طرح غضب ناک ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

بھیج دو اندر۔ بادشاہ نے کہا۔

سپاہی کناگی کو بادشاہ کے سامنے لے آئے۔

تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا تمہیں؟ بادشاہ نے پوچھا۔

میں پوہر کے شہر سے آئی ہوں۔ جہاں کے بادشاہ نے ایک فاختہ کی جان بچانے کیلئے باز کو اپنے جسم کا گوشت کھلایا تھا۔ اور جہاں کے ایک بادشاہ نے اپنے عزیز بیٹے کی جان کی پرواہ نہ کی اور اسے اپنی رتھ کے پہیوں سے کچلتا ہوا چلا گیا۔ تاکہ اس گلے تک پہنچ سکے جو محل کے دروازے پر لٹکا ہوا انصاف کا گھنٹہ بجا رہی تھی۔

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ بادشاہ نے کہا۔

اُس شہر سے کووَلن نامی ایک سوداگر یہاں آیا تھا۔ اور آپ کے حکم سے اُسے قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ ایک پائل بیچنا چاہتا تھا۔ میں اسی بدنصیب کی بیوی کناگی ہوں۔

نیک خاتون میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ چور کو موت کی سزا کے علاوہ اور کیا سزا دی جا سکتی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔

ایک بے گناہ کو قتل کرنا انصاف نہیں ہے۔ آپ نے اسے قتل کرایا ہے۔ انصاف نہیں کیا۔

تم اس کی بیوی ہو۔ اس لئے یہی کہو گی کہ وہ بے گناہ تھا لیکن وہ چوری کے مال کے ساتھ پکڑا گیا۔

کون سا چوری کا مال اس کے پاس تھا؟۔

ملکہ کی پائل۔

پائل کا چور وہ نہیں تھا آپ ہیں۔ آپ بادشاہ ہیں۔ اس لئے جو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ اگر ملکہ کی پائل کھو گئی تو اس میں بدحواس ہونے کی کیا بات ہے۔ اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس پائل کے لئے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا جائے۔ کیا آپ کو ایسی بے انصافی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔

بکواس بند کرو۔ تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے بادشاہ نے غصہ سے کہا۔

اس لئے کہ یہ سب سچ ہے اور میرے پاس ان سب باتوں کا ثبوت موجود ہے۔

ثابت کرو کہ جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے۔ ورنہ مر جاؤ گی بادشاہ غصہ سے لرز رہا تھا۔ لو یہ ہے وہ پائل جو تمہارے شوہر کے پاس سے نکلی ہے۔ بادشاہ نے پائل کناگی کو دے دی۔

کناگی نے پائل غور سے دیکھی۔ یہ اس کی اپنی ہی پائل تھی۔

آپ بتا سکتے ہیں کہ ملکہ کی پائل میں کیا بھرا ہوا تھا؟ کناگی نے پوچھا۔

اس میں سچے موتی تھے۔ بادشاہ نے کہا۔

اور میرے پائل میں جواہرات تھے۔ دیکھئے اس کے اندر کیا ہے اور کناگی نے پائل زور سے زمین پر دے ماری۔ پائل کے ٹکڑے ہو گئے۔ خوبصورت اور چمکدار جواہرات فرش پر بکھر گئے۔

اُف یہ کیا ہوا؟ میں کیسا بادشاہ ہوں۔ ایک بدمعاش ساہوکار کی باتوں میں آکر میں نے اتنا بڑا گناہ کر دیا۔

میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مروا دیا۔ چور میں ہوں۔ میں انصاف نہیں کر سکا۔

"اے خدا میں نے جو کچھ کیا جلدی میں کیا۔

میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مار دیا۔

مجھے معاف کر دیجئو اے خدا۔

مجھے معاف کر دیجئو۔

بادشاہ نے خنجر نکالا۔ اور اپنے سینے پر مار لیا۔

بادشاہ کی لاش تڑپ رہی تھی۔ ملکہ بادشاہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے آقا میں اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ میرے آقا میں آ رہی ہوں۔

ملکہ۔ کناگی نے کہا۔ میں بدنصیب قسمت کی شکار ہوں۔ میں ایک جاہل عورت ہوں۔ لیکن صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر کوئی انسان کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اسے اس کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ اور اگر عورت نیک ہو تو عام زندگی میں خواہ کتنی ہی لاچار اور مجبور رہو مگر اسے پوری فطرت پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ میں آج اس قوت کو ثابت کر کے دکھا دوں گی۔ میں آج تمام دنیا کو ایک سبق دوں گی تم دیکھو گی کہ یہ پورا شہر آگ کے شعلوں کی نذر ہو جائیگا۔

شعلہ

کناکی نے ملکہ کو دیکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ پھر اس نے پورے شہر کو پکارنا شروع کیا اور خدا سے دعا کی۔

"اے خدا آج میرے تقدس کی لاج رکھ لے۔
آج اس شہر کو آگ کی نذر کر دے۔
تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے۔
بے انصافی کا بدلہ کیا ہے۔
اے خدا صرف نیک لوگ اور برہمنوں کو چھوڑ دے۔
اے خدا صرف نیک عورتوں۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دے۔
اس پورے شہر کو ان کے بادشاہ کی کرتوتوں کی سزا دے
جس نے مجھے ماں بننے سے محروم کر دیا۔
اے خدا اس شہر کو آگ لگا دے
اے خدا آج میری لاج رکھ لے۔"

اچانک اگنی دیوی کناکی کے سامنے ایک برہمن کے روپ میں ظاہر ہوئی۔

"میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔" دیوی نے کہا۔

دیوی نے اپنا منہ کھولا۔ آگ کا ایک شعلہ نکلا۔ اور سارا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ آگ کے خوفناک شعلوں نے تمام شہر خاک کر دیا۔ رقاصائیں اپنے حسین اور قیمتی لباسوں میں، سپاہی اپنی وردیوں میں۔ سوداگر اپنی دکانوں میں۔ غرض سب اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔

لوگوں نے آگ سے بچنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پورا شہر جل کر خاک ہو چکا تھا۔ کناکی شہر کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔

"میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔

"تم کون ہو؟" کناکی نے پوچھا۔

"میں اس شہر کی دیوی مادھوراپتی ہوں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"

میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تمہارے شوہر کو پچھلے جنم کی سزا ملی ہے۔ پچھلے جنم میں تمہارے شوہر کا نام بھارت تھا۔ وہ بادشاہ کا سب سے بڑا پولیس افسر تھا۔ ایک دفعہ اس شہر میں سنگاما نامی نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی بیوی کا نام ... ہاں یاد آ گیا "نیلی" تھا۔ نوجوان بہت سا تجارتی مال لے کر واپس جا رہا تھا۔ بھارت کو اچانک اس پر شبہ ہوا کہ وہ غیر ملک کا جاسوس ہے۔ اس بے گناہ کو جان سے مروا دیا گیا۔

نیلی بادشاہ کے پاس فریاد لیکر گئی۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ چودہ دن تک اس نے انتظار کیا۔ اور آخر اس نے ایک پہاڑ سے کود کر خودکشی کر لی۔ مرتے وقت اس نے خدا سے دعا مانگی تھی۔

اے خدا جس طرح بھارت نے میرے شوہر کو بے گناہ مارا ہے۔ اسی طرح اگلے جنم میں اسے بے گناہ جان سے مروائیو۔ تو یہ بھارت کے پچھلے جنم کی سزا ہے۔

کناکی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اور شہر کے باہر ان پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئی جہاں نیلی نے خودکشی کی تھی۔

تیرہ دن تک وہ انتظار کرتی رہی اور چودھویں دن اندرا دیوتا اپنا تخت لیکر آئے اور کناکی کو اپنے ساتھ آسمان پر لے گئے جہاں کوولن اس کا انتظار کر رہا تھا۔

پنّالال پٹیل

ہندوستانی زبانوں کے ناولوں میں گجراتی کے ناول دیہاتی سماج کی اچھی تصویر پیش کرتے ہیں۔ "جیتی کی وراج" گجراتی زبان کا ایک نمائندہ ناول ہے جس کے مصنف پنّالال پٹیل دیہاتی زندگی کی مرقع کشی اور منظر نگاری میں باکمال سمجھے جاتے ہیں۔

زیرِ نظر ناول میں کئی وصف ہیں۔ اس میں گاؤں کی روح بول رہی ہے۔ گاؤں کی مزدورنیں، جھگڑے قصّے، ماحول، مسائل، معروفیات، پنچایت اور بہادروں کی تصویریں دیکھ کر قاری اُسی ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ پٹیل نے اس چھوٹے سے ناول میں قصّے کی ترتیب فنکارانہ انداز سے کی ہے۔ اس کا قلم بہکتا بھٹکتا نہیں، صرف ایک چھوٹے سے مسئلے کے گرد پورا ناول چکّر لگا رہا ہے لیکن ہر سطر پر دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور آخری باب تک پہنچتے پہنچتے بھی SUSPENSE باقی رہتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو دراصل منو ہے۔ اس کا بھرپور نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی شخص کے اندر کا "انسان" مرتا نہیں، سو جاتا ہے۔ اور جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو انسان اپنے عیب کا خود ہی احتساب بھی کر سکتا ہے۔ اور خود ہی کفارہ بھی ادا کر سکتا ہے!

تاثیر اور تاثر کے اعتبار سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ اس میں ابتدا کا وہ تمام حصّہ جو جھمکو کے مہوے کے نیچے جا کر بیٹھنے سے لے کر مہوا یاد میں اس کی واپسی کے لئے پھیلنے تک ہے جگہ جگہ بڑے دلنشین تاثر پیش کرتا ہے۔ مثلاً جھمکو اپنے گاؤں سے چلتے ہوئے اُن درختوں کی طرف نظر ڈالتی ہے جو اُس کے جلتے پھولنے ہیں جہاں وہ بچپن میں کھیلی ہے اور جن کے سائے میں اس کا بچپن گذرا ہے۔ انھیں دیکھ کر اُسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اب وہ کبھی ان درختوں کو نہ دیکھ سکے گی۔ اس کی حسرت بھری آنکھیں اُن درختوں سے کہہ رہی ہیں کہ "میری ماں اگر ادھر مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئے تو تم انھیں بتا دینا کہ ہم نے جھمکو کو دیکھا تھا اور وہ اس طرف گئی ہے!" ایسی جذبات نگاری نے ناول میں بڑے خوش نما اور دیرپا رنگ بھر دیئے ہیں!

یہ ناول ہندی کے واسطے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہندی کے مترجم نے اس کی زبان صاف نہیں رکھی۔ اسے ہم نے کہیں کہیں سنوار دیا ہے لیکن مکالموں میں زیادہ تر آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ ناول چونکہ ہمارے دیہاتی ماحول کا ترجمان ہے اور جانے پہچانے سے کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے، اس لئے پڑھنے والوں کو اصل ہی معلوم ہوگا۔ اور اس سے بڑی حد تک یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجراتی زبان میں ناولوں نے کہاں تک ترقی کی ہے۔

اس کا مصنف پنّالال پٹیل خود دیہاتی زندگی میں پلا بڑھا اور کھیلا کودا ہے، وہ دیہاتی زندگی کے حسن کا پوری طرح سے رمز شناس ہے اور اسے پیش کرنے میں بھی فن کارانہ مہارت رکھتا ہے۔ قصّے میں شروع سے آخر تک ربط و تسلسل موجود ہے۔ لیکن جزئیات نگاری میں پٹیل کا قلم تو بڑے حسن و اعتدال سے چلتا ہے۔ اس کے پیش کئے ہوئے کردار اور اُن کا ماحول بول اٹھتا ہے۔

پنّا لال پٹیل

مترجم: نثار احمد فاروقی

کاہے کو بیاہی بدیس....

جاڑے کے دن ہیں، رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے سردی اتنی شدید ہے کہ سب اپنے اپنے گھروں میں۔ کوئی چوپال میں سلگتے ہوئے الاؤ کے پاس تو کوئی چولہے کے سامنے بیٹھے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ کھیتوں کے رکھوالے بھی بیالو کر کے کھیتوں پر چلے گئے ہیں۔ گاؤں کی عورتوں کے گھریلو کام پورے نہیں ہوئے ہیں۔ کسی کسی گھر سے اناج پیسنے کی آواز گھرر، گھرر آ رہی ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بچے ماں کی گود کے بجائے اس کی ساڑی میں لپٹ کر یا گودڑی میں سمٹ کر سو گئے ہیں۔

گاؤں بھر میں دیر سے بیالو کرنے والے منورو اکھیا بھی بیالو کر کے اٹھے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے، دروازے کی طرف بڑھے اور اپنی گھر والی سے، جو کام کر رہی تھی پوچھا:

"کہاں گیا کلوا..... ؟ میرا حقہ چلم.......!"

"یہاں کلوا کہاں ہے۔ وہ تو بیالو کر کے کھیت پر چلا گیا۔ یہ کہہ گیا ہے کہ حقے میں پانی ڈال دیا ہے، تمباکو رکھ دیا ہے بس آگ رکھنے کی کسر ہے یہ ذرا سا کام خود کر لو!"

چلم بھرنے کا قصہ مختصر کرنے کے لئے، خواہ گھر والی کی روزانہ ایک ہی مطلب کی بات سننے سے بچنے کے لئے، وہ چوپال کی طرف چلے گئے اور وہاں سلگتے ہوئے الاؤ کی آگ سے چلم بھرنے چلے آئے۔ چلم سے دھواں زور کر منہ میں لگاتے والے ہی تھے کہ چوپال کی دیوار پر کسی کے آنے کی آہٹ دیکھ کر ہٹک لگائی۔

"کون ہے رے؟"

"میں ہوں موتیا، منورو کاکا، تم سے ایک کام ہے اگر گھر تک چلے چلو تو اچھا ہو۔"

"اتنی سردی میں وہ ایسا کیا کام ہے؟" یہ کہہ کر منورو حقے کے دو تین کش لگا کر موتی کی طرف دیکھنے لگے جو الاؤ کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"کاکا، بڑا ضروری کام ہے ذرا کمبل اوڑھ کر چلے آؤ۔" منورو کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا "شہاو اسے موتا بھائی کو بلا کر میں ابھی آیا!" "لیکن کام کا کچھ نام بھی تو ہو؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا موتی کسی کشمکش میں ہے۔ اس نے منورو کے آگے جھک کر آہستہ سے کہا "تم تو جانو کاکا۔ مجھے خود اچھی طرح علم نہیں، نہ جانے میری ان کہاں سے کیا خبر لائی ہے؟"

منورو نے اپنا سر ہلایا جو پتلی سی گردن پر بھدا سا لگتا تھا وہ آہستہ سے کچھ سوچ کر بولا۔ "اسے سا۔"

"اچھا تو میں ابھی آیا۔" پھر وہ پلنگ پر ہی بیٹھ گیا اور حقہ پیتا رہا۔

موتی نے جانے سے پہلے پھر کہا "تم گھر جا کر بیٹھو بس میں ابھی گیا اور ابھی آیا" دو قدم بڑھا تھا کہ پھر پلٹا۔

"ان سے کہا تھا کہ کاکا سو بھی رہے ہوں تو جگا کر بھیج دینا۔"

"اچھا تو لے میں چلتا ہوں۔" حقے کے دو چار کش جلدی جلدی کھینچ کر اسے دیوار سے لگا کر رکھتے ہوئے منورو نے کہا "نہ جانے اس وقت کیا کام پڑ گیا ہے ...... سمجھو! ایک بار تم گھر تو چلو پھر......" کہتا ہوا موتی چلا گیا۔

منورو کا دبلا پتلا مگر مضبوط جسم بڑھاپے کے باوجود اس وقت پھرتیلا ہو گیا اس نے سرہانے رکھا ہوا انگرکھا پہنا کھونٹی سے اتار کر صافہ لپیٹا اور کمری بھی پہن لی۔ پھر ایک ہاتھ میں لکڑی اور دوسرے میں حقہ لے کر باہر آیا۔ چوپال سے اترتے ہی کوئی بات یاد آئی اور گھر میں گھستے ہوئے بولے

"مہماں گئیں — میں گاؤں میں جا رہا ہوں ذرا باہر کا خیال رکھنا۔ آگ ذرا تیز ہے۔" یہ کہہ کر مڑے۔ گھر والی نے کوئی سوال کیا لیکن اس وقت منور دادا نے قصداً اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ جاری تھی اور منور دادا چلے جا رہے تھے۔ کچھ دور چل کر پھر رُخ بدل گیا پار کر کے ایک چھور پر آئے۔ وہاں ایک دروازے کی کنڈی کھول کر بلی کے سے دبے دبے پاؤں صحن پار کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ آہستہ سے کن سوئیاں لیں۔ ذرا سا سکوت ہوا۔ پھر وہ چار اٹھتے سے لفظ اُن کے کان میں پڑے۔

"جہاں جانا ہو چلی جائے..... نکال دے گھر سے....." یہ الفاظ سن کر منور دادا کے چہرے کا رنگ کھل گیا۔ گویا اُن کا جو قیاس تھا وہ ٹھیک ہی نکلا!

"مجھے اس کا اندازہ بھی کیا ہوا ہے!" اگر شاباشی کے لئے اپنی ہی پیٹھ ٹھونکی جا سکتی تو منور دادا اس وقت یہ بھی کر گزرتا۔ ساہوکاروں والی ہیر پھیر بازی سے پہلا اُنھوں نے دل ہی میں اٹھنے والے ایک سوال کا جواب بھی خود ہی دے لیا "ارے ہاں یہ بھی ہو جائے گا۔ کوئی پر ٹھکانا مل جائے گا ایک بار اس پھندے میں سے تو چھوٹے دے۔" یہ سوچتے سوچتے منور دادا کھنکارا۔ اور گلا صاف صاف کرتے ہوئے ایسے کھانسا جیسے بجلی کا تڑاقا ہو۔

"ارے بھئی کوئی ہے گھر میں؟"

"کون؟ منور کاکا —!" آواز کے ساتھ ہی بوڑھے والا جوان چوپال کے کنارے تک آ گیا۔

دعا سلام کرنے میں ہی منور دادا نے لالٹین کی دھیمی روشنی سے یہ تاڑ لیا کہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی نتھو کی ماں روہانسی ہو رہی ہے۔ اور اس سے ذرا فاصلے پر جو نتھو کی گھر والی بیٹھی تھی اسے دیکھ کر بھی بھانپ گئے۔ منور دادا لالٹین کی طرف منہ کر کے پلنگ پر پیر لٹکائے ہوئے بیٹھ گئے۔ پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے تمباکو کے ڈبے میں سے تھوڑا سا لے کر ہتھیلی پر ملتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ کاکا، تمباکو بھر دوں؟" منور دادا نے کہا۔

"ارے تمباکو گیا بھاڑ میں!" اور یہ تینوں سہم گئے۔ منور دادا نے دھیمی مگر گھمبیر آواز میں کہا "تم نے آخر ٹھانی کیا ہے مجھے تو بتاؤ؟"

دونوں ماں بیٹے بھوچک ہو کر ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے اور نتھو کی بیوی نے اپنا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

منور دادا نے پھر حقے کے دو تین کش لگا کر ذرا جھکتے ہوئے کہا:

"تم نے وہ کہاوت سُنی ہے، تیری ماں نے خصم کیا، بُرا کیا، بُرا کیا پھر چھوڑ دیا، بُرا کیا یہ اس سے زیادہ بُرا کیا۔ بس یہ معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔" پھر ایک ثانیے انتظار کرنے کے بعد سب کو خاموش دیکھ کر بولے تم سمجھتے ہو کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو گی، مگر تمہارا وہ دشمن گھر اجاڑنے کی سازش کر رہا ہے سمجھے۔"

نتھو کی ماں گھبرا کر بولی "لیکن اب ہم کیا کریں؟ اس بدنصیب نے یہ ناکردنی کام کر تو دیا، آخر اب اس کا علاج کیا ہو۔ بیٹے جانی بیٹی سے یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ تو گھر سے...."

نتھو نے جھنجھلا کر بات میں لقمہ دیا "چپ چاپ بیٹھی رہو۔ آئی بڑی بیٹی والی۔ اسی طرح تو تو نے اُسے سر پہ چڑھا لیا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ بھاڑ میں جائیں ایسے پیسے، نہ لیں تو نہ لے۔ لیکن اُس پٹواری کا پیسا...."

منور دادا نے بات کاٹی "نتھو سُن۔ اگر اب بھی میرا کہنا مانے تو اسے گھر سے نکال دے ورنہ ابھی تو دشمن سوتیاں آتا ہو گا اور گھر بار اس کے ہاتھ لگ گئی۔ تو صبح ہونے تک خدا جانے اس لڑکی کا کیا حشر ہو گا۔ اُس کا شوہر اس تاک میں ہے کہ تجھے چھوڑے تو ناک کان کاٹ لوں۔ اسے دستی کی ماں کے تو دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ اُدھر وہ اپنے گھی اور تجھ سے پھر مل لے گی۔" ذرا ٹھٹک کر پھر بولے "تمہارا تو اس میں بگڑا بھی کیا ہے؟ تمہارے سگے سمبندھی کا یا جات برادری کا معاملہ تو ہے نہیں۔ مگر یہ فکر ہے کہ گاؤں میں ناک کٹ جائے گی۔ اگر مال ہاتھ لگ گیا تو تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی۔ بس تمہاری گرفت کے لئے یہی سوال کافی ہے کہ تم نے اُسے گھر میں رکھا تو کس کے حکم سے؟"

"برادری تو سب سے پہلے پوچھے گی۔" نتھو کہتے کہتے جھجکا لیکن کاکا اس کی کوئی سبیل بتاؤ؟" پھر غصے سے دانت پیس کر آہستہ سے بولا۔ اس حرام کی بیری پر ایسا غصہ آ رہا ہے جی چاہتا ہے اپنے ہاتھوں ناک کاٹ لوں اس کی...."

"بس اب خاموش ہو جا۔ اپنے ہاتھوں یہ حرکت نہ کر۔" منور دادا نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ موقع کے لحاظ سے [illegible] اور [illegible] کچھ دیر بعد میاں تماشا ہونے والا ہے [illegible]

کے تمام رگ کی تدبیریں پوچھنے کے لئے گڑگڑا رہے تھے اُنہیں یہ ترکیب بھی بتا دی۔

"دیکھو ایسا کرو۔ خاموشی سے نکال کر کھیتوں کے اُس پار بھگا دو۔۔"

ماں نے بات کاٹ کر کہا ہائے منورما۔ ایسی اندھیری رات میں!!"

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُمڈ پڑا۔ بڑی مشکل سے جملہ پورا کر سکی آخر۔۔۔ وہ بدنصیب۔۔۔۔ جائے گی۔۔۔ کہاں؟" پھر بے بجھا کہا جتنی بھی گزارلی دیہہ کی گھر والی بولی "تمہارے کوس کے رستے میں کہیں کوئی اس کو بھی نہیں پاتا۔ ماں بولی "تو۔۔۔ تو۔۔۔ کہنا ہی کیا تھا۔ لیکن ان آنکھوں کے آگے۔۔۔"

منورما نے اُٹھتے ہوئے کہا "جتنا بھابی تم اس سے کہہ دینا کہ اس مہوے کے نیچے جا کر بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد میں آج رات بھر کے لئے اس کے سونے کا انتظام کر دوں گا" پھر وہ قدم آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگے "اچھا اب میں جاتا ہوں یہ سب کچھ تو میں سوچ سمجھ کر بتاؤں گا مگر اس بات کو راز ہی رکھنا۔۔۔"

پھر اسی انداز میں لہجے میں بولے "ورنہ مجھے اپنے ہاتھوں اسے اُن قصائیوں کے سپرد کرنا پڑے گا۔" پھر تاکید اً بولے "کیا تمہیں ہاں اُس مہوے کے پیچھے کو کہنا، ذرا ڈھارس بندھانا۔ نہیں تو گاؤں والوں کو پانی کی تکلیف ہوگی۔"

پھر بھیرا کی ماں کی طرف دیکھ کر بولے "اور دیکھنا۔ تم کہیں ساتھ مت جانا اگر وہ تمہیں دیکھ کر شبہے میں پڑ گئے تو اور بھی آفت آجائے گی۔ چلتے چلتے پھر میں اُسے اچھا ٹھکانہ ڈھونڈ دوں گا۔"!

منورما کا آخری جملہ سُن کر جتنا کانپ گئی اس نے سوچا یہ کہیں میری بیٹی کو اغوا تو نہیں کر دے گا؟" اس کے ساتھ ہی اُسے دو چار ایسے واقعات یاد آگئے جن میں منورما نے پہلے شوہر سے جھگڑا کر کے دوسرے سے شادی کرانے میں مدد دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بخود بڑبڑانے لگی۔

"نہیں ــــ نہیں ــــ اس غریب نے تو اُن دُکھیاروں کو مصیبت سے نکالا تھا اُن کا بھلا کیا تھا۔ پہلے ہی تھوڑے بہت لٹنے ہضم کرنے لیکن بیٹی کو ٹھکانے لگا دے تو اچھا ہو۔"

× × × × ×

دوسرے منورما نے دیکھا تو چار پانچ آدمی موتی کی چوپال میں بیٹھے اور چھ کمرے سے لگی ہوئی الاؤ کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی عجیب انداز سے۔ اس طرح کہ اس کے داہنے پیر کا پنجہ بایاں

سے لگا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ کمر سے لگے ہوئے تھے۔ بڑے موزوں طریقے سے دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ منورما ہی کیا گاؤں کا چھوٹا سا بچہ بھی پہچان سکتا تھا کہ یہ موتی کی ماں اتبا پھوپھی ہے۔ الاؤ کی لپٹ کے آگے دیا جل رہا تھا جس کی روشنی فضول معلوم ہوتی تھی پھر بھی وہ لیوٹ پر رکھا تھا، ٹمٹما رہا تھا۔

منورما نے اتبا کی غصہ آمیز خاموشی اور فیصلی آنکھوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے چوپال میں داخل ہوتے ہی ہنس کر کہا۔

"یہ چپ چاپ اور تل دونوں کیوں جلا رکھے ہیں اتبا بھابی؟"

اور موتی کی طرف بغیر دیکھے اُسے حقہ تھماتے ہوئے بولے۔

"لے خدا اس میں تمہارا کو رکھ دے۔"

ایک لمحے کے لئے اتبا کی چمکتی ہوئی آنکھیں منورما پر جم گئیں پھر اس نے شرما کر منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے!"

"اتبا بھابی۔ تمہارے ہوئے ۵۰ برس پورے ہو گئے مگر تم نہیں بدلیں۔" منورما اتبا کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ خالی پڑی ہوئی کٹیا کے سرہانے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"وہی تمہارا روٹھنا" اور روٹھی بولنا۔ ایک دن بھی تم مجھے طعنہ دیے بغیر۔۔۔۔"

"طعنہ کیوں نہ دوں؟ کتنی دیر ہوئی جب موتی کو بھیجا تھا تمہیں بلانے کے لئے۔ اور اب آتے ہو۔"

"یہ غنیمت جانو کہ آ گیا۔ اگر کسی دوسرے کا کام ہوتا تو ابھی سردی میں۔۔۔۔"

پھر اتبا کی طرف دیکھ کر "سچ کہتا ہوں اتبا بھابی اب تم پہلے سے کس بل نہیں رہے۔"

اتبا نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر میں تم سے بھی تھوڑا سی لیسوار رہی تھی!"

"اتبا بھابی۔ ذرا یاد کرو۔ تمہارے گھر تو ہم نے یہ بھی کیا ہے۔"

اگر اس وقت اتبا کا دماغ ٹھکانے ہوتا تو چار لڑکے کی ایسی ماں وہ جلد کی پیدا کئے بغیر کہہ دیتی "غرض کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرتا۔" اور پھر شاید آپ وہ جانکاروں کے جوانوں کے نام بھی گنا دیتی جو سارے کام کاج چھوڑ کر شاہ صاحب بیٹھ کر پروانوں کی طرح جان نچھاور کرتے تھے اس سے عشق

رہا کرتے تھے تو اس میں تعجب کی بات ذرا بھی نہ تھی پچپن برس کی ہونے پر بھی کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اماں کو جبڑھی کہہ سکے۔

اماں نے پیر پیچھے رکھ لیا گھونگٹ اور ذرا سرکایا۔ پھر دیوار سے ٹیک لیتے ہوئے بولی۔

" یہ سب فرصت میں یاد کرنا۔ لیکن اس وقت جو کام آپڑا ہے اس کے لیے کچھ کرو نا؟"

"کیا ہے کا؟ کچھ کہو گی بھی یا بس یوں ہی؟" یہ کہہ کر منورا نے حقہ سنبھالا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ویرا چیتل کی طرف دیکھا۔ ویرا نے آہستہ سے کہا" وہ بیچاری بڑھیا کی بہن جھمکو ہے نا؟ وہ جیتے پہلے ۔۔۔!"

"ہاں، ہاں۔ اس حرام زادی نے سارے گاؤں کی کریا خراب کر دی۔ لیکن اب کیا گل کھلایا ہے اس نے ؟" منورا نے ایسے پوچھا گویا اسے کچھ خبر نہیں۔

اس کے بعد ویرا نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اماں کو کسی نے یہ خبر دی کہ ایک عورت کو بھیڑیے کے بارشنے میں ڈبکتے ہوئے دیکھا گیا اور یہ یقین ہے کہ وہ عورت جھمکو کے سوا دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اماں نے اس شبہے کو ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ جھمکو کا اقرار کرنے والے پٹواری کا حقہ پانی برادری نے بند کر دیا ہے اور اس کے گھر والے اسے گاؤں سے نکال رہے ہیں۔ پھر کہنے لگی۔

" مجھے تو یقین ہے منورا لالہ کہ اس بامن نے رانڈ کو نکال ہی دیا ہے۔ " اور دانت کچکچا کر بولی "کب میرے ہاتھ لگے اور میں اس بھیڑیا کا تماشا دیکھوں ! "

ابھی تو بیٹیا صاحب بڑا دھرم چلا سا بنائے پھرتے ہیں اس سے کچھ بولتی نہیں۔ لیکن ایک بار یہ جھمکو میرے ہتھے چڑھ جائے پھر دیکھو ۔۔۔"

منورا نے اماں کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا: اگر یہ بات ہے تو چلو بھیڑیا کے گھر کی تلاشی لے لیں۔۔۔

اماں کا کلیجہ یہ سن کر ذرا ٹھنڈا ہوا وہ بولی" اسی لیے تو بیتیں بلایا تھا!

منورا ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا" اچھی بات ہے۔ اٹھ ویرا۔

موتی تو بھی چل ۔" اور پھر اماں سے پوچھا "اس سے پہلے تو کسی سے یہ بات نہیں کی ہے نا ؟"

" میں بات کہاں کی؟ میں نے تو موتیا کو بھی نہیں بتایا تھا جب اسے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ ورنہ کہہ دیتی کہ ایسا ایسا واقعہ ہو گیا ہے!"

"یہ ٹھیک ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کسی نے رسی کا سانپ بنا دیا ہو"؟

"نہیں ایسا نہیں۔ جس نے مجھ سے کہا تھا وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا" اماں نے کہا۔

"کون ہے وہ ؟" منورا نے قریب آکر پوچھا اور جب اماں نے آہستہ سے نام بتایا تو منورا نے کہا "ہو سکتا ہے وہ اندھیرے میں اچھی طرح نہ پہچان سکا ہو"

" ارے پہچانا کیسا۔ میں تو تمہارے روبرو کہلوا دیتی مگر اب وہ کھیت پر رکھوالی کے لیے جا چکا ہوگا۔"

" اگر یہی تھی۔ تو بھگو کر آ سے باندھ دیا" کہتے ہوئے منورا آگے بڑھے ان کے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے کہ اماں کو یقین ہو گیا" اب تو بندھ گئی رانڈ !" اور اب تو یہ انتظار تھا کہ کب دن نکلے اور بڑھیوں کی پنچایت اسے برادری سے خارج کرے۔ پھر دل ہی دل میں اسے وہ جھگڑے والا دن بھی یاد آیا جب جھمکو کا شوہر اسے مارتا تھا تب وہ بھاگ آئی تھی۔ ایسا دو تین مرتبہ ہو چکا تھا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ جھمکو ضرور دوسرا شوہر کر لے گی۔ اماں کو بھی اس کا یقین آگیا تھا۔ جھمکو کی سسرال میں بھی اس کا میکہ تھا۔ وہاں بھی روز روز کے جھگڑے سے تنگ آ گئے تھے بڑے بوڑھوں کی زبان سے ایک دوبار آثرتی سی سنی تھی کہ یہ کم بخت رانڈ کہیں کالا منہ ہی کرے تو اچھا ہو۔"

یہ سارا قضیہ اپنے بیٹے موتی کے لیے مفید ہو گا یہ احساس کرتے ہی اماں نے چپ چاپ بھیڑیے سے بات شروع کر دی تھی۔ بھیڑیے نے سخت الفاظ میں جواب دے دیا اور یہ طعنہ

بھی دیا کر یہ تو تم جیسوں کا کام ہے۔ اگر تو بیچر کر اپنے خاندان پر قیاس کرتی ہو تو غلطی پر ہو۔" یہ الفاظ سنتے ہی امبا غصے سے بھسم ہو گئی تھی۔ "پھر تو سسرال میں سکھ نہیں اور میکے میں چین نہیں۔" ایسی جگو کا دل ایک جوان برہمن پجاری سے لگ گیا اور ایک دن امبا نے بھی جان لیا کہ دونوں بھاگ رہے ہیں مگر اب بھی امبا کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ پنچوں کے آگے بیچر بول اٹھا۔ "میں کیا جانوں۔ وہ جانے اور اس کے سسرال والے۔ میرے گھر سے تھوڑے ہی بھاگی ہے۔"

پنچوں کے ہاتھوں سے پیچھے پڑ گئے۔ بیچر کی ناک کٹ گئی اسی پر امبا کو صبر آ گیا۔ لیکن آج جب اسے معلوم ہوا کہ بیچر برادری کے چکر میں پھنس گیا ہے تو وہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ کل اسے پنچوں کے بیچ کیسے کیسے طعنے دے گی ابھی سے دل ہی دل میں دہرانے لگی۔

امبا کے پاس سے نکلتے وقت منوروا کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے مگر کچھ دور چل کر دھیمے پڑ گئے۔ دوسرے گلیارے کا نکڑ آتے ہی وہ رک گئے۔ پیچھے چلنے والے تینوں آدمیوں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "مرلا! تو اپنا کر، بیچر کے پچھلے دروازے پہ جا کر چھپ جا، ایسا نہ ہو وہ کہیں رفوچکر ہو جائے۔"

منور کاکا کی اس دوراندیشی پر موتی بہت خوش ہوا، کہنے لگا۔ "اور ہمیں ایک ایک کرکے جانا چاہیئے ویرا۔ ایسا کر، تو چلا جا۔ ایک دم ہلا بولنے میں بات نہیں بنے گی۔"

وہ لگ بھگ دس پندرہ گز کا فاصلہ رکھ کر دونوں دیا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ منوروا سیدھے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ ویرا کو دیکھ کر "کیوں ویرا کاکا اس وقت کیسے آنا ہوا، آؤ بیٹھو" کہتے ہوئے بیچر نے کہا "ارے بیچر ذرا دروازہ تو کھول دے۔"

بیچر نے دو کھونٹیوں والے کواڑ کو جگایا اور دروازہ کھلوایا۔ سب اندر گھس پڑے اور دروازہ بند کرا دیا۔ بازو والے چولہے میں آگ سلگ رہی تھی۔

منوروا نے حکم دیا۔ "ذرا چراغ جلا لے اور تھوڑی سی گرہاٹی لا۔"

"اٹھو بیچرے یہ سب کیا ہے کاکا۔" ایسے سوال کی امید کتنی ہوگی۔ لیکن وہ کم عقل کچھ پوچھ بیٹھا۔ "آخر وہ بھاگ آئے۔"

"ہم پوچھتے کیا دیکھتا ہے، ابھی معلوم ہو جائے گا بدبخت۔" بھی

کا بچا؟" اور دیا کو ہاتھ میں چراغ لیتا دیکھ کر بولے۔ "دیکھ تو دیا بھولا بن کر مجھ سے پوچھ رہا کہ یہ کیا کا کا۔ وہ جن کیا گل کھلا کے آئی ہے اور اسے گھر میں رکھ لیا!"

بیچر کی ماں بولی۔ "ما مائی باپ کسی نے یہ بات اڑائی ہوگی۔ چاہے مر بھی جائے وہ رانڈ۔ گھر میں رکھنا تو کیا میں اسکا منہ بھی نہ دیکھوں!"

بیچر بولا۔ "یقین نہ ہو تو دیکھ لو یہ رہا گھر۔"

اور منوروا نے گالیوں کی بوچھاڑ میں تلاشی شروع کر دی۔ انھوں نے بڑی محنت سے کونا کونا چھان مارا، رسوئی گھر میں، پلنگوں کے نیچے، گھاس کی کوٹھری میں سب جگہ ڈھونڈھ لیا لیکن گھر میں ہو تو ملے!

شملا کو بلا کر پوچھا اور پھر سے تلاش کیا۔ چلتے چلتے منوروا کھسیا کر بولے "وہ تو مجھے مرنے والے (بیچر کے باپ) کا خیال ہوتا ہے نہیں تو دن دہاڑے پولیس سے خانہ تلاشی کراتا۔ ایک بار تو بچ گئے لیکن اب اگر پھنسے اور اس دھوکے بازی کا پردہ فاش ہوا تو میں نے تم کو جیل دیا۔" اور یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

انھیں چوپال سے اترتا دیکھ کر بیچر نے کہا۔ "منور کاکا تھوڑا بیٹھ جاتے۔" منوروا نے بات کاٹ کر گھڑک دیا "تجھے تو شرم نہیں آتی لیکن مجھے آتی ہے۔ میرا منہ ہے تیرے گھر بیٹھنے کا۔۔۔" یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔

راستے میں چلتے ہوئے یہ چپ شاہ کا بدزہ توڑا۔ اب کی آواز میں نرمی تھی۔

ویرا! یہ تو ٹھیک ہے کہ گاؤں میں کوئی نہیں جانتا اور پنچوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو بات پھیلائے، نہیں تو سوچ کہ کوئی سنے گا تو ہم سے کیا کہے گا، میرے لیے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہوگا!"

منوروا کے ساتھ پنچایت میں کھڑے رہنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھنے والے اور اپنی کم عقلی سے واقف ویرا نے اتنے ہی نرم اور اداس لہجے میں جواب دیا۔

"سچ کہتے ہو منور بھیا مجھے تو یاد نہیں کہ آج تک تم کہیں سے کبھی اس طرح خالی ہاتھ لوٹے ہوں۔"

پھر رُک کر منو رما بولے "سچ پوچھو ویرا تو مجھے تو پہلے سے معلوم تھا کہ اس بات میں جان نہیں ہے۔ ہمیں خود ہی سوچنا چاہیئے کہ سب کی ناک کاٹنے والے کو کون گھر میں قدم رکھنے بھی دے گا؟ اور دیکھو نا خود نچھر ہا کہہ رہا تھا کہ جس نے سات پشتوں کی عزت پر پانی پھیر دیا وہ بہن کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن میں نے سوچا کہ اگر انکار کروں گا تو آمبا بھابی ناراض ہو جائیں گی اور عمر بھر کے لئے میرے سر پر اس کے احسانوں کا بوجھ رہے گا۔"

"ہاں جی ٹھیک ہے!" ویرا بولا۔

"میں تو موتیاں سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو ہوا سو ہوا لیکن اب سوچ سمجھ کر کام کیا کرو۔ لوگ باگ تو ایسی ایسی باتیں اُڑا رہے ہیں جو کبھی کسی نے سُنی نہ ہونگی۔ ابھی ذرا سنتے جاؤ۔"

موتیا نے تائید کی "منو رما سچ کہتے ہیں۔ جب جگو گھر سے بھاگ گئی تھی تب بھی ایسی ہی باتیں آ رہی تھیں کوئی کہتا تھا کہ ماتاجی کی ٹیکری پہ دیکھا۔ کوئی سنگن پرسی کے گھر رضائی پہنے دیکھ کر آیا تھا حالانکہ وہ بیٹھی تھی گھر سے پندرہ کوس دور۔"

منو رما بڑبڑائے "اگر انھوں نے سچ مچ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی ہے تو میں بھی دیکھتا ہوں کہ آخر وہ جائیں گی کہاں، سویرا ہوتے ہوتے اٹھائی میں باندھ دونگا۔"

"دیکھنا۔۔۔ ہاں موتیاں بڑ بڑ مت کرنا اپنی اں سے کہہ دینا کہ دیکھ لو سیانے کیسے میا کھاتے ہیں۔"

پھر منو رما حکومت کے قاعدے قانون کی باتیں بھی بتا گئیں۔ ویتیا اور مولا بخش اور تنے کے ہی اُٹھ بیٹھے "اچھا" کہتے ہوئے چلے گئے۔

منو رما دل ہی دل میں بولے "جلدی کیا تھا کہ اُٹھو نگا! رات بھر سونا بھی شاید ہی نصیب ہو"

× × × × × × ×

منو رما گھر والی کو جگایا جو اس کے پلنگ کی حفاظت کر رہی تھی۔ گھر والی نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا "کہاں تھے اب تک؟"

منو رما نے الاؤ میں چلم رکھتے ہوئے کہا "جہاں گیا تھا وہاں ٹھیک ہی گیا تھا۔"

الاؤ کی دھندلی روشنی میں ان کا چہرہ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے جلتی فکر میں ہوں۔

"پھر بھی؟" گھر والی نے پوچھا

منو رما اپنی ہی دھن میں بولے "ابھی تک تو معاملہ جوں کا توں ہے پر آگے کی سوچنی ہے۔"

پھر چلم میں آگ رکھنے لگے۔

گھر والی اُٹھ بیٹھی اور جھنجھلا کر بولی "بھاڑ میں جائیں تمہارے ڈھنگ۔ کبھی جو سیدھی بات بتائی ہو۔"

"تیرے پلے کیا پڑے گا۔" کہہ کر حقہ گڑگڑانے لگے پھر بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر انہیں سب کچھ بتانا ہی پڑا۔ انھوں نے جھگڑے کی شروع سے لیکر آخر تک پوری کتھا سنا ڈالی۔ پھر کچھ رُک کر بولے "وہاں بیٹھا تو دیا ہے لیکن اب کیا کروں؟ پانچ دس روپے ضرور مل جاتے مگر یہ تو سالا عمر بھر اور ہی کا معاملہ ہے!"

"پانچ دس روپے؟" گھر والی نے سر پیٹتے ہوئے کہا پھر منہ بنا کر بولی۔ "تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک روپے کے ڈھیر لگ جاتے سمجھے؟"

پھر منو رما کو چپ دیکھ کر بولی "آئے بڑے چودھری۔۔۔ دیکھا اُس جگو بڈھے کو؟

صرف دس بارہ برس تک مکھیا گیری کی لیکن اتنا کما لیا کہ سات پیڑھی گھر بیٹھے کھائیں گی۔ اسے کہتے ہیں مکھیا!"

پہلے ہی گھر والی آہستہ بول رہی تھی پھر بھی منو رما نے دھیرے بولنے کا اشارہ کیا اور حقے کا کش لگا کر بولے "تجھے خبر ہے جگو نے یہ سب کیسے اکٹھا کیا؟"

پھر کچھ رُک کر بولے "لوگوں کی چار چار لڑکیاں بیچ کر کمایا۔ کہیں کھانے کے لئے تھوڑا ہی کیا تھا۔"

"لیکن یہ فن بھی تو آنا ہو، جب نا۔ تمہاری جگہ اگر وہ ہوتا تو اسی معاملہ سے ہاتھ کے تھیلی بھر روپے مار لاتا۔"

منو رما چپ ہو گئے اور الاؤ کی طرف دیکھنے لگے جس کی آگ اب خاکستر بنتی جا رہی تھی۔ اور اپنا حقہ گڑگڑاتے رہے۔

گھر والی پھر بولی۔ "دو برس سے تم بھی تو اس کی جگہ مکھیا بنے ہوئے ہو۔ تم نے کیا کمایا؟ اُلٹے اپنے باپ دادا کے زمانے کے زیور بیچ کر بیٹھ گئے!"

منو رما سر اُٹھائے بغیر ہی بولے "زندہ رہیں گے تو پھر بنا لیں گے"

ان کے اس سوجواب سے گھر والی ان کی صورت تکتی۔ اس طرح بھیت

کر کڑی ہوئی جیسے منورما کو اسنے جا رہی ہے۔ منورما کے پاس بیٹھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی دبی آواز میں بولی ختم کیا کرو گے؟ ذرا اپنی صورت تو دیکھو نکان دینے کے لئے تو بہو کی ہنسلی گروی رکھ آئے اور بیٹھے چلم بھرتے ہو؟ ایک مہینے بعد آئے گی تو کیا جواب دو گے اپنی ماں کو؟ منورما نے غصے میں آ کر جواب دیا۔ چڑ چڑ مت کرو۔ چپ رہے گی یا نہیں؟ اور پھر حقہ پینے لگے۔

گھروالی پھر بولی۔ تم مجھے تو چپ کر دو گے۔ لیکن مہینے بھر بعد لوگوں کو چپ کرو گے تب میں سمجھوں گی۔ تمہیں بہادر ہو بھی ایسی ہی ہے کہ گدھے پر نہ چڑھا دے تو بات نہیں۔ مگر منورما کچھ نہ بولے۔

—— گھروالی پھر بڑبڑائی۔ جب دیکھو بس حقہ اور رخواہ مخواہ کی تیچاپے نہ کھیت دیکھنا اور نہ گھر کا کوئی کام کرنا۔ دن بھر منہ ٹے پھر کر......"

منورما تنگ آ کر بولے۔ "اب گھر میں جاتی ہے کہ نہیں؟"

پھر فورا شھنک کر بولے۔

مگر کوئی بیانے کو آئے تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

"لوگ تو ہیاش لگے ہی۔ تمہارے کیا باپ دادے کہہ گئے ہیں کہ بیٹا اپنی گرہ سے کھانا اور ٹھلوؤں کے ساتھ....."

"اپنی گرہ کا کیسے؟" اور پھر گھروالی کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی کہ کس دن خالی ہاتھ لوٹا ہوں؟ زیادہ نہیں تو بھی....."

"اے ہو، ہو جو کبھی دو چار روپئے لے آئے ہوں گے، اُسی میں نہال ہو گئے!" منورما نے جھنجھلا کر کہا "تو کیا میرے باپ نے کہیں گاڑ دیئے ہیں جو تمہیں اٹھا لاؤں؟"

"باپ تو بہت کچھ چھوڑ مرا تھا لیکن تم نے سبھی پنچایت بازی میں پھونک دیا۔ اسے کہتے کہ پہلی بنتے۔.... ہنہ"

"لیکن کچھ کہو گی بھی کہ کیسی پنچایت کرانا چاہتی ہے؟ میری تو جان کھالی" گھروالی اپنی ہی گائے جا رہی تھی۔ ان آنا بابا کا نام سو کچھ بیں جگ پھینک دیا کہ وہ دن نہ تو خوشی سے پہنے اوڑھنے کو ملا اور نہ آرام سے کھانے کو ملا۔"

منورما ہنسے اور پھر بولے "تیرے اٹھ اب سو جا۔ وقت آنے دے جھگوان کرے گا تو سب کچھ مل جائے گا۔"

گھروالی چڑ کر جھرجھری سے بولی اور اس کی آواز میں غمگینی تھی۔ اب کیا ملے گا۔ پہننے کے دن ہیں۔ وہی مل جائے تو غنیمت ہے!

لیکن وہ تو....."

"کیوں نہیں ملے گا۔ اسے بھی لے گا" منورما سوچتے سوچتے بول پڑے۔ منورما کو محسوس ہوا کہ بیوی غصے میں آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے اور اس کی آواز کہیں پھوٹ نہ پڑے۔

"بے چاری کا زیور تھا۔ وہ تو گیا..." گھروالی کا گلا بھر آیا منہ سے آواز پوری نہ نکلی۔

منورما نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔"

"اری تو ذرا دیکھتی تو رہو، مہر تو کر۔ بس ذرا کچھ....."

گھروالی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اس دیکھنے دیکھنے میں میری تو آنکھیں پتھرا گئیں، دیکھا کچھ نہیں بکتے کہتے اٹھنے لگی۔ "میں تو یہ کہتی ہوں کہ اس کے گہنے پاتے چھڑا لاؤ تو بھی بہت ہے"

"اور تیرے لئے سونے کی ہنسلی؟" منورما نے مذاق شروع کیا۔

گھروالی نے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "وہ دن اب کہاں جب میاں کے پیر کی جوتی....."

منورما ہنستے ہوئے محبت آمیز لہجے میں بولے "ذرا ٹھہر تو سہی۔" مگر گھروالی مایوس چہرے کے ساتھ قدرے غصے میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی "اگر تجھے جگو کی بہو جیسی سونے کی ہنسلی بنوا دوں تو کیا دے گی؟"

منورما کی صورت اور گھروالی طرف جمی ہوئی نگاہیں نیز اُن کے جذبات دیکھ کر یہ فوراً احساس ہوتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو وہ بیوی سے ایک زہر خندگی توقع کئے ہوئے ہیں۔ لیکن آج گھروالی نے ان کی امید کے ساتھ اُن کی خوشی کا بھی خون کر دیا وہ بڑے غصے بھرے تیوروں میں بولی دوسری بات تو خیر کیا ہوگی۔ تم اس کے جوتے میں پیر ڈالنے کے قابل بھی ہو؟" یہ کہکر منہ چڑاتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔

منورما کو بھی یہ بات شاید سچ نظر آئی، مگر کہتے کیا؟ انہوں نے حقہ پھر بھرا اور لمبے گڑ گڑ لینے لگے جیسے "بے جان" بیٹھے ہوں۔ آدھ گھنٹے بعد حقے کو ایک طرف رکھ کر بلکہ چھپا کر، تھوڑا سا تمباکو پلنگ پر ایسے رکھ دیا جیسے کوئی آدمی پڑا ہو۔ اپنا بھیس بدلا، لکڑی سنبھالی اور چپکے سے نکل گئے۔

مہوے کے پاس پہنچ کر دیکھا تو کوئی پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا

"کون؟ جھمکو!"

"ہاں کاکا —!" آواز گرچہ بہت دھیمی اور سہمی سی تھی لیکن اس میں شکوے کی آمیزش بھی تھی۔

"چل اُٹھ۔ اس باڑی کے کنارے کنارے آگے چل — میں تیرے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔"

"کہاں چلو گے منورو کاکا؟"

"کہاں؟ وہ — جو ٹیلے ہیں — پہاڑی کی طرف، لڑکی نے کام سونپا اس لئے کرنا ہی پڑے گا! جوانی کے جوش میں اندھی ہو کر ہنسائی اور اب سب کو ڈگا میں مبتلا کر رکھا ہے" پھر کمبل کو ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے بولے "دل تو کہتا تھا آج تجھے مرنے ہی دوں — خیر! چل آگے آگے —"

جھمکو آگے آگے اوٹ میں چلنے لگی۔ بیس پچیس قدم کا فاصلہ چھوڑ کر منورو کاکا بھی پیچھے پیچھے ہو لیئے۔

ہلکی ہلکی مگر بہت خنک ہوا چل رہی تھی جس کا خاموش بہاؤ جذبات کو اُبھار رہا تھا۔ چاروں طرف کھڑی ہوئی فصلیں بھی گویا سردی سے کانپ رہی تھیں۔ چوبارے پہ کھیت کی رکھوالی کے لئے جاگ رہے تھے۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے کاٹھیاں لیکر الاؤ میں ڈال رہے تھے اور ہاتھ سینک رہے تھے۔ کسی کسی کھلیان سے دانت بجنے کی اور سردی میں "ای۔ای۔ای" کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ جنگل بالکل سنسان پڑا تھا۔ کسی جانور یا پرندے کی آہٹ بھی نہیں تھی۔ کبھی لمحہ بھر کے لئے گہرا سناٹا ہو جاتا، اور پھر اس سناٹے سے ایسی آوازیں، دھیمے دھیمے سُروں میں پھوٹتی تھیں جیسے کوئی خاموشی کا دریا بغیر رُکے مسلسل بہہ رہا ہو۔ رات کی گھٹاٹوپ سیاہی میں ستارے بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مبہوت ہو گئے ہیں کبھی کبھی کوئی ستارا ٹوٹتا تو ایسا نظر آتا گویا اس ظلم ظلمات کو توڑنے کی سعی کر رہا ہو لیکن بالآخر تاریکی کے بھیانک ہاتھ اُسے مسل دیتے تھے!

ایک کے بعد دوسرے کھیت کو پار کرتے ہوئے جھمکو چل رہی تھی، ناگاہ ایک آواز گونجی۔

"اے — کھڑی رہ!"

جھمکو وہیں ٹھٹک گئی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے پیچھے دیکھا تھوڑی تھوڑی دور پر منورو اپنے جھٹکے کے بعد پھر چلتے آرہے تھے۔ رکھوالے نے دوسری ہانک لگائی۔

"تھمی رہو۔ تو یہاں کھانے آئی ہے؟" منورو نے کچھ ہمت سے کام لیا لیکن جھمکو ڈر گئی "اب کیا ہوگا؟"

منورو نے جھمکو کے قریب آ کر ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"اری تو چلتی رہ۔ گھبرا نہیں، وہ تو تجھے گائے سمجھ رہا ہے۔ تیز تیز قدم اُٹھا!"

جھمکو کے پیروں میں پھرتی آگئی منورو کی اشارے پر وہ کھیت کے کنارے چلنے لگی کبھی کبھی اس کی ساڑی کانٹوں میں اُلجھ جاتی تھی لیکن وہ ساڑی پھٹنے کی پرواہ کئے بغیر تیزی سے کھینچ کر پھر آگے بڑھ جاتی تھی۔

کھیت ختم ہو گئے۔ ندی آگئی۔ جھمکو کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ منورو نے کہا "کھڑی رہ میں ذرا..." کہ آگے آن کی آواز آئی! پہلے کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے ندی کا جائزہ لیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پانی پینے کے لیے آنے والے باگھ بھیڑیوں کی جگہ ہے۔ پھر دونوں ڈھلوان پر اُترنے لگے منورو نے کہا۔

"اب ساتھ ساتھ چل۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔"

جھمکو کو ڈر لگا۔ وہ بولی "کاکا اگر کوئی جانور پانی پینے کے لیے..."

"تو میرے ساتھ ساتھ چل — میں ہوں تو گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اگر اس وقت منورو اور جھمکو میں سے کوئی بھی ذرا سا غور کرتا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ انسان اگر کسی چیز سے ڈر سکتا ہے یا اگر انسان کو کوئی چیز ڈرا سکتی ہے تو وہ انسان ہی ہے!

ندی کا چڑھاؤ چڑھنے کے بعد وہ گھنے جنگل میں گھس چکے تھے مگر ان کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ گویا گھاٹی پھلانگ کر کسی منزل کے قریب آ چکے ہیں — آدھے گھنٹے کے بعد شہر کے الاؤ کی لپٹیں نظر آنے لگیں اب منورو نے قفلِ سکوت توڑا۔

"پھر دیکھ سب تجھے وہ چاروں پہاڑ ہیں جہاں کہ ۔۔۔ میں

رہنا پڑے گا جب گاؤں میں بات آئی گئی ہو جائے گی تو میں آکر تجھے لے جاؤں گا!"

جھکو نے منوروا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ۔۔۔ کاکا؟"

"کہیں بھی تجھے ٹھکانے تو لگانا ہی پڑے گا۔ جب منڈی کھالی ہے تو منڈا ابھی ہے!"

بیچاری جھکو خاموش ہو گئی۔

ذرا دیر رک کر پھر منوروا نے کہا: "لیکن دیکھ یہاں تجھے بہت ہی سنبھل کر رہنا پڑے گا۔ اگر ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو پھر میں ذمہ دار نہیں، تو جانے اور تیرا وہ قصائی، گھروالا!"

پھر منوروا نے گول مول لفظوں میں یہ بھی جتا دیا کہ وہ چار دن میں ہی جھکو کے گھر کا ٹھکانا ہو جائے گا۔ جھکو نے بھی یہ محسوس کیا منور کا کا کسی اچھے گھر میں اس کا ٹھکانا کر دیں گے۔

اس پڑاؤ نے مندر کے پاس کوئی فقیر بجلا اندر سے چھپا کے لیے بیٹھا تھا۔ منوروا نے آہستہ سے جھکو سے "تو ذرا یہاں پوا کے پاس بیٹھ۔ میں اتنے بابا کر باتوں میں لگا کر راضی کروں!"

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے منور کا کا نے۔

"کون ہے۔" تقریباً ۶۵ برس کے ایک سادھو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور دھونی کی روشنی ہی میں آنکھیں گڑو کر دیکھا تو پہچان لیا "منور کھیا! تم اس وقت کیسے؟" پھر ادھر اُدھر دیکھ کر "کیا اکیلا ہے؟" منور کھیا دھونی کے پاس بیٹھ گئے اور ہاتھ لمبا کر کے تاپتے ہوئے بولے۔

"تمہارے پاس آکر جھوٹ نہیں بولوں گا مہاراج ۔۔۔ لیکن" کہہ کر چپ ہو گئے۔

"یہاں آیا ہے تو بات بھی بتانی ہی پڑے گی۔" مہاراج ہنسے، بغل میں پڑا ہوا تمباکو کا بٹوا دیتے ہوئے بولے۔

"لے ذرا سلفہ بھر، کچھ گرمی آئے گی، پھر سارا سب کچھ کہہ دینا۔" منوروا نے چلم بھر کر پہلے مہاراج کو دی پھر خود پینے لگے۔ دھونی کے اجالے میں چھپی ہوئی نظروں سے مہاراج کی طرف دیکھا۔ عمر تو مہاراج کی منوروا کے برابر ہی ہوگی لیکن سفید داڑھی اور جٹاؤں سے تقریباً ڈیوڑھی نظر آتی تھی۔ اُن کی گہری اور چمکتی ہوئی آنکھیں دھونی کی طرف لگی تھیں اس لیے منوروا زیادہ دیر نہ دیکھ سکے۔ یوں تو آنکھوں نے مہاراج کو کئی بار دیکھا تھا باتیں بھی خوب کی تھیں مہاراج بھی جب کبھی منوروا کے گاؤں میں آتے تو منوروا سے ضرور مل کر جاتے تھے، اتنی شناسائی ہونے پر بھی منوروا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی نظریں آج مہاراج سے کیوں نہیں مل رہی ہیں۔

منوروا نے چلم اُلٹی، مہاراج نے پوچھا "کیوں! آئی کھیا کچھ گرمی؟" اور پھر پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے "اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اور پھر ایسی ہنسی اُن کے ہونٹوں پر کھل گئی جس میں یقین بھرا ہوا تھا۔

منوروا کھسک کر ذرا قریب آگئے۔ "بات یہ ہے مہاراج ..." کہہ کر بات چھیڑ دی پھر یہ بتایا کہ کبھی کبھی سرکاری کام کے سلسلے میں جو پٹواری گاؤں میں آتا تھا کس طرح اُس سے جھکو کی آشنائی ہوئی اور پھر وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ ان واقعات کا تذکرہ کر کے جھکو کے شوہر کی بے رحمی اور قصائی پن کا قصہ بھی سنایا پھر یہ بھی کہا جھکو کی ماں اور اس کے بھائی نے اُسے میرے سپرد کر کے کسی ٹھکانے لگانے کی التجا کی ہے اور دوسری طرف، قانون گاؤں کی پنچایت بڑھیوں کی برادری سب کے سب اس پر ہنگامہ کر رہے ہیں۔

"آپ کہتے ہیں مہاراج کہ کھیا کیسے آیا؟ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟ اگر کچہری میں جاتا ہوں تو عدالت پھر اُسی قصائی کو دے دے گی اور بالفرض اُس کا شوہر دوبارہ اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو گیا تو کیا وہ اسے جینے دے گا؟ یہ کسی بڑھئی کے گھر میں بیٹھی ہوتی تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ لیکن یہ، چاہے کتنی ہی اونچی ہو رہی ہو سب سے نرالی جات!"

مہاراج بھی اُداس دکھائی دیتے تھے بولے "یہ ذات پات کے جھگڑے بڑے ہیں۔" پھر کھیا کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے "اب وہ لڑکی ہے کہاں؟"

"یہیں ہے مہاراج!" کہتے ہوئے منوروا اٹھے اور لڑکی کو بلا لائے۔

"ارے ۔۔۔ رے، تم نے بیچاری کو ایسی سردی میں باہر کھا تھا بٹھا۔ بیٹا! آ ادھر آکر ہاتھ تاپ لے۔"

جھکو دھونی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ مہاراج برابر اس سے قریب آکر ہاتھ تاپنے کو کہتے رہے مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ مہاراج نے پیار بھری مگر ترش آواز میں کہا: "اری بدبخت، سردی میں ٹھٹھر کے کیوں مر رہی ہے؟" اور پھر خلا میں دیکھتے رہے۔

جھکو کی آنکھوں میں شاید آنسو تو ختم ہو چکے تھے لیکن آنسوؤں کی دھار کے نشان اور سرخی اس کے چہرے پر صاف آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج نے پوچھا۔

"ہاں تو پھر اس کا کرنا کیا ہے؟ اسے یہاں کیوں لائے کھیا؟"

"میں تو آپ کے حوالے کرنے آیا۔ اب آپ جانیں اور یہ جانے!"

مہاراج کچھ ہنسے، "تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں نا؟ میں اس کا کیا کروں!"

"اور کیا کرتے۔ اسے جہاں مناسب سمجھیں ٹھکانے لگا دیں۔ مجھے تو اس سے زیادہ فکر گاؤں کے کنوئیں کی ہے۔"

"گاؤں کے کنوئیں بچانے کے لیے اسے ادھر لا کے ہو گیا، مگر کل کلاں کو گاؤں کے لوگوں کو پتہ چلا کہ تمہیں یہاں آؤ گے اور اس پتر اسے مندر کو بھرشٹ کر ڈالو گے! یہ بھی سوچا۔"

اور پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولے: "کیا اسے اتنی دور بھی چین نہیں لینے دو گے؟"

"تو پھر اس کا کیا کیا جائے مہاراج؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو کھیا؟" پھر کچھ سوچ کر بولے: "اس بے چاری کو کوئی اچھا سا ٹھکانا دیکھ کر لگا دو۔ کسی بھی ذات کا اچھا آدمی مل جائے۔ تم تو ضلع بھر کے ایک ایک گھر سے واقف ہو۔"

"یہی تو مصیبت ہے مہاراج۔ اگر ضلع میں کوئی مل جاتا تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مگر ایک تو خوف سرکار کا۔ پھر آپس میں کتنی چھپی ہوتی ہے، پرائی برادری کو گھر میں بٹھانے کے لیے کون تیار ہو گا۔"

"تو اب تم جاؤ کھیا۔" اور جھکو کی طرف ایک نظر ڈال کر پھر بڑبڑانے سے لگے: "ہمارے پاس یہ علت کہاں لے آئے؟"

کھیا بولے: "ٹھکانا تو میں لگا دوں گا مہاراج۔ ہماری طرف کے ایک سیٹھ احمد آباد میں رہتے ہیں، اُن کے ہاں ہمارے علاقے کا ایک پٹیل کال کے زمانے سے رہتا ہے اسکا نام چھپنیا ہے۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکا بھی ہوا۔ وہ پٹیل تو اب مر چکا ہے مگر اس کا لڑکا دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے اور عمر کا بھی پختہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سیٹھ ہمارے ہاں آئے تھے تو مجھ سے تذکرہ کرتے تھے کہ اس لڑکے کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈھوں۔ اُسے ذات پات کی فکر نہیں، لیکن مہاراج . . ."

"تو پھر اُس سے کر کیوں نہیں دیتے؟" مہاراج نے پوچھا۔

"لیکن وہ بھی وقت میسر ہوگا مہاراج۔ آج کل تو میں گاؤں سے باہر نکل نہیں سکتا۔ لوگوں کو وہم نہ ہوتا ہوگا تو بھی ہو جائے گا۔ دو چار دن کے بعد دیکھوں گا جب بات ذرا آئی گئی ہو جائے گی۔"

آخرکار منوروا چار پانچ دن کے لیے جھکو کی رکھوالی کا فریضہ مہاراج کے سپرد کر کے کھڑے ہو گئے۔ ابھی چبوترے سے اُترے ہی تھے کہ کچھ یاد آیا اور مہاراج کے پاس آکر بولے: "لیکن مہاراج، اس بات کا پتا کسی کو نہ چلے مائی باپ! اگر دو چار سال کے بعد بھی سرکار کو معلوم ہو گیا کہ جھکو خلاف ٹھکانے پر ہے تو رکھنے والے کی آفت تو آئے گی ہی، مجھے بھی تارے نظر آجائیں گے۔ مجھے تو صرف اتنا ڈر ہے کہ کہیں نیکی کرکے دھکے نہ کھانے پڑیں!"

مہاراج کچھ ہنسے اور بولے: "بھروسا نہیں تھا تو اسے یہاں لائے کیوں؟" اور پھر کہنے لگے۔

"تم اپنی زبان قبضے میں رکھو تو بہت ہے۔" اتنے میں مہاراج کی نظر جھکو کے پھٹے کپڑوں پر پڑی، دیکھ کر بولے "بیچاری کے کپڑے بھی کیسے پھٹے ہوئے ہیں!"

"وہ تو میں لیتا آؤں گا اس کی ماں سے۔ جب آؤں گا۔" منوروا نے جھکو کو تسلی دی اور ہوشیاری کے ساتھ رہنے کا مشورہ دے کر چل دیئے۔

چبوترے کی سیڑھیوں سے اُترتے وقت محسوس ہو رہا تھا جیسے آس پاس بسنے والے لوگوں کے گھروں سے جو مرغوں کی بانگ آ رہی ہے وہ منوروا کے قلب کی دھڑکن کی صدا ہے۔ ککڑوں۔ کوں!

خانہ تلاشی لے کر واپس آنے کے بعد موتی نے اپنی ماں سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا! ماں تو نے جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔"

"ارے، جا، جا! انھوں نے تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک دی" اما نے کہا۔

"تو بھی کیا بات کرتی ہے۔ منور دا کو بھلا کون ٹھگ سکتا ہے ناج کی کوٹھیوں سے لے کر گھاس کے پولے تک کھول کر دیکھ لیئے، پچھلے دروازے پہ مٹولا کو کھڑا کر دیا تھا۔ بلا وجہ بیچرا کی عزت خراب کی، اس کی ماں کو جو گھر کے کونے میں بیٹھی تھی ڈانٹ پھٹکار دیا۔ لیکن وہ گھر میں ہوتی تو ملتی!"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" ماں کو کچھ کچھ اطمینان ہوا۔

لیکن موتی نے کچھ چڑ کر کہا: "ارے کیا سچ کہتا ہے؟ منور کا کا تو مجھ سے بگڑ بیٹھے کہنے لگا کہ تیری ان نو دشمنی میں اندھی ہو رہی ہے لیکن تو بھی بالکل بے وقوف ہے۔ ویرا کا کا سے کہنے لگا، زندگی میں آج پہلی بار آنکھیں نیچی کر کے لوٹ رہا ہوں، یہ تو میری بھی چُپ اور تیری بھی چُپ۔ والی بات ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی بات اڑ گئی اور راجا کو معلوم ہو گئی تو ہم دونوں پھنس جائیں گے کسی کے گھر کی خواہ مخواہ تلاشی لے لینا مذاق نہیں ہے" کہتے ہوئے موتی کھٹیا پہ لیٹ گیا اور بولا "ابھی تو کل صبح وہ تجھ سے لڑنے کے لیے آنے والے ہیں" اس آخری جملے سے اما کے چہرے پر طمانیت وسکون کے جذبات نمایاں ہو گئے۔

اور صبح ہوتے ہی منور دا سچ مچ آ دھمکے۔ اما کو اُلہنا دیتے ہوئے بولے، "دیکھو اب اُس مُجرے کبھی مت پوچھنا کہ تو نے سچ مچ دیکھا تھا یا نہیں یہ تو ہمیں خود ہی سوچنا چاہیئے کہ شاید اُسے بامن نے گھر سے نکال ہی دیا ہو گا، تب بھی کوئی اپنے گاؤں میں کیا منہ دکھانے آئے گا۔؟" اور اُٹھتے اُٹھتے کہا: "میں نے اُس بیچرکو بادیا ہے نہیں تو سرکار میں رپورٹ کر دیتا تو نکالی بکری، گھس گیا اونٹ، والی بات ہو جاتی۔ اس لیئے یاد رکھو اب کسی کی بات پر کان نہ دھرنا آج کل تو اپنی آنکھوں دیکھی بات بھی جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے" اور جاتے جاتے یہ بھی کہہ چلے کہ "یہ تو میں نے تمھاری صورت دیکھ کر کہہ دیا، ابھی کیا ہے ابھی تو لوگوں کی افواہیں سُننی جاؤ۔ کوئی کہے گا کھلیان میں دیکھا تھا کوئی یہ جبر جوڑے گا کہ ندی کے کنارے دیکھا تھا۔ تم کس کس کا کہا سچ جانو گی؟"

اما نے بھی تسلیم کر لیا کہ منور دا کی بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس نے بات کرنے والے کو اس سوال پر "کیوں لمبا بھائی کل کی بات کا کچھ پتا لگا یا نہیں؟"

نہ تو کوئی بات کہی اور نہ اُسے جھوٹ بولنے کا الزام دیا، فقط یہی کہا "مرنے دے بھیا، بھاگ بھی آئے گی تو چھپے گی کہاں؟ اور نہ آئے گی تو ہمیں کیا مطلب، جو گئی سو گئی!" اور کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنے میکے گئی تو اس وقت بھی لوگوں نے کہا۔

"بہن سنا ہے کہ اس رانڈ کو تو بھگا دیا! لیکن پتا نہیں کہاں گئی، کیا تمھارے گاؤں میں آئی ہے؟" ان خبروں کا یا سوالوں کا جواب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں دیا کہ:۔

"ایک بار نہا ڈالنے کے بعد بار بار اس کی بات کرنے سے کیا فائدہ؟" چونکہ گاؤں میں بھی کچھ کچھ بات پھیل گئی تھی کسی کھیت کے رکھوالے نے کہا کہ میں نے رات کو ایک عورت کو کسی شخص کے ساتھ اُتر کی طرف بھاگتے دیکھا تھا اور دوسرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن تیسرے دن پن گھٹ پر بات کا یہ نتیجہ نکل آیا۔

"کچھ نہیں بہن، نہ تو اما کاکی کچھ جانتی ہیں اور نہ منور کا کا نے بیچرکے گھر کی تلاشی لی ہے یہ تو سب افواہیں ہیں، یہی غنیمت تھا کہ بات اُڑانے والے کا نام نہیں اُڑا تھا ورنہ اس بیچارے کی کوئی بچپن کی بات یاد دلا کر کہتی" وہ کیا تو بچپن سے ہی جھوٹا لپاڑیا ہے!" چوتھے دن تو گاؤں میں ایسا لگتا تھا جیسے جھکو کے آنے کی کوئی افواہ اُڑی ہی نہیں تھی۔

اگرچہ اس حادثے کو دوسرے سینکڑوں حادثات کی طرح لوگ بھول گئے لیکن ایک شخص اس کو نہ بھول سکا اور غالباً اپنی زندگی بھر بھول سکا بھی نہیں، اور وہ تھی جھکو کی ماں!

یا تو اس نے جھکو کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا تھا یا آج اتنی بڑی دُنیا میں جھکو کے لیئے کوئی جگہ نہیں! اگر ماں کا بس چلتا تو پھر وہ بٹھا کر اپنے پیٹ میں چھپا لیتی۔ لیکن اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟۔ جھکو کی ماں کے منہ میں ایک لقمہ نہیں چلتا تھا لیکن لڑکے اور بہو کے ڈر سے زہر مار کر لیتی تھی اور وہی لوگوں کے سامنے بناوٹی ہنسی ہنسنا بھی پڑتا تھا۔ اس نے اس عالم میں دو دن تو گزارے لیکن تیسرا دن کاٹنا دوبھر ہو گیا، سارے دن وہ منور دا کی اور ان کے گھر والوں کی چوکسی کرتی رہی کہ کب منور دا کہیں جائیں اور وہ اس سے جھکو کی خبر پوچھے۔

آخر دوپہر کے بعد ایک موقع مل گیا۔ جمنا نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ سویرے ہی ڈھور نکلنے سے پہلے منورما کا لڑکا ساکھو کھیت پر چلا گیا تھا اور ابھی ابھی دوپہر کا کھانا لے کر اُن کی گھروالی بھی نکل گئی تھی۔

جمنا مٹھے کی ہانڈی لے کر باہر نکلی گلیارے میں ایک دو گھروں کے پونچھی چکر لگا کر سیدھی منورما کی چوپال میں آ گئی۔ اور اس طرح چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ چوری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے پھر ایک ٹوٹی ہوئی رسّی کو گرہ دینے کے بہانے منورما کے پاس آ گئی۔

منورما نے اس کی طرف دیکھا، جمنا رو ہانسے منہ سے نیچے دیکھتی رہی۔ کیا بولیں، کیا پوچھیں۔

یہ طے کرنے سے پہلے ہی منورما بول پڑے

"تم مٹھا لینے آئی ہو جمنا بھابی! لیکن یہاں کوئی ہے نہیں، تھوڑی دیر بعد آتا تو۔۔۔۔"

جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جمنا نے ایک دم پوچھا۔

"ایں، منورما لالہ بھاگوں چلی کہاں ہے؟ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ۔۔۔؟"

منورما نے قدرے جھلاہٹ سے کہا۔

"بھاڑ میں پڑی ہے اور کہاں۔۔۔؟" پھر آنکھیں نکال کر بولے "مہربانی کر کے تم گھر چلی جاؤ کسی کو شک نہ ہوتا ہو تو بھی۔۔۔۔"

نہایت کوشش کرنے پر بھی جمنا اپنے آنسو نہ پی سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسو اس طرح بہہ نکلے جیسے یہ کسی دوسرے کی آنکھوں سے نکل رہے ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی۔

"اتنا تو بتا دو منورما لالہ، وہ زندہ ہے یا۔۔۔" اور باقی الفاظ سسکیوں میں کھو گئے۔ منورما کے چہرے پر جذبات کی پرچھائیاں اس وقت دیکھنے کے لائق تھیں، وہ کھڑے ہو کر بولے۔

"یہ تو ناداں کی دوستی جی کا جنجال ہو گیا۔" اور کواڑ کھول کر اندر جانے لگے۔

جمنا نے مٹھا لینے کے بہانے رسوئی گھر میں جاتے ہوئے منورما سے پھر پوچھا۔

"ایں، منورما لالہ۔۔۔۔ وہ ہے تو۔۔۔۔ زندہ یا۔۔۔ نا؟"

منورما جھلّا اُٹھے "ایک بار کہہ تو دیا کہ مر گئی۔۔۔!" پھر بڑے تیکھے لہجے میں جھنک کر بولے۔

"اس کلموہی کی خبر پوچھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہاری زبان کیسے کھل جاتی ہے" اور رسوئی گھر میں جاتے ہوئے بولے، "اگر وہ جیسی اس سے بھی تو کبھی ساتھ گھونٹ دیا ہوتا!"

پھر مٹھا لے کر باہر نکلے، اس کی ہانڈی میں مٹھا ڈالتے ہوئے جمنا کی طرف دیکھے بغیر، جو آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ انھوں نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ۔ پوچھنا ہی ہے تو دو دن بعد آنا۔" پھر ایسے کہنے لگے گویا خود بخود بات کر رہے ہیں، "میری عقل سالی کیا ماری گئی جو اس جھگڑے میں کود پڑا۔"

"لیکن مجھے اس کی کوئی خبر۔۔۔۔"

منورما آپے سے باہر ہو گئے "کہہ تو دیا ابھی غصّہ کیا چڑھا ہے، ہم تو کچھ کہہ دیں گے!" پھر کچھ منت سماجت کے انداز میں بولے "بھگوان کے لئے تم چلی جاؤ۔" اور برتن رکھنے کے لئے اندر جاتے ہوئے بولے "لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ باپ جیسا بیٹا اور ماں جیسی بیٹی۔ مجھے تو یہ حیرت ہے کہ اُسے ابھی کہنے کے لئے اس کی زبان کیسے کھلتی ہے۔"

جمنا نے بڑی مشکل سے سسکیوں پر قابو پایا پھر بولی "جانتے ہو کہ۔۔۔ پھر بھی تو پوچھنے۔۔۔۔ پیٹ میں رکھا ہے۔۔۔۔ کیسے بھول جاؤں!"

"اس کی جگہ اگر پتھر رکھا ہوتا تو اچھا تھا کم سے کم ہمارے تمہارے کپڑے دھونے کے کام ہی آ جاتا۔" پھر کواڑ بند کرنے کے لئے اُٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"اچھا اب چلی جاؤ مجھے کواڑ لگانے دو کوئی سن لے گا تو مجھے۔۔۔۔"

جمنا نے مٹھے کی ہانڈی اُٹھاتے ہوئے پھر ہمت کر کے کہا

"اتنا تو بتا دو منورما لالہ، وہ ہے تو کہیں آس پاس نا؟"

"جہنم میں گئی منورما لالہ" یہ کہہ کر کواڑ لگاتے لگاتے بغیر چوپال میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھنے کے لئے مڑے "ایسے ہی اڑ جاتے تو لڑکی کو غائب کر دیا۔ اب کچھ کمی رہ گئی ہو تو زیادہ چلّا چلّا کر سب محلے کے لوگوں کو بھی بتا دو۔ تو کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔۔!" پھر رسی سے شغل کرنے لگے۔ باہر نکلی تو جمنا کے کانوں میں آواز آئی۔ "اتنا غصّہ ہونے پر بھی ماں کو شرم نہیں آتی۔ پھر لڑکی کا تو کہنا ہی کیا" دوسرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ شاید نہ دے سکے پھر بھی جمنا سمجھ گئی کچھ بھی کہو۔ "آخر ذات ہے کمین، وہ چمار"

جمنا کا یہ حال تھا کہ جو لڑکی ماں کی کوکھ میں نو مہینے کروٹ لیتی رہی وہ کتنی ہی بھولی اور بدکار رہی "ماں جیسی بیٹی" سوا اس طعنے پر تو جگر کٹ ہی اٹھتا لیکن اس وقت وہ مجبور تھی چوپال سے اُترتے وقت اس نے

جمنا کے آنسو سوکھ گئے تھے۔ آواز بھی صاف ہو گئی تھی۔ وہ بولی "کیوں اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہے بیٹا۔ جب تا تا ہی توڑ دیا۔ تب تجھے کیا؟ پہلے ہی لوگ اُسے کسی پٹھان کے ہاتھ بیچ دیں یا...."

پھر اک دم اس طرح بولا جیسے وہ تنگ آ گیا ہو۔ "ماں! کیوں میرے پیچھے پڑی ہے اگر میرا ساتھ بیٹھنا ہے تو جینے دے...."

"جیو بیٹا۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔" ماں کی آواز میں تلخی اور غصہ شامل تھا ہی کچھ بے نیازی بھی شامل ہو گئی "جیو بیٹا۔ شکوہ سے جیو۔ اب بھی اگر کوئی اڑچن ہو تو میں بھی اپنا راستہ الگ ڈھونڈ لوں گی۔ پھر...."

"ماں.... تو مجھے کس لئے جلا رہی ہے۔ تیرے پیر ولا پڑتا ہوں، تو اٹھ جا۔ یہاں سے — میں کل پوچھ آؤں گا۔ لیکن اس وقت چلی جا۔ ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں...."

کس لئے میرے بچے......"

"کل کیوں پرسوں جاتا؟" طنز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جمنا نے کہا۔ "تو، تو ضرور پوچھنے جائے گا! تیری شکل ہی کہہ رہی ہے!" پھر کھڑے ہو کر کہنے لگی "میں خود ہی جاتی ہوں، دیکھوں آج وہ کیسے جواب نہیں دیتا۔"

ماں کے الفاظ سے زیادہ اس کی صورت دیکھ کر بھیرو گھبرا گیا۔ وہ کھڑا ہو کر بولا۔

"تو فکر کیوں کرتی ہے ماں؟ میں ضرور پوچھ آؤں گا!"

ماں کچھ رک کر بولی "پھر کب؟ جب وہ کہیں ٹھکانے لگ جائے گی تب؟" یہ کہہ کر چلنے لگی۔ بھیرو نے سامنے آ کر راستہ روک لیا۔ "یہ کوئی پوچھنے کا طریقہ ہے ماں؟" اس نے دیکھا کہ ماں نے اس کے احتجاج کا مطلق اثر نہیں لیا اور چلنے لگی۔ بھیرو نے کہا "سچ کہتا ہوں ماں کہ میں گھر میں آگ لگا کر نکل جاؤں گا۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کر بھی!"

اسی وقت دوسرے کمرے کے کواڑ کھلنے کی آواز آئی۔ شاید بھیرو کی گھر والی یہ سب سن رہی ہو گی۔ وہ ان دونوں کے سامنے آ کر بولی "کیوں اپنے ہاتھوں اپنا مذاق اڑوا رہے ہو؟" اور ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی "بیٹیا نے تو قیامت کر رکھی ہے تم اور دوسرے جھگڑے ہیں! ادھو، ہو۔ بیٹیا کے بغیر تو جیسے سورج ہی نہیں نکلے گا!— چلو، سو جاؤ۔"

"چپ چاپ.....!" اور کمرے کے کواڑ بند کر دیئے۔ بیچاری ماں ان بیچاری

بہو گئی بھیرو کی بیوی نے اُسے اچھی طرح پیٹ کر کھاٹ پر لڑھکا دی ہوئی۔ ساس کو سنانے کے لئے یا ویسے ہی کہا — "لاڈ کرنے والے اور بہوں میں تو جیسے کر دو کرے دوں گی — ہاں!"

لیکن اس وقت جمنا کا دھیان بہو کی باتوں میں یا بچے کے رونے میں نہیں تھا۔ وہ تو دنیا کے کسی نامعلوم گوشے میں اپنی آنسو بہاتی ہوئی بیٹیا کا تصور کر رہی تھی آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسوؤں کی دھار کا بھی شاید دھیان نہ ہو گا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ کب صبح ہو اور وہ گھیسا سے جا کر ملیں۔ پھر ملنے ہی ذلیل ہوں گے لوگوں کی پرواہ کئے بغیر رو کے جواب دینے والے سوروا کو وہ کوستی کاٹتی رہی۔

× × × × × × ×

صبح ہوتے ہی اور جمنا گھیسا کے گھر بھی پہنچی۔ لیکن وہ گھر نہیں تھے۔ اُن کی گھر والی نے کہا "جمنا بھابی وہ تو کل شام سے تھانے میں گئے ہیں۔" جمنا کے قدم جیسے وہیں گڑ گئے ہوں۔ اس کے بدن سے جیسے جان نکلنے لگی ہو۔ اس نے پوچھا۔

"واپس کب آئیں گے؟"

گھیسا کی گھر والی نے پاس کی ڈبیہ جمنا کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ خبر نہیں بھابی — کہتے تھے کہ شاید دہلی ان صاحب کے پاس بھی جانا پڑے۔ لے کی مرضی ہو... اسی کا جھگڑا پڑا ہوا ہے — تم بیٹھو تو سہی!"

"نہیں اب تو جاؤں گی۔" جمنا مشکل سے کہہ پائی لیکن چلتے چلتے پھر پوچھا۔

"کب تک لوٹیں گے؟"

"کیا بتاؤں بھابی۔ شاید دو دن میں آ جائیں۔ اور نہ آئے تو پانچ سات نہ آئے۔ سرکاری کام کا کوئی ٹھکانا تھوڑا ہی ہوتا ہے!"

جاتے ہوئے بھی جمنا نے پوچھا۔ "اکیلے ہی گئے ہیں یا گاؤں کا کوئی دوسرا آدمی بھی ساتھ تھا؟"

"کیا کہتی ہو — " گھیسا کی گھر والی نے ڈبیہ سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا — "کل ہی تو چوپال پر گاؤں کے آٹھ دس آدمی جمع تھے۔ اس وقت انھوں نے جتیرا کہا کہ — ارے بھیا ایک آدھ تو ساتھ چلو لیکن سب کی چپ سادھ گئے — دھیرا بھائی سے تو بہت کچھ کہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کون اپنے گھر کا کام چھوڑ کر جانے کو

ایک لمبی سانس بھر کر خون کا سا گھونٹ پی لیا۔ آنکھیں پونچھ کر چہرے پر معنوعی ہنسی بکھیر لی اور سر جھکا کر آہستہ سے گلیارے سے گزر گئی۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو پھر آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور مٹھے کی ہانڈی رکھتے رکھتے دل بھر آیا۔ وہ چکی کے پاس بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی، ایک ہی خیال ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ میں پڑ رہا تھا اور ریتے کی طرح دل چھید رہا تھا "حرام زادے نے لڑکی کو نہ جانے کہاں غائب کر دیا۔ کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا... "

اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا اس لئے جی بھر کر روتی۔ رونے سے نمٹی تو ڈھور باندھے، بھوکے ڈر سے تھوڑا سا کھانا حلق سے اتارا اور بھیرو ہال میں الاؤ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ جب ضبط نہ ہوا تو بھیرے بولی: "بھیا تو منور سا کا سے پوچھ تو دیکھ..."!

"کیا پوچھوں"؟ بھیرو نے لیے رد کھے انداز میں کہا جیسے وہ خود سمجھ رہا ہے کہ میرا یہ سوال فضول ہے۔

جمنا نے سوچ سوچ کر کہا۔ "یہی کہ وہ بھاگوں جلی ہے کہاں؟ زندہ ہے یا...؟"

"مر گئی ہوگی تو کیا بگڑ جائے گا۔" پھر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے پوری طاقت سے سانس کھینچ کر کہا "مر گئی ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا!

پر تو ذرا پوچھ کے تو دیکھ"

"یہ آخر تو کیا سوچ کر کہہ رہی ہے ماں؟" پھر آنکھیں جھپکا کر بولا "میں کیا منہ لے کر پوچھنے جاؤں"!

ماں بڑے شکیں اور مایوسانہ لہجے میں بولی "ہائے رام۔ تو ایسی بات کیوں کہتا ہے۔

بھیرو بیٹا ذرا سوچ تو سہی کیسی بھی ہو کمبخت ہے تو تیری سگی بہن۔ جب تو ہی...."

بھیرو بگڑ گیا "بہن؟ کیسی بہن؟ جب تھی، تب تھی، اب اس سے ہمارا کوئی رشتہ ناتا نہیں کان کھول کے سن لے..."

ماں ناک صاف کرتی ہوئی بولی "بھاڑ میں گیا رشتہ ناتا۔ ناتا نہیں رکھتا مت رکھ مگر اتنا تو پوچھ لے کہ...." وہ رونے لگی۔

بھیرو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا "تجھے غرض ہو تو پوچھ آ۔ بڑا بہن نے نیک کام کیا ہے جو میں پوچھنے جاؤں گا" پھر ماں کی طرف ہاتھ بڑھا کر نفرت آمیز لہجے میں کہا "تجھے ذرا سی بھی غیرت ہو تو اب کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لانا!"

"کیوں نہیں لاؤں۔ ضرور لاؤں گی، آخر وہ میری بیٹی ہے اور رہے گی اس کی...."

بھیرو کی رگ رگ میں جیسے زہر گھول دیا گیا ہو، وہ دانت پیس کر بولا "غصہ تو اتنا آتا ہے کہ ماں بیٹی دونوں کو.... لیکن کیا کروں سوچ کے رہ جاتا ہوں۔"

"تیرے بھاؤں تو وہ مر ہی گئی۔ لیکن نہ جانے بیچاری کہاں.... کس کے ہاں...."

ماں کی ان باتوں سے بھیرو پیچ و تاب کھا رہا تھا غصے سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ دانت پیس کر بولا۔ "سامنے سے چلی جا کہیں جا کر ڈوب مر جس سے تجھے چین تو آ جائے!"

کچھ توقف کر کے بولا "سچ پوچھو تو تو نے ہی اُسے بگاڑا تھا۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ ماں رہنے دے ہمیں یہ دو آنے روز نہیں چاہئیں لیکن تو مانے تب نا؟ میں جانتا تھا کہ تو میرے منہ پر کالک تھوپے گی!"

پھر سانس لینے کے لئے رکا اور ماں کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"تجھے تو یہاں گھر میں بیٹھنا ہوتا ہے اس لئے اپنی بیٹیا کو سر پر چڑھا لے گو میں تو پلک پنچوں میں جا کر بیٹھتا ہوں، جو باہر گھومے پھرے وہی جانتا ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اور کیا کیا انگلیاں اٹھتی ہیں؟"

"تجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں، تو انگلیاں آپی اٹھیں گی۔ کون سا ہے وہ دودھ کا دھویا، راجا کا بیٹا....؟"

"سب چمار ہیں! لیکن اس سے مجھے کیا؟" پھر تن کر بولا "تجھے خبر ہے؟ اب تک پنچوں میں بھیرو کی چلتی تھی سب اس کی بات مانتے تھے، ذرا سی بات ہو تو پنچ پوچھنے آتے تھے لیکن...." دانت پیس پیس کر وہ آگ اگلنے لگا "لیکن تیری لاڈلی نے جو کچھ کیا سو اچھا ہی کیا، مجھے منہ دکھانے کا قابل نہیں رکھا۔ تو بیٹا بیٹیا کیا کرتی ہو؟

اس نے تو میری سات سات پیڑھی کی کمائی...." اور غصہ میں بات "بیچ" جانے کیا کرتا۔

.... پھر کچھ ٹھنڈا ہو کر آپ ہی بولا "ہنہ ___ اگر میں اس بیرن کی خبر لینے جاؤں تو لعنت ہے۔

مجھ پر ___!"

بیٹا ہے۔ ہم تو کیا ٹھہرے اس لئے بار کے جھک مار کے جانا ہی پڑتا ہے پھر کاس کا منتر الٹے کر بولی۔ "دو چار دن سے تو اُن کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے۔ پھر اکیلے گئے ہیں یہی غنیمت ہے کہ راستے میں اس سپاہی کا ساتھ ہو گیا اس لئے....."

جمنا سے صبر نہیں ہو سکا تو بیچ میں بول پڑی۔ "بھگوان سب اچھا کرے گا۔"

پھر کچھ رُک کر کہا۔ "اچھا چلیں جاتی ہوں" اور چلی گئی

x x x x x x x x x

ماں کو چوپال میں آتے دیکھ کر چھیر نے پوچھا "کیا کہا ماں؟"

"گھر میں ہے ہی کہاں!" جمنا مشکل سے بول سکی۔

"ارے ہاں وہ تو تھانے گئے ہوں گے مجھے بھی ساتھ....."

ولیز کو پیار کرتے ہوئے جمنا کا گلا رُندھ گیا' تیرا باپ تھانے نہیں گیا" اس کے منہ سے ایک سسکی نکلی اور چکی کے پاس بیٹھ کے رونے لگی۔ اب بیٹا کے دکھ سکھ کی خبر بھی نہیں ملے گی۔ دکھ سکھ تو کیا اس کے دبی سے آواز نکل رہی' گئی ...... ضرور کسی دور دراز دیش میں بھیج دیا......" یہ سوچتے سوچتے وہ زمین پر گر پڑی۔

زمین پر پڑی ہوئی ماں کو منہ ڈھانپ کر روتے دیکھا تو چھیر دانت سے ہی پلٹ گیا۔ تو ب کر بولا "میں تو کہتا ہوں کہ تو بھی مر جا تو جھگڑا ہی چک جائے۔ دو چاروں کے لئے برادری سے باہر بھی بیٹھا رہوں تو کیا بگڑ جائے گا۔ تم سب مل کر کیوں میری جان کھائے لیتے ہو۔"

اور رو رو کر تھکی ہوئی جمنا کو ۔۔۔ شاید ابھی جینا تھا اس لئے خیال آیا۔ "شاید تھانے ہی گئے ہوں گے۔۔!" صاف صاف انکار کرتے ہوئے تو وہ جھجک رہی تھی لیکن ابھی سے اس کی آنکھیں تھانے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں جیسے کسی بھید کا انکشاف ہونے والا ہے۔

یا نائب سے کسی کے آنے کی خبر ملتی تو اس سے پوچھتی۔

"کیوں بھیا، منورا ملے تھے؟" لیکن وہ آدمی اُنھیں کہاں دیکھ لیتا منورا تو کل شام ہی گاؤں کی سرحد سے نکل کر دائیں طرف مڑے تھے، راستہ کچھ لمبا ضرور تھا لیکن خیالات کی ادھیڑ بُن میں پتا بھی نہیں چلا۔ رات کو قریب ۹ بجے وہ مہاراج کی دھونی کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

"کون ہے رے؟ ارے! منورا بھیا؟" اور منورا سے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"اری بجلی! کہاں گئی! سنتی ہے یا نہیں" اور اندھیرے میں کسی کی پرچھائی سی نظر آتے ہی بولے۔

"یہ منورا کا آیا ہے اری بہار تو آ۔۔۔" مہاراج جھکو سے بات کرتے وقت "ہے" کو "چھے" کہہ کر گجراتی میں بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُنھوں نے منورا سے کہا، رات کو بھی باہر نہیں نکلتی۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر بٹھاتا ہوں!"

جھکو دہلیز ہی پر کھڑی رہی۔ مہاراج کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی منورا بولے۔

"وہیں کھڑی ہے دیکھو۔" اور بغل میں سے ایک پوٹلی سی نکال کر اس کی طرف سرکاتے ہوئے بولے۔

"لے ۔۔۔ یہ کپڑے تیری ماں نے دیئے ہیں!"

جھکو نے دھونی کی دھندلی روشنی میں ان کپڑوں کو ایک آدھ بار الٹ پلٹ کر دیکھا یا تو اس لئے، یا اتنی روشنی نہ ہونے کے کارن کہ اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ اچھی طرح دیکھا جا سکے' بہر حال' مہاراج نے پوچھا۔

"اس میں کیا دیکھتی ہے؟ تیری ماں نے ہی تو بھیجے ہیں" اور [illegible] ہنستے۔"

"پہلے تیرے نہیں ہوں لیکن اب تو تیرے ہی ہیں، نا؟" پھر منورا کی طرف تائید طلب لہجے میں بولے "کیوں منورا؟"

منورا ایسے چونکے جیسے ابھی کسی خواب سے جاگے ہوں۔ ہکلاتے ہوئے بولے'

"ایں' ایں' ہاں' ہاں اسی کے تو ہیں!" پھر ایک گہری سانس بھری۔ لیکن جھکو اتنا تو جانتی ہی تھی کہ یہ کپڑے دوسرے کسی کے بھی ہوں اس کے یا اس کی ماں کے ہرگز نہیں' اس نے اپنے دل سے نکلتی ہوئی آہ کو بھی کپڑوں کے ساتھ ہی لپیٹ لیا' اور اندھیرے کی طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

مہاراج کے منہ سے بھی ایک گہری سانس نکل گئی۔ منورا کو ایک دم تمباکو کا خیال آگیا اور بھرنے لگے اُن کے چہرے پر تاثرات کی جو اُلجھنیں نمایاں تھیں اُن کا سُلجھنا مشکل تھا اگر مہاراج اپنے دھیان میں مست نہ ہوتے تو وہ بھی یہ دیکھ کر چاہے دریافت

نہ کرسکے لیکن کسی خیال میں ضرور کھو جاتے۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج پھر بولے "بڑی سیدھی لڑکی ہے" اتنا کہہ کر منورما کی دی ہوئی چلم منہ سے لگالی' اور جیسے کوئی انجن آرام سے کھڑا ہوا تھوڑا تھوڑا دھواں نکالتا رہتا ہے اس طرح منہ چلاتے رہے۔ پھر منورما سے یہ کہہ کر چھیڑا کرلی کب اور کہاں جانے والے ہیں۔ اُنھوں نے جھگو کے لیے کچھ ہدایتیں اور مشورے دیئے۔

جھگو صرف چار دن کے قیام میں ہی مہاراج کے دل میں گھر کر لیا تھا اور مہاراج کو بھی اپنی بیٹی کی طرح بلکہ اس سے بھی شاید کچھ زیادہ اُس کی فکر رہنے لگی تھی۔

جھگو کی بے سہارا زندگی دیکھ کر اُن کا اور بھگوان کا ناتا کچھ ڈھیلا پڑنے لگا تھا دنیا کی ہر شے اور ہر بات کا تعلق براہ راست بھگوان سے سمجھنے والے مہاراج کو بھگوان کی بے سہارگی نظر آگئی تھی اور وہ دل ہی دل میں سارا غصہ سماج پر اتارتے رہتے تھے۔ آخر میں تو بھگوان سے ہی پیار ترک کرنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آتا بھگوان! کہ یہ سماج کتنا بڑا شیطان ہے' انسان اس سے ڈرتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنے بچوں کو تباہ کر دیتے ہیں' مگر کیا تو بھی اس سے ڈرتا ہے؟" ایسی ایسی کتنی ہی باتیں اُن کے دل میں آتی تھیں۔

مہاراج نے تکیہ کو چلم دیتے ہوئے کہا "تم سو جاؤ کہتا ہوں مرغ کی پہلی بانگ پر ہی جگا دوں گا۔" اور پھر خود بھی لیٹ گئے۔ آنکھیں تو بند کرلیں مگر دل ان کا بے چین تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کتنے برسوں کے بعد بھی ان کا دل کوئی سکون کا گوشہ تلاش کر رہا ہو کسی گرم آغوش کی تمنّا یا زندگی کی کیف برساتی ہوئی کسی کی آنکھوں کو یاد کر رہا ہو۔

کملی اوڑھے مہادیو کی جگہ میں لیٹی تھی۔ اُسے خود بھی شاید یہ خبر نہ ہوگی کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے لیکن بے قراری جاگ رہی تھی۔ سب مرغا بولے گا اب اُٹھ کر چلنا پڑے گا۔" جھگو ایک دم چونک کر اُٹھ بیٹھی اور دوبارہ آواز سننے کے لیے کان لگا کر بیٹھی رہی جب کوئی آواز نہیں آئی تو اضطراب کچھ کم ہوا۔

پھر۔ جیسے دور سے آتے ہوئے کسی شخص کی راہ دیکھ رہی ہو مرغے کی آواز پہ کان لگے ہوئے تھے۔ "وہ بولا۔!"

اور پھر تو تک تک مرغے کی بانگ سنائی دینے لگی' پہلی' دوسری پھر تیسری۔۔۔ اس نے آوازیں گن بھی لیں۔۔۔ اگرچہ جھگو کچھ بولی نہیں لیکن تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مرغے سے کچھ کہہ رہی ہو'

"ہٹ حرام زادے۔۔۔ بولا' تو خیر مگر تھوڑی دیر بعد بولنا تھا نا!" مرغے کی آواز نے' جو ارتھی کے باجے کی طرح معلوم ہوتی تھی' جھگو کو مایوس اور بے طاقت کر دیا۔

مہاراج سے پہلے ہی منورما کی آنکھ کھل گئی اور جلدی سے جھگو کو بھی جگا دیا۔ باہر نکلتے ہوئے بولے "ذرا جلدی کر۔ منہ دھونا ہو تو دھو کر تیار ہو جا۔

بس جلدی چل۔ کپڑے نہ بدلے ہوں تو کوئی بات نہیں جاتے میں تو تیرا سنیری چلیں گے۔ اور پھر جہاں سوئے تھے وہاں سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی اُٹھا کر دیتے ہوئے بولے "اسے باندھ لینا۔۔۔ چل' جلدی کر۔۔۔ ذرا ٹھہر میں دیا جلا لوں"

دھونی میں سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اُٹھا کر دیا جلایا اور جھگو کو دے دیا۔

مہاراج بھی جاگ کر تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ منورما کی بھری ہوئی چلم کا دم لگاتے ہوئے دروازے میں کھڑی جھگو کی طرف دیکھ کر بولے۔

"ارے' تو نے کپڑے نہیں بدلے؟ ایسے کپڑے پہن کر راستے میں کیسے جائے گی! جا بدل لے۔"

منورما کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ جھگو کو اندر جاتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جھگو کپڑے بدل کر آ پہنچی۔

منورما کی نظر اس پر پڑی' مگر ایسے ہو گئے گویا دیکھا ہی نہیں اور لکڑی سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ "اب چلوں مہاراج؟"

دُنیا میں ایسی بھی محبت ہوتی ہے جسے سدا وقت کی ضرورت ہوتی ہے نہ آبیاری کی۔ اور بعض دوسری پروان چڑھ جانے والی چیزیں بے کار ہوتی ہیں۔ انھیں زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کی بھی پروا نہیں ہوتی' وہ تو جب اور جہاں چاہیں پھوٹ نکلتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ میں اچھا خاصا تناور درخت بن جاتے ہیں۔ جھگو کے معاملے میں مہاراج کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ دُنیا کی مایا سے بے تعلق رہنے کے لیے جنگل میں قیام کرنے والے اس بیراگی کے دل میں آیا ایک بیج پھوٹتے ہی وہ درخت ہو گئے۔ اُنھوں نے آنسو بہاتی ہوئی جھگو کو سینے سے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

دیتا سے بھری ہوئی ان آنکھوں کے دو چار آنسوؤں کو اپنے سر پر جگہ
دیتے ہوئے جھمکو سسکیاں بھرنے لگی۔ ظاہر میں یہ منظر ایسا لگتا
تھا جیسے شکنتلا اپنے پالنے والے باپ کنو سے وداع ہو رہی ہو لیکن
اندرونی طور پر بہت فرق تھا۔ شکنتلا کو تو اپنے ہرنوں سے، اپنی
سہیلیوں سے اور دوسری چیزوں سے دوبارہ ملنے کی اُمید بھی تھی،
امکان بھی تھا، اور اس لئے کچھ اطمینان بھی ہوگا لیکن جھمکو کے لئے
تو ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ گاؤں کی سہیلیوں نے تو ایک طرح اُسے
دھتکار ہی دیا تھا اور آئندہ اُن کے ملنے کی یا اُنھیں منانے کی کوئی اُمید
بھی نہیں تھی۔ جب وہ گھاس لینے آتی تب ان درختوں پر چڑھتی
تھی، کھیل کود کرتی تھی اور کبھی کبھی یہاں سکھیوں کے ساتھ گاتی بھی
تھی۔ اس جنگل کو اور اس گھر کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی
اب تو اس علاقے میں آکر جھانکنا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس
کے تمام روابط اور تعلقات یہاں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہے تھے!

پھر آس پاس پھیلے ہوئے چھپروں سے مرغوں کی بانگ سنائی
دی۔ کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے منور والے نے پھر کہا۔

"مہاراج اب آشیرواد دو۔ ہم چلیں!"

جھمکو کو چھوڑتے ہوئے مہاراج بولے "میں کیا آشیرواد دوں مکھیا؟
یہ جو کچھ ہے آشیرواد ہی ہے، یہ آنسو ایسی جگہ سے بہہ رہے ہیں کہ یہ آنسو
ہی اپنی مصیبتوں کو دھو دیں گے" کچھ رُک کر بولے "اور اگر ... سکے تو
آگے نہ بول سکے یا بولنا مناسب نہ سمجھا تو وہ چپ ہو گئے۔

منور وا ان باتوں کا مطلب سمجھے بھی یا نہیں یہ تو کون جانے لیکن قدم
اٹھانے سے پہلے بولے "سچ ہے مہاراج!" اور پھر ہاتھ اٹھا کر "اچھا تو
نارائن مہاراج" کہتے ہوئے چلنے لگے۔

مہاراج جھمکو کو سینے سے لگا کر مشکل سے کہہ سکے۔

"جا بیٹی ــــ بھگوان پر بھروسا رکھنا، وہی سنبھالے گا۔"

"میری ماں سے...."

جھمکو آگے نہ بول سکی اس نے پیٹھ پھیر لی، مہاراج نے کہا "اچھا اچھا
تو جا۔ وہ تو میں اُس سے سمجھ لوں گا، سب بات کر لوں گا!" پھر منور والے سے کچھ
سفارش کر کے جھمکو کو بھی نصیحت کی۔

"بیٹی پردیس میں جا کر ایسا کچھ نہ کرنا جس سے لوگ تماشا دیکھیں
... تیرے باپ جیسا، تیرے ساتھ وہ خود بھی تیرا

اچھی طرح ٹھکانا کر دے گا۔ بھاگوان تیرا بھلا کرے!"

اگرچہ ایسی دیر بھی نہیں ہوئی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں منور والے کے
دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی، موقع ملتے ہی انھوں نے مہاراج کو پھر سے
پرنام کر کے چلنا شروع کر دیا!

جھمکو پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

جب تک یہ دونوں جھاڑیوں کی اوٹ میں اوجھل نہ ہو گئے تب تک
مہاراج کھڑے کھڑے اُن کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک لمبی سانس بھر کر
سوئم بولے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، قدرت کے ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ گول مال ہے"
اُن کے چہرے پر عجیب تاثرات پیدا ہونے لگے۔ جن میں شکون کے
خطوط بھی شامل تھے۔ "اسی لئے تو اس میں اتنا مزہ ہے" لیکن
پھر کہیں سے جھمکو کی یاد آگئی اور دل میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ٹھنڈی
سانس بھر کر رہ گئے۔

اور جنگل پار کر کے، گھر چھوڑ کے جانے والی جھمکو کی آنچل
سا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔ پچھلی رات کا چاند، جو کچھ ہی دیر پہلے طلوع
ہوا تھا اب اپنی دھندلی روشنی جاتی ہوئی جھمکو کی پشت پر پھینک
رہا تھا لیکن جھمکو کا راستہ اس کی اپنی ہی پرچھائی سے تاریک ہو گیا تھا
چونکہ جھمکو کی زندگی کے جذباتی سفر کا راستہ اس سے زیادہ تاریک تھا
اس لئے وہ اس وقت راستے کی تاریکی پر فکر مند نہیں تھی۔ آنکھوں
سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی دھار کا بھی اُسے خیال نہیں تھا صرف
ایک بات کی فکر اور خیال تھا اور وہ یہ کہ ــــ ہر ہر قدم وہ اپنے وطن
سے علیحدہ ہوتی جا رہی ہے، بے تعلق ہوتی جا رہی ہے!

سکھ دُکھ کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں جن
باتوں کا اُسے کبھی دھیان بھی نہ آیا تھا ان کی حقیقت اس وقت معلوم
ہو رہی تھی۔ سارا جنگل، اس کے درخت، یہ پگڈنڈیاں، یہ سب
کچھ ابھی تک تو اس کے تھے لیکن اب یہ دیکھنے کو بھی نہیں ملیں گے۔
اپنی ماں اور وطن کی محبت کا صحیح اندازہ تو وہی کر سکتا ہے۔ جو کبھی وطن سے
دُور رہا ہو۔ یا ہمیشہ کے لئے اُسے جدا ہونا پڑ رہا ہو۔ آنسوؤں
سے قیمت ادا کرنے والی جھمکو، اپنے گمبھیر چہرے سے، اور گہری محبت
بھری آنکھوں سے اُن درختوں کو دیکھتی اور نگاہوں کی زبان سے
کہہ رہی تھی ــــ الوداع کہہ رہی تھی!

" اگر میری ماں کبھی دن ادھر آئے تو کہہ دینا کہ جھمکو کو ہم نے دیکھا تھا وہ اسی راستے سے گئی ہے"۔ . . .

تقریباً چھ کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ دونوں ندی کنارے آکر سستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ منورو انے ماچس جلا کر چلم سلگائی۔ اُن سے ذرا فاصلے پر، ایک پتھر پر پاؤں سمیٹے ہوئے، ایک ہاتھ ٹیکے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں لی ہوئی ٹہنی سے پتھر پر لکیریں کھینچتی ہوئی جھمکو بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر جذبات آ رہے تھے۔ منورو ا چلم کا کش لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ دیر بعد بولے،

" دیکھ بیٹیا، میں تیرے ساتھ تو آ رہا ہوں، لیکن پردیس میں فضیحت نہ کرانا، اگر ایسی بات ہو تو پہلے سے ہی کہہ دینا، کبھی مجھے نیچی کر کے جوتے کھانے پڑیں!"

"ماں کچھ کہتی تھی منوڑا کا کا؟" جھمکو نے سر اٹھائے بغیر ہی پوچھا

" اور تو وہ بے چاری کیا کہتی، کہنے لگی، تم کسی بھی طرح اس کا راستہ نکالو نہیں تو اس کے ساتھ ہماری بھی رسوائی ہوگی، یہ کہہ کر خوب روئی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے گاؤں کا رہنے والا ایک پٹیل تھا، اس کا لڑکا ہے، تو بے چاری خوشی سے پھولی نہ سمائی۔"

" ایک بار مجھ سے . . . ملنے بھی . . . نہ آئی!" کہتے ہی جھمکو کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

"موری بچی۔ وہ تو آنے کے لئے بلک رہی تھی، مگر آتی کیسے؟ اگر کسی کو شبہ بھی ہو گیا تو تم لوگوں پر آفت آ جائے گی۔" پھر چلم کا دھواں کھینچ کر بولے "اور ابھی تو یہ نیا نیا قصہ ہے، ابھی تو مل نہیں سکتی، ہاں ایک آدھ برس بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تب اگر کپڑے کمڑے آ کر مل جائے گی تو کون جان سکتا ہے؟ ہماری ذات کی سوندھی بڑھیا ڈاکورجی جانے کے بہانے اپنی بیٹی سے مل ہی آتی ہے!"

پھر چلم اُنڈیل کر بولے "یہ تو میں سب انتظام کر دوں گا۔ چل اُٹھ اب موٹر کا وقت ہو گیا۔" اور دونوں اُٹھ کر چلنے لگے

پھر جھمکو کچھ نہ بولی۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو زندگی میں پہلی بار موٹر میں بیٹھنے کی خوشی میں وہ آپے سے باہر ہو جاتی وہ خود ناچنے کودنے لگتی لیکن اس کا دل تو ضرور ناچ اُٹھتا اور اس کی آنکھوں میں مسرت چھا جاتی۔ منھ سے سرسوتی بہنے لگتی: "اوہو! ہو کیسی دوڑتی ہے کتنا مزہ آتا ہے، جیسے اوپر اُڑ رہے ہوں۔ وہ پہاڑیاں دیکھو لیے اپنا ٹکائیں وہ نظر آ رہا ہے، اپنے گاؤں کا پہاڑ کتنا چھوٹا سا لگتا ہے" وہ ایسی ویسی تو ہزاروں باتیں کرتی۔ لیکن آج ــــ اس وقت تو وہ کھڑکی سے سر نکال کر ان پہاڑیوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھی جو گویا سر اُٹھا اُٹھا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ موٹر کی سمت چل جانے سے یا فاصلہ بڑھ جانے سے ـــ یہ بات جھمکو نہ سمجھ سکی۔ لیکن اب وہ پہاڑیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ادھر اُدھر دیکھتے دیکھتے جھمکو تھک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو چار آنسو گرے جو اُڑتی ہوئی دھول میں مل کر ادھر ہی میں رہ گئے

x x x x x x

دوپہر ڈھل رہی تھی جب موٹر نے ایک اسٹیشن پر لا کر اُتار دیا۔

"چل، اس پیپل کے نیچے" کہتے ہوئے منورو ا آگے آگے ہو لئے۔ دونوں بیٹھ گئے کبھی جھمکو کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے مال گاڑی کے ڈبوں کی طرف جاتی تھی اور کبھی پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے مال پر پڑتی تھی کبھی موٹروں اور بیل گاڑیوں پر جاتی تھی اور کبھی دور، حد نظر تک پھیلی ہوئی ریل کی پٹڑیوں پر اس طرح پڑتی تھی جیسے ان کی جڑیں اور کنارے تلاش کر رہی ہو۔ منورو ا نے کچھ بیڑیاں اور ماچس خرید کر ایک بیڑی سلگائی اور منہ سے پیتے ہوئے ایک ٹھنڈی لمبی سانس کھینچنے لگے، پھر بولے،

"اٹھ بیٹیا۔ چل تھوڑا سا کھا لیں!"

"بھوک نہیں ہے کا کا۔ تم کھا لو۔" کہہ کر جھمکو پوٹلی کھولنے لگی۔

"ارے واہ کیسا رسالہ تو میری دھوتی میں بندھا ہوا ہے چل ایک ایک ٹکڑا۔"

"لیکن مجھے بالکل بھوک نہیں ہے کا کا! کھانا ہی ہوتا تو یہ مرچ مسالے کی روٹی بھی موجود ہے" اور منورو ا کے آگے روٹی کی پوٹلی کھولتے ہوئے بولی۔

"تو کا کا۔ اس میں کوئی چھوت نہیں لگے گی۔ یہ تو دودھ میں آٹا گوندھ کر بنائی ہے"

"اور وہ دودھ میں نہ گوندھا ہو تو بھی یہاں پردیس میں کیا بگڑ جائے گا!

لیکن تو تھوڑا سا لڈو تو کھا۔ بے چاری بڑی ماں نے کتنے پیار سے . . . ."

"کا کا کہتے ہو کا کا؟ میری ماں نے رکھا ہے یہ؟ تم نے تو مجھے یہ بات بتائی ہی نہیں" جھمکو کا چہرہ لمحہ بھر کے کھل اُٹھا۔

"اس میں کہنا کیا تھا۔ پگلی —" یہ کہتے ہوئے منورولانے جھمکو کے پاس پڑی ہوئی لٹیا اٹھاتے ہوئے بات کا رُخ بدلا۔

"میں ذرا پانی لے آؤں...."

"نہیں کاکا۔ تم کھاؤ، پانی میں لے کر آتی ہوں" اور منورولا کے منع کرنے پر بھی وہ لٹیا لے کر چل دی۔

جھمکو نل کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ اور عجیب نظروں سے نل کی طرف دیکھتی رہی۔ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ دیکھ کر جیسے ہی نل خالی ہوا وہ لٹیا بھرنے لگی۔ ٹونٹی دبا کر پانی بھرنے میں بڑا مزہ آرہا تھا جھمکو نے لٹیا دھونے کے بہانے بھری بھرائی انڈیل دی، پھر بھرا اور آس پاس دیکھ کر پھر انڈیل دیا، تیسری بار بھی یہی کیا، لیکن چوتھی بار انڈیلنے کی ہمت نہ کر سکی ایک مسافر کو نل کی طرف آتا دیکھ کر وہ بھری لٹیا لئے جھٹ وہاں سے چل دی اور منورولا کو پانی پلا کر پھر سے بھر لائی۔ بہت اصرار کرکے منورولا نے اُسے کھانے پر بٹھایا۔

اتنے میں بہت دور سے جھمکو کے کانوں میں ریل کی سیٹی سنائی دی، اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ کون بولا کاکا؟ ریل گاڑی بولی!" جھمکو کی آنکھیں اسی طرف منڈلانے لگیں جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہ ایک ہاتھی جیسے ڈیل کو سامنے سے آتے دیکھ کر اور اسٹیشن کے مسافروں میں شور غل اور کھلبلی دیکھ کر جلدی جلدی پوٹلی باندھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اٹھو کاکا۔ گاڑی آگئی۔ جلدی...."

"ارے پگلی، کھا تو لینے دے — یہ تو دوسری گاڑی ہے۔ اپنی گاڑی کو تو ابھی بہت دیر ہے۔ وہ تو اِدھر سے آئے گی۔" آرام سے بیٹھے ہوئے منورولا نے لڈو کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہوئے ریل گاڑی نے ایک اور سیٹی دی جھمکو کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے گاڑی کے انجن اور ڈبوں کو دیکھتی رہی۔ مسافروں کی بھاگ دوڑ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ کوئی بچے کو کھینچتا تھا تو کوئی بچے کے باپ کو۔ ہاتا تھا کوئی گاڑی میں جگہ پر قبضہ کرکے چلاتا تھا۔

"ادھر آؤ — اِدھر.... میں تو یہاں ہوں —" اور اس سے بھی زیادہ گڑبڑ اور دھاچوکڑی اُترنے والوں کی تھی۔ کوئی پیٹی سنبھالتا تھا تو کوئی پلیٹ فارم کے باہر کھڑی ہوئی موٹر میں جگہ نہ ملنے کے خوف سے گھوڑے کے سر پر ایک کے اوپر دوسرا سامان لادرہا تھا۔ جھمکو نے تو مُدت سے ایک مرد اور ایک عورت کو لڑتے ہوئے بھی دیکھا۔ ادھر موٹر کے پاس بھی شور غل اور دھکم دھکا ہو رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ گاڑی چل دی اور یہ شور غل کم ہوگیا نہیں تو بے چاری جھمکو تو ان باتوں سے پریشان ہو کر شاید رو پڑتی۔

جھمکو کی نظریں اور موٹر کی طرف پڑنے لگیں۔

منورولا بولے "کھاتی کیوں نہیں؟ کیا دیکھتی ہے؟" جھمکو نے اس بات کا جواب نہ دیتے ہوئے پوچھا "یہ کاکا جو اپنی والی موٹر میں بیٹھے ہیں وہ سب اپنی طرف کے ہیں؟"

منورولا لڈو کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے بے سوچے سمجھے ہی بول پڑے۔

"ہاں، ہاں!" اور ہاتھ دھونے میں لگ گئے۔

جھمکو نے تھوڑی دیر رُک کر پھر پوچھا "یہ پردیس گئے ہوں گے کیوں؟"

بیڑی سلگاتے ہوئے منورولا نے سر ہلا کر "ہاں" کہا۔

"کسی کو پہچانتے بھی ہو۔ کاکا!"

منورولا نے تنگ آکر کہا "مرنے دے نہ۔ تجھے کیا کرنا ہے پہچان کر"

جھمکو کی زبان تو رُک گئی لیکن آنکھیں موٹر پر ہی منڈلاتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں پٹپٹاتی ہوئے جھمکو نے آہستہ سے کہا۔

"اَپن کاکا۔ چلو نا اَپن بھی گھر چلیں!"

منورولا کچھ بھڑک اُٹھے۔ لیکن بالکل ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"ارے، پاگل تو نہیں ہوگئی۔ ابھی احمد آباد تو پہنچنے دے!" پھر کچھ رُک کر بولے۔

"ایک بار احمد آباد دیکھ تو سہی!"

"چولھے میں جائے۔ مجھے نہیں دیکھنا ہے" آواز کچھ رُوہانسی تھی۔

اب کی منورولا ذرا کڑی آواز میں بولے۔

"چل چل — پاگل مت بن — ذرا آگے پیچھے کا بھی سوچ لے۔" ذرا تنک کر کہا۔

"اب تک گھر ہی تو تھی!"

جھمکو کچھ نہ بولی — اب بھی اس کی آنکھیں موٹر پر لگی تھیں۔ موٹر چل دی تو اس کا سلسلہ خیال ٹوٹنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

" دیکھنا بٹیا۔ میں ذرا ٹکٹ لے لوں۔" پشورو دا کی آواز سن کر وہ کچھ چونکی ایک دم چوکنا ہو کر اس کے جنکار بھری، اور پوٹلی، تھیلا وغیرہ، سامان کو اپنے پاس کھینچ کر رکھ لیا۔ اور پھر اس کی نظر دھول اڑاتی ہوئی موٹر کا پیچھا کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد موٹر ظاہرا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کے دل کی اندرونی آنکھیں اب بھی اسے کسی گاؤں میں سڑک کے کنارے ہوٹل کے پاس ٹھیرتے ہوئے تالاب کے باندھ سے گزرتے ہوئے، ندی کا پل پار کرتے ہوئے، جنگلوں میں گھستے ہوئے، دیکھ رہی تھیں گاؤں کے پاس والا کھانڈا پہاڑ آنے ہی والا تھا، کہ اس کا سلسلۂ تصور ٹوٹ گیا۔

"چل اٹھ۔ پوٹلی لے لے، اندر جا کر بیٹھیں" کہتے ہوئے منوروا کا ہاتھ جیب کی ٹینک جا کر ٹکٹوں کو ٹٹولنے لگا۔ جھکو کو آگے بڑھتا دیکھ کر بولے:

"کیوں یہ ٹھیا نہیں لینا ہے؟" جھکو نے پلٹ کر ٹھیا اٹھالی۔ پلیٹ فارم پر بیٹھتے ہوئے جھکو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیوں کاکا، اب موٹر آدھی دور تو ...."

منوروا کو غصہ آگیا "تو بھی جب سے ایک ہی بات کے پیچھے پڑی ہے۔ میری ناک میں دم آگیا!" پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولے:-

"مجھے تو ایسا لگتا ہے بٹیا، کہ احمد آباد دیکھتے ہی تو تکی تکی رہ جائے گی! بال موٹریں ہی موٹریں ہیں۔ چلنے کے لئے راستہ بھی نہیں ملتا میرا خیال ہے تبھی دیکھ کر پاگل ہو جائے گی!" کہتے ہوئے کچھ مسکرائے۔ لیکن جھکو پر ان زنی کا ذرا سا اثر بھی نہیں ہوا۔ پھر منوروا ابھی کچھ نہ بولے لیکن ان کی تڑپ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر لمحہ گاڑی آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک بابو سے پوچھ کر انھوں نے پورے پانچ بج جانے کا یقین کر لیا۔ اتنے میں سیٹی سنائی دی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جھکو پر اُداسی چھائی تھی۔ یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا۔ گاڑی آتے ہی وہ منوروا کے ساتھ ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ انجن کی سیٹی سنتے ہی جھکو نے ایک آہ بھری اور سر نیچے کئے ہوئے ہونٹ چباتی رہی۔ سر پہ ساڑی کا پلو کچھ سرکا لیا!

تقریباً آٹھ برس پہلے منوروا نے دو آنے کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھنے کا شوق پورا کیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ گاڑی میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ جھکو کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت پوچھنے لگی:

"کون گاؤں کی ہو بہن!؟"

جھکو سے پہلے ہی منوروا بول اٹھے: "ہم تو ادھر پہاڑیوں میں رہتے ہیں" شاید جھکو کا گھونگھٹ دیکھ کر اس عورت نے پوچھا:

"یہ بائی تمھاری کون ...."

"میری بٹیا ہے!" منوروا بیچ میں ہی بول اٹھے۔ لیکن بڑھیا کے ایک دو سوالوں کے بعد اُن میں ضبط نہ رہا۔ انھوں نے یہ داؤ کیا کہ خود ہی بڑھیا سے سوال کرنے لگے۔

لیکن جھکو کا دھیان اُن سوالوں کی طرف نہ تھا۔ دو اسٹیشن نکل جانے کے بعد اس نے منوروا سے پوچھا:

"ایں کاکا۔ ابھی کتنی دور ہے؟"

"ابھی تو پڑے دو ٹیشن (اسٹیشن) ہیں۔ تیسرا ٹیشن احمد آباد کا آئے گا!" کہتے ہوئے منوروا نے آس پاس دیکھ کر چپکے سے جھکو کو سمجھا دیا کہ اگر کوئی کچھ پوچھے تو وہ کیا جواب دے۔ پھر شاید اُسے خوش کرنے کے خیال سے بولے۔

"دیکھا، کیسی گاڑی ہے؟ ہوا کی طرح جاتی ہے نا؟"

جھکو نے سر ہلا کر "ہاں" کر دی، اور کوشش کر کے کچھ ہنسی بھی۔ اب منوروا کو بھی کچھ اطمینان ہوا اور بیڑی سلگا کر پینے لگے۔

جھکو کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی گاڑی اُسے دھرتی کے کسی دور دراز گوشے میں جا پھینکے گی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی لیکن اسے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں رہا تھا۔ بات عقل میں نہیں آتی تھی پھر بھی وہ کھانڈا پہاڑ دیکھنے کے لئے بار بار آنکھیں پھاڑتی تھی۔ کھڑکی سے سورج ڈوبتا ہوا سورج دکھائی دے رہا تھا پھر بھی وہ اُسے پچھم نہیں مان سکتی تھی۔ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ اگر وہ سورج کو بھی بدلا ہوا مان لے تو اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا؟ اگر منوروا پاس نہ بیٹھے ہوتے تو وہ یقیناً سسک سسک کر رونے لگتی۔

دُور، بہت دور ملوں کی کالی کالی چمنیاں دکھائی دینے لگیں۔ منوروا نے کہا۔

"دیکھ جھکو۔ احمد آباد دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھنا! اب جو آرہا ہے وہی احمد آباد کا ٹیشن ہے!"

اسٹیشن بھی آگیا۔ اُترنے سے پہلے ہی ڈبے میں بتیاں روشن ہونے لگیں یہ دیکھ کر جھکو تو بڑی حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے غم میں—خوف میں ڈوب گئی!

اسٹیشن پر اُترتے ہی منوردا نے کہا: "کیوں جھکو، دیکھا احمد آباد! کیسی بجلی کی بتیاں ہیں۔ دِن سا معلوم ہوتا ہے!"

لیکن رات کو دِن بنا دینے والی بجلی کی بتیاں، طرح طرح کے بھونپو بجا کر دوڑتی ہوئی موٹریں، سائیکلیں، تانگے، بڑے بڑے مکان اور سجی بنی دوکانیں ان میں کوئی بھی چیز جھکو کے لیے کشش پیدا نہ کر سکی۔ ابھی تک سُنا تھا لیکن آج سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ زمین پر سچ مچ "کچھ" ہے! اُسے اس بات کا بھی احساس نہ ہوا، اس کا اضطراب اور بے کلی بڑھتی ہی گئی!

منوردا، جھکو کو نئی نئی چیزیں دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دھرم شالے میں جاکر اپنا اَتا پتا لکھوایا اور اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ کرائے پر رضائیاں اور گدّے بھی لے لئے۔ جب دھرم شالا کا جمعدار منوردا کو بجلی کی بتی وغیرہ کے بارے میں بتا رہا تھا اس وقت جھکو گدّے پر پڑی پڑی بے چین ہو رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔

کچھ دیر بعد منوردا نے جھکو سے ناشتہ نکالنے کے لیے کہا اور خود جاکر پانی بھر لائے۔ اس کے منہ میں ٹھوکا دیتے ہوئے بولے:

"بیٹھی کیں بیٹے ہے، کھا، نا؟"

"تم کھاؤ کاکا، مجھے کھانا نہیں!"

منوردا نے آنکھیں نکال کر پوچھا: "کیوں؟"

"بھوک نہ ہو تو کیسے کھاؤں—" کہتے کہتے جھکو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"لیکن بھوک نہ لگنے کا کارن؟ چل کھانا شروع کر دے،

نہیں تو جانتی ہے ...."

"لیکن مجھے ...." جھکو آگے نہ بول سکی۔

اب منوردا کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ دبی آواز میں بولے: "رونا دھونا بند کر۔ نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

... ہاں — یہاں پردیس میں میری رُسوائی کرائے گی؟" کہتے ہوئے اُٹھے اور موری کے پاس جاکر ہاتھ دھو لیے۔ پھر سامنے پڑے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"نہ جانے کہاں سے یہ بے وقوفی سوجھی جو دوسرے کے پاپ میں شامل ہوا!"

جھکو "دوسرے کے پاپ" کا مطلب اپنا ہی سمجھتی تھی اور اسی لیے شاید اس نے رونا دھونا بند کر دیا۔

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ بتی بجھا کر سو گئے۔ کب سوئے اس کی شاید اُنھیں بھی خبر نہیں تھی لیکن جب جاگے تو معلوم ہوا کہ سورج کافی چڑھ چکا ہے۔

دتون کر کے پیچھے کے کٹہرے پر جھک کر کھڑی ہوئی جھکو سے منوردا نے آس پاس کے مناظر کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا: "جھکو۔ وہ تعزیہ جیسا دکھائی دیتا ہے، دیکھا؟ نہیں دیکھتا وہ، بیچ میں پہیئے جیسا گول گول ......"

"ہاں ہاں۔ وہ کیا ہے کاکا؟ بیچ میں تو کچھ بیل بوٹے بنے ہیں" جھکو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں وہی! .... اس کا نام جانتی ہے تو؟ ..."

اور جیسے چھوٹے سے بچے کی طرف دیکھ رہے ہوں اس طرح جھکو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

"وہ گھنٹہ گھر ہے، گھنٹہ گھر! ؟ ..."

"اوہ، باپ رے .... اتنا بڑا" اور ایک لمحہ رُک کر پوچھا:

"ایں کاکا، یہ کیوں بنایا ہوگا؟ ..."

"کیوں؟ .... سب کے ٹیم دیکھنے کے لیے! ..... تو جانتی ہے جھکو، شہر کے لوگوں کو اسی سے دن نکل آنے اور ڈوبنے کی خبر ہوتی ہے۔ سمجھی!"

اور پھر منوروا آکاش سے باتیں کرتے ہوئے آس پاس کے مکان دُور دھواں چھوڑتی ہوئی ملوں کی چمنیاں۔ ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی موٹریں وغیرہ دکھانے لگے۔ جھکو طرح طرح کی باتیں پوچھتی تھی۔ منوروا جھکو کو خوش کرنے کے لئے ابھی نہ جانے کیا کیا بتاتے لیکن یکایک انہیں کچھ یاد آگیا ــــــ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پھر رکھ کر بولے ،

"چل تھوڑا سا کھالیں !"

جھکو کا ارادہ تو انکار کرنے کا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ بول نہ سکی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے بولی "میں تو بالکل تھوڑا سا کھاؤں گی کاکا !"

"اچھا۔ تو چل تو سہی" کہتے ہوئے منوروا آگے بڑھے۔ واقعی جھکو نے بہت تھوڑا سا کھایا۔

لوٹتے وقت منوروا نے طنزاً کہا، "پگلی، اس میں تھا ہی کتنا سا کھانا۔ اس میں سے بھی تو نے آدھا ...... یوں ہی تین پیسے بگاڑے !"

"میں نے کہا تو تھا"

"کہا تھا، تیرا سر!" منوروا چپ ہو گئے !

کمرے میں آنے کے بعد منوروا نے صافہ باندھا۔ کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے اور کمری پیچھے ہوئے بولے ،

"میں ذرا باہر جاتا ہوں ــ تو یہیں کوٹھری ......"

"نہیں کاکا ــ میں اکیلی نہیں رہوں گی" جھکو نے پیار سے بھرے لہجے میں گھبرا کر کہا۔

"میں ابھی واپس آیا ــ تو اتنے سوچا کنڈی لگالے۔ اس بھری بستی میں ڈر کاہے کا !"

اگر منوروا ذرا بھی غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ جھکو کو سارا ڈر تو بھری بستی کا ہی تھا۔ اُسے سمجھا بجھا کر وہ باہر نکل گئے۔

دھرم شالا کے دروازے پر آتے ہی جیب میں رکھا ہوا کاغذ دکھا کر لوگوں سے کہنے لگے ؛

"ذرا دیکھو دو صاحب، یہ امر سنگھ کہاں ملے گا ؟"

اور جس طرح فٹ بال اِدھر اُدھر ٹکراتی ہوئی آخر کار گول تک جا ہی پہنچتی ہے اسی طرح منوروا بھٹک بھٹکا کر ایک مل کے پھاٹک تک پہنچ گئے پہرے دار سے پوچھا ،

"اے جمعدار صاحب، امر سنگھ کہاں ملے گا ؟"

پہرے دار نے پہلے گاؤں اور برادری کا نام پوچھا پھر کہا "تم اُدھر بیٹھو میں ابھی بلاتا ہوں" اور ایک آدمی کے ہاتھ سندیسہ بھیج دیا۔

منوروا نے تقریباً ۲۸ برس کے ایک جوان کو مونچھوں پر بل دیتے اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً پہچان گئے۔ دور سے منوروا پر نظر پڑتے ہی وہ بولا، "اوہو، ہو ہو، منوروا کاکا !"

اور رام رام کرنے کے بعد پوچھا "کیوں کاکا ؟ تم یہاں آج کیسے راستہ بھول گئے ؟"

"بھولا نہیں، امر بھیا، خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں" منوروا ہنسنے لگے۔

"اچھا۔ چلو گھر چلیں" کہتا ہوا امر سنگھ آگے آگے ہو لیا۔ راستے میں اس نے منوروا سے پوچھا کون کون آیا ہے۔ کیسے ہو۔ کب آئے۔ کہاں ٹھیرے ہو۔ ایسے کتنے ہی سوال پوچھ ڈالے۔

ان میں منوروا نے کچھ کا ٹھیک جواب دیا اور "کون کون آیا ہے" کا جواب ایسا ہی گول مول دے دیا۔

اتنے میں گھر آگیا۔ امر سنگھ ایک مضبوط ہتھوں والی کرسی سرکا کر بولے ،

"بیٹھو کاکا ــ"

"ارے نہیں بھیا، اپنے رام تو ...... ؟"

"ارے ایسی کیا بات کرتے ہو ؟ آرام سے بیٹھو !" امر سنگھ نے کہا۔

منوروا کبھی کبھی ہوٹل میں یا کسی اور جگہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ لیکن آرام سے نہیں، آج وہ پیر پر پیر رکھ کر آرام سے بیٹھے ! چائے، ناشتے کا آرڈر بھجوا کر امر سنگھ بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے گاؤں اور آس پاس کی خیر سلا پوچھ کر بولا ،

"کاکی کو بھی لے آنا تھا کاکا !"

"کہاں ؟ احمد آباد میں ــ ؟" اور امر سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں ! ہاں !"

منوروا کھیتی باڑی اور ڈھور ڈنگر کا حال چال سنا رہے تھے کہ اتنے میں چائے وغیرہ آگئی اور دونوں نے نیچے بیٹھ کر چائے پی۔ ناشتہ کیا۔ سجا ہے۔ کھانے میں ڈلوا دینا ــ کہہ کر امر سنگھ نے ہوٹل کے لڑکے کو روانہ کر دیا لیکن ایک دم کچھ یاد کیا اور بولا، "لے اور لوٹتے ہوئے دو پان اور دو ناشتے پھر لے آ ! پر یہ پیالے یہیں رکھ جا، دھڈ

کر آنا بیٹا!"

لڑکا جلدی ہی لوٹ آیا۔ بہت اصرار اور تکلف کے بعد منوروا قابو میں آئے انھوں نے پان بھی کھایا اور سگریٹ بھی سلگا لیا۔

"کاکا ـــــ یہ بتاؤ امر سنگھ کہ ایک ایک کیوں یاد آ گیا؟" اور ہنستی ہوئی نظروں سے منوروا کی طرف دیکھا۔

"بغیر کام کے کون آتا ہے امر بھیا۔" کہہ کر باہر دیکھتے ہوئے بولے "لیکن بات ذرا . . ."

امر سنگھ سمجھ گیا، دیہاتی دیوار پر ایک رضائی ڈال دی۔ دروازے کو ادھ کھلا چھوڑ دیا۔ منوروا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سامنے امر سنگھ پاؤں موڑے اور ہاتھ کے سہارے سے بیٹھا تھا۔

اس نے پوچھا! "ہاں تو اب بتاؤ!" منوروا کچھ جھجک رہے تھے اس نے پھر کہا۔

"تم میری عادت جانتے ہو کاکا ـــ چاہے کیسی ہی بات ہو، سر کٹنے کی کیوں نہ ہو، لیکن جیسی سُنی ویسی ہی زمین گاڑ دی" سگریٹ کا کش لگا کر بولا . . . "اس بات سے تم بے فکر رہو . . . ."

سگریٹ کے لگاتار تین چار کش لے کر منوروا نے بات شروع کی . . .

"پار سال تم نے جو بات کی تھی وہ یاد ہے؟"

دیکھا کہ امر سنگھ کچھ سوچنے لگا تو بولے "یاد نہیں؟ جب لکھا پٹیل کی لڑکی کنوئیں میں گر کر مر گئی تھی اُسی دن تم نے . . . ."

"ارے ـــ ہاں ہاں! ٹھیک ہے، اب یاد آیا . . . ."

"یاد ہے اس دن تم نے اپنے اور آبادی بالمنوں کی دوسری باتیں بھی کی تھیں . . . . ؟"

"ہاں ہاں، اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن پنچایت پوری ہونے کے بعد تم رات کو بیٹھے تھے اور آدھی رات تک ہم باتیں کرتے رہے تھے" یہ کہکر امر سنگھ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ منوروا کو خاموش دیکھ کر پھر بولا "تو تم سمجھ گیا کاکا، مگر وہ ہے کہاں کی؟"

منوروا نے جھمکو کی کہانی شروع سے آخر تک کہہ سنائی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے واقعات کا بھی تذکرہ کیا۔ آخر میں بولے "جس طرح بھی ہو لیکن مجھے ذرا جلدی چھٹی دے دینا۔ امر بھیا!"

"ارے بھگوان نے چاہا تو کل اسی وقت تک تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!" امر سنگھ کی آنکھیں ہی نہیں سارا جسم چمک اٹھا تھا۔

"بس بس بیٹا،" اور جیب سے بیڑی نکالتے ہوئے بولے: "تم اٹھو، اب اپنا کام کرو۔"

"اچھی بات ہے! لیکن ایک بار میں اُسے دیکھ تو لوں؟" کہتے ہوئے امر سنگھ اٹھا۔ آئینے میں دیکھ کر صافا ٹھیک کیا۔ دھوتی کو کھینچ کر نیچے سرکایا۔ کوٹ پہنا اور ہاتھ میں پیسے کی موٹھ والی چھڑی سے منڈاسی سیدھی کر بولا: "لو چلو!"

کواڑ لگا کر دونوں سڑک پر آ گئے۔ بس اسٹینڈ پر کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ امر سنگھ کے ایک ہاتھ کی انگلیاں مونچھوں سے کھیل رہی تھیں۔ بیموں کی پھانک جیسی اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک تھی۔ امر سنگھ نے دور سے بس کو آتے دیکھ لیا اور کنڈکٹر کی آواز "دو آدمی!" سنتے ہی دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ منوروا کو چڑھا کر خود اندر گھسا۔ دو جوان جو بہت دیر سے کھڑے تھے ان میں سے ایک جماہیاں لیتے ہوئے بولا:

"دیکھا نا، ٹھاکر کا رُعب! کون کہتا ہے کہ راجپوتی رانڈ ہو گئی؟"

دوسرے نے منہ چڑھا کر جواب دیا: "راجپوتی تو رانڈ نہیں ہوئی۔ لیکن بیچارہ راجپوت رنڈوا ہو گیا ہے!"

چلتی ہوئی بس میں امر سنگھ نے ان دونوں کی طرف فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اور وہ کٹ گئے۔

دروازے میں کھٹ کھٹ ہوئی تو جھمکو اٹھی اور منوروا کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

"ذرا پانی تو بھر لا بیٹیا۔" منوروا نے اندر گھستے ہوئے کہا۔

لٹیا لے کر باہر نکلتے ہوئے جھمکو کی نظر امر سنگھ پر پڑی اور اس کا دل کانپ اٹھا نہ جانے کیوں؟ مگر لٹیا لے کر اسے اوپر جاتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن جائے بغیر چارا بھی نہیں تھا!

جھمکو پانی پلا کر دوبارہ لٹیا بھرنے گئی۔ امر سنگھ نے کہا۔

"یہ تو بلبل جیسی، کاکا، ایسی خوبصورتی تو . . ."

منوروا بیچ ہی بول پڑے: "خوبصورت ہے اسی لیے تو . . ."

امر سنگھ نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا: "بھگوان چاہے تو کل ہی تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!"

پھر ذرا سوچ کر بولا: "کیا بتاؤں اگر تم نے مجھے دو چار دن پہلے خبر دی ہوتی . . ."

"جو ہوا سو ٹھیک ہی ہوا، لیکن تم ذرا جلدی سے طے کرا دو تو اچھا ہے۔"

منور دا نے کہا۔ ان کا دل ٹھکانے نہیں تھا۔

"ارے یوں!" تھکتے ہوئے امر سنگھ نے چٹکی بجائی۔ سردی کا زمانہ تھا، پھر بھی اُسے دوبارہ پیاس لگی۔ بولا: "کہاں گئی؟ کیا نام ہے اس کا؟ جھکو، ذرا پانی تو لا۔"

جھکو کے ہاتھ سے لٹیا لیتے ہوئے امر سنگھ اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پانی پینے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے، کھڑا ہو گیا۔ منور دا اُسے نیچے تک پہنچانے آئے۔ جاتے ہوئے امر سنگھ نے کہا:

"ہو سکا، تو آج ہی شام کو آؤں گا۔ کاکا!"

"ہو کیا سکتا؟ ہونا ہی چاہیئے امر بھیا!" کہتے ہوئے منور دا واپس آ گئے۔ آ کر دیکھا تو جھکو گدے پر پڑی تھی۔ منور دا بیٹھ گئے تو بولی:

"کاکا، گھر کب چلو گے؟" اور حسرت آمیز نگاہوں سے منور دا کی طرف دیکھنے لگی۔

منور دا بولے: "پاگل تو نہیں ہو گئی بٹیا۔ گھر کس کے پاس جانا ہے؟"

جھکو جواب کیا دیتی؟ منور دا کی طرف اسے دیکھنے لگی جیسے آر پار دیکھ رہی ہو اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے!

منور دا ذرا دم لے کر بولے: "گھر رہنے کے قابل رکھا ہوتا تو میرے سر پر یہ آفت ہی کیوں آتی!"

"کچھ بھی ہو — یہاں نہیں رہنا ہے..." کہتے کہتے جھکو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منور دا آپے سے باہر ہو گئے، "تو یہاں کیا جھک مارنے آئی تھی؟ کیا مجھے یہاں کا ڈر کھانا ہے۔ یہاں؟"

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کھڑے ہو کر بولے: "مجھے کیا کرنا ہے! جھگڑتا ہے تو میں لے چلوں گا، لیکن جب آئے ہیں تو ذرا شہر تو دیکھ لیں۔ یا یوں ہی، چلو! چلو!..." اور بیڑی سلگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جب شام کو منور دا واپس آئے تو جھکو ساڑی کا کونا منہ میں دبائے پلنگ پر پڑی تھی۔ منور دا بولے: "چل، اٹھ، کچھ کھا پی لے۔"

جھکو کے منہ سے نکلا: "مجھے بھوک نہیں لگی۔" لیکن منور دا کے ڈر سے وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ کھانا کھا کر واپس آتے ہوئے منور دا جھکو کو شہر کی چہل پہل اور رنگینیاں دکھانے لگے۔

سامنے والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منور دا نے کہا: "انھیں دیکھا جھکو؟ کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر جا رہے ہیں، دونوں میاں بیوی ہیں! یہاں

کسی کو گھونگھٹ و گھونگھٹ نکالنا نہیں پڑتا۔ سب اپنے اپنے گھر کے رکھوالے!"

"آگ لگے ایسے جیون میں!" جھکو نے منہ بنا کر کہا۔ کمرے میں آنے کے بعد جب منور دا کو خوش خوش دیکھا تو جھکو بولی: "اچھا اب تو دیکھ لیا کاکا! چلو کل گھر چلیں!" "ابھی کل تو ہو جانے دے!"

کچھ دیر بعد جھکو نے پھر پوچھا: "گاڑی تو رات کو بھی جاتی ہوگی؟ کیوں کاکا؟"

منور دا کچھ دیر اس کی طرف گھورتے رہے۔ جھکو نے دیکھا یا نہ دیکھا یہ تو وہی جانتی ہوگی، لیکن ان کی آنکھ میں غصے کی ایک ہلکی سی لپٹ ضرور آئی تھی جو جلد ہی دور ہو گئی۔ کچھ گمبھیر آواز میں بولے:

"دیکھو جھکو۔ تو بچوں کی طرح نخرے کرتی ہے، یہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ اسی لیے تو میں نے وہیں سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تھا نہیں تو..."

جھکو نے بات کاٹ کر پوچھا: "کیوں کاکا، میری ماں کو معلوم ہے کہ میں یہاں آئی ہوں؟"

"اری پگلی۔" منور دا نے ایک لمحہ کے لیے جھکو کی طرف دیکھا اور ٹھنک کر بولے "ایک بار کہہ تو دیا کہ اسی نے تو اس آفت میں ڈالا ہے، نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی۔"

جھکو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگی "ماں مجھ سے ملنے بھی نہ آئی۔"

منور دا اداس ہو کر بولے: "اری کم عقل، [illegible] کس کی ماں اور کس کی بیٹی! یہ اپنی خوش نصیبی جان کو تیری ماں اتنی بھلی نکلی... اور مجھے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔" اور پھر منور دا نے خوب نمک مرچ لگا کر ساری باتیں کہہ سنائیں کہ تیری ماں رات کو میرے گھر آ کر کس طرح گڑگڑائی، کتنی روتی بلکتی رہی، اور جب میں نے بٹیا کو ٹھکانے لگانے کا وعدہ کر لیا تب اٹھ کر گئی! ساتھ ہی جھکو کو میکے، سسرال اور رشتے ناتے والوں کی مخالفت کا خوف دلا کر یہیں رہ جانے کی نصیحت کی اور ہمت بندھائی۔ شہر میں جو سکھ ہے اس پر بھی لکچر دیا۔ نتیجہ مگر وہی ڈھاک کے تین پات!

جھکو بولی، "بھاڑ میں جائیں، جہیں رکھیں گے تو کنواں تھے؟ لیکن واپس لوٹ چلو کاکا۔ میں تمہارے پیر چھوتی ہوں!" اور سچ مچ وہ منور دا کے پیروں پر گر پڑی۔ منور دا ایک دم آگ بگولا ہو گئے، "اٹھ، یہاں سے!" ان کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں، "بہت تنگ کیے بیٹی، سالی کمین کی ذات جو ٹھہری! ذرا نرمی سے کہا تو سر پر چڑھ گئی۔ جانتی نہیں... یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا، پھر روتی پھرنا اپنے باپ کو۔" آتے ہی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور منور دا الدم چپ ہو گئے۔

رات گئے تک امر سنگھ کا راستہ تکتے سو گئے!

× × × × × ×

صبح ہوتے ہی امر سنگھ آ پہنچا۔ منور والے کواڑ کھولے۔ امر سنگھ اندر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں نکلے تو ہو شگون دیکھ کر!"

"ایسا!" کہہ کر منور والے نے اسے آنکھ مارتے چپ کرا دیا۔ خاموشی سے ایک دو آوازیں دے کر جھمکو کو جگایا لیکن جواب نہ ملا۔ امر سنگھ کو آہستہ بولنے کی ہدایت کر کے منور والے نے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

امر سنگھ بولا "ایک بار خریدار کو دکھانا پڑے گا" لیکن یہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"اسے یہاں کیسے لایا جائے؟ اگر کوئی ....!"

"یہاں تو سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں اس میں کیا بات ہے!" منور والے نے فوراً کہا۔

"امر سنگھ کچھ سنبھل کر بولا" ذرا بات تو سن لو! ہندو دھرم شالا میں مسلمان اگر آ جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں لیکن اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو جائے تو آفت آ جائے گی!"

پھر منور والے کے چہرے پر عجیب تاثرات کا اتار چڑھاؤ دیکھا جا سکتا... بولے۔ پورے چھ سو مل سکتے ہیں کاکا!"

"اچھا؟" منور والے بولے۔ امر سنگھ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ غور کر رہے ہیں لیکن اس کی پروا کیے بغیر جھمکو کی طرف آنکھیں پھیراتے ہوئے بولا۔

"مال تو اصلی ہے اس لئے جھٹ پٹ کھلا کر لینا!" کچھ توقف کے بعد بولا،

"لیکن سوچتے کیا ہو؟ اسے میرے گھر لے چلو دوپہر سے پہلے ہی تمھیں چھٹی مل جائے گی ساہوکار بھی...."

"ہاں ہاں ٹھیک سوچا اس کام میں جتنی جلدی چھٹکارا ملے اتنا ہی اچھا ہے" منور والے بولے، دل میں کچھ سوچ کر۔ چہرے کے تاثرات بھی بدلے جا رہے تھے۔ امر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھمکو کو جاگتا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ منور والے نے بڑی نرمی سے جھمکو سے کہا۔

"چلو بیٹا جا کر منہ دھو لو!" جھمکو ہاتھ منہ دھونے چلی گئی [illegible] امر سنگھ دیکھتے رہے۔ امر سنگھ نے کہا بڑی محنت

کر کے اور پالی پوسی بیٹیا کو بیاہنے کے بعد ہی سو جانے دیتا ہے۔ لیکن منور والے کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں تھا۔

"کہاں گئی وہ؟ کیوں ناحق دیر لگا رہے ہو کاکا؟"

منور والے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جھمکو نہا دھو کر واپس آ چکی ہے اور باہر کوٹھڑی کے پاس کھڑی ہے۔

انھوں نے امر سنگھ کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"اچھا تو پھر بلاؤ جلدی" امر سنگھ نے بہت اکتا سا گیا۔

"بلاتا ہوں!" کہہ کر منور والے اٹھے لیکن دروازے کے پاس سے ہی واپس آ گئے۔ منور والے کے اس برتاؤ سے زیادہ ان کے چہرے کے تاثرات نے امر سنگھ کو تعجب میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی منور والے نے قریب کھسک کر بیٹھتے ہوئے امر سنگھ سے کہا۔

"کیا مسلمان کے سوا کوئی دوسرا اپنی ذات کا خریدار نہیں مل سکتا؟"

"ارے اس میں کیا رکھا ہے۔ رام کہو یا رحیم بھگوان تو ایک ہی ہیں کاکا!"

"بات تو ٹھیک ہے بیٹیا، لیکن ہندو لڑکی ہندو کے گھر میں جاتی تو اچھا تھا!"

اگر چہ پانسو کی لالچ دے کر امر سنگھ نے اس مسلمان گاہک کی بہت تعریف کی لیکن کوئی بات منور والے کے دل کو نہیں لگی۔

"ایک ٹھاکر بھی ہے، لیکن وہاں سے بہت کم ملے گا۔"

"آخر کتنے؟"

"اس سے آدھے!"

منور والے ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے "ٹھیک بیٹیا آدھے ہی سہی لیکن دھرم تو بچے گا!"

امر سنگھ نے یہ دھرم ورم کی بحث چھوڑ کر بات کا رخ بدل دیا اور منور والے کے مذہبی عقیدے اور احترام کی تعریف کی۔ اُٹھتے اُٹھتے جیسے اسے کچھ ایک دم یاد آ گیا ہو۔

اس طرح بولا "میری سمجھ میں تو کاکا۔ پہلے اپنا عقیدہ.... اس سے آگے بات گھما کر روپے پیسے کے بارے میں، عزیز داری اور لین دین کے تعلقات پر اس کاروباری موضوع پر تھوڑا سا لیکچر دینے لگا۔ منور والے ہنس کر رہ گئے۔

"تم خود ہی کہو نہ بھیا!"

"میں کیا کہوں کاکا؟ تم خود ہی دیکھ لو کہ میں کتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہوں" اس کے ساتھ ہی امر سنگھ نے پولیس کی رشوت [illegible] میں آنے

مطلبے میں کہا نا کہانے کے بعد جیسے لڑکی کے نکلتے ہوئے ایک بار پھر منوروا نے اپنا غصہ جھکو پر اُتارا: "کھایا کچھ نہیں، یوں ہی پیٹ بجا رہے! کھانا نہیں تھا تو آئی کیوں تھی؟"

پھر اچانک خیال آیا کہیں جھکو موٹر وغیرہ کی زد میں نہ آجائے تو پکارنے لگی:

"چل — آگے ہو جا!"

جھکو آگے آگے چلنے لگی۔

دھرم شالے کے دروازے پر کھڑے ہو کر منوروا نے پھر حکم دیا "تو جا۔ اوپر کمرے میں کواڑ بند کر کے بیٹھ، میں ابھی آتا ہوں..."

جھکو کے جانے کے بعد منوروا اندر آئے، کواڑ بند کرتے ہوئے اُسے دیکھا اور پھر باہر جا کر کھڑے ہو گئے۔ راستے پر جمی ہوئی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ امر سنگھ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور حسنِ اتفاق، کچھ ہی فاصلے پر امر سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک آدمی اور اس کے ساتھ تھا۔

"کیوں کاکا۔ کیا کھڑے انتظار دیکھ رہے تھے؟ چلو جلدی اوپر" یہ کہتے ہوئے امر سنگھ آگے آگے ہو لیا۔

منوروا اپنا سر ملتے ہوئے اس طرح پیچھے پیچھے چلنے لگے جیسے سر میں شدید درد ہو رہا ہو۔ زینے کے پاس آ کر آہستہ سے امر سنگھ سے بولے "تم نے بڑی دیر..." لیکن باقی الفاظ "لو چلو—" کہہ کر دبا دیئے!

کمرے میں پہنچ کر امر سنگھ منوروا سے پہلے ہی جھکو سے کہنے لگا۔ "جا، نیچے سے پانی لے آ۔" اور اس کے چلے جانے کے بعد منوروا سے کہا:

"دیکھا صاحب، ہو نا کاٹھیاواڑی کبوتر!؟"

پھر منوروا کو آواز دینے لگا: "باہر کیوں کھڑے ہو کاکا؟ لو سگریٹ سلگاؤ!"

جیب سے سگریٹ نکال کر منوروا کی طرف بڑھا دیا۔

امر سنگھ پان چباتا بھول گیا اور اپنے ساتھی سے منوروا کی تعریفیں کرنے لگا۔ یہ بظاہر دیکھنے میں بہت سادے ہیں، لیکن کتنی ہی لڑکیوں کی زندگی بنا چکے ہیں صاحب! اور اپنی برادری میں تو انھوں نے کئی کنواریوں کے گھر بسا دیے، جن میں عورت نہ کیا، عورت کا کپڑا چھونے کو نہیں ملتا تھا۔" یہ کہہ کر امر سنگھ نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیا اور "پھو—او" کر کے دھواں اُڑا دیا! پھر کہنے لگا:

"ارے راجا، تمہیں بھی بہت پہلے گرم چپاتیاں ملی تھیں لیکن کاکا کا اب سوچا..." شاید اپنا یہ تعارف منوروا کو جیلوں کے بیوپاریوں کا سا لگا، اس لیے بیچ میں ہی بول پڑے: "اچھا امر سنگھ۔ اب یہ سب چھوڑو، مطلب کی بات کرو۔" اُن کے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے آثار اتنے صاف تھے کہ امر سنگھ سٹپٹا گیا۔

جھکو پانی دینے کے بعد دروازے کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور کچھ دیر بعد وہاں سے ہٹ کر کھڑکی میں پہنچ گئی۔ منوروا نے امر سنگھ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"رخصت کرو۔ اب!"

"تو پھر دیکھ لیا منتر بھیا؟" امر سنگھ آنکھیں جھکا کر بولا۔ اور منتر بھیا کی مسکراتی ہوئی شکل دیکھ کر بولا: میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں کچھ جھوٹ ہے؟"

اور کھڑے ہوتے ہوئے کہنے لگا: "اچھا تو چلو" منوروا کی طرف دیکھ کر "میں ذرا انھیں پہنچا دوں، آدھ گھنٹے میں آتا ہوں!" دونوں چلے گئے۔

ذرا دیر بعد منوروا نے جھکو کو بلایا۔ اُن کی آواز میں پیار اور نرمی شامل تھی: "جھکو، یہاں تو آ۔ بٹیا، کواڑ لگا دے" اور جھکو کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ منوروا نے جیسے ہی اس کی کمر پر ہاتھ رکھا وہ رو پڑی۔ سسکیوں میں کانپتے ہوئے جسم کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کا انگ انگ رو رہا ہے۔ شاید منوروا کے ہاتھوں میں، جو وہ اس کی کمر پر پھیر رہے تھے کوئی جادو کا اثر تھا کہ اس سے جھکو کی آنکھوں میں اشکوں کا طوفان اُٹھا آ رہا تھا، لیکن یہ طوفان اور اس کی لہریں ظاہرا اتنی معلوم نہ ہوتی تھیں۔

کچھ دیر تو منوروا نے اُسے رونے دیا، پھر بولے:

"دیکھ پگلی! اس طرح رونے سے کیا ہوگا؟ میری بات تو سن۔ ابھی جو سیٹھ آئے تھے اُنھیں دیکھا؟ بڑی جوڑ ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے گھر موٹر نہیں تو بگھی ضرور ہی ہوگی۔ ایسا ٹھکانا تو اُسی کو ملتا ہے جس نے ہزاروں گئو دان

کاؤں کیا ہو! سمجھی؟ اور آدمی بھی کیسا شریف اور سنجیدہ ہے۔
امر سنگھ بڑبڑ سے گیا لیکن وہ بھلا ایک لفظ بھی بولا؟ چپ ہو جا
بٹیا!" پھر ذرا ٹھہر کر بولے: "آج تو آنسو بہا رہی ہے لیکن جب
سکھ چین ملے گا تو منور کاکا کو پہچانے گی بھی نہیں!"
"بھاڑ میں جائے وہ سکھ!" جھکو آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی۔
"کیوں؟" کہتے ہوئے منوردا کی شکل دیکھنے کے قابل تھی۔
"یہاں نہ تو کوئی اپنا رشتے دار ہے اور نہ دکھ سکھ کی خبر لینے والا!"
جھکو سسک سسک کر رو دی تھی۔
منوردا بگڑ گئے: "یہ رنڈاپے کی بولی ہے؟" اور جھکو کی
طرف گھور کر بولے:
"مجھے سمبندھیوں نے رکھا ہوتا تو میرے سر پہ بلا ہی کیوں
آتی؟" آگے کچھ اور کہتے کہتے ہیں کہ کواڑوں میں کھٹکا ہوا اور
منوردا کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ امر سنگھ کو دیکھا تو
اطمینان کا سانس لیا۔
کیا یہ دن بھر رونق رہتی ہے کاکا؟" "یہاں ایسے تسلی
دینے والے تھوڑا ہی ہے!"
امر سنگھ نے جھکو کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ٹھیک کہتے ہو بھتیا!" منوردا کھڑے ہو کر بولے "چلو
رونے دو اتو کو، بیٹھے رو رو کر مر جائے" کہتے ہوئے باہر
نکل گئے۔
جھکو ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، وہ کہہ رہی تھی:
"لیکن میری بات تو۔۔۔"
منوردا اچانک دروازے کے پاس سے پلٹے اور آنکھیں
نکال کر دھمکاتے ہوئے بولے:
"بیٹھ وہاں۔۔۔"
"ابکی تم مجھے۔۔۔ چھوڑ کر۔۔۔"
اب کی منوردا کے بدلے امر سنگھ بولا: "اری تجھے چھوڑ کر
کیسے جائیں گے۔ میں کس لیے آیا ہوں؟ لے کر جائیں گے ری۔
بیٹھ، میں تیرے لیے تانگہ لے آؤں!" امر سنگھ یہ کہتا ہوا اور
ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔
"کواڑ بند کر لے" منوردا نے کہا۔ امر سنگھ منوردا کے ساتھ

ساتھ چلتے ہوئے آہستہ سے بولا: "اسے یہاں سے لے
پڑے گا کاکا!"
"اسی لیے تو میں تم سے جلدی کرنے کو کہتا ہوں"
"لیکن کاکا، یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے؟"
منوردا کو پریشان سا دیکھ کر امر سنگھ ذرا نرم لہجے میں بولا
"دیر تو ہوگی کاکا۔ اس سے پہلے تو تین سو روپیہ کا انتظام
کرنا ہے نا؟"
منوردا ذرا سوچ کر بولے: "کیا کہا، اس سیٹھ کے پاس
پیسا نہیں؟"
"ارے چلو، کاکا ذرا ہوٹل میں بیٹھیں" منوردا کی صورت دیکھ
کر راستے میں باتیں کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے امر سنگھ نے
مسکرا کر کہا۔
اور ایک ہوٹل کے کونے میں ایک میز بھی مل گئی جو ایسی ویران
سی پڑی تھی جیسے دوپہر میں جماہیاں لے رہی ہو۔
امر سنگھ نے بتایا کہ وہ آدمی کون ہے اور اسے کب پٹھان سے
روپے لینے ہیں نیز یہ کہ روپے ملنے میں دو ایک دن کی دیر ہوگی۔
"تم تو کہتے تھے امر سنگھ، کہ ٹھاکروں کے پاس دولت من
مانی ہے مگر عورت نہیں ملتی" یہ کہتے ہوئے منوردا نے غیض
آلود نگاہوں سے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔
"یہ تو ٹھیک ہے، مگر تم تو اچانک گھوڑے پہ سوار ہو کر آ گئے۔
کیا کیا جائے کاکا؟"
پھر چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے بولا:
"اب کی بار دیکھنا! بس ذرا۔۔۔۔۔"
"ارے بھلے آدمی! جو موجود ہے اس کا تو کچھ کر نہیں سکتے
اور دوسرے پھیرے کی بات کرتے ہو!"
منوردا طشتری میں چائے انڈیلنے لگے۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ
تم آج مجھے چھٹی دے دو گے۔ میں نے تو گاڑی جانے کا ٹیم بھی
پوچھ لیا تھا!" منوردا کے چہرے پر ناگواری اور اضطراب کے
خطوط ابھرے ہوئے تھے! جھنجھلاہٹ میں ہی طشتری خالی
کرتے ہوئے بولے:
"یہ دو دن میں نکالوں کیسے؟" پھر ذرا سوچ کر بولے "اگر [illegible]

گھرا پہنچ گیا تو....."

"یہ تو میں نے پہلے ہی سوچ سمجھ لیا ہے تم اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو اور خود مزے سے گھومتے رہو۔"

"تم اسے جا کر کہاں رکھو گے؟ اور اُسے کہیں چھپے لیے بغیر..."

"کیسی بات کرتے ہو کاکا! کیا میری کوٹھری میں جگہ نہیں ہے؟ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ میری عورت ہے!" پھر ہنس کر کہنے لگا:

"کاکا، گال جل گئے تو گپیں بہت بل جائیں گی!"

منوروا کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا، غصے میں تھے مگر دبا رہے تھے، کھڑے ہو کر بولے: "چلو، اٹھو یہاں سے"

دھرم شالا کے قریب آ کر امر سنگھ نے کہا: "اچھا میں جا کر تانگا لے لوں؟" اور چل پڑا۔ منوروا نے اُسے روکتے ہوئے کہا: ذرا ٹھہرو تو چلے آدمی!" اور پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا: "وہ تمہارے گھر جانا پسند نہیں کرے گی۔" پھر گول مول لفظوں میں، اس طرح کہ امر سنگھ کو بُرا نہ لگے یہ بھی جتا دیا کہ وہ بار بار یہاں نہ آئے اور جب روپوں کا انتظام ہو جائے تو اُسے تب ہی آ کر لے جائے۔ امر سنگھ کچھ مایوس ہو گئے۔

امر سنگھ نے جمنا کو لے جانے کے لیے منوروا کو ہر طرح سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ راضی نہ ہوئے بولے: "میں اُسے سمجھاؤں گا، کہوں گا کہ چل گھر جانے سے پہلے ایک بار پورا شہر دیکھ لیں، اس بہانے شہر میں گھماتا رہوں گا۔ شہر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی ہے!"

امر سنگھ نے ہنس کر بات اُڑا دی، لیکن اس ہنسی میں نا اُمیدی کی کتنی آمیزش تھی یہ تو اس وقت اندازہ ہوتا جب منوروا نے امر سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا ہوتا۔ جیسے ہر سو روپے کی نقد ملنے والی رقم سے زیادہ خوشی اوپر کے دس پانچ مزید روپوں کی ہوتی ہے ایسے ہی اگر امر سنگھ نے صفت میں دو چار دن مزے سے لوٹنے کی گھات لگائی ہو تو یہ کچھ غیر معمولی بات نہیں۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ منوروا جمنا کو اس کی کوٹھری پر نہیں بھیجیں گے تو اس نے یہ خیال ترک کر دیا: "اچھا، میں جاؤں کاکا؟" کہہ کر چلا گیا۔

"چلے!" منوروا اُسے جاتا ہوا دیکھ کر سوچنے لگے۔ اُس کا تعاقب کرتی ہوئی غیظ بھری نگاہیں گویا کہہ رہی تھیں: "یہ تو سالا بڑا حرام زادہ ہے" وہ دل میں سوچنے لگے: "کچھ بھی ہو، اس وقت تو وہ میری لڑکی کی طرح ہے" خود ہی بڑبڑانے لگے: "میرے سامنے بولتے ہوئے اسے شرم بھی نہیں آئی!" اتنے میں دیکھا کہ امر سنگھ واپس آ رہا تھا تو پوچھنے لگے: "کیوں واپس کیوں آئے؟"

"میں یہ کہتا ہوں" امر سنگھ قریب آ گیا اور دھیرے سے بولا "اگر تمہیں جانے کی جلدی ہو تو میں ایک اور راستہ نکالوں، اس سے کہوں گا کہ بھائی تو کسی بھی طرح شام تک کچھ روپوں کا انتظام کر دے، اور اگر وہ ڈیڑھ سو ایک روپوں کا انتظام کر دے تو تم لے کر آج شام کی یا کل صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤ۔ باقی پچاس، میں دیپ چند سیٹھ کے نام سے منی آرڈر کر دوں گا!" منوروا خاموش رہے، امر سنگھ پھر بولا:

"اگر تمہیں پسند ہو تو! مجھے تو کوئی جلدی نہیں۔ بلکہ مجھے تو تمہارے رہنے سے...."

"نہیں بیٹا نہیں، کہاں رہنے کی فرصت ہے" پھر ذرا سوچ کر بولے:

"ایسا ہی کرو امر سنگھ۔ باقی پیسے تم بھیج دینا۔ میں چلا ہی جاؤں....."

"تو پھر میں جلدی سے جلدی آتا ہوں اُسے مل کر۔ تھوڑی دیر شاید ہو جائے لیکن کام جلدی ہو جائے گا۔ تب تک اگر تمہیں کچھ خریدنا ہو تو تیار رہنا۔ جس سے..."

"ارے بیٹا، کچھ نہیں لینا ہے۔ تم یہ کام سر کر دو تو سب کچھ لینا دینا ہو ہی ہے!"

"بھگوان بھلا کرے گا تمہارا کاکا..." امر سنگھ کہتا ہوا چلا گیا راستے بھر اس کے دل میں یہ سوال اٹھتا رہا کہ بڈھا اتنی جلدی کیوں کر رہا ہے؟ جب منوروا دھرم شالا پہنچ گئے اور ایک آدمی سے کہا... ہنس کر جمنا سے بولے: "چل بیٹیا ذرا بازار میں گھوم لیں—"

"میں تو نہیں جاتی کاکا — تم گھوم آؤ —" کہتے ہوئے جھمکو نے سر جھکا لیا۔ وہ سوچتی تھی کہ شاید فوراً منورما اچھنبھا اٹھیں گے لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ منورما نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "ارے تجھے چھوڑ کر میں کیسے جاؤں؟ چل اُٹھ، پھر گاڑی کا ٹائم ہو رہا ہے، گھر نہیں چلے گی؟ یہاں تک آئے ہیں تو کچھ لیتے بھی چلیں!"

جھمکو نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن اس کی آنکھیں سوالی تھیں "کیا کچھ ہو کاکا؟"

"چل اُٹھ — میں ہنسی ٹھٹھولی کر رہا ہوں۔ آج رات کی گاڑی میں چل دیں۔ اُٹھ ہاتھ منہ دھولے —" منورما نے پھر کہا۔

جھمکو جھپاک سے کھڑی ہو گئی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں منورما نے لمبی سے ٹھنڈی سانس بھری۔

جھمکو نے اپنی ساڑھی کا پلا ٹھیک کیا اور الٹا ہاتھ ملتی ہوئی کہنے لگی۔ "تم ہاتھ منہ دھو کاکا، میں ابھی آئی —"

"میرے لئے کچھ پھلانا —"

جھمکو نے ہنس کر لٹیا جس ہاتھ میں تھی اُسے ہلاتے ہوئے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔

"اسی لئے تو لٹیا لے جا رہی ہوں!" اور ایک دم پھدک گئی۔

منورما اچھی طرح جانتے تھے کہ جھمکو میں اچانک اتنی پھرتی، آنکھوں میں اتنی شوخی اور چہرے کو گلنار کر دینے والی مسرت کیوں آگئی؟ کہاں سے آگئی؟ انھوں نے ہر چند ضبط کیا، ایک آہ سرد پھر بھی نکل گئی۔

"اس کی تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہوگا" بڑبڑاتے ہوئے اپنا صافہ کھونٹے سے باندھ رہے تھے کہ جھمکو آ پہنچی، بولی: "لو منہ دھو کر باندھو کاکا!"

"اچھی بات ہے — لا!"

اور خالی لٹیا لے کر جھمکو پھر پھدک کے چل دی، منورما نے ہنس کر کہا کہ "کس لئے پریشان ہوتی ہے، راستے میں پی لوں گا" لیکن وہ نہ مانی لوٹ آئی۔ کوٹھری بند کر کے دونوں نیچے اتر آئے۔ راستہ میں چلتے ہوئے جھمکو کے قدم، زبان اور نظریں برابر چلتی رہیں۔ کئی بار منورما کو ہدایت کرنی پڑی کہ وہ راستے کا دھیان رکھے اور زیادہ بولے نہیں۔

"تجھے کچھ لینا ہے؟" منورما نے پوچھا۔

"اُدہوں — مجھے تو کچھ نہیں لینا۔ لیکن تم کچھ نہیں لوگے کاکا؟ دکشنا میں پیسا تو چاہیئے بیٹا، کل چار روپے ہیں۔ دولیوں کا کرایہ بھی مشکل سے پورا ہوگا۔"

"تو پھر بازار میں کیا دیکھنے نکلے؟" کہکر جھمکو ہنس پڑی، ایک دوکان پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"کاکا، وہ دیکھو کتنی اچھی ساڑی ہے! منو بھیا کی بہو کے لئے ایک لے لو نا! کاکی بھی پہن سکتی ہیں!"

"لیکن پیسے تو ہوں گی!" پھر ذرا رک کر بولے: "تجھے لینا ہے؟ اگر تو لینا چاہے تو لے دوں!"

"کیسی باتیں کرتے ہو کاکا، جب گھر والوں کے لئے پیسے نہیں ہیں تو میرے لئے کہاں سے نکالو گے؟" پھر منہ چڑھا کر بولی: "تم نہیں لوگے تو میں لے لوں گی!"

"پیسے کہاں سے لائے گی؟" بات پوری کہہ بھی نہ پایا تھا کہ منورما نے جھمکو کو ساڑی کا پلو کھولتے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی: "ساڑی کے زیادہ سے زیادہ دو روپے لگیں گے وہ پھر بھی بچے!"

"تیرے پاس کہاں سے ....؟"

"مہاراج نے دیئے تھے کاکا ..." کہتے ہوئے جھمکو دوکان کی طرف مڑ گئی۔ لیکن منورما نے اُسے روکتے ہوئے کہا کہ: "اس وقت گھر میں ساڑی کی ضرورت نہیں۔ یہ پیسے اپنے ہی پاس پڑے رہنے دے!"

اس وقت تو جھمکو نے مان لیا لیکن کھلونوں کی دوکان آئی تو اس نے ایک نہ سنی اور مچل گئی۔

"نہیں کاکا۔ منو بھیا کے بچے کے لئے ایک کھلونا ضرور لوں گی اور ایک اپنے بھیا کے چھوٹے کے لئے ....." اور منورما کے بڑبڑانے کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے دو کھلونے خرید ہی لئے!

"چل چل — جلدی!" منورما نے کچھ کھسیا کر کہا۔

تمام راستے جھمکو بولتی رہی لیکن منورما چپ تھے! جب دھرم شالا میں پہنچے تو سورج کی لمبی کرنیں کہیں چھپ چکا تھا۔ جھمکو کوٹھری میں گھستے ہی کپڑوں کی تہ ٹھیک کرنے لگی۔ منورما نے اپنی دھوتی تہ کرتے ہوئے دیکھا تو بولے: "کیا کرتی ہے بیٹا، کل چلے گا آئیں۔ جلدی کیا ہے؟ کپڑے آکر باندھ لیں گے!"

"نہیں؟ تو بھوک ہی اڑ گئی کاکا! تم جاکر کھا آؤ۔ پھر گاڑی کا ٹائم ہو جائے گا!" دھوتی ٹھیک کرتے ہوئے جھمکو نے جواب دیا۔

"گاڑی تو آٹھ بجے جائے گی۔ چل اتنی دیر میں کھا کر نمٹ جائیں۔ یہاں کی ریشمی پوری کا مزا تو چکھ لے!"

آنکھیں سمیٹ کر اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے جھمکو نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن سچ کہتی ہوں کاکا مجھے بالکل بھوک نہیں۔ جاؤ تم کھا آؤ۔" پھر یہ خیال کر کے سر جھکا لیا کہ کہیں منوروا بھڑک نہ اٹھیں!

لیکن منوروا نے کوئی دھمکی نہیں دی۔ شاید یہ خیال کر کے کہ جھمکو کے ساتھ ان کی یہ آخری گھڑیاں ہیں، دھیمے لہجے میں بولے۔ "تو بھاڑ میں جائے۔ مجھے بھی نہیں کھانا ہے!"

آخر جھمکو کو جانا ہی پڑا۔

واقعی وہ کچھ نہ کھا سکی۔ اسے زندگی میں پہلی بار ریشمی کھانے کو ملی تھی مگر اسے خوشی سے کھا نہ سکی۔ وہ ہاتھ دھو کر بار بار اپنی تھالی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ منوروا بولے۔

"ابھی تو دو گھنٹے کی دیر ہے۔ جیسٹ ہو تو مہاراج سے پوچھ لے!"

جھمکو نے نہ کسی سے پوچھا نہ اس کی بے صبری کم ہوئی۔ دونوں واپس آ گئے۔ منوروا دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ جھمکو سے کہہ دیا۔ "تو جا، میں آتا ہوں!"

"تو میں پوٹلی باندھ لوں کاکا؟"

"ہاں ہاں جا، سر کیوں کھاتی ہے!"

منوروا کی آواز میں حرارت تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو جھمکو کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

"لیکن یہ تو میں بار بار پوچھتی ہوں اس لئے...." اپنے دل کو اس طرح سمجھا کر وہ مطمئن ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جھمکو پوٹلی لئے ہوئے نیچے آئی اور بولی، "لو چلو کاکا سب سامان گن گن کر باندھ لیا ہے۔"

"لیکن تجھ سے یہ عقلمندی کرنے کو کہا کس نے؟ چل اوپر — جا!"

منوروا چڑ گئے۔ ان کی آنکھیں پھر ارسنگ کے راستے پر منڈلانے لگیں۔

جھمکو ویسے ہی نرم لہجے میں بولی۔ "رات تو ہو گئی۔ اب چلو نا!"

"ابھی گاڑی کا ٹکٹ نہیں ہے بھور...." کہتے ہوئے منوروا آگے آگے ہو گئے۔ "چل اوپر چل!"

جھمکو بڑی مایوسی کے ساتھ پیچھے لوٹی اور سیڑھیوں پر اس طرح بادل ناخواستہ چڑھ رہی تھی جیسے موت کے منہ میں جا رہی ہو۔

منوروا اندر جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن جھمکو پوٹلی ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شاید اس نے گاڑی کی سیٹی سنی۔ اس لئے دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی اور ڈرتے ڈرتے بولی: "چلو نا کاکا اسٹیشن پر بیٹھیں گے!"

"اس نے تو جان کھا لی۔ نہ جانے مجھے یہ کیا حماقت سوجھی جو اس سے بات کی!" منوروا جھمکو کی طرف روکھی نظر سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ابے اسٹیشن پر کون تیرا باپ لڈو لئے بیٹھا ہے؟"

"پھر گاڑی چلی جائے گی تو؟" جھمکو روہانسی آواز میں بولی۔

"چلی جائے گی تو کیا سویرے دوسری نہیں ملے گی؟"

روتے روتے جھمکو مشکل سے بول سکی۔ "میں سمجھ گئی.... ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے.... چھوڑ رہے ہو!"

اور پھر سسکنے لگی۔

"کیا تو میرا فضیحتہ کرانا چاہتی ہے؟ یہاں بیٹھ کر رو لے جتنا رونا ہو۔ سنتی ہے یا نہیں۔؟"

جھمکو بستر میں لیٹ گئی۔ منوروا کمرے کے کواڑ لگاتے ہوئے بولے۔

"اب رو جتنا رونا ہے!" اور جھمکو بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"چپ، مر۔ نہیں تو گلا دبا دوں گا! سمجھی!!...."

جھمکو نے رونے پر قابو پانے کی کوشش تو کی لیکن اس کا سارا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے آمازدہ بلنے سے جسم میں طوفان گریہ بپا ہو گیا ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں زور سے سسکی بھی نکل جاتی تھی۔ منوروا کہنے لگے

"گھر جا کر کون سے اپنے ملنے کی بے قراری ہے؟ وہاں قدم رکھنے کا منہ تو ہے نہیں!"

"ہو یا نہ ہو، لیکن میں یہاں نہیں رہوں گی۔" پھر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد منوروا کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولی۔ "کاکا مجھے گاڑی میں اکیلا بٹھا دینا بس...."

"اتنی یاد رہے تو جا نا!.... کاکا کی کیا ضرورت ہے؟ پیسے تو تیرے پاس ہیں ہی!...." اور جھمکو کی طرف عجیب انداز سے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"بہادہا اُٹھ ۔ !!" جھمکو ڈرتے ڈرتے کچھ سنبھلی اور سسکیاں بھرتے ہوئے پوٹلی اپنی طرف کھسکا کر پوچھا۔

"تو جاؤں؟"

"کہاں ۔ ۔ ؟" کہتے ہوئے منور وا نے سینہ تان لیا گھوڑے کی طرح اُن کی گردن لمبی ہو گئی۔ ذرا سے ہنک لگتے ہوئے بولے "گلا گھونٹ دوں گا ۔ ہاں!"

پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں اس طرح کہنے لگے: "بیٹا پیدا کرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے ورنہ یہاں کتوں پر رستی چلی!"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے جھمکو بھی آنسو بہا بہا کر خاموش ہو گئی تھی منور وا اُٹھ کر باہر چلے گئے اور ایک آدمی سے پوچھا

"کیا بجا ہو گا بھیا؟"

"سات!" منور وا واپس آ کر کوٹھری میں قدم رکھتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

"یہ گھنٹہ بھی سالا کتنا لمبا بنایا ہے" جھمکو اپنے دونوں ہاتھ پیروں سے لپٹے ہوئے اور دونوں گھٹنے پر گال ٹیکے بے فکری سے بیٹھی تھی۔ بجلی کوندتی تھی تو اس کے گالوں پر کبھی رُکنے اور پھر بہہ چلنے والے آنسوؤں کی دھار چمک جاتی تھی۔ دبے ہوئے گریہ کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے حلق سے اس طرح نکل پڑتی تھی جیسے وہ ہچکیاں لے رہی ہو!

جس طرح شام کے وقت آسمان ہر ہر لحظہ رنگ تبدیل ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سامنے بیٹھے ہوئے منور وا کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے جھمکو سے کہا "اب چُپ ہو جا۔ ذرا مجھے تھوڑا پانی پلا دے" اُن کی آواز میں شفقت کی بجائے محبت کی آمیزش تھی۔

ایک بار تو اُن کی آواز سے جھمکو بے اختیار رو پڑی لیکن فوراً ہی اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے منہ سے آنسوؤں کو پونچھا اور لٹیا اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ پانی بھر کر لے آئی۔ منور وا نے اس سے پاس بیٹھنے کو کہا لٹیا خالی کر کے اپنے پاس ہی رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"دیکھ پگلی، تو ذرا سوچ تو سہی! میرا کیا بگڑتا ہے میں تو تجھے ابھی واپس لے چلوں لیکن شہر میں مزے سے گھومنا پھرنا، موج اڑانا، طرح طرح کے کپڑے پہننا یہ سب تجھے وہاں نصیب نہیں ہوگا! اور یہ بات تو سوچ کہ تو جا کر رہے گی کہاں؟ یہ بھی تو سوچ لے۔ موشٹا نے کہا تو میرا سالا ہے۔۔۔۔ لیکن پھر کیا کرے گی؟"

جھمکو کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی جھڑی بہ نکلی۔ بولی "پھر جہاں جاتا ہو گا چلی جاؤں گی!"

"آسی باسن کے پاس؟"

"نہیں ۔ ۔ ۔" اور پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

"تو پھر یہاں کیا بُرا ہے؟ مجھے بتا تو سہی" منور وا نے پوچھا۔

جھمکو کے منہ سے روتے روتے بمشکل یہ الفاظ سنائی دیئے "یہاں میرا کون بیٹھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نہ ماں ہے، نہ بھائی ہے!" منور وا کا کلیجہ دھک ہو گیا اور وقفہ بڑھ رہا تھا جھمکو سسکیوں کے درمیان بول رہی تھی "تم ہو لیکن تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔۔۔۔"

اور پھر کوئی لفظ وہاں سنی آواز میں سنائی نہ دیا آنسو پھوٹ نکلے!

منور وا دانت پیستے رہے تھے آنکھوں میں غصہ کی آگ اس طرح بھری تھی جیسے ابھی جھمکو کو بھسم کر دے گی۔ دو چار سیکنڈ تک گھورتے رہے پھر ایک دم اکڑ کر کھڑے ہو گئے اور جھمکو کا ہاتھ پکڑ کر لاٹھی کی طرف کھینچتے ہوئے بولے

"لے اٹھا، پوٹلی ۔" جھمکو سہم کر پوٹلی اٹھانے لگی منور وا پھر گرجے "لیکن یاد رکھنا اگر گاڑی سے نہ پھینک دوں تو میرا نام بدل دینا" جھمکو اُن کی خوفناک نگاہوں سے ڈر کر لٹیا اٹھاتی ہوئی بولی "اور تمہارا صافہ؟"

منور وا ہاتھ میں صافہ اٹھاتے ہوئے بولے "گاڑی کبھی ابھی لالٹین کی لی ہے۔ یاد رکھنا" لیکن جھمکو آگے بڑھ کر زینے تک جا چکی تھی۔

x x x x x

چلتے چلتے منور وا آفس کی کھڑکی کے پاس ٹھہر گئے اور کلرک سے بولے۔

"ہم جا رہے ہیں صاحب ساتھی رضائیاں سنبھال لینا" یہ کہہ کر مڑے ہی رہے تھے کہ کلرک کی آواز کان میں آئی: "کیوں پٹیل؟ فرانٹ کا روپیہ نہیں لوگے؟"

"وہ تو مہربانی ۔ لیکن گاڑی کا ٹائم ہو چکا ہے صاحب ۔ آٹھ بجنے میں کتنی دیر ہے؟"

"ابھی تو بڑی دیر ہے۔ لو یہاں انگوٹھا لگاؤ۔" کلرک نے کہا۔

منور وا کو تو انگوٹھا لگانے، باتیں کرنے اور روپیہ وصول کرنے میں ذرا بھی دیر ہوئی تھی لیکن اتنی ہی دیر میں دو روپے فرسٹ کے پاس

کھڑی ہوئی منوردا کے دل میں نہ جانے کتنی اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن میں دہشت شامل تھی وہ سوچ رہی تھی، ایسا نہ ہو بڑھے کی کھوپڑی پھر جائے۔" وہ منوردا کو واپس آتے دیکھ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی وہ چار لمبی لمبی ڈگیں بھر کے منوردا آگے آگے ہو گئے اور جھمکو اُن کے قدم بقدم پیچھے چلنے لگی۔ ابھی تک منوردا نے اس سے لڑنا بند نہیں کیا تھا۔ دھیمے لیکن غصہ بھرے لہجے میں بولے

"اگر وہاں جا کر ذرا بھی منہ چلایا تو زبان کھینچ لوں گا!"

جھمکو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برابر چلتی رہی۔

ٹکٹ خرید لینے کے بعد منوردا کا غصہ کچھ دھیما ہو گیا۔

"لے، چل۔ کچھ بھول تو نہیں آئی؟"

پیچھے چلتی ہوئی جھمکو نے سر ہلا کر انکار کیا لیکن شاید منوردا دیکھ نہیں سکے اس لیے پیچھے مڑ کر پھر کہا: "ایں؟"

"نہیں! سب گٹھری میں کس کر باندھا ہے!"

"وہ کھانے کے لیے؟"

"ہاں!" پھر ذرا رک کر بولی "لیکن سر پر صافہ تو باندھ لو!"

بغل میں سے صافہ نکال کر منوردا باندھنے لگے۔

"بہت تیز ہے گی، تب سے کس نے منہ پکڑ رکھا تھا، لے پکڑ، ذرا میں لپیٹ لوں!"

اور کھڑے ہو گئے۔

"چلو! اب گاڑی میں ہی باندھ لینا۔" نہ جانے کیوں منوردا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولے: "تیری ماں بھاگ نہیں جائے گی، لے پکڑ، ابھی تو بہت دیر ہے!"

اور صافہ باندھ لیا۔

ٹکٹ لینے کے بعد ٹکٹ چیکر نے جو سمت بتائی تھی اُدھر دونوں چلنے لگے جھمکو منوردا سے بھی تیز تیز چل رہی تھی۔ وہ چاروں طرف دیکھتی جاتی تھی پہلا ہی ڈبہ جو سامنے آیا اس میں گھسنے لگی تو منوردا بولے:

"آگے چل یہاں تو بھیڑ ہے۔"

جھمکو خوشی سے پھول رہی تھی اور منوردا کی بات پر دھیان دیئے بغیر شیلوں سے بچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی "کا ہوں دو آدمیوں کی جگہ تو تھی؟"

اُسے اب بھی یہ شبہ ہو رہا تھا کہ "میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دم کا کا، کا خیال پلٹ جائے"

جھمکو کو واقعی اطمینان اس وقت ہوا جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور جب گاڑی سیٹی دے کر چھک چھک کرتی ہوئی چلنے لگی تب تو اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے پایاں مسرت کی جھلک دیکھ کر منوردا بھی بغیر کہے نہ رہ سکے "بوگئی ماں کی!"

جھمکو کی آنکھوں میں فرط خوشی سے آنسو آ گئے۔ منوردا اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے گفتگو کرنے لگے کر اُن کی بیٹی جھمکو احمد آباد میں آ کر کتنی پریشان ہو گئی تھی۔ جھمکو کھڑکی سے سر نکال کر سامنے نظر آنے والی ملوں کی کالی کالی چمنیاں اور روشن بتیاں دیکھ رہی تھی!

× × × × × ×

گاڑی کا سفر بھی ختم ہو گیا۔ اسٹیشن کے پاس ایک دھرم شالا میں رات بھی گزر گئی اور اب موٹر کا انتظار ہو رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بظاہر منوردا کسی گہری فکر میں نظر آتے تھے لیکن جھمکو دو تین دن کے بہائے ہوئے آنسوؤں کی قیمت ہنس ہنس کر وصول کر رہی تھی۔ لیکن یہ بھی آخر کب تک؟ موٹر میں بیٹھ گئی، آدھا راستہ بھی کٹ گیا اور اب اُس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ کہیں موٹر ٹھیرتی اور منوردا اس سے کھانے پینے کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے پوچھتے تھے تو وہ ڈھنگ سے جواب بھی نہ دے پاتی تھی۔

اب موٹر ایک پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ جھمکو کھڑکی پر سر ٹکائے بیٹھی تھی مگر اُسے چھ سات کوس کے فاصلے پر کھاندا پہاڑ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پہاڑ کی گود میں بسا ہوا اُن کا اپنا گاؤں تو اُسے نظر نہ آنے لگا، سامنے ہی معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور سب کچھ دھل گیا۔

منوردا ابھی کسی گہری اُلجھن میں تھے۔ جب موٹر اُن کے گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی بھی پار کر گئی تب انھیں یکایک خیال آیا اور موٹر رکوا دی۔ دونوں مسافروں کو اتار کر موٹر آگے چلی گئی۔

"کیوں جھمکو اب کیا ارادہ ہے؟" پوچھتے ہوئے منوردا مسکرائے۔ جھمکو کے گلابی چہرے پر لمحہ بھر کے لیے بے بسی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس وقت وہ نہ ہنس سکتی تھی نہ رو سکتی تھی۔ منوردا پھر بولے۔

"کنوئیں سے نکل کر کھائی میں پڑی۔ اس سے کیا مل گیا؟"

اور غصّے کے ساتھ کہا "بہت ماں، ماں، بھائی بھائی کرتی تھی اب دیکھتا ہوں . . ."

جھمکو کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر پوٹلی کھولنے لگی۔

"پوٹلی کس لیے کھولتی ہے؟"

"تمہارے کپڑے اور دوسری چیزیں نکال دوں!"

"پھر کہاں جائے گی؟" منوردا نے پوچھا اور تلخ نظروں سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کچھ گمبھیر ہو کر کہا: "اپی بٹیا، وہ پٹواری تجھے کیوں لے گیا تھا؟ اور پھر کیوں بھگا دیا؟"

جھمکو خاموش رہی۔ منوردا پھر بولے "مجھ سے بات تو کر، اس نے تجھے نکال کیوں دیا؟"

"انھوں نے کہاں نکالا؟"

"تو کیا تو اپنے آپ بھاگ آئی؟"

جھمکو روتے ہوئے بولی: "نہیں اُن کے گھر والوں نے نکال دیا۔ وہ تو گھر تھے ہی نہیں!" اس نے ہر چند ضبط کیا مگر آنسو بہہ ہی نکلے۔

"کہاں گیا تھا وہ؟"

"کوئی بُلانے گیا تھا — وہاں سے پھر واپس ہی نہیں آئے۔"

جھمکو آنسو پونچھنے لگی۔

"تجھے بھی اچھی گھر آنے کی سوجھی!"

جھمکو کچھ نہ بولی۔ شاید منوردا بھی اس بات کے جواب کی توقع نہیں رکھتے یا پھر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ یہ لڑکی اپنی برادری کی بے رحمانہ سزا سے واقف نہیں تھی۔

"چل اُٹھ!" منوردا نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اپنے بعض خیالات کا جواب سوچ چکے تھے:

"تو ایک بار یہاں سے چل تو سہی پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا!" پھر ذرا توقف کر کے بولے۔

"چل، چل، باندھ لے پوٹلی!"

اُن کے چہرے پر کسی مستحکم فیصلے کے آثار نمایاں تھے۔

منوردا آگے تھے اور جھمکو اُن کے پیچھے چل رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور یہ دونوں، گاؤں کو بائیں طرف چھوڑ کر آہستہ آہستہ دائیں طرف جا رہے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد منوردا نے جھمکو کو کچھ سمجھایا۔ اگر کوئی پوچھے کہ کہاں گئی تھی؟ منور کاکا کہاں مل گئے؟ تو وہ کیا جواب دے یہ سب کچھ سکھلا دیا۔

ذرا دیر کے بعد — شاید اس سوال نے اُنھیں کریدا ہوگا، اس لیے جھمکو سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے: "کیوں بٹیا اگر میں تجھے موڑ سے اُتر کے اکیلا چھوڑ دیتا تو کہاں جاتی؟"

"کون جانے کاکا؟" جھمکو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"پھر بھی؟ اب اگر میں چلا جاؤں تو؟"

جھمکو کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس بات سے جھمکو ڈر جائے گی لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ اس نے بڑے مایوس لہجے میں جواب دیا: "مہاراج کے پاس جاؤں گی . . . دوسرا کون ہے؟"

دو چار لمحے بعد منوردا خود بخود جیسے اپنے ہی سوالوں کا جواب دے رہے ہوں۔ اس طرح بولے:

"مہاراج بیچارے کیا کر سکتے ہیں؟"

ایک دل بے پناہ غم و اندوہ میں اور دوسرا اپنے خیالات کی اُلجھنوں میں، اس طرح گھومنے تھے کہ آس پاس کی جھاڑیوں میں ہونے والی کھڑ کھڑاہٹ،

"گیدڑوں کی ہُواں ہُواں" یا تاریک رات میں مستانے ہوئے اُلّو کی "گھُوں گھُوں" اور کبھی کبھی سر پھاڑتے ہوئے کسی پرندے کی "ٹی ٹیں" کوئی بھی آواز ان کے کانوں تک نہیں جا رہی تھی۔ اب جھکّو کو اپنے جانے پہچانے درخت نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ان درختوں سے رخصت ہوتے وقت اُسے جتنا دُکھ ہوا تھا اتنا تو کیا اُس کا عشرِ عشیر بھی دوبارہ دیکھنے میں مسرّت نہیں ہو رہی تھی۔ سامنے تھا نظر آیا تو منورما نے مقررہ جگہ پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر الاؤ کا نشان بھی نظر نہ آیا۔ قریب جاکر دیکھا تو دُھونی ٹھنڈی پڑی تھی منظر سُنسان تھا۔ بغیر کسی کے بتلائے ہی دونوں سمجھ گئے کہ مہاراج یہاں نہیں ہیں کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

بیڑی سلگا کر منورما لیٹ گئے اور نرمی سے بولے: "بیٹا، تجھ جیسی بد قسمت تو میں نے ایک بھی نہیں دیکھی۔" پھر ذرا سوچ کر "اب چپ ہو جا۔ روتی کیوں ہے؟ مہاراج نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ہوں؟ اور مہاراج ہوتے تو بھی بیچارے کیا کرتے؟ ہاں دو دن آرام سے رکھتے ضرور۔ لیکن دوسری مشکلیں تو مجھے ہی سُلجھانا پڑتیں!"

منورما تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بیڑی کا ٹوٹا ایک طرف پھینکتے ہوئے اُٹھ بیٹھے، تن کر بیٹھ گئے اور جیسے کوئی خیال دل میں جم گیا ہو اس طرح بولے: "اری پگلی۔ ایسی تو کئی گتھیاں تیرے منور کاکا نے سُلجھا دی ہیں۔ وہ میرے سامنے کیا پنچایت کریں گے! چل اُٹھ کھڑی ہو جا۔" اور دونوں اُٹھ کر گاؤں کی سمت چلنے لگے۔ منورما کی اس بات نے اور جگمگاتے ہوئے تاروں کی نہایت معتدل روشنی میں نظر آنے والے اُن کے تنے ہوئے جسم نے جھکّو کی ہمت مضبوط کر دی۔

وہی گھاٹیاں، وہی کھیت، اُنھیں آوازوں اور دُور چلتے ہوئے الاؤ کو پار کرتے ہوئے دونوں اُسی مہوے کے نیچے آ کر رک گئے!

"یہاں بیٹھنا بیٹا۔ میں ابھی جا کر تیری ماں کو بھیجتا ہوں۔ اگر کوئی نہیں آیا تو پھر میں خود آتا ہوں۔" جھکّو کو ڈھارس دے کر منورما چلے گئے۔

× × × × ×

گاؤں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کتّے بھی کبھی کبھار بھونکنے کے بعد "کوں کوں" کرکے چپ ہو جاتے تھے۔ منورما اِدھر کا چھپر کھول کر چوپال میں آئے اور دھیرے سے اُسے جگایا۔

"او ہو ہو ہو۔ کون منور کاکا؟ تم؟ اس وقت کہاں سے؟" بھیرو آنکھیں مل کر کھڑا ہو گیا۔ منورما سے بیٹھ جانے کو کہا، "حقہ آج نہیں لائے؟"

"بھاڑ میں گیا تیرا حقہ۔" اتنے میں کواڑ کھلے اور بھیرو کی ماں باہر آئی۔ حیران ہو کر پوچھنے لگی: "کون؟ منور لالا، کب آئے؟ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تو میں ..... تھا ہے ....."

"میں تو سیدھا یہیں چلا آ رہا ہوں۔ فرش تو سب راضی خوشی ہیں نا؟"

"سب اچھے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں سے آئی ہوں۔" پھر کچھ بے تابی سے پوچھا "اِن منور لالا ..... وہ کلموہی ....؟"

منورما بگڑ گئے۔ "چولہے میں گئے تمہارے منور لالا مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ پوچھو نا اپنے لڑکے سے؟ بہن کی خبر لینے تو گیا ہوگا!"

"لیکن کاکا، تمھیں تو...."

منورما نے جھنجھلا کر بات کاٹ دی: "بیٹھ بیٹھ۔ آیا بڑا ہوشیار کا بچہ۔" پھر ایک دم ٹھنڈے ہو کر بولے "ارے پگلے! بہن کے لئے تو لوگ حسرت کرتے ہیں حسرت!"

"ارے لالا، میں نے تو بہت کہا کہ تو ذرا تلاش تو کر۔۔"

منورما نے بات کاٹی، "ارے تیری بہن نے ایسا کیا پاپ کر ڈالا ہے؟ تو کہے تو تیری برادری میں ایک ایک کا کان پکڑ کر کہلوا دوں کہ کتنے پانی میں ہے....."

"ٹھیک ہے کاکا۔ لیکن جب ساری برادری ہی پیچھے پڑ گئی ہو تو......"

"تجھ میں دم ہوتا تو کیسے پیچھے پڑ جاتی؟" پھر کچھ سوچ کر بولے "کہاوت ہے نا کہ "دبّو بنیا ریت اُدھار!" ذرا دبانا بھی آنا چاہیے!"

شاید ماں کی بے صبری کچھ بڑھ گئی ہوگی، پوچھنے لگی: "لیکن اب وہ کہاں ہے منور لالا؟"

"وہ تو بیٹھی ہے اس مہوے کے نیچے بیچاری ٹھنڈ میں ٹھٹھر رہی ہے۔ جلدی جا کے لے آؤ...."

"لیکن اتنے دن کہاں تھی؟" بھیرو نے پوچھا

جمنا جواب سننے کے انتظار میں کھڑی رہی، منوردا نے سوچا کہ وہ مہاراج واقعی تو ان کے کہتے تھے اور انھوں نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا یہ سوچ کر انھیں ذرا اطمینان ہوا۔ کہنے لگے: "سان میں تھی! وہ تو مجھے ایک کام سے دیوان صاحب کے پاس جانا پڑا اور رستے میں مل گئی نہیں تو اب تک تیری بہن بیٹھی ہوتی کسی میاں کے گھر!" ذرا رک کر پھر بولے۔

"اس دن جب ہوے کے نیچے نہیں ملی تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ضرور کسی ندی کنویں میں ڈوب مری۔ کمبخت نے ایسا ہی کیا ہوتا تو اچھا تھا!" پھر لمبی سانس لے کر بولے:

"یوں کہو کہ لوٹ آئی اور رستے میں ہی بھگوان نے تیرے باپ کی عزت بچالی۔ نہیں تو تیری کیا تیرے سارے گاؤں اور ساری برادری کی ناک کٹ جاتی!" جمنا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"لو، جاڑے آ ز آ سے!" اور کھڑے ہو کر پھر سے بولے: "دیکھو بھیرا ابھی یہ بات چھپی رہے تو اچھا ہے، کل تک تو کہیں تیری بڑی کا میں ٹھکانا کر دوں گا۔" پھر دھیرے سے بولے: "ارے پاگل اگر عقل نہ ہو تو کسی سے لینا چاہیئے۔ مجھ جیسا کون نٹھلا ہوگا جو گھر کا کام چھوڑ کر تیرے پاس دوڑ آئے گا۔"

یہ کہہ کر منوردا چلنے لگے۔

"لیکن کاکا، جب معاملہ ہاتھ میں لیا ہے تو اسے سلجھا ہی دینا ہے" یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ منوردا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا

"اگر میری بہن کو کہیں ٹھکانے لگا دو تو میں بھی بگڑی..."

منوردا کچھ ہنس کر بولے: "یہ تو میں جانتا ہوں کہ اب تو تو بگڑی عادت کا اور دو شالا بھی۔ لیکن پہلے کچھ نہ سوچا؟ اچھا جا آرام سے سو، بھگوان مالک ہے!" منوردا اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔

× × × × ×

جمنا چپکے سے چھپ کر گھر آ گئی۔ پیچھے کی بہو کو ان سب باتوں کا پتا لگ گیا۔ مگر اس نے کوئی حرف منہ سے نہیں نکالا۔ لیکن منوردا جیسے جیسے اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے ان کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیا حماقت ہوئی جو میں نے یہ دھندا اور لیا۔ اب تو پورا کرنا چاہیئے تھا" لیکن یہ تو لینے کی تھی پیٹ کھو آئی

خصم والی بات ہو گئی — دل ہی دل میں خرچ کا حساب کیا تو پہلے کچھ بیس روپے کی چاندی مفت میں نکل گئی! سوچنے لگے کہ زیور خریدنے کی بات تو دور رہی، یہ تو جیب سے اٹھ کر خرچ ہو گئے!"

کافی دیر تک دیوان کا کلکتہ لے رہے۔ تب گھر والی کی آواز آئی۔

"کون ہے، اتنی رات گئے؟"

منوردا کے منہ سے پورا جملہ بھی نہیں... "نکلا بھی نہ تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ گھر والی نے فوراً سوال کیا: "آدھی رات گئے کہاں سے...؟" اور بازپرس کرنے لگی۔ منوردا نے کچھ جواب نہ دیا، اپنا صافہ کھونٹی پر لٹکا دیا، اور چادر سے سوتی سوئی پڑی تھی کرتی اتار کر ایک طرف رکھی اور انگرکھا بھی اتار کر ہاتھ منہ دھونے کے لیے لوٹے میں پانی لینے نکلے — دھوتی کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے گھر میں آتے ہی پوچھنے لگے۔

"تب کچھ کھانے کو...؟"

"روٹیاں ہیں جوار کی! مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی رات گئے آؤ گے: نہیں تو بیلوں کو کڑھی نہ پلاتی۔"

"اچھا، جوار کی ہے تو رہنے دو! اب تو دودھ بھی کہاں بچا ہو گا؟"

"کیا دیکھ کر کہہ رہے ہو؟ پوچھتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔" گھر والی بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی، وہاں سے روٹیاں نکالیں، باہر کے چولہے میں دبے ہوئے انگاروں پر انھیں سینکنے لگی، ان پر تھوڑا سا گھی لگا کر لہسن کی چٹنی بھی رکھ لائی۔

منوردا نے ابھی آدھی بھوک بھی نہیں کھائی تھی کہ گھر والی نے پوچھا:

"کیا کرنے گئے تھے؟"

"کر کیا آئے۔ تو پوچھ پڑی تھی اس لئے ہو آیا اور کیا!" منوردا سر جھکائے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے بولے۔ کچھ دیر خاموش رہے لیکن گھر والی سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"کتنے لگے؟"

"بہت سارے!"

"پھر بھی؟"

منوردا نے ہاتھ دھوتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے گھر کی طرف دیکھ کر کہا: "اس کی کون فکر ہوتی ہے پگلی!" پھر خود ہی ہنسے اور بولے "اٹھ ذرا تمباکو لا۔ میں تو تھک گیا، خواہ مخواہ پریشان ہو گیا!" اور حقے میں پانی ڈالنے

کے لئے باہر نکل گئے۔

گھر والی تپائی لے کر واپس آئی۔ اور اس سے ضبط نہ ہو سکا وہ منورما کے انگرکھے کی جیب ٹٹولنے لگی۔ اس میں سے دو چار بیڑیاں ایک ماچس اور ایک آدھ روپے کی ریزگاری نکلی۔ سامان بھی کھول کر جھٹکا، کہ شاید اس کے کسی پلو میں زیور بندھے ہوں۔ لیکن اس کے بھی چاروں کونے خالی! یہ دیکھ کر منورما نے پوچھا:

"سامان کیوں جھٹک رہی ہے؟"

"یوں ہی۔ میں نے سوچا کچھ ہو تو ٹھکانے . . . ."

منورما ہنس کر بولے "سالی عورت کی ذات، صبر کا تو نام نہیں!"

اور پھر حقہ بھرنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر والی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی منورما نے سبقت کی "پہلے پوری بات تو سن لی ہوتی! یہ پوچھا ہوتا کہ کہاں کہاں گئے تھے کیا کیا کر آئے۔ لیکن تو کر لگی ایک دم . . ."

"کس دن تم نے پوری بات کی اور میں نے نہیں سنی؟ . . ." کہتے ہوئے منورما کی بیوی اپنا سمیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کہو تا ؟" ابھی ابھی تو منورما نے بہلا دیا تھا مگر اس وقت ان کے سامنے بیٹھی ہوئی ان کی گھر والی نے ان کی عقل گم کر دی۔ اسے سمجھانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں گھٹنوں کے درمیان میں حقہ رکھ کر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے رہے۔ حقہ پیتے رہے اور مسکراتے رہے!

"بولو نا! کیا کر آئے؟" گھر والی نے پھر پوچھا۔

"خاک کر آئے۔ کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا! اور کیا؟" اور کیا؟ کہہ کر پھر اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگے۔ منورما کے چہرے پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر گھر والی کو غصہ تو نہیں آیا لیکن اس نے ذرا چڑ کر کہا:

"احمد آباد گئے تھے یا نہیں؟ صاف صاف بات کرو جس سے کچھ سمجھ میں آئے!"

منورما اب بھی چپ رہے تو اس نے پھر کہا: "یا پھر وہ چڑیل کہیں بھاگ گئی؟"

"بھاگ گئی ہوتی تو بھی اچھا تھا!" منورما نے کچھ مایوس لہجے میں کہا۔

اب گھر والی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا: "آگ لگے تمہاری اس عادت کو۔ سیدھی بات بھی نہیں کرتے!" اور منہ چڑاتی ہوئی، گھی کا لوٹا لے کر کھڑی ہو گئی۔

منورما نے دیکھا گھر والی کے غصے کا درجہ حرارت ہی نہیں بلکہ اس طرح بڑھنے لگا!

"اچھا، ذرا چوپال میں پلنگ تو بچھا دے۔ آرام سے سو تو جاؤں۔ جماہی آ رہی تھی اسے قصداً لمبا کر کے "ہو — ہا — آ — آ" کر کے کہنے لگے "آنکھیں بھی نہیں کھلتیں!" اور واقعتاً ان کی پلکیں کسی بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ منورما کے یہ سب عذر باعث سچے تھے یا جھوٹے لیکن یہ حق ہے کہ وہ جگو کے واپس آ جانے کی "منحوس" خبر زیادہ سے زیادہ دیر میں سنانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے بھرپور رخصت اور کم سے کم آدھے دن تک گھر والی کا ذہن ہموار کرنے کی ضرورت تھی اور پھر اس پر بھی گھر والی مانے گی یا نہیں؟ یہ ایک مستقل سوال تھا! اگر اسے ضد سوار ہو گئی اور اس نے ہنگامہ شروع کر دیا کہ جگو کو ٹھکانے لگانے کا معاملہ اور بھی الجھ جائے گا۔

گھر والی نے جھنجھلا کر کہا: "گئے تھے بڑی کمائی کرنے۔ یا آدھی رات تک کیا جھک مارنے آئے؟ کہیں اور پڑ رہتے!" اور۔ ایسے ہی بڑبڑاتی رہی۔ چوپال میں پلنگ بچھا دیا اور الاؤ میں آگ بھی سلگا دی۔ غصے میں وہ زور سے لکڑیاں توڑ توڑ کر الاؤ میں ڈالنے لگی۔ منورما نے سوچا کہ آج یہ رات بھر نہ سونے دے گی اور نہ سوئے گی۔ مگر اس وقت اس نے اچھا چھوڑ بھی دیا تو سویرے ڈھوروں کی آفت آئے گی اور ان پر غصہ اتارے گی۔ رضائی اوڑھتے ہوئے کہنے لگے: "سویرے اٹھ کر بامن کو سیدھا "تونیا" کر، مجھے سلامت عزت سے گھر واپس آ گیا!"

"تو نہیں تو؟"

"نہیں تو اب تک اندھیری کوٹھری میں بیٹھا ہوا چکی چاب رہا ہوتا!" منورما نے بات کو الجھانا شروع کیا۔ گھر والی بھی ایک دم ایسے ٹھنڈی ہو گئی جیسے کسی نے برف میں غوطہ کھلا دیا ہو۔

"آ تو ہو آیا؟ . . . . کچھ بات بھی؟"

"بات تو کروں گا ہی! لیکن اس وقت اتنا ہی بس ہے! ٹھیک ٹھاک ہو جانے دے پھر آرام سے سب بتا دوں گا!!"

نتیجہ منورما کی منشا کے مطابق ہی نکلا۔ گھر والی نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا ابھی کوئی ڈر ہے؟" منورما نے صبر دلاتے ہوئے کہا

"ایسا تو نہیں، پھر بھی چوکنا رہنا بھی ضروری ہے۔ اور بات تو تیرے سوا کسی کو بتانا ہی نہیں!"

اگرچہ اس سے گھر والی کو ذرا ڈھارس ہوئی لیکن ساتھ ہی الجھن بھی پیدا ہو گئی۔ وہ معاملے کی وضاحت کے لئے کوئی

سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ منوروا نے پھر ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے کہا،

"جا، سو جا، ذرا رضائی کو پیروں کے نیچے دبا لی جائے"

اگر گھروالی اس وقت الجھن میں پڑی ہوئی نہ ہوتی تو رضائی دباتے ہوئے پوچھتی۔ وہ کہتی کہ "تم سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا!"

گھر کے کواڑ بند ہونے کی آواز کانوں میں آئی تو منوروا کو اتنا اطمینان تو ضرور ہوا کہ "نہ سا جھگڑو کا ٹھکانا ہو جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا!" لیکن اس اطمینان کے بعد بھی نیند کے آثار کوسوں نہ تھے! جھگڑو کا سوال برابر ذہن میں گھوم رہا تھا۔ اور اسے حل کئے بغیر نیند کیسے آسکتی تھی؟

منوروا کی گھروالی بھی شاید سو گئی ہوگی۔ گاؤں اور گلیارا سب سنسان تھا۔ کبھی کبھی جاڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے کسی کتے کی کنناہٹ یا کھیتوں کے کسی رکھوالے کی ہانک ضرور سنائی دیتی تھی لیکن وہ بھی رات کی اتھاہ تاریکیوں میں کہیں گم ہو جاتی تھی!

"اوہو، ہو، ہو۔ میں بھی گھر چھوڑ کر جنگل میں بھٹکنے گیا تھا" بڑبڑاتے ہوئے منوروا اٹھ بیٹھے جیسے کسی ناقابل بیان طمانیت نے انہیں اندرونی گرمی پہنچا دی ہو۔

اس طرح سردی سے بے پرواہ ہو کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے! پاؤں لٹکا لئے اور آگ کی طرف ہاتھ کر کے سینکنے لگے جو راکھ کی رضائی اوڑھے الاؤ میں پڑی تھی!

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے —

جب وہ حقہ بھرنے کے لئے اٹھے تو الاؤ کی مدھم آنچ سے نظر آنے ان کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کسی بڑی مشکل کا حل تلاش کر کے سکون حاصل کر چکے ہوں! خود بھی بڑے سکون سے پیا — پھر رضائی اوڑھتے ہوئے بولے "سب برابر ہے — اب تو جھگڑو ارے گی!"

کچھ ہی دیر بعد ہوا کا ہو گیا اور نکسے بولنے لگے "گھروار — ہُوں — گھروار —"

× × × ×

علی الصباح جب منوروا چوپال کے چبوترے پر بیٹھے داتون کر رہے تھے۔ اس وقت پیار کی مستی سے بھرپور زندگی کا لطف اٹھاتے ہوئے کبوتر سامنے والے مکان کی منڈیر پر بیٹھے اپنے پر پھیلا کر سردی اتار رہے تھے۔

گاؤں میں ابھی چائے کا رواج نہیں تھا ہاں کبھی کبھار شوقیہ بنالی جاتی تھی۔ منوروا کو آج یہ شوق کرنے کی سوجھی۔ چائے میں شکر ہی ہو، کچھ ضروری نہیں۔ گڑ سے بھی کام چل جاتا تھا اور چائے کی پتی بارہ مہینے کے خرچ کا حساب لگا کر ہی لائی گئی تھی۔ رہی دودھ کی کمی۔ سو گھر کی گائے بھینس تھی کسی سے مانگنے نہیں جانا تھا۔ ستو ابھی کھیت سے نہیں آیا تھا اور اپنے چاپا تو کھیت پہ ہی پڑا رہتا تھا۔ اس لئے منوروا کو خود ہی پتیلی چڑھانی پڑی۔ چائے میں ڈالنے کے لئے ادرک چھیل رہے تھے کہ اتنے میں دیا اور ایک پڑوسی آ پہنچا۔ دیا نے چائے کا "چارج" سنبھال لیا۔ ابھی چھان ہی رہا تھا کہ دو آدمی اور آ پہنچے۔

چائے کی کٹوریاں بھرتے ہوئے دیا نے کہا:

"کٹوری کی جگہ آدھی کٹوری بن گئے!" چائے ایسے مزے میں سڑ سڑ کر کے پی جا رہی تھی کہ راستہ چلنے والا بغیر دیکھے ہی جان جائے کہ آج منوروا کاکا کے گھر چائے بنی ہے۔

کسی کی فرمائش سے پہلے ہی حسب معمول منوروا نے خود ہی چلم اٹھائی۔ اس کا توا صاف کیا۔ گُل جھاڑی اور تمباکو رکھ کر چلم بھر لی۔ اب حقہ تیار تھا۔

تمباکو جل گیا، تو دوسری چلم بھری گئی۔ کسی نے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ منوروا نے اسکول کے بارے میں سوالوں کے مناسب جواب دے کر گاؤں کی باتیں شروع کر دیں۔ آخر انہیں کہنا ہی پڑا۔ ایک پڑوسی جوان سے بولے،

"ارے شنکریا، ذرا اپنا حقہ تو اٹھا لا، مجھے گاؤں میں ۔۔"

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے منہ سے "جانا ہے" نکلے، دیا بول پڑا "ارے تمہیں کہاں فرصت ہے۔ ہم بھی اپنا کچھ کام کاج کریں گے!"

منوروا نے بیٹھنے پر اصرار کیا، دو چار چلموں کی بقدر تمباکو بھی الاؤ کے پاس رکھ دیا لیکن کوئی بیٹھا نہیں۔ منوروا نے بھی کمری پہنی اور اپنا حقہ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔

گھومتے پھرتے اسماعیل حسن کے گھر آ گئے۔

امبا نے "آؤ لالہ" کہہ کر منورما کا سواگت کیا اور موتی سے جو لالہ کے پاس بیٹھا کچھ بنا رہا تھا کہا "ابھی رہنے دے، پہلے کا کا گھڑا بھر دے!"

امبا ڈھوروں کو چھوڑ کر آنگن میں سے گوبر اٹھانے لگی۔ منورما نے کہا:

"امبا بھابی تمہاری قسمت میں یہ گوبر کوڑا ہی لکھا ہے؟"

تعجب تو یہ ہے کہ امبا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرے پر کچھ غمگینی ضرور چھا گئی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پہلی، "چل ہوتی۔ یہ ڈلیا اٹھوا دے!" اور ڈلیا لے کر گھر میں ہوتی ہوئی باڑے میں نکل گئی۔ ہاتھ بھی آنگن میں نہیں دھوئے۔ باڑے میں ہی کہیں دھو آئی پھر جلدی جلدی دونوں کر کے پانی کا گھڑا لے کر چل دی۔ منورما نے کہا:

"کیا ناراض ہو گئیں بھابی؟ بیٹھو تو سہی مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" پھر موتی کی طرف دیکھ کر بولے، "کیوں رے موتیاں تجھ سے دو گھڑے پانی بھی نہیں بھرا جاتا؟ اتنی سردی میں بے چاری بڑھیا کتنا کام کرے گی؟"

موتی کھڑا ہو کر بولا "ماں نے تب نہ کہا کا؟" پھر ماں کی طرف بڑھا اور کہا: "لا میں بھر لاؤں، کھیت بھی دیکھتا آؤں!"

"لے، تُو جا!" لفظ "تُو" پر زور دیتے ہوئے امبا نے پانی کا گھڑا موتی کو دے دیا۔ پہلے آنگن میں بندھے ہوئے بچھڑے کو کھول کر گھر میں باندھ آئی۔ واپس آ کر منورما کے پاس بیٹھ گئی۔ منورما نے پھر وہی سوال کیا:

"اپنے آپ کیوں دکھی ہو رہی ہو؟ آخر کیا بات ہے، کچھ بتاؤ تو؟"

"کیا دیکھ کر پوچھتے ہو؟" امبا نے ناراض ہو کر کہا۔

"تم کو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے یہ بیچارے مجھے اچھی لگتی ہے!"

"تو پھر اور کیا؟" منورما نے امبا کی طرف دیکھا جو انھیں غصہ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی پروا کئے بغیر کہنے لگے "یہ تو ٹھیک ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں لیکن دو برس بعد یہ سب کچھ کون سنبھالے گا؟ کیا تم زندگی بھر موتی کا ساتھ دے سکو گی؟"

"سو جب آن پڑے گی تو جھک مار کر سب کرنے گا، مرنے کے بعد میں تھوڑی ہی دیکھنے آؤں گی!"

منورما اداس ہو کر "تم نے ہی ایسی باتیں کر کے کام بگاڑا ہے، نہیں تو..."

"بس چپ بیٹھے رہو..." کہہ کر امبا نے سر جھکایا اور کہنے لگی "نہیں تو میرے منہ سے اور کچھ نکل جائے گا۔" پھر منورما کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی،

"میں نے کیا کر کے بگاڑا ہے؟ بولو؟... جسے دیکھو مجھ پہ ٹوٹ پڑتا ہے!"

امبا کے ناراض ہونے کی پروا کئے بغیر منورما نے پھر کہا:

"تم نے نہیں تو کیا شہر نے بگاڑا ہے؟"

پھر ذرا توقف کر کے بولے "بھگوان کی بیٹا کو یہ تو ورا اٹر ایسی ہے ویسی ہے" کہہ کہہ کر کھو دیا اور سمپیل والے ہرا کی بہن سے بھی نہ جانے کب سات پیڑھی اوپر کی دشمنی لے کر بیٹھ گئی!" پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولے "اس طرح دو دو میں کیڑے نکالتی ہو۔ اب تمہیں بتاؤ کون تمہارے دروازے پر آئے؟"

"نہیں آئے تو جانے دو ہونی میں!" امبا کہتے ہوئے کچھ رکی اور ذرا ٹھنڈی ہو کر بولی،

"میں تو اپنے لڑکے کو ایک بار اچھی طرح بیاہ چکی ہوں" ایک ٹھنڈی سانس زور سے بھر کر بات جاری رکھی "لیکن بھگوان کو کچھ اور ہی کرنا تھا۔ اس کی تقدیر میں ہوگی تو دوسری مل جائے گی۔ نہیں تو..."

"اس طرح تو ضرور مل گئی!" منورما کا چہرہ کچھ سخت ہو گیا۔ امبا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اسے روک کر بولے "تمہاری ان باتوں نے ہی تو سب کچھ بگاڑا ہے۔ میرا جیسا کوئی بات لانے بھی تو کیسے لائے؟ کوئی کچھ نہیں لاتا" اداس ہو کر امبا نے کہا "سب کو دیکھ لیا سب میٹھی میٹھی باتیں بناتے ہیں!"

منورما ان کر بولے "یہ بات ہے دیکھتا ہے؟" اور کچھ رک کر بولے، "تو آج رات میری موتیاں کو لگائی کرا دوں؟ ہے منظور؟"

ہوشیار امبا شاید سمجھ گئی ہوگی، بے آواز سا قہقہہ مار کر بولی:

"ہو گی کوئی جس کا کہیں ٹھور ٹھکانہ نہ ہوگا!"

منور روا اماں کی طرف دیکھ کر ہنسے اور کہنے لگے "اگر کسی کا کسی پر
یقین ہی نہ ہو تو اس کا کیا علاج؟" اماں خاموش رہی۔ تو منور روا نے پھر کہا
"موتیوں سے جتنا مجھے پیار ہے۔ اتنا نہیں تو اس سے کچھ ہی کم مجھے بھی پیار
ہو گا، اماں! تو شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں سب بھول گیا ہوں، لیکن... !"
منور روا کی اس "تم" میں اور ان گول گول باتوں میں نیز دل کی
گہرائی سے نکلنے والی آواز میں ماضی کی کوئی مبہم یاد چھپی ہوئی تھی۔ اماں
نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "اسی لئے تو موتیاں کی اتنی فکر رکھتے ہو"
منور روا اس طنز کو سمجھ گئے۔ بولے "جی تو بہت چاہتا ہے لیکن
تجھ سے بھی نہیں کہا جا سکتا!" اور مسکرانے لگے۔
منور روا نے اماں کی ترچھی نظر ملا، بس کچھ دیکھا اور پہچان لیا!
آنکھوں میں بڑا لطیف طنز تھا۔ شرم و حیا کے گہرے بادلوں میں محبت
کی مستی کا چھوٹا سا چھپا ہوا تھا۔ منور روا کی آنکھوں میں ان کی پرچھائیں اتر
آئی لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھنڈی سانسیں یوں نکلنے لگیں جیسے وہ ان
نیچے جھکی ہوئی چار نگاہوں سے نکل رہی ہوں۔
اتنے میں موتی پانی لے کر آ گیا اور وہاں سے پوچھ کر پھر گھبرا کے کر
چلا گیا۔ منور روا نے بھی حقہ ایک طرف سرکا دیا۔ منور روا اب ٹھہر ٹھہر کر
بات کرنے لگے:
"تو کچھ تو گئی ہو گی کہ میں جھکی کی بات کر رہا ہوں لیکن یہ سمجھتا کہ یہ
کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ اس بے چاری کا ایسا کون بیٹھا ہے جو مجھے
بھیجتا؟ بھائی بھاوج کو تو جانتی ہے اور ماں بیچاری کو تو رہنے کے
بھی لالے پڑے ہیں!"
اماں کا چہرہ پھر بدل گیا۔ غصے میں بولی: "یہ کہو کہ کوئی نہیں ملا۔
اس لئے موتیاں یاد آیا!"
منور روا کا چہرہ بھی کچھ سخت ہو گیا: "تو یہ سمجھتی کہ منور ڈھونڈتے ڈھونڈتے
تھک گئیں اور کوئی نہ ملے۔ اس سے پہلے کیا موتیا کی بہن کو ٹھکانے نہیں لگایا؟"
کچھ توقف کر کے: "اور تمہاری اسی بات کے ڈر سے تو آنے کی ہمت نہیں
پڑتی۔ یہ سوچا کہ تم لاکھ کوشش کرو، پھر بھی ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔ ذرا
دیکھوں موتیاں کی قسمت زور مارتی ہے یا نہیں — اور چلا آیا —
ملنی پھر رہی کو ٹھکانے لگانا کچھ مشکل بات نہیں ہے تم کہو تو ٹھکانے
لگا کر دیتا ہوں!" پھر منور روا نے ادھر ادھر گاؤں کے دو چار
بڑھیوں کے نام گنوا دیئے اور بولے "تم ہی بتاؤ ان میں سے کون سا بڑھی

انکار کرے گا؟"
اماں کسی سوچ میں پڑ گئی۔ منور روا نے پھر کہنا شروع کیا "کیا کہتا ہوں
اماں بھابی، ایسی اچھی لڑکی دوسری نہیں ملے گی؟"
"اچھی تھی اسی لئے تو رانڈ نے دنیا کو تماشا دکھایا!"
"اسی لئے نہیں، یوں کہو کہ بیچاری باتوں میں آ گئی۔ اگر اس کا نصیب
اچھا ہو تو کیوں بیچاری کا ایسا فضیحتا ہوتا۔ سسرال میں گھر والا اور ساتو کسی بات
میں ساتھ کو حرج کی آرزو میں تھا اور میکے میں ایسی ہے کہ جلتی کی بھاوج ملی!
اس لئے غریب چاروں طرف سے پریشان ہو گئی اور اسی زمانے میں اس کی
سے آنکھ لڑ گئی — بھاگا تھا اس سے منہ چھپا کے — پھر تو بھاگ ہی جاتی ہے؟"
اور پھر منور روا نے لگ بھگ سارے پڑھیوں کا کچا چٹھا پڑھ سنایا، اور بولے
"اماں بھابی، یہ تو دھرتی ناپاکی ہیں جو کبھی کرتے رہتی ہیں!" پھر ایک لمحہ
رک کر بولے "کیا تم نے بار دیکھا ہم میں ایسی باتیں تو اپنی برادری میں کچھ بری
بھی نہیں جاتیں!"
"لیکن وہ ہے کہاں؟"
"تمہیں اس سے کیا؟ — وہ بیٹھی ہے میرے گھر میں۔ یہ تو اتفاق کی
بات ہے جو میں آگیا نہیں تو اب تک کسی مسلمان کے گھر میں ہوتی" منور روا کے
اس جملے نے سامنے رکھی ہوئی اماں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ اس نے دو چار
سوال پوچھے جن کے جواب منور روا نے صاف کر دیئے اور پھر کہنے لگے:
"ہاں تو پھر کیا ارادہ ہے، بولو؟ کہو تو آج کا دن بھی اچھا ہے۔ آج ہی رات
کو......"
"یہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے والوں سے جو دشمنی......"
منور روا سے نہ رہا گیا، بولے: "تبھی تو پار سال جب بیمار پڑیں تو بھائی
اور بھاوج پوچھنے دیکھنے گئی تھی! یوں ہی ہوا کا جھکا رہنے جاتی ہو۔ اور یہ
کوئی تمہاری سگی بھتیجی تھوڑی ہے۔ اور ہو بھی، تو مجھے اس میں کوئی برائی
نظر نہیں آتی۔ دوسرا آدمی آ جائے، اس سے اچھا موتیاں کیا کمائے گا؟"
اتنا کہنے پر بھی اماں جب چپ کر رہی تو منور روا نے طعنہ دیا، "میکے کی
محبت تھی اسی لئے تو وہ چنچنے پہلے آئے گھر میں گھسنے کو تیار
ہو گئی تھیں!" اماں اس طعنے سے تلملائی تو بولے: "تم
یہ نہ سمجھنا کہ یہ ساری باتیں مجھ سے چھپی ہوئی ہیں۔
بھیجیا کے ساتھ تمہاری دشمنی تو جب سے ہی ہوئی
ہے؟"

میں سب جانتا ہوں!" منور رما مسکرانے لگیں۔ اسما ذہن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس طرح بولی جیسے چاروں طرف سے چوکنا ہو کر بول رہی ہے: "تم کتنا ہی کہو، لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔" پھر منور رما کی طرف دیکھ کر کہنے لگی: "موتیاں کو نگاہ کرنے میں میکا چھوڑنا پڑے گا یہ تو ٹھیک! لیکن برادری مجھے چھوڑ دے گی کیا؟

بڑھیوں کی ذات کو تم نہیں جانتے، ایک تو ڈیڑھ دو من گھی کھا جائیں گے، اس پر برادری سے نکال بھی دیں گے!" سر ہلا کر کہنے لگی: "نہیں لالا، نہیں پہلے ہی میرا لڑکا بغیر نگائی کے رہے لیکن...."

منور رما بولے: "برادری کا ذمہ میں لیتا ہوں!" اور اسما کی طرف ذرا جھک کر کہا۔

"تم دو من گھی دینے کو تیار ہو نا؟ پھر اس سے زیادہ کیا کھائیں گے وہ؟ تم سمجھتی ہو گی کہ وہ جرمانہ مانگیں گے لیکن برادری کا ذمہ لیتا ہوں" اور اسما کی طرف ذرا جھک کر کہا

"تم دو من گھی دینے کو تیار ہو نا؟ پھر اس سے زیادہ کیا کھائیں گے وہ؟ تم سمجھتی ہو گی کہ وہ جرمانہ مانگیں گے لیکن برادری کے رواج سے زیادہ دینا پڑا تو میں اپنے پاس سے دوں گا۔ اور کہو؟ اب بھی کوئی خطرہ ہو تو دل سے نکال دو!"

اسما چارسی ہو کر بولی: "کیوں مجھے جھنجھٹ میں پھنساتے ہو؟ ایک تو اس کے بھائی بھاوج ڈرتی ہیں، اس پہ....."

"تبھی تو تم نے اس دن ساری رات ہماری نیند حرام کر دی تھی، میں نے تو اسی دن سمجھ لیا تھا کہ یہ سب کچھ اسما بھابی میکے والوں کے لئے نہیں بلکہ سسرال والوں سے دشمنی میں کر رہی ہیں!" منور رما ہنسے۔ پھر بولے: "لیکن اُن بیچاروں کو تو خوشی ہو گی اور اگر نہ ہوئی، تو میں بیٹھا ہوں، تم ڈرتی کیوں ہو، تمہیں کیا فکر...؟"

"مجھے کیا فکر؟ اچھی بات ہے، اتنے برس بعد موتیاں کے باپ من کر آئے ہو تو کرو سب کچھ!" اور منور رما کی طرف دیکھ کر شوخی سے بولی:

"میں ایک پیسہ نہیں دوں گی!"

"تم نے آخر مجھے کیا سمجھ رکھا ہے! میرا وقت ہوتا تو یہ بھی کر کے دکھا دیتا۔"

اسما خاموش تھی۔ منور رما اس کی طرف دیکھتے رہے، دونوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں!

منور رما سے بغیر کہے رہا نہ گیا: "اسما بھابی، وہ دن نہیں بھولتے!" اسما کو منور رما کی آنکھوں میں کوئی جانے پہچانے جذبات نظر آتے ہوں اس لئے، یا پھر "اُن دنوں" کی یاد کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کا ڈر ہو، خواہ خاص بات کے ادھوری رہ جانے کا خطرہ ہو۔ بہرحال اُس نے تنگ کر کہا: "چھوڑو بھی اِن باتوں کو۔ اب یہ باتیں کیوں نکال رہے ہو، خاص بات کرو، نا؟"

منور رما نے کہا: "اب بات میں باقی ہی کیا ہے!" عین اسی وقت موتی پانی کا گھڑا لئے ہوئے اندر آیا۔ اُسے دیکھ کر منور رما نے کہا: "اس موتیاں کی جگہ کل میرا پانی بھر رہی ہو گی۔" اور کہا: "۔۔لیکن" اسما کے "لیکن" کی تشفی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اور منور رما اُسے لچھمی جیسی بہو کی تعریف کر کے اُلجھائے رہے تھے۔

اسما نے بھی اقرار کیا: "کیا میں اُسے جانتی نہیں؟ یوں تو وہ رانڈ ایسی ہے کہ دشمن کو بھی پیاری لگے!"

"اور پھر تو تو اس کی ساس ہونے والی ہے تجھے کیا پیاری نہیں لگے گی؟" کہہ کر منور رما اُٹھے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے، "تو پھر بات پکی نا؟ آج رات کو...."

"جب تم سارا بوجھ اپنے سر لینے کو تیار ہو تو میں کیوں انکار کر دوں؟ لیکن ذرا موتیاں سے پوچھ تو لو...."

"اس سے کیا پوچھنا ہے؟" پھر ہنس کر کہا: "ہاں اگر اس کے کانوں میں یہ بات ڈال دی جائے تو اچھا...." پھر اسما کی طرف دیکھا "نہیں تو اچانک جھمکو کو دیکھ کر پاگل ہو جائے گا!" پھر ہنسنے لگے۔

"اچھا، اب چپ چاپ گھر چلے جاؤ، نہیں تو میرے منہ سے کچھ نکل جائے گا!"

لیکن شاید منور رما کو کچھ "سننے کی خواہش تھی"، یا اور کوئی بات ہو گی، وہ اسما کو دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔ اسما کڑی ہو گئی اور کہنے لگی: "سچ کہا ہے کہ بندر بوڑھا ہو جائے مگر قلابازی نہیں بھولتا!" منور رما طول ہی طول میں خوش ہوتے رہے۔ کچھ خیال آتے ہی حقہ سنبھالا اور اسما کو رات کے لئے سب تیاریاں کر رکھنے کی ہدایت دے کر باہر آ گئے۔ اُن کے چہرے پر طمانیت اور بشاشت کے آثار تھے۔

× × × × × × ×

کھانا کھانے کے بعد فوراً بیچ سے گھر پہنچے اور گھر کے اندر جا کر جھمکو کا

نام لے کر جھوٹے سے آواز دی۔ جھمکو کسے پڑ پڑ رہی تھی، اس طرح اُتری جیسے آسمان سے بادل اُتر رہا ہو پھر کچھ شکایت بھرے لہجے میں بولی: "آج تجھے کسے ہو گا؟"

"لو بولو۔ اری تیرے لئے تو ابھی تک ٹھیک رہا تھا۔ لو اور پھٹ" جمنا بیچ میں ہی بول پڑی، "کچھ ٹھکانا ہوا؟ کون سے گاؤں گئے تھے؟"

"دیپچریا کہاں گیا؟ وہ آ جائے تو بتاؤں گا!" پھر جھمکو کی طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"جمیا تو کس نے کوٹھے پہ پڑھی تھی؟ خیر اب بہت دنوں چڑھنا نہیں پڑے گا!" پھر آس پاس دیکھنے لگے۔ جمنا شاید پیچھے کو ہی جا نے لگی تھی منورو نے چپکے سے جھمکو سے پوچھا:

"ابے جھمکو؟ اگر تیرے کپڑے گاؤں میں پہنوا دیں تو؟"

جھمکو نے شاید اسے مذاق سمجھا ہوا اس نے منہ پھلا کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا:

"ہونہہ! گاؤں میں کہاں؟"

"یہاں بڑھیوں کے پانچ سات گھر تو ہیں نہیں؟ جو تو پوچھ رہا ہے!"

جھمکو کے چہرے پہ جو سرخی دوڑ گئی اُسے تو منورو اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکے لیکن اس کی آنکھوں کی چمک اُنہیں ضرور نظر آ گئی اِن آنکھوں میں جو قلبی طمانیت، شرم و حیا اور حیلے سے پیدا ہونے والی ادا تھی وہ۔۔

منورو نے بھانپ لی۔ جھمکو کچھ ٹھٹک کر بولا:

"جاؤ جاؤ کاکا! میری ہنسی اڑاتے ہو؟" اس کی آواز ذرا لڑکھڑا گئی تھی ہوئی تھی لیکن منورو کو اس میں بڑا مزا آیا وہ پیٹھ پھیر کر بولے:

"نے تو میں چلا، مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا، ماننا نہ ماننا تیرا کام ہے" اور باہر نکل آئے جھمکو نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں اور کنیا کے پاس سے اس طرح بار بار گردن اُٹھا اُٹھا کر جھانکنے لگی جیسے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو وہ دراصل باہر ہونے والی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منورو پھر اندر آئے اور جھمکو سے کہنے لگے:

"یقین نہیں آتا تو اپنی ماں سے پوچھ لے!"

"اچھی بات ہے" جھمکو نے کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور ساڑی کا پلو چبانے لگی۔ منورو ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

x x x x x x x

اور گاؤں والوں کے حیرت و استعجاب کے درمیان ہی اسی

رات جھمکو کا بیاہ موتی سے کرا دیا گیا کسی نے تو جھمکو کی تعریف کی جو دولہا اور دُلہن دونوں کے باپ بنے پھر رہے تھے اور کوئی یہ کہہ کر ہجو بلیغ کر رہا تھا کہ "منورو کا بڑے فطرتی آدمی ہیں، اپنی بات کے پکے نکلے نہ جانے جھمکو کو کہاں سے پکڑ لائے۔" کھیتی کا زمانہ تو تھا نہیں اس لیے گاؤں کی جوانیاں مستی بھری آوازوں سے اپنے اپنے آنگنوں میں میٹھی سُریلے گیت گا رہی تھیں۔ کوئی مبارک باد دینے آتا تھا اور کوئی جلے دل سے شادی کی مٹھائی لے کر چلا جاتا تھا۔ برادری میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں: "موتیاں نے یہ جھگڑا اپنے گھر میں بٹھا کر کچھ اچھا نہیں کیا! پکی بات ہے نمٹنا تو ساری پنچایت کا ہے" وغیرہ۔

سب سے پیچھے منورو ابھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے نکلے اور گھر آ کر کھٹیا پر لیٹ گئے۔ اُن پر پنچایت کی ایسی فکر سوار تھی جیسے وہ گھوڑوں پر چڑھی بھاگی چلی آ رہی ہو اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے خراٹے بھرنے لگے لیکن خواب میں بھی بڑھیوں کی پنچایت ہی نظر آ رہی تھی چونکہ عالم بیداری میں تھی وہی خواب میں بھی سوار رہی وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ بھی سہی لیکن آخر معاملہ پنچایت کا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنچایت جھمکو کو واپس کرا دے!

x x x x

صبح ہوئی تو منورو پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلا سوال تو اُن کی بیوی نے ہی کیا۔ منورو نے گھر والی کا منہ دیکھا تو پھول کر کُپا ہو گئے۔ اس نے چائے کے لیے دودھ دیتے ہوئے پوچھا: "بتاؤ تو سہی کہ آخر اتنے دن کہاں رہے؟ اور خالی ہاتھوں کیوں واپس آ گئے، آخر کیا بھید ہے؟ لوگ تو کہتے ہیں تم جھمکو کو کسی مسلمان کے پاس سے چھڑا کر لائے ہو۔ یہ سب کیسی کیا اُڑ رہی ہیں کچھ بولو تو۔۔۔۔"

منورو انٹ سنٹ بکنے لگے: "یہ تو کہوں گا ہی! ذرا صبر تو کر۔ پہلے گھر کے کام کاج تو نمٹا لے۔"

گھر والی غصے میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بکنے لگی، "صبر کیا کرے تمہارا سر! محصول کے روپے تھے وہ بھی اُڑا کر آ گئے۔ چاندی

بعد آنے اپنے ابا کو کیا جواب دو گے؟ ....."

اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور گھر والی وہاں سے سرک گئی، لیکن بڑبڑاتے جا رہی تھی: "میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ اسے بھگوا.....ن، اگر موت دے دے تو میں اس آفت سے چھوٹ جاؤں!"

"کیا ہے بھابی؟ کیوں گرم ہو رہی ہو" کہتا ہوا ویرا اندر آگیا۔ اس وقت منورا نے اس کے آنے پر دل ہی میں ایسی خوشی محسوس کی جیسے بھگوان آ گئے ہوں!

بھابی نے اندر دالان میں سے ہی جواب دیا: "چولھے میں گئی تمھاری بھابی اور بھتیا...." منور وا نے چائے کا "تھا رح" ویرا کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "یوں ہی بک رہی ہے بڑبڑانے کی جو عادت ہے وہ تو مرنے پر ہی چھوٹے گی!" لیکن ویرا نے چائے پیتے ہوئے پھر سوال کیا تو دہی؛ لیکن منور بھتیا، یہ لڑکی تمھارے ہاتھ لگی کیسے؟"

منور وا تاڑ گئے کہ ویرا کے اس سوال میں بات "نفع" کی چھپی ہوئی ہو، خیال تو آیا کہ کہہ دیں "شاید اس میں دو چار آنے کے منافع کا لالچ ہو گا مگر بھیا اس سودے میں تو اُلٹا گرہ سے دینا پڑتا ہے!" مگر انھوں نے اتنا ہی کہا: "ہاں بتاؤں گا، مگر ذرا یہ برتن اُٹھا کر رکھ دے۔" پھر حقہ بھرنے میں لگ گئے۔

یہ دونوں وہاں سے اُٹھ کر چوپال میں آئے ہی تھے کہ اتنے میں جھکو کی ماں اور بیجو بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد اور بھی دو چار اکٹھے ہو گئے۔ کلو بھی کھیت سے آگیا تھا وہ بھی منور وا سے کیے جانے والے سوال جواب سُننے کو وہیں بیٹھ گیا۔

"ہاں منور کاکا، کچھ بتاؤ تو کہ جھکو کا ہوا کیا تھا؟ ہم نے سُنا ہے کہ کسی مُسلمان کے ہاتھ سے چھڑا لائے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ ایک آدمی نے پوچھا۔

"کہتا ہوں بھیا کہتا ہوں۔ ذرا حقہ تو پینے دو۔" منور وا حقہ پینے لگے۔

ایک عورت نے جھکو کی ماں سے پوچھا "جھکو کب آئی تھی اور یہ لاگ کیسے لگا دی؟" مگر جھکو کی ماں کیا جواب دیتی اس نے خود ہی جھکو کو بہلا پھسلا کر باتیں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے سبے سر و پا قصے سُنانے شروع کر دیے تھے!

"میں اُس دن رات کو وہاں بھوسے کے نیچے نہیں بیٹھی تھی؟ وہاں سے میں نے جہاں آج کے مندر کا راستہ پکڑا۔ مندر کے پاس پہنچتے ہی انھوں نے مجھے بلا لیا تھیں دن تک تو اپنی سگی بیٹی کی طرح رکھا لیکن مجھے یہ ڈر لگا کہ

کوئی تاڑ جائے گا اس لیے وہاں سے بھاگ نکلی راستے میں ایک مُسلمان ملا وہ مجھے چکنی چپڑی باتوں میں لگا کرے جا رہا تھا کہ راستے میں منور کاکا مل گئے اور گھر واپس لے آئے!" جھکو ایسی ہی انٹ شنٹ باتیں بک رہی تھی کہ بیجو نے مزید وضاحت کے لیے کچھ پوچھا تو بتانے کی بجائے رونے لگی اور روتے میں ہی بولی: "سب مل کر کیوں میری جان کھاتے ہو؟" پھر تو گھر والوں نے بھی سوال کرنے بند کر دیے۔ لیکن جھکو کی ماں اگر کوئی سارا قصہ کیسے سُنا سکتی تھی؟ گاؤں والے تو فقط اتنا جانتے تھے کہ جھکو پٹواری کے ساتھ بھاگنے کے بعد آج پہلی بار گھر واپس آئی ہے۔

اور اب منور وا نے بات شروع کی: "یہ تو اچھا ہوا بھیا۔ کہیں راستے میں مل گیا، گاؤں کی تو خیر لیکن دھرم کی عزت بچ گئی، نہیں تو......"

"کیسے منور بھیا.....؟ پوری بات بتاؤ جب ہی تو سمجھ میں آئے نا؟" کہتے ہوئے ویرا سبب جاننے کے لیے چوکنا ہو گیا۔

منور وا کو پوری بات کرنے میں کیا دیر لگتی؟ کہنے لگے: "میں دوپہر کو دیوان صاحب کی کچہری سے فارغ ہوا اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ کھانڈا پہاڑ کے پاس آیا تو سورج ڈوبنے لگے ایک تو میں اکیلا، پھر کھانڈا پہاڑ کا راستہ! میں نے لمبی لمبی ڈگیں بھرنا شروع کیا۔ ابھی گھاٹی میں گھسا بھی نہیں تھا کہ کچھ فاصلے پر کسی عورت کی آواز سُنائی دی۔ دیر ہو رہی تھی لیکن میں نے سوچا کہ دیکھو تو سہی کہ کون ہے؟ کون یہ دھینگا مشتی کر رہا ہے یہ سوچ کر دبے پاؤں آگے بڑھا اور بیریوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر دیکھا تو جھکو! ایک سپاہی جیسا آدمی کہہ رہا تھا: "چل چل، میں تجھے پٹواری کے پاس پہنچا دوں گا" جھکو انکار کر رہی تھی۔ وہ سپاہی پھر سمجھانے لگا لیکن جھکو اتنا تو جانتی تھی کہ یہ راستہ بھیلوں کے جھونپڑوں کی طرف جاتا ہے اس نے کہا: "لیکن ادھر تم کہاں جا رہے ہو؟" پھر کچھ سوچ کر بولی "نہیں، نہیں! تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔"

اتنا کہہ کر منور وا نے ذرا دم لیا اور پھر قصہ شروع کر دیا۔ "لیکن بھیا اس سپاہی نے تو اس خوبی سے بات کی کہ جھکو کو اطمینان سا ہو گیا کہ وہ پٹواری صرف دہاڑ زمین ناپنے آیا ہو گا۔ وہ تو جانے کو تیار ہو گئی لیکن میں اس میاں کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ سالا غنڈوں کا سردار ہے اور تمھیں تو معلوم ہے کہ وہ کی زمین پارسال ناپی جا چکی ہے۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور اس شیطان کو للکارا، "ٹھہر جا!" پھر ایک دم اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور للکار کر اس سے کہا: "کیوں میاں جی؟ لڑکیوں کو بہکانے کا کام کرتے

اتنے میں جھگڑو اسے کا کا! کہہ کر سب کے پیروں سے لپٹ گئی!

منورما نے ویرا کے ہاتھ سے حقہ سنبھالے لیا جو باتوں کی دھن میں اُسے پینا ہی بھول گیا تھا۔ اس وقت چوپال میں اتنا سناٹا تھا کہ اگر سوئی گرتی تو اس کی آواز بھی سنائی دے جاتی! ابھی تک لوگوں کے چہروں پر تحیر و تعجب کے آثار تھے۔ ایک نے پوچھا:

"پھر کیا ہوا منور کاکا؟"

منورما دوسرے کو حقہ تھماتے ہوئے بولے "پھر کیا بھیا! میاں کو میں ایسا سبق سکھاتا کہ جنم بھر یاد رہے لیکن بیٹا وہاں کھڑا رہتا تب نا! میں جھگڑو کو کھڑا کرنے میں لگا رہتے میں وہ دم دبا کر نو دو گیارہ ہو گیا......"

"پہچان تو لیا ہوگا منور بھیا؟" ویرا نے لقمہ دیا۔

"کچھ اندھیرا سا تھا اس لئے اچھی طرح پہچان نہیں سکا لیکن خیال ہے کہ گوہنے کے کسی گاؤں کا کوئی سپاہی ہوگا۔ اپنے علاقے میں تو ایسا کوئی میں نے دیکھا نہیں!"

بات پوری ہو جانے پر بھی سب کو کچھ ادھوری سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک اور شخص نے پوچھا: "پھر منور کاکا؟"

"پھر کیا بھیا! میں تو وہیں کھڑا رہا اور دانت پیس پیس کر گالیاں دیتا رہا لیکن جب وہ مسلمان آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تب دیکھا کہ جھگڑو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے!" اپنے چہرے کے جذبات پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے منورما نے کہا۔

"جتنا میں اُسے دلاسا دیتا اتنا ہی وہ اور روتی تھی" ویرا کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ "میں تجھے کیا بتاؤں ویرا کتنا رو رہی تھی وہ؟ پہلی بار سسرال جانے پر معلوم ہوتا ہے حقیقت جو لڑکی روتی ہے وہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں!" پھر بڑے زور سے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے "میری آنکھیں بھی اس وقت ڈبڈبا آئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُسے چپ کر سکا۔ چپ تو وہ ہو گئی لیکن کہنے لگی "چاہے کچھ ہو لیکن گھر نہیں جاؤں گی"۔ میں نے سوچا کہ اگر اکیلا چھوڑ کر چل دوں تو یہ کسی کنوئیں باؤلی میں گر جائے گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ ویسا ہی کوئی مسلمان اُٹھا لے جائے گا" آخر اُسے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا۔" اب منورما بات کو سمیٹتے ہوئے بولے "ماں باپ کی اور رحم کی طرح رہ گئی۔ انگلینڈ میں باپ کرتے ہوئے پچھتائی ہوگی اسی لئے بھاگ نکلی تھی۔" قصہ ختم کر کے منورما حقہ پینے لگے۔

ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے منور کاکا لیکن ان سالی چھوریوں کی جات"۔ ہے تو یہ الّٰہ گڑگ کی کٹیل کا گھر، جب بچی سے بھی کچھ بھی ہو آخر ذات تو کمینوں کی ٹھہری!"

"ارے بھیا یہ تو ایسا ہی چلتا ہے! یا من جو لاچار ہے گا اُسے کوئی نہیں چھوڑے گا" اور پھر اُٹھتے ہوئے بولے "اب تو ذرا جا کر دیکھوں۔"

"دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے؟" اور لکڑی کندھے پر ڈال کر دوسرے لوگوں کے ساتھ منورما بھی گھر سے نکل پڑے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی خیال آیا کہ جیب میں تمباکو نہیں لیکن واپس لوٹنے کی ہمت نہ کر سکے کیونکہ گھر سے نکلتے تو بیوی بہت غصے میں تھی۔ لوگوں کی شرم اس نے کچھ نہیں کہا لیکن منورما نے اُس کی آنکھیں دیکھ کر پڑھ لیا تھا جیسے کہہ رہی ہو: "دیکھو تو اس بڈھے کو نصیحتیں کی باتیں لا کر کے پندرہ بیس روپئے کا پانی کرایا اس کی تو بات نہیں کرتا اور اُلٹے پر سے مسلمان کی باتیں بنا رہا ہے!"

منورما نے دوپہر کا کھانا کلو کے ہاتھ منگا کر کھیت پر ہی کھا لیا اور پھر سارا دن اس طرح گزارا کہ اب کے گھر سے ویرا کے یہاں اور ویرا کے گھر سے پھولو کے یہاں! آخر کھانا کھانے کے لئے تو گھر آنا ہی پڑتا لیکن اس وقت انہوں نے ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ "تجھے کیا پتا کہ سب روپئے ختم ہو گئے ہیں! محصول ادا کرنے سے سامنے آیا اور کچھ؟"

"اگر اس وقت پہ نہ دوں تو کہنا! میری تو جان کھا لی!"

"اس وقت رو تا منہ ڈھک کر ابھی کیا کرنا ہے" گھر والی نے کھاٹ پر گودڑیاں پھینکتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔ منورما نے خود اٹھ کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"اب ذرا سی بھی بیکار ریل چلاتی رہتی ہے اپنا"

جواب تو اس کا منورما کو کرارا گرم ملتا لیکن وہ چپ ہو رہے اور گھر والی بھی کروٹ لگا کر گھر میں اپنی بھڑاس نکالتی رہی!

x x x x x

دوسرے دن صبح دھوپ کے نکلتے ہی موتی کے آنگن میں برادری کی پنچایت اس طرح جمع ہو گئی جیسے گھونٹوں پہ چڑھ کر آئی ہو۔ تا کہ اسادھوؤں کی طرح ان کا ایک ہی سوال تھا۔

"ماں کہاں گیا سوتیاں؟ عورت ہمیں سونپ دے نہیں تو تیری خیر نہیں!"

لیکن کوئی گھر میں ہو تو جواب دے۔ پیچھے کے گھر بھی تلاش کیا۔ وہاں سے جواب ملا کہ پچھر کسی کام کے کام سے دوسرے گاؤں گیا ہے قریب دو گھنٹے سے بڑھیوں کے بیچ بڑ بڑ کر رہے تھے۔ ایک ایک کر کے گاؤں کے سارے پنچ وہاں جمع ہو گئے تھے اور تین بار بلاوا بھیجنے پر آخر منوروا بھی اپنا حقہ گڑگڑاتے ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے آ پہنچے۔ پنچایت والے انھیں سامنے جگہ دیتے ہوئے بولے

"ادھر آؤ منور بھیا!" رام رام کرتے ہوئے منوروا ایک کھٹیا کے سرہانے بیٹھ گئے۔ شاید پنچوں کو سارا قصہ معلوم ہو چکا ہوگا اس لئے جھمکو کی پہلی سسرال والوں نے، منوروا کا نام تو نہیں لیا لیکن گھما گھما کر منوروا کو خوب طعنے دیئے اور گالیاں بھی دیتے رہے لیکن منوروا آنکھیں جھکائے بیٹھے رہے۔

آخر وہ چار آدمیوں نے انھیں ٹھنڈا کیا اور مقدمہ پیش کرتے ہوئے بولے۔

"ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ ہمارا آدمی ہمیں سونپ دو، بس ہم چلے جائیں!" یہی ایک بات تھی جسے چار پانچ آدمیوں نے الگ الگ چار پانچ بار مرتبہ کہا ہوگا۔ اچھا خاصا کہرام مچنے لگا۔

اب منوروا سے نہ رہا گیا کچھ تن کر بولے "اگر تمہارا آدمی تھا تو اب تک کہاں سو رہے تھے؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ جاؤ اس بامن کے پاس جتنا میں خاموش ہوں اتنا ہی سر پہ چڑھے آ رہے ہو"

ایک آواز آئی: "بامن نے تو نکال دیا تھا پہلے۔ لیکن تم نے زبردستی کر کے اس کے کپڑے پہنوائے ہیں کیا ہم جانتے نہیں؟"

"کپڑے نہ پہنواتا تو کیا کتا مسلمان ہو جانے دیتا کہوں؟"

"ایسا ہی اس کا خیال تھا تو اپنے لڑکے کے ساتھ پہناتے تب جانتا!" جھمکو کی پہلی سسرال والوں میں سے ایک نے اکڑ کر کہا۔

منوروا نے جواب دیا: میری برادری کی ہوتی تو یہ بھی کرتا!" اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دو چار پنچوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "تمہیں کہو بھیا برادری کی لڑکی، غیر برادری میں دی جاتی ہے؟" پنچوں نے زمین کی طرف نظر رکھتے ہوئے آہستہ سے سر ہلا دیا!

مثل کتا بھی اپنے محلے میں شیر ہو جاتا ہے۔" اس کہاوت کے مصداق ایک نوجوان کھڑا ہوا اور آنکھیں نکال کر بولا "اسے بیٹی تو اپنی بیٹیاں اپنے پاس رکھو۔ اٹھو چاہے ہماری پنچایت میں سے نہیں تو..."

"ایک بار اپنے پنچوں سے پوچھ لے وہ کہہ دیں تو میں بیچ جاؤں!" کہتے ہوئے منوروا نے بغل میں رکھی ہوئی کرسی اٹھا کر تقریر جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔ "پنچوں کی توہین کرتا ہے! یاد رکھ بیٹا اگر ایک آگ کو بیل نہ سمجھ لیا ہو تو منوروا کو مت کچھ گیا سمجھ رکھا ہے۔ دیکھتا ہوں تم بھی کس طرح گاؤں سے اپنا آدمی لے کر جاتے ہو!؟" کہتے کہتے منوروا ایک دم کھڑے ہو گئے۔

وہ تین بوڑھوں نے منوروا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "بیٹھو بیٹھو بھیا یہ تو لڑکے ہیں ان کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ اور بھدی چار گالیاں دے کر اس نوجوان کو چپ کرا دیا۔

منوروا بیٹھ گئے اور دھیرے سے بولے، ہم سارا ڈھنگ سے بات کرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ تم تو اس طرح بات کرتے ہو جیسے ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یہ کوئی بات کرنے کا ڈھنگ ہے" بھڑک کر بولے "اور اگر سب ایک ساتھ نہ بولے تو کیا پنچایت نہیں ہوگی؟ یہ سب جو بڑے بوڑھے ہیں وہ کیا نہیں سمجھتے تم بولو گے تبھی پنچایت ہوگی؟" یہ للکار سن کر سب کے کان ڈھلک گئے۔ سکون ہو گیا۔

منوروا کی چارپائی پر بیٹھوں کے چار پانچ ہوشیار سمجھے جانے والے پنچ آ کر بیٹھ گئے۔ منوروا نے کہا "بولو اگر تم کہو تو تمہارا آدمی تمہیں سونپ دوں؟ نہیں تو تمہارا خرچ واپس لوٹا دوں؟"

ایک جھمکو کا سسر اور ایک دوسرا آدمی دونوں ایک ساتھ بول اٹھے "نہیں ہمیں تو اپنے آدمی سے مطلب ہے خرچ نہیں چاہئے۔" ساتھ ہی ساتھ ایک دو اور بول اٹھے "ہاں ہاں ہمیں اور کچھ لینی دینی نہیں ہے پنچایت نہیں کرنا ہے ہمارا آدمی ہمیں دے دو تو چلے جاتے ہیں۔"

اتنے میں جھمکو کا گھروالا بول اٹھا "سیدھی طرح سے نہیں دو گے تو پھر تماشا دیکھ لینا۔ اگر اس رانڈ کی چوٹی پکڑ کر بھرے گاؤں سے نہ لے جاؤں تو اپنے ماں باپ سے پیدا نہیں!"

پانچ سات آدمیوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی: "اور کیا! یہ تو ہوگا ہی! ہم بھی دیکھیں کس کی ماں نے سوا سیر سونٹھ کھائی ہے جو بیچ میں پڑتا ہے!" کہتے ہوئے ایک آدمی کھڑا ہو گیا تو کوئی جھنجھلا کر دانت پیسنے لگا۔ ان لوگوں کا غصہ دیکھ کر تو ایک لمحے کے لئے منوروا کی خود اعتمادی بھی ڈگمگانے لگی تھی دل میں سوچنے

لگے یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں!" اور ایک جملہ تو منہ سے ہی نکل پڑا گئے،
"بھیلن رنی گھر بیٹھا بیٹھی، ارجن بیٹی ہاں!" اس وقت ان لوگوں کی شکلیں بھی بھیلوں کی سی ہو رہی تھیں۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اُن کی خود اعتمادی نے سہارا دیا اور کہنے لگے: "ارے ان کی تو ہمت ہی کیا ہے!" یہ سوچ کر تن کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہلا بھی ذرا کم ہو رہا تھا۔ منوردا نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے، مادھو بڑھئی سے پوچھا: "پھر لے جاکر کیا کرو گے مادھو؟" مادھو بڑھئی کے بدلے اس کا بھتیجا بول اٹھا: "جو کرنا ہوگا سو کریں گے، تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

منوردا نے نرمی سے جواب دیا "مطلب ہے بیٹا! تبھی تو پوچھتا ہوں۔ میں اسے مسلمان کے ہاتھ سے بچا کر لایا ہوں اس لیے مجھے جاننا تو چاہیے نا؟"

"بس جان لیا: اگر میرے سامنے آئے تو یہیں پنچوں کے سامنے رانڈ کی ناک کاٹ دوں!"

دیکھتا ہوں پھر کون آتا ہے سامنے۔۔۔" کہہ کر سانس لینے کے لیے رکا اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے سے کوئی بات کہے منوردا بولے:

"سن لیا مادھو؟" پھر ذرا رک کر بولے: "بوڑھا ہے جانتا ہے بچو کر؟" پھر پنچوں کی طرف غور سے تکنے لگے: "یہ تو تم چار بڑے بوڑھوں کا لحاظ کر رہا ہوں نہیں تو اس کو حوالات میں بند کرا دوں۔ تم سرکاری قاعدے قانون نہیں جانتے!"

"ارے منور بیٹا! تم بھی لڑکوں کی باتوں پہ دھیان دیتے ہو۔ نہ تو یہیں ناک کاٹتا ہے نہ اُسے مارتا ہے۔ ہمارا آدمی ہے اس لیے لینے آئے ہیں، ورنہ رہو تو ہم اپنا راستہ لیں!"

جھگرو کا پہلا خسر مادھو بولا۔

منوردا نے ہنس کر آہستہ سے کہا، "یہ بات کیوں کہہ رہے ہو مادھو بھیا؟" پھر ذرا رک کر، "تمھیں سے میں پوچھتا ہوں کہ اگر تمھارے گاؤں میں کسی کی عورت اس طرح آئی ہو تو کیا تم اُسے لوٹا دو گے؟۔۔۔"

"ہاں ہاں ضرور!" مادھو بڑھئی بولا۔

دوسرے پنچوں کی طرف دیکھ کر منوردا بولے: "سن لیا بھیا؟ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ ایمان سے کہنا!"

تین پنچوں میں سے دو نے کہا: "جھوٹ کیوں بولیں، آئے ہوئے آدمی کو تو کوئی نہیں سونپ سکتا۔۔۔" یہ سنتے ہی مادھو بڑھئی جھلا اٹھا: "تو پھر یہاں کیا جھک مارنے آئے ہو؟" پھر انگلی اٹھا کر تنبیہ کرنے لگا: "پنچایت کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرو۔ نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!"

منوردا تعجب سے پنچوں کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ ایک بولا "دھونس دے کر پنچایت کرانا ہے تو کسی اور کو دیکھو۔ ہم کسی کا دیا ہوا نہیں کھاتے جو تمہاری دھونس میں آجائیں!"

"اور تم بھی کہاں کے راجا ہو جو ہم دب جائیں۔ پنچ کے گھر کی تم کیا پنچایت کرو گے؟" مادھو نے جواب دیا۔

برادری کا اگوا دھنا اب تک چپ بیٹھا تھا، وہ بڈھا بھی اس بار آنکھیں نکال کر دھنا کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا: "تو پھر یہاں کیا جھک مارنے کو بلایا تھا؟"

اگرچہ آپس کی اس جنگ میں منوردا کا تو فائدہ ہی تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو اکسایا ہو لیکن انھوں نے اپنی ہمدردی ظاہر کی:

"ارے بیٹا۔ یہ تو وہ بات ہو گئی کہ سانڈ سانڈ لڑیں اور باری کے بھٹے اجڑیں۔ بیچارا مرتیاں ناحق مارا جائے گا۔" پھر دھنا سے کہنے لگے "دیکھو معاملہ نپٹا دو دھنا کاکا۔ پھر بعد میں لڑتے رہنا۔"

دھنا نے صاف صاف بات کہہ دی: "دیکھو مادھو میں تو یہ کہتا ہوں اگر تم اُسے جانا ہی چاہتے ہو تو تم جاؤ اور تمہاری پنچایت جانے، میں تو اس پاپ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر کچھ جائز کر کے رفع دفع کرنا ہے تو سب مل کے ابھی طے کر لو۔"

اگرچہ تھوڑا دیر کے لیے پھر ہنگامہ بڑھ گیا کیوں کہ کچھ لوگوں نے دھنا کی تائید کی اور کچھ نے مخالفت بھی کی، لیکن ان سب کو چپ ہی رکھنے والے پانچ پنچوں نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد یہ سمجھوتا کیا کہ کوئی اکال تو نہیں کہ برادری سے نکال دیا جائے پھر اگر پنچوں کی مرضی ہو تو پانچ یا پانسو کا جرمانہ کر کے برادری میں واپس لے لیں گے۔" مادھو بڑھئی نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا "ہاں ٹھیک ہے! ایک بار تو برادری میں اس کا حقہ پانی بند ہونا ہی چاہیے۔"

ابھی تک منوردا چپ بیٹھے تھے لیکن اب ان سے رہا نہ گیا

پہلے تو برادری کا حکم سر آنکھوں پر رکھا، پھر ذرا گمبھیر ہو کر بولے:
"دھنا کاکا، موتیاں نے برادری کا کچھ بگاڑا ہے یا شوبھا لے بیٹھی ہوں؟"

"میں تو یہی کہتا ہوں کہ اگر موتیاں اُسے رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی تو کوئی دوسرا مل ہی جاتا۔ اور نہ ملتا تو پھر جہاں سے میں اُسے لایا تھا وہیں چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ اگر میں اُسے چھوڑ آؤں اور وہ کسی کنوئیں باؤڑی میں جا گرے تو یہ گناہ کس کے سر؟ اور اس بڑھئی کا گھر بسا دیا اس میں مجھے کیا لالچ تھا؟ بولو؟ کسی دن اپنی کا ٹوٹا بھر کے دے گی تو تمھیں دے گی! ایک گھر بسا تو تمھاری برادری میں بسا۔ اب تمھیں کہو کر اس میں مجھے کیا فائدہ ہوا؟" یہ کہہ کر منوردا چپ ہو گئے۔ پنچوں کی صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ منوردا کی بات کا مطلب سمجھے ہی نہیں اُن کی شکلیں سوال کر رہی تھیں۔

"لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

آخر دھنا بول پڑا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا منور کھیا!" یہ موقع ملتے ہی منوردا نے اپنی پرانی بات دہرائی، جو گاؤں والوں سے پہلے جھوٹا قصہ بیان کر چکے تھے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے بولے:

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ مانو نہ مانو لیکن قصور میرا ہی ہے۔ اس میں بیچاری غریب کو کیوں سانڈتے ہو؟ جب وقت تو میں تھا جو دھرم کے جھنجھٹ میں پڑا۔" یہ کہہ کر بڑی اداس نگاہوں سے پنچوں کو دیکھنے لگے اور ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ذرا دیر بعد اس طرح بولے جیسے خود سے کہہ رہے ہوں: "اس میں بیچاری موتیاں کا قصور کیا؟"

"تم بھی کیسی بات کرتے ہو منور بھیا! موتیاں کا قصور کیوں نہیں؟ جو دُنیا میں بیٹنگ کرائی ہے اُسے گھر میں بٹھاتے وقت پنچوں سے پوچھنا تو چاہیے تھا نا؟" دھنا نے کہا۔

"بات ٹھیک ہے دھنا بھیا، لیکن ذرا سوچو گے تو تمھاری سمجھ میں آ سکے گی" دھنا بڑھئی کی طرف دیکھتے ہوئے منوردا نے کہنا شروع کیا: "دھنا بھا۔۔۔ئی، جات تو گنگا کہلاتی ہے گنگا!"

پھر دوسری طرف دیکھا: "اگر ایسا نہ ہوتا تو جب کوئی بڑی تقریب آتی ہے اُس وقت گاؤں کی عورتیں چاول لے کر پکا کیوں دیتیں؟ جات تو دھرتی میّا کی برابر ہے!" پھر ذرا رُکے، اور لوگوں نے "سچی بات ہے" کہہ کر سر ہلا دیا۔ منوردا نے آگے کہنا شروع کیا:
"یہ لڑکی غیر برادری میں گئی تھی یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اونچی قوم میں گئی تھی؟"

مادھو بڑھئی درمیان میں ہی چیخ اُٹھا: "اس سے کیا ہوا؟ اونچی برادری میں گئی تو کیا اپنی جات سے بڑی ہو گئی؟ یہ سب ہوشیاری یہاں نہیں چلے گی منور کھیا! کہہ دیتا ہوں!"

"ارے بھلے آدمی! اسے کون نہیں مانتا؟ لیکن یہ تو وہ کہاوت ہو گئی کہ "قصور کیا بھینسے نے، داغ دیا مشک کو!" اگر سزا دینی ہے تو لڑکی کو دو جس سے پھر دوسرا کوئی ایسا کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔" پھر دھنا بڑھئی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے:
"کیوں دھنا کاکا! کیا میں غلط کہتا ہوں؟" سب خاموش رہے۔ منوردا نے پھر بات جاری رکھی: "یہ تو ٹھیک ہے رجو بھیا، لیکن چھپنیا میں تو، تم سب جانتے ہی ہو، کیوں دھنا بھیا، لیکن چھپنیا میں تو، تم سب جانتے ہی ہو، کیوں دھنا بھیا! ـــ جو کاچھیوں اور دھینوروں کے گھر میں رہ کر پلے تھے اُنھیں بھی برادری میں شامل کر لیا۔ ابھی تو ہماری ہی برادری میں اُن میں کے کئی زندہ ہیں کہو تو نام بتاؤں؟"

"ارے ہماری برادری میں کہاں کمی ہے منور بھیا!" کہتے کہتے دھنا نے مادھو بڑھئی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ منوردا نے مادھو سے کہا:

"میں تو اسی سے کہتا ہوں مادھو بھیا! کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے سر سے بوجھ ہلکا کر کے جاؤ تو اچھا ہے۔ اپنی برادری میں تو ایسے جھگڑے بارہ مہینے میں بارہ ہی بار ہوتے ہیں! اگر آپ ایسے اسی طرح بڑھاتے رہیں تو کیسے کام بنے؟"

دھنا نے کہا: "ٹھیک ہے، اگر پنچوں کی سمجھ میں آتی ہو تو لڑکی کو سزا دو اور موتیاں کو بھی۔"

پنچایت میں سے دو چار آوازیں اُٹھیں: "ہاں بھیا ہاں،

یہ جھگڑا ختم کرو۔"

ایک بولا: "یوں کیسے مٹ سکتا ہے ابھی تو نہ جانے کیا کیا ہوگا۔"

بہت کچھ ردّ و کد اور جھگڑے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ موتی پنچایت کے رواج کے مطابق جرمانہ ادا کرے، یعنی دو دعوتیں کھلائے اور تیسری شرط جو جھکو کی سسرال والوں نے پیش کی وہ یہ تھی کہ جھکو دانتوں میں تنکا دبا کر پنچایت کے سامنے کھڑی ہو۔"

منور دا نے ایک مرتبہ تو یہ تسلیم کر لیا لیکن بعد میں برادری کے پانچ اگروؤں کو ایک طرف علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے:

ادھو بھیا یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے خاندان کی عزت بڑھے گی اور نہ پنچوں کی! فقط ایک کہاوت رہ جائے گی۔ ہاں ایک بار ضرور تمہارے نام کا ڈنکا بج جائے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ بعد میں تمہارے لڑکے لڑکیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ پھر ادھو بڑھئی کو غور سے دیکھتے ہوئے سمجھانے لگے: "بعد میں تمہارے ہی آدمی کہیں گے کہ، دیکھ لیا آپ ادھو کا خاندان بڑا بھاری خاندان ہے، جھکو کی جو حالت کی تھی ویسی ہی اپنی لڑکیوں کی کرے گا تو؟ اور سچ کہتا ہوں ادھو بھیا! لوگ تو دونوں طرف ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں!"

دھنا بڑھئی کسی سوچ میں غرق تھا منور دا نے ذرا دم لے کر اس کی طرف دیکھا، "اور دھنا کاکا! اس میں پنچوں کی کچھ عزت نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے کیا؟ میں تو اس لڑکی سے تنکا چھوڑ پورا پولا اٹھوا دوں! لیکن اس میں ہم سب کی کیا شان ہوگی؟ ہاں اگر کسی مرد سے تنکا دبواؤ تو بات بھی ہے! لیکن ایک عورت سے ...

مجھے تو یہ ٹھیک نہیں لگتا!"

منور دا نے اتنا کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولے: "میرے تو بال سفید ہو گئے لیکن ایسی سزا دنیا میں آج تک دیکھی نہ سنی!"

آخر اگروؤں نے وہ شرط واپس لے لی۔ لیکن اب ادھو بڑھئی نے ایک شرط اور رکھ دی۔

"لڑکی یعنی اس کے میکے والے بیس برہمنوں کو بھوجن کرائیں!"

اسے سب نے منظور کر لیا۔

منور دا دل ہی دل میں ہنسنے لگے یہ سوچ کر کہ بیچاری نے کچھ دنوں تک ایک برہمن کو بھوجن کرایا تھا اس کا تو یہ نتیجہ نکلا کہ اب بیس کا سر پر لشکر چڑھ آیا ہے! اور اب بیس کو..."

× × × × ×

اگرچہ موتی کا گھر والا کوئی نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کے کواڑ تو کھلے تھے گاؤں کے پٹیلوں نے چوپال میں بھٹی بنا کر پتیلے چڑھا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چورا اور دال بھات تیار ہو گیا۔ بڑھیوں کی پنچایت اور گاؤں کے دوسرے پٹیلوں کو کھانا کھلانے کے بعد منور دا بھی کھانے بیٹھ گئے۔

شام کو حقہ ڈکا پلانے کے بعد منور دا نے ان پانچ اگروؤں کو ایک طرف کونے میں لے جا کر رواج کے مطابق دو سو روپے گن کر دے دیئے۔ پنچوں کو "سرو پا" کے پانچ پانچ الگ دیئے اور خانۂ خلی پر دستخط کرا کر جیب میں رکھ لی۔

ایک دعوت کھا کر اور دوسری بقایا چھوڑ کر شام کو سب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ کہیں سے بیچر آ پہنچا اور چھ سات آدمیوں کو اپنے گھر لے گیا، صرف حقہ تمباکو کے لیے ہی نہیں بلکہ دات بھر بیٹھنے کے لیے ـــ لیکن ان میں جھکو کی سسرال والا کوئی نہیں تھا۔ بیچر نے ان سے اصرار بھی نہیں کیا تھا اور نہ اصرار کرنا مناسب ہی تھا۔

شام ہونے پر امبا اور جھکو منور دا کے گھر سے آ گئیں اور موتی بھی کہیں سے آ پہنچا۔ "کھاؤ جلدی! ڈھنڈورا دن کی بیلا ہو گئی!" چوپال میں بیٹھے ہوئے منور دا نے کہا۔

امبا نے پہلے تو کھانے سے انکار کیا لیکن منور دا کے میٹھے لہجے اور جھکو کے محبت بھرے اصرار سے مجبور ہو کر تھوڑی دیر میں کھانے پر آمادہ ہو گئی۔ موتی اور جھکو سے کھانا کھانے کے لیے کہہ کر خود منور دا کے پاس آ بیٹھی۔

منور دا نے پنچایت کی ساری باتوں کا خلاصہ سنا دیا اور ڈھائی سو روپے جو بیٹی کے گھر سے لائے تھے ان کا حساب بھی دے دیا۔ پانچ سو روپے بچے تھے وہ امبا کو دیتے ہوئے بولے:

"یہ باقی بچے ہیں!"

"کتنے ہیں؟"

"پانچ!"

"ان کی تم چمپی باندھ لو۔" امّاں نے ہنس کر کہا! منوّرہ انکار کرنے لگے تو اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "یہ پانچ روپے نہیں لوگے تو سوتیاں ان سے لمبی نہیں بن جائے گا۔ یہ روپے میں کوئی نجابت کرنے کے تھوڑی سے رہی ہوں!" پھر ترچھی نظروں سے منوّرہ کو دیکھنے لگی۔

منوّرہ کو جیسے اُس کی نظروں میں ہی جواب مل گیا ہو۔ اس طرح چُپ چاپ روپے جیب میں ڈال کر مسکرانے لگے اور یہ بھی نہیں پوچھا رہ مطلب ہے کے؟" پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اُٹھنے سے پہلے جھمکو کو بلایا۔ جھمکو دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ باہر سر نکال کر پوچھا "کیا ہے کاکا؟"

منوّرہ کے چہرے پر ہنسی اور آنکھوں میں طمانیت تھی۔ انھوں نے کہا: "وہاں اوٹ میں کیا کھڑی ہے ادھر آ!" جھمکو ذرا تیز مگر شرمیلی ہوتی چال سے آکر ساس کے پاس کھڑی ہو گئی اور ساری کا پلّو چبانے لگی۔

"ہو دیکھو بیٹیا۔ اب تو سسرال میں ہے۔ اس طرح پلّو کا کنارا چبانا نہیں چاہیے کبھی"؟

پھر ذرا دیر تک سامنے دیکھتے رہے اور بولے "اور دیکھو تیری ساس کا مزاج ذرا تیز ہے۔ اگر یہ کچھ کہے تو خیال نہ کرنا سمجھی بیٹیا؟" اور دیکھو تیری ساس کا مزاج ذرا تیز ہے اگر یہ کچھ کہے تو خیال نہ کرنا سمجھا۔" پھر امّاں کی طرف دیکھتے ہوئے جھمکو سے کہنے لگے۔

"اگر زیادہ گڑبڑ کریں تو مجھ سے کہنا میں ان کی خبر لوں گا!"

جھمکو نے کچھ کہا سنا تو نہیں لیکن گردن جھکا کر منوّرہ کی طرف دیکھا اور پھر جانے کے لیے مڑی۔

"چلی کہاں؟ ایک بار اپنے کاکا کو حقّہ تو بھر دے!" جھمکو واپس آنے لگی تو منوّرہ نے پھر کہا: "کیوں بھر دے گی نا؟"

امّاں نے کہا: "کیوں نہ بھرے گی، جنم بھر بھرتی رہے تو بھی کم ہے" جھمکو حقّہ میں پانی بھر کے لے آئی۔ منوّرہ نے کہا: "نہیں بیٹیا۔ مجھے زندگی بھر حقّہ نہیں بھروانے ہیں۔ بس آج ہی سب وصول ہو گیا!"

چہرے پر عجیب شفقت ظاہر کر کے جھمکو نے منوّرہ کی طرف دیکھا۔

"تم بھی کاکا......!" اور اندر چلی گئی۔

منوّرہ بھی اُٹھے اور حقّہ گڑگڑاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔

اب انھیں بس اپنی گھر والی تھی اور وہ تھے! مگر اُن کے چہرے سے بے کسی کا نام نشان بھی نہ تھا۔

جس طرح بھاپ پہاڑوں پر کھا کھا کر آخر پانی ہو جاتی ہے یہی حال منوّرہ کی بیوی کے غصّے کا ہوا۔ اگرچہ جس دن منوّرہ احمدآباد سے واپس آئے ہیں اس دن اُن کی باتیں "کہ پاس کو سیدھا دیا کہ صحیح سلامت عزت کے ساتھ گھر آ گیا" اور اندھیری کوٹھری، وغیرہ بیوی کو بناوٹی معلوم ہوتی تھیں لیکن گزشتہ رات کو "محصول نہیں بھرا تب کہنا!" والی بات سے اُسے کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ اور اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ "زیادہ نہیں لے گا تو جیل میں جائے! لیکن جتنے خرچ ہو گئے اتنے تو پہلے ہی آ گئے! امبالے سے بھی کچھ وصول کریں گے۔ اور کیا پھر یا کو یوں ہی چھوڑ دیں گے؟"

× × × ×

جھمکو کا بھرا ہوا حقّہ گڑگڑاتے ہوئے جب منوّرہ گھر آئے تو گھر والی بھینس دوہ رہی تھی۔ گھر میں آتے ہی کلّو کو پکارا لیکن جواب نہ ملا تو سمجھ گئے کہ وہ کھیت پر چلا گیا ہوگا۔

منوّرہ نے چوپال میں آ کر الاؤ کے پاس بیٹھتے ہی کہا "میں کہتا تھا نہیں کما لاؤں گا!"

اُن کی بیوی نے گوبر میں سے ہی جواب دیا: "اور کیا، میں تو جانتی تھی کہ آج لڈو لائے ہیں، پھر گھر کی راب کیسے بھائے گی؟" بات تو کچھ تھی لیکن کہنے کے انداز میں برسوں پہلے کے طعنوں کی آمیزش تھی جو منوّرہ نے پہچان لی۔ لیکن اس وقت وہ جیسا غصّہ ظاہر کیا کرتے تھے نہ کر سکے۔ بلکہ وہ کچھ اچھا ہی لگتا تھا اسی لیے بات کو دبانے کی بجائے انھوں نے اور ہوا دی۔ خوش ہو کر بولے: "دوسرے کے گھر کے لڈو اپنے گھر کی راب کی برابری نہیں کر سکتے!"

"میں تو کچھ برس پہلے اپنے دل سے ہی پوچھ لیتی!" کہتے کہتے گھر والی گوبر سے باہر آئی اور منوّرہ کی طرف آنکھیں مٹکاتی ہوئی بولی، "ارے اب تو ذرا شرماؤ! لڑکوں کے بھی لڑکے ہو گئے۔ لیکن تمھیں شرم نہیں آتی۔ ہمارا تو کچھ نہیں لیکن لوگوں کا تو لحاظ کرو۔"

"ذرا ادھر تو آ۔" بات ذرا ایسی ہی تھی منوّرہ نے گھر والی کو پیار سے قریب بلایا وہ آئی اور کپڑے سمیٹ کر اُن کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"کیا کہتے ہو بولو؟"

منورما نے پوچھا: "اس میں ڈرانے کی کیا بات ہے؟"
"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو گاؤں والوں سے!"
"پھر بھی"
"لوگ تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں کاکا نے تو آخر اپنے دوسرے رنڈوے لڑکے کو بھی ٹھکانے لگا دیا!"
منورما کو بھی یہ احساس اسی وقت ہوا کہ معاملہ "ایک پنتھ دو کاج" کا ہو گیا ہے۔
"لوگ بھی بیٹھے کیسی کیسی باتیں بنا لیتے ہیں" یہ کہہ کر منورما ہنسنے لگے۔
"بس تم سے اور آتا ہی کیا ہے۔ ہنس ہنس کر ہی تو سب کچھ بگاڑ لیا ہے۔" گھر والی نے کہتے ہوئے منہ بنا لیا۔
منورما ذرا سنجیدہ ہو کر بولے: "اچھا میں تجھ سے اپنے دل کی بات کہوں!" اور ذرا تن کر بیٹھ گئے۔ حقے کو اپنی بغل میں رکھ کر کش لگاتے ہوئے بولے: "لڑکے کو تو نہیں لیکن لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے، یہ بات سچ ہے!"
"چپ چاپ بیٹھے رہو، کیوں پاپ میں گرتے ہو۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟"
یہ کہہ کر گھر والی نے منورما کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور بولی: "اسی لئے تو... بھگوان جانے کہاں اتنے دن لگا دیئے۔ لڑکا رنڈوا نہ رہ جائے اسی لئے اُسے گھر واپس لے آئے۔" پھر ایک دم منورما کی طرف دیکھ کر ہاتھ مٹکایا اور بولی: "بال سفید ہو گئے سفید! اب تو بھگوان کو سر پر رکھ کر بولو۔" منورما چپ چاپ بیٹھے مسکراتے رہے۔ یہ دیکھ کر گھر والی کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ بولی: "ایک کا گھر بھر دیا اور دوسرے کو بھکاری بنا دیا۔
۔۔۔ اف کہاں ہیں وہ روپے جو تم کہتے تھے؟ زیور تو گئے بھاڑ میں، جو گھر سے لے گئے تھے وہ تو دو!" اس کے بعد بس گھر والی بولتی رہی اور بولنا رونا ہی ہوتی رہی۔
"میری بات تو سُن! پہلے تو پوچھا ہوتا کہ کہاں گیا تھا؟ اور کیا کر کے پھر گھر آیا ہے تو لڑتی رہنا!" یہ کہہ کر منورما نے جیب سے روپوں بھری تھیلی نکالی اور اُسے گھر والی کے سامنے رکھ کر کہنے لگے: "تُو نے تو مان لیا کہ میں نے لڑکے کو کیسا ٹھکانے لگایا ہے!" روپے دیکھتے ہی گھر والی کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ دیکھ کر منورما اُسے سمجھانے لگے: "میری جان! یہ مایا تو چلتی پھرتی چھایا ہے۔ میں تجھے اپنی ہی مثال دوں۔
جب میرے دادا جیتے تھے تو گھر میں گھی پانی کی طرح بہتا تھا اور بنیئے کے گھر میں پانچ بیس روپے بھی پڑے رہتے تھے۔ لیکن آج تو ہی دیکھ رہی ہے، کچھ بچا ہے اُن میں سے؟" پھر ذرا رُک کر بولے: "اور کسی کے یہاں ہوگا بھی تو اس میں سے کچھ ساتھ نہیں جائے گا، فقط اپنے کرم (اعمال) ساتھ جائیں گے!" یہ کہہ کر منورما نے زور سے سانس لی اور اس طرح بولنے لگے جیسے خود سے ہی کہہ رہے ہوں: "احمد آباد جاتے ہوئے اس دن رات کو جو بات مہاراج نے کہی تھی وہ سچ ہی تھی..." پھر گھر والی کی طرف دیکھ کر "ہنسی آتی ہو، اُسے راون کی اولاد سمجھنا چاہیئے! بھگوان بھی...!"
"تو کیا تم احمد آباد تک ہو آئے؟" گھر والی نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔
"ہو کیا آیا؟ دو راتوں رہ کر بھی آیا!"
گھر والی نے منورما کے چہرے کی طرف دیکھا، لیکن وہ غصہ نہ کر سکی۔ پھر اس سے بغیر کہے رہا نہ گیا: "جب گئے تھے تو کام پورا ہی کر آتے، یہ کلنکنی تو یہاں سے نکل جاتی! پھر اگر سادھو بن جاتے تو کون منع کرتا تھا۔" پھر کچھ رُک کر کہنے لگی: "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تم سے کچھ نہیں ہوگا!"
منورما مایوسی کے ساتھ اتنا ہی بولے: "سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن نہیں کیا، یہ بات بھی سچ ہے!" پھر ذرا دیر خاموش رہے اور خود بخود کہنے لگے۔
"نہیں، نہیں! اچھا ہی ہوا، بھگوان نے مجھے بچا لیا۔"
گھر والی نے ذرا گھبرا کر پوچھا: "کیوں کیا پولس کو خبر ہو گئی تھی؟"
منورما نے ہنس کر جواب دیا: "یہ بات ہوتی تب بھی کچھ ایسا بُرا نہ تھا!"
"کچھ سیدھی بات تو کہو!"
"کہوں گا بھی تو کوئی نہیں مانے گا۔ اور تو تو مجھے بالکل پاگل ہی سمجھے گی!" یہ کہہ کر منورما خاموش ہو گئے۔ گھر والی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا: "میں تجھے کیا بتاؤں،

گویا اس طرح منورما نے بات کا آغاز کیا، جبکہ میں نہ جانے ایسی بات دکھائی دی کہ اُسے دیکھتے ہی اپنی ناتھی یاد آجاتی تھی۔

مہاراج نے اس سے کہا تھا "منورما تو تیرا باپ ہے تو یاد چھوڑتی ہے!" یا تو اس کی وجہ سے یا کوئی اور سبب تھا لیکن میں نے دل کو بہت سمجھایا کہ میری بیٹی تو سورگ میں بیٹھی ہے۔ اور یہ تو غیر اور کسی کی بڑھیا کی لڑکی ہے، مگر میرا دل نہیں لگتا تھا۔"

گھر والی کو کچھ یاد آیا اور کہنے لگی "اس راؤنڈ کا چہرہ بھی بالکل ناتھی سے ملتا جلتا ہے۔" منورما نے آگے کہنا شروع کیا "پھر بھی میں ایک نہ سُنتا اور میں نے سب کچھ طے کر ہی لیا تھا لیکن آخر میں سارا کیا کرایا بگڑ گیا، کتنی روتی تھی وہ لڑکی، کتنی روتی تھی!! مجھے اس وقت کونے پر سسرال جاتی ہوئی ناتھی کی بدائی یاد آگئی!

بالکل ویسی کی طرح روتی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی، "بابا جب تم ہی چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ تب کون میری سُدھ لے گا؟" منورما نے اتنا کہہ کر آنکھوں کے کونے صاف کئے۔

گھر والی بھی کھنکارتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ بولے "تجھے یقین نہ آئے تو غور سے سُننا مجھے تو کم بخت کی آواز بھی بالکل ناتھی کی سی لگتی ہے!"

گھر والی نے آنسو پونچھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگی "میں کیا جانتی نہیں! جب ناتھی اور یہ دونوں مل کر گیت گاتی تھیں تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ دو گا رہی ہیں!"

کچھ دیر منورما کی بیوی خاموش رہی، پھر بولی "تم وہاں سے اُسے واپس لے آئے تو اچھا کیا لیکن یہاں جو تم نے اس کے لئے دماغ کھپایا اس کے روپے تو خوب وصول کر ناتے! جو چلی گئی اس سے تو وہاں..... " آسمان کی طرف اشارہ کر کے..."میری بٹیا اب کہاں ملے گی؟

لوگ تو کہتے ہیں کہ کنہیا نے اسا اور بیچپا دونوں کی ایسی بنا دی بلکہ اگر دونوں بیس بیس روپے نذرانہ بھی دیں تو کم ہے، اس کی جگہ....."

منورما نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن بھول گیا اچھا تھا میرا ارادہ تو ایک کوڑی لینے کا بھی نہیں تھا۔ اب بھی دل انکار کر رہا ہے لیکن میں نے سوچا کہ جو خرچ ہو گئے اُتنے لے لینے میں ہرج نہیں۔ باقی میں اپنے دل کی بات کہوں؟"

اور پھر گھر والی کی طرف جھک کر فقیرانہ ادا سے بولے "روپیے تو مل جاتے اور سب کچھ ہوتا مگر میں نے سوچا کہ مالدار ساہوکار لوگ تو اپنی اولاد کے نام پر سدا ورت کھولتے ہیں۔ اپنے سیٹھ نے لڑکے کے نام سے دھرم شالا بنوائی کہ نہیں؟ — جب یہ لوگ اتنا اتنا خرچ کر ڈالتے ہیں تو مجھے تو فقط زبان ہی ہلانا تھی۔ میں سمجھ لوں گا کہ اپنی بٹیا کے نام پر ایک غریب لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا۔

گھر والی کی بھی سمجھ میں آنے لگی، وہ بولی "ہاں جی۔ بھاڑ میں جائے ہماری ناتھی زندہ ہوتی تو اس کے لئے بھی آخر کپڑوں لتوں کا خرچ تو ہوتا ہی، ہم سمجھیں گے کہ۔

"اتنا ثواب تو کاشی کی یاترا کرنے سے بھی نہیں ملے گا۔ سکھو کی ماں!" منورما نے گھر والی کی طرف دیکھ کر کہا جو خاموش بیٹھی تھی۔

"سچی بات ہے" گھر والی نے سر ہلا کر کہا۔

منورما پھر بولے "جن کے بیٹی نہیں ہوتی وہ حسرت کرتے ہیں بیٹی کے لئے۔ ہمیں بھگوان نے بٹیا دی تھی لیکن اس کی مرضی کہ پھر واپس لے لی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی نے پھر سے یہ بٹیا دی ہے کچھ لگ دھرم کی بٹیا....."

"بنا ہی لیتے ہیں!" کہتے ہوئے اُن کی گھر والی نے جملہ پورا کر دیا اور اُن کے قریب آ کر بولی: جب تم بھگوان کی بات کرتے ہو، تو میں بھی کہتی ہوں کہ، اُس دن جب تم نے ایک جوڑی کپڑے مانگے تھے تو مجھے خیال آیا کہ اپنے کپڑے دینے کی بجائے مرنے والی کا ایک جوڑا دے دوں، اُن کا پہننے والا اب کون ہے! یہ سوچ کر صندوق کھول تو لیا۔ لیکن کپڑے نکالتے وقت میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے بہتیرا دبایا مگر کپکپی رُکی نہیں!"

پھر خود ہی کہنے لگی "کیا یہ ماتا جی کی بھا نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں ماتھیں کی!!" کہتے ہوئے منورما نے حقہ ہاتھ میں اٹھا لیا۔"

یہ کہہ کر کہ بھگوان نے عزت بچالی اور سب اچھا ہو گیا" پھر چلم کی راکھ نکالتے ہوئے کہنے لگے "ذرا تھوڑا تمباکو دے۔ تیرے ٹھاکر

کے ارے ذہن سے اچھی طرح تمہارا بھی نہیں پا سکا۔"
"لیکن مجھے خبر کیا تھی؛ آتے ہی تم نے بات تو بتائی ہوتی!"
گھروالی کھڑی ہو گئی۔ منورواپولے: "میں نے سوچا کر سارا کام نمٹا کر ہی کہوں تو اچھا ہے ورنہ ادھر اُدھر باتیں پہلی ترتیب نا پڑے گی، مجھے کیا پتا تھا کر تُو سیدھی طرح مان جائے گی!"
گھروالی نے کٹھیا سے تھاکر آتار کر منوروا کو دیتے ہوئے کہا: "میں ایسے کام میں کیا بولتی؟"
پھر نیچے بیٹھ کر بولی: "یہ خبر ہوتی تو جھنکو کے کپڑے ملیا کے گھر میں کیوں پہنانا پڑتے؟ کیا اپنا گھر نہیں تھا؟ تمہیں اتنا بھی نہیں سوجھا!"
"لیکن اب کیا، اب تو وقت نکل گیا۔ اچھا دن دیکھ کر جھنکو کا نیوتہ کر لے۔ اور بدا کرنے کی تجھے خواہش ہو تو بھی منع نہیں کرتا۔ بُرا کام دوبارہ مت کرو لیکن اچھا کام سو مرتبہ کرو تو کون روک سکتا ہے؟" منوروا سکون کے ساتھ حقہ پینے لگے۔
دیر تک گھروالی سوچتی رہی اور آخر بول اُٹھی:
تم کہو تو ناتی کے دو جوڑے ایک وہ کمخواب کا، دوسرا ریشمی رکھے ہیں، اب انھیں کون پہنے گا!...
"کون کیا، جھنکو پہنے گی!" پھر ہنس کر کہنے لگے: "اری پگلی اس میں مجھ سے پوچھنا ہی کیا!" پھر کھڑے ہو گئے۔
"چل اُٹھ! کھٹیا بچھا دے۔" کہا اور باہر نکلتے ہوئے" اور تجھے خبر ہے، جھنکو تو اپنے بھتیجے کلوا کے بچے کے واسطے اچھا سا کھلونا لائی ہے! تو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔" چلتے چلتے کہہ گئے، "کل تو دکھانا تو سہی!"
"ضرور لائی ہو گی۔ پھوپھی نہ لاتی تو دوسرا کون لانے والا تھا؟" گھروالی بھی یہ کہہ کر اپنے کاموں میں لگ گئی۔
ختم کر کے باہر آئی تو منوروا بڑے خراٹے لے رہے تھے۔ بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئی، "میں نے ہی احمد آباد دیا تھا، بھگوان جانے کیا کیا مصیبت اُٹھائی ہو گی، اتنے دنوں بعد آج ذرا آرام سے نیند آئی ہے!" پھر پانی کا لوٹا بھر کر کھٹیا کے نیچے رکھا، رضائی اچھی طرح اُڑھا دی، اور خود بھی سونے کے لئے چل گئی۔
رات کو خواب میں بھی دیکھا تو جھنکو اور ناتی ساتھ ہی نظر آئیں کبھی کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی، کبھی کنڈے تھپتی ہوئی۔ نیند پوری ہونے پر کروٹ بدلی تو اب خواب میں بھی جھنکو کے مستقبل کا پروگرام بن رہا تھا۔ جھنکو کو اچھی طرح کھلا پلا کر کپڑے دیئے۔ سنہری پھولوں والا کمخواب، گلابی ریشمی ساڑی اور اصلی زردی کا دوپٹہ ــــ ناتی کے جتنے بھی کپڑے تھے وہ سب جھنکو کو پہنا کر بدا کیا۔ لوگوں نے پوچھا، "کیا ہو رہا ہے آج پھر!" تو اس نے جواب دیا۔ "اس دن تو گھبراہٹ میں جیسا تیسا کر دیا تھا اصل بدا تو آج ہو رہا ہے!! اب تو ہمیں ہی اس کی ساری رسمیں پوری کرنی ہیں!" اس میں بڑا مزا آ رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی!!
خواب یاد کر کے منوروا کی گھروالی خوش ہونے لگی۔
اور خود بخود بولی،
"بدا تو اب کرنا ہے!!"
باہر نکل کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی، شفق کی اوڑھنی کا گہرا رنگ ہلکے گلابی رنگ میں تبدیل ہونے لگا تھا۔
گھروالی نے دیکھا کہ روز سویرے اُٹھ جانے والا منوروا ابھی تک خراٹے لے رہا ہے۔ وہ خود بخود بڑبڑانے لگی۔
"ابھی تک سو رہے ہیں!" یہ کہتی ہوئی وہ چل رہی تھی کہ سامنے سے کسی آنے والے پر جھنکو کا دھوکا ہوا۔ وہ قریب آئی تو اس نے پوچھا "اتنے سویرے کیسے آنا ہوا بیٹیا؟"
"میری ساس نے کہلا کر بھیجا ہے کہ منوروا کا اس وقت میکے والوں کے ساتھ جانے پینے کے لئے آ رہی۔" اور منوروا کو سوتے ہوئے دیکھ کر "تم کہہ دینا کاکی" یہ کہتی ہوئی واپس ہونے لگی۔

یہ آواز سن کر منوروا کی آنکھ کھل گئی۔ اُنھوں نے اُٹھتے ہی جھمکو کو آواز دی لیکن وہ گلیارا پار کر کے نکل چکی تھی۔

گھروالی نے منوروا کی طرف دیکھا اور پھر جاتے ہوئے کہنے لگی:

"بالکل پگلی ہے!"

گھروالی کے اس پیار بھرے جملے میں منوروا کو کتنا لطف آیا اس کا اندازہ اتنا چہرے سے نہیں ہو سکتا جتنا اُن کا دل دیکھ کر ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔

اور گھر کا کام کرتے ہوئے اُن کی بیوی بھی دل ہی دل میں جھمکی کا پروگرام بنا رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

× × × × × ×

تیسرے ہی دن جھمکو کو کھلا پلا کر اور نئے کپڑے پہنا کر سسرال بھیج دی گئی۔ لوگ طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے جن کا ایک ہی جواب منوروا کی بیوی سب کو دے رہی تھی: "اس دن تو جلدی جلدی میں رسم پوری کر دی تھی۔ باقی جو کچھ کرنا تھا وہ آج کر رہے ہیں!" اور پھر بھی لوگوں نے یہ تو نہیں کہا کہ "یہ سب کچھ تو پہلے کو کرنا چاہیے تھا تم کیوں کر رہی ہو" مگر منوروا کی گھروالی اس طرح کہتی جیسے وہ ان کے دل کا چور پکڑ رہی ہے: "اب تو جھمکو کی ساری رسمیں یہیں ہی کرنا ہیں بہن!" پھر اس کی آواز بھرّانے لگی اور وہ بمشکل پوری بات کر پائی۔

"اس کا بھائی تو اس سے بولتا بھی نہیں!" — جھمکو بلک بلک کر سسکیاں لے رہی تھی۔ اس جملے نے اُسے جھنجھوڑ دیا اور وہ رونے لگی۔ دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ منوروا چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

ایک عورت نے جھمکو کو ڈھارس دی، "چُپ ہو جا بیٹا! وہ بولتا نہیں تو کیا بھائی نہیں رہے گا! کل ہی بہن، بہن کرتا ہوا آئے گا۔"

جھمکو کے رونے کی آواز گلیارے کے باہر نکڑ والے گھر کے آنگن میں کھڑی ہوئی ایک عورت کے دل میں اُتری جا رہی تھی وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی گھر میں چلی گئی!

منوروا کی گھروالی نے گلا صاف کر کے اور آنکھیں پونچھتے ہوئے جھمکو کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اسی طرح کچھ دیر کھڑی رہی۔ اس وقت اس نے وہ الفاظ ادا کر دیئے جو منوروا کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

"چُپ ہو جا بیٹیا، چُپ ہو جا! جب تک ہم زندہ ہیں تب تک تجھے کس بات کی فکر ہے؟"

ایک طرف تو عورتوں سے بھرے ہوئے آنگن میں آنسو بہاتی ہوئی جھمکو کو سسرال کے لئے وداع کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف دو چار مردوں کے جھرمٹ میں خاموش کھڑے ہوئے منوروا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔!!


عالمی ادب کے ناولٹ

پرل ایس بک

پرل سیڈنسٹرکیر بک بمقام ہِلس بورو مغربی ورجینیا میں بتاریخ ۲۶ جون ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئیں۔ والدین عیسائیت کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے چین سے دوسرے ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے۔ مگر جلد واپس آ کر چین میں مستقل بس گئے۔

اس کے اپنے الفاظ میں "اُس نے یانگ سی دریا کے قریب ایک پہاڑی پر بنے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں بڑے سکون و اطمینان کی فضا میں اپنا بچپن گذارا۔" انھوں نے انگریزی سے پہلے چینی زبان سیکھی۔ اُن کی چینی نرس نے اُن پر سب سے زیادہ اپنا اثر چھوڑا۔ اور اُنھوں نے سب سے پہلے اسی کے ذریعہ وہاں کے عوام کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان کے پاس پرل کے لئے جادو وغیرہ کے قصے کہانیوں کا لامحدود خزانہ اک انتہائی لطیف و خوشی کا ذریعہ تھی۔

پرل پر اپنی ماں کا بہت بڑا اثر پڑا "میری ماں نے مجھے سب کچھ سِکھایا۔ خاص طور پر الفاظ اور ان کے معنی کا حسن۔ اُس نے بچپن ہی میں مجھے حسن کو پہچاننا اور احساسات و مشاہدات کو قلمبند کرنا سکھا دیا تھا۔" پہلے شنگھائی میں تعلیم حاصل کی اور امریکہ میں اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

شمالی چین میں ۵ سال شادی کے بعد گذارے۔ جہاں چینیوں کی قریب ترین دوست بن گئیں۔ اور چینی بھی اس کے قریب آ گئے۔

۱۹۳۲ء میں مسز پرل نے اپنا شہرۂ آفاق ناول "دی گڈ ارتھ" لکھا۔ جس پر انھیں پلٹیزر انعام ملا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اُن کے قلم سے بہت سے عظیم ناول نکلے جن میں 'دی مدر'، 'دی پیٹریاٹ' اور 'ڈریگن سیڈ' بہت مشہور ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں اُنھیں ادبیات کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلی امریکن عورت ہیں۔ جنھیں یہ اعزاز ملا۔ ناول نگاری بقول خود اُن کے اُن کی زندگی کا ایسا مقصد ہے جس کو پورا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے اُن کے ناول زندگی کے حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ پورا پورا خلوص برتا ہو۔



پرل ایس بک



محمد قاسم صدیقی

پرل ایس بک

مترجم محمد قاسم صدیقی

سفر حیات

قدیم چین کا منظر دھندلا اور ویران تھا۔ عالم نیلے آسمان کے پس منظر میں پہاڑیاں جنھیں صدیوں کی ہواؤں کے تھپیڑوں نے گھس کر محض چٹانوں میں تبدیل کر دیا تھا رتیلے رنگ کی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے چوکور اور تکونے سائے ڈھلوان چٹانوں پر پڑ رہے تھے۔ لیکن اس خالی وادی میں واقع برباد شہر جس میں بے ولنڈ ناویل اپنا ڈرامہ کیے جا رہا تھا۔ اس ڈرامہ کا مرکزی نقطہ تھا۔

"یہ سب مصنوعی ہے" اس نے خیال کیا۔ "یہ سب مردہ ہے" لیکن اس مدرسے جب آٹھ سال بھر سے زیادہ ہو گیا اس کے نزدیک موت و حیات میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ گلیڈیز کس طرح اس کے اس نئے دفتر میں آئی تھی جس پر اسے اس قدر فخر تھا وہ دفتر اس تنگ ہال میں ہیڈ ڈاکٹر کے دفتر کے پاس تھا اور اس کا پہلا خدشہ یہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر ہیلنگر نہ سن لے اسے وہ غصہ یاد آیا جو اسے پہلی مرتبہ ملنے پر آیا تھا۔ اب تو اس لڑکی کا نام گلیڈیز جس نے اسے چڑھایا تھا اسے احمقانہ نظر آیا پھر بھی پچھلی بہار میں جو اب اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صدیوں پہلے آئی تھی اس نے سوچا تھا کہ اس کا چمکدار خوشنما مزاج اس لڑکی کے لئے موزوں تھا مگر اب اسے اپنے اس خیال پر بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے پہلے کبھی محبت نہیں ہوئی تھی۔ نہیں، وہ آج بھی یہی کہہ سکتا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت وہ جو کچھ لاں لی کے بارے میں سوچ رہا تھا اسے محبت جیسے الفاظ سے آراستہ کرتا ہی رہے وانی لی اصل میں تتلی کی تھی اور اسے اب احساس ہوا کہ گلیڈیز کے لئے اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ محبت ہرگز نہیں تھی جب کوئی شخص کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے تو یوں ہی اس کو اپنے دل سے نکالتے رہنے کی کوشش نہیں کرتا ہے اور جب وہ گلیڈیز کے ساتھ تھا یا جب کبھی وہ اس کے متعلق سوچتا تھا تب بھی اس کا یہی عالم ہوتا تھا۔ اسے گلیڈیز کی کوفت آمیز انداز کے بالوں کا ضرورت سے زیادہ زرد رنگ گو پسند تھا پھر بھی وہ اسے نظر انداز کرتا تھا اور خود کو مجبور کرتا تھا کہ اس کے [illegible] کا خیال کرتا ہے۔

وہ آکسفورڈ کے ایک پروفیسر کا بیٹا تھا اور لڑکیوں کے متعلق اسے کوئی علم نہ تھا کیونکہ اس کی ماں بہت شرمیلی عورت تھی اور آکسفورڈ کی طالبات محض طالبات تھیں، ان کو کوئی عورتوں کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا پھر بھی اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے اندر رہے گا۔ زمانہ محض تفنن کے ساتھ پیار کرتا ہے حالانکہ وہ اس یاد کو دیکھ اور سہارا دینے پر لیتا تھا۔

اور پھر وہ جن کر جب جون کے مہینے میں ایک دن صبح جب آسمان صاف تھا گلیڈیز نے اس کے دفتر میں آکر کہا کہ میرے پیٹ میں تمہاری امانت ہے تو وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ خوف و ہراس اور حیرانی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اس کی خبر پر یقین کر لیا تھا اسے یہ خیال آیا ہی نہیں کہ جس امانت کا گلیڈیز نے ذکر کیا ہے وہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے اس نے یاد کیا اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا در اصل ابھی کچھ عرصہ پیشتر ہی اس کی اس سے ملاقات ہوئی تھی ایک میخانہ میں اس سے اس کی یوں ہی جان پہچان ہو گئی تھی اس کے ساتھی نے بہت زیادہ پی لی تھی اور وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اسے گھر چھوڑ آئے اور رونلڈ نے اسے گھر تک پہنچانے میں مدد دی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا اسے اس سے رخصت ہوتے وقت یہ محسوس ہوا کہ اس سے اگلے روز پھر ملے اور اس نے فوراً معلوم کیا۔

"کیا آپ کا ساتھی اس پر معترض نہ ہوگا؟"

'کون ہنری؟' گلیڈیز اس کے اس سوال پر اس طرح ہنسی گویا اس نے کوئی مضحکہ خیز بات پوچھ لی ہو اور پھر اس نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا "ہنری قطعی میرا عاشق نہیں ہے اس سے تو بس یونہی سلام دعا ہے"

اور یہ تھا آغاز۔ اس کا خیال پھر دفتر کی طرف گیا یہ ماضی کا واقعہ یک لخت اس کے ذہن میں آیا اب جبکہ وہ اس کے لئے اپنی کچھ محبت سمجھتا تھا بالکل ختم ہو گئی اور تنفر و حقارت کا جذبہ اس پر حاوی ہو گیا۔ اسے یاد آیا جبکہ وہ اس گہری خاموشی [illegible] کچھ چپکا سا بیٹھا ہوا اس کو گھور رہا تھا

اور وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

"او میں کچھ نہیں پال سکتی" اس نے روتے ہوئے کہا تھا "میں ابھی بہت کمسن ہوں" اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی چھوٹی کمر تھام لی۔

"تم نے مجھے مار ڈالا" اس نے ڈرامائی انداز میں روتے ہوئے کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ "خاموش" رونیلڈ نے ایسے لہجے میں کہا کہ اسے خود پتہ نہ چل سکا کہ وہ آواز اسی کی تھی یا کسی اور کی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے آگے مٹھیاں باندھے کھڑا رہا۔ خاموش خاموش، وہ بڑبڑاتا رہا اور بالآخر اس کے ان غضبناک الفاظ سے خوفزدہ ہو کر لیٹی کا رونا رفتہ رفتہ سکون میں بدل گیا۔ "رات کو یہاں آجانا" رونیلڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا "میں خود تمہاری دیکھ بھال کروں گا"

لیکن اسی رات اس چھوٹے تنہا اپرٹمنٹ روم میں جبکہ وہ لیٹی تھی کسی نے دروازہ کی کنڈی کھول لی۔ اس نے تاریکی کے پردہ کو چھوڑ دیا اور خاموش کھڑا اس شخص کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دروازہ میں ہر رات کو قفل لگا دیا جاتا تھا لیکن اس نے تو اندر سے بھی کنڈی لگا دی تھی۔ پھر اس نے کوارٹر کے تالے میں چابی کے گھمانے کی آواز سنی اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر ہیشنگر ہی ہے کیونکہ اس تالے کی کنجیاں اس کے اور ڈاکٹر ہیشنگر کے ہی پاس تھیں۔

"مجھے اندر داخل ہونے دو رونیلڈ"۔ اس نے ڈاکٹر ہیشنگر کو کہتے سنا۔ اس نے فوراً سمجھ لیا کہ چھپانا بیہودہ ہے۔ کیونکہ جب تک اس بوڑھے کو اندر نہ آنے دیا گیا وہ دروازہ پر ہی کھڑا رہے گا۔ لہٰذا وہ دروازہ پر گیا اور اسے کھول دیا۔

"اندر آئیے" اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا "میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ایک ضروری کام آ گیا۔"

"مس بیلی کہاں ہے" ڈاکٹر ہیشنگر نے کمرہ کے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ مس بیلی وہاں نرس تھی۔

"وہ مجھے نہ مل سکی"

لیکن بوڑھے کو حقیقت معلوم کرنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ اس نے نیچے دراز عورت کی طرف دیکھا جس کا چھوٹا سا چہرہ سفید اور رستا ہوا تھا پھر اس نے ایسٹر کی چھلی جھپٹ لی "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے" اس نے چلا کر کہا "تم نرے پاگل ہو"

رونیلڈ نیچے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ جھوٹ بولنے میں کمزور تھا کیونکہ اس نے کبھی جھوٹ بولنا سیکھا ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر ایک لمحے کے لئے کمرہ میں خاموش ٹہلتا رہا پھر بولا "یہ بہت جلد ہوش میں آجائے گی۔ جب تک وہ لوگ تم میرے دفتر میں چلو"

اس نے پھر کلیئر کی جانب نہیں دیکھا اور ڈاکٹر ہیشنگر کے پیچھے پیچھے دفتر میں چلا گیا۔ بوڑھے آدمی نے بڑی احتیاط سے کواڑ بند کر لئے۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے نرمی سے کہا اور خود بھی اپنی بڑی میز کے پیچھے بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آؤ اب کوئی ترکیب سوچو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کس کر کھینچ لئے "اگر تمہارے دل کی یہی کیفیت رہی تو وہ تمہیں فوج میں نہیں گھسنے دیں گے۔"

تلخی کی لہر پھر رونیلڈ پر طاری ہو گئی۔ اس نے سوچا اگر اس کے دل کی وہ کیفیت نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کب سے فوج میں بھرتی ہو چکا ہوتا اور کلیئر سے اس کی ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن یہ کوئی سنگین بات نہ تھی۔ صرف اس کو اپنے میدان میں کام سے باز رکھتی تھی۔ اس لئے انھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم محاذ پر زیادہ کارگر ثابت ہو گے اور اس نے اپنا سر ہلا دیا تھا

اسے اب یقین ہوا کہ اس شکست کے احساس نے اس کی افادیت کو نقصان پہنچایا ہے اور یکبیک یہ بات بھی واضح طور پر اس کے ذہن میں آئی کہ یہی احساس شکست اس کی جذباتی پریشانی کا باعث تھا جس نے چاہے براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی اسے گڑھے میں ڈال دیا اور ساتھ ہی اسے اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی کہ اب وہ اپنے ملک کے لئے کسی اور کے لئے یا اپنے ہی لئے کس مصرف کا رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر ہیشنگر اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے ان کے ہاتھ کوٹ کے پیچھے جاکٹ میں پیچھے بندھے تھے اور وہ انصار سے کے پردے کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ "یہ تو واضح ہے" انھوں نے کہا "کہ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ وہ لڑکی" انھوں نے کچھ نفرت آمیز تاثر سے اپنا منہ بنایا "وہ لڑکیا تم کو تباہ کر ڈالے گی"۔ وہ اچانک گھومے اور انھوں نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا "مگر اگر تم اس جھمیلے میں پڑ جاتے تو پہلے سے کہیں ابتر حالت ہو جاتی۔ وہ تمہیں تباہی کی اس منزل پر لے جا کر چھوڑتی جہاں وہ تم کو لے جانا چاہتی تھی۔ اور تم ان لوگوں میں سے ہو جو محض اس سے مطمئن نہ ہوتے۔ میرا مطلب ہے جنہیں کبھی چیز تمہارے حق میں نہیں ہے۔ کیا تم نے کبھی بلیک میل کا نام سنا؟" اب بوڑھے کی آواز میں قدرے سختی آگئی تھی "تمہاری زندگی تباہ و برباد ہو جاتی۔ ویسے ابھی ہی تمہارا عہدہ کون سا اونچا ہے" اور اب وہ کچھ نرم ہو گئے [illegible]

روزنیلڈ ڈاکٹر کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا کچھ کہنے والا تھا لیکن ڈاکٹر ہشنگز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ اس کے سارے خاندان سے واقف ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تم جیسے کسی شخص کو گرفتار میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ یعنی اگر تم ٹھہر گئے تو وہ تم کو اس لڑکی سے شادی کر لینے پر مجبور کریں گے۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اس تعزیر سے سنبھالا: اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم کہیں اور چلے جاؤ اور اگر تم یہاں سے چلے گئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی اور کو پھنسا لیں لیکن اگر تم یہاں رک گئے" ڈاکٹر ہشنگز نے اس نوجوان کی طرف ہمدردی سے دیکھا۔ "روزنیلڈ میں اس کا انتظام کروں گا میں وعدہ کرتا ہوں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ روزنیلڈ کر اس چلے جاؤ اور وہاں جا کر کسی دور دراز مقام میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کرو۔ کوئی ایسی جگہ انتخاب کرو جہاں جانے سے تم اس الجھن سے بچ سکو شنگھائی یا چلے جاؤ۔"

ایک لمحے کے لئے روزنیلڈ خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے لہجے میں کہا "لیکن میں اس طرح سے جا کر سارا معاملہ آپ پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میں سب نپٹ لوں گا" ڈاکٹر ہشنگز نے کہا "میں کسی نہ کسی طرح اسے سنبھال لوں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم آج رات کی گاڑی سے لندن چلے جاؤ۔ وہاں جا کر تم اپنے والدین کو اپنی اس روانگی کی اطلاع دے دینا۔ آج کل بچے کیسے ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔"

ڈاکٹر ہشنگز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "اچھا روزنیلڈ خدا تمہیں کامیاب کرے۔"

روزنیلڈ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ دو ہفتے بعد وہ روزنیلڈ کراس کے نئے چین کو روانہ ہو گیا مگر ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے اپنی خدمات محض ٹرک ڈرائیور کے پیشہ میں پیش کی تھیں۔

اب وہ اپنی پرانی ٹرک ایک طویل سفر طے کر کے والی تباہ و برباد شہر کی سڑک پر سے جا کر رک گیا وہ جنوب میں ادویات کے لئے گیا ہوا تھا۔ چینیوں میں دوائیاں بانٹ چکا تھا لیکن وہ خالی ہاتھ واپس آیا اور پھر اسی احساس شکست نے اسے آگھیرا۔

بعض اوقات اسے خیال ہوتا تھا کہ اس کا اصل محرک ٹوٹ گیا ہے اور خاص طور پر اسی روز ٹوٹ گیا تھا جس دن آدھی رات کو ڈاکٹر ہشنگز کے دفتر میں اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔

اس نے دور سے سڑک کے آگے پیچھے دیکھا جہاں سڑک پر بمباری ہوئی تھی۔ جس نے سڑک کے سرے کو بند کر دیا تھا۔ اگر جاپانی بمبار نشانہ باز ہوتے تو ہسپتال کو بھی پامال کر دیتے۔ اس نے اپنے لب بھینچے اب تو ان کے سامنے یہ اقبال کرنا اور بھی مشکل ہو گا کہ باوجود جد و جہد کرنے کے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔

اس نے کبھی کوئی چینی شہر پرانا نہیں دیکھا تھا۔ جب دو سال پہلے یہاں اپنا پہلا ٹرک لے کر آیا تھا تو تین چوتھائی شہر میں ٹوٹی پھوٹی شہتیری رنگ کی اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اس کے بعد شہر پر کئی بار بمباری ہو چکی تھی۔ اور وہ اینٹیں جو گندی ہوئی مٹی سے بنائی گئی تھیں روز بروز ٹوٹ ٹوٹ کر خاک میں ملتی جا رہی تھیں۔ سڑکوں پر ویرانی طاری تھی لوگ پہاڑوں کے غاروں میں چھپتے پھر رہے تھے۔

مگر اسے ویران اور اجاڑ مقاموں کی عادت تھی۔ آنا فانا تین خالی ہوتے والی سڑکوں کا اسے تجربہ تھا۔

ڈرامائی منظر کی حیثیت کی خوبیوں کا ایک جز تھا کہ اس شہر میں گھنٹے یونہی گزر جاتے ہیں جب وہاں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ حتیٰ کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہ ٹرک سے نیچے اترا۔ غصہ ہوا اس کا کوارٹر ٹوٹ کر گر چکا تھا اور اسی طرح ٹرک کی ہر ایک چیز ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ اس نے انگڑائی لی اور اس کے کپڑوں سے گرد و گرد کا بادل نکل گیا جیسے سخت چمکیلی دھوپ میں دھواں اٹھنے لگے اسے اپنے انگریز باپ اور آئرش ماں سے ورثے میں تاریکی ملی تھی اور اس کی آنکھیں بانسری کی طرح اندر ہی اندر جلتی ہوئی کتھئی رنگ کی تھیں۔ گرد گرد نے اس کی جلد پر ایک پھیکا زرد رنگ بکھیر دیا اور اس کے بالوں کو گندمی بنا دیا اس نے منہ پھیر کر گرد صاف کی۔ ٹوپی کو داہنی آنکھ کی طرف ترچھی کر کے سر پر جمایا تاکہ اس میں کچھ ہمت پیدا ہو جائے اور سامنے کھنڈروں میں واقع تنہا عمارت میں داخل ہو گیا۔

اندر ایک خوبصورت دکھائی دینے والا چینی نوجوان ایک میز پر بیٹھا ہوا کسی کتاب میں کچھ نام لکھ رہا تھا۔ برش نما قلم سے بڑی احتیاط کے ساتھ وہ ایسے معمولی فوجیوں کے نام لکھ رہا تھا جیسے "یانگ" "مو" "پان" وغیرہ

"ہیلو" "شان" روزنیلڈ نے کہا۔

نوجوان چینی نے اپنا برش دوات کے کنارے پر رکھ دیا اور بڑی مسرت سے کہا: "مسٹر فادوبل" اس کا بھلا سا چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا۔ اور اس کی خوشگوار آنکھیں عینک کے پیچھے چمک اٹھیں: "کیا آپ

لکھو روفارم لے آئے

روئیلڈ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں لا سکا" اس نے مختصر جواب دیا "تیج کہاں ہے۔" وہ ہمیشہ تیج کے بارے میں معلوم کیا کرتا تھا۔ اگر سال بھر پہلے کوئی اس سے کہتا کہ اس کی سب سے زیادہ قربت کسی نوجوان ہندو سرجن سے ہو گی تو وہ اس پر یقین کئے بغیر مسکرا دیتا۔

"اس وقت ڈاکٹر ہسکر شگاف کر رہے ہیں" شان نے جواب دیا۔ اس کے چہرے کی چمک غائب ہو گئی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا "آج ہم پر بمباری ہوئی ہے ہسپتال میں ہر جگہ تکلیف کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اب تو کوئی امید تک بھی نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے" روئیلڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے اپنی گرمی پر خود کو کوسا اور کمرے سے گزر کر خاموشی سے اس نے کواڑ کھولے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہو گا۔ خالی کمرہ میں عارضی آپریشنگ میز پر تیج ہیناپر انا مگر صاف ستھرا کوٹ پہنے ہوئے کام میں مصروف تھا۔ اس کی پیشانی پر لگے ہوئے شیشے سے دھوپ کا عکس کھڑکی میں ہوتا ہوا نوجوان فوجی کے پیٹ پر پڑ رہا تھا مریض کی آنکھیں بند اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ تیج کا خوبصورت سیاہ چہرہ پسینہ سے شرابور تھا اس کے نحیف کالے ہاتھ پھرتی سے نزاکت کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ لالی اس کے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھوں میں اوزاروں کی ٹرے تھی۔ اس کی آنکھیں روئیلڈ سے چار ہوئیں اور وہ مسکرا دی لیکن وہ وہاں سے ہلی نہیں۔

نہ معلوم روئیلڈ کی آنکھوں میں جو احترام تھا وہ اس کو جان سکی یا نہیں کیونکہ اس نے اس کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ جو لگاوٹ میں اس سے رکھتا ہوں وہ اسے جانتی بھی ہے یا نہیں۔ یہ وہ لگاوٹ تھی جو اتنی ہی اچھی تھی جتنی اس کی گلبرٹ میز سے محبت۔ مگر گلبرٹ میز اور اس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس کے چمکتے گھیرے کالے بال لمبی آنکھیں حسن کے معیار پر پورا اترنے والا چہرہ، آواز اور آداب و اطوار میں نزاکت، ادائیں، خاموشی۔ بھلا یہ خصوصیات کسی عورت میں موجود ہوں اور اس سے محبت نہ کی جائے لیکن اس۔ بڑا اپنی بیوقوفی کو اپنے رواجی قید خانے سے فرار نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اس کے عزیز ترین دوست تیج کی محبوبہ تھی۔ جس کی جان و جسم اور خوبصورتی سب کچھ تیج کے لئے وقف تھیں۔ اس سب کے علاوہ وہ چینی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہر نقل و حرکت۔ جب وہ اوزار جو تیج استعمال کرنے کے بعد رکھ دیتا تھا اٹھاتی اور اسے دیکھتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیتی تھی

میں ڈالتی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

"میں آگیا ہوں تیج" بالآخر اس نے آہستہ سے کہا۔

تیج نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اس نے رواں خالص انگریزی میں کہا "میں فوراً سن کرنے والی دوا کا استعمال کر سکتا ہوں۔"

"میں وہ دوا نہیں لا سکا" روئیلڈ نے جواب دیا

تیج کے چہرے پر بے چینیاں اڑنے لگیں مگر اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے کام کی رفتار مدھم نہیں کی۔ مگر اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

"کیا میں اب جاؤں" روئیلڈ نے دریافت کیا۔

"نہیں" میں تقریباً کام ختم کر چکا ہوں۔ تیج نے جواب دیا اور روئیلڈ انتظار کرنے لگا۔ وہ تیج کو دیکھتا رہا۔ اپنی ناقابل یقین مہارت کا مظاہرہ کرتے تیج نے اسفنج نکالے اور انہیں خاموشی سے شمار کرنا شروع کیا اور اس کے بعد اس نے زخم میں ٹانکے لگانا شروع کر دئیے۔ اب بھی روئیلڈ اسے غور سے گھورتا رہا۔ وہ موت و حیات کی کشمکش میں تھا، خون، ادھڑا ہوا گوشت، اور درد کی تکلیف یہ سب دیکھ کر اور اس قابل تعریف جوڑے کی طرف دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر اس کی تعریف کر رہا تھا وہ نوجوان چینی سپاہی جو ہو جو تکلیف کے سبب ہنس رہا تھا اور وہ نوجوان ہندوستانی سرجن جو سرجری کے فن میں کمال رکھتا تھا۔

"تم چین کیوں چلے آئے" اس نے ایک مرتبہ تیج سے دریافت کیا تھا

"کیونکہ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں" تیج نے جواب دیا۔

"ہائے رے میری ماں" اب سپاہی بے ہوشی کے عالم میں کراہا۔

"ذرا تمہارے زخموں کو سی لوں تب تک اور برداشت کر لو" تیج نے آہستہ سے کہا "تم نے بڑی ہمت اور بہادری کا ثبوت دیا ہے"

سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اوپر کی دبیز چھت کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

لمحہ بھر بعد تیج لالی کی جانب مڑا "اب اس شخص کو یہاں سے جا سکتی ہو" اس نے کہا۔ وہ دروازہ تک گئی۔ دو اردلی آئے انہوں نے ٹیبل کے تختے کو اسٹریچر کی طرح اٹھا لیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی جوں ہی وہ روئیلڈ کے قریب سے گزری مسکرا دی

"او منحوس خبر لانے والے۔ آج دوپہر کو ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ"

وہ سرگوشی کے لہجہ میں بولی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جواباً مسکرا دیا اس کی مسکراہٹ میں عجیب عنصر تھی کہ کہیں لالی اسے بچہ تو خیال کر

پہلے۔ وہ اس قدر حسین تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گذری تو اس نے اس کی بالائی جیسی جلد کو بغور دیکھا اور اس کے بالوں سے چنبیلی کی خوشبو آئی، اس کی چال میں ایک ڈرامائی کشش تھی۔ کیونکہ وہ ایکٹرس رہ چکی تھی۔ جب جاپان کے پہلے وہ نوجوان اداکاروں کے گروہ کے ساتھ پیکنگ سے آئی تھی اور اس نے پہاڑیوں کے سامنے کچھ جوشیلے ڈرامے پیش کئے تھے تب ہی تیج کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ تین ہی روز میں ان کی شادی ہو گئی اور اس نے ان دونوں جاننے والوں کو رومان کی طرف راغب کر لیا جس سے تیج کو نفرت سی ہوئی۔ وہ عام طور پر اس سے سختی کے ساتھ پیش آنے لگا اور لال لی نے اس کی اس سختی کا گستاخی کے ساتھ [illegible] کی اور اس کی گستاخی رونیلڈ کو بڑی پُرکشش اور دلفریب معلوم ہوئی

اس نے اپنے اور تیج کے درمیان دروازہ پر پردہ ڈال دیا اور اس نے مڑ کر تیج کو دیکھا جو بڑی احتیاط سے پانی پینے کے مگ میں سے انڈیل کر کٹورے سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ برتن مقامی مٹی کا بنا ہوا ہوتا تھا جو پکے ہوئے زرد رنگ کا یا پھیکے کتھی رنگ کا اور بھونڈی سی چمک لئے ہوئے ہوتا تھا۔

"تم ناکہ بندی نہیں توڑ سکے" تیج نے پوچھا۔ اس نے [illegible] ہاتھ خود سے بھیگا اس کے ہاتھ پر خون کی چپکیلی سرخ لکیر بنی ہوئی تھی۔

"تم نے تو اپنا ہاتھ کاٹ لیا" رونیلڈ نے سہم کر کہا۔ بھلا وہ تیج کو ناکہ بندی کے بارے میں کیا بتاتا؟

"نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں ہے" تیج نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کی پتلی کلائی اور انگلی ہاتھ سے جو خون بہہ رہا تھا تیج نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی چکنی سیاہ جلد پر ہلکا سرخ خون بہت زیادہ نمایاں اور چمکدار تھا۔

"تمہاری کلائی سے تو خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے" رونیلڈ نے کہا۔

"خون کا اخراج میرے لئے مفید ہے" تیج نے خاموش لہجہ میں کہا۔ "سپاہی کے ناسور تھا جس کا ورم کا اخراج کرنا چاہتا تھا اور اگر اسے بچاتا تو انخلا ممکن نہیں تھا۔"

"کیا تمہارے پاس دستانے نہیں تھے" رونیلڈ نے معلوم کیا۔

"نہیں۔ اپنا آخری جوڑا کوئی دس روز ہوئے پھاڑ ڈالا تھا" تیج نے جواب دیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کپڑے کی بوتل لی اور اس کا الکحل زخم میں ڈال دیا پھر اس نے اپنی ہتھیلی پر ایک پٹی باندھ دی "آؤ چلیں" اس نے کہا "کھانے کا وقت ہو گیا۔"

اس نے سرجن کا کوٹ اتار دیا کوٹ کے نیچے ایک بوسیدہ سوٹ ایک ناقابل بیان سفید سوتی کپڑے کا لباس جو گردن تک کسا ہوا تھا اور جس میں دوٹ گریبان تھی۔ یہ وہ لباس تھا جو عموماً چینی فوجی پہنتے تھے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ رونیلڈ کے کندھے پر رکھا اور وہ دونوں باہر نکلے۔

"ناکہ بندی" اس نے رونیلڈ کو یاد دلایا۔

"پہلے سے کہیں بدتر ہے" رونیلڈ نے مستقل مزاجی سے کہا "میں نے اپنی سب پرانی چالبازیاں کام میں لیں۔ مگر ناکام رہا۔ ناکہ بندی ۲۰ میل تک ہے"

"تعجب کی بات ہے کہ تمہیں کوئی ایسا نہ ملا جو ناکہ بندی توڑنے میں تمہاری مدد کرتا"

"جی اب تو صورت حال پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔ حکومت شمال مغرب پر بالکل اعتبار نہیں کرتی۔ تمہیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انھوں نے کمیونسٹوں سے جنگ کی اور جاپانیوں کے حملے کے برسوں پہلے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ چھاپہ مار سب کے سب کمیونسٹ نہیں ہیں وہ سارے شمال و مغرب پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انہیں رسد بہم پہونچائی جائے۔

تیج کے چہرے پر اداسی کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس کی ابھری آنکھوں میں جلن ہونے لگی "کیا تم کسی سپہ سالار جیسے بوڑھے پو کو رشوت دے سکتے تھے؟"

"نہیں بوڑھے سپہ سالار اس بات پر یقین ہی نہیں کرتے کہ سپاہی گویا دشمن سے جنگ کر رہے ہیں" رونیلڈ نے کہا "انھیں اپنی جان کی پڑی ہے میں نے قاصد کو بوڑھے پو کے پاس بھیجا تھا اور کہلوایا تھا کہ میں اس سے ملاقات کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا وہ آخرکار سمجھ گیا کہ میرا مقصد کیا ہے اس نے مجھے بلا بھیجا جب میں وہاں پہنچا تو وہ ایک قدیم لارڈ کی مانند بیٹھا ہوا تھا۔ موٹا بھدا اور بے ڈھنگا سا میں نے اس سے ان دواؤں کے بارے میں دریافت کیا جو ہمارے لئے امریکہ سے بھیجی گئی تھیں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہ ان دواؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جب میں نے اس کو بتایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو اس نے بتایا کہ امریکہ سے آئی ہوئی تمام ادویات [illegible] دوستوں کے لئے استعمال ہو گئیں"

"ان تمام کے پہاڑیوں نے تین روز پہلے کوئی ایک ہزار جاپانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا" تیج نے کہا۔ "ہاں جب کبڑا زخمیوں کو لایا تھا تو اس نے مجھے یہی اطلاع دی تھی۔"

"میں نے واپسی میں اس کے متعلق کچھ افواہیں سنی تھیں" رونیلڈ نے جواب دیا

یہ اس لنڈگی کے قریب کا ایک حصہ تھا کہ انھوں نے کبھی لن تان کو نہیں دیکھا تھا صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ اجاڑ پہاڑیوں میں کہیں یہ چھاپہ ماروں کا سردار رہتا تھا اور ساٹھ ہزار گمنام ... اس نے اپنے علاقہ کے دس ہزار کسان سپاہیوں کو رہنمائی کی تھی اس میں حکایت اور حقیقت کا امتزاج تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس کچھ بیرونی ملکوں کی اسناد ہیں جن کی رو سے وہ تیز زبان چاہے بول سکتا ہے اس کا قد ساڑھے چھ فٹ اونچا بیویوں میں ایک روسی بیوی یا تھوں میں دو دو انگوٹھے یہ خصوصیات بھی اسی کی تھیں۔

یہ سب سن کر رونیلڈ نے کہا "دو انگوٹھوں کی بات تو میں یاد کر سکتا ہوں، لیکن چاہے قابل یقین ہو یا نہ ہو یہ حقیقت تھی کہ لن تان نے گذشتہ ماہ میں دشمن کی فوجوں کو کوئی سو میل پیچھے دھکیل دیا تھا۔

میں نے بوڑھے پوچھا کہ لن تان نے کسی بھی چینی فوج کے جرنیل سے زیادہ جاپانیوں کو مارا ہے " رونیلڈ نے جاری کیا "لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اس بیان سے دو لن تان اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔

ملبے کے ڈھیر کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر کچھ دور تک وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"مجھے افسوس ہے" رونیلڈ نے بالآخر کہا "میں کچھ تو جانتا ہوں کہ آخر بغیر دواؤں کے آپریشن کرنے میں کیا مشکلیں پیش آتی ہیں یہ تو یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ اس ضمن میں ضرور ہونا چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے!"

"چونکہ ہم پر باقاعدگی سے بمباری ہو رہی ہے اس لئے یہ تو ظاہر ہے کہ بحیثیت مجموعی فتح ہماری ہوگی" تیج نے کہا

انھوں نے ایک تباہ شدہ صحن طے کیا اور ایک دروازہ میں سے ہو کر جس میں کواڑ نہیں تھے وہ لوگ سامنے گئے ایک خالی کمرے میں لالان ہلکے نیلے رنگ کے سوتی گاؤن میں ملبوس میز پر پیالے اور رکابیاں سجا رہی تھی اس کا سرخ منہ بالکل ٹیڑھا ہو گیا۔

"میں جانتی تھی تم آج یہاں آؤ گے" اس نے رونیلڈ سے کہا۔ آج صبح ایک بڈھی عورت دیہات سے جیب میں انڈے رکھ کر لائی تو میں نے سوچا رونیلڈ آنے کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ خدا نے [illegible] رونیلڈ میں نے بار بار یہ دیکھا ہے جب تم چلے جاتے ہو تو ہفتوں ہم باجرہ اور گوبھی پر گذارا کرتے ہیں اور پھر اچانک کوئی مچھلی پکڑ لاتا ہے اور تیج کو دے دیتا ہے اور میں غور سے دیکھتی ہوں۔ آہ اب تو رونیلڈ آنے والے ہوں گے کیونکہ ان کی تقدیر سے خدا نے آج مچھلی بھیجی ہے اور شام ہونے نہیں پائی کہ تم یہاں موجود ہوتے ہو۔

رونیلڈ نے اس کے حسین چہرے کو جی بھر کے دیکھا اور مسکرا دیا اسے دیکھتے ہو لالان لی کی سیاہ آنکھیں مسرور ہو گئیں۔ لیکن تیج نے اس کی گفتگو کی طرف توجہ دئیے بغیر رونیلڈ سے سنجیدہ لہجہ میں اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

" اور اسپیشل رسد کے چھ ٹن جو تھے جنھیں ناکہ بندی کے حکام نے گذرنے نہیں دیا۔ کیا وہ وہی ہیں جن کا ذکر بوڑھے تپو نے کیا تھا؟"

" وہ وہی ہو تھے" رونیلڈ نے جواب دیا "ہماشر کے ختم ہونے کے پہلے ہی امریکہ سے آخری جہاز آیا تھا۔"

" جلدی سے ہاتھ منہ دھو لو" لالان لی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ انڈے تیار ہیں۔

اس نے ایک چھوٹی تانبے کی کیتلی میں سے گرم پانی مٹی کے برتن میں انڈیلا اور رونیلڈ کو ایک صاف ستھری تولیہ تھما دی۔ اور اس لمحہ اس کی نظر تیج کے زخمی ہاتھ پر پڑی۔

" تیج" وہ چیخ پڑی "یہ تم نے کیا کر لیا؟"

"میں نے اپنے ہاتھ کو کاٹ لیا ہے"۔ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"لیکن کب میں نے تو دیکھا نہیں"

"میرے خیال سے یہ اس وقت ہوا جب رونیلڈ نے آکر کہا کہ بیہوش کرنے کی دوا نہیں ملی۔ میں کلورو فارم پہ ٹیک کئے بیٹھا تھا۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

اس نے تیج کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے نہایت نزاکت سے سنبھال کر بیٹھی "لیکن یہ تو بڑا کاری گھاؤ ہے"

اس نے متحیر ہو کر کہا " یہ بہت گہرا زخم ہے "تمھیں چاہیئے تھا کہ وہیں رک جاتے اور اپنا ہاتھ کسی چیز میں ڈبو لیتے "

" میں ایک سیکنڈ بھی نہیں رک سکتا تھا" اس نے جواب دیا " مجھے اس شخص کو زندہ رکھنا تھا " ان دونوں میں ایک دوسرے کے لئے جو گہری محبت تھی اسے دیکھ کر رونیلڈ کو رشک ہوا۔ تیج نے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی آنکھیں جو لالان لی کو گھور رہی تھیں، محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ اور لالان لی اپنی آنکھیں اوپر کئے ہوئے پرشوق انداز میں تیج کو دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا
تیج نے اپنی بائیں ہتھیلی سے اس کے رخساروں کو چھوا۔

رونیلڈ نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔ اس لمحے اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا
اس نے جلدی سے بھدے پن سے کہا۔

"میرا خیال نہ کیجئے"

"نہیں نہیں" کوئی بات نہیں تیج نے مسکراتے ہوئے کہا تاہم وہ دونوں الگ ہو گئے اور لاں لی کھانا پکانے میں لگ گئی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ رونیلڈ تم یہاں پیاو رتیج تم ادھر بیٹھو میں اسٹو کے قریب بیٹھوں گی۔ اور دیکھو جب تک انڈے تمہارے پیٹ میں نہ پہنچ جائیں باتیں وباتیں مت کرنا انڈے دو ہیں ایک تیج کے لئے دوسرا رونیلڈ کے واسطے۔"

"اور آپ کا انڈا کہاں ہے" رونیلڈ نے کہا۔

لاں لی نے منہ بنایا۔ مجھے انڈوں سے نفرت ہے اس نے گویا کھاتے ہوئے کہا "ہاں کبھی مجھے انڈوں سے سخت نفرت ہے۔"

"جھوٹی کہیں کی" رونیلڈ نے مسکراتے ہوئے کہا

"کھاتے جاؤ" اس نے حکم دیا "کھانے میں چپ رہو" بکواس مت کرو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"

لیکن تیج نے چینی کا چمچہ اٹھایا اور اس کے پیالے میں جو شوربا تھا اس میں انڈے کا تھوڑا حصہ ڈبویا اور اسے لاں لی کے ہونٹوں تک لے گیا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں اس نے سختی سے کہا

اس نے اپنے سرخ لبوں کو بھینچا۔ پھر یکایک کھولا اور انڈا نگل گئی۔ اور تیج بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا

یہاں بہار ہی کے ہوئے اس عمارت کے خالی کمرہ میں بیٹھ کر رونیلڈ کو بڑی زندگی اور تازگی محسوس ہوئی، دیواروں پر جو بہار ہی ہوئی تھی اس کے باعث کھڑکیوں کے کواڑ دیواروں سے الگ ہو گئے تھے اور وہ تینوں عمارت دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے جو سوراخوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی رونیلڈ تھوڑی دیر کے لئے خود بخود چلنے والی مشین بن گیا تھا اور ان برباد شدہ مکانوں اسنان سڑکوں پر سے اپنی ننھی لڑکی کو دیکھنے چلا جا رہا تھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے" اس نے کہا

"اور یہی میرا خیال ہے" لاں لی نے کہا

گو تیج کو سمجھ دونوں کے سے خواص رکھتا تھا مسکرا دیا اس نے بھوک

کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا لاں لی نے چودہ بارہ اس کے کٹورے میں سوپ ڈالا تو اسے قبول کر لیا۔ وہ سب نوجوان تھے اور بھول ان کو ستا رہی تھی۔ اس موقعہ پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے وہ اپنے سنجیدہ کام کو بھول گئے تھے۔ اس مختصر زندگی میں ایک لمحے کے لئے رونیلڈ کو یہ بالکل مناسب محسوس ہوا کہ وہ اور تیج دونوں اس خوبصورت لڑکی سے محبت کریں

لیکن تیج اپنی زندگی اور موت کے کام کو فراموش نہ کر سکا اور موت اس کے اتنی ہی قریب تھی جتنی کہ زندگی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا" اس نے کھانا کھا چکنے پر رونیلڈ سے کہا کہ تمہارے لئے دشمن کی صفوں میں سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت سپہ سالار کی ناکہ بندی سے نکلنے کے۔ میری مراد پیکنگ سے ہے۔

رونیلڈ نے اس بات پر غور کیا "ممکن ہے" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے آنے سے پہلے پیکنگ میں بہت دوائیں تھیں۔ تیج نے کہنا جاری رکھا یہ صحیح کہ چوری چھپے دوائیں نکال لینا سہل نہیں لیکن ایسا ممکن ضرور تھا۔ دشمن کو تو رشوت دے کر بھی پیچھا چھڑایا جا سکتا تھا اور پیچھا چھڑایا ایک اور سہولت یہ بھی ہے کہ پچھلے پہاڑی لوگ تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ ہے نا! صرف کرنے سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔

"ہاں" رونیلڈ نے مشتبہ لہجے میں کہا۔ یکایک وہ اس خیال سے کانپ گیا کہ اب اسے اس کمرہ کی جنت چھوڑ کر اس قسم کے سفر پر جانا پڑے گا اور اگر ایسا ہوا تو وہ اس کے لئے ناقابل اعتبار طور پر مشکل ہوگا اور خطرناک بھی ثابت ہوگا لاں لی نے اپنے چاپ اسٹک رکھ دیئے اور دونوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگی۔ تیج تم رونیلڈ کو اس قدر غیر سنجیدہ لہجہ میں زندگی بسر کرنے کو کہہ رہے ہو۔ اس نے اب کہا

کوئی بات نہیں۔ رونیلڈ نے مداخلت کی۔ اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں جھوٹ بولنا اب سیکھ لیا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملازم میری خدمت کو تیار رہتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو خط میں لکھا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ لاں لی ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اگر وہ کسی چینی گاؤں میں اچانک مر جائے یا کسی پہاڑی راستے پر اسے کوئی گولی مار دے تو اس کی اہمیت نہیں۔ وہ تو درحقیقت اس کے تمام تجربوں کا اختتام ہوگا جو زندگی سے متعلق ہوں گے۔

تیج کی اور اس کی آنکھیں چار ہو گئیں "رونیلڈ کو یہ معلوم ہے کہ میں اس سے وہی کام کرنے کو کہتا ہوں جو کرنے کے لئے میں خود بھی تیار ہوں۔ اس نے

جواب دیا۔ وہ اپنے دانت ہاتھ کو ذرا سختی سے سنبھالتے ہوئے اُٹھا۔

"مجھے اب جانا ہے" اس نے کہا "سات آدمیوں کا آج رات آپریشن کرنا ہے"

"اور تمہارا ہاتھ" رونیلڈ نے دریافت کیا۔

"اس کا چنداں خیال نہ کرو" سیچ نے جواب دیا

لال لی بیٹھ سے رکابیاں اٹھانے کے لئے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک تانبے کی کیتلی کے گرم پانی سے انھیں دھویا۔ اور مٹی کے چولھے کے کنارے سوکھنے رکھ دیا۔

جب سیچ کمرے سے باہر گیا تو وہ بھی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے ساتھ صحن تک گئی صحن اب زخمی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب کے سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ ایک سمجھدار چینی بیوی کی طرح اپنے شوہر کے احترام کے لئے اس کے پیچھے چلنے لگی رونیلڈ نے جو سیچ کی دوسری جانب چل رہا تھا اس کی طرف دیکھا اور اس نے شرارتاً ہاتھ ہلا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ سیچ گھورا وہ فوراً اسے رخصتی سلام کرکے مسکرایا اور لال لی کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا

آپریشن کے کمرہ کے دروازے پر رونیلڈ نے دیکھا کہ سیچ نے جونہی اپنا کام شروع کیا اس کے چہرہ پر وہی پہلی کشیدگی سی آگئی اور رونیلڈ نے ایک لمحے کے لئے جائزہ لیا کہ کیا میں نے وہ سب کام خلوص سے انجام دیا جو کہ میں بوڑھے کے ساتھ دے سکتا تھا۔

لیکن تو جیسے سخت بوڑھے کو پٹیانا کس کے بس کی بات تھی جب اس نے اس سے کہا تھا کہ سینکڑوں سپاہی بغیر کلوروفارم کے آپریشن کروانے پر مجبور ہیں تو وہ سپہ سالار بجائے متاثر ہونے کے خلا میں دیکھتا رہا اور اپنے چاندی کے خلال سے دانت کریدنے لگا۔ کسی کے مصائب کی اسے قطعی پروا نہ تھی۔ خصوصاً نوجوان لوگوں سے اس کو کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا کیونکہ وہ ان سب کو نہیں تو ان میں سے اکثر کو سرکش سمجھتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ بہاڑی اس وقت جاپانیوں سے جنگ کر رہے تھے لیکن وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہی لوگ مجھ جیسے سپہ سالاروں سے جنگ کریں گے اس لئے ان میں سے جتنے بھی آج لڑتے لڑتے کام آجائیں تو کل اس کے حق میں اچھا ہی ہوگا۔

"میرے پاس بحث کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے" اس نے بلند آواز میں دانت چوستے ہوئے کہا تھا۔ مجھے اور بھی بہت سے اہم کام انجام

رونیلڈ نے یہ سب کچھ سوچ کر آہ بھری اور کفِ افسوس ملنے لگا "مجھے افسوس ہے"۔ اس نے کہا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

یکایک لال لی اور سیچ کے چلے جانے کے بعد اسے کچھ تکان محسوس ہوئی گذشتہ ساڑھے تین دن اور راتیں اس کو ٹرک چلاتے گذر رہی تھیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ کئے اور آہستہ آہستہ کھلی سڑک پر نکل گیا۔ وہاں اس کی ٹرک سڑک پر تھی جو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے انجن کھٹکھٹایا اور لپک کر اندر جا بیٹھا۔ ٹرک اس قدر ناقص تھا کہ جونہی انجن اسٹارٹ ہوا ٹرک چلنے لگتی تھی اور اسے ہر مرتبہ دوڑ کر اس کو پکڑنا پڑتا تھا۔

اس سنسان سڑک پر وہ ٹرک کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلاتا ہوا ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف لے گیا جو تین سڑکوں کے بعد کچھ فاصلہ پر واقع تھی یہاں وہ اور فانی اپنے ٹرکوں کے درمیان قیام کرتے تھے مگر اسے اب یہ علم نہ تھا کہ وہ جھونپڑی موجود بھی ہے یا نہیں اس نے بریک دبائے اور ٹرک چوں چوں کی آواز کے ساتھ رک گیا۔ اس نے سفید رنگ کے سوتی پردے کو جو دروازے پر پڑا ہوا تھا اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا یہ کمرہ خالی تھا وہاں صرف ایک بستر بنیر اور دو اسٹول پڑے ہوئے تھے فانی جو اس کا معاون تھا چٹائی پر گٹھڑی بنا ہوا پڑا خراٹے لے رہا تھا وہ شاید کچھ دیر پہلے ہی وہاں آیا تھا۔ مگر اس کی ٹرک کا کہیں پتہ نہ تھا رونیلڈ کے داخلہ پر فانی چونک اٹھا وہ جمائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

تمہارا ٹرک کہاں ہے رونیلڈ نے پوچھا

پچھلے قصبہ میں جو لوہار ہے جب ہم اس سے گذرے تو اس کو دے آیا تھا وہ دو دن کے بعد دے گا فانی نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے خمار آلود تھیں۔ میں نے پیدل کھیتوں کو پار کیا اور ایک گھنٹہ ہوا یہاں پہنچا ہوں۔

فانی پھر اپنی چٹائی پر لیٹ گیا اور رونیلڈ نے اپنے جوتے کے بند کھولے اور دو اسٹول کے درمیان گدا ڈال کر لیٹ رہا اس کا تمام بدن درد کر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کی خنک ہواؤں نے اس کے لئے شراب کا کام کیا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار نظر آنے لگا۔ آج رات اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ اس لئے کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو چکا تھا۔

اپنی آنکھیں کھولیں
"ڈاکٹر نگساتت ڈاکٹر نگسار" فالی پکار رہا تھا۔
تیج رونیلڈ ایک دم جاگ اٹھا
اس کی بیوی تم سے فوراً ملنا چاہتی ہے فالی نے کہا۔ وہ بستر سے گود
گیا اور اپنے جوتے تلاش کرنے لگا۔ اس نے جلدی سے جوتے پہنے۔
"وہ کہتی ہے جلدی چلو" اس نے خود کہا۔
رونیلڈ جلدی سے دروازے سے نکل گیا۔ وہ کتنی دیر سے سویا ہوا تھا
سورج نے چاندنی کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا جس میں یہ مردہ شہر ایسا
معلوم ہوتا تھا جیسے کہ پیلی مٹی سے بنا ہو۔
فاصلے پر پہاڑ چاندنی میں اور حسین معلوم ہو رہے تھے "وہ خوابوں
کی طرح حسین ہیں۔ اس نے چلتے چلتے اسی رنگ کو دیکھا جو بے لسبی سے ہسپتال
کے دروازہ پر ٹمٹما رہا تھا۔
وہ وہاں پہنچ گیا۔ لاآن لی کی انگلی اسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر پہنچ گئی
"ہش" اس نے کہا تیج ابھی ابھی سویا ہے تم کہاں تھے۔
سو رہا تھا۔ تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہیں بلایا۔ اس نے کہا بلایا تھا
میں نے فالی کو تمہیں لینے کے لئے گھنٹوں گذر گئے جب بھیجا تھا اور اسے سب
بتلا دیا تھا۔
"بدمعاش" اس نے کہا۔ اس نے مجھے نہیں اٹھایا۔
"اچھا" اس نے کہا کہ تم دوسرے گاؤں گئے ہو اور صبح تک واپس
نہ ہو سکو گے۔
تم ٹھہرو میں اسے دیکھ لوں مگر تیج کیسا ہے۔ رونیلڈ نے کہا۔
آہ اس کا ہاتھ' اس نے خود ہی اپنے ہاتھ کا آپریشن کر لیا اس سے اسکو
بے حد تکلیف ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا بخار بڑھ رہا ہے۔ مگر وہ مجھے کچھ کرنے
نہیں دیتا اور اب لن تان نے پیغام بھیجا ہے کہ دشمن کا دستہ جنوب کی طرف
سے آ رہا ہے تب ہی فالی نے مجھے بلایا ہے" میں نے سوچا "تمہیں لن تان
کی بات کا تو خیال کرنا ہی چاہیئے تھا۔ رونیلڈ نے غصہ سے کہا۔
وہ اس کے ساتھ ساتھ تیج کے رہنے کے کمرہ میں گیا۔ وہ تیج کی شادی
کے بعد سے اس میں جاتا ہوا شرماتا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ ساتھ ساتھ رہتے
تھے اس نے کھڑکی میں سے سر ڈالا اور اندر داخل ہو گیا۔
تیج بستر پر تھا۔
یہ پلنگ لاآن لی کے پلنگ جیسا تھا لاآن لی نے پلنگ کے لئے ایک

چادر تیار کی تھی جو بچھی ہوئی تھی۔ تیج کے بستر کے پاس فرش پر ایک آٹھ سالہ
بچہ جیسا نحیف و زار شخص بیٹھا ہوا تھا اس کے گرد رشالو لپٹا ایک
بھاری کوٹ تھا۔ رونیلڈ نے اس کو اشارہ کیا لیکن بچے نے اس کا کوئی
جواب نہ دیا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب رونیلڈ بستر پر لیٹنے کو گیا
تو کپڑے کی معصوم مگر چمکتی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔
تیج آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کا سر ایک تکیہ پر تھا اس
کا زخمی ہاتھ پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اور اس کی بغل میں رکھا تھا
رونیلڈ نے دیکھا کہ اس کا خوبصورت چہرہ بخار سے تمتما رہا ہے۔
اس کے خشک ہونٹ انگارے ہو گئے ہیں۔ رونیلڈ نے اس کے
ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آگ پر رکھ دیا
ہو۔ تیج نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھا۔
رونیلڈ۔ اس نے بچے سے پکارا۔
تیج تم کیسے ہو رونیلڈ نے آہستہ سے پوچھا۔
ٹھیک نہیں ہوں رونیلڈ اس نے مری ہوئی آواز سے کہا۔
تیج کی پلکیں رفتہ رفتہ بند ہونے لگیں اس نے بیہوشی میں کہنا شروع
کیا۔ لن تان، لن تان کہتا ہے وہ بڑھ رہے ہیں دشمن۔ تیار ہو جاؤ وہ
ہماری طرف آ رہے ہیں۔ تیاری کرو۔
وہ تیج کے اس انداز سے خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے کہا تیج میں وعدہ
کرتا ہوں۔
مگر تیج اس کا جواب نہ دے سکا وہ بیہوش ہو چکا تھا۔
لاآن لی نے بہت سختی سے کہا رونیلڈ تم جانتے ہو یہ کتنا بیمار ہے۔
ہاں رونیلڈ نے کہا یہ بہت بیمار ہے اسے سلفا دینا چاہیئے۔
اور ہمارے پاس سلفا نہیں آؤ دیکھ لو اگر تمہیں یقین نہ ہو ہمارے
پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے رونیلڈ۔
اس نے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اسکو اسٹور روم میں لے گئی تمام
شیلف خالی پڑی تھیں کچھ بوتلیں ہیضہ کے لئے، دو کونین کے انجکشن اور
کچھ خالی کیسوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تیج کے لئے وہاں کچھ نہ تھا۔
اور رونیلڈ' اس نے اس کا بازو پکڑ کر کہا اور وہ خاموشی سے ان
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو تیج سے محبت کرتے تھے۔
اگر میں پیکنگ بھی گیا تو میں اسے بچانے کے لئے وقت پر نہیں پہنچ سکتا
ہاتھوں نے اس کے بازو کو چھوڑ دیا وہ خوش تھا اس لئے کہ اس خیال

کی دنیا سے واپس آ چکا تھا جس میں اس نے لاں لی کو تنہا اور نڈھال بھٹکتے ہوئے پایا تھا۔ اس نے زور دے کر کہا لیکن میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا اور جتنی جلدی ہو سکے گا آنے کی کوشش کروں گا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور رک رک کر کہا اگر ایسا ہے تو تم رک جاؤ اور اسے زندہ رکھنے میں میری مدد کرو۔

وہ کمرہ سے تیزی سے نکل گئی۔ اس کے قدم تیزی سے تیج کے کمرہ کی طرف بڑھنے لگے وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا

لاں لی تیج پر جھکی ہوئی اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ تیج خاموشی سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

جب رونیلڈ داخل ہوا تو لاں لی اس سے مخاطب ہوئی! تم ڈاکٹر ہو کیا تم اسے زندہ رکھ سکتے ہو کیا دنیا بھر کے لالچ تمہیں ثابت قدم رکھ سکیں گے لیکن یہ کہتے کہتے اس کی آواز تیز ہو گئی۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے، تمہیں اس کی امداد کرنی چاہیئے۔

رونیلڈ اسے گھورتا رہا۔

تم اس کے بچانے کے لئے کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتے۔ اس نے پھر دہرایا۔ تم دواؤں کے علاوہ بھی سب کچھ کر سکتے ہو تم ڈاکٹر ہو۔

کچھ سیکنڈ وہ اسے گھورتے رہے جیسے اسے سب کچھ پتہ چل گیا ہو سب کچھ۔ جیسے وہ اس مقصد سے آگاہ ہو چکا ہو۔ اسے خود اعتمادی حاصل ہو گئی۔ وہ اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکی ہے۔

میں انتہائی کوشش کروں گا اس نے خاموشی سے کہا اور اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

جتنا پانی تم کیتلی میں گرم کر سکتی ہو کرو۔ بھگو بھگو کر پٹیاں مجھے دیتی رہو۔ اور کسی کو مدد کرنے کے لئے پکار لو۔ اس نے لاں لی سے کہا۔

وہ چپکے سے کمرے سے نکل گئی اور تیز قدموں سے تیج کے کمرہ میں پہنچی۔

تیج کا بازو چھوا۔ اس کا بازو دھجیوں سے جکڑا ہوا تھا اور پورا بازو خون سے تر تھا اس نے دھیرے سے پٹیاں کھولنی شروع کیں لیکن جیسے ہی اس نے شانے کی پٹی کھولی تیج بیہوشی میں چلایا۔

کمرے کے کونے میں کبڑے نے زور سے آہ کھینچی اور رونیلڈ آواز سن کر چونکا۔ جیسے اسے بڈھے کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ پھر اس نے اپنے مریض کو دیکھنا شروع کیا۔ اسے اس کو دیکھتے ہوئے ایک قسم کی تکلیف سی محسوس ہوئی کیونکہ اس نے ایک عرصہ سے کسی مریض کو نہیں چھوا تھا۔ مگر وہ

اپنے کام کا ماہر تھا اس نے بڑی مہارت اور خود اعتمادی کے ساتھ کام کو شروع کیا۔ بازو اب ننگا تھا مگر اسے اس تکلیف کا احساس تھا جس سے تیج گذر رہا تھا۔ تیج ابھی تک بیہوش تھا اور اس کی بیہوشی تکلیف کی حد تک بڑھ چکی تھی۔

رونیلڈ نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ لاں لی اور خالی گرم پانی کا پتیلا لا رہے تھے اس نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

یہ خوش قسمتی سے مل گیا وہ لوگ کھانا پکا رہے تھے میں نے ان سے مانگ لیا۔ یہ پٹیاں ہیں میں انھیں تم کو دیتی رہوں گی پانی خوب کھول رہا ہے۔

اس نے جلدی جلدی پٹی پھاڑی اور جیسے ہی اس کی نظر تیج کے بازو پر پڑی بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ مگر اس نے آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔

آؤ جلدی کرو رونیلڈ جلدی' وہ چلائی۔

اس وقت صبح صادق کا وقت تھا جب وہ اپنے کام سے نمٹے۔ خالی بھر بھر کر گرم پانی کی بالٹیاں لاتا رہا اور پتیلے کو بھرتا رہا۔ لاں لی اور رونیلڈ کے ہاتھ برابر کام کرتے رہے۔ مگر تیج کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اب دیر ہو چکی ہے لیکن انھوں نے اپنا کام جاری رکھا

چار بجے کے قریب تیج نے آنکھیں کھولیں اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ رونیلڈ تم اپنا وقت بے کار کر رہے ہو اب دیر ہو چکی ہے۔

ایسی بات نہ کہو دوست تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔

لاں لی یہ کام کر سکتی۔ رونیلڈ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دواؤں کا استعمال کرو گے۔ تیج آہستہ سے بولا مگر یکایک وہ اٹھ بیٹھا اور رونیلڈ چلانے لگا۔ میں کہتا ہوں دشمن یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں تم آگے بڑھو۔ یہاں ہزاروں آدمی زخمی پڑے ہیں مجھے چھوڑ دو۔ ایک کے مرنے سے کام بند نہیں ہو سکتا۔

لاں لی خوف سے کانپنے لگی۔ تیج میرے تیج۔

فرش پر سے کبڑا بولا۔ خدا رحم کرے تمہیں جانا ہی پڑے گا رونیلڈ۔

تیج نے بڑی مشکل سے کہا سب کچھ تم پر ہی منحصر ہے

رونیلڈ بستر سے اٹھ گیا اور کہنے لگا اچھا تیج میں جاتا ہوں۔

تم وعدہ کرو۔ تیج نے کہا۔ اس کی آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں۔

میں وعدہ کرتا ہوں رونیلڈ نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

دو گھنٹے بعد وہ اور فانی اپنے پرانے ٹرک میں بیٹھے ہوئے پیکنگ کی
طرف جا رہے تھے۔ اسے اس کا یقین تھا کہ تیج مر چکا ہوگا۔ اسے اس خیال ۱
سے بڑی تکلیف تھی۔ اسے اس کا افسوس تھا کہ اسے پہلے سے خبر کیوں نہ ہوئی
شاید وہ کچھ کر سکتا۔ مگر اب تو موت ہی اس کے دوست کو غم سے نجات دے سکتی
ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ٹھیک بھی ہو جاتا تو وہ کسی کام کا نہ رہ سکتا تھا۔ لاں لی
سب جانتی تھی۔ اس کے تصور میں لاں لی گھوم گئی۔ جو تیج کے سرہانے کھڑی تھی
وہ جانتا تھا کہ وہ تیج کی یاد میں زندگی گزار دے گی اور اس کے کام کو پورا کرنے
کی کوشش کرے گی۔ اس کے لئے اب تیج کے کام کے علاوہ کسی میں کوئی دلچسپی نہیں
ہو سکتی۔

اس نے اپنی طرف دیکھا وہ تیج کے کپڑوں میں تھا۔ اس سے فانی نے جب اس
کے بارے میں کہا تو اس نے اپنی اسی زندہ دلی سے مسکرا کر جواب دیا کہ پیکنگ
میں آج کل شیطان کی حکومت ہے وہ کسی سفید آدمی کو پسند نہیں کرتے اور
تمہیں بھی مار دیں گے۔

رونیلڈ نے اس پر اپنے کندھے جھٹکے اور فانی حیرت سے اس شخص کی
طرف دیکھنے لگا جیسے اس بات کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔

تمہارا قد بکسر کی برابر ہے اس لئے تم اس کے کپڑے بدل لو اس کے بکس
میں ہندوستانی پٹھ سے ریشمی کپڑے جنہیں پہن کر وہ یہاں آیا تھا میں انہیں
ڈھونڈ لوں گا۔ میں ایک مرہم بھی لے آؤں گا جو تمہاری کھال کو کالا کر دے،
اور تمہیں ہم ایک ہندوستانی سوداگر کہہ سکیں گے۔ شیطان ہندوستانی کو
نہیں مارتے، وہ انہیں اپنا دوست مانتے ہیں۔ وہ تمہیں شہر میں بھی داخل
ہونے دیں گے۔

رونیلڈ نے ٹرک میں پٹرول ڈلوایا اور ٹھیک کیا اتنے میں فانی تیج ۲
کے کپڑے لے آیا۔ اس لباس نے اس پر بھاری ذمہ داری سونپ دی تھی
اور وہ طرح اعتماد دی جو اس کے اندر ایک عرصے سے پیدا نہ ہو سکی تھی اچانک
پیدا ہو گئی اور وہ سوچنے لگا کہ میں یہ کام خوب کر سکتا ہوں اور اسے خود اپنی
اس بات پر تعجب ہوا۔

فانی ٹرک چلا رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا اور ٹرک جھٹکے کھاتا ہوا
چل رہا تھا۔ فانی دیکھ کر چلو ہم کو بہت دور جانا ہے

کچھ پروا نہیں۔ فانی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ٹرک میرا بہت پرانا ساتھی ہے
اور ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ بڑا جانتا ہے ہم کہاں جا رہے
ہیں میں نے چلنے سے پہلے اس سے کہہ دیا تھا۔ اگر کوئی بات ہوئی تو دوسرے
لوگ ہماری مدد کرنے کے لئے آجائیں گے

یہ مشکل ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سنسان سڑک پر ان میں آدمی چھپے
ہوئے ہیں۔ وہ اب ایک دریا کے کنارے چل رہے تھے جس کے کنارے پر
ایک سنسان گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں دور دور تک کہیں زندگی کے آثار
نہیں تھے۔

لیکن اس سنسان ماحول میں چند ہی منٹ کے بعد ایک کسان نیلی
وردی پہنے نظر آیا۔ اور اس نے انہیں پاس ورڈ دیا۔

خدا کی زمین۔ اس نے کہا

خدا کی زمین۔ فانی نے جواب دیا۔

آدھی رات ہو گئی ہوگی۔ رونیلڈ نے اندازہ لگایا۔ اس وقت دو بجے
ہوں گے۔ یکایک دو سائے ٹرک کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

ٹرک چاؤ وہ چلائے۔ اور فانی نے بریک لگایا۔ اور ایک سخت آواز
کے ساتھ ٹرک رک گیا

تم کہاں جاتے ہو؟ دو آدمی چنگھاڑا۔ ہم ڈاکو ہیں کیا تم مرنے سے ڈرتے
ہو۔ اچھا تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

فانی ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ تم یہ بھول گئے ہو کہ دنیا کے سب آدمی
ایک ہی خاندان سے ہیں اور بھائی بھائی ہیں اس نے کہا۔

دو آدمی دانت پیسنے لگے۔ اتر جاؤ اور وہ گاڑی ہے۔ اس میں بیٹھ
جاؤ جلدی چلو

لیکن ٹرک کا کیا ہوگا فانی چیخنے سے بولا۔ بہت قیمتی چیز ہے اسے
یہیں چھوڑ دو۔ دوسرے نے کہا ہم اسے تمہیں واپس کر دیں گے جب تم واپس
آؤ گے وہ چلایا اور کھجور کے درخت کے پیچھے سے ایک بیل گاڑی آگے بڑھی
وہ اس میں سوار ہو گئے۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف فضا میں خاموشی ہی خاموشی تھی
تھی۔ وہ پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ آگے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ
لوگ بھی بہت خاموش تھے اور اس خاموشی کو توڑنا بھی نہیں چاہتے تھے ایک
مرتبہ جب فانی بولا تو انھوں نے اسے جھڑک دیا۔ دوسری مرتبہ جب رونیلڈ
کو کھانسی کا دورہ ہوا تو وہ اس پر چلانے لگے۔

جب وہ لوگ رکے تو تقریباً صبح ہو گئی تھی۔ ان میں سے
ایک نے کہا۔ مشرق کی طرف چار میل اور چلنا ہے تم ایک ویران مندر
پر پہنچ گے۔ جلدی چلو کیونکہ تم دشمنوں کے احاطے میں ہو۔ تم آج رات وہاں

پچھ ہوگے یہاں کا پاس ورڈ ہے بھائی

میں تمہیں کیا دالروں رونیلڈ نے پوچھا اور جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ انھوں نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔ ہم سب بھائی ہیں اس نے کہا اور جب حسرت آمیز مسکراتے ادھر روانہ ہو گئے۔

دو روز کے بعد فالی اور رونیلڈ پیکنگ کے قرب وجوار پہنچے تھے۔ وہ بس میں سوار ہو گئے۔ جس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ تین روز کی لگاتار بارش سے سڑک پر کیچڑ بھر رہا تھا بس بھری ہوئی تھی اور ہر مسافر کچھ نہ کچھ کھا رہا تھا۔ ان کی باتوں اور ہنسی نے بس میں شور کر رکھا تھا۔

رونیلڈ کے پاس اپنے سامان کا ایک بنڈل تھا اس میں لباس تھا جو کہ پرچے بالکل ویسے ہی تھے جیسے وہ پہنے ہوئے تھا تاکہ اگر اس کی تلاشی ہو تو وہ پکڑا نہ جا سکے فالی اس سے زیادہ چالاک تھا کیونکہ وہ تیج کے بکس میں سے بہت سے فالتو کپڑے رکھ لایا تھا ان میں ایک چمڑے کا بٹوا بھی تھا جس میں کچھ سکے تھے۔ اس کا برش تھا ایک تسا نہ تھا ہر چیز دشمن کو سوچ سمجھ کر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے جوتے کے بائیں تلے میں ایک ہزار پونڈ کے امریکن کرنسی کے نوٹ تھے تاکہ وہ اس سے دوائیں خرید سکے۔ امریکن روپیہ چین میں کم تھا لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کر ہی لیا تھا۔ وہ ایک پیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر دکھنے لگے تھے کیونکہ وہ میلوں پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے۔ اس کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور شہر کا دروازہ ان کے سامنے تھا

نیچے اتر جاؤ ڈرائیور نے چلا کر کہا وہ ایک نوجوان فوجی تھا جس کا بایاں ہاتھ بیکار ہو چکا تھا وہ اتر پڑے جاپانی سپاہی انھیں گھورنے لگے

رونیلڈ نے کہا ہم لائن میں درمیان میں رہیں گے تاکہ سپاہی جلدی جلدی دیکھ کر چھوڑ دیں وہ اس کام سے اس وقت تک تھک چکیں گے اور جلد سے جلد چھٹکارا پانا چاہیں گے تم بہت زیادہ چالاک ہو فالی نے کہا۔

یہ پیکنگ تھا اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا بہت کچھ پڑھا تھا اور اب وہ خود اس کے دروازے پر موجود تھا آسمان گہرا نیلا تھا لیکن دروازہ کا رنگ آسمان سے زیادہ گہرا تھا دروازے پر چاروں طرف بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آدمی اس دروازے سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے وہ ایک مغرور شہر کے شہری تھے۔ وہ سب یہاں ایک کھیل کھیل رہے تھے سب اپنے اپنے حصہ کا کام تیزی سے کر رہے تھے اور وہ بھی ایک پرندہ تھا وہ بھی اپنے حصہ کا کام کر رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں اور ہاتھ خاص طور پر چھپانے کے لیے مجبور تھا سورج نکلتے نکلتے وہ اپنے بھیس بدلنے کی طرف سے کافی پریشان نظر آنے لگے وہ محافظ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں لباس کا بنڈل تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس کے دل میں ایک شبہ جاگزیں ہوا۔ کیا یہ مجھ پر شبہ کریں گے

فالی اس وقت بالکل اس کے پیچھے تھا وہ بہت دور سے چلا یا میں لٹ گیا میں مٹ گیا۔ ہائے میرا تمام روپیہ چلا گیا اس نے اپنی کمر پر جو پٹی بندھی تھی اس کو پھاڑ ڈالا اور اس کو تلاش کرنے لگا۔ جیسے اس میں سے کچھ نکل گیا ہو اور ایک لمحہ کی دیر کئے ہوئے وہ اس کسان پر گر پڑا جو اس کے پیچھے تھا اور اس پر برس پڑا۔ میرا روپیہ دو، تم لٹیرے ہو میرا مال مجھے دو۔

گارڈ فالی پر جھپٹے اور اس کے دو چار ہاتھ رسید کیا تاکہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ اس کسان نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا کہ اس کے پاس سوائے خود اپنے ڈالروں کے کچھ نہیں ہے۔

سات! ہوں میں جانتا ہوں جب تم چلے تھے تو تمہارے پاس صرف دو تھے اور میرے پاس پانچ تھے۔ یہ میرے ہیں اس جھگڑے میں ان محافظوں نے جلدی جلدی آدمیوں کو جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ اور وہ سات ڈالر فالی اور اس کسان کے درمیان بانٹ دے گئے۔ اور اس کے بعد ہر ایک سے ایک ڈالر اپنے انعام کے طور پر وصول کیا۔ اس درمیان میں سب دروازہ سے گذر چکے تھے وہ ان محافظوں سے بہت دور نکل آئے کسان ابھی تک فالی سے ناراض تھا وہ فالی سے انصاف کی بھیک مانگنے ہی والا تھا جب فالی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ روپے نکال کر اس بھولے بھالے آدمی کے حوالے کر دیئے۔

کسان حیران تھا وہ ایک لمحہ تک کبھی روپیہ کو اور کبھی اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جس نے اتنے لڑ کر اس سے روپیہ وصول کیا تھا اور پھر آسانی سے اسے واپس کر دیا۔

اس میں بھی ایک بات تھی فالی نے اسے مطمئن کرنا چاہا اور اس نے جلدی سے روپیہ اس کی جیب میں رکھ دیا کہ کہیں کوئی اور نہ دیکھ لے

رونیلڈ آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور دل ہی دل میں اسے اس ترکیب پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر فالی سے کہا ہمیں کسی ہوٹل میں چلنا چاہیئے تم میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گے اور میری دیکھ بھال کرنا

ستا سا کام ہوگا۔ اس طرح کام آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ میں ایک اجنبی ہندوستانی مسافر کی حیثیت سے داخل ہوں گا۔ اگر تم ایسے ہی اپنا کام انجام دیتے رہو جیسے دیتے ہو تو ہم بالکل محفوظ رہیں گے۔

میرا باپ بڑا چالاک آدمی تھا۔ میں اس کا اکیلا بیٹا ہوں فالی نے جھومتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

رونیلڈ نے سوچا کہ وقت آدمی سے کیا کیا کراتا ہے۔ مگر ہماری زندگی ہمیں اس کے لئے مجبور کرتی ہے۔ وہ چین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ تمام لوگ تھے جنھیں اس کی ضرورت تھی۔ اس کے سامنے اس کا مشن تھا اسے دشمن کا احساس تھا۔ جو اس زمین کے چپہ چپہ پر موجود تھے اسے ذاتی طور پر وہ بات بھی یاد آ رہی تھی جس میں اس نے دشمن کے شمال سے حملہ کی خبر دی تھی اس سے پہلے پہلے اسے سب کچھ کرنا تھا۔ فالی نے اسے ایک نقشہ دکھایا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن کو پہنچنے کے لئے کم سے کم چودہ دن لگیں گے اور اس کو سب کام اس سے پہلے کرنا تھا۔

اس نے سوچا کہ اس کے بعد خراب کرنے کے لئے بالکل وقت نہیں ہے اور کام کی اہمیت نے اور اس کے فرض نے اس کو کافی تقویت بخشی۔ اس کا احساس شکست خوردگی اس سے دور بھاگنے لگا اور اسے ایک بہت محسوس ہوئی۔

جنگ نے اس دنیا کو اب اسٹیج بنا دیا تھا۔ اس اسٹیج پر آدمی مردہ دل ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ اس نے ایک ایک کرکے گزرتے ہوئے دیکھنا شروع کیا مگر اسے ہر ایک کے چہرے پر ایک سے جذبات نظر آئے۔ ہر آدمی اس کی طرح سے خوفزدہ تھا۔ چینی مرد اور عورتیں بازاروں سے اس طرح گزر رہے تھے جیسے وہ ہمیشہ سے ہی جاپانیوں کی غلامی رہتے آئے ہوں۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ جب تک کوئی اس کھیل میں بازی نہ ہار جائے۔

اس نے سوچا اگر زندگی رہی تو پھر جب یہ اپنی حقیقی زندگی شروع کریں گے تب پھولوں سے ملوں گا۔ اسی طرح کے کچھ اور چینی تھے اور اس کے علاوہ باقی سب جاپانی تھے وہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں کے کلرک سے کسی خالی کمرہ کے بارے میں پوچھا۔ کلرک نے جو صورت سے مغرور دکھائی دیتا تھا بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے رجسٹر دیکھنا شروع کیا۔ ایک دبلے پتلے چینی لڑکے نے اس کا سامان اس سے لے لیا۔ وہ دونوں افیون کھانے والے تھے زیادہ تر چینی اس طرح کے ملے۔ افیون کے عادی معلوم ہوتے تھے اس کے برخلاف جاپانی بہت چالاک نظر آتے تھے افیون ان کا سب سے

بڑا ہتھیار تھا۔ یہ کمزوری اور سستی پیدا کرتی ہے اور کیسے چینی لوگ طرف دیکھنے ہی کو کمزور رہتے ہوں۔

جب وہ ہوٹل کے کمرہ میں پہنچے تو یہ کمرہ انھیں ایک چال معلوم ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ بہت گندہ تھا فرنیچر جو کبھی نیا ہوگا اب بالکل شکستہ ہو چکا تھا بستروں کی چادریں گو دھلی ہوئی تھیں مگر ان پر استری نہ ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے چائے کافی سے کھیل کھیلا ہو اس لئے کہ اس پر جگہ جگہ کافی اور چائے کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے

فالی نے کہا۔ سنا ہے جاپانیوں کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے وہ ہر چیز کو دور سے ہی سونگھ لیتے ہیں۔ چلو بھائی باہر چلیں ہم باہر ہی زیادہ محفوظ ہیں۔

ہاں چلو کام میں لگ جائیں۔ رونیلڈ نے مختصر جواب دیا۔ وہ سڑک پر نکل آئے۔ دوبارہ انھیں وہ چلتی پھرتی زندہ لاشیں نظر پڑیں۔ وہ دکانوں سے گزرتے رہے اس نے فالی کو چپ چاپ اپنا رہبر تسلیم کر لیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ ان دکانوں میں دواؤں کی دکان تلاش کرتا رہا اور جیسے ہی پہلی دکان نظر پڑی وہ اس کے اندر چلا گیا۔ دکان کے اندر دو آدمی تھے جو نسخہ دیکھ کر دوائیں باندھ رہے تھے اور دکان کا مالک دوسری طرف کام میں مشغول تھا۔

رک جاؤ رونیلڈ نے فالی سے آہستہ سے کہا۔ اس وقت تک کچھ نہ کہنا جب تک ایک ایک آدمی دکان سے نہ نکل جائے۔ وہ آدمیوں کے جانے کا انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں دو آدمی اور آ گئے جب سب چلے گئے تو رونیلڈ دکاندار کے پاس پہنچا۔

ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ہم اپنے ساتھ کچھ دوائیں لے جانا چاہتے ہیں۔

دکاندار نے اپنا سر ہلا یا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس کی ناک بہت لمبی تھی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس نے کہا ہم بغیر پرمٹ کے کچھ نہیں بیچ سکتے۔

تمھیں کس نے منع کیا ہے فالی نے پوچھا۔

درندوں نے اس نے سادگی سے جواب دیا۔

رونیلڈ نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور کہا مگر ہم شمال مغرب سے آئے ہیں۔

اس آدمی نے پھر اسی طرح سر ہلا دیا۔ میرے بھی بچے ہیں اور ایسے زمانہ

پیچھے رہ گئے یہاں کا پاس ورڈ ہے بھائی

میں محسوس کیا اور کون رونیلڈ نے پوچھا اور جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ انھوں نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔ ہم سب بھائی ہیں اس نے کہا اور جلد ہی سب آہستہ سے ادھر روانہ ہو گئے۔

دو روز کے بعد خالی اور رونیلڈ پیکنگ کے قریب وجوار میں تھے۔ وہ بس میں سوار ہو گئے۔ بس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ تین روز کی لگاتار بارش سے سڑک پر کیچڑ بھر رہا تھا بس بھری ہوئی تھی اور ہر مسافر کچھ نہ کچھ کھا رہا تھا۔ ان کی باتوں اور ہنسی نے بس میں شور کر رکھا تھا۔

رونیلڈ کے پاس اپنے سامان کا ایک بنڈل تھا اس میں لباس تھا جس کے کپڑے بالکل ویسے ہی تھے جیسے وہ پہنے ہوئے تھا تاکہ اگر اس کی تلاشی ہو تو وہ پکڑا نہ جا سکے خالی اس سے زیادہ چالاک تھا کیونکہ وہ جس کے بکس میں سے بہت سے فالتو کپڑے رکھ لایا تھا ان میں ایک چمڑے کا بٹوا بھی تھا جس میں کچھ سکے تھے۔ اس کا برش تھا ایک تسلانہ تھا ہر چیز دشمن کو ستانے سمجھ کر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے جوتے کے بائیں تلے میں ایک ہزار پونڈ کے امریکن کرنسی کے نوٹ تھے تاکہ وہ اس سے دوائیں خرید سکے۔ امریکن روپیہ چین میں کم تھا لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کر ہی لیا تھا۔ وہ ایک پیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر دکھنے لگے تھے کیونکہ وہ میلوں پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے۔ اس کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور شہر کا دروازہ ان کے سامنے تھا

نیچے اتر جاؤ ڈرائیور نے چلا کر کہا وہ ایک نوجوان فوجی تھا جس کا بایاں ہاتھ بیکار ہو چکا تھا وہ اتر پڑے جاپانی سپاہی انھیں گھورنے لگے

رونیلڈ نے کہا ہم لائن میں درمیان میں رہیں گے تاکہ سپاہی جلدی جلدی دیکھ کر چھوڑ دیں وہ اس کام سے اس وقت تک تھک چکیں گے اور جلد سے جلد چھٹکارا پانا چاہیں گے۔ تم بہت زیادہ چالاک ہو خالی نے کہا۔

یہ پیکنگ تھا اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا بہت کچھ پڑھا تھا اور اب وہ خود اس کے دروازہ پر موجود تھا آسمان گہرا نیلا تھا لیکن دروازہ کا رنگ آسمان سے زیادہ گہرا تھا دروازہ پر چاروں طرف بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آدمی اس دروازہ سے ادھر ادھر آجا رہے تھے وہ ایک مفتوحہ شہر کے شہری تھے۔ وہ سب یہاں ایک کھیل کھیل رہے تھے سب اپنے اپنے حصہ کا کام تیزی سے کر رہے تھے اور وہ بھی ایک پرزہ تھا وہ بھی اپنے حصہ کا کام کر رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں اور ہاتھ خاص طور پر چھپانے کے لئے مجبور تھا سورج نکلتے نکلتے وہ اپنے بھیس بدلنے کی طرف سے کافی پریشان نظر آنے لگے وہ محافظ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں لباس کا بنڈل تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس کے دل میں ایک شبہ جاگزیں ہوا۔ کیا یہ مجھ پر شبہ کریں گے۔

خالی اس وقت بالکل اس کے پیچھے تھا وہ بہت دور سے چلایا میں لٹ گیا میں لٹ گیا۔ ہائے میرا تمام روپیہ چلا گیا۔ اس نے اپنی کمر پر جو پٹی بندھی تھی اس کو پھاڑ ڈالا اور اس کو تلاش کرنے لگا۔ جیسے اس میں سے کچھ نکل آئے گا اور ایک لمحہ کی دیر کئے ہوئے وہ اس کسان پر گر پڑا جو اس کے پیچھے تھا اور اس پر برس پڑا۔ میرا روپیہ دو، تم بے ایمان ہو میرا مال مجھے دو۔

گارڈ خالی پر جھپٹے اور اس کے دو چار ہاتھ دئے یہاں تک کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ اس کسان نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا کہ اس کے پاس سوائے خود اپنے ڈالروں کے کچھ نہیں ہے

سات! ہوں میں جانتا ہوں جب تم چلے تھے تو تمھارے پاس صرف دو تھے اور میرے پاس پانچ تھے۔ یہ میرے ہیں اس جھگڑے میں ان محافظوں نے جلدی جلدی آدمیوں کو جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ اور وہ سات ڈالر خالی اور اس کسان کے درمیان بانٹ دے گئے اور اس کے بعد ہر ایک سے ایک ڈالر اپنے انعام کے طور پر وصول کیا۔ اس درمیان میں سب دروازہ سے گذر چکے تھے وہ ان محافظوں سے بہت دور نکل آئے کسان ابھی تک خالی سے ناراض تھا وہ خالی سے انصاف کی بھیک مانگنے ہی والا تھا جب خالی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ روپے نکال کر اس بھولے بھالے آدمی کے حوالے کر دئے۔

کسان حیران تھا وہ ایک لمحہ تک کبھی روپیہ کو اور کبھی اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جس نے اتنے لڑ کر اس سے روپیہ وصول کیا تھا اور پھر آسانی سے اسے واپس کر دیا۔

اس میں بھی ایک بات تھی خالی نے اسے مطمئن کرنا چاہا اور اس نے جلدی سے روپیہ اس کی جیب میں رکھ دیا کہ کہیں کوئی اور نہ دیکھ لے

رونیلڈ آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور دل ہی دل میں اسے اس ترکیب پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے رک کر خالی سے کہا۔ ہمیں کسی ہوٹل میں چلنا چاہیئے تم میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گے اور میری دیکھ بھال کرنا

تمہارا کام ہوگا۔ اس طرح کام آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ میں ایک اجنبی ہندوستانی مسافر کی حیثیت سے داخل ہوں گا۔ اگر تم ایسے ہی اپنا کام انجام دیتے رہو جیسے دیتے رہو تو ہم بالکل محفوظ رہیں گے۔

میرا باپ بڑا چالاک آدمی تھا۔ میں اس کا اکیلا بیٹا ہوں فانی نے جھومتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

رونیلڈ نے سوچا کہ وقت آدمی سے کیا کیا کراتا ہے۔ مگر ہماری زندگی ہمیں اس کے لئے مجبور کرتی ہے۔ وہ چین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ تمام لوگ تھے جنھیں اس کی ضرورت تھی۔ اس کے سامنے اس کا مشن تھا اسے دشمن کا احساس تھا، جو اس زمین کے چپہ چپہ پر موجود تھے اسے فانی کی وہ بات بھی یاد آ رہی تھی جس میں اس نے دشمن کے شمال سے حملہ کی خبر دی تھی اس سے پہلے پہلے اسے سب کچھ کرنا تھا۔ فانی نے اسے ایک نقشہ دکھایا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن کو پہنچنے کے لئے کم سے کم چودہ دن لگیں گے اور اس کو سب کام اس سے پہلے کرنا تھا۔

اس نے سوچا کہ اس کے بعد خراب کرنے کے لئے بالکل وقت نہیں ہے اور کام کی اہمیت نے اور اس کے فرض نے اس کو کافی تقویت بخشی۔ اس کا احساس شکست خوردگی اس سے دور بھاگنے لگا اور اسے ایک ہمت محسوس ہوئی۔

جنگ نے اس دنیا کو اب اسٹیج بنا دیا تھا۔ اس اسٹیج پر آدمی مردہ دل ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ اس نے ایک ایک کرکے گذرتے ہوئے دیکھنا شروع کیا مگر اسے ہر ایک کے چہرے پر ایک سے جذبات نظر آئے۔ ہر آدمی اس کی طرح سے خوفزدہ تھا۔ چینی مرد اور عورتیں بازاروں سے اس طرح گذر رہے تھے جیسے وہ ہمیشہ سے ہی جاپانیوں کی غلامی رہتے آئے ہوں۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ جب تک کوئی اس کھیل میں بازی نہ ہار جائے۔

اس نے سوچا اگر زندگی رہی تو پھر جب یہ اپنی حقیقی زندگی شروع کرینگے تب پھر ان سے ملوں گا۔ اسی کی طرح کے کچھ اور چینی تھے اور اس کے علاوہ باقی سب جاپانی تھے وہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں کے کلرک سے کسی خالی کرہ کے بارے میں پوچھا۔ کلرک نے جو صورت سے مغرور دکھائی دیتا تھا بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے رجسٹر دیکھنا شروع کیا۔ ایک دبلے پتلے چینی لڑکے نے اس کا سامان اس سے لے لیا وہ دونوں افیون کھانے والے تھے زیادہ چینی جو اس برآمدہ میں تھے۔ افیون کے عادی معلوم ہوتے تھے اس کے برخلاف جاپانی چست و چالاک نظر آتے تھے افیون ان کا سب سے

بڑا ہتھیار تھا۔ یہ کمزوری اور سستی پیدا کرتی ہے اور کیسے پتہ چینی لوگ صرف دکھانے ہی کو کمزور بن رہے ہوں۔

جب وہ ہوٹل کے کرہ میں پہنچے تو یہ کرہ انھیں ایک جال معلوم ہوا چھوٹا سا کرہ بہت گندہ تھا فرنیچر جو کبھی نیا ہوگا اب بالکل شکستہ ہو چکا تھا بستروں کی چادریں گو دھلی ہوئی تھیں مگر ان پر استری نہ ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے چائے کافی سے کھیل کھیلا ہو اس لئے کہ اس پر جگہ جگہ کافی اور چائے کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے

فانی نے کہا۔ سنا ہے جاپانیوں کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے وہ ہر چیز کو دور سے ہی سونگھ لیتے ہیں۔ چلو بھائی باہر چلو ہم باہر ہی زیادہ محفوظ ہیں۔

ہاں چلو کام میں لگ جائیں۔ رونیلڈ نے مختصر جواب دیا۔ وہ سڑکوں پر نکل آئے۔ دوبارہ انھیں وہ چلتی پھرتی زندہ لاشیں نظر پڑیں۔ وہ دکانوں سے گذرتے رہے اس نے فانی کو چپ چاپ اپنا رہبر تسلیم کر لیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ ان دکانوں میں دواؤں کی دکان تلاش کرتا رہا اور جیسے ہی پہلی دکان نظر پڑی وہ اس کے اندر چلا گیا۔ دکان کے اندر دو آدمی تھے جو نسخہ دیکھ کر دوائیں باندھ رہے تھے اور دکان کا مالک دوسری طرف کام میں مشغول تھا۔

رک جاؤ رونیلڈ نے فانی سے آہستہ سے کہا۔ اس وقت تک کچھ نہ کہنا جب تک ایک ایک آدمی دوکان سے نہ نکل جائے۔ وہ آدمیوں کے جانے کا انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں دو آدمی اور آ گئے جب سب چلے گئے تو رونیلڈ دکاندار کے پاس پہنچا۔

ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ہم اپنے ساتھ کچھ دوائیں لے جانا چاہتے ہیں۔

دکاندار نے اپنا سر ہلایا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس کی ناک بہت لمبی تھی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس نے کہا ہم بغیر پرمٹ کے کچھ نہیں بیچ سکتے۔

تمھیں کس نے منع کیا ہے فانی نے پوچھا۔

درندوں نے اس نے سادگی سے جواب دیا۔

رونیلڈ نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور کہا مگر ہم شمال مغرب سے آئے ہیں۔

اس آدمی نے پھر اسی طرح سر ہلا دیا۔ میرے بھی بچے ہیں اور ایسے زمانہ

میں ہر آدمی اپنے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں تمھارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔

پھر کہیں اور دیکھنا چاہیئے رونیلڈ نے کہا۔ اور وہ اس دوکان سے دوسری دکان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور پھر دوسری سے تیسری اور چوتھی گھومتے رہے لیکن کہیں بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جواب کے ساتھ ساتھ انکی صورتیں بھی ایک ہی جیسی ہو گئی ہیں۔ وہ سب چھوٹے اور کم ہمت تھے۔ پانچ جگہ جانے کے بعد رونیلڈ نے بے چینی کا اظہار کیا اور فالی سے کہنے لگا۔ اب ہم جب تک کسی دوکان پر نہیں جائیں گے جب وہاں کے آدمی کی شکل ان سے بدلی ہوئی نظر نہ آئے۔ یہ سب بزدل ہیں انہیں صرف اپنی زندگی سے پیار ہے ہوں، تو یہ شیطان درحقیقت کام کر چکے ہیں۔ اچھا ہم کھانا کھالیں اور پھر دیکھیں گے۔ فالی نے سادگی سے کہا۔ میں ایک ریستوران کو جانتا ہوں، جس کا مالک مسلمان ہے اس نے یہاں بہترین گوشت ملتا ہے۔

وہ ایک خالی ریستوران کی طرف بڑھا اور رجاتے ہی چلایا۔ ایک بڑا آدمی آگے بڑھا اور فالی کو گھورنے لگا۔

تم جانتے ہو میں نے کتنی مرتبہ یہاں کھانا کھایا ہے بڑے میاں مگر ان دنوں میں تم پہلے سے بھی زیادہ موٹے تھے۔ جاؤ یہاں کا بہترین گوشت لے آؤ۔

گوشت نہیں ہے اس نے رو ہانسا ہو کر کہا۔ ہمارے پاس تھوڑا سا کھانا ہے۔ وہ افسردہ ہوا کھڑا رہا۔ وہاں ایک چھوٹے لڑکے کے علاوہ اس کی مدد کے لئے کوئی بھی نہ تھا۔ تم کسی بھی مسلمان ہوٹل میں اس کے علاوہ کچھ حاصل نہ کر سکو گے۔ بوڑھے نے کہا۔ ان روحوں نے ہر چیز اپنے لئے چھین لی ہے۔

فالی رونیلڈ کی طرف مڑ گیا۔ اب ہمیں یقین ہے شہر ہمارے ہاتھ سے گیا۔ پیکنگ میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ شہر وہی ہے یہاں کی جگہ وہی ہے مگر وہ باتیں ہیں سب چیزیں بدل گئیں۔ سب چیزیں بدل گئیں۔

خدا کے لئے خاموش رہو میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں بوڑھا گڑگڑانے لگا۔ کیوں میری مٹی خراب کرتے ہو۔

ہم وہی کھائیں گے جو تمھارے پاس ہے رونیلڈ بول اٹھا۔

خاموشی سے انھوں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اگلی صبح سڑکوں پر ہر طرف خاموشی تھی۔ سوائے دو چار عورتوں کے جو گھر کو صاف کر رہی تھیں یا کچھ چائے کے لئے گرم پانی لا رہی تھیں جب وہ رونیلڈ اور فالی کے پاس سے گذریں تو انھوں نے ان کو گھورا۔

ہمیں دیرینہ کرنی چاہیئے فالی نے کہا۔ یہ شیطان اس سے زیادہ چالاک ہیں جیسا دکھائی دیتے ہیں۔ آج جب میں منہ دھونے اٹھا تو ان میں سے ایک میرے پاس آکر میرے بارے میں سوال کرنے لگا کہاں سے آئے ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔

ہم سلک کی دکان پر کیوں نہ چلیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک ہندوستانی سلک کا سوداگر ہوں۔ اگر جاسوسوں نے دیکھا بھی تو کچھ خیال نہ کریں گے

تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو فالی نے کہا۔

ہو سکتا ہے اچھا تم مجھے سلک کی دکان پر لے جاؤ۔

فالی چپ چاپ چلنے لگا۔ اور آدھے دن تک وہ سلک کی ایک دکان سے دوسری دکان دیکھتے ہوئے پھرے۔ انھیں یہ دیکھنا تھا کہ کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح دن گذر گیا اور رونیلڈ پریشان ہو گیا کہ کیا ترکیب کی جائے آخر کار وہ سلک کی آخری دکان پر گئے۔

اچانک کسی نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا اس نے دیکھا ایک بوڑھا آدمی جو کافی لمبا تھا۔ اس کا کٹ بھا پکڑے کھڑا تھا۔ یہ وہی دکاندار تھا جس سے یہ ابھی دو منٹ پہلے بات کر کے انھوں نے اس کی بات پوری طرح سنی بھی نہ تھی کیونکہ اس کی دوکان تو بہت بڑی تھی مگر لٹی لٹی سی تھی اور وہ خود بھی تھکا ہوا سا ایک کونہ میں بیٹھا تھا

اب کیا ہے رونیلڈ نے سوال کیا۔

میرے پاس سلک کا ایک نوجوان ٹکڑا ہے جو تمھیں نہیں دکھایا تھا بوڑھے نے آہستہ سے کہا یہ میرا سب سے بہترین سلک ہے اسے میں نے ہی نکالا تھا۔

شکریہ مجھے نہیں چاہیئے رونیلڈ نے جواب دیا۔

مگر اس بوڑھے نے اس کے کوٹ کو زور سے پکڑ کر کھینچا اور زور سے کہا۔ آدمیوں نے اسے چھپا کر رکھا ہے یہ جنگ سے پہلے کا ہے میں نے سوچا تھا کہ کسی شیطان کو اسے نہیں دوں گا میں تمھیں سستا دیدوں گا۔ تاکہ وہ شہر سے باہر چلا جائے۔

وہ اتنی جلدی مچائے ہوئے تھا کہ رونیلڈ ایک لمحہ کے لئے جھجکا مگر فالی نے کہا کہ یہ بوڑھا آدمی ہے چلو اس پر یہ احسان کر دو۔ فالی کے اس طرح کے جواب نے رونیلڈ کے دماغ میں فوراً ایک نئی چیز پیدا کر دی وہ بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دکان پر کوئی نہیں تھا مگر بھی بوڑھا

اس طریقے سے برتاؤ کر رہا تھا جیسے ہزاروں جاسوس اس دکان کی نگرانی میں موجود ہوں۔ دکان میں کھڑکیاں نہیں تھیں۔ مگر کاؤنٹر روشن تھا۔

یہ نادر سلک۔ بوڑھے نے جھکتے ہوئے انداز میں کہا۔ میں نے اسے چھپا دیا تھا۔ یہ خزانہ ہے خزانہ ایک شہزادہ ہی اسے پہن سکتا ہے مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر تم اسے اس ملک میں لے جاؤ گے۔ اب ملک میں ان حاکموں کے علاوہ یہاں کوئی اور نہیں پہن سکتا اور ہمارے ہاتھ بنا ہوا سلک انھیں پہننے کا کیا حق ہے۔

اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک بندھا ہوا پیکٹ نکالا اور اس کو کھولنے لگا۔ یہ بڑی خوبصورت سلک تھی جس پر جگہ جگہ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

رونیلڈ نے سلک کو دیکھا۔ یہ بہت خوبصورت اور بہت اچھا ہے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

بوڑھے نے اسی جلد بازی کے ساتھ کہا یہ کبھی نہیں پھٹے گا۔ تم اسے ضرور لے لو۔ یہ آج کل نہیں بنتا اور نہ یہ تمھیں کہیں اور ملے گا۔

میں نے ایسا سلک کبھی نہیں دیکھا رونیلڈ کا جواب مختصر تھا۔

فالی دروازہ سے لگا ہوا کبھی باہر اور کبھی اندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے بلانا چاہتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں ہلا۔

کیا قیمت ہے اس کی رونیلڈ نے سوال کیا۔

بوڑھے نے اس کے ہاتھ پکڑے اور کہا میں اس کی کوئی قیمت نہیں لگاتا۔ تم اسے میری طرف سے لے جاؤ۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں سے یہ نکل جائے اور ان درندوں کے ہاتھ نہ پڑ سکے۔

کون کسی اجنبی کو بغیر کسی وجہ کے تحفہ دیتا ہے فالی پوچھ بیٹھا۔

بوڑھے کا رنگ لال ہو گیا اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ تحفہ بغیر کسی وجہ کے نہیں دیے جاتے۔

فالی ہنسا اپنے ہاتھ اپنے منہ پر پھیرنے لگا اور چپکے سے دکان سے باہر ہو گیا لیکن رونیلڈ نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا کہ یہی وہ آدمی ہے جس سے کام چل سکے گا۔ وہ ٹہلتا ہوا پھر اندر آ گیا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ہر آدمی اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ فالی نے کندھے ہلا کر کہا۔

بوڑھے نے فالی کو گھورا اور رونیلڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا یہ تمھارا نوکر کیسا ہے جس کی زبان قابو میں نہیں ہے۔

رونیلڈ نے ادھر ادھر دیکھا اور کاؤنٹر پر جھک گیا اس نے دھیرے سے بوڑھے سے کہا کیا تم اپنے وطن سے محبت کرتے ہو۔

جان سے بھی زیادہ۔ بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔

کیا مجھے تم سے سچی بات کہہ دینی چاہیے رونیلڈ نے اس سے کہا۔ ایسا محسوس ہوا کہ دوستی کی ایک لہر دونوں کے جسموں سے گزر گئی۔ مجھے چین سے بہت محبت ہے حالانکہ میں چینی نہیں ہوں۔ میں یہاں ایک دوست نواز ملک سے آیا ہوں یعنی شمال مغرب سے، مجھے یہاں سے دوائیں خریدنی ہیں۔ شمال مغرب میں لڑنے والے زخمی ہو گئے ہیں اور ان کے پاس دوائیں ختم ہو چکی ہیں وہ زخموں سے چور ہیں اور مر رہے ہیں اس لئے کہ ان کے زخم پر مرہم رکھنے کو نہیں۔ یہ ہے میرا اصلی کام کو میں ابھی تک اسے انجام نہیں دے سکا دوائیں دکانوں میں بند کر دی گئی ہیں۔ اور کوئی بھی بغیر پرمٹ کے نہیں دے سکتا۔

خدا نے کیا مہربانی کی جو تمھیں یہاں بھیج دیا اس نے دھیرے سے کہا اگر تم میری مدد کرو تو میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ اس نے فالی کو دروازہ کے باہر بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی نگرانی کرتا رہے وہ اس وقت تک محفوظ تھے جب وقت تک فالی دروازہ پر رہے گا۔

بوڑھے دوکاندار کے چہرے پر ایک عزم جھلکنے لگا۔ اس نے کہا میرا نام کنگ ہے اور مجھے شہر میں سب جانتے ہیں حالانکہ جب سے دشمن آئے ہیں۔ میں مچھلی کی طرح بند ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں نے گھر سے باہر اس لئے قدم نہیں نکالا کہ کہیں میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ کیونکہ میں ان آدمیوں میں سے ہوں جنھوں نے اکیس مانگوں کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ یہ عرصہ ہوا جب کی بات ہے۔ لیکن درندے اسے کبھی نہ بھول سکیں گے ہمارے گروہ کا لیڈر مر گیا تھا۔

رونیلڈ اپنا نام بتاتے ہوئے جھجکا۔

کنگ کو جیسے اس کے دل کی بات معلوم ہو گئی ہو۔ مجھے اپنا نام نہ بتاؤ یہ ہی بہتر ہوگا۔ اگر میں تمھارے بارے میں نہ جانوں۔ میں تمھارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ میرا خاندانی ڈاکٹر ٹینگ ہے بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے میں اسے اپنے گھر بلاؤں گا۔ اور تمام باتیں بتاؤں گا۔ اس کے بعد ہم اس کے کہنے پر عمل کریں گے۔ اس کا جو مشورہ ہوگا۔

تمھیں میرا صرف اتنا کام کرنا ہے کہ جب شہر سے جاؤ تو ایک عورت

کو اپنے ساتھ لیتے جانا۔

رونیلڈ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

ایک عورت کنگ نے دوبارہ کہا، وہ جوان ہے وہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہاں درندوں کے ہاتھوں مر گیا تھا جب یہ شہر میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کی لڑکی میرے ساتھ ہے وہ اس وقت سے میرے گھر میں چھپی ہوئی ہے۔

لیکن کیا یہ کام آسانی سے ہو سکے گا۔ اسے اس میں شک تھا۔ کیا وہ اسے محفوظ لے جاسکتا ہے۔

وہ ایک چینی کے مقابلہ میں تمھارے پاس زیادہ محفوظ رہے گی۔ کنگ نے وثوق سے کہا میں یقین دلاتا ہوں کہ تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں اس کا بھیس بدل دوں گا۔ تم آسانی سے اسے اپنا رشتہ دار بتا سکو گے میں تمھارے ساتھ اسے ایک ہندوستانی بنا دوں گا۔

رونیلڈ نے دیکھا کہ بوڑھا اس کی آنکھوں کو گھور رہا ہے اس نے فوراً کہا تم جانتے ہو کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔

میں تمھیں ہندوستانی سمجھ سکتا ہوں کنگ نے علمیت کا اظہار کیا وہ ایک لمحہ رکا اور اس کے بعد کہنے لگا کیا تم میرے گھر آنا پسند کرو گے میں کسی کو ڈاکٹر ینگ کو بلانے بھیجتا ہوں۔

اس کا گھر اس کی دکان کے بالکل پیچھے تھا۔ الماری کے درمیان سے گھر کے لئے راستہ تھا۔ کنگ نے دروازہ کھولا اور وہ صحن میں پہنچ گئے۔ ایک جوان آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ کنگ نے فخر سے کہا رونگ اٹھو یہ ایک ہمارا دوست ہے۔

ایک نوجوان آدمی اس کے سامنے تھا وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر جھکا کر سلام کیا۔ سگریٹ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ سگریٹ جاپانی تھا۔ وہ غور سے رونیلڈ کو دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی آنکھوں سے کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ رونیلڈ نے سر کے اشارہ سے سلام کا جواب دیا آؤ یہاں انتظار کرو کنگ نے کہا۔

رونیلڈ نے اس کا ساتھ دیا اور وہ جوان آدمی پھر کرسی میں دھنس گیا۔ رونیلڈ اس کے نئے جوتے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ اس بوڑھے کا بیٹا کس طرح ہے جس کا گون پھٹا ہوا ہے وہ اندر تک بڑھ گئے۔ نوجوان ان کے ساتھ نہ تھا۔

یہاں بیٹھئے مہربان کنگ نے کہا اور خود میز کی طرف بڑھ گیا معاف کیجئے میں ایک آدمی کو ڈاکٹر بلانے کے لئے بھیجدوں۔ اس نے کیتلی کو دیکھا چائے ابھی تک گرم تھی۔ برتن لینے کے لئے دوسرے کمرہ کی طرف بڑھا اور رونیلڈ کمرہ میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے کمرہ کا جائزہ لیا یہ ایک معمولی کمرہ تھا۔ ہاں کسی زمانہ میں خوبصورت رہا ہوگا کمرہ میں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑھیا بید کی تھیں جن کا بید اب پرانا ہو چکا تھا۔ کچھ معمولی لکڑی کی تھیں۔ تمام کرسیوں اور کمرہ کی اور چیزوں پر دھول ہی دھول جمی ہوئی تھی۔

ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا آگے کیا ہوتا ہے وہ خطرہ کو بہت جلدی سونگھ لیا کرتا تھا۔ قالی ابھی تک دروازہ کی پہرہ داری کر رہا تھا۔ اس نے بےچینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھا نوجوان ابھی تک ویسے ہی کرسی پر لیٹا تھا وہ ویسے ہی کھڑا رہا سگریٹ کے دو چار کش مارے اور پھینک دیا۔

رونیلڈ نے پیروں کی چاپ سنی اور دروازہ کی طرف مڑا۔ دروازہ پر پڑا ہوا پردہ ہلا اور ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ عورت اسے غور سے دیکھنے لگی

اس نے بھی اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ عورت دیکھنے میں چینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ لباس ضرور پہنے ہوئے تھی۔ اس کی صاف شفاف آنکھوں نے لمبے سنہرے بالوں نے اسے بہت متاثر کیا۔

میں کہتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے اس نے ہکلاتے ہوئے کہا مجھے اس کی امید نہ تھی لیکن اس نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اچانک اس کے چہرہ پر ناگواری کے آثار نظر آئے اس نے بڑھ کر باہر کی طرف جھانکا کہ اس نے کھڑکی میں سے کیا دیکھا۔

نوجوان نے اسے دیکھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ نوجوان داخل ہو اس نے دروازہ کا پردہ گرا دیا اور رونیلڈ اس کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔

کون تھا اس نے پوچھا۔

کون' چینی نے سوال کیا۔

وہ سفید عورت' رونیلڈ نے زور دے کر کہا۔

نوجوان نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ کیا؟ سفید عورت انگریز

کوئی سفید عورت نہیں ہے۔

چینی کے تعجب پر اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا کہ اس نے ایک نوجوان عورت کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت غیر شعوری طور سے انگریزی میں بات کرنے لگا۔ نوجوان نے بھی صاف انگریزی ہی میں جواب دیا تمھیں خواب آ رہے ہوں گے۔

رونیلڈ اٹھ گیا۔ میں خود دیکھوں گا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کمرے کو پار کرے۔ رونگ نے اسے پکڑ لیا۔ تم اندر نہیں جا سکتے۔ اندر کسی اجنبی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

جواب کی بجائے رونیلڈ نے اس آدمی کو ایک طرف کر دیا۔ اور اسی لمحے دوسرے دروازے سے کنگ داخل ہوا اور اس نے رونگ کے اس رویہ پر احتجاج کیا۔

یہ گدھا ہے جسے تم لے آئے ہو۔ یہ اندر جانا چاہتا ہے۔ رونگ نے جواب دیا اسی طرح۔

رونیلڈ اس کی طرف مڑ گیا اور کہنے لگا کہ اس نے ابھی ایک سفید فام عورت اس گھر میں دیکھی ہے۔

لیکن یہ تو وہی ہے۔ جس کے بارے میں میں نے تمھیں بتایا تھا۔

کنگ اپنی آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ مگر تمھارا اجنبی کہنے لگا کہ گھر میں کوئی عورت ہی نہیں۔

تم نے مجھے خود کیوں نہیں بتایا کہ وہ سفید فام ہے۔ رونیلڈ نے شکایت کی۔

مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں سفید فام کا سن کر ذمہ داری لینے سے انکار کر دو۔ اور میں اسے کسی اور طرح یہاں سے نہیں بھیج سکتا۔ اس کا باپ میرا گہرا دوست تھا۔ میں اس کو تب سے جانتا ہوں جب کہ وہ خام مال امریکہ کو بھیجنے کے لئے خریدا کرتا تھا۔ اس کی بیوی بھی دیر ہوئی مر چکی تھی اسے اپنی بچی کی بہت فکر تھی۔ اور میں نے ہی اسے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے لے آیا اور میں نے دیکھا کہ ایرا کافی بڑی ہے وہ میرے لڑکے اور لڑکی جو مر گئی اس کے ساتھ اکثر کھیلا کرتی تھی جب دشمن شہر میں آئے تو اس نے اسے میرے سپرد کر دیا۔

رونگ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے ایک اجنبی کو یہ سب کیوں بتا دیا۔ اس نے غصہ میں پیر دو سر کا یا اور چلا گیا۔

کنگ کو کھانسی آگئی۔ "تم جانتے ہو" اس نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔

"اس خوبصورت لڑکی کو ہمیں اپنی بھلائی کے لئے بھی گھر سے نکالنا ضروری ہے میرے لڑکے کی ماں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ ہمارا لڑکا اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ ہم اس کی شادی کر دیں۔ اور ہمیں خوف ہے کہ وہ ایرا کی طرف کھنچ جائے گا۔ مگر دو نسلوں کا ملانا کس قدر تباہ کن ہے خدا نے ہمیں مختلف مٹی سے بنایا ہے اور قدرت نے جن کو جدا کر دیا ہو انسان کو انھیں ملانا نہیں چاہیئے"

"میں تم سے پورا اتفاق کرتا ہوں" رونالڈ نے سختی سے کہا۔ "اب ہمیں جلدی چلنا چاہیئے"

"ہاں ہاں" کنگ نے کہا "ہم جلدی چلتے ہیں۔ ڈاکٹر کسی لمحہ آ جاتا ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ ہر چیز تیار ہے یا نہیں۔ اچھا! اجازت"

ایرا لائبریری میں بیٹھی بظاہر ایک کتاب پر جھکے ہوئے باتیں سن رہی تھی۔ وہ دو روز سے زنانخانہ میں چھپ کر رونگ کی نظروں سے بچ رہی تھی۔ آخر وہ رونگ کی ماں کے ساتھ کیوں نہیں رہی جہاں وہ محفوظ تھی؟ مگر اس غیر ملکی کی بات اس کے لئے کتنی پرکشش تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ غیر ملکی سفید فام ہے یا شاید امریکی اگر وہ اس سے بات کر سکتی تو ممکن تھا کہ اس شہر سے نکلنے کی کوئی راہ نکل آتی۔ اس جذبے کے ساتھ وہ تیزی سے بڑے کمرے کی طرف گئی تھی۔ مگر وہ غیر ملکی ایک ہندوستانی تاجر تھا اور وہ اس کے لئے کیا کر سکتا؟ اسی لمحہ رونگ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ دوڑ کر اس امید پر لائبریری کی طرف بھاگی کہ حسب معمول کنگ وہاں ہوگا مگر کمرہ خالی تھا۔ اب رونگ کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے سمجھ لیا کہ اس سے بچنا مشکل ہے تیزی سے الماری سے ایک کتاب نکال کر اپنے سرخ ہونٹوں کو بھینچ کر بیٹھ گئی۔

دوسرے لمحہ وہ وہاں تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کی کالی اور جواب طلب آنکھوں میں کچھ دیکھا۔

"ایرا" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم ان دو دنوں میں مجھ سے دور کیوں رہیں؟"

"تم جانتے ہو کیوں"۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے باپ کی موت تک ایرا محفوظ تھی گو اس وقت بھی اسے معلوم تھا۔ کہ رونگ اس کا طالب ہے۔ ان دنوں وہ اس پر ہنس سکتی تھی۔ مگر اب جبکہ وہ اس کے باپ کے گھر میں تھی۔ ہنسنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے خائف تھی۔ وہ اٹھی اور بظاہر بے تعلقی سے کتاب واپس رکھتے ہوئے دروازہ کی طرف چلی۔

"ایرا تم ابھی نہیں جاؤ گی۔" وہ چیخا "اس وقت تک نہیں جب تک تم...."

"تمہاری ماں میرا انتظار کر رہی ہے" اس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا
اچانک خوف کا احساس شدید ہو گیا۔ وہ اب وہ لڑکا نہیں تھا جس کے ساتھ وہ پل کر بڑی ہوتی تھی۔ وہ ایک اجنبی تھا۔ جنگ نے اسے بدل ڈالا تھا مگر جنگ نے تو ہر چیز بدل دی تھی۔ وہ بڑا پر امن شہر جہاں وہ خوش خوش اپنے اپ کے ساتھ رہتی تھی اب اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جہنم بن گیا تھا اور روفانگ اس کا دشمن تھا۔

اس پر خوف چھانے لگا اور کتاب گرا کر وہ آنکھ بند کر کے کمرے سے نکل کر تنگ راہداری پر دوڑنے لگی۔ مگر اینٹ کی زمین نم اور سرد تھی وہ پھسل اور دو مضبوط بازوں میں خود کو محسوس کیا۔ پھر اس نے ہنری کی بگڑی ہوئی سیاہ فام چہرہ دیکھا۔

"اوہ" وہ چیخ پڑی اور خود کو چھڑا لیا۔ روفانگ جس نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا
"ہا" مسٹر لنگ نے تیزی سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ تم یہاں ہو میں تلاش کرتے کرتے آ ہی رہا تھا۔ یہ ہیں مسٹر...... مسٹر......"
"سنگھ" رونالڈ نے آہستہ سے کہا
"یہ ہے وہ لڑکی" کنگ نے جلدی سے کہا "ایرا" یہ میری ہی طرح ریشم کے تاجر ہیں جلد ہی شمال کی طرف سفر کریں گے۔ میری بچی! میری خواہش ہے کہ اب میں تمہیں یہاں سے بھیج دوں۔ کہیں دشمنوں کو تمہاری خبر نہ ہو جائے یاد رکھو کہ جاپانیوں اور امریکنوں میں جنگ ہو رہی ہے اور تم امریکی ہو۔ میں مجبور ہوں جیسا کہ ہم سب مجبور ہیں۔ اگر انھوں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا تو کیا میں تمہیں بچا سکوں گا؟ نہیں۔ اور یہ بھی کیسے یقین کر لوں کہ کوئی لاپروا نوکر یا مہمان تمہیں دیکھ کر نہ کہے کہ تم یہاں ہو۔ امریکہ کے اعلان جنگ سے پیشتر ہی مجھے اندیشہ تھا اور اب تو ہر ساعت خطرناک ہے۔ یہ شیطان تمام امریکنوں کی تلاش میں ہیں"
کیا امریکنوں نے لڑائی کا اعلان کر دیا ہے۔ ایرا نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ اس نے اس دیواری میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنا تھا۔ نہ کسی نے کچھ بتایا اور نہ یہاں اخبار پڑھنے کو مل سکا۔
یقیناً تمہیں تو معلوم ہو گا روفانگ کہ یہ نئی لڑائی چھڑ چکی ہے۔ اس نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں رہی گہری تشویش پائی کہ یہ اب جاتی ہے۔ اگر اسے جواب دینا نہیں ہے تو نہ دے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے سنجیدگی سے کہا مجھے اب جانا ہی ہو گا مجھے اب یہاں رہ کر تم سب کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ اگر یہ مہربانی کر کے مجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو میں چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں میں اپنے آپ کو چھپا لوں گی۔ اور یقین ہے کہ میں نہیں سکتی یہ بال ہیں تا میرے۔
وہ چینی میں گفتگو کر رہے تھے لیکن اب رونیلڈ نے انگریزی میں کہا میں تمہیں خطرہ سے نکالنے کے لئے جو کچھ بھی کر سکوں گا بڑی خوشی سے کروں گا: اچانک اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی بات پر ایک تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی۔ جسے روفانگ نے دور کیا: "معاف کیجئے گا۔ ابا جان ضعیف کنگ کے سامنے وہ بڑے ادب سے جھکا! اور پھر کچھ کہے بغیر وہ راہداری سے گذر گیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام باتیں دور ہو گئیں جن سے وہ پریشان تھے۔
ایرا ایجابی انداز میں رونیلڈ کی طرف مڑی اور کہا: "تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ میں جانا چاہتی ہوں" اس نے انگریزی میں کہا جو کنگ کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ ان کا منہ تکنے لگا۔
"میں انگریز ہوں" رونیلڈ نے اچانک کہا اور وہ متحیر ہو گئی "میں شمال مغربی علاقوں کے لئے دوا لینے آیا ہوں۔ ہسپتال میں میرا ایک ہندوستانی دوست سرجن ہے اور اس نے مجھے یہ لباس دئے تاکہ میں محفوظ رہوں میرا خیال ہے یہ بہتر ہے اگر تم تمام باتیں سمجھ لو۔
سچ کے تذکرے نے اسے لاں لی کی یاد دلا دی۔ اس نے اسے ذہن سے نکال دیا تھا جب اسے اپنے مرتے ہوئے شوہر کے پاس چھوڑا تھا کیونکہ اس کے خیال سے اسے شرم آتی تھی۔ اب ایرا کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اب وہ لاں لی کے بارے میں صحیح طور پر سوچ سکے گا۔ اس واقعہ سے اسے حیرت اور تسکین ہو رہی تھی۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست کی بیوی تمہارا استقبال کرے گی۔ میرا مطلب ہے تم صرف مردوں کے ساتھ نہیں رہو گی"
"اوہ" اس نے ایک طویل سانس لیا "ضرور! تم کنگ سے کہو اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر یہاں لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا"
"اپنے والد کی طرح" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ کنگ کی طرف مڑی اور نرم چینی زبان میں جو کچھ رونیلڈ نے کہا تھا کہہ دیا۔
کنگ نے حیرت سے منہ پھاڑے ہوئے سنا "ای یا" رونیلڈ کی طرف تاکتے ہوئے اس کے منہ سے نکل پڑا۔ "انگریز؟" میں خود ڈاکٹر کو لانے جا تا ہوں

بیشک اب ہم دیر نہیں کر سکتے۔" اس نے تیزی سے لبادہ جسم پر پہنا اور نکل گیا۔

اب وہ چینی تاجر کے گھر کی خاموش اور دھندلی فضا میں تنہا تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رونیلڈ کی سانس حلق میں پھنسنے لگی۔ جذبات کا وہ طوفان جو وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ تصورات کی اس تراکت سے مختلف تھا جس نے لاوس لی کے متعلق اس کے احساسات میں ہلچل مچا دی تھی۔ ایرا کو اپنے بازوؤں میں لے کر قریب تر کرنے کی اور وحشیانہ طریقہ سے چومنے کی خواہش اس کے دل میں ابھرنے لگی۔ جذبات کی شدت سے سکتہ کا عالم طاری ہو گیا اور وہ اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں پھیر لیں

"مجھے امید ہے تمھیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی" اس نے کہا۔

"قطعی نہیں"

"میرا مطلب ہے" ایرا بولی "میں اچھی طرح اپنی حفاظت کر لوں گی میں چینیوں سے مانوس ہو چکی ہوں۔ دشمنوں کے ملک میں سفر کرتے ہوئے بس تنہا نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں سمجھتا ہوں" اس نے جواب دیا

رونیلڈ نے بمشکل کوئی بات سنی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بہت ہی حسین اور سڈول تھے۔ ایرا! یہ نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"کیا ہم فوراً ہی جا سکتے ہیں" ایرا نے دریافت کیا۔

"ہاں فوراً جانا چاہیے" اس نے احتیاطاً کہا "مگر میں اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک میں جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ پورا نہ ہو جائے۔ وہ یہ کہ تھی بھی دوائے جاتا ممکن ہو مجھے اپنے ساتھ لے جانی چاہیے۔"

"غیر قانونی طور پر"! اس کی آواز اکھڑ گئی۔

"جو چاہو کہہ لو" اس نے جواب دیا۔

کنگ کی واپسی پر گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اور وہ ایک شخص کی آستین پکڑے ہوئے لا رہا تھا۔ رونیلڈ نے اتنا مختصر اور ایسا جھریوں والا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا انسان قدرے جھکا اس کی چھوٹی آنکھیں پرانے انداز کے بڑے سینگ نما چشمے کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ کنگ نے اس کی آستین پکڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ڈاکٹر ٹینگ مجھے یہ روانہ ہو ملا اور میں نے اس کو تمام باتیں سمجھا دی ہیں۔ تمھارے لئے دواؤں کا انتظام کر دے گا۔"

کنگ نے اس مختصر آدمی کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں اس سے کہہ دوں کیوں؟"

"ہاں" امید سے زیادہ گہری آواز میں چھوٹے سے ڈاکٹر نے کہا "اس سے کہہ دو یہ میرے قابل اعتبار ہونے کا ثبوت ہوگا۔"

کنگ نے دھیمے لہجے میں رونیلڈ سے کہا "اس کی واحد لڑکی ان بدمعاشوں کے ہاتھ میں پڑ گئی۔ وہ زندہ ہے یا مر گئی اسے نہیں معلوم مگر اس نے پھر کبھی اسے نہیں دیکھا۔ وہ بہت چھوٹی اور بے حد حسین لڑکی تھی۔ گلاب کے پودے کی طرح۔ اور کچھ بھی نہیں سوچنا۔ تمھیں مدد کرنے میں اسے بڑی خوشی ہوگی۔"

ایرا نے نیلی خوفزدہ آنکھوں سے سنا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سانحہ کے ساتھ ہی سانحہ پیش آیا۔ اوہ ڈاکٹر ٹینگ......"

چھوٹے سے ڈاکٹر نے ملتجیانہ انداز میں اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور ایرا پر نم آنکھوں سے خاموش کھڑی رہی۔

"کیا تم لوگ آج جا رہے ہو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کی آواز خوردبینی نرم کے پیچھے سے رکتی ہوئی نکلی اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کی تمام ہڈیاں لرز رہی ہیں "میرا ایک دوست ہے ——— وہ وہ......

جو میری ہی طرح دشمنوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ ان کی دوا کی دوکانیں ہیں۔ فطری طور پر میرے دوستوں کو دوا فروش ہونا چاہیے تاکہ ان سے میں کھل کر بات کر سکوں۔ دوسرے ڈاکٹر سے مجھے محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں وہ میرا راز نہ معلوم کر لے۔ میرے یہ دوست مجھے دوائے دینگے جب انھیں معلوم ہوگا کہ یہ پہاڑی آدمیوں کے لئے ہے پہلے وہ غیر قانونی طور سے لے جایا کرتے تھے مگر جب سے چند دوا فروش پکڑے گئے اور ان کو موت کی سزا دی گئی۔ ان لوگوں نے بند کر دیا۔ اب یہ شیطان بہت سخت ہو گئے ہیں۔ اب ان کو حاصل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان دواؤں کی جگہ اسی قسم کی دوسری چیزیں رکھ دوں۔ آج رات سے پہلے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔"

کنگ کے چہرے پر مسکراہٹیں چھائی ہوئی تھیں۔ "یہ شخص دواؤں کا جادوگر ہے۔ اس نے میرے والد کو ایک خفیہ دوا کے ذریعہ دس سال تک زندہ رکھا جب کہ دوسروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ یہ شخص!"

کنگ ہنسا "یہ انسان کے پھیپھڑے سے کسی غیر ضروری چیز کو جس کی وجہ سے موت واقع ہو سکتی ہے ہٹا کر اس کے بازوؤں میں لگا سکتا ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔"

ایک غم انگیز مسکراہٹ ڈاکٹر کے چہرے پر بمشکل پیدا ہوئی "اگر کافی

پیسے میں تو میں اسے درخت پر بھی لٹکا دوں۔" اس نے کہا۔

کنگ بولا۔ "ہاں! یہ ایسا ہی کر سکتا ہے اور جس کام کو کرنے کا تہیہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ یہ تمھیں دوائیں ضرور لا کر دے گا۔ اب کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔" کنگ نے چٹخارہ لیا اور ہاتھ ملنے لگا۔ پھر ایرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری لاڈلی! تمھیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے روشنیاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں ڈرتی"۔

"اندر داخل ہو" جاپانی گارڈ نے کہا۔

روفنگ باغ کے سامنے دروازے میں گیا۔ جہاں بچپن میں وہ ایرا کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب اس کا باپ جان میک لین سے ملنے آیا ہوتا۔ وہ شاعرانہ جذبات سے خالی نہیں تھا اس لئے اس کے ذہن میں وہ چھوٹی لڑکی اپنے زرد لہلہاتے سید ھے بالوں کے ساتھ ابھر آئی جس کی اپنی خوشبو اس کے لئے کس قدر دلکش تھی۔ اس کی جوانی کے ساتھ ساتھ ایرا کا خیال اپنے دامن میں لامتناہی گہرا رومانی سمیٹ لایا تھا جس کے سائے میں وہ اپنے باپ کے مکان اور دکان کی حقیقتوں سے مفرور ہو کر پناہ لے سکتا تھا۔ جان میک لین نے ہمیشہ اس خوبرو چینی لڑکے کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا جو اس کے دوست کا لڑکا تھا۔ روفنگ اس گھر کی آراستگی اور حسن سے محظوظ ہونے کو اور غیر ملکی آرام دہ کرسیوں پر کتابیں پڑھنے، رسالے دیکھنے اور ایرا کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے لئے بڑی خوشی سے داخل ہوا تھا۔ اس گھر میں ایک حسن شادمان کا راج تھا۔

روفنگ کئی وجوہات کی بنا پر جاپانیوں سے متنفر تھا۔ جن میں ایک یہ تھی کہ وہ میک لین کے گھر پر قابض ہو گئے تھے۔ مگر اس نفرت سے بھی شدید تر جذبہ اس کے اندر کار فرما تھا۔

جونہی برآمدے کی طرف جاتی ہوئی اینٹوں کی سڑک پر وہ چلنے لگا اور پھر پتھروں پر سے سامنے کے دروازہ پر جا پہنچا گارڈ کے علاوہ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسا کہ اسے یاد تھا۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ میک لین اسے کہیں سے دیکھ رہا ہے۔

"اندر داخل ہو" دوسرے گارڈ نے چیلے کی سی آواز میں کہا۔ اور روفنگ ہال میں داخل ہوا۔ دائیں طرف لائبریری تھی جہاں اکثر میک لین کا سفید سر پرانی بھاری سی چینی میز پر جھکا رہتا تھا جہاں وہ ان دنوں کتاب میں لکھتا تھا جب اس نے امریکہ جانا چھوڑ دیا۔ وہ ابتک اسی طرح شیلف پر جھوری اور سنہری جلدیں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر میک لین کی میز پر ایک جاپانی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ روفنگ کے داخل ہوتے ہی اس نے اس پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

"اب تم کیا چاہتے ہو"؟ اس نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں وہ جگہ لوں گا جو گزشتہ ہفتہ مجھے دی جا رہی تھی" روفنگ نے کہا۔

"جو کچھ تم دیکھ گئے مجھ سے کہنے کے لئے ؟" افسر نے کہا

"ظاہر ہے"۔

افسر نے میز پر تھاپ ماری اور کلرک اندر داخل ہوا۔ افسر نے کہا "یہ شخص ملازم ہو رہا ہے۔ اس کی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار ین اور مخصوص ملازمت کا نشان اسے ابھی دے دو"۔

کلرک نے کان پر لٹکا ہوا قلم نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا اور واپس چلا گیا۔ دوسرے لمحہ وہ لوٹا اور ایک پیتل کا تمغہ جس پر طلوع ہوتے سورج کا نشان تھا اور جاپانی دستاویزوں کا پلندہ اسے دیا۔

"اگر تم نے اچھی طرح کام کیا" جاپانی افسر نے بلند آواز میں کہا "تین ماہ میں تمھاری ترقی ہو جائے گی۔ شہر کی حکومت میں تمھیں کسی اعلیٰ عہدے پر بھی فائز کیا جا سکتا ہے"۔ اس نے ایک سگار سلگایا اور دھوئیں کے حلقوں میں اس کی آواز تیرتی رہی "تم چینیوں کو یہ جاننا چاہیئے کہ ہم تمھارے دشمن نہیں بلکہ تمھارے دوست ہیں ہم دونوں کی ترقی ......"

مگر روفنگ نے کچھ نہیں سنا۔ افسر کی تنی ہوئی بھوئیں، چھوٹی سی آنکھیں اور موٹے موٹے ہونٹوں سے اسے کراہت ہونے لگی۔ پھر اس کراہت پر تاریک نا امیدی چھا گئی جو اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ پانچ سال پہلے وہ کالج کا ایک حوصلہ مند طالب علم تھا اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی جانے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ ریشم کی بنائی کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں کے بارے میں سوچتا رہتا۔ "چین کو اپنی دولت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔" وہ اکثر اپنے دوستوں کے مختصر حلقے میں کہا کرتا۔

اور پھر سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرح لوگ اچانک سیاہ بادل کی طرح ان کے اور سورج کے درمیان چھا گئے۔ قدیم اور مہذب شہر پر قابض ہو گئے۔ فتح کرتے ہوئے یہ لوگ مشرقی چین کے خوشحال علاقے کے نصف حصہ پر چھا گئے اور روفنگ ان کی آسان فتوحات کو دیکھ کر نا امید ہو گیا۔ شمالی مغربی لوگوں کی گوریلا جنگ کو وہ نفرت سے دیکھنے لگا جدید سائنس کے طریقوں سے آراستہ جاپانیوں کے خلاف کسانوں کا اسی طرح لڑنا بھی پاگل پن

قربان کرنا بے سود تھا۔ وہ آخر کار وہ ایک نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اس جیسے نوجوانوں کی آخری امید صرف صلح کرنے میں پنہاں تھی۔ اگر ان کی طرف داری حاصل کرے تو بہت ممکن ہے کہ وہ ان کارخانوں کی تشکیل کر سکے گا جن کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اپنے باپ سے بحث کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "ہم لوگ ان شیطانوں کی وجہ سے چین کو ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں اور پھر جب ہم طاقت ور ہو جائیں گے.........."

مگر اس کے باپ نے مشورہ دیا تھا "صبر کرو صبر! ہم ہزاروں سال تک ان کارخانوں کے بغیر زندہ رہے اور سو سال اور بھی گزار سکتے ہیں۔ میرے بیٹے! ہم لوگ کاشتکار رہیں۔"

"اور اس نئے میشن کے آدمی ہم پر قابض ہو گئے۔" رو فنگ نے تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔

ایرا! وہ لاچار تھا کیونکہ وہ ایرا کو چاہتا تھا۔ وہ ناراض تھا کیونکہ وہ اس کو اس رات سے چاہنے لگا تھا جب اس کا باپ اسے اپنے گھر سے لے آیا تھا۔ وہ گھڑی اسے اچھی طرح یاد تھی جب دالان میں شور ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے باپ کی تیز مگر دھیمی آواز آ رہی تھی۔

"ہمیں اس کو چھپانا ہے۔"

"اسے اندر کے احاطے میں لے آؤ۔ میں اس کی ذمہ دار رہوں گی" اس کی ماں نے جواب دیا تھا۔

یہ جان کر کہ وہ ایرا ہی ہے وہ فوراً بستر سے اچھل پڑا تھا۔ یہ بالآخر دن اس ضعیف شخص کی ساتھ گھڑی تھی جو اس کو نکال لے آیا تھا۔

"میرے والد نے مجھے یہاں آنے کو کہا تھا۔ مگر وہ اس کو لے گئے نہ جانے کہاں" اس نے لنگ سے کہا۔

پھر اس نے رو فنگ کو دیکھ کر جو اس کی موجودگی سے خوش ہو کر دیکھ رہا تھا وہ یہاں بھی اس کے گھر میں قبل اس کے کہ وہ اپنے فاتحانہ جذبات کو چھپا سکے ایرا نے سب کچھ سمجھ لیا۔ رو فنگ نے اس کی ناگواری محسوس کر لی۔ وہ آشنا تھا کہ فوراً اس نے یہ سمجھ لیا کہ اس کی محبت ایرا کو ناگوار گزر رہی ہے شروع میں اسے خیال سے اسے بے حد تکلیف ہوئی۔ اب صرف اسے غصہ آیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بچھڑ نہیں جانے دے گا

اسی جذبے کی بے پناہ قوت کے تحت اس نے افسر کی بھدی آواز کے درمیان کہا "میں اپنا پہلا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اس شہر میں ایک ہندوستانی تاجر ہے مجھے شک ہے کہ نہ تو وہ تاجر ہے اور نہ ہندوستانی۔"

جاپانی کی گھنی بھویں اوپر کو تن گئیں اور اس نے پوچھا "وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

رو فانگ نے جلدی سے جواب دیا "یہاں صرف ایک ایسا ہوٹل ہے جہاں سفید فام شخص رہ سکتا ہے۔ بہت زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ گرانڈ ہوٹل میں ہوگا"

جاپانی نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

رو فانگ نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "آپ یہ جان لیں کہ میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ دو مہینے والد کی دکان پر ایسا شخص خریدنے آیا تھا جو ہمارے پاس نہیں ہے یہ صرف میرا شک ہے۔"

افسر نے جواب دیا "اگر وہ سفید فام ہے تو شک ہی کافی ہے۔"

رو فنگ جھکا اور چلا گیا لفظ خوفزدہ اور نصف مطمئن۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتا رہا میں نے ٹھیک کیا۔ میں نے صرف شک ہی کیا۔

کنگ کی ریشم کی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تالی نے رو فنگ کو پھاٹک سے نکلتے اور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا۔ سڑک پر بیٹھے ہوئے فقیر سے جو دھوپ میں اپنے پھٹے پرانے کوٹ سے جوئیں نکال رہا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ خوبصورت شخص کون ہے؟"

فقیر نے اوپر دیکھا "وہ ؟ کنگ خاندان کا اکلوتا لڑکا ہے اسکے ہاتھوں میں کیڑے پڑیں کبھی مجھے ایک پائی نہیں دیتا۔ بوڑھا میری جھولی میں پیسے ڈال دیتا ہے اور بوڑھی آسمان میں اس کا اجر حاصل کرنے کے لئے ہر رات بچا ہوا کھانا بھیج دیا کرتی ہے۔ مگر اس نوجوان کا دل تو خشک مٹی کا ہے۔"

تالی غائب ہوتے ہوئے ہیولے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کہا "مجھے حجامت بنوانی ہے میں کسی حجام کی تلاش کو جا رہا ہوں۔"

وہ مخالف سمت میں چلتے ہوئے ایک کونے کی طرف مڑ گیا۔ اور پانچ منٹ میں وہ رو فنگ کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چل رہا تھا۔ اس نے رو فنگ کو ایک پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا جہاں وہ جاپانی گارد ٹھہرے تھے اور زندگی میں پہلی بار اسے یہ خواہش ہوئی کہ وہ پڑھ سکتا کیونکہ پھاٹک پر کچھ لکھا ہوا تھا لہٰذا سامنے تابوت کی دکان پر گیا اور اس کے مالک سے جو اندر بیٹھا ہوا تھا۔ دریافت کیا۔

اس نے جواب دیا "ایک امریکی یہاں رہا کرتا تھا۔ مگر اب وہ مر چکا ہے۔ میں نے ہی اس کا تابوت بنایا تھا۔ اس کی لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کہاں۔ ممکن ہے دشمنوں کے پاس ہو۔ مکان پر دشمنوں کا قبضہ اور کون جانے وہ اس کے اندر کیا کرتے رہتے ہیں مگر اکثر وہ بیشتر سپاہی باہر نکلتے ہیں اور مزدور قیدیوں

پکڑ کر لاتے ہیں۔ اور پھر وہ کبھی نظر نہیں آتے۔ یہ کسی قسم کا قید خانہ ہے۔"

فالی نے جماہی لی جیسے کہ یہ خبر اس کے لئے غیر اہم تھی اور آگے بڑھ گیا چند قدم آگے ایک چائے کی دکان میں ایک میز پر بیٹھ گیا اور ایک کپ چائے کی قیمت دے دی۔ وہ سامنے ہوٹل کی جانب دیکھتا رہا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے ڈونگ کو نکل کر گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ڈونگ نکلا ہی تھا کہ دشمنوں کے سپاہی تیزی سے اپنے چھوٹے چھوٹے گھوڑے بڑھا کر سخت پاؤں کے ساتھ صف باندھ کے نکلے۔

"ہا" چائے والے لڑکے نے کہا "کوئی دوسرا بدقسمت آج مرنے والا ہے۔"

اس پر فالی نے پیسے دیئے اور سپاہیوں کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ گو وہ جلدی جلدی بڑھ رہے تھے۔ درحقیقت وہ زیادہ تیز نہیں چل رہے تھے۔ اس لئے بظاہر بے کار چلتے ہوئے بھی اس نے ان لوگوں کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ہوٹل کی طرف گئے اور وہ ان لوگوں کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے ان کو پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ذہن اور بھی تیزی سے کام کرنے لگا اور فوراً اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ڈونگ کے لڑکے نے اس کے مالک کے بارے میں دشمنوں کو سب کچھ بتا دیا ہے اور یہ لوگ اس کے مالک کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔

وہ مڑا اور چالاکی سے گھومتے ہوئے گلی کی طرف چلنے لگا۔ گھر معلوم نہیں ہو رہا تھا گو دراصل وہ دوڑ رہا تھا اور جب وہ اپنی دکان پر پہنچا تو ہانپ رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سانس کی رفتار ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ جب دوکان پر نہیں ہے تو اس کا مالک ضرور گھر پر ہوگا۔ وہ دکان سے پھر دوڑا۔ رونیلڈ کنگ اور ڈاکٹر کمرے سے نکل رہے تھے ان کے ساتھ ایک سفید فام خاتون کو دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر اس کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

رونیلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ چلایا "بھائی جان! دشمن جانتے ہیں کہ آپ اس شہر میں ہیں اور دشمن ہوٹل میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ واپس مت جائیے بلکہ کہیں چھپ جائیے۔"

"آں..... ں ....." کنگ چیخ پڑا اور پھر لڑکے سے ڈاکٹر کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اچھے دوست! اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے"۔ دونوں چینیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ فیصلہ کرتے ہوئے کنگ نے رونیلڈ سے آہستہ سے کہا "ہمیں تمہیں چھپانا چاہیئے"۔

"لیکن مجھے یہ لازم نہیں ہے کہ....." رونیلڈ نے احتجاج کیا مگر ایرا کی آنکھوں میں خوف کے آثار دیکھ کر وہ رک گیا اور فیصلہ کن انداز میں کہا

"مجھے چھپا لو کیونکہ میں بچ کر نکلنا ہے"

جاپانی افسر کو خبر دے کر ڈونگ بڑی شان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اسے امید تھی کہ ابتک وہ اجنبی ہوٹل واپس آگیا ہو گا۔ رونیلڈ کا اب بھی اس کے باپ کے گھر میں موجود ہونا اسے بہت ناگوار گذر رہا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ بلکہ وہ صحن کی طرف خاموشی سے مڑ گیا اور باغ کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے ان لوگوں کو لائبریری کے برآمدہ اور باری میں کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ ایرا ان کے ساتھ تھی اور اسے دیکھ کر وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اجنبی جو کچھ کہہ رہا تھا ایرا بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس نے ایرا کو بچپن کے بعد اتنا حسین نہیں دیکھا تھا جب وہ اس کے لئے طرح طرح کے کھلونے لے جایا کرتا تھا۔ بچپن کی تمام یادیں جو ان دونوں سے متعلق تھیں اس کے ذہن میں سمٹ آئیں اور اب وہ اس کی جوانی کا اور بھی حاسد ہو گیا اور ان لوگوں کو رازداری سے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ اب وہ اجنبی جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ ہوٹل پہنچ جائے گا جہاں جاپانی سپاہی اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے ایک جماہی لی اور ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اطمینان کا سانس لے کر اپنے کمرے میں گیا اور کئی جاپانی سگریٹ یکے بعد دیگرے سلگاتا رہا جن سے کبھی اس کو تشفی نہیں ہوتی تھی مگر ان کے پینے کے بعد ہمیشہ اسے نیند سی آنے لگتی اور اب نیند کا خمار محسوس کرتا ہوا وہ بستر پر دراز ہو گیا اور دیر تک گہری نیند میں سوتا رہا۔

جب وہ اٹھا تو اس نے گھر میں اجنبی آوازیں سنیں۔ عام طور سے وہاں خاموشی اتنی تھی لیکن اس وقت تیز قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی ماں کی تیز آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ بہت مشکل تھا اور وہ تھوڑی دیر تک پڑا ہوا اٹھنے کی جدوجہد کرتا رہا اور پھر وہ یکایک اٹھ بیٹھا اور اس نے اپنی جیکٹ پہن لی جسے اس وقت وہ اتار کر سونے لیٹا تھا وہ ابھی بہت دیر تک سوتا کیونکہ ابھی اندھیرا تھا اور جب اس نے چھوٹے گھنٹے کی طرف دیکھا تو اسے بڑا تعجب ہوا کہ ابھی صرف آدھی رات گذری ہے اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور چائے کے دو گھونٹ پئے جو ہر وقت میز پر تیار رہتی تھی۔

رفتہ رفتہ اسے دن کی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ اس وقت وہ غیر ملکی جیل میں ہوگا اس نے سوچا یا شاید مر چکا ہو۔ ان شیطانوں سے کچھ بعید نہیں اسی لمحہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کسی نے اسے پکارا۔

دروازہ کھولو، دروازہ کھولو۔ اس کی ماں اسے گھبراہٹ میں پکار رہی تھی لیکن کیسا دروازہ؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے ہی لائبریری تھی اور وہ آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور داخل ہو گیا۔ کمرے کے سب آدمی اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کی ماں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ صرف رونئنگ ہے" اس نے کہا۔

اس نے ایرا کا چہرہ دیکھا جو بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ تب اس نے اس غیر ملکی کو دیکھا۔ اور حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اب اس کا کیا ہوگا وہ پکڑا ابھی نہ جا سکتا تھا۔ وہ ایک دم اس کے خیال سے خوفزدہ ہو گیا۔ اسے جاپانی افسر کی کالی تمر تیز آنکھیں یاد آ گئیں۔

صرف میں ہی ایسا ہوں مجھے پتہ نہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے اور سوتا رہا اس نے چھپنے کی کوشش کی۔

اس کے باپ نے اسے بتایا کہ شیطانوں نے کسی طرح پتہ لگا یا کہ غیر ملکی یہاں ہے۔ اور ہم اسے اور ایرا کو ساتھ بھاگنے میں مدد دے رہے ہیں وہ فوراً جا رہے ہیں بس ذرا ان کا بھیس بدل دیں۔

وہ کہاں جائیں گے رونئنگ نے کہا۔

آج تو ہمارے گاؤں جائیں گے ہمارے آدمی انہیں پہاڑی تک پہنچنے میں مدد دیں گے۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔

یہ اچھی ترکیب ہے۔ رونئنگ نے خاموشی سے کہا۔ وہ اپنی کمر دروازہ سے لگائے کھڑا ہوا خاموشی سے خلا میں گھورتا رہا۔

تمام وقت رونیلڈ خالی کی طرف سے پریشان رہا۔ جو کبھی کھانستا تھا کبھی آہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ اسے خاموشی سے برداشت کرتا رہا کہ کس طرح یہاں سے نکل بھاگیں۔

خالی کی قوت برداشت جواب دے گئی وہ رونیلڈ کو زبردستی صحن میں لے گیا اور اس سے خاموشی سے چاروں طرف چوروں کے انداز سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

ہم بری طرح پکڑے گئے اس کے لڑکے نے تمہیں دھوکا دیا۔

اب ہم کس طرح فرار ہو سکتے ہیں۔

لڑکے سے رونیلڈ نے سوال کیا۔

میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ خالی نے کہا۔ وہ دشمن کے خیمہ میں گیا تھا جب وہ باہر آیا تو اس کے ساتھ سپاہی بھی تھے۔

یہ تمام گفتگو ایک اور ہستی بھی سن رہی تھی اور وہ تھی مسز کنگ کی باندی وہ شروع ہی سے ان کے پیچھے پیچھے تھی اور جب خالی کو اس نے نکلتے دیکھا تو وہ بھی ساتھ ساتھ ہو گئی اور دروازے سے ان کی باتوں پر کان لگا دیے۔ حالانکہ وہ صرف دو لفظ سن پائی تھی "بیٹا" اور "دشمن کا خیمہ" مگر اس نے باقی کڑیاں خود ملالی تھیں اور اس نے اب خطرہ رہنا بیکار سمجھا۔

ہمیں واپس چلنا چاہیئے اور ایسا بننا چاہیئے کہ جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ ہم اس کے باپ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں تکلیفوں سے بچنا چاہیئے تم شاید غلطی پر ہو اس نے کہا۔

میں غلطی پر نہیں ہوں، خالی اپنی بات پر اڑا رہا، مگر یہ بات تم ٹھیک کہتے ہو کہ ہم کچھ نہیں بول سکتے۔ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ جلدی سے ان کے ساتھ ساتھ بھاگی اور اسی لمحہ داخل ہوئی جب وہ داخل ہوئے خالی نے اس کی طرف شبہ کی نظر سے دیکھا۔ اس نے جلدی سے ایک رومال نکالا اور مسز کنگ سے کہنے لگی کہ آپ کے چہرے پر یہ نشان پڑا ہوا ہے۔ لایئے اس کو مٹا دوں۔ میں رومال کی تلاش میں ہی گئی تھی۔

خالی نے دوبارہ اسے دیکھا اسے کچھ اطمینان ہوا اور اسکی نگاہیں نوجوان کو تلاش کرنے لگیں

ہمیں جلدی کرنی چاہیئے رونیلڈ نے مسز کنگ سے کہا۔ "بالکل" کنگ نے جواب دیا۔ یہ کچھ کپڑے ہیں تم انہیں بدل لو۔ دشمن تمہیں جان گیا ہے کہ تم ہندوستانی سوداگر نہیں ہو۔

اس نے کچھ کپڑے نکالے اور ایک جوتا اور اسے رونیلڈ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس کے بالکل ٹھیک ہے۔ اس پر بوڑھے نے پہلے ہی سے تیل کی مالش کر لی تھی اب وہ بالکل چینی معلوم ہوتا تھا۔

لیکن رونیلڈ کی طرف سے وہ بوڑھا ابھی تک مطمئن نہ تھا۔ قدرت نے تمہیں کالی آنکھیں کالے بال دیئے ہیں مگر یہ ناک تم کس طرح چھپا سکتے ہو۔ یہ تمہاری چغلی کر رہی ہے اس نے رونے والے انداز میں کہا۔

اور اس لڑکی کی نیلی آنکھوں کا کیا ہوگا مسز کنگ نے ایرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایرا چینی لباس میں تھی اور اس کی کھال بھی پیلی تھی اس کے کالے بال کر لئے گئے تھے۔ میں جانتی ہوں کیا کرنا چاہیئے اس نے کہا میں اپنی آنکھیں بند رکھ سکتی ہوں اور اس طرح اندھی بن سکتی ہوں۔

مگر خوفزدہ ہونے پر تم اپنی آنکھیں کھول سکتی ہو مسز کنگ نے اعتراض

کیدا ایرا پیلی پڑگئی۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

مجھے مرہم کی پتی لا دو۔ اب کوئی اس کے علاوہ چارہ نہیں کہ میں اس کی آنکھیں بند کردوں۔ اس نے باندی کو حکم دیا۔ اور پھر مڑکر ایرا سے کہنے لگی جب تمھیں اپنی آنکھیں کھولنے کی ضرورت پڑے تو تیز گرم پانی سے انھیں دھولینا۔ بھول نہ جانا۔

میں اسے یاد رکھوں گی ایرا نے جواب دیا۔

جب باندی جانے لگی تو اس نے جاتے جاتے روفنگ کو آہستہ سے بلاکر اسے مخاطب کیا۔ وہ تھوڑی دیر رکا اس کے بعد کمرے سے باہر جانے لگا بیٹے کہاں جا رہے ہو کنگ نے اسے پکارا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔

میں ایک منٹ میں آتا ہوں روفنگ نے جاتے جاتے دروازہ سے جواب دیا۔

رونیلڈ نے یہ سب دیکھا اور وہ اپنی جگہ پریشان نظر آنے لگا اگر روفنگ فوراً نہیں آتا تو انہیں فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس نے بہت سے لمحات اسی بے چینی میں گذار دیے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ روفنگ داخل ہو رہا ہے۔ کم از کم ان لمحات میں تو اس نے دھوکا نہیں دیا۔ مگر اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ مگر وہ اس وقت تک کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے جب تک ایرا اندھی نہ ہو جاتی۔

باندی مرہم لے کر داخل ہوئی اور اس نے اسے مسز کنگ کو دے دیا۔ اس نے روفنگ کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اس نے خانی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

روفنگ نے سب کچھ سن لیا مگر کوئی جواب نہ دیا اسے باندی پر پورا پورا اعتماد تھا مگر اس نے اس وقت اپنی اپنے خاندان کی اور باپ کی حفاظت کے خیال سے کچھ نہیں کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن یہاں آئے۔ اور رہا ایرا کا سوال تو وہ اسے یہاں روکنا چاہتا تھا۔ وہ اسے ضرور روکے گا اور دشمن اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اس نے گردن ہلائی اور فوراً کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کا دماغ برابر مصروف تھا

اسی وقت مسز کنگ نے مرہم کو پگھلانا شروع کیا اس نے کنگ کے ایک برش کو میز پر سے اٹھایا اور ایرا کے پپوٹوں پر پھیرنے لگی ایرا نے آنکھیں بند کرلیں

اب میں بالکل اندھی ہوں اور یقیناً میں کچھ خوفزدہ بھی ہوں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

خوفزدہ ہونے کی بات نہیں رونیلڈ نے جواب دیا وہ مسز کنگ کو ایرا کی آنکھوں پر برش پھیرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تمھاری پلکیں کتنی لمبی لمبی ہیں۔ اس نے قینچی سے تھوڑی پلکیں کتر دیں۔ اب تم بالکل چینی معلوم ہوتی ہو خوش قسمتی سے تمھاری ناک بھی لمبی نہیں ہے۔ کتنا عجیب عجیب لگ رہا ہے۔ ایرا بڑبڑائی۔ میں تمھاری مدد کروں گا۔ رونیلڈ نے کہا اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور بٹھاتے وقت اسے اس کے ہاتھ کی گرمی کا احساس ہوا۔

تمھارا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے۔ اس نے رونیلڈ سے تعجب سے کہا۔

میں ان آدمیوں میں سے ہوں جن کے ہاتھ ہمیشہ ٹھنڈے رہتے ہیں اس نے وثوق سے کہا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مسز کنگ نے اسے غور سے کہا اور پھر آہستہ سے کہا کہ اگر راستے میں کوئی وقت آئے تو وہ اپنے آپ کو میاں بیوی بھی بتا سکتے ہیں۔

یقیناً بوڑھے نے کہا اب انھیں ہر کوئی چینی ہی کہہ سکتا ہے تم اپنے آپ کو یہاں چینی ہی ظاہر کرنا۔

کنگ نے رونیلڈ کو ہدایت کی تاکہ لوگ تمھیں اجنبی نہ کہہ سکیں۔

رونیلڈ کہنے سے پہلے کچھ ہچکچایا اور پھر اس نے ایرا سے پوچھا کہ اسے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس نے بغیر کسی ڈانواڈول پن کے کہا مگر وہ روفنگ کی طرف سے بہت خوفزدہ تھی۔ اب رخصت کا وقت آ گیا تھا۔ بوڑھے کنگ نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک مڑا ہوا نقشہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے رونیلڈ کو سمجھانے لگا۔

آج تم صرف میرے خاندانی گاؤں تک پہونچ سکتے ہو۔ وہاں دو بھائی ہیں جب تم وہاں پہونچو گے تو صبح ہو چکی ہوگی۔ میرے سب سے بڑے بھائی تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے اور وہ تمھارا استقبال کریں گے۔ تم وہاں رات تک آرام سے سو سکو گے۔ باہر مت نکلنا اندھیرا ہونے تک اندر رہنا۔ میرا بھائی تمھیں آگے راستہ دکھائے گا۔ اس سے کچھ نہ کہنا تمھاری سمجھ میں بات بھی آگئی یا نہیں۔

ٹھیک ہے رونیلڈ نے کہا۔

میں یہ سب اس لئے کہا کہ جب ہم گھر سے باہر قدم رکھیں گے تو پھر ہم

میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ کنگ نے اسے بتلایا۔

باوجود اتنی گفتگو کے کنگ بہت کشمکش میں تھا۔ اس لئے ذرا سے یقین نہ تھا۔ آیا محافظ انھیں گیٹ سے گذرنے دیں گے یا نہیں۔ اس نے جیبوں میں بے انتہا رکھ لیا تھا۔ مگر یہ سب خیال ہی خیال تھا۔ امید ایک موہوم سی امید اب جبکہ ایرا جارہی تھی مسٹر کنگ کی آنکھیں بہنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے کندھے سے الگ کر الگ ہوئی۔ اب یہ تہیا کر لیا تھا کہ جب وہ جا رہی ہے وہ رو فنگ سے بغیر بات کرے چلی جائے۔ اس لئے آہستہ سے لپکا رہا اس لئے کہ اب وہ دیکھنے سے بالکل مجبور تھی۔

خدا حافظ رو فنگ

خدا حافظ، رو فنگ نے جواب دیا۔ دعا ہے تمہارا سفر بخیر گذرے وہ مسکرایا۔

وہ وہاں سے چلدیے اور صحن میں آئے جہاں سلک کی گانٹھیں اس کا انتظار کر رہی تھیں اور اس کے اندر قیمتی دھاتیں موجود تھیں نوکروں نے ان گانٹھوں کو بیل گاڑی پر لاد دا اور وہ سب گاڑی پر سوار ہوگئے۔ کنگ ان کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ وہ شہر کے دروازہ پر آگئے۔ سڑک پر بالکل خاموشی تھی وہ بھی اس خاموشی میں اضافہ کرتے رہے صرف گاڑی کے چلنے کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔

رو فنگ ان کے جانے کے بعد سوچتا رہا کہ بغیر اپنے باپ اور ایرا پر سائے آئے ہوئے اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو کس طرح باہر جانے سے روکے اس نے اس لمحہ کو کوسا کہ جس لمحہ ان لوگوں سے اس کے باپ کی شناسائی ہوئی تھی لیکن اپنے آپ کو کوسنا تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے دروازہ کے سپاہیوں کو ہوشیار کرنا تھا مگر یہ سب کیسے کیا جاسکتا تھا جبکہ اس کا باپ ان کا برابر شریک تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کے اوپر کوئی مصیبت آئے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ پھر اس افسر کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ وہ غیر ملکی بھاگ رہا ہے۔

نہیں اسے سیدھے سپاہیوں سے مدد لینی چاہیئے اس نے طے کیا اور وہ شہر کے مغربی دروازہ کی طرف تیزی سے روانہ ہوگیا۔

وہ لوگ گاڑی سے آرہے تھے اس کو پیدل چلنا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کسی قریبی راستے سے جائے تو ان سے پہلے پہونچ سکتا ہے۔ اس نے انھیں اپنے سے قریب ہی پایا اور وہ تیز دوڑنے لگا اس کے جوتے بے آواز تھے۔ اس لئے اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ ان سے پہلے دروازہ پر پہونچ گیا۔ اور سپاہیوں کو بلا کر ایک طرف لے گیا۔

ایک منٹ تک وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اس کا سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ جب اس کی نظر سپاہیوں کے خوفناک چہرے پر گئی جو اسے بالکل نہ جانتے تھے تو اس نے اپنی جیکٹ الٹی اور اسے الٹ کر انھیں وہ خفیہ تمغہ دکھایا۔ اس نے انھیں مطمئن کر دیا اور وہ انتظار کرنے لگے کہ یہ کیا لیتا ہے۔ مگر جب اس نے انھیں سمجھانا شروع کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں نہ وہ چینی زبان جانتے تھے اور نہ انگریزی وہ جاپانی کسان لوگ تھے وہ صرف اپنے علاقہ کی زبان سمجھ سکتے تھے۔ وہ قیمتی لمحات گذر گئے اور اس نے دیکھا کہ گاڑی قریب آگئی ہے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ سمجھانا چاہا مگر بات صاف نہ ہوسکی وہ گاڑی کی طرف اشارہ کرنے کی ہمت نہ کرسکا کیونکہ اس نے اس پر اپنے باپ کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنے باپ سے ڈرتا تھا اگر اس کا باپ نہ ہوتا تو اس نے اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو گرفتار کروا دیا ہوتا اور خود ایرا کو لے کر فرار ہوگیا ہوتا۔ مگر اب سوال باپ کا تھا اب صرف یہ کرسکتا تھا کہ وہ ان سپاہیوں کے کمرہ میں چلا جائے جو ان کے آرام کے لئے بنا ہوا تھا اور وہاں پر خاموش رہے۔

سپاہی اس کو بھول کر گاڑی کی طرف بھاگے تاکہ اس کو روک سکیں اور معلوم کرسکیں کہ وہ شہر سے کہاں جارہی ہے اور کیوں رو فنگ نے اس جگہ سے جہاں وہ پوشیدہ تھا جھانک کر دیکھا کہ اس کا باپ ان سپاہیوں کے سامنے روپیہ کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

شروع میں تو سپاہیوں نے روپیہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے افسر نے گاڑی کا پردہ ایک طرف کھینچا تاکہ دیکھے کہ کیا ہے۔ مگر وہاں پر صرف گانٹھیں تھیں کیونکہ جو لوگ شہر سے بھاگ رہے تھے وہ ان گانٹھوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ اس نے پردہ پھر گرا دیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچیں مسٹر کنگ نے اپنی جیب سے اور روپے نکال لئے۔ سپاہیوں نے انکار کیا مگر کنگ نے روپیہ ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور شہر کا دروازہ ان کے لئے کھل گیا تاکہ گاڑی آسانی سے نکل سکے۔

جب گاڑی دروازہ سے گذرنے لگی تو رو فنگ کو اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا محسوس ہوا۔ اس گاڑی میں وہ چھپی تھی ایرا اس سے چھن گئی تھی۔ ایرا کے فرار کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہوا کہ وقت نے اسے قید

کر دیا ہے۔ اس کے لئے آزادی اور خوشی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ وہ ایرا کے سامنے اپنے کو آزاد سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ اسے اپنے آپ سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ ایک نشان تھی آزادی کا۔ آزاد دنیا کا "جہاں خوشیاں ہیں۔ آزادی ہے۔ بہاریں ہیں روپیہ ہے" اس دنیا کا جس سے اُسے حسد تھا۔ اس لئے کہ اس دنیا میں روپیہ تھا۔ تسکین تھی جس نے زندگی کو راحت بخشی تھی۔ جہاں غریبی اور بھوک مٹ چکی تھی۔ اس نے کبھی سفید فام کو بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی کوئی غریب نظر آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سب سفید فام امیر ہوتے ہیں۔ آزاد ہوتے ہیں اور یہ ایرا اس دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ اس کی آرزوئیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

وہ کمرے سے نکل کر بھاگا سپاہی اس کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ ایک سڑک پر مڑ گیا۔ اب اس کے لئے صرف ایک راستہ باقی تھا اور وہ راستہ گاؤں کا تھا۔ لیکن وہ اسے اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اس لئے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ یہ تو طے تھا کہ اسے ہر حالت میں انھیں ڈرانا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو کسی طرح جاپانیوں کے حوالے کر دے۔ ایرا کو وہ کسی نہ کسی طرح واپس لے ہی لے گا۔ وہ شمال کی طرف مڑ کر وہ جون مک لین کے گھر کی طرف دوڑنے لگا تاکہ جاپانی افسر جو جون کے گھر آرام کر رہا ہے۔ اس سے کچھ مدد حاصل کر سکے۔

گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ پہیوں کی گھڑ گھڑ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ فالی باہر بیٹھا ہوا تھا اور ایرا اور رونیلڈ اندر۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک مرتبہ جب گاڑی کا پہیہ گڈھے میں گرا تو ایرا اچھل پڑی۔ رونیلڈ نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرنے سے بچا لیا۔

اوہ معاف کرنا۔ اس نے آہستہ سے کہا مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور کہنے لگا کہ کتنا بُرا ہے کہ میں یہاں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں اور تم بالکل معذور ہو۔

ہاں اس نے مجھے بالکل معذور بنا دیا ہے۔

وہ خاموشی سے بیٹھے رہے مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس کو اپنی زندگی سے زیادہ چاہنے لگا۔ اس کا اندازہ اسے اب ہوا۔ اب اس لمحہ جب وہ اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا اور ان میں بات چیت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ تو صرف یہ ہاتھ ہی ان دونوں کے پیغام کا واحد ذریعہ تھا۔ اور ایسے میں وہ صرف اس کے ہی متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کے بال، اس کی چال ڈھال، چلنے کا انداز، سر جھٹکنے کی ادا، اس کے ہونٹوں کا تراش اور پھر وہ معصوم پلکیں جو بہت سادگی اور شرم کے ساتھ جھک جاتی تھیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ وہ اس وقت اس سے لاؤ لی اور ریچ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے یہ بات بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح اس نے نا امیدی کے ساتھ انگلینڈ چھوڑا اور پھر کس طرح ذہنی زندگی کو کارآمد بنایا۔ وہ اسے لن تان اور دشمن کے بارے میں بھی بتانا چاہتا تھا جو جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر وہ یہ سب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ سب خطرناک تھا۔ چین کی گاڑی میں انگریزی میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے صرف اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔

ایرا کا دماغ بالکل صاف تھا اسے یہ مضبوط ہاتھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے رونیلڈ پر اعتبار کرتی تھی۔ رونیلڈ کے ساتھ نے اس کے اندر ایک اور عزم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جب ایرا اونگھنے لگی تو اس نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور سونے کی کوشش شروع کر دی گھنٹے منٹوں میں گذر گئے۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک گاؤں میں داخل ہوئی۔

گاڑی بان نے انکی طرف مخاطب ہو کر بتایا کہ نو بھائیوں کا گاؤں آ گیا۔ فالی فوراً کود پڑا۔ رونیلڈ نے ایرا کو جگایا اور اسے اتارنے میں مدد دینے لگا۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انھیں پہلے ہی اس گاڑی کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

رونیلڈ جلدی سے ایرا سے مخاطب ہوا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ابھی اور اسی وقت۔ میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے پاگل سمجھو مگر کیا کروں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ میں تو اسی وقت تم سے محبت کرنے لگا تھا جب میں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

گاؤں والے ان کی بات نہ سمجھ سکے مگر فالی بہت زور سے ہنس پڑا اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی ایک بوڑھا آدمی نیلا کوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا اور انھیں راستہ بتانے لگا۔ آپ اس طرف چلیں گے اور میری بیوی عورت کو لے جائے گی۔

میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے یاد رکھنا ابھی مجھے تم سے اور بہت کچھ کہنا ہے۔ رونیلڈ نے جلدی جلدی کہا۔

اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے ہلے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک

خوبصورت سی عورت نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور مسکرا کر کہا۔

میرے ساتھ آؤ۔

مگر اسے پھر اس سے کہنا پڑا۔ تم اسے یقین رکھنا کہ تم بالکل محفوظ ہو۔ اگر کوئی بات ہو تو فوراً شور مچا دینا۔ میں سن رہا ہوں گا۔ میں بالکل نہیں سوؤں گا تم سو جاؤ۔ اس نے کہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

وہ اس وقت تک اسے دیکھتا رہا۔ جب تک کہ وہ نظروں سے دور نہ ہو گئی اور اس کے جاتے ہی اسے افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ سا تھا اس کی اپنی دنیا بھی چلی گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ اس نے خالی سے کہا کہ وہ نہیں سوئے گا مگر سو گیا۔

باہر ضرور کچھ گڑبڑ تھی۔ خالی تیار رہتا۔ اس نے اس کو بھی خبردار کر دیا ہلکی ہلکی چاندنی کمرہ کے اندر آ رہی تھی۔ اس نے اس سوراخ سے، باہر کی طرف جھانکا جہاں سے چاندنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ صحن میں جاپانی سپاہی داخل ہو رہے ہیں۔

جاپانی۔ رونیلڈ نے حیران ہو کر کہا۔ انھیں ہماری خبر ہو گئی۔

رونفنگ نے ہمیں دھوکہ دیا۔ صحن گاؤں والوں سے بھرتا جا رہا تھا وہ سپاہیوں کی ترش اور تیز آواز سن رہا تھا۔ جو چیخ پکار مچا رہے تھے۔ مگر وہ ان کی بولی سمجھنے سے معذور رہتے۔

اسی لمحے ایک درخت کی آڑ سے۔ ایک صورت نظر آئی۔ اور خالی چلایا وہ دیکھو حرامزادہ وہ رہا

یہ رونفنگ تھا۔ وہ وہاں خاموش کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا۔

سامنے ہی گاؤں کا سردار کھڑا تھا جو اس کا چچا بھی تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

بھتیجے پاشا یہ سب کیا ہے؟

رونفنگ نے اسے سلام کیا اور کہا کہ آپ مجھ سے یہاں آنے کا سبب نہ پوچھئے۔ آپ میرے باپ کی زندگی کے بچانے کے لئے ان دو آدمیوں کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔

نہیں۔ ہم نے تمھارے باپ کے حکم کے بموجب انھیں پناہ دی ہے۔ ہم انھیں تمھارے حوالے نہیں کر سکتے۔

میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ انھیں ہمیں دے دیں۔

بوڑھا غصہ میں دیوانہ ہو گیا۔ کون ایسا بیٹا ہے جو اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہو۔

تم یا تو انھیں دے دو۔ ورنہ نہ تو تمھاری جان کی خیر ہے اور نہ میرے باپ کی رونیلڈ آگے بڑھا۔ مگر اس کو خالی نے پکڑ لیا تاکہ وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ مگر وہ اپنے آپ کو چھڑانے لگا تاکہ وہاں پہنچ سکے۔

مجھے جانے دو۔ اس نے کہا۔

کس لئے۔ تم وہاں کیا کر سکتے ہو۔ خالی نے اس سے پوچھا۔

میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اس نے جواب دیا

تم۔ جس کے پاس بندوق بھی نہیں۔ وہ مارنے جا رہا ہے۔ وہاں ذ سپاہی تیار ہیں۔ خالی نے گرفت اور مضبوط کر لی۔

رونیلڈ آگے بڑھ گیا۔ خالی اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا بڑھا مگر اس نے رونیلڈ کو نہ چھوڑا۔

جانے دے گدھے رونیلڈ نے کہا۔

رکو، وقت کا انتظار کرو، موقع آنے دو پھر چلے جانا۔

وہ رکے ہوئے باہر کے لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔

رونفنگ ان سے سودا کر رہا تھا۔ دیکھو عورت کو کم از کم ان آدمیوں کو دے دو۔ مجھے دوش نہ دو۔ میں بالکل مجبور ہوں۔ ا لوگوں کو پتہ معلوم ہو گیا اور باپ کی غیر موجودگی میں انھوں نے مجبور کر دیا کہ میں یہاں آؤں اور ان کی مدد کروں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا ہے کہ یہ میرے باپ کی خطا بخش دیں گے اگر میں انھیں ان آدمیوں کو واپس دلا دوں گا۔

اگر تم سچ بولو تو میں خود ان آدمیوں کو تمھارے حوالے کر دوں گا پلٹا اور چلا کر بولا۔ ان آدمیوں کو لے آؤ۔

اسی لمحہ رونیلڈ نے دیکھا کہ بوڑھی عورت ایرا کو لئے آ رہی ہے۔ اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے کہ خطرہ کا لمحہ آ پہنچا ہے۔

واپس چلی جاؤ۔ واپس چلی جاؤ۔ وہ چلایا۔ وہ خالی کی گرفت سے نکل کر تیزی سے صحن کی طرف بھاگنے لگا۔

توبہ۔ خالی کے منہ سے نکلا۔

میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔ رونیلڈ نے رونفنگ سے رونفنگ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور ہنسنے لگا ایرا نے اس ہنسی کو سنا اور وہ سمجھ گئی کہ یہ رونفنگ ہے تیز آواز میں کہنا شروع کیا۔ وہ چینی بھی اتنی ہی آسانی اور تیزی سے

سکتی تھی جتنی کہ انگریزی۔

بھائیو اور بہنو! تم اپنے اس بھائی کی کسی بات کا یقین مت کرو۔ اگر یہ اپنے ساتھ دشمن کے آدمیوں کو لایا ہے تو یہ غدار ہے۔ اس نے غداری کی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے رونیلڈ سے انگریزی میں کہا تم مجھے واپس جانے کے لئے مت کہو میں اس شخص سے نفرت کرتی ہوں۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ اجنبی رونگ کے اوپر جھپٹ پڑا اور اس کو زمین پر دے پٹخا۔

فالی یہ دیکھ کر چیخ اٹھا ہم سب کو مل کر ان دشمنوں کو بھگا دینا چاہئے فالی کے ساتھ وہ تمام سپاہیوں پر جھپٹ پڑے۔ مگر وہ کیسے ان سپاہیوں سے لڑ سکتے جو مسلح ہیں مگر اس وقت دوسرے لوگ بھی لاٹھیاں اور دوسری چیزیں لے کر آگئے اور ان لڑنے والوں کی مدد کرنے لگے۔

مجھے بھی دیکھنا چاہئے ایرا نے سوچا۔ بہن ذرا گرم پانی لا دو۔ اس نے پاس کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت سے کہا

بوڑھی عورت اسے پانی دے کر مدد میں لگ گئی۔ ایرا نے گرم پانی سے اپنی آنکھیں دھونی شروع کیں۔ گرم پانی نے اس مرہم کو پگھلا دیا۔ اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ مگر وہ کچھ نہ دیکھ سکی سوائے اس کے کہ آدمی ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ دو مرتبہ اس نے سنگین آدمی کے سینے کے پار ہوتی دیکھی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اس کی آنکھیں رونیلڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اسے نہ دیکھ سکی وہ اسے تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس نے اسے پا لیا وہ ان لڑتے ہوئے آدمیوں کے درمیان رونگ کا گلا پکڑے ہوئے اسے گھسیٹ رہا تھا۔

وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ کیا تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ وہ اس پر چلایا۔ میں تمہیں مار ڈالتا۔ مگر تمہارے باپ کی وجہ سے چھوڑے دیتا ہوں۔

گاؤں کے لوگوں نے یہ الفاظ سنے اور وہ اس کی تعریف کرنے لگے۔ باپ کی شرافت نے بیٹے کی جان بچالی۔ وہ کہنے لگے۔ اور پھر سپاہیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

سپاہیوں کو ان کے افسر نے رونگ کے ہر حکم کو ماننے کا حکم دے دیا تھا۔ اور وہ اب تک اس کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اب گولی چلانے کا حکم دے گا مگر رونگ کس طرح یہ حکم دے سکتا تھا۔ اسکے خاندان کے دو آدمی خاک و خون میں لتھڑے ہوئے فرش پر پڑے ہوئے تھے

اور اس چیز نے اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ وہ کس طرح اب گھر جائے گا اور اس کے چچا کا لڑکا ان کے سامنے مردہ پڑا تھا۔ یہی صرف کافی نہیں تھا جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو وہاں ایرا کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور اس جھلک رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکے گی کیونکہ وہ اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو ان لوگوں سے نکال لیا اور سپاہیوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ سپاہی فوراً اس کا حکم مانتے ہوئے اپنی کاروں کی طرف بڑھ گئے اور وہ بغیر ایرا یا چچا کی طرف دیکھے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ سب اسے گھورتے رہے۔ گاؤں والے ایرا، رونیلڈ اور فالی سب نے دیکھا کہ سپاہیوں نے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا اور وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ کار چلدی اور کچھ ہی دیر میں سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ سب جانتے تھے کہ اب وہ کبھی دکھائی نہ دے گا۔

گھر میں رونے کی آواز آرہی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے جسم کو لئے ان سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ان کا باپ گھر کے اندر نہ گیا اس نے رونیلڈ سے کہا کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مجھے صرف اپنے بھتیجے کی طرف سے معافی مانگنی ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔ اب تم چلے جاؤ میرا بھائی تمہیں سرحد تک لے جائے گا اور تمہیں پہاڑیوں کے پاس پہنچا دے گا۔ وہ سب جانتے ہیں

رونیلڈ بہت غمگین تھا۔ اس نے کہا میں کیا کہہ سکتا ہوں ہماری وجہ سے ہی تمہارے بیٹے کی جان گئی۔

نہیں یہ بات نہیں۔ یہ وقت کی بات ہے وقت انسان کا صحیح ممتحن ہے۔ کچھ امتحان میں پورے اترتے ہیں اور کچھ ناکامیاب۔ میرا بھتیجا اس میں ناکامیاب ہو گیا۔ وہ غدار نکل گیا اور اب اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بوڑھے نے بڑے وقار سے کہا۔

اس نے نوکرانی کو کچھ پکانے کے لئے پکارا مگر وہ پھر بھی گھر کے اندر نہ گیا اور اس وقت تک جب تک کہ یہ لوگ تیار ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہو کر روانہ نہ ہو گئے وہ وہیں رہا اور ان کے جانے کے بعد وہ بہت آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لئے چلا۔

رونیلڈ اور ایرا نے گاڑی میں اپنی جگہ لے لی اور سفر شروع ہو گیا اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کیا تم بالکل ٹھیک ہو۔ اس نے اس سے پوچھا۔

بالکل اس نے جواب دیا۔ اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ آسمان ہلکا نیلا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ اس نے خالی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور پھر وہ سب یاد آگیا جو اس وقت بالکل غیر متوقع ہوا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ خالی کنارے پر بیٹھا ہوا تھا اور گاڑیبان زور زور سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ دونوں طرف گاؤں والے ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس نے گاؤں والوں کو باری باری گاڑی میں بٹھایا اور خود پیدل چلنے لگے۔ وہ بالکل خاموش رہے۔ انھوں نے خود ایرا سے بھی بات نہیں کی جب تک کہ وہ خود کچھ نہ بولی کیونکہ انجانی عورت سے بات کرنا ان کی تہذیب کے خلاف تھا۔

وہ راتوں کو سفر کرتے رہے اور دن میں گاؤں میں رکتے رہے۔ ہر گاؤں وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ مرد مردوں میں اور عورت عورتوں میں۔

کیا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہی ہوں۔ اس نے ایک دفعہ ہنس کر کہا۔

یہ ضروری ہے اس نے جواب دیا۔ اس لئے کہ ہم ایک دوسرے ملک میں مہمان ہیں جن کی زندگی خطرہ میں ہے۔

وہ عجیب تھی اس کے اندر نہ تکلیڈس کی سی بات تھی جس سے اسے نفرت تھی اور نہ لالتی کی طرح جس کے اندر زہر ہی زہر تھا۔ ایرا کے اندر سادگی تھی دنیا کی اچھائی تھی اور اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ جہاں جہاں وہ گئی اس نے اس جگہ سے لطف لیا۔ خوب کھایا پیا اور دل کھولکر ہنسی۔ وہ زیورات پہنے ہوئے تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کے لئے ہی بنے تھے۔ وہ ہر آدمی سے محبت سے پیش آتی تھی اور ہر آدمی سے ایسے ملتی تھی کہ جیسے وہ اس کی بہت ہی اچھی دوست ہو۔ اور اسی لئے اجنبی لوگ اس کے سامنے بولتے ہوئے جھجکتے تھے۔

وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گذرتے رہے اور ہر قسم کے آدمی ملتے رہے۔ خالی انکی خدمت کرتا رہا۔ اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ وہ ایک مالک اور ایک مالکن رکھتا ہے جن کی خدمت اس کا فرض ہے۔ وہ ایرا سے گھنٹوں باتیں کرتا اور وہ اس سے طرح طرح کے سوالات کرتی۔ خالی سے اسے پتہ چلا کہ رونیلڈ شمال مغرب سے ایک سال ہوئے آیا تھا اور وہاں سے دوائیں لایا تھا۔ مگر اب دشمن ان لوگوں پہ اعتماد نہ کرتا تھا اور یہ کہ ہندوستانی ڈاکٹر سخت بیمار تھا اور شاید مر بھی چکا ہو اور سب سے ضروری

بات یہ کہ انھوں ان دواؤں کو لے کر وقت پر ہسپتال پہنچ جانا تھا کیونکہ سن تان حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اور اس طرح ایرا نے رونیلڈ کے بارے میں سب کچھ جان لیا۔ خالی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا جو وہ جانتا تھا وہ بھی اور باقی اپنی طرف سے۔ ایک دن جب وہ ایک گاؤں میں تھے اسے موقع ملا کہ وہ اکیلے میں اس سے بات چیت کرسکے۔ اس نے اپنے اسی مذاق کے انداز میں اس سے کہنا شروع کیا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ ہمارے اس مالک کو سمجھنا آسان بات ہے۔ اس کا اپنا موڈ ہے جو اس پہ حاوی رہتا ہے۔ کبھی وہ اس طرح ہاتھ پر سر رکھ کر خلا میں گھورنے لگتا ہے جیسے زندگی اس کے لئے بہت ہی تلخ ہو میرے خیال میں اسے ایک بیوی کی ضرورت ہے جو اس کا خیال رکھے۔ مگر ہم کہاں سے اس کے لئے تلاش کریں۔

کہاں سے یقیناً ایرا نے اتنی معصومیت سے کہا کہ خالی کو ایک لمحہ کیلئے سخت تکلیف ہوئی وہ سوچنے لگا کہ کیا اس نے عورت کو سمجھنے میں غلطی کی ہے مگر جب اس نے اس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ حالانکہ اس نے اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

انگریز عام طور سے تیز مزاج کے ہوتے ہیں۔ خالی نے کہا۔ حالانکہ اس نے صرف رونیلڈ کو دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے زیادہ توقعات رکھتے ہیں وہ ہم چینیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونے کی بجائے چیزوں سے ناامید ہوتے ہیں اور پھر انھیں اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے مجھے یقین ہے کہ کوئی انگریز بھی میری ذات سے کوئی امید نہ رکھ سکے گا۔ ایرا نے کہا۔

خالی پھر سوچنے لگا۔ اس عورت کے بارے میں اپنے مالک کے بارے میں

اب انھیں چلتے چلتے چار دن ہو گئے تھے چوتھے دن جب وہ دشمن کی سرحد کے بالکل آخر میں پہنچ گئے تھے۔ گاؤں کا سردار جو ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا رونیلڈ کے پاس آیا اور اسے ایک طرف بلا کر کہنے لگا کہ اب ہم خطرہ میں ہیں۔ آج کی رات سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اب تک ہم کسی نہ کسی طرح سے بچتے رہے مگر اب ہمیں دشمن کے روبرو ان سے بات کرنی ہوگی اور وہ جگہ جگہ ہمیں روک کر ہماری تلاشیاں لیں گے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اور وہ عورت ایک لفظ بھی نہ بولنا ہم تمہارے لئے جگہ بنائے دیتے ہیں تم وہاں خاموشی سے لیٹ جانا۔ اس نے اپنی جیب سے دشمنوں کے کچھ کاغذات نکال کر اسے رکھنے کے لئے دئے۔ ہم اس کپڑے کو

بچنے کے لئے جا رہے ہیں اور یہ سب دشمن کا کیڑا ہے۔ اگر تمھاری آوازیں انھوں نے سن لیں تو ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ایک لفظ بھی نہ بولیں گے۔

انھوں نے ان بسلک کی گانٹھوں کو اس طرح لگایا کہ ان کے درمیان ایک خلا بن گیا۔ اور اس میں رونیلڈ اور ایرا داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ان گانٹھوں والوں نے اس خلا کو پھر چاروں طرف سے ڈھک دیا

ایرا سنکر پوچھنے لگی کہ اگر تمھیں کچھ کہنا ہو تو کہہ دو اس لئے کہ اب ہم کئی گھنٹے تک کوئی بات نہ کر سکیں گے۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ اسے بہت کچھ کہنا ہے مگر وقت آنے پر کہے گا۔

جب سفر ختم ہو جائے تب کہنا۔ ایرا نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ دو میل سے کم فاصلہ باقی تھا جب وہ دشمن کے سامنے ہوں گے۔

اس نے اپنے بازو پھیلائے اور ایرا کو ہاتھ پر اٹھا لیا۔ اس نے اس کے رخساروں کو آہستہ سے چھوا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ رونیلڈ کو وقت کا پتہ بھی نہ چلا گھنٹے منٹوں میں گذرتے معلوم ہوئے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ابھی چلا تھا۔ اس نے مختلف آوازیں سنیں جو ادھر ادھر شور مچا رہی تھیں۔ اس نے اسے اپنے اور قریب کر لیا وہ لوگ گانٹھوں کو ٹٹول رہے تھے ایک مرتبہ تو ایک سنگین رونیلڈ کے کندھے کو چھوتی ہوئی گذری وہ سانس روکے پڑے رہے۔

آوازیں برابر آتی رہیں۔ بہت دیر کے بعد گاڑی پھر چلنے لگی۔

وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح خاموش پڑے ہوئے گاڑی کے گھسٹنے کی آواز سنتے رہے۔ موت اور زندگی میں ایک قدم سے بھی کم کا فاصلہ تھا۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے حصے میں کونسا قدم آتا ہے۔ موت اور زندگی ان دو الفاظ نے اسے تیج کی یاد دلا دی۔ اسے بھی وہ اسی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے سامنے بھی موت اور زندگی میں فاصلہ نہ تھا ایک مرتبہ تیج نے اس سے کہا بھی تھا کہ موت اور زندگی ہم سے اتنی قریب ہیں کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کب کونسی راہ ہمیں مل جائے۔ یہ جسے ہم زندگی کہتے ہیں یہی ایک دن موت میں بدل جائے گی۔ کیونکہ حقیقی زندگی تو موت کے بعد ہی ملتی ہے۔

میں نہیں سمجھا۔ رونیلڈ نے اس سے کہا تھا۔ مگر تیج کہتا رہا تھا جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ موت کے منہ میں ہوتا ہے مگر وہ اس کے خلاف لڑتا ہے اور پیدا ہو جاتا ہے تو یہی موت زندگی میں بدل جاتی ہے

آخر کار گاڑی رک گئی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ وہ سننے لگے۔ یہ آوازیں خوش و خرم لوگوں کی تھیں۔ انھوں نے خالی کی آواز سنی جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

نکل آؤ۔ باہر نکل آؤ۔

لوگوں نے جلدی جلدی گانٹھیں ہٹائیں اور سورج کی کرنیں ان کے منہ پر پڑنے لگیں۔ انھوں نے سب سے پہلے خالی کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھا

نکل آؤ اور زمین پر آ جاؤ۔

اس سے پہلے کہ وہ اترا ایک تیز آواز اس کے پیچھے سے آئی۔ سفید آدمی جلدی کرو ہم نے بازی جیت لی ہے۔ یہ وہی کھڑا تھا۔ رونیلڈ نے دیکھا کہ اس کا بڑا ناٹرک وہیں کھڑا ہے۔ جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔

جلدی کرو جلدی کرو۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں گانٹھیں سب چڑھا دی گئیں۔

وہ کود پڑا اور اس نے اپنا ہاتھ ایرا کی طرف بڑھا دیا۔ آؤ ٹرک کے اندر آ جاؤ۔

اس نے اسے سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ اسکے بیٹھتے ہی ٹرک چل پڑا چھ گھنٹے کے مستقل سفر کے بعد وہ ہسپتال کے سامنے تھے۔ اس درمیان میں وہ ایک جگہ چائے پینے کو ضرور رکے تھے ورنہ چلتے ہی رہے اس کے دماغ میں ہزاروں سوال آ رہے تھے اس نے خالی سے کہا کہ وہ کبڑے سے پوچھے کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔

جنوب میں یہ اور تیز ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہسپتال کے متعلق معلوم کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مکسار ان کے آنے کے اگلے روز مر گیا تھا مگر اس کی بیوی ہسپتال چلا رہی ہے اور وہ اس کی منتظر ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ہسپتال کے سامنے وہ ٹرک سے کود پڑا۔ اس نے بڑھ کر ایرا کو اتارا اور وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صحن کی طرف بڑھا۔

آؤ لال بی سے ملو اس نے کہا۔

اس نے لال بی کو آپریشن روم میں پایا۔ وہ تیج کی جگہ کھڑی ہوئی تیج کا چوغہ پہنے ہوئے اس کا کام انجام دے رہی تھی وہ ایک سپاہی کے زخم

کو دھو رہی تھی جو سخت تکلیف میں میز پر پڑا ہوا تھا۔ دوسری نرس رونیلڈ اور ایراکو گھورنے لگی۔

لاں لی کی نظر صرف رونیلڈ پر پڑی۔ آخر کار تم آ گئے۔ کلوروفارم کہاں ہے۔ اس نے کہا۔

میں اسے لے آیا ہوں۔ ابھی لاتا ہوں۔ رونیلڈ نے جواب دیا۔ اس نے ایرا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تیزی سے بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ سب سے ہاتھ ملاتا ہوا بڑھتا رہا۔

ہلو شان کیا حال ہے۔ رونیلڈ نے کہا۔

ٹھیک ہوں کیا تم دوائیں لے آئے۔ شان نے پوچھا۔

ہاں لے آیا آؤ ذرا میری مدد کرو۔ وہ اس کی مدد کرنے لگا۔

رونیلڈ ڈاکٹر بغیر دوا کے مر گئے۔ اسنے بڑی غمزدہ آواز میں اسے خبر دی۔

ہاں میں جانتا ہوں اور وہ ایک گھنٹہ کھو دینے لگا جس میں کلوروفارم کی بوتلیں تھیں

جب وہ آپریشن روم میں واپس آیا تو شان ایک خط لئے اس کے پاس آیا یہ تمھارے لئے ایک پیغام ہے۔ تمھارے جانے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔

رونیلڈ کا دل دھڑکنے لگا خط ڈاکٹر ہیٹنگ کا تھا خط کی مہر تین ماہ پہلے کی تھی۔ وہ جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ شروع میں کسی اور خط کا حوالہ تھا جو اسے لکھا گیا تھا اور جس کا جواب اس نے نہیں دیا تھا۔ آگے ڈاکٹر نے لکھا تھا۔

"تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب گلیڈس کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اس نے اب ہنری گرین نامی شخص سے شادی کر لی ہے میں نے اس سے بات کی اور پھر اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ سچ بولے اور اس نے اقرار کیا کہ تم اس کے بچے کے باپ نہ تھے اس نے تم پر اس لئے الزام رکھا تھا کہ اس کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا کلرک کی بیوی کی حیثیت سے کوئی اسے اس حال میں زندہ نہ رہنے دیتا تم اسکے مسئلہ کا واحد حل تھے اسی لئے اس نے تمھیں بلیک میل کیا۔ وہ دونوں بہت خوش ہیں"

اس خبر نے رونیلڈ کو مطمئن کر دیا اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اوپر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔

وہ آگے پڑھنے لگا لکھا تھا۔ ڈاکٹروں کی یہاں سخت ضرورت ہے اگر تم چین چھوڑ کر یہاں آ جاؤ تو کیسا اچھا ہو مگر تم خود بہتر سمجھ سکتے ہو کہ تمھاری کہاں ضرورت ہے"

لاں لی جلدی کر رہی تھی اسنے خط جیب میں ڈال لیا اور اندر کی طرف دوڑا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم تھیں۔

میں گولی نہیں پا سکی اس نے کہا یہ جگر کے قریب ہے لیکن یہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے تو ابھی تم سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔

میں اسے کریوں گا۔ تم اسے کلوروفارم دو۔ اس نے کہا۔ وہ لاں لی کو ہدایتیں دیتا رہا۔ اسے کلوروفارم آہستہ آہستہ دو اسے تکلیف کا احساس کم ہونا چاہئیے کام کرنے کے بعد اس نے ہاتھ دھوئے اسے لاں لی کے ہاتھوں پر دستانے دیکھ کر دکھ ہوا اسے فوراً تیچ یاد آگئی جو ان ہاتھوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

ایرا الپنڈ آئی۔ اس نے یکایک سوال کیا۔

ہاں۔ وہ آہستہ سے بولی۔

ٹھیک ہے۔ ہم جلد سے جلد شادی کر لیں گے اُس نے مختصر سا جواب دیا وہ بغیر دیکھے ہوئے مسکرائی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمھارے لئے بہت اچھا ہوگا۔

ہسپتال بھرا ہوا ہے؟

بہت زیادہ

لن نان دشمن سے جھگڑا۔ اس نے پوچھا۔

ہاں کل اس نے انھیں روک دیا ہے۔

ٹھیک ہے۔ یہ چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر تیچ کا غم بہت بڑا ہے۔ رونیلڈ نے کہا زخمی کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ پٹی لینے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس وقت تک کام کرتی رہوں جب تک کہ تم نہ آ جاؤ اور پھر سب کچھ تمھارے سپرد کر دوں۔

کیا اُسے مجھ پر اعتبار تھا۔ اس نے پوچھا اور وہ اسفنج گننے لگا۔

ہاں اس نے کہا تھا کہ تم یہ کام بہت اچھی طرح کر سکتے ہو۔

ایرا اپنی باوقار چال کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس نے اسے محبت بھری نگاہ سے دیکھا

اچھا ہوا کہ میں تمھارے آنے سے پہلے ہی گولی پانے میں کامیاب ہو گیا تھی ورنہ دیکھ کر میرا ہاتھ اس تیزی سے شاید کام نہ کرتے اس نے ہنس کر اس سے کہا۔

تم نے گولی نکال لی۔ اس نے پوچھا۔ میں جانتی تھی کہ تم کر سکتے ہو اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

تم جانتی تھیں تو ٹھیک ہے۔ وہ پھر گننے میں مشغول ہو گیا۔

کافی کلوروفارم ہے۔ اسنے لاں لی سے کہا اور وہ اپنے چہرہ سے اپنی لٹ کو ہٹانے لگی اس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی حسین تھیں مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے کتنی مختلف تھیں۔

ایرا ذرا سوئی میں تاگا ڈال دو۔ اس نے حکم دیا۔ لاں لی تم اسے سکھا دو کہ کیسے کام ہوگا ؛

جان اسٹین بیک

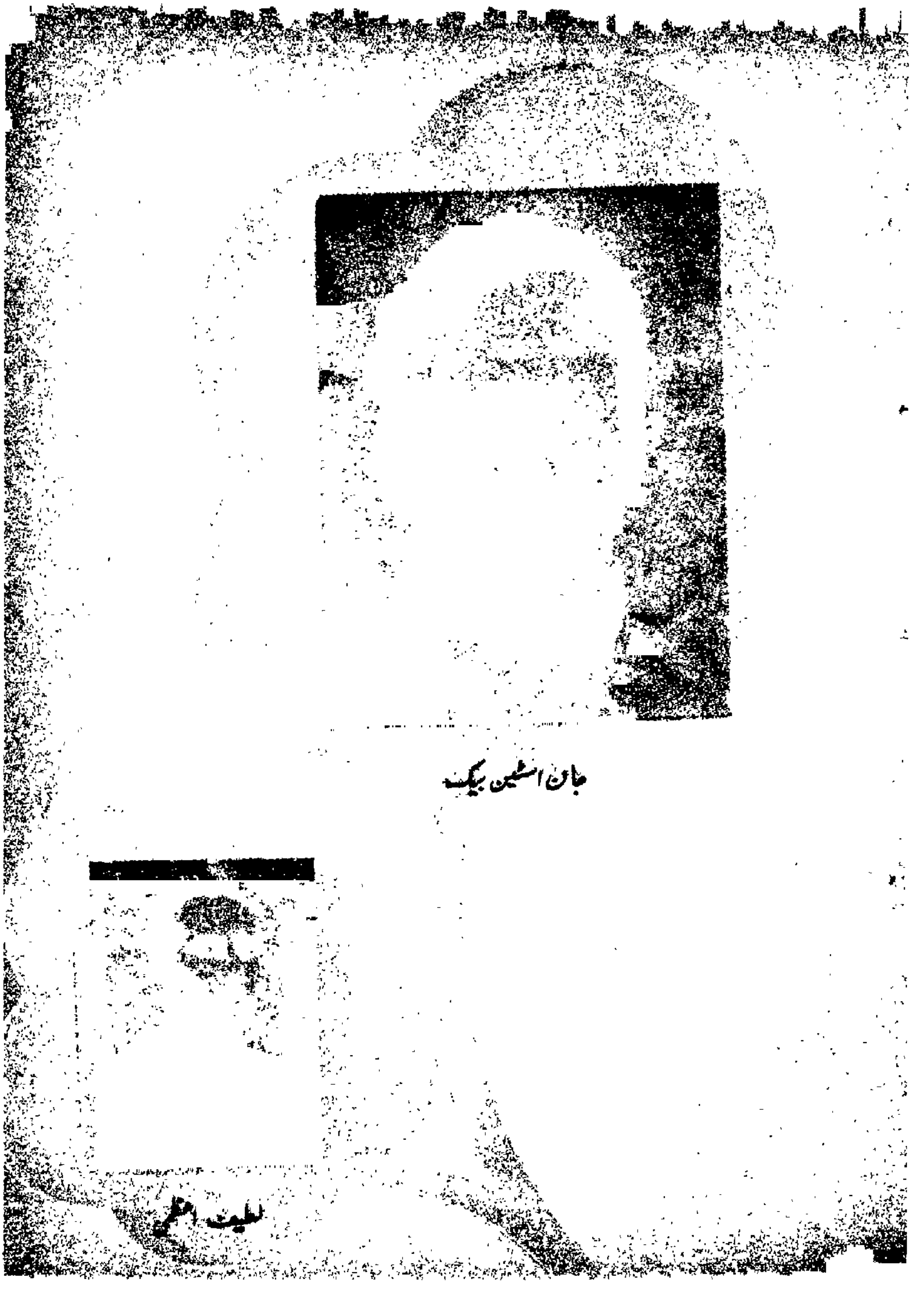
جان اسٹین بیک کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہے۔ اُس نے اپنے شباب کے ایام کیلیفورنیا میں گذارے۔ اُسے کیلیفورنیا کی فضا اتنی عزیز ہے کہ وہ دور دراز ملکوں میں برسوں رہ کر بھی کیلیفورنیا لوٹ آتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران وہ برطانیہ میں رہا۔ چند برس ہوئے اُس نے روس کا دورہ کیا۔ اس کا ذہنی جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے لئے نچلے طبقے کے کردار چُنتا ہے۔ سماج کی خرابیوں کو اجاگر کرنے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انسان کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے قلم سے بجلیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

جان اسٹین بیک ایک ہنگامہ پرور مزاج رکھتا ہے۔ اپنی اسی ہنگامہ پروری کی بدولت اُس نے اپنی زندگی کے لئے کئی راستے تراشے اور وہ کہیں بھی جم کر نہ بیٹھ سکا۔ اُس نے برق رفتاری سے ایک کام کے بعد دوسرا کام اپنایا۔ سب سے پہلے اس نے ایک گوالے کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر وہ ایک بڑھئی کا شاگرد رہا۔ اس کام سے وہ جلد اُکتا گیا۔ اور ایک مصوّر کا شاگرد بن گیا۔ اس کی چنچل طبیعت نے اسے بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ایک ادویات فروش کے یہاں ملازم ہو گیا پھر مزدوری کرنے لگا۔ طبیعت یہاں بھی گھبرا گئی اور اخبار بیچنے لگا۔ آخر کار اُسے ایک جاگیر کا نگران بنا دیا گیا۔ جہاں سال میں آٹھ مہینے برف پڑتی تھی یہیں اُس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

اس نے اب تک ایک درجن ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کے بیشتر ناول فلمائے جا چکے ہیں۔ اس کی طرزِ تحریر اتنی شگفتہ اور رنگین ہے کہ ایک معمولی واقعہ بھی قاری کو انتہائی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مکالمہ نویسی میں اس کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جان اسٹین بیک معمولی انسانوں کے معمولی جذبات کا عکاس ہے مگر وہ اپنے مشاہدے اور زندگی کے بھرپور تجربے سے اُن میں اتنی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

جان اسٹین بیک کا یہ ناولٹ اس کے تمام فنی محاسن کا حامل ہے۔ یہ ایک بستی کی کہانی نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری دنیا کی کہانی ہے۔ اس کے تمام کردار مثالی کردار ہیں۔ جو انسانی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔


جان اشتین بک

جان سٹین بیک
مترجم عبداللطیف اعظمی

یہ گلیاں یہ کوچے

لی چانگ کی پرچون کی دوکان اگرچہ بہت زیادہ صاف ستھری نہیں تھی، مگر سامان کے لحاظ سے عجیب وغریب تھی۔ دوکان بہت مختصر تھی، مگر اس کے باوجود ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز مل سکتی تھی، مثلاً مختلف قسم اور سائز کے لباس، کھانے کی تازہ اور ڈبے کی چیزیں، شراب، تمباکو، مچھلی کے شکار کا سامان، کل پرزے، جوتے، رسے، ٹوپیاں، غرض اس قصبے کی روزمرہ کی سبھی چیزیں مل جاتی تھیں۔

یہ دوکان صبح سویرے کھلتی اور رات گئے بند ہوتی۔ لی چانگ لالچی نہیں تھا، لیکن اگر کوئی روپیہ خرچ کرے تو وہ اسے منع بھی نہ کرتا۔ اسے اپنی برادری میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ کنری رو میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو لی چانگ کا مقروض نہ ہو۔ اس کا اصول تھا کہ جب کسی کا بقایا بہت بڑھ جاتا تو اس کے پیچھے دوڑنے کے بجائے، ادھار دینا بند کر دیتا۔ اس کے اسی معقول رویے کی بنا پر عام طور پر لوگ بقایا ادا کر دیتے یا کم سے کم ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

لی کا چہرہ آفتابی تھا اور خوش اخلاقی میں اپنی آپ مثال تھا، وہ انگریزی بہت اچھی بولتا تھا اور بولنے کا انداز اور لہجہ بہت ہی شاندار تھا۔ کیلیفورنیا میں جب زبان کے مسئلے پر جینگ چیڑی تولی کی گرفتاری پر انعام مقرر تھا۔ تو یہ چھپ کر سان فرانسسکو چلا گیا اور جب تک یہ ہنگامہ ختم نہ ہوا وہ ایک ہسپتال میں مقیم رہا۔ فرار کے وقت وہ اپنے روپے ساتھ لے جا سکا یا نہیں، اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ شاید وہ نہ لے جا سکا یا شاید اس کا کل سرمایہ ناقابل وصول بلوں کی صورت میں تھا بہرحال یہ واقعہ تھا کہ وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا اور اڑوس پڑوس کے لوگ اس کی بیحد عزت کرتے تھے۔ وہ اپنے گاہکوں پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ اس کا یہ اعتماد اسوقت تک قائم رہتا، جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ مزید اعتماد کرنا حماقت ہے۔ کبھی کبھی وہ کاروبار میں غلطیاں بھی کر گذرتا، مگر ایسی صورت میں بھی وہ فائدے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیتا، کچھ اور نہیں تو نیک خواہی کی شکل میں۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ فلوپ ہاؤس اور محل کا تھا۔ دوسرے لوگ چاہے اس کو خسارہ ہی خسارہ سمجھیں، مگر لی چانگ ایسا نہیں سمجھتا۔

لی چانگ اپنی دوکان میں سگار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے بائیں جانب کیش رجسٹر رکھا رہتا اور داہنے جانب قیمت کا حساب کرنے کے لیے، گنتی گننے کا فریم تھا۔ شیشے کے کیس میں سگار، سگریٹ اور مختلف قسم کی دوائیں تھیں اور اس کی پشت پر دیوار سے لگا ہوا ریک تھا۔ جس میں چند عمدہ قسم کی شرابیں تھیں۔ لی چانگ شراب کے گاہکوں کے معاملے میں ذرا بھی مداخلت نہ کرتا، سوائے اس کے کہ مداخلت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔ سگار کیس کا شیشہ لی چانگ کی ڈیسک کا کام دیتا۔ اس کے موٹے ہاتھ ہمیشہ اس پر پڑے رہتے اور انگلیاں ہمیشہ حرکت میں رہتیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی تھی، جس سے وہ شغل کے طور پر کھٹکھٹایا کرتا۔ نصف شیشے کی عینک استعمال کرتا اور چونکہ ہر چیز کو اس کے اندر سے دیکھنے کا عادی تھا، اس لئے جب کبھی دور کی چیز دیکھنی ہوتی تو گردن کو پیچھے جھکانا پڑتا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے، جو ہر وقت دوکان کا جائزہ لیتی رہتی تھیں، محبت اور دوستی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کے چمکیلے دانت ہر گاہک کو دیکھ کر نکل پڑتے۔

ایک شام کو وہ پیروں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لئے اخباروں کی گڈی پر پیر رکھ کر کھڑا تھا تو اسی حالت میں مذاق ہی مذاق میں ایک بہت بڑا سودا ہو گیا۔ لی چانگ کی دوکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک عمارت تھی، جو ایک طویل عرصے تک مچھلیوں کے چارے کے گودام کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ یہ ایک پریشان حال شخص ہوریس اپی ویلے کی ملکیت تھی۔ ہوریس کے دو بیویاں تھیں اور چھ بچے تھے۔ آمدنی ناکافی ہونے کی بنا پر اس پر قرض برابر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ مانیٹری میں سب سے زیادہ وہی مقروض تھا۔ اس شام کو لی چانگ کی دوکان پر ہی ہوریس آیا

تھا۔ اس کی حساس اور نازک طبیعت نے لی کے چہرے کی روشنی کو فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے کہا "نا لیا! میں آپ کا بہت مقروض ہو گیا ہوں" لی کے لئے یہ سوال خلاف توقع تھا۔ حسب عادت اسکے دانت نکل پڑے، مگر اس نے انتہا ئی صرف گردن ہلانے پر اکتفا کی اور اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔ ہوریس نے زبان سے اپنے لب تر کئے پھر کہا "میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پڑے۔ تم میرے مکان سے واقف ہو، جو مچھلیوں کے چارہ کا گودام ہے۔ اگر میں یہ مکان تم کو دیدوں تو کیا میرا حساب بے باق ہو جائے گا؟" لی چانگ ذرا پیچھے جھکا اور عینک کے نصف شیشوں میں سے ہوریس کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں اس کا ذہن بہی کھاتے کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا اور اس کا داہنا ہاتھ قیمت جوڑنے والے فریم پر حرکت کرنے لگا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے جواب دیا "ہاں حساب صاف ہو جائے گا" "اچھا حساب تیار کر لو میں اس مکان کا بیع نامہ لکھے دیتا ہوں" ہوریس نے بعجلت جواب دیا۔ "حساب کتاب کی ضرورت نہیں۔ میں بے باقی کا پرچہ لکھدیتا ہوں" اس طرح مختصر سے وقفے میں یہ سودا ہو گیا۔ لی چانگ فوراً شراب کے پیگ میں غرق ہو گیا۔ اور ہوریس سیدھا گھر واپس آیا اور آتے ہی خودکشی کر لی۔ لی چانگ کو اس پر افسوس ہوا، اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اس مصیبت زدہ خاندان کو کھانے پینے کے سامان کی ایک ٹوکری بھیجدی۔

لی چانگ اب ہوریس کے گھر کا مالک تھا۔ اس عمارت کی چھت اور فرش بہت عمدہ تھے۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور ایک دروازہ۔ اس نے سب سے پہلے اس کو گودام بنانے کو سوچا، مگر فوراً اس خیال کی تردید کر دی۔ کیونکہ دوکان سے یہ عمارت فاصلے پر تھی اور کوئی شخص بھی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی سونے کی انگوٹھی سے کھٹ کھٹاتا رہا اور ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں مشغول رہا۔ اسی حالت میں میک اندر داخل ہوا۔ میک عمر میں بڑا تھا، اس علاقے کا لیڈر تھا، تجربہ کار اور بھروسہ کا مشیر تھا اور ایک حد تک ایک چھوٹے سے گروہ کا سرغنہ تھا جس کے افراد مختلف خاندان کے تھے، جن کے پاس روپے نہ تھے اور جن کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت اور آسودہ خاطری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ایسے لوگ زیادہ تر عیش و عشرت کی خاطر اپنے کو تباہی کے گڑھے میں ڈالدیتے ہیں، مگر میک اور اس کے ساتھی ان سے مختلف تھے۔ وہ عیش کی سرحدیں اچانک اور بہت خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مقصد پورا کر لیتے۔ میک اور ہیزل نوجوان اور طاقتور تھے، ایڈی کا جو لا ایڈا میں ایک شراب خانے میں آب دار کا کام کرتا تھا ہوئی اور جونس جو وقتاً فوقتاً سائنس کے ایک تجربہ گاہ کے لئے مینڈک اور چوہے جمع کیا کرتے، یہ سب کے سب فی الحال لی چانگ کے قریب ہی زنگ آلود بڑے بڑے پائپ میں رہتے تھے۔ جب موسم خراب ہوتا تو ان پائپ میں رہتے اور جب موسم اچھا ہوتا، تو سرو کے ان درختوں کے نیچے رہتے جو نسبتاً اونچائی پر تھے اور جن کی شاخیں کچھ اس طرح جھک کر آپس میں مل گئی تھیں کہ ان سے ایک منڈپ کی سی شکل بن گئی تھی۔ جہاں سے ایک شخص بہت آسانی سے کینری رو کے مد و جزر اور اس کی سرگرمیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

لی چانگ کے چہرے پر، میک کی آمد سے ذرا سختی پیدا ہوئی اور بے اطمینانی کے لئے اس نے رکھتی (ایڈی)، ہیزل، ہیوز اور جونس تو نہیں ہیں، اس نے اسٹور پر ایک نظر ڈالی۔ میک نے آنے کے ساتھ ہی اپنا مدعا بیان کیا۔ "لی! میں نے اور ایڈی اور دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہوا ہے کہ ابی بولی کا مکان تم نے خرید لیا ہے؟" لی چانگ نے اثبات میں سر ہلایا اور مزید استفسار کا منتظر رہا "میں اور میرے دوست چاہتے ہیں کہ تم ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیدو، ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں" اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی "ہم کسی کو اندر گھسنے نہ دیں گے، نہ کسی چیز کا نقصان ہونے دیں گے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ لونڈے کتنے شریر ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ کھڑکیاں توڑ دیں" میک نے مشورہ دیا "اگر کوئی شخص اس پر نگاہ نہ رکھے گا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی آگ لگا دے"

لی کی آنکھیں میک کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ اور اس کے خیالات گہرے ہوتے گئے، اس کی انگلیوں کی کھٹ کھٹاہٹ کمزور پڑتی گئی۔ میک کی آنکھوں میں خلوص، محبت اور انسانی دوستی جھلک رہی تھی، مگر لی چانگ شک اور شبہے کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھا اور اس کی یہ خیالی دنیا آہستہ آہستہ حقیقت بنتی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے میک کی درخواست کو ٹھکرا دیا ہے اور کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو گئے ہیں۔ میک نے مکان کی حفاظت کی دوبارہ پیشکش کی ہے اور اس مرتبہ بھی انکار کر دینے پر لی نے مکان سے دھواں نکلتے دیکھا، جسے میک اور اس کے ساتھیوں نے بجھایا۔ لی کی انگلیاں رک گئیں اور اس نے اپنے کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ بالآخر لی نے جواب دیا "تم چاہو تو مکان کو کرایہ پر لے سکتے ہو" میک کی خوشی سے باچھیں

کھل گئیں۔ اس نے پوچھا "کتنے میں؟" "پانچ ڈالر فی ہفتہ" لی نے جواب دیا۔ "بہت اچھا، میں ساتھیوں سے مشورہ کروں گا" اس نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا "کیا چار ڈالر فی ہفتہ نہیں ہوسکتا ہے؟" "پانچ ڈالر" لی نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا "بہت اچھا دیکھو میرے ساتھی کیا کہتے ہیں" ہیک کا جواب تھا۔

اس کے بعد معاملہ طے پا گیا۔ ہر دو پارٹیاں اس پر خوش تھیں — دوسروں کی نگاہ میں چاہے اس سودے میں لی چانگ کا نقصان ہی نقصان تھا، مگر خود اس کا خیال اس سے مختلف تھا۔ کیونکہ کھڑکیاں محفوظ تھیں اور آگ کے شعلے کبھی نہیں بھڑکتے۔ اگرچہ مکان کا کرایہ کبھی وصول نہیں ہوا، مگر کرایہ داروں کو جب بھی پیسے ملتے — اور اکثر ملا کرتے — تو وہ صرف لی چانگ کی دوکان ہی پر خرچ ہوتے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ لی چانگ کو مختصر مگر سرگرم گروہ مل گیا تھا جو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اگر کوئی شرابی کبھی دوکان میں دنگا فساد کر بیٹھتا یا نیو مانیٹری کے سپاہی نرغہ کر بیٹھتے تو لی چانگ کی صرف ایک آواز پر اس کے کرایہ دار اس کی مدد کو آ پہنچتے۔ علاوہ ازیں لی چانگ کی اب ہر چیز محفوظ تھی۔ اس کی وجہ سے اس کو جتنا فائدہ پہنچتا تھا، وہ مکان کے کرایہ سے کہیں زیادہ تھا۔

بہرحال ہیک اور اس کے ساتھی اس مکان میں منتقل ہو گئے اور مچھلیوں کا چارہ وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سے اس مکان کا نام "فلاپ ہاؤس گرل محل" مشہور ہو گیا۔ اس کے رہنے والوں کی پچھلی زندگی ہر قسم کے فرنیچر سے بے نیاز تھی۔ مگر موجودہ حالات میں فرنیچر کا اضافہ، جدید تہذیب و تمدن کی نشانی ہے، ناگزیر تھا۔ چنانچہ میز، کرسی اور چارپائی سے ان خانہ بدوشوں کی زندگی روشناس ہوئی اور فلاپ ہاؤس گرل محل میں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ اس کے مکین دروازے کے سامنے بیٹھ کر زندگی کا نظارہ کرتے، رات میں سائنس کے تجربہ گاہ کے گانوں سے محظوظ ہوتے اور جب ڈاک۔ لی چانگ کی دوکان پر شراب پینے جاتا تو ان کی آنکھیں اس کا تعاقب کئے بنا نہ رہتیں۔ ایسے موقع پر ہیک کہا کرتا "ڈاک۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔"

لی چانگ کی دوکان کھلے میدان کے دائیں جانب تھی (نہ جانے اس کو کھلا میدان کیوں کہتے تھے۔ حالانکہ اس میں براق بھٹیوں، زنگ آلود پائپ، بیکار شہتیر اور ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے) اس خالی میدان کی پشت پر ریلوے لائن اور فلاپ ہاؤس گرل محل تھا اور میدان کے بائیں کنارے پر ڈورا فلگڈ کا شاندار قحبہ خانہ تھا، جو صفائی ستھرائی اور ایمانداری کے لحاظ سے اچھی شہرت کا حامل تھا۔ جو بھی وہاں جاتا سکون اور اطمینان قلب محسوس کرتا۔ کوئی سستے قسم کا قحبہ خانہ نہیں تھا، جہاں چند منچلے وقتی تفریح کے لئے آجاتے تھے۔ اس کا معیار بڑا اونچا تھا اور اس کے رہنے والے اچھے کردار کے حامل تھے اور ڈورا جیسی شخصیت اس کی انتظام و انصرام کی ذمہ دار تھی، جس نے سالہا سال کی محنت، مصلحت بینی، حقیقت پسندی اور ایمانداری سے ایک خاص شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی، جس کی ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ بڑی قدر کرتا تھا، مگر اسی کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جو انہیں خوبیوں کی بنا پر اس سے نفرت کرتا تھا۔

ڈورا بڑی عظیم اور شاندار عورت تھی، اس کے بال شوخ سنہرے رنگ کے تھے اور اسے شام کا لباس گہرے ہرے رنگ کا بہت مرغوب تھا۔ اس کے یہاں مول بھاؤ نہیں ہوتا تھا، اس کے یہاں ٹھہرا پینے والوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، شور اور بیہودہ گوئی کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی لڑکیوں میں بعض کافی بوڑھی ہو چکی تھیں، مگر ڈورا کی شرافت نے ان کو الگ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ خود کہا کرتی تھی کہ ان میں سے بعض لڑکیاں ایسی ہیں کہ مہینے میں تین گاہک بھی حاصل نہیں کرسکتیں، مگر وہ روزانہ پابندی سے تین مرتبہ کھاتی ہیں۔ ڈورا نے ہی اس جگہ کا نام بیر فلیگ ریسٹورانٹ رکھا تھا۔ اس میں بارہ لڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک یونانی باورچی اور ایک چوکیدار بھی تھا، جو چوکیداری کے علاوہ بعض بڑے نازک اور خطرناک امور بھی انجام دیا کرتا۔ اگر کوئی لڑائی کر بیٹھے تو اس کی گوشمالی کرنا، مست شرابیوں کو باہر نکالنا، ہسٹریا کے مریضوں کو ہوش میں لانا، دردِ سر کا علاج کرنا اور شراب خانے کی نگرانی کرنا، یہ تمام ذمہ داریاں اسی کو انجام دینی پڑتیں۔ اس سے پہلے جو شخص اس جگہ کام کرتا تھا، وہ ذرا غیر متوازن قسم کا تھا اور اس کا خاتمہ ایسے حالات میں ہوا تھا کہ ڈورا کی شخصیت داغدار ہو سکتی تھی، مگر الفریڈ نے آتے ہی صورت حالات پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ کس قسم کے لوگوں کو وہاں آنا چاہئے اور کس قسم کے لوگوں کو نہیں۔ نیز وہ مانیٹری کے باشندوں کی

گھریلو زندگی سے پوری طرح واقف تھا۔

ڈورا کا پیشہ ایسا نازک تھا کہ اسے بڑی احتیاط کرنی پڑتی۔ خلافِ قانون ہونے کی بنا پر دوسروں کے مقابلے میں، اس کی ذمہ داریاں دہری تھیں۔ کوئی شرابی بدمست ہو کر ہنگامہ نہ کرے، دنگا فساد نہ ہو، بدتمیزی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اسے خرچ بھی کافی کرنا پڑتا۔ ہر شخص کی نگاہ اس پر رہتی۔ اگر پولیس کو اپنی پنشن کے فنڈ کے لئے رقص و سرور کی محفل سجانی ہوتی تو اس کے لئے دوسرے ایک ڈالر چندہ دیتے تو ڈورا کو پچاس ڈالر دینے پڑتے۔ چیمبر آف کامرس کو اپنے لان کو بہتر بنانے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی تو عام تاجر اگر پانچ ڈالر دیتے تو ڈورا سے سو ڈالر طلب کیا جاتا اور اسے دینا پڑتا۔ غرض کہ ریڈ کراس، کمیونیٹی کے مشترک فنڈ، بوائے اسکاؤٹس وغیرہ کے لئے جس قدر عطیے حاصل کئے جاتے ان میں ڈورا کی گناہ کی کمائی کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی۔ لیکن سب سے زیادہ ڈورا کو اُس وقت خرچ کرنا پڑا! جب کنسری رو میں کاروبار مندا پڑ گیا تھا اور ہر طرف بیکاری اور غربت پھیلی ہوئی تھی۔ اُسوقت معمول کے چندوں کے ساتھ ساتھ ڈورا نے بھوکے بچوں، بے کار والدین اور پریشان حال عورتوں کی کافی خبر گیری کی اور ان کے کھانے پینے کے بلوں کی کوئی دو سال تک ادائیگی کرتی رہی۔ ڈورا کی لڑکیاں بڑی تربیت یافتہ اور خوش اخلاق تھیں۔ وہ راستہ میں کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتیں، چاہے وہی کیوں نہ ہو جس کے ساتھ گذشتہ رات بسر کی گئی ہو۔

موجودہ چوکیدار الفریڈ کے آنے سے قبل بیر فلیگ ریسٹوران میں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ سابق چوکیدار ولیم تنہائی پسند تھا، دن کے وقت جبکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہوتی تھیں، عورتوں کی صحبت سے الگ تھلگ رہتا۔ کھڑکیوں سے ہیک اور اس کے ساتھیوں کو خالی میدان میں نلوں پر بے فکری کے ساتھ گپ کرتے اور شراب پیتے دیکھتا تو ان کی زندگی پر رشک کرتا۔ بالآخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا اور وہ ان کی مجلس میں شریک ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ہر ایک اس طرح خاموش ہو گیا، جس سے اس کے دلی اضطراب اور غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ ولیم مایوس ہو کر بیر فلیگ واپس آ گیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ گفتگو پھر جاری ہو گئی ہے تو اس کا غم دوچند ہو گیا۔ دوسرے روز ولیم پھر گیا اور اس مرتبہ اس نے وہاں بیٹھ کر شراب بھی پی۔ مگر اس مرتبہ ہیک اور اس کے ساتھیوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور حسبِ معمول شراب پیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ولیم تھوڑی دیر میں واپس آ گیا۔ بیر فلیگ پہنچا تو اس کو ہیک کی اونچی آواز سنائی دی: "خدا اس کو جہنم رسید کرے، مجھے اس دلال سے سخت نفرت ہے۔" گو یہ الزام صحیح نہیں تھا، مگر ولیم کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اُسی وقت ہیٹ پہنی اور سمندر کی طرف چل دیا اور اس خاموش اور پرسکون فضا میں اپنے بارے میں سوچنے لگا، ساحل کا دلکش نظارہ بھی اسے بُرے اور خطرناک خیالات سے، جو اسوقت اس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے، روک نہ سکا۔ اُسے دکھ تھا کہ دنیا میں کوئی نہیں جو اس سے محبت کرے، کسی کو اس کی پروا نہیں، اگرچہ وہ چوکیدار ہے، مگر دنیا اسے دلال سمجھتی ہے ـــــ گندا دلال، دنیا کا ذلیل ترین انسان۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیا اسے شرافت کی اور خوشی کی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں ہے۔ ضرور ہے۔ وہ انتہائی غصے کی حالت میں واپس آیا، مگر بیر فلیگ پہنچتے ہی اس کا غصہ جاتا رہا۔ اس وقت "موسم خزاں کا ماہِ کامل" (ہارویسٹ مون) کی دُھن فضا میں مرتعش تھی۔ اُسے یاد آیا کہ اس کی پہلی محبوبہ کو یہ دُھن کس قدر پسند تھی۔ اس گانے سے اس کا غم دوچند ہو گیا۔ اس وقت ڈورا اپنی خلوت کی نشست گاہ میں چائے پی رہی تھی۔ اس نے ولیم کا چہرہ دیکھ کر تعجب سے پوچھا: "معاملہ کیا ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟" "نہیں" ولیم نے جواب دیا: "تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سر ٹکرا کر جان دیدوں۔" ڈورا کو اپنی زندگی میں اس قسم کے اعصابی مریضوں سے کافی سابقہ پڑا تھا۔ وہ ایسوں سے ہمیشہ بچوں کا سا سلوک کرتی اور ان کی باتوں پر کبھی سنجیدگی سے دھیان نہ دیتی۔ "ضرور جان دیدو، مگر خدا کے لئے میرا فرش خراب نہ کرنا،" ڈورا نے جواب دیا۔

ولیم کے دل پر گہرے بادل چھا گئے۔ وہاں سے خاموشی کے ساتھ نکلا اور ایوا فلیٹگن کے دروازے پر دستک دی۔ ایوا کے بال سُرخ تھے اور وہ ہر ہفتہ اعترافِ گناہ کے لئے چرچ جایا کرتی۔ بڑی مذہبی تھی، مگر شراب کی بڑی دلدادہ تھی اور غیر معمولی بناؤ سنگار سے اپنے حسنِ رفتہ کی تلافی کی کوشش کیا کرتی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بھدی ہو گئی تھی اور ولیم کو معلوم تھا کہ ڈورا بھدی اور بے ڈول جسم کی عورت کو اپنے یہاں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اس وقت ایوا غصہ میں بھری بیٹھی تھی۔ ولیم کو دیکھ کر تیز لہجے میں بولی: "تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟" ولیم کو بھی غصہ آ گیا۔

"میں اپنا سر پھوڑنے جا رہا ہوں" اس نے جوش میں جواب دیا۔ ایوا اُبل پڑی "یہ بڑا گھناؤنا اور نامعقول خیال ہے" وہ چلائی "میں خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ نہ جانے تم کہاں سے مصیبت بن کر ٹپک پڑے" ولیم دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ مگر وہ بدستور چیخ رہی تھی۔ ولیم عورتوں سے کافی بیزار تھا۔ اس لئے سیدھا باورچی خانہ کا رخ کیا۔ ایسی حالت میں یونانی کے پاس ہی کچھ سکون ملتا تھا۔

یونانی اسوقت آستینیں چڑھائے دو بڑی پتیلیوں میں گوشت کے پارچے تل رہا تھا اور برف کاٹنے کی چھری سے انہیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ "کہو دوست، کیا حال ہے" ولیم کو دیکھ کر سوال کیا "مجھے کچھ نہیں معلوم" ولیم نے بیزاری سے جواب دیا "کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنا گلا گھونٹ لوں" یونانی نے چھری چولھے پر رکھی اور آستینیں اور اوپر چڑھا لیں "آخر تم کہہ کیا رہے ہو" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ ولیم نے ہاتھ بڑھا کر چھری اٹھالی۔ اور یونانی کی سیاہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ یونانی کی آنکھوں سے پریشانی ظاہر تھی۔ ولیم اس کی دلی کیفیت کو تاڑ گیا اور قبل اس کے کہ یونانی اس کے ہاتھ سے چھری چھینے، ولیم کے سینے میں پیوست ہو چکی تھی۔ الفریڈ نے ولیم کی جگہ لی۔ ہر شخص اس کو پسند کرتا تھا اور یہ ہیک کے ساتھ اکثر پائپ پر بھی بیٹھا کرتا اور کبھی کبھار فلاپ ہاؤس گرل محل میں بھی جایا کرتا ہے۔

ڈاکٹر گریٹ ٹائنڈ پول سے، جو جزیرہ نما کے سرے پر واقع تھا سمندری جانور پکڑا کرتا تھا۔ جگہ اس قدر عجیب وغریب تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ جب جوار بھاٹا آتا تو گودی میں موجیں اس قدر متغنا شروع کرتیں کہ ہر طرف کریمی رنگ کی جھاگ ہی جھاگ ہوتی۔ اور یہ بیقرار موجیں پیراک سیپیوں سے ٹکراتیں تو ہر طرف سیٹی ہی سیٹی بجتی۔ لیکن جب سمندر اتر جاتا تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور منظر انتہائی خوبصورت ہو جاتا، سمندر کا پانی اس قدر صاف شفاف ہو جاتا کہ تہہ کی تمام چیزیں دکھلائی دیتیں۔ مچھلیاں چلتی پھرتی اور لڑتی بھڑتی نظر آتیں۔ قسم قسم کے دوسرے جانور چہلیں کرتے اور کلیلیں کرتے دکھائی دیتے۔ غرض یہ منظر عجیب وغریب ہوتا۔

پول پر ڈاکٹر اور ہیزل دونوں ساتھ مل کر شکار کھیلتے۔ ہیزل فلاپ ہاؤس محل میں ہیک اور اسکے ساتھیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کا یہ نام محض اتفاق سے رکھا گیا تھا۔ اس کی پریشان حال ماں کے آٹھ سال میں سات بچے ہوئے، ہیزل آٹھواں تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو اس کی جنس مشتبہ تھی۔ اس کی ماں سات بچوں اور ان کے باپ کو کھلانے پلانے اور ان کے کپڑے لتے کے انتظام میں کافی پریشان اور مضمحل رہا کرتی۔ اسے روپے کمانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے۔ اس کا شوہر گھر میں بیٹھا صرف مشورے دیا کرتا، بحثیں کرتا اور تنقیدیں کیا کرتا۔ ہیزل کی ماں کے ایک چچی تھی، جس کا نام ہیزل تھا اور لائف انشورنس کا کام کرتی تھی۔ آٹھویں بچے کا نام اسی کے نام پر اسوقت ہیزل رکھا گیا تھا، جب یہ طے نہیں تھا کہ یہ لڑکا ہے، بعد میں اس کی ماں نے نام بدلنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ہیزل بڑا ہوا تو چار سال گرامر اسکول میں گذارے اور چار سال ریفارم اسکول میں۔ مگر ان میں سے کسی میں بھی کچھ حاصل نہ کر سکا۔ ریفارم اسکول میں، نام کے برعکس بد خصالی اور معصیت سکھلائی جاتی ہے، مگر ہیزل نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ چنانچہ جب ریفارم اسکول سے نکلا تو اتنا ہی معصوم تھا جتنا ضرب تقسیم کے علم سے محروم۔ ہیزل کو گفتگو سننے کا بہت شوق تھا، مگر الفاظ پر کبھی غور نہ کرتا، وہ طرح طرح کے سوالات کیا کرتا، مگر جواب معلوم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف گفتگو کی خاطر۔ اس کی عمر ۲۶ سال تھی، بال سیاہ تھے، خوش رو، توانا، رضامند اور وفادار تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ڈاکٹر کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتا، مگر ڈاکٹر کو کسی موقع پر بھی اس سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔ اور سخت سے سخت پھسلن پر بھی اس کے قدم مضبوطی سے جم جاتے اور ان میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوتی۔ وہ شکار کا انتہائی عاشق تھا۔ ڈاکٹر شکار کے وقت برساتی ٹوپی اور گم بوٹ استعمال کیا کرتا، مگر ہیزل کیلئے ٹینس شو اور معمولی کپڑا ہی کافی تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر کو تارا مچھلی کے لئے تین سو کا آرڈر ملا تھا اور دونوں تارا مچھلی پکڑنے میں مشغول تھے۔

ہیزل نے ایک عمدہ قسم کی ارغوانی مائل کی تارا مچھلی پکڑی۔ اس کو اپنے بورے میں جو قریب قریب بھر چکا تھا، جلدی سے ڈالتے ہوئے سوال کیا "میں حیران ہوں کہ آخر اس کو کرتے کیا ہیں؟"

"تم کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"تارا مچھلی" ہیزل نے جواب دیا "تم ان کو بیچ دیتے ہو۔ تم ان کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بھیجتے ہو۔ آخر لوگ ان کو کرتے کیا ہیں۔ تم کھاتے تو ہو نہیں؟"

"وہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں" ڈاکٹر نے انتہائی تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ اس کو یہ بھی یاد آ گیا کہ اس سے قبل وہ ہیزل کو اسی سوال کا جواب متعدد مرتبہ دے چکا ہے۔ مگر ڈاکٹر میں ایک خوبی تھی کہ اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ جب کوئی شخص کوئی بات پوچھتا ہے تو وہ اس کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، خود ڈاکٹر کا اصول یہی تھا کہ وہ اسی وقت کوئی سوال کرتا تھا، جب اس کو سچ مچ کوئی بات معلوم کرنی ہوتی تھی۔ لیکن ہیزل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ محض گفتگو کی خاطر سوال کرتا اور ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ اس کا جواب دوسرے سوال کی بنیاد بن جاتا، تاکہ گفتگو کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

"مشاہدہ کرنے سے ان کو ملتا ہی کیا ہے؟" ہیزل نے گفتگو جاری رکھی "یہ تو محض تارا مچھلی ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ میں تم کو لاکھوں کی تعداد میں پکڑ کر دے سکتا ہوں۔"

"ان میں بہت سی چیزیں سمجھنے کی ہیں اور دلچسپ بھی ہیں" ڈاکٹر نے مدافعانہ انداز میں جواب دیا "اس کے علاوہ ان کو مڈل ایسٹ اور نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی بھیجا جاتا ہے۔"

ہیزل نے اپنے معمول کا طریقہ اختیار کیا "کیا وہاں تارا مچھلی نہیں ہوتی؟"

"وہاں کوئی سمندر نہیں ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"اوہ!" ہیزل نے کہا۔ حسب عادت وہ چاہتا نہیں تھا کہ اس طرح گفتگو ختم ہو جائے۔ وہ کوئی سوال کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر ایک سوال کر بیٹھا۔ ہیزل کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کیونکہ اس کو جواب دینے کے لئے اپنے دماغ کو کام میں لانا پڑتا اور یہ چیز اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ ہیزل کا دماغ ایک اجاڑ میوزیم کی طرح تھا، اس میں بہت سی چیزیں تھیں۔ مگر تمام چیزیں غیر مرتب حالت میں تھیں۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اسے کوئی بات بھولتی نہیں مگر وہ کبھی انہیں ترتیب دینے کی زحمت نہ اٹھاتا۔ اس کے ذہن میں تمام باتیں اور معلومات اس طرح گڈمڈ اور رلی ملی تھیں جس طرح کسی کشتی کی تہہ میں طرح طرح کی مچھلیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دی جائیں۔

ڈاکٹر نے سوال کیا "محل کا کیا حال ہے؟"

ہیزل نے اپنے سیاہ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا!"

کچھ وقفہ کے بعد اس نے مزید کہا "گے بھی اب ہمارے ساتھ رہتا ہے، میرے خیال میں اس کی بیوی نے اس کو بہت بُری طرح مارا ہے — اگر جاگتے میں اسے مارا جائے تو اسے کوئی غم نہیں ہوتا مگر اس کی بیوی تو بہ فرض منصبی اسوقت ادا کرتی ہے، جب وہ سو جاتا ہے۔ گے کو اس کی یہی ادا پسند نہیں ہے۔ یہ لڑائی اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے، اس لئے بیچارہ ہمارے یہاں چلا آیا ہے۔"

"نئی بات نہیں ہے" ڈاکٹر نے کہا "اس کی بیوی دارنٹ اور جیل کی دھمکی دیا کرتی ہے۔"

"نہیں" ہیزل نے کہا "یہ اسوقت کی بات ہے جب نئی جیل کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ گے کو بیس روز پرانے جیل خانہ میں رہا اور اس سے نکلنے کے لئے انتہائی بے چین تھا، مگر نئے جیل میں ریڈیو ہے، آرام دہ چارپائی ہے۔ اور افسر اعلیٰ بہت شریف اور نیک ہے، اسلئے ہیزل کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس لئے اب اس کی بیوی جیل بھیجنے کی دھمکی نہیں دیا کرتی اور نہ اس کو سوتے میں مارتی ہے۔ مگر تم کو معلوم ہے کہ گے کو یہ مار پیٹ بالکل پسند نہیں ہے اور وہ اس سے تنگ آ چکا ہے، اسلئے ہمارے یہاں چلا آیا اور میرا قیاس ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔"

ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ گریٹ ٹائڈ پول پیر پر موجیں بڑھنا شروع ہو گئی تھیں اور پیراک پتھروں سے لہروں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ غرض جوار بھاٹا آنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے برساتی ٹوپی ذرا پیچھے کر لی "تارا مچھلیاں کافی ہو گئی ہیں" ڈاکٹر نے کہا "ہاں، سنو ہیزل! تمہاری بوری کی تہہ میں چھ سات چھوٹے سائز کے سیپ ہیں۔ اگر اتفاق سے ہم پکڑے جائیں اور انسپکٹر ہم سے پوچھے تو تم کہنا کہ انہیں تم نے اپنے پرمٹ پر پکڑا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بہت اچھا" ہیزل نے کہا۔

"دیکھو!" ڈاکٹر نے نرم لہجہ میں کہا "فرض کرو مجھے سیپ کا آرڈر ملتا ہے، تو انسپکٹر سمجھے گا کہ میں اپنا پرمٹ اکثر استعمال کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ وہ سوچے کہ میں اس کو کھاتا ہوں"

"ٹھیک" ہیزل نے کہا۔

"یہی حال انڈسٹریل الکوحل بورڈ کا ہے۔ یہ ہر شخص پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ میں الکوحل پیتا ہوں۔ وہ ہر شخص کے بارے

میں بھی کا سوچتے ہیں ۔"

"تو کیا تم نہیں پیتے ؟"

"زیادہ نہیں ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔ "اس میں جو چیز ملائی جاتی ہے، وہ بڑی بدمزہ ہے ۔ اور اس کو دوبارہ صاف کرنا بڑا صبر آزما کام ہے ۔"

"کچھ ایسا بدمزہ تو نہیں ہے ۔" ہیزل نے جواب دیا ۔ "ابھی حال ہی میں نے اور میک نے پی ہے ۔ اس میں ملاتے کیا ہیں ؟"

ڈاکٹر جواب دینے والا ہی تھا کہ اس کو خیال آ گیا کہ ہیزل اپنی عادت کے مطابق بلا وجہ سوالات کر رہا ہے ۔ "چلو چلیں ۔" اس نے کہا ۔ اس نے تارا مچھلی کی بوری اٹھا کر کاندھے پر رکھی اور یہ بھول گیا کہ ہیزل کی بوری میں سب سے نیچے غیر قانونی مگیپ ہیں ۔ ہیزل اس کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلتا رہا، مگر تاپہ کے ۔

"وہ پینٹر محل میں واپس آ گیا ہے ۔" اس نے کہا ۔

"ہاں تو ؟" ڈاکٹر نے سوال کیا ۔

"تم جانتے ہو کہ اس نے تمام تصویریں پھر سے بنائی ہیں ۔ اب کہتا ہے کہ انہیں جوز کے چھلکے سے دوبارہ بنائے گا ۔"

ڈاکٹر نے تمسخر کے ساتھ پوچھا "کیا وہ اب بھی کشتی بنا رہا ہے ؟"

"یقیناً ۔" ہیزل نے جواب دیا ۔ "اس نے یکسر بدل دیا ہے — بالکل نئے قسم کی کشتی ہے ۔ میرے خیال میں ایک ایک حصہ لیتا جائے گا اور جوڑتا جائے گا ۔ کیوں ڈاکٹر ؟ کیا وہ نمائشی آدمی ہے ؟"

ڈاکٹر نے اپنی بھاری بوری اتار کر زمین پر رکھ دی ۔ "نمائشی ؟" اس نے سوال کیا ۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے، مگر اسی قدر نمائشی ہے، جس قدر ہم سب ہیں، بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا مختلف طریقے سے اس کا اظہار کرتا ہے ۔"

ہیزل کے لئے یہ جواب خلاف توقع تھا ۔ اسے غصہ آ گیا ۔ "لیکن کشتی ..." اس کی آواز ذرا سخت اور بلند تھی ۔ "سات سال سے کشتی بنا رہا ہے، جب وہ ختم کے قریب ہوتی ہے تو بدل دیتا ہے اور از سرِ نو شروع کرتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف نمود و نمائش کے جذبے کے تحت ایسا کرتا ہے ۔ سات سال ایک کشتی پر !!"

ڈاکٹر زمین پر بیٹھا گم بوٹ نکال رہا تھا ۔ "تم سمجھے نہیں ۔" اس نے بڑی نرمی سے کہا ۔ "ہنری کشتیاں پسند کرتا ہے مگر سمندر سے ڈرتا ہے ۔"

"پھر وہ کشتی کیا کرے گا ؟" ہیزل نے توضیح چاہی ۔

"اسے کشتیاں پسند ہیں ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔ "لیکن فرض کرو اگر وہ اپنی کشتی مکمل کر لے تو لوگ اس سے کہیں گے کہ اس کو پانی میں کیوں نہیں ڈالتے ۔ اگر وہ پانی میں ڈالتا ہے تو اس کو پانی میں جانا بھی پڑے گا اور اسے پانی سے نفرت ہے ۔ اس لئے وہ کبھی اپنی کشتی مکمل نہیں کرتا ۔ تاکہ نہ مکمل ہو اور نہ پانی میں ڈالنے کا امکان پیدا ہو ۔"

تھوڑی دیر تک ہیزل نے بحث کی، مگر جلد ہی اس نے بند کر دی اور گفتگو کے لئے کوئی دوسرا موضوع تلاش کرنے لگا ۔ "میرا تو خیال یہی ہے کہ وہ نمائشی آدمی ہے ۔" اس نے ڈاکٹر کی دلیل سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔

زمین پر سینکڑوں کی تعداد میں بدبودار کیڑے رینگ رہے تھے اور ان میں سے زیادہ تر اپنی دم اوپر اٹھائے ہوئے تھے ۔ "ذرا ان بدبودار کیڑوں کو دیکھنا ۔" ہیزل کو ان کیڑوں کی وجہ سے موضوع بدلنے کا موقع مل گیا ۔

"بہت دلچسپ ہیں ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔

"آخر یہ احمق اپنی دمیں اوپر کیوں اٹھائے رہتے ہیں ۔"

ڈاکٹر نے اپنے اونی موزے لپیٹ کر گم بوٹ میں رکھ لئے اور جیب سے دوسرے خشک موزے اور ہرن کی کھال کے ہلکے جوتے نکال کر پہنے ۔ "یہ عام کیڑے ہیں اور ان کی سب سے عام خصوصیت یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی دم اٹھائے رہتے ہیں ۔ مجھے کسی کتاب میں اس کی وجہ لکھی ہوئی نہیں ملی ۔"

ہیزل نے اپنے بھیگے ہوئے ٹینس شو کی نوک سے ایک کیڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ایسا وہ کیوں کرتے ہیں ؟"

"میرے خیال میں یہ دعا کرتے ہیں ۔" ڈاکٹر نے جواب دیا ۔

"کیا ؟" ہیزل کو سخت تعجب ہوا ۔

"غیر معمولی بات یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی دم اوپر اٹھائے رہتے ہیں ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔ "دراصل حیرت ناک غیر معمولی بات یہ ہے کہ ہم اس کو غیر معمولی بات سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ ہماری حیثیت ایک کیڑے سے زیادہ نہیں ۔ ہم سے اگر کوئی ناقابلِ توضیح اور عجیب و غریب بات کی ہے تو وہ ہمارا طریقہ دعا ہے ۔ اسلئے ممکن ہے کہ وہ دعا کر رہے ہوں ۔"

"چلو یہاں سے نکل چلیں ۔" ہیزل نے کہا ۔

ہیک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں منتقل ہوئے، تو تھوڑا ہی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ابتدا میں وہ اس سے زیادہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ بارش اور ہوا سے ان کو نجات مل جائے۔ محل میں صرف ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس کی دیواریں نقش و نگار سے خالی تھیں اور صرف دو کھڑکیاں تھیں، جن سے مدھم سی روشنی آتی تھی، اس کے علاوہ کمرہ میں پچھلی کے چارے کی سخت تکلیف دہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہیک اور اس کے ساتھیوں کو ان خرابیوں کا احساس تھا، مگر اس کی اصلاح کے لئے تنظیم کی ضرورت تھی، اور وقت درکار تھا۔ ہیک نے فی الحال یہ کیا کہ زمین پر پانچ مستطیل لکیریں کھینچ دیں۔ ہر خانہ سات فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس نے ہر خانے میں ایک ایک نام لکھ دیا اور تمام ساتھیوں سے کہہ دیا کہ جس میں جس کا نام ہے، وہ اس کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی ساتھی دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کرے گا، تو باقاعدہ قانونی کارروائی کی جائے گی۔ کمرہ کی بقیہ جگہ مشترک ملکیت ہے۔

اس حالت پر یہ لوگ قانع اور مطمئن تھے۔ دن بھر زمین پر بیٹھے تاش کھیلتے، گپیں کرتے اور رات میں ہارڈ بورڈ پر سو رہتے۔ شاید اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی، مگر ایک مرتبہ خلاف معمول بڑی شدید بارش ہوئی اور ایک ماہ سے زیادہ جاری رہی۔ اس کی وجہ سے موجودہ صورت حالات میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ اتنے طویل عرصے تک مسلسل زمین پر پڑے رہنے سے یہ لوگ اکتا گئے۔ بے رنگ دیواریں آنکھوں میں کھبنے لگیں اور اس مصیبت نے مکان کی حیثیت اور قیمت کو ان کی نگاہوں میں کئی گنا بڑھا دیا۔ بی چانگ نے کبھی مکان کا کرایہ طلب نہیں کیا تھا، اس لئے مالک مکان کے قبضہ کا بھی ان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو مکان کی درستگی اور ساز و سامان کی فکر ہوئی۔ ایک روز سہ پہر جیوگی ایک پرانی چارپائی کہیں سے لایا۔ جس کے نواڑ جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کو سی سلا کر سونے کے قابل بنایا۔ رات بھر وہ بڑے آرام سے گہری نیند سویا۔ اس کے دوسرے ساتھی رشک سے اس کو دیکھتے رہیں اور رات بھر کروٹیں بدلتے رہیں۔ دوسرے روز ہیک کسی لوہے کے بیکار ڈھیر پر سے زنگ آلود اسپرنگ اٹھا لایا۔ اسطرح فلاپ ہاؤس کے فرنیچر میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا۔ ایک پرانا قالین فرش پر بچھا ہوا تھا، ٹوٹی پھوٹی کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ میزیں اور بغیر ڈھکن کی ایک دیواری گھڑی بھی تھی۔ ان کو درست کرایا گیا، سفیدی کرائی گئی، جس سے کمرہ نسبتاً روشن ہو گیا۔ دیواروں پر آہستہ آہستہ تصویروں کا اضافہ ہونے لگا، لیکن زیادہ تر کلینڈر کی صورت میں، جن پر سستے قسم کی غیر حقیقی تصویریں ہوتیں، جن کے ہاتھ میں کوکا کولا کی بوتلیں ہوتیں۔ ہنری نے واٹر پینٹ کی ہوئی چند تصویروں سے کمرہ کی زینت میں مزید اضافہ کیا۔

آخر میں ایک بہترین اسٹو کا اضافہ ہوا۔ انہیں ایک اسٹو کی عرصہ سے تلاش تھی اور جب ان کی منشا کے مطابق ملا تھا تو مول بھاؤ میں کافی دن لگ گئے۔ مالک ڈیڑھ ڈالر سے کم میں بیچنے کے لئے تیار نہیں تھا اور یہ لوگ اسی سینٹ سے زیادہ دینے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ بالآخر بڑی جد و جہد کے بعد یہ سودا طے پایا۔ اس کا وزن کوئی تین سو پونڈ تھا، اس لئے اس کو کینری رو تک لانے میں پورے تین دن صرف ہوگئے۔ حالانکہ صرف پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اسٹو بہت شاندار اور خوبصورت تھا۔ فلاپ محل میں اس کے لگ جانے سے چار چاند لگ گئے اور ہیک اور اس کے ساتھی اب اس محل کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔ ایڈی نے دروازے پر چڑھانے کے لئے بیل کا درخت لا کر لگایا۔ ہیزل نے ایک مخصوص قسم کا پھول کا درخت کسی طرح حاصل کیا۔ کبھی کبھی صفائی بھی کی جانے لگی۔ یہی لوگ جو کچھ ہی عرصہ پہلے بے گھر تھے اب بے گھروں کی ہنسی اڑانے لگے اور فخر و تکبر کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے وقتاً فوقتاً مہمان پکڑ لاتے اور انکو دو چار روز ٹھہرانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے۔

ایڈی، لا ایڈا کے شراب خانے میں قائم مقام آب دار تھا۔ مستقل آب دار واٹے جب کبھی بیمار پڑتا یا کسی اور کام سے رخصت پر ہوتا، تو ہمیشہ ایڈی ہی اس کی جگہ پر کام کرتا۔ یہ جب بھی قائم مقامی کرتا تو چند بوتلیں ضرور غائب ہو جاتیں، مگر اس کے باوجود واٹے محض اس لئے اس کو پسند کرتا کہ اسے یقین تھا کہ ایڈی مستقل طور پر اس کی ملازمت کو حاصل کرنے کے لئے کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ ایڈی شراب ضرور چراتا، مگر اتنی ہی کہ ہضم ہو سکے۔ وہ ایک گیلن کا جگ شراب خانے کے کسی کونے میں رکھ دیتا اور گلاسوں میں پینے سے جو شراب بچ رہتی، اس کو اپنے جگ میں ڈال لیتا اور جب کبھی کچھ شرابی کسی بحث میں الجھ پڑتے یا بدمست ہو کر بہک جاتے تو ایسے مواقع پر وہ فائدہ اٹھانے سے کبھی نہ چوکتا۔ کبھی نصف کبھی دو تہائی گلاس، جیسا موقع ہوتا، اپنے جگ میں انڈیل لیتا۔ اس طرح مختلف قسم کی شرابوں کا جو مکسچر تیار ہوتا وہ بڑا پُر سرور اور مزیدار ہوتا۔ اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب کبھی اچھے قسم کی شراب کا

آرڈر ملتا تو میز پر لانے سے قبل تھوڑی بہت ضرور اپنے جگ میں ڈال لیتا۔ اس شراب سے اس کے سبھی ساتھی لطف اٹھاتے۔ اسی لئے فلاپ ہاؤس محل میں ایڈا کو بہت پسند کیا جاتا۔ اسی وجہ سے وہ بعض ذمہ داریوں سے بھی بری تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اس کے بعض نجی کام بھی انجام دیئے جاتے۔

ایک روز بعد دوپہر ہیزل، ڈاکٹر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کے لئے چلا گیا، اور دوسرے ساتھی محل میں بیٹھے شراب کے مزے لے رہے تھے۔ اس گروپ کا نیا ممبر جَے بھی اس وقت موجود تھا۔ ایڈی نے ایک خاص انداز سے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور اس کا مزہ لیتے ہوئے کہا "تم بھی عجیب ہو۔ اتنی جلد کیسے ہوش کھو بیٹھتے ہو؟ کل ہی کی بات ہے۔ کوئی دس آدمی رہے ہوں گے۔ انہوں نے سب سے تیز شراب پی۔ تم تو مہینے میں دو مرتبہ بھی یہ شراب پی نہ سکو گے۔ دراصل ایک خاص قسم کا شربت ہوتا ہے، جس کی ملاوٹ سے اس کا مزہ کئی گنا بہتر ہو جاتا ہے۔

میک نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور اپنے گلاس میں مزید شراب لیتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا "ہاں! معمولی چیزیں بھی بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں۔" یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں پر ایک تجسسانہ نگاہ ڈالی کہ اس کی اس بات کا دوسروں پر کس قدر اثر ہوا۔ صرف جَے مرعوب دکھائی دیتا تھا "یقیناً" اس نے کہا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میک نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا "ہیزل کہاں ہے؟"

"ہیزل ڈاکٹر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا ہے۔" جونس نے جواب دیا۔

میک نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلایا "ڈاکٹر بہت عمدہ دوست ہے۔" میک نے رائے زنی کی۔ دوسرے ساتھیوں نے بالاتفاق اس کی تائید کی "میں عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہیے کوئی اچھی سی چیز، کوئی ایسی چیز جو اس کی پسند ہو" میک نے مزید کہا۔

"اس کو ایک عورت بہت پسند ہے" ہیوئی نے اطلاع دی۔

"اس کی تو تین چار محبوبائیں ہیں" جونس نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔ میک نے ہیوئی سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "محض اس لئے کہ وہ سڑکوں پہ دن کی روشنی میں لڑکیوں کے ساتھ گھوما نہیں کرتا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ بہت پارسا ہے؟"

"پارسائی جلا ہے؟" ایڈی نے سوال کیا۔

"نہیں اگر تم کو کوئی عورت نہ ملے تو تم پارسا ٹھہرے" میک نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس کو کوئی اچھی سی پارٹی دی جانی چاہیئے" میک نے اصل مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا۔ میک کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ سب کی نگاہیں میک پہ تھیں۔ میک کچھ سوچ رہا تھا۔

"ڈاکٹر کو کس قسم کی پارٹی پسند ہے؟" ایڈی نے سوال کیا۔

"کس قسم کی پارٹیاں دی جا سکتی ہیں؟" ہیوئی نے توضیح طلب کی۔ "ڈاکٹر، جگ والی شراب پسند نہیں کرے گا۔" میک نے محویت کے عالم میں جواب دیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" ہیوئی نے سوال کیا "تم نے تو کبھی نہیں پیش کی۔"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے" میک نے جواب دیا "وہ کالج میں رہ چکا ہے۔"

"نہیں، تم نے کبھی پیش نہیں کی۔" اس نے دوبارہ گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"تیسرے گلاس کے بعد اس کا مزہ بہت خوب ہو جاتا ہے۔" ہیوئی نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

"نہیں" میک نے اصرار کیا "ڈاکٹر کے لئے یہ شراب موزوں نہیں۔ اس کیلئے اچھے قسم کی وہسکی چاہیئے۔"

"اسے بیئر پسند ہے۔" جونس نے جواب دیا "وہ لی کے یہاں سے ہمیشہ بیئر خریدتا ہے۔ اس کے لئے اگر آدھی رات میں جانا پڑے، جب بھی اس کو تامل نہیں۔"

"میرے نزدیک تو بیئر پر پیسے صرف کرنا حماقت ہے۔ ۹۲ فیصدی تو اس میں پانی، رنگ، صابن اور اسی قسم کی دوسری چیزیں شامل ہوتی ہیں۔"

"ایڈی!" اس نے مزید کہا "اگلی مرتبہ ویٹریس کی بیماری کے موقع پر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم وہسکی کی چار پانچ بوتلیں اڑا دو۔"

"یقیناً" ایڈی نے جواب دیا۔ "میں ضرور حاصل کروں گا، مگر یہ آخری ہوں گی۔ اس کے بعد ناممکن ہے۔ میرے خیال میں جو نے کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ پچھلی مرتبہ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ بچا کر جگ لا سکا۔"

"دیکھو یہ کام تم سے نکلنے نہ پائے۔" جونس نے مشورہ دیا "اگر

دھاگے بیمار پڑجائے یا کسی اور وجہ سے چھٹی لے تو تم کسی نہ کسی طرح اس کی جگہ ہفتہ ڈیڑھ کے لئے ضرور پہنچ جاتا۔ اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو وہسکی ضرور خریدنی پڑے گی ـــــ ایک گیلن وسکی کتنے میں ملتی ہے ؟"

"مجھے معلوم نہیں" ہیوئی نے جواب دیا "میں نے ایک وقت میں گلاس آدھے گلاس سے زیادہ کبھی نہیں خریدی۔"

"اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو پیسوں کی ضرورت پڑے گی" ہیک نے سب سے اہم معاملہ کی طرف توجہ دلائی ـــــ "پارٹی بہت عمدہ ہونی چاہیئے ـــــ بہت شاندار..... کسی کو اس کا یوم پیدائش معلوم ہے ؟"

"پارٹی کے لئے یوم پیدائش کی ضرورت نہیں۔" جونس نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ضرورت تو نہیں ہے، مگر بہتر ہے" ہیک نے جواب دیا "میرے خیال میں ڈاکٹر کی پارٹی کے لئے بہت کافی روپے کی ضرورت پڑے گی"

ہر ایک، ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ہیوئی نے مشورہ دیا "ہیڈی وَنڈو کنری میں لام بند کا کھیل ہوتی ہے۔"

"نہیں" ہیک نے فوراً مخالفت کی "لوگوں کی نظر میں ہماری بڑی عزت ہے۔ اس کو کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم میں سے ہر ایک مہینے سوا مہینے کے لئے کام سے لگا ہوا ہے۔ ہم میں سے کسی کو جب بھی کام کی ضرورت ہوتی ہے، تو فوراً ہی مل جاتا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص کبھی بیکار نہیں رہا۔ پھر ہم اپنا وقار خطرے میں کیوں ڈالیں"

اس خیال کی سب نے بالاتفاق تائید کی "اگر پارٹی کرنی ہے تو کرسمس کے قرب و جوار میں روپے جمع ہو جانے چاہئیں" جونس نے تجویز پیش کی "اس مرتبہ مرغ پکنا چاہیئے۔"

"خدا کی قسم ضرور پکے گا" ہیک نے یقین دلایا "کارمیل کی وادی میں میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں، جہاں مرغ کے جھنڈ کے جھنڈ رہتے ہیں"

"اس وادی سے میں بھی واقف ہوں" ہیوئی نے کہا "اس سے میں ڈاکٹر کے لئے کیچوے، جھینگے کی مچھلی اور مینڈک پکڑ کر لایا کرتا تھا، فی مینڈک پانچ سنٹ مجھے ملتے تھے"

"میں بھی جانتا ہوں" گے نے کہا "ایک موقع پر مجھے پانچ سو مینڈک۔ بیچے!"

"ڈاکٹر کو اگر مینڈک کی ضرورت ہو تو پھر معاملہ طے ہے" ہیک نے کہا "ایک ہفتہ دو کا ہے۔ دریائے کارمیل سے مینڈک لائیں گے اور تفریح بھی کر لیں گے۔ مگر بھئی، ڈاکٹر کو اس کی خبر نہ ہونے پائے کہ ہم لوگ اس آمدنی کو کہاں خرچ کریں گے ـــــ بس اس کے بعد ایک اچھی سی پارٹی دے دیں گے"

اس فیصلے پر فلاپ ہاؤس محل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی "گے!" ہیک نے کہا "ذرا دیکھنا ڈاکٹر کی کار تو نہیں آئی ہے ؟" گے نے عینک اتار کر دیکھا ـــــ "ابھی تک نہیں" اس نے اطلاع دی۔

"بس آتا ہی ہوگا" ہیک نے کہا "خیر، ہماری اسکیم مکمل ہو گئی ہے"

ڈاکٹر کی کار جب سائنس کی تجربہ گاہ پر آکر رکی تو ہیک اور اس کے ساتھی چھپ کر دیکھنے لگے کہ وہ کیا لایا ہے۔ ڈاکٹر اور ہیزل کاہے اٹھے اور مچھلی کی بوریاں اتار کر تجربہ گاہ میں لے گئے۔ اس سے فارغ ہو کر ہیزل فلاپ ہاؤس محل واپس آگیا۔ اس کے جوتے اور کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ ہیک نے پوچھا "ڈاکٹر کا کیا حال ہے؟" "بہت اچھا" ہیزل نے جواب دیا "دوستی کا موڈ بھی ہے" ہیک نے پھر سوال کیا۔ "یقیناً" ہیزل نے جواب دیا "ہمیں کوئی دو تین سو مچھلیاں ملی ہیں۔ اس وقت اس کا موڈ بہت اچھا ہے"

"کیا یہ بہتر رہے گا کہ ہم سب اکٹھا اس کے پاس چلیں" ہیک نے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیا "نہیں، بہتر ہے میں اکیلا ہی جاؤں۔ ہم سب کے ایک ساتھ جانے میں ممکن ہے وہ گڑبڑا جائے"

"آخر معاملہ کیا ہے ؟" ہیزل نے سوال کیا "ہم نے ایک اسکیم تیار کی ہے" ہیک نے کہا "میں ڈاکٹر کے یہاں جا رہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں"

ہیک تجربہ گاہ میں داخل ہوا تو ڈاکٹر بوریوں سے مچھلیاں نکالنے میں مشغول تھا۔ ہیک کو دیکھ کر ذرا گھبرایا۔ اس لئے کہ ہیک کے ساتھ کچھ مسائل بھی آجاتے ہیں "کہو کیا حال ہے ؟" ہیک نے بڑے خلوص سے حال دریافت کیا۔ "ٹھیک ہوں" ڈاکٹر نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی "تم نے یہ دلچسپ خبر بھی سنی کہ بے لس مفنے ہیرفلیک میں ایک بدمست شرابی کی ٹھکائی کر دی۔ اس کا گھونسہ بہت سخت پڑا

تھا کہ اس کا مصنوعی دانت اس کے ہاتھ میں چبھ گیا اور اس کی کہنی تک زہر پھیل گیا ہے۔ اس نے مجھے وہ دانت دکھلایا ہے۔ کیوں ڈاکٹر! کیا مصنوعی دانت میں زہر بھی ہوتا ہے؟"

"میرے خیال میں ہر وہ چیز جو انسانی منہ سے نکلے اس میں زہر ہوتا ہے ـــــ" ڈاکٹر نے جواب دیا ـــــ "اس نے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟"

"وہی شخص جو بیٹا تھا، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے" ہیک نے جواب دیا۔

"اس کے لئے سلفا کی کوئی دوا لیتے جانا" ڈاکٹر نے کہا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس کے آنے کا کوئی اور مقصد ہے، اس لئے منتظر رہا کہ وہ اصل منشا بیان کرے۔ ہیک بھی سمجھ گیا کہ وہ تاڑ گیا ہے۔ اس لئے اسے اپنے مقصد کی طرف آنا پڑا "ڈاکٹر! اس وقت تم کو کسی قسم کے جانوروں کی ضرورت ہے؟" ہیک نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "کیوں؟"

"ابھی عرض کرتا ہوں" ہیک نے جواب دیا ـــــ "دراصل مجھے اور میرے ساتھیوں کو روپے کی ضرورت ہے ـــــ ایک اچھے کام کے لئے، ایک نیک مقصد کیلئے۔"

"ـــــ پیسے کے گرم گرم پہلو کے لئے؟"

ہیک کو اپنے مقصد کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اچھا موقع مل گیا "نہیں، ایسا نہیں ہے۔" اس نے کہا "بہت اہم مقصد کے لئے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے سوچا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم اس کو مہیا کر دیں۔ اس طرح ہم کو کچھ روپے مل جائیں گے اور آپ کا کام ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے چند مچھلیاں اور بوری سے نکالیں۔ پھر ہیک سے مخاطب ہوا "مجھے کوئی تین چار سو مینڈکوں کی ضرورت ہے۔ میں خود انتظام کر لیتا، مگر مجھے لاجولا جانا ہے۔ کل بہت اچھا جوار بھاٹا آنے کی امید ہے۔ مجھے خاص قسم کے کچھ سیپ کی ضرورت ہے۔"

"کیا مینڈکوں کی وہی قیمت ہے؟" ہیک نے سوال کیا "فی مینڈک پانچ سنٹ؟"

"ہاں وہی قیمت ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ہیک کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا "ڈاکٹر! تم مینڈکوں کی ذرا بھی فکر نہ کرو" اس نے کہا "تمہیں جس قدر ضرورت ہے ہم مہیا کر دیں گے۔"

"بہت اچھا" ڈاکٹر نے جواب دیا "تم کو جس قدر ملیں گے میں خرید لوں گا۔ مگر مجھے تقریباً تین سو کی ضرورت ہے۔"

"پرواہ نہیں، ڈاکٹر! اگر تم کو سات آٹھ سو کی ضرورت ہو تو وہ بھی ہم پوری کر دیں گے۔" ہیک کے چہرے پر بادل سا آگیا "ڈاکٹر!" اس نے کہا ـــــ "کیا وادی تک جانے کے لئے تمہاری کار مل سکے گی؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے بغیر کسی تکلف کے جواب دیا "میں نے ابھی کہہ چکا ہوں کہ کل کے جوار بھاٹے سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجھے آج رات کو لاجولا جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے" ہیک کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی "خیر اس کی فکر نہ کرو ڈاکٹر! شاید لی چانگ کا پرانا ٹرک ہمیں مل جائے" ہیک کا چہرہ اور اتر گیا "ڈاکٹر!" اس نے دوسری درخواست کی "اتنے بڑے کاروبار کے لئے کیا تم کچھ پیشگی رقم دے سکو گے، کم از کم پٹرول کے خرچ کے لئے؟ مجھے یقین ہے کہ لی چانگ پٹرول نہیں دے گا۔"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "اس سے پہلے تم کو رقم دے کر نقصان اٹھا چکا ہوں۔"

"پھر شاید ہم نہ جا سکیں" ہیک نے جواب دیا۔ اسکے لہجے میں غم اور درد تھا۔ ڈاکٹر کو واقعی مینڈکوں کی سخت ضرورت تھی۔ اسلئے اسے اپنے رویے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

"میں ایک اور ترکیب کر سکتا ہوں۔ میں ایک پرچہ لکھ دیتا ہوں، تم پٹرول اسٹیشن سے دس گیلن میرے حساب میں لے لو۔ کہو ٹھیک رہے گا؟"

ہیک مسکرایا "بہت اچھا" ہیک نے رضامندی ظاہر کی۔ "میں اور میرے ساتھی کل صبح سویرے روانہ ہو جائیں گے اور جب تم جنوب سے واپس آؤ گے تو اتنے مینڈک پاؤ گے، جتنے کبھی تم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھیں گے۔"

ڈاکٹر نے اسی وقت دس گیلن پٹرول کے لئے پرچہ لکھ دیا۔ ہیک نے مینڈکوں کا مزید اطمینان دلایا اور پرچہ لے کر واپس لوٹا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

اس لئے کہ ہیک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ سودا کرنے میں شاید ہی کبھی فائدہ رہا ہو۔ ہیک تجربہ گاہ سے سیدھا لی چانگ کی دوکان پر آیا۔ لی چانگ حسب معمول سگار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہیک داخل ہوا تو اس کی انگلیاں ذرا تیزی سے کھٹکھٹانے لگیں۔ ہیک نے بغیر کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کیا "لی! ڈاکٹر کو نیویارک میوزیم سے مینڈکوں کے لئے ایک بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ ڈاکٹر کو جنوب جانا ہے۔ اس لئے ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوست کو دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہیئے، خصوصاً ڈاکٹر جیسے مخلص دوست کی ـــــ کیوں سالانہ ستر ڈالر تو وہ تمہاری دوکان پر خرچ کرہی دیتا ہوگا؟" لی چانگ بدستور خاموش رہا۔ ہیک نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "کیا تم وادی کارمیل تک جانے کے لئے، ڈاکٹر کی خاطر اپنا ٹرک دے سکو گے؟"

لی چانگ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتحمندی تھی "ٹرک ٹھیک نہیں ہے" اس نے کہا "ٹرک خراب ہوگیا ہے" اس جواب نے ہیک کو چکرا دیا، مگر جلد ہی اپنے پر قابو پالیا "سگار کاؤنٹر پر پیٹرول کا پرچہ رکھ کر اس سے مخاطب ہوا "دیکھو، ڈاکٹر کو مینڈکوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پیٹرول کیلئے یہ پرچہ لکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹر کا نقصان کسی حالت میں گوارا نہیں۔ گے بہت اچھا مستری ہے۔ اگر وہ تمہارا ٹرک ٹھیک کردے تو کیا دے سکو گے؟"

لی نے پیچھے جھک کر اپنی عینک کے نصف شیشوں سے اسکو غور سے دیکھنے لگا۔ ٹرک واقعی خراب تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ گے بہت اچھا مستری تھا "کب تک واپس آؤ گے؟" لی نے سوال کیا۔

"غالباً دوپہر تک، یا ممکن ہے کہ پورا دن صرف ہو جائے۔" ہیک نے اطمینان دلایا "بس جوں ہی ضرورت بھر مینڈک مل جائیں گے ہم واپس آجائیں گے۔"

لی پریشان تھا، مگر انکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے حامی بھرنی پڑی "بہت خوب۔" ہیک نے خوش ہوکر کہا "مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کو تم پر کس قدر بھروسہ ہے۔ میں ابھی گے کو بھیجتا ہوں۔" وہ واپسی کے لئے مڑا "ہاں!" اس نے رک کر کہا "ڈاکٹر ہمیں فی مینڈک پانچ سنٹ ادا کرے گا، ہم کوئی سات آٹھ سو مینڈک حاصل کریں گے، تم جانو کتنا بڑا سودا ہے۔ کچھ عمدہ سی شراب پلاؤ گے، پیسے ملنے پر قیمت ادا کردوں گا۔"

"نہیں" لی نے صاف انکار کردیا۔

لی چانگ کا ٹرک فورڈ ماڈل ٹی تھا۔ اس سے پہلے مختلف لوگوں کے پاس اس قدر استعمال ہوچکا تھا کہ اب اس کی قریب قریب عمر ختم ہوچکی تھی۔ لی چانگ کو ایک بل کی ادائیگی کے سلسلے میں ملا تھا۔ اس کو کام میں لانے کے لئے بہت احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی اور چونکہ لی کے یہاں اس قدر توجہ نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے اکثر بیکار پڑا رہتا تھا۔

فلاپ ہاؤس محل کا ہر شخص ٹرک کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، کیونکہ ہر شخص تھوڑا مستری تھا، مگر گے ان سب میں ماہر تھا۔ یہ سب کے سب صبح سویرے لی چانگ کے ٹرک کو درست کرنے میں لگ گئے۔ اس میں کافی وقت لگا۔ مشکلات کچھ بہت سی پیش آئیں۔ مگر انکی انتھک کوشش سے ٹرک چلنے کے قابل ہوگیا۔ دو قانونی زحمتیں بھی پیش آئیں۔ ٹرک کے لائسنس کی تجدید نہیں کرائی گئی تھی، دوسرے لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ لائٹ کا مسئلہ تو خیریت میں پیش آتا، مگر لائسنس کا معاملہ ذرا اہم تھا، اس لئے پیچھے مستقل طور پر کپڑا باندھ دیا گیا اور اس کا ایک حصہ نمبر کی پلیٹ پر اس طرح گرا دیا، جس سے پلیٹ ڈھک جائے اور دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اتفاقی طور پر پلیٹ چھپ گئی ہے اور سامنے کی پلیٹ پر اس طرح کیچڑ لگادی گئی تھی کہ نمبر پڑھے ہی نہ جاسکیں۔ اس کے بعد ٹرک وہاں سے روانہ ہوا۔ پیٹرول اسٹیشن پر پیٹرول کے لئے رکا۔ ہیک نے ایڈ ولیم کو پرچہ دیا اور اس سے کہا "ڈاکٹر کے پاس پیسے کچھ کم تھے، اس لئے اگر آپ پانچ گیلن ٹرک میں ڈال دیں اور پانچ گیلن کی نقد قیمت مجھے دیدیں تو عنایت ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جنوب گیا ہے۔ جاتے وقت اس نے یہ بات زبانی کہدی تھی۔"

ایڈ بڑی خوش اخلاقی سے مسکرایا "تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر بہت محتاط آدمی ہے۔" اس نے کہا "اگر کسی گڑبڑ کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو

وہ اس کا تدارک کر دیا کرتا ہے۔ یہی چیز تمہارے ساتھ پیش آئی۔ اس نے رات مجھے خود ہی فون کر دیا تھا۔"

"اچھا تو دس گیلن ڈلوا دیجئے۔" میک نے کہا۔ "مگر ٹھہریئے۔ اچھا پانچ گیلن ٹرک میں ڈلوا دیجئے اور پانچ گیلن الگ دے دیجئے۔"

اب ٹرک منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے عام سڑک کے بجائے سنسان سڑک اختیار کی گئی۔ ہموار سڑک پر تو ٹرک بغیر کسی دشواری کے چلتا رہا، مگر جب پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوئی تو اس کی رفتار کافی سست ہو گئی اور کچھ عرصے میں ریڈی ایٹر کافی گرم ہو گیا۔ مگر یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ کیونکہ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ ماڈل ٹی کا انجن ریڈی ایٹر کے گرم ہونے کے بعد ہی اچھا کام کرتا ہے، مگر ایسا ہوا نہیں۔ ریڈی ایٹر جب بہت گرم ہو گیا تو ٹرک یکایک رک گیا۔ "کیا ہوا؟" میک نے گھبرا کر سوال کیا۔ "غالباً کاربوریٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔" تگے نے جواب دیا۔ "ماڈل ٹی کا کاربوریٹر کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتا، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام پرزے ٹھیک ہوں۔ اگر ذرا بھی خرابی ہوئی تو کاربوریٹر کام نہیں کرے گا۔" تگے نے انجن کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کاربوریٹر کی نیڈل والا پورا حصہ ٹوٹ گیا ہے۔ "کیا تم ٹھیک کر سکو گے؟" میک نے سوال کیا۔ "نہیں۔" تگے نے جواب دیا۔ "دوسری خریدنی پڑے گی۔"

"کتنے میں ملے گی؟"

"نئی کوئی ایک ڈالر میں اور پرانی چوتھائی ڈالر میں۔"

"تمہارے پاس ایک ڈالر ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا تو فوراً واپس جاؤ۔ تمہارے آنے تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔"

تگے نے پیدل چل کر، دیگر تین کاروں کو روکنے کی کوشش کی، مگر کسی نے اخلاقاً بھی رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ چوتھی کار رکی اور اس نے بٹھا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے کار کو رکتے اور اس کو بیٹھتے دیکھا، مگر اس کے بعد ۱۸۰ دن کے بعد اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔

تگے کار میں بیٹھنے کے بعد مطمئن ہو گیا، مگر بدقسمتی یہاں بھی ساتھ تھی۔ مانیٹری پہنچنے سے پہلے ہی کار خراب ہو گئی۔ مگر چونکہ تگے ایک ماہر مستری تھا۔ اس لئے اس کی کوششوں سے کار آگے جانے کے قابل ہو گئی۔ اس کی اس خدمت سے مالک کار بہت خوش تھا۔ اس لئے اس نے شراب پینے کی دعوت دی۔ تگے کے لئے آج کا دن ہی کچھ منحوس تھا۔ بار میں چند لوگوں میں جھگڑا ہو گیا۔ تگے کے نئے دوست نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اس سے ایک شخص زخمی ہو گیا۔ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ پولیس پہنچی تو یہاں تگے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

جب اندھیرا ہونے لگا اور سردی بڑھنے لگی تو میک اور اس کے ساتھی صنوبر کی پتیوں میں گھس کر بیٹھ گئے اور تگے کی مشکلات کا ذکر کر کے وقت گزارنے لگے۔ "ہم میں سے کسی اور کو بھی اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔" میک نے اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ کوئی دس بجے ایڈی اٹھا۔ "سامنے کی پہاڑی پر کسی ٹھیکیدار کا کیمپ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں شاید ان کے یہاں کوئی ماڈل ٹی ہو۔"

میک اور اس کے ساتھی بڑے آرام سے صنوبر کی پتیوں پر سوئے۔ دن نکلنے سے کچھ پہلے ایڈی واپس آیا۔ اس کو کافی دوڑ دھوپ کے بعد ماڈل ٹی ملا۔ پہلے اس نے سوچا کہ صرف نیڈل والو نکال لے، مگر پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کہ وہ فٹ نہ ہو سکے، اس لئے پورا کاربوریٹر نکال لایا۔ وہ آیا تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ صنوبر کے درختوں کے نیچے سو رہا۔ دن نکلا تو سب اٹھ کر ناشتے میں مشغول ہو گئے اور ایڈی کاربوریٹر فٹ کرنے لگا اور جب ٹرک ٹھیک ہو گیا، تو سب منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ایڈی ٹرک چلا رہا تھا۔

یہ لوگ دریا پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ ایک خوبصورت مقام پر ان لوگوں نے ڈیرا ڈال دیا۔ "اگر یہاں مینڈک مل سکیں گے، تو اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے۔" میک نے کہا۔ "مینڈکوں کے پکڑنے کا بہترین وقت رات ہے، اس لئے باری باری سے ہمیں جاگنا ہو گا۔"

رات میں ابھی دیر تھی، اس لئے وقت گزاری کے لئے یہ لوگ شراب اور گپ میں مشغول ہو گئے۔

"مجھے تعجب ہے، آخر تگے کو کیا ہوا ہے؟" ایڈی نے سب کی توجہ اس طرف منعطف کرائی۔

یہ پہلا موقع جب تگے کے جانے کے بعد ان لوگوں نے اس کا ذکر

کیا۔

"خود میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" ہیک نے کہا "شادی شدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے وہ اپنی بیوی سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرے، مگر جائے گا اسی کے پاس۔ خود گے کی مثال لے لو۔ اس کی بیوی اکثر گوشمالی کرتی ہے مگر آخر میں گے ہی کو معذرت کرنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد دوسرے موضوع چھڑ گئے۔ ڈاکٹر کی پارٹی کا بھی ذکر آیا اور اس کی تفصیلات پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ یہ باتیں جاری تھیں کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔

ایک لمبا چوڑا آدمی بندوق کاندھے پر ڈالے کھڑا تھا "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو" اس نے رعب دار آواز میں سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں" ہیک نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ فوجی علاقہ ہے۔ یہاں شکار کھیلنے یا کیمپ لگانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اپنا بوریہ بستر اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً چلدو"

ہیک بہت ہی خاکساری کے ساتھ کھڑا ہو گیا "ہمیں اس کا بالکل علم نہیں تھا کیپٹن!" ہیک نے عاجزی سے کہا "بہر حال ہمیں بےحد افسوس ہے" کچھ توقف کے بعد اور اس کے بلّے کو غور سے دیکھتے ہوئے ہیک نے کچھ کہنے کی جرأت کی "آپ فوجی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ فوجی آدمی کی سج دھج ایک عام آدمی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، میں فوج میں ایک عرصے تک رہا ہوں۔"

"میں اپنی زمین پر آگ جلانے کی اجازت نہیں دے سکتا" اس نے ہیک کی خوشامد سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"ہمیں سخت افسوس ہے" ہیک نے دوبارہ معذرت کی "ہم ابھی صاف کئے دیتے ہیں — ہم کچھ سائنسداں کے لئے کام کرتے ہیں۔ ہم مینڈک پکڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ وہ لوگ کینسر پر ریسرچ کر رہے ہیں اور ہم ان کو مینڈک مہیا کرکے ان کی مدد کرتے ہیں"

"وہ مینڈک کیا کریں گے؟" اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ ان کو کینسر کا انجکشن دیتے ہیں" ہیک نے سمجھانے کی کوشش کی "اور اس کا ردّ عمل دیکھتے ہیں — لیکن کیپٹن! اگر آپ نہیں چاہتے کہ ہم یہاں ٹھہریں، تو ہم ابھی چلے جاتے ہیں"

یکایک ہیک نے کتیا کی طرف دیکھا، جو فوجی کے ساتھ تھی اور کچھ ایسے انداز سے گویا ابھی اس پر نگاہ پڑی ہے "خدا کی قسم بہت عمدہ ہے" اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا "یہ تو بالکل نولا کی طرح ہے جس نے پچھلے سال ورجینیا میں انعام حاصل کیا تھا۔ کیا یہ ورجینیا کی ہے، کیپٹن؟"

"ہاں" تھوڑے سے تامل کے بعد وہ جھوٹ بولا "ابھی بچّہ ہے اس کے کاندھے پر ایک زخم ہو گیا ہے"

"کیپٹن! ذرا مجھے دیکھنے دو" ہیک نے بڑی مستعدی دکھلائی

"اوپر کے حصّے میں ہے، جہاں وہ چاٹ نہیں سکتی"

"میرے پاس بھی ایک کتیا تھی، اسی قسم کا ایک زخم ہو گیا تھا، وہ مر گئی"

"میں تھنچر آیوڈین لگاتا ہوں"

"بیکار ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا"

"کیا آپکے یہاں اپسن سالٹ ہے؟"

"کیوں نہیں، ایک بوتل ہے"

"آپ اپسن سالٹ کی گرم پلٹس بناکر اس پر روزانہ رکھئے۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے کیپٹن! اگر آپ اجازت دیں تو میں خود اس کی دیکھ بھال کروں گا"

کیپٹن نے کتیا کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "میرے مکان کے پاس ایک تالاب ہے، اس میں بےشمار مینڈک ہیں۔ رات بھر سونے نہیں دیتے۔ کیوں نہ تم وہاں آجاتے۔ تمہیں مینڈک مل جائیں گے اور مجھے ان سے نجات مل جائے گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے" ہیک نے کہا "سائنسداں آپ کے بہت ممنون ہوں گے۔ مگر مجھے توفی الحال پلٹس کی ضرورت ہے" اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "تم لوگ آگ بجھا دو۔ دیکھنا کوئی چنگاری رہ نہ جائے۔ میں کیپٹن کے ساتھ جاتا ہوں اور نولا کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ تم لوگ بھی جلد آجاؤ"

ہیک اور کیپٹن ایک ساتھ چل دیئے۔

ہیزل نے آگ پر ریت ڈالتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے اگر ہیک چاہتا تو امریکہ کا صدر بن جاتا"

"مگر بن جاتا تو کیا کر لیتا" جونس نے سوال کیا۔

"کچھ نہ کچھ تو مزہ آتا ہی"

دوپہر کے وقت ماڈل ٹی ٹرک گیبزی روبین فاتحانہ داخل ہوا اور لی چانگ کی دوکان کے پیچھے اپنی مستقل جگہ پر آکر رکا۔ ہیک اور اس کے ساتھی اترے۔ اگلے پہیوں کے سامنے روک لگائی، ٹین کی پانچ گیلن پٹرول میں سے جس قدر بچ رہا تھا، اس کو نچوڑ کر نکالا اور مینڈکوں کو لے کر تھکے ماندے فلاپ ہاؤس محل کو واپس آئے۔ ہیک نے پہلے لی کی عنایت کا شکریہ ادا کیا اور بہت فخر کے ساتھ بلکہ کسی قدر مبالغے کے ساتھ اپنی کامیابی کا ذکر کیا۔ لی اس پر مسکرایا، مگر اس کی مسکراہٹ میں کچھ عجیب بھی شامل تھی "اسوقت ہم بڑے خوش قسمت ہیں" ہیک نے جوش کے ساتھ کہا "ڈاکٹر ہمیں پانچ سنٹ فی مینڈک کے حساب سے ادا کرے گا اور ہمارے پاس کوئی ایک ہزار مینڈک ہیں۔" لی نے اسکی تائید کی۔

"ڈاکٹر آج کل باہر گیا ہوا ہے" ہیک نے کہا "جب واپس آئیگا تو اتنے مینڈک دیکھ کر بڑا خوش ہوگا۔" لی نے دوبارہ تائید کی۔

"مگر بھئی! اسوقت ہمارے پاس پیسوں کی کمی ہے۔" ہیک نے بالآخر دل کی بات کہی۔

"وسکی نہیں ہے" لی چانگ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہم وسکی کیا کریں گے" ہیک کو تاؤ آگیا "ہمارے پاس عمدہ ترین وسکی ہے۔ ایسی کہ تم کو چکھنے کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ دراصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ماحضر تناول کرو۔"

لی خوشی سے مسکرایا۔

"میں اور میرے ساتھی آجکل بہت تنگ دست ہیں اور اس وقت سخت بھوک لگی ہے۔" ہیک نے توضیح کرنے کی کوشش کی "تم کو مینڈکوں کی قیمت معلوم ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل ڈاکٹر باہر گیا ہوا ہے اور ہمیں اسوقت کھانے کی شدید ضرورت ہے، اس لئے ہم نے سوچا کہ تم کو ایک ڈالر میں پچیس مینڈک دیں گے۔ اس طرح تم کو پانچ مینڈک نفع میں ملیں گے۔"

"نہیں" لی نے جواب دیا "اسوقت پیسے نہیں ہیں۔"

"مگر ہم پیسے کب مانگ رہے ہیں۔ ہمیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں چاہئیں۔ ڈاکٹر کو اس کی واپسی پر ایک مختصر سی پارٹی دینے کا ارادہ ہے۔ سوچو تو ڈاکٹر کتنا بھلا آدمی ہے۔"

ہیک جانتا تھا کہ لی، ڈاکٹر کا بہت کافی مقروض ہے مگر لی سوچتا تھا کہ اس کی وجہ سے ہیک کیوں فائدہ اٹھائے۔

"ہم ادھار بھی نہیں چاہتے" ہیک نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "واقعی ہم ایک ڈالر کی چیزوں پر ۲۵ مینڈک تم کو ادا کریں گے۔ اس کے علاوہ تم کو پارٹی میں بھی مدعو کریں گے۔"

لی کو اس سودے میں کچھ خرابی نظر نہیں آئی۔ ہر چیز باضابطہ تھی۔ ڈاکٹر کی وجہ سے مینڈکوں کی حیثیت نقدی سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ قیمت میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں لی کو دہرا فائدہ تھا۔ ایک طرف فی ڈالر پانچ مینڈکوں کا فائدہ تھا، دوسرے اسکی وجہ سے اس کی دوکان کی چیزیں بکیں گی، جس کا نفع اس کے علاوہ ہوگا۔ "میں مینڈک دیکھنے کے بعد کچھ کہہ سکتا ہوں" بالآخر لی نے جواب دیا۔

لی اور ہیک فلاپ ہاؤس محل آئے۔ وسکی پی اور مینڈکوں کو دیکھا اور اس شرط پر معاملہ کر لیا کہ کوئی مردہ مینڈک وہ نہیں خریدے گا۔ ہیک نے پچاس مینڈک گن کر بالٹی میں رکھے اور لی چانگ کے ساتھ دوکان واپس آیا۔ اور ان کے بدلے میں دو ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں جیسے گوشت، انڈے اور روٹی خرید کر لایا۔

لی کا اندازہ تھا کہ یہ کاروبار بہت کامیاب رہے گا۔ ایک بڑا پیکنگ کیس نکال کر لایا اور اس میں پچاسوں مینڈک رکھ کر اس پر بھیگا ہوا بورا ڈال دیا، تاکہ ان مینڈکوں کو کچھ نہ کچھ تری ملتی رہے۔

لی چانگ کا خیال واقعی صحیح تھا۔ ان مینڈکوں کی وجہ سے اس کا کاروبار بہت بڑھ گیا اور ہر چیز کے دام کافی چڑھ گئے۔ ایڈی نے دو مینڈکوں میں آدھ پاؤ رم شراب خریدی تھی اور جب جونس کوکاکولا خریدنے گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی قیمت ایک مینڈک سے دو مینڈک ہوگئی ہے۔ جوں جوں دن گذرتا گیا، قیمتیں بڑھتی گئیں۔ مثلاً گوشت اور پھلی کے ٹن کو لے لو۔ ان ٹنوں کی قیمت زیادہ سے زیادہ دس مینڈک فی پونڈ ہونی چاہیے تھی، مگر ساڑھے بارہ میں بک رہے تھے۔ ڈبے کے شفتالو کی قیمت سب سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ نمبر ۲ کا ٹین آٹھ مینڈک میں بکتا تھا۔ اس اندھا دھند اضافے سے لوگ کافی بے چین اور پریشان تھے۔ اس کی وجہ سے خاصی تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ تلخی اسوقت اور بڑھ گئی جب ہیزل نے سلک کا ایک جوڑا کالر خریدنا چاہا تو اس سے کہا گیا اگر وہ ۳۵ مینڈک ادا نہیں کر سکتا تو کہیں اور سے خرید لے۔ کاروبا

حلقے میں اس کی وجہ سے تلخی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، مگر آئی کے پیکنگ کیس میں بینڈنگ بھی بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

یہ اضطراب اور تلخی مِیک اور اس کے ساتھیوں میں زیادہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ کاروباری تھے، نہ اپنی مسرت کو بڑھتی ہوئی قیمتوں سے ناپتے تھے۔ نہ بینک بیلنس کی فکر تھی اور نہ خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے۔ اگر وہ کچھ برہم تھے تو اس پر کہ آئی کی وجہ سے وہ کفایت پر مجبور ہو گئے تھے، مگر پھر بھی دو ڈالر کے گوشت اور انڈے ان کے پیٹ میں پڑے ہوئے تھے، وسکی اس کے علاوہ تھی۔ اسی طرح ناشتے کے بعد کبھی کبھی بھرے وسکی پینے کو مل رہی تھی۔ علاوہ ازیں وہ اپنی کرسیوں پر بیٹھتے، اپنے مکان میں رہتے اور بے فکری کے عالم میں ڈارلنگ کو دودھ پیتے دیکھتے، جو ڈبے کا دودھ پینا ابھی سیکھ رہی تھی۔ ڈارلنگ بہت ہی خوش قسمت کتیا تھی۔ مِیک اور اس کے ساتھی اس کو بہترین ٹریننگ دینا چاہتے تھے، مگر چونکہ پانچوں ساتھیوں کے ٹریننگ کے اصولوں میں بنیادی اختلاف تھا، اس لئے ڈارلنگ کو کسی قسم کی ٹریننگ دی ہی نہ جا سکی۔ کبھی کبھی پانچوں ساتھیوں کا اس بات پر اتفاق ہو جاتا کہ موجودہ صورت حال نامناسب ہے اور ڈارلنگ کو ٹریننگ ضرور دی جانی چاہئے، مگر ہر مرتبہ ٹریننگ کے طریقے پر بحث اتنی طویل ہو جاتی کہ ان کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ کر دوسری طرف مرکوز ہو جاتی۔

سہ پہر کو یہ لوگ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کھانا ہضم کر رہے تھے۔ سوچ بچار کر رہے تھے اور کبھی کبھار جگ میں سے شراب لے کر پی لیا کرتے اور ہر مرتبہ ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے کہ یہ ڈاکٹر کے لئے ہے۔ ہمیں خرچ میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ بات یہ لوگ ایک منٹ کے لئے بھی نہ بھولتے۔

"تمہارا اندازہ کیا ہے؟ ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟" ایڈی نے سوال کیا۔

"عام طور پر آٹھ نو بجے واپس آتا ہے" مِیک نے جواب دیا۔

"اس کو پارٹی کب دی جائے؟ میرے خیال میں آج ہی رات میں دینا مناسب رہے گا"

"یقیناً" سب نے اتفاق کیا۔

"ممکن ہے وہ تھکا ہوا ہو" ہیزل نے مشورہ دیا "بہت لمبا سفر ہے"

"کیا کہہ رہے ہو" جونس نے اپنا تجربہ بتلایا "تھکن میں تو صرف پارٹی دینی ہے۔ میں ایک مرتبہ بہت سخت تھک گیا تھا۔ پیر اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے بعد ایک پارٹی میں شریک ہوا تو تمام کسلمندی دور ہو گئی اور طبیعت تر و تازہ ہو گئی"

"آج ہم پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں" مِیک نے تبصرہ کیا "پارٹی دی کہاں جائے۔ یہاں؟"

"ڈاکٹر کو اپنے ریکارڈ بہت پسند ہیں۔ پارٹی کے موقع پر اپنا فونوگرام ضرور بجاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم خود اسی کے یہاں دیں تو وہ بہت خوش ہوگا"

"تم ٹھیک کہتے ہو" مِیک نے تائید کی "مگر میرے خیال میں اس سے پہلے سے پارٹی کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس کو یکایک معلوم ہوگا تو بڑا لطف آئے گا۔ اس کو شراب پلانے کے بہانے سے لائیں"

"سجاوٹ کس قسم کی ہو؟" ہیوئی نے تجویز پیش کی "چوتھی جولائی کی طرح یا ہیلوویں کی طرح؟"

مِیک کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔

"ہیوئی" اس نے کہا "تم نے بڑے پتے کی بات کہی۔ میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا کی قسم تم نے بڑی اونچی بات سوچی" اس کی آواز مدھم ہو گئی اور اس کی نگاہیں مستقبل کا جائزہ لینے لگیں "جیسے میں واقعی دیکھ رہا ہوں" اس نے کہا "ڈاکٹر واپس آتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ اس کا مکان روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ تجربہ گاہ میں کوئی گھس آیا ہے۔ زینے کے اوپر چڑھتا ہے اور اوپر کے حصے کی سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ وہاں کھانے پینے کی مختلف چیزیں دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ کسی پارٹی کا انتظام ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے چھپ جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر یہ سب کس نے کیا ہے۔ اسوقت ہم یکایک اس کے سامنے آ جاتے ہیں ـــــ کیا اس کا چہرہ دیکھ رہے ہو؟ ـــــ خدا کی قسم، ہیوئی! میں حیران ہوں کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیونکر؟"

اس غیر معمولی تعریف سے ہیوئی شرما گیا۔ اس نے دراصل کوئی نئی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کے ذہن میں سال نو کی پارٹی تھی جو لا ایڈا میں دی گئی تھی۔ اس لئے اس نے انکساری کے ساتھ کہا "بس یونہی ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ اس طرح اچھی رہے گی"

"بہرحال بہت اچھا خیال ہے۔" ہیک نے کہا: "ڈاکٹر کو جب پارٹی کی تفصیلات بتلائی جائیں گی تو اسوقت سب کو بتلاؤں گا کہ یہ خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا تھا۔"

اس کامیاب پلان کے بعد لطف اٹھانے کے لئے شراب کا دور پھر چلا۔

لی چانگ کا اسٹور اس علاقے کا بہترین اسٹور تھا۔ اس میں ضرورت کی سبھی چیزیں مل جاتی تھیں، یہاں تک کہ وہ کبھی جن کا موسم نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی شاندار پارٹی کرنی ہو تو لی چانگ کی دوکان ہی سے سامان مل سکتا ہے۔ اس لئے شام ہی سے اس کے یہاں سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ جلد ہی ایک بوری کے مینڈک ختم ہو گئے اور لی چانگ کے پیکنگ کیس میں جگہ باقی نہ رہی۔ چھ بجے تک ایک گیلن وسکی ختم ہو چکی تھی اور لی کی دوکان سے خرید کر پی جانے لگی تھی۔

"ڈاکٹر کو وائن بہت پسند ہے۔" ہیک نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اس کو وسکی سے بھی زیادہ پسند کرتا ہے۔"

ڈاکٹر کبھی تجربہ گاہ میں تالا نہیں لگاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص واقعی اندر داخل ہونا چاہے تو قفل اس کو نہیں روک سکتا۔ اس کا یہ بھی ایمان تھا کہ لوگ بنیادی طور پر ایماندار ہیں اور ان کی بھاری اکثریت چوری پسند نہیں کرتی تھی۔ وہاں سب سے قیمتی کتابیں، ریکارڈ، سرجری کے اوزار، عینک کے شیشے اور ایسی چیزیں تھیں جن پر ایک مشاق چور کبھی نگاہ ڈالنا بھی پسند نہ کرے گا۔ اس لئے چوروں، اچکوں اور ڈاکوؤں کے لئے تو یہ نظریہ ٹھیک تھا، مگر دوستوں کے لئے یہ قطعی بے اثر تھا۔ اکثر کتابیں مستعار لی جاتیں اور کبھی واپس نہ کی جاتیں۔ اس کی غیر حاضری میں لوبیا کا ٹین ہمیشہ غائب ہو جاتا اور اکثر اوقات جب وہ رات گئے واپس آتا تو اسے اپنے بستر پر کوئی مہمان سوتا ہوا ملتا۔

ہیک کے ساتھی آرائش کا سامان سامنے کے کمرہ میں جمع کر رہے تھے۔ یکایک ہیک نے انہیں روک دیا "ڈاکٹر کو سب سے زیادہ کیا چیز خوش کرے گی۔" اس نے سوال کیا۔

"پارٹی" ہیزل نے جواب دیا۔

"نہیں" ہیک نے کہا۔

"آرائش" ہیوئی نے مشورہ دیا۔

"نہیں" ہیک نے کہا "مینڈک سب سے زیادہ مسرت اسکو انہیں سے ہوگی۔ ممکن ہے اس کے آنے تک لی چانگ اپنی دوکان بند کر دے۔ ایسی صورت میں وہ کل سے قبل اپنے مینڈکوں کو نہ دیکھ سکے گا۔ لہٰذا ان کو بیچ کمرہ میں نہایت نمایاں جگہ پر رکھو اور ایک کارڈ پر لکھ کر لگا دو: "ڈاکٹر کا خیر مقدم۔""

سامان کے لئے لی کے پاس جو وفد گیا تھا، اس کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام کوششیں اس کے خدشات کو دور کرنے سے قاصر رہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ تم خود بھی پارٹی میں شریک ہو رہے ہو۔ اگر کوئی شخص تمہارے سامان کو خرد برد کرنے کی کوشش کرے گا تو تم کو معلوم ہو جائے گا۔ لی نے تحریری ضمانت لی کہ اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کے معاوضے میں مینڈک ادا کئے جائیں گے۔ بالآخر بڑی مشکلوں سے لی نیم راضی ہوا۔ اسکے بعد بڑی تیزی سے تجربہ گاہ کو سجانے کا کام شروع ہوا۔ اسوقت تک وسکی ختم ہو چکی تھی، اور لوگوں میں پارٹی کا موڈ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سے راہ گذر بھی پارٹی میں شریک ہو گئے۔ سب سے زیادہ رش شراب پر تھا۔

لی چانگ صرف تھوڑی دیر کے لئے پارٹی میں شریک ہو سکا۔ وہ معدے کا پرانا مریض تھا اس لئے جلد ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ گھر واپس آ گیا۔ گیارہ بجے گوشت اور مچھلی کے تھال نکلے گئے اور خوب لطف لے کر کھائے گئے۔ گراموفون ریکارڈ اور شریک ہونے والوں کا شور دور دور تک سنائی دیتا تھا، اس سے بیر فلیگ کے مالک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ویسٹرن بایولاجیکل (تجربہ گاہ) میں بیر فلیگ کے مقابلہ میں دوسرا ریسٹورانٹ کھول دیا گیا ہے۔ اس کی بنا پر ان میں غصے اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی، مگر اسوقت یہ غلط فہمی دور ہو گئی جب طویل خوشی اور مسرت کے بعد پھاٹک کے سامنے سخت لڑائی ہو گئی، جس میں دو کھڑکیاں بالکل ٹوٹ گئیں اور شیشے کے مرتبان چکنا چور ہو گئے۔ ہیزل باورچی خانے سے ہو کر غسلخانے جا رہا تھا۔ اسی ہڑبونگ میں اس سے فرائی پان کو ٹھوکر لگ گئی اور گرم گرم گھی اس کے اوپر آ گرا اور وہ بری طرح جل گیا۔

ڈیڑھ بجے ایک شخص شراب میں مخمور اندر داخل ہوا اور ڈاکٹر پر ایک جملہ چست کر دیا۔ اس کے دوستوں کو یہ توہین برداشت نہیں ہوئی۔ ہیک نے ایک اوزار اٹھا کر دے مارا۔ وہ مینڈکوں کے پیکنگ کیس کو گراتا توڑتا نکل بھاگا۔ ایک صاحب اسوقت ریکارڈ بدل رہے تھے، وہ ایسا بوکھلائے کہ ان کے ساتھ گراموفون کا ساؤنڈ بکس نیچے گر گیا

اور بلوری شیشہ پاش پاش ہوگیا۔ ہنگامہ فرد ہوا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور اپنے پیچھے ایک لاش چھوڑ گئے۔

صبح کی روشنی تجربہ گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کا بیچ تک ٹوٹا ہوا تھا، اس کے فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشوں کا ڈھیر تھا۔ فوٹوگراف کے کچھ ریکارڈ ٹوٹے ہوئے اور کچھ کور کے باہر بکھرے ہوئے تھے، گوشت کے قتلوں کے بچے کھچے حصے پلیٹوں میں پڑے ہوئے تھے اور جما ہوا گھی زمین پر گرا ہوا تھا، کسی کے کتابوں کی الماری پر چڑھنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے بہت سی کتابیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ فرش پر خراب و خستہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔

پیکنگ کیس کے ٹوٹے ہوئے حصے سے ایک مینڈک باہر نکل کر ٹرانے لگا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ فرحت بخش اور ٹھنڈی ہوا جو دروازے اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے آرہی تھی، محسوس کی۔ پھر ان میں سے ایک "ڈاکٹر کا خیر مقدم" پر اچک کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دونوں ڈرتے ڈرتے دروازے کے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مینڈکوں کا ایک سیلاب آگیا، جو کینبرا کی سڑکوں پر ہر طرف پھیل گیا۔ ایک ٹیکسی رات کے آخری حصے میں بیر فلیگ کے ایک گاہک کو لے کر آئی۔ اس سے کئی مینڈک کچل کر شہید ہو گئے۔ لیکن دن نکلنے سے قبل سب کے سب جا چکے تھے۔ کچھ گندے نالوں میں چلے گئے۔ کچھ نے پہاڑی پر چڑھ کر ریذروائر میں پناہ لی، کچھ زمین دوز نالیوں میں جا گھسے اور کچھ کھلے میدان کے گھاس پھونس میں چھپ رہے۔

غرض صبح کی روشنی ایک ایسی تجربہ گاہ میں پھیلی، جو اُجڑ چکا تھا، تباہ ہو چکا تھا۔

تجربہ گاہ کے عقبی کمرے میں سفید چوہے اپنے پنجروں میں دوڑ رہے تھے اور چوں چوں کر رہے تھے۔ ایک الگ پنجرے کے کونے میں ایک چوہیا اپنے انڈے بچوں کے جھنڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے انڈے اور ننھے بچے اس کا دودھ چوس رہے تھے اور چوہیا خوف سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

سانپوں کے پنجرے میں سانپ اپنے پیچ و خم پر اپنی تھوتھنیاں رکھے اپنی گرد آلود اور سیاہ آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت ایک موٹر کار کینبرا روڈ میں داخل ہوا اور ڈاکٹر اپنی تجربہ گاہ کے آگے آکر رکا۔ تھکن سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ موٹر کار کے رکنے پر بھی وہ اپنی نشست پر کچھ دیر تک بیٹھا رہا تاکہ راستے میں سڑک پر اس نے جو جھٹکے کھائے تھے ان کا اثر زائل ہو جائے۔ اس کے بعد اچھل کر وہ اپنی کار میں سے باہر نکلا۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو سانپ اپنی زبانیں باہر نکال کر آہٹ سننے لگے۔ چوہوں نے پنجروں میں دوڑ لگانی شروع کر دی۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ گیا تو اس نے جھولتے ہوئے دروازہ پر اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ اس کی تھکن جیسے کافور ہو گئی۔ وہ تیزی سے تجربہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ اس نے جھک کر گراموفون کا ایک شکستہ ریکارڈ اٹھا لیا اور تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

باورچیخانہ میں لڑھکا ہوا گھی فرش پر جم کے سفید ہو گیا تھا۔ برہمی کے عالم میں ڈاکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے عظیم گراموفون کو چابی دی اور اس پر ایک ریکارڈ رکھ دیا۔ لاؤڈ اسپیکر سے صرف ایک بھنبھناتی ہوئی آواز پیدا ہوئی اس نے اپنا بازو اٹھا کر گراموفون کے چمچے کو بند کر دیا اور دوبارہ صوفہ پر آ بیٹھا۔

سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز پیدا ہوئی اور دوسرے لمحہ دروازے میں سے میک نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ کمرے کے وسط میں گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ "ڈاکٹر"، وہ بولا "میں نے اور لڑکوں نے ....؟"

ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر اسے دیکھ نہ پایا۔ پھر وہ لپک کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میک ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کیا یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔ میں نے اور لڑکوں نے ...؟"

ڈاکٹر نے اپنی مٹھی باندھ کر میک کے منہ پر زور سے مکہ مارا۔ اسوقت ڈاکٹر کی آنکھیں ایک درندہ کی طرح شعلہ گوں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے مکے کی ضرب کڑی اور مضبوط تھی۔ میک کے ہونٹ پھٹ گئے اور اس کا سامنے کا ایک دانت پیچھے کی طرف مڑ گیا "اٹھو" ڈاکٹر

نے سخت گمبیر لہجہ میں کہا۔

میک لڑکھڑاتا ہوا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اسکے بازو اسکے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کے ایک اور مکا مارا۔ میک کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ خون اس کی ٹھوڑی تک بہہ گیا اور میک نے اپنے ہونٹوں سے خون چوسنے کی کوشش کی۔

"دیکھ کیا رہا ہے کتیا کے بچے۔۔۔ لڑتا کیوں نہیں۔" ڈاکٹر نے اس کے ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے دانت ٹوٹنے کی آواز سنی۔

میک کے سر نے صرف ایک جھٹکا سا کھایا، مگر وہ اپنی جگہ پہ جما رہا۔ اس کے دونوں بازو اس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے رہے "اور مارو ڈاکٹر" وہ بولا۔۔۔ "یہ سب میرا قصور ہے"

آخر ڈاکٹر نے ہار مان لی اور بولا "کتیا کے غلیظ بچے" اس کے بعد ڈاکٹر اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

میک ایک کرسی پر بیٹھ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ میک کی آنکھوں سے کرب و اضطراب پیدا تھا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی پہ بہتا ہوا خون بھی نہیں پونچھا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا "جاؤ اور جا کر اپنا منہ دھوؤ۔" ڈاکٹر سیڑھیوں سے اتر کر لی چانگ کی دوکان کی طرف چل پڑا۔ اس نے لی چانگ سے بیر کی دو بوتلیں طلب کیں۔ برف کے بکس میں بیر کی بوتلیں نکالتے ہوئے لی چانگ نے ڈاکٹر کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملائیں۔ ڈاکٹر سے رقم لیتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی۔ ڈاکٹر بیر کی بوتلیں لے کر سڑک پر آ گیا۔

میک غسلخانہ میں اپنا خون آلود منہ دھو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بیر کی ایک بوتل آہستہ سے کھولی اور ایک گلاس میں انڈیل دی۔ اس نے بیر سے ایک اور گلاس بھرا۔ ڈاکٹر وہ دونوں گلاس اٹھا کر اگلے کمرہ میں آ گیا۔ میک غسلخانے سے اپنا منہ پونچھتا ہوا نکلا۔ ڈاکٹر نے اپنے سر کی جنبش سے بیر کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ میک نے منہ کھولا اور بیر کا آدھا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔ اس نے سرد آہ بھری اور پھر وہ بیر کی طرف گھورنے لگا۔ ڈاکٹر اپنا گلاس ختم کر چکا تھا۔ ڈاکٹر دوسری بوتل بھی لے آیا۔ اور اس نے ایک دفعہ پھر دونوں گلاس بھر دیئے۔ ڈاکٹر صوفے پہ بیٹھ گیا اور اس نے پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

میک نے فرش کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ کر بیر میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنے ہونٹوں کا خون پونچھا اور بولا "میں اور میرے ساتھی آپ کو ایک دعوت دینا چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ کل رات گھر آ جائیں گے"

"اچھا تو یہ بات تھی"

"ڈاکٹر میں ساری عمر کف افسوس ملتا رہا ہوں میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میرے ساتھ یونہی ہوتا رہا ہے۔" میک نے بیر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "میری ایک بیوی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یونہی ہوا ہے، جو کچھ بھی کرتا اس کا الٹا نتیجہ نکلتا۔ وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ یہ اگر کوئی اچھی بات بھی کرتا تو اس میں کیڑے پڑ جاتے۔ اگر میں اسے کوئی تحفہ دیتا تو کوئی نہ کوئی غلط بات ہو جاتی ۔۔۔ وہ بیزار ہو گئی۔ جب میں نے ایک مسخرے کی حیثیت سے اداکاری شروع کی تو اس وقت یونہی ہوا ۔۔۔ تب سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ میں نے اسے بھی ترک کر دیا۔ اب میں لڑکوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہوں"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ہمہ تن گوش ہو کر میک کی باتیں سن رہا ہوں "میں جانتا ہوں" ڈاکٹر بولا۔

"آج جب تم نے مجھے پیٹا تو میں خوش تھا" میک نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا شاید اس طرح مجھے سبق مل جائے۔ شاید میں اس بات کو ساری عمر یاد رکھوں لیکن کمبخت کو کچھ بھی تو یاد نہیں رہے گا۔ میں کبھی کوئی سبق حاصل نہیں کر سکوں گا۔ کل کی بات ہی لو ۔۔۔ ہم خوش تھے کہ تمہیں پارٹی دے رہے ہیں اور پارٹی بھی کیا پارٹی تھی ۔۔۔" میک نے فرش پہ بکھری ہوئی شکستہ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن انجام نہایت برا ہوا"

ڈاکٹر نے مزید بیر گلاسوں میں انڈیل دی۔

"ڈاکٹر! میں اور میرے ساتھی سب کچھ صاف کر دیں گے اور جو چیزیں ٹوٹ گئی ہیں ہم ان کے دام بھی ادا کر دیں گے۔ ہمیں چاہے پانچ برس تک کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم ان چیزوں کے دام ادا کر کے رہیں گے"

ڈاکٹر نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی مونچھوں پر سے بیر کی جھاگ پونچھی۔

"نہیں۔ یہ چیزیں میں خود صاف کروں گا"

"ڈاکٹر ہم ان چیزوں کے دام ادا کر دیں گے۔"

"نہیں میک مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم دام ادا کرنے کی بات سوچتے رہو گے، پریشان ہوتے رہو گے اور ایک کوڑی ادا نہیں کرو گے۔ یہ شیشہ جو تم نے توڑ دیا ہے، یہ تین سو ڈالر کا تھا۔ تم اس کی قیمت نہیں ادا کر پاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں کیا کروں؟"

"میرا غصہ دور ہو چکا ہے" ڈاکٹر نے کہا "اب اس بات کو بھلا دو۔"

میک نے اپنی بیئر ختم کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا تو ڈاکٹر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ — ہاں یہ تو کہو۔ تمہاری بیوی کا کیا ہوا؟"

"میں خود نہیں جانتا" میک نے کہا "وہ چلی گئی۔"

میک سیڑھیوں پر نہایت بھدے انداز سے اترا اور فلاپ ہاؤس محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھاڑو اٹھایا اور دن بھر کوڑا صاف کرتا رہا۔

میک فلاپ ہاؤس محل میں داخل ہوا تو اس کے ہونٹ کٹے ہوئے تھے اور اس کے دانت ٹوٹ رہے تھے۔ تاسف کے طور پر اس نے اپنا منہ صاف نہ کیا۔ وہ سیدھا اپنے پلنگ کی طرف گیا۔ اپنے سر پر کمبل اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گیا اور دن بھر نہ اٹھا۔ اس کے منہ کی طرح اس کا دل بھی گھائل تھا۔ اس نے زندگی میں جتنے بُرے کام کیے تھے ان کو ایک ایک کر کے یاد کیا — وہ بہت اداس تھا۔

ہیوئی اور جونس تھوڑی دیر تک خلا میں جھانکتے رہے اور اس کے بعد وہ بھی ملول و افسردہ باہر نکل گئے اور انہوں نے ہیٹر پانڈو کنری جا کے ملازمت کی درخواست دی جو انہیں مل گئی۔

ہیزل کی طبیعت بہت ہی خراب تھی۔ وہ مونٹریری پہنچا۔ وہاں ایک فوجی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا اور جان بوجھ کر مار کھائی۔ ایسا کرنے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا۔ حالانکہ وہ ذرا سی بھی کوشش کرتا تو اس فوجی کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔

صرف کتیا ڈارلنگ ہی خوش تھی۔ وہ میک کے پلنگ کے نیچے بیٹھی ہوئی اس کے بوٹ چباتی رہی تھی۔ میک نے تنہائی سے تنگ آ کر پلنگ سے نیچے ہاتھ لٹکا کر دو مرتبہ اسے اپنے ساتھ سلانے کی کوشش کی، مگر کتیا بار بار نیچے اتر جاتی اور بوٹ کا چمڑا چبانے لگتی۔ میک اور اس کے ساتھی دل سے جانتے تھے کہ ان کا ستارہ گردش میں ہے۔ وہ سماجی طور پر اچھوت بن گئے تھے۔ ان کے نیک ارادوں کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ ان کے اس جھگڑے کے متعلق کچھ اور ہی کہانی مشہور ہو گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ انہوں نے روپیہ اور شراب چرائی۔ بُرے ارادے سے وہ تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ محض اپنی شیطنت اور کینہ زوری کی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر کے گھر کے شیشے اور کھڑکیاں توڑ دیں — "لا ایڈا" ریسٹوران کے کچھ شرابی ڈاکٹر کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر ان کو بُری طرح پیٹنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

لڑائی کے متعلق میک کی سوجھ بوجھ نے ان کو تباہی سے بچایا۔ سماج جب کسی فرد کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس پر دو طرح کے ردعمل ہوتے ہیں۔ یا تو اس کی بوکھلاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ وہ تمام دنیا سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ بُرے کام کرتا ہے۔ یا پھر اپنی اصلاح کرتا ہے۔ زیادہ پاکیزہ اور مہربان ہو جاتا ہے۔

میک اور اس کے ساتھی نیک و بد کے ترازو میں کبھی ایک طرف جھک جاتے تھے اور کبھی دوسری طرف — انہی دنوں ڈاکٹر نے ایک بات دریافت کی۔ ۴ جولائی کا دن تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ فراسٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا بیئر پی رہا تھا۔ گراموفون پر نئے ریکارڈ بج رہے تھے۔ تجربہ گاہ کے سامنے فلاپ ہاؤس محل تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا شہتیر پڑا تھا۔ میک اور اس کے ساتھی اس پر دھوپ میں بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا — "ذرا ان کی طرف دیکھو۔ میرا خیال ہے تمہارے سچے فلاسفر یہی لوگ ہیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو دنیا کی ہر ایک بات معلوم ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اس دنیا میں زیادہ اچھی طرح رہیں گے۔ جس وقت لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنے ٹکڑے اڑا رہے ہوتے ہیں یہ لوگ آرام کرتے ہیں۔ ہمارے تمام کامیاب لوگ بیمار ہیں۔ ان کے معدے خراب ہیں۔ ان کی روحیں متعفن ہیں لیکن میک اور اس کے ساتھی صحت مند اور پاکیزہ ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

رچرڈ فراسٹ نے کہا "مجھے تو وہ دوسروں کی طرح نظر آتے

ہیں۔ ان کے پاس بھی روپیہ نہیں ہے۔"

"یہ روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی زندگی تباہ کر کے روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ میک بہت ذہین ہے۔ وہ سب بہت ہوشیار ہیں۔" ڈاکٹر آہستہ آہستہ اپنے گلاس میں بیئر ڈال رہا تھا "تم چاہو تو میں ثبوت بھی مہیا کر سکتا ہوں۔ تمہیں انہیں اس طرف منہ کر کے بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہو۔ آدھے گھنٹے میں ابھی ادھر سے ایک پریڈ گذرے گی۔ پریڈ گذرتی ہے تو لوگ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات پریڈ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں تم سے دو بوتل بیئر کی شرط لگاتا ہوں یہ پریڈ کو مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔"

"اگر وہ اس پریڈ کو مڑ کر نہیں دیکھیں گے تو اس سے ثابت کیا ہوگا؟" رچرڈ فراسٹ نے پوچھا۔

"ثابت کیا ہوگا؟" ڈاکٹر نے بلند آواز سے کہا "ثابت یہ ہوگا کہ ان کو معلوم ہے کہ پریڈ میں کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ پریڈ کئی مرتبہ دیکھی ہے اور اب اسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"جو لوگ یہ پریڈ نہیں دیکھتے وہ زندہ نہیں رہتے" رچرڈ فراسٹ بولا۔

"تو پھر شرط رہی؟"

"رہی۔"

"مجھے موجودہ نظام میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے" ڈاکٹر نے کہا "مہربانی، سخاوت، فراخدلی، ایمانداری اس نظام میں ناکامی کا باعث ہوتے ہیں۔ تیز فہمی، چالاکی، لالچ، کمینگی، زنا اور خود غرضی کامیابی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اور انسان ہیں کہ اول الذکر صفات کی تعریف کرتے ہیں اور موخر الذکر کے اوصاف کے نتائج سے محبت کرتے ہیں۔"

"لوگ بھوکے رہیں تو نیک رہنے کا خیال کیسے پیدا ہوتا ہے۔" رچرڈ فراسٹ نے کہا۔

"یہ بھوک کا سوال نہیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں نے مجھے دعوت دینا چاہی، لیکن حالات بگڑ گئے۔ مگر انہوں نے مجھے دعوت دینے کی خواہش تو کی تھی۔"

اتنے میں بینڈ کی آواز سنائی دی۔ میک اور اس کے ساتھی شہتیر پر اداس بیٹھے تھے۔ بینڈ باجے کی آواز قریب آ گئی۔ پھر جلوس بھی نزدیک آ گیا۔ میک اور اس کے ساتھیوں نے اس جلوس کو اپنی گردن تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوئی، اور جلوس ان کے سامنے سے گذر گیا۔

رچرڈ فراسٹ دروازے کی طرف بڑھا اور بولا "میں شرط ہار گیا۔ میں تمہارے لئے بیئر لاتا ہوں۔ بولو کون سی بیئر لاؤں؟"

"جو پہلے آئی تھی" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر دراصل میک اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

انہی دنوں ایک لہر چلی کہ ڈورا کا قحبہ خانہ بند ہونا چاہیے۔ عورتوں نے خاص طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ ڈورا نے بیئر فلیگ ریسٹوران ایک ہفتہ کیلئے بند کر دیا۔ اس کے بعد مصائب کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ میک کی کتیا ڈارلنگ بیمار ہو گئی۔ چند روز کے بخار نے اس کو اتنا لاغر کر دیا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگی۔

ڈارلنگ فلاپ ہاؤس محل میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ فلاپ ہاؤس محل میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ آخرکار ہیزل اور جونس کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا کہ وہ ڈاکٹر سے ملیں اور اس سے کتیا کا علاج کروائیں۔

ڈاکٹر نے ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

"ڈارلنگ بیمار ہے" ان دونوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں مویشیوں کا ڈاکٹر نہیں ہوں" ڈاکٹر بولا "مجھے ان کے علاج کی کوئی خبر نہیں۔"

"کیا آپ اسے ایک نظر دیکھ نہیں سکتے؟" ہیزل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کتیا کا معائنہ کیا۔ وہ سب ڈاکٹر کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے رہے۔ ڈاکٹر نے کتیا کی زبان اور اس کے کان دیکھے اور پھر پوچھا "یہ کتیا کھانا نہیں کھاتی؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو اسے زبردستی کچھ کھلا دو۔ شوربہ، انڈے اور مچھلی کا تیل۔"

میک اور اس کے ساتھیوں نے شوربہ ابالا۔ نہایت گاڑھا اور تیز شوربہ جب انہوں نے مچھلی کا تیل پلایا۔ پھر اس کا منہ کھول کر یہ شوربہ زبردستی اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ میک ساری رات جاگتا رہا۔ صبح کو کتیا نے پانی پیا اور زمین پر لوٹنے لگی۔ میک نے زور سے چلایا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دیا۔ ان چاروں نے ان کا شور

سنا تو اسے خیال ہوا کہ وہ سب دعوت اڑا رہے ہیں۔ ۹ بجے تک ڈارلنگ نے ایک انڈا کھایا اور دودھ پیا ــــ دوپہر تک وہ بالکل تندرست ہو گئی۔

کتیا ڈارلنگ کیا ٹھیک ہوئی دوسرے حالات بھی معمول پر آ گئے۔ ڈورا کو بھی یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ اپنا ریسٹوران کھول سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ میں رات گئے تک گراموفون بجتا رہا۔ اور پھر نہ جانے لی چانگ کو کیا خیال آیا اس نے غنڈوں کے سلسلے میں میک اور اس کے ساتھیوں کا قرضہ معاف کر دیا۔ اور ان کو ربڑ کے جوتوں کا تحفہ دیا۔ ڈارلنگ کی بیماری نے ان لوگوں پر جو تباہ کن اثر کیا تھا وہ دور ہو چکا تھا۔ جس وقت لی چانگ ربڑ کے جوتے لے کر آیا اس وقت

ڈارلنگ ہیزل کے جوتے سے کھیل رہی تھی اور وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔

میک کبھی بیئر فلیگ ریسٹوران میں نہیں گیا تھا۔ ایک روز جب وہ بیئر فلیگ ریسٹوران کے دروازہ پر نمودار ہوا تو سب کو یہ خیال گذرا کہ وہ بیئر پینے آیا ہے۔ مگر وہ الفریڈ کے سامنے جا کر رکا اور اس نے پوچھا "کیا ڈورا اندر ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا چاہیے؟" الفریڈ نے پوچھا۔

"میں اس سے کچھ پوچھنے آیا ہوں"

"کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں" میک نے درشت لہجہ میں کہا۔

"بہت اچھا ــــ ٹھہرو ذرا میں پتہ کر آؤں کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے کہ نہیں"

ایک لمحے کے بعد وہ میک کو ڈورا کے کمرے میں لے گیا۔ ڈورا اپنی میز کے سامنے حساب کی کتابوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گلابی رنگ کا ایک شاندار لباس پہن رکھا تھا۔ جس وقت میک کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ریلفرڈ دروازے میں کھڑا رہا۔ جب تک ریلفرڈ دروازہ بند کر کے چلا نہیں گیا میک اسوقت تک خاموش کھڑا رہا۔ ریلفرڈ کے جانے کے بعد ڈورا نے میک کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر اس نے پوچھا "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مادام آپ شاید وہ قصہ سن چکی ہیں کہ ہم نے چند روز ہوئے ڈاکٹر کے مکان میں کیا کچھ کیا تھا"

"ہاں سنا تو ہے"

"مادام شاید آپ اعتبار نہ کریں۔ ہم ڈاکٹر کو دعوت دینا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر وقت پر گھر نہ آیا اور دعوت کو ہمارے لئے سنبھالنا مشکل ہو گیا"

"ہاں میں نے یہی سنا ہے ــــ خیر ــ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بات یہ ہے مادام ــ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ آپ سے مشورہ لیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم ڈاکٹر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں مشورہ دیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے تاکہ ہم ڈاکٹر کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے سکیں"

"اونہہ" ڈورا نے گھومنے والی کرسی میں ایک چکر کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بولی "تم نے ڈاکٹر کو ایک دعوت دینا چاہی لیکن وہ اس دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ یہی بات ہے نا؟ اب ڈاکٹر کو ایک ایسی دعوت دو جس میں وہ ضرور شریک ہو سکے"

"اوہ! میرے خدا" بعد میں میک نے لڑکوں کو بتایا "یہ کتنی سیدھی سادی بات تھی۔ بلا کی ذہین عورت ہے۔ لوگ اسے مادام کہتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ــــ خدا کی قسم کیا عورت ہے"

سارے کا سارا کینری رو یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک بھاری تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ قسمت اور شگون پر یقین نہ رکھنا ایک اچھی بات ہے۔ دراصل ان پر کوئی یقین رکھتا بھی نہیں ہے لیکن ان کے سلسلے میں لاپروائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کینری رو دوسرے مقامات کی طرح توہم پرست نہیں ہے اس کے باوجود یہاں کوئی سیڑھی کے نیچے نہیں چلتا۔ اور گھر کے اندر کوئی چھتری نہیں کھولتا۔ ڈاکٹر تو ایک خالص سائنسدان تھا۔ وہ تو توہم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی جب کبھی وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور اپنی کھڑکی کی چوکھٹ پر سفید پھول پڑے پاتا تھا تو اسے بہت برا وقت دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کینری رو کے بیشتر لوگ توہمات پر

یقین نہیں رکھتے تھے۔

البتہ میک کو ضرور اس بات کا یقین تھا کہ فلاپ ہاؤس محل پر ایک تاریک سایہ مسلط ہے۔ اس نے گذشتہ دعوت کے متعلق تمام حالات کا جائزہ لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ فلاپ ہاؤس محل کی ہر دیوار میں بدقسمتی نے ڈیرہ جما لیا ہے۔ میک کا یہ بھی خیال تھا کہ جب کوئی مصیبت آجائے تو سو جانا چاہیے تاکہ یہ مصیبت گذر جائے۔ میک کا یہ خیال ضرور تھا لیکن وہ توہم پرست نہیں تھا۔

کینری رو میں پھر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ فلاپ ہاؤس محل کی کتیا بھی اچھلنے اور کودنے لگی تھی۔ اب وہ گھر کے اندر نہیں رہتی تھی۔ باہر بھی نکل جایا کرتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈارلنگ بڑی ہو کر ایک اچھی کتیا ثابت ہو گی۔

مسرت کی لہر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ کتے زور زور سے بھونکتے۔ اسکول جاتی ہوئی لڑکیاں دفعتاً رک جاتیں اور اپنی نگاہیں اوپر اٹھا کر قہقہے سر کرتیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں میں بھی سدھار کی تبدیلی آگئی تھی۔ جونس کرسی سے اٹھ کر رقص کرنے لگتا تھا اور دوبارہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ ہیزل خواہ مخواہ مسکراتا رہتا تھا۔ ایڈی نہ جانے کس مقصد کے لئے شراب جمع کر رہا تھا۔ اب وہ شراب کے جگ میں بیئر بھی نہیں ملا رہا تھا۔ خالص وسکی جمع کر رہا تھا۔ سیم موسلے نے گھر میں کچھ پودے لگائے تھے اور وہ ان کی آبیاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی صبح سے شام تک چادر پر کشیدہ کاڑھتی رہتی تھی۔ مسرت کی لہر بیئر فلیگ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کاروبار بہت اچھا تھا۔ علیس کی ٹانگ اچھی ہو گئی تھی اور اب وہ دوبارہ اپنے کام پر جانے والی تھی۔ ایوا فلیننگن ایسٹ سینٹ لوئس سے لوٹ آئی تھی اور وہ وہاں سے واپس آکر بہت خوش تھی۔

ڈاکٹر کو جو پارٹی دی جانے والی تھی اس کی بات چل نکلی تھی۔ میک نے اپنے ساتھیوں سے کہا "پچھلی مرتبہ تو ہم نے زبردستی کی۔ پارٹی اس طرح نہیں دی جاتی۔ دعوت کو پہلے اپنے ذہن پر پوری طرح سوار کر لینا چاہیے۔"

"خیر اب دعوت کب ہو رہی ہے" جونس نے بیقرار ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس کی کوئی خبر نہیں!" میک نے جواب دیا۔

"کیوں کیا اب کے بھی اچانک کوئی دعوت دی جا رہی ہے؟"

"ہاں ہوئی تو اچانک ہی چاہیے" میک بولا۔

ڈارلنگ اسوقت ایک گیند سے کھیل رہی تھی۔

"اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر کا جنم دن کونسا ہے تو ہم اس کے جنم دن پر دعوت دیتے" ہیزل نے کہا۔

حیرت سے میک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہیزل اسے ہمیشہ حیرت میں ڈال دیا کرتا تھا "خدا کی قسم ہیزل۔ تم بات ہمیشہ پتے کی کہتے ہو۔ اب تو ہمیں کوشش کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر کا جنم دن کون سا ہے"

"یہ تو بہت ہی آسان بات ہے" ہیوئی نے کہا "ڈاکٹر سے پوچھ کیوں نہ لیا جائے؟"

"پھر تو سارا بھید کھل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاؤں اور پتہ چلانے کی کوشش کروں"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں" ہیزل بولا۔

"نہیں ——— ہم دونوں گئے تو وہ بھانپ جائے گا کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔"

"دیکھو۔ بات تو تمہیں میں نے سمجھائی ہے"

"میں جانتا ہوں" میک بولا ——— "اگر دعوت ہوئی تو میں ڈاکٹر کو بتا دوں گا کہ یہ تمہارا خیال تھا۔ لیکن اس کے پاس مجھے اس وقت تنہا ہی جانا چاہیے"

"ویسے ڈاکٹر کا حال کیا ہے۔ کیا وہ ہماری طرف دوستانہ رویہ رکھتا ہے؟" ہیزل نے پوچھا۔

"ہاں"

میک نے ڈاکٹر کو تجربہ گاہ کے عقب میں مصروف پایا۔ اس نے ربڑ کا انگرکھا پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے تھے۔ وہ ایک مچھلی کی شریانوں میں کسی رنگ دار چیز کا انجکشن لگا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے ہاتھ بڑی پھرتی سے کام کر رہے تھے ———

"ڈاکٹر۔ کیا اتنے ہی مصروف ہو؟" میک نے پوچھا۔

"ہاں ——— کہو ڈارلنگ کا کیا حال ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو وہ مر جاتی۔" ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر ٹھٹھک گیا کہ میک اس کی خوشامد کر رہا ہے۔ لیکن جلد ہی ڈاکٹر کا یہ وہم دور ہو گیا۔ ڈاکٹر خوشامد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ میک کو ایک مدت سے جانتا تھا — آج میک کے لہجہ میں تشکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ میک کو اپنی کتیا کتنی پیاری ہے۔

"کہو فلاپ ہاؤس میں وقت کیسا گذر رہا ہے؟"

"اچھا ہی گذر رہا ہے۔ ہم دو نئی کرسیاں لے آئے ہیں۔ کاش آپ کسی وقت آکر دیکھتے۔"

"میں ضرور آؤں گا — کیا ایڈی اب بھی شراب کے جگ لے آتا ہے؟"

"ہاں — اب تو وہ شراب میں بیئر بھی نہیں ملاتا۔ اب شراب کا مزہ اچھا ہو گیا ہے۔ اس کا نشہ بھی تیز ہے۔"

میک انتظار کرتا رہا کہ کوئی ایسی بات چھڑے جس سے اسکو گوہر مقصود کا سرا ہاتھ آجائے۔

"بہت دنوں سے ہیزل کو نہیں دیکھا — وہ بیمار تو نہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں —" اس کے بعد میک نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ "ہیزل اچھا ہے۔ آج کل ہیزل اور ہیوئی میں ایک ہفتہ سے جنگ ہو رہی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جھگڑا ایک ایسی بات پر ہو رہا ہے جس کے متعلق دونوں کچھ نہیں جانتے۔ میں کوئی دخل نہیں دے رہا ہوں۔ چونکہ اس بات کے متعلق مجھے بھی کچھ علم نہیں ہے۔"

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ہیزل ان دنوں قسمت کا حال بتلانے والے نقشے خرید رہا ہے اور ہیوئی کہتا ہے کہ یہ نقشے بالکل بے معنی اور بیکار ہوتے ہیں۔ ہیوئی کہتا ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آدمی کب پیدا ہوا تھا تب تک اس کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر؟"

"میں بھی ہیوئی سے متفق ہوں۔" ڈاکٹر نے سرنج میں لال دوا بھرتے ہوئے کہا۔

"کل رات تو ان میں خوب گرما گرمی ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ ۱۲ اپریل کو۔ پھر کیا تھا ہیزل وہ نقشہ خرید لایا اور مجھے میری قسمت کا حال بتلانے لگا۔ کہیں کہیں تو نقشہ میں باتیں بالکل سچی تھیں مگر زیادہ تر باتیں اچھے مستقبل سے متعلق تھیں۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے متعلق اچھی باتوں پر ایمان لے آتا ہے — اس نقشہ میں لکھا تھا۔ میں بہادر ہوں۔ چالاک ہوں۔ ہوشیار ہوں۔ ہیزل کہتا تھا کہ اس نقشہ کی میرے متعلق ہر بات سچی ہے — ڈاکٹر آپ کا جنم دن کیا ہے؟" میک نے دفعتاً سوال کیا۔

ڈاکٹر میک کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ لہٰذا میک کے اس اچانک سوال پر ڈاکٹر ذرا چونکا۔ ڈاکٹر کا جنم دن ۱۸ دسمبر کا دن تھا لیکن اس نے بتایا "۲۷ اکتوبر" اور پھر ڈاکٹر نے میک سے کہا: "ہیزل سے پوچھنا میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

"میں تو سمجھتا ہوں یہ سب بکواس ہے لیکن ہیزل بضد ہے کہ ان نقشوں کی باتیں سچی ہوتی ہیں۔ بہرحال میں ہیزل سے کہوں گا کہ وہ آپکی قسمت کا حال بتائے۔"

جب میک چلا گیا تو ڈاکٹر سوچتا رہا کہ میک نے یہ کہانی کیوں گھڑی تھی۔ میک نے جان بوجھ کر یہ باتیں چھیڑی تھیں اور ڈاکٹر کو میک کی تکنیک کا علم تھا — وہ اس کے انداز کو خوب سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر دیر تک سوچتا رہا کہ میک کا آخر مقصد کیا تھا۔ بعد میں جب یہ افواہ اڑی کہ وہ لوگ اُسے دعوت دینے والے ہیں تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔

میک اور اس کے ساتھی — ہم اوصاف اور ہم جنس — وہ فلاپ ہاؤس محل میں بیٹھے تھے لیکن وہ تالاب میں پھینکے جانے والے کنکر تھے جن سے تالاب میں لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ کینری رو ہی میں نہیں مونٹیری اور پیسیفک گرو میں بھی حرکت پیدا کر دیتے تھے۔ وہ حرکت اور پیش قدمی کے مجسم دیوتا تھے۔

"اس دفعہ ہمیں یقین کے ساتھ ڈاکٹر کو دعوت میں شامل کرنا ہے۔ ڈاکٹر نہیں آئے گا تو دعوت بھی نہیں دی جائے گی۔" میک نے کہا۔

"مگر یہ پارٹی کہاں دی جائے گی؟" جونس نے پوچھا۔

میک نے اپنی کرسی دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا "میں اس کے متعلق بہت سوچتا رہا ہوں۔ دعوت تو ہم ڈاکٹر کو یہاں بھی دے سکتے ہیں لیکن یہاں ڈاکٹر کچھ اچھا محسوس نہیں کرے گا۔ ایک بات اور ہے ڈاکٹر کو اپنی جگہ بہت پسند ہے۔ اس کے پاس وہاں باجہ بھی ہے "

اور پھر میک نے خشم آلود ہو کر کہا "مجھے خبر نہیں ہے کہ پچھلی مرتبہ کس نے ڈاکٹر کا گراموفون توڑا تھا۔ اب کے اگر کسی نے گراموفون کو چھیڑا تو میں اس کا بھرکس نکال دوں گا"

" میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر کو اس کے مکان پر پارٹی دی جائے "

ہیوئی بولا۔ لوگوں کو یہ خبر دی گئی تھی کہ ڈاکٹر کو دعوت دی جا رہی ہے مگر وہ جان چکے تھے کہ ڈاکٹر کو پارٹی دی جا رہی ہے۔ کسی کو اس پارٹی میں شریک ہونے کا بلاوا نہیں دیا گیا تھا پھر بھی ہر کوئی اس دعوت میں شریک ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

۲۷ اکتوبر کی تاریخ کے گرد سب نے ایک سرخ حلقہ بنا دیا تھا تاکہ یہ دن بھول نہ پائے —— یہ چونکہ جنم دن کی دعوت تھی اس لئے ہر کوئی تحفہ خریدنے کی فکر میں مبتلا تھا۔

ڈورا کے ریسٹوران کی لڑکیاں ڈاکٹر سے اپنی بیماریوں کے متعلق مشورہ کرنے آتیں۔ ان کی نگاہ ڈاکٹر کے پلنگ پر پڑتی۔ اس کے بستر پر گھسا ہوا کمبل۔ لومڑی کا سمور اور ریت پڑی رہتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے سفر سے لوٹتا تھا تو یہ چیزیں ساتھ لے آتا تھا۔ اس کے پاس روپیہ ہوتا تھا تو وہ اپنی تجربہ گاہ کا سامان خرید لیتا تھا۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اسے کوئی نیا کمبل خریدنا چاہیے۔ ڈورا کے ریسٹوران کی لڑکیاں ڈاکٹر کے لئے کمبل تیار کر رہی تھیں۔ اس کمبل کے کنارے ریشم کے تھے۔ یہ ریشم شام کے ملبوسات اور زیر جاموں سے حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہ کمبل مختلف رنگوں کا مرقع تھا۔

لی چانگ نے آتش بازی اور رنگین قمقمے جمع کئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان چیزوں سے دعوت کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔

سیم مورنے قدیم اشیاء کا شیدائی تھا۔ وہ ان نادر اشیاء کو دیر سے جمع کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ایک دن یہ نادر الوجود اشیاء اس کو مالا مال کر دیں گی۔ اس نے پرانی موٹروں کے پرزے بھی جمع کئے تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر کو تحفہ دینے کے لئے کئی دن تک سوچتا رہا تھا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک پرانی موٹر کا پرزہ ڈاکٹر کو بطور تحفہ دیگا۔

میک اور اس کے ساتھی بھی اس مسئلہ پر دماغ سوزی کر رہے تھے۔ آخر کار کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈاکٹر کو بلیاں حاصل کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے اس لئے کیوں نہ ڈاکٹر کو بلیوں کا تحفہ دیا جائے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا پنجرہ خریدا اور روز بروز اس پنجرے میں خونخوار بلیوں کا اضافہ ہونے لگا۔ میک کا خیال تھا کہ ۲۵ بلیاں ڈاکٹر کے لئے ایک نہایت موزوں تحفہ ہوگا —

"اب کے کوئی سجاوٹ نہیں کی جائے گی۔ سیدھی سادی پارٹی ہوگی۔ البتہ شراب کافی مقدار میں ہوگی"

اس پارٹی کی اطلاع سیلے ناس جیل میں بھی پہنچ گئی "ٹیگے" نے داروغہ سے مل کر یہ انتظام کر لیا کہ وہ اس رات کو تاریکی میں نکل جائے اور دعوت میں شرکت کے بعد دوبارہ جیل میں آ جائے گا۔ ہنری نے ڈاکٹر کے لئے ایک ریشمی گدی تیار کی تھی۔

ہنری کا دوست ایک نائی تھا جس کا نام ایرک تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فصل کی کٹائی کی مشین دینے کا فیصلہ کیا۔

دعوت کی افواہ چار سو زور و شور سے پھیل گئی۔ آمد و رفت جاری ہو گئی۔ تحائف پر بحث ہونے لگی۔ اس بات کی احتیاط رکھی گئی کہ ڈاکٹر کو کسی بات کا پتہ نہ چلنے پائے۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ ہر کوئی اس سے بات کرتے ہوئے راز داری سے کام لیتا تھا۔ بہت سے لوگ اس سے سوالات کرتے کہ وہ ۲۷ اکتوبر کو کہیں باہر تو نہیں جائے گا۔ ۲۷ اکتوبر کو اسے کوئی کام تو نہیں ہے —— ان سوالات سے ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ میک نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی قسمت کا حال ہیزل سے پوچھ کر آئے گا۔ میک نے نہ صرف اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے متعلق کوئی ذکر تک نہیں چھیڑا تھا۔

ایک دن وہ ہات وے ہاؤس میں بیئر پینے کے لئے رک گیا۔ بیئر کا اسے مزہ آیا تو وہ وہیں بیٹھ کر بیئر پینے لگا۔ دفعتاً اس نے ایک شرابی کو شراب خانہ کے مالک سے کہتے ہوئے سنا "کیا تم دعوت میں شریک ہوگے؟"

"کون سی دعوت؟" شراب خانہ کے مالک نے پوچھا۔

"تم کنری رو کے ڈاکٹر کو جانتے ہو؟"

"ہاں"

"کچھ لوگ اس کے جنم دن پر اسے دعوت دے رہے ہیں۔"

"کون دعوت دے رہا ہے؟"

"یہ دعوت سب کی طرف سے ہوگی۔"

ڈاکٹر نے اس شرابی کی طرف دیکھا۔ وہ اس شرابی کو جانتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کو اس بات پر خوشی ہوئی کہ اسے دعوت دی جارہی ہے۔ لیکن جب اسے گذشتہ دعوت کا خیال آیا تو وہ اداس ہوگیا۔

دوسرے دن ہی ڈاکٹر نے دعوت کے لئے خود بھی تیاریاں شروع کردیں۔ اس نے گراموفون کے بہترین ریکارڈ صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ جو چیزیں ٹوٹنے والی تھیں انہیں سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مہمان بھوکے ہوں گے۔ وہ شراب جلد پی جائیں گے اور پھر انہیں بھوک ستائے گی۔ لہٰذا ڈاکٹر نے منڈی میں جاکر ۱۵ پونڈ گوشت کا آرڈر دیا۔ وہ شراب بھی لایا۔ اس نے کھانے کے لئے دوسری چیزوں کا انتظام بھی کیا۔ اسے معلوم تھا کہ مہینے کی ابتداء میں اسے تکلیف ہوگی۔ بنک میں روپیہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کوئی پروا نہ کی۔

کنری رو میں دعوت کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شراب جمع کی جارہی تھی۔ تحائف کا انبار لگ رہا تھا۔ شراب خانوں میں مسلسل اسی موضوع پر گفتگو ہورہی تھی کہ دعوت کے دن کونسا لباس پہنا جائے۔ ڈورا کے یہاں جو لڑکیاں تھیں وہ شہری عورتوں کا لباس پہننے پر بضد تھیں۔ انہوں نے دعوت کے روز اپنے کام کی تقسیم کا پروگرام بھی پہلے بنالیا تھا—— وہ جو کمبل تیار کررہی تھیں وہ بھی اب مکمل ہونے والا تھا۔ میک نے جو بلیاں جمع کی تھیں وہ رات کو میاؤں میاؤں کرتی رہتیں اور ڈارلنگ کو ان سے خوف معلوم ہوتا۔

۲۷ اکتوبر کو ڈاکٹر نے جیلی فش کے آخری ڈھیر کو بوتلوں میں بھرنے کا کام ہنسی خوشی ختم کیا۔ جگ کو دھویا، زمبور کو صاف کیا اور ربڑ کے دستانوں کو نکال کر احتیاط سے رکھا اور زینے کے اوپر جاکر چوہوں کو کھلایا اور کچھ بہترین ریکارڈ اور خورد بین پچھلے کمرے میں رکھ کر تالا لگادیا۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ یہ پارٹی جہاں تک ہوسکے تکلیف دہ اور ڈل نہ ہو۔ اس لئے تیاری کے وقت تمام احتیاطیں اور پیش بندیاں کرلینا ضروری سمجھتا تھا۔

کافی کے لئے پانی چولہے پر رکھ کر اور گراموفون پر اپنی پسند کا ریکارڈ شروع کرکے غسل کرنے لگا۔ اس نے ان کاموں کی انجام دہی میں انتہائی عجلت اور پھرتی سے کام لیا۔ چنانچہ میوزک ختم ہونے سے قبل اس نے صاف ستھرے کپڑے بدل لئے اور کافی کی ایک پیالی ختم کرلی۔

اس نے کھڑکی سے میدان پر پھر محل پر نظر ڈالی، مگر کوئی شخص آتا ہوا نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر کو معلوم نہیں تھا کہ کون لوگ اور کتنی تعداد میں اس پارٹی میں شریک ہورہے ہیں۔ دن بھر وہ پارٹی ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے سوچا کہ روزمرہ کے کام کرنے چاہئیں۔

وہ سیدھا لی چانگ کی دوکان پر گیا اور بیئر کے دو کوارٹ خریدے۔ وہاں اس نے دبا ہوا جوش محسوس کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لوگ بھی آرہے ہیں۔ ڈاکٹر تجربہ گاہ واپس آیا۔ اسے سخت پیاس لگی تھی اس لئے بیئر کا ایک گلاس تو اسی وقت پی گیا، البتہ دوسرا گلاس مزے لیکر دیر تک پیتا رہا۔ میدان اور گلی اب بھی لوگوں کی آمد و رفت سے خالی تھے۔

میک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں تھے اور اس کا دروازہ بند تھا، دوپہر کے بعد سے اسٹوو برابر جلتا رہا اور نہانے کے لئے پانی گرم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈارلنگ نے بھی غسل کیا اور اپنے گلے میں سرخ رنگ کا نیا فیتہ پہن کر پارٹی کے لئے تیار ہوگئی۔

"ہمیں کس وقت وہاں پہنچنا چاہئے؟" ہیزل نے سوال کیا۔

"میرے خیال میں آٹھ بجے سے پہلے نہیں" میک نے جواب دیا۔ کیوں نہ جب تک اپنے کو گرم کرلیں۔"

"ڈاکٹر اپنے کو کیسے گرم رکھے گا" ہیوئی نے سوال کیا "کیوں نہ اس کے لئے بھی ایک بوتل خرید لیں۔"

"نہیں" میک نے کہا "ڈاکٹر ابھی ابھی لی کے یہاں سے بیئر لے گیا ہے۔"

"کیا اس کو کسی قسم کا شبہ ہے؟" جونس نے سوال کیا۔

"اسے کیونکر ہوگا؟" میک نے سوال کیا۔

کونے کے کٹہرے میں دو بجے لڑھکے اور ان کی غراہٹ سے پورا کٹہرہ گونج اٹھا۔ وہاں کوئی اکیس بلیاں تھیں۔

" آخر یہ بلیاں وہاں جائیں گی کیسے ؟" ہیزل نے سوچتے ہوئے کہا ۔" اتنا بڑا کنستر دروازے سے لے جانا تو ناممکن ہے ۔"

" ہم ایسا نہیں کریں گے ۔" میک نے اطمینان دلایا ۔ " یاد کرو مینڈکوں کے لئے ہم نے کیا ترکیب کی تھی ۔ اسوقت ہم ڈاکٹر کو ان کے بارے میں صرف اطلاع کریں گے اس کے بعد پھر لے جائیں گے ۔" میک نے اٹھ کر ایڈی کا ایک جگ کھول کر شراب لی ۔ " ذرا گرمی پیدا کرلیں ۔" اس نے کہا ۔

بیئر فلیگ کی لڑکیاں تیاری اور بناؤ سنگار میں مشغول تھیں ۔ ڈورا کا نکھار دیکھنے کے قابل تھا ـــــ بالوں کو از سر نو نارنجی رنگ سے رنگا گیا ۔ بالوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ گھونگر پیدا کئے گئے ۔ شادی کی انگوٹھی پہن گئی اور سینے کو الماس کے بروچ سے زینت دی گئی ـــــ دوسری لڑکیاں بھی ، جن کو پارٹی میں جانا تھا ، تیار ہو چکی تھیں اور وقت کا انتظار کر رہی تھیں ۔ چوکیدار منہ لٹکائے بڑبڑا رہا تھا ۔ اس لئے کہ اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ پارٹی میں نہ جا سکے گا ، اسے مکان کی دیکھ بھال کرنی ہے ۔

ڈورا نے بڑے آئینے میں اپنے سنگار کا دوبارہ جائزہ لیا اور بالوں کو دوبارہ درست کر کے بار میں آئی ۔ الفریڈ چوکیدار اداس اور آزردہ تھا ۔ ڈورا نے بے پروائی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی ۔ " کیا کچھ گڑبڑ کا خطرہ ہے ؟"

" نہیں ۔" الفریڈ نے جواب دیا ۔" نہیں ، سب ٹھیک ہے ۔"

ڈورا نے اس کے جملے کو دہرایا ۔" سب ٹھیک ہے ۔ واقعی ؟ ـــ دیکھو مسٹر ! تمہارے سپرد ایک کام کیا گیا ہے ۔ تم اس کو کرنا چاہتے ہو یا نہیں ؟"

" بالکل ٹھیک ہے ۔" الفریڈ نے روکھے پن سے جواب دیا ۔ بار پر کہنی ٹیک کر اس نے دیوار کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا ۔" تم جاؤ اور لطف اٹھاؤ ۔" اس نے کہا ۔" میں یہاں ہر چیز کا خیال رکھوں گا ۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔"

ڈورا کا مزاج نرم پڑ گیا ۔" دیکھو ۔" اس نے کہا ۔" ایک مرد کا یہاں ہر وقت ہونا بہت ضروری ہے ۔ کوئی شرابی کسی وقت بھی گڑبڑ کر سکتا ہے ۔ لڑکیاں اس پر نہیں قابو حاصل کر سکتیں ۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد تم وہاں آ سکتے ہو اور کھڑکیوں سے تم اس جگہ پر بھی نگاہ رکھ سکتے ہو ۔ سمجھو یہ کیسا رہے گا ؟ اگر کوئی بات ہوئی تو تم وہاں سے دیکھ سکو گے ۔"

" بہت اچھا !" الفریڈ نے جواب دیا ۔" میں وہاں آنا چاہتا ہوں ۔" اس کی آواز سے وہ نرم پڑ گیا ۔" بس دو ایک منٹ کے لئے بعد میں آ جاؤں گا ۔ گذشتہ رات لوگوں نے شراب پی کر بڑی رذیل حرکتیں کیں ۔ ڈورا ! مجھے اب اپنے پر پہلے جیسا بھروسہ نہیں رہا ۔ اس دن جب ایک شخص کو زبردستی نکالنا پڑا اسی وقت سے میرے اعصاب بہت کمزور پڑ گئے ہیں ۔"

" تم کو آرام کی ضرورت ہے ۔" ڈورا نے کہا ۔" مجھے امید ہے کہ میں میک کو تمہاری جگہ کام کرنے پر راضی کر لوں گی ۔ اسوقت تم چند ہفتے کی چھٹی پر جا سکتے ہو ۔"

تجربہ گاہ میں ڈاکٹر نے بیئر کے بعد تھوڑی سی وسکی لی ، جس سے سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ یہ خیال دل میں چٹکیاں لے رہا تھا کہ اس کو پارٹی دی جا رہی ہے ۔ اس نے اپنا پسندیدہ ریکارڈ بجایا ، جس سے جذبات اور ابھر آئے اور طبیعت کچھ غمزدہ سی ہو گئی ۔ طبیعت کو بہلانے کے لئے اس نے ایک کتاب اٹھائی ، اس کے ایک باب پڑھنے لگا جس نے اس کے ذہن کو ایک اور جگہ پہنچا دیا ۔ اس کو پڑھنے کے بعد وسکی کا ایک اور گلاس لیا ۔ اس کو لا ایڈا کی کنیس کی بتی جھلملاتی ہوئی دکھائی دی اور پھر بیئر فلیگ کے سامنے سڑک پر بتیاں روشن ہو گئیں ۔

فلاپ ہاؤس محل کے مکین بڑی بے چینی سے کلاک کی طرف بار بار دیکھتے تھے ۔

کینری رو کے ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ اس پارٹی میں حسب معمول بڑا شور اور ہنگامہ ہوگا ، مگر ان کی توقع اور امید کے خلاف اس کی شروعات اس طرح کی نہیں ہوئی ۔ ٹھیک آٹھ بجے میک اور اس کے ساتھی اپنے تحفوں سمیت ویسٹرن بایولاجیکل پہنچے ۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا اور میک نے ایک مختصر سی تقریر کی ـــ " آج تمہارا یوم پیدائش ہے ۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ آج کے مبارک موقع پر تحفہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے ہم نے اکیس بلیاں حاصل کی ہیں ۔" وہ رک گیا ۔ اس کے ساتھی

خاموشی سے سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔

"اندر آؤ —" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیوں — مجھے — مجھے تعجب ہے — مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ آج میرا یوم پیدائش ہے۔"

"سب جانتے ہیں۔" ہیزل نے کہا۔ "ہم ان کو ساتھ نہیں لائے ہیں۔"

وہ سب کے ساتھ قاعدے کے مطابق کمرہ میں بائیں طرف بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ "اچھا،" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیوں نہ تھوڑی دیر شراب سے لطف اٹھایا جائے۔"

میک نے کہا — "ہم تھوڑی سی "اسٹورٹ" اپنے ساتھ لائے ہیں۔" اور اس نے تینوں جگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ایڈی بہت دنوں سے جمع کر رہا تھا۔"

ڈاکٹر نے اپنی شام کی خاموشی اور مزاحمت پر پردہ ڈالا —۔

"نہیں۔" اس نے انکار کیا۔ "تم لوگوں کو میرے ساتھ پینی ہوگی — اتفاق سے میرے پاس کچھ وسکی ہے۔"

یہ لوگ وسکی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ڈورا اور دوسری لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے گدا پیش کیا۔ ڈاکٹر نے چارپائی پر بچھایا تو بہت خوبصورت تھا۔ انہوں نے بھی شراب میں ساتھ دیا۔

اس کے بعد لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ ہنری نے پیشکش پیش کیا۔ کوئی تین فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا۔ وہ اپنے آرٹ کے بارے میں تقریر کرنے جا رہا تھا کہ اس درمیان میں باقاعدگی اور ترتیب جاتی رہی۔ مسٹر اور مسز تھے داخل ہوئے۔ لی چانگ نے بھی چند عمدہ چیزیں پیش کیں۔ لا ایڈا کے کچھ ایسے لوگ بھی پارٹی میں شریک ہو گئے، جو نسبتاً اجنبی تھے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا، پارٹی کا ضابطہ تیزی سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈورا اس پارٹی میں سب سے شاندار لگتی تھی۔ وہ ایک خاص انداز میں اپنی خوبصورت انگلیوں سے وسکی کا گلاس پکڑے ہوئے تھی اور کن انکھیوں سے وہ لڑکیوں کی بھی نگرانی کرتی رہتی۔ ڈاکٹر نے رقص کے میوزک کا ریکارڈ فونوگراف پر رکھ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور گوشت کے قتلے تلنے لگا۔

پہلی لڑائی کچھ زیادہ بری نہیں تھی۔ لا ایڈا کے ایک منچلے نوجوان نے ڈورا کی لڑکیوں سے نامناسب خواہش ظاہر کی۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے بغیر کسی چیز کو نقصان پہنچائے اس کو معقول سزا دیدی۔

ڈاکٹر باورچی خانے میں تین پتیلیوں میں گوشت کے قتلے تل رہا تھا اور ٹماٹر کاٹ کر ساس پر رکھتا جا رہا تھا۔ میک نے فونوگراف کا چارج خود اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رقص شروع ہو چکا تھا اور لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ایڈی نے ٹاپ ڈانس پیش کیا۔ ڈاکٹر نے جب گوشت کے قتلے پیش کئے تو سب کو تعجب ہوا۔ کھانے کی گرانی نے سرور میں کمی پیدا کر دی — وسکی ختم ہو گئی تو ڈاکٹر کئی گیلن وائن نکال لایا۔

ڈورا نے ڈاکٹر سے اپنے ایک پسندیدہ میوزک کی فرمائش کی۔

ڈاکٹر نے فوراً تعمیل کی۔ تمام مہمان خاموش ہو گئے، اور پوری محفل پر مکمل سکوت چھا گیا۔ دو نئے اشخاص سیڑھیوں پر ظاہر ہوئے اور چپکے سے محفل میں شریک ہو گئے۔ میوزک ختم ہوا، تو ہر شخص خاموش اور متاثر تھا۔ ڈاکٹر ایک کتاب اٹھا لایا اور صاف اور پر اثر آواز میں پڑھنا شروع کیا:

آج بھی
اگر اپنی روح کی گہرائیوں میں مجھے وہ حسینہ نظر آ جاتی ہے۔
اس کا سنہرا رنگ اسی طرح برقرار اور اس کا چہرہ ستارہ جلئے شب کے مانند
برگشتہ، اس کا تن نازنین محبت کے شعلوں کا گہوارہ۔
اور خنجر عشق سے زخمی
اس کی نوخیز جوانی میری پہلی محبوب
تو میرا دل برف کی سیلوں میں زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

آج بھی
اگر میری محبوبہ اپنی کنول جیسی آنکھوں سمیت آ جائے۔
وہ آنکھیں جو جوانی کی محبت کے شیریں بوجھ سے تھکی تھکی ہیں۔
تو میری آغوش بیتاب ایک بار پھر اسے اپنے میں سمو لے۔
اور اس کے دہن شیریں سے میں ایک بار پھر بادہ کشی کروں۔
پُرسکون شور میں جیسے عکس آوارہ
دہن شہد و شکر جو گل نیلوفر کی

آج بھی

اگر میں اسے اس طرح دراز دیکھوں کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں
اور کاجل نے بہہ کر اس کے خطِ رخسار کو
اس کے چمکدار کان اور زردیِ رخسار تک پہنچا دیا ہو
مرے فراق میں بے تاب و بے قرار ہو وہ
تو میری محبت اس کے لئے کمندِ گل بن جائے اور شب
دن کے سینہ پہ ہو پھیلائے ہوئے زلفِ سیاہ

آج بھی

میری آنکھیں کہ ہیں دیدار سے یکسر مایوس
اس کی صورت کی بناتی ہیں حسیں تصویریں
اُف وہ آویزے وہ رخسار سے مَس پیہم
ہائے وہ مصحفِ رخسار کہ جس پر میں نے
لب پژمردہ سے لکھی ہے بوسوں کی
وہ غزل بن گئی جو آخری تخلیق مری

آج بھی

یاد آتے ہیں تری چشمِ غزالیں کے پپوٹے بوجھل
اور ترحم کا طلب گار وہ ترا تبسم نزار
تعقبِ وصل کا انجام مسرت کا شکار
مری دنیائے سکوں تیری جوانی کا ابھار
اور میرے دردِ محبت کے لئے وجہِ قرار
ترے یاقوت کے ترشے ہوئے ہونٹوں کا نکھار

آج بھی

سرمگیں چشم کا وہ ریشمی آغوش مجھے یاد ہے دوست
مسکراتی ہوئی غمگیں وہ پلکیں تیری
بند ہوتی تھیں تو انداز عجب ہوتا تھا
یہ بھی جیسے کوئی اندازِ نظر ہو تیرا
وہ لبِ تازہ ترے جیسے معطر کلیاں
دو دو پیچیاں کی طرح گیسوئے شب رنگ کا خم
اور وہ انگلیاں وہ گوہرِ دنداں کی ہنسی

آج بھی

ہے مجھے یاد ترا ہائے وہ خاموش جواب
تذکرہ روح کی وحدت کا باندازِ حسیں
ہم نشیں یاد ہے لب مثلِ خطِ ساغر سے
چاندنی رات میں "راتی" کی پجارن کی محبت سے فزوں
جس کا انجام ہے قندیلِ طلائی کی ضیا
اور کسی محل کے قالین پہ خوابِ شیریں

ڈاکٹر یہاں تک پڑھنے کے بعد رکا تو مجمع کے تاثر کا عجب عالم تھا۔ بچے لیس بری طرح رو رہی تھی اور ڈورا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ہیزل الفاظ کی آواز ہی میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اس کو معانی پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بہرحال ہر شخص نظم سے متاثر تھا اور اپنی گزشتہ محبت کو یاد کر رہا تھا۔

میک نے تبصرہ کیا "بہت خوب۔ اس نے ایک محبوبہ کی یاد تازہ کر دی۔" انہوں نے اپنے گلاسوں میں وائن انڈیلی اور سب خاموش ہو گئے۔ محفل آہستہ آہستہ برخواست ہو رہی تھی۔ لوگ غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے۔ ایڈی نے ٹاپ ڈانس پیش کیا اور واپس آکر بیٹھ رہا۔ مجمع اٹھنے والا ہی تھا کہ سیڑھیوں پہ قدم کی آواز سنائی دی اور ایک گرجدار آواز سنائی دی "لڑکیاں کہاں ہیں؟"

میک ہنستا ہوا اٹھا اور بڑھ کر دروازے پر پہنچا۔ جونس اور ہیوئی کے چہرے پر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی "کن لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو" میک نے نرمی سے دریافت کیا۔

"کیا یہ قحبہ خانہ نہیں ہے؟" کوچوان نے معلوم کیا۔

"تم غلط سمجھے، مسٹر!" میک کے لہجے میں خوشی تھی۔

"اور یہ عورتیں یہاں کیوں ہیں؟"

اس کے بعد لڑائی شروع ہو گئی اور لوگ گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑائی بہت زبردست تھی۔ بالآخر نئے آنے والے پسپا ہونے لگے پہلے انہوں نے کتابوں کی آڑ لی مگر وہاں بھی زیادہ دیر تک جم نہ سکے۔ سامنے کی دونوں کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ اچانک الفریڈ نے، جس کو ہنگامے

کی اطلاع مل گئی تھی، پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اب لڑائی مکان سے نکل کر سڑک پر آپہنچ گئی اور پھر کھلے میدان میں۔ تجربہ گاہ کا دروازہ ٹوٹ کر اس بار بھی قلابے پر لٹکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی قمیض پھٹ گئی تھی اور کندھے پر زخم آجانے سے خون بہہ رہا تھا۔ دشمن نصف میدان تک پسپا کئے جا چکے تھے کہ سائرن سنائی دیا۔ پارٹی کے منتظمین کو بمشکل اتنا وقت ملا کہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے وہ تجربہ گاہ میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر سکیں اور روشنی بجھا سکیں۔ سپاہی ناکام واپس گئے۔ مگر پارٹی کے لوگ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے اور وائن پی رہے تھے۔ اس کے بعد بیر فلیگ کی

باری آئی۔ ایک تازہ دم جماعت نے اپنی پوری قوت سے حملہ کیا۔ پارٹی کے لوگوں کو ان کی امداد کے لئے جانا پڑا۔ سپاہی واپس آئے۔ اندر دیکھا، اپنی زبانوں سے تخ کی آواز پیدا کی اور اس میں شریک ہو گئے۔ میک اور اس کے ساتھی اسکوئڈ کار پر بیٹھ کر مسّی بروشیا کی دوکان پہ گئے اور مزید وائن خرید کر لائے۔ خود مسّی بھی ان کے ساتھ واپس آیا۔ پارٹی کا شور کینری رو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دیتا تھا۔ سان پیڈرو کشتی کے ملاح بھی پارٹی میں شریک ہوئے جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک خاتون نے شور و ہنگامہ سے تنگ آکر کوتوالی کو فون کیا، مگر وہاں کوئی نہیں ملا۔ خود پولیس کو رپٹ لکھانی پڑی کہ اس کی کار چوری ہو گئی، جو بعد میں ساحل پر ملی۔ ڈاکٹر ٹانگ پر ٹانگ رکھے میز پر بیٹھا ہوا تھا اور خوشی سے اپنے گھٹنے پر انگلیاں تھپتھپا رہا تھا۔ میک اور فیلس نے زمین پر ہندوستانی کشتی لڑ رہے تھے اور خلیج کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھی۔ اس وقت کسی شخص نے گودے کی ۲۵ فٹ لمبی ڈوری میں آگ لگا دی۔

ڈاکٹر بڑی سستی اور بے ڈھنگے پن سے، جس طرح ایک موٹا آدمی تیرنے کے حوض سے نکلتا ہے، اپنے بستر سے نکلا۔ اس نے پہلے ایک آنکھ کھولی۔ کمرے کا بہترین رنگ دیکھ کر پھر بند کر لی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اس نے آنکھ کھولی۔ اس کی آنکھ گدے سے گزر کر فرش پر پڑی۔ کونے میں پلیٹیں ٹوٹی ہوئی تھیں، میز پر زمین پہ لاشی ہوئی تھیں، وائن اور کتابیں زمین پر بکھری پڑی تھیں، باورچی خانے کے دروازے سے گوشت کی پلیٹوں کے انبار اور قمچی میں لت پت پتیلیاں نظر آرہی تھیں۔ سگریٹ کے سیکڑوں ٹکڑے فرش پر مسلے ہوئے پڑے تھے۔ اس کی نگاہ ایک لمحہ کے لئے بیر پیوں پر اکی، جو فرش کے بیچ میں کافی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور ایک کہنی پر ٹیک دے کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کینری رو میں ہر طرف خاموشی تھی اور دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ فلاپ ہاؤس محل کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، کھلے میدان میں ایک شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ بیر فلیگ کا دروازہ بند تھا۔

ڈاکٹر اٹھا، باورچی خانہ میں جا کر گیس کے ہیٹر کو جلایا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ پہاڑی کے اوپر سے چرچ کے گھنٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پانی پکنے لگا، تو اس نے غسل کیا اور نیلی پتلون اور فلالین کی قمیض پہنی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ کھولا تو لی چانگ تھا۔ رفریجریٹر سے بیئر لایا اور بغیر طلب کے اس کو پیش کی۔

"اچھا وقت؟" لی نے سوال کیا۔ اس کی بھوری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اچھا وقت" ڈاکٹر نے جواب دیا اور وہ اپنی ٹھنڈی بیئر لے کر تجربہ گاہ میں چلا گیا اور بیئر کے ساتھ کھانے کے لئے کچھ سینڈوچ تیار کئے۔ اس وقت گلی میں مکمل سکوت تھا۔ سینڈوچ اور بیئر سے فارغ ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور ناند میں گندی پلیٹیں نکالیں اور ان میں گرم پانی ڈال کر صابن کا پاؤڈر ملا دیا۔ تاکہ ان کی چکنائی آسانی سے صاف ہو جائے۔ اس کے بعد جو گلاس ٹوٹنے سے بچ رہے تھے، ان کو جمع کیا اور صابن کے گرم پانی میں ان کو بھی ڈال دیا۔ چولہے پر گوشت کی پلیٹوں کے ڈھیر تھے۔ یہ سب چکنائی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک میز کا کچھ حصہ صاف کیا اور گلاس دھو کر وہاں رکھ گیا۔ اس کے بعد پچھلے کمرے کا تالا کھول کر اپنا ایک پسندیدہ ریکارڈ نکال لایا اور اس کو گراموفون پر لگا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ گلاس بھی دھوتا رہا، مگر بڑی احتیاط کے ساتھ تاکہ میوزک میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ ریکارڈ ختم ہوا تو ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ پونچھے اور



سید شہیر الدین اشرفی
(ناظم شاہراہ)



محمد اسمٰعیل
(ٹائٹل آرٹسٹ)

اس کو نکال کر رکھ دیا۔ اس کی نگاہ ایک کتاب پر پڑی، جو نصف اس کے بستر کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کو اٹھا لیا اور بستر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دل ہی دل میں پڑھتا رہا مگر رفتہ رفتہ اس کے لب ہلنے لگے اور پھر اس کے بعد وہ زور زور سے پڑھنے لگا۔

آہ بھی

جب عُلما ئے عصر محلوں سے لوٹتے اور وہاں کی باتیں کرتے تو
میں غور سے سنتا
وہ محل جہاں انہوں نے اپنی جوانیاں مسلسل تفکر میں ختم کر دیں
میں یہ سب کچھ سنتا ہوں، لیکن اگر نہیں سنتا تو اپنی محبوبہ کی سرگوشی کو
ہماری وہ مبہم گفتگو جب ہم پر نیند طاری ہو رہی تھی
وہ اس کے عقل و تدبر سے بھرپور مختصر الفاظ
پانی کی طرح بے پروا اور شیرینی کی طرح پُر اشتیاق

آج بھی

مجھے یاد ہے کہ گلاب کے پھولوں اور سرو کے درختوں سے
مجھے کتنا پیار تھا
مجھے کتنا پیار تھا عظیم نیلے پہاڑوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری
پہاڑیوں سے
سمندر کے شور پیہم سے اور بارہا
خلا میں نظر آنے والے عجیب آنکھوں اور تتلی کے جیسے
بازوؤں سے

کس طرح میری قدیم قاطر صبح کو پرندے معروف پرواز ہوتے تھے
اور ننھے چھوٹے چھوٹے چشموں میں غسل کرتے تھے

ڈاکٹر نے کتاب بند کر دی۔ پلیٹوں کے ڈھیر میں جو موجیں اٹھ رہی تھیں وہ اسے صاف سنائی دے رہی تھیں، اسی طرح جالی کے اندر چوہوں کی بھاگ دوڑ کی آواز بھی اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں گیا تو نادمیں پانی ٹھنڈا ہو گیا تھا، اس میں اور گرم پانی ملایا۔ اس نے بلند آواز میں نائندے گفتگو کی، چوہوں سے باتیں کیں اور اپنے سے خطاب کیا۔

آہ بھی

جب کہ میں شریعت زندگی کو اچھی طرح چکھ چکا ہوں
بزم جہاں میں زمرد کے ساغر کبھی اٹھا چکا اور سونے کے ڈھیر بھی

ایک اور صرف ایک ہی لمحہ کے لئے
اپنی محبوبہ کے طفیل میں میں نے آنکھیں بھر کے دیکھا ہے
اس بالا نور کو جس میں ابدیت کی جھلکیاں تھیں
اس نے اپنے ہاتھ کی پیشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

سفید چوہے جالی کے کٹہرے میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور نکلنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ جپی سانپ گلاس کے پیچھے اب بھی بیٹھا ہوا تھا اور اپنی گرد آلود اور خشمگیں آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔

دیگر اداروں کی کتب

ادب:-

تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	۱۰/۰
تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسن	۴/۰
اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	۲/۸
آب حیات	محمد حسین آزاد	۶/۸
اردو ہندی ہندوستانی	سجاد ظہیر	۰/۱۲/۰
مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	۴/۰
تاریخ ریختی	دیوان جان صاحب	۳/۰
سنہ ۵۴ء کا بہترین ادب	مکتبہ شاہراہ	۵/۸
سنہ ۵۵ء ،، ،،	،،	۵/۸
منتخب ادب	احتشام حسین	۶/۰
تاریخ ادبیات ایران	مترجمہ مبارز الدین احمد	۱۲/۰
روسی ادب مکمل	پروفیسر محمد مجیب	۸/۰
ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین	۲/۸
ادب اور سماج	احتشام حسین	۲/۱۲
نیرنگ خیال مکمل	محمد حسین آزاد	۱/۸
ایک مشرقی کتب خانہ	مبارز الدین	۳/۰
احوال غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	۹/۰
نقد غالب	،،	۱۰/۰
میر تقی میر	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۲/۰
مطالعہ حالی	شجاعت علی سندیلوی	۲/۸
مطالعہ شبلی	،،	۳/۸
[illegible]	آل احمد سرور	۳/۸
ادب کیا ہے	ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی	۲/۰
اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر عزیز	۵/۸
بیان غالب	باقر	۵/۰
دو نایاب زمانہ بیاضیں	ہندوستانی اکیڈمی	۲/۴
فلسفۂ کلام غالب	شوکت سبزواری	۳/۴
ہمعصر شعراء کے خطوط	ضیاء الاسلام	۴/۸
انشائے داغ	سید علی حسن	۱/۸
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	عبداللطیف اعظمی	۳/۰
جنوبی ہند میں دو ہفتے	جگن ناتھ آزاد	۱/۰
آرائش محفل	نولکشور پریس	۷/۸
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۷/۴
الف لیلیٰ مکمل	نولکشور پریس	۵/۰
داستان امیر حمزہ	،،	۸/۰
سیر کہسار (مکمل دو حصے)	رتن ناتھ سرشار	۱۰/۰
اردوئے قدیم	شمس اللہ قادری	۲/۸
انوار سہیلی		۱/۰
گل بکاؤلی		۰/۱۱/۰
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۸
امیر خسرو	ڈاکٹر وحید مرزا	۵/۰
کبیر صاحب	منوہر لال زتشی	۳/۰
اقبال کامل	عبدالسلام ندوی	۶/۸
بزم تیموریہ	سید صباح الدین	۷/۰
بزم مملوکیہ	،،	۵/۸
چند دکنی پہیلیاں	محمد نعیم الرحمٰن	۱/۸
ایک نادر روزنامچہ	نور الحق ہاشمی	۲/۸
اکبر میری نظر میں	مولانا عبدالماجد دریابادی	۳/۰
فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۲/۸
ادبی خطوط غالب	مرزا عسکری	۳/۸
معرکۂ چکبست	نولکشور پریس	۳/۰
ذوق ادب و شعور	احتشام حسین	۳/۰
سنہرے چراغ	احتشام حسین	۵/۰
ہماری قومی زبان	سر تیج بہادر سپرو	۰/۸/۰
ادب الجاہلی	رضا انصاری	۴/۰
حکایات سعدی مکمل	مرزا نظام شاہ	۲/۰
حکایات آفاقی	رئیس احمد جعفری	۴/۰
جامع الحکایات مکمل	اختر شیرانی	۵/۰
اخوان الصفا	مولوی اکرم علی	۰/۸/۰
طربیہ خداوندی		۳/۰
آرائش محفل	شیر علی افسوس	۲/۸
کلاسیکی ادب	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲/۸
اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالعلیم	۰/۸/۰
آثار ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار	۴/۰
یادگار غالب	مولانا حالی	۲/۰
اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۰/۰
شعر الہند مکمل	علامہ شبلی	۱۲/۸
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	۳/۰
طرۂ امیر	،،	۱/۰
عود ہندی	غالب	۱/۸
ہماری شاعری	مسعود حسین رضوی	۳/۰
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	،،	۳/۰
مکاتیب شبلی مکمل	مولانا شبلی	۲/۴
زبان داغ	رفیق مارہروی	۲/۸
ادب کا مقصد	ڈاکٹر محمد احسن ہاشمی	۲/۸
ذکر حافظ	سجاد ظہیر	۲/۴
بزم بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲/۸
ترکی زبان پر فارسی کا اثر	ڈاکٹر عبدالحق	۱/۰

بال و پر　کنہیا لال کپور　۲/۸

پردیسی کے خطا　مجنوں گورکھپوری　۳/۸

اُردو ادب کے چاند تارے　امیر الحسن نورانی　۳/۸

زبانِ داغ　سید رفیق مارہروی　۳/۸

بزمِ داغ　۳/۴

آبِ حیات کے لطیفے　محمد حسین آزاد　۱/۸

اُردو کی کہانی　سید احتشام حسین　۱/۴

ساحل اور سمندر　"　۴/۸

ناول کیا ہے　ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی　۲/۴

مختصر تاریخ ادب اُردو　ڈاکٹر اعجاز حسین　۵/۸

اصول انشو　مہاتما گاندھی کے ادبی کارنامے　۲/۸

مشاہرہ عالم ارواح　سید مرتضیٰ حسین　۴/-

میری اصلاحیں　ابرار حسین گنوری　۳/-

مطالعۂ غالب　اثر لکھنوی　۱/۸

تحقیقی مطالعے　ڈاکٹر نذیر احمد　۲/-

نقد الادب　حامد اللہ افسر　۲/۸

اُردو (مضمون نگاری) ڈاکٹر ظہیر الدین　۲/۸

اُردو زبان کا ارتقاء　ڈاکٹر شوکت سبزواری　۶/۸

میعار البلاغت　۱/-

بحر الفصاحت　نجم الغنی　۱۶/-

اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست　نصیر الدین ہاشمی　۱۲/-

تنقید

تنقیدات عبد الحق　مولانا عبد الحق　۲/۴

شعر العجم مکمل ۵ حصے　علامہ شبلی　۱۶/۸

محاسن کلام غالب　ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری　۱/۴

تحقیقات　ڈاکٹر عندلیب شادانی　۵/۸

تنقید کیا ہے　آل احمد سرور　۳/-

تنقیدی اشارے　"　۳/-

اُردو میں تنقید　ڈاکٹر احسن فاروقی　۲/۴

قدر و نظر　پروفیسر اختر اورینوی　۳/-

تنقیدی اصول اور نظریئے　حامد اللہ افسر　۲/۸

حسرت موہانی　پروفیسر عبد الشکور　۳/-

تنقیدی سرمایہ　"　۳/-

فانی　"　۳/-

روحِ اقبال　ڈاکٹر یوسف حسین　۶/-

مراثیِ مکمل دو حصے　اثر لکھنوی　۹/-

نکات الشعراء　میر تقی میر　۱/۱۲

نقد حیات　ممتاز حسین　۳/-

انیس کی مرثیہ نگاری　اثر لکھنوی　۲/-

جہانِ بینہ　"　۳/۸

اثر کے تنقیدی مضامین　"　۳/۸

اقبال کی شاعری　عبد المالک آروی　۵/۸

نصرتی　ڈاکٹر عبد الحق　۳/-

تحقیقی مقالے　پروفیسر معین الدین　۲/۴

سخنہائے گفتنی　کلیم الدین احمد　۲/-

نقوش و افکار　مجنوں گورکھپوری　۳/-

ادبی تنقید　ڈاکٹر محمد حسن　۳/۸

چند تنقیدات　عبد الحق　-/۸/-

فن شاعری　عزیز احمد　۱/۴

سودا　شیخ چاند احمد　۲/۸

غالب نامہ　محمد اکرم　۴/۸

فکر و فن　خلیل الرحمٰن اعظمی　۳/-

جہانِ نو　ڈاکٹر غلام جیلانی　۳/-

باقیاتِ فانی　فانی　۳/۸

نکاتِ مجنوں　مجنوں　۵/-

ادبی رجحانات　اعجاز حسن　۳/۱۲

نئی فکریں　سید محمد طفیل　۱/۸

اُردو ادب میں طنز و مزاح　فرقت کاکوروی　۱/-

روایت اور بغاوت　احتشام حسین　۳/-

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ　"　۲/۸

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ　سید مسعود حسن رضوی　۱/۸

اُردو تنقید کی تاریخ　مسیح الزماں　۳/-

تعبیر و تشریح تنقید　"　۲/-

تنقیدیں　اویس احمد ادیب　۳/-

اقبال　مجنوں　۱/۴

مطالعۂ شبلی　ناظر کاکوروی　۳/-

کتابِ نورس　ڈاکٹر نذیر احمد　۲/۸

مقالات:-

مقالات حالی مکمل　عبد الحق　۴/۸

فردوسی پر چار مقالے　پروفیسر محمود شیرانی　۶/-

مقالات گارساں دتاسی مکمل دو حصے　۸/-

خطبات　"　۶/۸

مضامین عابد　ڈاکٹر عابد حسین　۴/-

خطبات عبد الحق جلد دوم　۱/۸

خطباتِ شبلی　۱/۸

مقدمہ رقعاتِ عالمگیر　پروفیسر نجیب اشرف　۵/-

رقعاتِ عالمگیر　"　۴/-

مقالاتِ شبلی مکمل ۸ حصے　۲۴/۸

مکالماتِ برکلے　۱/۸

مکاتیب حالی　شیخ محمد اسمٰعیل　۳/-

پطرس کے مضامین　۲/-

مضامین سرسید　عزیز الدین اختر　۲/۴

انتخاب مضامین شرر　۱/۴

تذکرے و سوانح:-

گلِ رعنا　مولانا عبد الحیٔ مرحوم　۶/-

حیاتِ شبلی　سید سلیمان ندوی　۹/-

برکلے اور اس کا فلسفہ　مولانا عبد الباری　۱/۴

ادبی اور قومی تذکرے حصہ اول و دوم　۱/-

حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی　پروفیسر خلیق احمد　۶/-

چارج برنارڈ شا	ظ۔ انصاری	۲/۸
یادِ رفتگاں	جگر بریلوی	۴/۰
شاعراتِ اردو	محمد جمیل احمد نقوی	۶/۰
عہدِ جدید کے ہندو شعراء	عبدالشکور	۳/۰
ہندی کے مسلمان شعراء	،	۰/۱۲/۰
ہندو ادیب	،	۲/۰
تذکرۂ ریختی گویاں	سید فتح علی حسینی	۰/۱۲/۰
چمنستانِ شعراء	لچھمی نرائن	۴/۱۲
تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن دہلوی	۱/۱۲
رندِ پارسا تذکرہ ریاض خیرآبادی		۴/۴
ریاض الفصحاء	غلام ہمدانی	۲/۰
گلزارِ ابراہیم	سید محی الدین	۳/۰
نکات الشعراء	میر تقی میر	۱/۱۲
تلسی داس	جے کشن چودھری	۲/۸
عقدِ ثریا	،	۰/۱۲/۰
مخزنِ نکات	قائم	۱/۴
مہاراجہ رنجیت سنگھ	سیتارام کوہلی	۶/۰
سلطان محمود غزنوی	سید جمیل حسین	۱/۸
میر کی آپ بیتی	نثار احمد فاروقی	۲/۸
گلِ عجائب	اسد علی	۱/۴
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۴/۴
حیاتِ اجمل	قاضی عبدالغفار	۸/۰
حیاتِ سرسید	نورالرحمن	۳/۰
باپو کے قدموں میں	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵/۰
یادگارِ شعراء	طفیل احمد	۲/۸
سوانح حیات	امیر خسرو	۰/۱۲/۰
ذکرِ غالب	مالک رام	۳/۰
تبصرۂ امیری	سید محمد عبدالحکیم	۴/۸
سوانح مولانا روم		۴/۰
میر ولا	سید حسین	۱/۸
تلاشِ حق	مہاتما گاندھی	۴/۰

کیا خوب آدمی تھا	ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ	۱/۸
جواہر لال کی کہانی	،	۵/۰
سعادت حسن منٹو	کرشن چندر	۰/۱۵/۰
اسرار الحق مجاز	عصمت چغتائی	۰/۱۵/۰
دیوندر ستیارتھی	ساحر لدھیانوی	۰/۱۵/۰
مشاہیرِ چین	میر عابد علی خاں	۱/۸

ڈرامے

انار کلی	امتیاز علی تاج	۲/۸
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	۱/۴
پردۂ غفلت	ڈاکٹر عابد حسین	۱/۰
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	۰/۱۲/۰
کھیتی	،	۱/۸
ہیروئن کی تلاش	،	۱/۴
کربلا	منشی پریم چند	۲/۸
ٹیگور کے ڈرامے	ٹیگور	۲/۴
آگرہ بازار	حبیب تنویر	۱/۸
شکنتلا	کشن چند زیبا	۱/۴
لنگوٹی والا (گوتم بدھ)	،	۱/۸
کایا پلٹ (اچھوت ادھار)	،	۱/۸
بیوی اور بیوا	،	۱/۴
زخمی پنجاب	،	۲/۰
گریجویٹ مزدور	،	۱/۸
دان ویر کرن	،	۱/۸
ارادے	فریدہ سیٹھ	۲/۸
ریڈیو ڈرامے	فضل حق قریشی	۲/۰
پیسہ اور پرچھائیں	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۸
تاتی	مترجم نعیم الرحمن	۴/۰
فریبِ گل	مترجم جگت موہن لال	۳/۰
علیا حضرت	قدسیہ زیدی	۱/۸
انصاف	مترجم ریاض الحق	۱/۸

نقشِ آخر	پروفیسر اشتیاق حسین قریشی	۱/۰
نفرت کا بیج	،	۰/۱۲/۰
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۱/۰
دروازہ	کرشن چندر	۲/۰
مرزا جنگی	عظیم بیگ چغتائی	۰/۸/۰
دوسری شام	پروفیسر محمد مجیب	۰/۱۲/۰
کنڈیڈا برنارڈ شا	مترجم نورالحسن ہاشمی	۱/۸
دل سے قریب	انتصار حسین	۱/۸
یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری	۱/۸
خوبصورت بلا	،	۱/۸
انار کلی کی داستان	اظہار اثر	۳/۸
روحانی شادی	پریم چند	۱/۴
دکھیاری	ڈی۔ ایس کول	۱/۸
آزادی	،	۱/۰
ویر ابھیمنیو	کشن چند زیبا	۳/۴
سرون کمار	،	۱/۴
ستیہ وان ساوتری	،	۱/۸
شہیدِ اعظم سردار بھگت سنگھ	بشن گپتا	۰/۱۲/۰
جلیانوالہ باغ	،	۰/۸/۰
قاتل	اوم پرکاش	۰/۱۲/۰
رضیہ سلطانہ	کلیم عرفی	۵/۰

نظم

جواہرِ سخن اول	مولوی مبین کیفی چڑیا کوٹی، شعرائے دکن سے لیکر آج تک وغیرہ کے کلام کا انتخاب	۶/۸
، دوم	، ،	۳/۸
، سوم	، ،	۴/۰
، چہارم	، ،	۴/۰
گلزارِ نظیر	مرتبہ سلیم جعفر	۳/۰
کلامِ انشاء	مرزا عسکری	۱/۰

انتخاب کلام آتش	ڈاکٹر اعجاز حسین	۲/۸	میری نظمیں	طبراج کومل	۲/۸	اردو کے سو شعر	ریاض	-/۵/-
دیوان بیدار	خلیل احمد قدوائی	۲/-	جرس	وامق جونپوری	۳/۸	”	اصغر	-/۵/-
دیوان مومن	پروفیسر ضیا احمد ضیا بدایونی	۴/۸	پتھر کی دیوار	سردار جعفری	۲/۸	”	اقبال	-/۵/-
دیوان ذوق	محمد حسین آزاد	۲/-	نئی دنیا کو سلام	”	۳/-	”	جگر	-/۵/-
منتخب داغ	جلال الدین احمد جعفری	۶/-	امن کا ستارہ	”	۱/-	”	درد	-/۵/-
اکبر الہ آبادی	”	۵/-	سرود و خروش	جوش ملیح آبادی	۴/-	”	داغ	-/۵/-
دیوان حالی	”	۲/۴	سموم و صبا	”	۸/-	”	حالی	-/۵/-
دیوان غالب	آغا طاہر نبیرۂ آزاد	۱/۸	کلیات اقبال	اقبال	۵/-	”	حسرت	-/۵/-
انتخاب ذوق و ظفر	کیفی دہلوی	۲/-	گماں سنجیو	منور لکھنوی	۵/-	”	غالب	-/۵/-
رباعیات آسی	عبدالباری آسی	۱/۸	جاوداں	جاں نثار اختر	۳/۸	”	میر	-/۵/-
رباعیات انیس	سید محمد عباس	۲/۸	مقامات	احسان دانش	۳/-	”	مصحفی	-/۵/-
مثنوی میر حسن	شمسی بریلوی	۱/۱۲	نغیر فطرت	”	۲/۸	”	مومن	-/۵/-
گلزار نسیم		-/۱۲/-	بادباں	کمال احمد صدیقی	۱/۸	صنم و حرم	شکیل بدایونی	۲/۴
کلیات نظیر اکبرآبادی	نولکشور پریس	۱۲/-	ارمغانِ آلام	سید محمود	۲/۸	رعنائیاں	”	۴/۸
نظم لطیف (انتخاب)	جلال الدین احمد جعفری	۴/-	ترکش	محمد توقیر	۳/-	آخر شب	کیفی اعظمی	۳/-
رباعیات عمر خیام	نولکشور	-/۱۲/-	جوئے رواں	حامد اللہ افسر	۲/۸	سب رنگ	اختر الایمان	۱/۸
مرقع چغتائی	دیوان غالب مصور	۲۵/-	کاروانِ سخن	چاند نرائن	۳/۸	شکست زنداں	غلام ربانی تاباں	۳/-
مکمل شرح دیوان غالب	آسی	۳/۸	حرف تمنا	میکش اکبرآبادی	۳/-	ساز لرزاں	”	۲/۸
شرح کلام غالب	جوش ملسیانی	۵/-	دامِ خیال	ضیاء الاسلام	۳/-	فروزاں	جذبی	۳/-
مرآۃ الغالب	بیخود دہلوی	۵/-	ذوقِ جنوں	آل احمد سرور	۳/۸	آہنگ	مجاز	۳/-
دیوان اثر	عبدالحق	۱/۸	محفلِ خواتین	توفیق فاروقی	۴/-	تعمیر حیات	حافظ ولایت اللہ	۴/۸
دیوان تاباں	”	۲/-	گلزار سخن	اوتار	۲/-	شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۵/-
انتخاب داغ	”	۱/۱۲	جوئبار	بھیم سین ظفر	۹/۸	نشاطِ روح	اصغر گونڈوی	۱/۱۲
جلوت دریچہ	کیفی دہلوی	۱/۸	نقشِ بہزاد	بہزاد	۱/۸	سرودِ زندگی	”	۲/۴
کلیات ولی	احسنی	۴/۶	خمخانۂ حبیب	”	۱/۱۲	بانگِ درا	اقبال	۴/۸
اس نظم میں	میراجی	۲/۸	وجد و حال	”	۲/۸	بالِ جبریل	”	۳/۸
میراجی کی نظمیں	”	۲/-	طلوعِ طور	”	۱/۸	ضربِ کلیم	”	۳/۸
قومی نظمیں اور ترانے	”	۲/۸	کاروانِ منزل	آسی لکھنوی	۲/۸	ارمغانِ حجاز	”	۱/۱۲
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	۲/۸	کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲/۱۲	شاہنامہ اسلام مکمل چار حصے	حفیظ جالندھری	۱۲/-
مسدس حالی	”	-/۱۰/-	انتخاب کلیات نظیر اکبرآبادی	جلال الدین احمد جعفری	۵/-	نغمۂ نار	”	۳/۸
بوستانِ روس	شعاد دہلوی	۲/-	اردو کے سو شعر	اکبر	-/۵/-	روپ	فراق گورکھپوری	۳/۸

رات گئے تک امر سنگھ بیٹھا سوچتا رہا اور پھر تھک کر سو گئے!

× × × × × ×

صبح ہوتے ہی امر سنگھ آ پہنچا۔ منورما نے کواڑ کھولے۔ امر سنگھ اندر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سوا لاکھ تو ہو شگون دیکھ کر!"

"ایسا!" کہہ کر منورما نے اسے آنکھ مارتے چپ کرا دیا۔ خاموشی سے ایک دو آوازیں دے کر جھمکو کو جگایا لیکن جواب نہ ملا۔ امر سنگھ کو آہستہ بولنے کی ہدایت کر کے منورما نے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

امر سنگھ بولا "ایک بار خریدار کو دکھانا پڑے گا، لیکن یہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"اسے یہاں کیسے لایا جائے؟ اگر کوئی ....؟"

"یہاں تو سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں اس میں کیا بات ہے!" منورما نے فوراً کہا۔

"امر سنگھ کچھ سنبھل کر بولا "ذرا بات تو سن لو! ہندو دھرم شالا میں مسلمان اگر آ جائے تو آپ یا میں کچھ حرج نہیں، لیکن اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو جائے تو آفت آ جائے گی!"

پھر منورما کے چہرے پر عجیب تاثرات کا اتار چڑھاؤ بھانپ کر بولا۔ "پورے چھ سو مل سکتے ہیں کاکا!"

"اچھا؟" منورما بولے۔ امر سنگھ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ غور کر رہے ہیں لیکن اس کی پروا کیے بغیر جھمکو کی طرف آنکھیں پھیراتے ہوئے بولا۔

"مال تو اصلی ہے اس لئے جھٹ پٹ کلدار گن لینا!" کچھ وقت کے بعد بولا۔

"لیکن سوچتے کیا ہو؟ اسے میرے گھر لے چلو دوپہر سے پہلے ہی تمھیں چھٹی مل جائے گی۔ اور میں بھی...."

"ہاں ہاں ٹھیک ہے! اس کام میں جتنی جلدی چھٹکارا مل جاتا اتنا ہی اچھا ہے" منورما دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگے۔ چہرے کے تاثرات بھی بدلے بدلے سے تھے۔ امر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھمکو کو جاگتا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ منورما نے پیار سے جھمکو سے کہا۔

"چلو بیٹا جاگ گئی۔ چلو" جھمکو ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔ منورما امر سنگھ کے ساتھ دھرم شالہ سے باہر نکل گئے۔ امر سنگھ بڑی محنت

کر کے مسلمان کی بیٹیا بہلانے کے بعد ہی سو ملنے کی بات ہے۔ لیکن منورما کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں تھا۔

"کہاں گئی وہ؟ کیوں، نا تو دیر لگا رہے ہو کاکا؟"

منورما کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جھمکو نہیں ہے۔ واپس آ چکی ہے اور باہر کوٹھری کے پاس ہی کھڑی ہے۔

انھوں نے امر سنگھ کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"اچھا تو پھر بلاؤ جلدی!" امر سنگھ نے بے چین سا کہا۔

"بلاتا ہوں!" کہہ کر منورما اٹھے لیکن دروازے کے پاس سے ہی واپس آ گئے۔ منورما کے اس برتاؤ سے زیادہ ان کے چہرے کے تاثرات نے امر سنگھ کو تعجب میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی منورما نے قریب کھسک کر بیٹھتے ہوئے امر سنگھ سے کہا۔

"کیا مسلمان کے سوا کوئی دوسرا اپنی ذات کا خریدار نہیں مل سکتا؟"

"ارے اس میں کیا رکھا ہے۔ رام کہو یا رحیم بھگوان تو ایک ہی ہیں کاکا"

"بات تو ٹھیک ہے بھیا، لیکن ہندو لڑکی ہندو کے گھر میں جاتی تو اچھا تھا"

اگرچہ چھ سو کی لالچ دے کر امر سنگھ نے اس مسلمان گاہک کی بہت تعریف کی لیکن کوئی بات منورما کے دل کو نہیں لگی۔

"ایک ٹھاکر بھی ہے لیکن وہاں سے بہت کم ملے گا"

"آخر کتنے؟"

"اس سے آدھے!"

منورما ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے "ٹھیک ہے بھیا! آدھے ہی سہی لیکن دھرم تو بچے گا!"

امر سنگھ نے یہ دھرم ادھرم کی بحث چھوڑ کر بات کا رخ بدل دیا اور منورما کے مذہبی عقیدے اور احترام کی تعریف کی۔ اٹھتے اٹھتے اسے جیسے کچھ ایک دم یاد آ گیا ہو۔

اس طرح بولا "میری سمجھ میں تو کاکا۔ پہلے اپنا عقیدہ... اس سے آگے بات گھما کر روپے پیسے کے بارے میں، عزیز داری اور لین دین کے تعلقات پیدا کرنے جیسے موضوع پر تھوڑا سا لیکچر دینے لگا۔ منورما ہنس کر بولے۔

"تم خود ہی کہہ دو نہ بھیا!"

"میں کیا کہوں کاکا؟ تم خود ہی دیکھ لو کہ میں کتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی امر سنگھ نے پولیس کی رشوت اور دلالی میں آنے

صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ کیچ تیوہار ہو، چھٹی ہو ـــــ کچھ بھی ہو کسانوں کی یہ خدمت بند نہیں ہوتی۔ اس خدمت میں کوئی کمی نہ ہو اس لئے بعض لوگوں نے تو اپنے رہنے کے مکان بھی کھیتوں اور باغیچوں میں ہی بنا لئے ہیں۔ یہ کالی ماتا جب تک یہ نہیں دیکھ لیتی کہ اس کے بیٹے نے اس کی خدمت انجام دینے میں اپنے خون کا پسینہ کر ڈالا ہے، تب تک وہ خوش نہیں ہوتی اور نہ ہی موتی کے مانند اناج کے دانے دیتی ہے۔ میرے گاؤں کے تمام کسان اپنی کالی ماں کی خدمت میں اپنے خون کا پسینہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے خوش رہتی ہے اور انھیں پیار کرتی ہے۔ یہاں کے جینیوں کے بارے میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کھیتی جینی ہی کرتے ہیں اور پھر سونے سے اپنی تجوری بھرتے ہیں۔ اور یہ مثل بالکل سچ ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ محنتی اور دبنگ ہیں۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی کرنا، دریا سے پانی لانا، دودھ دوہنا، گایوں کی خدمت کرنا، کھانا پکانا، کھیتوں پر کھانا پہنچانا، دریا پر کپڑے دھونا، بعض اوقات کھیتوں پر کام کرنے بھی جانا ـــــ فصلوں کو پانی دینا، بازار ہاٹ کرنا، شام کے وقت جین مندر میں جا کر "پُران" سننا اور بچوں کو سنبھالنا وغیرہ متعدد کام وہ کس طرح کر لیتی ہیں یہ وہی جانیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے ان سب کاموں میں تنظیم، صفائی اور خلوص خصوصاً پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانگلی کے بازار میں دھرم پور کی چیزوں کو ـــــ خصوصیت سے گھی کو دو پیسے زائد میں خریدا جاتا ہے۔

جینی بیواؤں کے کام تو بالخصوص قابل ذکر ہیں ـــــ گھر گرہستی کو کفایت شعاری سے چلانے میں یہ مہارت رکھتی ہیں۔ یہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی ہیں اور ان کی ازدواجی کاموں میں سرگرمی سے امداد کرتی ہیں۔ ان کے جسم پر ایک صاف سفید کپڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں چاندی کے کنگن ہوتے ہیں۔ اس قسم کا جذبۂ ایثار رکھ کر خدمت کرنا انہیں کا حق ہے۔ جینیوں کی اصل تہذیب اپنی خواتین کی وجہ سے جن میں ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، قائم ہے، پھر جاپا پاٹھ۔ اپواس برت، پُران کی سماعت اور مختلف مذہبی رسومات وغیرہ اگر کوئی سچے دل اور خلوص سے ادا کرتا ہے تو وہ جینی بیوائیں ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان سب باتوں کا مقصد ہوتا ہے ـــــ ایثار، خدمت اور عبادت۔

ایشور نے دھرم پور کو جو ایک خاص عطیہ دیا ہے وہ ہے دریائے کرشنا۔ ہندوستان میں متعدد مرتبہ متعدد مقامات پر قحط پڑا۔ کئی مرتبہ پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض خوفناک طریقہ پر جانی بربادی کے باعث بنے۔ لیکن میرا دھرم پور ان سب غیبی تباہیوں سے آج تک بالکل اچھوتا رہا ہے۔ حالات جس طرح بدلتے گئے ان کے مطابق ہی یہاں کے جینی کسانوں نے دریائے کرشنا کے ساحل پر جگہ جگہ انجن اور پمپ لگا کر اپنی فصلوں کی آب پاشی کا بندوبست کر لیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اناج کے علاوہ وہ بڑھیا سے بڑھیا گڑ، ہلدی، مرچ اور تمباکو بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا سارا مال سانگلی کے بازار میں پہنچتا ہے اور اس پر گاہک ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کیا گرما، کیا برسات، کیا خزاں اور کیا سردی سبھی موسموں میں دھرم پور کے قرب و جوار کے علاقہ میں ہمیشہ ہریالی چھائی رہتی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بڑے بڑے آم کے درختوں اور اونچے اونچے ناریل کے پیڑوں نے اس گاؤں پر ہری مخمل کا خوبصورت شامیانہ تان دیا ہے۔ اس گھنی ہریالی میں سے ابھرا اٹھتی ہوئی یہاں کے قدیم جین مندر کی محراب بہت دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ گاؤں کے مغرب میں بہنے والا دریائے کرشنا، اس کا خوبصورت اور شاندار پاٹ اور اس پانی میں متواتر اپنے قدم دھوتا ہوا لمبا چوڑا اور مرد و عورتوں نیز بچوں سے بھرا پورا گھاٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اسے ایک ناقابل بیان اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکون و اطمینان مہابلیشور اور شملہ ایسے ٹھنڈی آب و ہوا والے مقامات پر بھی میسر نہ ہوگا۔

تیرنے کے لئے پانی اور کشتیاں لڑنے کے لئے ریتیلا کنارہ دیکھ یہاں کے باشندوں کو کھلاڑی بنا دیا ہے۔ ملک میں ایسا کوئی بھی تیرنے کا مقابلہ یا کشتیوں کے دنگل نہیں ہوتے جس میں دھرم پور کے نوجوان جوش و خروش سے حصہ نہ لیتے ہوں۔ اگر میں کہہ دوں کہ ۱۹۴۲ء کے انقلاب میں حصہ لینے والے زیادہ سے زیادہ انقلابی ہیرو یہیں کے تھے تو میں سمجھتی ہوں اپنے گاؤں کے نوجوانوں کی بہادری کی مزید تعریف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

دھرم پور کے خاص رہنما ـــــ نہیں کہنا چاہئے 'دیوتا' یہاں کے زمیندار شری سیوک رام جی ہیں جنہیں لوگ محبت اور عزت سے دادا جی

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ۔۔۔ دیدی اور بھیا کے لئے دونوں کی موٹریں بھی تو گی جاتی ہیں کیا؟
ہاں ۔۔۔ اس کا سوال اور سر بستہ سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے
لیکن اس شادی پر غور کرنے کی ضرورت دیکھ کر کی جا سکتی
دیدی کا ہر ایک جملے سے ماں کے اثرات کی بو آ رہی تھی ۔۔۔ جیسے کہ
ماں اور دیدی ہم خیال تھیں۔ دیدی کی ان باتوں میں میرا کوئی [illegible]
ذہن کے خانے میں تیر کا گھنٹہ یا [illegible] اس کی آخری گرہ
پانی میں سن کی اور پھر نیند نے مجھے اپنے آغوش میں چھپا لیا۔

دیدی کی شادی ہو گئی رخصتی کے وقت وہ ماں سے لپٹ کر زار و قطار روئیں کہ پتاجی کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ میں نے پتاجی کو اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ تو دیدی کی رخصتی کے وقت اور دوسری دفعہ ۔۔۔۔ پھر بتاؤں گی۔

ماں کی نظروں میں میں کسی مشورہ کے قابل نہ تھی۔ دیدی کے لئے کپڑے اور زیورات بنوائے گئے ۔۔۔ اس وقت بھی انہوں نے میرے مشورے کی ضرورت محسوس نہ کی جس کا رنگ سیاہ ہو وہ بھلا کیا جانے گی کس ساڑی کے ساتھ کون سا بلاؤز خوشنما دکھائی دے گا ۔۔۔
ماں کھلے ہاتھوں خرچ کر رہی تھیں۔ بوا نے ٹوکتے ہوئے کہا ۔۔۔ رانی کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ اسے کس طرح کرو گی؟ ۔۔۔ کیا اس کی شادی میں خرچ نہ کرو گی جو اسی شادی میں تمام رقم اٹھائے دے رہی ہو؟
ماں نے نہایت افسردگی سے جواب دیا ۔۔۔ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے ۔۔۔ کوئی اسے اپنائے تو سمجھو بس۔
واہ بھابی! واہ ۔۔۔ رانی کنواری ہی رہ جائے گی؟ ہماری سینا (لڑکی کا نام) تو رانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ سانولی ہے۔ پھر رانی کے نقوش تو نہایت دلکش اور خوبصورت ہیں۔ آنکھیں بھی بڑی خوبصورت ہیں۔
لیکن اس کے بعد ماں نے جو کہا اس نے میری روح کو ہلا دیا۔ کیا کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے اس طرح کے الفاظ استعمال کر سکتی ہے! میری پیدائش کے وقت کیا ماں نے تکلیف محسوس نہ کی تھی؟ ۔۔۔
میں نے تو سنا تھا کہ ماں کو اپنے سبھی بچوں سے یکساں محبت ہوتی ہے۔ ان کے درمیان فرق تو صرف [illegible] کیا کرتا ہے ۔۔۔

ماں نے کہا ۔۔۔ [illegible] لڑکی ہی ہو کر رہ گئی [illegible] نہیں ہے۔ جب بھی دیکھتی ہوں تو سر پر [illegible] دیکھتے ہی میں خوف زدہ ہو اٹھتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ نہ جانے کس [illegible] کی بد دعاؤں سے ایسی لڑکی میری کوکھ سے پیدا ہوئی۔
بوا کی آنکھیں [illegible] بھیگنے لگیں ۔۔۔ رنجیدہ نہ ہو [illegible] لڑکی پڑھ لکھ کر [illegible] بن جائے گی۔ تمہارے لیے [illegible] بنا دو ۔۔۔ ڈاکٹر بنا دو۔
اس پر ماں نے کہا ۔۔۔ نہیں بی بی! ہماری حیثیت اس قابل نہیں کہ ڈاکٹری پڑھا سکیں ۔۔۔ دوسرے۔ ڈاکٹر بن کر جب یہ اپنے کالے ہاتھوں سے بچے پیدا کرائے گی تو وہ بھی کالے ہو جائیں گے۔
ماں کی اس بات کا بھلا کیا جواب دیتی [illegible] بہت پہلی گئی۔ میرے دل کو [illegible] تھا۔ آخر کیا ایک ماں اپنی بچی کے لئے اس قدر سخت اور [illegible] الفاظ استعمال کر سکتی ہے؟ یہ میرے تخیل اور تخیل سے پرے کی بات تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ماں کی الفت اور ممتا مجھے نصیب نہیں ہوئی لیکن ماں کی ممتا اور محبت کیسی ہوتی ہے یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ ماں کے دل میں دیدی کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ میں نے کئی مرتبہ ماں کو دیدی کی طرف ممتا بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھا تھا۔ دیدی کی [illegible] کیا نہیں کرتی تھیں؟ ایک مرتبہ شہر میں نمائش ہو رہی تھی۔ دیدی نے اس میں [illegible] ایک ساڑی دیکھی جس پر ان کا دل مچل اٹھا۔ ساڑی [illegible] کی تھی۔ ماں کے پاس اتنے روپے نہیں تھے [illegible] ساڑی دلوا دیتیں۔ پتاجی ایک معمولی بینک کے [illegible] تھے۔ صرف چار سو روپے تنخواہ [illegible] اسی سے گھر کا خرچ [illegible] بھائی کی تعلیم [illegible] رشتہ داروں کی شادیاں [illegible] کہ ساڑی [illegible] دیدی کے لئے [illegible] گھر واپس جا کر دیدی نے کھانا تک نہ کھایا [illegible] ماں [illegible] گئی۔

سر سے پاؤں تک بغور دیکھا جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کہ آیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس پر اس قدر جادو کر دیا تھا کہ وہ اُس کے پیچھے یہاں تک کھنچا چلا آیا ہے — وہ اپنے حُسن کی تمام رنگینیوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال ویسے ہی خوبصورت تھے۔ اُس کی آنکھوں میں وہی سحر انگیزی تھی۔ اُس کے چہرے کی تازگی بھی ویسی ہی تھی۔ اُس کی عمر صرف سترہ برس کی ہوگی۔ ابھی تک پکاریو میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ وہ اُس کے تازہ اور گلابی رخساروں کو چھو سکے۔ وہ بہت حسین تھی۔

وہ اُس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اپنے آپ میں کھو جانے کے لئے ویسے ہی تیار تھا۔ جیسے وہ پہلا اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ لیکن وہ حسین لڑکی اس لمبی خاموشی سے تنگ آ گئی۔ اور پکاریو کی نگاہوں میں جھانکتی ہوئی معنی خیز طور پر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک دردناک بیہودگی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر اتنی عجیب لگ رہی تھی جتنا کسی جلاد کے دل میں رحم اور کسی شاعر کے ہاتھ میں بہی کھاتہ۔

وہ کانپ سا گیا۔ اُس نے اپنے حسین ہونٹوں کو جنبش دی اور کچھ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ سب فضول اور بیہودہ تھا — جیسے پاکیزگی کے چھن جانے سے عقل بھی چھن گئی ہو۔ وہ اب کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ پکاریو میں ایک بچے کی سی سادگی تھی۔ اس قسم کا موقع کسی بھی اور شخص کے لئے مسرت کا باعث ہو سکتا تھا لیکن وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گلی میں آ تر آیا۔

سر جھکائے اور اپنے بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑے وہ اپنے کمرے میں ایک ایسے دکھی انسان کی طرح بیٹھا تھا جو ایک نایاب ہیرا پا کر اسے سمندر میں گرا دے۔ "اتنی حسین عورت! اتنے پیارے نقش و نگار! اور کہاں پڑی ہے؟" وہ صرف یہی الفاظ کہہ سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم اس قدر رحم دل کبھی نہیں ہوتے جتنا ہم ایک حسین چہرے کو غلاظت کے گڑھے میں گرا دیکھ کر ہو تے ہیں۔ بدصورتی اور غلاظت کو ایک جگہ دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن حسن — حسن کی اور بات ہے۔ حسن کا تعلق ہمارے خیالات میں پاک و صاف چیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ حسین لڑکی جس نے پکاریو کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ حسن نسوانیت کا ایک حسین نمونہ تھی۔ اُس غلاظت کے گڑھے میں اُس کی موجودگی کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہی تھی — اُس کے چہرے کے نقوش اس قدر متناسب تھے۔ اُس کے چہرے سے اس قدر برتری ٹپکتی تھی کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ گراوٹ نے اُسے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

وہ ایک نایاب ہیرا ہو سکتی تھی۔ ایک بے پناہ محبت کرنے والے خاوند کی جنت ہو سکتی تھی۔ وہ ایک خاندان کا چشم و چراغ ہو سکتی تھی۔ اُس کے حسین لبوں کی جنبش حکم صادر کر سکتی تھی۔ رقص و سرود کی محفلوں کی وہ شہزادی ہو سکتی تھی جہاں موم بتی کی روشنی میں ہزاروں عشاق اپنے دلوں کے نذرانے اُس کے قدموں پر پیش کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن افسوس کسی شیطانی قوت کے زیر اثر وہ زندگی کی قدروں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس غلاظت کے کنوئیں میں دھکیل دی گئی تھی۔

دکھ اور رحم کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا وہ موم بتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ آدھی رات کب کی گذر چکی تھی۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سے جب آدھی بجے کی آواز آئی تو وہ نیند سے بیدار گم سم پڑا تھا۔ نیند کی دیوی آہستہ آہستہ اُسے اپنی گود میں لے رہی تھی۔ کمرے کے در و دیوار اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں گم تھا۔ اُسے صرف موم بتی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کانپ سا گیا۔ اور اٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بڑے قیمتی لباس میں ایک کوچوان اندر داخل ہوا۔ آج تک اس کمرے میں کبھی اتنے حسین لباس میں ملبوس کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ اور پھر اتنی رات گئے اُسکی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کوچوان کو اُس نے بڑے بے صبر تجسس سے دیکھا۔ کوچوان جھک کر آداب بجا لایا اور کہا "میری مالکن سے آپ چند گھنٹے ہوئے مل کر آئے ہیں آپ کو بلایا ہے۔ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ گاڑی نیچے کھڑی ہے"

پکاریو حیرت میں گم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی حسین لباس